

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔

پیش نظر کتاب میں بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 📖

<https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share>

میر ظہیر عباس روستغالی

0307-2128068 📞

@Stranger ❤️❤️❤️❤️❤️❤️

نوییل ادبیات

باقر نقوی

پہلی اشاعت : اکتوبر ۲۰۰۹ء
کچھ رنگ : طرز و پلنگہ نمبر: 32751324
قیمت : ۱۰۰۰ روپے
جواز حقوق محفوظ

نوبل ادبیات | باقر نقوی

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 📖

<https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share>

میر ظہیر عباس روستمانی

0307-2128068 📞

@Stranger ❤️ ❤️ ❤️ ❤️ ❤️ ❤️ ❤️

Nobel Adabiyat

Translation

Compiled and Translated by : Baqar Naqvi

Korba Market, Office 17, St. # 3,
Lahore Bazar, Karachi, Pakistan
Ph: (92-21) 32751423
e-mail: a.2521371@gmail.com

انتساب

ہماری پیاری، قومی زبان
اُردو کے لیے
لوگ جس کو تنگ داماں سمجھتے ہیں

باقر نقوی کی یہ کتاب جو دنیا کے نوبل انعام یافتہ ادیبوں اور دانشوروں کی تخلیقات اور کوائف سے کما حقہ متعارف کراتی ہے، اردو ادب کی تاریخ میں یقیناً پہلی کوشش ہے۔ باقر اصلاً شاعر ہیں اور ایک اچھے شاعر جس کا اظہار ان کے کليات "نامن" سے ہوتا ہے۔ پچرانہوں نے کمپیوٹر سائنس اور اس کے جملہ تعلقات پر بھی کتابیں لکھیں ہیں۔ تاہم نوبل انعام یافتگان کی کارکردگیوں سے اردو دنیا میں بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اردو دنیا کو صرف چند دانشوروں نیز شعرا اور ادیبوں سے واقفیت ہے جن میں برٹینڈ رسل، پابلو نیرودا، گئیرگراس، نجیب محفوظ، اوکتاویو پاز اور مابندرماتھ نیگور خاص ہیں۔ باقر نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ان تمام دانشوروں کے حالات اور ان کی عالمی شہرت کے اسباب اور ان کی فکری صلاحیتوں کا تجزیہ اپنی اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

کتاب کی زبان خاصی روٹیں دواں اور دل چسپ ہے جس سے قاری لطف اندوز ہوتا ہے۔ بیانات، اخباری رپورٹ یا تاریخ کی خشکی لیے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان میں ادبیت حسب موقع بولتی ہوئی نظر آتی ہے جو قاری کو دل چسپی کے ساتھ لپیٹے رہتی ہے۔ اس طرح یہ کتاب ایک اچھا ادبی نمونہ بھی بن جاتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب ادبی دنیا میں ایک خاصے کی چیز تصور کی جائے گی اور اس کا جبر پورنہر مقدم ہوگا۔

سید محمد عقیل

نوبل انعام یافتگان کی غیانت کے دوران جو خطبات ان مابہر روزگار شخصیات نے دیے اور جو کہ میں مہینہ مرزا کے توسط سے پڑھ سکی ہوں، یا پھر "پچر" ریویو اور دیگر ادبی پرچوں میں میری نظر سے گزرے ہیں، بنیادی بات یہ ہے کہ بیش تر انعام یافتگان نے اپنی زمین، اس کے مسائل اور تاریخ کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اس کے حوالے اس طرح دیے ہیں کہ بعد ازاں ان کی تحریریں پڑھ کر پورے ماحول کا منظر سامنے آ جاتا ہے۔ یہ بھی مفہوم آشکار ہوتا ہے کہ ہر لکھنے والا اپنے سیاسی اور سماجی مسائل سے بیگانہ نہیں ہوتا ہے بلکہ اپنی تخلیقی جولانی کو ذہنی حیات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

ترجمہ کرنا، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ادبی نقطہ نظر اور اسلوب کو سامنے رکھ کر باقر نقوی نے جس طرح ترجمہ کیا ہے، وہ اعلیٰ ادبی طہریوں کو نہ صرف آسان کرتا ہے بلکہ یہ مجموعہ پڑھنے والوں اور سننے والوں دونوں کے لیے اعلیٰ ادبی عمیت فراہم کرتا رہے گا۔ یہی کسی ادبی تخلیق کی مابہر ہوتی ہے۔

کشور ناہید

باقر نقوی کی اولین شناخت ایک خوش گوشا عمر کی حیثیت سے ہے، لیکن انھوں نے اس شناخت پر قناعت نہیں کی۔ اور کربھی نہیں سکتے تھے۔ مسلسل متحرک رہنے اور سوچنے والا ذہن کبھی ایک دائرے میں محدود رہنے پر کیوں کراؤا ہوسکتا ہے۔ چناں چہ ہم نے دیکھا کہ انھیں جدید تر فکری، عقلی اور سائنسی موضوعات میں دل چسپی ہوتی۔ ”نظیے کی دنیا“، ”نم قیامت مع الیکٹرونس کی تاریخ“ اور ”مصنوعی ذہانت“ اسی دل چسپی کا عملی اظہار ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ جدید موضوعات اور سائنسی تحریات کی دنیا کو جانے والے پھرو ہیں کے ہوسکتے ہیں اور ادب و شعر کی طرف واپسی کا راستہ بھول جاتے ہیں لیکن باقر نقوی نے ایسا نہیں کیا۔ اب انھوں نے ایک ادبی کارنامہ سرانجام دیا ہے اور یہ ہے جس میں دس صدی کے نوٹیل ادیبوں کی تقاریر اور خطبات کا اردو ترجمہ۔ باقر نقوی ترجمے کی بہت غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر انھیں دسترس حاصل ہے۔ ان تراجم کے مطالعے کے بعد یہ بات نہایت ذمہ داری سے کہی جاسکتی ہے کہ پوری ایک صدی کے نوٹیل انعام یافتہ ادیبوں کے خطبات کا یہ ترجمہ نہ صرف اپنی نوعیت کا منفرد کام ہے بلکہ یہ کتاب اردو ترجمے کی روایت میں اضافے کا دوجہ بھی رکھتی ہے۔

وہ لوگ جو ادب کا مطالعہ عالمی تناظر میں کرتے ہیں، ان کے لیے یہ کتاب بلاشبہ ایک قیمتی دستاویز ثابت ہوگی، اس لیے کہ یہ انسانی احساس کی بلا تفریق سچائی اور ادب کے وسیع تر آفاق کا اشارہ ہے۔

سید مظہر جمیل

فہرست

۱۱	پروفیسر محمد انصاری	”نویں ادبیات“ پر ایک نظر
۱۶	باقی نقوی	کچھ ضروری باتیں
۲۱		گادڑ ٹنگیان
۳۵		مکھنتر گراں
۵۱		ہونے مارا مارا گو
۶۵		دار پو نو
۸۰		دھلاوا سمیو ریکا
۸۷		شیش پانی
۱۰۳		کیڑا بندہ اے
۱۱۸		نویں سواری سہی
۱۲۹		نیرک والکٹ
۱۳۷		نارین گورنر
۱۶۰		لوکتو یو پان
۱۷۶		کھیلو ہونے مالا
۱۹۱		نجیب محفوظ
۱۹۸		جوزف میا کی
۲۱۲		دولے سونکا

۲۳۳	ککڑ سیمال
۲۵۱	یارو صلاف ساقی فریت
۲۶۴	ولیم کولڈجنگ
۲۷۹	گھبر چل کارشیا مارکیز
۲۸۶	الیاس کا نتی
۲۸۹	چوہا میڈوش
۳۰۴	اولی سس ایلی جیر
۳۱۴	اسحاق باقیدون سنگر
۳۲۱	ہینچے الیکرا اندرے
۳۲۹	مرال بیلو
۳۴۳	ایوچینیو مونٹالے
۳۵۶	ایونڈ چانس اور ہیری مارٹنس
۳۶۱	ہیٹرک و ہائٹ
۳۶۵	ہائٹریج ہونگ
۳۶۸	پابلو نیرودا
۳۸۰	الیکرا اندرے ایوا چی سوئٹے مین
۳۹۷	سینوئل بیکٹ
۴۰۰	یاسوناری کلواماتا
۴۱۵	میکیل انجیل آستوریاس
۴۳۰	اشموئل یوسف الگنسی
۴۳۷	نئے فی رماش
۴۴۰	مینا نکلی الیکرا اندرے و چی شولوفوف
۴۴۵	شاں پال سارڈ
۴۴۸	یورگوں سفیریس
۴۶۴	چارچ اٹھائیک
۴۶۹	آئیو آلمیریچ
۴۷۵	سینٹ جان پریس
۴۸۱	سلوا تو رے کا زیدو

۴۹۵	یورپس لینا ڈوچی پوسٹراک
۴۹۸	انجمن کامیو
۵۰۳	موان رومان پتہ پتہ
۵۰۸	بالدوین کیلیان لکینیس
۵۱۳	اوسٹ سمٹکوے
۵۱۷	پوسٹن چوچل
۵۲۳	فرانسوا شارل مارے
۵۳۰	پرو فلپیاں لارگر کوٹ
۵۳۸	لارڈ پورٹنڈر پوسٹل
۵۵۵	ولیم فاکر
۵۶۰	ٹامس اسٹیرٹس لپٹ
۵۶۶	آندرے ڈی
۵۷۱	ہرمین پیس
۵۷۶	گیبریل مسٹر ال
۵۸۰	جوبانز ولیم چیمپس
۵۸۵	فرانز لاسل سیلین پا
۵۸۸	پارل پک
۶۱۳	راجہ مارٹن ڈوکار
۶۱۶	پوسٹن اوٹل
۶۲۳	لوکی واندیلو
۶۲۸	ایوان پوسٹن
۶۳۳	جان گارڈر
۶۳۶	ایریک ایکسیل کارل فیلٹ
۶۳۹	پوسٹن لپٹ
۶۴۲	ٹامس مان
۶۴۸	سیگرید انڈریٹ
۶۵۱	پیری برٹس
۶۵۶	گرازیلا ولید
۶۵۹	جارج برٹس

۶۶۲	ولادیسلاو اسٹیشسکا ریوانٹ
۶۶۵	ولیم بٹر فیلڈ
۶۸۰	بلڈینو جیا ویٹے
۶۸۳	اماٹول فرانس
۶۸۸	ٹنٹ پیپرینس باسول
۶۹۳	کارل اچنر
۶۹۶	ہنرک پونتہ پیمان
۶۹۸	کارل ایڈولف گیلاف
۷۰۰	کارل گسٹاف ورنڈ فان ہائیڈن اسٹام
۷۰۳	روٹس رولاں
۷۰۶	رابندر ناتھ ٹیگور
۷۰۹	گیرمارٹ ہانڈلمان
۷۱۲	کاؤنٹ مارٹن میٹرلک
۷۱۷	پال یونان لڈوگ فان پے
۷۲۰	ہلما اوہلیا لوویا لگیرلوف
۷۲۸	روڈولف کریستوف ایوکی
۷۳۱	رڈیا راکپونک
۷۳۵	جیوسو کاروچی
۷۳۸	ہنرک بیکلی وچ
۷۴۱	ہوزے انخیزگارے
۷۴۳	فریڈرک مسٹرال
۷۴۵	پیوٹر سترنے مارٹنس پیورنس
۷۵۱	کریچین ستانکس تھیوڈوروس مسین
۷۵۳	شلی پروموم
۷۵۷	اشادیہ
۷۷۷	قونسل اکادمی کا اجازت نامہ
۷۷۸	باقریٹوی کی تصانیف

”نوبل ادبیات“ پر ایک نظر

میرا خیال ہے دنیا میں ہر تعلیم یافتہ فرد افریڈ نوبل کے نام سے واقف ہے۔ نوبل کا پیدائش نام افریڈ برنہارڈ نوبل (1833-1896) تھا۔ ان کا تعلق سویڈن سے تھا اور انھوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی سے اپنی دلچسپی کے نتیجے میں ڈائنامائٹ اور دیگر آتش گیر آلات ایجاد کیے۔ ان کا مطمح نظر یہ تھا کہ کوہ کنی اور ارض شہت میں سخت جاں فشانی کرنے والوں کے لیے سہولت پیدا کی جائے لیکن نوبل کی اولاد جس نے پتھر کو بھی مہلک ہتھیار بنالیا تھا، کہل باز آتی ہے؟ ڈائنامائٹ کو تخریب کاری اور جنگ آزمائی میں استعمال کیا جانے لگا۔ نوبل کو اپنی ایجاد کی بے وقاحتی اور غلط استعمال پر شدید ملال ہوا۔ چنانچہ انھوں نے یہ وصیت کی کہ ان کے مالی اثاثوں کا فائدہ ان اہل دانش کو پہنچے جنھوں نے انسان کی فلاح و بہبود کے کسی شعبہ میں کاربائے نمایاں انجام دیے ہوں۔

10 دسمبر 1896ء کو نوبل کا انتقال ہوا۔ ان کے مرنے کے بعد یہ طے پایا کہ چھ شعبوں (1) تعلیمات یا طب، (2) طبیعیات، (3) ادب، (4) کیمیا، (5) امن اور (6) معاشیات میں کوئی اہم کام نہ سہرا انجام دینے والی شخصیت کو ایک خطیر رقم کے ساتھ ملائی تمغہ دیا جائے۔ یہ انعام نوبل کے نام سے موسوم ہے۔ نوبل انعامات کا اجرا 1901ء میں ہوا۔

سویڈش اکیڈمی آف سائنس (اسٹاک ہوم) ہر سال 10 دسمبر کو نوبل کی برسی کے موقع پر ان انعامات کا اعلان کرتی ہے۔ نوبل انعام کی بڑی وقعت ہے۔ نوبل انعام یافتگان کو انتہائی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ دیگر شعبوں کے مقابلے میں ادب کے حتمن میں دیے جانے والے نوبل انعام کا چھپا

کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ دوسرے کی بار یہ شوشر پھوڑا جاتا ہے کہ فڈس غنمش کو نوٹس انعام سیاسی وجود کے تحت دیا گیا ہے۔ بعض نوٹس انعام دستانے تو انعام واپس بھی کیے ہیں۔ ان میں بڑی پائتربک اور ڈاس پال سواتر جیسے ادیب بھی شامل ہیں۔

نوٹس انعام کی تقریب شان و رطریٹے سے مستعد کی جاتی ہے۔ اس موقع پر انعام یافتہ شخصیت کو ایک ٹکیر بھی پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہ ٹکیر عموماً خیالات، اسلوب اور منظر و بیان کا ثبوت کار ہوتا ہے۔

اردو کے معروف شاعر مرزا دہل، اتر نقوی جو کئی کتابوں کے مصنف ہیں، نے یہ سوچا کہ ان خطبات کا اردو میں ترجمہ سنا چاہیے۔ باتر نقوی صاحب اس سے کمال "معنوی زبان" "راکی فب" پر ایک تحریک "جسکی" سہیں رداوی کو پیش کر چکے تھے۔ ان کی شاعری کا رنگ و آہنگ بھی جدا ہے۔ ان کا یہ شعر قد عہد قوی پھر پور نہا کندی کرتا ہے۔

نہ جانے کون سا کھی وقت کام آجائے

سو ایک جب ملے ہمت ایک میں خدا رکھتا

باتر نقوی مہذب، شائستہ، منہار اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ وہ اپنے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ ایسے گوشے تلاش کرتے رہتے ہیں جو انسانی معاشرے میں روشنی اور آگہی کے فروغ کا سبب بنیں۔ ان کی شاعری اور تخلیق منہ و قیت تو ان کے لیے لازمہ حیات ہے ہی، لیکن ترجمے سے بھی انھیں خاص شغف ہے۔ ہمارے یہاں ترجمے کو نہ وہ اہمیت نہیں دی جاتی، حالانکہ بہا اوقات ترجمہ تخلیق سے زیادہ مشکل اور محنت طلب ہوتا ہے۔ دیوتی عام کی تاریخ میں تراجم کے بعض ایسے اوارگز سے ہیں جن کے بغیر ادب اور زبان، علم و فنون کی ترقی شاید اس معیار کی نہ ہوتی جو تراجم کے بعد ممکن ہوتی۔

ترجمے کی میت کے پیش نظر بعض بین الاقوامی ورے ترجمے پر کانٹریس اور سیمینار منعقد کرتے ہیں۔ ان میں پیشگو ہمیشہ پیش رہا ہے۔ چوں کہ اس وقت تذکرہ نوٹس انعام کا ہے اس لیے یہ مر باعث دل چسپی ہوگا کہ خود نوٹس انعام کا مذہن اپنے نوٹس سپریم فنڈ کے ذریعے تراجم کے باب میں سپریم منعقد کرتی اور اس کی روادی کا رداوی کی تفصیل کے ساتھ ان میں پیش کیے جانے والے مقالات بھی کتابی شکل میں شائع کرتی ہے۔ اس ضمن میں سیریٹس اکیڈمی پھر پور تعاون کرتی ہے۔ ان اجتماعات میں صراہ انسانی، خون لطیفہ اور مائش کے موضوعات بہ طور خاص زیر بحث آتے ہیں۔ ترجمے کی زبان، اصطلاحات، ور زبان، زمین کے تعلق پر عالمہ افکار و خیالات اجاگر کیے جاتے ہیں۔

باتر نقوی کا یہ سارا شغف Latour of Love کے سوا اور کچھ نہیں۔ انھوں نے کئی مہمی، سائنسی اور ادبی مشن کے کامیاب ترجمے کیے ہیں۔ ان کا کوئی منصوبہ سرش ٹوہیت کا نہیں ہوتا۔ انھوں نے یہ

نے کیا کہ وہب کا نہیں انعام پانے والوں کے نوٹس خطبات کا ترجمہ کیا جائے۔ یہ خیال بھلے خود
تہامت اہم لیکن جاں کاوتھا۔ مجھ سمیت کئی دوستوں نے باقر نقوی کے اس خیال کو نہ صرف مبرا بلکہ
مستعمل اصرار کرتے رہے کہ اس منصوبے کو عمل کر کے ہی دم نہیں۔

اس کار اذ تو آید و مرناں جنیں کند

کے صدیقی باقر نقوی نے گویا میر تقی میر کی زبان میں مسئلہ حل کریں:

سب پہ جس راہ بنے گویائی کی

اس کو یہ باتوں اٹھا لایا

باقر نقوی اپنے بچے میں باتوں کوئی دیتے ہیں گئے تین عزم و ماندہ اور ذہنی سرگرمیوں کے
انتہار سے وہ ہرگز باتوں نہیں۔ میں باقر نقوی کی اس کاوش کو مسیحا قلب سے کیوں سر ہوا ہوں؟ اس کا
بنیادی سبب یہ ہے کہ مجھے مظلوم ہے کہ یہ خطبات بہت غور و فکر کے بعد دنیا کے ہر سے زمینوں نے صفا
کیے ہیں۔ ان کا سوچ، ان کی فکر اور مضمونیات کو ادبی لوازم کے ساتھ دھ نیاں میں منتقل کر دینا آسان
کام نہیں۔ اس سے قبل اس نوعیت کے بعض تراجم میری نظر سے گزرے ہیں۔ مجھے افسوس ہوا کہ مترجمین
نے صحافیانہ انداز میں جیسے خوشی کا ترجمہ کرتے ہیں، ان کے ساتھ کمال انصاف نہیں کیا۔ باقر نقوی نے اردو
زبان کے کلچر کو متاثر ہوئے ان خطبات کی ادبی شان کو برقرار رکھا ہے۔ لیکن ان کا کا نام ہے۔

باقر نقوی نے ستر کے ساتھ ساتھ نوٹس خطبات میں شامل شاعری کے بھی مظلوم تراجم کیے ہیں
جو بلاشبہ قابل ستائش ہیں۔ میں نے اس رخ پر قلم دینے کے بعد بالآخر صاحب سے گزارش کی ہے کہ
عالمی سطح کے شعر کا ایک انتخاب اپنے مظلوم تراجم کے ساتھ شائع کریں گویا
پھر ”انجمن“ سے حل کیا ایک نیا بچھا ہوا

نوٹس ادبی خطبات کا ایک اور زویہ اس طرح بھی جائز ہوتا ہے کہ تمام پانے والے ادیب اور
شاعر کسی ایک زبان یا ایک ملک اور ثقافت سے تعلق نہیں رکھتے۔ ان میں اگر ایک طرف ماقول فرانس اور
جارت متحدہ شامل ہیں تو دوسری طرف راہنما تھ نیور اور نوٹی مورسن ہیں۔ گویا ہر گلوب اپنے اپنے لائن اور
کی کوئی کے لیے موجود ہے۔ جیسنی کے کھڑا اس نے ناستان کوئی اور قطعہ نگاری کو تاریخ کے تناظر میں
دیکھا اور پیش کیا ہے۔ داریو کا خطبہ کیسے دنیائی انداز میں شروع ہوتا ہے۔

گرچہ میرے ماتھ میں کوئی جام نہیں پھر بھی میں غام مرتبت ملکہ کر سکتا ہوں

میں، جو ماضی میں آپ کی ملکہ تھیں، جام نوش کرنا چاہتا ہوں۔

بوسن چپھل، نامس مان، بشری برہمن، بی اسٹا، بیٹ، ڈیوک واکاٹ، رلیاڈ کینگ کے

خطبات چنانکہ ایک جہان گہری اور اپنی رُخ رکھتے ہیں۔ انہیں گہر نے اپنے ہم وطن شاعر کے چند مصرعے اپنے قلم سے دریغ کیے تھے ان کا خوب صورت ترجمہ باقر نقوی نے یوں کیا ہے

ہم وہ بے متوے
زندگی کی دلدلی سے سرنگاں کر گویا
سائے کے چروں کو دنگی ٹکا ہوں کو
مٹنے مٹنے پڑھتے ہیں، جھانک جھانک پڑھتے ہیں
اور یہ ہر ہم نے

دوسری کہہ لی زندگی سے سیکھا ہے
سلوا تو رہے کا زمیرو نے اپنے قلم سے بعض نہایت بلند کلمات چھپے کیے ہیں جن پر غور و فکر اور
مکالمے کی گنجائش ہے۔ وہ کہتے ہیں

کفایت کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ پہلے نہ تھا، ایک انسان دوسرے
انسان کے لیے اس کا اضافہ کرتا ہے۔

یوں نے ”بدی کے بھول“ کو علامت بنایا۔ وان گو نے مہواری میں تصور حسن کو جہر مل کر کے
رکھ دیا۔ کا زمیرو بھی شاعری کے باب میں ایک اٹوٹا نقطہ نظر رکھتے ہیں۔

میرے نزدیک حسن صرف منہ بخت یا سم آجلی میں ہی نہیں بلکہ مہواری اور
بے دھتکے پن میں بھی ہوتا ہے اس لیے کہ کبھی کبھی مہواری بھی درست شعری
تجربہ کا روپ نہ رہتی ہے۔

تمام نوبل خطبات یہ اور اسی طرح کے متعدد دیگر شعرائے معہور ہیں۔ ان کے مطالعے سے
ہماری نئی مثال خصوصیت کے ساتھ قدر و نظر کے نئے زاویے تلاش کر سکتی ہے۔ یہ چاہا اس قدر روشن ہیں
کہ ان سے متعدد ذہنوں میں اچالے کی جنم دہی استوار کی جا سکتی ہیں۔

نوبل انبیات کی تربیت سے ایک اور پہلو پر بھی مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ اور وہ ہے نوبل ادیبوں
کے کوئی قرائمی۔ باقر نقوی نے جس کتاب یا کتابوں سے یہ خطبات منتخب کیے ہیں ان میں یہ
کوائف شامل نہیں تھے۔ یہ ایک عمل دسریج کا کام تھا جو باقر نقوی نے بڑی محنت و توجہ و دیر و دیر
سے پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ یہ کیا معلومات کو دینا، دینا دینا کے ایک عمل دینے کا مرحلہ تھا جس سے باقر نقوی
بہ حسن و خوبی نرے ہیں۔

باقر نقوی کی شخصیت کا ایک رُخ ان کی فنی و ادبی زندگی ہے۔ عزیز حامد مدنی کے بعد یہ دوسری

مثال میرے زمانے ہے جنہوں نے متعلقہ ادارے سے اجازت حاصل کر کے نثر، تاریخی اشاعت، مکتبہ بنائی۔ اس ضمن میں باقر صاحب کو بھی مدنی صاحب کی طرح بے شمار مسائل و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن ایک محنت مند ذہانت کو پانے کو خاطر و داس منزل سے بھی مسامحت ہوئی کہ ساتھ آگے بڑھ سکے۔ اب نوبل انبیاء کا آپ مطالعہ کیجئے اور دیکھیں کہ، ملکہ ادب کے سرکاری میں پانہ قوی نے ایسا انجام معیاری اور دل کش اضافہ کیا ہے۔

پروفیسر سحر انصاری

کچھ ضروری باتیں

خداوند کریم و متعالی کا شکر کتنی دیر سے چاری رہے والا کام انجام کو پہنچا۔ جب میں نے کتاب کی آخری ترتیب شروع کی تو خیال ہو کہ ویل ویب سائٹ سے مصنفین کے حقوق (Copyright) کے بارے میں مکمل معلومات ضروری ہیں۔ اسی لیے وہ بھی کر ترتیب کے آخری محاذات میں۔ جب میں لندن میں تھا، کسی ادیب یا ماثر کے خلاف بلا اجازت اشاعت پر یورپ کے کسی ملک میں مقدمہ چلا تھا اور عدالت نے اس پر جیتیں یورپ کا حقدار نہ کیا تھا۔

نوٹس فاؤنڈیشن کی ویب سائٹ کا محور سے مطالعہ کیا تو ہنا چلا کر Nobel Lectures پر غصہ دینے والے ادیبوں اور نوٹس فاؤنڈیشن کی جانب سے سخت تنبیہ کی گئی تھی کہ ان کی اجازت کے بغیر اشاعت پر سخت ناجائز کام لائی گئی جائے گی۔ اس کو پڑھ کر تو پاؤں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ نہ ان سے بے ملاحظہ نکلا، ”یا اللہ، کیا میری برسوں کی دیر در پڑی اور شب خیزی بے کار گئی۔“ ابھی میں پریشانی کے مراقبے ہی میں تھا کہ میرے ارد گرد پر دستک ہوئی۔ دیر از دیکھا تو دیکھا کہ ایک بزرگ ٹرک و دستار میں ملیں، گھرے ہیں، اور دس لاکھ چاہتے ہیں۔ میں نے اڑتے مہرں نوازی اندر بلایا اور دیر و دستار دریافت کی۔ بزرگ بولے، ”تو ہے آپ مشکل میں ہیں؟“ میں نے عرض کی، ”جی ہاں۔“

پوچھا، ”آپ تو ایک زمانے سے ہمیں وادی نہیں کرتے، مگر میں نے یہ حیاتیاتی خیال بھی نہیں کیا اور وہی بجائے ہی چلا گیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ پریشان ہیں، اور جو معاملہ پریشانی کا ہے میں اس سے بھی وقف ہوں۔ رے میں، کس پتھر میں پڑ گئے ہیں آپ بھی۔ آپ کے ترک ٹھکانے میں تو لوگ چوری کے مضامین کی بنیاد پر ڈاکٹریٹ حاصل کر کے جامعات میں اعلیٰ عہدوں تک پر فائز ہو

جاتے ہیں اور آپ بھی ترجمے پر، اور وہ بھی مصنف کے نام کے لافٹے کے باوجود پریشان ہو رہے ہیں۔ "میں نے ان سے ادب سے عرض کی کہ، "جنابِ والد، آپ کا کہنا سچا، مگر میرے سامنے وہ مشکلات ہیں۔ پہلی مشکل تو یہ ہے کہ میں آپ کے حلقہٴ رشتہ میں نہیں، کہ میں شریکین کے ملک میں قیام اور ان کی قومیت حاصل کرنے کے بعد سے ملے سربے سے مسماں ہو چکا ہوں اور باقیوں میں چھوٹے شہر لٹے کا نتیجہ سرچکا ہوں۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ لندن میں میرا گھر ہے اور میں اس کے غلام ہو جائے تو تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ نے غلط زمانہ پر دستِ دہی ہے۔ آپ اس جیسے میں کسی اسلامی ملک میں تشریف لے جائیے۔ اگرچہ بیشتر میں روزِ شب عفو و بقاء من العیطان الرحیم کا ورد کیا جاتا ہے مگر سچ جائے بہت سے لوگ اس کا مطلب جاننا ہی نہیں جانتے ہیں۔ طرفہٴ ثانیاً تو یہ ہے کہ جب آپ ان پر فضا فرماتے ہیں تو وہ اس کو بھی حد، میں فضا دینی کہہ کر سب کچھ اللہ کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ لہذا حضرت، آپ مجھ پر کرم کیجیے اور میری جان چھوڑ دیجئے۔" اس طرح ان سے گفتگو میں جاسکتی تھی۔

ان سے فراغت کے بعد میں نے نوٹس فائڈیشن سے رابطے کے لیے ایک ترقیاتی مامور مانا لیا۔ کئی دنوں کے انتظار کے بعد جواب موصول ہوا۔ انھوں نے مطلع کیا کہ نوٹس فائڈیشن نے اپنے کے تماموں کی تصاویر کی اشاعت کی سخت ممانعت ہے، کبھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ خطبات کے لیے انھوں نے نوٹس فائڈیشن ہی کی ایک اور خاتون Alegria Greveaus کا پتا دیا اور ان سے خطبات کے بارے میں رجوع کرنے کے لیے کہا کہ یہ ان کے دائرہ اختیار میں آتا ہے۔

میں نے ان کو خط لکھا اور ایک ادب سے نیا دہانہ لال کے پوسٹلے اور کچھ دینی نیاں کی کس مہری اور افادے کے ذکر کے ساتھ ملتجیانہ انداز میں لکھا کہ اس نیاں میں تو کس نوٹس فائڈیشن پانچ سو کتابیں بھی موصول نہیں کیں۔ لہذا یہ کتاب مترجم کے لیے مالی فائدہ تو کیا تھیں ہی کا موجب ہوں۔ پھر نوٹس فائڈیشن پر خط لکھ کر خط بھیج دیا اور "انتظارِ مسافر کھینچ" کے مصداقی و مراد سے بیٹھ رہا۔ کئی دنوں تک جواب نہیں آیا۔ پھر کئی فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ تھیں ہی پر ہیں۔ چند دنوں کے بعد اس کا ترقیاتی محبت نامہ موصول ہوا۔ انھوں نے کچھ تصدیقات مانگیں جو فوراً دیا نہ کر دی گئیں۔ پھر کئی دنوں بھر کتے دل سے انتظار کیا، فون کیے اور دلائلِ قرآن کا جواب دیا جس میں انھوں نے مشروط اجازت دی اور فرمایا تھا کہ نوٹس فائڈیشن کے ٹکاؤ اور پوری ایک صدی پر مشتمل نوٹس انومات پر اتنی محنت کے پیشِ نظر ہم پرے "بڑی" کے بجائے سٹائی کے طور پر ایک معمولی سی رقم کے عوض اجازت دینے کے لیے تیار ہیں۔ اور پھر انھوں ایک License Agreement کا سودہ بھیجا، اور مجھے پریکٹس کی سولی سے مار دیا۔ Alegria کے برقیاتی خط کی نقل الیہ اصحاب کی اطلاع کے لیے اس کتاب میں شائع کی جا رہی ہے۔

یہ کتاب کس طرح، جو میں آئی، اس کا ذکر آگے آئے گا مگر میرا خیال ہے کہ پہلے اس کتاب کے متن کے ترجمے اور ٹائپ کے لحاظ کار سے قاری کو مطلع کرنا ضروری ہے۔

یہ سب دراصل بیسویں صدی میں دب کا نوٹیل انوم پانے والوں پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلا انوم 1901 میں دیا گیا تھا۔ اہام پانے والی ہر شخصیت کا ایک دب ہے جس میں سب سے پہلے اس کی زندگی، تعلیمی اور ادبی کوائف کی تاریخ کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا بہت بڑا تعارف ہو جائے۔ اس کوشش میں ان تقریروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو نوٹیل کاؤں کی طرف سے انوم کے سب سے پہلے کی گئی تھیں۔ فقط ان پر ہی اتنا اس لیے نہیں کی گئی کہ میری نظر میں شخصیات کے کچھ دلچسپ پہلو بھی نقشہ نہ بن جائیں گے۔ اس لیے نوٹیل کاؤں کی ویب سائٹ ہی میں موجود Pegasus Authors Calendar میں کیے گئے شعبی تبصروں اور تنقیدات سے بھی بہت سی تصویریں لی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں نے اپنی پسند کے مطابق تصویریں انتخاب کیں، ایک نقشہ شجرہ جمع سوانحی خاکہ ترتیب دے گا، اپنی استقامت کے مطابق، اس کا اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اس طرح یہ حصہ نقشہ سیدھا سادہ ترجمہ ہی نہیں بلکہ تالیف کے زمرے میں آئے گا۔ دوسرے حصے میں شخصیات کی تقریریں اور خطبات کے ترجمے کیے گئے ہیں اور ان دنوں اشتہار ترجمہ ہی سمجھا جاتا ہے۔

سب جانتے ہیں ترجمہ آسان کام نہیں اور جب پوری ایک صدی کے دیباچے کے مختلف انوم اعلیٰ ترین ادیبوں کی تخلیقات کا جامع موقوف کام، اب بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ میں نے یہ کام کس طرح مکمل کیا ہو گا اس کا اندازہ تو آپ کہیں گے مطالعے سے خود ہو جائے گا۔ مگر اس مقام پر یہ کہنا حق از حد نہیں ہو گا کہ مذکورہ تقریریں اور خطبے ترجمے کے ترجمے ہیں، کہ ایک زبان سے دوسری زبان، دوسری زبان سے تیسری زبان تک پہنچنے پہنچنے تخلیق کا حسن اصل حالت میں باقی رہ سکتا ہے۔

مجھ جیسا کم علم، ترجمے کے لیے میں ترجمہ کے معیار پر مائے زنی کی حد ات بھی نہیں کر سکتا۔ مگر میں اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ متون میں سے کچھ متن ایسے ضرور تھے جن کا ترجمہ محال محصل ہو تھا، اس لیے کہ شاید مثال نگاروں نے جدید سائنسی فن کاری کے زیر اثر Linguistic Montage پر ایسے خطبے دیے تھے جو پکڑیں لیتی ہوئی ہر معصوم سمجھتے تھے اور مجھ جیسا بے بصارت، مدائی غر کا متوال، ان میں دیوانہ عرش میں جو جھٹتا ور غور رہتا رہا۔ میں نے بہر حال کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، جس تحذیب کی بھی نظر ہو، ترجمے کی دیانت پر حرف نہ آئے پائے۔ میں نے اس بات کا بھی خاص طور پر خیال رکھا ہے کہ اصل نثر کی ثقافت کو جہاں بھی ثقافت کی بدولت ری ہو، کم سے کم کوشش نہ کی جائے۔ یعنی جس دوسرے نثر ہو گی دوسرے کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی جائے۔

کچھ شخصیات نے نہ تقریر کی اور نہ خطبہ دیا۔ چند نے اپنی زبان میں تقریر کی مگر ان کے انگریزی ترجمے نہیں مل سکے۔ بعض خطبوں میں ایسی مشکلیں بھی آئیں کہ طوالت اور کرداروں کی بہتات کے باعث متن میں شامل نام، ایہ، او، اس کی طرف اشارہ کرتے تھے، اسانی سے معلوم نہیں ہوتا تھا۔ لہذا میں نے (اپنی مجھ کے مطابق صحیح سمت میں اشاروں کی خاطر) کئی کئی متن کو چھوٹے کے لیے آسان

بنانے کو نہ طر تو میں میں کچھ انداز شامل کرنے کی جدت بھی کی ہے۔ اس اصرار پر کہ ان کی دوسری مطالب کی تنبیہ کے لیے ذہن پر زیادہ زور نہ دینا پڑے۔ حتیٰ میں کہیں کہیں ان نظموں کے کلام بھی آئے ہیں۔ جب تو نہیں سمجھ میں نے صرف ان نظموں کا ہر وزن ترجمہ کرنے کی جدت بھی کی ہے جو میرے دل کو لگیں۔

چونکہ اس کتاب کی تکمیل میں طویل عرصہ لگا، اس لیے ان ہی وقتوں کی زندگی اور موت کے بارے میں تفصیلات ماحصل اور پرائی ہو سکتی ہیں۔ اب اگر میں ان کو بھیج کرنے کی کوشش بھی کروں تو کتاب کی اشاعت تک تاوانت زرجائے گا کہ یہ تفصیلات پھر ماحصل ہو جائیں گی اس لیے درزور میں ممنون ہوں گا۔

پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے دوران اکائی نے نومات کا سلسلہ معطل کر دیا تھا، شاید اس لیے کہ یہ حالات میں یہ معلومات کتب کی جاسکتی تھیں اور یہ ادبی تقریبات کا انعقاد ہوسکتا تھا۔ اس لیے کچھ برس اندامت سے خالی رہے اور تسلسل میں بظاہر نہیں آئے گا، لیکن یہ خود مجھے سمجھتا ہوں تھا۔

اس کتاب کی بعد اس طرح ہوئی، یہ ایک طویل قاعدہ ہے۔ اس مقام پر اس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ جب میں 1999 میں انٹرنیٹ نوٹس کے بارے میں اپنی پہلی ٹری ٹیلیک پیس کر چکا تو لوگوں کا خیال تھا کہ اس ضمن میں مزید کام ہونا چاہیے۔ کچھ کا خیال تھا کہ تمام وہ میں انعام یافتگان کی مختلف سوانح پر کام ایک واقع کام ہوگا۔ مگر مسئلہ یہ تھا تقریباً پانچ سو افراد کی مختلف سوانح 2 زبان کام نہ تھا۔ پھر بھی میں نے اسی دم اپنے آپ سے خفیہ مدد کر لیا تھا کہ خدا نے توفیق دی تو کم از کم ادب کے انعام یافتگان پر میں ضرور مزید کام کروں گا۔

پھر یوں ہو کر میں دوسرے کاموں میں جا پہنچا اور کئی برس تک جینیات، برقیات، مصنوعی ذہانت کے جیتاں کے سلسلے میں کتابوں کی تالیف میں سرگرم رہا۔ برقیات پر کام کے بعد میں نے ایک صدی کے ادب انعام یافتگان کی مختلف سوانح پر کام کیا اور اس کو مکمل بھی کر دیا تھا۔ یہ کام ختم کرنے کے بعد مسودہ اپنے دوست مبین مرزا (جو اس کتاب کے ناشر بھی ہیں) کے حوالے کرنے کے بعد میں مصنوعی ذہانت کی طرف راغب ہو گیا، جس میں کافی وقت لگا۔ اس دوران میرا دل چاہتا رہا تھا کہ کاش میں اپنی نوٹس انعام یافتگان کی مختلف سوانح کے ساتھ ساتھ ان کی تقریروں اور خطبوں کے ترجمے بھی کر پاتا جو انعام لے جانے کے موقع پر پیش کیے جاتے ہیں۔ جب اس خیال کا تذکرہ جناب مبین مرزا سے کیا تو یہ سن کر خوش ہوئے، اور بولے اگر یہ کام ہو جائے تو بڑا کام ہوگا۔ اس یوں اس کتاب کی اشاعت بڑک دی گئی۔

مصنوعی ذہانت پر کتاب ختم کرنے کے بعد میں نے اس کام کو پھر سے شروع کیا اور ابھی نصف صدی تک پہنچا تھا کہ مجھے اپنے عارضی ادارے ای-ٹایف۔یو کی چھ سو صفحات پر مشتمل تاریخ EPU Saga کا گم پڑنے سے مدد ملی ترجمہ کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس کی ذمہ داری کی وجہ سے

جو تھیں پیدا ہوئی کہ وجہ سے یہ خیال ہوا کہ کیوں نہ نصف صدی تک کے ادب کے انعام یافتگان پر شتم کا یہی وہ پہلی جلد کے طور پر پیش کر دی جائے اور بقیہ کام، نئی فیس داری کی تکمیل کے بعد، دوسری جلد میں شائع کیا جائے۔ مگر یہ آدھ کے سفر کے دوران میٹر شمس الرحمن قادری سے بہت ملنے لگے اس کا تذکرہ کیا تو ان کا مشورہ تھا کہ جلدوں میں اشاعت مناسب نہیں ہوگی۔ سب کام مکمل ہو تب ہی اشاعت بہتر ہوگی۔ بس، پھر جو کچھ ہو چکا تھا اس کی اشاعت بھی روک دی گئی اور یہ طے پڑا کہ جب EFU Saga کے ترجمے کا کام مکمل ہو جائے گا تو پہلی ایک صدی کے انعام یافتگان پر کام مکمل کرنے کے بعد ہی اشاعت ہوگی۔ سو اب 1901 سے 2000 تک کے ادب کے انعام یافتگان کی مختصر سوانح اور ان کی تقریروں اور خطبوں کے ترجمے آپ کے ہاتھوں میں ہیں۔ اس کام میں بہت وقت لگ گیا، جو لگتا بھی تھا، اس لیے کہ ملازمتی ضروریات کے باعث مجھے روزانہ ایک دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت میسر نہیں ہوتا تھا، وہ بھی تو اتار اور پارتھی سے نہیں۔

لہذا اس کتاب کی موجودہ صورت میں تکمیل میں، تھیں اور اردو ادب کی تہذیب کے باعث، مگر اس لگ گئے مگر ان دوران بہت سے دوستوں نے تقاضے کی صورت میں میری بہت اضافی چارگی رکھی۔ ہر فیسر عمر احمدی، جناب مبین مرزا، جناب مظہر جمیل، جناب افتخار عارف، جناب حسین بھڑو، جناب سلیم یزدانی، انھوں نے اور بے شمار دوستوں نے میری دل بڑھادی اور تحقیقی کتابوں کی خاطر میری ترجمے کی استعداد کی تعریف سے بہت بخیر حال۔ اس طرح یہ کام مکمل ہوا۔ میں ان سب تمام حضرات کا تہہ دل سے ممنون بھی اور شکر گزار بھی ہوں۔

باقر نقوی

لندن

14 اپریل 2009



گائو زینگیان

اعترافِ کمال۔ عقی مفاقی جوارا، تیکہ بھیرت اور سہائی ہر بندی کے لیے جس نے جینی نبون کے ماوس دروازے کوئی ماوس سے آتش کیا۔

نوتس نوم کے اعدان سے بہت پہلے گاؤ کے کئی ماول اندوات کے مستحق مردانے چاچکے تھے جن میں Soul Mourner شامل ہے جو کسی متفرد دینی تئیس سے جس کا کس بھی حجر سے موازہ نہیں ہو سکتا، جو آپ اپنی مشابہ ہے۔ یہ ماول جنوب مغربی چین کے دوران دو قصبوں کے دوران سفر کے ناثرات سے پُر ہے جہاں س دور میں بھی باقی ٹرس پرتی (Shamanism) سائبریا کا ایک مذہب جس کا عقیدہ ہے کہ انسان کے روڑا راجیں رہتی ہیں جو اس کا نقصان پہی نے پر قادر ہوتی ہیں۔ مترجم) کے عقائد پائے جاتے ہیں جہاں لٹیروں کے بارے میں گائی جانے والی داستانوں اور ہندو جگتھوں کو آج بھی حقیقت سمجھا جاتا ہے، جہاں رہنما قدیم کے فرسودہ عقائد سے آج بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔ یہ ماول پیسے سرغنہ مردوں کی جانچ گاری سے طرین ہے جو ایک دوسرے کی یک جیسی نا پسندی کی پتو کا مٹی کرتے نظر آتے ہیں۔ گاؤ اپنے کرداروں کے لیے نئے نئے اسمی فی اشاروں کے آزمائش استعمال سے قاری کے تصورات کو بچی کی جیسی سرعت سے اس چاچک دتی سے جھڑل کرتا ہے کہ اس کا کلامی حیران ہو کر ہر پیش منہ کو بھگتی کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ دراصل یہ طریقہ کار ڈرامے سے نیو گیا ہے جہاں اداکار کو اکثر پیسے کرنا راہتیار کرنے

پڑتے ہیں جن کی امانتگی کے ساتھ ساتھ ان کا اظہار بھی کرنا ضروری ہوتا ہے، جن میں اس گواہ کی وقت
میں۔ تم۔ اور۔ وہ۔ سب کچھ بنا پڑا ہے۔

گاؤ شینگیان شان چین کے شہر Ganzhou میں 4 جنوری 1940 کو پیدا ہوئے تھے مگر سیاسی و ہونو کی بنا
پر اب وہ ترکیب وطن کے ذریعے فرانس کی شہریت اختیار کر چکا ہے اور وہیں مقیم ہے۔ نثر نگار، مترجم، ڈراما
نویس، ہمدست کا رہتلیہ نگار اور لاداکار گاؤ چین پر چارپائی قلم کے دوران پورا ان چاروں کا اہم کام ایک کا
فرق تھا جب کہ ہاں شوقیہ لاداکاری کرتی تھی۔ گویا لاداکاری کا ڈاکا، ادبی مشق تھا۔

گاؤ کی بنیادی تعلیم حوالی جمہوریہ چین میں ہوئی اس نے فرانسیسی زبان بھی چین کے دارالحکومت
بیجنگ میں ہی سیکھی تھی۔ چین کے محترقی اتحاد 1966-76 کے دوران زبان کی تعلیم کے لیے گاؤ کو زیرِ قی
یک تر چھٹھپ میں داخل کیا گیا جہاں اس نے اپنی تحریروں سے نمبرے عندیائی کو لڑا پیش کرنا ضروری بنا۔
اس کی مجبوریوں کی وجہ سے 1979 تک اس کی کوئی تحریر شائع ہو سکی نہ ہی وہ ملک سے باہر چکا۔

1980-87 کے دوران گاؤ کے مختصر قصائے اور مضامین چین کے ادبی جریدوں میں شائع ہوئے۔ اسی
زمانے میں اس کی کتابیں (1981) A Preliminary Discussion of the Art of Modern Fiction،
(1985) In Search of a Modern Form of Dramatic Representation اور (1987) A Pigeon Called Red Beak
و دیگر نکت (Brecht) اور صیقت (Beckett) سے متاثر دھاتی دیتا ہے بیجنگ کے ٹیٹروں میں کیے گئے۔ گاؤ
کے ایک تھیل (Signal Alarm) 1982 نے چین میں غوغائی کا میانی حاصل کی جب کہ ایک ڈراما Blue
(1983) Stop جس کے ذریعے اس نے شہرت پائی چین کی حکمران پارٹی کے نزدیک اخلاقی غارتگری قرار
پڑا۔ اس کے ایک اور ڈراما (Wild Man 1985) پر بھی ملک کے اندر متاثر ہوئے اور وہ چین
لاٹوای سطح پر توجہ کا مرکز بنا۔ 1986 میں گاؤ کا ایک اور ڈراما The Other Shore چین میں تنازع کی وجہ
بنا اور ڈراما کی اشاعت اور اس کے کیے جانے پر پابندی لگا دی گئی۔

1987 میں گاؤ نے چین کو خیرباد کہہ دیا۔ ایک سال بعد ورس میں سیاسی پناہ گزینی کی حیثیت سے
قامت پزیر ہو گیا۔ 1989 میں Square of Heavenly Peace کے قتل عام سے بدلہ ہو کر اس نے
کمپنٹ پورٹی سے علاحدگی اختیار کر لی۔

گاؤ نے بہت سے ڈرامے کیے جن کے مختلف غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہوئے اور دنیا کے مختلف
حصوں میں کیے گئے۔ گاؤ دھاتی کے ذریعے مصوری بھی کرتا ہے۔ اس کی کئی بین الاقوامی نمائشیں بھی
ہو چکی ہیں۔ وہ اپنی کتابوں کے مربوط خود ہی بنا رہا ہے۔

خطبہ

ادب کا مقدمہ

میرے پاس یہ جاننے کا کافی طریقہ نہیں کہ میں یہ معلوم کر سکوں کہ کیا تقدیر نے مجھے اس شخص پر دیکھیں دیا ہے، مگر جس طرح بہت سے خوش قسمت انکافات نے یہ موقع فراہم کر دیا ہے، اس کو میں تقدیر ہی کہوں گا۔ خدا کے موجود یا موجود ہونے کے مسئلے کو ایک طرف رکھتے ہوئے، میں کہنا چاہوں گا کہ باوجود بے دین ہونے کے میں نے ہمیشہ ایک ناقابل تلافی وجود کا احترام کیا ہے۔

کئی فریخہ نہیں ہو سکتا، بدشہر خدا کی جہد نہیں لے سکتا کہ دنیا پر ایک سپر مین کی طرح حکومت کر سکتے، وہ صرف مزید افراتفری پھیلانے میں دروہی کو ایک اور بڑی گندھ بٹانے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ پچیس کے بعد کی صدی میں انسان کی لائق ہونی آفتیں انسانیت کی سیاہ تاریخ پر پنے نقوش چھوڑ گئی ہیں۔ ہر قسم کے سپر مین، جس کو عوام کے رہنما کہہ جاتا ہے، یعنی قوم کے سربراہ ہوں، ہر نسل کے کمال واروں نے مختلف طریقوں سے کیے جانے والے جرائم کی مزاحمت نہیں کی، جو کسی طرح بھی خود غرض فلسفی کی بے عقلی سے مشابہت نہیں رکھتے تھے۔ اس کے باوجود یہ امت اور تاریخ کے بارے میں نیا وہ تصور کہہ کے میں ادب کے صوبے میں اس مٹی کو خالص نہیں سمجھتا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس موٹے کو ایک ادب کی طرح ایک فرد کی توالی میں بات کرنے میں استعمال کریں۔

ادب ایک عام آدمی ہوتا ہے، شاید وہ کچھ زیادہ حساس ہوتا ہے، مگر وہ ٹوک جو حساس ہوتے ہیں اکثر کمزور ہوتے ہیں۔ ادب یہ عوام کے ترہان کی حیثیت میں ہوتا ہے اور نہ رامت باری کی تجسیم ہوتا ہے۔ اس کی آواز لادہ کی کمزور ہوتی ہے مگر یہ اس فرد کی اپنی آواز ہوتی ہے جو دنیا وہ تختیں شہر ہوتی ہے۔

اس مقام پر میں چاہتا ہوں کہ ادب صرف کسی ایک فرد کی آواز ہی نہ رہتا ہے اور ہمیشہ سے ایسا ہی رہا ہے۔ ادب کسی قوم کی حاجی کا گیت، کسی جدوجہد کا پرچم، کسی سیاسی جماعت کا بھونڈا کسکی دوسرے کے فراڈ یا کسی گروہ کی گورڈین جاتا ہے تو اس کو تبلیغ کے لیے ایک ٹھہرت طاقت اور اور چمکانے والے اوزار کی طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ ادب اس جوہر سے عاری ہو جاتا ہے جو ادب کا خاتمہ ہوتا ہے، ادب نہیں رہتا، اور طاقت و منفعت کا غم ابدی بن جاتا ہے۔

اس صدی میں جو بھی ختم ہوتی ہے ادب کو ہی بد قسمتی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کو سیاست نے، ماضی کے آثار کے مقابلے میں بہت گہرے زخم لگائے ہیں۔ اور لکھنے والے بھی بے مثال انتہا دکھانا نہ جانتے ہیں۔

تاہم ادب اپنے وجود کی وجوہات کی حفاظت کرے، اور سیاست کا گہرا کاوش نہ کرے، اس کو ایک فرد کی

اور ان حیثیت میں ٹوٹ جانا چاہیے اس لیے کراچی سے یہ انفرادی حرارت اور ن سے پیدا ہونے والے تنازع کے بدلے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ کامیابیت سے کوئی رشتہ نہیں ہونا چاہیے اور یہ بھی نہیں کہ کسی کو یہ کامیابی کا حصہ نہ دینا چاہیے۔ اپنی سیلابات یا ادیب کے سیاسی میلانات کے بارے میں ہم سے نوازاؤں پھیلنے کے لیے کجی صدق میں ادیب کو جہت لیا جیچا ہے۔ خیال پرستی نے ریاست اور عملیات کے مسئلے میں اٹھنے والے تنازعات کو قدر امت پسندی اور نقد ہیئت کی طرف موڑ کر ادیب کو اس مسئلے میں بھجایا ہے۔ رائے دہیت کیا ہے اور رجعت پسندی کیا ہے۔ اگر خیال پرستی طاقت کے ساتھ جوڑ کر لیتی ہے اور ایک حقیقی طاقت میں اس کی قسب ماریت ہو جاتی ہے تو تو دور وہ دنوں تہا ہو جائیں گے۔

میں صدق میں چینی ادیب کو یاد دلاتا رہا گیا ہے، اس کا گنا گھونکا گیا ہے اس لیے کہ یہ کامیابیت کو حکامات جاری کر رہی تھی۔ وہ میں ادیب اور انقلابی ادیب، دونوں ہی نے ادیب اور فرد کو موت کی سزا شاق تھی۔ انقلاب کے نام پر چینی روایات کو توجہ دے کر پہلے کے نتیجے میں جوئی کی طرح متنازع کیا گیا اور کتاب کی آتش روئی ہوئی۔ پچھلے سو برس میں بے شمار دیوبند کو کوئی سے زاملا گیا۔ قید کیا گیا، ملک بدر کیا گیا یا سخت مشق کی گئیں۔ ان کی جین کی خاموشی شاہین کی تاریخ کے مقابلے میں کہیں نہ وہ فتوتیں دی گئیں۔ جس کی بنا پر چینی زبان میں آکھ، اور آزادی، تخلیق و مباحث پر کڑے پہرے لگا دیے گئے تھے۔

اگر وہ لے لائیں وہاں۔ آزادی کی تمنا کی تو اس کے سامنے وہی راستے تھے خاموش ہو جائے یا فرار ہو جائے۔ مگر چوں کہ ادیب زبان پر نھار کرتا ہے، اس لیے زیادہ دیر تک نہ بولنا ایسا ہی ہے جیسے خود کشی کر رہی ہو۔ وہ ادیب جس نے خود کشی سے اعتنا نہیں کیا، یا اس کو خاموش کر دیا گیا اور اپنی مریضہ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تو اس کے پاس سوائے ترک وطن کے اور کوئی راستہ نہیں رہتا تھا۔ اگر ہم مشرق اور مغرب دونوں کے وہب پر نظر لائیں تو ہمیں آجواکس کی کیفیت بھائی دیتی ہے۔ Qu Yuan سے سوئسے مکس وائس مان، جوئس، جانتے اور بہت سے چینی دانش ور اس تک، جن کو 1989 میں Tiananmen کے میدان قتل عام کے بعد ترک وطن کرنا پڑا تھا۔ یہ ہے شہر کا وہ مائزہ مشہور جو اپنی کوئی حماقت کرنا چاہتا ہے۔

اس دور میں جب ماؤزے عہد کے نئے نئے آمریت نافذ کر رہی تھی، قرار کا اختیار نہیں تھا۔ دور ہمارا پہلوں میں قائم تھا۔ ہوں کہ جوہان علم کا اور جاگیر کا زمانہ دور میں دیوں اور دانش وروں کو پناہ دینا کہتی تھیں، مگر دیکھو یہ تھا، اور خفیہ طور پر لکھنا بھی اپنی جان کی بازی لگانا تھا۔ اپنی دانش ورانہ خود اختیاری کو قائم رکھنے کے لیے ایک کو دوسرے سے زبانی رابطہ کرنا پڑتا تھا، اور وہ بھی نہایت مازظاری میں۔ اس شکل پر میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ صرف اسی دور میں جب وہب کے لیے یہ قطعی مائیں تھیں، میں اس نتیجے پر پہنچتا تھا کہ یہ کتنا ضروری تھا کہ ادیب ایک فرد کو انسانی شعور کے تحفظ کی اجازت دیتا ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ خود کشی ادیب کا تختہ بتا ہوتی ہے اور زبان کے استعمال کے ذریعے زمیں ہلانی ہوتی ہے۔ ایک فرد اپنے احساسات اور خیالات کو زبان میں اظہار دیتا ہے۔ جس کو ضبط تحریر میں لایا

جائے تو وہ بن چکا ہے۔ اس وقت اس کے استعمال کا خیال نہیں ہوتا، کہ کسی حد تک یہ شائع بھی ہو سکتا ہے، اس کے باوجود گھنٹا ضروری ہوتا ہے اس لیے کہ لکھنے کی مسرتوں سے سکون بھی اور انداز بھی ملتا ہے۔ میں نے اپنا نام Soul Mountain چنے اندرون کی تنہائی کو دور کرنے کے لیے لکھنا شروع کیا تھا، اس وقت جب میری سخت غموں اور تنہائی کے ساتھ لکھنے ہوئے کو بھی منوں تو روئے دیا تھا۔ Soul Mountain کو میں نے خود اپنے لیے لکھا تھا، اس امید کے بغیر کہ یہ شائع ہوگا۔

لکھنے کے اپنے تجربے سے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ انسان کی اپنی شخصیت اور انداز تصدیق کرتا ہے، اور اس کا جواز دہرانے پر غور پیدا ہوتا ہے۔ ادب دنیا کی ظہور پر انسان کی تکمیل ذات کی ضرورت سے وجود میں آتا ہے۔ آج کل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے، یہ تخلیق کی تکمیل کے بعد واضح ہوتا ہے، اور بلاشبہ، وہ تو لکھنے والے کی خوش بختی سے متعین نہیں ہوتا۔

ادب کی تاریخ میں ایسی بہت سی سخت محنت سے تو ہونی تحقیقات ملتی ہیں جو ادیبوں کی اپنی زندگی میں شائع نہیں ہوئیں۔ اگر تجربے کے دوران ادیبوں کی اپنی شہرت ملتی نہیں ہو رہی تھی تو وہ کھانا کس طرح چاہی رکھ سکتے تھے؟ تشہیر کی طرف، اب تک ان چار شخصوں کو ان کی زندگیوں کے بارے میں تفسیر نہیں مل سکی ہیں جنہوں نے چین کے سب سے پرے اول Journey to the West, Water Margin, Jin Ping Mei اور Dream of Red Mansions تخلیق کیے تھے۔ جو چھوٹے تھے وہ Shu Natan کے خود نوشت سوانحی مضمون سے حاصل ہوا ہے اور اگر اس نے، جیسا کہ اس نے کہا ہے، اپنے آپ کو تجربے کے ذریعے سمجھنا نہ سیکھا ہوتا تو کیوں وہ اپنی باقی ماندہ زندگی کو اس کام کے لیے وقف کر دیتا، جس کا کوئی نتیجہ اس کو اپنی زندگی کے دوران نہیں ملتا؟ اور کیا کافکا کے ساتھ بھی یہی کچھ نہیں ہو تھا جس نے جدید فکشن کے لیے راہ ہموار کی تھی، اور Fernando Pessoa کے ساتھ بھی، جو بیسویں صدی کا سب سے فاضل شاعر تھا؟ لبنان کی طرف ان کی رجعت دنیا کی درستی کے لیے نہیں تھی اور وہ خود بخود دنیا کی مجبوری سے واقف تھے وہ پھر بھی پڑھتے رہے، کہ زبان کا چاروں ہی ایسا ہوتا ہے۔

لبنان کی انسانی تہذیب کی انتہائی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ عجیب ہے۔ کلئے والی ہے اور مشکل سے سمجھ میں آنے والی ہے، اور اس کے باوجود مراعات کرتے والی ہے، انسان کے احساس میں علول کر جاتی ہے اور دنیا کے بارے میں ان کی اپنی سمجھ بڑھنے کے مطابق، آدمیوں کو آپس میں دلتی ہے، لکھا ہوا لفظ بھی چاروں ہی ہوتا ہے، کہ یہ غلام افراد کے درمیان ترسیلِ طبع کی اجازت دیتا ہے، باوجود اس کے کہ وہ مختلف، دور اور نسلیں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اس طرح بھی ہے کہ ادب کے لکھنے اور پڑھنے کے دوران کا مشترک وقت اس کی ادبی روحانی قدر سے مستحکم ہوتا ہے۔

میرے خیال میں، اپنے زمانہ حال کے ادیب کو کسی قومی تہذیب پر زور دینے کے گوشل ایک نوع کا معجز ہوتی ہے۔ باوجود اس کے کہ میں کہاں پیدا ہوا تھا اور میں کون سی زبان استعمال کرتا ہوں، مچھن کی تہذیب

روایات نظری غور پر مجھ میں جائز ہیں ذاتی ہیں۔ تہذیب اور مذہب ہمیشہ ایک دوسرے سے رشتے میں بندھے ہوتے ہیں اور اسی طرح نمایاں خصوصیات، عناصر پر سیدار احاسرات، خیالات اور نقطہ وجود میں آتے ہیں۔ ہر کیف، ایک ادیب کی تخلیقی صلاحیت بلا کم و کاست اس نکتے سے شروع ہوتی ہے کہ اس کی زبان میں کیا جوڑ بند ہو، ہے اور معلوم کیا جاتا ہے کہ کیا جوڑ بند نہیں کیا گیا ہے۔ سہلی فن کے ایک تخلیق کار کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے ادیبانہ خصوصیات قومی، قبائلی، چٹان کے لیے، جس کو اس کی سے پہچان جائے۔

ادب قومی سرحدوں سے بند ہوتا ہے۔ تراجم کے ذریعے یہ زبانوں سے بھی بند ہو جاتا ہے اور پھر جغرافیائی کٹ و قوع اور تاریخ سے مخصوص سماجی روایات اور بین الاقوامی رشتے وجود میں آتے ہیں تاکہ انسانی فطرت کے بارے میں عمیق، کثرت ہو سکیں۔ مزید یہ کہ آج کا ادیب، اپنے عقد تہذیب سے باہر کے کثیر اثرات و موصول کرتا ہے، بلکہ یہ کہ وہ سیاحت کے فروغ کے لیے نکلیے جا رہے ہوں، لہذا کسی قوم پر نسل کے تہذیبی نقوش پر زور دینا، لادینی مشتبہ ہو جاتا ہے۔

ادب نظریات، قومی سرحدوں اور نسبی شعور سے اسی طرح بند ہو جاتا ہے جیسے فرد کا وجود بنیادی طور پر نظریہ پسندی سے بند ہوتا ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ انسان کی وجودی کیفیت اس بھی قسم کے نظریات اور غور و فکر سے ارتفع ہوتی ہے۔ ادب ایک آفاقی مشاہدہ ہوتا ہے اس تہذیب پر جواب دہ، جو اور کچھ بھی ممنوع نہیں کے درمیان ہوتا ہے۔ ادب پر پابندیاں ہمیشہ باہر سے عائد ہوتی ہیں، یہ صحت، سماج، غلو قیوت اور مذہبیات اپنے مختلف ابعادوں کی ترغیب و آرائش کے لیے ادب کی کات چھانٹ کرتے رہتے ہیں۔

پھر بھی، ادب نہ تو اقتدار کے لیے اور نہ کسی سماجی فیشن کے لیے متغیر ہوتا ہے، فصلیات کے لیے اس کا اپنا جانچ کا معیار ہوتا ہے یعنی اس کا جمالیاتی معیار انسانی جذبات سے متعلق ادبی تحقیقات کے لیے تعالیم کی ایک ماثریہ معیار ہوتی ہے۔ ہاں، ایسے فیصلے مختلف فرد کے لیے مختلف ہوتے ہیں اس لیے کہ افراد کے جذبات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ پھر بھی، یہ اندرونی جمالیاتی فیصلے آفاقی سطح پر تسلیم شدہ معیار پر کیے جاتے ہیں۔ ادب کی پروردہ تنقیدی و صیقلی صلاحیت قارئین کو بھی تجربہ کرنے کی اجازت دیتی ہے شاعرانہ احساس اور حسن نگارش اور نامحلول کا، آرزو اور لذت کا، مزاج اور عطر کا، جن کو مصنف اپنی تحقیقات میں شامل کرتا ہے۔

شاعرانہ احساس، انکسار جذبات کی سے حاصل نہیں ہوتا، اس کے وجود تحریر کے ابتدائی مراحل میں ہے کام خود بینی، ایک نوٹ کے غر، معتدل بچکانہ پن سے بچنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کجی و جذبات کے بہت سے درجات ہوتے ہیں اور ہند درجات تک پہنچنے کے لیے بہت مروت عداوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعری فاحش سے محو رہ کر دیکھنے کے عمل میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ مزید برآں، اگر یہ گھومنے کا عمل مصنف کی شخصیت کی پڑتاں بھی کرتا ہے اور کتاب اور مصنف دونوں کو مادی یا تخلیقی بھی قرار دے کرنا ہے، مصنف کی تیسری آنکھ کے لیے جو جتنی الامکان غیر جانب دار ہوتی ہے، کہ وہ یہاں اور انسانی

دنیا کی بے قیمت اشیاء، سب ہی چانچ کے لقمے ہوتے ہیں، تب جیسے حساب درہم نیرت اور مہمات چاہتے ہیں۔ اسی طرح احساں کی نصرت اور زندگی سے محبت بھی آنکھیں کھولتی ہے۔

ادب اور فن میں دنیوی تہذیب کے فیشن کے باوجود وہ بنائیاں جس کی بنیاد انسان کے جذبات پر ہوتی ہے کبھی انکار و نفرت نہیں ہوتی۔ لیکن وہ ادبی لہر یا فیشن جو فیشن کی طرف دیرینہ ہوتی ہے اسی پر تکیہ ہوتی ہے کہ تازہ ترین کیا ہے۔ لیکن، جو کچھ بھی نیا ہے وہ اچھا ہے۔ یہ عام بات ہے کہ ادبی فیشن کا ایک انداز کا رہے، کتب کا بازار اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، مگر اگر ادیب کا خیال یا فیشن ہمارے انکار چاہا تو کچھ حاکم جبروتی کرتا ہے تو یہ ادب کے لیے غور و خوض کے مترادف ہوگا۔ بالخصوص، موجودہ ادبی ماحول میں، میر خیال ہے کہ ہم کو ٹھنڈے ادب (cold literature) کی طرف رخ کرنا چاہیے۔

دب میں پہلے، Soul Mournan کی نگیناں کے بعد، جس کو میں نے سات برس میں مکمل کیا تھا میں نے ایک نئے مضمون لکھا تھا جس میں اس قسم کے ادب کی تجویز پیش کی گئی تھی۔
 ”ادب کو پست سے غرض نہیں ہوتی کہ یہ کیا مانتا ہے ایک فرد کا اپنا مسئلہ ہوتا ہے۔ دب مشاعرے کے ساتھ ساتھ فیشن کی تسکین، ہونے والے تجربات پر نظر ثانی، واقعات کی یاد دہانی اور احساسات اور کس دماغی کیفیت کی تشریح ہوتا ہے۔“

”ایک ماحول اور ادب، پورے اور ٹکٹے دارے سے نیا نہیں ہوتا۔ اس کو بنا جانے، یا پڑھا جانے یہ دونوں پر منحصر ہوتا ہے۔ ادب کوئی چیز نہیں ہوتا جو لوگوں کے حکم پر عمل کرتا ہے نہ ہی وہ ایک بہت سی طرح سے پوچھ جانے کے قابل ہوتا ہے اور بالخصوص وہ بھروسہ بنا اور نہ ملامت کا دشمن۔ کثیر اوقات تحریروں کے ساتھ اس کو قریابی کا کہا جاتا ہے فقط دوسروں کی ضرورت کے لیے۔ جب صاحبان اقتدار کو کچھ دشمن پیدا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو کہ ملامت کی توجہ کو کٹیں اور منتقل کیا جائے تو ادب قریابی کے تجربے بنائے جاتے ہیں، اور سب سے خراب بات یہ ہوتی ہے کہ وہ ادیب جن کو دھوکا دیا جاتا ہے، یہ کچھ دیکھتے ہیں کہ قربان ہو جانا ایک بڑا عجز ہوتا ہے۔“

”بماثل مصنف اور قاری کے درمیان رشتہ ہوتا ہے روحانی ترسیل خیریت کا، جس کے لیے بالمشافہ اوقات کو کوئی ضرورت نہیں ہوتی، یہ ترسیل کس کیفیت کے ذریعے ہوتی ہے۔ دب ایک نوعیت کی مائیز انسان کی سرگرمی ہوتا ہے جس میں قاری اور مصنف دونوں اپنی مرضی سے مصروف ہوتے ہیں۔ لہذا، ادب کو محض احساس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔“

”اس قسم کے ادب کوئی، جس نے پناہ چاہی کرواد واپس حاصل کر لیا ہو، ادب کہا جاسکتا ہے۔ یہ اس لیے ہوتی رہتا ہے کہ وہ انسانی مادی خواہشات کے حصول سے پرے خاص روحانی سرگرمی کی بھی کوشاں ہوتی ہے۔ بلاشبہ، اس قسم کا ادب انسانی وجود میں نہیں آیا ہے۔ پھر بھی، جہاں تک کہ ماضی کا سوال ہے ادب کو ظاہر یہی قوتوں اور سماجی رجحانوں سے مقابلہ کرنا پڑتا رہا، آج اس کا اثر یہی قوتوں اور رجحانوں

سومانی سے معاملہ ہے۔ اس کی بنا کا ٹھکانہ آرمیٹ کرنے کی رہنمائی پر ہوگا۔
 ”اگر ایک ادیب خود کو کس قسم کی تحریروں کے لیے ہی وقف کر دے تو اس کو اپنا گزرا کرنے میں
 مشکل پیش آئے گی۔ لہذا اس قسم کا ادب تخلیق کرنے کو عموماً کسی ایک قسم کی خاص روحانی تسکین ہی سمجھا
 جائے گا۔ اگر ایسے ادیب کو شاعرت کی ورثہ میں خوش قسمتی نصیب ہو جائے تو یہ مصنف کی اور اس کے
 دوستوں کی کوششوں کے سبب ممکن ہو گا، جس کی ایک مثال Cao Xueqin کا ناول ہے۔ ان کی زندگی میں
 ان کی تخلیقات شائع نہیں ہو سکی تھیں، اسی لیے وہ بے وقوفی اور بے چارگی کے اور نہ مشہور و معروف ہو سکے۔ یہ
 مصنف سماج کے ماحولوں پر اور قلوب پر رہے، اور خود کو ایسی روحانی سرگرمیوں کے لیے وقف کرے
 رہے، اس وقت جن کے لیے کسی اجتماعی میدان تھی۔ انھوں نے سماجی مظلوموں کی خواہش نہیں کی، صرف تحریروں
 کے ذریعے حسرت حاصل کرتے رہے۔“

”مختصر ادیب وہ ادیب ہوتا ہے جو زندہ رہنے کی خاطر فرار نہیں کرتا ہے، یہ ادیب روحانی نجات کی
 تلاش میں سماج کے ہاتھوں اپنا گھر گھونٹنے جانے سے انکار کرتا ہے۔ اگر بے وقوفی اس قسم کے بغیر، فادیت
 پسند کو سبب مانیں دے سکتی تو یہ صرف مصنف ہی کی بد قسمتی نہیں، پوری نسل کے لیے المیہ ہوتا ہے۔“
 اپنی زندگی میں سونڈش اکادمی سے اس عظیم، عزیز کا حاصل کرنا میرے لیے خوش قسمتی ہے۔ اور
 اس میں پوری دنیا میں پچیسے پھرے دوستوں نے میری مدد کی ہے۔ کسی اندام کے تصور تک کے بغیر، اور
 مشکلوں کے باوجود انھوں نے میری تخلیقات کے ترجمے کیے، اشاعت کی، میری تحریروں کے کھیں بھی پیش
 کیے اور اس کی قدر افزائی کی۔ پھر حال میں ماما جی ان کا شکریہ ادا نہیں کروں گا اس لیے کرنا سوں کی
 فہرست بہت طویل ہے۔

مجھے فرانس کا بھی شہریہ دینا چاہیے کہ اس نے مجھے قبول کیا۔ فرانس میں جہاں ادب اور فن کا
 احترام کیا جاتا ہے، مجھے آزادی سے لکھنے کے حالات میسر ہوئے، اور مجھے پڑھنے والے اور سننے والے بھی
 نصیب ہوئے۔ خوش قسمتی سے میں تنہا نہیں ہوں، اگرچہ تنہا نہ رہا، میں نے جس کا دامن نہیں چھوڑا، ایک
 ”گوشہ نشین مشغول ہوتا ہے۔“

میں اس مقدمہ پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ زندگی ایک جتنی نہیں رہے یہ بھی کہ باقی دنیا اتنی پرسکون نہیں جتنی
 کہ سویڈن ہے، جہاں 180 برس سے کوئی جنگ نہیں ہوئی ہے۔ نئی صدی بلاؤں سے محفوظ و مامون نہیں
 ہوئی اس لیے کہ نئے صدی میں بے شمار مہلکات ہوئے ہیں، کیا وہائیں چین کی طرح منتقل نہیں ہوتیں۔
 انسانوں کے پاس وہ بڑا ہوتا ہے عمر بڑھاتے تو ہیں نہیں ہوتے کہ ماضی سے سبق لے سکیں اور جب انسان
 کے دماغ میں بدخواہی بھڑک اٹھتی ہے تو خود انسانیت کی بقا خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ نسل انسانی وجہ بددعائی سے ترقی کی طرف بڑھتی رہے، اور اس منزل پر میں
 انسانی تہذیب کی تاریخ کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ تاریخ اور تہذیب دونوں ایک ساتھ بڑھ رہے ہیں۔

نعم اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ مادہ فنکوں میں، دب آدمی کا اپنے آپ پر نگاہ کے مرکز کرنے کا عمل ہوتا ہے اور جب وہ شعور کا دھماکا بخاتا ہے جو اس پر روشنی ڈالتا ہے تو اس کی ذات ترقی کا شریک بنتی ہے۔

ادب کا مقصد یہ، دلا کر دکھانا نہیں ہوتا، اس کی غیبتی ہے انسان کی دنیا کو درہم و ثلث کرنا اور کشاف کرنا، جس کا ادب ایک شاندار رویہ ہو، جس کے بارے میں قیاس ہو کہ معلوم ہے مگر اچھی طرح معلوم نہ ہو۔ سچ تو ادب کا سب سے بنیادی معیار ہوتا ہے اور اس کا ذریعہ نہیں کیا جاسکتا۔

نئی صدی کا ظہور ہو چکا ہے۔ مجھے یہی کہی پر واضح کر دینا چاہیے ہے کہ ادب کا مقصد یہ نہیں ہوتا ہے کہ ادب میں انقلاب اور تبدیلی دے اور نظریات بھی، سب اپنے انجام کو پہنچ گئے ہیں۔ وہ سماجی یوٹیو جس نے ایک صدی سے نیا دور عرصے کو اپنی پیٹ میں رکھا تھا، ہوا ہو گیا ہے، اور جب ادب اسکی دیکھنے کی طرف پسند یوں کی چیزیں اُتار پھینکے گا، تو اس کو بھی انسانی وجود کے کی طرف لوٹ کر پڑے گا۔ حالانکہ انسانی وجود کے متذہب میں بہت گہمی تھی آگے ہے اور یہ دب کا جری مضمون بنا رہے گا۔

اب وہ دور ہے جس میں نہ جوشین گوئیوں ہیں نہ وعدے اور میرے خیال میں یہ اچھی بات ہے۔ ادب کا خود ہی جوشین گوئی کرنا، خود ہی فیصلہ کرنا بند ہو جانا چاہیے اس لیے کہ جوشین صدی کی بہت سی جوشین گوئیوں فریب طاعت ہو چکی ہیں۔ اور مستقبل کے بارے میں جو وہام تخلیق کرنے چاہتے ہیں وہی نہیں، بہت بہتر ہے کہ ہم دیکھیں اور انتظار کریں۔ ادب کے لیے یہ عمل بہترین ہوگا کہ وہ نگاہ کے گردار کی طرف لوٹ جائے اور سچ کو پیش کرنے پر محنت کرے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادب بالکل ایک دستاویز جیسا ہوتا ہے۔ دراصل تحریر کی شہادتوں میں ہمیشہ کچھ وجوہات اور مقاصد ہوتے ہیں جو ثقافت میں پھپھکے گئے ہوتے ہیں، مگر جب ادب سچ سے معاملہ کرنا ہے تو ایک دوسرے شعور سے ثقافت تک کا پورا عمل میں دیکھیں، کچھ پھوڑے بغیر، لٹ کر دیا جاتا ہے۔ یہ طاقت ادب میں شریک دن سے ہوتی ہے اور اس وقت تک باقی ہے جب تک کہ لکھنے والے انسانی وجود کے حقیقی حالات کی تصویر کشی کرنا رہتا ہے، محض فنیویات پر نہ رہتا۔

یہ ادب کے سچ کو طرفت میں پہنچنے کی صورت ہوتی ہے جس سے وہ کام کے معیار کا تعین کرنا ہے، حروف سے الفاظ بنانے والے کھیل، و ترجمہ کرنے کی تکنیک متبادل کا کام نہیں کر سکتی۔ یقیناً سچ کی بہت زیادہ تعریفیں ہوتی ہیں، اور ان سے کسی طرح معاملہ کیا جاتا ہے، یہ برآمدی پر مختلف طرح سے منحصر ہوتا ہے، مگر اس کو ایک نظر دیکھ کر معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کہنے والے امر انسانی کی طرف اشارہ ہے یا اس کو بے دانہ انداز میں پیش کر رہا ہے۔ کسی خاص نظریے کی وہی عقیدہ سچ اور غیر سچ کو سبوتاغی تجزیے میں بدل سکتی ہے مگر وہی تخلیق میں ایسے بنیادی اصول و رہنما کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

بہر کیف، لکھنے والا سچائی کا مقابلہ کرنا ہے یا نہیں، یہ محض تخلیقی صورت کا مسئلہ نہیں ہوتا، یہ لکھنے کے بارے میں اس کے دے پر منحصر ہوتا ہے۔ سچائی پر قلم اٹھانے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا سچیدہ

میں یہاں سچائی، محض وہی کی شخصیت میں ہوتی ہے اس میں اخلاقی مفاد بھی ہوتے ہیں۔ یہ ادیب کے فرائض میں نہیں ہوتا کہ وہ اخلاقیات کی تبلیغ کرے مگر جب وہ دنیا کے طرح طرح کے لوگوں کی عجیب تیار کرتے کی کوشش کر رہا ہو تو، غیر سوچے سمجھے وہ اپنی ذات اور شعور کے، راز افشا کر رہا ہوتا ہے۔ کتنے والے کے نزدیک ادیب میں سچائی، اخلاقیات کے ہمہ نام ہوتی ہے یہی ادیب کی اخلاقیات کی انتہا ہوتی ہے۔

نتیجہ نکلتے والے کے ہاتھوں، ادیبی جعل، سرائیاں بھی انسانی زندگی کی سچائی کی صورت بری کی تمثیل ہوتی ہیں، اور یہی ان حقیقتات کی حیات بخش عاقبت ہوتی ہے جو نہ اندیک سے جس تک وقت کو جھیل جاتی ہیں۔ کچھ مغلوں میں یہی وجہ ہے کہ چاقی اسے اور شکیبازی بھی بقیہ نہیں ہوں گے۔

ادیب حقیقت کی محض ایک نقل نہیں بناتا، بلکہ اس کی سچائی کی قبول میں صورت کرتا ہے، اور ان کی اندرونی زندگی کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے، ناراضی، فریب، نظر کو رش کرتا ہے، مضمونی، ثقافت کو بہت اونچے نیچے سے دیکھتا ہے، اور ان کی کیفیت کو ایک وسیع تناظر میں پیش کرتا ہے۔

بدشہد، ادیب تصور پر بھی مبنی ہوتا ہے مگر وہ اس کے اندر اس قسم کا سفر نہیں ہے کہ وہ وہ جوڑ کر پیش کرتا نہیں ہوتا۔ تصور جو سچے محسوسات سے مدد دے رہا ہے اور جعل سرائیوں جو زندگی کے بنیادی تجربات سے مدد دے رہے ہیں صرف بے لطف اور کمزور حقیقت پر پہنچ جاتی ہیں۔ جو حقیقتات خود مصنف کو بھی قائل نہ کر سکیں وہ قارئین پر گنا اثر چھوڑیں گی۔ سچ تو یہ ہے کہ ادیب عام زندگی کے تجربات پر نگاہ نہیں کرتا، نہ ہی مصنف اپنے ذاتی تجربات کا پابند ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک بار کئی زبان کی معرفت دیکھی یا سنی ہوئی چیزیں پسے آنے والے مصنف کی ادبی حقیقتات سے ہمہ رشتہ ہوں اور ان سب کی قلب ہریت کی ایک کے احساس میں ڈھل جائے۔ یہ بھی ادبی نین کا جائز ہوتا ہے۔

جیسا کہ بدعا و دعا کے سلسلے میں ہوتا ہے، زبان میں جسم بوجہ دماغ کو مضطرب کرنے کی طاقت ہوتی ہے۔ زبان کا فن پیش کرنے والے کی صلاحیت پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اپنی محسوسات کی دوسریوں تک رسائی کیسے کرتا ہے، یہ کوئی اشاروں کا اندھ سبب سائنات کا ڈھانچہ نہیں ہوتا جس کی زبان کے قواعد کے علاوہ اور کچھ مددگار نہیں ہوتا۔ اگر زبان کے عقب کی زندہ شخصیت کو بھلا دیو جائے تو سائناتی مراجعیں اور انکھار ۲ اسالی سے دانش کے کھلواڑ میں بدل سکتے ہیں۔

زبان محض تصور کی درمزداری نہیں کرتی، یہ ہم عصر محسوسات اور حواس کو متحرک کرتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ عداوت، اور اٹھائے زندہ دلوں کی زبان کی جھڑپیں ملے سکتے۔ سائنات اور خطابت تہذیبان کے پیچھے چھپی خواہش، تحریکات، سچے اور جذبات کی پوری طرح ترجمانی نہیں کر سکتے۔ ادبی زبان کی تعبیر کا انکھار ضروری ہے، لوگوں کو بولنے کے لیے اس کا استعمال کرتا چاہیے، تاکہ انکھار مکمل ہونے کے۔ ہذا خیالات کی بار بردہائی کی خدمت کے ساتھ ساتھ ادیب کو قارئین کو متوجہ بھی کرنا چاہیے۔ فسانے کے لیے زبان کی ضرورت محض معنی کی برتری کے لیے نہیں ہوتی، یہ ساتھ ہی ساتھ اس کو شاعری بھی ہے اور فزیک کے وجود کی تصدیق بھی کرتا ہے۔

ڈیکارٹ کے قول کے مطابق، مصنف کہہ سکتا ہے میں کہہ رہا ہوں، لہذا میں ہوں، میں کے باوجود مصنف کا 'میں' خود اس کا وجود بھی ہو سکتا ہے، بیان کرنے والے کے مساوی بھی ہو سکتا ہے، وکسی تحقیق کا کردار بھی ہو سکتا ہے۔ چوں کہ بیان کنندہ خود بھی اور مضمون بھی ہو سکتا ہے، لہذا وہ سرکاری طور پر ایک مرکزی مقرر کا تعین کرنے والا اسم ضمیر نقطہ ابتدا ہوتا ہے تصور کی صورت گہری کا اور اس سے مختلف نمونے تشکیل پاتے ہیں۔ اپنے بنیادی طریقے کی تلاش کے عمل کے دوران ہی مصنف اپنے تصورات کو مستحکم کر چکا ہوتا ہے۔

میں اپنے الفاظوں میں کرداروں کے بجائے اسم ضمیر استعمال کرتا ہوں اور ساتھ ہی 'میں'، 'میں' اور 'میں' اور جیسے اسم ضمیر بھی استعمال کرتا ہوں تاکہ مرکزی کردار کا تعارف ہو سکے اور اس پر توجہ کی جاسکے۔ کسی ایک کردار کی صورت گہری کے لیے کئی اسم ضمیر کے استعمال سے کردار کی احسان پیدا ہوتا ہے۔ چوں کہ یہ طریقہ شریعت پر موجود ناکاروں کو ایک فرخانی نفسیاتی وسعت مہیا کرتا ہے، میں نے اپنے کھیلوں میں بدست ہوئے اسم ضمیر کو بھی متعارف کیا ہے۔

الفاظ یاد رکھنا نہ بھٹکا ہوا ہے اور نہ کبھی ختم ہو گا، اور ادب و فن کی بعض اصناف کی موت کے چوب نبال اعداء میں کئی زمیں ہیں۔

انسانی تہذیب کے ابتدائی دور میں پیدا ہونے والی، مذہبی، جسمی، مذہبی حیرتوں سے پر ہے وراثی کے انکار کی استعداد کی وقتی حد نہیں ہے۔ یہ مصنف کا کام ہوتا ہے کہ وہ نائن کے باطنی امکانات کو ابھارے۔ مصنف کی عقل کی نہیں اور وہ دنیا کو ابھار نہیں سکتا، خود کو دکھائی پائی کی نہیں نہ ہو چکے۔ نہ وہ کوئی نئی مثال دینا سکتا ہے، باوجود اس کے کہ موجودہ دنیا لوٹ چلائی اور انسان کی مجھ سے بالاتر ہے۔ مگر وہ یقیناً پیسے کے لوگوں کے بیانات میں اضافے سمیت آخر کی بیانات دے سکتا ہے یا وہ اس سے ابتدا کر سکتا ہے جس مقام پر پہلے لوگ ٹک گئے تھے۔

تہذیبی انقلاب کا دور ادب کو پامال کرنے پر تھا۔ ادب مرا نہیں اور ادیب تباہ نہیں کیے گئے۔ کتابوں کی امارتوں میں ہر ادیب کے لیے جگہ ہے اور اس کی حیات اس وقت تک ہے جب تک کہ اس کے قاری موجود ہیں۔ کسی ادیب کے لیے اس سے زیادہ تسکین کی بات نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی نوک انسان کے دنیائے خزنے کے لیے ایک کتاب چھوڑنے کے قابل ہے جس کو مستقبل کے زمانوں میں پڑھا جاتا رہے گا۔

ادب صرف اس وقت تک جیتا جاگتا اور دلچسپی کے قابل ہوتا ہے جب مصنف اس کی تخلیق کرتا ہے اور قاری اس کو پڑھتا ہے۔ اگر یہ محسوس نہیں ہوتا تو صرف مستقبل کے لیے لکھنا اپنے آپ کو اور دوسروں کو بھی قریب دینے کے مترادف ہے۔ ادب زندہ لوگوں کے لیے ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر زندہ لوگوں کی موجودگی کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ اگر کوئی اس نظم شے کی وجوہات معلوم کرنے پر صراحت کرے جو اپنے وجود پر قائم رہتی ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ادبی حاشیہ اور اندر کی زندگی تصدیق، عین وہ مطلق وجہ ہے جس کی اساس پر ادب ادب ہے۔

جب روزی رتی کا ٹکڑا تھیں پر نہ ہی پاؤں اس میں اتنا غرق ہو کر بھی بھول جائے کہ وہ کیوں لکھ رہا ہے اور کس کے لیے لکھ رہا ہے تو لکھنا بھی ایک ضرورت بن جاتا ہے اور لکھنے والے مجبوراً لکھنے لگا اور ادب لکھنے لگے۔ جب ادب کا یہ غیر افادیت پسند پہلو ہی ادب کی بنیاد بنی تو نہ بن جاتا ہے۔ یہ ایک بد عملی حاصل ہے جو بد سلیکی میں تقسیم محنت کا اور لکھنے والے کے لیے ایک نا پسندیدہ ثمرہ کہ ادب لکھنا ایک پیشہ بن چکا ہے۔ بالخصوص موجودہ دور میں سلی ہو رہا ہے جس میں منڈی کی معیشت سرایت کر چکی ہے اور کتابیں بھی مالی و منالی بن گئی ہیں۔ ہر طرف فقیرانہ منڈیوں وجود میں آ چکی ہیں اور صرف انفرادی لکھنے والے ہی نہیں، قومیں اور مائیں کے سامنے ادبی دیہاتان بھی قائم ہو گئے ہیں۔ اگر مصنف منڈی کی ضرورتوں کے قید و کے آگے جھکتا نہیں ہے ورنہ وقت کے فیشن اور عوامی سید مات کے مطابق تہذیبی تحقیقات پیش کرنے پر راضی نہیں ہوتا تو اس کو اپنی نر سہر کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ ادب زیادہ بکنے والی کتاب نہیں ہے یہ ایسی کتاب نہیں ہونا جس کے مصنفین لکھنے کے بجائے ٹیلی ویژن پر مشہور روزی میں مصروف ہوں۔ لکھنے کی آزادی نہ ملتی ہو تو ہے اور نہ ضروری ہو سکتی ہے، یہ مصنف کو اپنی اندرونی ضرورت بن کر بھرتی ہے۔

یہ کہنے کے بجائے کہ بیکہ بد عملی میں ہے، یہ کہتا بہتر ہوگا کہ انسانوں میں ہے اور یہ الہی پرمختصر ہوتا ہے کہ کوئی الہ کو استعمال کرتا ہے یا نہیں۔ اگر کوئی آزادی کا حق شے سے تعلق رکھتا ہے تو آزادی کو چھوڑ کر سے اڑ جائے گی، نہ آزادی کی یہی قیمت ہوتی ہے۔

لکھنے والے، احمد کی پروا کیے بغیر وہی لکھتا ہے جو چھٹا چاہتا ہے، نہ صرف اپنا غما کرنے کے لیے بلکہ سماج کو دکھانے کے لیے بھی۔ یہ بلکہ قسٹ نہیں ہوتی اور لکھنے والے کو چاہیے اما کے غبار سے میں ہو کر چٹکیا بیرونی بننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بیرونی اور چٹکیا سب ہی کوئی ہے یا قابل تعریف کام کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں جو ادبی تحقیقات کے احاطہ قریب سے پرے ہوتا ہے۔ اگر لکھنے والے سماج کو دکھانا چاہتا ہے تو اس کو تباہ کا، اپنے کراہوں کا اور اپنے کام کی مانگیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ورنہ وہ ادب کو صرف نقصان ہی پہنچا سکتا ہے۔ ادب پیچھے پڑنے کے لیے نہیں ہونا، مزید یہ کہ ادب کسی فرد کے طیش کو القامات میں نہیں بدل سکتا۔ جب کسی مصنف کے، ایک فرد کی حیثیت میں راجح سماعت تعلق میں بکھرتے ہیں تب ہی اس کے حسرت و وقت کی غارتگری کو برداشت کر سکتے ہیں ورنہ طویل عرصے تک باقی رہتے ہیں۔

لہذا براہ راست یہ لکھنے والے کا سماج کو چیلنج نہیں بلکہ اس کے اپنے کام کا چیلنج ہوتا ہے۔ کوئی بھی برداشت کے قابل مشکل کام لکھنے والے کے طور اور اس کے سماج کا طاقتور جوانی رو عمل ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لکھنے والے کی فریاد اور اس کی حرکات معدوم ہو چکی ہوں مگر جب تک پڑھنے والے موجود ہوں گے اس کی تحقیقات میں اس کی جگہ کو بھرتی رہے گی۔

اس میں شک نہیں کہ ایسا چیلنج سماج کی قلب ماسیت نہیں کر سکتا۔ وہ (لکھنے والے) محض ایک فرد ہوتا ہے جو معاشرہ، جو بات کی حدود سے بندھنے والا ایک بہت غیر معروف موقف اختیار کرنے کا اندیشہ

ہوتا ہے۔ پھر بھی، یہ کسی طرح بھی مضمون موقوف نہیں ہوتا، کہ وہ انسان ہونے پر فخر کرتا ہے۔ یہ ہمارے انھوں کی بات ہوگی، اگر تاریخ میں عہد کے معلوم قوانین کے ذریعے جوڑ وڑ کی جائے اور وہ خیر دیکھے بعد اعلیٰ حال کے ساتھ چل چڑھے تاکہ افراد کی مختلف کوازیز سنی نہ جاسکیں۔ ہاں ان کی مستحیوں میں ادب تاریخ کی ورثوں کو بچاتا ہے۔ جب تاریخ کے عقیم قوانین بنی نوع انسان کی تشریح کے لیے استعمال نہیں کیے جاتے تو یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ لوگ اپنی کوازیز ہی سے ورثہ رکھیں۔ تاریخ ہی سب کچھ نہیں جو انسان کا تاش ہے، اس کے پاس ادب کی ماضیت بھی ہوتی ہے۔ ادب میں افراد دنیا فٹوں کے ہاتھ ہوتے ہیں مگر وہ خود اپنی اندہ قیمت پر عمل پشیر بھی دیکھتے ہیں۔

قابل احترام اور کان اکادمی، میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے ادب کو نوبیل نعام عطا کیا ہے، اس ادب کو جو پچی خود بخاری کے بارے میں غیر حیرت انگیز ہے، جو نہ انسان کے دھوں سے نہ سیاسی مقصد اسے عربی نظر کرتا ہے نہ سیاست کی خدمت کرتا ہے۔ مجھ پر آپ سب کا شکریہ واجب ہے کہ آپ نے نہایت معزز انعام اس کام کو عطا کیا ہے جو منڈی میں قیمت کیے جانے والے ماہ سے کہیں زیادہ مختلف ہے، وہ ہر کام جنھوں نے اپنی جانب ہیب تم توجہ سہول کمانی ہے، مگر جو واقعی پنھنے کے قابل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ، میں سمیڈش اکادمی کا بھی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے اس شریعت پر بلند ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی اور دنیا کی نظروں کے سامنے بولنے کا موقع فراہم کیا۔ ایک منتخب شخص کی کثرت اور ذوق، جو عوامی ذریعہ ابلاغ میں عام طور پر سنی نہیں جاتی، دنیا سے مدد و راستہ خطاب کرنے کی اجازت فراہم کی گئی۔ اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ نوبیل نعام کا اس مقصد ہی میں ہے اور میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے بولنے کا موقع دیا گیا۔



گنتر گراس

اعترافِ کمال۔ جس کی شوخیوں پر جی ٹرکسٹن حکایتیں تاریخ کے فراش کردہ چہرے کی جگر تراش کرتی ہیں۔

ہر دور میں ہر صنعت، حتیٰ کہ وب تک، ارتقا پذیری کے مراحل سے گزر کر ایک بے مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب اس عروج کا زوال شروع ہو گیا ہے۔ یہی منزلوں پر یہ جگہ کہا جانے لگتا ہے کہ شاید اب وب کی چوہا سمیت نہیں رہی، بس یہ مخصوص لوگوں کے لیے ایک شعلہ بن گیا ہے۔ جس طرح جب قدیم یونان کے طبیعی نظریے (Basic Theory) کے مطابق حرکت ممکن نہ تھی، ایک فلسفی نے ایلیفینس کے مجمع کے سامنے سے گزر کر اس نظریے کی ٹی کر دی تھی۔ صیٰ، ہی طرح گنتر گراس کی موجودگی نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ آرمی سے اب کو کنارے نہیں لگا جاسکتا۔

گراس کی خوبی صرف اس کی بیانیہ بورکھنڈری تخلیق The Tin Drum ہی میں نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اس نے اپنی پوری ادبی زندگی میں کبھی اپنے کسی کاروباریاں کو دہرانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اس نے اپنی کارگزاری کو ہر پشت ذرا کر حیرت انگیز طور پر اپنی ہی راہوں پر قدم بڑھاتے ہیں۔ اس نے ہمیشہ جنایتی ورسپاسی پر بندیوں اور توقعات کے حصار بند کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی ہر تخلیق میں وہ اس پر کاربند نظر آتا ہے۔

گھر گراں 1927 میں جرمنی کے علاقے دانزیگ (Danzig- Langfuhr) میں پیدا ہوا۔ گراں کے والدین جرمن اور پولینڈی تھے۔ دوسری عالم گیر جنگ میں گراں اتسی جرمنی کی فوج میں شامل ہو کر لڑائی میں شریک رہا اور 1944-46 میں امریکی فوج کی جنگی قید میں بھی رہا۔ قید سے رہائی کے بعد اس نے کھیتوں میں مزدوری کی، کان کنی کی اور ساتھ ہی ساتھ ڈوسلڈارف (Dusseldorf) اور برلن میں فلم مصوری کی تعلیم حاصل کرنا رہا۔

1955-59 کے دوران جرمن اور برلن میں مجسم سازی، مصوری اور ڈرامہ، ٹیلی ویژن کا ذریعہ معاش رہا۔ 1955 میں گراں جرمنی کے تنقیدی حلقہ 47 (Gruppe 47) میں شامل ہو گیا جس کے بعد میں The Meeting at Telg ae کا نام لیا گیا۔ گراں کی پہلی شعری کاوش 1956 میں گراں کا لکھا ہوا پہلا ڈرامہ 1957 میں پیش کیا گیا۔

1959 میں گراں کا پہلا ناول کا سیب ناول The Tin Drum شائع ہوا اس ناول سے گراں کی شہرت جرمنی کی سرحدوں سے باہر گئی۔ اس ناول میں مدنی کے پچھلے بچوں کی طرف سے مقرر کردہ کی گئی تھی۔ بعد میں گراں کے ناول Cat and Mouse اور Dog Years شائع ہوئے۔ اسے پسند کیے گئے۔ اس کے تینوں ناول The Danzig Trilogy کے نام سے مشہور ہوئے۔

گراں نے 1960 میں سیاست میں مگرمی سے حصہ لیا مگر وہ کیا اور جرمنی کے چانسلر ولی براڈٹ (Willy Brandt) کے لیے مائے شادی میں کام بھی کیا۔

گراں نے فائنل ورڈ کی ذمہ داری پر اپنی کتابوں Local Anaesthetic اور From the Diary of a Snail میں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اپنی کتاب The Plebians Rehearse the Uprising میں جو جرمنی میں ہونے والی اپنی سیاسی تقریروں اور مضامین کے ذریعے شدت پسندی اور حساب بندی سے پاک جرمنی کی بڑی شہادت سے وکالت کی ہے۔

اسی اور ماحولیات کی تحریک سے گراں کی وابستگی اور اس کے بچپن کے شہر دانزیگ کی یادیں اس کے دو کامیاب ناولوں The Flounder اور The Rat میں شدت سے نکلنے نظر آتی ہیں جن میں اس نے اس دور کی تہذیب پر گہری تنقیدی نظر ڈالی ہے۔

گراں کے ضخیم ناول En Wasen Feld پر اس کے ہم عصروں کے طرف سے کڑی تنقید ہوئی اور کچھ پھنریں۔ یہ ناول مشرقی جرمنی کے اس دور کے پس منظر پر پیش کرنا ہے جس میں اشتراکیت کا زوال ہو اور برلن کی دیوار سمٹاؤ ہو۔ اپنے ناول My Century میں گراں نے تاریخ کو سال پس پس اپنے ذہنی نقطہ نظر سے پیش کیا۔ فن کار اور مصور گراں نے، جس نے اپنی کئی کتابوں کے سرورق بھی خود ہی بنائے، برلن کی فنی اکائی کی 1983-86 میں مصداقت بھی کی اور کئی اعزازات بھی حاصل کیے۔

گراں کو کیشیا، ہامبولٹ، پونزان (Ponzan) اور گڈانسک (Gdansk) کی جامعات نے ڈاکٹریٹ

کی اعزازی اسنادیں کیسے اور متعدد ایجابات اور تحفے دیے گئے۔

خطبہ

”چاری رہے گا“

عزت نامیہ ارکان سینیٹش اکادمی، قواضین و حضرات

اس غلام کے مرنے کے بعد بھی انیسویں صدی کے افسانے پر کام جاری رہے گا۔ رائل اور اخبارات نے غیر واقعی ہی جلد دی ہوئی ماول مسلسل اپنے دور عروج پر رہا۔ ہندی ایجاب ایک کے حد تک شائع ہوتے رہے، تخلیقات کا مرکزی حصہ، قصوں سے لکھا جاتا رہا، اور اس کے نتائج اخذ کیے جانے باقی رہے۔ وہ بدتر صرف مضمون ڈالنے والے تھے اور نہ اس کو نکالتے، بلکہ جواب تک قاری کو ملتا پیش کیے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر کے بہت سے اوس مسلسل سطحوں میں آتے رہے۔ اسٹونے کا اپنا سبھا مسلسل اوس تھا۔ بالترک کے دور نے، جس میں مسلسل ماولوں کی ان تھک تخلیق ہوتی رہی تھی، امید و بیم کی تکنیک میں، بہت سے بے نام کتب خانوں اور اخبارات کا لم کے اختتام پر لگا لگا پیدا کرنا سکھا۔ اور Forsane کے تقریباً تمام ماول پسے اخبارات میں اور بعد میں رائل میں قسط وار شائع ہوئے۔ اخبار Vossische Zeitung کی کوڈ کی جیسے، جس میں Trials and Tribulations نامی بار شائع ہوا، جس نے قاری کے پیش کو بولی ”کیا یہ ہے ہودہ قصہ سچی ختم نہیں ہوگا“

شمر قبیل اس کے کر میں اپنے خطاب کے دھماکے مٹا جانے، یہ دوسرے مسائل پر آگے بڑھوں، میں اس بات کی نشان دہی کرنا چاہوں گا کہ خلیش ادنیٰ نقطہ نگاہ سے، یہ نقل اور سینیٹش اکادمی کے دو مکان جنھوں نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی ہے، میرے لیے قطعی اچھی ہیں۔ میرا ماول The Rat جو تقریباً چودہ برس قبل شائع ہوا تھا اور جس کا نام ”ورنر متوازی تنہید سے دوچار ہو تھا، جو شاید دو چار قاریوں کو یاد بھی ہوگا، دراصل ایک قصیدہ تھا جو آپ جیسے سننے والوں کے سامنے پیش کیا گیا تھا، ایک چوسے کی مٹ تھی، یہ امر یاد رکھنا کہ قلم میں کہا جائے تو تجربہ گاہ میں کام آنے والے ایک چوسے کی مٹ تھی۔

The Rat کو نوٹس انجام سے وانا گیا ہے اس جیسے میں ”بارتھ“ بھی ”مٹی“ سے شامل کیا جاسکتا ہے۔ دراصل یہ ماول کئی برس سے فوٹل داس کی قبرست پر تھا، بلکہ مختلف قبرست پر موجود رہا تھا۔ سڈرول تجرباتی چلوڑوں کے نمائندوں — gamea pig سے mesus monkey تک سپید بادل اور مرغ

بخصوص قومی تنازعے ہمیشہ قصوں کے لیے دلچسپ ہوتے تھے۔ لہذا کشمیری کافی پیسے سے تھی جو بڑے اور بڑے
 دھڑوں میں آنے والے سیلاب اور قحط کے ساتھ قصوں میں شامل ہو گئی تھی۔ غلاموں اور مویشیوں کی طویل
 غیرتیں قبول نہیں، درگاہ بھی داستان، بالخصوص بہادری کی داستانیں، بلیوں کے قاتل نہیں ہوتی تھیں اگر
 اس میں تفصیل جینیات شامل نہ ہو تھی، کہ کون کس سے پیسہ، درگاہ کس کے بعد پیدا ہو تھا۔ عشق و محبت
 جو اب بھی بہت مروجہ ہیں، اور خداؤں کے قصے۔ نصف انسان اور نصف دھندے۔ جو بیوی بھیلوں
 سے گزرتے، یا لہلہ لہی گھاس میں شکار کے منظر چھپے ہوتے، بتدائی سے سرزمین کے لیے کشش کا باعث
 ہوتے تھے۔ روایت، دیوتاؤں، انسان اور سمندری سفر کے قصوں کا ذکر ہی کیا، جو چٹا کس کا علاقہ تھا اس کا
 سنو رگ، بدل بدل کس اور بالآخر داستان گو کے ہاتھوں کھینچے جاتے جو قریباً ہومر یا انجیل کے سہ سے
 داستان کو یوں کے گروہوں کے مروجہ مشق تھے۔ چین اور فارس میں، ہندوستان اور Peru کے پہاڑی
 علاقوں میں، جہاں بھی ان تحریر نے ترقی پائی، داستان گو۔ خود دگرہ میں ہی صورت میں رہے ہوں یا
 انگریز، بے نام یا نام کے ساتھ۔ حسب ذیل تھے۔

ہم تحریر کے متعلق تو ہیں، پھر بھی داستان گوئیں بھولتے سرزمین ادب کی بتا تھے۔ اور ایک
 اچھی بتا تھے۔ اس لیے کہ اگر ہم یہ بھول جائیں کہ داستان گوئی لہوں کے قریبی ہوتی ہے بھی ہے بعد
 متذبذب، کبھی یہ طراز کو خوف کی پیداوار کبھی کبھی پھونکی تا کہ اللہ کیسے ہوئے مارا فلان کالوں تک نہ پہنچ
 جائیں، کبھی بلند آواز اور واضح، خود بخود ہی دھمکیوں سے جو ہر حیات کی برآمدگی تک۔ اگر تحریر یہ پورا انسان ان
 سب کو بھولے پر راضی ہوتا، ہمارے داستان گوئی صرف ایک سہل شے ہو کر رہ جائے گی، تھی شک جیسے خاکسار
 کتنا اچھا ہے کہ ہمیں بے شمار کتابیں ملیں ہیں، خواہ ہم انھیں بلند آواز میں پڑھیں، یا اپنے تئیں یہ
 دیر پا تو ہیں۔ مجھے ان ہی سے ٹھیک تحریر ملتی رہی ہے۔ جب میں نو جوان اور نرم خور تھا، سیل دی اور
 Doban، اپنی کھیرانی جرمین کے ساتھ دفتر، مجھے کچھ وقت بلند آواز میں اپنے کچھ کو دہرانے پر، روشنائی کو
 اپنے حجاب دن میں لانے پر اکسلا کرتے تھے۔ تاس کے بعد سے کافی تبدیلی آئی ہے نہ مہر و برداشت کی
 زندگی کے پانچ یہ عشرے میں نہ اظہار محبت اور عزیزی میں، جس کو تحریر کہتے ہیں، میں سخت اور بچے دار حیلوں
 کو چھڑا کر قابل استعمال قائم کرنا ہوں، غوث کن تہا میوں میں خود سے کہ کہ کتنا ہوں، اور قلم پر کاغذ صرف اسی
 وقت رکھتا ہوں جب میں موزوں سرور آواز کے اتار چڑھا سکتا ہوں، گونج اور گنگ سے متاثر ہوتا ہوں۔

ہاں، میں اپنے چہرے سے محبت کرتا ہوں۔ یہ میرا سر تھی ہے، ایسا ساتھی جس کی کثیر معنی کہ کہ
 میرے مسوہوں میں شخصی غل کی مزدمند ہوتی ہے۔ مجھے اپنی کتابوں سے مل کر جو خوشی ہوتی ہے اس کو بیان
 نہیں کیا جاسکتا۔ کتابیں جو زمانہ ہوا قید سے آزاد ہوئیں اور قاری کے ہاتھ لگی ہیں۔ جب میں بلند آواز
 میں سرزمین کو سناتا ہوں، ان کے متن کو جو ان کے صفحات پر آ رہا ہے سمجھتا ہوں۔ ایسا میرا شہر دار کی ہی میں
 زبان سے جدا کیے گئے اظہار ہوں یا بھولے ہوں یا نئے شہر اب بھی غارت گرد ہوں، دیوؤں کے لیے،

کھسے ہوئے لٹریچر کے لئے کہتے ہیں، اور یہ جانوروں پر مشتمل ہے۔ یہ مصنف کے اندر کا shaman (نہ سحر کا ایک مذہب جس کا حقیقہ دے کہ نہان کے اندر دو جہیں رہتی ہیں جو اس کو نقصان پہنچانے پر قادر ہوتی ہیں۔ مترجم) ہے جو وقت کے خوف، کھسے اور مستحکم پڑاؤ کے بارے میں ڈروٹا کوئی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور ہر کوئی اس کے خاموشی و سر پر یقین کر لیتا ہے کہ ”اے جادوگر“

مگر میں مصنف، شاعر اور فن کار کیسے بنا۔ اچانک، اور وہ بھی خوف زدہ کر دینے والے چھید کاغذ کے خالی اوراق پر؟ یہی کون سی سو روٹی ریخت تھی جس نے ایک بچے کو ایسے دیوانہ پن سے آشنا کیا؟ میں فکھ و رومس کا تھا جب مجھے احساس ہوا کہ میں فن کار بننا چاہتا ہوں۔ یہ اس وقت ہو جب دوسری عالمی جنگ چھڑ رہی تھی، جب ٹائی Danzig کے منافعات میں مقیم تھا۔ مگر میری پیشرو، نہ شو ونا کو ایک جیسے تک نظام رکھتا تھا، جب مجھے نو جوانوں کے لیے شائع ہونے والے پتھر کے رسے HMF MAF (تھیڈی کی مر) سے کپ پکشتش پشش ہوتی۔ یہ افسانوں کا ایک مقابلہ تھا، جس میں انوم رہا تھا۔ میں فوری پتا چھوڑا اور دل کھینچنے بیٹھ گیا۔ اپنی ماں کے پس منظر کے رپارٹس کا عنوان تھا The Kashubians، مگر اس کی شروعات وہاں کے باسیوں کے درناک حالات سے تھی، بلکہ تیر سو سالہ ممدی کے ایک ایسے وقت سے تھی جتنی تھی جس میں اس علاقے کا کوئی حکمران نہ تھا، ایک دروازے والے سے، جب شام ہوں پڑھتا اور ڈاک مار سڑکوں کی ٹھکرائی تھی اور ایک کہانیاں کے لیے انصاف جوئی کے لیے صرف جینی حدائیں (Kangaroo-cours) ہی ہوتی تھیں۔

مجھے صرف متاثر دے رہے تھے Kashuban کے ساحلی علاقے کی معاشی بحری کا مختصر خاکہ کہنے کے بعد انتظامی نوٹ کھسٹ اور قلم عام سے ابتدائی تھی۔ وہاں گلے میں پسند آئے، چاقو زنی اور قوربانیاں جیسے جرائم پر جیکی عدالتوں کے ذریعے پھانسیوں اور موت کی سزاؤں کا اتنا ڈر رہتا تھا کہ پسے باپ کے آخر تک پہنچے پہنچے تمام سرخسہ کرن راور بہت سارے عام قسم کے مرد مر چکے تھے، جن کے راتے یا تو قتل کر دیے گئے تھے یا جیل اور کیوں کے لیے چھوڑ دیے گئے تھے۔ پورے سیر انداز تحریر لاشیں کو رو جس میں بدلے اور سوال کو بھوت پریت کی کہانی بنانے جیسا نہ تھا، مجھے بالآخر شخص تسلیم کرنی پڑی اور مجھے یہ سب کچھ چاہیے گا۔ ”جادوگر“ کہہ کر روک دینا پڑا۔ ہمیشہ کے لیے نہیں، مگر اس وقت تک یہ انداز سب سے کچھ چکا تھا کہ آئندہ سے بچے مردانوں کے ساتھ زنی سے پیش آتا ہوگا۔

مگر پسے تو میں نے پڑھا اور پڑھتا ہی گیا۔ میرا پڑھنے کا پنا ایک انداز ہے کانوں میں ٹھیکیاں ٹھیکنے سے ہونے پڑتا۔ تو تھک کے صوف پر میں یہ بھی بتاتا چوں کہ میں اور میری چھوٹی بہن، دونوں کی تشویش بہت سختی کے ماحول میں ہوئی تھی، یعنی کامروں کے ایک فلیٹ میں، جس میں میں ایک کمروں کی عروسی تھیب نہ تھی، حتیٰ کہ ہمارے لیے ایک کچا بھی مختص نہیں تھا۔ میں ”گے چل کر یہ ہمارے لیے فائدہ مند ہوا تھا، کہ کو ایک عمری ش سے ہم نے شور مچا اور ڈوگیں کے درمیان رو کر بھی غور کرنے کی عادت ہاں کی تھی۔

میں جب پڑھنے لگتا تو اتنی محویت میں ہوتا تھا کہ مجھے دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی تھی۔ میں کتابوں کی دنیا کا اتنا رہیا ہو گیا تھا کہ ایک بار میری ماں نے اپنی پوپون کو مذاق کے طور پر اپنے بیٹے کی محویت کا مظاہرہ کرتے کے لیے اس اہل مدنی کی جگہ پڑھنے کے دوران میں جس کو کھانا جاتا تھا، ایک عداوت کی تمپہ رکھ دی، شاہ جو Palmolive تھا۔ پھر دونوں عورتیں خاموشی سے انتظار کرنے لگیں، اور انہوں نے دیکھا کہ میں نے پڑھنے کے دوران، حسب عادت، نظر اٹھائے بغیر پیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور عداوت کی تمپہ اٹھائی اور اس میں اپنے دانت گاڑ دیے، اور پھر تھوہینا ایک منٹ منٹ پہنچنے کے بعد بڑا کٹھنواہے نے کتاب کے صفحات سے میری توجہ ہٹائی تھی۔

وہ نیک عمری سے آٹھ تک میں پڑھنے میں ہی طرح کھوجا کرتا ہوں، مگر میں نے ابھی جبرائیل پڑھا۔ ہمارے کتابیں ٹیلے ٹیلے کے دو زوں کی الماری میں رکھی رہتی تھیں۔ میری والدہ ایک کتاب کلب کی رکن تھیں اور Hamson, Raabe اور Vicky Baum کے مادل کے درمیان دو مینوسکری اور سٹوئے کے مادل بھی رکھے موتے تھے۔ سلی، گریٹ اور Gosta Berling کی کتابیں بھی قریب ہی رکھی ہوتی تھیں۔ میں بعد میں میڈیکل لائبریری چلا جاتا تھا، مگر سچی تو یہی ہے کہ میری والدہ کی کتابوں کے ڈسٹرے نے مجھے پڑھنے کا عالمی مثال ہے۔ میری مائیک طبع مگر کاروباری، دو چھ مجبوروں کی مثال، اپنا مال قسطوں پر فروخت کرنا پڑ گیا تھا۔ وہ میری حسن پرست بھی تھی، وہ اپنی operetta سننے تھی، اپنے ریڈیو پر نظمیں سن کر قہقہے اور میری کہے ہوئے تمہوں کو بھی ذوق و شوق سے سننے تھی۔ میڈیکل ٹیبلر بھی جانتی تھی، اور ابھی مجھے بھی اپنے ساتھ لے جایا کرتی تھی۔

اپنی تھیلی کا دھون میں بہت سارے معمولی گھڑائیوں کی شمولیت اور ادب کے برٹش سے مناسب رنگ بھرنے کے بعد میں اپنے میسوں میں پڑانے، معمولی بوڑھا، بچپن کے عینے اس لیے دیر تا ہوں کہ میں ”آپ دین کیسے بنے“ جیسے، ”دبا پوچھے جانے والے سوالات کا جواب دے سکیں، کہ میرے سے کس طرح قتل ہو، دن کی روشنی میں عورتیں خواب دیکھنے کی صلاحیت کا حصول، ڈو معنی جسے کہہ کر زبان سے کہیں، خود موضوع سے انصاف کی خاطر کہہ سہنے مٹا دے لیے، وروٹ مٹائی کہہ اس لیے کہ کبھی کبھی غیر ضروری جگہ پڑ جانا فضول سے لگتا ہے۔ مٹھ، ان کیفیت کو اچا کر کرنے کے لیے، عام طور پر جنہیں عداوت کہتے ہیں مگر جو خالہ کی سیاست میں اچو تک دھل ہو جاتی ہیں، جن کی وجہ سے ہند دے کی ملا جلیتیں کبھی نہ اترنے والے مسئلے ہو جوتھائی دینے لگتی ہیں۔

میری والدہ کے منظر نظر علم زاد، جو والدہ کی طرح Kashubian میں قوم ہوئے تھے، Danzig کے ایک ایک خانے میں کام کرتے تھے۔ وہ ہمارے گھر میں لایا گیا کرتے تھے اور ہمیں چھتے تھے۔ جب جنگ پھری تو Hevetus Square کے ایک خانے کے کارٹوں کے SS-Hemwehr کے خوف سخت مزاحمت کی۔ بالآخر میرے عم کو تھپا دیا لے پڑے تھے اور وہ دیر تھا ہوئے۔ ہمارے لوگوں پر مزاحمت

کرنے پر مقدمے چلے اور سب کو گولی مار کر موت کی سزا دے دی گئی۔ اچانک وہ بھڑک اُٹتی سے حرفیہ غلطی
 طرح منادیہ گئے۔ اس کے بعد سے ن کا نام بھی نہیں لیا جاتا تھا۔ گویا کئی دن کا وجود ہی نہیں تھا۔ مگر شاید
 میرے حادثہ میں وہ زندہ رہے ہوں گے۔ سترہ برس کی عمر میں جب میں نے چوٹی دار درولی پہنی تب
 اندازہ ہوا کہ خطرہ کیا ہوتا ہے۔ میں سترہ برس کی عمر میں امریکی جنگی قید میں رہا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں ایک
 مارکٹ میں کام کیا، سڑک قزاقی کا ہنر سیکھا اور کئی کچھ بٹائے لگا۔ کسوں میں داخلہ دیا، معذرت کی گئی، سر قند ہی
 فٹ نے لکھے، طرح طرح کے اور یہ سلسلہ چلتا رہا، اس وقت تک جب تک کہ جو تھیل معلوم نہ ہونے لگا۔
 یہ لگتا ہے جیسے میں پیدا ہی طور پر بھاریات پسند ہوں۔ اس چور سے گئے امیر نیچے میری والدہ کا تم زاد چھپا
 ہوا تھا، پائینڈ کے خاک خانے کا ٹکڑا، جس کو گولی ماری گئی اور دخان دیا گیا، مگر میں نے اسے ترسے نکالا اور
 دلی تنفس کے ذریعے دوسرے عام اور اجنبی بغیر میں زندہ کر دیا، مگر اس در ایک ماہ میں اس کو ایک معمولی
 سر کٹا کر دیا تھا، مگر اسے سے بھر چڑا، جیسا کہ دیکھا تھا، اس ماہ کے سارے کردار ایک باب سے دوسرے
 باب تک، تجربے اور ذوق سے، کچھ تو "آخر تک باقی رہ گئے"، اور اس طرح مصنف پھر باہر دیکھا جانے
 والے وعدہ "جہاں رہے گا" چھانک گئے ہیں کا سبب رہا۔

آئیے اب دہائی آگے بڑھتے ہیں۔ میرے دہائیوں کی شاعرت The Tin Drum اور Dog Years، دوران کے درمیان کہے جانے والے novella یعنی Cat and Mouse نے مجھے، لیکن ایک نسبتاً
 نئے لکھنے والے کی یہ سبق دیا ہے کہ کتابیں ضرور بھی پہنچا سکتی ہیں، ملیں بلا سکتی ہیں، حتیٰ کہ غربت بھی ابھار سکتی
 ہیں، کہ اپنے ملک کی محبت میں اٹھائے ہوئے قدم کو کسی کی ہمدردی کی وجہ بھی گردانا جاسکتا ہے۔ اس کے
 بعد سے میں بہت تنازعہ ہو گیا ہوں۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ ان لکھنے والوں کی طرح، جن کو سبھی دوران میں جگہوں پر جلا وطن کیا
 جاسکتا ہے، میں اچھے لوگوں کے درمیان ہوں۔ "تینا مجھے شکایت کرنے کی کوئی حاجت نہیں دیتی ہے" اس
 کے برعکس لکھنے والوں کو متفقہ تنازعہ ہونے کی کیفیت کو اتنا ہی غلط تصور کرنا چاہیے جو کسی بھل چٹے کے
 انتخاب کے جذباتی خطرات کا بہت ہو سکتے ہیں۔ حقیقت اس میں کوئی شک نہیں کہ لکھنے والوں نے ہمیشہ بلند
 رہتے اور وقت والوں کی سر قوں کے رنگ میں بھنگ لائی ہے، اور یہی حقیقت ادب کا تاریخ کو مندر شپ
 کی باریکیوں اور تخیل جیسے بناتی ہے۔

صاحبانِ ادب و رسوخ کی ہے چار ماہیت مہر بندوں نے مترابط کو زیر کا پیلہ پینے پر، Ovid کو
 جیوٹینی پر، Seneca کو اپنی رسی کہنے پر مجبور کیا ہے۔ صدیوں قبل سے آج تک مشرقی ادب کے باغوں
 کے بہترین ثمرات نے کیتھولک کلیسا کی قبرستوں کی رونق بخائی ہے۔ یورپ کی مائیں خیاں نے اقتدار
 مطلق کے حامل شاہزادوں کی مندر شپ کی عادتوں سے کتابیں بچھ کرنا سیکھا ہے؟ قسط حیات نے کتنے جرم سن،
 جانوں، ہسپانوی اور پرتگالی لکھنے والوں کو اپنی زمینوں سے نکال باہر کیا ہے؟ کتنے لکھنے والے

کوہر کے گل کھڑا کر دیا تھا۔ ان کے قہقہے آگ لگانے والے تھے۔ جب Notre-Dame, Garganua کے مینار پر بیٹھا ہو کر بھٹکا اور اس نے چڑی کی غول و غرش کو اپنے چوہا ب میں فرق کر دیا، مردہ شخص جو غرق نہیں ہو سکا قہقہہ، رگڑ رگڑ اور سے ہنسنے لگا تھا۔ اور ہم سوڈٹ پر نظر کرتے ہیں تو آئینہ کی بھوک و منانے کے لیے اس کے منکسر مطلق مشاہدہ کی وقت کے مطابق بدلا جاسکتا ہے، اگر دوسری ہر مشق ہوئے دن وہی سٹی کا ٹرانس میں مریحان ملکیت کے لیے بجائے گئے ہستہات پر برازیل کی سوان کی سڑک پر پھرنے والے بچوں کے گوشت سے بنائے ہوئے لذیذ طعمہ پختے گئے ہوں۔ میرے نزدیک طواریک فن ہے، اور طواریک میں ہر بات کی اجازت ہوتی ہے، یہاں تک کہ چھپنے کو بھی ہے جتنی طریقے سے چھپا جاسکتا ہے۔

جب ہائٹس یوٹس نے 2 مئی 1978 کو اپنا نوٹس خطبہ دیا تھا، وہ بھاری ملائی اور شاعری کے مختلف مسائل و قریب سے قریب تر لایا تھا اور اس نے موضوع کے ایک اور پہلو پر بات کرنے کے لیے وقت کی کمی کا شکوہ کرتے ہوئے کہا تھا، ”مجھے طرح سے دہرا رہا پڑا، جس کی وجہ سے قائل شجوں کے باعث، اس کی شاعری میں مزاحمت کی بناء کی جیسے سچو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔“ اب یہاں جانتا ہوں تھا کہ شاعر، ڈاں پال، جو آج کل بہت کم پڑھا جاتا ہے، تہذیب کے Culture Hall of Fame میں ٹھہرا گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی شاعرانہ oeuvre میں اور بائیں دونوں بازو والوں کی نظر میں، اس وقت کے شاعر و طعن کے سلسلے میں کسی حد تک مشتبہ تھی (میں یہاں یہ اضافہ کروں گا کہ، اب بھی ہے)۔ بلاشبہ، جو چھپنے والے کے دماغ میں تھا (دل ہی دس میں ہنسنے کے قائل ہی نہیں) ماقابل سماعت، خفیہ مزاح تھا، اس کے بدرون کے مستخرج کی مشہور راہ اتحاد سے افسردہ تھی، ایسے نشان کی، چون عرافت تھی جو نہاد و شیاں سمیٹ رہا تھا وہ عمل، جو مغرب کے آثار و قرائع الیاف میں ”رضا کا مانہ ضبط نفس“ کے طور پر۔۔۔ ایک بے ضرر شمر شپ کی صورت میں، کچھ اہم ہو گیا ہے۔

پانچویں عشرے کے شروع تک، جب میں شعبدہ بازی پر کھسے لگا تھا، ہائٹس یوٹس، اگرچہ پسندیدہ نہیں تھا، مگر ایک معروف و محبوب فن چکا تھا۔ Wolfgang Koeppen, Gunter Exh, ورنو Arno Schmidt کے ساتھ وہ تہذیبی معنیت سے ایک تھمب کھڑا تھا۔ جنگ کے بعد کا ادب جو ابھی نیا ہوا تھا، جرمن زبان کے مقابلے میں مشکل وقت سے گزر رہا تھا، جس کو قاضی نظام حکومت نے خراب کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یوٹس کی نسل، جلد مجھ جیسے نوجوان لکھنے والے بھی، اس مرنیت کے باعث کسی حد تک کسی مشکل صورت حال میں گرفتار ہو گئے تھے جو تھوڑے دنوں نے چاروں کیا تھا ”Auschwitz“ کے بارے میں کوئی نظم لکھنا بہت ہی مشکل ہے، ایسے ہی اس دور میں شاعری کرنا ممکن ہو گیا ہے۔“

دوسرے الفاظ میں ب ”جاری رہے گا“ نہیں کہا جائے گا۔ ”اگرچہ ہم لکھتے رہے ہیں۔ ہمارے یہ ذہن نشیں کرنے ہوئے لکھا ہے، جیسے کہ اڈولف نے اپنی Reflections from Minima Moralia (1951) Damaged Life میں لکھا تھا کہ Auschwitz ایک شکار ہے، تہذیب کی تاریخ کا ایک قابل

میدرخ۔ یہی ایک طریقہ تھا ممانعت سے بچنے کا۔ اس کے باوجود، اور نو کی تحریر یہ آج بھی اپنے اندر ایک قوت رکھتی ہیں۔ میری نسل کے تمام ادیبوں نے سرعام اس سے ٹرائی کی۔ کسی میں بھی خاموشی رہنے کی نہ خواہش تھی نہ عمل، حیرت۔ یہ سارا فرض تھا کہ ہم جن جن زبان کی خامدانی سمجھیں اور کبھی اور اندرون سے باہر نکلنے کی کوشش کریں۔ ہم وہ بچے تھے جو اپنی انگلیاں جوڑ چکے تھے، ہم بنی تھے جو غصے، مطلق، نظریاتی سیاہ دھبہ و مظلور کر سکتے تھے۔ شہادت اور تشکک ہمارے اجداد بنے ہوئے تھے اور ان کی بے شمار مہم اور ہمارے سے تھانف کی مانند تھیں۔ بہر حال، میں نے، زبان کی زرخیزی کے نام سے پہلے ہی اپنے اوپر لکی پریسنگاری جاری کرنی تھی کہ مجھ کو یہ ایک جنٹل قلم پر مقرر رہے ہو گیا تھا، (زرخیزی سے مراد ہے) اس کی دنگلانے کی نرمی، اس کی گہرائی یہ ملا حیرت اس کی مطلق مگر چمک دار تھی، اس کی بدلیوں کی پتک دھک کا توڑ رہی تھا، اس کی چستی ورقیع کاری، اس کی کجروی و راس کے لیلی حسن کی خشکی۔ اس کے اٹائے کو وہی پانے کے حد، زیادہ منفعت کے لیے ہم نے ان کو تباہ کر دیا۔ انڈیو کے ٹیسے یا اس کی مہمیزی کی بنا پر۔ AUSCHWITZ کے واقعے کے بعد شعرا نے نظر نگاہ اسی طرح نگاہیں تھیں کہ اس کو بدداشت کی صورت دیا جائے اور ماضی کو صفحہ زمین سے مٹنے سے روکا جائے۔ بعد از جنگ صرف اسی صورت میں خود حیرت زبان کے ادب پر ہمارے کی بدداشت پہ "جاری رہے گا" کا عام طور پر طریق ممکن ہو سکتا تھا۔ کبھی صورت میں زخمی رہے رکھے جاسکتے تھے اور بھلا دیے کی شہادت کے حامی مقلد "اکب" واقعہ کا ذکر ہے "کی کا پٹ ہو سکتی تھی۔

(کئی بتائے تو کسی سر) کئی بار ادب نے مزاحمت کی کوشش کی ہے، جب کسی دلچسپی رکھنے والے گروہ نے یہ تقاضا کیا ہے کہ جو کچھ ہو چکا اس کو تاریخ کا حصہ بنا کر آگے بڑھا جائے، کہ ہم کو معصوم کی طرف واپس لے کر اور قتل شرم ماضی کو پست ڈال دینا چاہیے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اس لیے کہ یہ صرف ایک حقدار کیفیت ہوتی ہے جس پر کسی کو حق نہ سمجھ بھی جاتا ہے اس لیے کہ جب بھی یہ ماضی میں، بعد جنگ کی کیفیت کے اختتام کا اعلان کیا جاتا ہے، جیسا کہ اس میں ہیں، اس کی ریوار کے اٹھنا، پوچھا گیا تھا، ماضی پھر ہم پر سوار ہو جاتا ہے۔

میں نے فروری 1990 میں، فریڈ فرٹ کے طلبہ سے "AUSCHWITZ" کے بعد "کھانا" کے عنوان سے خطاب کیا تھا۔ ورمل، اس نے اپنی تحریروں کا، ہر کتاب کا ٹکٹ، تجزیہ کرنا چاہا تھا۔ اپنی کتاب The Diary of a Snail میں، جو 1972 میں شائع ہوئی تھی، جس میں ماضی اور حال ایک دوسرے سے نیچے نظر آتے ہیں، مگر ساتھ ساتھ جھپٹتے بھی ہیں، وہ کبھی "پس میں تمہارے بھی ہیں، میرے بیٹے مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ میں اپنے پیٹے کی کیا تشریح کرنا ہوں، اور میں جواب دیتا ہوں، "ہجے، ادیب وہ ہوتا ہے جو وقت کے بھاؤ کے خلاف کھینچتا ہے۔" میں نے فریڈ فرٹ کے طلبہ سے کہا تھا، "اس قسم کا انداز نظر قیاس کرنا ہے کہ نکلنے والے حقائق کے پاس کسی حوالی خلی میں بند نہیں ہوا کرتے، کہ وہ خود کو یہاں اور اسی وقت

زندہ رکھتے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ کر وہ خود کو زندہ کرنے کی گردش کے سامنے پیش کر دیتے ہیں، کر وہ اس میں کود پڑتے ہیں اور طرف داری بھی کرتے ہیں۔ ان میں کود پڑنے اور طرف داری کرنے کے خطرات سے مبرا وقت ہوتے ہیں۔ لکھنے والے کو جو فائدہ دیکھتے ہوتے ہیں وہ خطرے میں ہوتے ہیں، کر اس کی زبان کو ایک خطے میں محدود کرنا چاہیے کہ عصری واقعات کی رنگی اس کو کچھ جاکھ ہے اور اس کے تحلیل کو کچھ کر سکتی ہے جس کو آزاد رکھتے ہیں کہ بہت دلی گئی ہوتی ہے کر اس کو بے حال ہو جانے کا خطرہ درپوش ہے۔“

جن خطرات کی میں نے نشان دہی کی تھی میں ان سب سے معاملہ کرتا رہا ہوں۔ مگر میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس ادیب کو خطرات درپوش نہ ہوں اس کا پیشہ کیا ہوگا۔ مانا کر ادیب کو ایک سماجی سرکاری افسر جیسا تھکا میسر ہوگا، مگر پھر اس کو حال کے مسائل میں اپنے ہاتھ بندھے کرنے کا خوف درپوش ہوگا۔ اس خوف کے پیش نظر کہ فاصلے شتم ہو جائیں گے، وہ خود کو ان حدود میں گم کر دے گا جن میں اس کا طبعی رویہ ڈالے ہوئے ہیں، جہاں اونچے اونچے اماں اور منسوبیوں کا جھوم بھٹکا ہے۔ مگر حال، جو مستقل ماضی میں بدل رہا ہے، آخر میں اس کو پکڑ لے گا اور شدید عقوبت سے روکا کرے گا۔ چوں کہ ہر لکھنے والا اپنے وقت کا ہوتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی احتجاج کرے کہ وہ قبل از وقت یا بعد از وقت پیدا ہوا ہے، وہ خود مختار ہو کر یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ کس یا سے میں لکھے گا اس کے لیے فیصلہ کیا جا چکا ہوتا ہے۔ کم از کم میں تو یہ فیصلہ کرنے میں آزاد نہیں تھا۔ مگر مجھے پسند کی آزادی ہوتی تو میں جمالیات کے قوانین کی پیروی کرتا اور بے ضرر و راز کو کئی قسم کی سحر میں اپنا مقام بنا کر خوش رہتا۔

مگر ایسا ہونا نہیں تھا۔ میرے سامنے میری کم کرنے والے حالات تھے، میں کے پہاڑ تھے، تیرا پھاڑ کرنے کے لیے ان میں پڑی تھی، تاریخ کی کوڑ سے لگے ہوئے فحش تھے۔ میں ان کو دھتا ہوتا تھا، یہ اتنا ہی پڑھتے جاتے تھے۔ ان کو پھر اندر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مزید یہ کہ میں ایک مہاجر خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ ہر اس قوت کے علاوہ جو لکھنے والے کو ایک کتاب سے دوسری کتاب تک لے جاتی ہے۔ عام قسم کی بلند چوٹنگی، استہانت کا خوف، خود سری۔ میری چائے چید نش ایک ناقابل حوالی حقیقت بن کے میرے سامنے کھڑی ہوتی تھی۔ اگر میں کہانیاں سننا کر ایک جاہل شہر کو سنا نہیں کر سکتا تھا، تو کم از کم میں اس کو یقین تو دے سکتا تھا۔ میں امی دلیا گئی نے مجھے دواں دواں دکھا۔ میں اپنے آپ پر اپنے قاریوں پر بغیر کسی احساسی مانتیت کے، یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ جو کچھ تھوڑا سا ہے اس کو ہمیشہ کے لیے حقیقی نسیان کے حوالے نہیں کر دیا جانا چاہیے، کر اس میں فن ادب کے ذریعہ، پئی تمام تر نشان و شوکت اور کم مائیگی کے ساتھ دہرہ چان دانی جاسکتی ہے: کلیسا اور مدرس، بندرگاہوں کے شور اور ٹکڑے پیتے ہوئے Balaic کی باس، ایک آخری سلسلے یعنی ہولی زبان جس کے جسد میں سری باقی ہو اور جو شکایت سے برہنہ ہو، جس میں ہر طرح کا گناہ کے مظہر ہوں اور جہاں جرم بر داشت تو کر لیے جاتے ہوں مگر کبھی معاف نہ کیے جائیں۔

ایک ایسے ہی نقصان نے دوسرے نکتہ و جان کو جاری ہو جانے والے موضوعات کا ایک حمایت خانہ مہیا کر دیا ہے۔ کافی عرصہ پہلے ایک محقق کے دوران سلمان رشیدی اور میں دونوں نے بات چیت کی تھی کہ میرا کھیل جو Danzig میرے لیے تھا، اسی طرح جیسے اس کا کھیل تھا۔ دونوں ہی، پیداوار کے مرکز اور فنکار کے لیے جیسے نکتہ وحدت اور غور پر چلنے والی ماف جیسے۔ اس قسم کی گفتگوئی اور غور و بحث سے نیا نہ اتفاق دونوں ہی ادب کے چان ہوئے ہیں۔ یہ ان کہلوں کے غور و بحث ہوتے ہیں جو تمام مہماتوں اور دور کرتی ہیں۔ جھانکی سے حاصل کی ہوئی تفصیلات، حراست اور لکھیات آرائی، زندگی کو فاشی فاشی پرکھنا۔ میں کوئی تکنیک ہمارے دیوید کی خام مال کو سنبھال نہیں سکتی۔ ہم جتنے احسان مند ہیں عقلی روشن خیالی و دیات کے تاریخی کا تقاضا ہے ہو وہ اسٹک تمام مناسب تخریجات و حمایت سے رد کرتا ہے۔

جس طرح لوٹس اندر کی (مرہم اس کو دیکھ لیا اسے کے بغیر دیکھیں) جزیں بھی لایا، بات کی بھاد میں پڑت ہیں، انسان کی دوسری زندگی کا سپیڈ، جیسے اس کے نکلے کیا، اور جزیں کی فوٹو نہ لیا بدی، دونوں نے دنیا کو خوش حالی اور اندر سے بھر دیا ہے، اسی طرح ادب کی جزیں میں بھی ایک دھماکا خیز خصوصیت چھپی ہوئی ہے، حالانکہ وہ دہ کے گئے ہوئے دھماکے کے ایک تاثیر کی عمل کا اثر رکھتے ہیں اور دھماکا وقت کے مختلف شعبے میں تھیل کر دیتے ہیں، گویا یہ ایک بہت زیادہ انتظامہ وجہ ہے، مصرت اور فعال یونی کے ہے۔ Montaigne سے Diderot, Kant, Lessing اور Lichtenberg تک واقعہ کی اندھی تھیل کے اندر میرے کولوں میں معنویت کی بھیل کو داخل کرنے میں یورپی روشن خیالی کو کتنا عرصہ لگا تھا؟ وروہ بھیل بھی رہا رہی کے زمان مرقی، شمر شپ کی ایسی رہا رہی کے وہ ن جو رکاوٹ کا باعث ہوئی۔ شمر بالآخر جب روشنی نے جالا کر دیا تو، یہ ایک بے رحم معنویت کی روشنی تھی، تھیل کی طور پر کرنے کے قابل پوششوں، معاش اور سماجی ترقی کے لیے، ایک معنویت جو روشن خیالی ہونے کا دعویٰ کرتی تھی مگر جس نے معنویت بنیاد argon (جس کی علامت سے برقیات پر ترقی کا حصول ضروری تھا) کو سرمایہ داری، یا اشتراکیت کے (جو روڈ ڈال سے ہی ایک دوسرے گلے کھانے لگے تھے)۔

آج ہم بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ ان تاباں ناگامیوں نے، جو روشنی خیز کا شاخسانہ تھیں، ہمارے کمر کیو ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ان کے تاثیر کی عمل اور عقلی قیمتوں سے ہونے والے دھماکے نے ہمیں کہاں لپیٹا ہے۔ وراہم روشن خیالی کے لوڑ سے مرمت کی پوشش کر رہے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہماری دسترس میں اور کسی قسم کے اوزار نہیں ہیں۔ ہم دہشت زدہ آنگلوں سے دیکھ رہے ہیں کہ مرہ یہ داری۔ اب کہ اس کی بہن اشتراکیت کی موت کا اعلان ہو چکا ہے، بغیر کسی مزاحمت کے کیا تو متی ڈھاری ہے، اور اعلیٰ سے اپنی مایہ دہن کی غلطیوں کو دیر نے کا نہیں تھیں یہی ہے۔ اس نے آزاد مندی کو ایک عقیدے کی جڑیں دی ہے، اور اپنی بے حد طاقت کے شے کی، جیسا کہ نہیں تھیں یہی ہے، ان روش کے ایک انتظام کے بعد دوسرے انتظام کا، کسی اور عقیدے کے لیے نہیں سوائے شے کو بے حد و حد بڑھانے

کے۔ عجب نہیں کہ سرمایہ داروں، اصلاح پسندوں کی قابلِ نفوذ طاقت ہو رہی ہے جیسے کہ اشتراکیت تھی، جس نے خود کو پچھلی لکان ہے۔ آفاقیت اس کا غرہ ہے، وہ غرہ جس کے قابلِ غنیمت ہونے کا اعلان نخواست سے کرتی ہے، اب اور کوئی تھیل سے بھی تو نہیں۔

ابتداء کا رخ بچے اختتام کو پہنچ گئی ہے۔ اب ”جاری رہے گا“ کا اور کوئی اعلان نہیں ہوگا، اب مزید کوئی بہانہ نہیں ملے گا۔ اگرچہ شاید امید کی جا سکتی ہے کہ سیاست نہیں، جو فیصد سرائی کی طاقت معاشیات کے حوالے کر چکی ہے، تو کم از کم ادب سمجھ لے کر آگے بڑھے گا جو ”نئی خود میری“ کے تلامذوں کو متزلزل نہ کر سکے۔

بھلا کوئی محرابِ اخلاق تحریر ایک سرائی کا نام نہ لے اور ادبی معیاروں کی حامل کس طرح ہو سکتی ہے؟ کیا تاخیر سے ہونے والے عمل کے نظام کے لیے ہمارے پاس کافی وقت ہے؟ کیا یہی کوئی کتاب ہے جو مستقبل جیسی کم مقدور شے میں سونے کی ملاحیت رکھتی ہے؟ بلکہ کیا یہ صحیح نہیں کہ فی زمانہ حوالیہ زندگی سے دبا ہوا پاپا بوریہ سے ورید کرتے نکھنے والے انحریث کو کھیل کے میدان کی طرح استعمال نہ کیے ہیں؟ ایک قہر آؤ جیسی کیفیت، جس کو ”ابلیس“ جیسا مشہور لفظ ایک مخصوص بلہ دیتا ہے، پیش قدمی کر رہی ہے۔ آخری عہدی ٹوٹ پھوٹ کے لیے وقت کے ہر پرزے کی منسوب بندی کی جا چکی ہے۔ تہذیبی صنعتی آسمانوں کی دادی دنیا پر چھائی جا رہی ہے۔ تو اب کیا کیا جا چاہیے؟

میری دہریہ ایک طرف، میں صرف اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ کسی عہد یا سرائی کے سامنے اپنے نگلنے ٹیک دونوں جس نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا ہے اور کچھ ناقابلِ حل مشکلات کی متعدد کٹائی کی ہے۔ (کو مقدس، (پیشانی کا میو) ورنہ فیصلے ہوئے Geyrophus کا کش تھمرا پتھر پر لڑکی کی پسندوں پر قائم نہ رہے، کاش ہم اس گولچہ نیچے کی طرف دیکھیں سکیں اور تمہاری طرح اس پر خوشی مناتے رہیں، اور کاش ہمارے وجود کی مشقت کی کہی ہوئی داستان کبھی ختم نہ ہو۔ آمین؟

حمر کیا میری دعا قبول ہوگی؟ یا، کیا فوجیں بھیجیں؟ کیا ٹکٹوں کی ہوائی تھلوں کی نئی نسل انسانی تاریخ کے تسلسل پر ماسور ہو گئی ہے؟

جو (میری دعا) مجھے میرے قہار کی ابتدا کی طرف واپس لے جا رہی ہے۔ میں ایک بار پھر The Rat کو پھنجوں باب تک کھوتا ہوں، جس میں تجربے گاہ کا چوبہ، تجربے گاہوں کے لائحوں جانوروں کو نمائندہ کرتے ہوئے نویل نوم بہت درما ہے۔ اور مجھے یاد دلایا جا رہا ہے کہ کتنے کم انوماں ان مخصوص کو عہد کیے گئے ہیں جو دنیا کے انسانیت کو بیلوک سے پاک کریں گے۔ ہر کوئی جو قیمت دے کر سکتا ہے گروں کا جوڑا اترے سکتا ہے۔ سینوں میں سے دل لگائے جاسکتے ہیں۔ ہم دنیا میں کسی بھی جہتدار کے بغیر ٹیلی فون پر بات کر سکتے ہیں۔ مصنوعی سپرست اور خدائی اسٹیشن ہمارے سرومہتیا نہ انداز میں گڑب گڑ رہے ہیں۔ تازہ ترین تھیلوں کے ٹکا م سوتے اور بنائے جا رہے ہیں، انوکھی، انوکھی جیسے نئی تھیلیں پہ موت کو دودھ رکھنے میں اپنے مانگوں کی مدد کر سکتے ہیں۔ انسانی دعا کا جو کچھ سچی سکتا ہے، اس سے حیرت انگیز چیزیں بنائی

چا سکتی ہیں۔ صرف بھوک مزاحمت کرتی بلکہ فی دہائی ہے۔ منہسی کی گہرائی تباہی کو جنم دیتی ہے۔ بھوک کے باعث تمام دنیا میں مہاجر بھنگ رہے ہیں۔ اس وجہ کی تباہی کو ختم کرنے کے لیے مائکسی معلومات کی ضرورت ہوتی ہے، مگر کوئی بھی اس کا جڑا اٹھانے پر تیار نہیں تھا۔

سن 1973 میں جب یہ سب باتیں سمجھنے کی غرض سے پہلی بار دہشت گردی بنانا کرنے والی تھی، Willy Brandt نے قوام حیدر کی جہز کی اسبلی سے خطاب کیا تھا۔ وہ پہلا جرمن چانسلر تھا جس نے اسبلی سے خطاب کیا تھا۔ اس نے مائکسی کے مسئلے کو اٹھا دیا تھا۔ اس کی چار ”بھوک بھی جنگ ہے“ پر بلاق تاپوں بھی تھیں۔

جب اس نے یہ مضمون کی تھی تو میں وہاں موجود تھا۔ میں ان دنوں اپنے نام The Flounder پر کام کر رہا تھا۔ یہ بادل انسانی وجود کی بنیادی ضروریات کے بارے میں ہے، انہوں نے عام انسان کی قیمت اور بے انداز بہتات، بڑے بڑے چنے اور ناقابل بیان بھوک سے مرے ہوئے بچوں کو مٹانے کی سرکشی اور میراثی کی میروں سے مرے ہوئے نکلنے والی بھوک کے بارے میں۔

یہ مسئلہ اب بھی ہمارے سامنے ہے۔ منہسی بڑھتی ہوئی دنیا کا مقابلہ کر رہی ہے۔ بھوک شریعہ پیدا کرنے سے کرتے ہیں۔ خوش حال شاہ و مرغرب اپنے آپ کو پاگل پن کی حد تک فحشیت میں کیے ہوئے مخلوق میں چھپ تو سکتے تو ہے مگر ایک دن وہ جنس کے جیوہ ان کو دھڑ پڑیں گے۔ کوئی بچہ بھوک کی گھر کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔

مستقبل کے پاس ان سب کے بارے میں کہنے کے لیے کچھ نہ بچا ہے۔ ہمارے بچوں کو چاہیے رہنا ہوگا اور اگر ایک دن کے لیے بھی لوگ لکھنا اور اشاعت کرنا رکھیں، یا رکنے پر مجبور کر دیے جائیں، اگر کہیں صبر نہ ہوں تو کسی داستان کو تو ہوں گے جو منہ درگوش سالس پہنچائیں گے۔ پرفی بھائیوں کو مٹے دھاگے سے بٹھیں گے، نور سے یا آہستہ سے ہکا بٹکا کرے اور راک راک کر ابھی قہقہے پورا بھی اٹھو:



ہونے سارا ماگو

اعترافِ کمال۔ جو اپنی تصوراتی تہئیں، دردمندی، اور جویاتی اور کے ذریعے ہم کو ایک بار پھر
گرہوں کی حرکت میں مدد دیتا ہے۔

بعض مصنف مس عتاب کی طرح ہوتے ہیں جو ایک ہی علاقے پر پھرنگاتے رہتے ہیں اور ایک
کتاب کے بعد دوسری کتاب کے ذریعے ایک مریطہ الخاز میں دیا کے ارتقا کی تصویر پیش کرتے جاتے
ہیں۔ ہونے سارا ماگو ان سے مختلف قبیل کا مصنف ہے، ایب، جو ہر بار ایک نئی دیا اور ایک نیا طرزِ تلب و
ایجاد بنا چاہتا ہے۔ وہ ہر وقت دنیا کے بدلتے ہوئے نقوش و ارتقا کو ایک لمبی میں پہونے کا کام بھی کرتا
ہے، ”رقدم بہ قدم قاری کے ہم کتاب بھی رہتا ہے۔ پ ظاہر و یک داستان کو نظر آتا جو اپنی تعلقات کو
جائزین کے سامنے پیش بھی کرتا ہے، ان کی تعریفیں بھی بیان کرتا ہے و دشوئیں بھی کرتا جاتا ہے۔

ہونے سارا ماگو 1922 میں پرتگال کے دار الحکومت لوزن (Lisbon) کے شمال میں واقع ایک
تھوٹے سے گاؤں Azinhaga (Ribatejo) میں ایک کسان کے گھر پیدا ہوا۔ والدین کی عمرت کی وجہ
سے سارا ماگو کو اپنی اہلی تعلیم ترک کرنی پڑی اور مجبوری کے تحت اس نے ایک مستربی کی تربیت حاصل و
تا کہ اس کے ذریعے بے زنی تہائے کے قابل ہو سکے۔

سرکاری مدد مت حاصل کرنے کی ناکامیگ وجہ کے بعد سارا ماگو نے ایک اشتہائی لاسکے میں بارے

مال تک بلزمت کی۔ اٹھائی بارے میں کام کرنے کے تجربے کی بنیاد پر اس کو بعد میں مختلف اخبارات میں بلزمت کے سوانح طے اس طویل تجرباتی کا کردار کی وجہ سے ایک اخبار نے سارا ماگو کو اپنے مدیر کی نیابت کا سونپ بھی دیا۔ 1975 کی سیاسی کشمکش کی وجہ سے سارا ماگو اخبار کی بلزمت ترک کرنا پڑی۔ غائب اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ 1969 میں اس وقت کی غیر قانونی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گیا تھا۔

1975 اور 1990 کے درمیان سارا ماگو ایک مترجم کی حیثیت سے کام کرتا رہا یہاں تک کہ ایک وقت اس نے خود بھی لکھنا شروع کر دیا۔ سارا ماگو کو بین الاقوامی شہرت اس وقت ملی جب 1982 میں اس نے انٹرویو سبکی کے پرستار کے پس منظر میں، طرینا اور ڈی ایل ایل میں ایک مجلہ Batazar and Bimunda تحریر کیا۔ اگلی کے مشہور موسیقار کا ری (Corghu) نے سارا ماگو کے اس مادل پر Bimunda نام کا ایک غنائیہ ٹیبل ترتیب دے کر پیش کیا جس کی بہت بے پناہی ہوئی۔

سارا ماگو بنیادی طور پر نظر نگار ہے۔ اس نے تین کتابیں تصنیف کی ہیں جس میں تین شاعری کے مجموعے بھی ہیں۔ 1977 میں شائع ہونے والی اس کی کتاب The Manual of Pinning and Calligraphy ایک مادل ہے جس کا بنیادی موضوع دراصل قلمی لکھنے کے کسی ماہر، مصور اور مصنف کی داستان حیات ہے۔ اپنے انداز کے مطابق یہ مادل کتاب سارا ماگو کی اپنے سوانح حیات معلوم ہوتی ہے مگر یہ محبت کے جذبات سے خیر، غلاں معامات، مصنف کے سفری روایتیں، درامی کے دور کے معاشرے اور فریو واہد کے بارے میں انکار سے ملبو ہے۔ اس مادل کا ختام 1974 میں پرستار کے تر Salazar کے مادل کے احوال سے طے کیا گیا ہے۔

1984 میں سارا ماگو کا ایک دلچسپ مادل The Stone Rat شائع ہوا۔ اس کا قصہ چھوٹیوں ہے کہ بکے بعد دنگے قہور میں آنے والے چھوٹے بوقت انضرث واقعات اس انجی کو چھوٹے ہیں کہ جزیرہ آزوریا (Azores) جو اٹلی اور پرستار پر مبنی خطے کا قدیمی نام ہے، براعظم یورپ سے آف ہو کر، بوقتوں میں تیرا ہو Azores کی جانب بڑھنے لگا ہے۔ سارا ماگو نے اس کی مصحت حال کچھ ایسی بتائی ہے جس میں اس کو بہت محبت اور اس دور کی زندگی کے حالات کے بارے میں اپنے سفری انداز میں تبصرے کرنے کے سوانح نصیب ہوئے جس کے ذریعے اس کی طامانی فرست اور قوت کھلا، نکلے عروج پر نظر آتی ہے۔

سارا ماگو کا ایک اور مادل The History of the Siege of Lisbon بہت اہم اور قابل ذکر ہے جو 1984 میں شائع ہوا تھا۔ یہ مادل دراصل ایک مادل کے بارے میں ہے جس میں مادل کا پروف ریڈر دانہ طور پر غلط No ایسے مقدم پر مبنی میں داخل کر دیا ہے جس سے مادل کے تاریخی واقعات بالکل مٹ جاتے ہیں ورمی سے، کھتے وال، یعنی سارا ماگو نے نئے اور دلچسپ پروفراشتا ہے۔

سارا ماگو کو متعدد نا اعلیٰ استاد اور تحفے عطا ہو چکے ہیں۔

خطبہ

کس طرح کروا دیا لک میں گئے اور مصنف ان کے شاگرد

مجھ کو اپنی زندگی میں جو سب سے عظیم منہ آتی رہا تھا وہ نہ چھوٹتا تھا اور نہ لکھ سکتا تھا۔ صبح سویرے چار بجے کے قریب، جب فرانس کی سرزمین پر ایک نئے دن کی امیدیں دینی تھیں وہ اپنی کنیاس سے لٹکے اور کچھوں میں چڑھ گیا، اپنے ساتھ لے گئے وہ جس سڑک پر جس کے سچے ہوئے بچے اس کے اور اس کی بیوی کے بے خدا کا کام کرتے تھے۔ میری ماں اسی وقت سے علاقے میں رہا کرتی تھی اور اس وقت تک اس کا گزارہ مکینوں کی فراڈ شپ سے ہوتا تھا، جنہیں دودھ چھڑانے کے بعد ہمارے قریب کے گاؤں Azinhaga میں رہنے والے فریڈیہ کہتے تھے۔ ان کے ام Jeronimo Meinho اور Josefa Caxinha تھے اور وہ دونوں ہی ان پر تھے۔

موسم سردی میں جب راتیں اتنی سرد ہوتی تھیں کہ گھر میں رہنے پر عیش کا پانی بھی جم جاتا، وہ باؤس سے سڑک کے چھوٹے بچوں کو لے کر اپنے بستر میں لے جاتے۔ موٹے تسموں تھے، ان کے ہاتھوں کی گرمی ان کو غصہ کر رہا تھا۔ بچاؤ تھی۔ اگرچہ وہ دونوں بھراں نوک تھے، یہ دراصل ان کی رحم دینی نہیں تھی جو انھیں اس کام پر آمادہ کرتی تھی، وہ دراصل اپنی روٹی کی حفاظت کے لیے ایسا کرتے تھے۔ انھیں زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے بار بار سڑک کے باؤس میں محنت کے دھن اپنے دان کی مدد کے علاوہ پھر سے محنت کیاریوں میں بڑی لگانے کے لیے کھدائی کی تھی، آگ جودنے کے لیے کنیں نکالی تھیں، پانی کا پمپ چلانے کے لیے محنت کی تھی۔ میں ٹکٹے کے کنویں سے پیچھ پر لا کر پانی لے لیا کرتا تھا۔ آٹھ چوکیوں والوں سے نظر بچا کر اپنی تازی کے ساتھ بھنے کے کیت سے جانوروں کے لیے چارو کاٹ کر لے لیا اور کھجی، گرمی کی راتوں میں رات کے کھانے کے بعد میری دادی کہتی تھیں: "آج رات ہم دونوں انجیر کے درخت کے سونیں گے۔" وہاں انجیر کے دو درخت اور بھی تھے، مگر چوں کہ یہ سب سے بڑا تھا اس لیے، جب گھر والے انجیر کا درخت کہتے تو ان کی مرد میں چھتا درخت ہوتا تھا۔ رات کے پندرہ گھنٹے

درختوں کی گھنی لائیوں میں، مجھے ایک ستارہ نظر آیا جو "بستہ" بستہ ایک سپید پتے کی آڑ میں چھپ گیا۔ دوسری طرف نظر کی تو مجھے "سکان" کی خلا میں ایک خاموش بہتا ہوا درخت نظر آیا، یعنی "بیشاں"، جس کو ہم گاؤں کے لوگ سائیا گوانے دان مڑک کہہ کرتے تھے۔ انکو ٹکٹے میں دیہ کے باعث راتیں کہانیاں سننے میں گرمی تھیں اور میرے دادا ایک کے بعد دوسرے قہر چھیڑ دیتے، رات کا، دہشت کا، قہر درخت، زردے دنوں کی

موات، پتھروں اور کنڑوں سے ہونے والی نرا نہیں، اجداد کے اقوال۔ گویا کبھی نہ تھکنے والی یو ویں، جو ساری ساری رات جگائے رکھتی ہے، فکر سنا تھی، مٹھی مٹھی لعلیاں اور تھپتھپاہٹیں۔ مجھے کبھی اندازہ نہ ہوتا کہ وہ مجھے سوتا کچھ کرنا موٹی ہو گیا ہے، پڑھ میرے سوال سے کہے اذیت سے جواب کھل کر کہنے کے لیے بولتا رہتا ہے، وہ سوالات جو میں اس کے بیان کے دوران طویل وقفوں میں پوچھتا رہتا تھا، ”چھر گیا ہوا“، ”ٹالیاں، وہ قلعے اس لیے دیرانا رہتا تھا کہ وہ اس کے ذہن سے گھوٹا ہو چکا تھا، کیا اس کو دنیا بھر سے مارنے کے لیے، خارنے کی خاطر۔ عمر کے اسی حصے میں، جیسا کہ ہم سب کرتے ہیں، میں اپنے دادا Jerónimo کو ساری دنیا کے غم کا مایہ بکھاتا تھا۔ علیٰ خیال، جب چڑیوں کے چھپچھپے مجھے جگا دیتے، وہ سوچتا نہ ہوتا، وہ شاید یہ سوچ کر موٹیوں کے ساتھ کھیتوں پر چڑھتا، کہ میری نیند میں غلغلہ نہ پڑے۔ پھر میں گھٹا ہونے لگتا، تو کرتا اور مجھے پاؤں (جو وہ ایک کی عمر تک میں گاؤں میں گئے پاؤں ہی پھرا کرتا تھا) بازو کے زخموں سے دھو کر دے دیتا تھا، چلا جاتا، جہاں سونہ بند کیے جاتے تھے۔ میری دادی، جو دادا سے پہلے ہی اٹھ چکی ہوتی تھی، میرے سامنے کافی سے بھر ایک بڑا سا پیلا جس میں روٹی کے ٹکڑے پڑے ہوتے، رک دیتی اور پوچھتی کہ دست میں کچھ طرح سبب بھی کر نہیں۔ اگر میں اس کو کوئی ڈانڈا خواہ سٹاکا، جو دادا کے سٹاکے ہوئے قصوں کی پیداوار ہوتا تو ہمیشہ وہ مجھے تسلی دیتے ہوئے کہتی، ”خوابوں سے کچھ نہیں ہوتا، یہ اہل یوں ہی سے ہوتے ہیں۔“ حالانکہ میری دادی بہت عقل مند عورت تھی، میں اکثر سوچتا کہ وہ واقعی جیسی عقل مند نہیں، جو ایک زبردست انسان تھا، فخر کے درخت کے، اپنے پوتے Jose کے ساتھ اپنا، صرف چند لحاظ سے کائنات کو تحریک کر سکتا تھا۔ میرے دادا کے انتخاب کے بہت دنوں بعد، جب میں کچھ دارا دلی بن چکا تھا، مجھے احساس ہوا تھا کہ میری دادی خود بھی خوابوں میں مبتلا رہتی تھی۔ دن کو کافی دیر نہیں کہ وہ اپنے گھر کی دیوار پر بیٹھی، جہاں وہ واقعی رہتی تھی، آسمان پر پھٹکے چھوٹے بڑے ستاروں کو دیکھتی رہتی، اور کہتی، ”یہ دنیا کتنی خوب صورت ہے، اور یہ کتنی افسوس اک بات ہے کہ مجھے ایک دن مرنا ہے۔“ میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ موت سے خوف زدہ ہے، سوائے اس کے کہ مرنا افسوس ناک ہوتا ہے، گویا کبھی نہ ختم ہونے والی مشکلات سے بھر چر اس کی زندگی کے الوداعی لحاظ میں، کائنات کا حسن ایک لحاظ سے کے صعوبت میں اس پر ظاہر ہو رہا ہو۔ وہ ایک ایسے گھر کے دیوانے پر بیٹھی ہوتی تھی، جیسا شاید دنیا بھر میں ہوتا ہو، اس لیے کہ اس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو سبز کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بستر دوں میں کی طرف سوتے تھے جیسے یہ ان کے اپنے بچے ہوں، جو اس دنیا کو چھوڑنے پر اس لیے افسوسہ ہوں کہ یہ دنیا بہت حسین ہے۔ اور Jerónimo، سکر پائے والے، داستان گویا میرا دادا، جب اس کو یقین ہو گیا کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے تو، ایک کے بعد دوسرے تمام درختوں کو خدا حافظ کہنے ان سے ملے ٹکڑے کر دئے ٹکڑے کیا تھا، اس لیے کہ وہ اب ان کو کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔

کئی برس بعد، جب میں اپنے دادا Jerónimo کو اپنی دادی Josefa کا (ان لوگوں کے مطابق،

جو میری ماوی کو اس کی فوجیاتی کے وقت سے چانتے تھے، کروہ غیر معمولی حسین عورت تھی (مذکرہ لکچر باتھا میں چانتا تھا۔ میں ان جیسے معمولی انسانوں کو اپنی کردہوں میں ڈھلیا رہا تھا۔ غائب، میرے نزدیک ان کو نہ بھولنے کا یہی ایک طریقہ تھا، پس سے ان کے چہروں کے خاکے بنانا، دوبارہ بنانا، جو شاہجی کی کبھی یادداشت کو تبدیل کر سکیں، ہڈ مزہ کے اکتا دینے والے معمولات کو چکانا، ان میں رنگ بھرا، گلیا یادداشت کے مایا پیار نقشے پر، اس ملک کی موقوف انہریت حقیقت بنانے کی کوشش کی چاروں جوانی میں زندگی بھر رہنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ پٹی ویکس کی ذہنی کیفیت، جس نے مجھے اپنے Berber ناطق کی تصویر کشی اور پیچیدہ شخصیت کی یاد دلاتی ہے، مجھے مجبور کر دیتی ہے کہ ان کی نگاہ میں اس، (تقریباً اتنی برسی پرانی) اس تصویر کا بھی تذکرہ کروں۔ جس میں میرے والدین، فوٹو گرافری کی طرف متوجہ کھڑے ہیں، جوان اور خوب صورت، اپنے چہروں پر تقدیس بھری بنجیدگی سجے، شاید میرے کی آنکھ کے خوف سے، جو کہ ان چہروں کے نقش محفوظ کر دی جو، کبھی ایسے ہی نہیں رہیں گے اس لیے کہ یہ آنے والے نیا دن، ایک دوسرا ملک دل دن ہو گا۔ میری ماں ایک اونچے سے حقین پر پٹی مانی کبھی نکلتے ہے اور اپنے دائیں ہاتھ میں ایک پھول پکڑے ہوئے ہے۔ میرے والد کا نام زور میری ماں کی پشت پر ہے، اور اس کا ہاتھ اس کے کاندھے پر اس طرح رکھا ہوا، کہ اس کا محنت کش پنجہ اس کے کاندھے سے نکلے ہوئے ہنگو کی طرح دکھائی دے رہا ہے۔ دونوں، تائے ہوئے، ایک قافلین پر کھڑے ہیں جس پر کسی درخت کی شاخیں مٹی ہوئی ہیں۔ پس منظر میں تکی ہوئی کینوں کی معمولی دیوار پر جھنڈن لٹکی ہوئی ہیں مگر معمولی تعمیر کا نمونہ ہے۔ درمیان میں نے اس تذکرے کو ان جملوں پر ختم کیا تھا، ”ایک دن آئے گا جب میں تم کو ہمالیہ کا یہ علاقہ میرے یہ کہیں کے کام کا نہیں۔ شام اٹھتا ہے، ایک Berber ناطق، ایک اور ناطق، سڑکی کی نقلی افرا، کش کرنے والا، نہایت خوب صورت ناطق، بنجیدہ اور حسین والدین، تصویر کشی میں ایک پھول۔ مجھے درستی جینیات کی کیا ضرورت ہوگی؟ اور ٹیک لگاتے کے لیے اس سے بہتر کون سا درخت ہوگا؟“

میں نے یہ سارا تقریباً تیس برس قبل کہہ دیا تھا، جن کا کوئی اور مقصد نہیں تھا سوائے اس کے کہ ان لوگوں کی زندگی کے نکات کی دوبارہ تعمیر اور یاد دہانی ہو جائے جنہوں نے میرے وجود کو پیدا کیا تھا اور جو سب سے زیادہ مجھ سے قریب رہے تھے، اس خیال سے کہ اس کے بعد لوگوں کو اور کچھ تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی کہ میں کہاں سے آیا اور کس مائے سے بنایا تھا، اور رفت رفت میں کیا ہو گیا۔ مگر میں بالکل غلطی پر تھا، اس لیے کہ علم الحیات پر حید کا احاطہ نہیں کر سکتا اور جہاں تک جینیات کا سوال ہے تو، اس کے رستے بہت پر اسرار رہے ہوں گے تاکہ اس کا سفر طویل ہو جائے۔ میرے جینیاتی درخت میں وہ چند شاخیں تھیں ہی نہیں، وقت اور زندگی کے مسلسل مجادلے سے تھکے ہوئے ہیں جن کی مدد سے ہیں، بلکہ ان لوگوں کی بھی کی تھی جو اس کی جڑوں کو زمین کی عمیق ترین صوبوں میں چھید کر پہنچ جانے میں معاون ہوتے ہیں، وہ جو اس کے شرا اور ان کی خوش بو کی یکسانیت کی تصدیق بھی کر سکتے، وہ جو اس کی ہندو زمین

شاخ کو بڑھاتے اور مضبوط کر سکتے، تاکہ پرندے ان میں سے آسانی سے نرہ سکیں اور اپنے گھوسے بن سکیں۔ جب میں اپنے والدین اور اجداد کو ادب کے رنگوں میں رنگ رہا تھا، اور ان کو بوقت و پوسٹ کے عام آدھیوں سے ان سٹے نرہوں میں تبدیل کر رہا تھا جو مختلف ہزاروں میں میری زندگی کی تعمیر میں مددگار ہوں گے، میں بے باوری میں ان ماحولوں کو پیش کر رہا تھا، مگر وہ میرے بچاؤ کے لئے کرنا چاہتے تھے۔ وہ چیزیں اور اوزار بنائیں گے اور مجھ تک آئیں گے جو بالآخر، چھائی کے لیے یا برقی کے لیے نفع اور نقصان میں کافی رہا کافی ہوں گے، ان سب میں جو بہت نقص ہیں، مگر ان میں بھی جو کثیر ہیں، مجھ میں سے وہ شخصیت بنائیں گے جسے "جنگل" میں چنا "پ" سمجھا ہوں۔ ان کے کرداروں کا خالق مگر ساتھ ہی ان کا خالق بھی۔ ایک طرح تو یہ بھی کہ جس کا ہے کہ اس انسان کے اندر جو میں خود ہی ہوں، میں حرف بہ حرف، لفظ بہ لفظ، سنی بہ سنی کتاب پہ کتاب، اپنے ہی بنائے ہوئے کرداروں کو داخل کر رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے بغیر میں وہ شخص نہیں بن سکتا تھا جو میں آج ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے بغیر میری زندگی کا سہارا نہ ہو سکی، ایک ماورست تھا کہ بخنے ٹل، ایک وعدہ بخنے ٹل، اور پھر دوسرے وعدوں کی طرح میں صرف وعدہ ہی رہ جاتا، یہ کہیں کا: جوداں جاتا جو موجود ہوتا یا بالآخر میں ہونے کے قابل ہی نہ ہوتا۔

اب میں صاف دیکھ سکتا ہوں کہ وہ جو میری زندگی کے مالک تھے، وہ جنہوں نے بڑی مشکلوں سے مجھے کھنور زندگی گزارنے کا سیکھ سکھا یا تھا، اور میرے ماؤں اور ڈراموں کے وہ درجنوں کردار جو اس وقت میرے تصور کی آنکھوں کے سامنے سے نظر و ارتداد کر رہے ہیں، اور وہ صحت جان نظم و روشنی، وہی، میں جنہیں اپنی مرضی کے مطابق، داستان کوئی طرح استعمال کرنا چاہ رہا تھا، ایک مصنف ہونے کے ناستے میری خواہشوں کے فرماں بردار ہو کر متحرک کھیلوں کی طرح حرکت کر رہے ہیں، جن کی حرکات اب مجھ پر اس طرح اثر نہیں کر سکتیں، جس طرح کہ ان فوریوں پر آمدی ہیں، ان کو بلائے اور پچانے کے لیے جس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ ان استادوں میں، بلاشبہ، پہلا ایک عام قسم کا پورٹٹ ہانے والی مصور تھا، جس کو میں صرف H کہتا تھا، جو اس قصے کا مرکزی کردار تھا (جس کا عنوان Manual of Painting and Calligraphy ہے) اور جس کو میرے خیال کے مطابق وہاں آغاز کیا جانا چاہیے (اپنا بھی اور ایک معنی میں، مصنف کا بھی) جس نے، بغیر کسی خفگی یا مایوسی کے، اپنی حدود میں سب سے ہوئے، مجھے اپنے تاثرات اور اعتراضات کو ایمان داری سے بیان کرنے کا سیکھ سکھا یا تھا، اس لیے کہ میں نے کبھی اپنے تجویز سے سب سے جس میں میری ادبی کاشت کا دی ہوئی ہے، باہر قدم نکالنے کی تمنا نہیں کی تھی، اور نہ کر سکتا ہوں، جس چیزوں تک رسائی کے لیے کھدائی کے نکات تھے، اور اگر مجھے ایک ماحولوں خواہش کی اجازت ہو تو یہاں تک کہ خود ہی اور دنیا کی جھڑپ تک ہی محدود رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں اپنے کام کے حسن و قبح کے نتائج کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کا حق نہیں رکھتا، تاہم آج یہ حال تھا کہ جو گویا ہے کہ اس وقت کے بعد سے میرے تمام کام میں ان مقاصد اور اصولوں کی پاس داری کی گئی ہے۔

اس کے بعد میرے سامنے آتے ہیں Alentejo کے مرد اور عورتیں، وہی بھائی ملاوڑی والے، زمین کے بوجھ، میرے Jerónimo Da اور دانی Josefa بھی جن میں سے تھے، غیر متقدم انسان، اپنے مزدوروں کی قوت کو نہ ہونے کے برابر حیرت پر، اس کام کے لیے، فروخت کرنے والے جن کو صرف غیر اہم ہی کہہ جاسکتا تھا، اسکی زندگی کے لیے، مذہب دینا جس کو وسیع کمال کے مطابق ہی سمجھتی، متقدم یا ارفع گردانی تھی۔ میرے واقف کار تھے، اولگ کلیہ کے قریب قورودہ ملاست اور چائیرا 1973ء کے چھوٹے ہمیشہ پولیس کی نظروں میں رہنے والے، جو بلا بنا خود مرنا راست خلاف کے شکار ہوئے تھے۔ انسانوں کی تین تسلیں، the Badweathers، عدلی کی بدنامی سے اپریل 1974ء کے انقلاب تک، آمریت کو سرنگوں کرنے والے، Risen from the Ground نامی ناوب میں ڈال دی ہیں، اور وہی خاک سے اٹھائے ہوئے مرد اور عورتیں، حقیقی انسان، جو بعد میں محدودی افسانہ بن گئے، جس سے میں نے نمبر کیا، نمبر دس بنا سیکھا تھا، جو ہمیں ایک ساتھ بناتے بھی ہیں اور تباہ بھی کرتے ہیں تاکہ ہمیں ایک ہر پچہ تباہ کرنے والے ہمارے دکھائیں۔ اس ایک چیز جس کو میں چوٹی طرح مضمر نہیں کر سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کے تجربات کی مشکلات ان لوگوں میں زندگی کی طرف ایک سخت مزید پیدا کیے والی طاقت میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ یہ انہیں طرح کرتے ہوئے کہہ سکتے ہوئے تمام سچ آج میں جس بعد بھی میری یادداشت میں محفوظ ہیں، اور ایک مسلسل بلاؤس کی طرح مجھے، اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے ہیں، میں نے مسہ کا نام ساتھ سے چھوڑ نہیں ہے، کہ Alentejo کے وسیع میدانوں کے یہی عظیم تجربات میری عذریتوں پر مشتمل کریں گے۔ اس طرح، یہ صرف وقت ہی قائم گا۔

میں ان پرستانیوں سے اور کیا سبق کچھ سکتا ہوں جو سوچوں میں مدد میں زندگی رہنے والے ایک پرستار سے کوئی سبق نہ کچھ سکے، جس نے Rimas اور دوسری کئی عظیم تخلیقات ترتیب دی تھی، جن میں Lucidas کے تباہ شدہ جہازوں کے بے کو اور قوی بے زری کو سمایا تھا، جو ایک مطلق شاعرانہ جنس تھا، جو ہمارے ادب کا سب سے عظیم فرد تھا۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ اس بیان سے Fernando Pessoa کو کتنا آں پہنچتا ہے کہ اس نے خود کو Super Camões مشہور کیا تھا۔ مجھ پر کوئی سبق اثر انداز نہیں ہو سکتا، نہ میں کچھ کچھ سکتا ہوں، سوائے ان سرودیوں کے جو اپنی تمام تر خاص انسانیت کے ذریعے Lus Vaz da Camões مجھے دے سکتا ہے، مثلاً ایک ایسے ادیب کا منظر کشا، جو اپنی تخلیقات کی شاعت کی خاطر درپردہ خاک چھانٹا پھرتا ہے، وہاں نسل اور خون کی پیدا کردہ بے خبری کو سمجھتا ہے، کسی فرماؤ اور اس کے دوباروں کی دہلی ہی تو چین آمیز بنی ہوئی داشت کرتا رہتا ہے، جیسی کرشمات عروں، بصیرت رکھنے والوں اور محفلوں کے ساتھ رو رکھی جاتی ہے۔ تم آرام زندگی میں ایک ہر ہر ادیب، شاعر اس نے Obolos Rads جیسی نظم لکھی ہو لی نہیں، Lus de Camões جیسا ہوتا ہے یہ اسے اس جیسا ہوتا ہے، اشتراکی کے درمیان، محاریم کے اور مقدس تختہ نگاروں کے درمیان، ماضی کے پسندیدہ سمات و قیاس از وقت و عہد پر

کے ازالہ و اہم کے درمیان، تحریر کے دوران ہونے والے درد و غریب کی تحریک کی سرفروں کے درمیان۔ یہ تھا وہ بھارا دلی، جو ہندوستان سے غصہ کی دھڑکی ہوا تھا، دولت مند بچے کے لیے نہ جانے کتنے لوگ جہاں کا سفر ایشیا رکھتے تھے، یہی تھا وہ سپی، جس کی ایک آنکھ بھی ضائع ہو چکی تھی، جس کی مدد پر بھی رقم نہ پہنچے تھے، یہ تھا وہ رعد نے والا جواب دہاری خواتین کے دلوں کی جھڑکیں شیشوں کے ٹکڑے کا، جس کو میں نے اپنے ایک کھیں "What shall I do with this Book?" میں ادا کار کے طور پر پیش کیا تھا، جس کھیل کے اختتام نے ایک اور سوال پیش کر دیا تھا، بہت اہم سوال، "What will you do with this book?" جس کا شاید ہمیں کبھی جواب نہیں ملے گا۔ یہ بھی اس کا منظر کشی تھی کہ وہ (شاعرت کے لیے)، پناشاہ کار بغل میں دبائے ہوئے پھرنا رہا اور دنیا اس کو روک رہی تھی۔ منظر کشی اور ایک سرگشی کی کیفیت کے ساتھ ہی یہ سوال ہے کہ ہم آج جو کچھ لکھ رہے ہیں کیا مستقبل میں کسی کام کی ہوں گی، ہوں اس لیے گئے ساتھ کرنا یہ ہے عمر سے تک باقی بھی رہیں یا نہیں، (یہ یہ کتنے دن باقی رہیں گی) کیا تو ہمیں اس کا کوئی تعلق پیش جواب دینا چاہیے، یا پھر اپنے آپ کو ہم خود اس کا جواب دے دیے ہیں۔ اس سے بہتر دھکا کھانے والے کہیں ہو سکتا ہے جو خود دہریوں کو دھکا دینے کے اجازت دے؟

لیجے، اب ہم سے سامنے ایک "رخصت" موحود ہے جس کا بایاں، "تھ جگہ کی مڈر ہو گیا تھا، ایک عورت، جو نوکھ کی جہد کے نیچے بھی دیکھنے کی غلطی قوت کے ساتھ اس رشا میں آتی تھی۔" "دی کا" Batazar Maeus ہے، اور اس کی عربیت Seven-Suns ہے، اس عورت کو پچھے Bimunda کے نام سے جانا جاتا تھا اور بعد میں Seven-Moons کے نام سے موسوم ہوئی، اس لیے کہ، لکھا گیا ہے کہ جہاں ایک سورج ہوگا وہاں ایک چاند بھی ہوگا اور یہ بھی کہ محبت کے ذریعے، دلوں کی ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہے، جبکہ موجودگی ہی مٹا دینے کے قابل ہوتی ہے۔ "ہم سے سامنے Bandomeu نامی ایک دور مایا کار پادری کی شخصیت پھر رہی ہے جس نے آسمان پر جانے کے لیے ایسی مشین ایجاد کی تھی جس کو سائنس خدائش کے علاوہ کسی ایجنٹ کی ضرورت نہ ہوتی تھی، وہ خدائش ہی لوگ کہتے ہیں کہ، سب کچھ کر سکتی ہے، مگر جو نہ پتھر کر سکتی تھی، نہ سے مضمون تھا کہ کسی طرح پتھر سنا ہوتا ہے، پھر آج تک اس نے کچھ سنا چاہا ہی نہیں، نہ معمولی مہربانی دار سورج و چاند یا اسی قسم کی کوئی شے بنا چاہا تھا۔ انہوں نے صدی کے یہ ٹین پریمائی حق، اس ملک اور دور میں جہاں قلم پرستی اور تہذیب کے شعلے بلند ہو رہے تھے، جہاں بڑائی کے خیال میں دور چھوڑے پن کے باعث، بات بات پر ہوشیار کی خانقاہیں، ایسے کل حق کر basica تعمیر کرتے تھے، جو دنیا کو حیران کر دیتے تھے، گھر پریمائی کو دیکھنے کے لیے دنیا کے پاس Bamunda جیسی ناقابل قیوس نگاہیں ہوئیں جو سب کچھ دیکھ لیتی تھیں، ظاہر ہو کر خیر۔ اب ہم سے سامنے بڑا افراد کا جیم بھی ہے جن کے ہاتھ محنت کے باعث گندے اور سخت ہو چکے ہیں، جن کے جسم، سال با سال شائع ہونے کی سخت دیوار میں اٹھانے، پڑے پڑے محنتی کمرے بنانے، ستون پستاد کرنے، چابی دار

گھٹنا گھرنے اور basilica کے غر پر گتہ بنانے کے باعث بڑیوں کا اچھا نچا بن چکے ہیں۔ ہم کچھ آوازیں بھی سن رہے ہیں جو Domenico Scarlatti کے ساز harpschord کی ہیں جس کو ٹیڈ بھی نہیں معلوم کر اسے جانتا ہے یا دانتا ہے۔ یہ ہے Bazar اور Blimunda کا قصہ ایک کتاب جس میں ایک زیر تربیت مسیح، جس کی امی کے نام Jerónimo اور دایا Josefa کے زمانے میں تربیت ہوئی تھی، کچھ اس قسم کے شاعرانہ الفاظ لکھ پایا ہے۔ ”موتوں کی باتوں کے علاوہ، صرف خواب ہی جاتے ہیں جو دنیا کو اس کے مار میں محسوس رکھتے ہیں۔ مگر خوب سی اس کو مبتلاوں سے مرمتی بھی کر دیتے ہیں، لیکن وجہ ہے کہ آسمان مردوں کے سر میں چمکتا ہے، بشرطے کہ مردوں کے سر ہی خود ہی دھڑکنا نہ ہوں۔“ اور ہے جو کچھ بھی ہوتا ہے۔

ایک زیر تربیت نوجوان اپنی درسی کتب میں شاعری کے بارے میں کچھ پڑھ چکا تھا، جب وہ لڑکپن کے ایک ٹیکیکال سکول میں داخل تھا، اور اس کو اپنی مزدور کی زندگی کی ابتدا میں میٹیک بنانا تھا۔ عوامی کتب خانوں میں شام کے وقت اس کو شاعری کے بہت سے اسٹوری میسر ہوتے تھے، جب وہ فہرستوں سے پوچھتا ہی بے مقصد شاعری کی کتب نکالتا، اور بغیر کسی رہنمائی کے پڑھتا تھا، ورا ہی طرح بچپن جیسے ہی کھو جاتا تھا۔ وہاں کسی نئی زندگی کے دیوانے پر غرق سے تھراں ہو جاتا ہے۔ یہ اسٹوریٹل سکول اسٹوریٹل کا واقعہ ہے جہاں Ricardo Reis کی موت کا سال منایا جاتا تھا۔ وہ ایک دن اس نوجوان میٹیک کو (جو اس وقت تقریباً سترہ برس کا تھا) Aena نام کا ایک رسالہ نظر آیا جس میں اس کے نام سے کی گئی کچھ شاعری شائع ہوئی تھی۔ چھ سترہ اپنے ملک کے ادبی نقشے سے ہم واقفیت رکھتا تھا، وہ سمجھ کر شاید Ricardo Reis نام کا وہی پرکاشی ہوگا جو شاعری کرتا ہے۔ بہر حال، جدیدی اس کو پتا چل گیا کہ شاعری کرنے والے اصل میں Fernando Nogueira Pessoa تھا۔ وہ غرضی ماسوں سے بچے کھے ہوئے اشعار شائع کر داتا تھا، اور ان ماسوں کو heteronyms کہتے تھے۔ جب کہ اس قسم کا کوئی لفظ اس وقت کی لغات میں موجود ہی نہیں تھا۔ اس نوجوان نے Ricardo Reis کی کئی نظمیں یاد کر لی تھیں۔ ”To be great, be one/Put yourself into the little things you do“ مگر بہت کم عمر اور حالات سے نا آشنا ہونے کے باوجود وہ اس بات کو قبول نہیں کر پاؤ تھا کہ ایک برتر دماغ، بغیر کسی مدد کے ایسی خامانہ مصرعے بھی لکھ سکتا تھا۔ ”Wise is he who is satisfied with the spectacle of the world“۔ بعد میں، بہت بعد میں، جب اس کا لیب علم نوجوان نے، جس کے باب اب پیپر ہو چکے تھے اور اپنے طور پر عقل مند ہو گیا تھا، ایک ماہی لکھنے کی ہمت کی، اس شاعر کو 1936 کے کچھ ڈیرٹ ٹیگز مناظر دیکھنے کے لیے جہاں وہ، اپنی بقیہ زندگی گزارنے کے لیے قید کر دیا گیا تھا۔ ماسی جرمی کے زیر تسلط رہاؤن لینڈ (Rhuneland) کے، ہسپانوی جمہوریہ کے خلاف Franco کی جنگ کے خلاف اور Saezar کی تیاری ہوئی پرکاشی فرسٹائی میٹیک کے خلاف۔ ان لحاظ میں اس نے شاعر کو اسی کے مصرعے کی گونج میں جواب دیا تھا۔

"Here is the spectacle of the world, my poet of serene
business and elegant scepticism
Enjoy, behold, since to be strong is your wisdom."

اور پھر Ricardo Reis کی موت کا سال ان اداس الفاظ میں اختتام کو پہنچا "Here where
the sea has ended and land aways"۔ مکیب پر پٹنگل کے لیے کوئی رہائش نہیں ہوگی، ایسے
مستقبل تک، جس کا نہ کوئی انت ہے نہ تصور، بس ایک خام نویت کی بے رنگی ہوگی، وہی پرانا saudade
اس سے بھی کچھ زیادہ۔ پھر ٹائٹلرو سمجھ کر جہازوں کو سمندر میں بھیجنے کا کوئی اور طریقہ ضرور ہوگا، مثال کے
طور پر، خورد زمین کو سمندر تک سے جہاں۔ چرپ کی تاریکی عمارت پر پٹنگل کے اچھا لگی ٹیسے کے ٹکھار میں
(اس کو میرا پنا غصہ بھی کہہ جاسکتا ہے) میں نے، ایک ماول ایچاقی The Stone Rat (پتھر کی کشتی) جس
میں ہسپانیہ کے جزیرہ نما کو پانی پر تیرتے ہوئے، ایک بڑے سے تیز بڑے کی مانفد براعظم یورپ سے
معاہدہ کر لیا تھا، جو بغیر چین کے بغیر ممالک کے بغیر دھکیلنے والے ہتھیاروں کے جنوب کی سمت "پتھر اور
زمین کا ایک بڑا سا تودہ، جس پر شہر، گاؤں، دریا، جنگل، جہاز جھکاؤ، کارخانے، زرعی قطعات تھے، اپنے
جانوروں اور انسانوں سمیت" واں تھا، ایک بڑے یونانی کی طرح۔ میری حکمت عملی تو اس حد تک تھی کہ
اتحاد کے دوسرے جانب کے باشندوں کا جزیرہ نمائی نوکوں کے ساتھ سماجی اتصال ہو، ورنہ اس طرف
ریاست ہائے متحدہ امریکا کے محکمہ خزانے والے راج سے مقابلہ ہو۔ ایک دہرا یونانی تصور اس سیاسی
افسانے کو ایک نیا وہ کشادہ دل انسانی استعارے کی طور پر دیکھتا تھا جو دنیا کے قوانین کو بدلتا رہے رکھے کے
لیے، اس کی پرانی اور حالیہ نوازا بیاقی نیاہتیوں کے ہر جانے کے طور پر، سارے یورپ کو جنوب کی جانب
جھکنا دیکھ بھال تھا، بالآخر، یہ تھا یورپ، ایک اخلاقی حوالے سے۔ "پتھر کی کشتی" کے کرداروں میں جیسے جیسے
جزیرہ نما سطح سمندر پر خط بنانا ہوا اسے بڑھ رہا ہے، دو ٹوٹیں، تین مرد اور ایک عورت، مسلسل سفر میں ہیں۔ دنیا
جوں جی ہے اور وہ جانتے ہیں کہ انھیں اپنے آپ میں سے (مٹنے سے قریب نظر ہے اس لیے کہ وہ عام مخلوقوں
کی طرح نہیں ہے) ان کے اندر اور بیرون میں ہے مستقبل میں جن کا روپ خود انھیں ہی دھارنا ہے۔ اس ان
کے لیے بھی کافی ہوگا۔

پھر زیر تربیت ٹائٹلرو باوا آ کر ایک زمانے میں وہ ایک پروف پڑھنے والے کے طور پر کام کر رہا
تھا، اور صرف کہنے کی حد تک، اگر اس نے "پتھر کی کشتی" کے مستقبل میں تبدیلی کر دی ہوگی، اگر چاہے
مستقبل میں تبدیلی کر دینا معیوب نہیں رہا، ایک ماول ایچاقی جس کو زمین کے محاصرے کی تاریخ پکارا
جائے جہاں ایک پروف پڑھنے والا، اس عنوان کی، ٹھیک جتنی تاریخی کتاب کی چھاپ میں آئے وقت،
اور یہ دیکھتے ہوئے کہ تاریخ کم سے کم خیرات کہنے والی ہو رہی ہے، تاریخی صداقت کے قدار کو زیر و
زیر کرتے ہوئے، فیصلہ کرتا ہے کہ ایک "ہاں" کو نہیں "میں تبدیلی کر دیا جائے۔ زیر تربیت ٹائٹلرو

Ramundo Silva ایک مردہ انسان، ایک عام آدمی ہے جو غیر متغیر سے اس طرح مختلف ہے کہ اس کے نزدیک تمام اشیاء کے نعر آنے والے اور نظر نہ آنے والے، کئی پہلو ہوتے ہیں اور یہ کہ ہم ان کے دوسرے میں کچھ نہیں جان سکتے جب تک کہ ہم دونوں قسم کے پہلوؤں کو دیکھ نہ سکیں۔ لہذا وہ مثلاً مردہ پروف پڑھنے والا، ایک تاریخ دان سے ان الفاظ میں گفتگو کرتا ہے: ”میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ پروف پڑھنے والے سنجیدہ دُک ہوئے ہیں، زندگی اور ادب کے معاملات میں بھی بہت تحریر کا رعبوتے ہیں، اور یہ نہ بھولیں کہ میری اپنی کتاب حیات بھی تاریخ سے متاثر کرتی ہے۔ پھر بھی، چوں کہ میں دوسرے اختلافات کی طرف اشارہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا، جناب اور میری مؤذوب رائے میں، مردہ تھو جو اب نہیں ہوتا زندگی ہوتا ہے، تاریخ بھی، اور انھیں تاریخ، اور مصوری، اور موسیقی، موسیقی و ادبی سے ہزار شاہ رانی ہے، یہ آئی جانی رانی ہے، اور میرے خیال میں رنگ کی بنا پر اپنے آپ کو دنیا سے آزاد رکھنا چاہتی ہے۔ درمصر دئی، ادب کے سو اور کچھ نہیں جس کو ہم شے سے تخلیق کیا گیا ہو۔ مجھے یقین ہے، آپ بھولے نہیں ہوں گے کہ نئی ڈیٹا سائنس سمجھنے سے پہلے سے مصوری کر رہا ہے۔ آپ نے یہ مقالہ لکھا ہوگا کہ اگر آپ کے پاس کچھ نہ ہو تو بلی سے کھانا کیجیے۔ دوسرے نقوشوں میں جو ”دلی آکسائڈ“ جیٹا وہ پکوں کی طرح خاکے یا تصویریں بناتا ہے۔ گویا، دوسرے نقوشوں میں یہ کہنا مقصود ہے کہ ادب اپنی پیمائش سے پہلے ہی وجود میں آچکا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ اپنی ملا جلیوں کو خواہے ہیں، آپ کو فلسفی اور تاریخ دان ہونا چاہیے تھا، آپ ان ملا جلیوں کے لیے ادب اور ادب اور مزاج رکھتے ہیں۔ اور جناب والد، میں تو کسی تربیت سے محروم رہا ہوں، اور مجھ جیسا بچہ ہوں، بغیر تربیت کے کیا کر سکتا ہے۔ میں ضرورت سے زیادہ خوش قسمت ہوں کہ میں اپنی گنج genes کے ساتھ (جس میں ایک خام کیفیت میں) اس دنیا میں آیا ہوں، مگر ابتدائی اسکول سے زیادہ تعلیم حاصل کیے بغیر۔ آپ چاہتے تو اپنے آپ کو اپنی کوششوں سے بولنے والے خود آموز کے طور پر پیش کر سکتے تھے۔ اس میں کوئی شرم کی بات نہیں، اس لیے کہ سائنس نے مانی میں اس قسم کے خود آموز فراہم کر رکھا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ ترقی نے ان سب پر تدفین لگا دی ہے، اب خود آموز لوگوں کے لیے طور یوں پر عمل نہیں پڑتے۔ سب تو صرف ان ہی دعووں کو جو ہچسپ اشعار اور اف نے نکلتے ہیں، حل ہوتا ہے کہ وہ خود آموز خود آموز کہیں، اور وہ خوش قسمت ہیں۔ جہاں تک میرا سوال ہے تو مجھے اس اعتراض میں ہاگ نہیں کہ مجھ میں ادبی تخلیق کی کبھی صلاحیت نہیں رہی ہے۔ کیوں نہ آپ ایک فلسفی بن جائیں، آپ میں جس مزاج بھی ہے، جس میں ایک مخصوص نوعیت کا خطر چھپا ہوتا ہے۔ اور میں خود اپنے آپ سے یہ سوال کرتا چاہتا ہوں کہ تم تاریخ (اسی کے پرستار ادب سے ہونگے) کہ یہ تو ایک سنجیدہ اور عیسائی شخص ہے۔ میں صرف حقیقی زندگی میں طعنہ آمیز ہو جاتا ہوں اور مجھے ہمیشہ ایسا لگا ہے کہ تاریخ حقیقی زندگی نہیں ہوتا، مگر ادب ہوتا ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ مگر تاریخ ان حقیقی زندگی ہو سکتی تھی جب اس کو تاریخ نہیں کہہ جاسکتا تھا تو، جناب والد، یقین کیجیے کہ تاریخ حقیقی زندگی ہے۔ جی ہاں، اس سے میری مراد یہی ہے کہ

تاریخ حقیقی زندگی تھی۔ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں۔ ”یہودیوں کا ہونا“ (دیکھو وہ حرف) deieaur نہ ہوتے۔ ”پردہ پہننے والے نے ایک سرور آدھ بڑا کیا۔ یہاں اس کا اضافہ مبالغہ ضروری ہوگا کہ پردہ پہننے والے نے ایک سبق سیکھا تھا، شکایت کا سبق۔ اور سچا وقت پہنکھا تھا۔

گویا یہی حقیقت کا مستحق تھا جس کو سیکھ کر اس نے The Gospel According to Jesus Christ بھی تھی۔ یہ سمجھ بھی ہے، اور اس نے خواہ کب بھی ہے، کہ یہ عنوان ایک بھری سرب کا نتیجہ تھا، لیکن یہ پوچھنا مناسب ہوگا، کیا یہ پردہ پہننے والے کی ایک سرور کی مثالی ہوئی جو ہمہ وقت، اس زمین کی تیاری میں رہا جہاں سے نئے ماؤں کا چشمہ پھوٹنے لگا تھا، اس، مریضے پر تعمیری تصدیق خوشی میں مہمداں (New Testament) کے صفحات پھٹنے کی نہیں بلکہ ان کی سطحوں کو چاڑھ کر نئے، ایک رنگوں سے بنائی تصویر کی طرح، جس کے کوچے، نقوش، اور شیبہ و فراز کے پڑاؤ کو واضح کرنے کے لیے ہلکی سے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح اس شاندار نے پہنچا تھا، جو اب عجیبی آوازوں کے چہرے میں تھا، گویا یہ پہلی بار ہوا تھا کہ معصوم لوگوں کے قتل عام کا بیان اس کی نثر سے گزر رہا تھا، جس کو پڑھ کر بھی وہ سمجھ نہ سکا۔ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ اس مذہب میں شہداء کیسے مرنے لگے، جس کے اعلان کا پہلا لفظ بھی، اس کے بنیاد گزاروں کے ہاں سے نہیں گزرا ہوا تھا۔ اس کو سمجھ سے یہ بھی باہر تھا کہ عرفہ وہ شخص جو چھ کریم تھا، اس نے بھی Bethaehem کے بچوں کی جان بچانے کی ہمت نہیں کی۔ بچے اہل فاندان کے سرور مصر سے فرار کے بعد (حضرت) یوسف کے احساں نے دے داری کو، مدت کی حرم کی حقیقت جس میں کتاب کی کو بھی وہ سمجھ نہیں سکا۔ اس بات کو بھی مانا نہیں جاسکتا کہ یسوع مسیح کی جان بچانے کی خاطر Bethaehem کے بچوں کی جانیں قربان ہونی ضروری تھیں۔ یہ تو بالکل سادہ کی بات ہے، جس کا اطلاق انسانی اور خدائی معاملات پر بھی ہونا چاہیے، کہ خداوند عالم اپنے بچے کی بالخصوص انسانیت کے گناہوں کو بخٹوانے کی خاطر، روئے زمین پر بھیجنا نہیں کہ وہ کسی کی عمر میں اس کا سر Herod کے ایک سپاہی کے ہاتھوں قلم ہو۔ نہایت ڈرامائی انداز میں لکھی ہوئی شاندار کی اس انجیل میں، Joseph اپنے حرم سے واقف ہوگا، اپنے حرم کی پاداش میں نہ صرف وہم ہوگا بلکہ بغیر کسی جبر کے مزائے موت پائے گا، گویا وہ چھوڑنے سے پہلے ہی کے لیے اس کی سمجھ دے گا، مگر یہاں ہونا، شاندار کی حرم پروردگار خدا اور اس کے نیک بندوں کی ایک اور داخلی طاقت نہیں، بلکہ چند انسانوں کی داستان سے جن کی حالت سے جنگ پر مجبور کیا جاتا ہے جس کو شکست دینا ان کے بس کی بات نہیں۔ یسوع، جس کو وراثت میں وہ خاک بھری چھپیں ملیں گی جس کو چھین کر اس کا باپ ملک کی کئی عزمیں پر مارا مارا پھرتا رہا تھا، وہ ملے میں احساں حرم بھی اور الم اقمیر احساں نے درمی بھی پائے گا جو کبھی اس کا بچہ نہیں چھوڑیں گے، اس وقت بھی نہیں جب وہ صلیب کی ہند کی سے پکار کر کہے گا، ”لوگو! اس کو معاف کرو“ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ اس نے کیا کیا ہے“ (جملہ) بلاشبہ خدا کے بارے میں ہے جس نے اس کو باں بھیجا ہے، لیکن شاید، وہ ان ۲۲

نجات کرب میں اپنے اصل باپ کو یاد دہا رہا ہے جس نے گوشت و پوست میں اس کو پیدا کیا تھا۔ جس کہ آپ دیکھ سکتے ہیں، شاگرد ایک عموں مفرطے کرچکا تھا، جب اس نے پتا چھاندہ نیکل میں مہادت گاہ میں ہونے والی گفتگو کے وہ آخری الفاظ تحریر کیے تھے جو یسوع اور کھنے والے کے درمیان ادا ہوئے تھے۔ ”میرم ایک بھیڑیہ ہے جو ہرپ کو ہرپ کرنے کے بعد، اس کے بچے کو بھی کھا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہی بات کہہ کر ہے، وہ میرے باپ کو پیسے میں ہرپ کرچکا ہے، اور بعد تباہی ہوئی بھی آئے گی۔ اور تمہارا کیا خیال ہے، یہ تم بھی ہرپ کیے گئے تھے۔ صرف ہرپ ہی نہیں کیے گئے، بلکہ انگی بھی دیے گئے تھے۔“

اگر شہنشاہ Charlemagne نے شمالی جرمنی میں ایک خانقاہ نہ قائم کی ہوئی، اگر وہ خانقاہ St Munster کے شریک ابتدا کا باعث نہ ہوئی ہوئی، اگر Munster شہر کے پاس میں نے پروٹسٹنٹ عیسوی شریعت کے چروکاروں اور کیتھولک کے درمیان سلخوین معدنی میں ہونے والی خوف ناک جنگ کے ایک اور پیر کے ذریعے پتی بارہ سووی سائیکل نے منافی بیٹی تو یہ شاگرد Nomine Dei میں پناہ لیا تھا۔ کبھی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک بار پچیس، کسی بار بعد کے بغیر، سوائے اپنی محنت کی ایک خلیفہ کی روشنی کے شاگرد کو بندہ ہی عقائد کی جھجک بھول بھلیا میں داخل ہونے کا موقع مل گیا، وہ عقائد جو کئی آسمانی سے منسوب کو قائل اور مقبول بنا دیتے ہیں۔ اور اس نے ایک بار پھر کیا دیکھا، تنگ نظری کا اور انکار نقاب، اسی تنگ نظری جو Munster میں ایک جنرل بھان بن گئی، اسی تنگ نظری جس نے خود اس نظریے کی توثیق کی، دونوں فریق جس کے دفاع کے دیوے کربہ تھے۔ چونکہ وہ دشمن خدا کی کے درمیان نہیں بلکہ اسی یک خدا کے نام پر جنگ کا مسکن تھا اس لیے، اپنے ہی عقائد کے اندر سے، عیسوی شریعت کے پیرا کار اور کیتھولک، دونوں تمام اثبات میں سب سے زیادہ واضح ثبوت کو دیکھنے کے قائل نہ تھے۔ یوم حساب میں، جب دونوں حریف آگے بڑھ کر اپنے ان اعمال کے عوض، جو انھوں نے دیئے زمین پر کیے تھے، نعام و عزا جس کے مستحق ہوں، پارہے ہوں گے، اور مر، اس دن، خدا کے فیصلے بھی انسانی منطق جیسی منطق کے زیر اثر ہوئے تو خدا کو ان سب کو جنت میں داخل کرنا ہوگا، صرف اس مادہ سے اصول کی بنیاد پر کہ دونوں ہی ان (عقائد) پر یقین رکھتے تھے۔ Munster میں ہونے والے ہشت ماک قتل عام نے شاگرد کو یہ بھی سبق دیا ہے کہ تمام مذاہب یا وجود یکہ وہ یا دھڑے کرتے ہیں، سناٹوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے بھی استطاعت نہیں کیے گئے، کہ جتنوں میں سب سے نامناسب جنگ وہ ہوتی ہے جو مذہب کے لیے کر جائے، اس خیال کے پیش نظر کہ اگر خدا چاہے بھی تو خود اپنے خلاف جنگ کا اعلان نہیں کر سکتا۔

کوہ چشم شاگرد سمجھا کہ ”ہم سب کو چشم ہیں“ اور اس نے بیٹھ کے کوہ چشمی کا لفظ تحریر کیا، ان لوگوں کو یاد دہانے کے لیے جو شاہ اس کو پڑھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ جب ہم اسباب کی غلط تامل کرتے ہیں تو زندگی کو ذلیل کرنے ہیں، کہ ہماری دنیا کے لیے اختیار و طاقت کے باطنوں پر روز انسانی شوکت و عظمت کی توثیق ہوتی ہے، کہ اتفاقی کدب نے جمالی مصلحت کو جگہ سے لی ہے، کہ انسان نے خود

پہا احترام کرنا بند کر دیا ہے، جب اس نے اپنی مرتحنی مخلوق کا احترام کرنا چھوڑ دیا۔ پھر اس ٹٹا مرد نے، گویا، وہ اسباب کی غلط تاویل سے پیدا ہونے والی کورجٹھی کے ذریعے اس آسپ کو درد مند بنائی دیتے کی کوشش کر رہا ہے، اس ن قرین قصے لکھنا شروع کر دیا ہے۔ کیا کوئی دوسرے کوشش کر رہا ہے، اس لیے کہ اسے حساس ہو چکا ہے کہ زندگی کے پاس انسان سے بننے کے لیے اس سے نیا نہ سمجھ اور کون کام نہیں۔ کتاب کا عنوان ہے All the Names۔ تمام غیر قرین شدہ ہمارے ہمارے نام اس میں موجود ہیں۔ زندہ لوگوں کے نام، اور مرے ہوئے لوگوں کے نام۔

میں اب اپنے خطاب کو ختم کرنا ہوں۔ جس آواز نے یہ صفحات پڑھے ہیں، اس کی خواہش ہے کہ میرے تمام کردار اس کی آواز سے آواز ملائیں۔ میرے قبضہ قدرت میں تھی اور نہیں جتنی آوازیں ان کے پاس تھیں۔ مجھے مخالف فرمایئے، اگر جو کچھ آپ کے نزدیک معمولی تھا، میرے نزدیک وہی سب کچھ ہے۔



دار یوفو

امتراف کمال۔ جو قرون وسطی کے مسخروں کا دلچسپ و حاد کرشمہ رکھ کر پیش کرتا ہے اور پامالی شہر
انسانیت کی عزت نفس بحال کرتا ہے۔

مسخرہ بننا ہمیشہ سے ایک مشکل کام رہا ہے۔ قرون وسطی کے سوینڈن کے قوانین ہاتھ سے تھے کہ
پڑوسی کے گھول کے کسی دشمن سے ہر باتھ اٹھانے کی پاداش میں سمجھ جانا ہوتا تھا، اس لیے ہی ملک کے کسی
دوسرے سے ساتھ ایک ہی نیا دلی پر نیا وہ سخت مزاحمت تھی جب کہ کسی مسخرے کی چٹائی پر کوئی باز پرس نہیں ہوتی
تھی۔ تیرہویں صدی کے قانون کے مطابق، اگر کسی مسخرے کو صوف مارا جاتا تو اس کو جرم نہیں سمجھا جاتا
تھا، ہاں اگر مسخرے کو کسی قسم کی جسمانی گزند پہنچتی ہو تو گزند پہنچنے والے کو اتنا ہی جانا دیا کرتا ہے کہ
بتے کہ مسخرہ اب الہ کا گھبراہٹ ہوا ہو۔ دار یوفو قرون وسطی کے ان ہی مسخروں کے حوالے سے تحقیقی تحریک
ہی جن کے لیے قانون کوئی تحفظ فراہم نہیں کرتا تھا۔ دار یوفو کے مطابق غلطی نشان پر سب سے زیادہ اثر
انداز ہوتا ہے۔ قہقہے، اور خجیدگی کے دلچسپ کے ذریعے مانگھتی اور بدسلوکی کی سچا بیاں گھنٹا ہی دار یوفو
کا انداز اظہار ہے۔

لڑانا فوئیس اوراوا کاردار یوفو 26 مارچ 1926 کو اٹلی کے ایک چھوٹے سے شہر ریگو میورے (Lago
Maggiore) کے ایک بچے کے ہاتھ سے گھرانے میں پیدا ہوا۔ دار یوکا دلچسپ قہقہے اور بچہ ایک اشتراک تھا جس کا

فریجہ معاشی ریوے کی انٹین ماسٹری تھا۔ سب کی ماں بھی دسبج کی قائل اور فوٹین قانون تھی۔ داریو کی ماں Pina Rosa کی قابلیت کا ثبوت اس کی غیور فوجت ہے جو بیویوں صدی کے مساویں عشرے میں شائع ہوئی تھی۔ گودادسب س کی گھنٹی میں پڑا تھا۔ داریو نے فرانکا رامے (Franca Ramo) ماں ایک اور کارہ سے شادی کی جو خردا ملی کی ایک مشہور شخصیت ہے۔

داریو کا دوا گھوڑے گاڑی پر عام استعمال کی مختلف اشیاء اور فزیت کس کے رہائی کھانا تھا۔ گاؤں کو اپنی جانب متوجہ کرنے اور اپنا مال بیچنے کے لیے وہ جرن کر دینے والے فی اہد بہد قصے شانا ورن میں مقامی خبریں، علاقائی چٹھے میں پوسٹ کر دینے والے ہر تن کوئی ہو کر اس کی جانب متوجہ ہو جاتے۔ داریو اپنے دادا کی گھوڑا گاڑی پر بیٹھا سب کچھ سننا رہتا اور غائبائیں سے اس نے بیانیہ سیکرہ س کی رانی اور ملانہ داستان بھی سیکھ داریو کا دلپ رلوے میں ہونے کے، عث شہزاد شہزادہاں کے لیے س کی مختلف ماحول میں رہنے کے تجربات ہوئے۔ داریو شام کے شراب خانوں اور رستورنوں میں جا بیٹھا، مای گیسوں اور بلور کے کاشیوں کی رانی داستان بھی، جو مای سیاہی طرز سے ٹھہری ہوئی، سنا اور مٹھوٹا ہوتا تھا۔

داریو نے 1940 میں اٹلی کے مشہور شہر میدن میں قائم ہدیا ۲۰ صت کینڈینی میں داخلہ لے لیا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ داریو کو اٹلی کی فوج میں جبری بحری کرلیا گیا تھا مگر کچھ دنوں بعد وہ فوج کی ملازمت سے قرار ہو گیا اور جنگ کے آخری دنوں میں فوج کے ہکاروں سے پشیدہ رہنے کے لیے کئی ماہ تک وہ ایک گودام کی دھچکتی میں چھپی رہا۔ داریو کا والد اٹلی پر مسلط سویشی کی آمریت کے خوف جہد جہد میں مصروف رہا۔ اس نے بہت سے یہودی سائنس دانوں اور صحافیانہ کے جنگی قیدیوں کو سوئٹزر لینڈ لے کر ہونے میں مدد بھی دی تھی۔

جنگ عظیم کے اختتام پر جب آمریت نازل پڑی تو داریو اپنی تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے میدن واپس پہنچا اور اس نے فوٹین تعلیم کی تعلیم کے لیے اپنی فینک میں داخلہ لے لیا مگر کچھ دنوں بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ داریو نے فوٹین غیرت کی تعلیم شروع کر دی اور اس کی تحسین کے بعد اپنی تعلیم کی مہارت کو تحسیر کے سٹیج جانے اور اس کی تزئین میں استعمال کرنا شروع کیا۔ اس دوران اٹلی میں تحسیر ایک حقیقی انقلاب سے دوچار ہو رہا تھا جس میں چھوٹے چھوٹے عوامی تحسیر مذاہج پڑے تھے۔ داریو اپنی مسرت کے باوجود تحسیر دیکھنے جایا کرتا تھا۔ تحسیر کے اسٹیج جانے کے کام کے دوران داریو اپنے ساتھیوں کو بچپن میں سے ہوئے قصے اور داستانیں طرز سے لے کر سنا تا۔ داریو نے 1950 کے موسم گرما میں اٹلی کے ایک مشہور تحسیر ڈائریکٹر سے رابطہ کیا اور ہاتل فائیل کے قصے کی تحسین کو طرہ فزیت انداز میں شاکر تھا متاثر کیا کہ اس نے داریو اپنے تحسیر میں غیرت کی دعوت دے دی جو اس نے فوراً قبول کر لی۔

داریو اپنے دور کے عظیم ادما مٹھانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے بے شمار دوسرے کھمبہ دنیا کے سر سے برا غصوں کے قانون سکوں میں داریو کے قہیل جس کے جہر عصر لکھنے والوں کے مقابلے میں سب

سے نودہ اور مشہور تھیٹروں میں پیش کیے گئے ہیں۔ اپنے ڈراموں کے ذریعے وہ ذات کی بات میں تھیں، تعقل اور مہانت کے اچھوتے استراق سے معاشرے میں ہونے والی مبالغوں اور ان کے وسیع تاریخی مناظر کو کھلتا ہے اور اپنے ماہرینی و مسکین کو تعمیر کرتا ہے۔ درپوش ذات میں ایک نہایت سنجیدہ طنز نگار پوشیدہ ہے جو آزاد خیال ہونے کے ساتھ ساتھ غافل نگاہ بھی رکھتا ہے اور اپنے خیالات کے ظہار کے رد عمل میں ہونے والے خطرات سے چشم پوشی نہیں کرتا۔

نارو کے مشہور ترین کھیلوں میں *More Accidentale di un anarchico. Mastro Bufo* یعنی ایک انارکسٹ کی حادثاتی موت اور *Non si paga. Non si paga* یعنی نہ ہم دے سکتے ہیں نہ ہم دیں گے۔ *Trumpets and Raspberries* اور *The Devil with Boobs* قابل ذکر ہیں۔

ضیافت سے خطاب

اگرچہ میرے ہاتھ میں کوئی جام نہیں پھر بھی میں کافی مرتبہ۔ ملکہ کرینا کی یاد میں، جو ماضی میں آپ کی ملکہ تھیں جام نوش کرنا چاہتا ہوں۔

سترہویں صدی کے آخر میں ملکہ کرینا، اعلیٰ تشریف لائی تھیں۔ جیسا کہ کوئی پہنے بھی کہہ چکا ہے کہ وہ بوم آئیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح ان کی مہلات، پاپائے اعظم، کیسے مڈم شمع سے ہوتی۔ وہ (پاپائے اعظم) پہنے شخص تھے جو شہر کے کھنڈروں کی تہذیب کو دوری حیات دینا چاہتے تھے۔ "متوازن، عمدہ" کے خلاف رد عمل چند سال پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ انیسواہریں کی دینی خواہش تھی کہ "متوازن اصلاح" کے ہونگے ہوئے تھیٹر کے دن واپس آجائیں۔ اسی کوشش میں کرینا کی اہلی کے عظیم مستحروں سے ہم دور ہوئی، کہہ نا کہ اپنے وطن واپسی کا اجازہ مل گیا تھا۔

وہ (ملکہ) تھیٹر کی ولعادہ تھی، اور ان اداکاروں کی معرفت تو وہ تھیٹر کی اسیری ہو گئی۔ اپنے ڈانس کے سفر کے دوران اس نے *Molière* سے شناسائی بھی ہو گئی تھی، اہلی واپسی پر جس سے اس کی حد کتابت شروع ہو گئی تھی۔ ایک بار *Molière* نے اس (ملکہ) کو پناہ فراہم کی۔ *Taruffe* بھی دیکھا تھا۔ گھر وہ مکمل نہ تھا۔

کرینا نے *Molière* سے اس کھیل کو اہلی میں پیش کرنے کی اجازت چاہی، وہ اس نے پاپائے اعظم کی رضامندی بھی حاصل کر لی تھی۔ پاپائے اعظم نے، جو نہایت خوش مزاج انسان تھا، کہا تھا "آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

ڈی ہیں کہ اس مزاح سے میرا تجربہ بڑی نہ رہے یہ سب cardinal مل کر مجھ کو نکال دیتے ہیں گے۔“
 گھر Motere اپنا مزاحیہ کھیل کر ملیا کی بڑی نہیں کر سکا اس لیے کہ باہتمام خود اس کو چھوٹا تھا۔
 کھیل، Tarulie، کھلی بار کھینچا تھا۔ اگرچہ وہ کھیل نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک ایسا مزاح تھا جو اپنے دور
 کے لیے کافی پر شدید طنز تھا، ہاتھوں کے تھوکانے کی بول کاری پر، جوانان کے خاندانوں میں مزاحیت مرقی تھی۔
 اس کھیل نے بجای مچی دی۔ اس پر بہت لمبے دے ہوئے اور تین برس کے لیے پابندی لگا دی گئی۔
 کچھ دنوں کے لیے اس کو پھر پھینک دیا گیا، اور پھر کئی برسوں کے لیے اس پر دوبارہ پابندی لگا دی گئی۔
 تو سنا کہ چاہتا ہے کہ گھر یہ کھیل کر ملیا کو دے دیا جائے اور اگر وہ اس کو بروم میں کھینے چاہے گا
 تقاضا کر دیتی تو کسی کو اس پر پابندی لگانے کی ہمت نہ پڑتی کہ۔ عیناً۔ پاپائے اعظم کی حمایت حاصل تھی،
 اور بعد پاپائے اعظم سے کون تھر لے سکتا تھا؟
 سہ اس شام کھڑے محترمہ و شہزادگان سے میری استدعا ہے کہ اگر آپ قہقہہ نہ پسند کرتے ہیں تو،
 اس کی ویسے ہی سر پرستی فرما کیں، چھٹی کہ یہ عین نے کی تھی۔
 میں جانتا ہوں۔ کیا آپ نے اپنا لطیفہ سنا دیا ہے؟ آپ نے میرے چھٹی ہونے کو دیا ہے؟
 بھی نہیں۔ بھی نہیں؟ میں ٹھیک ہے۔ میں ٹھیک ہے!
 جیسا کہ میں گہرے ہاتھ، جب قہقہہ ہو جائے، بے سرو پا ہو جائے، پانی سر سے اوتھا ہو جائے
 تو آپ کو اس کا دفاع کرنا چاہیے اس لیے کہ قہقہہ لوگوں کو خوش رکھتا ہے، قہقہہ انسان کی ضرورت ہوتا ہے۔
 اور اگر آپ کو کوئی مشکل ہو تو پاپائے اعظم سے درخواست کیجیے۔ بلاشبہ آپ کا مطالبہ ہوں گے۔
 کھڑے کر لینا کی ہے۔

خطبہ

مخبروں کی خدمت میں جو توہین کرتے ہیں اور تذلیل بھی

Agains: jesters who defame and insult وہ قانون سے جو شہنشاہ فریڈرک دوم نے
 جاری کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ مخبروں کے خلاف تھوکانے کا استعمال کرنے والے کو کوئی مزاح نہیں دی جائے گی۔
 اس خطبے کے دوران میں جو تصویریں آپ کو دکھائی گارہ میری ہی بنائی ہوئی ہیں۔ ان کی نقل، جو
 آپ میں سے زور کم ہیں، آپ حضرات میں تقسیم کر دی گئی ہیں۔

بچہ دنوں سے میری یہ عادت ہو گئی ہے کہ میں اپنی تقریر کی تیاری میں خاصے استعمال کرتا ہوں بجائے اس کے کہ میں اس کو کھوں میں پیشکش کرتا ہوں۔ اس طرح مجھے فی البدیہہ تقریر کا موقع ملتا ہے ساتھ ہی میں بے تکلیف کو بھی استعمال کرتا ہوں اور آپ کو بھی اس کا موقع دیتا ہوں۔

جیسے جیسے میں آگے بڑھوں گا، آپ کو بتاؤ گا چاروں کا جب ہم مسودے سے دست کریں گے۔ اس طرح مسئلے کی ذرا آپ کے ہاتھ سے پیچھے لے لی نہیں۔ اس سے نگوں کو آسانی ہوگی جو ان لوگوں پر سوشلسٹ زبان نہیں سمجھتے۔ انگریزی بولنے والوں کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ناخوش ہوگا اس لیے کہ وہ لوگ ان چیزوں کو بھی سمجھ نہیں سکتے جو نہ میرے ذہن میں آتی ہیں اور نہ میں نے کی ہوں گی۔ مگر ہم نے سب سے دو قہقہوں کا مسئلہ ضرور ہونا چاہیہ۔ جو لوگ طاوکی زبان سمجھتے ہیں وہ فوراً نہیں دیں گے کہ انھیں سوشلسٹ زبان میں Anna [Barson] کے ترجمے کا انتہائی پسند آتا ہے گا۔ دوسرا سب سے لوگ جو یہ فیصلہ نہیں کر سکیں گے کہ وہ پہلی بار سنتے کی پسند ہیں، یہ میری بار۔

ہر حال اب ہم (پہلی بات) شروع کرتے ہیں۔



خواتین و حضرات، اس مختصر سی گفتگو کے لیے جو عنوان میں نے منتخب کیا ہے وہ 'contra jogulatores obloquentes' اور شاید آپ سب چاہتے ہیں کہ یہ لاطینی، بلکہ ان وسطی کی لاطینی زبان کی عبارت ہے۔ یہ عنوان قدیم قانون کا جو 1221 میں شہنشاہ Frederick II of Swabia نے (جس کے دربار میں ہمیں سکول میں پڑھا گیا تھا کہ نہایت روشن خیال، آزاد و "خدا کا برگزیدہ" شہنشاہ ہے) سکول میں جاری کیا تھا۔ 'Jogulatores obloquentes' کا مطلب ہے "مستحضرے جو بدنام کہتے ہیں، توہین کرتے ہیں"۔ مذکورہ قانون ہر بد شگوارے کو اختیار دیتا تھا کہ وہ مستحضرے کی توہین کر سکتا ہے، ان کی پٹائی کر سکتا ہے، اور اگر چاہے تو ان کو قتل بھی کر سکتا ہے، مگر اب کوئی مزاحمتیں دی جائے گی، حتیٰ کہ انھیں کچھ کہہ بھی نہیں جائے گا۔ اس فوراً یہ یاد دینا چاہتا ہوں کہ یہ قانون اب لاگو نہیں ہے، اس لیے میں آہستہ سے

آگے نہ دھکتا ہوں۔

لٹا قہقہے و حضرات!

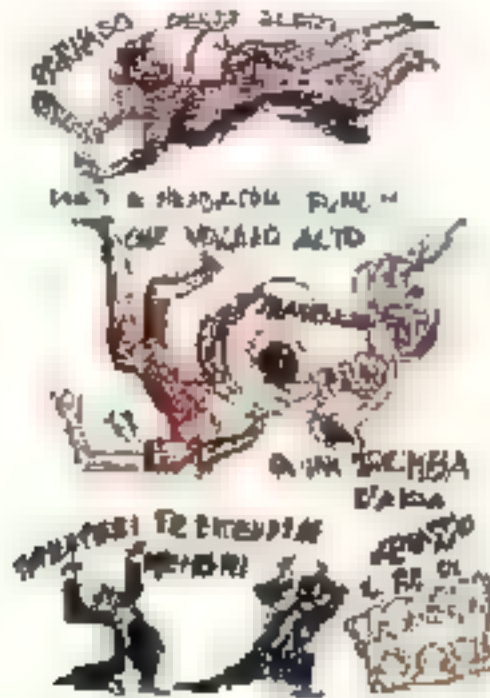
میرے دوستوں نے، جو مصروف اربابوں میں رہتے ہیں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اعلان کیا ہے ”بلڈ شیپ سب سے بڑا انعام سویڈش اکادمی کے مکان کو دیا جانا چاہیے، اُن کی اس دھمک پر کہ اس عرصے کا انعام ایک کھرے کا عھ کیا جا رہا ہے۔“ میں اس بیانات سے کھنکھاتی کہتا ہوں۔ ”پاپ کا یہ قدم ایسی دھمک کا ہے جس کے پیادے اشتعال دلانے کے عمل سے ملتے ہیں۔“

اس پر اُنھنے واسے بننا سے پر کافی غور کیا ہوگا، اس لیے رابرٹ ڈسجے کے شاعر و مادیب عام طور پر بلند ترین درجات پر فائز ہوتے ہیں (جوان لوگوں کے بارے میں کم دلچسپی دیتے ہیں جو نا کساری کی مٹھوں پر مشقت بھی کرتے ہیں اور زندہ بھی رہتے ہیں) چاہے بولے کے طوفان میں گھر گئے ہیں۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، میں اپنے دوستوں سے اتفاق کرتا ہوں۔

یہ شعر پہلے ہی Parnassian (پارنائس کا ایک پہاڑ جو اپنی نو کے مطابق متعلق ہے۔ منجم) جیسی بلند یوں پر فائز تھے اور آپ نے اپنی شوخی کے ذریعے، انھیں زمین کی طرف ٹکھکایا اور وہ بے چارے منہ و دندانہ دونوں کے بل گر گئے ہیں، عموماً کے کچھڑ میں لٹ پٹ ہو گئے ہیں۔

سویڈش اکادمی کے مکان لوران کی ساتویں پشت تک کو اہانت آمیز الفاظ سے نواز جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ ”شہنشاہ مارکس مرید“ کے نعرے بلند کیے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اس ہوباز کی میں دو خط شاعری خاندان کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔

(ب آپ صفحہ پلٹ سکتے ہیں۔ آپ کو ایک نیا کر نظر آئے گا جس میں ایک نہ ہند شاعر کو طوفان مریبا دے اٹھا کر بیچ دیا ہے)



کچھ تو اپنے زیریں حصوں کے بل بہت زور سے گرتے تھے۔ کچھ شاعروں اور لکھنوں کے بارے

میں اظہارِ عقیدت کی کہ ان کی رگوں اور جگر میں بری طرح چوڑھیں آئی تھیں۔ خبر ہے کہ اس کے بعد کئی دلوں تک اٹالیہ کے کسی بھی دواخانے میں ایک بھی مستحق کوئی میسر نہیں تھی۔

گھر پیارے، مکان اکادق! کیوں نہ آپ ہنرِ آف گریس کہ یہاں آپ سے طرانا نودتی ہوگی جب۔ دیکھیے، میرا مطلب یہ ہے کہ پہلے تو آپ نے ایک سیاہ عام کو خام دسے مارا، پھر ایک یہودی کو چمکے لے گئے۔ اور اب ایک مسخرے کو انعام دے رہے ہیں۔ کیا بات ہے آپ لوگوں کی بھی! ہمیں کہ Naples کے باشندے کہتے ہیں۔ *pazziamme?* کیا آپ لوگ واقعی پاگل ہو گئے ہیں؟

لوچے دو سچے مکے پادری بھی پاگل پن سے نہیں بچ سکتے۔ چند فرماں روا سنا ہے کہ پوپ، ایٹلی کا ریڈیٹل اور پیرس کی مجتہدین کے انتخاب کرنے والے۔ سب کے سب حد سے ترس گئے ہیں اس حد تک کہ انھوں نے مسخروں کو جزدیے کے کانوں کو دوبارہ نافذ کرنے کے لیے درخواستیں گزار دی ہیں، مگر بالکل آٹھ پتھرے دھیرے جھنے کی اذیت دے کر، مانے ہی۔

اس کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ ایسے بے شمار افراد ہیں جو آپ کی جانب سے میرے انتخاب پر شاداں ہیں۔ البتہ اس وقت چہرے نگاہے والوں، مسخروں، اٹلیوں، قومازیوں، مرد ستان گویوں جیسے بے شمار افراد کی طرف سے آپ کی خدمت میں ہے بجا سرت آئینز شکرانہ پیش کرتا ہوں۔
(اب ہم اگلے صفحے پر آتے ہیں)



جب داستان گویوں کا ذکر کریں گے تو مجھے Lago Maggiore جیسی چھوٹی سیٹی کے فن کاروں کو نہیں بھولیو چاہیے، جہاں میں پانچ جہتتہ، وہ لہجہ کیا تھی، نیا نیا دیات کا ایک ٹرین تھی۔ وہ پانچ داستان گو تھے، ماہر پیشہ گر جیسے جنھوں نے مجھے اور دوسرے بچوں کو فن کے دھڑے لگنے کا بہت سکھایا تھا۔ ہم ان کو سنتے، قہقہے دیتے۔ اور جب ہم پتھر میں پوشیدہ اماںک بھید خانہ ہوتے تو قہقہے ہمارے حلق میں کانٹھیں کر دیتے۔ آج بھی میرے ذہن میں Rock of Calde کا قہر بائیکل ماز ہے۔

”بہت ہی گز دے“ شیشہ گرنے کی بنا شروع کیا، ”اس چوٹی کی ڈھلوان پر، جو پھیل میں سے نکلتی ہے، Calde نامی ایک ہستی تھی۔ یہ ہستی چٹان کے ایک سلتے ہوئے ٹکڑے پر تکی ہوئی تھی، جو ریزہ ریزہ آہستہ آہستہ ڈھلوان کی طرف سرک رہی تھی۔ یہ ایک عظیم الشان ہستی تھی، جس میں ایک گھنا گھرقنا، تھمے جیسے مٹا اور ایک کے بعد ایک، گھریں کے جھنڈے کے جھنڈے تھے۔ ایک ہستی جو کبھی اس جگہ تھی، بے موجود نہیں رہی۔ یہ ہندوویں صدی میں عظیم ہستی سے مراد تھی۔“

”او“ کسان اور کچھروں نے گواہ لگائی تھی، ”تم بھی سرک رہے ہو، اور وہاں سے نیچے آ رہو گے۔“ مگر پہاڑی پر سہلے والوں نے سنی ان سنی کر دی، انھوں نے منہ کر کے کاہلی کر لیا اور بولے، ”تم خود بہت چالاک سمجھتے ہو، مگر کوڑا مار رہے ہو کہ ہم اپنے گھر اور پٹی دینیں چھوڑ کر یہاں جا کر تم ان پر قبضہ کر لی گھر ہم اتنے بے وقوف نہیں۔“

”وہ سب شراب کشید کرتے رہے، کھیت جوتے جوتے رہے، شادی بیاہ کرتے رہے، سچے بختے رہے۔ عبادت کے لیے گرجا جاتے رہے۔ انھوں نے گھسیں کیا کہ ان کے چہرہ کے نیچے سے چٹان سرک رہی ہے مگر انھوں نے اس کی بالکل پروا نہیں کی، بلکہ ایک دوسرے کو دھکیلتے دھکیلتے لیے یہ کہتے رہے کہ ”دماغ یہ چٹان اپنی جگہ رہی ہے۔ کوئی نئی بات نہیں۔“

”چٹان کا سب بڑا حصہ پھیل میں ڈوبنے والا تھا۔“ ہوشیار، پتی تمنا دے انھوں تک پہنچا ہے۔ کتا رہے پر موجود نوک پڑے۔ ”کھاس، یہ چشموں سے آنے والا پانی ہے، جس کی زیادہ ہو گئی ہے۔“ ہستی کے لوگوں نے جواب دیا، اور پھر، پھیل آہستہ آہستہ چوٹی تک پہنچ گئی۔ ”تھقل۔ تھقل۔“ تھچا کا۔ وہ ادب رہے ہیں۔ مکان، کوئی، گھٹس، لا گھوڑے تین گھرے۔ ہو ہو۔ تھقل۔ بغیر کسی خوف کے یہ وری ایک نیا کا اعتبار الہیہ من راتھا۔ Te absolva. animus sana. gurgie. Aame. gurgie. مٹا رہا مٹا رہا، گھنا گھریں گھریں کے پھیل میں غرق ہو گیا۔ Dong. ding. ”dop. plock.

شیشہ گرنے کا راز ”آج بھی، گرا آپ پانی پر چنگی ہوئی چٹان کے ٹکڑے پر نیچے جھانک کر دیکھیں۔ اور اگر اسی لمحے طوفان برقی و بارانی آجائے، اور گرجا کی چمک میں پھیل کی تہ کا مٹھرا داغ ہو جائے تو آج بھی آپ دیکھ سکیں گے۔ اگرچہ یہ ناقابل یقین ہے مگر وہ ڈوبی ہوئی ہستی اپنی مٹھروں سمیت موجود ہے اور ان پر چھتہ پھرتے وہاں کے باشندے، ایک دوسرے سے شوٹی میں کہتے نظر آئیں گے ”کوئی بھی نہیں ہوا۔“ وہاں کی آنکھوں کے سامنے تیرتی، ن کے کانوں کے اندر آتی جاتی مچھلیاں، جن کو وہ صرلے ہاتھوں سے پکارتے ہوئے کہتے ہیں ”کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ یہ کچھ اس قسم کی مچھلیاں ہیں جو ہواؤں میں اڑنا سیکھ گئی ہیں۔“

”آج تمہیں اپنی گھر، اللہ! شکریہ۔“ آج کچھ نیا ہوئی ہے، کال سے نیا مگر سب کچھ ٹھیک ہے مگر

جہاں تک ان کا سوال ہے، کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔“

اگرچہ یہ سب چھیڑ چھاڑ ہو سکتی ہے، مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کہانی میں ہمارے لیے کچھ موجود ضرور ہے۔ میں ایک واریم کہوں گا کہ میں اپنے شیٹ ٹروس کا شکر گزار ہوں، اور یقین کیجیے، انکانہ اکاؤنٹاؤن آپ لوگوں کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ان کے شاگرد کو ڈانٹا ہے۔ وہ اپنے دھماکا خیز فحش کالیکٹار رکھتے ہیں۔ میرے فحش کے لوگ فحش لکھا کر کہتے ہیں کہ جس رات یہ شران تک پہنچی تھی کہ ان کے اپنے دستاں کو ڈانٹ لیا، مگر عیا کیا گیا ہے، ایک اینٹوں کے بھنے سے، جو بچوں کے ہاتھوں سے ٹھنڈا ہوا تھا، اچانک بڑے بڑے شے سے ٹکے گئے تھے، اور اس میں سے اہٹش بازی کی طرح، فحش میں رنگین شیٹوں کے انٹیم ٹکڑے ہو میں بلند ہو کر بھیل میں گرنے لگے تھے، جس کی وجہ سے بھیل کی سطح سے بھاپ کے گھبراہٹ بلند ہوئے لگے تھے۔

(جب تک آپ لوگ نمایاں ہو گئے، میں ذرا سا پانی پیوں) مترجم سے مخاطب ہوتے ہوئے! کیا تم بھی بیوقوف؟

یہ بہت ضروری ہے کہ جب تک ہم پانی نہیں، آپ لوگ آپس میں باتیں کریں، ورنہ اگر آپ نے پانی پینے کے دوران ٹکڑے والی غصہ، غصہ، غصہ کی آوازوں پر ہیوان دینے کی کوشش کی تو ہمارے گلے بندھ جائیں گے اور ہم کھانا شروع کر دیں گے۔ لہذا، آپ لوگ آپس میں شانت باتیں کریں، جیسے ”اوہ کتنی خوب صورت شام ہے، سبنا ہو غیر“

وقت ختم ہوا۔ سب ہم نئے منظر پر جاتے ہیں فحش کیجیے، میں اب ذرا تیز چوں گا)

سب سے بڑھ کر اس شام، ایک بلند رتبہ ادبی شخصیت آپ کے ہنگ ہانگ اور خجید و شریہ کی مستحق ہے، جو نہ صرف آپ لوگوں اور فرانس، مارکے فن لینڈ کے لوگوں کے لیے، بلکہ اعلیٰ کے لوگوں کے لیے بھی جنم ہے۔ پھر بھی، شکسپیر تک، بلاشبہ وہ یورپ کی مثالی الہامیہ کا سب سے بڑا ڈراما نگار تھا۔ میرا شمار Ruzante Beoko کی طرف ہے، جو Molière سمیت، میرا عقیم استاد ہے۔ یہ دونوں اداکار ڈراما نگار تھے، ان کے دور کے پیش ذمہ دار تھے اور وہ ادیبوں نے جن کی نقالی کی ہے۔ عربی برائے مارکے مارکے نندوں کی ان کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کی صحابی اعتبار اور اعلیٰ لوگوں کی منافقت اور تکبر، اور ان کا نام انھیں انھیں کو اسٹیج تک لانے پر لوگ ان کو قمارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور ان کی سب سے بڑی ناقابل محافل غلطی یہ تھی کہ سب کچھ تاکرہ لوگوں کو ہلاتے تھے۔ چارٹے نہیں آپ، کہ قہر حاکمیت و لوگوں کو پسند نہیں ہوتا!

Ruzante نے، جس کو Commedia dell'Arte کا حقیقی بوسپ کہا جاتا ہے، مختلف نندوں کی بنیاد پر، فحش کے لیے، خود اپنی ایک زبان ایجاد کی تھی جو Po کی راوی کی یونی، لاطینی، ہسپانوی حتیٰ کہ جمن، اور خود اپنی بنائی ہوئی onomatopoeic (دو غلط جمن کی بچے خود تو، نہ کی کیفیت پیدا کسے ہیں، مثال کے طور پر bang, boom, click وغیرہ۔ مترجم) آوازوں کو ملا کر بنی تھی۔ یہ Beoko Ruzante

ہی کا فیض تھا کہ میں نے خود کو رایتی دنیا تحریر سے آزار دہا ہے، اور اپنے اکبر کے لیے میں وہی اٹھاؤ
پسند کرتا ہے جو میرے لیے مناسب ہوتے ہیں، لیکن معمولی آدمیوں کے، کٹنگ ٹیکنیک کے، وزن اور
سائز کے ذریعے دیکھنے والے حتیٰ کہ بے ربط اور بے مقصد بیانیہ آواز پیدا کرنے والے اور مسخروں کی
آوازیں دے۔

اور آپ، چارلٹ دین تو میں اپنے معزز زانیہ کا ایک حصہ Ruzante کے نام کروں۔

چند دن قبل، ایک لائق نوجوان اٹاکا نے مجھ سے کہا تھا، "استاد آپ کو چاہیے کہ آپ اپنی قوتوں
کو، ورنہ جو ان کے لیے، اپنے جذباتوں کی حفاظت کریں۔ آپ کو اپنے فن کی بجائے انہیں منتقل کرنے ہوں۔
آپ کو اپنی پیشہ ورانہ دانش اور تجربے ان میں تقسیم کرنے ہوں گے۔" میری اہلیہ Franca اور میں نے ایک
دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا، "یہ صحیح کہا ہے۔" لیکن، اگر ہم دوسروں کو اپنا فن سکھاتے ہیں تو ان میں
اپنی تھاک کی بجائے منتقل کرتے ہیں تو (وہیں یہ بھی دیکھنا ہوگا) یہ سب ان کو کس طرح استعمال کریں گے
اور یہ سب (جذبہ اور بجلی) ان کی کیا رہنمائی کریں گے؟

پچھلے دو ماہ کے دوران Franca اور میں کئی چلی درستیوں میں نو عمر افراد کے لیے مذکرے منعقد
کرنے کی غرض سے گئے تھے۔ وہ تکلیف دہ تو نہیں، مگر ہمارے لیے یہ وقت حیرت انگیز تھی کہ وہ لوگ
س دور کے بارے میں، جس میں ہم غرق ہیں، بے خبر تھے۔ ہم نے ان کو ترکی کے صوبے Sivas میں
ہونے والے قتل عام میں ملوث لوگوں کے مقدمے کے بارے میں بتایا۔ جس میں ملک کے سینتیس
سروے آئندہ جمہوریت پسند دانش ور جو عثمانیہ دور کے مسخروں کی یاد منانے کے لیے اماطوں کے ایک شہر میں
جمع ہوئے تھے، رات کے وقت اپنے ہوٹل میں ٹکڑے جلا دیے گئے تھے۔ آگ لگانے والے ایک نیا دہشت
گروہ کے لوگ تھے، جن کو حکومت وقت کی سرپرستی حاصل تھی۔ ایک رات میں ملک کے دسے ہونے والے سینتیس
فنان کا انصاف، اٹاکا راؤر کی مدد کا شکر ادا کرتی تھی کہ وہ سب سے متاثرہ گئے تھے۔

ایک ہی وار میں ان مجنون لوگوں نے ترک تہذیب کے سب سے اہم رہنماؤں کو ختم کر دیا تھا۔
ہزاروں عظیم ہم کو جن رہے تھے۔ ان کے چہرے حیرت کے جذبات سے تھما رہے تھے۔ انہوں نے اس
قتل عام کے بارے میں کچھ نہیں تھا۔ سب سے نیا دہشت گئے اس بات پر ہونے لگی کہ اس مذہب اور مذہب
حضرت بھی اس واقعے سے ناواقف تھے۔ یہ بے رحمی، ٹکڑے ہمارے بالنگ سامنے، Mediterranean کے
کنارے واقع، چورلی احمد میں شہریت کا خواباں، جس میں کسی کو اتنے بڑے واقعے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔
عالیہ کے معروف جمہور پسند Salvini نے کتنا بد وقت کہا تھا، "ایسے (خوفناک) واقعات سے ملک
بے انت بھلی ہوئی لاکھوں کی مالک بنی اصل پشت پناہ ہوتی ہے۔" مگر نوجوانوں میں اس قسم کی غائب
دہائی کے ذمے درود لوگ ہوتے ہیں جن کو انہیں تنہا دینے کا فرض سونپا گیا تھا۔ ان غائب دہائی اور انہیں
فراوانہ اسکول کے امداد اور دوسرے تنہا دینے والوں کا شامل ہونا سب سے بڑا بات ہے۔

نوجوان لوگ ملت کی عام قسم کی اور تحریک اشتراک پر گروہوں کی پورٹ کا شکار ہو جاتے ہیں جو زمانے ایسے کے تھیں جو نژاد ان کو روک پیش ہوتی ہے۔ ٹیلی ویژن پر دکھائی جانے والے بے رحم فلمیں جو مشکل سے دس منٹ میں تین منٹ اور پھر دو منٹ، ایک تشدد اور ایک حادثہ جس میں، ایک بچہ یا آگے پیچھے جیتے والی گولیوں میں گمراہ جاتی ہیں اور پھر گر جاتا ہے جس پر موجود سب کچھ کارہی، ان کے چلائے والے اور اس میں سارے صف، سمندر میں چاہتے ہیں جن میں سے صرف ایک شخص بچتا ہے، مگر اس کو چھو نہیں آتا اور ڈوب جاتا ہے، جب کراہی کو دیکھنے کے لیے جمع ہونے والے یا اس دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

ایک اور پوری ورلڈ میں جہاں نے ایک منصوبہ کو دہرایا کر دیا۔ فیسوں کروڑ ٹھیک ٹھاک چلی رہا تھا جس کے تحت عجیبہ تھی کہ یورپی پارلیمنٹ جینیوا میں مواد کو لٹا پٹا کرنے اور جان مار جسمانی نظاموں پر پیٹنٹ کے حقوق لینے کی اجازت دے گی۔ ہم بہت آسانی سے محسوس کر رہے تھے کہ اس موضوع کے تحت سے جانٹرین پر خوف کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ میں نے Franca نے جانٹرین پر واضح کرنے کی کوشش کی کہ حاکم کے، اور جگہ جگہ موجود دیگر اقوامی اداروں کے گمراہے ہوئے یورپ کے سرکاری ملازمین ایسے سائنس فکشن کے پلاٹ کی تیار کر رہے ہیں، جس پر Frankenstein's pig brother کا عنوان خوب سچے لگا۔ یہ لوگ ایسے فرمان چاہی گمانے کی کوشش کر رہے ہیں جو صنعتی اداروں کی جینیاتی الٹ بھرنے سے بنائے جانے والے مخلوق پر، اور ان کے جسمانی حصوں پر پیٹنٹ کی اجازت دے سکیں گے جو بالکل 'The Sorcerer's Apprentice' سے اقتداء کیا گیا متحرک پیش کرے گا۔

اگر یہاں ہو تو کیا ہوگا؟ ہم اس کا ایک متحرک مادی پیش کرتے ہیں خنزیر کے جینیاتی نظام کی موت بھرنے سے ایک سائنس دان ایسا خنزیر پیدا کر رہا ہے جس میں انسانی خصوصیت شامل ہوتی ہیں۔ اس طرح اس تخلیق کردہ خور کے جسم سے آپ کی پسند کے اعضاء جیسے گردے وغیرہ نکال کر انسان کے جسم میں اس کی پیوند کاری کرمان ہو جائے گی۔ مگر اس بات کا نتیجہ کرنے کے لیے کہ انسانی جسم پیوند شدہ عضو کو زندہ کر دے، یہ بھی ضروری ہو جائے گا کہ خنزیر کے جینیاتی نظام سے کچھ اصلاحات انسان کے جسم میں منتقل کر دی جائیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا، ہمارے سامنے خنزیر کی خصوصیتوں اور ایک انسان موجود ہوگا (اگرچہ ہم علاج کا ٹھیکے کی حالت میں دیکھ رہے ہیں کہ اس دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں)۔

اور اس کی تخلیق، یعنی انسانی خنزیر، کے برعکس پر پیٹنٹ کے قوانین لاگو ہو جائیں گے، اور جو کوئی بھی اس کے کسی عضو کا طالب ہوگا اس کو اس ادارے کو کافی رعایت کی فیس اور سرمایہ ہونی چاہیے کہ اس کو "ایچو" کیا ہوگا، ان اعضاء کو پیوند کاری سے نئی قسم کی بہت سی بیماریاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں، مثلاً، جسم میں انوکھے یا ڈھروٹ ہو سکتے ہیں، متحرک بنائیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ کیا، سر سے خدائی تھا نیک عظمت!

پاپائے اعظم دھرم نے اس جادو نوے کو جتنی سے مدد کرنے کا فتویٰ جاری کر دیا ہے۔ انھوں نے اس عمل کو انسانیت کے ورثہ جاتی عظمت کے خلاف خیر قرار دے دیا ہے۔ انھوں تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ

یسے ہمارے منصوبے کمال طور پر غیر اخلاقی تصور کیے جا سکتے ہیں۔

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ جب یہ سب کچھ ہو رہا ہے، ایک سرکاری سائنس دان نے، جو چارٹرڈ ماس کمینس، آپ نے اسی کے بارے میں شہید پر چھ بھیجی ہیں، ایک ہندو کے سر کی پچھکاری کر دکھائی ہے جاس نے وہ ہندوؤں کے سر کاٹ کر ایک ڈاکٹر کے جسم پر پیوند کر دیا۔ اس ڈاکٹر کی جگہ دونوں ہندوؤں کو بہت زیادہ اذیت تھی۔ وہ اصل دونوں ہی فالج زدہ ہو گئے اور تھوڑے دنوں بعد ہی انتقال کر گئے، مگر تجربہ کام کر گیا، یہی سب سے بڑی بات ہے۔ مگر زخم پر نمک کے مترادف بات یہ ہے کہ اس ڈاکٹر کے Frankenstein پروفیسر White ہیں جو Asian Academy of Sciences کے ممتاز رکن بھی ہیں۔ بے مافی جو پاپائے اعظم کو بتائے؟

اس ہم نے یونیورسٹیوں کے طلبہ کے سامنے ایسے مجرمانہ کھیل کا پروگرام کر دیا، اور وہ تو بچے کا کر رکھنا بھی ہوئے۔ وہ دنگ میرے اور میری بیوی کے بارے میں کہتے ہیں، ”یہ دونوں انسان ہیں کہ بچکے، کیسے کیسے قہر، کہاں کہاں سے نکال کر لاتے ہیں۔“ ایک دہشت گرد کے لیے بھی ان میں سے کسی نے نہیں یہ محسوس نہیں ہونے لگا کہ یہ سب کیا ہے ہوئے قصوں پر ان کو تنہا رہیں۔

ایسے مجاہد نے ہم دونوں کو تعلیم دلائی سارو Savino کی سمجھ کے مطابق، خود اپنی کہانی سننے کے عمل میں اور راج کر رہا ہے۔ دانش ور اور ایسے افراد ہونے کی حیثیت میں جو مشیر و مہربان کی زینت ہوتے ہیں، جو لوگوں کی نسل کے افراد سے مستغیر کرتے ہیں، صرف ان کو تعلیم دے کر کہ اسے کیسے استعمال کیے جاتے ہیں، سرس کی مشین کیسے کی جاتی ہے، اسے پتہ نہ کہی آواز کی اور شرٹال کے مارچ پٹھا کو قابو کرنے پر ہی ہمارے قہر نامیاں ختم نہیں ہو جاتیں۔ صرف کسی تکنیک یا انداز کی تعلیم ہی کافی نہیں ہوتی، ہمیں ان کو دکھانا ہوتا ہے کہ وہ اسے اطلاق کیا ہو رہا ہے۔ تاکہ وہ بھی اپنی کہانی سنانے کے قابل ہو سکیں۔ یونیورسٹی، یونیورسٹی اور دنیا بھر کے لوگوں کو اپنے دور کی حکمت عملی نہیں کہتا، اس کام کا نہیں ہوتا۔

حال ہی میں، ایک پڑھو کانفرنس میں شرکت کے دوران میں نے لوگوں کی نسل کے لوگوں کو ایک خاص اطلاقی عملوں کے انداز کار کے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی۔ ان عملوں کے سامنے چلے ہوئے والے ایک مقدمے کی سماعت، آگ الگ سماعتیں ہونے لگی تھیں، بائیں بازو کے قہر سیاست دانوں کو، ایک پاپس کٹھن کے قہر کے مجرم نظر آکر، ایسا کیسی بریں کی مزائیدہ سائنس کی تھیں۔ میں نے اس مقدمے کے کاغذات کا مطالعہ کیا ہے۔ اسی طرح جیسے میں نے مطالعہ کیا تھا جب میں Accidental Death of an Anarchist کہنے کی چوٹی کر رہا تھا۔ اور کانفرنس میں اس مقدمے سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے، جو نہایت فضول، بلکہ مستحکم فیصلہ تھے۔ مگر ایک موقع پر میں نے محسوس کیا کہ میں بیرونی کے اجتماع سے خطاب کر رہا ہوں، اس لیے کہ میرے سامنے نہ صرف اس مقدمے سے بالکل ناہم تھے بلکہ اس سے بھی کہ پانچ برس قبل، جس میں قتل کیا جاتا رہا تھا، تھوڑا بہت گزرا۔ غیرہ انہیں اس قہر عام کے بارے

میں بھی غم نہیں تھا جو ملی میں ہو چکا تھا، ریل گاڑیاں ہم سے اڑ دی تھیں، چور ہیں پر ہم پیچھے گئے تھے
بے مشکل خیر بدلتی مقدمات برسوں گھنچے گئے تھے۔

سب سے نیا وہ مشکل بات یہ تھی کہ یہ بتانے کے لیے کراچی آیا ہو رہا ہے، مجھے تو اس کی بجائے
کے واقعات بتا کر آگے بڑھنا پڑ رہا تھا۔ گویا، حال کی بات نہ کرانی تھی۔ ایسا صرف ملی میں نہیں، ہر
جگہ سامنے یورپ میں ہو رہا ہے۔ میں نے ہسپانہ میں بھی دوشش کی تھی، گویا ہاں بھی وہی ہی مشکل پیش
آئی تھی، فرانس میں، جرمنی میں بھی، ایس سوئیڈن میں بھی تک دوشش نہیں ہو رہی ہے، مگر کمزور۔

بات ختم کرنے سے پہلے، آپ اجازت دیجئے تو میں اس موقع پر Franca میں بھی شریک کر لوں۔
Franca Rame، میری زندگی میں دو میرے فن کی شریک، جس کی ارکان اکاؤنٹی، آپ نے بھی
ایک واکارہ اور مصنف کی حیثیت میں، انعام کی تحریک تسلیم کیا ہے، جو ہمارے فیئر کے لیے نکھے جانے
والے بہت سے کھیلوں کے متنا میں شریک رہی ہے۔



(اس لیے Franca ملی میں ایک فیئر کے اسٹیج پر موجود ہے، تحریک دو دلوں میں یہاں مجھ سے
آئے۔ اس کی پرواز دو پہر کے وقت اترتی ہے، اور آپ چاہیں تو ہم سب اس کو ہوائی اڈے پر خوش آمدید
کہنے کے لیے اگھے جاسکتے ہیں)۔ یقین کیجیے، فرانکا کی چیز جس مزاح رکھتی ہے۔ انعام ملنے کی خبر عام
ہونے کے فوراً بعد ایک صحافی نے اس سے سوال کیا تھا، تو ایک فوکل انعام یافتہ کی بیوی ہونے پر آپ کا
محسوس کردہ تھا: کیا آپ اپنے گھر میں اس کی کوئی یادگار بنائیں گی؟ "اے اے اس نے جواب دیا، مجھے
کوئی قدر نہیں۔ نہ میں خود کو کسی گھانے میں محسوس کر رہی ہوں۔ میں ایک عرصے سے زہر پروریت ہوں، ہر صبح
سیرت کرتی ہوں، اپنی ہتھیلیوں اور گھٹنوں کے بل زمین پر ہوتی ہوں، اور اس طریت ملی نے خود کو ایک
دو گنا چھپرہ پیچھے کا عادی بنالیا ہے۔ میں اس میں بہت مایوس ہوں۔"

جیسا کہ میں نے کہا ہے، اس کے مزاح کی حس بہت تیز ہے۔ اکثر اوقات وہ اپنے طنز کو خود اپنی

ہی طرف موڑتی ہے۔ اس کی معیت کے بغیر جہاں وہ ایک عرصے سے موجود رہی ہے، اس میں اس کا کام کو اتنی ہی تک نہیں پہنچ سکتا تھا، جس کی بنا پر آپ نے مجھے اس اعزاز کے قابل سمجھا ہے۔ ایک سو چھ سو دسوں نے بہت سے کھیل چیلنج کیے ہیں، ٹھیکڑوں میں، کارٹوں میں، چوٹی درمیانی کی ٹیموں میں، حتیٰ کہ بے حومت گرجا گھروں میں، قید خانوں اور شہر کے میدانوں میں، ڈھوپ میں اور موسلا دھار بارش میں، ہر جگہ ہم ہمیشہ ساتھ رہے ہیں۔ ہمیں گالیاں، پولیس کی ماتہ ماست خیال والوں کے ہاتھوں توچن، اور تشدد کے ظلم برداشت کرنے پڑے تھے۔ اور وہ انکا ہی تھی جس کو سب سے زیادہ ظالمانہ حملے سب سے پڑے تھے۔ سب سے کم میں سب سے زیادہ قیمت دینی پڑی تھی، اپنی گریں اور ہاتھ پاؤں کے ذریعے، مایوس، اور مقصود لوگوں سے ایک جہتی کی خاطر، جو ہمیں اعزاز ملے۔



جس دن یہ اعلان ہوا تھا کہ مجھ کو نوبل انعام مل چکا ہے، میں Mian کے ٹھیکڑ Via di Porta Romana میں Giorgio Alberazzi کے ساتھ ماطرین کے سامنے تھا، اور ہم لوگ The Devil with Tes پیش کر رہے تھے۔ اچانک مجھے اخباری نمائندوں، ٹوٹو گرافروں اور ٹیکروں سے میں TV والوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ سامنے سے گزرتی ہوئی عوام کے لڑائیو نے مجھے مبارکباد دینے کے لیے ہتھ دنگ لی، پھر سامنے سے فرنگی برآئے اور ان سب نے مجھے مبارکباد دی، اور ہر ایک نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مبارکباد دینا چاہا۔ اور پھر ایک دوسرا ایک گئے اور آواز مل کر سب نے پکارا "فرانکا کہیں ہے" اور سب فرانکا، فرانکا کے گھر سے نکلتے رہے جب تک کہ تھوڑی دیر بعد فرانکا نہیں گئی۔ سبے سرفراہ پریشانی کے عالم میں، تمکھیں انسیوکیں سے بریز رہی تھیں، گنگے لگاتے گئے، لیے نیچے تری۔ اسی وقت، نہ جانے کہاں سے، ایک جیٹز خام ہوا، جو صرف ہوا سے بچنے والے سبز و زرد تھیں بھرا ہوا تھا۔ میرے ساتھ کھیل میں، پہلی دو مشاغل بہت سے بچے تھے، جو شہر کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے تھے، ان سب نے مل کر samba کی ڈھن میں "Porta Romana bella, Porta Romana" کا شروٹ کر دیا۔ اس نے

اس سے پہلے انقلاب ٹھہرا گا، کبھی نہیں سنا تھا، مگر میرے لیے یہ سب سے زیادہ حسین موت تھی جو میں نے دیکھا۔
 فراق کا نے اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔
 یقیناً سمجھیے، ہم وطنوں اس احوال کے حق دار ہیں۔



☆ ویسلاوا سمبورسکا

اعترافِ کہاں۔ اس شاعری کے لیے جس کی طرح بدلتی انسانی حقیقت کے ریزے ریزے میں پوشیدہ مٹا رہی اور جیاتیاتی اشاروں کو جھگا دیتی ہے۔

سمبورسکا کو شاعری کا سوتارٹ کہہ سکتا ہے اور یہ کچھ غلط بھی نہیں، اس لیے کہ اس کے کلام میں پوشیدہ مٹا رہی ہزاروں کے ساتھ ساتھ جہان کی فراوانی اور اس کی تحریر کی حقیقت آرائی اس طرح نظر آتی ہے جیسے الخط خوب خود متین میں پیوست ہو گئے ہوں۔ اس کی شاعری میں سوتارٹ کی مٹتی کی مٹتی کے ساتھ ساتھ مٹھوین کا طیش بھی جھٹکتا ہے۔ انسانی تہذیب اور تمدن پر تنقید کرتے وقت اکثر سمبورسکا کے طریقے لہجہ کا ضبط بھی اس کا چرچا نہ بناتا ہے۔ جیسے وہ ایک جگہ کہتی ہے "ایسی کوئی شے نہیں جس کو خود چنا احصاب کرنے والا گیدڑ کہا جائے۔" اس طرح اس کا مزاج بسا اوقات اپنے معنوں میں تخریب ہو جاتا ہے۔ سمبورسکا کی تحریر سلیبیٹی بولیمونی کا شاد کار ہوتی ہے۔ اس کے یہاں استعمال ہونے والے الفاظ یوں لگتا ہے گلیا تراش کر منڈول بنا دیے گئے ہوں شہرانی میں قہقہے یا آتش پسندی کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ اس کے انداز میں بلا کی بے ساختگی اور رندیت ہوتی ہے۔ ایسے کلام کا ترجمہ اگرچہ بہت مشکل کام ہے اس کے وجود پر تقریباً تمام یورپی زبانوں کے علاوہ اس کے تراجم عربی اور عبرانی زبانوں میں بھی کیے جا چکے ہیں۔

سمبورسکا 1923 میں مغربی پولینڈ کے شہر برین (Brin) میں، جناب کاٹک (Kornik) کا حصہ ہے،

پیدا ہوئی۔ اس کا قلم نام ریو ہے اسٹیشن کے قریب رہتا تھا اور وہ مڈنا تھا اپنے باورچی خانے کی کھڑکی سے گزرتی ہوئی سڑک گلیوں دیکھا کرتی تھی مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس نے کبھی پوینڈر کے دھڑکنے نہیں سنا۔
اس نے Jagiellonian یونیورسٹی میں پڑھائی اور عمریات کی تعلیم حاصل کی۔ سمبورسکا اپنی ایک علم
’مجھے ایک لفظ کی تلاش ہے‘ کے ذریعے 1945 میں ادب کے امتحان پر طوع ہوئی، جو ایک مقامی اخبار میں
شائع ہوئی تھی۔ سمبورسکا کے سلسلہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ شاعری کے ساتھ مقامی اخباروں میں مختلف
موضوعات پر تحریر کی جانے والی کتابوں پر تبصرے بھی کرتی ہے۔ سمبورسکا نے 1953 سے 1981 تک ایک
اولی سبکے میں شاعری کے مدد کی حیثیت سے کام کیا جہاں اس کا مضامین کا حصہ بھی شائع ہوا۔ یہ مضامین
’Lektury Nadobowiazkowe‘ کے نام سے کتابی صورت میں چارہ شائع ہو چکے ہیں۔

سمبورسکا کی شائع ہونے والی کتابوں پر اب تک بائیس کے قریب انومات اور اسٹاڈل چھاپی ہیں۔
اس کو 1995 میں پونزان Ponzan کی یونیورسٹی Adam Mickiewicz نے اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری
بھی عطا کی ہے۔ اس کو گونے انعام اور رزمیہ انعام بھی دیے جا چکے ہیں۔
سمبورسکا جدید حیات سے اور پوینڈر بھی میں متعلق ہے۔

خطبہ

شاعر اور دنی

کہتے ہیں کہ سنی تقدیر کا پہلا جسد بہت مشکل ہوتا ہے۔ چھاء تو میرے معاملے میں وہ تو ہر حال
گزر گیا ہے۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پہلے خود میرے پاس آتے ہیں، تیسرا، چھٹا، دسواں آخری ستر
تک، سب کچھ بتا ہی مشکل ہوگا، اس لیے کہ میں شاعری کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ میں نے اب
تک اس موضوع پر بہت کم کہا ہے، دماغ میں نہ ہونے کے برابر۔ اور جب بھی میں نے کچھ نہیں کہا ہے، میں
نے دس ہی دس میں سوچا ہے کہ میں اس میں بہت الجھی بھی نہیں ہوں۔ کیا وجہ ہے کہ میرا خدہ زرا متنتہ ہی
ہوگا۔ ساری خولیاں مفاشت کے قابل ہوتی ہیں اگر چھوٹی چھوٹی خوراک میں دن چاہیں۔

ہمارے عصر کے شاعر حقیقی طور پر شاعر نہیں ہیں، بالخصوص اپنے بارے میں وہ سرعام اپنے شاعر
ہونے کا اعتراف بھی بے دلی سے کرتے ہیں، گلیا وہ اس پر کچھ شرمندہ ہیں۔ مگر اس شرمندگی کے دور میں
اپنی غلطیوں کا اعتراف بہت آسان ہے۔ ہر شاعر نے کڑا قہقہے سے کیا جائے، اپنی خوبیوں کی نشان دہی
کے بدلے میں اس لیے کہ یہ گہر نہیں میں پوشیدہ ہوتی ہیں اور آپ کو خود بھی ان پر یقین نہیں ہوتا۔ خاص

مگر جب آپ کوئی سوال نامہ پھر رہے ہوں، اور انجینی افر دے گپ قپ کر رہے ہوں، یعنی، جب وہ اپنے پیٹے کے بارے میں بتانے سے گریز نہ کر سکتے ہوں۔ شاعر عموماً اپنے پیٹے کے نام کے ساتھ غیر روپی مصروفیات کو بیان کرنے کے لیے ”شاعر“ کے لفظ کے بجائے ”ادیب“ کی عام اصطلاح استعمال کرتا پسند کرتے ہیں۔ سرکاری سر زمین و زمین کے سرفروں کو اگر علم ہو جائے کہ وہ کسی شاعر سے معاملت کر رہے ہیں تو کچھ بے اعتباری و غیرت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ شاید فلسفیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہو گا۔ پھر بھی وہ قدرے بہتر حالت میں ہوتے ہیں، اس لیے کہ کبھی کبھی وہ کسی دانش ورانہ قسم کے نام کی ذمہ داری استعمال کرنے سے پرہیز کرتے۔ فلسفے کا پروفیسر۔ اب کچھ زیادہ قابل احترام لگتا ہے۔

تغزیشگری میں پروفیسر نہیں ہوتے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ شاعری ایک ایسا پیشہ ہے جس کے لیے مخصوص مطالبے، قاعدہ اعتدال، منطقی مضامین، معیاری کلیات و حوثی، اور بالآخر بھد تکلفات اسناد و عطا کا جتنی ہونا چاہیے اس کا یہ بھی مطلب نکھتا کر شاعر بننے کے لیے یہ کافی نہیں کہ نہیں تیرین نظموں سے صفحات پھر دیے جائیں۔ اس کا قطعی عنصر کاغذ کا کوئی ٹکڑا ہوگا جس پر سرکاری ہر گئی ہوگی۔ آئیے ہم دوسری طرف دیکھتے ہیں اور وہی شاعری کی شوکت، (اس وقت کے حساب سے) مستقبل کے نوپس خاتم کے حق دار جوزف براؤن کو یاد کرتے ہیں جس کو ان کی وجوہ کی بنا پر مدنی جڈ و ملی کی سزا دی گئی تھی۔ اس کو ”مفت خود“ کہا گیا تھا، اس نے کہا اس کے پاس کوئی سرکاری سند نہیں تھی جس کی مدد سے اس کو شاعر کہا جاتا۔

کئی برس قبل مجھے جوزف براؤن کی سے ذاتی طور پر ملاقات کی مسرت و انتظار نصیب ہوا تھا۔ اور میں نے محسوس کیا تھا کہ ان تمام شاعروں کے مقابلے میں، جن سے میں واقف تھی، وہ وہ واحد شخص تھا جو خود کو شاعر کہلانے میں شوق محسوس کرتا تھا۔ بغیر کسی تکلف کے وہ اس لفظ (شاعر) کو استعمال کرتا تھا۔

اس کے برعکس، وہ بڑی آسناخ آزدی سے کام کرتا تھا۔ مجھے یہ بھی محسوس ہو کر اس کی وجوہات وہ خامانہ نہیں تھیں جو اس نے پی نو جوانی میں اٹھائی تھیں۔

نیا وہ خوش قسمت ملکوں میں، جہاں ساقی عظمت پر اتنی آسانی سے چڑھتی نہیں کی جاتی تھی جہاں شاعری فرائض ہوتی ہے اس کو پڑھا جائے، ورنہ اس کو سمجھا جائے، غمزدہ نہ خود کو عوام سے بالاتر سمجھتے ہیں اور نہ شب وید نہ کی بجائے باب اس کے بارے میں بہت نیا وہ عرصہ نہیں مزا تھا کہ اس حدی کے پہلے شعرے میں شاعروں نے ہم کو چوکاٹنے کی کوشش میں فضول خرچی سے تیار کیے ہوئے لباس پہنے ثروٹا سے اور کج رو رنگ ڈھنگ اتار دیا تھا۔ مگر یہ سب کچھ صرف سر عام دیکھا دے کے لیے تھا۔ ایسے لمحات ہمیشہ محسوس آئے جب شاعروں کو اپنے دروازے بند کرنے پڑے اور اپنے پیٹے، اپنی نعلی اور دوسرے شاعرانہ سارے سامان اتارنے پڑے تھے، اور انھیں خود اپنے آپ کا کبھی، ممبر سے اور خاموشی سے، سامنے کرنا پڑا تھا۔ لیکن کاغذ کے ایک سرورق سے اس لیے کہ بالآخر میں وہ حقیقت ہے جو کام آتی ہے۔

یہ سب کچھ محسوس حاداتی نہیں کہ ہم سے سائنس دانوں اور فن کاہن کی فلمی سوانح عمریوں تھوٹ کے

ہو کر تیار کی جا رہی ہیں۔ نرووہائی جمست فلموں میں ڈائریکٹروں کی کوشش بیوقوفی ہے کہ وہ ان تخلیقی اعمال کی ذمہ داری ترتیب کریں جنہوں نے مائکسی دیو فتوں پر مشاد کارڈوں کے ظہور کا راستہ ہموار کیا ہوا، اور اس قسم کی مائکسی کا رٹزارپوں کو دوبارہ کامیابی سے فرش کیا جاسکتا ہو۔ تجزیہ گاہیں، مختلف ادوار، پیچیدہ اور مشکل مشینیں دوبارہ تیار کی گئیں۔ کچھ وقت تک کے لیے ایسے مناظر میں دیکھنے والوں کی دلچسپیوں کو برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ ورپے انٹرویو کے دو نجات، (کیا معمولی سی تہذیبوں کے ساتھ ایک ہزار بار کیے جانے والے تجربات سے، بالآخر مطلوبہ نتائج نکال سکتے ہیں؟) بہت ذرا مائی ہو سکتے ہیں۔ مصوروں کے بارے میں بنائی گئی فلمیں دیکھنے کے قابل ہو سکتی ہیں، اس لیے کہ وہ مصوری کے نقاب کے ہر درجے کی چمک سے شرماتے کی بیوقوفی نہیں نیکر سے فرش کے اثری نشان تک، دوبارہ دکھائی دیتی ہیں، موسیقی فلموں میں موسیقاروں کو بوجھ چھو کر پیش کرتی ہے۔ پہلے اس نغمے کے عمودی خطوط، جو موسیقار کے کانوں میں بجتے ہیں، بالآخر پیچیدہ نوعیت کی مسلمانی کے بحرین کے انہرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب کچھ بھولیں میں ہوتا ہے اور یہ ان نرانی ذہنی نشیات کی تشریح نہیں کرتا جن کو عام طور پر اٹکا ہوا جاتا ہے، پھر بھی ان میں کچھ تو دیکھنے اور سننے کے قابل ہوتا ہے۔

مگر یوسپ کے شاعر بدترین ہیں۔ ان کی تحقیقات فضول حد تک بے رنگ و کشش ہیں۔ کسی کو میزیا صوفی پر بٹھایا لٹایا جاتا ہے، دیوار یا دو چھتی کی طرف گھومتا ہو، بالکل سائت۔ کبھی کبھی یہ شخص سب سے طریق کو لٹاتا ہے، پندرہ منٹ بعد، جن میں سے ایک سطر قلم زد کردی جاتی ہے اور پھر ایک اور نغمہ گزر جاتا ہے، جس میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پھر ان اس قسم کے متغیروں کو ہر شے ترسنا ہے؟

میں نے ابھی اٹکا کا ذکر کیا تھا۔ ہم عصر شاعر میہم سا جواب دے رہے ہیں، جب ان سے پوچھا جاتا ہے وہ کیا چیز ہے اور کیا وہ واقعی وجود میں ہے۔ یہ نہیں کہ نہیں کبھی اپنے اس اندرونی فیض کا علم نہیں تھا۔ کسی بات کے بارے میں کچھ بتانا آتا آسان نہیں ہوتا جب تک کہ آپ خود اپنے آپ کو نہیں سمجھتے۔

جب کبھی مجھ سے اس کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے تو میں بھی سوال کو مالی جاتی ہوں۔ مگر میرا جواب یہ ہوتا ہے، اٹکا پر عام طور پر شاعروں اور مصوروں کا بد اثر کرتا غیر سمجھا اشتقاق نہیں ہوتا۔ ایک مخصوص گروہ ہمیشہ رہا ہے اور وہ ہے گاہ جس پر اٹکا ہوتا ہے۔ یہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جنہوں نے شعور کو غور پر اپنے بندوے کو پکڑا ہے، اور اپنا کام محبت اور محبت سے کرتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر، اساتذہ، ماسٹران شامل ہو سکتے ہیں، بلکہ میں ان میں سکھوں، مڑیہ پیشوں کو ان میں شامل کر سکتی ہوں۔ ان کا کام لگانا چارگی سہنے والی مہم بن جاتا ہے جب تک کہ وہ ان میں سے کچھ چیزیں دریافت کرتے رہیں۔ مشکلات اور کامیابی ان کی جستجو کو بھی قیام نہیں دیتیں۔ ہر سطح کے ہونے مسئلے سے نئے سوالات کا ایک جھنڈا اٹھتا ہے۔ اٹکا جو کچھ بھی ہو، بار بار کہے جانے والے جیسے "میں نہیں جانتا" سے پیدا ہوتا ہے۔

مگر اس طرح کے دنگ بہت نہیں ہیں۔ کہہ دینا پر ہونے والے کام کر کے گزر کر رہتے ہیں۔ ان

لوگوں نے طرح طرح کے کام اہل یوں ہی جذباتی ہو کر پسند نہیں کیے ہیں، ان کو زندگی کے حادثات نے ان کو اتنا پر مجبور کیا ہے۔ محبت سے جاتی کام، اکتا پیچے وا، کام، کام کی قدر اس سے ہوتی ہے کہ دوسروں کی پہنچ میں کتا بھی نہیں ہوتا، خود وہ کتا ہی اکتا پیچے والا نہیں نہ سوہ کی انسان کی سب سے بڑی برائی ہے۔ درجہاں تک۔ یہ مسکے کا سوال ہے، یہی کوئی ۲۰ نہیں مٹے کر آنے والی صدیوں میں حادثات ہی سے بہتر ہو چکا ہے۔

لہذا، اگرچہ میں شاعروں کی القایہ اجماع اور اس سے انکار کر سکتی ہوں، پھر بھی میں ان کا تقدیر کے پسندیدہ گروہ میں شمار کروں گی۔

اس مرحلے پر، سر مضمین میں کچھ شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہر طرح کے اثبات و رد، امر و نکرے باز متعصب اور عوامی رہنما وقت کے حصوں کے لیے کوٹاں مہجے ہیں مگر وہ بھی اپنے کام سے لطف پتے ہیں اور اپنے فرنگی بھی شوق سے پورے کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں، اور جو کچھ وہ جانتے ہیں، ان کے لیے کافی ہوتا ہے۔ وہ مزید کچھ چاہتے ہیں کہ یہ کہ مددہ جان پنے میں ان کی جنت کے گروہ ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اور کوئی بھی علم جو نئے سورت کی طرف رہنمائی نہیں کرتا جلد ختم ہو جاتا ہے، زلزلہ بننے کے لیے ضروری حماقت قائم نہیں رکھ سکتا۔ بہت سے انتہائی معاملات میں، آئیم اور جہاں تاریخ کے مشہور معاملات، سماج کے لیے شدید طور سے خطرناک بھی ہوتے ہیں۔

میںی وجہ ہے کہ میں اس چھوٹے سے حصے میں نہیں جانتی، کوئی کی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔ یہ چھوٹا سا حصہ ہے مگر بہت بڑے بڑے پروں کے سامنے پروں نہ کرنا ہے۔ یہ بہار کی زندگیوں کو ہمارے اپنے اندر کے خدوئل میں، اور ان پہنائیوں میں جو ہمارے اطراف چھٹی ہوئی ہیں، جن میں گرا ارض بھی گویا اس ہے، پھیلا دیتا ہے۔ گریڈنٹ نے کچھ نہ کہا ہوتا کہ "میں نہیں جانتی" تو اس بارٹ کے سبب اوسلے کی طرح زمین پر گرے ہوئے، اور نیا وہ سے نیا وہ یہ ہوتا کہ وہ جھک کر ان کو اٹھاتا اور رنجیت سے چرپ کر چاتا ہے مگر ہارنی ہر وطن Marie Skłodowska-Curie نے اپنے آپ سے یہ کبھی نہیں کہا ہوتا کہ "میں نہیں جانتی" تو شاید وہ ٹرکیوں کے کسی معنوں سے غمی اسٹول میں کیپ پڑھ رہی ہوتی، ہر اپنے دن، ہر انداز میں قابل تعریف، کامیابی سے اپنے فرائض ادا کرنے میں گزارا کرتی۔ مگر وہ کہتی رہی کہ "میں نہیں جانتی" اور وہی الفاظ اسے، ایک بار نہیں، دو مرتبہ سوئڈن لے گئے، جہاں بے چین اور حیا شئی روسی، فوٹیل انعام سے نوازی جاتی ہیں۔

ان شاعروں کو بھی، جو اصلی شاعر ہیں، اس حصے میں نہیں جانتا، گویا سارا دہراستے رہتا چاہیے۔ ہر نظم، ہی بیان ہی ایک کوشش ہوتی ہے، مگر جوں ہی اس کا انتہائی نقطہ کاغذ پر مائل ہوتا ہے، شاعر تذبذب میں پڑ جاتا ہے، اور اس کو احساس ہوئے گئے ہے کہ یہ مخصوص جواب دہی تھا، قفلش ناقابل حتم۔ اس طرح شاعر کوشش کرتے رہتے ہیں، اور جہاں جہاں ان کی اپنی ہے، طینتانی کے نتائج کو دینی ماہرین کا رخ ایک

”وطن پارہ“ کہہ کر ہڈی کی ہچکچاہٹ سے ہمیں مرویٹے ہیں۔

کبھی کبھی میں ان کیلیتوں کے شباب و نچوٹی ہوں جن کے جگ ہونے کا مکان نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر، میں گستاخانہ طور پر سوچتی ہوں کہ کاش مجھے Ecclesiastes کے مصنف سے گپ شپ کہے کا موقع مل جاتا ہے، جس نے انسانی کوششوں کے چھجورے پن کا غم ماک مرثیہ تحریر کیا ہے۔ میں اس کے سامنے بڑے احترام سے غم ہو چکی ہوں، اس لیے کہ وہ غم، زخم میرے نزدیک، دہر حال، عظیم شاعروں میں سے ایک ہے۔ اگر ایسا ہو تو میں اس کا ہاتھ پکڑ کر ہوں گی کہ Ecclesiastes تم نے لکھا ہے، ”اسی سورج کے نیچے وہی شے تھی نہیں۔“ مگر تم خود بھی اس سورج کے نیچے سننے ہی پیدا ہوئے تھے۔ اور جو نظم تم نے لکھی ہے وہ بھی اس سورج کے نیچے ہی تھی، اس لیے کہ تم سے پہلے کسی اور نے یہ نظم نہیں لکھی تھی۔ تمہارے سارے قارئین بھی اس سورج کے نیچے سننے ہی ہیں، اس لیے کہ تمہارے پیدا ہونے سے قبل کے زندہ قاریوں نے تمہاری نظم نہیں پڑھی تھی۔ اور یہ صنوبر کا درخت جس کے نیچے تم بیٹھے ہوئے ہو نہ زون سے نہیں لگا ہوا ہے۔ اور یہ درخت تمہارے ہی کسی دوسرے سے نکلے ہوئے ہے۔ اور یہی اصل ہے۔ اور Ecclesiastes میں تم سے پوچھنا چاہوں گی کہ اس سورج کے نیچے تم اور گولن سا جیسا کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔ یعنی جو تمہارا نظم ہے جو کیا اس کو اور آگے بڑھلا چاہتے ہو؟ یا تم اب اس میں سے کچھ کی تردید کرنا چاہتے ہو؟ تم نے اپنی پہلی نظم یعنی بونی تخلیقات میں خوشی کا ذکر کیا تھا۔ تو کیا ہوا، اگر یہ ضائع ہو رہا ہے؟ تو شاید تمہارے سورج کے نکلنے کی جی نظم بھی خوشی کے بارے میں ہوگی؟ تم نے کچھ یادداشتیں لکھی ہیں؟ کیا تمہارے پاس ان کا نسخہ ہے؟ مجھے خبر ہے کہ تم کوئی نہ لکھ سکتے ہو۔ اور اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔ ”دنیا میں ایسا کوئی بھی شاعر نہیں جو یہ کہہ سکے گا کہ زخم تم جیسے بڑے شاعر نہیں کہہ سکتے۔“

یہ دنیا، جسے ہم کچھ بھی سمجھ رہے ہوں، جب ہم اس کی وسعتوں اور مانی گزریاؤں سے خوف زدہ ہو رہے ہوں، یا لوگوں سے، یا ٹوٹاؤں سے، حتیٰ کہ پڑوسوں سے، (جن کے بارے میں نہ چاہنے سم یہ کہیں سمجھتے ہیں کہ ان کو درد نہیں ہوتا) اس کی بے رخی پہ مالوں ہوں، خواہم اس کی وسعتوں میں ان ستاروں سے آنے والی روشنیوں سے فضا میں ہونے والے سوناٹوں کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے ہوں، جن کو سیارے گھبرے ہوئے ہیں، جن کا اب اوجاگ ہوا ہے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ، خود ہم اس بے انت خمیر کے بارے میں کچھ بھی سمجھ رہے ہوں، ہمارے پاس جن میں داغے کے نمٹ ہیں، ایسے نمٹ جن کا وقت بہت مختصر اور جس کی رفتار انتہائی کم ہے، ان کے درمیان محدود ہے، ہر دنیا کے بارے میں ہم جو کچھ بھی سمجھیں۔ ہم بھی نہیں کہہ سکتے دنیا بہت جلد تھک جائے گی۔

مگر حیرت انگیزی ایک خاصہ ہے، مجھ سے ایک ماہ ہے، جس میں ایک منظمی کھٹکا پشیدہ ہے۔ آخر، ہم سب بھی حیرت زدہ ہیں، اس تیزوں سے جو معرکوں اور ٹکرائوں میں سارے منظر ہو چکی ہیں، ہم جن کے قاری ہو چکے ہیں۔

ٹہنی مانتی ہوں کہ روزانہ کی مسکندگی میں جس میں ہم ہر نفل کو توڑنے کو پروا نہیں کرتے، ہم سب نے جسے استعمال کرتے ہیں "سیدھی سادہ دنیا"، "سیدھی سادہ زندگی"، "معشوقی حالات میں" وغیرہ۔ گنہگار کی زبان میں، جہاں ہر لفظ تولا جاتا ہے، وہی بات نہ سمجھیں ہوئی ہے اور نہ عام جہت۔ ایک دیکھو اور نہ ایک دوس کا ٹکڑا اس کے بعد نہ ایک دوسرا دن اور نہ ایک دوسرا رات جا اور سب سے بڑھ کر نہ ایک دوسرا دن دنیا میں کسی کا وجود۔

ایسا آگتا ہے کہ شاعری کے کرنے کے لیے ہمیشہ کوئی خاص کام ضرور رہا ہوگا۔



شمس یمنی

اعترافِ کمال: غنائی حسن اور اخلاقی مہربانی سے مہم تجلیات کے لیے جو روزمرہ کے تجربات اور دھڑکتے ہوئے، فاضل اور محنت بخشی ہیں۔

انگریزی زبان کے مشہور شاعر و دانش ور ڈاکٹر جی طرح شمس یمنی ہر انسان کو زمین کے بچے کی طرح پیش کرنے کی قہرمت رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک شاعری اس زمین کی طرح ہے جس میں اس چلا کرتی کو اہمیت ملتی ہے۔ اس کے مطابق کھدکی بودیاں ایک خاص انداز میں ماضی کا احساس دلاتی ہیں۔ یمنی کی سب سے زیادہ بھرپور اور معنی خیز نظم از منبر مقدم کے س انسان کے تجربے سے متعلق ہے جس کی مہمت جنت لینڈ کے علاقے میں کھادی ایک دور کی میں حدود کی ہوتی تھی ہے۔

شاعر شمس یمنی شامی انڈینڈ کے در حکومت بناسٹ (Ballast) کے مغربی علاقے میں ایک زراعتی دہانے میں 1939 میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے شمال سے جنوب کی طرف ہجرت کی جس کی، اس کے اپنے قول کے مطابق، فیوڈل وچ شامی "نویسنڈ کے ہاسپٹل کی محتاط ادائے تم غشی تھی۔ یمنی اپنے والدین کی جانب سے ملے والے تجربہ کی بھرپور تہارت کے ذریعے گاہ کرتا ہے قرآن کی محتاط تم غشی کے بارے میں بے صبری کا مظاہرہ بھی کرتا ہے۔ یمنی اس بات کا اعتراف بھی ہے کہ شمال سے جنوب کی طرف ہجرت میں اس کے لیے شاعری کے لیے خطرہ بھی ہیں۔ قرآن ایک ہی مرفس میں وہ یہ بھی کہتا ہے۔ "رودہ جب بھی کچھ لکھتا ہے تو ایک گونڈ

احسانِ قلم سے دوچار رہتا ہے۔

شاعری کے علاوہ بی بی نے نثر میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اپنے مضامین کے مجموعوں The Government of the Tongue (1938) اور The Place of Writing (1989) میں شامرو اور شاعری پر بات کرتے ہوئے بی بی لکھتا ہے کہ شاعر حسن کی بقا کا قوس مار رہتا ہے، خاص کر ن وقوں میں جب کہ جبروتِ حائض اس کو مٹانے کے حربے جوہ۔ خواہ ایک آزمائش کی صورت میں ہو۔ بی بی نے اپنے دور کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہو رہا ہے کہ ہم لوگوں نے اپنے درمیان موجود افعال کو ناممکن کر دیا ہے۔ بارے میں کبھی کھل کر بات کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ مگر وہ کہتوں کہ عیسائیوں کے احسانِ بخشش کو تسلیم کرنے پر بھی راغبی نظر نہیں آتا۔

بی بی نے 1990 میں Phloxes نامی نثر لکھی اور اسے نوابی جیل میں The Cure as Troy کے نام سے پیش کیا جو کھیل بھی گیا اور بہت پسند کیا گیا۔ اس کا یہی بی بی کی شاعری سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ اس کھیل میں وہ بی بی کی تخلیقی مسکن کو شاعرانہ انداز میں کامیابی سے برتا دکھائی دیتا ہے۔

بی بی کی شاعری 1960 میں اس وقت منظرِ عام پر آئی جب وہ اور اس کے کچھ شاعر ساکنی آئرلینڈ کے ادب میں ’دہشتانِ شمال‘ کے نام سے پہچانے جانے لگے۔ حالانکہ بی بی اپنے لفظی کلمہ معرکے اور سبب میں اپنے ساتھیوں سے منفرد تھے مگر وہ بھی نئی مسکن سے بہرہ ور تھے جن کی گود میں پیدا ہوئے اور پیدائش چھنے کے باعث وہ اور اس کے ساتھی وہ سب کچھ سمجھتے ہیں جو ایک ربع صدی سے آئرلینڈ میں شدت اختیار کرنے والے مذہبی جنوں اور فرقہ وادیت کا شاخسانہ تھا۔

فیمس بی بی اپنے والدین کے نوجوانوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس کا باپ شمالی آئرلینڈ کے قصبے کاؤنٹی ڈیرن میں واقع پچاس ایکڑ مرقعے پر پھیلے ہوئے ایک زرعی پیداوار کے بارے میں جد زمت کرتا تھا۔ اس کی مصلیٰ قوم دینی سوشلوں کی خرید و فروخت تھی۔ بی بی کی ماں کا تعلق دیہات کے ان افسانہ نگاروں سے تھا جہاں کے باسی کارخانوں میں کام کرنے کے رشتہ کرتے تھے۔ بی بی نے بھی اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ دو مختلف دینی اور صنعتی معاشروں کی چیدوار ہونے کے باعث ایسے ماحول میں پیدا ہوا تھا جس نے اس کو خاموشی اور شور و غلوں کا ایک عجیب امتزاج دیا تھا۔ اور خاموشی اور تکلم کی دو زبان کا تعلق ہی اس کی شاعری کو جنم دیا ہے۔

شمالی آئرلینڈ میں اپنی تعلیم کی تکمیل اور شادی کے بعد وہ جنوبی آئرلینڈ کے دارالحکومت ڈبلن منتقل ہو گیا اور 1976 سے وہیں مقیم ہے۔ 1982 سے بی بی فنِ خطابت کے پروفیسر کی حیثیت سے ہارویڈ یونیورسٹی سے جب کہ شعر و ادب کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے آکسفورڈ یونیورسٹی سے منسلک ہے۔ اس کی ادبی تفادات اور اسناد سے فخر چاچکا ہے۔

بی بی کی نکلوس کا پیدا مجموعہ Death of a Naturalist 1956 میں شائع ہوا اور آخری مجموعہ 1991

میں شائع ہوا۔ جب تک اس کے شاعری کے کلاں کی پورنٹری مضامین کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

خطبہ

شاعری کے حق میں

سب سے پہلے جب میں نے اسٹاک ہوم کا نام سنا تھا تو مجھے خیال بھی نہیں آیا تھا کہ میں کبھی اس شہر میں قدم بھی رکھوں گا، اس سے قطع نظر کہ میں یہاں سویڈش کابلی اور ڈنمک فاؤنڈیشن کے مہمان کی حیثیت سے آیا ہوں۔ اس وقت میں سوچ رہا ہوں کہ ایسا ہونا صرف میری توقعات سے پرے ہی نہیں تھا، سچ تو یہ ہے کہ اس کا تو میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس صدمہ کے چوتھے عشرے میں جب میں County Derry میں ایک پھیلتے ہوئے شاذان کا سب سے بڑا بچہ تھا، ہم سب تین کمروں پر مشتمل ایک مٹی دار لڑی میں ٹہرے ہوئے، ایک قسم کے تاریک اندر رہ رہے تھے جس میں کم و بیش ہڈیاں اور ہڈیاں و مانا ہمارے بیرونی دنیا سے محفوظ تھے۔ یہ ایک ذاتی و جسمانی اور عقلی زندگی جس میں صرف کمرے کی دیوار کی موٹائی کے فاصلے پر اسٹیل میں بندھے کھڑکی کی آوازیں، دوسری جانب و قلم اور پانی خانے سے آتی ہوئی بارغ سانی آوازوں میں گھل مل جاتی تھیں۔ ہم وہ کچھ سمجھتے رہے جو ہمارے اطراف ہو رہا تھا۔ بیڑوں پر بہت پانی، دو چھتی کے اندر دیکھتے ہوئے چوبے، گھر کے عقب سے گزرتی ہوئی ریلوے کی پٹری جاتی ریل گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ۔ ہم یہ سب کچھ اسی طرح سمجھ رہے تھے گلیا ہم مر رہے تھے (hibernation) کی کیفیت میں مست پڑے ہوئے ہیں۔ تاریخ سے پرے، طبیعت سے نا آشنا۔ قدامت اور جدیدیت کے درمیان جھومتے، ہم ویسے ہی اٹو گیر اور حساس تھے جیسے کہ ہمارے دور پانی خانے میں بہت دھونے کی ہوئی کے قریب رکھی ہوئی کاپی۔ جب بھی گزرتی ریل گاڑی زمین کو لرزاتی، پانی کی سطح پر بڑی نزاکت سے ہر ہر کنارے سے مرکز کی طرف و مرکز سے کنارے کی طرف، تھوڑا خاصوٹی میں آتیں چلتی۔

گھر ہمارے لیے صرف نہایت ہی جیس پتی تھی، ہمارے اطراف پورا پورا موجود ہوا کبھی ہمیں ایسے ہی اشارے دیتی تھی۔ جب ہوا سفید کے درختوں کو مرانی، تو شاہ بلبل کے درخت کی سب سے اونچی شاخ سے ہندھے ٹیلی گراف کے ہار بھی لرزے لگتے۔ نیچے کی طرف چلتی تو، پاور پتی خانے کی کھڑکی کے کھنکھنے میں موجود سورخ سے، سیدھی ہمارے ریڈیو کے اندرون سنت میز دانوں اور کٹلی چمچ کا بیونچاں آجاتا اور اچانک اس سے آتی ہوئی ہڈی کی کھیر میں پڑھنے والے کی آواز ایک غیر متوقع deus ex

machina (1984) میں لکھا گیا ایک ابتدائی کمپیوٹر ٹیم جس میں جکی بار آواز کا بھی استعمال کیا گیا تھا۔ مترجم) معلوم ہوتا ہے۔ وہ آواز بھی ہمیں اپنی خواب گاہ میں صاف سنائی دیتی، اس کے پیچھے سے دوسری فائن جس موجود ہوں کی آوازیں بھی سنیں اور جیسے کہ ہم کٹر سنتے رہتے تھے، ہرگز کے پیچھے اور دور سے شروع، کان کے پردوں کو چھیدنے والی morse code کے سگنل کی آوازیں آتیں۔

اپنے والدین کے مقامی لیجر میں لیے ہوئے نام بھی سنائی دیتے، اور شریں پڑھتے والے کے گویا جتے ہوئے ٹھکانے کی سیج میں بمبارجہ زوں کے دوران شریوں کے نام بھی جی پر بمباری ہوتی، جنگ کے محاذ پر ڈیوڈوں کے نام، گھرے چائے والے جہ زوں کے اور قیدی بٹائے چائے، اسلے سپاہیوں کے نمبر، ہونے والے نقصانات، اور پیش قدمی کی تفصیلات اور ہمیشہ کی طرح، ہم دوسرے متبرک اور نرے ڈیجٹل سے پائے ہوئے الفاظ "ڈنچن" اور "تھاوی" وغیرہ بھی سنتے۔ اس کے وجود، دائمی تشنگی کی کوئی بھی شریجھ میں کبھی دہشت بن کر دھل نہ ہوتی۔ اس شریں پڑھنے والے کے بچے میں کوئی نامہ رک بات ہوتی تو ہم سمجھتے کہ کچھ دیر پہلے ہو رہا ہے اور اگر اس وقت اور اس مقام پر کسی سپاہی کو کوئی ناقابل موافقت بات ہوتی تو ہم سمجھتے کہ ہمارے تحفظ کے ضمن میں کوئی مثبت بات ہوگی، جس کے لیے ہم میسر تحریر رہتے تھے۔

دوسرے فکروں میں جنگ کا زمانہ میرے لیے سوچا ہی سے قبل کا دور تھا۔ کچھ قبل از تاریخ جیسا۔ ایک طرح سے تاریخی دور سے بھی پہلے کا۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا میں باتوں کو فور سے سننے لگا۔ میں صوفی کے تجھے پر چڑھ کر اپنے کان میڈیو سے ذرا نیوا قریب کر لیتا۔ شراب بھی میرے لیے ٹھیک کی کوئی شریجھ تھی، میں جس چیز کی تلاش میں ہوتا دو تیسری کوئی ایسی بات جو یگانہ یا تنہائی پیدا کرے، بدھ توں جاسویں Dick Baron کی کہانی تھی، بادشاہ برما جاسویں Capt. W.E. Johns کا مہمانی قصہ جو ریڈیو کے لیے دوبارہ لکھا گیا تھا، رائل ایئر فورس کے ایک باکمال ہوا باز Biggles کے بارے میں۔ اب چوں کہ دوسرے بچے بڑے ہو گئے تھے، دوسری خانے میں زیادہ جہاں بکھل رہی، اپنی سماعت کو مجتمع کرنے کے لیے مجھے ریڈیو کے ڈنکل قریب ہو جانا پڑا تھا اور ریڈیو کے ڈنکل سے جہاں بوجھ کر قریب ہو جانے کے باعث میں دوسرے فکروں کے ریڈیو اسٹیشنوں کے نام سے آشنا ہو گیا تھا، مثلاً لارپ ٹو۔ اوسوں اسٹیشن کا رٹ ورڈ اور اور بلاشیہ سٹاک ہولم۔

اب مجھے غیر ملکی زبانوں سے بھی تھوڑی غلہ ہد ہو چکی تھی۔ جب سوئی ریڈیو کے ڈنکل پر چھلٹی تو بی بی سی سے، ریڈیو Breann، اور لندن اور ڈبلن کے لیجہ سنائی دیتے تو، اگرچہ میں یہ نہیں سمجھ پاتا تھا کہ یورپی کلام کے آئی بارکان میں پڑنے والے حلق سے نکلنے والے اور سکائی جیسے الفاظ میں کیا کہا جا رہا ہے، دنیا کی دستوں اور اس سے بھی پرے کا میرا سفر شریوں کو چکا تھا۔ آگے چل کر میں سفر زبانوں کی دستوں کا سفر بن گیا، ایسا سفر جس میں سرحد پر خود وہ شاعری میں ہو یا کسی کی زندگی میں، ایک زمین ہوتا

ہے، منزل مقصود نہیں۔ اور یہی وہ سفر تھا جو مجھے اس مختصر مقام تک لے آ رہا ہے۔ اب بھی، یہ ششماشی مجھے ایک رہنے کے بجائے، ایک خدائی اٹیشن جیسی محسوس ہو رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی زندگی میں کتنی بار میں خود کو ہونے پر چھٹنے کی محاشی کی اجازت دے رہا ہوں۔

میں شاعری کو اس کا یہ حق دے رہا ہوں جس نے اس خدائی جہاں قدی کو ممکن بنایا ہے۔ میں یہ حق فوراً دے رہا ہوں اس لیے کہ میں نے حاب ہی میں اپنے ایک مہرے میں خود کو (اور جو کوئی بھی اس کو سنے اس کو) "walk on air against your better judgement" کا حکم دیا ہے۔ مگر میں حتیٰ حق دے رہا ہوں اس لیے کہ شاعری بیوقوف حقیقتوں پر اثر انداز ہونے کے لیے ویسا ہی ذی جس حکم دے سکتی ہے جو شاعر کے اندرون کے قوانین پر بھی اثر انداز ہو، بالکل ایسی طرح جیسے بچوں میں قبل باور پگھلانے کی بالٹی میں پھرے پانی کو کٹھ پتھر سے مرکز کی طرف اور مرکز سے کنارے کی طرف پھوڑے آتے جاتے تھے۔ یہ حکم جس میں باختر سم، اس قامت کو پچھپچھ گئے جس کو ہم نے اپنی نشوونما کے دوران سنبھال رکھا تھا۔ وہ حکم جو ہر اس شے کو تسکین دیتا ہے جو دانش کی بھوک بڑھائے، اور محبتوں میں قائل ٹرٹ ہو۔ میں شاعری کو اس کا حق دیتا ہوں، خود اس کے اپنے وجود پر اور سمیڑوں کے لیے مددگار ہمارے پورے دل کے مرکز اور اس کے دائرے کے زمین سیال اور بھولنے والے رشتوں کو ممکن بنانے پر، ریڈیو کے ڈائل پر موجود اسٹاک ہوم کے لفظ پر نظریں جماتے والے بچے اور اس آدمی پر جو بڑے اہم ترین لمحے میں سٹاک ہوم میں سامنے آنے والے چہروں کے سامنے کھڑے ہیں۔ میں اس لیے حق دے رہا ہوں کہ یہ اسی کا حق ہے، سارے عالم، ہر فرد میں، زندگی سے اس کی مٹی محبت بنانے پر۔

سب سے پہلے تو میں چاہتا تھا زندگی کی سچی کھل تبارک حافل ہو، اور مجھے مسرت ہوئی جب مجھے یہ نظم بالکل راست انداز میں اپنا مقصد بیان کرتی گئی، اس دنیا کی نمائندگی میں، جس کی مدد کے لیے اس کو چھٹا یا تیار تھا۔ سکول کا غائب نم ہونے کے باوجود مجھے جان کیس کی نظم "To Autumn" بہت پسند تھی اس لیے کہ یہ زبان اور حسیات کے درمیان ہمہ پہچان کے صندوق کیسہ (ark of covenant) کی مثال تھی۔ اپنے مہر ہونے میں، اپنی فیر وکی ہدایت کے لیے، جو سرسستی اور درد کے درمیان مساوات پیدا کرتی تھی مجھے یہ رڈ مینو یا پکھر بہت پسند تھا، جس سے میں اپنی طرح واقف نہیں ہوا تھا جب تک میں نے اس کو پڑھا نہیں تھا۔ مجھے کسان جیسی درختی درخت کساد کی کے لیے رابرٹ فراسٹ پسند تھا، جنگ کی شاعری کے لیے Wilfred Owen اچھا لگتا تھا، ایسی شاعری کے باعث جس میں عہد نامہ جدید کی حسیات نقصان اٹھاتی ہے اور نئی صدی کی مہمیت کے عہدے پر داشت کرتی ہے۔ اس کے بعد پھر مجھے اتھاقی کے طور پر Elizabeth Bishop کے انداز میں، Robert Lowell کی عمدہ اور اچھاتی میں اور Patrick Kavanagh سے مزید متاثر ہے میں مجھے مزید وجوہات نظر آئیں جن کی بنا پر میرے خیال میں شاعری میں یہ کہنے کی صلاحیت اور اسے دہانے کے "pay the planets" سے مراد ہے "not concerned"

with Poetry

کسی فن سے، جو چیزوں سے اس کی موجودگی کیفیت کے مطابق سمجھنا اور انکس میں مزاح کے مطابق برتاؤ کرنے کی میری عادت اس تجربے کی بنا پر ہوئی تھی جو شمالی آئرلینڈ میں میری ولایت، نشوونما اور اس میں طویل قیام کے باعث چڑی تھی، اگرچہ اب، تقریباً ایک چوتھائی صدی سے میں اس کے باہر قیام پذیر ہوں۔ میرے خیال میں دنیا کا کوئی بھی عرصہ اپنی پیدائش، حقیقت پسندی پر ہمارے غلامانے سے زیادہ غر نہیں کر سکتا ہے اور نہ کوئی عرصہ اس خطہ بہت بد تو قعات کی نمودی پر قدرتی لگائے پر اپنے آپ کو اتنا اذیت سمجھتا ہے۔ لہذا، کچھ تو اپنی نشوونما کے دوران اپنے طور طریقوں کو بالکل بدلنے کے نتیجے میں اور کچھ جزوی طور پر اس سے حفاظت کی خاطر میں نے خود ہی اپنے وجود پر ایک نئی جھلک پیدا کرنے کی کوشش میں برسوں اپنے آپ کو ویس اسٹونز اور ریجہ مارٹی رکھے جیسے مختلف خیالات کے شاعروں کے بنی مکتوب اور وصیت بیان سے، نیم دن سے باز بھی رکھا اور دوسرے بھی رکھا اور لے بھی لکھیں کہ اس کی بلوریں واقعیت کے باعث شرکت میں پیدا ہونے والے، دوشادہ برق زدہ، دمازدہ دوسے ہر ٹھہرنا ہلا اور اہلیت کی قدرت انگیز تعمیراتی ہستیوں سے کنارہ کش رہا۔ شاعریاں کو ایک عام انسان سے نہ تھکا رہنے کے انکار سے بھی میرے ان کم و بیش پتیل طریقوں کو استحکام دیا تھا اور ان (شاعروں) کو مزید ترغیب کروا دیا کہ مسلسل جاری رہنے والے سیاسی تھکد کے دوران عمومی توقعات کے مطابق خود کو ایک شاعر کی طرح پیش کیا کریں۔ عمومی توقعات سے مراد صرف شاعرانہ کردار ہی نہیں، بلکہ ایسا سیاسی منصب ہے، جسے آپس میں خدشہ کرنے والے گروہ بھی ہر غرض میں قبول کریں۔

ایسے حالات میں، ذہن اس حقیقت پر تکیہ کرنا چاہتا ہے جس کو بیسویں جاسوس نے اپنے بے مثال حقیقت کے ساتھ 'the stability of truth' کہا تھا، اس کے وجود کو وہ خود اپنے کا بڑا بار کی اصلیت اور استغناء رکھنا پسند کر لیتا تھا۔ خیر کی کلیاتی تربیت کے شعور کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ مختلف نوع کے جلالہ خیال کی آمات کا وہ ہے۔ خوب گاہوں میں اس سے بچہ، 'نیش گریو' کا وہ ہے اور نہ ہی کوئی ریڈیو پر بولے جانے والے سرکاری مجبور سے ساتھ ساتھ متعلق رہتا ہے، جب کہ عقوبت سے آنے والی پریشان کن آوازیں بھی اسے پریشان کرتی رہتی ہیں، وہی بچہ اسکول بھی بھیجا جا رہا ہے اپنی بوخت میں پیش آنے والی مشکلات کے حل کے لیے، ایسے مستقبل کے لیے جس میں اس کو بہت سے اخلاقی، جہاد، ماسکائیڈ، سیاہی، بیانی، دیکھتہ ہی، مسالعی، مثالی اور ماحول نوآبادیاتی فیصلے دینے پڑیں گے جو ایک تقریباً ناممکن کام ہوتا ہے۔ سو اس طرح ہوا کہ ساتویں عشرے کے دو دہان میں نے خود کو ایک اور بھی چھوٹے سے گھر میں پیدا کیا، اس بار ڈبل کے جنوب میں واقع County Wicklow میں، اپنے ہی ایک نئے خاندان میں اور ایک معتد وسط کے ریڈیو کے ساتھ، چڑیاں پر پڑتی موبلا دھار بادش کی آوازیں اور گھر سے قریب بمباری کی دھڑک Provisional IRA کی نہیں جہ شمال سے آئے والے loyalist paramilitaries کی بمباری کی خبریں

سننے ہوئے۔ اپنی مشکلات میں ناتوانی کے احساس کے ساتھ جب میں 1930 میں Osep Mandessiam کے قسمت میں کھینے کی لمباک شہنشاہ پر چڑھتا ہوں تو، نتیجہ ہونے کے وہ جود میں خود کو ایک مقابے کی کیفیت میں پاتا ہوں، مثال کے طور پر جب سنتا ہوں کہ میرے اسکول کے نمائندے سے ایک فہانت خوش مزاج دوست کو ایک سیاہی قتل میں موٹ ہونے کے شبہ میں، اخیر مقدمے کے جمل میں ڈال دیا گیا ہے۔ جس چیز کی میں خواہش کر رہا تھا وہ یہ کہ انتظام ہی میں بلکہ نظریے صداقت کی دلدل ناراحت سے فرار تھا، جو ایک طریقہ تھا شاعری کے احرام کا، بغیر شوش یا معذرت کے۔

امریکی شاعر Archibald MacLeish اپنی ایک نظم میں، جو عجب نمونوں میں سب سے نادر، متقبل ہوتی تھی، جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اس نے جمیل نگارگریک سے مذاہا صل کی تھی اور پھر اس کو پھول کی صورت میں اوروں کو مہیا کر دیا تھا، کہا تھا کہ "ایک نظم کو بچ نہیں بلکہ بچ کے نامہ ہونا چاہیے۔" شاعری کے اس نئے کے بارے میں مذہبیان کہ شاعری بچ ہوتی ہے مگر آڑھ میں حاجت زد دست بھی ہے اور صلیب بھی۔ پھر بھی اکثر اوقات ہمیں آہستہ آہستہ وضاحت پڑ جاتی ہے، جب ہم چاہتے ہیں کہ نظم یہ صرف مغرب انگیز حد تک صحیح ہو بلکہ یہ جبر، مافی سے مسمو بھی ہو، نہ صرف دنیا پر ایک متعجب تفسیر کا باعث ہو بلکہ خود دنیا کی ہم آہنگی بھی کرے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تعجب ایک بے خبری سے، بارے ہوئے غلے کی طرح متعجب ہو جو غیر متوقع طور پر نیلی وٹن کے لبے پر لگنے سے اس کی تصور کو اپنا تک درست کر دیتا ہے، یا بجلی کے اس غلٹنے کی طرح ہو جو لگنے پر وہ کی بے غلٹم و جڑ کی کو گھج رفتار پر ڈال دیتا ہے۔ ہم دیتی چاہتے ہیں جو Leningrad کے تیرخانے کی قطار میں کھڑی، سالن کی ظالمانہ حکومت کو چیلنج ہوتی، ٹھنڈک سے نیگلوں عورت، خوف کے باعث سرگوشی میں شاعرہ ایسا اٹھاتا تو اسے کہہ رہی تھی کہ وہ اس کا مذاہیان کر دے اگر وہ اس کا حق ادا کر سکتی ہو۔ اور یہی خواہش، County Wicklow کے محفوظ کردہ حالات میں تھی، مجھے جس کا تجربہ ہو رہا تھا، جب میں نے یہ مصرعے جو بھی پیش کیے تھے، کھسے تھے۔ شاعری کو ایسی ہی تعریف کی غرور ہوگی جو چند دقتی تھی میں نے ایک حکم کی مانند ان الفاظ میں پیش کی تھی

"true to the impact of external reality and sensitive to the inner laws of the poet's being"

1968 سے 1974 تک شانی آئرلینڈ میں رہنے والے : تعلات کی بیرونی حقیقت اور اندرونی

حرکیات تبدیلی کی، یا تبدیلی کی تبدیلی، اور وہاں مشیہ، کلیت کی نظر میں بہت اخیر سے ہونے والی تبدیلی کی نشان دہی کر رہی تھیں، اور ساتھ کے عشرے میں سڑکیں پر ہونے والے احتجاج سے اٹھنے والے فیبر کے دھٹ ان تبدیلیوں کو بہت پسے ہو چکا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور خوف کے جوڑے بہت عرصے سے سے جاری تھے، ان میں سے ایک چیز نے کھما شروع ہو گئے۔ جب کہ سینے میں چھپ چھپا ہوا اخلاق پرست باشندہ IRA کی ظالمانہ سیاست اور قتل و غارت پر اندوہ کرنے پر مجبور تھا، اور اس کے اندر کا "نیارہ

آئرش "بمب نوئی نوئی" کے 1972 کے Bloody Sunday کی جنگ دہلی پر مبنی تھی، جب کراچی کا قسبی باشندہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کا قائل ہوتا چاہتا تھا کہ اس کے گروہ پر حملہ کیا جاتا، اور دوسروں کے مقابلے میں اس کے ساتھ سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطحوں پر کیا دہلی ہو رہی تھی۔ اس ہشتادے کا تصور ایک تو موقع کی شاعرانہ سچائی کے ساتھ تھا، یہ اس دہلی کے ساتھ کہ گمشدہ گزشتہ کو بھی بھٹنا چھلنا ہے تو تبدیلی کا ہونا لازمی ہے۔ مگر اس ہشتادے کا دور کہ اس سچائی کے ساتھ تھا کہ جس سے دہلی سے FA تبدیلی کے لیے زور ڈال رہی ہے وہ اس اعتبار کے لیے جہاں گن تھا جس کی بنیاد پر نئے امکانات کی عمارت تعمیر ہو چکی تھی۔

اس کے باوجود جب تک کہ بمب نوئی حکومت نے Labor کے شاہ پرستوں کی 1974 میں ہونے والی Sunningdale Conference کے بعد کو سخت فیصلہ آسانی کے سامنے کھینچے نہیں تھک دیے تھے، کچھ راستے پہ چلنے والا دہلی اس وقت بھی امید کر سکتا تھا کہ حالات سے بہتری کی توقع کی جاسکتی ہے، اور انہی امید افزا ہے اور کیا تھا کہ گن ہے "میں تو ان دنوں بے قرار رہنے کے لیے دہلی کرنا چاہیے جو بیرونی طاقتوں نے نصف صدی قبل کرنے کی کوشش کی تھی، یعنی، "ایک ہی تصور میں حقیقت اور انحراف کو برقرار رکھنا"۔ پھر بھی، 1974 سے 1994 تک کی جنگ بندی کے عرصے میں اس امید شکن حالت ہوئی۔ تب نیچے سے ہونے والا ہشتادہ پورے چھ بیس برسوں کے بعد دوبارہ سے نئے نئے انتظامی تھک دے، انصاف کا خواب حقیقت کی سنگدلی میں غرق ہوتا، اور عوام ایک نئی صدی کے زلزلوں کی لور دہلی کی پامال کے لیے تیار ہو گئے، سخت ہوتے ہوئے دہلی کے لیے اور تنگ ہوتے ہوئے امکانات کے لیے، جو سیاسی یک جہتی کا، زخم خوردہ شکایت کا اور محض جذباتی خود کشی کا نتیجہ تھا۔

پوری تاریخ کے جبر خراش بحالت میں سب سے جبر خراش محمد شام "فرینڈز کا تھا جب، 1976 میں، مزدوروں سے بھری ایک بھی بس نہیں گھر پہنچنے جا رہی تھی کہ راستے میں اس کو بھٹیہر بند نقاب پوش افراد نے روک لیا اور بس کے تمام مسافروں کو بدھوی کی ٹوک پر سڑک کے کنارے گھرے ہونے کا حکم دے دیا گیا۔ پھر ایک نقاب پوش انہما کرنے سے کہہ "آؤ تم میں دہلی کی بھٹیہر ہے، تو اس طرف نکل آؤ۔" تاقی کی بات ہے کہ ایک کے سوا اس گروہ میں سب پر ہنسنت تھے۔ لہذا، قیاس یہ تھا کہ انہما کرنے والے سب پر ہنسنت غیر فوجی رہے ہوں گے جو امن کا جو بے پھر سے دینے کے مصداق کی تحریک فراتے دہلی کی طرف سے کی جانے والی ہلاکت کا بدلہ لینے کے لیے تھے۔ اس تھا دہلی صرف ایک کی تحریک تھا، جس کے بارے میں قیاس کیا جاسکتا تھا کہ وہ IRA اور اس کے کمانڈر سے ہمہ جہتی رکھنے والوں میں سے رہا ہوگا۔ اس کے لیے یہ ایک غریب ناک لمحہ تھا، مگر اس نے "ہنگامی سے قدم بڑھانے کا ارادہ کیا۔ بیان کے مطابق، سرکاری کے اندر سرے شاہ کے چند کے میں، اسے محسوس ہو چھو اس کے برادر گھرے آدمی نے آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ کو آہستہ سے دبا، جو اس بات کا اشارہ تھا کہ آگے نہ بڑھنا، ہم تمہیں جھوٹا نہیں

دیں گے، ہمیں اس سے غرض نہیں کہ تم کس سبک سے تحقیق رکھتے ہو۔ بد قسمتی سے وہ تھوڑا سا بھڑک کر آگے بڑھا، مگر بجائے اس کے کہ ہاتھوں کی بات اس کی کشنی پر ہوتی، اس کو ایک دھن سے پیچھے کی طرف، دور وکیل دیا، اور ہندوئی ہڈیوں نے ایک آن میں قطار کے تمام ٹوئیں پر گولیوں پر سارا دیں، اس لیے کہ انہوں نے اسے پروڈنٹ نہیں، شاید Provisional IRA کے اکان تھے۔

کبھی کبھی اس خیال کو کہ تاریخ ایک مذبح کی طرح ہوتی ہے، دیکھنا بہت مشکل امر ہوتا ہے۔ اگر نیم خاموشی کی تھی، اگر بے رحم طاقت کے ٹیبلٹوں استعمال کے بعد کچھ رہنے والا اس میں بھڑکی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، پتا دیتا رہی ٹیبلٹ جنوں جب مجھے پتا چلا تھا کہ میرا ایک دوست اس شہرے میں قید کر دیا گیا ہے کہ وہ ایک سیاسی قتل میں موٹ تھا۔ میں یہ سوچ کر اور بھی حیران ہو رہا تھا کہ اگر وہ مجرم تھا بھی تو شاید وہ اس مستقبل کی پیدائش میں مدد کر رہا تھا جس سے استبداد کی قوتوں کو توڑ دیا جائے گا، جب آزادی کے نئے امکانات کے لیے میں ایک راستہ ہوگا جو کام کا ہوگا، کیا شاید تھکا دکا راستہ ہی کچھ راستہ ہوگا۔ ایسا لمحہ خلاؤں میں ٹھکرا دیتے وہی سردی کا وعدہ کرنے کا لمحہ ان خوف ناک اندرونی درجہ بندی، حقارت کی یاد دلانے والا ہے، جس میں انسان کو جسے مانا جاتا ہے کہ وہ کس طرح زندگی گزارے۔ مگر یہ صرف ایک لمحہ تھا۔ ہم جس مستقبل کی تمنا کرتے ہیں، یقیناً اس عمل انتہائی میں ہوتا ہے جو اس کی تھوڑی سی مراد کے کنارے پر کھینچا گیا تھا، جب دوسرے، تھکنے والے کے ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا تھا، پٹنے والی گولی میں نہیں کھینچا تھا، اور کتنا سہانہ تھا وہ ہونے والا تھا ایک باجے جیسا، جس کو بچانے پر کبھی مجبور بھی ہوتا ہے۔

ادب اور لٹریچر کے لیے میں، گناہ گار اور بد شہرہ ہونے میں، حقیقت پسند اور حقیقتی میں نہیں مثبت تا رہ چھوڑنے سے ہوشیار کرتی ہے۔ گولی چھتے کی آواز ہمیں چوکھا کر دیتی ہے اور ظالم اس کو برداشت کرنے کی قیمت اور نوک و دوکاتا ہے۔ ہم صحیح معنوں میں Paul Celan کو شاعری کی انٹیکس کے بحر میں غرق ہیں اور صحیح معنوں میں سیویٹل جینٹ کی مسکارتی جیسی آواز کے مزید، اس لیے کہ یہ دلوں اس دست کے ثبوت ہیں کہ وقت آنے پر فن ہی مدد کرتا ہے اور کبھی طرے، نتیجہ بن جاتا ہے Celan کے ہونوکاٹ سے بچ جانے والے ماضی کا، اور فراموشی مزاحمت کے دوران بھٹ کی سنجیدہ بہادری کا۔ اسی طرح، ہمارے اس شے پر شہرہ کرنے میں حق بجانب ہوتے ہیں جو ایسے حالات میں بہت زیادہ اذیت مند حقیقت ہے۔ اور اسی طرح بیسویں صدی کے آخری دنوں کی راتیں ہماری تہذیبی ورثہ کو شدید امتحان میں ڈالتی ہے۔ کوئی بہت ہی احمق یا محروم شخص بھی اس حقیقت سے غم نہیں ہوگا کہ ہماری تہذیب کی دستاویز خون سے لیریا شکوں سے گھرے ہوئی ہے، اور یہ خوں اور یہاں تک، اصلی خون اور اصلی اشکوں سے کبھی طرح بھی کم نہیں تھے۔ اور جب یہ راتیں ورنہ رہتھان، USB اور سرائیں اور دنیا اور دنیا جیسے بہت سے دشمنوں جیسی حقیقتوں کا سرک بن جاتا ہے تو نہ صرف انسانیت کو اس کا حق دینے کو جی نہیں چاہتا جس میں بہت قیمتی امکانات ہوتے ہیں، بلکہ کسی فن پارے کو بھی کٹی مثبت میں نہیں چلا جاتا۔

یہ وہ تھی کہ میں نے سوچا کہ میں نے جتنا کہ مراقبے میں رہا تھا، بالکل اسی طرح جیسے بد مذہب کا کوئی بیوقوف سمجھتا ہے کہ وہ دانی کا پرہیزگار ہے، کیونکہ مندی کے ساتھ اپنے ادراک کے طور پر اس کو شش میں ہوتا ہے کہ وہ دیکھ سکو کہ میں نے اپنے جسم کے وزن کو اٹھا لیا ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ دلیرانہ شخصیت نہ ہو، ان جان فوٹ اثر کو سنبھالنے کے قابل نہیں، مگر اپنے اصولوں کی قیام پر مجبور رہا، یہ عمل دہرنا ہے۔ اپنی حقیر حرمت سے چنگاریاں، رائے کی کوشش کرتا رہے۔ عقیدے، فراموش کیے، ایک عمل کی طرف پوری قوت سے متوجہ۔ یہ ہے ہمیں حسیوں پر مبنی قوت، مگر اس حقیقت کی طرف متوجہ جس کا حسی درجہ ہو۔ پھر بد مذہب اور مندی کے ساتھ اپنے وطن کے قریب رہا، حالات کی فہم برداری میں نہیں، بلکہ ان کے بدحواسی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ جہت کی قیام میں نے اپنے حساب اور اپنے تصور میں جھگڑائے کی کوشش کی، ایک تجب انگیز شخصیت کے لیے بھی اور ایک قائل کے لیے بھی۔ اور میں آئرلینڈ کے ایک قصبے کی مدد سے، ایک دیکھ راس تھریڈ شدہ دست بندی کے مفہوم کی نمائندگی کی کوشش کرتا ہوں گا۔

یہ قصبہ ہے ایک اور بیوقوف (monk) کا جو بد مذہبی اور بد مذہبی سے اپنے حالات سے بد آواز کی کہ رہا تھا۔ کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ ایک ناخوشی عدتے Glendalough میں St. Kevin صلیب کے انداز میں ہاتھ پھیلائے اپنے گھٹنوں کے مل کھڑا تھا، دعا اور مراقبے میں تھا۔ یہ قصبہ ہمارے علاقے County Wicklow سے زیادہ دور نہیں، جو آج بھی پورے ملک میں سب سے زیادہ گھٹنے منگیوں اور تپسیوں پر مشتمل علاقے کے درمیان واقع ہے۔ بہر حال، جب St. Kevin دعا کیہ مراقبے میں تھا، ایک کواں اس کے پیچھے ہاتھوں کو ایک بیسر سے جیسی جھڑکھڑکی کر رہی تھی اور اس نے اس پر ہاتھ ڈال دیا اور غولہ بنانے میں مشغول ہوئی، گویا یہ کسی درخت کی شاخ تھی۔ اس وقت کے ساتھ ہی St. Kevin پر رحم کا جذبہ غالب آیا اور اپنے عقیدے کے مطابق اس کو ہر جسم کی مخلوق سے محبت کرنے کے خیال کے زیر اثر وہ ٹھٹھکیا، دونوں ہاتھوں اپنے ہاتھ پھیلائے، جس و حرکت کی طرح گھڑا رہا تھا کہ انڈوں میں سے لکڑی گرہنے پھانر کر گئے۔ یہ اگرچہ عام فہم کے اعتبار سے ناقابل یقین واقعہ تھا، مگر زندگی سے قریب، نظری عمل و تصوراتی معیار کے چوراسے پر نظر آتا ہے، مگر ساتھ ہی ایک سنگ میل اور دوبائی کے مترادف بھی تھا۔ یہ شاعری جیسا کہ ہمارے جس میں ہم کم از کم اس درجے تک پہنچ سکتے ہیں، اپنی نشوونما کے دوران ہم نے جس کو سنبھال رکھا تھا۔

جیسے کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں St. Kevin کا قصبہ آئرلینڈ سے متعلق ہے۔ مگر یہاں آگیا ہے گویا یہ ہندوستان، افریقہ اور بحرہند میں امریکا میں سے کسی کا بھی ہو سکتا ہے۔ میرا اس سے یہ مطلب نہیں کہ میں اس کو لوک کہانوں جیسے سمجھتا ہوں، اس کو شریعتی سیاق و سباق میں کسی مخصوص تہذیب سے منسوب کرنے کے لیے کی قدر و قیمت کے بارے میں حساب اٹھا رہا ہوں۔ اس کے برعکس، اس کا بھروسہ کے قابل اور سفر کے قابل ہونا اس کی مقامی کیفیت پر منحصر ہوگا۔ میں اس کو آج کل کے قاعریں میں ایک نوازا دیتی

نمونے جیسے تصور کر سکتے ہوں، جس میں Kevin ایک ٹیک ہل بادشاہ کے طور پر ابھرتا ہے (یا مہاراجہ کے مقابل ایک سٹیف کی طرح) یہ جو شاہی زندگی میں قتل ہوتا ہے اس کو استعمال کرتا ہے اور اس کی دیرینہ ماحولیات میں دھت گردی کرتا ہے۔ اور میں صرف کہتا چاہتا ہوں کہ اس میں یہ نظر پوشیدہ ہے کہ اس کا اس طرح احوال اور تحفظ کیا گیا ہے کہ اسے "فرش و راحت کا حسن" دیا گیا ہے۔ Kevin کا واقعہ بالآخر، Giraldus Cambrensis کی تحریروں میں ملتا ہے، جو مارٹن حملہ آوروں میں سے ایک تھا جس نے دسویں صدی میں انگریز پر چڑھائی کی تھی۔ وہی، آئرش زبان کے، ہیر Keating Geoffrey نے بھی پانچ سو برس بعد جس کا ذکر ان کتابوں کا مطالعہ تھا جنہوں نے مارٹن "فرش و راحت" میں قتل کی تھی "کے خلاف میں تذکرہ کیا تھا۔ اس کے باوجود میں اب بھی اپنے آپ کو اس بات پر راضی نہیں کر سکتا کہ "مارٹن" کے ماضی اور حال میں اخصاص یا نہایت کی نوعیت کے جو بھی واقعات ہوئے ہیں ان کو صادق سے بتدائی عیسائی تاریخ کا انکشاف کہہ کر منہ رنجیدہ جائے۔

اگر دیکھا جائے تو یہ فیصلہ ہی تھا جو ایک نہایت مختلف مسئلہ سے نکلا تھا SLKEVIN جس کا حوالہ تھا۔ اس کے باوجود اس عمل میں مظلومانہ دل لے پہلے ہی، یہ خود دھت اور ایک خود مسرتی سے مقبول انسان کی نمائندگی ہوتی تھی، سوائے اس کے کہ اس مرحلے پر جو آدمی تھا وہ Orpheus کے کردار میں تھا اور اس کی سرمستی دعا سے نہیں، موتی سے برآمد ہوتی تھی۔ یہ عمل خود ایک مختصر سر تراشا ہوا سیکھ تھا اور میں اس کا خاکہ کھائے بغیر نہیں رو سکتا تھا۔ نہ میں اس شخص کی موت کی ہوتی تفصیل نقل کرنے سے باز رہ سکتا جو نمائش کے لیے لگی گئی تھی پاس سے منتقل تھی۔ اس خاکہ کے نے اپنی قدامت آباد رکھی کے باعث مجھے متاثر کیا تھا مگر شخصیت پر دست کی ہوتی تصویرت نے بھی مجھے متاثر کیا تھا، اس لیے کہ اس پر، ایک نامور ایک اعتبار نقش تھا، اس کے دہسے میں جس کو میں خود مجھے تین عشروں سے مان کر دیکھ رہا ہوں۔ تعارف کی محنت پر لکھا ہوا تھا "ایک نذر نہ جو شاید مقامی شاعر Orpheus کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ Hellenistic فن کا ایک مقامی نمونہ۔"

ایک بار پھر، میں امید کرتا ہوں کہ میں جذباتی نہیں ہو رہا ہوں، یہ مقدسیت کو محض طلسمیت کے طور پر پیش کرنے کی مویش کہہ رہا ہوں، جیسے کہ ایسی صورتوں میں ہم لوگ کہتے رہتے ہیں۔ اس کے بجائے میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ اس قسم کے قصے یا خاکے اس موقع پر جن کا ذکر کیا گیا ہے، انداز کے پرچہ برداروں کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس تبدیلی نے ہتھیاروں کی قوت سے ماسی ازم کی شکست دیکھی ہے، مگر سوجھ بوجھ کا نزل، دوسرے عناصر کے علاوہ، نظریاتی مطابقت کے ساتھ ہم "مٹی" پر اصرار کی خدمت سے ہوا تھا، اور ان تبدیلیوں میں سے اور نظریاتی مڑاوتوں سے جو ایسے قصوں میں متحرک انداز میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اگر ہم نے، کسی قوم کی تہذیب اور اس کی قدامت پرستی کو کسی معیاری و خارج کرنے والے نظام میں ترقی دیتے ہوئے شوق زدہ ہونا بھی سیکھ لیا ہے تو، شاید ہمارے پاس کیسے کی ثبوت موجودگیوں نہ ہوں کہ نسلی اور مذہبی وراثت پر غرضیت کی جتنی میں کر رہا ہے، ہماری بیداری کو، مقامیت سے محبت و رہا

ہر، اتحاد کے باعث، کم رتبہ نہیں مرنے چاہیے۔ اس کے برعکس، مہاراجے کی قوت پر، ہر سفر کے چالوں
 ہونے پر اتحاد کی بنا پر ایسی ایسی دنیا کو ن امکانات کا حق دینا چاہیے۔ جس میں ہر مذہب کی ہر مذہبی ایک
 قوتوں کا سیاسی نظام کی بنیاد اور اس کی شریعت کی کا جواز ہوگی۔ باوجود یہ کہ مذہب کی قوتوں کا غارت گری کے
 سیاسی ہلکتوں اور تنہا کئی، عقیدوں پر مبنی مذہب کے اندام کے رشتوں کا باعث ہوئے ہیں فلسطینیوں اور
 اسرائیلیوں میں، افریقی اور وسطیہ کام فی کانوں کے درمیان، اور، طریقے جس سے یورپ کو تقسیم کرنے والی
 دنیا کا انہدام ہوا ہے، اور آئینی پر دے آٹھ دیکھ گئے ہیں، یہ سب کچھ ہمیں امید دلاتے ہیں کہ آئینہ میں
 بھی ایسے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس مسئلے کی سب سے بڑی دشواری مذہبی قوتوں اور کوشش مذہبی
 عقیدوں کی بنیاد پر جزمیہ کی مسلسل تقسیم میں ہے، اور شمالی آئرلینڈ میں محبوں کی تقسیم مسلسل میں ہے جو
 آئرش ورکرز کی ورکشپ کے درمیان جاری ہے، مگر اس ملک کے ہر باشندے کو امید رکھنی چاہیے کہ
 تکراری میں شامل تھیں ایسے، دور سے بنا سکتی ہیں جو اس تقسیم کو ایک منس کوٹ کی جان جیسا بنا سکتی ہیں،
 ایک ایسی حد بندی جو پھر تیسے لین دین کی، ملکہ بھیرور منہ تیسے کی، ور مستعمل کی پیش بندی کی، جس میں وہ
 توانائی جو ہمارے "شمن" اور "اشوری" جیسے ناک کے درمیان بہہ رہی تھی، ایک دن کھڑے تاروں اور
 بالکل کم بندش کرنے والی لٹ سے پیدا ہوگی۔

تھریوٹر کی قیاس جب اس شہر نشین پر شاعر ڈیوئی ہینس بیتا ہو تھی، زخم زخم آئرلینڈ خدشہ
 جنگی کے رب سے نکل رہا تھا جو مذہب کے تسلسل سے آزادی کی جنگ کے نتائج کا شکار تھی۔ اس میں
 ہونے والی جدوجہد تھوڑے عرصے میں چلی اور 1923 میں ختم ہو گئی تھی، اس کا ہوا کے لیے ہینس کی ملائی
 کے تقریباً سات، دہائی، عمر یہ خانہ جنگی بہت خراب اور وحشیانہ تھی، جو آنے والی کئی نسوں تک، آئرلینڈ کی
 چھبیس خود مختار کا تعمیر کی سیاست پر، اثر انداز ہوئی رہی تھی، آئرلینڈ کا وہ حصہ جسے Irish Free State اور
 بعد میں Republic of Ireland کہلائے۔

ہینس نے اپنی نوٹس تقریر میں شاید ہی خانہ جنگی یا جنگ آزادی کا ذکر کیا ہو مگر سیاسی امانوں کی
 تعمیر اور تخریب کے جوڑوں کو اور سماجی زندگی کی بنیاد کی طرح انداز کی fouderng کی نزاکت کو
 اس سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا، مگر اس موقع پر اس نے بجائے اس کے آئرش لی مائیک موومنٹ پر بات
 کرنے کو ترجیح دی تھی۔ اس کا قصداں تحریک کے تحقیقی مقاصد سے تعلق تھا، اور اس میں نہ صرف ہینس کے
 ہینس کا کڈلتی ممد رتھا، بلکہ اس کے دوستوں John Mangan Syrige اور Lady Augusta Gregory کی شرکت بھی، تحریک کی تاریخی خوش قسمتی تھی۔ وہ سٹیڈن کی تھی، دنیا کو یہ بتانے کے لیے کہ
 شاعروں اور ڈراما نگاروں کا مقامی کام کے وطن اور ان کے دور کی تبدیلی میں تقابلی اہمیت تھا کہ کوریڈر
 فوجوں کی چھاپا مار، مگر یہاں۔ اور اس کی اعلیٰ پائے کی نظر میں اس کی نئی ترقی دیکھنی تھی جیسی کہ ایک
 عشرے کے بعد اس کی نظم "The Municipal Gallery Revised" میں پائی تھی۔ اس میں ہینس قصداں یہ

اور پینٹنگ کے ذریعہ نظر آتا ہے جو حایہء آستانہ کے واقعات اور شخصیات کا جشن منانے کے لیے رکھی گئی تھیں اور یہ چارکس کو حساس ہوا کہ سچ کچھ مہم سزا کی ہو گئی ہے اور پھر اس نے لکھا تھا:

This is not, I say,

The dead Ireland of my youth, but an Ireland

The poets have imagined, terrible and gay

اور پھر نظم ختم ہوئی ہے، ان دو مصرعوں پر، جو اس کی نظم کے سب سے زیادہ اہم مصرعے تھے:

Think where man's glory most begins and ends,

And say my glory was had such friends

دنوں کی وسعت دینے اور بیکان پیدا کر دینے والے یہ مصرعے شاعری کو اپنے آپ کو ثابت کرنے کے بجائے نئی جہتیں دھانسنے کی راہ جو بے مثال ہیں۔ یہ ایک فاتح کھلاڑی کے یا آخری پتھر کے مراحل ہیں جو فتح سے ہم کنار ہونے کے بعد تماشائیوں سے شہر سزا کی کے شور پر تکیا جاتا ہے، اور اگر یہ (مصرعے) وہی کچھ بات نہیں کہتے جو میں کہہ رہا ہوں تو یہ نیا شایع تصبیح و کلمات سے نیا وہ کچھ در نہیں۔ دراصل مجھے اس نظم کے کچھ اور نکلے بھی آپ کی نظر کرنے چاہئیں۔

You that would judge me, do not judge alone

This book or that

اس کے نیٹکس میں آپ سے وہی کچھ کہنے کی درخواست کہیں گے جو پیش نے اپنے سب مہین سے کہا تھا، کہ ان آئرش شاعروں، اردو نویسوں اور ماہر نگاروں نے، جن میں میرے بہت چھوٹے دوست بھی شامل ہیں، چالیس برس کی محنت سے جو کچھ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اس پر غور کریں۔ اپنے ماہر نے مشورہ دیا تھا کہ وہی معادلات میں ان لوگوں کی رائے قبول نہیں کر لی جائے۔ جتنوں نے خود کو قابل ذکر کام نہ کیا ہو، اور میں نے اس مشورے پر عمل کر کے کوشش کی ہے، اس لیے کہ یہ مشہور عالمی ادیبوں کی طرف سے آیا ہے، صرف ہمارے اپنے ملک کے ادیبوں کی طرف سے نہیں، اور اس بات نے میری ان کوششوں کو زیادہ مستحکم کر دیا ہے جو میں نے تمہیں پہلے Belfast میں شروع کی تھیں۔ آج میں جس آئیڈیل میں مطمئن ہوں وہ ہمارے بلند مرتبہ آئرش ہم عصریوں کے تصورات کا نتیجہ ہے۔

اس کے دو جوہر پیش کرتی افکاش و نگار تھا، آراستگی تھا، ندرت تھا۔ ہماری صدی کی شاعری کے باب میں اس کی دو کتابیں "Nineteen Hundred and Nineteen" اور "Mediations in Time of Civil War" آئرش ادب کا تقسیم سربا ہے۔ آخری نظم میں، ایک ٹھونسے پر اس کے مشہور شعراء ہیں، جو ایک جتانے اس کے درستی کے قریب کی پرانی دیوار کے ایک شگاف میں بنائے تھے۔ شاعر اس وقت مارتن دور کے ایک جتانے نر مکان میں قیوم ہیں، اور پھر ایک اس کے تصور نے پرواز کی، یہ دیکھ کر کہ ظالم اور طاقتور حملہ آوروں نے فن کاروں اور مصوروں سے ہمارے ملک تہذیب و تمدن کی بنیادیں مضبوط کی تھیں۔ تو

اس نے ہندو کو اپنے بھروسے کو نذرِ افراتفرات کرنے کے عمل کو شدید کبھی پر منطبق کرنا شروع کیا، یہاں متعجبو
شعری حالات کی گہرائیوں میں تہہ نشین ہے اور ہمیشہ جفاکش، ہم آہنگ اور ہتھیارِ دوست، مشترکہ کی سعی
خیزی پیدا کرتا ہے۔

وراندوں میں، دشت و بیابان کے اکڑے پستری
شہد کی تمہیں، مٹھائی پائی ہیں
ہندوئے میں سب سے بڑے لیے خوراک لگتے ہیں
مرگ و دیوار کا کھڑا چاقو ہے
شہد کی نگہیں آؤ
جنگی بیٹا کے اچھے گھونسلے کی دھڑکنا دیکھو

ہم اپنے گھر میں یوں محبت میں گھبرا
ہم میں ہے جتنی، قس ہے اور قس، کتنی عورتیں جا رہی ہیں،
دوسری قس ہو رہی ہے
کسی کا گھر بھلا جا رہا ہے
کسے محبوب چل رہا ہے
شہد کی نگہیں آؤ
جنگی بیٹا کے اچھے گھونسلے کی دھڑکنا دیکھو

لکاتے چھروں کی درجہ بندی
ہوئی ہے خاتہ جنگی تم سے تم چھوڑ کر
تقی شب اس سڑک پر ایسا لڑھکایا گیا تھا
یک مرد، خوش خبر لا شہر کی ہے کس پانی کا
شہد کی نگہیں آؤ
جنگی بیٹا کی اچھے گھونسلے کی دھڑکنا دیکھو

ہم اپنے دل کا، حیرت خیزیوں سے دل بھرتے تھے
ہم ما دل بھی وحشی ہو گیا تھا
میں نے کتنی نماشیں
ہم میں دشمنی میں جانے کیا بھر دیا تھا، جز محبت کے
شہد کی نگہیں آؤ
جنگی بیٹا کے اچھے گھونسلے کی دھڑکنا دیکھو

پچھلے پچیس برس کے عرصے میں، 'ازینڈ' کے باشندوں کی لہائی میں نے یہ غم باور سنی ہے، پوری بھی اور جست و جست بھی، اور عجب نہیں کہ یہ زندگی کے لیے خود کو قتل کر رہا ہے، جیسا کہ St. Kevin تھا، اور جو کچھ زندگی میں ہوتا ہے اس میں اتنی ہی سخت دلی، جیسے ہو مر۔ یہ جانتی ہے کہ سڑک کے کنارے پھر رہے درختی قتل ہوں گے کہ کام ختم کر کے مٹی میں موار پتے گھروں کو چاتے ہوئے مزدور پھر قطار میں گھڑے گھر کے گولوں سے بھوننے چائیں گے، مگر یہ پورا حق و حق ہے؟ پتہ ہے ہاتھ دہانے کے قتل کی حقیقت کی مخلوقات کے درمیان ہمدردی اور حفاظت کی واقعیت کو۔ یہ ن متعلق ضروریات کی دل جوئی کرتی ہے، نہایت بھڑائی کیلیات میں ہمارے شعور کو جن کا تجربہ ہوتا ہے ایک طرف تو ایسا ہی پورے کی ضرورت جو مشکل بھی ہو اور انتہائی بھی، اور دوسری طرف اس کی ضرورت جو دہانے کو ہی حد تک سخت نہ کر دے کہ وہ اعتبار اور شیریں دہنی کی خاطر اپنی خواہشوں کو رد کر دے۔

یہ ثابت ہے اس بات کا کہ شاعری کچھ بھی ہو سکتی ہے اور کچھ کے برابری بھی، جس کی مثال وہ مکمل شاعری ہے جو دس کی موت نے اپنا اٹھا تو اسے طلب کی تھی، اور ہر دو سو برس قبل وہی وہی روئے تھیں کی تھی، تقریباً سب سے متے بہتے تاریخی بحار اور ذاتی خوف زندگی کی حالت میں۔

جب Troy کے زوال اور اس سے متعلق ہونے والے قتل عام پر 'ظرب Demodocus' کا ہوتا ہے تو، Odysseus روتا ہے اور ہومر کہتا ہے کہ سب کے صنوبریادہ جنگ میں رونے والی اس عورت کے آنسو جیسے ہیں جس کا شوہر قتل ہو چکا ہو۔ اور اس کی رزمیہ تشبیہ کہتی ہے۔

At the sight of the man paning and dying there,

she slips down to enbid him, crying out;

then feels the spears, prodding her back and shoulders,

and goes bound into slavery and grief,

Precious weeping wears away her cheeks,

but no more precious than Odysseus' tears,

cloaked as they were now, from the company

میں نر و نر بعد، آج بھی، جب ہم اپنے زمانے کی غم خواروں کو اس حد تک پر و مامت دیکھ رہے ہوتے ہیں تو ہمیں ان سے اس قدر واقفیت ہو جاتی ہے کہ ماسونیت پیدا ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، اور اس درجے کی ماسونیت ہو جاتی ہے کہ ہم gulag اور concentration camp کی پرانی newsreels سے کچھ زیادہ ہی ماضی ہو جاتے ہیں۔ ایسی منزل پر ہومر کا تصور ہمیں ہوش میں لاسکتا ہے۔ اس عورت کے کاندھوں پر اور پشت میں پیوست ہر چھبوں کی ہے مٹی وقت اور مزے ڈانوں کو سر جاتی ہے۔ اس کے تصور میں اتنی دستاویزی صورت نہیں ہے جو اس سب کا جواب ہے ہم جس کو ناقابل بنداشت سمجھتے ہیں۔

مگر یہاں ایک اور طرح کی ماسونیت بھی ہوتی ہے جو فقط شاعری سے مخصوص ہوتی ہے۔ یہ ہماری

ساعتوں کے اندر سو جود مند سے متعلق ہوتی ہے، نظم کے بند جس کو پیدا کرتے ہیں۔ یہ موندنیت اس کیفیت سے اخذ ہوتی ہے Mandelstam جس کو "تقریر کے لہجے کی اہمیت قدرتی" کا نام دیا ہے جسے، ہمت اور آزادی سے، پوری ترتیب دی ہوئی نظم اخذ کرتی ہے۔ اس کا تعلق لسانی توڑ پھوڑ اور آمیزش سے، "دوازہ کے گارچہ حاکم سے، لہجے سے، غنائیت سے ورنہوں سے پیدا ہونے والے ایسے دوسرے ہوتا ہے، اسی طرح جیسے نظم کے اغراض، مقصد سے یا شاعری، مست کوئی سے ہوتا ہے۔ دماغی، غنائی شاعری میں راست کوئی ایک دائرے کی مانند پکپکی چلتی ہے جو جس کے اپنے اندر ہی سے وجود میں آتی ہے۔ اور یہ اس کو کا ناقابل تشکیل تعاقب ہوتی ہے، وہ گواہ اپنی حد تک دماغی و فکری Paul Cezan میں ہم آہنگ ہوتی ہے اور جان کینس میں اپنے تمام تر محلوں کے ساتھ ترتیب پاتی ہے، اور یہی شاعر کے ساتھ کہ، طبعی دینے والی تمام دوسری آوازوں کے عقب میں ٹھننے والی مؤثر آواز کی سماعت پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ جو جملے کا ایک اور طریقہ سے کہ میں اس صوفیہ کے ہتھے سے (اس معمولی بندہ سے بھی) نیچے بھی نہیں اتر کر میں یہ وہ نتیجہ ہوا ہوں گا خیروں کی طرف، اور زیادہ متشدد ماحول کا دنیا کی تاریخ اور اس کے پیچھے دور کے غصے پر۔ مگر قمر کی تقریر کے جس مقصد کی طرف میں نے توجہ دی ہے وہ اس کا بیان نہیں تھا کہ اب کیا ہو رہا ہے، یہ اس سے بھی زیادہ پچھتاہ ہے، اس لیے کہ ایک شاعر ہونے کے ساتھ میں، دراصل اس کا ذوق کی طرف توجہ دینے کی پوری کوشش کر رہا ہوں، تاکہ میں موسیقی کے اختیار سے سکون بخشے والی آوازوں کی ترتیب کے استحکام پر غور و ساساں سکوں۔ گویا، پانی کی سطح پر اٹھنے والی لہروں کی پوری وسعت میں پناہ جانا ہو اس کی ترجیح ہو، اس کے ابتدائی نقطے سے، اندر سے باہر، اور پھر سے اندر کی طرف۔

میں شاعری کا مطالعہ کرتے وقت اس پر بھی توجہ دیتا ہوں۔ مثال کے طور پر، مجھے کومپس کے مصرعے "Come build in the empty house of the stare" میں، ارترازی فکر، بھی نظر آتی ہے جس کی صفت کا محور اس کے التجائی لہجے کے ساتھ، "build" اور "house" کے الفاظ میں ہے جب کہ اس کی تحلیل کا عنصر "empty" میں ہے۔ مجھے "fantasies" اور "enigmas" اور "honey-bees" کے تالیف کی محوئی قوتوں کی مبادت، اور پوری نظم کو بخیر، زبان کے فراہم کردہ جگہ میں نظر آتی ہے۔ شاعرانہ پیکر دراصل جہاں بھی ہوتا اور اس کا شکر بھی۔ یہ ایک ہی وقت میں ایسا رہی ہوتا اور قافیہ بھی، اور اس کا ایک وقت فکر بھی جو کچھ دماغ میں مرکز شریز (centrifugal) اور مرکز (centripetal) ہو۔ اور ان کی باہر پھیلنے والی کچھ کٹا ہے جو ضروری شاعری ہمیشہ انجام دیتی ہے، یعنی ہماری ہمدردی و غصہ کی بنیاد کو چھینا، اور اس کے ساتھ ہی دنیا کی ہمدردی و غصہ جس سے مسلسل برہنہ ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں نظم کا پیکر ان قوتوں کے ہے کچھ ترنر نے کے لیے قفسی ہوتا ہے جو شاعری کے لیے ہمیشہ اس کا حق ہوتی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ یعنی ہماری شعور کے ان مازک ترین حصے کہاؤں دکھانے کے لیے، اس کی درستی کے لیے، وجود اس کے طوائف کو تم مخرابیوں کے مثبت کے، ہمیں یاد دلانے کی قوت کے لیے، کہ ہم

اقدار کا ارتکا ر کمنے والے بھی ہیں اور شکا رٹی بھی، کرہا رٹی تہا ریاں اور ہماراں مشکلات بھی اتنی ہی حل دار ہیں، جہاں تک کر دہا رے اسامی وجود کا حقیقی عنصر ہوں۔



کینز ابورو اوئے

اعترافِ کمال۔ جوہی شاعر نہ ٹوٹ سے کہہ سکی تخیلاتی دنیا تعمیر کرتا ہے جس میں حقیقت اور
فہم نے کے ٹکڑے سو جانے سے انس کی موجودہ خوش گوار عادت کی بے ترتیب
تصویر اچھڑتی ہے۔

کلیئر ایڈمز اوئے صرف چھ برس کا تھا جب دوسری جنگ عظیم بمبار ہوئی۔ مرٹھنشاہ جاپان کے حکم پر
جو حاکم الٹی ہونے کے ساتھ ساتھ جاپانیوں کے لیے ایک آسمانی دیوتا کا درجہ بھی رکھتا تھا، جاپان کے ایک
کونے سے دوسرے کونے تک عسکر کی تعلیم و تربیت لائی قرار پائی۔ اوئے نے بچپن میں پہلے داستان گو
دادی سے سنی کہانیاں بھی سن رکھی تھیں جن کے ذریعے وہ مزاحیہ انداز کی باتوں میں نہی چاہے کہ الٹی سے
قومی رہیوں پر تنقید کرتی اور پرانے لوگوں کی طرح دیہات کی ان روایتوں کا دفاع کرتی تھی جو قومی اور ملکی
سوج سے متصادم ہوتی تھیں۔ باپ کے اشتغال کے بعد اوئے کی ماں نے اس کی تربیت کی ذمہ داری سنبھالی
اور اس نے اوئے کی تربیت The Adventures of Huckleberry Finn اور The Strange
Adventures of Näs Hoxgerisson جیسی کتابوں کے ترجموں سے کی۔ بچوں کے لیے جن سے خدا کیے
ہوئے تصورات قہر کی تھانیاں تھیں ان کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ اس طرح اوئے کی بنیادی ڈھانی تربیت
ہوئی اور وہ امر اوئے کو ادبیاتی ماحول کی ملازمت کے ساتھ ساتھ ان قومی سفر ناموں اور تاریخ کا ادماک ہوا جو

آپس میں مصائب نظر آتے تھے۔

اتحادی فوجوں کے ہاتھوں جاپان کی محنت سے جاپان کے قومی اور سیاسی مقدمات میں کسی نگاہی تبدیلیوں کی نہیں جو ملک کے کوئے کوئے میں اڑ اڈا رہیں۔ مطلق انسانیت پرستی کی جگہ جمہوریت کے تجربات نے اوئے کوئی وجہ سے یہاں تک جمہوریت کا والد و شہداء بنایا تھا کہ اس نے پاپ دادا کے دیہات کی زندگی کو خراب و کد کر دیا اس لیے کہ اس کے خیاب میں نئی شہری زندگی ہی کی کوئی راستوں پر ڈال سکے گی جہاں سے ایک امن انگیز اور آزاد خیول دنیا کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔ اگر جاپانی معشرہ اور قوم کی بنیادی اور شدید تہذیبوں سے دوچار نہ ہوئے ہوتے تو شاید اوئے کچی اپنے پڑتھوں کی طرح وادیوں، جنگلوں، درختوں کے پیرواروں کی دیکھ بھال میں اپنی ساری زندگی گزار دیتا۔

جاپان پر جوہری بم کے گرے جانے کے بعد چچا جیسے شہنشاہ کا انسانی آواز میں حوام سے رقت انگیز خطاب ائے کے نیچے سے زمین کے لیے شدید صدمہ تھا۔ جاپانی قوم کی اس منزل نے اوئے کے دین پر کاری ضرب لگائی جس کے رحم اس کی تعلیمات میں جگہ جگہ بکھرے دھماکے ہیں۔ خود اوئے نے اپنی تحریروں کو اس آئینہ کے اٹارنے کے عمل سے تعبیر کیا ہے جو جاپان کی جہاں اور منزل کی صورت میں قوم کے مصائب پر موعظ ہوا ہے۔

جاپان کی اشراقیہ کے مشہور قبیضہ سمورائی کا وارث یہ تاہم ہوئے جاپان کے ایک بڑے جزیرے پر واقع شکی کوکو (Shikoku) کے جنگلات کے درمیان واقع چھوٹے سے وادی گاؤں میں پیدا ہوا جس کی صدیوں سے اس کے آباد اجداد مشیم تھے۔ اس گاؤں کی روایت کے مطابق کبھی کسی نے گاؤں میں چھوڑ دیا تھا۔ اس سر جوہری بم کی تباہ کاریوں سے قبل ہی ہوئے وادی جاپان کی ترقی کی صورت میں رونما ہونے والی تہذیبوں کے زیر اثر گاؤں کے نوجوانوں میں شہری طرف ہجرت کی ہر آنچل تھی مگر اوئے اپنے گاؤں ہی میں مقیم رہے۔ مگر جب غنیم کے بعد کی آتش فشاں اور اوئے کے شعوری تبدیلی نے امریکا کی کوکائیں سے شہر کی جانب ہجرت پر اکسایا۔

انہی ہی نبیوں کا طالب علم ہونے اور ان کی ناک و انانیہ کے مطالعے کے دوران اوئے جاپانی فلسفی و صائبے (Wazanabe) کے انکار سے متاثر ہوا جس نے انسانی معاشرے اور انسان کی موجودہ حالت کے بارے میں اس کے ذہن کے امر کی مدد و نظریہ تشکیل کی۔ ہم عصر فلسفی اور امریکی ادب کے گہرے اور پڑشوق مطالعے نے اوئے و شہروں میں بسنے والے انسان کی حالت زار سے آشنا کیا جب کہ بچپن میں ہی ہونے کی باتوں اور ان کے ذریعے نفس ہونے والی روایات نے اس کے ذہن کی بنیادی تعمیر کی تھی۔ اس کش کش و راس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خیالات کی طوفانی نے اوئے کے ذہن کی بنیاد رکھی۔

اپنی تخلیق کی ہوئی خیالی دنیا کے ذریعے اوئے بڑی شہمت سے انسانیت کی ان مشکلات کی تلاش کر رہی ہیں کہ اس کا یہ نظر آتا ہے جو سماجی نہیں بلکہ خالص نفس یا فاعلی ہوتی ہیں۔ سچے یہاں وہی طور پر معذور رہے

کی پیدائش اور اس سے ہونے والے تجربے نے اوائی تخلیقی اوج کو ایسی گہر پر ڈال دیا جو اس کے مادل A personal matter کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔

مادل (1967) The Silent Cry اوائی کی ایک بڑی تخلیق ہے جس میں پہلا ہرود ایک ماکام بغاوت کے دورے میں متردد وگھائی رہتا ہے مگر اصل میں وہ اس مادی کے ذریعے اس پر آشوب دنیا میں بسنے والے انسانوں کے رشتوں، خلوں، انگلیوں، جذبات و رویوں کے متراج ذی صورتوں کو ایک تخلیقی صورت میں پیش کرتا ہے۔ اس مادل کی تخلیق کے بعد اوائی کے ذہن سے خیالات کے ایسے برفانک دھارے نکلنے لگے وگھائی دیتے ہیں جو مختلف ہونے کے باوجود کبھی کبھی ایک نظر آتے ہیں۔ اپنے مادل A Personal Matter میں وہ اپنے معذور بچے کی پیدائش اور اس سے جنم لینے والی مشکلات سے سمجھتا کرتا نظر آتا ہے جب کہ (1969) Teach us to Outgrow our Madness میں وہ بڑے دکھ کے ساتھ معذور بچے کی پیدائش اور جسم کے دوران لاپچا ہو جانے والے دمپ کی تلاش کے دوران ہونے والے کرب انگیز تجربات کی کشاکش میں الجھا نظر آتا ہے۔

اوائی نے 1957 میں اس وقت سمنا شروع کیا جب وہ نوکیلی ویشی میں فرانسیسی ادب پڑھ رہا تھا۔ اوائی کا تخلیقی عمل لسانے کہنے سے شروع ہوتا تھا تو اسے دنوں بعد ہی اس نے اول نکلنے شروع کر دیے۔ وائے کو اس کے پہلے ہی مادل The Catch پر Akutagawa Award ملا۔ 1990 تک اوائی کی، جاپانی زبان میں ترجمہ اور انگریزی میں سات کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ اوائی ابھی یہ قیہ حیات ہے اور جاپان میں ہی مقیم ہے۔

ضیافت سے خطاب

میں ایک ہجرت انگیز جاپانی ہوں جس کا بچپن اور نرکس Nils Holgersson کے جیسا کہ وہ زمردست ذہنی لہو کے تحت گزرا تھا۔ مجھ پر Nils کا اثر اتنا گہرا تھا کہ ایک وقت وہ آیا جب میں سوئڈن کے خوب صورت علاقوں کے نام اپنے ملک کے علاقوں کے مقابلے میں بہتر طور پر سے سکتا تھا۔

Nils کی محبوبہ گھر کی عادت کا جو چھو میرے اربنہ رقصات پر پڑنے لگا تھا۔ میں نے The Tale of Genji سے سرور پائی۔ میں مہاجر اول سے زیادہ بہت محسوس کرتا تھا، اس حد تک کہ میں اپنی میزبان کے مقابلے میں، جو اس مائی گری تخلیق کی خالق تھی، اسل کوئی وہ مگریم کے قائل چاہتا تھا۔ پھر بھی،

Nils اور اس کے دوست نرادران کا شمار یہ کہ ان کے فطیل میں نے The Tale of Genji سے لپٹی اور وہ دوست کیا۔ دراصل Nils کے دل و دماغ دیکھے والے دوست اور مجھ کو اس تک اڑ کر لے گئے تھے۔ کوئی داستانوں کا اہم کردار Genji قاز کے ایک پرے کو اپنی مری ہوئی بیوی کی روح کی تلاش پر مامور کیا ہے جس نے اس کے خیالوں میں بھی آنا چھوڑ دیا تھا۔

روح کی متحرک مفسر۔ اس کے نکتہ تھا، Nils کے فطیل، میں جس کی تلاش میں یورپ کے ادب تک پہنچا تھا۔ میں بہت دیر سفری سے امید کرتا ہوں کہ ایک جاپانی ہونے کے ماتے، ادب اور تہذیب کی تلاش میں صرف ہونے والی کوشش، اس روشنی کا معمولی سا اچھ کا کردار کی جو مطلق یورپ نے انسانی حالت کو واضح کرنے کے لیے شروع کی تھی۔ شاید اس انعام کی نسبت نے مجھے یہ موقع فراہم کیا ہے۔ اس کے باوجود میرے ذہن میں بہت سے خیالات اور تصورات آتے جا رہے ہیں اور یہ مشکل میں نے اس کے حوصلے کو تھکا سکا ہے۔ یہ کیفیت بھی، ایک تھکا ہے، جو میں لہجے کی تمام تر گہرائی سے قبول کرتا ہوں۔ آپ کا شکر یہ۔

خطبہ

مہمہ جاپان، اور میں

اپنی تباہ کن عالمی جنگ کے زمانے میں ایک نوخیز لڑکا تھا۔ میرا قیام جاپان کے مجمع الجزائر کے جزیرے کی کوئی ایک درختوں بھری وادی میں تھا، جو یہاں سے کئی ہزار میل دور ہے۔ اس زمانے میں وہ کتابیں تھیں جنہوں نے واقعی مجھ کو سکھ کر رکھا تھا The Adventures of Huckleberry Finn اور The Wonderful Adventures of Nils۔ اس زمانے میں پوری دنیا پر خوف کی ہری چھائی ہوئی تھیں۔ Huckleberry Finn کو پڑھنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پہاڑوں میں چکر وڑوں کے درمیان رات گزارا، اس طینان کے ساتھ جو مجھے گھر کے، اور کبھی غیب نہیں تھا، میرا ایک معقول عمل ہو گا۔ Adventures of Nils کا ایک ممتاز کردار ایک چھوٹی سی مخلوق کا جن میں ظاہر ہوتا ہے، چاروں کی زبان سمجھتا ہے اور خطرناک مسافرت اٹھاتا رہتا ہے۔ اس قصے سے مجھے مختلف قسم کا جنس کا غیب ہوتا تھا۔ سب سے پہلے تو اسی کو جو چیز ہے کے گھنے جنگوں کے درمیان رہا کر، جیسے کہ میرے اچھ دیا کرتے تھے، مجھ پر یہ مشکلف ہو کر یہ دنیا اس طرح کا بہن سہن واقعی کی آزادی جیسے تھا۔ دوسرے میں نے Nils سے اچھ روٹی محسوس کی اور خود کو اس جیسے ہی سمجھنے لگا تھا، ایک چھوٹے سے شریر لڑکے کی طرف، جو سوینڈن کی لڑائیوں میں اڑتا پھرتا، جنگی قاز کے پرے میں شامل ہو کر ان کے لیے لڑتا رہتا تھا۔ ایک مضمیمہ، باوجود

اور جیو فارفر کے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ آخر کار Nils اپنے گھر واپس آتا ہے اور اپنے والدین سے باتیں کرتا ہے۔ میرے خیال میں اس قصے سے جو اعلیٰ درجے کی مسرت میں نے حاصل کی تھی وہ اس کی زبان میں پوشیدہ ہے، اس لیے کہ Nils سے بات کر کے میں خود کو پاک معاف اور بلند و بالا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کے ان ہی فرانسیسی زبان میں (ترجمے کے بعد انگریزی میں) پتھر پڑے تھے۔

”اے، تو، تو، پڑا یا“

”میں اب ایک بڑا پتھر ہوں،“

”میں گیا پھر انسان!“

میں خاموش کر۔ ”I'm a human being again“ جسے سے مسکرا ہو گیا تھا۔ بڑا ہونے کے درمیان زندگی کے مختلف منازل۔ بچے خاندان میں، چاہتی معاشرے سے اپنے رشتوں میں، اور بیسویں صدی کے آخری حصے میں اپنے الٹا زمانوں میں مجھے مستقل طور پر شکست سے واسطہ پڑا تھا۔ میں مادہ کے سب سے اپنے دور کی نمائندگی کے وسیعے قائم رہا ہوں۔ میں نے آٹھ خود کو دہرایا بھی ہے، بلکہ میں اب ایک بڑا پتھر ہوں، ”ان پتھر انسان“ کہ وہ بار بار آرا ایک قسم کا ممکن محسوس کرتا تھا۔ اس مقام پر اور اس محفل میں اپنے بارے میں اس طرح بات کرنا شاید مناسب نہیں۔ پھر بھی مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ میری تحریر کا بنیادی انداز ہی اپنے ذاتی معادلات سے شروعات کرنے کا، پھر اس کو معاشرے اور بچے دینی سے جوڑنے کا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اپنے بارے میں زمانہ دوبارہ بات کرنے پر آپ حضرات مجھے معاف فرمائیں گے۔

نصف صدی قبل، اس جنگ کی گہرائیوں میں رہتے ہوئے میں نے The Adventures of Nils پرچی اور اس کے دوران دو شخصیت گویاں محسوس کیں۔ ایک شخصیت گوئی یہ تھی، ممکن ہے کہ ایک دن میں پرندوں کی زبان کہنے کے قابل سوچوں گا۔ دوسری یہ تھی کہ میں کسی دن اپنی محبوب پٹخوں کے ساتھ اپنے پسندیدہ علاقے، اسکیٹری بندر کی طرف پرواز کر جاؤں گا۔

شادی کے بعد ہمارے یہاں چھ پھل بچے ہو اور وہ ذاتی طور پر مضور تھا۔ ہم نے اس کو Hikari کا نام دیا، جاپانی زبان میں جس کا مطلب ہے ”نیشی“۔ Hikari جب بچہ تھا تو وہ صرف چڑیوں کی چوں چوں پر ہی گوئی رو عمل ظاہر کرتا تھا، انسانی گوانڈوں پر کبھی نہیں۔ ایک بار موسم سرما میں، جب وہ صرف چھ برس کا تھا ہم نے وہی مکان میں مقیم تھے۔ Hikari نے پھیل سے پرے دور ایک چھڑیوں کی آبی پرندوں (water raiss) کو گاتے شہ، دریا نکل ایک مصرعی آواز میں کہا، ”They are water raiss“۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے بیٹے نے کوئی جاپانی زبان سے کوئی انسانی لفظ ادا کیا تھا۔ اس کے بعد سے، ہم دونوں، اپنے بیٹے سے اپنی زبان میں گفتگو کرنے لگے۔

آٹھ کل Hikari ذاتی طور پر مضور افراد کے ترقی مرکز میں کام کرتا ہے، ایک ادارے میں جو سویڈن کے باروں کے خطیہ پر کام کرتا ہے۔ انسانی سوشلٹی کی ترقیب میں اس کے غور و فکر کی ابتدا پرندوں

کی سے ہوتی تھی۔ Hikari نے میری پہلی پیشین گوئی کی تکمیل کر دی ہے کہ شاید کسی دن میں پندوں کی زبان سمجھ سکیں گا۔ مجھ پر یہ کہنا بھی واجب ہے کہ اپنی بیوی کی وافر نسوانی حالت اور بالوں کے بھر پور رنگ کی ممکن ہوتی۔ وہ Nao کی جنگلی بھٹیوں کی سردار Akka کا نندہ نمونہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک دوسری طرف پیدائش ہے، اور مجھے سب سے بہتر میری دوسری پیشین گوئی کی تکمیل ہو گئی ہے۔

کادابا نے سواری چہا چاہی، وہب تھا جواب کا ٹوٹل، نوا چاہتے کے بعد اسے شیشیں پر کھڑا ہوا تھا اور اس نے "خوب صورت جاپان، اور میں" (Japan, the Beautiful, and Myself) کے عنوان سے خطبہ لیا تھا۔ یہ عنوان، ایک ہی وقت میں، خوب صورت بھی گہرا بھی تھا۔ میں نے انگریزی زبان کا لفظ vague جاپانی زبان کے لفظ amana کے متبادل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جاپانی زبان کے اس کلمے صفت کا انگریزی میں ترجمہ کئی الفاظ سے ہو سکتا ہے۔ جس قسم کا ایہام کادابا نے جان بوجھ کر اختیار کیا تھا، خود اس خطبے کا عنوان اس کی مراد ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ 'Myself of Beautiful Japan' ہو سکتا ہے۔ پورے عنوان کا ایہام پیدا ہوتا ہے جاپانی زبان کے ایک کلمے "no" سے (جو دراصل "of" ہے) جو "Myself" اور "Beautiful Japan" کے آپس میں مربوط کرتا ہے۔

عنوان کا ایہام مختلف قسم کے معانی کی تاویلات کے ساتھ پیدا کر دیتا ہے۔ مندرجہ بالا عنوان "Myself as a Part of Beautiful Japan" بھی ہو سکتا تھا جس میں "no" کا کڑا اسم سے مشتے کی نشان دہی کرتا ہو اس سے پہلے اسم تک چاہیے تھا۔ possession, belonging attachment کے عمومی معنوں میں لیا جاتا ہے۔ اس کے معنی beautiful Japan and myself بھی ہو سکتے تھے جن میں موجود نکلاؤ خدائی اسم کو جوڑا، جیسا کہ کادابا کے خطبے کے انگریزی عنوان میں ہے، جاپانی ادب کے سب سے اہم امریکی ماہر نے جس کا ترجمہ کیا ہے۔ وہ اس عنوان کا Japan, the Beautiful and Myself ترجمہ کرتا ہے۔ اس ماہر نے ترجمے میں اسم از کم مترجم traduttore کو traduttore تو نہیں کہا گیا ہے۔

اس عنوان میں کادابا نے ایک مفروضہ کے متوقف کی بات کی ہے، جو یہ صرف جاپانی خیالات میں پایا جاتا ہے بلکہ مشرقی خیالات میں زیادہ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لفظ مفروضہ سے اس مقدمہ کی مراد جتنی بدوازم کی طرف رجحان ہے۔ بیسویں صدی کا ایک ادیب ہونے کے باوجود کادابا اپنی ذاتی کیفیت و شعور کی پہلی میں چین جوگیوں کی انہی نظموں کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ ان میں سے زیادہ تفصیل سے کہنے کے سہے میں لسانیاتی ہے اسکا فی پتھر مرقی ہیں۔ ان نظموں کے مطابق الفاظ اپنے خول کی حدود کی میں محصور رہتے ہیں۔ قافیہ یہ توقع نہیں کر سکتے کہ الفاظ نظموں سے نکل کر ان تک پہنچ سکیں گے۔ بغیر خود کو مکمل طور پر ان کے حوالے کیے اور اعلیٰ کے بند خول میں داخل ہونے کی دانستہ کوشش کیے، کوئی بھی ان میں نظموں کو سمجھ سکتا ہے اور ان سے بھر پور فی گھر سکتا ہے۔

کادابا نے ان نظموں کو اسٹاک ہوم کے سامعین کے سامنے جاپانی زبان ہی میں پڑھنے کا طریقہ

فیصلہ کیوں کیا تھا؟ میں اتنے زیادہ ماضی کی طرح چلتے کر کا وہ تان کی سیدھی مادیکی دھیری پر حیرت کی نظر ڈالتا ہوں، جو اس نے اپنی اور باندہ زندگی کے انتہام کے قریب پہنچ کر حاصل کی تھی اور جس کی مدد سے اس نے (اپنی نیاں پر) اپنے یقین کا ایسا بھڑکی مظاہرہ کیا تھا۔ کاواہا تا عشروں ایک فن کار یا ترکی رہا تھا، اور اپنی بدترانوں کے دوران اس نے بہت سارے شاہ کار تخلیق کیے تھے۔ پاترا کے ان برسوں میں، اس نے عرف کرنے کے بعد بھی، کڑواہ کس طرح کسی ممکنہ رسائی چاہی انھوں سے مسکود ہوا تھا، جو ان کو پوری طرح سمجھنے کی کسی کوشش کو چکرا کر رکھ دیتی ہیں، کیا واقعی وہ Japan the Beautiful, and Myself پر بات کرنے کے قابل تھا یعنی اس دنیا کے دورے میں جس میں وہ زندہ رہا اور اس ادب کے دورے میں بھی جو خود اس نے تخلیق کیا تھا۔

یہ بات مزید غور کے قابل ہے کہ کاواہا نے اپنا طبع ان اخلاق پر تمام کیا تھا، "میری تخلیقات کو خالی پن، یا سب سے سبکدوشی کی حقیقات پر مبنی ہے، مگر اس کو مغربی دنیا کے نگاہوں کی دین نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح بدھائی بنیادیں ہر نکل مختلف تھیں۔ Dogen نے سوسوں کے دورے میں اپنی ایک نظم کو "Inate Reality" کا عنوان دیا تھا، مگر اس وقت بھی، جب اس نے موسوں کے حسن کے ریت گائے تھے، وہ چین کی گہرائیوں میں غوطہ زن تھا۔"

اس مقام پر بھی میں ایک سیدھی سادہ دلیل دہانہ خود ادھائی کی کیفیت دیتا ہوں۔ ایک طرف تو کاواہا چین فلسفے کی روایات کے حوالے سے اپنی شناخت کرتا ہے، اور جمالیاتی حسیات کے حوالے سے جو مشرق کے کلاسیکی ادب میں رہتی تھی ہے۔ اس کے باوجود دوسری طرف وہ اپنی تخلیقات کے خالی پن کی (مستند) خصوصیت کو آثار دین سے یکسر کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ اس عمل کے ذریعے وہ انسانیت کی "نے والی ان نسلیوں سے مختص ہے انگریز نوٹس نے جن سے میڈیکل باغی تھیں اور جن پر اعتبار کیا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ بجائے اپنے ہم وطن سرگرمی کاواہا کے جو تھیں ہر فن میں اس مقام پر موجود تھا، میں انرش مشاعرہ پر بلرہٹس سے نیا وہ روحانی نسبت محسوس کرتا ہوں جس کو آخر نہ اس کی ادب کا فوسس انجام دیا گیا تھا، جبہ بدترانہ میری ہی عمر کا تھا۔ بدترانہ میں اپنے آپ کو شاعری کے جھنڈے میں کے درجے پر فائز کرنے کی جماعت نہیں کر سکتا۔ میں محض ایک فزوقی اتوا کرتے وال ہوں، ایسے ملک میں رہتا ہوں جو اس کے ملک سے بہت فاصلے پر ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ وہیم بیک نے (سینس نے جس کی تخلیقات کا دوبارہ تعین کیا تھا وہ ایک بلند درجے پر اس کی تہذیب کی تھی) ایک بار لکھا تھا، "یورپ کے "رہا اور ایشیا سے چھٹن اور چالان اکثر کتا بہت ہی مثال۔"

میں کچھلے چند برسوں کے دوران ایک irony لکھنے میں مصروف رہا ہوں، جس کو میں اپنی دہائی سرزمینوں کا مقام اور سمجھوں گا۔ اب تک، میں وہ بعد میں شائع ہو چکی ہیں اور میں نے حال ہی میں تیسری جلد مکمل کر لی ہے۔ چاہی نیاں میں اس کا عنوان ہے A Flaming Green Tree۔ میں سینس کی نظم

Vacillation کا احسن مندر ہوں جس کے ایک ہند مندر سے یہ عنوان لیا گیا ہے۔

ہم نے کلا دیکھا جنگل میں، ایک ٹوٹا ہوا

مکھنوں سے نیچے تک آدھا شعور سے روشن

باقی آدھے پر سرتی سزا سزا بہار

پھر بھی، ہر چہ، ہر کوشش

شہم سے حق نم

چیتھ میرٹی nlogy سر سے پاؤں تک میٹس کی ٹھنوں سے چھلکتی ہوتی ناشر میں شراور ہے۔ میٹس

کے انوم پانے کے موقع پر آئی لینڈ کی پاریمان نے، اس کی تنہیت کے لیے ایک فرار در تجویز کی تھی، جس کے جملے مندرجہ ذیل تھے:

”اس کی کامیابی کے لیے، جس کے ذریعے اس قوم نے ایک قدرتی حاکم کی

ہے، انہی کی تہذیب میں نمایاں اضافہ کرنے والے کی حیثیت سے،

... ایک مکمل جواب تک شائستہ قوموں کے ذمے میں شامل ہیں کی گئی تھی

۔ ہارنی تہذیب کی قدر و قیمت سٹیو میٹس کے نام پر مختصر ہوئی

... ایک خطرہ ہمیشہ رہے گا کہ بھی اس ایک ن لوگوں کی ہمت نہ بھی ٹوٹ سکتی ہے جس کو

تہائی و مردان کی جنونی شدت پسندی سے بحولی اور بھگیا ہو۔

میٹس ایسا اصرار ہے جس کی حیران کی چروٹی گھا چاہوں گا۔ میں ایک اور قوم کے لیے ایسا

گھا چاہوں گا جو اپنی برقیاتی انجینئرنگ کی ٹیکنالوجی اور سوڈ گائیاں بنانے کی مہارت کے باعث، اب

شائستہ قوموں کے ذمے میں شامل کرنی گئی ہے۔ میں اس قوم کے ایک باشندے کی حیثیت میں بھی ایسا

گھا چاہوں گا، جس کی اپنی زمین پر بھی اور اس کی ہمسایہ قوموں پر بھی تہائی و مردان کی جنونی شدت

پسندی کی مہر لگا دی گئی تھی۔

حال میں سرائس پینے والے کسی انسان کی طرح جس کے ذہن پر ماضی کی تلخی تین دہائیوں سے

رہی ہوں، میں کاوا با نا کی گوند سے آواز نہ کر رہا ہوں۔ ”خوب صورت جاپن اور میں“ میں دہرا سکوں گا۔

بھی، اچھو سے قلم، میں نے شمار کاوا با نا کے ٹھپے کے متن اور عنوان کے سپام کے بارے میں کچھ کہا تھا۔

اسی لفظ کے بارے میں، متنازعہ نوٹ شاعر تعلیمین ریٹی کی نئی معنویت کے باعث، اب میں اپنے ٹھپے کے

باقی حصے میں سپام کا لفظ استعمال کروں گا۔ تعلیمین ریٹی نے وہیم بیک کے بارے میں کہا تھا کہ وہ تانید پر منحہ

خیال نہیں تھا تھا کہ بہت تھا۔ میں اپنے بارے میں مزید کہہ نہیں کہہ سکتا سوائے ”سپام جاپن اور میں“ کے۔

میرا مشاہدہ ہے کہ ایک سو تیس برس کی سر سے پاؤں تک تھکے کے بعد موجودہ جاپن سپام کے

متفرد اور متبادل قلمی کے درمیان بنا ہوا ہے۔ میں خود بھی زندہ ہوں، ایک ادیب کی طرح، اس قطعیت

کے ساتھ جو مجھ پر رحم کے ایک گہرے سنگ کی طرح گر رہا تھا ہے

یہ ایام اتحادات و راور چھینے والا ہے کہ یہ سیاست اور مجموعہ دونوں کو ایک دوسرے سے مختلف طریقوں سے جدا کر دیتا ہے، جس کو مختلف انداز سے دیکھا بھی جا سکتا ہے۔ جاپان کی تجدید کا رجحان مغرب سے سست لینے میں مضمر رہا ہے۔ اس کے باوجود جاپان لٹریچر میں سے اور اس نے اپنی علاقائی تہذیب کی اپنی مٹھی میں جتنی سے قحط رکھا ہے۔ جاپان کے ایہام زور و نشان نے اس کو لٹریچر پر حمہ ورجیہ بتا دیا ہے۔ اس کے ہتھیار جدید جاپان کی تہذیب کے دو انیسے پورے طرح مغرب کی طرف، یا کم از کم، تہذیب کے دہجہ میں یورپ کے مزاحم فکر کی طرف کھینچتے ہیں۔ مستزاد یہ کہ جاپان لٹریچر کی طرف سے دوری کے باعث تہذیب ہو گیا ہے، عرفیاتی اعتبار کی سے نہیں، بلکہ اس کی اور تہذیبیں اعتبار سے بھی۔

جدید جاپان کے ادب کی تاریخ میں، شجیدگی سے لکھنے والے اور اپنے ہدف پر نگاہ قائم رکھنے والے دونوں تھے جو کچھ جگہ کے بعد ادبی مضمر پر نمودار ہوئے، مکمل جاتی کے گہرے رحم کھائے ہوئے، اور دوسرے جنم کی امیدیں لیے ہوئے۔ انہوں نے قلم تر مشکلات کے ساتھ ان غیر انسانی بے رحمی کے انالے کی کوشش کی جو جاپانی فوج نے ایشیائی ملکوں میں ڈال رکھی تھیں۔ انہوں نے یہ کوشش بھی کی کہ اس گہرے غم کو بھی پرکریا جانے جو نہ صرف مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں اور جاپان کے زمین و ہلک افراقتی اور لاطینی امریکی محاکمہ جاپان کے ہمدردان بھی حائل ہو گیا تھا۔ اس کوشش کے باوجود کہ وہ سمجھتے تھے کہ بقیہ تمام دنیا کے ساتھ ان کی فاکساری آمیز مشاقت سے یہ خود پڑ ہو سکے گا۔ ہمیشہ سے میری یہ شواہش رہی ہے کہ ہم کو ان ایسوں سے مسئلے میں ملنے والی اپنی ریاست سے مربوط رہنا چاہیے۔

عصر کی جاپان کی سیاست اور اس کے عوام، اپنے ملحد جدید دور میں دوڑنے ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جاپان کے تجدیدی دور کی تاریخ کے بچوں سے دوسری عالمی جنگ وارد ہوئی تھی، وہ جنگ جو خود تجدید کی رقی ہوئی تھی۔ پچاس برس قبل اس جنگ میں شکست نے جاپان کو درخود چٹکیا جاپانیوں کو موقع فراہم کیا تھا کہ وہ اس ہیونیک سارنگے سے صحت لے کر، جنگ کے بعد کے جاپانی دہشتناکی ادب نے جس کی پڑنا شیر نشتر گری کی تھی، نئے جنم کی ہند کر سکیں۔ یہ نئے جنم کے تصور کرنے والے جاپانوں کے لیے جمہوریت نے درگاہی جنگ نہ کرنے کے عہد نے ایک اخلاقی سہارا مہیا کیا ہے۔ انہی اخلاقی سہاراں پر زور دے رہے ہیں جاپان کے عوام اور ریاست دونوں محصور نہیں تھے مگر ماضی میں ایشیائی ملکوں پر حملہ آور ہونے کے باعث اپنی تاریخ کے ہاتھوں رہا ہوئے۔ یہی اخلاقی سہارا ان کے لیے اور ان کی اور دہکے لیے بھی اہم ہو سکے جو سریشما اور ناگاساکی میں استعاب ہونے والے ایٹمی ہتھیاروں اور ان کی تابکاری کے شکار ہوئے تھے۔ (ان میں وہ نزار باؤگ بھی شامل ہیں جن کی مادری زبان کوہیائی ہے)۔

پچھلے برسوں میں جاپان کی اس پالیسی پر تنقید کی گئی تھی، جس کے مطابق جاپان نے شواہش ظاہر کی ہے کہ اسے اقوام متحدہ کو مزید فوجی طاقت مہیا کرنی چاہیے اور اس طرح دنیا کے مختلف خطوں میں قائم

کرنے میں عملی طور پر زیادہ ہاتھ ٹکانا چاہیے۔ ایسی تنقید کو کمزور کے ہمارے دل ڈوبنے لگتے ہیں۔ دوسری بات یہی جنگ کے اختتام پر تائیدی گئی تھی ہم اپنے آئین کی مرکزی شے میں یہ عہد شامل کریں کہ ہمیشہ کے لیے ہم جنگ میں ملوث نہ ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ اور جاپان کو اس سے بعد کی اصول کا انتخاب کیا، جس کی بنیاد پر جنگ کے بعد ہمارے ملے جنم کی ابتدا ہوئی۔

مجھے یقین ہے کہ یہ اصول مغرب میں، جس کی فلوٹ عمر سے ہی روایت برداشت کی رہی ہیں، بہتر طریقے پر سمجھا جاسکتا ہے جس کے تحت شعور کی طور پر فوجی خدمات کو رد کیا گیا ہے۔ خود جاپان میں پچھو فوج نے جنگ سے دست برداری سے تعلق آئین کی شے و مضبوط کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، اور اس کے لیے ہر سے ڈے گئے دیو کا سہا ماہ ہے۔ لیکن، آئین سے بعد کی امن کے اصول و مضبوط کرنے کا عمل، دنیا کے مروجہ سے، اور یہ وہیہ اور ناگامی کے دشمن جہاں کول کا شکار ہونے والے سے بھر رہی کے مترادف ہوگا۔ ایک ادیب کی حیثیت میں میرے لیے یہ تصور ممکن نہیں، کہ اس (نام نہاد) خدائی کا نتیجہ بیا لگے گا۔

جنگ سے قبل کے جاپانی آئین میں یہ مندرجہ شامل تھا کہ جمہوریت کے اصولوں کے مطابق مطلق طاقت کے حوصلے میں کسی حد تک، عوام کی حمایت شامل ہوتی ہے۔ جو اس کے کہ ہمارے پاس، نصف صدی پہلے، نیا آئین ہے، مگر ہمارے (جنگ سے پہلے کے) پرانے آئین کی حقیقتوں کی خواہ۔ میں آج بھی عوامی جذبات کے ایک حصے کی حمایت شامل ہے۔ اگر جاپان اس اصول کے بد نکلس، ہم جن پر نصف صدی سے عمل پیرا ہیں، نئے اصول کو انارے کی صورت دینا چاہیے تو وہ عہد جو ہم نے مابعد جنگ کے عہد پر کٹر سے جو توجہ پر کرنے کی کوشش کے بارے میں کیا تھا، اور ہمارا وہ عہد جس میں ہم نے ایک نئی انسانیت کے تصور کو اجاگر کیا تھا، مانگیں ہوگا۔ یہ ہے وہ آئین ناسیہ، جو ایک عام انسان کی نیان والی ہوا، ہمارے سامنے ابھر رہا ہے۔

جس کو کمزور نے خطبے میں جاپان کا ایہ مژدان بایوں، ایک قسم کی متحدہ باری ہے جو پورے جدید عہد میں غالب رہی ہے۔ جاپان کی معاشی خوش حالی بھی اس سے آزاد نہیں، جس کے جہوں میں، عالمی معیشت اور ماحولیاتی تحفظ جیسے ہر قسم کے ممکنہ خطرات گل رہے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارا ایہ مہم جو رہنا محسوس ہوتا ہے۔ دنیا کی تنقیدی نظر میں ایہ ایہام نیا اور نیا ہوگا، بد نسبت ہمارے جوں تک میں سچے ہیں۔ جنگ کے بعد کی معاشی غمریت کی پست ترین انتہا میں ہمیں بھرنے والی ایک قوت نظر آتی ہے جی، بد نیافت کی امیدوں سے بھی مایوس نہیں ہوتی اور اس کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایسا کہنا شاید عجیب لگے، مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ہم میں موجود خوش حالی سے پیدا ہونے والے نامبارک نتائج کو برداشت کرنے کی پلک بچھو تم نہیں۔ اگر ہم کسی دور ہمارے دیکھیں تو ایک ہی صورت ابھرتی نظر آ رہی ہے جس میں لاپرواہی کی پچھلی ہوتی حالتیں، پیداوار کی اور استعانی و فلوں جاپان کی خوش حالی میں شامل ہو جائیں گی۔ میں ان امیدوں میں سے ہوں جو اب میں ایسی تنبیہ و تخلیقات کی کوشش کرتے ہیں جو خود کو یہ مانگیں سے علاحدہ کرتے ہیں جو لوگوں کی وسیع استعانی

تہذیب، اور دنیا کی ماتحت تہذیبوں کے ٹکس ہوں۔ ایک جاپانی کو کس قسم کی شناخت رکھنی چاہیے؟ لیبی ایچ آئن نے ایک ماہر نوکس کی بیچن، مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا تھا۔

نہایت سے قریب تر

غیظ سے غیظ تر کے ساتھ ہو رہے تھے

اس کی اپنی نرم شخصیت میں، ہونے لگے آہ

تو آدمی کے ساتھ ساتھ کام کی مڑا ہے

یہی ہے جو دیب ہونے کے باعث، جو میرا پیشہ ہے، میری زندگی کے عادت (تقریباً دو) بن چکی ہے۔ ایک مرغوب جاپانی شناخت کی تعریف کے لیے میں لفظ 'decent' کا انتخاب کرتا ہوں گا جو ان معنوں میں سے ہے جس کو جارج آرمیل نے اپنے پسندیدہ کرداروں کے لیے، sane, humane اور comely وغیرہ کے ساتھ کثرت سے استعمال کیا ہے۔ میری شناخت کے لیے، متبادل کیا جائے والا لفظ 'Myself' کا حصہ ہے، گراہ کن حد تک سرور ہے۔ جاپانی کی شخصیت میں ایک وسیع طرز یہ تضاد ہے کہ وہ باہر سے دیکھ کر نظر نہیں آتے جو وہ نظر آتا چاہتے ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ آرمیل کوئی اعتراض نہیں کرے گا اگر میں اس کے 'decent' کو humanist اور فرانسیسی زبان کے لفظ humaniste کے مترادف کے طور پر استعمال کروں، اس لیے کہ یہ دونوں نہ داشت و انسانیت جیسی خصوصیات میں مماثلت کے شریک ہیں۔ ہمارے اجداد میں کچھ نئی باتیں بنائے گئے تھے جنہوں نے جاپانی شناخت 'decent' یا 'humanist' بناتے ہیں نہ ہی محنت کی تھی۔

اسکی ایک شخصیت Kazuo Watanabe کو تھی جو فرانسیسی سائنس دان تھے۔ انہوں نے ادب اور خیالات کا ماہر تھا۔ دھرم کی عالمی جنگ کی شروعات سے قبل اور اس کے درمیان، وطن کی پانچ سوڑیے والی سرزمین کے چہرے کے طور پر رہتا ہے۔ ایک خوب دیکھا تھا کہ وہ جاپان کے راجہ کی احسان جہاں اور قدرت کی اثر پذیری میں انسان کے humanist نقطہ نظر کی قلم کار کی کہے گا، جو ہر قسم سے تعمیر کو نہیں پہنچے گا۔ یہاں یہ کہنا ضروری جانتا ہوں کہ پروفیسر بھٹا نے کا حسن اور نظریات کے بارے میں اپنا ایک نقطہ نظر تھا جو کاہوتا کے مضمون میں جاپان اور میں سے مختلف تھا۔

جس انداز سے جاپان نے اپنے ملک کو یورپی خطوط پر ایک جدید سیاست بنانے کی کوشش کی تھی وہ انقلابی حیات سے متعلق تھی۔ جاپانی دانش ور نے مغرب اور ان کے اپنے ملک کے درمیان پیچا ہونے والے خد کو بھرنے کے لیے، اس سے کئی طرح سے مختلف، پھر بھی جزوی طور پر مشابہ عمل استعمال کیا چاہا تھا۔ یہ ایک محنت طلب کام رہا ہوگا مگر بلاشبہ سرتوں سے ہرگز تھا۔ François Rabelais کا عیسائی مطالعہ جاپانی دانش کی دنیا میں پروفیسر بھٹا کے اختیار کی دانش ور نہ کاہوتا تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران دھنیا پے پیرز میں زینچ تقسیم تھا۔ چپ اس نے اپنے دہلی رہنے کو Rabelais کی شاعری کا چپائی نبوت میں ترجمہ کرنے کے اپنے ارادے سے؟ گاؤ کیا تو اس ممتاز فرنیسی وائش ورنے اس ہو کوا سزمہ نو جوان چپائی طالب علم سے کہا تھا، ”ما قابل ترجمہ Rabelais کا چپائی زبان میں ترجمہ ایک بے نظیر کام ہے ہوگا۔“ یک اور فرنیسی ادیب نے نہایت حیرت سے کہا تھا، ”یہ تو Paragruet جیسا ایک قابل متائش کام ہوگا۔“ اس کے باوجود نہ صرف یہ کہ دھنیا پے نے جنگ کے حالات و فرمائش پر مرثیہ کہنے کے باعث ہونے والی نہایت حسرت کی حالت میں ہوتے ہوئے بھی یہ کام انجام دے دیا، بلکہ اس نے اسی زمانے کے اچھے ہوئے اور بے سمت چپان میں ان فرنیسی انسانیت پرستوں کے خیالات کی فکر کاری کی، یہی سوشلسٹ کی تھی جو François Rabelais سے قبل کے م صحر اور چپ کا مرثیہ تھے۔

میں اپنی زندگی در تحریر دونوں میں پروفیسر دھنیا پے کا شمار رہا ہوں۔ مجھ پر اس کا اثر نہ فیصلہ کن طریقوں سے رہا تھا۔ ایک تو ماویہ نگھے کے میرے اسلوب میں تھا۔ میں نے اس کے کیے ہوئے Rabelais کے تراجم سے بہت سیکھا تھا، جس کی دیکھا نیل بافتن نے ”غرب ادب حقیقت پسندی کا مہم“ تھم میں عوامی قہقہے کی ثقافت“ کے عنوان میں خراج تحسین پیش کیا تھا، یعنی ماویہ اور طبقاتی اصول کی اہمیت، کائناتی، سماجیاتی اور طبقاتی عناصر کے درمیان مشابہت، موت اور دنیا و زندگی کے جنون کی برابری (overlapping) اور دہندہ قہقہہ جو مرثیہ و مرثیوں کو الٹ پٹ کرتا ہے۔

مجھ جیسے لوگوں کے لیے، چین کی پینکشن، دانش و فن چپان جیسے بیرونی اور مرکز سے ہٹے ہوئے ملک میں ہونی تھی، اس مہم کی نظام (image system) نے دنیا میں مانگ اور بی طریقوں سے شنائی کی سہولتیں پیدا کر دی ہیں۔ ایسے پس منظر سے بدتر کرنے کے باعث میں، ایک نئی معاشی طاقت، لشیہ کی تیل جلد ایسے لشیہ کی فائبرنگ کر رہا ہوں جو (بظاہر) کبھی نہ ختم ہونے والے انقلاب اور ایک گزند زخری کا حامل ہے۔ قدیم شراب بھی رنگ استغافوں کے استعمال میں شرکت سے میں خود کو کومو کے ادیب Kim Ji-ha اور چین کے (Chon) اور (Mu Jen) ادیبوں کی صف میں گھرا کر رہا ہوں۔ میرے نزدیک عالمی ادب کی مبادلہ ایسے ہی رشتوں سے مضبوط ہوتی ہے، ساکد بار میں نے قبیلہ کے ایک شاعر کی، ساسی آواز کے لیے بھوک ہرنال میں بھی حصہ لیا تھا۔ اب میں ان رنگ چینی ماویل نگاروں کے بارے میں بہت فکر مند ہوں جس کو Tienanmen Square کے واقعے کے بعد آزادی سے محروم کر دیا گیا ہے۔

ایک اور حقیقت، جس میں پروفیسر دھنیا پے نے مجھے متاثر کیا ہے، وہ اس کا تصور انسانیت پرستی ہے۔ میں اس کو یورپ کا دھڑکتا ہوا جوہر اسی سمجھتا ہوں۔ یہ وہ تصور ہے جو میلان کنڈیرا کی پیش کردہ تعریف، رنچ ماویہ، میں بھی سمجھتا ہے۔ تاریخی سرچشموں کے راست مطالعہ کی بنیاد پر دھنیا پے نے Erasmus سے Sébastien Castellon تک، جس میں مرکزی مقام Rabelais کو حاصل ہے، اور

بھری چہرہ سے متعلقہ خوبیاں، ملکہ، گرینٹ سے Gabrielle Destré تک کی تنقیدی سماجی عمریاں بھی ہیں۔ یہ ذریعے سے دعائے نے چاہیوں کو انسانیت پرستی کی اور خود انسان کی تخلیق کی ہوائی مشینوں کے ٹکڑے تھکات کے بارے میں تحسین دینے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کی سنجیدگی ہی نے ڈائریکٹ کے علم انسانیت کے مائے Kræfner Nyrop کے قوس "ہر لوگ جگہ کے خلاف حقیقت نہیں کہتے وہ چنگیز وگوں کے جرم میں شریک ہوتے ہیں" کی طرف اس کی رہنمائی کی تھی۔ مغربی تصویرت کی بنیاد پر چھپنا میں انسانیت پرستی کی نظم کاری کی کوشش میں دعائے بہت دیر کی سے "Tentrepree inoue" اور "Tete entreprise" "Pansagruéique" دونوں کی مابوں پرچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دعائے کی انسانیت پرستی سے متاثر فری "راپک" اولی نگاری حیثیت میں، میری خواہش تھی کہ لوگوں کو تیار کیا جائے، تاکہ وہ جو لحاظ کے ذریعے پتا، کھیا کرتے ہیں، اور ان کے قاری بنے، اور اپنے وقت کے عصری آواز سے شغلیاب اور بحال ہو سکیں اور ان کی مدحوں پر سب سے زخم مندھل ہو سکیں۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں چاہیوں کی بہم خصوصیات کے متضاد قطبین کے دو مہیا بنا بت چتا ہوں۔ میں کوشش کرتا رہا ہوں کہ جب کے ذریعے میں درد اور زخم سے شغلیاب بھی اور محاس بھی ہو سکیں۔ میں نے اپنے ہمدردان چاہیوں کی شغلیاب اور بھی کی لیے اپنی ہی کوشش بھی کی ہے اور دعا بھی۔

اگر آپ مجھے یاد دلا دیں کہ اس کا تذکرہ کرنے کی جائز دیں تو میں، دولاؤں کہ میرے ذہنی طور پر معذور بیٹے Hikan کو پرندوں کے آوازوں سے بے کرباش اور موت رت کی کے موتی کی نے پہلی، غبار سے حیرت کیا ہے، اور اب وہ خود اپنی موتی کی ترتیب دے سکتا ہے۔ تمہارے بہت کچھ ہے جو اس نے پہلے ترتیب دیے تھے تازہ چمک دک اور فرحت سے معمور تھے۔ وہ گھاس کی بیوں پر بھلا تے ہوئے شہنم کے فطروں کی مانند تھے۔ لفظ innocence ہے اور not hurt سے یعنی not hurt۔ کیا Hikan کی موتی کی ترتیب دینے والے کی اپنی مصومیت کا فطری پہاؤ تھی۔

جوں جوں Hikan موتی کی کے مزید کڑے ترتیب دیتا گیا، ان میں مجھے کسی تاریک روح کی چمکوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ ذہنی طور پر معذور جیسے کہ وہ تھا، Hikan کی چوں فٹوں کوشش نے اس کی موتی کی ترتیب کی ہر مندی میں، یا اس کی زندہ مہنے کی عادت میں، رتقا کا ایک سرایت کرنے والا تصور پیدا کر دیا۔ اس تصور نے اسے وہ وقت عطا کر دی جس سے وہ اپنے قلب میں پوشیدہ گہرے شہ کو دیلافت کرنے کے قابل ہو گیا، جس کو وہ انداز کے ذریعے بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔

"زور سے مانی ہوائی تاریک روح کی آواز" خوب صورت ہے، ہر موتی کے ذریعے میں کے اعظم کا عمل اس کو اندازہ سیاہ سے شفا بخشا ہے۔ مزید یہ کہ، اس کی موتی کی دلیکی مٹے، مانا گیا ہے جو شفا بخش بھی ہے اور اپنے عصری مٹے والوں کو بحال بھی کرتی ہے۔

میرا یہ یقین پوری طرح ثابت نہیں ہو سکا ہے۔ اگرچہ میں ایک کمزور انسان ہوں، اس کا قابل تصدیق

قبولت کے مرتبہ میں اُن میں بڑی غلطیوں کا خمیازہ جھٹلنا پسند نہ کروں گا جو بیسویں صدی کے دوران ٹیکنالوجی اور
 حمل و نقل کی حیثیت نامک ترقی کے باعث جمع ہو چکی ہیں۔ ایک مضائقہ، جاپانی اور امریکہ سے بڑے بڑے
 وجودی حیثیت میں، اپنی محتول، مشائستہ اور نشان پرستائہ شرکت کے ساتھ، میں تسامیت کی شکار ہیں اور صرف
 مندی کے عمل میں یقیناً مرد و معاون ہو سکتا ہوں۔



ٹونی موریسن

اعترافِ کمال۔ جو قوتِ بصیرت اور شاعرانہ شاموں سے مہرِ خصوصیت رکھنے والے، ماویوں کے ذریعے امریکی معاشرے کے ایک اہم رشتہ کو زندگی بخشی ہے۔

ماوی کا رسورس سن ایک اول درجے کی فن کار ادیبہ ہے۔ اس کا کتاب یہ ہے کہ جس مذہب کو وہ رنج اور نسل کی رشتہ بندیوں سے نجات دلانا چاہتی ہے اس کے قلب کی گہرائیوں میں اتر کر اپنے خاندان شاعرانہ شعور سے قاری کو متاثر کرتی ہے۔

موریسن اپنے مضامین کے مجموعے *Playing in the Dark: Whiteness and the Literary Imagination* (1992) میں کہتی ہے کہ اس رنگ و نسل، مرد اور عورت کے امتیاز و رشتہ منیت سے غریب دنیا میں ایک سیاہ فام امریکی عورت ادیب ہونے کے ماتے کچھ کہنے سے پہلے مجھ کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ میں اپنے اخیار کے لیے کس قدر آزادی اختیار کر سکتی ہوں۔ ”مجھ ایک افریقی نژاد امریکی ہونے کے وجہ سے اس کو اب میں بھی آزادی کا ہمارے لیے حدیں مقرر کرنی پڑتی ہیں۔“

اپنے اول *Song of Solomon* (1978) میں سیاہ فام شاموں کے معاشرے اور مذہب کے بیان کے ذریعے موریسن اپنے فن کا ایک اہم نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس ماوی کے ایک کردار کو اس کی اپنی شخصیت اور اپنے آس کی جستجو ہی اس کے ماویوں کی بنیادی نفسِ مقرر قرار پاتی ہے۔

ناول (1987) "Beloved" میں اسی جستجو کے فکر کے بازوؤں کو وسعت دینے کا مکمل موزی سن کی تخلیقات اور فن کا قیاری پہنچا رہا ہے۔ اس کی حقیقت نگاری اور کہانیوں کے ٹکڑوں، اتصال سے پیدا ہونے والی حیرت انگیز قلائد سلیبت موزی سن کے فن کو اعتبار کی بخند کی جھلک دیتی ہیں۔

موزی سن نے چھ پنہاٹے دلچسپ ناول، ڈرامے اور مضامین تصنیف کیے ہیں۔ اس کی تخلیقات بہتے اور ٹھکی ہوئی ہونے کے باوجود رنگ رنگ اور دلچسپ ہوتی ہیں۔ اس کی لطف بیانیہ تکنیک کی جڑیں فاکٹر اور جنوب کے مصنفین سے ملتی ہیں۔ ان کے مطالعے سے انسانیت کے لیے بہت بڑی محرک برے احرام کے جذبات ابھرتے ہیں۔

لوئی موزی سن کا پیدائشی نام نکوینوئی ولفورڈ (Choe Anthony Wolford) ہے۔ وہ 1931 میں امریکا کی ریاست اوہائیو کے شہر نورین (Lorain) میں چار بہن بھائیوں کے ایک عام درجے کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ موزی سن نے شروع سے ادب میں دلچسپی دکھائی۔ اس نے Howard اور Cornell یونیورسٹیوں سے انسانیات کی تعلیم حاصل کی اور کیمیا، بائیالاجی اور پرنسٹن یونیورسٹیوں میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ موزی سن نے ادب کے معاصر کی حیثیت سے بھی کام کیے اور افریقی نژاد امریکیوں کے ادب کے موضوع پر تقریریں بھی کیں۔ بہ حیثیت، ادب کے موزی سن 1970 میں مختصر شہور پہلا روئے ہوئے اور بہت جلد ہی اس کے شاعرانہ قوت سے مملو کتب اندازہ کرنے والے ادب کے مہم میں واپس اپنی جانب مائل رہے۔ موزی سن بہ قیہ حینت ہے اور مامریکا میں تنظیم ہے۔

صیافت سے خطاب

جلالت ملک دوہان شاہی عزت تاب، خواہن اور حضرات!

اس وقت میں اس بال موزی ہو رہی ہوں، جو آج تک ان لوگوں کے خوش گاراڑ سے مملو ہے، جو مجھ سے پہلے اس میں داخل ہوئے تھے۔ ان تمام باتوں کا گروہ مامریکا اور خوشیوں کے حیرت سے پیدا کرتا ہے، اس لیے کہ اس کی فہرست ان مامریکا پر مشتمل ہے جن کی تخلیقات نے تمام دنیا کو میرے لیے دستیاب کر دیا ہے۔ اور ان کے فن کی خصوصیت اور ان فنکارانہ شان نے اپنی جگہ اور بھارت کی صورت سے کٹر میرا دل توڑ دیا ہے۔ ایک مشہور کہنے والی دکان کے ذریعے انھوں نے اپنے فن کی ہر مندی سے

نہ صرف مجھے چیلنج کیا ہے بلکہ میری پوزیشن بھی ٹی ہے۔ مجھ پر ان کے فرض سے بڑا اور فرض ہے جو سینیڈش اکاڈمی نے معزز سائنس میں شمولیت کے لیے میرا انتخاب کر کے مجھ پر ڈال دیا ہے۔ حکومت کے سینے کی ابتدا میں میری ایک فن کار دوست نے ٹیلی فون پر ایک پیغام دیا تھا جس کو میں نے حجاب دینے والی اپنی مشین پر ہفتوں چھوڑ رکھا تھا اور جس کو بار بار چلاتی تھی، اس کی لڑکیاں مسرت اور نشیں سے پُر آواز منے کے لیے۔ ”میری پیاری سنا“ اس کے الفاظ تھے ”ابو نعیم جو تم کو دے رہا ہے وہ ہمارا بھی ہے اور اس کو وصول کرنے کے لیے تمہارے ہاتھوں سے بہتر ہندو کس کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔“ اس کے پیغام کا جذبہ اس میں رہ گیا رجائیت اور اس کے رفیع عقو نے وہ دن میرے لیے ایک تعلیم دین کا دیو تھا۔

سیر جال، میں اس ہال کو ایک نئے دروازہ مسرت گھیرا اور کے ساتھ چھوڑ دیں، اس سے نہیں زیادہ مسرتوں کے ساتھ میں جن کے حواس کے ساتھ اس میں داخل ہوئی تھی۔ مستقبل کے انعام و فنان کے رزہ کے لیے، یعنی ان کے لیے جہاں اس صبح بھی، جب میں آپ سے مخاطب ہوں، ہوں کہ ان کی آمد ہے ہیں، اس کی چھان بین و رہائی کے لیے اسے یوں مختل کر رہے ہیں، جس کا ہم میں سے کسی نے خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر وہ پتاؤں کے اس مندر میں ان میں سے کسی کو جگہ ملی بھی ہے نہیں، میرے خیال میں، ان اسیوں کے اجتماع کا مکان خطا سے ماورا اور رنجت پذیر ہے۔ ان کی آوازیں ماضی کی اور مستقبل میں آنے والی تہذیبوں سے فرمائش کر رہی ہیں، ان بلند چٹانوں سے، جہاں سے ان کے تخلیقات ہم کو ہمیشہ بخود رکھیں گے اس لیے کہ ان کی پلکیں جھپکی ہیں اور وہ ہم سے منہ پھیرتے ہیں۔ اس لیے اپنے پہلے آنے والوں کے تحائف سے بھرپور اپنی بہنوں کی ٹیکہ خواہشات کے ساتھ اور بعد میں آنے والے اسیوں کی مسرت آئیں پیش ہندی کے پیش نظر میں سینیڈش کاڈی کے اس اعزاز کو قبول کرتی ہوں، اور آپ سے اتماس کرتی ہوں کہ آپ بھی اس لمحے میں شریک ہوں، جو میرے لیے ایک لمحہ دل ہوا ہے۔

خطبہ

”کسی زمانے میں ایک ضعیف عورت تھی، ہمارے سے محروم مگر عقل مند“ مگر شاید عورت نہیں کوئی ”دن تھا؟ یہ شاہ کوئی گرویدہ پھر سکون غامت کرنے والے بچوں کا کوئی گرویدہ۔ میں سے مختلف تہذیبوں کے صوم میں، یہ یہ بالکل ہی قسم کا کوئی قصہ پڑھا ہے۔“

”کسی زمانے میں ایک ضعیف عورت تھی، ہمارے سے محروم مگر عقل مند۔“

ایسے قصوں کی عورت و تو کسی غلام کی بیٹی ہوتی ہے، سپاہ قلم، امریکی، و رشیہ کے مضامینات کے

ایک تھوٹے سے مکان میں رہتی ہے۔ محل مندر کے ضمن میں اس کی شہرت ہے مثالی اور کئی شے سے بالاتر ہوتی ہے۔ اپنے لوگوں کے درمیان وہ قانون کی پاسداری بھی ہوتی ہے اور قانون شکنی بھی۔ اس کو عزت دی جاتی ہے اور وہ ایسے جہاں رہے یہ فائدہ سمجھی جاتی ہے جس پر نہ اس کے علاقے کا اور نہ دور دراز کا کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے، حتیٰ کہ اس شہر میں بھی جہاں دیہات کے غریب داس خاص تفریح کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

ایک دن کچھ نوجوان لوگ، جو اس کی مہینہ غیب بنی قانون کو چیلنجی ثابت کرنے لارہی تھی اپنے قیاس کے مطابق، غریبی ثابت کرنے کے واسطے ہیں، اس سے واقعات کے لیے جاتے ہیں۔ ان کا منصوبہ بہت سادہ ہے۔ وہ اس کے گھر میں داخل ہوتے ہیں اور ان کا سوال، اس کی اہم ترین کمزوری، یعنی اس کی کوریجمنٹ سے فائدہ اٹھانے والا تھا۔ وہ اس کے سامنے پانچ کھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں ”بی بی، میرے ہاتھوں میں ایک پرندہ ہے۔ یہاں وہ زندہ ہے کہ مر رہا؟“

عورت کو جواب نہیں دیتی، سہل دہراؤ جاتا ہے ”میرے پاس تو پرندہ ہے وہ زندہ ہے یا مر رہا؟“ وہ پھر کوئی جواب نہیں دیتی۔ وہ مایوس ہے اور اُنے والوں کو دیکھ نہیں سکتی، چہ جائے کہ اس سے واقف ہو سکی کہ ان کے ہاتھوں میں کیا ہے۔ یہ وہ ناک کے رنگ سے متاثرہ تانیٹ سے پانچ کے دھس سے ماہو ہے۔ وہ صرف پانچ کے اردوں سے واقف ہے۔

یہ بھی عورت کی موٹی اتنی غول ہو جاتی ہے کہ آنے والے نوجوانوں کو ہلکی سی مشکل ہو جاتی ہے۔

بالآخر وہ بولتی ہے، اس کا لہجہ بھی اٹھ اٹھتا ہے۔ ”مجھے نہیں معلوم۔“ وہ کہتی ہے، ”مجھے نہیں معلوم کہ جو پرندہ تمہارے ہاتھوں میں ہے وہ زندہ ہے یا مر رہا؟ مگر جتنا میں جانتی ہوں اس کے مطابق وہ تمہارے ہاتھوں میں ہے تمہارے ہاتھوں میں!“

اس کے جواب سے جو مطلب نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر وہ مر رہا ہے تو تم نے اس کو اس حالت میں پکڑا ہے، یا تم نے اس کو مار دیا ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو تم اس کو مار سکتے ہو۔ اگر اس کو زندہ رہنا ہے تو یہ تمہارا فیصلہ ہوگا۔ جو کچھ بھی ہو، ان سب کے لیے دار تم ہو۔

پتی حاکم کی اور اس قانون کو ہے چوڑی کی ناک پر نوجوان مدقاتیوں کی سرکشا ہوتی ہے، اور ان پر واضح کر دیا گیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ انھوں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کی غرض سے کسی کا تشویر کیا، بلکہ ایک تھوڑی سی جان کو بھی قربان کر دیا ہے۔ اس طرح وہ مایوس حاکم کے دوسرے ہتھیاروں پر مارے جاتی ہے جس کے ذریعے حاکم کا استعمال ہوتا ہے۔

ہاتھوں میں پرندے کی موجودگی (اس کے مارک بدن کے علاوہ) کوئی کچھ ظاہر کرے گی مجھے جس میں دلچسپی رہی ہے، یعنی ہر اس کام میں جس کی بدولت میں اس ادارے میں حاضر ہوتی ہوں۔ ہند میں پرندے کو زبان، اس عورت کو ایک ٹکڑے کا ادویہ سمجھنا پسند نہیں آتی۔ عورت پریشان سے کہتا ہے زبان،

جس میں وہ غیاب دیکھتی رہی ہے، جو جس کو پیدائش کے وقت دی گئی تھی، اس طرح استعمال ہو رہی ہے، اس قدر کہ کسی فاسد مفرد کی غرض سے اس موت سے بھی باز رکھی جا رہی ہے۔ ایک ادیب ہوتے ہوئے، وہ زبان کو جزوی غور نہ کر کے لکھتا ہے، اور جزوی طور پر ایک ایسی ذی روح رشتے سمجھتی ہے جس پر اس کو پورا قائل ہے، ایک دوسرے کی حیثیت میں ایک نتیجہ خیز عمل کی طرح، لہذا بچوں کا پوچھا ہوا سوال کہ "یہ زندہ ہے یا مردہ" غیر حقیقی نہیں اس لیے کہ وہ زبان کو موت کا اثر قبول کرتے، معنی کاٹ چھانٹ کرتے، وہ اپنی رشتے سمجھ رہی ہے، بد شہ جو خطرے میں ہے، جس کو کئی ارادے سے ہی بچایا جاسکتا ہے۔ وہ سمجھ رہی ہے کہ اگر وہ لکھتیوں کے ہاتھ کا پرندہ مردہ ہے تو وہی اس مردہ جسم کے قسے دار ہیں۔ اس کے نزدیک ایک مردہ زبان آئینہ نہیں جو نہ بولی اور نہ لکھی جاتی ہے، یہ بے لوث زبان مود ہے، جو اپنی فانی زندگی کو پسند دیتی ہے، نگاہ سے دیکھنے پر مہلک ہے، شامانی زبان کی طرح، اکتساب زدہ بھی ہے اور مکتسب بھی۔ اپنی شیرینی کی ذمہ داریوں میں بے رحم، اس کی ورتائی خوش نشین سوائے اپنی آرزو محض، فنیاتی ذہنیات کے تسلسل کے، احساس اور تسلط کے۔ کتنا ہی قریب المرگ کیوں نہ ہو یہ بے اثر نہیں اس لیے کہ عملی طور پر یہ دانش بردار کر دیتا ہے، شعور کو چاہے کر دیتا ہے، انسانی صلاحیت کو دہرایا کرتا ہے۔ فنیاتی میں غیر زہریلے ہوتا ہے، نہ نئے خیالات، نہ سکتا ہے نہ ان کو برداشت کر سکتا ہے، نہ مختلف خیالات کو سنو سکتا ہے، کوئی اور قصہ بیان نہیں کر سکتا، دھوکا دینے والی نموشیں کو نہیں کر سکتا۔ مادہوں کو منظور کرنے، اور رعایت، مفادات کو محفوظ کرنے کی خاطر کاریگری سے بدلتی ہوئی سیکاری زبان لکس زدہ مکر ہوئی ہے جس کو پوچھنے کے ذریعے ایک پوچھنا دینے والی چٹک دی گئی ہو، اس پوچھنا یا خوب کی حرکت جس سے سورما سمجھنے کا لگن گیا ہو۔ اس کے باوجود یہ موجود ہے۔ گوئیہ شکاری اور جذبہ فانی۔ طیب علموں میں جذبہ احترام کو ابھارنے کے لیے، جامہ تمدن کو چاہے سپا کرنے کے لیے، جو امر میں دماغی دھول اور ہم آہنگی طلب کرتے کے لیے۔

وہ موت قائل ہے کہ لا پرواہی، بے استغناء، بے وقوفی اور عزت کے فقدان سے زبان مرفی ہے، فرمان کے وسیع قتل کی جاتی ہے، تو وہ خود بھی، بلکہ تمام استعمال کرنے والے درہلنے والے بھی، اس کی رحمت پر حجاب دوہرتے ہیں۔ خود ان کے ملک میں بچوں نے بھی اپنی زبانوں کو چھوڑ دیا ہے، اور ان کے استعمال کے بجائے گونیاں استعمال کرنے لگے ہیں۔ اپنی خاموشی کی زبان کے اذکار کے لیے، معنویت اور رہنمائی کے لیے، حتیٰ کہ اکتسابی رحمت کے لیے بھی انھوں نے اپنی زبانوں کا استعمال بالکل ترک کر دیا ہے۔ مگر وہ چاہتی ہے کہ زبان کی خود کشی صرف بچوں کی پسند نہیں ہوتی۔ یہ کیفیت تو بچکانہ سرپرستی حکومت اور حالت کے نامزدوں میں بھی عام ہے، جن کی پھوڑی ہوئی زبان ان کو اپنی بھی لگتی الٹی جہتوں کی طرف رجعت کی اجازت نہیں دیتی، اس لیے کہ وہ لوگ صرف فرماں برداری کے احکامات کی بجا آوری کرنے والوں کی سے کلام کرنے کی زحمت کرتے ہیں۔

زبان کی دانستہ لوث مار کا انداز اس کے استعمال کرنے والوں کے کھاس میدان سے لگا جاسکتا ہے،

جس میں وہ ایمانے دھمکانے اور بعد رن کے پیچیدہ و سازش کرتی تھی خصوصیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔
 ظالمانہ خیالات شہرہ کی نمائندگی سے زیادہ سکھ کا پرچہ کرتی ہے۔ عموماً یہ خود کش ہو جاتی ہے، دانش سے زیادہ دانش
 کی حد بند ہیں کی نمائندگی کرتی ہے، گویا دانش کو محدود کرتی ہے۔ خود یہ سرکاری زبان کا بڑا سبب و قوت اور
 پاپور میڈیا کی مصنوعی زبان کو بگاڑ رہی ہے، خود یہ انکاوش کی مشہور گھر پتھر کی زبان ہو، یہ سائنس کی ماحولیاتی
 زبان ہو، حقوق سے بے بہرہ قوانین کی ملک زبان ہو، الکلیت ہے گاندھ کے نام کی زبان ہو، جو اپنے اپنی
 رخصتوں کی منہوں میں اپنی فنی لوٹ مار کو پوشیدہ رکھتی ہو، ایسی تمام زبانوں کی جتنی شور پر زد کیا جاتا ہے۔
 یہ وہ زبان ہے جو فحش جاتی ہے، جو کنزرویٹو کو پالتی ہے، اپنے فسطائی جتنوں کو احترام اور حب وطنی کے
 کمرے کے اٹھاپ لیتی ہے، جب وہ بے رحمی سے نتیجے کی طرف ورا بھرتے ہوئے زمین کی طرف مڑتی
 ہے۔ جنسی زبان، سلی زبان اور جو دہائی کی زبان۔ سب حکم چلانے والی زبانیں ہوتی ہیں، جو دہائی دانش کو
 قتل کرتی ہیں اور نہ خیالات کے بلکہ انکی حمایت لے کر اچانک سے کھینچ لیتی ہیں، نہ دیتی ہیں۔

وہ عمر رسیدہ عورت اچھی طرح جانتی ہے کہ نہ کوئی رزخ و دانش وہ نہ تیرہ میں امر، نہ کوئی عیادت
 ناں پر متعین ہوئی رہتا، اور نہ کوئی جعل میں فی کبھی اس کے خیالات کی طرف مائل ہونے لگا۔ ایک بیدار
 کرنے والی زبان ہمیشہ موجود ہے، جو باشندوں کو بھیدوں سے لیس رکھے گی، جس کوئی سب سے گی جو
 ہزاروں میں، دہائیوں میں، ایک نئیوں میں، کھینچ کے میدانوں میں، خواب گاہوں میں اور شاہیوں پر تخت و
 تختوں سے گزرتی اور ساقی سے گزرتی جو دہائی کو بھولتی اور یاد دلاتی سب سے غیر ضروری اسوات میں
 اٹھانے کے حجاب میں اور ان سے پیدا ہونے والی ہمدردی پر پردہ ڈالا جائے۔ نہ بالآخر سکھ اور دہائی
 قلب مد کو تے روپ دینے کے لیے اور بھی وقت شناس زبانیں موجود ہوں گی۔ اور بہت ساری زبانیں
 موجود ہوں گی اور غنی رہیں گی جن کا مقصد ہوگا، وہیں غلط مابوں پر ہیکانا، عورتوں کا نیلا ابدان (قیسے کے
 سموسوں سے مٹھیسے لگنے والی مٹائی طرح) ان کے گلوں کو بچانے کے لیے، جن کے پاس کہنے کے لیے
 بہت سارے پیادہ زانو بھی ہوں گے، اور بہت کچھ بھی ہوگا، تحقیق کے لہارے میں گھمائی، سپرست اور ناچتی
 جیر کی زبانیں، جن کو اس طرح تحریر کیا جائے کہ محروموں کو اپنے پرہیزیوں پر حسد کرنے میں عاجز نہیں نہ
 ہو، مشہور مصنوعی۔ سلطانی زبانیں جو بشر مند افرا، دوا احساس کتری اور نا امید کی کے گھروں میں قید کرنے کے
 لیے گھڑی جائیں گی۔

جوش خطابت کے تھے، محرر تیزی اور دیوانہ سلسلوں کے باوجود خواہ وہ کتنے ہی قریب میں کہیں نہ
 ہوں، ایسی زبانوں کے دل بڑھلے ہوتے ہیں، یا شاید جڑ کٹا بند کر دیتے ہیں۔ اگر ان بچوں کے ہاتھوں کا
 پروردگار اچھی مرچکا ہے۔

اس عورت نے اس نکتے پر غور کیا ہے کہ کسی تہذیب کی دانش و دانش رنج کیا ہو سکتی تھی، اور وقت
 کے اور زندگی کے نیلے پر اس بار نہ کیا گیا ہوتا، یا وہ مجبور نہ کی تھی، یا کہ تسلط و اقتدار قائم رکھنے کے لیے کیا

کیا عقلی استدلال ضروری ہوتے ہیں۔ ممانعت و اخراج کے لیے ملکہ مقالے جو غرض کرتے ہوئے اور غرض و لذتوں کی آگاہی کر رہے ہیں۔

خبر باتوں کے بیٹا سے ملے قصے کی ہوائی دانش یہ ہے کہ اس کا اجماع ایک طرح کی بد قسمتی تھی۔ گویا یہ پرستش تھی کہ لذتوں کا جو جہ تھا جو بیٹا سے ملے قصے کی غیر عقلی لذت کا کامی کامی ہو گیا کہ محض ایک ایک تھی (monothetic) لذت نے اس کی تعمیر و ساز کر دیا ہوا اور اس کے ذریعے جنت تک پہنچا جاسکتا تھا۔ مگر کس کی جنت؟ وہ اپنے آپ سے سوا کس کی ہے، اور کس قسم کی جنت؟ مگر کس کی دوسری لذتوں کے مختلف نکتے ہائے نظر اور دوسرے ذائقے قصوں کے ادراک کے لیے وقت میں نہیں کر سکتا تھا تو، شاید جنت کے حصول کی کوشش قبل از وقت ضروری تھی، ذرا بعد بازی تھی۔ اُردو (اور عبرت) ہوتا تو، ان کی تصوراتی جنت اس کے قدموں میں ہوتی۔ بے شک، یہ سب کچھ پیچیدہ ہے، وقت طلب ہے، زندگی جیسی جنت کے تصور کے لیے، زندگی کے بعد کی جنت کے لیے نہیں۔ اس (زادگی عورت) نے اپنے نوجوان ملاقاتیوں پر یہ تاثر چھوڑا، میں چاہا ہوں کہ کسی عنوان کو محض زندہ رہنے کے لیے مجبور کیا جانا چاہیے۔ کسی مذکر کی تو لگائی اس کے پورے عالم، پڑھنے والوں اور لکھنے والوں کے حقیقی، تصوراتی اور ممکنہ زندگیوں کے مرقعے بنائے میں ظہر ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کا عقل اس کے بے عمل کردیے والے تجربات میں ہوتا ہے مگر یہ اس کا غم نہیں ہوتا۔ اس کا بھکاؤ اس طرف ہوتا ہے جہاں اس کے معانی ہو سکتے ہیں۔ جب ریاست ہائے متحدہ کے ایک صدر کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کا ملک ایک آبرمان جیسا ہو چکا ہے، اور اس نے کہا تھا کہ ”ہم یہاں جو چاہیں کتے دیں نہ اس پر توجہ دے گی، نہ حرم سے کچھ یاد رکھے گی۔ مگر ہم نے یہاں جو چاہیں کیا، دنیا اس کو کبھی فراموش نہیں کرے گی۔“ اس کے مردہ سے غلط زندگی دوسرے دیکھنے کی خصوصیات کے سبب نہایت متاثر کرنے والے ہیں اس لیے کہ انہوں نے حیات نو کے لیے لڑی جانے والی نسلی جنگ میں چھ لاکھ زندہ گویوں کے نیاں گواہ پتے کپھول کے اندر بند کر لیتے سے انکار کر دیا ہے۔ انکار ہٹا دیا ہے۔ انکار سے انکار اور ”تھی لفظ“ اور ”تعداد“ ”نہ نہ“ جیسی گیلیات کی تختیر سے اور ”مشافہ کر کے یا علاحدہ کرنے کی ضرورت“ کے مترادف کے انداز اس زندگی کی ناقابل گرفت کیفیت کی تعظیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا سوگ مناد چاہیے۔ دراصل وہ تعظیم ہی سے جو اس کو متاثر کرتی ہے، اور وہ دلچسپی، لذت جس پر کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔ نہ اس کو قائم رہنا چاہیے۔ لذت غلامی کی نسل کشی کو اور جنگ کو بھی ناک نہیں کھتی۔ نہ ایسا کرنے کے لیے اس کو تکیہ کا شوق نہ چاہیے۔ اس کی طاقت، اس کی آسروں، اس کے ناقابل بیان ہونے اور کرنے کی ملاحیت میں ظہر ہے۔

وہ عالی شان ہویا نازک، دل میں چھپ جائے، ذہن سے اڑ جائے، ذہن میں دینے سے انکار کرے، خواہ وہ زندہ سے قہقہہ مارتی ہو یا بغیر انداز کے چتراتی ہو، بگاڑ سے محفوظ زبان ہمیشہ دانش کی طرف قدم بڑھاتی ہے اپنی حاجی کی طرف نہیں۔ مگر یوں نہیں جانتا کہ جب پرندہ نغمہ لگاتی جاتی ہے اس لیے کہ یہ

ہمیشہ سوال تھا ہے، اس کو بھلا کیا جاتا ہے اس لیے کہ یہ تنقید کرنا ہے، منایا جاتا ہے اس لیے کہ اس کا بدل مل جاتا ہے؟ اور کہا کہتے ہیں جو ایک خود پامس شدہ مذہب کے خیال ہی سے خفا ہو جاتے ہیں؟

اس صورت کے خیال میں، انھوں کا کاروبار ایک اعلیٰ فعل ہے، اس لیے کہ یہ زرخیز ہونا ہے۔ یہ ایسے معانی جاتا ہے جو ہمارے اختلاف ہی ہمارے مفاد ہی اختلاف کو محفوظ کرتے ہیں۔ ان معنوں میں کہ ہم کبھی اور زندگی کی طرح نہیں ہیں۔

ہم مرتے ہیں۔ شاید زندگی کے بھی معنی بدل گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہی ہماری زندگی کا پتہ ہو۔

کسی خانے میں... "وہ کافی بددھمی موت سے ایک سوای پوچھتے ہیں۔ کون ہیں، وہ بچے؟ اس متا سے انھوں نے کیا حاصل کیا؟ ان مغربی اخلاق میں انھوں نے کیا سنا؟ "پہلے تمہارے ہاتھوں میں سے" ایک جملہ جو ایک امکان کی طرف اشارہ کرتا ہے، یہ وہ جو وہ نہ سے بند کر رہا ہے؟ "بچہ نے جو کچھ موت تھا وہ شاید یہ تھا "یہ میرا مسئلہ نہیں۔ میں ایک بددھمی، مورت، مہادھام اور ناہیا ہوں۔ یہ جاننے میں کہ میں تمہاری رتی بددھمی رکھی، کیا فائز پوشیدہ ہے۔ نہ ان کا مستقبل تمہارا مستقبل ہے۔"

فرض کیجیے وہ (لا کے) یہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ان کے ہاتھوں میں کچھ نہیں تھا؟ فرض کریجیے کہ وہ وفات ایک چکر تھی، ایک شرارت تھی ات کہنے کے لیے، سنجیدگی جیسی کہہ سکتے ہیں ہوتی تھی؟ بوخت کی دنیا میں خصل ڈالنے کا ایک موقع تھا، ان کے لیے تنگنوک کا ایک مریضانہ، خوب بنانے کا؟ کچھ ضروری سوالات یہ جانے ہیں، جن میں وہ سوال بھی شامل ہے جو وہ پوچھ چکے ہیں، "ہمارے ہاتھ کا پہلو زندہ ہے یا مردہ؟" اس سوال سے شاید مقصد یہ تھا کہ "کیا کوئی ہمیں بتا سکتا ہے کہ زندگی کیا ہوتی ہے، موت کیا ہوتی ہے؟" اس میں کوئی شہرت نہیں، کوئی حماقت نہیں۔ کسی عقل مند کے رتی ایک سیدھا سادہ، پرانا سوال ہے۔ وراٹر عقل مند اور عمر رسیدہ لوگ، جو زندگی گزار چکے ہیں، اور موت کا سامنا کر چکے ہیں، جو ب نہیں دے سکتے، تو پھر کون دے سکتا ہے؟

شکر وہ عورت جو ب نہیں دیتی۔ اپنے رز، اپنے وارے میں اپنی تھیں رائے، اپنے اقوال و امثال سے معمولی بات، پتا غیر بددھمی سب کچھ اپنے دل میں پوشیدہ رکھتی ہے۔ وہ ایک فاصلہ قائم رکھتی ہے، اس پر عمل کرتی ہے اور انفرادیت کی تہائی میں، پیچیدہ درجہ کے مراعات یا فزائل میں، پس ہو جاتی ہے۔ کچھ بھی نہیں، اس کے بعد کوئی غلط منہ سے نہیں بھگا۔ خاموشی گہری ہے، اس کے ادا کیے ہوئے لحاظ کے صحیح سے بھی زیادہ گہری۔ یہ کاہتی ہے، خاموشی اور خفا ہے، ہونے پر ایجاب کی ہوتی زبان سے اس کے خرا کو بھر دیتے ہیں۔

"کیا کوئی تحریر نہیں ہوئی؟" لوگ کے مورت سے سوال کرتے ہیں، "کیا تم مجھ وہ الفاظ دے نہیں سکتیں جن کی حد سے ہم تمہاری کامیابیوں کی بسمل (dossier) کو بھرنے میں؟" تو نے ہمیں بھی جو تعیم

دی ہے وہ تعلیم پر گز نہیں، اس لیے کہ ہم بہت غور سے دیکھ رہے ہیں کہ تم نے کیا کیا ہے اور ہم سے کیا کیا ہے؟ اس رپورٹ کے بارے میں جو تم نے عجیب سی ورڈز اس کے درمیان کھڑی کی ہیں؟

ہمارے ہاتھوں میں کوئی پتہ نہیں ہے، زیادہ یا مراد۔ ہمارے سامنے صرف تم ہو اور ہمارا اہم سوال۔ کیا ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے؟ کیا وہاں کچھ ہے جس کو تم سمجھ نہیں سکتے، جو کچھ نہیں سمجھ سکتے؟ کیا تمہیں اپنی جہان پر دیکھیں جب نہ ان بغیر کسی معنی کے چارہ ہوا کرتی تھی؟ جب تم جو کچھ کہہ سکتی تھیں، اب کا کوئی مطلب نہیں ہوتا تھا؟ جب وہ کچھ غیر مرئی ہوتا تھا تصور جس کے دیکھنے کو کوشش کرنا تھا؟ جب سوالات اور جوابات کے مطابق اتنی سیٹی سے روشن ہوتے تھے کہ لاشیٰ پر تم غصے سے کانپ اٹھتی تھیں؟

کیا ہمیں شعور کی ابتدا کرنی ہوگی اس جگہ سے جو تمہاری جیسی بہ دکن اور سیر لڑ چکے ہیں، بار چکے ہیں جب کہ ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں سوائے اس کے جو تمہارے تصور کے مطابق اس میں بہت اٹھنا جواب لین کا رہا ہے، مگر اس کی فن کاری پس پیش دیکھ میں اس دیتی ہے، جب کہ تم کو خود کش، بیچ میں ہونا چاہیے۔ تمہارا جواب آپ اپنی طرف سے ہے مودہ سے۔ ٹیلی وژن کے لیے لکھی ہوئی تحریر کی طرح جس کا موافق مطلب نہیں ہوتا، اگر ہمارے ہاتھ کچھ بھی نہیں ۲۲۔

تم ۲۲ گئے کیس نہیں بدھیں، اپنی ذمہ انگلیوں سے ہمیں چھو آئیں نہیں، چھتا مارا جواب دینے میں دیر کیوں نہیں کی، نتیجے تک یہیں نہیں پہنچیں، جب تک تمہیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ ہم کون ہیں؟ کیا تم ہمارے مکر سے، ہمارے طریقہ کار سے، اتنی غارت رقی تھیں کہ یہ بھی نہیں دیکھ سکتے کہ ہم چھائے ہوئے تھے کہ تمہاری توجہ کیسے حاصل کریں۔ ہم ان جوان لوگ ہیں، بالکل کچے۔ ہم اپنی مٹھ جی زندگی میں ہمیں مل سکتے رہے ہیں کہ ہمیں قے دار رہنا چاہیے۔ اس مصیبتوں پھر کی دنیا میں ہم اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے، جب ایک شاعر یہ کہتا ہے کہ "کسی شے کو فنا کرنے کی ضرورت نہیں، کہ وہ دہرے سے ہی ہے لبرٹ، اے شرم ہے۔" ہماری وراثت ہمارے لیے ہے عرق ہے، تم چاہتی ہو کہ ہمارے پاس تمہاری جیسی لڑکی، خانی آنکھیں ہوں اور ہم ان سے صرف سبک دلی اور واسطہ مدبج کے مناظر ہی دیکھیں۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ ہم اتنے احمق ہیں کہ قومیت کے اٹھانے پر دوبارہ جھوٹی قسمیں کھانے کا ذمہ کریں گے۔ تمہیں ہم سے سچے غرض کے بارے میں بات کرنے کی ہمت کیسے ہوتی جب کہ ہم تمہارے ماضی کے پیدا کردہ زیر میں مکر کر دیکھتے ہوئے ہیں؟

تم ہم کو گھر رہی ہو اس پرندے کو بھی جو ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ کیا ہماری زندگیوں کا سیاق و سباق ہوتا ہے؟ شکایتی گیت، شادی کوئی ادب، شوفا میں سے ہر پڑ کوئی تھم، نہ تجربے سے منتیں کوئی تاریخ جس کو تم ہمارے حورے کر سکتا کہ ہمت کے ساتھ ہم اپنی ابتدا کرتیں؟ تم یک باغ انسان ہو، عمر رسیدہ وہی چھٹا مند ہو۔ اپنی شرمندگی کو مٹانا چھوڑو۔ ہماری زندگیوں کا خیال کرو اور ہمیں اپنی مخصوص دنیا دکھاؤ۔ کوئی کہانی بناؤ۔ مذکرہ تو ایک جہاد کی طریقہ ہوتا ہے، جو اس لیے جاری کر رہا ہے، اور خود بھی جنگیں ہو رہا ہے۔ اگر تمہاری پہچان تمہاری مصاحبت سے ۲۲ لگا جائے تو ہم تم کو انکار نہیں دیں گے۔ اگر محبت تمہارے عقائد کو

تھا آتش گیر مگروچی ہے کہ وہ بھلک سے جل اٹھتے ہیں تو کچھ بھی بالی نہیں رہتا سوائے چھانوں کے۔ یا شاید، سرچش اعتباراً کارکی بنا پر شفا کے ذمہ صرف انہی چھانوں سے بیٹھا ہے جہاں مزید خون بہنے سے روکا جاسکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم اس کو کبھی، کوئی طریقہ سے نہیں کر سکو۔ جوئی یہ دیکھ لیں کہ کافی نہیں ہوتا۔ یہی صرف کوئی بہرہ کافی ہوتا ہے۔ مگر کوشش کرنی چاہیے۔ ہماری اور اپنی خاطر، اپنے نام کا پرچہ نہ کرو۔ یہ بتاؤ کہ غلطی میں اور روشن محلات میں دنیا نے تمہارے ساتھ کیا سہو کیا ہے۔ ہمیں یہ بتاؤ کہ کس شے پر یقین کیا جائے اور کس سے خوف کھایا جائے۔ ہمیں یقین کا گھیر دار لہنگا دکھاؤ اور دھماکا دکھاؤ جو خوف کا (caul) اس عمل کو کہتے ہیں جو رحم مادر میں حمل کے اطراف لپٹی ہوتی ہے۔ مترجم (کا سرانگ دیتا ہے۔ تم، ایک بڑھی ہوئی عورت ہو، اللہ جسے ہنسی کی محنت سے معمور ہو، اور وہ نہایت بول سکتی ہو جو ہمیں صرف یہ بتاتی ہے کہ نہایت ہی آگاہی ہے، تصویروں کے بغیر کیسے دیکھا جاسکتا ہے۔ نہایت ہی ہمیں ہے، نام چیزوں کے خوف سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ نہایت ہی مراد ہے۔

ہمیں یہ بتاؤ کہ عورت ہونا کیسا ہوتا ہے، تا کہ ہمیں کبھی معلوم ہو کہ مرد ہونا کیسا ہوتا ہے۔ ہمارے اطراف کسی حرکت ہوتی رہتی ہے۔ اس جگہ گھر کا نہ ہونا کیسا ہونا ہے، اسی طرح اس جگہ سے پھٹکا ہوا، جس سے تم واقف ہو، یہ گناہ ہے۔ شہزادوں کے ایسے مضافات میں رہنا کیسا ہوتا ہے جو تمہارے جو سرچش سکتے۔

”ہمیں اس جہاز کے متعلق بتاؤ جس کو، سر کے دن ساحلوں سے واپس کر دیا گیا تھا، وہ میدان میں پڑی ہوئی آؤں (placenta) کے بارے میں بھی۔ ہمیں غلاموں سے بھری گاڑی کے بارے میں بتاؤ، وہ (غلام) اتنے دھیرے دھیرے کس طرح گام سے تھے کہ ان کے منسوب اور گرتی ہوئی ہونے میں فرق نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انہیں اپنے ساتھیوں کے گانوں کی دھڑ سے کس طرح معلوم ہو تھا کہ آگاہ قدم کیا ہوگا۔ ان کے ہاتھ prayerd in sex تھے، انہیں گرمی اور سواری کا خیال کس طرح آیا۔ اس طرح لٹتے ہوئے چہرے گویا وہ دکھانے کے لیے آئے تھے۔ سوڑا ہونے ہوئے، اسی طرح کر دیتے سے مرزا تھا۔ وہ سرے کے قریب رہتے ہیں۔ گاڑی بان اور اس کا ساتھی چوڑے سے کر اندر چلے جاتے ہیں اور ان (غلاموں) کو اندھیرے میں بچھٹانا چھوڑ جاتے ہیں۔ بھوپ اڑتے، برف پڑتے گھوڑوں کے ٹینڈے، عقب سے نہ رچ ہونے والی مروج اور ان (گھوڑوں) کی بھاپ اُٹتی سسکا ہوا سردی میں پکپکتے غلاموں کے لیے رھک کا باعث تھیں۔“

اندرونی دروازہ کھلتا ہے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا، دروازے سے آنے والی روشنی چھوڑ کر جھٹ جاتے ہیں۔ وہ گاڑی میں سوار ہو جاتے ہیں۔ تین برس بعد اسی لڑکے کے پاس بھی ہندو ہوتی ہیں، مگر اس وقت اس کے ہاتھوں میں ایک چوڑے اور عرق سیب کی گرم شرب سے بھری ایک پیالہ۔ ایک کے بعد دوسرا پیالہ سے منہ لگا کر پیتا ہے۔ لڑکی ڈٹی، گوشت کے ٹکڑے اور مریج بھی کچھ پیٹ کر رہتی ہے، پیتے والے کی آنکھیں پر ایک آتش کی نظر آتی ہے۔ ہر مرد کے لیے ایک، اور ہر عورت کے لیے دو حصے ہیں۔ اور ایک تیز

نکاح و دونوں بہت کرپچھے دیکھتے ہیں۔ انگلہ پٹا کون کے لیے "خون ہوگا۔ عمر یہ والا نہیں، یہ تو شوقیر ہے۔"
 بچے بونا بند کر دیتے ہیں، خاموشی چھا جاتی ہے، جب تک کہ عورت خاموشی نہ کرے ہوتی نہیں۔
 "بہتر" عورت کہتی ہے، "میں بتم پر بھروسہ کر سکتی ہوں۔ تمہارا ہاتھ میں پرندے کے ہونے
 کے باوجود میں تم پر بھروسہ کر سکتی ہوں اس لیے کہ سچے تم نے ہی اس کو پھرتا تھا۔ دیکھو یہ کتنا خوب صورت
 ہے، کہ یہ سب کچھ ہم نے بدل نہیں کر سکتا ہے۔"



ذیرک والکات

امیرانی کمال۔ اس نہایت تاب ناک شاعر نے تخلیق کے لیے جو نارنجی مسیت کے تو دن اور
مستونٹ ٹھانڈوں سے وابستگی کی دینا ہے۔

ذیرک والکات کے شاعرانہ جوہر اسی وقت کھلنے شروع ہوئے تھے جب وہ بیس برس کی عمر کو بھی نہ
پہنچے تھے۔ برادری اور پارٹی طرح و شاعرانہ فنون کا والد و شیدا تھا اور یہی جذبہ اس کی شاعرانہ کا
بنیادی جوہر ہے۔ والکات ایک مثلث کے کمرے میں گرفتار ہے، جزائر غرب اہند جہاں وہ رہتا ہے، انگریزی
نہایت کا پور جس کو وہ بدھتا ہے اور اپنی فریفتگی سے خستہ سی جاہ نے اس کے اکثر ادبی و ادبی کوشش عراہہ رکھا رہی
ہو نہ ہے۔ نئی ایک نظم "A Far Cry from Africa" میں والکات کہتا ہے

میں تو بڑی مشکل میں ہوں
ایک طرف انگریزی ہے
اور ایک طرف فریقا ہے
میں کس کو پھیر سکوں

والکات کی ایک ہم تخلیق طویل نظم (1973) "Another Life" سے جو اس کے ماحول اور اس کے
زمین کی نشوونما سے مورت ہے۔ اپنی نظمیں کے مجموعے (1987) "The Arkansas Testament" میں

وہ اپنے اندازِ نظر کو وسعت دیتا دکھائی دیتا ہے جو اس کے کلام کو افاقیت عطا کرتی ہے۔ ان نظموں میں واکاٹ Manna Tsvetaeva اور ٹیبو میچ آلمن کوثر کی عقیدت چٹن متے ہوئے آتا ہے۔

کرتی سے میں نے یاد

تصاریف = شاعری

ہنگل سبق کی طرح

منہات کی طرح

واکاٹ کی نظموں کا مجموعہ "Omros" (1990) ناقابلِ بیان حرأت اور حوصلہ مندی سے مملو ہے جس میں وہ بہت سے بکھرے دھڑول سے نئی سڑک اکائی تیار کرتا ہے، ایک ایسا پرچم جو ادب، تاریخ اور حقیقت سے مرید شاعری کے رشتوں سے تیار کیا گیا ہو۔ واکاٹ کے کلام میں ہم کو ہومر، پو، ملی کوئگی اور میل ول چھانکتے دکھائی دیتے ہیں۔ واکاٹ کے پاس ایسے بے شمار استعارے، تشبیہات ملتی ہیں جو قاری کو پی مروت سے حیرت زدہ کر دیتی ہیں۔ اس کی شاعری ایک ہی وقت میں منقرض تاب نائی اور قوت کی حامل نظر آتی ہے۔ اس کا مد و تخلیق سرید بھی ہے اور حساس بھی جو اصول ہے پناہ خزانہ آمد کا سرہون منت دکھائی دیتا ہے۔ واکاٹ کی دور پر شاعر بے ٹکراس نے کئی اعلیٰ درجے کے کھل بھی کہے ہیں۔ ان میں بھی اس کا شاعرانہ مد و آتش کا کام کرتا ہے۔

واکاٹ 1930 میں جزائرِ غرب البند کے ایک شہر Castries میں پیدا ہوا۔ وراثتاً آتش فشاں جزیروں کی آیا کی مگر، جو بڑھ کر ان کی عجمانی بھی مد چکا ہے، پلٹے پلٹے کی شاعری پر اس کے بچپن کے ماحول کے گہرے اثرات عیاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی مائی اور دو دو غلاموں کی اولاد میں سے تھیں۔ واکاٹ کا باپ شیشے پر رنگ کاری کا ماب تھا جو اس کی اوائل عمری میں ہی انتقال کر گیا تھا۔ ماں شہر کے عیسائی اسکول کی مٹا دھبا تھی۔ بیٹ میری کا لچا کی تعلیم کے بعد واکاٹ 1953 میں ٹرینیڈاڈ (Trinidad) چلا جہاں اس نے تھیں ٹور و مسوری کے بعد کی حیثیت سے کام کیا۔ واکاٹ اٹھارہ سال کی عمر میں اپنی پہلی نظموں کی اشاعت سے 1959 میں منقرض عام پر تو محمد اس کی شہرت اس کے مجموعے In a Green Night (1982) سے شروع ہوئی اور پھر وہ اپنے علاقے وراثی کے اس پاس کے واپس آئے پھر چھ ماہ تک رہا۔

واکاٹ سفر کا دل مانہ ہے۔ کافی عرصے سے وڈرینی ڈاڈ اور بوسن (Bosson) کے درمیان وقت گزارتا ہے، پنے عرصے میں ایک شاعر کی طرح وڈرینی ڈاڈ کی دہائی میں جہاں وہ دب اور تخلیق کا استاد ہے، ایک مدرس کی طرح۔

ضیافت سے خطاب

جی لٹ ٹب بدوہاں شاہی، ٹوٹیل فاؤنڈیشن کے ممتاز نمائندگان، عزت مند، آداب ارکان کاؤٹ،
کیہ رٹلسک انٹرنی ٹیوٹ اور اتھارٹی ٹیوٹوں کے عہدے داران، طلبہ، خواتین و حضرات! یہ اعزاز جو آپ مجھ کو عطا کر رہے ہیں، اسے اسی ایک نام سے قبول کیا جاتا ہے، جو عطا ہوا کیہ بتیں
کی تمام ٹیوٹ پھوٹی مذہبوں پر مشتمل ہے۔ وہ سب اس سمجھ یک جا ہیں، ایک لحد جوان کی کوششوں کو تسخیر کرتا
ہے، اس (انجمن) کو جسے میں، بڑے فخر اور انکسار کے جذبات کے ساتھ ان کی جانب سے وصیب کردہ
ہوں یعنی Anasean اور سچل کی جبر مسلسل پو فخر کے ساتھ، ان کی نمائندگی کی چکا چوند میں، اپنے انکسار اور
اپنے سرلیج، لڑوال تا فخر کے ساتھ۔

خطبہ

مجمع البحر Antilles رزمیہ یا دوا شت کے ٹکڑے

(Felixity) ایک گاؤں ہے ٹریڈی ڈاؤ (Trinidad) کا، جو کارونی (Caroni) کے میدان میں واقع ہے
کنارے پر واقع ہے، ایک کش رو مریزی میدان میں علاقہ جہاں اب بھی شمر کی پیداوار ہوتی ہے، جہاں طوق
غلامی کے سیرتے کانٹے والے غلامی سے نجات پانے کے بعد لڑ کر بسائے گئے تھے۔ لہذا لیلی ٹی کی لفظ ہی
"بارونی شرقی ہندی (East Indian)" ہے اور میں جس سر پیر مریکا سے گئے دے اپنے دوستوں کے
ساتھ وہاں گیا تھا، راستے میں نظر آنے والے تمام چہرہ شرقی ہندی تھے، اس بیان سے میری مراد یہ
دیکھنا ہے کہ یہ ایک شرقی گرتی ہوئی، خوب صورت عورت ہے، اس لیے کہ سنیچ کی اسی شام، جلد رزمیہ ماماؤن
کی ڈرامائی پیش کش، رام پیل، یونے وائی تھی۔ اور ایک نئے کھلتے ہوئے گیس سٹیشن کے، تند ٹکلف رنگ کی
چھتر یوں سے طرخی میدان میں ذوق بھری میں ملیں، مقامی اداکار جمع ہو رہے تھے۔ خوب صورت
مرد و ستالی گور کے سر پیر کے لٹلتے ہوئے اچالے میں سرخ، سیاہ رنگ کے تیرا بہتر اچھر پچنگ رہے تھے۔
اگر پر نیچے رنگ کی پٹا لیاں، دھماکی گھاس، وروہاں تھے جن میں روشنی جانے سے قبل رنگ گھل جاتی کرتے
ہیں۔ لیلی ٹی! واؤ کیا زرم و مارک ایٹھو ٹیکسن نام ہے ایک رزمیہ یا دوا شت کے حوالے کے لیے۔

میدان کے کنارے واقع ایک کھلے میدان کے نیچے داس سے بنے ہوئے دو عظیم الجثہ دیواری
 اُجالے تھے جو بڑے عجیبوں کی طرح نظر آتے تھے۔ وہ ایک دیوار کے جسم کے حصے تھے، اس کے جو
 بندریاں یا جھوٹے قلعے کے بعد ایک دیواری کھلے کا ڈھپ بھرا پتے۔ رنڈیہ کے اختتام کے طور پر یہ
 پتہ جلیا ہاتے والا تھا۔ پیر سے بنے اُجالے، شیعے کے سائیت Ozymandias اور اس کی عظمت کے
 زور پر، کافی رنگیناں میں دیواری کی طرح ایک متوازی ٹیٹل بندی کی جھٹک دکھا رہے تھے۔

تھوڑوں نے میدان میں "گ" جا رکھی تھی اور شخصوں کے قریب سے ہاتھوں کی ٹرکی سے ٹیلوں
 پر چڑھی کھانوں کو کھ رہے تھے۔ رنڈیہ کی شیعے، دیواری کھانوں، اور جڑے جانے والے لکڑے کڑے دیواری
 کے باوجود سے بڑے ہوئے، ڈھلچٹے کسی اور رنگیناں میں ٹیٹل ملتے جلتے جوں بالآخر سطح کی وقت سرخوں کر دی
 گئی تھی، بس یہ ایک رسم تھی، سرسبز موسم کی، فصلی کھانے کی طرح کی، جو ہر سال دہرائی جاتی تھی۔ اس
 قربانی کا سال نکتہ س کا ہر سال دہرائی جاتا تھا، اور وہی میں پنہاں نکلتے تھے "گ" کے ذریعے جیتے تھے۔

موریتیاں میدان میں دائیں ہو رہی تھیں۔ جسے ہم مزد ستانی سوتیلی کہتے ہیں، تھوڑے پر بنے
 ہوئے کھلے میدان سے، جس پر مذہب بیان کیا جانے والا تھا، چنگی ڈری تھی۔ کھیں بدلے ہوئے اناکار
 آتے جا رہے تھے۔ میرے خیال میں شاید شہزادہ یا یوتا کا روپ دھارے۔ کتنا افسوس! ایک طرف
 ہے بڑا اور دیوتا وہ دیوتا ہے جو ہمارے افریقی اور ایشیائی جڑواں انتھار کی تقسیم ہے۔ میں نے اکثر اس
 کے بارے میں سوچا ہے مگر میں نے عام ایلا کھی نہیں دیکھی۔ نہ کھی میں نے ایسا ٹھیٹر دیکھا، کھلا میدان،
 گاؤں کے بچے جھگو، شہزادہ، دردینا کے روپ میں۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ یہ مذہب کیا ہے، اس کا
 بیرونی تھا، من ڈھنوں سے اس کی جگہ ہوتی تھی، اس کے باوجود میں نے کبھی ہی میں، انگلستان کے ایک
 ٹھیٹر کے لیے Odyssey پر مبنی ایک کھیل لکھا تھا، اس قیاس کے ساتھ کہ افریقین ایشیائے کوچک کے مذہب
 Odysseys کے مقدس کی بارے میں جانتے ہوں گے۔ جب کہ فریقی ڈاڈ کے "ہندوستانیوں کے علاوہ"
 کوئی بھی رام، کان، شیو، دشنو وغیرہ سے واقف نہیں۔ یہ جملہ "apart from Indians" جو عادت کے
 مطابق میں بھی استعمال کرتا ہوں Trinidad میں نامعلوم پر مشتمل ہوتا ہے۔

ایسا لگتا تھا کہ مرکز میدان کے کنارے پر ایک اور سطح مرتفع ہے، ایک مہتمیوں کا بیڑا جس پر
 گئے کے کھیتوں کے اس مندر میں راہن بھدے طریقے سے چٹائی جانے والی تھی، مگر یہ چیزیں کو ایک
 دیوتا انداز میں دیکھنے کا طریقہ تھا، اور یہ میری غلطی تھی۔ میں تو یقینی سنی میں ٹھیٹر کی طرح رام ایلا دیکھ رہا
 تھا، جب کہ وہ کھیل سے نیا دیوتا ایک عقیدہ تھا۔

اس عقیدے کے اس لمحے کوئی بدتریب دیکھیے جب ایک دکان بھیس بڑے ہوئے، سٹیج پر جانے
 سے پہلے آکھنے کے سامنے خود کو کچھ ثبات میں سر ہلاتا ہے، اس میدان پر کہ وہ ایک حقیقت ہے جو حقیقی
 دیگر میں داخل ہو رہا ہے، تو آپ مجھ جائیں گے کہ میرے قیاس کے مطابق رنڈیہ کے ان کاٹس پر کیا بیت

ہی تھی۔ غمزدہ تو ان کا نہیں تھے۔ ان کو چنانچہ تھا یا انھوں نے اس مقدس و متان میں خود اپنے گمراہ چنے تھے، جو نوین، غروب آفتاب تک چھے گی۔ وہ شوقیہ ان کا نہیں بلکہ اہل یقین تھے۔ تھیٹر کا یہ لفظ ان کے لیے نہیں تھا۔ ان کو ان کرداروں کو دیکھنے کے لیے خود کو سبقتی عہد پر تیار کرنا ضروری نہیں تھا۔ ان کی دیکھنی شہرہ آفاق دل خوش کن نہیں تھی جیسے کہ دہلی کے بنے ہوئے تیر جو سر پہر چہرہ آگاہ کی فضا میں ابھر اہل تیر رہے تھے۔ وہ یقین رکھتے تھے، اس کھیل پر جو وہ کھیل رہے تھے، متین کے مقدس پر، ہندوستان کی دہلی پر، جب گرد مٹے اور بھلاہوت کے مطابق، اداکاروں کے خوش دلی چروں سے کسی قسم کی مٹائیت کی، نقصان کی، جتنی کہ اہل کے سوانح کی، یہ گاہوں کے شہرہ آفاق کے خوش دلی میں تھا۔ میں اس سر پہر کو شہادت اور سر پر ستارہ تعریف سے "دو کر رہا تھا۔ میں نے تاریخ کی بھرپور بازگشت کے ذریعے اس کو غلط سمجھا۔ مجھے کے حقیقت پر کام کرنے کے پند مزید، مندراور جنگی ملتے ہوئے، تھی۔ جب کہ ہمارے چاروں طرف اس سے کہیں مختلف ماحول تھا، رقص میں، نوجوانوں کی مسرت آمیز چٹائی، مٹھائی کی دکانوں میں، یادہ سے یادہ بھیکس بدلے اداکاروں کی ظاہر مونی ہوئی یقین کی مسرت میں، نقصان نہیں بلکہ اب تو لیں ہی نام زیادہ معنی خیز لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے لیے اشیاء کے ہلا تے کوئٹوں میں تقسیم تصور کیجیے۔ چھوٹے چھوٹے تجربے کے نتائج جیسے مینارے مجھے کے کھیتوں میں مندروں کے جتنی گنبد۔ اور تب ہی ان لوگوں کی خود تھوڑی اور شرمندگی کو سمجھا جاسکتا ہے جو اس قسم کے رسمیں کو مستحکم شکل ہی نہیں، بلکہ اس سے بھی کمتر دیکھتے ہیں۔ یہ باریک میں لوگ کسی رسموں کو بھی ویسا ہی سمجھتے ہیں جیسے قواعد کے، مہرین کے ماننے مقامی ہے اصولی رویوں، جیسے شہر دیکھتے ہیں صوبوں کی طرف، اور سطحیں پل نوادیدات کی طرف۔ جیسے کوئی یادداشت مرکز میں شامل ہونا چاہتی ہو جیسے کوئی داند اس جسم کو یا برکتے جس سے مت مرحد ہو گیا ہو، جیسے یہ دہلی دیوانوں کے دیوان بن کر۔ دوسرے فنکاروں میں، جس انداز میں آج بھی گہرے ہیں کی طرف نظر کی جائے وہ دانا جائزہ ہے مجھے، اور دوست ہی گئے گا۔ (نیسویں صدی کے ایک انگریز مؤرخ اور ماہرِ آثار) Froude کے فنکاروں میں "مکھی معنوں میں وہاں کوئی انسان نہیں۔" "وہ شہدوں کے بغیر، اصل لوگوں کی بازگشت کے کلک سے غیر اصلی، ٹوٹے پھوٹے سان کی اداکاری ایک مقامی یونی کی طرف تھی، جیسے اصل زبان کی ایک شاخ، اس کا ایک اختصار غمزدہ نہیں، نہ اس کے رزمیرہ جے میں کوئی کمی۔ مجھے پتا چہ تھا کہ کوئی ڈانڈ میں دیا کے رزمیوں میں سب سے بڑا موٹی میلا تھیو چاہا تھا، کسی مذہب کو محفوظ کرنے کے لیے نہیں، عقیدے کے کھمبے پر اور کسی ہی ثابت قدمی کے ساتھ جیسے Caron میدان کی تیر ہو جو تیرے جیسے کڑے مجھے کو کج کرنے کی پیشکش میں چلتی ہی رہتی ہے۔ ہمیں رام سیلا کی شروعات سے پسے ہی جانا پڑ گیا تھا، Caron کے فطرت کے راستے، قمر مزی رنگ کے مسمری پردوں کے ہیکار کے لیے جو سر شام واپس لوٹتے ہیں، رام سیلا کے اداکاروں کی فحری کارکردگی کی طرح، ہم نے، سرخ پہچوں کی طرح، غول کے غول آتے پہلوں کے ہامٹ ایک

چھوٹے سے جزیرے کو قریبی رنگ کے بھیلوں سے لکڑے درخت میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ یہاں تاریخ کے مسائل کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ یہ دو مناظر، عام سیلا اور تیر کی طرح اترتے ہوئے قریبی پرندوں کے غول، تفکر کے ایک واحد مسائل کی طرح یکہ جان ہو گئے تھے۔ کیرتین میں بحری جہاز انگیزی عام ہے۔ یہ زمین کے قدرتی منظر کے ساتھ آتی ہے، اور حسن سے دوچار ہوتے ہی تاریخ کے مسائل کو تحلیل کر دیتی ہے۔

ہم اسی لمبی سراد سے بہت کچھ اخذ کر رہے ہیں جو ماضی کو ہم بتاتی ہے۔ مصری پرندوں اور سیل کے ساتھ لمبی مٹی کے قریبی شراعتوں کو دریافت کرنے پر میں نے خود بہت مراعات یافتہ رہا۔
تاریخ کا مسائل مختلف سے ملتا ہوتا ہے، مثلاً کے قدرتی مناظر سے نہیں اور Amies میں کوئی مختلف نہیں جس پر مسائل بڑھ جائے، سوائے غیر از و شکر کی تحقیقوں اور ویران کیے ہوئے مقلوب کے۔ طرف پر آہستہ آہستہ قلمی کیمرے کی طرح، نظر ڈالتے ہیں پورٹ آف اسپین کی نیلی پہاڑیوں، دیگی سڑکوں اور ریلوں، جنگی تیر ہزاروں، دیوتا کا بپ نجر نے قلم لے پھلوں اور ان کو منہ لے والوں، سوائے ٹریک میں بحری موٹی، ماب کو سوار میں ایک قلم لے چاہتا ہوں جو لمبی مٹی کے اوپر کھینچا ہوا ایک لمبا سا لکھی ہوگا۔ میں اس سر پر کو ہندوستان کے احضار (evocation) سے چھان رہا تھا، مگر احضار و نہج ہی سے کیوں؟ ایک حقیقی وجود کی موجودگی کی خوشی سے کیوں نہیں؟ ہندوستان کو تینوں مقلوب جائے جب کہ لمبی مٹی کے ویرانی شہر کی کچھ اس وقت رہے ہوں، اور اس کو چاہی کیوں نہ رکھا جائے، لمبی مٹی میں خوشیوں کو نہ کیوں نہ بٹھا جائے، مرکزی میدان علاقے کے دوسرے ناموں Couva, Chaguanas, Charley Village کی خوشیوں کو بھی کیوں نہیں؟ میں اپنے سرور کو اپنے درتے و کیوں نہیں کہتے دیتا "ٹریڈ مارک کے باسیوں کی طرح ان کے جہوں کے وجد نے مجھ کو بھائی ہے اس لیے کہ وہاں ان کیوں سے نکلنے والی پچا دار میں تو نہ ہی بعد کی مرکزی پس کی مانند ہوتی ہے۔ مجھے دعوت ملی، آمینوں اور crepe کاغذوں سے بنی (امام) حسین کے رزمیہ کی نشانوں کی طرف، چینی ڈسکوں داس کی طرف، Sephardic Jewish synagogue کی رسومات کی طرف جو ایک دروازوں پر لگائی گئی تھیں۔ میں کھینچنے والے کی حیثیت میں اس کا صرف آٹھواں حصہ نہ ہوتا ام میں نے ٹریڈ مارک میں ہونی چاہنے والی تمام زبانوں کے ٹکڑے اپنے آپ میں جذب کر لیے ہوئے۔

ایک گھمان کو تو نیچے، آپ دیکھیں گے کہ وہ محبت جو کھڑوں کو دوبارہ جوڑتی ہے، اس محبت سے دوبارہ طاقت و رہ ہوتی ہے جس نے اس کی مٹی حیثیت، انگل مٹا بہت کو اپنا کچھ یہ تھا۔ وہ وہ جو کھڑوں کو ان کی پہلی جگہ پر بٹھاتی ہے، اس کی شکل میں دیکھو وہی صبر ہوتی ہے۔ محبت بھی کچھ ایسی ہی شے ہے جو ہم انفرقیوں اور کشیدگیوں کو دوبارہ جوڑتی ہے، ایک شگفتہ اور شے کی طرح جس کی بازوی منہل ریشموں کے سفید شامات کوئی نہ کرتی ہے۔ لوگے ہوئے کھڑوں کی کچی Amies کی غیر گیری اور مرد ہے اور اگر ٹکڑے بے چیز یا بُری طرح جھانکے گئے ہوں تو ان میں اصل کھد کا رہی سے دوبارہ درخشا ہوتا ہے، ایسی کھینچیں اور منہل

ظروف اپنے آؤنی چھوں پر قول ہو گئے ہیں۔ Amilian فن ہونی پاش پاش تاریخ کا جیہ ہے ہاری لغت کے طرف کے کھڑے ہیں، یعنی ہمارے مجمع الجزائر اس پر اعظم سے نوٹ کر ملک ہونے والے کھڑوں کے نمائند ہیں۔

شاعری تنقید کرنے کا یہی قطعی عمل ہے جس کو "تنقید" نہیں بلکہ "دب و تنقید" کہنا چاہیے، پاش پاش نہایت ہی، اس انداز کے جو دنیا کی تقسیم میں معاون ہوتا ہے، اس رسم کی بھی جو، فنی عمل کے ہند مندوں کے ہاتھوں میں لا رہا رکھنے سے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کو چھوڑ چکا ہے۔

شاعری، اس کا پسینہ ہے ایسا پسینہ جس میں تاریکی ہو، جیسے کسی گھٹے کے اندر پر آؤیاں پاش کے کھڑے۔ شاعری شعری اور نثری اشیا کو جوڑتی ہے، ماضی و حال، دونوں کا ایک ہی وقت میں وصول کرتی ہے، گراہتی گو ایک ہمسرہ تصور کر رہا جائے اور اس کی جھپٹ پر آؤیاں اس کے کھڑوں کو حال۔ شاعر کے سامنے ایک ہدفوں زبان، ایک نئی نکتہ ہوتی ہے، اور شاعری کا کام اس کی کھٹائی اور خود اپنی زبانیت کرنا ہوتا ہے۔ شعر کے اعتبار سے ہر انداز کی گوار ایک ہونی چھٹی ہوتی ہے جو زبان کے شایانہ تصور کے مقابلے میں اپنی نکتہ اور اپنی فکری گہرائی کے لیے شکل دیتی ہے۔ زبان سے مراد ہے Ozymandias کی، کتب خانوں اور لغت کی، علاقوں اور مصروف کی، کلیساؤں کی، جامعات کی، سیاسی اقوال اور اداروں کی عمارتیں۔ شاعری اسے جزیرے کی، مند ہے جو کسی بڑے عقلمند سے جدا ہوتا ہے۔ ہمارے مجمع، جزائر کی بویوں جھٹے گھٹے کے ماتھے پر تھماتے ہوئے پاش کے کھڑوں جیسے گھٹتی ہیں، سب مرمے سے نچوڑ ہوا پسینہ نہیں، بلکہ اس تاریکی کے حال جو تک اور پاش کی تغیر کی پیداوار ہوں۔

اپنا اصل زبان سے محروم پکڑے اور مسخ کی ہوتی شکلوں والے قبائل، شیعہ، افریقہ کی قدیم، رزمی لغات کی حال، زبانوں کے پچھڑے اور پھیلاؤ سے اپنی زبان ٹوٹ جاتے ہیں۔ ان کی آؤنی مندوں کو جن کے خون میں ایسی وجہ اور تال مل ہوتی ہے جسے غلامی و معاہدہ بندی جیسے جبر نہ نہیں کر سکتے، حالانکہ ان کے اپنے نام سے ماسوں میں بدل رہے جاتے ہیں اور مٹھکا رتوں بھی کھیلے جاتے ہیں، جیسا کہ فنی مٹی اور Choseul کے بارے میں ہو رہا ہے۔ اصل زبان غاصوں سے پیدا ہونے والی تھکن کے باعث مسترد پار گزرنے کی کوشش کرنے والے کھڑے کی طرح مایوس ہو جاتی ہے۔ مگر نام لپیچہ نام تبدیل کرنے کا یہی تشبیہات تلاش کرنے کا عمل ہے یہی عمل ہونا ہے جو ہر نئی صبح شاعر کو درپیش ہوتا ہے، Crusoe کی طرح اوز و بھانے کا، ضرورت کے پیش نظر نام بنانے کا، فنی سٹی کی طرح پتہ نام تبدیل کرنے کا۔ اور خالی ہاتھ انسان اپنے حیرت، خواہش، وراثت سے رجوع کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ Aniles کے تجربے کی بنیاد پر ہی ہے، جیسے کسی تباہ شدہ جہاز کے کھڑے، بارش، وسیع قبائلی نکتہ کے ٹھیکرے، جزوی طور پر بھڑائی ہوئی روم، مگر بوسیدہ نہیں، مستحکم ہیں۔ یہ سب معاہدہ بند شدہ قوانین کو حاصل کردار میں سے فنی عمل کے گھٹے کے کھیتیں تک لے جانے کے لیے کرام و مل کے زنجیروں میں جکڑے ہوئے سوا یا فز بھڑوں، Sephardic

یہودیوں، چینی بیوں اور دیگر نیکال پر کھیم کھیم کر پڑے بیچنے والے لہنائی تاجروں کو لے جانے والے جہز Middle Passage اور Fattel Rozack کو بھی مرد مت کر گئے۔

اور آج، یہ سب تاریخ کے مارے Trolope کے ناجیز لوگ (non-people)، شہریوں سے مزین دکانوں اور گلیوں والے، بے سندے کثیر المکان، تاریخ سے مدامتیر جیسے، ایک نظیر بابل (Babel)، یعنی تاریخ کا خوب کیریتیں کے واحد شہر پورٹ آف اسپین میں آیا وہیں اس لیے کہ نئی دنیا میں یہ شہر کھڑا ہی ہے جیسے، وہیں کی جنت۔

بھ سب قریب جانتے ہیں کہ تھنہب شہری میں بنتی ہے۔

طوبہ قریب کے لیے بے چین، ایک اور کئی صبح۔ نویں تہہ۔ پانچ بجے کا اندھیرا ہوا ہے۔ کمرے ہوئے جن کے غلے کی ضرورت کس پھر اچانک روٹتی میں، یہی دیواروں، میاں پختوں والا پھنس تھا، جس کے طرف، نوآبادیان، تھانہ میں گئے پستہ قد تار گئے درخت، جن کے عقب میں مایا نیر درخت، اور بالقدیم، ایک خار کے اندر پھرتا ہوا آیت، بارش کے باعث کافی رود لیت جو کبھی حد یہ تھے، ریوے اسٹیشن کی طرف جاتی ہوئی سڑک، ٹرگاڑیوں سے خالی۔ ایک حیرت افرا، سکون کے مختلف عناصر۔ ہر سفر پر مجھے اس شہر کا سکون اس شہر میں محسوس ہوتا ہے جو میرے دل کی گہریوں میں پو مت ہو گیا ہے۔ تمام پھول اور نظر آتے ہیں پھاٹیاں آسمان اور ان کی پسند ہوتی مسنم۔ دماغ میں اس کی طرف تھیری، کئی صبح، مسافر کو رہنے کی ہے۔ ساحر کا سے واپس پر وہاں کے، ماحول کے بہکاوے مسافر کو حساس دلاتے ہیں کہ، کافی زود فیسوں کی طرح اس کی دنیا میں بھی پتہ بخود پیدا ہو گیا ہے۔ اور پتہ اپنے آپ کی تھکس کی کوشش میں ہے۔ درپے کے قریب رکھے ہوئے برتن اور اس کے قریب پڑے ہوئے فیس، گویا ایک شہر بلند ہونے کی کوشش کر رہا ہے، بے رحم ہونے کی کوشش کر رہا ہے، ایک رشتے خانے میں، پھرتے ہوئے کسی امرنگی شہر کی طرح، کوئیس Des Moines کی مصروفیت کی مقامی کی طرح۔ گویا ایک فیس کی طاقت کا اظہار ہو رہا ہے، عمارتیں، بے رنگ آرائش، کارکنان اور افسران، ماحول خشک رکھے والی عظیمی کے پیدا کردہ مصنوعی خشک ماحول میں، سٹے نئے دنی شلو کے زنجیر تن کرنے کی گاڑی میں مصروف، کسی دور ملک کے موسم کی فکس میں اپنے اندر کی فکس کی لیا و سے نیا رنگی۔ دلوں میں سردیوں کی خشک، میز تھک، بنجیدہ قسم کے شہریوں میں، کبر کے رنگ کا بھوہ، مختلف، شاسوں وال، دہشت، گنیز سرد موسم، اور دن۔ گویا اپنے اپنے دلوں کے دپ سے نیچے تک بند کیے ہوئے جن کے ساتھ گزرتا ہوا دما زخم پانچ، ہر طاقت روشن دیکھیں والے سے واپس کمروں کی قطار چھٹی، اور جب صرف ہارنی ہوتی ہے، انیسویں صدی میں موسم سرما کے ادب کے ماحول کے ظنار، کسی دنی مایوں کے ماحول میں رہنے کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس لیے کیریتیں آئے والے مسافروں کو محسوس کتا چہ ہے کہ وہ تصویر کی چسٹ کا رڈز کے یک سسے میں موجود ہیں۔ دونوں موسم ویسے ہی محسوس ہوتے ہیں جیسا کہ ان کے بارے میں پڑھا ہوتا ہے۔ تفریح کے لیے آئے والے مسافروں کے لیے دھوپ

اہم نہیں ہو سکتی۔ صرف کا موسم زندگی کی طرح ادب میں بھی گہرائی پیدا کر دیتا ہے اور استوائی علاقوں کے طویل موسم گرما میں صرف فانی و شاعری کی اہم نہیں ہوتے (Amies) میں انہوں نے شاعری ہے زندگی کی، بلکہ تخیل کی ایک کیفیت ہے) اس لیے کہ اس کے اطراف کا ماحول بھی، اس کی موسیقی کی طرح، کتنا مسرت، صبر، کتنا شدید و جد اور ہوتا ہے۔ مسرتوں کی بنیاد پر بننے والی تہذیب ہمیشہ پایاب ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی چاروں طرف سے لے کر لیے کیے ہیں، بہ خیر کی مسرتوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، شاعری میں ذہنی خلاق، سرد موسم سے فرار کی، اس سنجیدگی کی بھی جو صرف چاروں موسموں کی تہذیب سے پیدا ہوتی ہے۔ سوچیں معذوں میں وہاں صرف ایک قوم کیسے ہو سکتی ہے؟

ان لوگوں کو ان موسموں کا کوئی برک نہیں ہوتا جن میں زرد پھول کے ہاتھوں پھل سال بھر جاتے ہیں، جن میں بریلے عورتوں سے کٹھنیں مرتبہ جاتی ہیں، ہڑکس برف سے سفید ہو جاتی ہیں، کہر میں پورے پورے شہر غائب ہو جاتے ہیں، آتش دان روشن ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ اس جغرافیہ کے کہیں ہوتے ہیں جس کے تال اور غرا، ان کی موسیقی کی طرح، ہر قسم کے دباؤ میں محدود ہو جاتے ہیں۔ گرمی اور نمی، آفتاب اور بارش، روشنی اور سب سے، دن اور رات۔ ایک نامکمل پیمانے پر پابندی کے باعث یہ لوگ تنہا کی مازو اور قصوں کی پیچیدگی کے دماک سے ابد ہوتے ہیں۔ تو پھر یوں ہی کسی گویا ہم بات کو اجزاء میں تبدیل نہیں کر سکتے۔

ہمارے شہر عام معنوں میں شہر نہیں، مگر مٹی چاہتا بھی نہیں کر دے ہوں۔ وہ اپنی حدود کا، اور مخصوص مقامات پر پل پیچون کا خود نہیں کہتے ہیں، حتیٰ کہ ان کی جی ٹی ٹی تحریروں میں بھی مقامات، بے صرف ہیئت جیسے نہیں بلکہ Narpaul کی پسندیدہ نگلیاں، دماغی طے تھے، نگلیاں اتنی چھوٹی اور خوب صورت جیسے اس کی نظر کے پتلے، صرف Tunapuna کا شور و غل اور دھکم پیل نہیں بلکہ C.L.R. James کی Beyond a Caroni Boundary کے میدان کا گون Felony نہیں بلکہ Selvon Country، اور یہی وہ راستہ ہے جو ہمارے جزیرہ کی طرف جاتا ہے، جواب Jean Rhys کا پر Dominica ہے، جس کے بارے میں اس نے لکھا تھا۔ اور Cesare کے چرائی دونوں کی Perse Maranique کی Guadeloupe کیسی خوش اور ایسا شگفتہ ہوتا تھا اب کو دیکھ کر ایک ادب اور کئی سامراجی نیاٹوں میں۔، مگر یہی، انہیں، سپر فو، تہذیب کے سہارے میں کھتا ہوا، جو میرے کے بعد جو میرے، نہ خوف زدہ اور نہ کسی سے کسب کیا ہوا، 'فرنگی پانی' پھول کی پیدائشوں سے نیا روخت۔ یہ ایک جنگجو و شاد ف زلی نہیں تھی، بس ماگزیری کا ایک ساوہ سماجی تھا، کہ یہ گل لکھائی ہوئے والی تھی۔

پورٹ آف اسپین کی پتھر جیسی گرم و پھر، اجائے کی چٹ سے پیدا کی، بار پر چھلکتی ہوئی شرب محبت، پام کے درخت اور ایک کونے کی طرف سے ابھرتے ہوئے، چند ایک ذوبے ہوئے کوہساں، جیسے Herbert Vaughan کی "That Shady Cry of Palm-trees" یا Casnes کے چوٹی مر جا گھر

Hammond کے مرنوں کی، پھرتی ہوئی غریبی کو ازہ جہاں اجتماع میں "سنہری پونچھ" گا لیا جاتا تھا۔ اب ویرانی جیسا خانہ بن دیکھا نہیں جاتا۔ عبرتی دواگل Anne کو وسعت ہے، اور راز یہ نہیں کہ اس سے غلط قسم کی طلب کی جائے، اس سے وہ اسٹگ نہیں کی جاتی جو ہے جس میں اس کو کوئی دلچسپی نہیں۔ سچا اس کو نکالی، مردہ دل بچکے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہاں کافی کتابیں نہیں، قصیدے نہیں، عجائب گھر نہیں، یعنی انسان کے لیے کمرے، کچھ بھی نہیں۔ اس کے باوجود کتابوں سے محروم انسان کو خیالات پر توجہ دے کر سنا چاہیے، اور خیالات سے نکل کر وہ گرا اپنے دماغ کو حکم دینا سیکھ سکے تو، اس کو کھینچنے کی خواہش پیدا ہوگی، اور اسے بغیر غیبی محسوس، کھانا ملنے نہ ہو تو زور زور سے پڑھے، کہ زور زور سے پڑھنا وراثت کا حکم رکھتا ہے، جس سے (شعری) اوزان تک، و نال تک رسائی ہوتی ہے۔ محرومی میں بھی بھلائی ہو سکتی ہے، بے شک بھلائی ہوتی ہے جس کو اس طرح کی کیفیت کے باعث تھکتا ہے، کہ جاسکتا ہے، اس لیے کہ سب کتابیں نیا بہتر تخلیق نہیں نکالتی جاتی ہیں۔ شہر تہذیب بناتے ہیں، اور ہمیں ضرورت سے زیادہ سے زیادہ کی نگاہ ملتی ہے۔ تو کسی کریم شہر کا مقامی پکھلاؤ کیا ہوتا ہے؟ اگر وہ پیش کا ایک ماحول، مہتر سے مہتر کا علی رسائی، دیہات، اور اگر شہر خوش قسمت ہے تو، اس کے عقب میں وسیع سطح میدان۔ اس کے پیچھے ڈاکے پھارے، اس سے پیسے ایک کوا کی صند۔ مرکز میں "سہائی بلند یوں کی طرف نہ جتنے ہوئے گا کوڑا نہ ہو، بوران کے اطراف، بے شک پوش، سایہ دار چمن۔ آسمان میں حریف کی صورت میں اڑتے ہوئے کبوتر، اپنی کرات میں یقینی غیب دہی کے (زمانہ قدیم میں پرواز کے دوران پرندوں کی ٹانگ سے ہٹنے والے خاکوں سے غیب کی پیشین گوئیاں کی جاتی تھیں۔ مترجم) آگے، اور شہر کے ملک میں گھوڑے، ہاں وہی جانور جو نیسویں صدی کے اختتام پر، وینچی ہیٹ دن سفاریوں سے پھرتی کھینچ کر لے جاتے تھے اس دور میں بھی نندہ ہیں، غم، بد ہضمی کے باوجود ان کے عقب سے خاموش ہوتی ہوئی میان تک میں ٹم ائیر کی گونج نہیں ہوتی، خشک پہاڑوں کی بلند یوں سے چمنوں پر اترتی ہوئی وحش، مخلوق فجر کے ساتھ Queen's Park Savannah کے اصطبل سے نکلے ہوئے کھوڑے اور شہر کے مرکز میں ہڈیاں ہونے والی گھڑ دوڑ تاکہ لوگ انیسویں صدی کے جانوروں کی رفتار اور ان کے حواس اور توانا جسموں کی دلی کھلی پر خمیں کا غرہ بند کر سکیں۔ ان کی بند گاہیں دھوئیں سے اور غارت سے زیادہ مشینوں کی گڑ گڑاہٹ سے پاک، اور سب سے زیادہ، فسطی اہبار سے اتنی مشتوٹ کہ ان میں دنیا پھرتی (لٹریچر، چورلی ورافریٹی) تہذیبیں نمائندگی کرتی نظر آئیں، دوران کا نرم خونوں، جوس کے ڈبوں سے کہیں زیادہ جذبات ائیر۔ اس کے باشندے اپنی پسند کے مطابق، روایت نہیں، نصرت کے اہبار سے شادیاں کریں گے، جب تک کہ ان کی اولاد اپنی جینیات کی تلاش کو غیر ضروری نہ سمجھنے سکے۔ اس میں زیادہ راستے نہیں، جو پیدائش، فروع کے لیے ڈھیر بک و مشکل ہوں، اس کے تھرائی علاقے کی پوری نوبت کے کنٹرول پر مشتمل مختلف لہجوں کی ہے، چچی اور شام کے پانچ بجے ہی۔ انسان ہو جائے، اور توانا کے دن ان کی

بندرگاہوں کا ہمیشہ خالی رہنا۔

میں میرے نزدیک یہ ہے پورٹ آف انکین، اپنے تھوڑی بورسائی تمامب میں ایک مٹائی شہر جہاں ایک لاشعہ چٹنے والا ہوتا ہے جہاں نہیں۔ تھوڑی گونج سے قیل شاید اتنے کچھ اسی طرح کا رہیوگا۔ پورٹ آف انکین کا اٹھرتا ہوا بہترین تصویر کی خاکہ اس میں بننے والے ہر بندوں کے ہاتھ کا کام ہے، سینٹ اسٹیفنس کا بنا ہوا نہیں، ایک نقش و نگار کے پچہ پی مرتھے، ہر گھنٹی اور اصل عمارت کے بجائے خود اپنی تصویر دکھاتے ہیں۔ شہر کے عقب میں اپنے دیہاتوں سمیت Caron کی سطح میدان ہے جس کے پاس سے نرمی ہوئی شاہراہ پر لہراتے ہوئے سندھوستان کے دھانیہ پرچم، میدہ فروشن کی دکانیں ہیں اور غصہ میں پرچم کی طرح جھرتے ہوئے (پرندے) ایک تصویر نصب افلاس ہے اکیلا مٹھری ادا کی ہے۔ اس بیان سے میری مرد جنت کو دوبارہ جاننے کی کوشش نہیں۔ Aniles کے معنی ہیں حقیقت، روشنی کی کام کی اور بلا کی۔ میرا مطلب ہے وہی شاہراہ کے کنارے کا ایک مکان، کیرجین کا مندر جس کو یہ ہے، تازہ و انکانات اور پتلا۔ پتلا ہے شیلے پن کی، اور وہ حالی بیلا پن، ایک ارتقا ہے بقول ہی وہ کیفیت ہے جو شاعر کی پیشہ کو مدد شت نکھاتی ہے، جب کہ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو اس کو فٹنل بناتی ہیں۔ یہ ساری چیزیں یک جہ ہوں ایک مجموعی رسم کے تحت آجاتی ہیں، جس کو ”دنیہ“ کہتے ہیں۔

یہی ہے Aniles کی آشکار شاعری۔ یعنی پتلا۔

اگر آپ اس دل بوندہ دی کو سمجھنا چاہتے ہیں جو جزائر کے ساتھ کی گئی ہے تو آپ کو چاہیے کہ Aniles کے جنگوں کی چند نقش نگاری، ان کے مخصوص پدم درختوں کے ساتھ کزف اور آب و ہوا پر نظر کریں۔ بات چیت و لغو کی طرح ان میں ایک مندر کرنے والی شرافت ہے، جیسے ”سمن شیلے کی چھت گیری ہو جس کے نیچے سمن شیلے چہل قدمی کے لیے، سوار کی گاڑیوں پر سیر کے لیے ایک نوؤہ دیانی نہایت ترتیب دی گئی ہے، یہ قبلاات ایسی دل سوزی کے ساتھ سندھو سے ملے ہیں جو سندھو کا رہنما بند کے اوزار کی اور چھرا پانی نقشہ ساز کے قلم کی رہنمائی کرتے ہیں۔ وہ بھی وہ دی سوزی ہے جس نے، ایک طعنہ زن ٹری سے، گاؤں کو لپٹی مٹی جیسے سب نام لیا ہے۔ ایک صدی، روسیوں سے خفاء اس کے پیش مندر کی طرف لٹا روشنی میں اور خط انھوں سے دیکھتی رہی ہے۔ گرم ٹپے کے موسم سے بچائے یہ ایسی تصویریں ہیں جو دیکھنے والے کو طوب کرتی ہیں۔ مخصوص لباس میں میڈی مقدی عورتوں کی، شکر کے کارخانوں اور بندرگاہوں پر سندھ کی ہوئی نرم و لطیف سندھ کا دیو، مارنخ کے حصوں کے طور پر دکھائی جاتی ہیں، وہ نامرغ جو سندھ کا دیو کرنے والوں کے، اور بعد میں فوٹو گرافروں کے کامیوں کے پورے سے دیکھتی رہی ہے۔ مارنخ خود اپنے مندر کو موافق جانے کو خاطر رکھتی اور حرکت کرنے والے ہاتھوں کی علامت کرتی ہے، یہ وطن کی خاطر جمیوں کو سے ہاسوں سے موسد کرتی ہے گرم ملکوں کی روشنی کی رنگ کو مٹاتی سڑکی ایک رنگ میں اور Trolope کے مجوں میں شائع کیے گئے، کا ناز کے لیے کو مستدل کرتی ہے۔

نیا جاپنے مرتھاپنی کامیت کے قوائیم بھی لیے گئے، پورن کی تحریر کی ہوئی نثر نے منظر نامے کو بھی قعر و حست پر خود بخیر کی کھانی میں سر دیو۔ فن تیر سے سویتی تک ہر کوشش کو نقل کہہ کر اس کی تحقیر کی جاتی ہے۔ Froide میں بھی اس پر حیرت تھا کہ تاریخ کا سر ل پر مختصر ہوئی ہے، اور چوں کہ Amies کی تاریخ پستیاتی طور پر اتنی بد عنوان مائی بدل انگیز تھی، قتل عام کے باعث، غلامی کے باعث، اور عرطوں کی مشروط پابندی کے باعث، کہ ان علت، خراب بندرگاہوں میں، کہ ایک ہی آغاز کے ان چاگیر و اماں شکر ساز ظالموں میں اتنی تہذیب ناقابل تصور تھی، کبھی کوئی بھی شے تخلیق نہیں کی جاسکتی تھی۔

نہ صرف Amies کے پیراؤں کے تک دور روشنی نے، بلکہ اس کے پشندوں کی محو ہمت اور توش نے بھی اس کا مقصد کیا۔ اگر آپ تھوڑی دیر کسی بازار کے قریب کھڑے رہیں تو آپ کو اس کی بار بار سنائی دینی بند ہو جائے گی۔ اب بھی انیسویں صدی میں کھوڑوں کی طرح رہتا، جیسا کہ ہم نے دیکھا تھا، کوئی بے سودا نہیں ہوگا، اور Amies میں بنائی گئی کا پتہ صراحتاً غریب ابتدائی کی طرح، کچھ صدی کے غریبوں کا محسوس ہوتا ہے۔

گھاسم رین جیسے تازہ کار گھنے دلوں کے عقل، کیرمیں کو مائی گداز کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے، ایک غریب آبادی سے، جس کو کوئی استغناء نے، اپنی پاؤں کے غریب سے Tristes Tropiques کا لوح مزاج اہم کر دیا ہے۔ ان کی ادبی کیرمیں کی شام کے دیے سے، مارش اور بے قلاب و نیو افندہ کوئی ہے اور کیرمیں شہروں کی ملاقاتی توقع بھی، جن میں جدید فن تیر کی بے ہم ہو ہو نقل، چھوٹے مکانات اور گھیسوں کو اور پستہ تہ بنا دیتی ہے۔ ان کی مزاجی کیفیت کچھ میں آئے وہی ہے، دوران کی نائی و پیانی متھدی مرنے سے جیسے غروب آفتاب کا بخان جیسے مارل کے پیر و درختوں کے سرے پہے، مگر ان میں کوئی انجی بٹے ہے جو بلا آخر نائی کی طرف غلط ہے، ہلکے پری ہے، جس کو انگریزی و فرانسسی یا کچھ تارکے بٹن دیوں نے بیان کیا ہے۔ یہ دھنگی سے غلطی سے متعلق ہے، اور ان لوگوں سے متعلق ہے جن پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ ادیب، ہمارے ناممل شہروں کی ہوا پوری کی ان کے ناممل و حریف نیچے کو بیان کرتے ہیں مگر کیرمیں شہر کسی نکتے پر کوئی نتیجہ نکال سکتے ہیں، جہاں یہ اپنے موجودہ دسجے سے مطمئن ہوں، بالکل اسی طرح جیسے کیرمیں تہذیب ارتقا پذیر نہیں ہو رہی ہے بلکہ پسے سے مجسم ہو چکی ہے۔ اس کے تناسب کا کبھی نیا تہ تارکے وطن ادیب کے ہاتھوں مدد نہیں کیا جاتا چاہیے، سوائے اس کے باشندوں اور تفسیرات کے۔ یہ کہہ جاتے ہیں کہ ہم انہی تک ایک شہر تہذیب نہیں بن سکے ہو، جس نے تمہارا شہر ہوں پورے تمہاری تہذیب جیسا مدلل دیکھا ہوتا ہے۔ اس کے بعد Tristes Tropiques کی کم ضرورت رہ جاتی ہے۔

اس شخصیت پر جہاں ہم اس وقت موجود ہیں، مجھے اٹھتی ہوئی ہروں کی خمیں امیز آواز سنائی دے رہی ہے گویا یہ پھر میں ہمارے منظر نامے کو پورے ہادی تاریخ کو "At Last" کے ذریعے غریب تہذیب بخش رہی ہیں۔ "At Last" کیرمیں کی کوئی کتابوں میں سے ایک کا عنوان تھا جو ڈکٹوریہ کے عہد کے ایک نیا تہ

چارلس ٹنٹرو نے کبھی بھی یہ بیان ابتدائی کتابوں میں سے ہے جس کے ذریعے Antilles کا منظر نامہ اور اس کا خیال انگریزی ادب میں داخل ہوا تھا۔ میں نے اس کا مطالعہ تو نہیں کیا ہے مگر معلوم ہوا ہے کہ اس کا بانی لہجہ مہربان اور شگفتہ ہے۔ Antilles کا مجمع جزائر، Trolope، Patrick Leigh-Fermor کے ہاتھوں، اس انداز میں لکھے جانے کے لیے موجود تھا، میں ٹیلی مٹی کے نظارے کے بارے میں تقریباً حس الامان میں لکھ چکا ہوں، ایک جھرو اور فنی غیر ملکی کی طرح، اپنے آپ کو ٹیلی مٹی سے فاصلے پر رکھ کر جب کہ میں اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جو شے پیشہ ہوا اس سے محبت نہیں کی جاسکتی۔ سیاحت کے دوران گزرنے والی چیزوں سے محبت نہیں کر سکتا اس لیے کہ محبت غیر متحرک ہے اور سیاحت حرکت ہوتی ہے۔ اگر کوئی سیاحت کی مظہر نامے کی کسی شے کی طرف واپس آتا ہے، جس سے اسے محبت ہو گئی ہو تو پھر وہ سیاحت نہیں رہتا بلکہ کچھ دور کا ذاتی کشیت میں، وہ دنیا کے اس مخصوص حصے کا محب، یعنی ایک مقامی، بن جاتا ہے۔ بے شمار لوگ کہتے ہیں کہ وہ کیریبین سے محبت کرتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ نقطہ اس کی سیرت کے لیے واقعی کا رودہ رکھتے ہیں، وہاں بس نہیں سکے، جو ایک سیاحت کی شگفتہ تو ہیں کے مٹا ہوا ہے۔ یہ سیاحت اپنی تمام تر مہربانیوں کے باعث ایک قسم کی سرپرستی پر یقین رکھتے تھے، جب کہ یہ جزائر ان کے سیاحتی خاکے سے گزرتے ہوئے سڑے تھے، ان کی باقی فراوانی کے، ان کی پرمالذوق کے اور ان کی غربت کے۔ اور وہ گنورینی طرح کاری نے ان کو حیرت بخش دی تھی۔ وہ خوب صورت خاکوں سے گزر رہے تھے، ہوں ایک تفریحی تعطیل کی طرح پھر دیئے گئے تھے۔

Alexis Saint-Leger Leger جس کا تعلق نام Saint John Perse ہے، پیر Analean تھا جس کی مشاعرے میں ٹوئیل انعام ہوا تھا، Guadeloupe میں پیدا ہوا تھا، فرانسیسی زبان میں لکھتا تھا، مگر اس سے قبل محسوسات میں ایسا تازہ اور صاف بیان دیکھ نہیں آیا تھا جیسے کہ Antilles کے ذریعے ملنے والے سہنے والے اس مراثیات یا قہر سفید فام بچے کی بچپن میں کبھی غنی نظموں Enfanoe, Exoges Pour Peter اور une Images a Crusoe میں انگریز تھا۔ 'At last' (جیسے کہ پہلے عرض کیا چکا ہے) کاغذ کے صفحات پر پہلی تازہ ہوا تھی، کتب کی کاغذ رکھنے والی، از خود تازہ دم ہو جانے والی تیار ہوئی ہوؤں (trade winds) جیسے، جس میں مسلمانے نئے کی آواز اور پام کے درخت 'The Odour of Coffee Ascents the Stars' میں دھسے ہوئے تھے۔

کیے بہن کا جن جنس اپنی تردید پر مجبور کر دیا ہے۔ اگر ہم Perse کا جشن منا چاہیں تو ہو سکتا ہے کہ ہم کو قدیم نظام شجر کاری کا، اپنے باغ کے ہر کام کے، اپنے باغ میں کام کرنے والے نہ سے مزدور کا، سر پر ستانہ خطابت اور تبرکات کا جشن منانے کے لیے بہ جائے اور اگر Perse اپنی ابتدا کا بھی انکار کرے، جیسے کہ تقسیم لکھنے والے انٹر اپنے، خاندان کو پائیدہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو، ہم افریقہ کے شاعر Ame Cesaire کی غلی سے لیا کہ اس کی غلی نہیں کر سکتے۔ یہ سمجھنا نہیں، یہ ایک طریقہ جس پر یہ ہے

جس کو شاعری کہتے ہیں، کہ جب میں طوبیٰ آفتاب کے دلت ہندی تار (cabbage palms) کوٹھونے پرستے دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ کئی ہندوؤں میں Perse کی عذوبت گھر رہے ہیں۔

Perse نے اپنے سفید نام بچپنے اور لیبیائی کے ہندی رنگ کے نوجوان تیرہ برس کے پس منظر میں بچنے والی ہندوستانی موسیقی، ہڈیوں کا جشن منانے کے لیے جو منگتی ہوئی اور اشتقاقی کی شاعری کی ہے، جیسے Aniles کے آسمان میں ہندی تار ہڈیوں میں دل۔ ایک ہی طرح بھی کرتے ہیں۔ میں ان نظموں میں وہی کئی محسوس کرتا ہوں جیسے کہ لوگوں کے چہروں سے مترشح تھی۔ تو، Aniles کو تاریخ کے پتھر نظر، یہ غیر معمولی کتب خانہ؟ دنیا کی تاریخ بدشاہد جس سے ہماری مراد یورپ ہے، قبیلوں کے درمیان لڑنے، رسائی، اور نسلی صفائیوں (ethnic cleansings) کی ایک دستاویز ہے۔ بالآخر وہ جزیرے جن کے بارے میں کچھ نہیں سمجھا گیا، اب پٹی تاریخ ٹوٹ کر رہے ہیں۔ اور ہاتھ پھیلائے پام کے درخت اور آسمان کی طرف سر اٹھائے ہندوستانی Aniles میں مسلمانوں کی زیادتیوں سے لگتے ہیں۔ بالآخر، Guadeloupe کے شادی پام کے دلب سے Perse کی نظم Etoges کی صدائیں اٹھ رہی ہیں۔ بعد میں Guadeloupe کا سفید نام بچہ، Perse، اپنی تخلیق "Anabase" میں سرحدی پھرتیوں کی کھڑکیوں، زہر آلود تھیلوں کے جھاگ سے نچری خشک برساتی لہریوں، کیرتوں کی خشک مچھوں کے برعکس، جوانی تک لپٹی مٹی کے چند نوجوان تیر لہانوں میں زیادہ نظریاتی نہیں کرتی تھیں، جھنڈوں سے مزین میدان میں مقدس متون کی عذوبت کے شور باجی اور ہندوستانیوں کی لہریوں، کھیتوں میں اٹنے والے گھٹے کے تیرہوں کی مدد سے، شاہانہ لکھیوں اور بلب، Aniles کے افق پر بالوں کی پتلیوں کے ذریعے قدیم زبانوں میں، ہندی، چوٹی اور عربی کی خوش نوکی سے اپنے خلیق رزمیہ کے ٹکڑے جمع کرنا دکھائی دیتا ہے۔ رہائش سے Anabasis تک، Guadeloupe سے ٹرینی ڈائی تک، فریقائی پر بادبادکوں سے، Canton کی کھینچنے کے سٹیل پر بنے ہوئے شکاف سے، شام اور بیتان سے، ٹکڑے ٹکڑے کھرنی ہوئی تمام قدیم کتابیں، لہریں، شکر ہاری چٹھی ہوئی؟ ورنوں میں ورثہ ہم مسرور مہر رہنوں کے تپوں میں ٹوٹ کر کھنکھاتی ہیں۔

کمزور آنکھیں، لایک بچہ، آگے Aegean کے پتلیوں پر ایک چکن، ہرچونے چکر پھینکتا ہے، اور رہائشی کی شکل میں مزی ہدف کش کا یہ نہایت سادہ سا عمل ہومر کی مشہور نظم Odyssey اور Iliad میں کیے گئے بتانا چاہتا ہے، ایک وہ لڑکا گاؤں کے میسے میں بالوں کے تیر پھینکتا ہے، تو وہی کیرتوں کے صوبہ آفتاب میں ہندی تار کی سربراہی پیش قدمی منتا ہے، اور اس آواز سے، جس میں قبائلی طور پر ٹکڑے شامل ہیں، صدیوں اور مجمع الجزیرہ سے تشع نظر، Perse کے رزمیہ کی زبردست مجموعہ شروع ہو جاتی ہے۔ ہر شاعر کے لیے دنیا میں صبح کا وقت ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ اور تاریخ، ایک فاموش کردہ بے خواب رات ہے۔ تاریخ اور غنصری خوب ہمیشہ ہماری کوئی ابتدا ہوتے ہیں، بچوں کے باج جو دشمنی کا متعدد دنیا کی محبت میں گہرے رہتا ہوتا ہے۔

جب ایک ادیب خود کو ایک سویرے کا گواہ بناتا ہے جو شاخ شاخ پتی پتی، پتی تعریف کر رہا ہو اور اسے خود تعارفی صبح میں، خاص کر ساحل سمندر پر، غلوغ صبح کا ایک رسم کی طرح دکھاتا رہا ہو۔ تب وہ اسے جس کو "Arrebas" کہتے ہیں چمک دار پانی کی طرح ہلکے سے لیتا ہے اور جس کی آواز میں، پام کی خوشبو، اور پتہ مل کر ایک تازہ بون کی آوازیں بنتے ہیں، جس کو مقامی بون کہا جاتا ہے۔ ذاتی لغت، انفرادی لغت جس کی شاعرانہ بحر کسی کی بھی خود نوشت ہو، خوش قسمتی سے، اس آواز میں شریک ہو جاتے ہیں، ورنہ سب غنیمت سے بیدار ہوتے ہوئے ڈیرے کی طرح چٹا ہل قدمی کی انتہا حرکت کرتے ہیں۔

یہی وہ دعا ہے جس کا جشن منایا جاتا ہے اور جس کی وہ خوفناک فریاد ہے جو جس کی انگلی لازماً آن ہے۔ میں ان دنگ کی طرف سے، اگرچہ ان کی شکل میں نہیں، اس مقام پر کھڑا ہوں، اس مقامی بون کے نام سے بھی، وہ جس کا میں دین کرتے ہیں، ان درختوں کے چمک کی طرف جن کے نام نودہ ٹک دار ہیں، نیا و ہیر ہیر اور گھریزی زبان سے نیا و تانہ launer canelles, bos-fol, bois-canoel — یا درختوں سے گھری وانیوں — Fond St. Jacques, Maboonya, Foresser, Roseau, Manaur یا حتیٰ ساحل سمندر — Paradis, Case en Bas, L'Anse, vrogne, جو ٹورسب نئے ہیں، تو رنج ہیں فرانسیسی میں نہیں (بیر کا کی مقامی بون) pabois میں۔

ایک گلاب کا وہ تختہ و نائے وہ نہیں ملتا ہے، درختوں کی زبان اور انگریزی میں باتیں کرتے ہوئے اسکول کے بچوں کی:

میں جو کچھ دیکھ سکتا ہوں، وہ سب جاگیر ہے میری
مرے حق پر کوئی اگلی اٹھا سکتا نہیں، ہرگز
نہ مرکز سے، نہ اس پچھے ہوئے گہرے سمندر سے
کہ میں ہی تو ہوں مالک ان پتھروں کا چھوڑا
ارے تھائی! پوشیدہ کہاں ہے دل فریبی اور وہ آنسو
جسے ہائش نے دیکھا ہے ترے چہرے کے صفحہ پہ
میں بہتر ہے خطروں میں بسر ہو زندگی سادگی
بھائے اس خطوں انگیز ہستی پر حکومت کے

ٹک کے اندر وہیں کی بحر میں، مگر ہائشانی ساندوں پر مقامی طور پر، ہاتھ سے پھانے ہوئے chac-chac, solin پر پورے کی کمال سے بنے ہوئے دھووی پر Sensenne، میں ایک لڑکی گاتی
مناقی دیتی ہے:

اگر میں تم سے کہوں، جواب میں
ہزار دھووی نہی ہیں مجھ کو

تو تم کہو گے ”یہ بات سچ ہے“
 اُمّ میں تم سے کہیں کہ تم نے
 لگائے ہیں زخم میرے دل کو
 تو تم کہو گے ”یہ بات سچ ہے“
 جس مری جان، اس زمانے کو نساں تو بھی تو
 ملت کرتی نہیں محبت

یہ مطلب نہیں کہتی صبح سے آج کو ملا رہی ہے۔ یہ تو American جغرافیہ میں رہتی ہی ہے، خود اس کے نہات میں بھی۔ مایہ وٹنی (Middle Passage) کا سمندر بھی غرق مرنے والوں پر سنا جاتا ہے، اس کے اس قدیم باشندوں Carib اور Aruac اور Tano کے قتل عام پر، جن پر قرعہ لڑی شک پھول بھی ختم دیتے ہیں۔ ساحل سے ٹھکانے والی ہیریں بھی ریت پر لکھی ہوئی فریقا کی یادوں کو مٹا نہیں سکتیں، نہ جگہ کے بدلے کھیتوں کے سرسبز قید خانے کو توڑ سکتے ہیں جس شرط شکنجہ پر مجبور پیشانی، یعنی لٹی لٹی کے آلود اچھاں آج بھی قید کاٹ رہے ہیں۔

اپنے اطراف سے، لڑکپن سے میں نے یہی سمجھ لیا ہے، جب سے شاعری کی ہند ہوئی ہے، یعنی کوششوں کی دل رانی، مکمل کاٹنے والوں کے جسم کی سخت مہنگی (mahogany) میں، چرواہوں میں، مال جیسے سخت سناٹوں میں، ٹوکے بنانے والوں میں، ایک ٹھنڈے ست انسان میں جو ہمیشہ کی طرح بے نام خاک کی گچھے کے ساتھ کھڑا ہے، ال چارہ کو لپیٹے، جواں نے صبح کے چھٹے ہوئے اٹھوڑے میں اٹھتے ہوئے، خشکی کے باعث اوپر سے ڈال لی تھی تاکہ ہندوؤں پر واقعہ باغ میں کام کر سکیں بلندیاں، باغ، جواں کے گھر سے میوے مزدور کو ملے، گھر و جی تو اس کی زمین ہے۔ کیا ذکر کیا جائے، یہی کیڑوں کا، ٹوک پر لانے والے مزدوروں کا، سانس ملتی ہوئی بھول میں، افریقہ کے تمام ابتدائی مزدوروں میں جن کی تجسیم ہوئی، اور استحکام ہو، واپ ہو جزیرے کی زمین میں چوڑی طرح بچوست ہیں، ویسے ہی چائل، جیسے بچاں چائل ہوئی ہیں، یہ لوگ پڑھ لکھ نہیں سکتے، وہ صرف پڑھے جانے کے لیے ہیں، اور گران کو اچھی طرح پڑھا جانتے تو ہم دیکھیں گے کہ وہ پناہ دہ خیریت کرتے ہیں۔

غربی حوں کے لیے بنائے ہوئے کتا پھوں میں کیر جین، مٹی ایک بیٹوں خوش سے جس میں امریکی جمہوریت نوریلر اعلیٰ ڈاک لگائے ہوئے سے اور ہمارے جزائر و جزیرے کے ہو تجربے جزیرے چھترپوں اور مشروب لیے اس کو جانب ہی مٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح یہ جزائر نہایت کی شرمساری کے ساتھ اپنے آپ کو خدمات کے لیے پیش کرتے ہیں۔ اس طرح ان جزائر کی اپنی شہادت کا موبی نیلام ہوتا ہے، ایک جیسی خدمات کی ایک ہند آہنگ کھمار میں جو ایک جزیرے کو دوسرے سے میسر نہیں کر سکتیں، مستحکم کے مادہ شریعتی ساحل کے ساتھ، دہریوں کے طے کیے ہوئے زمین کے سوڈوں کے

ایک طویل ساحل، بالکل دیرین جس کے آخری حصے پر مٹی گیموں کی تمباکو نوشی کا امرا نامہ ہوتا تھا۔ کیرتین کے جزیرے تم از کم اس کے باسیں کے لیے، دیہاتیوں کے پھولے چھوٹے گیت نہیں مددہ کی سے نامہ ہوتی طور پر اپنی کارکردگی کی طاقت حاصل کرتے ہیں، جہاں کی طرح، Sea Almond اور جوشی و جذبہ کی بندہ یوں کی سرشاری کی طرح۔ اس کے آسٹن اور پھیرے نہ محبت کے لیے ورنہ تصویر کشی کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ ایسے چٹے ہوتے ہیں جو ہینے چھوڑتے ہیں، اور جن کے تنوں کی چھال پر نمک کی پست چھگی ہوئی ہے۔ مگر ہر روز کی جزیرے پر، سوٹ میں ملبوس، بے حد شجرہ نسب کا باؤں منتظمین سے ٹیکس کی موافق چھٹ کی دستاویز پر دستخط کرتے ہوئے، Sea Almond کو اور پہاڑوں دان کی جہاں تک ترہ نو کرتے ہیں۔ اسکی سیج آسکتی ہے جس میں تھوٹیں یہ پوچھ سکتی ہیں کہ صرف جنگیں اور تھالیوں پر ہی نہیں، تمام باشندوں پر کیا اثر رہا۔

یہ ایک بار پھر موجود ہیں، پھر موجود ہو سکتے ہیں، یہ چہرے ہر عنوانی پر مائل فرشتے، چٹکیں سیاہ جہد اور لڑائی خوشی سے چٹکی بڑی ہوتی، رام نیلا میں شامی، ایشیائی لڑکیوں جس، سفید آنکھیں۔ وہ مختلف مذاہب و مختلف بر عقلم و مردہ سے نبرہ وہ اصلی خوشی جو دیوں کو حاصل ہوتی ہے۔ مگر بغیر خوف کی خوشی کیا ہوتی ہے؟ خود غرضی کا خوف جو یہاں، اس ششیں پر، ساری دنیا کی قہر کے باعث، موجود نہیں صرف، مجھ پر ہے۔ میں ان تمام بھونٹ ہائی خوشیوں کو سب سے بچا کر رکھنا چاہتا ہوں، اس لیے میں کہ وہ معصوم ہیں، صرف اس لیے کہ وہ بچی ہیں۔ ایسی ہی جی جیسی کہ Perse کو اس وقت، نعت کی صورت میں بھسوں ہوئی تھی جب ایشیائے کوچک کے ہندو کی تخلیق کے دوران کچھ سطریں ہندی تاریکی سربراہت میں نازل ہوئی تھیں، جذبات کا وہ انداز ہی ایشیائے جس میں تخیلات کا وہ گرد ہوتے ہیں، اگر ہماری پوری نسل کی اجتماعی برداشت کے، مقابلے میں تخیل جیسی کوئی شے واقعی وجود میں ہے۔ اس شگبہ بچے کی خوشی کی طرح جس نے لیلیٰ کی کے میدان میں ابر تے ہوئے سمندروں کے پورے بانس کے تیر پھینکے تھے۔ اور اب مجھ میں وہی ہی شکر انگیز معجزات اللہ دینا ہی مقدس خوف ہے جیسا کہ ایک بچے کو اس وقت محسوس ہوا تھا جب اس نے کئی بار اپنے اس کے کاپی کھونٹ تھی، اور حاشیوں کی تمہید کی قید اور نئے ہوئے جھلوں میں کسی گم نام جزیرے کے پہاڑوں کی وہ روشنی محسوس کی تھی جو ہماری ہے تو جس کو نگلے لگے ہوئے ہے۔

ماڈلین گورڈیمر

اعترافِ کمال۔ جو اپنے پشیموہ سرمیہ انداز تحریر سے، اطریشی نوٹس کے اپنے عطر کے مطابق، انسانیت کے لیے زیر دست بھلائی کا باعث ہوئی۔

جنوبی افریقا کی ایک سفید فام ماڈل ٹاکر ماڈلین گورڈیمر اپنے، خوب میں موجود نہایت پیچیدہ معاشرتی رشتوں کی شدید ضرورتوں پر سب سے زیادہ قلم اٹھاتی ہے۔ وہ میاں میں بھی حصہ لیتی ہے مگر اس کو اپنی تخلیقی مصروفیتوں پر انداز نہیں ہونے دیتی۔ اس کے باوجود وہ تخلیق کے دوران حائل ہونے والی تاریخی بصیرتوں سے چل رہی متعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔

گورڈیمر کے تخلیقی دور کا پہلا سہ ماہی (1970) A Guest of Honour تھا جو کوسٹل مڈر کا ایک گھٹا ہوا دور پر تھیل ماڈل ہے۔ اس ماڈل میں گورڈیمر جنوبی افریقا کے قومی پیش سفر میں آنے والی تبدیلیوں پر بڑی شرف نگاہی سے روشنی ڈالتی ہے۔ ماڈل ایک ساری نوآبادیاتی حاکم کی واسطی کے بارے میں ہے جو مختلف سطحوں میں کھینچنے والی دفاتاریوں میں جھنڈے کے باوجود مرکزی کردار سے محبت کے باوجود گھر پیچیدہ مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کی لاکھائیں موت قوم کے مستقبل میں کسی ایک فرد کے کردار کے بارے میں مسائل کو جنم دیتی ہے۔

تھیل صدی کی ماحولیات و بیانی سے گورڈیمر نے اپنے ماڈلوں میں ایک پیچیدہ طریقہ تحریر اختیار کیا۔

کے دور میں اس نے تین شاہ کا ماول (Conservationist (1974), Burger's Daughter 1979 اور (1981) July's People لکھے ہیں جن میں وہ اپنے فنی نکتہ نگار سے فریقہ میں سیاہ فام لوگوں کی برحق ہونے اور سب سے زیادہ بری کا تجزیہ کرتی ہے اور ساتھ ہی سفید فام افریقیوں کے لیے خصوصی مراعات کی برقراری کے سوال پر بحث کرتی ہے۔

اس کا ماول July's People خصوصی طور پر تذکرے کا حق دار ہے۔ یہ ماول Soweto میں ہونے والے خونی واقعات کے پس منظر میں تحریر کیا گیا ہے جس میں سیاہ فام لوگوں کی بغاوت کی عکاسی ایک سفید فام خاندان اپنے شہر سے فرار ہوتا ہوا اپنے یہاں ملازم ایک لڑکے کے گاہوں میں پناہ گزین ہوتا ہے جہاں اس کو ایک طویل عرصے تک نہایت نامساعد حالات میں رہنا پڑتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ اس کی حالت سے دور ہوتے ہیں جس میں مالک اور نوکر کے رشتے ٹٹ پھٹ ہو جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں پناہ گزینوں کی ذہنی کیفیت کا تجزیہ اس ماول کو معرکہ آما بنا دیتا ہے۔

1990 میں گورنر کا تازہ ترین ماول My Son's Story میں شائع ہو گیا۔ اس کا موضوع تھا، ایک ناقابل ترمیم معاشرے میں محبت، انجمن، رفیق قدم پر رکاوٹیں جو بدلتے ہوئے حالات میں مائل ہو جاتی ہیں۔ اس میں محبت کرنے والے افراد کے رشتوں کی نزاکتوں کا بیان خصوصی طور پر قابل تعریف ہے۔ شاعرانہ قدموں سے مملو اس ماول کا لہجہ انگریزی اس کو ان پلیدیوں پر لے جاتا ہے جہاں بچپن کر اس کا قاری محبت ہو جاتا ہے۔

گورنر کے کاغذی درجے کے ماولوں کے سامنے اس کی چھوٹی کہانوں کو بھی بھلا دینا نہیں جاسکتا جن کے مجموعے (1975) Selected Stories اور (1980) A Soldier's Embrace کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

گورنر 1923 میں جوہانسبرگ کے جوار میں کان کنوں کی ایک چھوٹی سی بستی سپرنگس (Springs) میں ایک تارک وطن یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اس کا باپ جو ایک زرعتی، طبی سے آگاہ اور اس کی ماں بھارت سے نقل مکانی کر کے جنوبی افریقہ میں آباد ہوئی تھی۔ کانوٹ اسکول کی تعلیم کے بعد گورنر نے جہانسبرگ کی University of Witwatersrand سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

گورنر نے نو سال کی عمر سے لکھنے شروع کر دیے تھے۔ اس کی پہلی کہانی جنوبی افریقہ کے ایک ریلوے میں اس وقت شائع ہوئی جب اس کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ اس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ Face to Face 1949 میں اور 1953 میں پیدا ماول The Yang Days شائع ہوا۔ اب تک گورنر کے اس ماول، افسانوں کے ساتھ مجموعے کی تعداد تیس کے قریب ہے اور بہت سے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ گورنر کی کئی کہانیاں اس کے اپنے وطن جنوبی افریقہ میں پانچویں بھی لکائی گئی ہیں۔

خیانت سے خطاب

حضرات!

جب میرے ایک دوست کی چھ سالہ بیٹی نے اپنے باپ کو کھانے سے منہ پھیر دیا تو اس نے اپنے باپ سے پوچھا کہ کیا یہ انعام اس سے پہلے بھی مجھ کو مل چکا ہے یا نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ یہ انعام اس کی چیز ہے جو کسی کو مدد میں ایک باری مل سکتی ہے۔ جس پر چھوٹی سی بیٹی نے ایک لحظہ توقف کیا اور پھر، ”اوہ تو یہ خسرہ (chicken-pox) کی طرح ہے۔“

فلوینز نے کہا تھا کہ اعزاز لکھنے والے کو بے عزت کرتے ہیں، اور ان پال سڑنے والے ان مخصوص انعام کو لینے سے انکار کر دیتے تھے، جو دعوتِ دلگدگ بھیج کر اس کے بارے میں کچھ کہہ نہیں جاسکتا۔ میں یقیناً خود کو اس انعام سے کٹے ہوئے خیانت کو جو خسرہ سے کہیں زیادہ سرت آگیاں بوریہ انگیز پاتی ہوں، اس لیے کہ میں اپنی زندگی میں ان دنوں تجربوں سے زبردست ہوں۔

مگر وہ چھوٹی سی بیٹی کھانے کی شکل پر غلطی پر نہیں تھی۔ کھانا اور حقیقت، ایک قسم کا ایک ہے جو طلب میں تمام مشغلوں سے زیادہ توجہ و درودوں میں کمربند ہے اور مشغول ہوتا ہے۔ میرے خیال میں، ہم ایک لوگوں میں حوصلہ افزائی و دوستانہ پسند نہیں ہوتا، اور میرا مشہور ہے کہ ان لوگوں میں بھی نہیں ہوتا جن کا کام گروہی سرگرمی کا ہوتا ہے۔ ہم ترتیب شدہ دشمنیاں طرح نہیں۔ شاعر بغیر کسی حکمت کے کاٹا ہے، شاعر کا رد کوئی اشارہ بھی نہیں ہونا کہ اس کو، کھار کے، اپنے نظرائں سڑ کے ساتھ منظر میں کب داخل ہونا ہے تاکہ پیش کش کی جہاز اٹھائی جائے یا مامور کی شکل ہو جائے۔ ہم کو اپنے کام کے جوہر کو مکمل طور پر چھوڑنے کے لیے پوری طرح زندہ رہنا پڑتا ہے مگر ہم کو تنہا کام کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے تجربے میں ایسی مثالیں بدلتی خدائی خلوت ہوتی ہیں، جسے روبرو ہوتے ہوئے لوگوں کے لیے کوئی عیب نہ کہتا تھا ہم جن کے درمیان مہجے ہیں، اور ہماری آگے بڑھے ہوئے ہاتھ دینا کے لیے اس کی بہترین چیزیں لیے ہوتے ہیں جو ہم اسے دے سکتے ہیں۔

جب میں نے ایک سخت نسل پرست نوادہ کوئی معاشرے میں ایک بہت اوجھڑاؤ کی طرح کھانا شروع کیا تو اوروں کی طرح میں نے بھی محسوس کیا کہ میرے جو دشمنوں اور خوب صورتی کی دنیا کے بالکل کٹے ہوئے پر واقع ہے۔ شاعری اور افسانے میں، ذرا سے میں، مصوری اور سنگ تراشی میں، افسی ہوئی میری تحقیقات اس دورانیہ مملکت کے لیے مخصوص تھیں جس کو مسند پر رکھا جاتا ہے۔ میرے ہر عنصر و بیوں کا خواب تھا کہ وہیں قسمت سازی کی جائے، کہ فن کا دنیا کی دنیا میں دھڑکنے کا صرک کی ایک راستہ تھا۔

مجھے یہ احساس ہو کر رہی و نسل پرستی رکھنا ہو جو قوم میں وہی پر مائل پرستی کا نغمہ تصور استہلال کیوں گئی۔ کانٹا کے مقابلے میں، قانون کے پھانسی کی مانند جو عرشِ نر پر زندگی بھر کے لیے بند تھا چوں کہ وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہی اسے کھول سکتا تھا۔ میں ایک عرصے بعد احساس ہو کر اس دنیا کو پانے کے لیے ہمیں پہلے خود اپنی دنیا میں چرئی طرح دھنل ہونا ہو گا۔ ہمیں اپنے مخصوص مقام کے لیے کے راستے کاٹنا ہونا پڑا تھا۔ اگر کوئی انعامات کا کوئی نام مطلب ہے، تو یہی کہ یہ اس تصور کو آگے ملے چاہیے ہیں۔ اپنے عالمی نظریہ انتہائیت (Ecclesiast) میں یہ عکسِ امتزاج کہتے ہیں کہ کوئی واحد معیار، شہر کوئی ملک و بزرگشہ دنیا کے لیے ایک ہی سہافی کچھ تحقیق کرنے کا ثمن بھی نہیں کر سکتا ہے۔ انعام یافتگان میں شامل ہونا، ماضی جو حال، کم از کم کسی ایک قسم کی دنیا میں شمولیت ہے۔

خطبہ

زندہ رہنا اور لکھنا

ابتدا میں صرف لفظ کا وجود تھا

لفظ تو صرف خدا کے پاس تھا، خدا کا پسندیدہ لفظ، وہ لفظ جو خدا کی تخلیق کردہ کائنات تھا۔ مگر انسان کی صدیوں کی تہذیب کے دوران لفظ نے کئی معانی اختیار کیے ہیں، اور انی معانی کے ساتھ ساتھ مذہبی معانی بھی لفظ کا حصول نہیں ہو گیا ہے، کمال اقتدار کے ساتھ عزت کے ساتھ رعب کے ساتھ، اور کثیر ہر وقت کے حصول کے لیے سمس کا خطرناک تعاقب کرتے ہیں، کسی فیلی ڈائن ڈاکٹر کے لیے، کب کب کے لیے اور باتیں بولنے کے لیے۔ لفظ خدا میں پرواز کرتا ہے، سپادوں سے گھرا کر رہتا ہے، پسے کے مقابلے میں بلحا سے کہیں نیا دور قریب ہے، تو اس کے مطابق، جہاں سے آیا ہے۔ مگر اس میں سب سے زیادہ قابلِ تہذیبی میرے اور میرے جیسے افراد کے لیے بہت عرصہ پہلے ہوئی تھی جب پہلوتی سب پر نقش، یا papyrus (مصریوں کے ہوائی کانڈ) پر نقش کیا گیا پلا گیا، جب آواز سے بڑھ کر نظارے میں اس کی تجسیم ہوئی، سنے جانے کے بعد، خامات کے ایک سلسلے کی طرح پڑھے جانے لگے، اور پھر ایک مسودے کی طرح، اور اس نے حیوانی کمال سے Guenberg کا (جس پر چھاپا خانہ ایجاد ہوا تھا۔ مترجم) سفر کیا۔ یہ لکھنے والے کا انتہائی باب ہے۔ یہی وہ پہلی ہے جس نے اس کو نکھالا اور اس کو جو دیا کیا۔

تخلیق، حیرت انگیز طور پر ایک دیر سے عمل جس کی تخلیق، یعنی ایک ہی وقت میں، لکھنے والے کی تخلیق اور اس خاص مقصد کی تخلیق، جسے سہافی کچھ کے کاروبار میں تخیل جیسا ہوتا تھا۔ یعنی یہ فرد کی حیثیت سے دونوں

کی نشوونما کی ابتدا تھی، ایک فرد واحد کی نشوونما، اور اس کی فطرت میں سو فطرت کی نشوونما۔ اس سے کہہ سکتے ہیں کہ انسان کا ارتقاء ہی اسی سے ہو رہا ہے، جیسے بومیں کے پہلے قصبے The God's Spirit میں کچھ قیدی ایک قید خانے کے ساتھ قید خانے میں بند کر دیے جاتے ہیں جو دشمنی کی اس کرن میں ہو چکے ہوں گے دہشت گردانہ میں صرف ایک با قید خانے میں اترتی تھی، اسی کی چھ پر بنے ہوئے نقوش سے وجود کے معنی پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اپنی تمام زندگی، معاشرے میں، اس دنیا میں ہم جس کا حصہ ہیں، پڑھ رہے ہوئے متن کا مطلب سمجھنے میں گزار دیتے ہیں۔ ان معنوں میں یہ ناقابلِ رہائی اور ناقابلِ نیستی شرارت ہوتی ہے کہ تحریر ہمیشہ در ہر وقت اپنی، انفرادی اور اجتماعی وجود، اور دنیا کی کھوٹی میں ہوتی ہے۔

سوچو

اپنا احترام کرنے والے و حدی راج، خوش بختی و بد بختی جیسی تشدد انگیز اور سخت برکت کے حامل، انسان نے ہمیشہ 'کیوں' جیسے سوالات پر مدد دے دی ہے، کہ ہم کیوں؟ مہربان و رشتہ کیوں؟ مختلف دہات پر مختلف لوگوں کے ایسے سوالات کا کافی جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ سائنس نے آزمائش خود پر نکل کر یہ تفصیلی جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر، شاید ہم سب مائیں کی مہلک نشوونما کے بغیر ہی ڈائنوسار کی مانند اپنے مائے میں ہی ختم ہو جاتے۔ جب سے انسان کو خود اپنی اور اس کے ہونے، اس نے انسانی نسل کی عام کیفیت کے بارے میں موت، موسموں کے چکر، گریز، ارض، سمندر، ہوا اور ستاروں، سورج اور چاند، فزائی اور طبیعیات کے بارے میں وضاحت طلب سوالات پوچھے ہیں۔ سائنس کے ختمیہ میں، لیکن والدین کے آبا و اجداد کی ناپائی و ستان گویوں کی رزخ و کی (قابلِ مشاہدہ) زندگی کے عمار اور تصویر کی برکت (ختمیہ میں تجویز کرنے کی طاقت) کے استعمال کے ذریعے ان معنوں کو ظاہر صورت دینے اور قصبے گھرنے کی ضرورت کا احساس ہو چکا ہے۔

دولت با مت سوال کرتا ہے کہ اسطور کی خصوصیت کیا ہوتی ہے اور پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ اس معنی کو پھر میں داخل دیتا۔ اساطیر ایسے قصبے ہوتے ہیں جو معلوم اور نامعلوم کے درمیان وسیلہ بنتے ہیں۔ مزاح کا ڈیڑھ، سترس اسطور کو اسطوریت کے دم سے نکال کر پوچھ گچھوں اور چاہی گہلوں کے درمیان ایک طرزِ نگارش کے حیثیت دینے کی بات کرتا ہے۔ ہمیں قطعی علم نہیں کہ سوچو کس کا کام ہے۔ اگر ہمارے پاس اس سوال کا جواب نہیں، تو مطمئن کرنے کے لیے کچھ بھاڑ کیا چا سکتا ہے۔ اسطور دراصل معنی اور معنی کا مرکب تھا (انسان کے تخلیق یہ ہوئے خداؤں نے چہرہ، پیر، اسطور کی اور خدائی مخلوقات و انسان کی خصوصیات کے ساتھ متشکل کیا) جو تفصیل سے معنی کو کسی قسم کی وضاحت فرماتا تھا۔ انسان اور اس کے ساتھ مخلوقات قصبے کی طاقت تھی مگر جیس کہ Nakos Kazantzakis نے ایک بار لکھا تھا 'طرح جسم کا نہیں، ان طاقتوں کا فراموش ہے جس نے جسم کو فطرت کیا ہے'۔

اب قدرتی قدرت انگیزوں کے بارے میں بہت سی ثابت شدہ دواؤں تھیں بھی ہیں اور دواؤں کے سلسلے میں دیکھنے کے کچھ جوابات سے نئے سوالات بھی جنم لے رہے ہیں۔ اس وجہ سے اسطور کو ہیئت و انداز کو کبھی بالکل نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، اگرچہ ہم اس کو ایک پورا مسند سمجھنے پر آمادگی ہیں۔ اگر یہ (یعنی اسطور) بتدریج گھٹ کر کچھ معاشروں میں بچھ کر ہولانے والی کہانی کے ذریعے پوچھ جانے تو بھی، جنگوں اور جنگ ناموں کے ذریعے بین الاقوامی کال ثقافت (megaculture) سے محفوظ کیے ہوئے علاقوں میں بھی، فرد واحد و فرد وجود کے درمیان مرتبے کا نظام جاری رکھنے کے لیے فن کو استعمال کیا جائے گا۔

اور یہ، Balman کے Icarus اثر اور اس جیسے کرداروں کی طرح، چھانا ہو خود سے اور پس آتا ہے مگر زندگی کے تقاضوں کی طاقت سے تپنے کے لیے اگلا کیمپوں کے سمندر میں بھی نہیں گرتا۔ حالانکہ یہ نئے سرے پر (قارئین کے) ذہنوں کو مزید روشن کرنے اور یہی جو بات کے ذریعے مختلف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگوں کو بھیجی کے ذریعے مزید وسیع کرتے ہیں جو اپنے وجود کے بارے میں جو بات کے شعرت کا بھی سامنا کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے (شعبہ یہ ایک مثبت حم ہو کر اب انسان چورے کرنا رہی کو تباہ کرنے کے ذرائع کا حامل ہے، اور اس طرح پیدا ہونے والا خوف خود کی خود بنانا ہے، اور اپنے وجود کے تسلسل کے خوف ایک زعمی ہے ان کو اس قسم کی مزاحیہ کتب اور اس عیاری فلموں کے ساتھ فراموشی (ہے) مگر وجود کی طاقتیں قائم ہیں۔ محبوب عام عصری اسطور سڑوں کے علاوہ، آٹن کا اور ایک قدرتی ناول کی طرح آٹن بھی ان طاقتوں سے اسی طرح پیچھا آتا ہے۔

اسیوں نے کس طرح اس پیش کش کی طرف توجہ دینی کی ہے اور کیا ادبی دائرہ دہوں کے بارے میں ان کے تجربات، شاید ہمیشہ سے نیا اور جاری ہیں یا رہے ہیں۔ ہر لکھنے والا قابل تصور حقیقت اور اس سے بھی آگے یعنی ناقابل تصور حقیقت، کے سلسلے میں تمام مشاہدوں کی بنیاد رکھتا ہے، اس سے قطع نظر کہ نتیجے میں کون سے تصورات چسپاں ہوتے ہیں، اور اس سے بھی قطع نظر کہ ادبی تاریخ کو کسی کی خاطر لکھنے والوں کو کس وجہ سے کی طور پر سنوں (recollections) میں ترتیب سے نقلی کر کے سرور ٹانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ حقیقت بہت سے دیکھے و ان دیکھے عناصر سے بنی جاتی ہے، ظاہری جاتی ہے، اور غیبی رشتہ جو خود کو جاتی ہے تاکہ ناسا کو کچھ وقت سلپنے کا طے اس کے باوجود جس کو جدیدیت اور مابعد جدیدیت، سائنس و ادبی سائنس کے ضمن میں تعمیل نفسی کا پورا انداز رکھتے ہیں اس میں، تمام ادبی مطالعے، ایک ہی جہاں کی سمت نشانہ کیے ہوتے ہیں، تاکہ لکھنے والوں کو یکساںیت و یک رنگی پر مجبور کیا جائے (اگرچہ اس میں پوشیدہ اصول نہیں ہیں تو پھر ایک رنگی کیا ہے) تاکہ اصویات کے ذریعے وجود کی طاقتوں پر لکھنے والے کی گرفت کو مضبوط بنایا جائے۔ مگر حیات تو خود اتنا قید ہوتی ہے۔ وجود، شعور کے مختلف درجات اور حالات کے باعث، متواتر کھینچاؤں میں طریت یا اس طرح، نکلا جاتا ہے۔ وجود کی قوتیں اس صورت میں ہوں، اہم قوتیں خاص مقصد، اصل مقصد یا کمال اتنا قید مقصد نہیں ہوتا۔ اس تک یقیناً کسی جمہوری اصویات کے ذریعے نہیں پہنچی

چا سکا، خواہ روشنی کتنی ہی پسندیدہ یا دلچسپ کیوں نہ ہو۔ کسی متن کو منہدم کرنا ایک طرہ کا تضاد ہے، اس لیے کہ نگاروں میں منہدم کرنے کا مطلب ہونا ہے نگاروں سے دوبارہ ایک تفسیر، جیسے کہ وہ اس پر کتنی دل فریبی سے، بالکل ایک نئی روشنی اور معنویاتی چیز پھانک رہا ہے، اور پچھے قیسے Sarrasine میں اس کا اقرار کرنا جب لہذا اپنی دانش و رہی ایک قسم کے داستان گو بن جاتے ہیں۔

مثلاً، جو کہ اور کہ تک رسائی کا کوئی اور راستہ نہیں سوائے فن کے۔ لکھنے والے خود تجربہ نہیں کرتے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ تجربہ کرنا بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کسی گھٹاں کے اوپر تکی ہوئی رسی پر چپے ہوئے پیچھے دیکھنا۔ یہ کہنے کا مطلب لکھنے کے عمل کو پیچیدہ کرنا نہیں، یہ بتانا ہے کہ لکھنے والے کو چاہیے کہ وہ اس سخت المردنی ارتکاز کا تصور کرے، ہر لکھنے والے کے اندر جس کا ہونا ضروری ہوتا ہے، ثقافتی و مذہبی پارے اور اس دباؤ و لفظ کے حوالے کر دے، اسی طرح جیسے کسی غلطے کو جھڑپ کرنے والا، محو شغل ہونے ہی اس غلطے پہ اپنا جھنڈا کھڑ دیتا ہے۔ مثال کے طور پر جنس کے ہوا باز کو تھا رن میں المردنی Tonally "impulse of light" اور اس کی "terrible beauty" جو کوا کی انقلاب کی پیادہ ہیں، دونوں مختلف ہوتے ہوئے بھی اکٹھے ہیں، کی نیم نور شعری فرہاد یہ تخلیق "Only Connect" اور جنس کی منتخب تخلیق "science, cunning and exile" اور شی و دھیری ادب سیریس میں گارشیا مارکیز کی بھول بھیاں جس میں Simon Bolivar کا کردار صرف ناقابل تغیر حاکمیت یعنی موت کی طرف لے جاتا ہے۔ لکھنے والوں کے لامتناہی مختلف طریقے ہیں جن کے ذریعے وہ لفظ کے اندر سے گزر جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کسی بھی حیثیت کا کوئی بھی لکھنے والا وجود ہی ایک خوں خوار نگر خوب صورت بھول بھیاں میں، اپنے جنس اور اپنا ایک ساتھ آجائے دائمی مشعل کی معرفت، ایک روشنی فراہم کرنے والی جیسی نرسق جیسے کام کرتا ہے۔

Anthony Burgess نے 'The Aesthetic Exploration of the World' کے عنوان سے ایک بار وہب کا خدمت پیش کیا تھا۔ اس کی کہیں کوئی کہ نہ بہت دور کی تلاش کے لیے راجہ برہم کی مقام سے شروع ہوتی ہے جس کا نگار صرف بحالیاتی طریقوں ہی سے ہو سکتا ہے۔

لفظ کی حد کے بعد لکھنے والے، لکھنے والا ایسے جاتا ہے، مجھے علم نہیں کہ میری ابتدا بھی کسی دلچسپی کا باعث ہوگی یا اس میں کوئی تبدیلییں کران کے درمیان بہت سے تجزیاتی مشترک ہیں، تیرہویں منعقد ہونے کی محضوں میں جن کا تذکرہ ہوتا ہے۔ جہاں تک میرا اپنا سوال ہے، میں نے کہا ہے کہ میں کچھ حقیقت پر مبنی نہیں لکھتی یا کہتی ہوں جو اتنا سچا ہوگا جتنا کہ میرے افسانے۔ زندگی کا آرام کام نہیں ہوتا، اصل کام ہونا ہے دست بردار ہو کر الگ گھرے ہونے کی مثال ہونے سے پیدا ہونے والے تناؤ و سہتا، جو دونوں کی کاپی لکھ کر دیتا ہے۔ میں اب اپنے بارے میں بھی تجویز دیتا ہوں کہ اجازت چاہوں گی۔ میں وہ ہوں جسے میرے خیال میں ادیب کو جانا چاہیے۔ میں نے ٹھکانا ادیب بننے کا فیصلہ نہیں کیا۔ شروع میں مجھے تو قیاس نہیں تھی کہ ادیب سے میرا گزارہ ہوتے گا۔ میں بچپن میں اپنے محسوسات کے ذریعے زندگی کو گرفت میں لینے کے شوق میں

تکلیف تھی، یعنی چیزوں کی قیمت، فوشیو اور احساس کے ذریعے اور جدید اپنے جذبہ کی تسکین کے لیے نکتے کی جو مجھے بھائے رکھتے تھے یا غصہ دیتے تھے، اس مدنی کے لیے، سون اور سرت کے لیے جو لکھے الفاظ کے سانچے میں ڈھلتی تھی۔ میں آپ کی خدمت میں کھانسی کی ایک نکتہ ہی حکایت پیش کرنا چاہتی ہوں جو کچھ یوں ہے: Seize him, Hold him, Nevermore۔ پسے ۵ توڑنے کے Schipperke (ٹیمپسلی) کہتے ہیں، جسے چھوٹے کر، گرا کیے ہوں تو ان کی طرف کوئی متوجہ بھی نہ ہوگا۔ مگر ایک Nevermore بھی ہے۔ Nevermore ایک دوغلا (cross breed) کچھ شیم (انمارک) کا Great Dane مٹی ہے جو دیکھنے میں اتنا ڈراما ہے کہ شہر صدیوں کی جھاڑیوں کی پٹائی بھی یہ جانور نہ پیدا کر سکے۔ Nevermore ایک بنجارہ ہے۔ جنوبی افریقا میں سونے کی کان کنی کی ایک چھوٹی سی بستی ہے جہاں میری پرورش ہو رہی تھی اور میں، یعنی Nevermore the mongrel تھی (حالانکہ مشکل سے ہی مجھے Great Dane کہا جاسکتا تھا) جس میں اس شہر کے لوگوں کی خصوصیات مشکل سے ہی پائی جاسکتی۔ میں بنجارہ تھی، پائے استعمال شدہ اعلیٰ کی جو توڑ سے نکلتی رہتی، جو کچھ پرستی اس سے کچھ نہ ہلائی ہوشیار سے کچھ نکلتی رہتی۔ میرا سکول مقامی کتب خانہ تھا۔ پراڈسٹ، یہ متونیسٹی، جیوف، بہت ساری میں سے دو جہت مشہور نام ہیں جن کے مشکل میرا ادیب کی حیثیت سے وجود تھا، مگر میرے بازی پرانیسہ تھے۔ اپنی زندگی کے اس دور میں، جی ہاں، اس کلمے کا ثبوت تھا کہ کتابیں دوسرے کتابوں کی سے بنتی ہیں۔ مگر میں نیا دور تک ایسی نہیں رہی، نہ مجھے یقین ہے کہ میرے تک کوئی محسوس اسکاٹی ادیب رہ سکتا ہے۔

بوخت میں جنسی خواہشیں پہلی بار ایک کو دوسرے کی طرف کھینچتی ہیں۔ اس کے بعد، زیادہ تر بچوں میں، تصور کی حد حیات دن میں خوابوں اور محبت کے خواب دیکھنے کے اشارے میں کم ہو جاتی ہے۔ مگر ان لوگوں میں، صرف جن کو آگے چل کر کسی قسم کا فن کار بننا ہوتا ہے، پیدائش کے بعد زندگی کا پہلا بحران ہوتا اور منافی کام کرنا ہے۔ نئے اور متناہم جذبات سے قوت قبیلہ کی رہائی ہوتی ہے۔ نئی حیات پیدا ہو جاتی ہے۔ لکھنے والا دوسروں کی زندگی میں جھانکنے لگتا ہے۔ گویا الگ رہ کر الجھ جانے کا دوسرا درجہ ہو گیا ہے۔

میں محسوس ہے تیری میں، خود سے وجود کے موضوع پر باتیں کرنے لگی تھی کہ اپنے پیسے لسانوں کی طرح، کیا ایک ہی وار میں کام تمام کر دیتے کی خدمت میں قتل کا بچکانہ نظریہ نہیں جھٹکتا، جیسے ہی کے ہاتھوں چاکل ایک فائدہ کی چیز بھاڑے۔ اور کیا اس میں نسلی امتیاز کے ابتدائی شعور کی شہر نہ غم زدگی نہیں تھی جب سکول جانے کے بعد ان میں دکان داروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھتی تھی کہ شہر کی پورب کے تاریک وطن، انگریزوں کی لال کے مشید غام ہونے، اور نسلی تیز کے لیے بتائے گئے پیمانے کے مطابق خود بھی نچکے درجے پر رکھے جانے کے باوجود وہ بھی سیاہ غام لوگوں کو، بڑی بے دردی سے، انسان سے کم کہتے کی حقوق سمجھتے تھے، حالانکہ وہ سیاہ غام افراد ان دکان داروں کے بار کے کاہت ہوتے تھے۔ بہت ہی بعد مجھے احساس ہوا تھا کہ اگر مگر اسی وجہ کی ایک سیاہ غام بچی ہوتی تو شاید میں ادیب بھی نہ بن سکتی،

اس لیے کہ ان کتب خانے کے دو جنموں نے میرے لیے یہ ممکن بنایا تھا، یہ تمام لڑکیوں کے لیے وائس ہونے تھے۔ اس لیے اور بھی کہ میری باقاعدہ اسکول کی تعلیم میں سرسری ہی تھی۔

آپ جب خود کسی دوسرے فرد سے مخاطب کرتے ہیں تو اگلے درجے کی طرف آپ کی نشوونما شروع ہوتی ہے، اسی طرح، جیسے آپ اپنی تخلیقات کی شاعت کریں گے تو لوگ آپ کو پڑھیں گے کہ آپ نے کیا لکھا ہے۔ یہ تمام مضمون اور فطری مشروقات اشاعت کے بارے میں، اور یہ ابھی تک وہ انہیں ہے۔ آج بھی میرے نوویک اس کے معنی میں ہیں، اس آگاہی کے وجود کے نیرور لوگ اس پر یقین نہیں کرتے کہ کچھ وقت کسی ادیب کے ذہن میں کوئی مخصوص مضمون نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ کسی کے لیے بھی ہو، اس وہی شائع کروں گی جو میں نے لکھا ہے۔ اور میری دوسری آگاہی ہے، شاعری اور لاشعوری ترقیب جو لکھنے والے کو ان لوگوں پر نظر رکھنے پر رغبتی ہے جن کے ماضی ہونے کا مکان ہوگا، جو منظور کریں گے کہ صفحے پر لکھا ہے Eurydice کی جیسی زبان ہوتی ہے نظر کی ترقیب، جو ادیب کی بہادر شہرہ عملیتوں کی بدولت ہے۔

اس کا درد، اشیائے کے گھر میں بیٹھ کر سوزنا، کہ یہ تخلیق کی ایک اور جہتی ہوتی ہے۔ پورٹریٹ نے ایک بار کہا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کی خاطر اور وقت گزاری کے لیے لکھتا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک پویشن کرنے والے سوال "تو پھر آپ کس کے لیے لکھتے ہیں؟" کا جواب تھا۔ میں جواب دہ نہ سزاؤں تھا۔ سزاؤں نے دنیا میں ایک دگر بھری، انسانی کے دل نچل نماز مجھے کو حل کرنے کی کوشش میں کہا تھا کہ "یک" یا وقت بھی آتا ہے جب لکھنے والے کو ہاتھ دیکھ پتے چاہیں اور اس کے ہر نفس میں سما جائے۔" جب کہ وہ خوب جانتا تھا کہ صب سے بہتر تک رسائی کے لیے لکھتے رہنا چاہیے۔ سزاؤں اور پورٹریٹ دونوں، ادیب کو ایک سماجی مفکر کا رتبہ دینے سے انکاری تھی، جہاں پر ہوتے ہوئے بھی عجیب طرح چلتے تھے کہ وہ جنم ہونے کے باعث ادیب کا ایک مخصوص اور ناقابل تبدیل سماجی کردار ہے جن کو انی مظاہروں پر قافی یا دستوں کے درمیان، یہ عوامی مظاہروں کے درمیان، کہ وہ ان کو ہمیں سمجھاتا ہے۔ پورٹریٹ نے دوستوں کے لیے نہیں لکھتا تھا، کہ اس نے اپنی تخلیقات شائع کیں اور ہم صب اس کے کام کی لغت سے مستفید ہوئے ہیں۔ سزاؤں نے لکھنا بند نہیں کیا حالانکہ 1986 میں وہ ہدایت خود مظاہروں میں ٹریک رہا تھا۔

پھر بھی یہ سوال کہ "میں کس کے لیے لکھتے ہیں؟" انہیں کو ایسی طرح پویشن کرتا ہے جیسے ہر شاعت کی دُم میں ایک ٹیٹ کا ڈبا ہوا ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ تعریف یا تحقیر کے حق میں ایک بے مقصد شروع ہوتا ہوتا ہے۔ اس سیاق و سباق میں، کامیونے اس سوال کو بوجہ طریقے سے ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ ادیب کے مقابلے میں وہ ان لوگوں کو بے پسند کرتا ہے جو طرف داری کرتے ہیں۔ "لیو تو آپ کسی انسان کے کھل کا ساتھ دیتے ہیں یا بالکل اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ اور اگر انسان کو کوئی بالمشافہ چاہیے، اور اگر اس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے جو کچھ ہونا چاہیے، وہ کیا چاہتا ہے تو اس کوئی اس حسن کی بھی ضرورت پڑتی

ہے جو اس کے دل و دماغ کے لیے بڑی ہوتا ہے۔" لہذا کامیو "کام میں جمش اور وحدت" طلب کرتا ہے۔ اور انسانیت کی بنیاد پر تشریح کرتے ہوئے، ریکٹر لکھتا ہے کہ "کسی انقلاب کی خدمت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ لکھنے والا جتنا ممکن ہو اچھا لکھے۔"

میرے خیال میں یہ ادبیات ہم سب لکھنے والوں کے لیے عقیدے کے بیانات کے نمائش ہو سکتے ہیں۔ یہ ان تنازعات کو حل نہیں کرتے جو ہم عصر ایسوں کے سامنے آچکے ہیں "دستے رہیں گے مگر یہ سب غلطی کے ذریعے ہماری سیاق و سباق میں انسان ہونے اور ادیب بننے کی حیثیت کی بنیاد پر مددگار ہے۔ اس مقام پر موجود ہونا اور ایک خاص وقت میں۔ یہ وہ وجود کی کیفیت ہے جو شخصوں میں تعمیرات کے ساتھ ادب میں برآں ہوتی ہے۔ ایک دفعہ Czesław Miłosz نے ایک ڈیہائی لکھی تھی "اسکی شاعری اس کام کی جو قوموں و ممالک کے کام نہیں آتی" اور بدستور نے اپنے ایک دور میں لکھا تھا "درختوں کے بارے میں باتیں کرنا ایک جرم سے کم نہیں۔" ہم میں سے بہت سے لوگ زندگی کے، لکھنے کے، زبان، اسکی جھکیں پر اس قسم کے بے راہ خیالات کا اعتراف کرتے رہتے ہیں، اور سمارٹ کا پیش کردہ اسکی دنیا میں کوئی معنی نہیں رکھتا جہاں ادیبوں کے کام کا اعتبار ہوا ان کو نہ لکھتے ہر جگہ کیا جاتا ہو، حتیٰ کہ خیالات کو کاغذ پر لکھ کر قید خانوں سے باہر بھیجے پر بھی خطرات ہوتے ہوں۔ ان لوگوں کے وجود کی کیفیت میں، جن کی انفرادی انفرادیت (ontology) پر ہم خوب غور تحقیق کرتے رہتے ہیں، ہمارے سامنے تجربات ہیں۔ Nikos Kazantzaki کے الفاظ میں، "ہمیں اپنا فیصلہ کرنا چاہیے جو ہمارے دور کے پُر خف ٹرکیزم ہوگا۔"

ہم میں سے بہتوں نے دیکھا ہے کہ ہمارے اپنے ملک میں ہماری اپنی کتابیں برسوں قاری کو ہستی رہیں، مکتوب کی کتابیں اور ہم لکھتے رہے۔ بہت سے لکھنے والے قید کیے گئے۔ صرف یہ عظیم افریقا میں Soyinka, Ngugi wa Thiong'o, Jack Mapanye اپنے اپنے ملکوں میں، اور ہمارے ملک جنوبی افریقہ میں Jeremy Cronin, Mongane Wally Serote, Breyten Breytenbach, Dennis Brutus, Jaki Seroke وغیرہ نے لکھنے کے سلسلے میں جی ہمت کے اظہار کے باعث قید خانوں میں اور شاعر ہونے کی حیثیت میں جیلوں سے باتیں کرنے کا اپنا حق استعمال کیا ہے۔ نامک مان سے چلنے چھپنے کے، جنہیں مختلف ممالک میں یہی تنازعات اور جبر کی بنا پر لکھنے والوں کو راندہ کیا گیا تھا، ملک ہر ملک کی تعمیر و ترقی پر راستہ کرتی ہیں، جس کی وجہ سے کئی تو ادب میں باقی بھی نہ رہ سکے۔ مجھے جنوبی افریقہ کے Can Themba, Alex la Guma, Naz Nakasa, Todd Matshikiza کے نام یاد رہے ہیں۔ اور کچھ لکھنے والوں کو تو نصف صدی کے عرصے میں Joseph Roth سے میلان کنڈر پر تک اپنی تخلیقات چھپنے ان زبانوں میں شائع کرتی پڑیں جو ان کی اپنی نہیں، غیر ملکی تھیں۔

پھر 1988 میں ہمارے دور کا خوف آمیز ٹرکیزم بے نظیر دہائی کے باعث تیز ہو گیا جس کے بارے میں لکھنے والوں کو سمجھنا پڑا۔ جدید دور کی دانش خدائی کے وسیع عرصے میں، لکھنے والوں کو حقارت آمیز

مذمت، قتل، حتیٰ کہ غیر سیاسی وجوہات کی بنا پر ملک بدر کی بھی جھینپی پڑی۔ فلک بھر کو "مارم دیو مرنی" کے سسے میں بے حیائی کے انعام میں عدالتوں میں کھینٹا گیا اور اسٹریٹ پرگ کو "Marrying" میں لکھ کر پورے لڑکیوں کی "میز کی جھڑپ" منوٹ کی تھی۔ منہ خفا نہ یہ رڈ وار سوم کے خوف یا نہ یہ وجہ مرن کی سی بہت سے مثالیں ملتی ہیں، بالکل ویسی ہی جیسے یہاں "مردوں کے دور میں خدائیں مثالیں۔ لیکن ایسے دور میں جب فرانس، سویڈن اور ہالینڈ میں "زانی" سمجھا رہا ہے ایسے اقوامت لگاتار بھی نہیں آیا تھا، ایسی حالت بھی انگریزوں میں ملتی تھی ہے جو اپنے غربت انگیز اختیارات ان سے حاصل کرتی ہے جو سماجی رسوم سے کسی نیا دور میں اور کسی وادی میں نظام سے بھی نیا دور خالق و رہا کرتے ہیں۔ ایک عالمی مذہب کے قیام کے لیے ایک لکھنے والے جوت کی سزا سنائی ہے۔

تین برس ہوئے کو آئے ہیں وہ جہاں بھی چھپا ہوا جہاں بھی جائے، سلطان رشیدی مسلمانوں کے بارہ روز زندہ ہے۔ اس کے لیے کوئی جائے بند نہیں۔ ہر صبح صبح یہ لکھنے والا لکھتے دیکھتا ہے اس کا یہ شریک ہوتی کہ دن بھر وہ زندہ رہے گی اس کے گالہ نہیں، اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا شریک کیا ہوا مسلمان بھی پڑ بھی ہوگا۔ سلطان رشیدی ایک تیر طبع لکھنے والا ہے اور The Satanic Verses نامی اس کے لکھنے کی پانچ اس میں اس کو ملتی ہے چھ لکھنے میں کسا جا رہا ہے، ایک انگریزی تجسس ہے ہمارے دور میں وجود کے نہایت کڑے تجربات کا، ماحول آبادی دنیا کی طرف لاتی ہوئی دو تہہ ہیں کے درمیان منفرد شخصیت کے تغیر و تبدل کا۔ تصورات کے انحطاط (refraction) کے ذریعے سب کچھ کو مزید زیرِ نقوش لایا گیا ہے، جنسی اور توہینِ محبت کی سماجی رسمیات کی قیوت کی فرد کے لیے لکھنا یا مذہبی عقائد کے سختی کی جو مختلف عقائد کے نظام کے داخلی پن کے باعث لگ الگ کردہ گئے تھے، ایک مختلف مذہب اور مذہبی، سابق و سابق میں طرزِ حیات کو۔ اس کا نام ایک نئی دیوہ لایا ہے۔ پھر بھی، اگرچہ اس نے یہ سب کچھ یورپ میں ماحول نوآبادیاتی آگاہی کے لیے کیا تھا، وہی کچھ جو گھوڑوں نے The Tin Drum اور Dog years کے ذریعے ماسیوں کے بعد کے شعور کے بارے میں کہا ہے۔ اس نے شہید وہی کچھ کہنے کی کوشش کی ہے، اس کی کاسیائی کی وجہ بندی سے قطعاً غم، جو صحت نے ہماری وجودی بے چینی کے لیے Wailing for Godot میں کیا تھا، اگر وہ (سلطان رشیدی)، ایک سٹیلی لکھنے والا جتنا کہ بھی، اس کی موجودہ حالت، ذوقی حالت، بارے سے قطعاً نظر نہ لکھنے والے سماج کے لیے نہایت تشویش کی بات ہے کہ کیا مضمرات، اور کیا خطرات الفاظ کے اس بارے میں اور پیش ہیں۔ یہ افراد کے لیے باعث تشویش ہوا چاہیے اور سب سے زیادہ تو حکومتوں اور دنیا بھر کے انسانی حقوق کے اداروں کے لیے۔ امریکوں کے نظامِ مغلوب ہونے کے ساتھ، ایک عظیم اور محترم مذہب کے کھام پھانے میں غلط فہمی نہ حکم کو جو بین الاقوامی دہشت گردی جیسی حالت کا اظہار ہے جمہوری حکومتوں اور اقوام متحدہ کے ذریعے انسانیت کے حلال جرم قرار دیا جا چکا ہے۔

میں سب سے، حد و ہمتی سے اس صدمہ کے دہش کو لاحق خوف، مابعد انفرادی جمعیوں کے مضمرات

کی طرف واپس آتی ہوں، جو اس آخری عشرے میں ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ چار حکومتی نظاموں میں، وہ کہیں کے بھی ہوں، خود وہ اس علاقے میں ہوں جو سوویت بلاک کہلاتا تھا، یا ملٹی امریکا، افریقا، چین، نیو ورتھ، زیرِ کتاب ادیب، مقرر اپنی انہی ریت اور ساق کی آزادی کے دشمنوں کی جانے والی سرگرمیوں سے محروم رکھے گئے ہیں۔ پچھ اپنی عمریں کے وسیع، خواہ وہ کتنی ہی رہی ہوں، اپنے ساتھی نظام کی خدمت کی پاداش میں چار نہ حکومتوں کے محبوب رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک ہر رقی یہ جیاتی کوشش تخریبی ہو جاتی ہے جب ہمارے وقت کے شرمناک رازدہرائی میں کاشی سے جاتے ہیں۔ جب ریاست کے خلاف فن کار کی باغیہ راست بازی زندگی کے طراف کے، جس میں رقی اس جاتی ہے، تب ہمارے میں موجود ہڈی وریگا کے زیر اثر، ادیب کے موضوعات اور رازدہرائی، ناگزیر ہو جاتی ہے، کسی طرح، جیسے ایک ہائی گیر کی زندگی مسترد کی طاقت ملے رہتی ہے۔

میرے سامنے ایک امر محال ہے، اپنی راست بازی کو بچ کر رکھنے کی کوشش میں ادیب کو کبھی کبھی بدست کی طرف سے غداری کے انعام، اور آزادی کی حالتوں کی طرف سے ادبی تقلید میں کمی کی شکایت سے نہ چار ہونا پڑتا ہے۔ جب ہڈی کو اسی کی جانب کے پڑے میں رہتا تو اچھا ہے تو وہ ہمیشہ اپنے جوتوں کے تیشل آگے رہتی ہے۔ اگر ایک لکھنے والے اور انصاف کے جنگجو کی حیثیت میں، مگر کے دیے منوالے کے مطابق گھر چلی تشریف کریں تو لکھنے والے کو دشمن اور محبوب جنگجو ساتھیوں دونوں کی تلاش کا حق لیا جائے، اس لیے کہ سچائی کی صرف ایک کوشش وجود کے باقی رہنے کا جواز ہو جاتی ہے، سچائی کی صرف ایک کوشش انصاف کی طرف بڑھاتی ہے، جس ایک قدامت پسندی کوشش پیش کے، پیدائش کے لیے سرنگوں حیران سے ڈرا آگے لے جاتی ہے۔

ہم ادیب کے متوالے

زندگی کی داری سے، سرِ کمال گھر گوید

ماسنے کے چروں کو دیکھتی نگاہوں کو

صنفِ منہ پڑھتے ہیں، جھانک جھانک پڑھتے ہیں

اور یہ ہر لمحے

بار بار جی کر ہی، زندگی سے سیکھ سے

یہ مصرعے ہمارے ملک میں انصاف اور امن کے لیے لڑنے والے جنوبی افریقا کے شاعر Mongane Serote کے ہیں۔

لکھنے والا انسانیت کی خدمت صرف اس وقت کر سکتا ہے جب وہ اپنے کو اپنی وفاداریوں کے مقابل میں استعمال کرنا یا کرتی ہے، بدست کے وجود پر یقین کرنا ہے، اسی طرح جیسے اس کو بھلا جانا ہے، تاکہ وہ اپنی سچائی میں سچائی لکھنا اس کے پیشوں کو اپنے فن میں، یہاں یا دبا، بدست کے خور پر استہوار کرنے کے

لیے منجانب کر رہے، بدست پر نچر رہا کہ وہ کردہ ضرورت کے وقت سچائی کے بکھرے ہوئے ٹکڑے فراہم کر سکی ہے، جہاں کے الفاظ کا آخری لفظ ہوتے ہیں، جو وہ ملک بیرون کرنے کی یا سمجھنے کی انوں ذیل پیش سے بھی تبدیل نہیں ہوتے، نہ لفظ کوئی سے تبدیل ہوتے ہیں، نہ یہ یہ نہایت سے، نہ لفظ کوئی سے، نہ یہ کہنے کے لیے سمجھ کر نہ سے، جہاں سے غلبے سے جہاں کی شام سے بد دعاؤں اور قسیدہ خرابی سے۔



اوکٹاویو پارٹر

امتراف کمال۔ وسیع آفاق رکھے وہ اور پر جوش و اثراتی تحریروں کے لیے جن کی شاعرت
ہیں بڑی قربانت و دشمنان دوست خدائی پلہ کی ہے۔

”میں کو دیکھنا اس کو تیرا حرف پہ طے کے مترادف ہے۔“

پارٹر ایک نظم A Draft of Shadows کا یہ مصرعہ ہی اس کے فنی تخلیق کی کلید ہے۔ اس کی
شاعری بہت حد تک ایسی تخلیق ہے جو الفاظ کے مودے اور لفظ کے بغیر بھی کہی جاسکتی ہے۔ پارٹر کے تحت
الشعور کے الفاظ کے ہوئے خیالات میں استعمال ہونے والے الفاظ ہمہ وقت بدلتے ہوئے اور ہمہ دورہ معنویت
کے حامل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہمارے لفظی اور واکاٹ بھی اکثر گھس چکے ہیں و حرفت شاعری کی قوت ہر اوقات
الفاظ کو قابل حصول معنی دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پارٹر جتنا ہے۔

نظم کا کوفی بھی لفظ

ہم دا نہیں کہتے

نظم لکھتی ہے خود

پارٹر جی 1976 کی ایک نظم Return 1969 میں ڈکن جیمس سن سے چٹا مولف بیان کرتے

ہوئے کہتا ہے

مرے دیکھنے اور تکلم کے حج
تکلم کے اور فاشی کے میان
مری فاشی اور غلوں کے ہیں
مرے شباب کے ورثہ اموش لمبوں کے حج
ہاں ہے نظم

پانے نہایت لطیف و مازنی شاعری بھی تخلیق کی ہے عورت کے بارے میں اپنی ایک نظم میں لکھتا ہے
عورت!

اک چشمہ شب کی مانند
جس کی خاموشی رانی کا رقص رملوں میں

اوکناویو بازار 1914 میں میکسیکو میں پیدا ہوا اور 1998 میں انتقال کیا۔ اس کی ماں ہسپانوی تھی جب کہ باپ کی طرف سے اس کو ہسپانوی اور ہندوستانی خون کی آمیزش ملی تھی۔ بازار کا تانا ایک مشہور نہایت آزاد خیال دانش ور تھا۔ وہ ہسپانوی مذہب کے ان پیسے مادی نگاروں میں سے تھا جنہوں نے اپنے مادی میں ہندوستان وراثت کے ماحول کو شعوری طور پر برتنے کی ابتدا کی تھی۔ بازار کو گچھن کی سے اپنے خاد کے پڑے کتب خانے سے استفادہ کرنے کا موقع ملا تھا جس نے اس کے دانشورانہ ذہن کی گہرائی کی۔ بازار کی طرح بازار کا باپ بھی نہایت متحرک سیاسی مہم جو تھا۔

پانے نے وائس عمری کی سے کھانا شروع کر دیا تھا۔ 1937 میں ہسپانوی فسطائیت کے خلاف ہڑتال ہونے والے اجتماع میں شرکت کے لیے وہ اچلی گیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد بازار نے دوسرے دیوں کے ساتھ مل کر ایک جدیدے Taller کو بنایا جہاں جس کے ذریعے میکسیکو میں ایسے ادیبوں کی ہمدانی جو بالکل نئے طریقہ احساس سے سوچتے ہوئے دیکھنے کی کوشش کرتے۔

پانے نے 1943 میں Guggenheim Fellowship کے ذریعے پر امریکا کا سفر کیا جہاں وہ دیر طوئی امریکی جدت پسند شاعری کی تحریک میں شامل ہو گیا۔ دو سال بعد وہ میکسیکو کے ستانی ٹیسے میں شامل ہو گیا اور 1962 میں ہندوستان میں سفارت کے فرائض ادا کرنے پر مامور ہوا۔ بازار نے احتجاج کے طور پر اس منصب سے اس وقت استعفیٰ دے دیا جب ولیم کیلیوں کے درمیان میکسیکو کی حکومت نے غالب عملوں کی احتجاجی تحریک کو خوں ریزی سے دبا دیا۔ ہندوستان میں اس کے قیام کے دوران کے تجربات کے اثرات بھی بازار کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ بازار کی شاعری اور اس کے دلی مضامین میں شکست کے ساتھ ساتھ ایسے تخلیق کی زرخیزی بھی نظر آتی ہے جس کا خیر قدیم ہندی، ہسپانوی فائین اور مغربی جدیدیت کے معاشروں کو شلٹ سے غائب ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شاعری جدید زمانے کا خیر مذہب ہے۔ وراثی سے شاعر کے خون کی عورت کی جتنی ہے۔

پانڈی شاعری کا پھر مجموعہ اس وقت شائع ہوا جب اس کی عمر میں سال بھی نہ تھی۔ آخری وقت تک وہ شاعری اور تنقید کے میدان میں متحرک رہا۔ پانڈی کو بارہویوں کی ویرانی نے اعزاز کی ٹاکریٹ عطا کی۔ اس کے علاوہ امریکا سمیت کئی ملک نے اس کو انعامات اور اعزازات سے نوازا ہے۔ پانڈی کے چوتھوں کے قریب شاعری کے ہر مضامین و مقالات کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

ضیافت سے خطاب

جہالت ماب دو دہان شاہی، ثو تین و حضرات!

میں، اختصار کی کوشش کروں گا، عمر چوں کہ وقت چک در رہتا ہے اس لیے احتمال ہے کہ آپ حضرات کو میرے ایک سو ساٹھ طویل مضمونوں کی جمع خرائیج برداشت آسانی ہوگی۔

ہم نہ صرف ایک صدی کے آخری حصے سے مراد ہے ہیں بلکہ تاریخ کے ایک دور کی ابتدا کو دیکھ رہے ہیں۔ غریب پرستی کے انہدام سے مایاں ہو رہے ہو گئے؟ کیا یہ ایک کائناتی نچوٹ کا دور ہے؟ آزادی کے دور کا سویرا ہے یا قبائلی دت پرستی اور مذہبی جنون کی حیات نو ہے؟ جو عدم ہم آہنگی اور استبداد کی ٹھیکر کشافی ہے؟ کیا طاقت اور جمہوریت کی جنمیں نے آزادی اور افراد حاصل کر لی ہے کم خود غرض ہو چکا؟ کیا لگی اور بھرہ قوموں کے ساتھ خوش معاملگی کا مظاہرہ کریں گے؟ کیا جبرائذ کو نظریہ پرست تھڈ دکا پر چار کرنے والوں سے بدامنی کرنا سیکھ جائیں گے جنہوں نے ان کو امراد کی کاراست دیکھا ہے؟ اور کیا ایسے خطہ انیس، اوشنی امریکا اور خصوصاً اپنے وطن میکسیکو میں ہم بدلتی ہوئی جدیت حاصل کر سکیں گے، ایسی جدیت جو صرف ایک سیاسی جمہوریت اور معاشی خوش حالی اور سماجی انصاف ہی نہیں، ہم سے اور تاریخی دلائل سے قہریدہ تعلقات پرستو رہو۔

اس کا جواب ناممکن ہے۔ ماضی قریب نے ہم کو دکھایا ہے تاریخ کی کچھ بات کسی ایک کے پاس نہیں ہوتی۔ یہ صدی ایک ہیجیم سوالیہ کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود ہم عقین سے ایک دت کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے گرد ارضی پر حیات خطرے میں ہے۔ بغیر سوچے سمجھے رفاقی پرستوں کے ساتھ ساتھ فطرت کے استحصال کی جانب ہمارے پیش قدمی خود کشی کی ایک دلدل میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اب جس طرح کہ ہم کتھ، وکس اور انہم کے ذرات کے سر بستہ رانوں پر سے پردے اٹھا رہے ہیں اور سماجی (لیگول) حیاتیات اور حیاتیات کی ابتدا کے معنی سمجھا رہے ہیں، ہم نے فطرت کے قلب کو زخمی کر دیا ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ ہمارے سامنے سب سے بڑا سوال، ہوں تو بقا کا چید ہو گیا ہے، اس سے قطع نظر کہ سماج اور قومیں
کس قسم کے انتظامات کو پسند کرتی ہیں، نظریات کی حفاظت میں نوع انسان کی حفاظت سے۔ صدی کے انتظام
کے قریب نہیں پتا چلتا ہے کہ ہم پودوں اور حیوانات سے غصوں، ملامتوں، انہم اور ستاروں پر مشتعل ایک ہی
نظام (یہ نظاموں کے سہ سے) کا حصہ ہیں۔ جسے قدیم فلسفی کائنات کہتے تھے، ہم اسی "عظیم زنجیر وجود" کی
ایک کڑی ہیں۔

انسان کی سب سے پرانی عادت، وقت کی اہتمام سے جوہر راقی جا رہی ہے، کھلے جھگڑتے آسمان
کے ٹھنڈے کی طرف دیکھ کر اسی پر حیرت کا کھار رہی ہے۔ اس قسم کا غور اکثر کائنات سے حسرت یا نکت
کی پہچان پر منتج ہوتا ہے۔ کئی برس قبل مہربان میں ایک رات جب میں کھلے آسمان میں جھلکے جھلکتے
ستاروں پر غور کر رہا تھا، قریب ہی سے جھینگاری سی جیسی تیز آواز سنائی دی۔ رات کے وقت پندرہ آسمان اور
ایک چھوٹے سے کڑے کی موسیقی کی گونج میں عجیب قسم کی مماثلت تھی۔ اور پھر میں نے یہ منہ سے سہے

آسمانوں کے ٹکپ اندھیرے میں
کھینچی ہیں بڑا دنیا میں
کتنا بہت قدم ہے کہ جھینگ
اچھے ہے نہا اندھیروں سے
نہ تو مایوسی ہے نہ ہے آرام
بے مبرا دور ہے اثر ہے تو کیا

ستارے پھاڑ، بادلی، شجر، پرند، جھینگ، ہر ایک کی اپنی ایک دنیا ہے، ہر ایک خود ایک کائنات کی
ہے، اور اسی کے باوجود یہ تمام دنیا میں آپس میں ایک دوسرے سے باتیں کرتی ہیں۔ حیرت کو صرف اسی
صورت چا سکتے ہیں مگر ہم کائنات کے ساتھ اسی قسم کے احساس یا گنت کو متھے سرے سے زندہ کر سکتے۔ یہ
ناممکن نہیں، کہ گنت کا لفظ آزاد خیالی اور اشتراکیت و سائنس اور مذہب کی ہدایات کا حصہ ہے۔

میں اپنا جام اٹھاتا ہوں۔ گنت کی قدیم علامت کے طور پر۔ اور نوش کرتا ہوں وجہات آپ
کی صحت، سرتوں اور بلند اقبال کے لیے، اور سوئیڈن کے عظیم شریک النفس دانشوروں کے لیے۔

خطبہ

موجودگی تلاش میں

میں ان چند فنکاروں سے اپنے کام کی ابتدا کرتا ہوں جو بتائے انسانیت سے تمام نتائج ان کے لیے ہیں۔ آپ کا شکریہ۔ ہر نبی اور ہر بدن میں شکرانے کے لفظ کے لیے کئی تبادلات لکھے ہیں اور ان کے معنی بے شمار ہیں۔ یہ وسعت محیط ہے ہر انسان کی ہر روحانی اور جسمانی وجود پر، انسانوں کو خیر اور موت سے بچنے کے لیے انتہائی پریشانی، رشتہ رقی ہوئی، شہزادہ کی جسمانی زندگی پر، چھاڑیوں سے اچھل کر اچانک سر ہٹنے آجانے والی کسی سُر پر خوشگوار پر۔ لطف کے معنی ہوتے ہیں، مخلوق درخشاں، عبادت، عطا، بھدان۔ یہ ایک طرح کا نذر خطاب ہے، جو کہنے کا ایک دل نہیں ملتا، بلکہ روشناسی اور محض ایک ایسا عمل جو روحانی زندگی کا مظہر ہو۔ لطف ہے دامن عطا ہوتی ہے، ایک تحفہ ہوتا ہے، جو پسندیدہ شخص اس کو حاصل کرتا ہے، اس کے لیے مہتمم ہوتا ہے اور اگر وہ خود اس کی بنیاد نہیں تو اپنے تشکر کا اظہار کرتا ہے۔ اس لمحے میں ان بے مایہ الفاظ کے ذریعے میں کچھ کہتا ہوں اور میں امید کرتا ہوں کہ میرے جذبات ان کی بے مائیگی کی حلائی کہہ رہے ہیں۔ اگر میرا یہ غلط فہم ہے تو آپ اس کے بارے میں کچھ کر میرے احساس کا اندازہ کر سکتے، یعنی فخر اور اعتراف کا۔ اور آپ کے سامنے، اس مقام پر میری موجودگی پر، جو سوئڈن کی تعلیم اور دنیا کے ادب دونوں کا مرکز ہے، مجھ میں خوف، احترام اور حیرت کا ایک ناقابلِ تحریف مزیدہ بھی آپ صاف دیکھ سکتے ہیں۔

نہائیں ایسی وسیع حقیقتیں ہوتی ہیں جو ان ساری اور تاریخی حقیقتوں پر فوقی ہیں جنہیں ہم قوم کہتے ہیں۔ اس کا مظاہرہ دو یورپی نہائیں کرتی ہیں جو ہم دونوں امریکا میں پڑ گئے ہیں۔ انگلستان، ہسپانیہ پر بحالی اور فرانس کے ادب کے تقاضے میں، ہمارے ادب کی ایک خاص حیثیت اس بنیادی حقیقت سے متعین ہوتی ہے۔ یہ ادب ہر مذہبی حقیقتوں میں تخلیق ہوتے ہیں۔ نہائیں دراصل مقامی معنی میں پیدا ہوتی ہیں اور ایک مشترکہ تاریخ ان کو قائم کیا کرتی ہے۔ یورپی نبیوں کے پورے اپنی مقامی معنی اور اپنی روایت سے اکٹھا کرنا معلوم اور بے نام دنیا میں دلدارہ لگائے گئے۔ انہوں نے نئی زمینوں میں اپنی جڑیں پیوست کیں، اور امریکا کے معاشرے میں نشوونما کے ساتھ ان کی کاپی پیس ہو گئی۔ یہ وہی چارے ہونے کے ساتھ ساتھ ایک طرح سے مختلف چارے بھی ہیں۔ ہمارے ادب نے پچھلے شہزادوں کے چرلے ہوئے عقیدہ کو مہر بھگا کر نہیں نہیں کیا، انہوں نے ہمارے عمل میں حصہ لیا، بلکہ اس کو ہمیشہ کیا۔ بہت جلد ہی وہ محض سمندر پار کے پڑوسی نہیں رہے، اکثر وہ یورپ کی زبانوں کی نقلی رہے ہیں، پیش تر اوقات میں وہ ایک جواب

نہی گما نچرے ہیں۔

اس مسلسل ارتعاش کے باوجود ہمارا رابطہ کبھی نہیں ٹوٹا۔ میرے کلاسیک وہ ہیں جو میری نیاں سے تعلق رکھتے ہیں اور میں کسی ہسپانوی ادیب کی طرح خود Lope اور Quevedo کا وارث سمجھتا ہوں، اس کے باوجود کہ میں ہسپانوی نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہسپانوی امریکا کے نیاؤں کو ادیب اور اس کی طرح دیا ست دئے ستودہ امریکا، برازیل اور کیناڈا کے تمام ادیب، انگریزی، ہسپانی اور فرانسیسی دیالیا کے بارے میں بھی کٹھن گئے۔ امریکاؤں کے دیہیوں کی حیثیت کو نیاؤں واضح طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں ہمارے کے اس شلٹ کو مد نظر رکھنا چاہیے جو چلیا، چینی اور عرب ادیبوں نے ادیب کے مختلف ادیب سے قائم کیے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جو کثیر العنصر نیاؤں کو تہذیبوں سے برو راست قائم ہے۔ اس کے برعکس ہمارا مقام اس نیاؤں کے اندر ہی سوتا رہتا ہے۔ ہم یورپی ہوتے ہوئے بھی یورپی نہیں بنے تو پھر ہم ہیں نیاؤں ہمارے تعریف کریم تیار ہیں ایک مشکل کام ہے، مگر ہمارا کام ہمارے بارے میں خود بولتا ہے۔

ادیب کے میدان میں موجود صدی کی سب سے بڑی عورت امریکا کے ادیب کے ظہور سے عبارت رہی ہے۔ سب پہلے ظاہر ہونے والے ادیب انگریزی بولنے والوں کے جسے سے تھا اور پھر جیسویں صدی کے دوسرے نصف میں لاطینی امریکا کی دو بڑی شاخوں سے ہوا یعنی ہسپانوی امریکا اور برازیل سے۔ حالانکہ یہ بہت مختلف ہیں، ان تینوں ادیب کی ایک مشترکہ خاصیت ہے کہ تازہ جواہری ہونے سے نیاؤں نچر رہی ہے وہ ہے عالمی اور دیہی رجحانات کے مابین یوہیت اور امریکا کے درمیان۔ اس تازہ کی میراث کیا ہے؟ حجت غائب ہوئی ہے اور جو بچ رہا ہے وہ صرف کلام ہے۔ اس عمومی مشابہت کے علاوہ، تینوں ادیب کے درمیان کثیر الجہت اور غمیت اختلافات ہیں۔ ان میں سے ایک ادیب سے نیاؤں تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ سیاست ہائے متحدہ امریکا کے عالمی طاقت کی حیثیت میں جنم ہونے کے ساتھ ہیگو مرکیٹن ادیب کے ارتقا کا ہوا، جب کہ ہمارے ادیب کا ارتقا ہماری قوموں کی سیاسی و سماجی شکل و صورت اور بدقسمتی کے ساتھ ہوا۔ اس سے ایک در پھر سماجی اور تاریخی جبریت کی حد بندیوں ثابت ہوتی ہیں۔ مسطرتوں کا انحصار اور سماجی ہنگامے اکثر ادبی اور سماجی درخشاہی کے لحاظ کے ساتھ ساتھ ہوا کرتے ہیں۔ Lu-Po اور Tu Fu نے Tang شہی خاندان کا زوال دیکھا، Verázquez نے فلپ چہارم کے لیے معصوری کی، Seneca اور Lucan مہم عصر تھے اور Hero کے غلم کا شکار تھے۔ دوسرے اختلافات ادبی نوعیت کے ہیں اور ہر ادیب کے اپنے کردار سے نیاؤں مخصوص تخلیقات پر لاگو ہوتے ہیں۔ مگر کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادیب کی اپنی ایک سیرت ہوتی ہے؟ کیا سب ایک مشترکہ رخ و خال کے مالک ہوتے ہیں جو ان کو دوسرے ادیب سے ممتاز کرتے ہیں؟ مجھے اس میں شک ہے۔ ایک ادیب کسی قیاسی وغیرہ مرئی کردار سے متعلق نہیں ہوتا، یہ حناؤں اور میلاؤں کے رشتوں سے متعلق انفرادی کام کی ایک حکمت کے ماتحت ہوتا ہے۔

لاٹینی امریکی اور ایگو مرکیٹن ادیب کے درمیان بنیادی فرق بنیادی فلسفی میں پنجاں ہے۔

دنوں یورپ کی توسیع کی طرف شروع ہوئے۔ شمالی امریکا میں ایک جزیرے جیسی توسیع و جذبہ کہ ہمارے معاملے میں ایک جزیرہ نہائی کیفیت ہے۔ یہ دونوں خطے جغرافیائی اور تہذیبی اعتبار سے انوکھے (دائرہ مختلف امریکز) ہیں۔ شمالی امریکا کی ابتدا کا مرکز اور تھیلی نوا انگلستان اور ہمارے طرف سے ہسپانیہ و پرتگال میں اور اس میں جاپانی تھیلیاں نو۔ ہسپانوی امریکا کے بارے میں مختلف افسانوں میں بتایا جاتا ہے کہ یورپی ملک کے معاملے میں ہسپانیہ کس طرف مختلف ہے، خصوصاً ابتدائی تاریخی شناخت کے حوالے سے۔ ہسپانیہ انگلستان سے کم انوکھا نہیں مگر اس کا انوکھا پن مختلف قسم کا ہے۔ انگلستان کی غیرایت جزیرائی سے اور علاقہ کی سے متشخص ہوتی ہے۔ انوکھا پن جو دائرے سے باہر رکھتا ہے وہ ہسپانوی انوکھا پن جزیرہ زائی ہے، مختلف تہذیب اور مختلف علاقوں کا قیوم باہمی جو اپنی ایک داخلی اثر دیت رکھتا ہے۔ جو حد میں کتب تک ہسپانیہ ہوا، اس کے بارے میں Visagons نے آبیائیت کی بدعت کی پیشین گوئی کی تھی اور ہم صدیوں پرانے عرب کے تہذیبی غلبے کی بات بھی کر سکتے تھے جب کہ یہودی اثر نے دوبارہ نو حیات اور دوسری خصوصیت ہیئت کے بارے میں سوچا۔

ہسپانوی تہذیب کے بنیادی اجزاء امریکا میں جو چکا ہے خصوصاً میکسیکو اور چیلز میں جہاں قدیم اور تابناک تہذیبیں قائم رو چکی تھیں۔ میکسیکو میں ہسپانویوں کو تاریخ اور جغرافیہ کا سنا سنا پڑا تھا۔ وہ تاریخ ابھی تک زندہ ہے ماضی نہیں ہوتی ہے، ابھی تک حال کی کیفیت میں ہے۔ کولمب سے قبل کے مندور دور ویرنا کھنڈر کا انبار میں چکے ہیں مگر وہ جذبے جوان میں سالس بن کر چل رہے تھے ابھی تک ختم نہیں ہوئے ہیں، وہ ہم سے کتنی عرصہ کی زبان میں اسطوں، روایت، سماجی ہم عصری، عوامی فن اور مذاہب کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ ایک میکسیکیائی دین ہونے کے معنی ہوتے ہیں اس موجود آواز کو دواس کی موجودگی کو سننا۔ اس کو سننا، اس سے باتیں کرنا، اس کی تعبیر کرنا اور اسے چٹا کرنا۔ اس مختصر سے گریز کے بعد ہم اس خاص رشتے کو سمجھ سکیں گے جو ایک وقت ہم کو یورپی روایات سے جڑاتی بھی ہے اور الگ بھی رکھتی ہے۔

تلاشہ ہونے کا یہ مستقل شعور ہماری روحانی تاریخ کی خصوصیت ہے۔ بلا حد کی بھی ابھی ایک بڑی طرح کی طرح محسوس ہوتی ہے جو ایک مذہبی تقسیم کی علامت ہوتی ہے، ایک کٹکی جیسی آگاہی جو خود تشخیص کی دعوت دیتی ہے، ابھی یہ ایک چیلنج نظر آتی ہے، ایک مہیڑ جو ہمیں عمل پر آمگے بہادر کرداروں سے، اور باہر کی دنیا سے فٹڑ جانے پر کھاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ علاقہ حد کی احساس عالمی ہوتا ہے، صرف ہسپانوی امریکیوں سے مخصوص نہیں۔ یہ ہماری پیدائش کے وقت ہی پیدا ہونا ہے، جوں کی ہم نکل سے مردہ کر فٹڑے جاتے ہیں۔ ہم نا، فوس سریمینوں پر پتہ جاتے ہیں۔ یہ تجربہ ایک زخم بن جاتا ہے جو کبھی مندمل نہیں ہوتا۔ یہ ہر انسان کے مذہبی ایک ناقابل یقین گہرائی جیسا ہوتا ہے، ہماری تمام قسمت آزمائیاں اور انحصار، ہمارے تمام اعمال اور خواب پل کی مانند ہوتے ہیں جو علاقہ حد کی گہرائی اور ہم کو دنیا سے اور سماجی انسانوں سے

ہوتے سمنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ہر انسان کی زندگی اور اپنی نوع انسان کی مجموعی تاریخ ہمارے آغاز کی کیفیت کو دوبارہ پیدا کرنے کی کوششوں کی طرح دیکھی جاسکتی ہے، ہمارے تقسیم شدہ حالات کا ایک نامکمل اور نامتناہی مدق۔ مگر میرا ارادہ نہیں کر میں اس احساس کی اور کوئی تفصیل بیان کر دوں۔ میں صرف اس حقیقت پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے لیے یہ وجودی کیفیت خود کو تاریخی تقاضوں میں پیش کرتی ہے۔ لہذا یہ ہماری تاریخ کی انتہائی بنی چاتی ہے۔ تب "دیکھو" یہ احساس ہوتا ہے کہ کس طرح یہ شعور میں داخل چاہتا ہے؟

اس دو حادی سوال کا جواب ایک نظریے کی صورت میں برزائی بیان کی صورت میں دیا جاسکتا ہے۔ میں دوسری صورت کو پسند کرتا ہوں۔ نظریات بہت سے ہیں مگر وہی بھی سراسر ناقابل یقین نہیں۔

خلافت کا احساس میری سب سے پرانی اور سب سے قریبی باتوں سے متعلق ہوا ہے، جیسے پہلا گریہ اور پس خوف۔ ہر بچے کی طرح میں نے بھی دنیا اور دوسرے انسانوں سے شک ہونے کے لیے اپنے تصور میں جذباتی ٹپک بنائے ہیں۔ میں میکسیکو میں کے مقامات کی ایک آب و ہوا میں رہا ہوں، ایک پرانے درخت مکان میں جس میں ہنگل جیسا ایک لالچہ تھا اور ایک کمرہ کتابوں سے بھرا ہوا۔ پیدا کیلیں اور چلا ہوا۔ بعد ہی وہاں پہلے میری دنیا کا مرکز بن گیا، اور کتب خانہ ایک سرگمیز غار۔ میں سلاحدہ کتا، اپنے غم زد دور میں کے ساتھیوں کے ساتھ کھیلا۔ وہاں انجیر کا ایک درخت تھا، نباتات کا ایک مندرجہ مصنوعہ کے چار درخت، نمین دیوار کے درخت، ترکاریوں کے پودے، انار کا ایک درخت، خود کو گھاس اور چھنے والے پودے جس سے بعد میں ہمارے ہمارے مکان پر جاتے تھے۔ کتنی بیٹوں سے بنی دیواریں۔ وقت ٹپک دار تھا، کش دگی ایک کھونٹے والے چمکے کی مانند تھی۔ ہر وقت، ماضی یا مستقبل، اصل یا خیالی، بس خاموش موجودگی تھی۔ کشادگی اپنے آپ کو مسلسل تبدیل کر رہی تھی۔ دور ہوتے ہوئے بھی سب آچھو تب تھا ایک، ایک، ایک پہاڑ، ایک دور دراز کا ملک، پڑوسی کا ہر آمد۔ تصویر سے بھری کتابیں، خاموش طور پر تاریخی کی کتابیں، سرسری طور پر پلنے ہوئے صفحات ریستائیں اور جنگوں کے نقوش سے مزین، محل اور جھونپڑیاں، پانی اور شہزادے، بھکاری اور بادشاہ، ہم حلیا دیور ریٹس کے تباہ شدہ جہازوں میں سوار تھے ہم نے d'Antagrian سے جنگ کی، ہم نے Cxi سے Valenna کو چھین لیا تھا۔ میری کتنی خواہش تھی کہ میں ہمیشہ کے لیے Calypso کے جزیرے پر رہ جاؤں، گرہ کے موسم میں انجیر کے درخت کی ڈیلیاں، ہوا میں مانی گیہ کی کشتیاں یا سمندری قاقوں کے جہازوں کے باجائے و طرح ہرائیں۔ تیرہ ہمارے زور آزمائی کرتے ہوئے مستول کی بلندوں سے میں جزیرے اور دریاؤں کو دیکھ سکتا، دھنس غائب ہو جاتیں جب وہ محسوس ہونے لگتیں۔ دنیا بے گناہ ہوتے ہوئے بھی آج میں تھی، وقت ٹپک دار تھا جس نے ایک شستہ دل کی بات کر دی تھی۔

یہ جادو کب ٹوٹا؟ اچانک ٹوٹنے کے بجائے درجہ بدرجہ۔ بہت مشکل ہوتا ہے سر لینا کسی دوست کی بے وفائی کا، جس بورت سے محبت ہو اس کا جھوٹا اور اس خیال کا کہ آرزو کی کسی چادر کی نقاب ہے۔ ہم جس کو "ڈیوڈ لینا" کہتے ہیں، ایک ست اور کرب باز کا عمل ہوتا ہے اس لیے کہ ہم خود اپنی غلطیوں اور

دھوکے بازیوں کے شریک نہ ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود مجھے انجلی غرت ایک واقعہ یاد ہے جو چھ ماہ شمار تھا۔ اگرچہ اس کو جلد بھلا دیا گیا تھا۔ میں اس وقت تقریباً چھ برس کا رہا ہوں گا جب میرے ایک ہم راہ نے، جو مجھ سے عمر میں کچھ بڑی تھی مجھے شانی امریکا کا ایک پہلا دکھایا جس میں ایک بہت چوڑی سڑک پر، جو شاید پانچ یا دس میٹر رسی ہوئی مارننگ سٹے ہوئے فوٹی سپاہیوں کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ "یہ جنگ سے واپس آگئے ہیں۔" اس نے کہا تھا۔ ان چند الفاظ نے مجھے پریشان کر دیا، مگر انہوں نے مجھے دنیا کے حتم ہونے کی یا (حضرت) عیسیٰ کی دنیا میں دوبارہ آمد کی جھٹک دکھائی تھی۔ مجھے بس یہ طور پر معلوم تھا کہ بہت دور کہیں چند سال قبل کوئی جنگ ختم ہوئی تھی اور یہ فوٹی سپاہی فتح کا جشن منانے کے لیے مارننگ سٹے پر تھے۔ میرے لیے تو وہ جنگ کسی دور زمانے میں شروع ہوئی تھی، نہ یہاں اور نہ اب۔ اس تصویر نے مجھے بھلا ثابت کر دیا۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ مجھے خود کو اب سے نکال دیا ہوگا۔

اس کے بعد سے وقت نے نیا دور سے نیا دور وخت شروع کر دیا۔ اور یہ بار بار ہوا۔ تجربے نے خواہ مخواہ رہنا شروع کر دیا۔ کسی شہر نے، ایک بے شمار جیسے نے، خبر کی کسی سڑکی نے، سب نے بیرون کی دنیا کے وجود کو دور میرے اندرون کی موجودیت کو ثابت کر دیا۔ مجھے محسوس ہوا گویا دنیا ٹکافت ہو رہی تھی اور یہ کہ میں حال میں موجود نہیں رہتا تھا۔ میرا وقت، باغیچے کا وقت، انجیر کا وقت، دوستوں کے ساتھ کھیل کود، تین بجے سہ پہر کی ذمہ داری دھوپ میں پیوں کے قریب غنڈوں، ایک ٹوٹی اور شکاف، انجیر (اور سے دیکھتے ہوئے کوٹھے کی مانند سرخ و سیاہ پھٹی میٹھی اور تازہ) یہ ایک بھی وقت تھا۔ یہ جو دیکھ میری حس نے کہا تھا کہ اس پر کا وقت، دوسروں کی ملکیت وقت، اسی وقت تھی، حقیقی حال کا وقت تھا۔ میں نے مائیکرو کی قیاس کر لیا۔ میں باغ ہو گیا۔ وصال طرے ماضی سے میرے احرائق کا عمل شروع ہو گیا۔

یہ کہنا تھا کہ بالذات گئے گا کہ میں حال سے غارت کر لیا گیا ہے، غریب احمدی ہم سب کو کہی نہ کی وقت ہو تھا۔ ہم سے کچھ نے پیسے تو اس کید مت سمجھا، بعد میں اسی کو شعور و عقل میں تبدیل کر دیا۔ حال کی تلاش نہ تو کسی زمکہ حث کا تعاقب ہے نہ کسی ابدی حث۔ یہ خوشی ہے اصل حقیقت کی۔ ہم سب توئی امریکیوں کے لیے حقیقی حال ہمارے اپنے سکوں میں نہیں تھا۔ یہ دوسروں کا گزرا ہوا وقت تھا انگریزوں کا، فرانسیسیوں اور جرمنوں کا۔ یہ نوبل راک کا، جیسا کا، لندن کا وقت تھا۔ میں خود چاکر اس کو گھر واپس آتا تھا۔ یہ زمانہ میرے لیے اب کی دنیا وقت کا نانا تھا۔ میں نے نظم لکھنی شروع کی۔ مجھے خبر نہیں کہ میں نے مجھے کتنے پر اکسایا۔ مجھے ایک اندرونی ضرورت نے اکسایا تھا جس کی تعریف میرے لیے مشکل ہے۔ صرف اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ حال سے میرے احرائق اور شعر کہنے کے درمیان ایک نظیر رہتا تھا۔ شاعری وقت موجود سے محبت کرتی ہے اور اس کو نظم میں لا رہا پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے اس طرح اس کو تسلسل وقت سے علاحدہ کر کے ایک جامد حال میں تبدیل کرنا چاہتی ہے۔ مگر اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ میں کیوں کہتا ہوں، میں نکلتا رہا۔ میں حال میں داخل ہونے کی گزرگاہ کی تلاش میں تھا۔ میں نے اپنے وقت اور اپنی

صدی کا ہونا چاہیے۔ پھر عمر سے بعد یہ آسب یک چہ خیال بن گیا۔ میں نے ایک جدید شاعر بنانا چاہا۔ جدت کا آغاز ہو چکا تھا۔

جدیدیت کیا ہے؟ سب سے پہلے تو یہ ایک مبہم اصطلاح ہے، جس طرح مختلف معاشرے ہوتے ہیں اسی طرح نئی قسم کی جدید شے بھی ہوتی ہے۔ ہر معاشرے کی اپنی جدیدیت ہوتی ہے۔ اس لفظ کے معنی غیر معین اور من مانے ہوتے ہیں، اسی طرح جیسے ادوار کے نام ہوتے ہیں جو ان سے پہلے نرہ چکے ہوتے ہیں، مثلاً سرفروں و سٹی کے مقابلے میں ہم جدیدیت کیا سمجھا؟ مستقبل کی جدیدیت کے زمیں و سٹی میں ہیں؟ کیا جو نام وقت کے ساتھ تبدیل ہوتے ہیں وہ اسی نام ہوتے ہیں؟ جدیدیت کیا نام کی تلاش میں ہے۔ یہ ایک خیال ہے، ایک مراب ہے یا تاریخ کا ایک لمحہ ہے؟ کیا ہم جدیدیت کے نچے میں یا اس کے خالق؟ یقیناً کسی ذہنی یہ سب معلوم نہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم اس کے پیچھے چلتے ہیں، ہم اس کے تعاقب میں رہتے ہیں۔ میرے نزدیک اس وقت جدیدیت بالکل مرحلہ میں پورست تھی وہاں نے ہی اس کو خلق کیا تھا۔ جاں اس کا سب سے بڑا تر پھول تھا۔ میرا معادہ نہ اٹھا ہے، پورہ اشتیاق۔ ملاحظہ کے طور سے تمام جدید شعرا اس عقاید طبعی اور مشرور ہیئت کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں جو انھیں چاہیے اور غیر ان سرفروں کی ہے۔ بولنے و دوپہر شخص تھی جس نے اس کو جانچ لگایا تھا اور وہی وقت کیا تھا کہ یہ وقت کے عذوہ چھو اور نہیں جو کسی کے ہاتھوں میں جا کر چور چور ہو جاتی ہے۔ میں جدیدیت کی تلاش میں ہی جانے واپی اپنی کوششوں کی بیان کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ وہ بیسویں صدی کے دوسرے شاعروں کی طرح بہت مختلف نہیں۔ جدیدیت ایک عالم گیر دھمک رہا ہے۔ 1850 سے پہلے دیوئی بھی رہی اور شیطنت بھی۔ حالیہ برسوں میں اس آسب کو اٹانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے اور اس ضمن میں "ماجد جدیدیت" کے دانش ہوتی ہیں۔ مگر یہ ماجد جدیدیت ہے یا شے، اگر یہ ایک مزید جدیدیت نہیں؟

ہم لاطینی امریکیوں کے نزدیک شاعرانہ جدیدیت کی تلاش، تاریخی اعتبار سے ہمارے ملکوں کو جدید بنانے کی کوشش کے متوازی پہتی رہی ہے۔ نچا وین صدی بیسویں میں یہ میدان شروع ہوا، جس میں خود ہسپانیہ بھی شامل تھا۔ بدست بائے متحدہ کی پیدائش کی جدیدیت میں ہوتی تھی، اور 1930 تک، جیسے کہ de Tocqueville نے بیان کیا ہے، وہی مستقبل کا ہم ماہد رہی تھی۔ ہم اس وقت پیدا ہوئے تھے جب ہسپانیہ اور پرتگال جدیدیت سے مانا توڑ رہے تھے۔ مگر وجہ سے کہ ہمارے ملکوں کو "یورپین" کی کٹر دشمن ہوتی تھیں۔ مگر جدت ایک جدیدی شے تھی جس کو وہ مانا جاتا تھا۔ میکسیکو کی تاریخ میں یہ عمل جب آزادی سے زما پہلے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ ایک تنظیم نظریاتی اور سیاسی نکانہ بن گیا جس نے میکسیکو کے سماج کو جدید بنانی اعتبار سے بیسویں صدی میں تقسیم کر دیا۔ ورنہ یہ تھا کہ کسی کو اصطلاح کی تحریک کے جواز پر کوئی اعتراض نہیں تھا، اعتراض صرف اس طریقہ کار پر تھا کہ تحریک کو کسی طرح شروع کیا جائے، یعنی انقلاب میکسیکو۔ بیسویں صدی کے دوسرے ملکوں کے برعکس، انقلاب میکسیکو داس کی مہم یورپی

نظریے کا کیا نہیں تھا بلکہ حقیقت کے اس وجود کے پر تھا جس کو تاریخی اور تاریخی اعتبار سے کچھ دیکھا گیا تھا۔ یہ کسی نظریاتی غرور کا کام نہیں تھا جو کسی سیدھی کچھ سے بنائے گئے اصولوں کو متعارف کرانا چاہتا تھا۔ یہ ایک مواصلاتی احتجاج تھا جس نے پوشیدہ چہرے سے نقاب اٹھایا تھا۔ اسی وجہ سے انکشاف زیادہ اور نمک بھرا تھا۔ میکس کیلکولس کو اپنے حیران کن حریف اس لیے خوش کر رہا تھا کہ اس کو یہ اپنے غریبوں کی میں مل جائے، جو وہیں زندہ دفن تھے۔ جدیدیت کی تلاش نے اپنی قدامت کی قوم کے چھپے ہوئے چہرے کے دریافت کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میں غیر متوقع تاریخی سبق سے سب نے کچھ سیکھا ہے کہ جدیدیت اور روایت کے درمیان ایک کھلی موجود ہونا ہے۔ جب وہ آپس میں خود ہی جد ہو جاتے ہیں تو وہ بہت قلم کرسات ہو جاتی ہے اور جدیدیت بخیرین مگر پرواز کر جاتی ہے، جب کہ ملاپ کی صورت میں جدیدیت روایت میں زندگی کی روش پھونک دیتی ہے، اور انڈر گراؤ اور انقلاب سے جواب دیتی ہے۔

شاعرانہ جدیدیت کی تلاش ایک جستجو تھی، بارہویں صدی میں جس کو مشرق اور روم کے معنوں میں دیکھا جاتا تھا۔ آخر چرچوں نے کئی دیرانے پار کیے ہیں، لیکن کے محلوں میں گیا ہوں اور محبت پریت کے قبائلی کے ساتھ خیموں میں وقت گزارائی کی ہے مگر جس کی جستجو تھی وہ شے تو مجھے کہیں نہیں ملی۔ مگر میں نے جدیدیت نہ صرف درود و وقت گزلی ہے۔ اس لیے کہ جدیدیت کوئی شاعرانہ اسکول نہیں، ایک فلسفہ نسب ہے، کئی براعظموں پر پکھر ہوا نظام ہے جو دو صدیوں تک بہت سردی چاکت تھیلوں اور بدبختیوں کو بھیل کر بھی باقی رہ گیا ہے۔ مونی، مگوری، تنہائی اور مذہب سیاست، دانش اور جنسی قدامت پرستی کے نام پر مانی۔ چوں کہ یہ ایک روایت ہے عقیدہ و فلسفہ یہ ثابت قدم رہی اور ساتھ ہی ساتھ جدیدی بھیل گئی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ اتنی رنگا رنگ ہے، گویا ہر شاعرانہ مہم نیا رہی ہوئی ہے اور ہر شاعر نے کلام کرتے ہوئے تجزئی درختوں کے جنگل میں ایک مختلف قسم کا چوبانگیا ہے۔ اس کے باوجود اگر تخلیقی رنگا رنگ ہے اور ہر ماہی رہی ہے تو پھر وہ کیا شے ہے جو ان تمام شاعروں کو متحد کرتی ہے؟ ہر عورتی نہیں بلکہ ایک واقعی تلاش۔ میری تلاش قیام نہیں تھی، اگر چہ جدیدیت کا خیال کی سراب کا، عکسوں کا ایک چندہ ہے۔ ایک دن مجھ پر مشکلف ہو کہ میں آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف جا رہا ہوں، گویا جدیدیت کی تلاش میرا کی طرف ایک واحد ن تھی۔ جدیدیت نے میری ابتدا اور میری قدامت کی طرف میری رہنمائی کی۔ اسی طرح مجھ پر کشف ہو کہ شاعرانہوں کے مترجم بہاؤ میں ایک دھڑکن کی مشابہت ہے۔

تاریخ کے ہمارے تصور کے مطابق جدیدیت کا خیال ایک منفرد اور خطی (linear) عمل کے تسلسل جیسا ہے۔ اگرچہ اس کی ابتدا یودیت اور عیسائیت دونوں سے ہوئی ہے، یہ عیسائی عقیدے کو توڑتا ہے۔ عیسائیت میں، بہت پستی کی تہذیب کا، گھوم گھوم کر بار بار آنے والا دور اس تاریخ کے ذریعے ٹھوسا گیا ہے جس کو دور نہیں جاسکتا، وہ کچھ جس کی ایک لمحے ابتدا ہوئی ہے اور ایک لمحے اس کا انجام بھی ہو گا تو تر سے آنے والا دور تاریخ کا مایا ک دور تھا، بارہویں صدی کے انسانوں کا کھانا، مگر جس پر مقدس وقت کی حکمرانی

حق، جس کی نہ کوئی پتہ تھا اور نہ انجام۔ یوں حساب کے بعد نہ جنت میں کوئی مستقبل ہوگا نہ جہنم میں۔ آخرت کی حدود میں کوئی دائرہ نہیں، یہی ہے کہ ہر شے ”ہے“ گیا ہونا، ہو جانے پر غالب آ جانا ہے۔ ماب کا وقت، یعنی وقت کا ہمارا تصور، پھر نیت کے وقت کی طرح خفگی ہے، مگر نہ محدودیت کے لیے نکلے ہوا ہے جس میں اوجہت کا کوئی حوالہ نہیں۔ ہمارا وقت تاریخ کے ہاپک، منحوس، ناقابلِ مسودگی، دائمی اور مستقبل کی طرف رواں ہے، اپنی انتہا کی طرف نہیں۔ تاریخ کا سورج مستقبل سے اور ترقی میں کی حرکت کا نام ہے جس کا رُش اپنے انجام کی طرف نہیں مستقبل کی طرف ہے۔

میراثی اس دنیا کو جس کو دنیاوی زندگی کہا جاتا رہا ہے، اس کی ترقی کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اتنا ہی دنیا میں گونا گویا مٹھوئی کی جانتی ہے۔ نئے تصور میں تاریخی مونیٹوٹ آخر کی انتہا نہیں تسلیم کرتا ہے، جس کو کبھی میں حیث نکل دیکھا جاتا اور کبھی ایک پیسہ ہمارا دکان صورت میں جو اس کی نمائندگی کرتا ہے۔ یعنی مطلب کی ترقی یا نئے قومی، پرانی دنیا، سفید فام نسل یا کئی اور وجودیت پرستوں اور عیسائیوں کی تفسیرات۔ روایت نے وجود کو ایسے نمائندہ ہے تغیر کی زندگی پر پہنچا دیا جس سے غلامانی کے چشمے رواں ہوں۔ ہم تبدیلی کو پسند کرتے ہیں، جو ارتقا کا پسیدہ اور تاریخی معاشرت کے لیے ایک نمونہ ہوتی ہے۔ تبدیلی خود کو دنیاوی طریقوں سے پیش کرتی ہے، دنیا کے طور پر اور انتخاب کے طور پر، جیسے زندگی چاہی اور اچانک چھوٹا گھم۔ جدوجہد تاریخی حرکت کی سرخیں ہے ارتقاء کی انتخاب کی تقسیم، جن کو ہم ترقی کے دو روپ سمجھ سکتے ہیں۔ سائنس اور فیکٹوریوں کے سطحیں آخری ترقی کو جیتتی ہے تعلیم فطرت سے اعلیٰ سے اور اس کے ہے بدلے نمونے سے۔

دراختر کے انسان نے خود کو ایک تاریخی وجود کے طور پر متعارف کرایا ہے۔ دوسری معاشرتوں نے اپنے آپ کو تبدیلی سے مختلف، اقدار اور خیالات کے ذریعے متماثل سمجھا کر کیا۔ یونانیوں نے شری مملکت (polis) اور حاکم کو متمرک کیا مگر وہ ترقی سے مایل تھے۔ تمام ریاستوں (یونانی فلسفی نے ان کے پیسے۔ مترجم) کی طرح Seneca (امریکی انڈین قبیلہ جو تھی لیو ریکس غربی میں آباد تھا۔ مترجم) بدی و اسی کے درے میں بہت متکثر تھے، سینٹ اگسٹین کو یقین تھا کہ دنیا کا آخرت نزدیک ہے، سینٹ ماس نے وجود کے درجات کے تعین کے لیے ایک پیمانہ ایجاد کیا تھا، جو خود ترین مخلوق کو خالق سے منسلک کرتا تھا۔ فیروز ایک ایک کر کے سارے خیالات اور یقین دہانہ دہو گئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی قسم کا زوال ترقی کے ہمارے خیالات پر اور اس کے نتیجے میں وقت کے ورثے پر، تاریخ پر اور ہم لوگوں پر اثر انداز ہونے لگا ہے۔ اب ہمیں مستقبل کی تمام نظر آنے لگی ہے۔ جدوجہد کے خیالات کا انحطاط اور ”مابحدہ جہت“ جیسے مشہور نام کی مقبولیت یہی حیرت انگیزی ہے جو صرف ادب و فن لطیفہ پر ہی اثر انداز نہیں ہوتی۔ بہمان لادہ کی خیالات اور محتاط کے بحران کا تجربہ کر رہے ہیں جنہوں نے دو صدی سے زیادہ عرصے تک اپنی فوٹ انسان کی رہنمائی کی ہے۔ میں نے کہیں اور بھی اس مونیٹوٹ پر گفتگو کی ہے۔ اس لیے یہاں میں ایک مختصر

عزیز جی پر کتنا مڑوں گا۔

سب سے پہلے تو ہے اخت ترقی کے مترادف اہمیت کا گہنی تصور یک سالیہ نشان ہے۔ مجھے یہ بتانا ضروری نہیں کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ترقی و سماں مہم دو ہیں در ایک دن ختم ہو جائیں گے۔ ہم نے ترقی ماحول کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں، پورے ماحول کی ٹوٹ بھی خطرے میں ہے۔ آخر میں ترقی کے اوزار سائنس اور ٹیکنالوجی، ایک ڈرامائی وضاحت سے دکھا رہے ہیں کہ وہ بہت آسانی سے تباہی کی طاقت بن سکتے ہیں۔ پھر ہر تضحیلوں کی موجودگی اس خیال کی تردید ہے کہ ترقی تاریخ کا ناقابل رد حصہ ہے۔ اس تردید کو صرف تباہ گئی ہی کہا جاسکتا ہے۔

دوسرے مرحلے پر ہمارے سامنے تاریخی موضوع، بیسویں صدی کے نئی ٹوٹ انسان کا مختصر ہے۔ شاہد ہی کہیں، قومیں یا فرد اتنے عذاب سے گزر رہے ہوں گے کہ وہ عالمی جنگیں، پانچ ہزار غنیمتوں پر محیط استبداد، غم و افسانہ تاریخی کے سب سے زیادہ بڑا افسانہ ہے۔ حد بلکہ انارڈس کا پھیلاؤ، مائیکس مینوٹ خانے۔ جدید ٹیکنالوجی غنایات بے شمار ہیں مگر ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ جب ہماری صدی میں ہمارے سامنے کروڑوں بے تصور انسان پر، قتل، تشدد، تفریق، رسوائی جیسے دوسرے سارا سوک کے چارے ہوں اور ہم اپنی آنکھیں بند کیے رکھیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ ترقی کی ضرورت پر ہمارے یقین کو ٹکا گیا ہے۔ ہمارے آجوا جہاد کے لیے تاریخ کے کھنڈروں (لوشس، اجاز میدان جنگ، تباہ شدہ شہر وغیرہ) نے تاریخی عمل کی ریمیں خوبوں کو فتح نہیں کیا۔ پچاسی کے تختے اور شہداء، تنازعات اور خانہ جنگیاں وہ قیامتیں تھیں جو ترقی کے لیے چکان گئیں۔ گویا تاریخ کے خدا کو خوش بہا ایا گیا۔ خدا؟ جی ہاں، جیہ کی بیگم کہہ سکتا ہے وہیں نے خود طمان چا۔ کیوں کو خدا کی وجہ دیا ہے۔ خدا کے طور پر ترقی کی جان کو ہوائی معنویت غائب ہو گئی۔ خود قانون کے حقدار میں و قاعدگی اور اعمال (خالص سائنس میں علم طبیعات) جیسے حادثات کے تقدیم امان اور آفتیں دوبارہ ہر تھارہ ہیں۔ یہ پیمانے کن دست بندی مجھے ان وحشتوں کی یاد دلاتی ہیں، جنہوں نے ہزاروں سالوں کو تباہ کر دیا ہے اور Aztecs (میکسیکو کے مقامی لوگ جن کو ہسپانیوں نے 1519 میں شکست دی تھی۔ مترجم) قد قہری کی یاد دلاتی، جو ہر کائناتی دور کے ختم پر پیدا ہوتی ہے۔

اس نذر و حسرتی کا آخری عنصر تمام قسطنطنیہ و روم کی مٹنے کی تباہی ہے جو تاریخ کی تلاش پر حکمران قوانین کو خراب کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ معتقدین نے، جو یہ یقین تھے کہ تاریخ کی کتابیں ان کے لیے میں ہیں، انہوں نے ہر ام پر طاقت ور سیاستیں کھڑی کیں۔ یہ پُر غرور تعمیرات، جو نظریاتی اعتبار سے انسان کی آزادی کا مقدس بن رہی تھیں، جدیدی بہت قوی یکل قیدیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اپنے نظریاتی دشمنوں کے ماحول میں، آزادی کی خواہش میں نئی نسوں کی بے مبری کی وجہ سے آٹھ ہم نے ان کو منہدم ہوتے

دیکھو۔ یہ تو یہ یونیورسٹی جزیروں کا نت ہے۔ ایک تصوراتی کیفیت کی حیثیت میں مسائل یہ تاریخ کے خیال کا اختتام ہے، جس کے نتائج قبل از وقت دیکھے جاسکتے ہیں۔ تاریخی جبریت بہت گراں، غصہ مود کھائی رہی ہے۔ تاریخ کا قابل پیش گوئی ہوتا ہے کہ اس کا ہر کارہ یعنی نئی نوع انسان، لائحہ عمل (indeterminism) کی تقسیم ہوتا ہے۔

یہ مختصر تبصرہ دکھاتا ہے کہ غالباً ہم ایک تاریخی دور کی اظہار و جہ سے کی ابتدا کے منقسم ہیں۔ کیا یہ عصر جدید کا اختتام ہے یا محض ایک عملِ تغیر (transition) ہے؟ یہ غماض شکل ہے۔ بہر حال، یونیورسٹی منصوبہ کے منہدم نے ایک نیا اخلاقی چھوڑا ہے، ان ممالک میں نہیں جہاں یہ نظریہ تصور کا محبوب ثابت ہو ہے بلکہ وہاں جہاں لوگوں نے اس کو جوش و خروش اور میدان کے ساتھ گلے سے لگایا ہے۔ تاریخ میں کائنی بارہی نوع انسان ایک قسم کے روحانی بیابان میں رہ رہا ہے۔ یہ مذہب اور یہی نظم و انضام کے سائے کے نہیں جنہوں نے ہماری شک و شبہ کے ساتھ ساتھ ہمیں مغلوب بھی کیا ہے۔ اگرچہ سائنس معاشرے کے تاریخی ہیں، ہر فرد طے شدہ مابعد التاریخی (metahistorical) ترتیب کی رہنمائی اور عقائد کے زیر اثر زندگی گزار چکا ہے۔ ہم پیسے دار سے شہس رکھتے ہیں جو مابعد التاریخی عقیدے کے بغیر زندہ رہنے کے لیے تیار ہے خواہ وہ مذہبی ہو یا لائسیٹائز، اخلاقی ہو یا جن لیاٹی، ہمارے امتیازات مطلق اجتماعی نہیں جگہ لگی ہیں۔ یہ ایک خطرناک تجربہ ہے۔ یہ جاننا بھی ممکن نہیں کہ جب تک یہ خیالات، طریقے کار اور عقائد میں تاریخی جانے وہی کشش اور تنازعات، جو روایتی طور پر جوانی اور اختیار کا حصہ تھے، ساج کی بافت کو نہیں نہیں کر کے ہم نہیں میں گئے۔ اس طرح مذہبی غیظ و غضب اور تنہا پسند قومیت وغیرہ لوگوں پر ایک بار پھر جاری ہو چکی ہے۔ یہ بہت خوف ناک ہو گیا اگر نظریات کے تجربے کی مناسبت کا زندگی قیودوں کے فی شدہ جذبات، فرقہ بندی اور کلیسا کی حیثیت کو کاوش خیمہ بنا۔ بد قسمتی سے اشارے خامے پریشان کن مل رہے ہیں۔

نظریات کے ذہن کو میں نے مابعد التاریخی کہا ہے، جس سے میری مراد وہ تھے جو کسی ہدف یا سمت کو تاریخ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یعنی پسے عالمی مسائل کے حل سے خاموش دست کشی کرتے ہیں۔ ہوش مند کی کے ساتھ، ہم کھن میں کل کے حل کے لیے محدود وقت کا رد کرتے ہیں۔ مستقبل کے بارے میں ۲ تین سادگی سے اکثر ذرا مشکل مندرجہ کی بات ہوتی ہے۔ اس کے باوجود حال کو اپنی فوری ضروریات کے لیے زیادہ توجہ کی ضرورت ہوتی ہے، زیادہ کھن عانی سوچی پھارتی۔ کانی عرصے تک مجھے س بات کا پورا یقین تھا کہ مستقبل کی شام کی باتوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ وقت موجود کے بارے میں سوچنے کا مطلب ہوتا ہے سب سے پسے تنیدی وراثت کی بازیافت۔ مثال کے طور پر بازاری معیشت کی (اپنے جمالی کی چوک کے سبب سے) جیت تھی کا سبب نہیں ہو سکتی۔ اپنے نگاہ کے نام پر دنیا پر چھٹا ہوتا ہے، مگر تمام نظاموں کی طرح یہ بھی شعور اور جذبہ سے معزاً ہوتا ہے۔ ہمیں اس کو سائنس میں غم کرنے کا راستہ تلاش کرنا

چاہیے تاکہ یہ سماجی معاہدے کا اظہار کرے اور انھیں ف اور مافی کا لگہ تن سکے۔ ترقی یافتہ جمہوری معاشرے خوش حالی کی سطح تک پہنچ گئی ہیں، ساتھ ہی ساتھ وہ عالمی پریشانی کے منہدم میں غرق ہونے کے جزیروں کی مانند ہیں۔ بازرگانی ماحول کی پیچیدگی کے ساتھ ماحول کی بھری سے جڑا ہوا ہے۔ آلودگی صرف ہوائی پھیلنے والی ہڈیوں اور بیماری آتا ہے بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک معاشرے میں لیجان کی حد تک نیا استعمال کی ضرورتوں کے باعث نیا نیا سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی عزم و ہمت کے باعث خیالات، احساسات، فن، محبت، دوستی اور پیداوار کے مستعار کرنے و لوہے میں بھی کمی واقع ہونے لگی ہے۔ ہر شے ڈھلنے کے قابل شے ہو جاتی ہے، جو ڈھلنے لگے اور استھیں کرنے کے بعد کڑے میں پھینک دی جاتی ہے۔ کوئی اور معیار نہ تھا کڑا کرکٹ پھانسیں مٹا جتنا کہ ہم کرتے ہیں۔ ہاتھ اور خنجر کا نیو۔

وقت موجود پر غور کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم مستقبل سے ہمت مردہ رہ رہے ہیں یا ماضی کو بھڑ رہے ہیں اس لیے کہ حال وقت کے قریب مستقبل کا تقیم ہوتا ہے۔ نہ ہی اس کو Hedonism (فلسفے کا وہ دہشتان جو راحت کو زندگی کی سب سے اہم جدوجہد سمجھتا ہے۔ مترجم) کے ساتھ اٹھایا جاسکتا ہے۔ انہماک کا درخت نہ ماضی میں اور نہ مستقبل میں اگتا ہے، مگر اسی لمحے میں۔ اس کے علاوہ موت بھی حال کا شریک ہوتی ہے۔ اس کو زندگی کہا جاسکتا، اس لیے کہ یہ زندگی کا حصہ ہوتی ہے۔ اچھی زندگی کا مطلب ہے اچھی موت۔ میں سمجھتا ہوں کہ موت سے کچھیں کس طرح چارگی جائیں۔ حال بھی درختوں اور کھجوروں ہوتا ہے، ایک گیند کی طرح جو عمل و رسم پر پورے کے دو نصف کو جوڑتا ہے۔ ہند جس طرح فلسفے کے ماضی پر مستقبل کے، دور کے اور فطرت کے، گاہ کارے پاس ایک فلسفہ ہوگا حال کا بھی۔ شاعرانہ تجربہ اس کی بنیاد ہوتے گا۔ ہم حال کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ کچھ نہیں، تقریباً کچھ نہیں۔ اس کے باوجود شاعر ایک بات جانتے ہیں، وقت ہم جو وہ جو دیوں کا منہج ہوتا ہے۔

میں خود جدیدیت کے اسی مقدس خرم میں راستہ تلاش کرنے کی کوشش میں بہت سے مقامات پر رہا ہوں۔ میں ملنے کی طرف واپس ہو اور دریافت کیا کہ جدیدیت بازنائیں شریکارے اندر ہے۔ یہ امروز ہے اور سب سے پرانی قدامت، یہ فنا ہے اور دنیا کی ابتدا۔ یہ ایک بڑا عزم پرانی ہے مگر نوزائید۔ یہ Nahua (مرکز میسیکو کے دیہاتین افراد کے صدیوں پرانی زبان۔ مترجم) میں لکھا کرتی ہے، قریب صدی سے چھٹی تصویریں رسم الخط نقل کرتی ہے، اور عمل و اثرات کے پردے پر نمودار ہوتی ہے۔ یہ زمانہ وراثت امروزہ حال ہی میں نمودار ہو گیا، صدیوں کی رویتا ہے، منکرنا ہے اور خرم سے باہر اچانک پرورد شروٹ کر دیتا ہے۔ وقت ورم وجود کو ایک وقت کثرت جدیدیت ماضی قریب سے فنا توڑتی ہے تاکہ نہ سوں پرانے ماضی کی بنیاد کر کے اور پھر کے دور کی ایک نئے ماضی زرخیز کوہارے عصر میں تبدیل کرنے کے۔ ہم جدیدیت کو اس کی بھی نہ ختم ہونے والی کاپی پلٹ میں تلاش کرتے ہیں، اس کے باوجود اس کو

کبھی تھیر جس سکتے۔ وہ ہمیشہ بیچ کر نکال جاتی ہے، ہر تہجد لڑائی پر ختم ہوتا ہے۔ ہم اس کو سگھڑے نکالتے ہیں اور وہ فوراً غائب ہو جاتی ہے، گویا وہ تھوڑی سی بھی تھکی۔ وہ ایک آن ہے، وہ تپا یا جو ہر جگہ ہوتی ہے اور کبھی نہیں۔ ہم اس کو زندہ پھانسا چاہتے ہیں مگر وہ اپنے پتھر پتھر کرتی ہے۔ وہ منہ کی سیر syllables کے پیکر میں غائب ہو جاتی ہے۔ ہم ٹھان باتھ رو جاتے ہیں۔ تب تک کے دواڑے لڑا س گھنٹے ہیں اور وہ نہ رادقت نمودار ہوتا ہے، اسی وقت ہم جانے بغیر جس کو تلاش کر رہے تھے۔ یعنی وقت سوچو اور سوچو دیں!



کمیلو ہوزے سیلا

اعتراف کمال۔ اس گنبد اور بحرِ پورٹر کے لیے جو عاجزان کا منقبطہ ہڈ بہ اور درستی کے ساتھ ایک باہمت بصیرت معنی کرتی ہے۔

کمیلو ہوزے سیلا کے تجربات وراثی کا نتیجہ تھا اور ادبِ ہوس میں ہسپانیہ میں ہونے والی خانہ جنگی کے اس پس منظر کی دین چہ جس نے ہسپانیہ کو لیس سرحدوں کے ذریعے تقسیم کر دیا تھا جن محبتوں، خاندانوں اور قوموں کے بچوں سے گزرتی تھیں۔ کیلئے ذاتی طور پر بھی اس جنگ میں حصہ لیا وراثی دورانِ غم بھی کھائے تھے۔

کمیلو کے مائتدین نے اس کو ایک بے یقین و اتے سے تشبیہ دی ہے۔ اس کے قالب میں تجربات سے محبت کرنے عمر ساتھ ہی ساتھ طیش و اتے والے دانش ور کا ایک دل چسپ اعتراض پایا جاتا تھا اس کے ساتھ ہی اس میں ہسپانوی بدعت متعینہ خیزی بھی ملتی تھی جو عموماً ایک طرح کی نوید کی کار عمل ہوتی ہے۔

کمیلو کے بنیادی طریقہ عمل اور تجربہ بہترین مثال اس کا ناول The Family of Pascual (1942) ہے جس نے اس کو بے پناہ شہرت عطا کی۔ یہ ایک جذبات پر غرور کرنے والا نگرہ و خیر ناول ہے جس نے اثنائی پابندیوں کے وجود کا قابل مثال قوت مرتب کیے ہیں۔ شاید Don Quixote کے بعد یہ ہسپانوی زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول ہے۔ کمیلو کی تحریروں میں، عجیب

مکتوبات کی طرح، ایسے کردار بہت ہی کم ملتے ہیں جن کی تمام صورت گری کی جاسکے، اس لیے کہ کمبلو اور ایسیلا نہیں بلکہ انھوں کو اور معاشرت کی چٹان کاہل کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے۔

کمبلو کے دو مادل *Requiem of Darkness* اور *Maturca for Two Dead* میں نبات اور مرد سے کیے ہوئے نوکے تجربات ہسپانوی زبان پر بہت اثر انداز ہوئے ہیں۔ یہ مادل پشاور و سرحدی قدر گستاخ ہونے کے باوجود تاریکی کے دامن دل کو چپکے چپکے اپنی جانب کھینچتے ہیں۔

کمبلو ہوزے سیلا 1916 میں شمال مغربی ہسپانیہ کے شہر گلیسیا *Galicia* میں ایک تجربے پرے گھر پیدا ہوا۔ اس کا خاندان ایک وسط درجے کا کھانا پیتا گھرانہ تھا مگر اس کے شجرہ نسب کا مسئلہ ہسپانیہ کی اشرافیہ سے جڑا ہے۔ اس کا دادا ہسپانوی تھا۔ ماں اُسچہ انگلستان میں پیدا ہوئی تھی مگر اس کی زبانیں ان دونوں تھیں۔ کمبلو جب نو برس کا تھا اس کے والدین ہسپانیہ کے دار الحکومت میڈرڈ منتقل ہوئے اور پھر وہیں کے ہو گئے۔ مدرسے کی تعلیم کے بعد کمبلو نے طب کی تعلیم شروع کی مگر وہ شعبہ فلسفہ میں لیسے جانے والے ادبی مضامین سننے میں بہت دل چاہی دیتا تھا۔ ہسپانیہ کی خانہ جنگی کی وجہ سے اس کے تعلیمی سلسلے میں رخنہ پیدا ہو گیا۔ اسی دوران میں کتبہ حق کا عارضہ لاحق ہو گیا اور دو صحت دہنی کے لیے میڈرڈ چھوڑ کر اپنے مصلح چچا گیا جو اس زمانے میں محض وطن افواج کے قبضے میں تھا۔ وہیں اس کو جبراً خانہ جنگی میں شریک ہونا پڑا اور گھٹاں ہوا۔

خانہ جنگی کے خاتم پر کمبلو واپس میڈرڈ پہنچے اور اس نے اپنی تعلیم دوبارہ شروع کی مگر اب وہ قانون پڑھنے لگا تھا۔ 1942 میں اس کا پہلا ناول *La familia de Pascual Duarte* شائع ہوا جس سے اس کو ادبی حلقوں میں متعارف کرایا۔ اس کے بعد سے وہ معروف ادب ہی کی طرف مائل رہا۔

کمبلو سیلا کی متر کتاہیں شائع ہو چکی ہیں جن میں اس تجرباتی انداز کے ناول، کئی سفرنامے، مضمون، قصوں کے اور مضامین کے کئی مجموعے شامل ہیں۔ اس کو کئی ملکوں کی جامعات نے ڈکٹریٹ کی اعزازاتی ڈگریاں عطا کیں اور بہت سے انعامات سے نوازا گیا ہے۔ کمبلو نے 2002 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

جہالت مآبہ، دوان شاہی، طالبی مرثیہ، خواجہ مخبر، حضرت

دنیا کے ہم عصر ادب کے نام پر اور ذہنی رتبہ اثر اور خدمت کے واسطے پر میرا نام راقم کے سینیڈس اکادمی مجھے اعزاز بخش رہی ہے۔ یہ ایک اعزاز ہے جو میری صلاحیت اور ہمدردی کے قیام سے

کتنی نیرودہ ہے۔ صمیم قلب سے اپنے تھکر کے جذبات کے ساتھ مجھے یہ دلچسپی کرنے کی اجازت دی جائے کہ مجھے اس مقام پر، جس میں اس وقت موجود ہوں، پہنچنے کی ہمت اسی لیے ہوئی کہ میں، اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ انوکھا سفر ہے، مجھ ہی کو نہیں، میرے ہم عصر دیہات، کبھی مل رہا ہے جو اس اعلیٰ درجے کی زبان میں لکھ رہے جو دراصل ہمارا اوزار ہے، یہاں میری مراد ہسپانوی زبان ہے۔ میں اسی بے حد شغف سے اس طرف کی ہمت نہ کرتا چوں کہ Miguel de Cervantes میرے استاد ہے۔ میں اور مجھے احسن ہے کہ ایک مضمون جو طولیت اختیار کرے، خواہ کتنا ہی مناسب یوں نہ ہو، کامیاب نہیں معلوم ہوتا۔

آپ کے احسان نے اواں کے باعث جب میں اس کتاب کو اس طرف آرہا تھا تو میں نے خود سے سوال کیا کہ میرے یہاں آنے کی وجوہات کیا ہیں؟ پھر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ آپ کا مقصد کسی فرد کے بجائے اس پیشے کو سرفراز کرنا تھا۔ اگر ایسا ہے تو آپ نے ہرگز غلطی نہیں کی ہے۔ اسی لیے کہ سرواٹے کے قول کے مطابق دب کا ہدف انصاف کو اس کا صحیح مقام دینا ہے، ہر شخص کو وہ سچو پہنچانے سے جو اس کا حق ہوتا ہے اور اچھے قوانین کی سرپرستی سے۔ (دب کا دھڑکا اور ناقابل تہدنی میری مدق، میری موت اور میری اذیت، میری پیشہ اور میری حلقہ پیش، میری مسلسل آمد اور میرے بے بجا غور سے زچہ نہایت ہے۔ میری ضمیر اس اعتراف کے بعد گتہ آسودہ ہوگا)

نوٹیل انعام پانے والوں میں دی بھر کے ہم عصر رائٹس دانوں کے نام شامل ہیں جو انھیں قابل تہریف مقاصد کے متعین کیے ہوئے ماستوں پر چلتے ہیں جو ہم سب کو مختار و مخصوص کرتے ہیں، یعنی ہمارے ذہنوں اور دلوں میں امن کی غم آہنٹیں ہوں، نئی نوع انسان اور قوموں کے درمیان ایک جہتی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ ہم بچے متعین کیے ہوئے ہدف تک پہنچ نہیں سکے ہیں، کراہی اچھے معنوں میں بہت سے قدم اٹھانے ہوں گے۔ میں مشورہ دوں گا کہ ہم اس سخت سفر راستے سے کبھی نہ ہٹیں۔

میں شاہ اور ملکہ عالیہ کے عزائم میں جام تجویز کرتا ہوں، جو ایک قوم پر امن کے ساتھ حکومت کرتے ہیں، سوئڈن کے باشندوں کے لیے جو امن سے محبت کرتے ہیں، سوئڈش اکاڈمی اور میرے نوٹیل ادب کے لیے جو امن کی کفالت کرتے ہیں اور دنیا کے ان تمام افراد کے لیے جو امن کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کو مشترک کرتے ہیں۔ میں امن کے لیے بھی ایک جام تجویز کرتا ہوں۔

خطبہ

اخلاقی قسے کی تعریف کا بیان

اکا وی کے محترم ارکان

میرے عزیز دوست و مرہبی Pio Baroja نے، جنہیں نوبل انعام نہیں ملا، اس لیے کہ اسکا کہانی کی غیر روشنی میں شہرت دار پر نہیں پڑا کرتی، اپنی دیوار پر ایک گھڑی آویزاں کر رکھی تھی۔ گھڑی کے چہرے کے چاروں طرف روشن خیالی کے الفاظ تحریر تھے۔ ایک قول جس پر گھڑی کی سوئی کے پہنچنے ہی آپ کے ہاتھ کانپنے لگیں گے۔ یہ تھا کہ ”ہر گھنٹا غمی مٹتا ہے۔“ آخری منٹا قتل کر دیتا ہے۔“ اس گھڑی کی سوئیوں نے، جو کبھی الٹی نہیں چلتیں، میرے دل و دماغ میں بہت سی گھنٹیں بجاتی ہیں، اور آج ایک قدم اپنی طویل عمر میں رملی نل اور دیرا مستحق کی میدان میں رکھے ہوئے، میں آپ کے پاس، خیر مکان کے جذبے کے ساتھ آج ویں دماغ کی بابت، چند باتیں کہنے کے لیے آیا ہوں۔

میں صحیح طور پر نہیں جانتا کہ ان کس مرحلے پر یہ حبابے کی دلیلیا پار مٹا ہے۔

اور Don Francisco de Quevedo کے الفاظ میں ہم سب بدعابے کی پکی عمر تک زندہ رہتا چاہتے ہیں مگر ہم میں سے کوئی بھی یہ قہر کرنے کو تیار نہیں ہوتا کہ ہم اس منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ ہر حال کوئی بھی حقیقت سے آنکھیں نہیں چھوڑا سکتا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آگے بڑھنے والے وقت تو روکا نہیں جاسکتا۔ اس لیے میں بغیر الہام یا کسی بدحظی کے، کہ میں ان دونوں طریقوں کو پسند نہیں کرتا، وہی کہوں گا جو میں اس وقت کہنا چاہتا ہوں۔

اپنے آپ کو آج اس جگہ پا کر اور اس شرفیابی سے آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے، جہاں پہنچتا تھا مشکل ہوتا ہے، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کہیں الفاظ جو— یعنی میرے الفاظ چھک دکھائے میری مسئلہ اہیت کے باب میں آپ کی آنکھیں تو خیر نہیں کر دیں ہیں۔ ہر کوئی زبان میں نکھتا کچھ مشکل نہیں، ہر کوئی زبان خداؤں کی طرف سے دیو گیا تھا ہے جسے ہم ہر کوئی اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اس لیے میں اس خیال سے سکون محسوس کر رہا ہوں کہ آپ نے اس عالی مرتبت زبان کو فرج شمسین پیش کرنا چاہا ہے، نہ کہ اس حقیر و صبا کی جو ہر قسم کے ٹکڑا کھار کے لیے اس کو مستمال کرتا ہے، خوشی کے لیے، نئی نوٹ انسان کی دانش کے لیے، اس لیے کہ وہ فن کے اعلیٰ کا ذریعہ ہوتا ہے، اگرچہ بغیر کسی لحاظ کے نکھتا جاتا ہے، مگر صرف کسی مخصوص وقت اور مخصوص جگہ کی بے نیون و ممانوں سرگشتی پر بھیون ضرور دیتا ہے۔

میں خلوت سے لکھتا ہوں اور خلوت ہی سے کچھ کرتا ہوں۔ Mateo Alemán اپنی تخلیق Cuzmán de Alfarache میں اور فرانسس شکسپیر خلوت کے بارے میں اپنے مضمون میں (دونوں کم و بیش ایک ہی وقت میں لکھ رہے تھے) کہتے ہیں کہ جو انسان خلوت کی خواہش کرتا ہے اس میں کوہنہ اور عیوان دونوں پیشہ ہوتے ہیں۔ مگر میں نے خلوت کی خواہش نہیں کی ہے، اس کو پیدا ہے۔ اور اپنی خلوت ہی سے میں سوچتا ہوں، کام کرتا ہوں اور زندہ رہتا ہوں، اور میری خیال ہے کہ میں ایک انتہائی دل چسپی اور قناعت کے ساتھ بولتا اور لکھتا ہوں۔ میں اپنی حقوق میں ہر وقت پاسو (ایک اور جریدہ دوست اور مرید) کے بیان کیے ہوئے اصول کو مد نظر رکھتا ہوں کہ بڑی خلوت کے بغیر حق پایہ دار فنی تخلیق وجود میں نہیں آسکتی۔ اپنی زندگی کے دوران میں اپنے فلسفہ بونے کا مظاہرہ کرتا رہتا ہوں مگر بغیر کسی شرمندگی کے میں خلوت کی بات بھی کر سکتا ہوں اور اس کے لیے شرمگزار بھی ہو سکتا ہوں خواہ وہ کتنی ہی تکلیف دہ ایس نہ ہو۔

کسی انسان کے لیے سب سے بڑا انعام یہاں تک ہوتا ہے کہ وہ سوچ سکتا ہے اور سمجھ میں آئے وہی آوارہ ناکاں لکھتا ہے۔ اور ایسے ہی قدامت گار سکتا ہے جو چیزیں کہ واقعات کو اور جذبات کو بیان کر سکتے ہیں۔ انسان کی حریف سب سے ہوئے فلسفیوں نے رات دن انداز میں close genus کے معیار کی طریقہ کو مستعمل کیا ہے اور مخصوص فرق کے لیے ہر سہ حیوانی حوالے اور تنازعہ بیان کیا ہے۔ ارسطو کی zoon potikon سے لیکر res cogitans تک انسان کو وسطے سے مختلف ظاہر کرنے کے لیے ایسے حوالے ضروری تھے۔ مگر جو کچھ میں کہنے چاہتا ہوں بہت سے تخلیقات کے فلسفی اس کو چیلنج کریں گے۔ میرا کہنا ہے کہ ایسے بے شمار ثبوت حاصل کرنے مشکل نہیں ہوں گے کہ نہایت انسان کی فطرت کا ایک مقیم ثبوت ہے، جس کے ذریعے، اچھا ہو یا برا، ہم انسان اور حیوان میں تفریق کر سکتے ہیں۔

ہم ابھرے جانوروں سے مختلف ہیں، اور چاروں کے بعد پتا چلتا ہے کہ ہم ان کی کے ارتقا سے وجود میں آئے ہیں۔ لہذا، زبان کا ارتقا ایک حیوانی حقیقت ہے، ہم جس سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔

میں لوٹ انسان کا نامی ارتقا ایک ارتقا کا عمل ہے جس میں وہ ارتقا جو آواز پیدا کرتے ہیں یا ان کو بھیج سکتے ہیں، اور دماغ جو ان کو زور سے مطلب خدا کرتا ہے ایک طویل عرصے میں ارتقا پذیر ہوتے ہیں جس میں انسان کی تخلیق اول بھی شامل ہوتی ہے۔ یہاں کے بعد کے مظاہرہ El Cantar de Mio Cid اور Quixote اور نہ کلیہ مقدمہ (Quantum Theory) اہمیت کے، تیسرے کئی تخلیق سے قائل کر سکتے ہیں کہ بنیادی شیا کوانٹم کے نام سے جانیے جاتے ہیں۔ بہر حال میں اس مقام پر زبان کے ارتقا کو مدد دینا کے بارے میں بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ بچائے اس کے ان لوگوں کا ذکر کرنا چاہوں گا جو ایسے مواقع میں پید ہوئے تھے جو روایت کے اعتبار سے روایت کے مقابلے میں اولیٰ نیا تھے۔

A. S. Diamond جیسے مشہور ماہر طبیعیات کا خیال ہے کہ تمام زبانوں کی تاریخ ایک ہی قسم کے نمونے پر چلتی ہے جس میں ابتدا میں جسے بالکل حیوانی اور ابتدائی اہمیت کے ہوتے ہیں، بعد میں نیا

قواعد اور معیاتی آثار چڑھانے کے اعتبار سے گنجلک ہوتے چھ جاتے ہیں۔ تاریخی ترقی پذیر میلانی سے امر ن کو extrapolate کیا جائے وہ یہ بات رہی اخذ کیا جاسکتا ہے مرتبہ حتی ہوتی دیکھتی ابتدائی درجے کی سے رہتا پذیر ہوتی جاتی ہے جہاں گنگو کے طریقے بنیادی طور پر فعل (verb) پر مبنی رکھتے ہوتے موجودہ کیفیت میں آجاتے ہیں ورنہ میں اسم (noun)، صفت اور (adverbs) شامل ہوتے جاتے ہیں جن سے جملوں کو گہرائی اور مخصوص خوش ہوتی ہے۔ اگر یہ کلیہ صحیح ہے تو روبرو اس پر تحلیل کا تصور اس اطلاق کریں تو ہمیں نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ استعمال ہونے والا سب پر لٹکا اپنے سب سے ضروری و فوری tense میں ایک فعل (verb) تھا، یعنی امرانہ تھا۔

اور بدشہر امرانہ انما زاب بھی رمل و رماں میں فاعلی امیت رکھتا ہے۔ استعمال میں یہ tense مشکل ہوتا ہے۔ اس کو حقیقت سے منہ جانا چاہیے اس لیے کہ اس کے لیے خاصے تفصیلی اصولوں کی ضرورت ہوتی ہے جو مونا سید سے مدد نہیں ہوتے۔ بعد کے طریقے سے مستعار کیا ہو امرانہ جملہ مطلوبہ مقدمہ کے بالکل مخالف مقصد پر آمد کرتا ہے۔ John Langshaw Austin کا مشہور مشہور امرانہ boundary locutionary and perlocutionary language ایک جملہ فاعلی مظار ہے اس لیے کہ اس کے لیے جو بنیادی گنگو میں حصہ بننے والے کو ایک فاعلی دے پر آگیا۔ بعد فاعلی حکم چاروں کر مفعول ہوتا ہے، یہ معلوم ہو کر جس کو مخاطب کہا جا رہا ہو، اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کہے گا۔

لہذا، zoon polakon سے res cograns تک کافی امتیازات وضع کیے گئے ہیں، ایک وحشی کے درمیان، جو گھاس چبا رہا ہے اور ایک انسان جو گانا ہے اگر چہ گانا ہمیشہ قاعدہ سے قریب سے مینڈ گن میں نہیں ہوتا۔

اندھون کے مکالموں میں جوں کے نام سے مشہور ہیں، Cratylus, Heraclitus کو اپنے شو کے کے گھر میں چھپا لیتا ہے۔ فلسفی Democritus اپنے ہم غن کی معرفت سے سرین کی اور خدا کے تصور پر بات کرتا ہے۔ جیومیٹری کے ناظم Protagoras کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے جو گستاخی سے یہ کہنے پر معرقت کر انسان تمام اشیا کا یہ نہ ہے وہ کیا ہیں اور کیسے ہیں، وہ کیا ہیں اور کیسے نہیں ہیں۔

Cratylus نیاں کے معاملے میں دس ہتھی لے رہا تھا، یہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ اور اس نے Hermogenes سے اپنی گنگو کے دوران ان کی خیل ت کو وسعت دی تھی۔ Cratylus کا خیال تھا کہ اشیا جن ناموں سے موسوم ہوتی ہیں انھیں سے ان کا ایک رشتہ ہوتا ہے۔ اشیا پیدا ہوتی ہیں، تخلیق کی جاتی ہیں، ایجاد ہوتی ہیں یا دریافت ہوتی ہیں۔ اپنی ابتدا ان سے، نہ پتہ، ان کے وجود میں پہلے کے وقت کا عین ہوتا ہے جس سے ان کی شناخت ہوتی ہے اور دوسری اشیا کے مقابلے میں نئی پیدا ہوتا ہے۔ وہ ہمیں یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ اشیا ز انفرادی ہوتے ہیں اور ان ہی سے یہ تہہ ہوتا جس سے شروع ہونے پیدا ہوتی ہے۔ سوائے ماہر علم صرف کی منتقل دیا کہ، ایک شخص ہر قدیم زبان میں ہمیشہ کٹھالی رہا ہے اور بہت سی دن

ہے، جب محسوس کی گئی، محبت ہی رہی ہے۔ Heracles کے مقررہ نبیوں کے مقابلے میں Cratylus کے خیالات میں قیودِ محال کی حدیں ہیں جو وحدت کی ناقابلِ تقسیم خرویدیت میں، ان کی ہم آہنگی (دن اور رات) میں مستقل حرکت میں دوران کے دائرے کی دوبارہ توثیق میں پیشہ ہیں۔ الحاق کے معاملے میں بھی وہی صورت ہے جو اشیاء میں ہوتی ہے جیسے کہ پانی کے بخیر کسے کی اور محبت کے بخیر غرت کی۔

اس کے برعکس Hermogenes کا خیال تھا کہ الحاق دوسروں کو کسی معنوں حد تک سمجھنے کے لیے محض روانہ ہوتے ہیں جن انسان تخلیق کرتے ہیں۔ انسان کا شیوا سے ساتھ پڑتا ہے یا اشیاء اس کو باقاعدہ پیش کی جاتی ہیں۔ کئی نئی اور بے نام شے کے سامنے آنے سے انسان اس کو ایک نام دے دیتا ہے۔ اشیاء کی اہمیت کثرت میں اس پر محسوس نہیں ہوتی مگر جس کائنات نے پیوست کیا ہو۔ احساس کی اور حس کی تخلیق سرحدیں، جیسا کہ Hermogenes نے پیش کی ہیں اور Democritus اور کثیر اوقات میں Protagoras نے چھپائی ہیں، باہر راہنہ رہتی ہیں: کیا وہ انسان جہاں سے شیوا کو مانا جاتا ہے اور متعین آتا ہے جیسا کہ ہے یا غریبی؟ کیا ان اشیاء کی ماپ محض ایک ہی تصور ہے؟ کیا اشیاء صرف طبعی مادہ ہوتی ہیں یا یہ کہ وہ بھی کسی قسم کا احساس اور تصور ہوتی ہیں؟ وجود کو سب اب کی حد تک کم کرتے ہوئے Hermogenes سچائی کو شمار سے ہی میں مانا دیتا ہے: اب حقائق نتیجہ کہ ممکنہ تجویز وہی ہوتی ہیں جو انسان خود اظہار کرتا ہے جو حقیقت کو جان کرئی میں کہ کیا صحیح ہے اور کیا صحیح نہیں ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ Victor Henry کا مشہور کتاب Apona شیوا نام دے سکتا ہے مگر وہ انھیں اپنی نہیں سکتا، وہ زبان کو بدل سکتے ہیں مگر اس کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل نہیں کر سکتے۔ ماسوں کو بہت زیادہ احتیاط کے ساتھ درستی تک لے جاتے ہوئے فداطون درستی کی پوزیشن سے بیڑھی میڑھی ہم درد کی کرنا نظر آتا ہے اشیاء کو انھیں ماسوں سے پکا جاتا ہے جن سے ان کو پکا جانا چاہیے (ایک organic اور معتبر نظریہ جو خالص احوال کے ساتھ تقسیم کیے جانے کے قریب ہو) نہ کہ اس نام سے پہچانی ہوئی ہوا کے کٹ کے مطابق جس کا ٹیسٹ انسان کرے۔

یہ رویہ جو ہند میں رومائیت و روم میں سیاسی شور و غل، عداوت، لاپرواہی شاعروں کے لیے ابتدائی نقطہ تھا، جس کا سربراہ Horace تھا۔ اس سے دو تمام مایاں پیدا ہوئیں جو اس سسٹم میں ہم پالی وقت سے اثر پذیر ہوئیں، اب تک ہندو جن کا عداوتیں کرسکتے ہیں۔ Ars Poetica نے ہند نمبر 70 سے 72 میں نمونہ کے ارتقا میں استعمال کی موجودگی کا رُک الا پ ہے (جو وہی اچھا ٹکڑوں نہیں ہوتا)۔

ٹیک نیتی میں بڑھتا ہوا جیسے گئے والے اس ماتم ہم میں کئی پیچیدہ خطیرے پیشہ تھے جو ہم کو کسی قیاس کی طرف سے چارہ تھے کہ زبان موام کی اصطلاح صرف موام کی تخلیق ہوتی ہے اور زبان کو چوکس اور معقول منطق کے سوالوں کے شکار میں کسا جاتا ہے حصول عمل ہوتا ہے۔ Horace کے اس فطرتاً کہ اسے ارے کو استعمال ہی اس امر کا حاطہ کرتا ہے کہ زبان میں کیا صحیح اور قابل قبول ہے، ضرورت سے زیادہ نفسیات کا ایک ڈھیر پیدا کر رہا ہے جس میں حقیقی عقلی ذیلی گلیاں ایسی شمار ہوں گی جو چھپ چکی ہیں پر کالک پڑتی ہوتی

تہ ہو میں انسان، زبان کے بجز بچا لیتے ہوئے پر تم بچا لے، اور کھڑے ہوئے مگر بچہ آگے بڑھتا رہا ہے۔

جب کہ Horace نزدیک طور پر سمجھتا تھا (اور میں اس سے متاثر نہیں ہوا چاہیے) اور بہت سے معنوں میں غلط بھی تھا اور میں اس کو چھپا کر بھی نہیں چاہیے۔ مگر میں اس کے قلم کردہ اصولوں کی قرآنی قرآنی کے ساتھ Craylus و Hermogenes کے خلاف کا متناقض بھی تھا چاہیے۔ Craylus کا مقام اور عمل فطری، عمومی اور عام طور پر ہونے والے زبان میں بننا ہے، جو تاریخی اور نفسیاتی مابین میں مستقل استعمال سے وجود میں آتی ہے، جب کہ Hermogenes کا مقام اس حصے میں ملتا ہے جسے ہم معنوی یا مخصوص زبان یا اس چال سمجھتے ہیں، کم و بیش، جو تقریباً ایک بات کا تعلق ہے۔ یہ اس کا مقصد بنیادی منطق پر استوار ہوتی ہے، مگر اس کے پیچھے ہونے والی تاریخی و نفسیاتی حمایت نہیں ہوتی، کم از کم اس وقت جب اس کی بنیادی ابتدا ہو رہی ہوتی ہے۔ Hermogenes کے درجے کا پہلا مشہور اور جدید ٹریٹس Tractatus کا مصنف، لیکن نہیں تھا۔ چنانچہ ان معنوں میں Craylian زبان کا، یہ فطری یا انسانی زبان کا، اور Hermogenean زبان کا یہ معنوی یا parahuman زبان کا تذکرہ غیر منطقی نہیں ہوگا۔ Horace کی طرح، ظاہر سے کہ میرا نقطہ حوالہ، بغیر کسی گنتیوں کے مذہب کے مذہب کی زبان ہوگی۔ جب Max Scheler یا اس کے طرف دار Craylian زبان کی بات کرتے ہیں تو زبان سے ان کی مراد اشارہ ہے۔ عدت، یا کبیر رہتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے کہ Karl Buhler زبان کے تین عوامل کا امتداد، اشارہ اور نشان کی ترتیب کرتا ہے۔

یہ کہنا کچھ ضروری نہیں کہ Hermogenean زبان فطری طور پر اپنی ابتدائی خصوصیت کو چھوڑتی ہے۔ اس کے برعکس Craylian زبان ان خامی علاقوں کو نہیں چھوڑتی جس میں کثیر ہوتی ہے، جو اس کی باہری شفافیت کے لیے اجنبی ہوتے ہیں۔

یہ تسمیہ کر لینا خطرے سے خالی نہیں کہ آخری تجربے میں فطری Craylian زبان عوام اور اتفاق کے درمیان ایک چارہ کی روداد کی ولادت لیتی ہے۔ چونکہ عوام زبان کی تخلیق نہیں کرتے، وہ اس کے رقا کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ہم کچھ شرمندہ کے ساتھ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ عوام شیا کو نام دینے کے ذریعے کافی حد تک زبان کی گتھیں کو سمجھاتے ہیں، مگر اس کو وہی بنانے کے لیے اس میں بلاشبہ بھی کرتے ہیں۔ اگر عوام خطرات سے متعلق نہ ہوتے، جن کا پسے ذکر کیا جا چکا ہے تو یہ مسئلہ اور بھی ضروری اور فحش ہو جاتا۔ جو کچھ کہا نہیں جا رہا ہے، اگرچہ اس مسئلے کے قلب میں پوشیدہ ہے، وہی ہے اور طے شدہ ہے، اور نہ میں نہ کوئی اور اس کو بدل سکتا ہے۔

Craylian زبان اور فنیٹیک کی سولیر کا بتایا ہوا اس کا اوجھنا اور فنیٹیک، جس کو langue کا نام دیا گیا ہے، ساتھ کی مشترکہ زبان ہے، ادیبوں نے اس کی تفکیر اور تشہیق کی ہے جس کو اکاون کے فرد نے بات کا وہ درست کیا اور اس کی مست بندی کی ہے۔ یہ تین شعبے — ساتھ، وہب اور اکا دیال اپنی قے

دامیاں ہمیشہ پوری نہیں کھرتے۔ اکثر و بیشتر دوسرے علاقوں میں دراندازی کرتے اور ان کے کام میں دخل دیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے گویا، شکار میں، شکاریوں اور نہ ساق اپنے کردار سے مطمئن ہوتا ہے۔ مستعدی اور یقین کے نقصان کے باعث دوسرے کے کردار کا تعین کرنے کو ترجیح دیتے ہیں جو اصولی طور پر صحیح ہونے کے باوجود ہمیشہ عجیب اور غیر معین ہوتے ہیں۔ اس پر مزید خرابی یہ ہوتی ہے کہ اصل مضمون منتشر اور جھٹکا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی زبان اور فعل ضروری طور پر متضاد ہونے چاہئیں۔ جیسے 'اوم سونو' (انیسویں صدی کے سپہ نئی دہلی۔ مترجم) کی محبت و رعبہم اطفال میں شامل لٹریٹری نقادش اور آئے، کا مادہ ہونے کے علاوہ جن کی کوئی قیمت نہیں۔

آخری فیصلہ کرنے والا عنصر یعنی مباحثہ جو نہ ساق ہے اور نہ ادیب، شاکاوی، مشروط کرتی ہے اور ہر طرح پر بند کر دیتا ہے، ہزار طریقوں سے مداخلت کرتی ہے (انتظامی جیسے بازی، تکنیکی علامات، ٹیبل و ڈیٹا وغیرہ) امتیاز کے بجائے خراب مثالوں سے، بد نظمی، اشتباہ و درکی و برکی، افسانہ نثری سے حالات کو بگاڑتی ہے۔

مگر یہی بھی موم بیست و دہائی، انیسویں اور دہائی مباحثوں کے بارے میں زبان نہیں کھلتا۔ زبان اپنے آپ کو شورو مچی نہیں دیتی، جو اصولی طور پر صحیح ہونا چاہیے، مگر اس کے واسطے کے طرف کی قوتیں مجبور کرتی ہیں۔

بالآخر ویرود جس کو Horace کی طریق سے بتائی جاتی ہیں شیون سراپتا کراہی طرح زبان کو ترقی کرنا چاہیے اور اپنے اندر جسے طریقہ تحریر و ادب کو شکست دینے کی کوشش کرتی ہے جیسے جو تا الہامی ہوتے ہیں اور تان کے لاشعور کی پیداوار ہوتے ہیں، جو کم از کم کچھ نہ کچھ مدتی و معتدیت پیدا کریں گے۔ مگر کچھ جان بوجھ کر اور شعور کی طور پر ایجاد کیے گئے، یا غلط وقت پر اور عام سمجھ بوجھ کے خوف و رعب سے چلتے ہیں۔

لکھنے والے، ظاہر ہے کہ اس میں سب شامل نہیں، اپنے ماحول میں، اکثر ناقص طریقہ استعمال دہاتے ہیں اور ایسے سلیوب شروع کرتے، رقومیں مانتے کرتے ہیں جو نہایت مشکل ہوتے ہیں اور سب سے خراب بات یہ ہوتی ہے کہ وہ زبان کی لازمی روح سے علاحدہ ہوتے ہیں۔

اکادمیوں کے مسائل ان بتا دیوں سے پیدا ہوتے ہیں جن پر وہ کام کرتی ہیں: اداروں کی حیثیت میں دو قدر امت پسند اور چلتی کیے جانے سے خوف زدہ ہوتی ہیں۔

Hermogenean اثرات سے Cranyan زبان کی کم زوری کا عمل اور بھی بڑھتا جا رہا ہے اور خطرہ ہے کہ یہ زندہ زبان کی چیزیں بھڑکنا اس کے اور فطری زبان کو معنوی بنادیں گے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، یہ خطرہ ہے ایجاد شدہ خواہ مخواہ تیار کی ہوئی، مادیات طریقے سے پھر سے زندہ کی ہوئی یا تازہ قوت دی ہوئی نہ ہونے سے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس قوت محرکہ کے پیچھے کوئی سیاسی وجہ ہے جو فحشی خوشی ان لوگوں کی دنیا کے خوف نہت کو اپنے اصولوں سے دست کشی پر توڑ کر رہی ہے جو اس کا کامرہ کیے ہوئے ہیں۔ میرے نزدیک انسانی فوٹو کے مقابلے میں خطرات نہ ہوتی ہیں۔ جو کسی حد تک پورا پوری ہیں۔ جو مظلوم مستقبل میں

کسی وقت پیش آسکتے ہیں۔ اگرچہ میں باریک بینی کا قائل نہیں، میں پہلے لکھنے والوں سے، اور پھر ان کا دیوں اور ملستوں سے ترش کرنا چاہوں گا کہ وہ اس بے ترتیبی کا سہارا نہ لیں۔ بلاشبہ زبان میں ایک تسلسل ہونا ہے جو ان درجہ بندوں کی فہم کو کٹا ہے جو ہم زبان پر مقرر کرنا چاہتے ہیں، مگر جو زبان کی فطری حدود کو مسہر کرنے کا جواز نہیں دیتی۔ اگر ہم اس کی اجازت دیں گے تو ہم اس شکست کو تسلیم کریں گے جو ابھی تک جوتی نہیں ہے۔

آئیے، ہم اپنے فلسفے کو زبان سے دفاع کی خاطر متنبہ کریں، تمام زبانوں کے لیے، اور ہمیں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ قانون کی باوقی کے ساتھ ہم ہمیشہ دیکھنے والے طریقے کار۔ یعنی قانون کی روح کے بجائے اس کی تحریر پر زور دیتے۔ ہمیشہ انصافی پر متوجہ ہوتے ہیں جو بے ترتیبی کا ضیق بھی اور نتیجہ بھی ہوتے ہیں۔ خیال سلا زبان سے ٹکرا ہوتا ہے۔ مزدوری بھی، غلطی، غلطی میں سادہ بینی اور تصوراتی غلطیوں سے منسلک ہوتی ہے۔ دوسری چیزیں میں مل کر تمام انسانی کوششوں کو ایک وسیع دائرہ میں گناتے ہیں۔ ان کوششوں کے لیے جو انسانیت کی حدود کو پہنچانے کی سعی کرتی ہیں، اور ان کے لیے بھی جو انسان کی حیثیت کی جڑیں کاٹنا چاہتی ہیں۔ خیال آزادانہ اور آزادانہ کے بدعاش مخالفین، زبانوں کے انہماک میں پٹی جاتی ہے۔

مگر یہ قہم لیا ورتی کی ضرورت کو دھندلا دیتی ہے، اگر ہم اس نتیجے پر پہنچنا چاہتے ہیں کہ ہمیں کیا سوچنا چاہیے اور کس طرح آزاد رہنا چاہیے۔ جہاں تک کہ ہم ان phenomena کی نشان دہی کر سکتے ہیں جو ہم سے فیض میں نچرتے رہتے ہیں، انسان کی آزادی کے لیے سوچنے کا مطلب ہوتا ہے آزادی کے لیے سوچنا۔ اس بارے میں کہ یہ آزاد کی مستحکم ہے یہ صرف انسانی ذہن کا پیدا کیا ہو ہکا پھکا phenomenon ہے، بہت ہمیش ہو چکی ہیں۔ مگر غالباً ایسی بحث تصدیق اوقات ہوتی ہے۔ ایک پیچیدہ پس منظر فلسفہ کا کہنا ہے کہ سراب اور حقیقی آزادی کا تصور دونوں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ اگر انسان آزاد نہیں ہے، اگر وہ پیچیدگیوں میں جکڑا ہوا ہے جنہیں نفسیات، حیاتیات، سماجیات اور تاریخی پیچیدگیاں چاہتی ہیں، نہ ان ہونے کے واسطے جس کا خیال اس میں خود بھی ہوتا ہے، جو ایک سراب بھی ہو سکتا ہے، مگر جو مطلق کائناتی ہونا ہے، تو وہ آزاد ہے۔ اور اگر ہم آزادی کی خوشی رکھتے ہیں تو ہم اپنی دنیا کو تقریباً انہی خطوط پر ترتیب دیں گے جس طرح کہ اس وقت جب ہم آزاد ہوں گے۔

یہ تعمیراتی بحث جس پر ہم نے کلابانی سے اپنے سانچے کا ڈھانچا تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے انسان کی آزادی کے بنیادی اصول کا حامل ہے اور ایسی اصول کی روشنی میں ہم شخصیتوں کی قدر کرتے ہیں، ان کو بلند کرتے ہیں، بدنام کرتے ہیں، سرزد کرتے ہیں اور برداشت کرتے ہیں، اور خود کو ان کا بالہ ہی وہ جذبہ ہے جو ہمارے اخلاقی قواعد، سیاسی اصولوں میں محفوظ رہتا ہے۔

ہم ابھی طرح جانتے ہیں کہ ہم سوچتے ہیں، ہم سوچتے ہیں اس لیے کہ ہم آزاد ہیں۔ خیال اور

آزادی کے درمیان کا رابطہ ایسا ہی ہے جیسے ایک پھٹی خود اپنی ذمہ کو بکترری ہو یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ پھٹی اپنی ذمہ کو پکڑنا چاہتی ہو، اس لیے کہ آزاد ہونا ایک ہمہ راست نتیجہ بھی ہوتا ہے اور خیال کے لیے ضروری شرط بھی۔ خیال کے ذریعے آدمی اپنے آپ کو انہیں نظریات سے جس قدر چاہے منہ کر سکتا ہے ان قوانین کو قبول اور ان کے آگے سرختم کر سکتا ہے، اسے ماہر کیمیا کی طرح جو phlogiston (وہ نظریہ کہ جب آتش سے جلتی ہے تو اس میں سے ایک مادہ نکلتا ہے جس کا نام فلی رگٹ ہوتا ہے، نہ مٹتا، نہ بڑھتا، نہ بڑھتا، نہ مٹتا) نظریہ کی حدوں کو چھو گئے یا پھر اپنی کامیابیوں اور اپنی نیک مانی توانائی کو قبولیت اور طاعت پر محمول کرنا ہو۔ اس کے باوجود خیال میں مستقل یا مستقل کی حدیں منقطع کی عظمت سے متعلق ہوتی ہیں، اس لیے کہ آدمی صرف حقیقی و ممکن کی حد میں رہ کر نہیں سوچتا۔ بلکہ خود اپنی بندشوں یا چوڑیوں کو بڑیوں نگاہوں میں تبدیل کرنے کے بعد بھی ان کو بالکل دوسری شے میں مرقب کر سکتا ہے۔

اس طرح ان تجزیاتی یا تجزیاتی اصولوں کی بنیاد پر جتنی قسم کی آپ چاہیں، سوچنے کی آزادی کے وعدے کی بنیاد پر، دنیا کی عقلی تشریح کی جاسکتی ہے۔ معنی کے اس شخص کے میں اور دوسرے تجزیاتی یا تجزیاتی دنیا کی ضد ہوتی ہے اور قصوں میں جگہ پاتی ہے اس طرح انسانی دماغ میں قہر گھڑنے کی قابیلیت تیسرا عنصر ہوتی ہے۔ دوسرے دو عناصر خیال اور آزادی ہوتے ہیں۔ اور یہ قابیلیت چیزوں کو اس انداز میں بدل سکتی ہے کہ قصوں کا حصہ بننے سے قبل، جن کو غلط ہوتی تک نہیں کہا جاسکتا تھا، صحیح بن جاتی ہیں۔

خیال کے عمل کے ذریعے آدمی دنیا کی فطرت سے نیا دنیا فٹ کرنے لگتا ہے، اس طرح کہ وہ قصوں کے ذریعے اپنی الگ دنیا بنانے کا مادہ کر سکتا ہے۔ گویا، سچائی، خیال، آزادی اور قدرت میں، ایک پیچیدہ اور کبھی کبھی مشتبہ رشتوں کے ذریعے، مربوط ہوتے ہیں۔ یہ یہی انداز ہے جسے اس نے اس طرح ہوتے ہیں جس میں بہت سے سوڑ آتے ہیں جو غلط سمت میں لے جاتے ہیں۔ ایک بھول بھلیوں میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو مگر خطرہ ہی، کسی ہمہ گیر شریعت کا سب سے مستحسن بہانہ ہوتا ہے۔

قدر و رسائی سچی فی خیال کا پتہ نہیں ہوتے یہ مختلف المانوں میں ہوتے ہیں جن کا آپس میں تقابل نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ دونوں اپنے مختلف قوانین اور مختلف کے تابع ہوتے ہیں۔ البتہ، یہ مناسب نہیں کہ انسان کے دماغ کو آزاد کرنے کی جدوجہد میں ادب کے معیار کی چکاچوند دکھائی جائے، بلکہ ادب کو سائنس کی نوید یافتہ علامت کا طاق کا متبادل اہل ان ہونا چاہیے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ میرے نزدیک ادب اور سائنس کے ان پیکروں کے درمیان کا تعلق اور جملہ طریقہ اپنا نہ جانا چاہیے جو آپس میں مل کر انسان کو اس کی حمت حدوں میں محدود کر دینا چاہتے ہیں جو ہر قسم کی آزادی کے خیال کی نفی کرتی ہیں، اور یہ بھی کہ ہمیں بڑھ کر سائنس اور ادبی تجربہ کی حد سے ان پیکروں کو متوازن کرنا چاہیے جو امید کے لیے خطرہ ہو سکتے ہوں۔ بجائے اس کے کہ ان سچائیوں پر غور کیا جائے جو قوانین کے مستند میں عمل کرتی ہیں، بلکہ کامیابی انسانی آزادی اور عظمت کی بڑی پرہیزگار رہا، بات کی حد مت ہوگا کہ ہم نے ذوق کی ہے۔

بذات خود یہ کافی نہیں سائر ہم نے کچھ سیکھا ہے تو اتنا کہ مائیں^۱ زوئی کی^۲ زوئیوں کو، جب پھیرانے کی عمدت نہیں رکھتی بلکہ اس کے بدفکری میں کچھ نہیں پرہیز ماکرتی ہے جو اس کو بالکل مخالف سمت میں بھٹکا دیتی ہیں۔ مائیں کی بنیاد انسانی آزادی اور خواہشات کی اہم ضرورتوں پر مبنی چاہیے۔ یہی ایک طریقہ ہوتا ہے جو مائیں کا افادیت ہندوئی سے مشابہتوں میں ملتا ہے جو مقہور اور اندازوں کے بدھے گروہوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ مسئلہ اس ضرورت کا احساس دلاتی ہے کہ ہمیں اس بات کا ادراک ہونا چاہیے کہ ادب اور مائیں اگرچہ پھیر چلی ہیں مگر یہ مانسوارا مائیں کی مائیں میں ایک دوسرے سے لائق نہیں رہ سکتے جو اثرات کی علاقوں کی حد بندی کرتے ہیں اور ان کو جذبات کی مظاہرہ زبان کی حیثیت اور ساتھ ہی ساتھ اس کی حدوں میں احتیاز بھی کرتے ہیں (بنیادی دنیا میں خیالات کے جن کے درمیان کچھ قابل تعریف ہیں اور کچھ ایسے کہ ہر طرف سے ان پر لعن طعن ہونا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ادب جسے تخلیق کرنے کے اوزار کی حیثیت سے دو متونوں پر قائم ہے جو اس کو طاقت فراہم کرتے ہیں، یہ یقین دلانے کے لیے کہ ادبی کوششیں کارآمد ہوتی ہیں۔ ان کا پہلا متون ہے جو الیہ، جو شرط عائد کرتی ہے کہ مضمون، نظم، ڈرامے یا کاسیڈی کا ایک سچا معیار قائم رکھا جائے جو اس کے اونچے اور نچلے درجے کی ادبی دنیا کے درمیان تیز کرے، جو اس تخلیق سے جو قابل کے جذبات کے ساتھ قدم ملا کر چل نہیں سکتی۔ تجربے کرنے والی اشتراکی حقیقت سے بے شمار تضادات ہیں، جب بھی بحالی کی ملا حیت کمزور پڑتی ہے، نچلے درجے کا ادب تفکروں کی ایک رنگ و عاریہ مناجات میں جاتا ہے جو قابل قدر تصور تخلیق کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

دوسرا متون جس پر ادبی کوشش اٹھا رہی ہے وہ ہے اخلاقیات، جو حلیات کی نیکیاں کرتی ہے جو خیالات اور آزادی کے معاملے میں بہت کچھ کر سکتی ہے، جس کے بارے میں سب کچھ بہت کچھ ہوا چکا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدو قیوت اور جن بات، انہی طرح بھی ایک جیسے نہیں، نہ ہی دونوں کی ایک جیسے نثر ہوتی ہے۔ ادب صرف جن بات پر انھما رگڑ کے خود کوئی کی غیر تعلیمی کیفیت میں متوازن رہ سکتا ہے۔ فن کی خاطر۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے بعد خدو قیوت حوالے سے جمالیات زیادہ محیط تصور ہو۔ ہم اب بھی تو صیقل کر سکتے ہیں ہومر کے اشیاء کی اور قرون وسطیٰ کے مذہبی بچوں کی مگر چہم بھول گئے ہوں گے کہ ان کے علاقائی روایات کی کریوں ہم قدیم چٹائی شہزادوں یا جاکہ نامہ پورپ سے و نہیں سکتے۔ پھر بھی، فن بدلے فن ایک نہایت مشکل منصوبہ ہوتا ہے جس میں ہمیشہ یہ خطرہ ہوتا ہے کہ اس کو جن مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہو وہی اس کے حقیقی معنی کو مسخ کر دیتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اخلاقی اصولی وہ عنصر ہے جو کسی ادبی تخلیق کو قسے کی تخلیق میں ایک عاقی طرف گروہا رافا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ مگر میں یہ بھی صاف طور پر واضح کر دیتا چاہتا ہوں کہ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ اس سے کہ ادبی قصہ ایک کڑی کی صورت میں کی سوچنے کی صلاحیت اور آزادی کے

یونانی تصور کے درمیان کسی قسم کی اخلاقی پابندی کو جنم نہیں دے سکتا۔ میری سمجھ کے مطابق ایک دینی شخص صرف کسی فرد، معنک یا اس کے اپنے تصور آزادی کی اخلاقی پابندی کے تابع ہو سکتی ہے۔ بد شیعہ کوئی بھی، چاہے کترین اور نہایت متوازن معنک بھی اس انسانیت کو محبوب نہیں کر سکتا۔ اگرچہ کسی کو یہاں خطرہ آئے، مگر آزادی ایک بہم تصور ہو سکتی ہے جو اس کے نام پر بہت سی مذمت چند غلطیوں کی جاسکتی ہیں۔ بھالیاتی جسمانی دیکھ سکتوں سے اخلاقیات کی جاسکتی۔ لہذا، ایک ادبی قلم کا خدائی جس پر اور تعلیمات پر ہر دق کو بنیاد پر ہونا چاہیے۔ صرف اس طرح اس کو وہ اہمیت نصیب ہو سکتی ہے جو نہایت کم عمر فیشن یا پویشٹان کو تو صلیف کی سطح سے جہد ہو سکتا ہے، جو بہت جلد برباد ہو سکتا ہے۔ آدق کی تاریخ بدل رہی ہے اور غریب بھیڑ ہے۔ نتیجے کے طور پر اخلاقی اور بھالیاتی درک کی پیش بندی مشکل ہوتی ہے۔ پیسے بھی لکھنے والے ہیں جو اپنے وقت کے حواس سے اتنے ہم آہنگ ہوتے ہیں کہ وہ موجودہ بھالیاتی میدان کے ایک عظیم الشان نمائندے بن جاتے ہیں جن کا کام مشروط پٹو ہوتا ہے۔ جب کہ اور دگ آزادی اور انسانی موجودہ اندازے و ملامت سنبھال دیتے ہیں جن کی نہ احسان مندی اور نہ تعریف و تہ صلیف ہوتی ہے، اس کے باوجود کہ یہ ذمے دار ملامت ان کے کام نہیں آتی۔

یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے انسان کے سچے سے سروں میں ادب اپنا کردار کر سکتا ہے۔ اگر ہم اس مقالے میں کھل غور پر بھیج دیا جائے تو، اپنی کوشش کو بدلتی شخص کے سچے ادب کہا جاسکتا ہے۔ پھر بھی، انسانی حاج کو صرف ہم زادوں، صوفی اور مسیحیوں سے منسک نہیں کیا جاسکتا۔

آزادی کی تلاش کے اس فیصلے میں، قلم کو ادبی کہانی کی اندرونی ملامت کی جہتی پہچانی خصوصیت کا فائدہ ہوتا ہے۔ قلم کو ایسی کسی چیز کا ماتحت نہیں ہونا چاہیے جو اس کی وسعت پر قدغن کا نکتہ جیسے مذمت اور انتہی کا عنصر ہے، جس کے کسی دور پیکر کے مقابلے میں یہ بنا یونانی جھنڈا ہوا سکتا ہے۔ مثالیہ یہی وجہ ہے کہ یہی فلسفے کے سب سے زیادہ مشاقی مصنفین نے یونانی تھویری کی تہذیب کے لیے ادبی کہانوں کو استعمال کا ذریعہ بنایا ہے، جو فسانے کی مملکت کے ہر قابل قلم نہیں ہوتے، جب وہ کہتے جا رہے تھے۔ یونانیات کی یہی حد یہ نہیں ہوئی تھی۔ جن کو خاہر کر سکیں، اس لیے کہ اپنی فطرت کی بنا پر قلم خود بھی یونانی بنیاد پر لکھے جاتے ہیں۔

پھر بھی، ادبی اظہار کے فوائد اس سبوت تک محدود نہیں ہوتے جن کے ذریعے یونانی تھویری یونان کی جاسکیں۔ بھالیاتی اندرونی چلک، موقع محل کی ملامت، شخصیات اور واقعات کی اسل محدود بھی تیار کرتی ہے جس سے، پھر کسی ماہر جب خطرے کے، ایک چار کا رخ تیار کیا جاسکتا ہے، یا اگر ہم دوسری طرف سے اس کو بیان کرنا چاہیں تو، ایک کیس کی تجزیہ گاہ تیار ہو سکتی ہے جس میں ادبی انسانی رویے اور ممکن ترین کیفیت میں تجربات کرنے ہیں۔ مگر قصہ اپنے آپ کو یونانی اظہار تک محدود نہیں رکھتا۔ یہ احتیاط سے تجزیہ بھی کر سکتا ہے کہ اس کا مطلب کیا ہوتا ہے اور صد ہزار مختلف متبادل حالات میں، عقلی پیشین گوئی سے ان

مضمون تک جو حقیقی خیال پیدا کر سکتا ہے، اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

ایک تجزیاتی تجربہ گاہ کی حیثیت میں ادب کے کردار کو اکثر مائیکسوفونوں میں اچھڑایا گیا ہے۔ مستقبل کے بارے میں نکل جس کا بعد میں ادراک ہوا ہے، بھرنے نے ان ماول نگاروں پر تجربہ کے دو ٹوکے برسائے ہیں جو صداقت رکھتے ہیں۔ اپنے قصوں میں نیا دی اور عملی اجزاء ان پیشین گوئی کرنے کی، بعد میں جن کے ثبوت پائے گئے ہیں۔ مگر قصے کی حقیقی افادیت، test tube کی طرح، نہ اس کی مدد دیتی حیثیت میں ہوتی ہے اور نہ کسی چیز کے بارے میں صحیح طور پر، یا زیادہ راست یا نقل انداز میں پیشین گوئی کرنے میں، بلکہ وقت پر اس بات کی مرہٹا کرنے میں ہوتی ہے، جو اب یا مستقبل میں ممکن ہوں گے یا نہیں۔ یہ حدش ہوتی ہے انسانی مضمون کی، المیاتی تجربوں کے لیے، جو روشنی ڈال سکتی ہے بغیر سمجھ بوجھ کے ہوئے تہاں انتخاب کے، بہانہ پر جو دنیا کے مطابقت کے پیش نظر کرنے پڑتے ہیں، اب یا مستقبل میں، جو ادب کی ایادوں اور طریق چیتوں پر ٹکس آزمائی (tesco)، ایک تجزیاتی تجربہ گاہ میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اب پیشین گوئیوں پر تجربہ نہیں کرتا اس لیے کہ انسانی رویے کا ماضی، حال اور مستقبل جو ہر تو ہے مگر صرف مخصوص اور بہت محدود معنوں میں۔ ہمارے نصرت کے بھی کچھ بنیادی پہلو ہیں جو ہم کو اپنے بارے میں مختلف دور کی کسی جذباتی کہانی کے ذریعے پریشان کر دیتے ہیں۔ تو سب وہ "آفاق آدمی" ہے جو اپنی قہر کی سب سے قیمتی شخصیت ہوتا ہے، ایک ایسے تجرباتی کارخانے کی طرح جس میں نہ موجدین ہوتے ہیں اور نہ وار۔ سبکی ہیں Don Juans، Othellos، Quixotes وغیرہ جو ہر سے سامنے مثال پیش کرتے ہیں کہ قصہ طفرج کا دو کھیل ہوتا ہے جو بار بار دہرایا جاتا ہے، مزاربان مگر پیش ان کی مہروں کے ساتھ جو کا ما مقبول ہر سے سامنے بسا ہر پر بجا دیتا ہے۔

حقیقی معنوں میں ایسا گئے گا کہ یہ اس مام نہاد آزادی کو بچھکا رہا ہے جس کی وکالت کر رہا ہوں اور بد شہد سبکی ہوگا اگر ہم نے اس اچھے سوائے کردار کا محاسبہ نہ کیا، یعنی مصنف کا، انسان کا۔ مثالی ایک کی چاروں شخصیت Bard کی نظری قابلیت کے بغیر بھی نہ بھرتی، جس کی غیر معتبر یا دناست، بد شہد ان کرداروں سے کہیں نیا دونا موافق نہیں جن کو خود اس نے خلق کیا تھا اور آخر میں جن کو موت دیتے سے نکال کر دیا تھا اور ان بے مام شہرہوں اور ہماروں کا کیا کیا جائے جن کو ہم یاد رکھتے ہیں صرف ان کی بات کے حوالے سے بد شہد سبکی توجہ بھی ہوتی ہے جس کو یاد کیا جانا چاہیے، ان چیزوں سے نیا دونا جن کو ہماری بات پر تاریخ محرم پر مسلط کرنے کی کوشش کرتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ، اب تک اور جہاں تک ہم اپنی نوٹ انسان کے مستقبل کا تصور کرتے ہیں، ادبی تخلیقات مصنف کی ضرورتوں کی دست مگر ہوتی ہیں، یعنی، ایک واحد ذریعہ ہوتی ہیں اس اخلاقی اور جہانی دوس فی کا جن کا میں پسے ذکر کر چکا ہوں۔ مصنف ان بہروں کے لیے اپنی عداوت کرنے کے آلے کی مانند کام کرتا ہے جو بد شہد اطراف کی سہ ماہی سے عداوت ہوتی ہیں۔ انسان اور سات کے درمیان شاخ سبکی کرتی ہے جو بہترین اچھا رہے اس تناقص کا جو انسان ہونے اور اپنی

نفر دہشت پر فخر ہونے کا، اور اس کے ساتھ ہی اس گروہ سے بستہ ہونے کا جو اس کو پھیرے میں لیے ہوتا ہے، جس سے پاگل پن کے خطرے کے بغیر وہ خود کو علاحدہ نہیں کر سکتا۔ اس مقام پر ایک شخصیت ملتی ہے: ادب کی مجید مایاں بالکل ویسی ہی ہوتی ہیں جیسے کہ نسان کی فطرت کی ہوتی ہیں ورنہ ہمیں قافی ہیں کہ ایک اور رجید ہوتا ہے، جو خدوئیں اور غنڈہ خیزوں کا ہوتا ہے۔ یہ وہی وہی، ابرہن کا تصور کر سکتے ہیں اور جس ۲ اسانی سے نسل انسانی خدا ہے، سچا و کرفی ہے، عرف بتاتی ہے کہ ایسا ہوتا ہے۔ قلمی تخلیق کرنے کی ہماری صلاحیت ایک کارآمد ذریعہ فراہم کرتی ہے ابرہنوں کو دکھانے کا، جیسا کہ ہم اس وقت سے کرتے رہے ہیں جب ہومر شعر لکھتا تھا۔ جس وہ بھی ہمیں اپنی فطرت کو غلط معنوں میں لینے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ اگر لٹری ان شمعوں کو بجھانے پر جو ہمارے علامان اندرون میں جلتی ہیں، جس کو محبت پر نہیں فرماں بردار کی یہ سزا پائے اور مرنے پر مجبور نہ کیا جاسکتا ہے مگر پنے نہایت عمیق خیالات کو تھیلے کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

جب مفروہ اور آنکھوں کے اندر سے عقیدت پسندوں نے تو ریت و لٹیل کی ترغیبات کی وہ نسان خیال دہانوں میں تبدیلی کی تھی جس کے اثری معیولے نے وعدہ کیا کہ "تم خداؤں جیسے ہو گے" تو اس نے اس حقیقت کا اعطاف نہیں کیا تھا کہ ۲ وہی بہت آگے تک جا چکا ہے۔ وہ بد غنٹی اور غافل صدیوں جس نے نسان کو خدا جیسا بننے کی کوشش کرتے دیکھا تھا، انسان کو ایک بہتر طریقہ سکھا چکا تھا، کہ کوشش اور تصور کے ذریعے وہ نسان بن سکتے ہیں۔ جہاں تک میرا سوال ہے، میں پھر سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے بعد، نسان قلمی ۲ میں، جس کا بہت کچھ حاصل ہوا ابھی باقی ہے، اپنی تصویر ہمیشہ سے، (اور تمام حالات میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ) ایک فیصلہ کن اور ناروا ہے، ایک ہتھیار جو آزادی کے کبھی نہ ختم ہونے والے سفر کے لیے آگے جانے کا راستہ دکھاتا سکتا ہے۔

نجیب محفوظ

اعترافِ کہاں۔ جس نے مارک ٹگر تجزیاتی طریقہ تخلیق۔ ایک موت ہمہ عمر یادوں کو جانے والے دھند سے پاک معروضی اندازِ نظر کے قریب ایک نیا عرب اندازِ بیان پیدا کیا ہے جو اب ساری انسانیت پر لاگو ہوتا ہے۔

نویں انعامات کی صد سالہ تاریخ میں نجیب محفوظ پہلا عرب نگار اب تک و صد عربی میں لکھنے والا ادیب ہے جس کو یہ عزاز عطا ہو ہے۔ نجیب کی بی بی اور فیصلہ کن کامیابی افسانے اور ناول نویسی سے عبارت ہے۔ اس کی تخلیقی مدد جیتوں نے عربی زبان پر لے گئے و لے اکتوں میں ناول اور افسانہ نویسی کی مشق کو اپنی راحت عطا کی ہے۔ اس کا علاقہ اثر عربی کی محدودیت سے نکال کر اب دنیا بھر میں پھیل چکا ہے۔ نجیب اب صرف عربوں سے ہی نہیں ہم سب سے یکدم گنا ہے۔ نجیب کے ابتدائی ناول فریضہ مصر کے ماحول کی عکاسی کرتے تھے مگر آج وہ موجودہ معاشرے پر بھی غور کرتا دکھائی دیتا ہے۔ نجیب کے ناولوں کا ایک مسئلہ آج کے قارئین کے پس منظر میں کھڑا ہے۔ ان میں Madaq Alley 1947 قابل ذکر ہے جس کی گئی و واضح ہے جو رنگا رنگ ٹیٹے و نسوانی حقیقتوں کے محراب سے یک جا رہتی ہے۔

نجیب کا سب سے ہم کام قلمی جہدوں پر مشتمل ناول Between the Palaces, Palace of Longing, Sugarhouse ہیں جو 56-57 میں لکھے گئے تھے۔ ان کا مرکز ایک خاندان اور 1910 اور

1950 کے دہائی اس کے دو بوں کی قسمت کا اُلٹ پیچہ ہے۔ ان ماہوں میں خود نوشت سوانح حیات کا اس انداز ہے۔ ان کی شخصیات ماحول کے معاشرتی و سیاسی اور دانش ورانہ طرز عمل کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے ذریعے، مٹی حیرت انگیز، عجیب نے اپنے پورے ملک و ملت سے متاثر کیا ہے۔

عجیب کے ایک غیر معمولی مایہ (1959) Children of Gebelawi کا مضمون انسان کی روحانی قدروں کی ترقی نہ ختم ہونے والی بات ہے۔ اس میں نہایت مہین پودوں کے پیچھے پھرنے والی دراصل حضرت آدم، حوا، حضرت موسیٰ، حضرت یحییٰ اور آنحضرت کی مقدس شخصیات ہیں۔ اور اس میں ایک سائنس دان ہے جو قدیم، پ (خدا) کی موت کا زمرہ راز کھمبہ ایوانا ہے۔ اس ماہوں میں ہدائی و ہدائی کے درمیان راز سے ہونے والی کشاکش کو عام آدمی سے ہٹ کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مٹی قدروں کے حساس مسائل کو جس قدر میں ہم نے کی کوشش کی گئی ہے اس کی وجہ سے مصنف کے خود اپنے ملک میں اس مایہ کی اشاعت نہ ہو سکی۔ لہذا اس مایہ کو ملک سے باہر شائع کیا گیا۔

عجیب کی مختصر ریاضیہ کہلیش کی تخلیق کی ایک اچھی مثال (1966) A Houseboat on the Nile میں ملتی ہے۔ اس میں حقیقتوں اور توہمات کی سرحدوں کے مابین مافوق الفطرت عجیبو غریب ہے جس کے ذریعے تخلیق کیا جانے والے متن و ماحول مٹی فہم و فراست کے، صاحب پر ایک با معنی تبصرہ بن جاتا ہے۔

عجیب محفوظ مایہ نگار کے علاوہ ایک کامیاب افسانہ نگار بھی ہے۔ اس کے منتخب ناولوں کے مجموعے (1973) God's Word سے عجیب کی اس میدان میں کامیابی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں وجودیت کے بارے میں اچھے والے سوالات کا لہجہ کا مانہ بہت خوبصورت طاقت ور ہے اور اس ضمن میں پیش کیے جانے والے مختلف حل اکثر نہایت پائے لگتے ہیں۔

عجیب محفوظ 1911 میں مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں پیدا ہوا۔ اس نے سترہ سال کی عمر سے لکھنا شروع کیا۔ عجیب کا پہلا ناول 1939 میں شائع ہوا۔ مصر میں فوجی انقلاب تک کے عرصے میں اس نے اہل مایہ کیسے تھے۔ انقلاب کے بعد کچھ دنوں تک عجیب نے لکھنا بند کر دیا تھا مگر اس عرصے میں اس کا ایک مایہ دوبارہ شائع ہوا۔ اس کے سرحدی مایہوں میں عرب شہری زندگی کی کامیاب نقاشی پوری عرب دنیا میں اس کی شہرت کا سبب ہوئی۔ عجیب نے اپنے مایہ (1959) The Children of Gebelawi کے ذریعے ایک نئے انداز سے دوبارہ لکھنا شروع کیا جس میں وہ اپنے سیاسی خیالات کو دعوتوں اور ستاروں میں لپیٹ کر پیش کرنے لگا۔ اس کی دوسرے دو مایہ حقیقت میں مندرجہ ذیل مایہ شامل ہیں:

Autumn Quail (1962)

Small Talk on the Nile (1966)

The Thief and the Dogs (1961)

Miramar (1967)

عجیب محفوظ نے مصر کی حکومت کی بددست بھی کی۔ اس دوران اس نے مختلف شخصوں میں اعلیٰ درجہ کی

یہ کام کیا جس میں قابل ذکر مضمون کی سرمدی اور ذرا سی ثقافت میں مشیر کی عمر سے تھے۔ سرکاری ملازمت سے سبک دہانی کے بعد سے نجیب نے ایک طرح کی تجرباتی تخلیق میں شہرت سے کام لیا۔

نجیب نے تیس کے قریب ملازمین سے نیا اور افسانے اور بیسویں سے بھی نیا اور نیا میں تحریر کیے ہیں۔ نجیب کے آدھے سے زیادہ ماضی پر مبنی عرب دنیا میں فلمیں بن چکی ہیں جو عرب دنیا میں مقبول ہوئی ہیں۔ نجیب محفوظ کی ہر نئی تخلیق کی اشاعت مصر میں ایک ثقافتی واقعہ ہوتی ہے اور جبرائیل سے قطعاً فارسی تک کسی بھی ادبی موضوع کے سلسلے میں نجیب کا ذکر نہ کرنا لازمی ہے۔

خطبہ

خواجہ نین و حضرات!

سب سے پہلے تو میں سوینڈش اکادمی کا درس کی نوبل کمیٹی کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ انھوں نے میری طویل اور ستیمارہ یعنی کوششوں پر توجہ کی نظر ادا کی ہے اور میری خواہش ہے کہ یہ ثابت کے ساتھ آپ سب میرے کام پر توجہ دیں۔ اس لیے کہ یہ اس نائن میں ہے، آپ میں سے بہت سے جس سے ماہر ہیں۔ مگر میں تو حقیقی فلاح ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے سرے سے نئے جتنی بات آپ کے تہذیب اور تمدن کے نگران میں سمجھیں گے۔ مجھے یہ امید ہے کہ یہ تحریر باقی رہے اور یہ کہ میری قوم کے ادب نگار اپنی اپنی اہمیت کے ساتھ آپ کے درمیان سونے والے بین الاقوامی دیوں کے درمیان جلوہ فروز ہونے کی معاہدات حاصل کریں گے جنھوں نے مسرت و دلہانہ کی خوشبو سے ہماری اس غم آلود دنیا کو مہلکا ہے۔

قاب: میں ایک غیر ملکی نامہ نگار نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے سسے میں جوں ہی میرا نام یاد کیا تھا ہر طرف ایک عجیب سی خاموشی سی چھائی تھی، اور بہتوں کو ہیرت ہوئی تھی کہ میں کون تھا۔ اس لیے مجھے اپنا رشتہ دیکھنے کے لیے خود کو، جہاں تک الٹی اعتبار سے ممکن ہو، معروضی انداز میں پیش کروں۔ میں ان دنوں سمندریوں کا غریبوں کا تاریخ کی ایک مخصوص عمر میں جن کا تعلق غیر اردو ہے، ان میں سے پہلے سات ہزار سالہ قریبوں سمند تھا، اور دوسرا ایک نیا اور چار سو برس پرانا اسلامی تمدن۔ مجھے شاید اس کی ضرورت نہیں کہ میں آپ کے سامنے کسی ایک، یا ان دونوں کا تعارف پیش کروں، کہ آپ خود ہی عام فاضل لوگ ہیں۔ مگر مجھے یاد دہانی کے طور پر کچھ بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

جہاں تک قریبوں سمند کا سلسلہ ہے اس توہمات اور مضبوطی ساز ہیں کی دت نہیں کروں گا۔ یہ

کے گھسا پور غرور ہے، اللہ قدر جس کے بیان کی سے جدید شعور مضطرب ہو جاتا ہے۔ نہ ہی میں تذکرہ
کروں گا کہ کس طرح کئی دہریہ اسکے وجود کی طرف اس کی رہنمائی کی گئی تھی اور اس کو کس طرح انسانی شعور
کے سوچے میں لے جایا گیا تھا۔ اس کی ایک طویل تاریخ ہے اور آپ میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو میر
دوستانہ اختلاطوں سے واقف نہ ہوگا۔ میں ٹیپ لایٹر اور اوپ میں اس حمدن کی کامیابیوں اور اس کے مشہور
عام مجذوب، مرم اور ایلا بولی اور کسٹاک کا تذکرہ بھی نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ انھیں ان یادگاروں کو دیکھنے کا
موقع نہیں ملا، ان کے بارے میں پڑھا ضرور ہوگا اور ان کے دیونگی بیکروں پر فور بھی کیا ہوگا۔

تو پھر مجھے جائز دیکھیے کہ میں آپ سے فرغواں حمدن کا تعارف کراؤں جو ایک کہانی کی طرح
معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ میرے حالات نے مجھے ایک داستان کو بتایا ہے تو جیسے سنے، مانتا میں گھٹوٹ
یہ واقعہ پر نے کاغذات پر (فریموں کے زائے میں ایک آبی پورے سے کاغذ بنایا جاتا تھا جس کو Papyrus
کہا جاتا تھا۔ مترجم) کبھی تحریریں ملتی ہیں کہ فرغواں کو پتا چلا کہ اس کے حرم کی کچھ خواتین کے اس کے
دیبا ریوں سے ناجائز تعلقات ہو گئے ہیں۔ تو قیاس یہ تھی کہ اس زمانے کے حالات کے پیش نظر یہ سب بدعق
کہنیا جائے گا۔ مگر واقع کے برعکس، اس نے اپنی پسند کے قانون دانوں کو طلب کیا اور انھیں اس اعلان کی
تحقیق کا کام سونپا جو اس کے قانون تک پہنچی تھیں۔ اس نے قانون دانوں سے کہا کہ وہ صرف جج بننا چاہتا
ہے تاکہ وہ انصاف کے مطابق فیصلہ صادر کر سکے۔

میرے نزدیک ایک عظیم سلطنت بنانے یا ہر اہم تعمیر کرنے سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے انصاف کی۔
کئی حمدن کی بدترکی کے بارے میں، امارت اور شان و شوکت سے نیا دہ اس کا کردار ہم ہو کر رہا ہے۔
اب وہ بات کہیں حمدن کو اب محض ماضی کی داستان رہ گیا ہے۔ ایک دن یہ عظیم حرم بھی غائب ہو جائے گی
کے مگر سچی اور انصاف پائی رہیں گے، اس وقت تک جب تک کہ انسان میں ایک سچی بچہ میں غری
زبان اور ایک نندہ ضمیر ہوتی ہے۔

میں اسلامی حمدن کی اس پکار کی بات نہیں کروں گا جو خالق کے زیر سر پہنچتی تمام انسانیت کے
ادبیات کی ایک جہتی کا قیام چاہتی ہے، جو صداقت اور عقیدہ اور رند زریں دنیاویں پر استوار رہو۔ نہ میں اس
کے عقیدہ کی عظمت کے بارے میں کچھ کہوں گا۔ اس لیے کہ آپ کے دو مین پیسے سوچنے والے زمین موجود
ہیں جو ان کو تاریخ کا سب سے بڑا انسان مانتے ہیں۔ میں ان لوگوں کی توقعات کے بارے میں بات نہیں
کروں گا جنھوں نے ہندوستان پر چھین سے لے کر فرانس کی سرحدوں تک پھیلے ہوئے زمین کے وسیع
درجے پر بڑی مینار قائم کیے ہیں جن سے عبادت انہو پر مبنی اور مٹی کی آؤ زمین بند ہوتی ہیں۔ نہ
میں بات کروں گا انھوں اور انھوں کے دو مین انھوں کی جو بدداشت کے ذریعے اس کو قیادت سے حاصل
ہوتی ہے تاریخ میں جس کی نہ پسے ہوئی نظیر تھی اور اس کے بعد سے آج تک کوئی مثال ہی۔

اس کے برعکس میں، ایمانی کیفیت میں اس حمدن کی سب سے نمایاں خاصیت کو پیش کروں گا۔

دارشینیوں کے خلاف ایک جتنی ہوئی جنگ میں یونانی فلسفے کی وراثت، طب اور موسیقی کی چند کتابوں کے عوض ان کے سرے جتنی قیر کی دوائیں کر دیے جاتے ہیں۔ یہ سے موت تھا دس اقدار کا، عجم اسانی کے جذبے کا اور عجم کی پیاس کا۔ اس کے باوجود کہ، گنگوہی والا حد پر یقین رکھتا تھا، ایک شریک نہ مہذب کے شہرت طلب کر رہا تھا۔

یہ میرا مقصود تھا، خواتین و حضرات، کہ میں ان دو حملوں کی گود میں پیدا ہوا، ان کی چھاتیوں کا دودھ پیا اور ان کی کے دب اور غنم میری نشوونما کی غذا بنے۔ پھر میں نے آپ کی تحیر کر دیئے وانی تہذیب کا مذہب شہرت نوش کیا۔ فیض و تحریک کی ان تمام تہذیبوں کے باعث۔ اور میری اپنی تشویش کی وجہ سے، میرے اعلیٰ فہمی ہو گئے ہیں۔ یہ ان لفظوں کی قسمت تھی کہ ان کو آپ کی مہذب کا لڑکے کی تعریف و توصیف میں مشغول کیا جا رہا ہے جس نے میری کوششوں کو عظیم نوپس اہم کام کا ثبوت دیا ہے۔ تھرا، میری جانب سے اور ان نژاد نے، دے لئے معذرتوں کی جانب سے جھوٹے ان دو حملوں کی بیہوشی۔

خواتین و حضرات!

آپ سوچ رہے ہیں گئے کہ قیر کی دنیا سے آئے دے اس آئی کو بھلا کس طرح ایسا ذہنی سکون نصیب ہوتا ہے کہ وہ کہیں نہ لکھ سکے۔ آپ نے بالکل صحیح سوچا ہے۔ میں اس دنیا سے آیا ہوں جو سب سے قریبوں کے بوجھ سے محنت مزدوری کر رہی ہے صرف جن کی ادائیگی پر غصے والا اثر ہے ہی اس کو قاتل مہذب، اس سے قریب تر رکھتا ہے۔ اس کے بہت سے لوگ اشیاء میں سیلاب کی نذر ہو جاتے ہیں، جب کہ کچھ افریقا میں قحط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جنوبی افریقا میں لاکھوں افراد، سوڑا اور بھڑوں کے ذریعے انسانی حقوق کے اس دور میں بھی تمام انسانی حقوق سے محروم رکھا گیا ہے، گویا ان کو انسانوں کی کشتی میں شمار ہی نہیں کیا جاتا۔ غزوہ اور مغربی کنارے پر ایسے لوگ بستے ہیں جو اپنی زمین پر، اپنے آباؤ اجداد کی زمین پر بستے ہوئے بھی اپنی شناخت سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ سو وہ خود کھڑے ہوئے ہیں صرف یہ طلب کرنے کے لیے کہ انہیں بھی وحشی انسان کی طرح پہلا حق دیا جائے، کہ ان کی اپنی ایک معقول جگہ ہو جس کو دوسرے ان ہی کے کام سے بچھو نہیں۔ ان کو ان کی بہادری اور شہیدانہ حرکت کا جو ب لٹو ہوئی ہریوں، گویوں سے چھٹی جسموں، مسہار شدہ مکانات اور عجیب و غریب خانوں میں انہیں سے لیا گیا۔ ان کے چاروں جانب بڑے عذاب و غم غصے اور غم کی کیفیات میں سب کچھ ہونا دیکھ رہے ہیں۔ اگر اس کو ان لوگوں کی دانش کے ذریعے بچایا نہیں گیا جو ایک معصومانہ اور کھلا امن کے خواہاں ہیں، تو یہاں شدید تباہی پھیلے گی۔

میں ہوں، تو قیر کی دنیا سے آئے دے کہ کہانیاں کہنے کے لیے ذہنی سکون کیسے نصیب ہوا؟ خوش قسمتی سے فن فراشوں اور ہمدرد ہوتا ہے۔ یہ جس طرح خوش و ہمدرد انسانوں سے پیش آتا ہے اسی طرح یہ رنجور کو بھی تھ نہیں چھوڑتا۔ یہ دونوں کو ایک جیسے بل طریقے میں کرتا ہے جن کے ذریعے وہ اپنے سینوں میں محراب کا سب کچھ باہر نکال نکلیں۔

تمدن کی تاریخ کے ان فیصلہ کن مرحلوں میں یہ مائتابل تصور اور ناقابل قبول ہے کہ انسانیت کی کہانیاں خد میں خالق ہو جائیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آخر کار انسانیت میں مومنت کو پختی چکی ہے، اور ہمارا عہد عالمی طاقتوں کے درمیان ہوسانہ اتحاد کی توقعات رکھتا ہے۔ انسانی دماغ کے لیے تباہی اور مہدم کے سباب کو ختم کرنا سب سے بڑا کام ہے۔ اور جس طرح سائنس دان ماحول کو غلط فہم سے پاک کرنے میں اپنی تمام تر کوششیں کر رہے ہیں، اسی طرح دانش ورانہ کوششیں کرنا چاہئیں کہ انسانیت ابھی اخلاقی غلطیوں سے پاک کیا جائے۔ یہ ہمارا فرض بھی اور حق بھی ہے کہ ہم تمدن کے بڑے ٹکڑوں کے تقسیم رہنماؤں اور معاشیات کے مامروں سے یک جہتی کی جست کے حامل ہوں جو ان کو اس عہد کے غلط رنگا رنگ پہنچا دے۔

پرانے زمانے میں ہر متمدن عرف اپنی قوم کی بھلائی کے لیے کام کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ لوگ حریف ہوتے تھے یا استحقاق کے حرف ہو کر بکتے تھے۔ اس وقت کسی اور قدر کا خیال نہیں رہتا تھا۔ سوائے برتری و برتری کا اثر کے۔ اور ان کی خاطر بہت سی اخلاقی اور تصوراتی قدریں ضائع ہو چکی تھیں، بہت سے غیر اخلاقی طریقوں کو معیار قرار دیا جاتا تھا، بے شمار لوگوں کو تہوہ کرنے کے لیے تہوہ دیا جاتا تھا، جھوٹ، دھوکے، بڑی غلامی اور غلامی کی مندی اور عظمت کے نشانات اور ثبوت ہو کر رہے تھے۔ آج اس تصور کو اس کی جہاد سے تہوہ مل کر ضروری ہے۔ آج کے تمدن رہنما کی عظمت کو اس کے کائناتی تصور کے معیار سے اور تمام انسانیت کے بارے میں اس کے احساس اور ذمے داریوں کے پیمانوں سے ماپا جانا چاہیے۔ ترقی یافتہ دنیا و برصغیر دنیا کا خاندان ایک ہی ہے۔ انسانیت کی فہم داری ہے کہ وہ اپنے عمرو بشر، دانش و تمدن کے درجے کے اعتبار سے اس کی پاماری کرے۔ میں یقیناً اپنی حدود سے تجاوز نہیں کرے گا۔ اگر میں تیسری دنیا کے نام سے ان سے یہ کہوں کہ یہ لوگ ہماری بددعا کے قماش ہیں نہ بنے رہیں۔ آپ کو اپنے رتبے کے مطابق ایک تقسیم امریت گزارا کرنا ہے۔ اپنے برتر مقام سے آپ پو دنیا کے چودوں کوں میں، انسان کا تو کوہی کیا، چاندوں اور چودوں کو بھی غلط روپ ڈالنے سے روکنے کی ذمے داری نہ ہوئی ہے۔ ہم بہت لگاؤ کر چکے ہیں۔ اب عمل کا وقت ہے۔ اب بات آج ہے کہ تیسروں اور سارے لوگوں کا درجہ ختم کر دیا جائے۔ ہم اب اس دور میں ہیں جس میں دنیا پوری دنیا کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ غلامی میں جکڑے جنوبی افریقیوں کو بچائیے۔ قسطنطنیہ کو غلامیوں اور قوموں سے بچائیے۔ نہیں امرائیلوں گمان کی اپنی تقسیم وراثت کو پاک کرنے سے بچائیے۔ ان کو بچائیے جو ترقی کے باعث معاشیات کے ترے قوانین کے شکوے میں گرفتار ہیں۔ اس حقیقت کی طرف ان کی توجہ دلائیے کہ تو انسانی کے بارے میں ان کی فہم داریوں کا جس کے ان قوانین سے پہلے آتی ہیں وقت جن سے آگے نکلا گیا ہے۔

میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں، قوانین و حضرات، مجھے حسرت ہے کہ میں آپ کے مکتب میں چند نسل اندازی کا مرتکب ہوا ہوں۔ مگر آپ تیسری دنیا سے آنے والے فرد سے اور کیا توقع رکھیں

گئے۔ کیا (پیشے کا) ہر مرتبہ ایسی جگہ کا نہیں ہونا چاہیے جس رنگ کی شے اس میں بھر دی گئی ہو؟ اگر نوح انسان کی کماؤ کی دولت آپ کے ممدن کے تختہ ان میں، جہاں اس (المریخ ٹوٹل) نے، ہر پون ساکس، وہ اور فنی سنائی ممدوں کے لیے بکھا گیا ہے، نہ گولچے تو اس کو روکن میں جھکے گی۔ اور جیسا کہ ایک دن اس نے اپنی دولت کو بھلائی کی جگہ ممد کے لیے وقف کر دیا تھا، معافی اور دوزخ کی امید میں، سم، تیسری دنیا کے بچے صاحبان حیثیت سے، صاحبان ممدن سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ بھی اسی کے نقش قدم پر چلیں، تاکہ اس کے روائے نیک قائم رہے، تاکہ اس کی چشم بلی پر مر لید جا سکی رہے۔

خاتمین و حضرات!

ہمارے اطراف جو کچھ ہو رہا ہے اس کے دو جہوں میں "شریک اپنی خوش امید" سے وابستہ ممالک میں کائنات کے راجہ مل کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہاں کی ترقی دنیوی میں سرخرو ہوئی ہے۔ مگر نکل ہر روز غم سے ہم کنار ہو رہی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بدی بھارے تصور کے مقابلے میں زیادہ کمزور ہو۔ ہمارے سامنے ایک ناقابل انتہا ثبوت موجود ہے۔ "فتح ہمیشہ نیک لوگوں کے ساتھ نہ رہی ہوتی تو یہ بے شمار بھگتے ہوئے انسان زندہ اور حشر اب الٹ کے، قدرتی آفات کے خوف اور مائیت کے مقابل ترقی نہ کر سکتے۔ وہ قومیں جانے، گمبختیت و بجا میں بے مثال درجے پہ پہنچے، خدا کا فتح کرنے اور انسانی حقوق کا اعزاز کرنے کے قابل نہ ہوتے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ بدی بھارے اور وجود و جسم میں نے والی، اور نیکی سے گمراہ کرنے والی قوت ہے، اور یہ کہ انسان کو یہ ہمیشہ یاد رہتا ہے کہ لطف سے زیادہ تکلیف کس سے ہوتی ہے۔

ہاں عظیم شاعر ابوالاعلیٰ اہمری بالکل صحیح تھا جب اس نے کہا

سوت کے وقت کا نقطہ ایک رنج

سوگنا سے ملتا وہ ہوتا ہے

خوشیوں سے لمحہ دلالت کی

میں ایک بار پھر آپ سب کا شکر یہ ادا کرتا ہوں اور آپ سے غم کا طالب ہوں۔

(محمد سہاوی نے یہ خطیر سلیڈز اکائی میں پہلے عربی پھر انگریزی میں پیش کیا۔)



جوزف براؤسکی

اعترافِ کمال۔ اس آغوش کشا تصنیف و تالیف کے لیے جو تجلیل کے شفاف رنگوں سے تر ہوا اور
شاعرانہ شہرت سے نچر پڑی ہوئی ہیں۔

رومی زبان کے شاعر جوزف براؤسکی نے صرف 47 برس کی عمر میں دیوت کا نقش انجام حاصل کیا
جو ایک نئے اعزاز کی بات ہے۔ اس کے لیے یہ بھی کسی اعزاز سے کم نہیں کہ اس کی تحقیقات کے سب تک
وعدے نیا دل نبالوں میں تر جیسے ہو چکے ہیں۔

یہ لکھی دنیا کی طور پر شاعر اور مضمون نگار ہے۔ اس کا ذہن اور تخلیقی تعلق روس کے کلاسیکی اور عظیم
پیش رو پطرس اور فائل الی مینوفت ادیب یوزس جوسٹناک سے ہے جو روسی ویب کے بلند درجہ شاعر ہیں
میں سے تھے۔ براؤسکی اس نئی شاعرانہ طرزِ تحریر کو آگے بڑھاتا نظر آتا ہے جس کی بنا پر سب سینڈسٹا اور ایسا
اضواء جیسے روسی شعرا نے رکھی ہے۔ شاعری کی صلاحیت براؤسکی کو خدا کی جانب سے نعمت کے طور پر عطا
ہوئی ہے۔ اس کے کچھ میں ایسے جذباتی پہلو بھی ملتے ہیں جن کو کسی بھی مسک سے نکل نہیں کیا جاسکتا۔ اس
کے ہاں مافوق الفطرت اور اخلاقی مسائل سب سے ہم نظر آتے ہیں۔

ادبی، جغرافیائی اور سماجی ہر سطح پر مشرق اور مغرب کے پس منظر نے ہر لکھی کے کلام کو متاثر کیا
ہے۔ دراصل ان مٹیوں نے ہی اس کی شاعری کو غیر معمولی مہرانی اور دلکش عطا کیا ہے۔ پرانے مہر

کے ادب کے مطالعے نے براؤنسکی کی شاعری کو ایک تاریخی بصیرت بھی دی ہے۔

روس سے براؤنسکی کی ہجرت اور نئے ساؤی ماحول میں اقامت اختیار کرنے سے اس کی شاعری پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اپنی 1972 میں لکھی جانے والی ایک نظم میں اس نے ہجرت کے تناظر میں اپنی شخصیت کی عجیب تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ رفتہ رفتہ اپنے ہال، فائٹ گنوا چکا ہے اور اپنی زبان کے سمعہ معرکہ فضاں وغیرہ تک بھٹی چکا ہوتا ہے۔ اس قسم کے شدہ شاعرانہ خیالات کے باوجود ادب بھی بدی زبان میں زور دینے سے ادب تخلیق کر رہا ہے۔ براؤنسکی انگریزی میں اپنی شاعری کے ترجمے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی براہ راست انگریزی میں بھی شعر لکھتا ہے۔ اس نے انگریزی میں لکھی گئی نظمیں کے ایک سسے میں بالکل نفاذ اور فخر سے ہڈی سے ٹھہر چکا ہوں کا ثبوت غیر ظہور پر خوب صورت استعمال کیا ہے۔

براؤنسکی اپنی شاعری پر مضامین میں لکھتا ہے کہ "وقت انسان کے ساتھ جو سلوک کرتا ہے اس کا بیان ہی وہ ادب ہوتا ہے۔" براؤنسکی نے یہ کہہ کر ایک طرح سے اپنی شاعری کے نفس منبھوٹ کا جادہ لایا ہے۔

جدا جاتی، معذرتی، بڑا ہڈا اور موت سب وقت کے گھرے ہوئے ہیں۔

بنیادی طور پر صرف شاعری ہی ہے جو ہم کو اپنے وجود کے جبر کتبے میں مدد دیتی ہے۔

شاعر کا فہم وہ مثل الفاظ کا تراشہ ہے۔

شاعری سات کا بلند ترین رتبہ ہوتی ہے۔

شاعر مستقبل پر تراز بند کرنے کا آلہ ہوتا ہے۔

دنیا میں شاعری کا کردار ایک ٹف منبھوٹ ہے۔ شاعری آمرانہ ماحول میں شاعر کو پامال شدہ

سائیت کے احساسات کا نمائندہ ہوتا ہے جب کہ آزاد ماحول کے شور و شغب میں اس کے ادب جانے کے خطرات زیادہ ہوتے ہیں۔

جوزف براؤنسکی سوویت روس کے شہر لینن گراؤ میں 1940 میں پیدا ہوئے اور انھوں نے شاعر کی عمر سے

شاعری شروع کی۔ شاعر بننا انھوں نے بہت جلد محسوس کیا کہ اس نوجوان شاعر کے پاس اپنے دور کا سب سے زیادہ اور پہاڑ فضا سیت سے بھر پور لہجہ ہے اس لیے اس نے براؤنسکی کے تعارف اور اس کے آگے بڑھنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ امریکا ہجرت سے قبل کچھ عرصے کے لیے براؤنسکی نے شان روس میں با مشقت قید بھی کائی اس لیے کہ حکومت کی نظر میں وہ اشتراکی معاشرے کے خلیں پر پلٹے والا ایک حقیر گھڑا تھا۔

براؤنسکی ابی دوسرے کا مترجم بھی رہے جس نے انگریزی کے علاوہ پانچ شاعروں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ وہ ادب کے مہمان پر و فیسر کی حیثیت سے کافی عرصے تک میٹل گن اور کیمبرٹ ویلی ور سٹیوں سے بھی منسلک رہے۔ براؤنسکی کوئی اور زبان کی اعزاز کی رکنیت اور بہت سے خدمات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

ضیافت سے خطاب

جبرائیل مارکس دو روایتی شاعری، شراکتیں و حضرت!

مغربی ملک کے مجبور سے سرسبز ہونے میں صوبوں پر میری پیدائش اور نشوونما ہوئی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ کبھی کبھار، بالخصوص غزوں کے شفاف موسم میں Kelomaki کے آس پاس ساحل پر میرا کوئی دوست سمندر کے اس پار شمال مغرب کی طرف، انگلی کے اشارے سے کہتا تھا، تمہیں وہ نیلے رنگ کا زمین کا ٹکڑا نظر آ رہا ہے؟ یہ سوئڈن ہے۔ یقیناً وہ مذاق کر رہا ہوتا تھا، اس لیے کہ مدھم مدھم شاد آواز، وہ زوہی کی غلط ہوتا تھا، اس لیے کہ بھری قوانین کے مطابق انسانی آگے سمجھنے مقرر میں تقریباً بیس میل تک دیکھ سکتی ہے۔ اور یہ منظر ٹھیک ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

پھر بھی، شراکتیں و حضرت! یہ یاد رکھنے کے بھی مجھے خوش ہوتی ہے کہ ہم اسی ہو میں سانس پیتے تھے، وہی چھبیل ہماری غذا ہوتی تھیں اور ہمیں شاد و بلور کے درختوں کے ٹکڑوں سے ہم میرا پ ہوئے رہتے تھے۔ ہوا کے ڈھچ پر مختصر، ہم اپنے جھروکوں سے بنیں، دونوں کے نظارے کرتے تھے، آپ لوگ بھی انھیں گود دیکھتے تھے، یا اسے آپ چٹ کر جی کہہ سکتے ہیں۔ مجھے یہ سوچ کر بھی خوش ہوتی ہے کہ اس کمرے میں داخل ہونے سے قبل بھی کچھ چیزیں ہم دونوں میں مشترک تھیں۔ اور جہاں تک اس کمرے کا سوال ہے تو، چند کھینے والی یہ خالی تھا اور ب سے دو کھینے بعد یہ پھر خالی ہو جائے گا۔ اس کی دیواروں کے لیے، ہم سب کی، اور بالخصوص میری، موجودگی بالکل ادا قریب ہے۔ میں جیٹ ٹکڑا اس عدتے کے نقطہ نظر سے، یہاں ہر کسی کی موجودگی بالکل ادا قریب ہوگا تا اس کہ کسی کا قیوم مستقل ہو، ایک نئی منہ کی طرح، ایک پتھر پرے قوس کی طرح جیسے کوئی پہاڑ کی چوٹی، دیکھی دنیا کا سوز۔ اور کسی جگہ پر، کسی ناقابل چٹائی گئی شے یا کسی جسم کے ظہور سے جو اس کے احوال سے میل کھاتا ہو تو ایک موقع وجود میں آ جاتا ہے۔

لہذا اس شکرگزاری کے ساتھ کہ آپ نے مجھے نوٹس انعام دینے کا فیصلہ کیا، میں کسی لیے اور بھی شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے کام میں تمام کے چہرہ کا اضافہ کیا ہے، ادب کے ایک وسیع منظر عام میں ایک برف زرمے کی مانند۔

میں اس (برف زار کی) تشبیہ میں پوشیدہ خطرات سے پوری طرح آگاہ ہوں (یعنی) سرورہری ہے مقصد ہے اور ہر آخر پھل جاتا۔ اس کے باوجود اگر اس میں متحرک، کئی دعوت کا ایک ریشہ بھی شامل ہے

جو میرے خیل میں ملے وہ جو ہو گا تو شاہی یہ تشبیہ برنگل ہوگی۔

برنگل ہونے کا ذکر آ رہا ہے تو میں تحریر شدہ تاریخ کے حوالے سے اس میں اضافہ کرنا چاہوں گا کہ شاہی ہی کہیں، کسی آبادی کے ایک فی صد سے زیادہ لوگ شاعری میں دلچسپی جتے ہوں۔ اسی وجہ سے عہدِ قسطنطنیہ کا نامیہ کے موضوعات کے شعرا دیوانوں یا مراکز اقتدار کی طرف متوجہ ہوئے، اور اسی وجہ سے آج یہ لوگ چامعات، یعنی مرکزِ علم و دانش کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

آپ کی کادوں کی دونوں کے امتزاج کی مانند ہے اور مستقبل میں۔ جب محمد موجود نہیں ہوں گے، اگر ایک فی صد کا تناسب قائم رہا تو یہ سب کچھ آپ کی دیکھ بھال کی کوششوں کا ثمر ہو گا۔ اگر آپ کو مستقبل کا یہ منظر نامہ بھندلا لگ رہا ہو تو شاہی آبادی کے چارک اضافے کا تصور ہی، کسی حد تک آپ کے جذبات کو بخلا دے گا۔ اس لیے کہ آج کے عرب سے ایک فی صد کا ایک چوتھائی بھی بہت ہو گا۔

پند، خواہش و حضرات، آپ کے لیے میرا تھمرنا نکل کر پستہ نہیں۔ میں بن افرد کی طرف سے بھی آپ کا شکر گزار ہوں، آپ کے فیصلے جن کی آواز اور مستقبل میں، شاعری پڑھے کی طرف رغبت کریں گے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ انسان کا وہی رہے گا، جیسے کہ عظیم لوگوں نے اور میرے ایک امریکی ساتھی نے، اس مقام پر استادہ شاہی اس کمرے میں کہا تھا مگر میں پورے بھلاؤ سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ شخص جو شاعری کا سنا حد کرتا ہے اس سے یقیناً بہتر ہو گا جو اس سے بے بہرہ ہو۔

بدشہرہ پینر نہ گئے سے اسٹاک ہوم تک کا سفر آسان نہیں، مگر میرے خیال کے انسان کے لیے یہ خیال کہ سیدھا راستہ قاصد سمجھتا ہے بہت دن ہوئے دلچسپی کے قابل نہیں رہا۔ اس لیے مجھے یہ سوچ کر بھی خوشی ہوتی ہے کہ کبھی بھی انگریز اور خود بھی شاعرانہ اصناف کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ شکریہ

خطبہ

کسی غیر یلسی انسان کے لیے، جس نے عمر بھر مادی اعتبار سے ہم ماحول پر اپنی فنی زندگی کو قوت دی ہو، وہ جو اس خوشنہش میں دورنگی گیا ہو حتیٰ کہ اپنے وطن سے بھی دور کہ کسی جمہوری معاشرے میں بالکل کامیاب ہو جائے، شہادت کے اسی فخر سے جو آرائشوں سے ہر کسی کا سنا نہ ملکتی میں قوم سے حاصل ہو۔ یہ انسان کے لیے اچانک اس مقام پر پہنچ جانا (جہاں میں آج کھڑا ہوں) کچھ ناگوار اور کسی قدر مشکل تجربہ ہوتا ہے۔

میرے احباب قاضی کی منہلی اس خیال سے ہرگز بد مزہ نہیں ہوتی کہ مجھ سے پہلے کتنے عظیم انسان

اس مقام تک پہنچ سکے ہیں، نگران لوگوں کی یاد سے جنہیں اس مقام سے پاپائے عظمیٰ کی صرح شہرِ روم و رومیا سے خطاب کا موقع نہیں مل سکا اور ان کی مجموعی خاموشیاں اس ذریعہ ابلاغ سے نشر ہونے کی ناکام کوششیں کر سکتی رہ گئی ہیں، دکھ ہوتا ہے۔

نہیں یہی ایک سادہ سا احساس وجہ تائید ہوتا ہے کہ گھٹن مٹائے صوب، ایک ادیب دوسرے ادیب کے لیے کچھ نہیں کر سکتا، بالخصوص ایک شاعر دوسرے شاعر کے لیے؛ کہ Oshp Mandelstam و Manna Tsvesaeva، Anna Akhmatova، Robert Frost اور Wyssan Auden اس ارفع منزل تک پہنچے تھے مگر وہ اپنے علاوہ کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے، اور شاید وہ بھی یہی ہی ہے اطمینانی کا شکار رہے ہوں گے۔

یہ سب مجھے مستحق پریشان کرتے رہے ہیں، اور آج بھی میں اسی دوسرے میں ہوں۔ لیکن کسی بھی صورت میں یہ، کسی کو بھی، خطابت کی ترغیب نہیں دیتے۔ میں اپنے بہتر لحاظ میں خود کو ن سب کا مجموعہ سمجھتی رہتی ہوں، مگر کسی تفریق کے بغیر، میں خود کو کسی ایک سے بھی فخر آدمی طور پر تصور کرتی ہوں۔ اس لیے کہ نہ کاغذ پر اور نہ گوشت پوست میں ان سے بہتری کا امکان ہو سکتا ہے۔ اور بلاشبہ کائنات ان کی مدح میں ہے، شواہد و ثبوت ہی اس کا کیا تلفیح میں ہوں، جو ضرورت سے کہیں زیادہ، مجھے افسردہ کر دیتی ہیں۔ مگر واقعی دوسری زندگی ہوتی ہے تو میں ان کے لیے ایک ابدی زندگی کے امکانات کو مسترد نہ کر سکتا۔ اگر دوسری دنیا ہوتی ہے تو، امید کرتا ہوں کہ وہ مجھے اور اس میں روشنی پر میں ان کے بارے میں بات کیا رہے ہوں، مجھے صحاف کر دیم گے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع پر ہمارے شعبے میں، مصروف وقت رہی نہیں سردار بھی ہوتا ہے جس کے ذریعے کسی کو پرکھ جاتا ہے۔

میں نے یہاں صرف پانچ اراد کا تذکرہ کیا ہے، ان کا، جن کے کام پور جو ٹیو بھی مجھے عزیز ہیں، جن سے میں بہ حیثیت انسان اور ادیب، کہیں کمتر ہوں، اور جن کے بغیر میں اس مقام تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اور بھی بہت سے بڑے ہیں، بڑی مکتے، چنانچہ ہمارے جوتینا پانچ سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ اور ان میں سے ہر ایک مجھے مکمل طور پر خاموش کر دیتے ہیں، کیونکہ حیات گھٹتا ہے۔ کسی ادیب کی زندگی میں ایسے بہت سے بڑے ہوتے ہیں، میرے معاملے میں تو یہ نئے ہو جاتے ہیں، کہ لوشیز تقدیر کے باعث میں ۱۹۵۷ء میں تہذیبوں کے درمیان ہوں۔ دونوں تہذیبوں سے متعلق اپنے ہم عصر ادیبوں، شاعروں اور فلسفہ نگاروں کے خیالات سے مسائل حل نہیں ہو جاتے، جنہیں میں اپنے آپ سے کہیں مدد تقسیم کرتا ہوں، جو اگر اس مقام تک پہنچ پاتے تو اس نکتے پر بہت پہلے آ جاتے، اس لیے کہ شہرِ دنیا کو جاننے کے لیے مجھ سے کہیں زیادہ ان کے پاس تھا۔

اس مرحلے پر میں کہتا ہوں، بہ ترتیب، بلکہ پی بے سرور پائی کے اعتبار سے، انجمن میں ڈالنے والے تبصرے کرنے کی جرأت کرنا چاہتی ہوں۔ جاں کر اپنے خیالات کو پیش کرنے کے لیے مجھ کو جو وقت دی گیا ہے اس کی جنگی و گرم ازم سیرے شعبے کی شکست مجھے ہے، لہذا اور فرط و تغریط کے دہرام سے پرہیز کروں گا۔

فسوں کا مقام ہوگا کہ اس ایک موقع کو کسی اور کے لیے، ذاتی کی بنا پر، کسی اور کے تجربے کے لیے ضائع کر دیا جائے۔ یہ اس لیے اور بھی فسوں، مآب ہوگا کہ تاریخی ضرورت کے پیرامور جن کے اشارے پر انسان اس قسم کی ذاتی پر ماضی ہوگا، اس کے ساتھ قیاس نہیں جائیں گے، حتیٰ کہ اس کا شمار یہ بھی ادا نہیں کریں گے۔

نہایت اور قیاس، جب وہ تیز ہیں جو مذکورہ قدیم اور سائنسزم پر مبنی ہیں، کسی بھی قسم کی سماجی ترتیب سے زیادہ دیر پا ہوتی ہیں۔ ادب کا، کسی ریاست کے بارے میں حقارت، یا انقلابی کا، انقلابی رہنما کی طرح کا رد عمل ہو سکتا ہے، عارضی کی مخالفت اور محدود کے خلاف۔ جب تک یہ سمت ادب میں ڈھل اندر نہیں کرتی رہے گی، ہم انہیں اس حد تک ادب کو بھی ربطی امور میں ڈھل اندر نہیں کا حق ہوگا۔ یک سیاسی نظام، یک قسم کی سماجی ترتیب، کسی بھی عہد میں کے نئے مکتب کی طرح، ایک نوعیت کا ماضی بن جاتا ہے جو خود کو جاب پر (بلکہ بھی بھی تو مستقبل پر بھی) ٹھونچنے کی محاکمہ ہے اور یک انسان جس کا پیشہ ہی نہایت ہو، سب سے آخری فرد ہوتا ہے جس میں اس سے عارف نظریں نکلتی ہو۔ اصل خطرہ ریاست کی طرف سے ایچ اے ای کے مکان ہی کا نہیں (کچھ پیشی کا بھی) ہوتا ہے، جتنا کہ اس مکان کا کہ لوگ یہ سمت کے ہاتھوں خود کو توجہ عمل کے زیر اثر پا رہے ہیں۔ وہ خود مآب ہو رہا ہے، ذاتی کی تلاش کے لیے جو خود دیکھ رہی ہے۔

مذاہب کے فیصلے، ان کی غنیمت، برائیت سے قطع نظر ہمیشہ اسے ہوئے کل پر ہوتی ہیں۔ جب کہ زبان اور ادب ہمیشہ آج تک کام کرتے ہیں، اور کبھی کبھی، جب سیاسی نظام دینی نوعی ہو تو مستقبل بھی تعمیر کرنے لگتے ہیں۔ ادب کی اہمیت میں یک کیفیت تو یہ ہوتی ہے کہ یہ سائنس کو اپنے وجود کے وقت کو چست کرنے میں مدد دیتا ہے تاکہ وہ خود کو "اپنے جیسے افراد کو ماضی میں گزرتے ہوئے" جہم میں اس نوشتہ قدیر سے متعلق کہنے، ذاتی سے بچنے کے لیے جس کو مانع کے شکار کا خوف، مآب مایوس جاتا ہے۔ عام طور پر، ہاتھوں ادب، زندگی کے مقابلے میں انسان کو اہمیت دیتا ہے، اسی لیے کہ لوگ کسی دت کو دہرانے کے عمل کو برا سمجھتے ہیں۔ زندگی کے عام حالات میں آپ یک ہیے کو تین دہنا کر لوگوں کو تین بار دہنا کر محفل کی جان بن سکتے ہیں۔ ادب میں ہی فعل کو انکار رفتہ دیکھتے رہتے ہیں۔

ادب جھٹکا روک لینے والا اظہر ہوتا ہے اور اس کی نشوونما فن کار کی انفرادیت سے نہیں بلکہ مادے کی حرکیت اور منتقلی سے ہوتی ہے جو صلاحیت سے، ہر دہر گنہیت کا خالق کرتے ہوئے، ایک ہی جاتی حل طلب کرتا ہے۔ فن، خود، اپنی جہت سے، حرکیت، منتقلی اور مستقبل کے باوصف، مانع کے مترادف نہیں، جہاں تک ممکن ہو اس سے متوازی رہتا ہے، اور جس انداز کے مل پر زندہ رہتا ہے وہ ہے نئی جاتی پانی حقیقت کی مسلسل تخلیق۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اکثر ترقی سے آگے، مانع سے آگے ہوتا ہے جس کا مرکز ذی اور۔ کیوں نہ ہو، ایک بار پھر، ہر کس سے بہتر ہوں۔ جیسا کہ لکھتے ہوئے ہے۔

آج کل یہ خیاب عام ہو گیا ہے کہ ایک لکھنے والے، ہاتھوں شاعر، کو بازاری، عوام الناس کی زبان استعمال کرنی چاہیے۔ تمام ترجمانی اکیلا رہا رہے لکھنے والے کے قابل احساس فوٹو کے اظہار کے بارے میں یہ

بالکل و بڑا ہوتا ہے، کہ یہ ادب دنیا میں کے ماتحت کرنے کی ایک کوشش ہے۔ یہ قویاں ہی ہے کہ ہم یہ طے کر سکیں کہ اب وقت آیا ہے کہ تمام نوعِ انسانی ادب میں اپنی ترقی کو رک دے اور عام لوگوں کی زبان بولنے لگے۔ اس کے برعکس ہونا تو یہ چاہیے کہ تمام ادب کی زبان بولنی چاہیے۔

میں حیثِ انکس، برتنی جہانِ انسانی حقیقت انسان کی اخلاقی حقیقت کو نیا رو چست کر دیتی ہے۔ اس لیے کہ حقیقت ہر بات کے پس سے پیدا ہوتی ہے۔ اچھے اور بُرے دو درجات ہیں جو سب سے پہلے جہانِ انسانی ہوتے ہیں، کم از کم ان سماجی اصولوں کے اعتبار سے جو شر اور شر سے پہلے مستحالی کیے جاتے ہیں۔ اگر اخلاقیات میں سب کچھ چڑھے کی جائے نہیں تو اسی کا مطلب یہ نہیں کہ جہانِ انسانی میں سب کچھ چڑھے ہوئے ہے اس لیے کہ اس کے طبقوں میں لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ایک نوفاشیہ طبقہ کی جنسی کو دیکھ کر ہٹا ہے اور اسے مسدود کر دیا ہے، یا اس کے برعکس اس کی طرف لپٹا ہے۔ یہ فطری طور پر ایک جہانِ انسانی میں ہونا ہے نہ نہ اخلاقی۔

جہانِ انسانی پسندیدہ کی ایک نہایت واقعی بات ہوتی ہے اور جہانِ انسانی تجربہ ہمیشہ ایک نئی معاہدہ ہوتا ہے۔ ہر نئی جہانِ انسانی حقیقت ہر شخص کے تجربے کو اور بھی زیادہ اثر دیتی ہے اور اس قسم کی صورت، جو کبھی بھی ادب (یعنی اور قسم) کا ادب نہیں ہوتی ہے غلامی کے خلاف، اگر مذہب نہیں تو کم از کم ایک نوعیت کے غلامی کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ کسی مازوق، مخصوص دلی ذوق رکھنے والے انسان کے لیے ترنما کی جاتی ہے۔ خلافت کم قابلِ مہارت ہوتی ہے۔ یہاں اس نکتے پر زور دینا مقصود نہیں کہ کوئی قابلِ تعریف صفت کسی شاہ کار کی تخلیق کی ضمانت نہیں ہوتی، بالکل اسی طرح برائی، بالخصوص یہ سی بنائیاں، ہمیشہ خراب طرز کی بنائیاں ہوتی ہیں۔ کسی شخص کا جہانِ انسانی صحیح ہوتا ہے، اس کی پسند چننی گھری ہوئی، اس کا اخلاقی ارتکاز جتنا سیدھا ہوگا، وہ اتنی زیادہ (ضروری نہیں کہ زیادہ خرم) ہو اور خود بخود ہوگا۔

میں اسی قسم کے اخلاقی، نہ کہ اخلاقی معنوں میں دو سطحوں کے قوب کی کوشش کرتی چاہیے کہ حسن دنیا کو بخوبی سمجھ سکے یا معصوم آریلڈ کے یقین کو کہ شاعری میں پچائے کی شادی دنیا کے لیے بہت دیر ہو چکی ہے، اگر ایک انفرادی انسان کے لیے ایک موقع ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ انسان میں جہانِ انسانی جہت کچھ نیا و جدید ہی ترقی پاتی ہے، اس لیے کہ بغیر چلنے والے گھن ہے اور اس کی ضروریات کیا ہیں، ایک انسان فطری طور پر یہ جانتا ہے کہ اسے کیا پسند نہیں اور اس کے لیے کیا مناسب نہیں۔ علمِ ابشر کی بنیاد میں کہنا چاہوں گا کہ اخلاقی ہونے سے پہلے، انسان جہانِ انسانی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ نفس، بالخصوص ادب، نوعِ بشر میں ہونے والے ارتقا کی خمی پیدا ہو، بلکہ حقیقت تو اس کے برعکس ہے۔ اگر تقریباً ملاحیت میں چاروں کے مقابلے میں جتنی سرتی ہے تو ادب اور شاعری جو طرزِ نظم کا سب سے بڑا ہیکر ہے، بلکہ اگر اس کو نوکِ انداز میں یوں کہا جا سکے کہ، ہماری لوٹ کا اصل ہدف ہے۔ میں شعر کہنے کی لازمی تربیت کا خیال ہرگز پیش کرنا نہیں چاہتا، تاہم، فائش و ریش اور عوام کے

ورمیں تفریق بھی میرے لیے قابل قبول نہیں۔ اخلاقی اعتبار سے اس قسم کی کیفیت سماج کو غریب اور امیر میں تقسیم کر دیتی ہے، لیکن اگر خالصتاً کسی طبیبی یا مادی بنیاد پر اب بھی سماجی عدم مساوات ہو بھی تو دانش ور نہ عدم مساوات کا تصور بھی نہیں کیا جائے گا۔ دوسرے عوامل کے برعکس ہنر مند نے جس میں اس ضمن میں مساوات کی ضمانت دی ہے۔ میں تعلیم کی نہیں، مقررین کی تعلیم کی بات کر رہا ہوں، جس میں معمولی سی مادیاتی بھی کسی نہ زندگی میں غلط قسم کی وراثت کی ابتدا کا شکار نہ بن سکتی ہے۔ ادب کا وجود ادب کے میدان میں احرام کی پیش بندی کرتا ہے، صرف اخلاقی نہیں بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی۔ اگر سوشلزم کا ایک گز ادب بھی کسی شخص کو سننے دے اور بچانے والے کے متحرک کرداروں کے مابین تقابلی چارٹ دیتا ہے تو ایک ادبی تخلیق، جو موصوفے کے انداز میں بے نیاں ہوتی ہے، اس کو صرف بچانے والے کے ردِ ادبی پر مجبور کر دے گی۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی شخص کو کسی اور کردار کے بجائے کسی کردار میں نیا دور نظر آنا چاہیے۔ مزید یہ کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آبادی کے ہمارے خیر اضافے کے نتیجے میں دور سماج کی روز افزوں تخیل (یعنی فرد کی بدستی ہونی چاہتی) کے پیش نظر ایک فرد کے لیے یہ فرد زیادہ مآثر ہو جاتا ہے۔ جس سے نہیں کہتا کہ میں اپنی عمر کے کسی بھی شخص سے نیا ہو جاتا ہوں، مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ہم عمر کی حیثیت میں ایک کتاب کسی دوست یا محبوب سے نیا ہو کر اس کے قابل ہوتی ہے۔ ایک ادب یا ایک نظم خود بخود نہیں، مگر ایک نکتے والے کا قاری سے کلام (میں کلام کے لفظ کو دوبارہ لکھتا ہوں) بہت آتی ہوتا ہے، صبر سے الگ ہو کر مرد بے ناری جیسا۔ اور ایسے کلام کے لیے میں ایک نکتے والے قاری کے، اور قاری نکتے والے کے برابر ہوتا ہے، اس سے قطع نظر کہ نکتے والے کوئی عظیم شخصیت ہے یا نہیں۔ یہ مساوات شعور کی مساوات ہوتی ہے۔ یہ اس فرد کے ساتھ یہ دنی صورت میں دھندلی ہو یا واضح، زندگی بھر رہتی ہے اور جمعیہ بدیہ مناسب یا غیر مناسب انداز میں اس کے چال چلن پر اثر انداز ہوتی ہے۔ پس جب میں کردار کی بات کرتا ہوں تو میرے ذہن میں کلام کرتے والے کا کردار رہتا ہو یا نکل فصری ہوتا ہے، اس لیے کہ ایک ناول یا ایک نظم، نکتے والے کی قاریہ دونوں کی باہمی تعلق کی پیداوار ہوتی ہے۔

ہماری نوٹ کی تاریخ میں، ہکمان کی تاریخ میں، کتاب کی ہم اشرفی تھیں، بدیہا پیسے کی بجائے کسی پیسے کی ایجاد تھی۔ ایک کتاب ہمیں صرف یہی نہیں بتاتی کہ انسان کی تخلیق کس طرح ہوتی اور وہ کیا کچھ کرنے کے قابل ہے، یہ ورق اسے جس برقی رفتار سے ہمیں تجربات کے میدان سے گزرتی ہے۔ تمام حرکتوں کی طرح یہ حرکت بھی ایک مشترک مقبوضہ (common denominator) سے شروع ہونے والی ایک ایسی پرواز بن جاتی ہے جو خود مقبوضہ ہی کی گیر و ہار سے دل تپ، شعور تپ اور ہمارے عقل تک بلند کرنے کی یہی کوشش ہوتی ہے جو ہمیں جائیداد کی سطح سے نیا رو بند نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ پرواز دراصل انسان ہے ایک مادیوں بشرے کی سمت، شمار کنندہ (numerator) کی سمت، خود بخوار کی سمت، مصلحت کی سمت۔ اس سے قطع نظر کہ ہم کس شبیہ میں تخلیق ہوئے، چہ ہم پانچ بلین کی کتنی تک پہنچ چکے ہیں، اور کسی

انسان کے لیے فتنے کھینچے ہوئے مستقبل کے خاکے کے عدد و کیفی اور مستقبل ہے ہی نہیں۔ اس کے برعکس، ہمارے سامنے ہمارا ماضی ہوتا ہے، یہی ماضی، سب سے پہلے، پولیس کی تمام تر مداخلت کے ساتھ۔

کسی بھی صورت میں، سماج کی حالت، جس میں عمومی طور پر فتنے اور فحاشی عروج پر ادب اکٹھا ایک اقلیت کی چانچا دھنکا، میرے نزدیک، نہ صرف غیر محنت مندر بلکہ خطرناک ہوتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی دوست یا کتب خانے میں تبدیلی کر دی جائے، اگرچہ میرے دل میں یہ خیال اکثر آیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اپنے دماغوں کو ان کے سیاسی منصوبوں کے بجائے ان کے مطالعے کے تجربات کی بنیاد پر چنتے تو آج کرہ زمین پر فتنے ہوتے۔ کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ ہمارے محکمہ حکمران سے پہلے یہ نہ چھپ جائے کہ وہ اپنی خواہش پر کسی کو کس گرو پر چڑھائے گا، ہڈیاں سے سب سے پہلے یہ سوال کیا جائے کہ وہ سوشلسٹ، کپٹن، استبداد کے حامی ہیں یا نہیں۔ اور چوں کہ تمام تر ادب ہی دراصل انسان کے تنوں، دھجج، رگوں کا باعث ہوتا ہے، یہی انسان کے وجود کے تمام مسائل کے لیے ایک معجزہ ترقیاتی بھی ہوتا ہے۔ ہم ارم، ایک قسم کے اخلاقی نیسے کی طرح، ادب ہی کسی فلسفیانہ کھیلے یا عقائد کے نظام سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوتا ہے۔

چوں کہ یہ قوائیسی ماحول نہیں کہ ہم کو خود اپنے آپ سے محفوظ رکھ سکیں، کوئی تحریراتی غلطی اب کے خلاف حقیقی جرغم کا سرمایہ نہیں کر سکتا حالانکہ ہم (ادیبوں کی حقارت، احتساب اور کتابوں کو لڑاؤ آتش کے جانے پر گامدقت کر سکتے ہیں، ادب کے خلاف بدترین خلاف ورزی (کتب کو نہ پڑھنے) کی صورت میں ہم بالکل بے بس نہیں ہوتے ہیں۔ ایسے جسم پر ایک فرد اپنی پوری زندگی پاداش میں دے دیتا ہے، اور اگر کوئی قوم مجرم ہو تو اس کو پاداش میں اپنی تاریخ دینی پڑتی ہے۔ اس ملک میں سب سے ہوئے جس میں مذہب ہر گز رہا جاتا، میں سب سے پہلا شخص ہوں گا جو یہ یقین کرنے پر تیار ہوگا کہ ایک فرد کی مادی فلاح اور دینی حیثیت کے درمیان ایک طے شدہ مجبوری ہوتی ہے۔ مجھے ایسا کرنے سے باز رکھنے میں دراصل اس ملک کا کرہ جس میں پیدا ہوا اور پران چڑھا ہوں۔ اس لیے کہ عسلہ ورنجیہ جیسے خام خام دوسرے کی ہستیوں تک گھٹایا جانے والا مذہبی سرمایہ دراصل ایک سماج کا المیہ ہے جس میں ادب پر قربان مادی ایک اقلیت یعنی مادہ روی فائز روی کی اجارہ داری ظہور کی۔

اس سوشلسٹ پر مزید کچھ کہہ کر میں اس مقام کو ان سرگرمیوں کی یاد سے غماز نہیں بنانا چاہتا جنہیں صرف چند افرانے اپنے ہاتھوں سے بدباد کر دیا تھا اس لیے کہ جو کچھ بھی مصویر صمدی کے پیسے بچاؤ میں رہا میں ہوتا تھا وہ جو بڑی تھوڑی دس کے بنائے جانے سے پہلے ہو چکا تھا۔ ایک سیاسی کھیلے کی فتح کے نام پر جس کی نامحوریت اس حقیقت میں آشکار ہو چکی ہے کہ اس کے حصول کے لیے انسانوں کی قربانی دینی ہوگی۔ میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ میں اس پر، حیاتی طور پر نہیں مگر انسانی کے کلیاتی اعتبار سے یقین رکھتا ہوں کہ جس نے کپٹن کو بہت پڑھا وہ اس کے خیالات نے وہ مسائل پیدا کئے ہیں جو

نسبت اس کے جس نے فزنیس کو بالکل نہ پڑھا ہو۔ واضح رہے کہ جس پر کم و کاست، فزنیس کا ہونا دوستوں، استاذوں، اساتذہ، دانشور، محققین، محاوروں، پرستش، پس والی وغیرہ کو پڑھنے کے بارے میں بات کر رہا ہو، ادب پر تعلیم کے بارے میں نہیں۔ یقینی طور پر ایک پڑھا لکھا انسان ایسے ویسے سیاسی مقابلے وغیرہ پڑھنے کے بعد اپنے جیسے انسان کو قتل کرنے، بلکہ اس کے تجربے میں، اور میرا میں بھی وجدانی کیفیت تلاش کر سکتا ہے۔ لیکن پڑھا لکھا تھا، اس میں پڑھا لکھا تھا، ویسا ہی مقرر تھا اور ماڈرن ٹیک تو شاعری بھی سمجھتا تھا۔ ان سب دوسوں میں جو بات مشترک تھی وہ یہ تھی کہ ان کے قتل و غارت کی فہرست مطالعے کی فہرست سے ملتی تھی۔ قتل اسی کے کہ میں شاعری کی طرف آؤں، اس مقام پر اس بات کا خدائہ نہ کرنا چاہوں گا کہ وہی تجربے کا ایک تنبیہ کے طور پر بیان کرنا چاہیے۔ یہی ہے کہ آج کے یورپ کا سماجی، سماجی، ادبی میں 1917 سے قبل کے سماجی ڈھلچے سے بہت مرثیت رکھتا ہے۔ (اتفاق سے مغرب میں، دوسرے قسام کی طرف کے مقابلے میں انیسویں صدی کے وہی نفسیاتی ادول کے شہرت کی ہیں وجوہات تھیں۔ بیسویں صدی میں وہی میں جو سماجی رشتے ابھرے تھے وہ قارئین کے لیے شہرے اتنے دلچسپ نہیں تھے جتنے کہ ان گزراؤں کے نام تھے جو قارئین کو ان سے متعلق کرنے سے نہ کہتے تھے۔) مثلاً کے طور پر اکتوبر کے انقلاب کے وقت کے وہی کی جو تھیں آج کے سیاست ہائے متحدہ امریکا یا برطانیہ میں موجود جماعتوں سے کسی طرح کم نہیں تھیں۔ دوسرے لفظوں میں، ایک غیر جذباتی مشاہدہ کرنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ تین سو سالوں میں مغرب میں انیسویں صدی اب بھی جاری ہے، جب کہ وہی میں اس کا اختتام ہو چکا ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ اس کا اختتام ایک لمبے کی صورت میں ہو تھا تو اس کی پہلی وجہ تو یہ ہوگی کہ اس قسم کی سماجی اور سماجی تبدیلیوں میں آتی جانوں کا نیا نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اگر بھی کہ ایک ایسے میں صرف ہیروئی جان سے نہیں جانا، اس کی پوری نکتہ جاد ہو جاتی ہے۔

۳

اگرچہ ایک انسان کے لیے جس کی مادری زبان وہی ہو، یہی میں یوں کے بارے میں نہیں کہتا، سماجی فطری ہے جیسے کہ اس کا ہضم، جذبہ بھی اس مقام پر ہے۔ اپنا موضوع تبدیل کرنا چاہوں گا۔ بالکل سائنس کی باتوں پر پیش یہ کہنے کے مقابلے میں جو خرابی ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی کل، انسانی کی بنا پر شعور کو بد عنوان بنادیتے ہیں کہ وہ اتنی سرعت سے اسکی خدائی تن آسانی مہیا کر دیتے ہیں جن میں بالکل صحیح ہونے کی تمام سائنسی فحری موجود ہوتی ہے۔ اسی میں وہ ترغیب ہوتی ہے، مانتی مدد دیتی ہے تو نیات ہوتی ہیں جو اس خدائی کو ختم دیتی ہیں۔ اس ترغیب کا احساس بلکہ اس کا ادراک اور اس کی مظلور کی کسی حد تک میرے کم عصر ادیبوں کا متحد ہوتی ہیں جو اس ادب کے قلم کار ہیں جو ان کے قلم سے صادر ہوا ہے۔ وہ (ادب) نہ تو تاریخ سے فرار ہوا ہے اور نہ ہی فکے کو جھٹلانے کے لیے غش کیا گیا ہے، جیسا کہ ہر نظر

آسکا ہے۔ دوزخ و سحاب کتنا ہے بھلا کوئی بھی آشوب کے واقعے کے بعد موسیقی کی خوشی بنا سکتا ہے؟ اسی طرح کوئی بھی جو وہی تاریخی سے واقف ہے، عرفِ کیمپ کا نام بدس گریبان کا سحاب دہرا سکتا ہے، اور شاہی نذرانہ معقوب جواز کے ساتھ اسی لیے کہ سائنس کے بنائے ہوئے کیمپوں میں جتنے ٹوٹ چان سے گئے ہیں ان کی تعداد و جمعہ منوں کے بنائے ہوئے کیمپوں میں شمار ہونے والوں سے کہیں زیادہ تھی۔ امریکی شاعر وارک اسٹریٹ نے ایک پارٹری پرٹری جراب دیتے ہوئے کہا تھا، بھلا آپ کے حلق سے کھانا کیسے اتر سکتا ہے؟ بہر حال، جس نسل سے میرا تعلق ہے اس نے ثابت کیا ہے کہ وہ موسیقی ترتیب دینے کے قابل ہے۔

دوسری جہاں وقت پیدا ہوئی تھی جب "شوہن" کی شمشان بھیمیاں زور شور سے جل رہی تھیں، جب سائنس کی صداقت جیسی طاقت اپنے عروج پر تھی اور طاقت کی سرپرستی جیسی کیفیت میں نظر آ رہی تھی۔ ہنگر، دودھ، نسل دینے میں کوئی تھی، اس شمشان بھیموں کو مرد کرنے کے لیے اور انسان کے بنائے جتنی قبروں کے جزیروں کو بنانے کے لیے۔ میری نسل کی ایک حد تک، اس بات کا فہم دار ظہور پا سکتا ہے کہ ہم، ہم زخم دہی میں ہونے والے تمام ظلم کو چوڑی طرح راکش نہیں کیے تھے، اور مجھے اس نسل میں شامل ہوتے ہوئے بھی اس مقام پر کنٹرول ہونے پر چھوڑ نہیں دیا۔ اور یہ حقیقت کہ میں اس مقام پر کنٹرول ہوں، ان خدمات کی قدر شاہی کے عوض جو تہذیب کے لیے اس نسل نے پیش کی تھیں، اور اس منزل پر میں Mandelstam کے ایک جملے کو دنیا کی تہذیب کا حصہ بنانا چاہوں گا۔ "ماضی پر نظر ڈالتے ہوئے، میں پھر کہہ سکتا ہوں کہ ہم بتا کر رہے تھے، ایک خالی ٹوٹی، مہیب اور سنگھار جگہ پر اور یہ بھی کہ شعور کی کیفیت کے بجائے وجدانی طور پر، ہم نے قہما کی ہے، تہذیب کے اثرات کو دوبارہ بنانے کی، اس کے جکر اور اندر بیان کو دوبارہ تیسرے کرنے کی۔ اور (اس میں شک نہیں کہ) بھی بھی ہم کو اپنے عصر کی خیالات پیش کرنے کے لیے، اپنے بائبل نئے، یا ہائی ٹیک میں جہاد پر پیکر پر سمجھوتے بھی کرنے پڑے ہیں۔"

شاہی ہمارے سامنے ایک اور راستہ بھی تھا، مزے بگاڑ کا، کنٹرول اور جس کی شاعری کا، اشتراکیت کا اور مافسوں کے گھونٹنے کا۔ ہم نے اگر اس راستے کو رد کیا تو صرف اس خیال سے نہیں کہ یہ راستہ خود مافی کا تھا، بلکہ اس لیے کہ ہم تہذیب کے ان وفاق اور شریعت پر پیکروں کو محفوظ رکھنے کے لیے نذر شور سے سرگرم عمل تھے، جو ہمارے خیال میں اور ہمارے شعور کے مطابق انسانیت کے دکھ کے پیکروں کے بند تھے۔ ہم نے اس کو رد کیا کہ درحقیقت یہ ہماری پٹی پسند نہیں تھی، مگر اس لیے کہ تہذیب کو اپنی پسند اخلاقی ہونے کے بجائے بحالی کی نوعیت کی تھی۔

بدشہد کسی انسان کے لیے یہ ایک فطری فعل ہوتا ہے کہ وہ خود کو کسی تہذیب کا آلہ کار سمجھنے کے بجائے اس کا خالق اور مگر اس سمجھنے لگے۔ لیکن اگر آج میں اس کے برعکس ادعا کر رہا ہوں تو اس لیے نہیں کہ اس صدی کے خاتم کے قریب Fioenus, Lord Shatesbury, Schelling Novais وغیرہ کی تشریح جو تجميع کرنے میں ایک قسم کا فوسل پوشیدہ ہے، مگر چوں کہ عام انسانوں کے برعکس، ایک شاعر ہمیشہ

جانتا ہے کہ مڑی ہوئی زبان میں جس کو وہ شاعری کی کوزہ کہتے ہیں وہ حقیقت نبوت کا نظم ہوتا ہے، اس لیے نہیں کہ نبوت اس کی آواز کا ہوتی ہے، اس لیے کہ وہ زبان کے وجود کی تسلسل کا ذریعہ ہوتا ہے۔ خواہ کوئی اس کو ایک متحرک مخلوق سمجھتا ہو (جو شاید صحیح بھی ہو) زبان بہر حال، اخلاقی پسند و ناپسند کے متیہ کے قابل نہیں ہوتی۔

ایک شخص مختلف وجوہات کی بنا پر ایک نظم لکھنے پر مایوس ہوتا ہے اپنے معشوق کا دل چیتے کے لیے، اپنے اطراف، خواہ زمین کا ایک ٹکڑا ہو یا کوئی ریاست، بکھری حقیقتوں کے بارے میں اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کے لیے، کہ لکھنے والی ذات کی کیفیت کو رفت میں پیش کرنے کے لیے یا زمین پر اپنے موجودہ خیالات کے نقوش چھوڑنے کے لیے۔ وہ ایک جگر (نظم) کو اختیار کرتا ہے، شاید، شعوری طور پر فطرتی کے لیے۔ حسیہ کاغذ کے سطح پر الفاظ کا عمودی جھوم، غائب دنیا میں اس کو اپنی حقیقت کی، اس کے جسم اور جسد کے درمیان توازن کی تلاش ہوتی ہے۔ لیکن ان وجوہات کے باوجود جن کے لیے وہ نظم لکھتا ہے، وہ اس اثر کے وجود جو اس کے رہنما لکھنے والی عبارت قاری پر چھوڑتی ہے، کیسا ہی بڑا اور چھوٹا کیوں نہ ہو، اس کو پیش کا فوری نتیجہ ایک شش کی محسوس ہوتی ہے جو زبان سے برہنہ ماسہ سے پیدا ہوتی ہے: وہ فوری شش جو کہے یا لکھے گئے متنی سے حاصل کی گئی ہو۔

یہ اٹھارہ سنی ہوتا ہے، جبری ہوتا ہے، مگر بیز بول کو کاغذ بھی ہے۔ اگر چہ زبان ہمیشہ عمر میں اوج سے بڑی ہوتی ہے پھر بھی اس کے ہنسنے میں ایک نظم اچھے مرکز گریہ قوت ہوتی ہے جو اس کے عارضی وجود اور اس کے مستقبل کی ممکنہ طوالت سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اس مکان کا قیمن قوم کے تقداری نظم سے اتنا نہیں ہوتا جو اس میں بات کرتی ہے (اگرچہ کبھی کبھی اس سے بھی ہوتا ہے) جتنا کہ اس میں لکھی جانے والی نظمیں کے معیار سے ہوتا ہے۔ اس موافق پر چنانچہ اور روشن لکھنے والوں کو قدامت کو یاد کیا، ماننے کو یاد کیا کافی ہوگا۔ اور وہ کچھ جن مثال کے بغیر، آج کل دینی و راہنمائی زبانوں میں تخلیق کیا جا رہا ہے ان زبانوں کے وجود کو اگلے ہزار میں تک محفوظ رکھے گا۔ میں اس بات کو دہرانا چاہوں گا کہ کسی زبان کے وجود کا ذریعہ شاعر ہوتا ہے۔ وہ جیسے کہ میرے معشوق آلمن نے کیا تھا کہ اسی (شاعر) کی وجہ سے یہ (زبان) زندہ رہتی ہے۔ میں، جو یہ طرز میں لکھ رہا ہوں، ہوتی نہیں رہوں گا، نہ کہ آپ جو اس کو پڑھیں گے۔ عمر وہ زبان جس میں یہ لکھی جا رہی ہیں اور جن میں آپ اس کو پڑھیں گے باقی رہے گا، صرف اس لیے نہیں کہ نبوت انسان سے نیا وہ عمر سے تک زندہ رہتی ہے بلکہ اس میں تبدیل ہونے کی حد حیرت نیا وہ ہے۔

وہ جو ایک نظم لکھتا ہے، اس لیے نہیں لکھتا کہ اپنی آنے والی نسلیں کی وجہ سے شہرت حاصل کرے گا، اگرچہ وہ کثیر اس کی تمنا کرتا ہے کہ اس کی نظم، ہم از ہم ایک محققہ و قلم کے لیے ہی باقی رہے گی۔ وہ جو ایک نظم لکھتا ہے، اس لیے لکھتا ہے کہ زبان اس کو اس قدر سے بیا ایک سطر کے بعد وہ سبھی سطر کا مدد ہوتی جاتی ہے۔ نظم شروع کرنے وقت شاعر کو علم نہیں ہوتا کہ جو کچھ ہوگا، اور کچھ وہ اس کے اعتماد پر بہت متعجب

ہوتا ہے، اس لیے کہ نظم اس کے وقوع سے کہیں زیادہ اچھی ملتی ہے۔ اکثر اوقات اس کے خیالات اس کی
توہمات سے کہیں زیادہ آگے نکل جاتا کہتے ہیں۔ لارنس وہ بعد ہوتا ہے جب زبان کا مستقبل اس کے
چنے خاص پر حملہ آور ہوتا ہے۔

جیس کہ ہم چاہتے ہیں، شناخت تین طریقوں سے ہوتی ہے۔ تخلیقی، وجدانی اور وہ طریقہ جو کہانی
تخلیروں کے عم میں چھوٹتی، کہانی۔ ادب کے دوسرے پیکڑوں کے مقابلے میں شاعری، جو اچھ رہے، وہ
اس وجود سے ہے کہ یہ ایک وقت شہت کے عین طریقوں استعمال کرتی ہے (جیسا کہ طور پر دوسرے اور
تیسرے طریقے کی طرف کھینچتی چلی جاتی ہے)۔ اس لیے یہ تینوں طریقے زبان میں ویسے گئے ہوتے ہیں،
وہ ایسے اوقات بھی آتے ہیں جب کسی واحد لفظ، کسی وعدہ قافیے کی بنا پر نظم کھینچنے والا خود کو ایسے مقام پر پاتا
ہے جہاں اس سے پہلے بھی کوئی اچھا نہیں نکلتا تھا، شاید جس کی اس نے بھی تمنا کی ہوگی۔ وہ جو ایک نظم لکھتا
ہے، اس لیے لکھتا ہے کہ شعر لکھنا شعور، وہ خیالات کو اور کائنات کے درک کو غیر معمولی طور پر تیز کرتا ہے
اور ایک بار ایسی تیزی کا گر تجربہ ہو جائے تو کوئی بھی دوبارہ ایسے تجربے کی بجائے کر دینے کی ضرورت کے
قابل نہیں رہتا۔ گویا ایسے عمل پر انحصار پر مجبور ہونا ہو جاتا ہے، اسی طرح جیسے وگن شپک اور مے شاری
پر انحصار کے لیے مجبور ہو جاتا کرتے ہیں۔ ایسا غلطی جو خود کو زبان پر اس قسم کے انحصار پر خود کو مجبور پاتے،
میرے خیال میں اسی کو شاعر کہا جاتا ہے۔



دولے سوئیکا

اعترافِ کمال۔ جو پل وسیع تہذیب کے تناظر میں اٹھارویں صدی کے سرچشمہ عالم سوئیکا کو ڈرامے کی صورت عطا کرتا ہے۔

مانچیکریا ڈراموں کے سوئیکا نے پچاس برس کی عمر میں ہی اتنا متنوع اور مختلف النوع ادب تخلیق کر دیا تھا کہ اس کا سب سے مشہور ڈراما انعام اس کا مقدر بنا۔ خاندانی پس منظر، پرورش اور تعلیم نے سوئیکا کو ایسے مخصوص حالات پیدا کیے جن میں اس کو ادب کی تخلیق کے بہترین موقع ملے۔ سوئیکا کا خاندانی منسلک مانچیکریا کے یوربا (Yoruba) قبیلے سے ملتا ہے جس کی روایتیں، رسوم، معاشرتی انداز اور تارکین رہنے پھرنے کے روم کے غلطے کے باوجود سے چلتے ہیں۔ سوئیکا کی تعلیم اور تربیت مانچیکریا، یورپ میں ہونے کے باعث وہ مغربی یورپ کے معاشرے سے مانوس ہوا جو اس کے مضامین کے مجموعے Myth, Literature and the African World کی خوبی کا باعث ہوئے۔ انگریزی میں لکھنے والے شاعرانہ طرز کے بہترین ڈراما نگاروں میں سوئیکا کا شمار کیا جاتا ہے۔

سوئیکا کے لکھے ہوئے ڈراموں میں A Dance of the Forests اور Death and the King's Horseman قابل ذکر ہیں۔ پہلا ڈراما افریقا کی موسمی گرما کی باتوں کے خوابوں میں آنے والے رشتوں، بھتیگوں اور خداؤں کے بارے میں ہے جس کے سب سے مقامی قبائلی رسوم و رنجیں (ایڈیٹر تھا اول

کے دور کے) انگلستان کے ماحول سے متعلق ہیں۔ دوسرے ڈرامے کا ہیرو ایک موبیل فون کا بیانیہ ہے۔

سوزکا کے صرف ڈرامے ہی شاعرانہ انداز میں تحریر سے مزین نہیں ہیں، اپنی غزلوں کے کئی مجموعوں میں وہ ایک بڑے امتیازی شاعر کے طور پر بھی ابھرتا ہے۔ ان میں قابل ذکر Danre اور Other Poems ہیں جن کے مرکزی موضوع، تئیں اور غریب کے درمیان تنازعے کا ایک نمونہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

غزلوں کے مجموعے A Shute in the Crypt میں سوزکا اپنی انسانی اخلاقی قیامت میں نظر آتا ہے۔ یہ نظمیں اس وقت لکھی گئیں تھیں جب سوزکا خانہ جنگی میں اپنے مخصوص رویہ کی وجہ سے قید میں تھا۔ یہ نظمیں ذہنی، انسانی، باطنی، غصے اور غموں کے دہانے میں شاعر کے نظریے کو پیش کرتی ہیں۔ ان ہی حساسات کی ترجمانی اس دور میں لکھی ہوئی نثر The Man Died اور Prison Notes کے ذریعے ہوئی ہے جو خود ایک اعلیٰ نثر کے نمونے ہیں۔ انسانی اعتبار سے بھی سوزکا ایک اعلیٰ پائے کا مصنف ہے۔ اس کے ہاں فوٹو، اطفال اور منفرد طرز نگار سے جس کے ذریعے وہ اپنی جذباتی اور کائنات دار طور کو ایک طرف کی خاموش شاعری اور زندگی سے بھرپور تاب ناک نثر میں پیش کرتا ہے۔

وہ لے سوزکا 1934 میں انجیر کے شہر ایبادان (Ibadan) کے قریب Abeokuta میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انگلستان کی یڈز یونیورسٹی میں داخل ہوا اور وہاں سے ڈکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ بعد ازاں اپنے چھ سالہ قیام کے دوران لندن کے مائل کڈت ٹھیٹر میں ڈرامے کے ماہر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد ورائٹنگ (Rockefeller) وغیرہ پر ارتقا ڈرامے کی تعلیم کے لیے انجیر واپس پہنچا۔ اس دوران ورائٹنگ کی مختلف یونیورسٹیوں میں تھیلی ارب ورڈ ماہی پڑھاتا رہا۔

انجیر کی خانہ جنگی کے دوران سوزکا نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں اس نے جنگ بندی کی غلطی کی تھی۔ اس وقت پر سوزکا پر ہیڈ لائن کے باغیوں سے ساز باز کا الزام لگایا گیا اور اس کو پکڑ لیا، وہ کے لیے قید کر دیا گیا تھا۔

سوزکا نے ڈرامے، ناول اور مضامین کے جس مجموعے شائع کیے جن میں انگریزی میں آٹھ سو ادب بھی شامل ہے۔ اس کے بہت سے ڈرامے انجیر اور برطانیہ میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ سوزکا ابھی بہ قیامت ہے اور انجیر میں قیام پزیر ہے۔

ضیافت سے خطاب

اراکین و دوادب شای، خیر تین و حضرات!

اس واقعے کا بولا حتی تھا کہ ایک دن ماروئی اور فائی دنیا میں میں، بالخصوص وہ خط جس سے Yoruba نقل کیا ہے، سوینیڈن کے چارے پر بغل گیر ہوں گی۔ میں، جسکی حد حتی سچائی کا ترجمہ ہوں، اس کی بہت سادگی کی وجہ سے کہ مجھے صحیح فیصلہ کرنے والی رہے Ogun ہے جو خدا سے تعلق۔ تخریب کا، غما اور رعایت کاری کا۔ اس خدائی نے وقت کی شرائط کی میں آپ کے رکنس داں القریہ نوٹیل کو سوجی یا تھا، اور پی دسری سائگی خدائیوں کے لیے، جو ہم فائی نوکمی سے دوبارہ تہجد ہو جائے کے لیے ہے چہن تھیں، ایک چھڈائی و اسکی ہے ترشی سے پاک کیا، اور ڈاکٹار کی مدد سے مکان کے قلب تک راستہ نکالا تھا۔ شمری کے حوالے سے، اپنے مائتروں کی خاطر میں نے اس تخریب میں Manre کے عنوان سے شرکت کی تھی۔ آپ نے اس تخریب کا آنکھوں دیکھا حال، جو Ogun Skugga کے نام سے سوینیڈش زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے، پڑھا ہوگا۔ اگر نہیں تو میرا مشورہ ہے کہ قریبی کتب فروش سے آپ مارکی سے ملا اس خرید کو حاصل کریں، جو یقینی طور پر Ogun کو آپ کے نظم سوجد افریڈ نوٹیل کا پیش رو بیان کرتی ہے۔

میں بالخصوص اس پر اصرار اس لیے کر رہا ہوں کہ اگر آپ ان سڑکوں پر چہل قدمی کریں، یہ سڑک ہوم کے بوتلوں کی کھڑکیوں میں جھانک کر دیکھیں تو آپ کے ذہن میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ میرے وطن، مانچیریا نے، اپنے بہت سے مسائل کے حل کی تلاش میں، اپنے ملک کی تقریباً نصف آبادی کو سوینیڈن منتقل کر دیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ وہ یہاں محض اسی فطری جستجو میں آئے کہ وہ اس سوجد کی اصل قومیت کے بارے میں معلومات کریں۔ اس لیے کہ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ Ogun نے تنے زبردست راز کو Yoruba کی نقل کے بجائے ایک سوینیڈش باشندے میں کیوں منتقل کر دیا۔ ہمیں احساس ہے کہ اس مقدس روح کے لیے سوینیڈن گئے کو ہزار ایک پکشتش مقام قیام ہیں مگر سوینیڈن کے سر، کی طور پر راکش اس کے عزت کے ہرگز موافق نہیں۔ اور جب کہ یہاں کی آپ وہاں کے جوڑوں میں پتھر گرمی اتارنے میں معاون ہوگی، ہم جانتے ہیں کہ وہاں کا پینے کا شراب Palm Wine کو نہیں چھوڑ سکتی۔ میرا خیال ہے کہ ایک نہ ایک دن ہم اس ماز پر سے چرہ ہٹانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس

دوران، بحر حال، ہم اس پھیلتے گوسوام کرنے پر ہی قناعت کریں گے جس نے ہمارے یہاں موجودگی کو ایک مثبت واقعہ بنادیا ہے، اس لیے کہ انفریڈیویشن کی یہ خواہش تھی کہ اس کے بے حد ہوں تاکہ ہم کی بھی اسان پرتی میں تبدیلی، اسانوں کی زندگی کی بہتری پر پہنچ سکیں۔ یہی سبب ہیں Ogun سے مناجات ہے، جو نچوڑ ہے جسکی سفاقی نصرت کی دعوتی کا۔ دوسری کوششیں میں شریک ہوتے ہیں کہ اس امر میں کاغذاتی روپ ہمارے زمانے میں سرخ رویوں کا، جو ہمارے کمرے میں پر ہوش ایک ناقابل گرفت پردے امن کو چال میں پھانسنے کی کوشش میں رہتا ہے۔

خطبہ

مانشی کو اپنے حال سے مخاطب ہونا چاہیے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ لندن کے ایک فیمین میں، جب کہ کھیں شریٹ ہونے ہی، لہذا شائقین کی موجودگی میں، ایک حیرت انگیز مشہور فاسٹ ہو۔ یہ کہ ایک اداکار نے اپنا کردار کرنے کے لیے اسکی پانے سے انکار کر دیا۔ کھیاں کی شروعات ملوث ہوئی۔ ایک ساتھی اداکار نے اس کو اسکی پر لانے کی بہت کوشش کی مگر وہ جٹ دھری سے انکار کرنا بنا۔ پھر ایک جہد شریٹ ہوئی۔ کھیاں میں شامل ایک دوسرے اداکار کا خیال تھا کہ اگر انکار کرتے ہیں تو اداکار پر موجود شائقین کے سامنے اپنا کتبہ spotlight سے مانشی لال دی جائے تو اس کے پاس دوسرے اداکاروں کے ساتھ کھیاں شریٹ کرنے کے علاوہ چارہ نہیں رہ جائے گا۔ پھر اس نے انکار کرنے والے اداکار کو اپنا کتبہ اسکی کی طرف گھسیٹنا شریٹ کر دیا۔ اس کو چوری کامیابی تو نہ ہوئی، لیکن کسی قدر کھپائی مافی شریٹ ہوئی۔ انکار کرنے والے اداکار بہت شرمندہ ہوا، اس لیے کہ شائقین کے ایک حصے کو یہ سمجھنا پائی دشواری دے رہی تھی۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ کھیاں خود ایک حادثے کے بارے میں پرہیز گوئی پر مبنی تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کھیاں کے اصول کچھ ایسے تھے کہ تمام اداکار کام روک دیجے، کسی ایک حصے پر نظر پانی کرنے، شائقین میں سے کچھ افراد کو اسکی پر آنے کی دعوت دیجے، کردار متعین کرنے اور تمام شائقین کے سامنے کھیاں کے پاس کو تبدیل کرنے میں چوبی طریت کرنا تھی۔ اس لیے مانشی اداکار کھیاں میں شامل کرنے کے لیے اپنی خواہش کو کھیاں کی شکل دے سکتے تھے جو انھوں نے ذوق و شوق سے کیا۔ قبل اس کے کہ کھیاں کا تنازعہ فیہ منظر پیش ہوتا، ماراں اداکار اسکی چھوڑ کر چکا تھا۔ اس نے کھیاں کی آزمائی مشقوں کے دوران ہی بتا دیا تھا کہ وہ اس میں شامل نہیں ہوگا۔ اور آخر میں یہی ہوا مگر یہ واقعہ اس کے لیے اہمیتیں

بعد تک دوسرا بنا ہوا۔ اسے محسوس ہو کہ اسے اپنے اور دوسرے اداکاروں کے درمیان ہونے والے اس تصادم کو سمجھنا پڑے گا۔ ایک طرف تو اس کو غصہ تھا کہ اس کو ایک واضح حقیقت سے آنکھیں چوڑھ کر مٹنے والے آدمی کی طرح پیش کیا گیا، سداوتہ برائی چاہ کا شکار رہا ہے، کہ کوئی سلاک حقیقت اس کا راستہ روک رہی ہے، یا اس واقعے سے نمٹ کر شاید کوئی جذباتی الجھاؤ اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ اس کی پیشہ ورانہ فرائض میں خلل انداز ہو رہا ہے۔ یاد رہے، اس کو علم تھا کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ آج تو یہ تھا کہ اس کے نزدیک اس کھیل میں ان شائقین کے سامنے جو مجموعی طور پر سب انسانیت کرنے والی واقعیت کے ذریعے دار تھے، جو کچھ اسٹیج پر پیش کیا جاتا تھا اس کے لیے نہایت بھولہ انداز اختیار کیا جا رہا تھا اور اس کی موجودگی کی وجہ سے شدید بے چینی کی وجہ بن رہا تھا۔

اب آئیے، ہم اس واقعے کے رازوں میں سے کچھ سے پردہ اٹھا کر اس کا ایک ٹھیک صورت میں دیکھتے ہیں۔ (زمرہ بحث) منظر نویس کوٹھیمبر، لندن، کا تھا۔ یہ یوم انقلاب کی ان راتوں میں سے ایک رات تھی جس کو تجربات کے لیے نقش کر دیا گیا تھا، ایک قابل ذکر ٹھیکر چارٹ دیوان کی تاریخی اختراٹ نے اس دور کے برطانوی ٹھیکر کیسٹریڈ میں گرہ لگا تھا جس نے John Osborne, N. F. Sampson, Edward Bond, Arnold Wesker, Harold Pinter, John Arden اور اس وقت کے قدامت پسند برطانوی فرائیڈ کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ خاص اسلوب سے دور Samuel Beckett اور Bertolt Brecht کا نمونہ پیش جمعیں نظریاتی چھوٹ بنالیا گیا تھا۔ اس خاص موقع پر، وہ ایک شام زندہ ٹھیکر کے نام وقف کر دی گئی تھی اور Eleven Men Dead at Hota کے عنوان کا مرکزی کھیل پیش کیا گیا تھا۔ سر رے کا کارپیشہ نہیں تھے، پھر بھی ان میں نیا دور لکھنے والے تھے جن کے آج کے اشتراک سے کھیل کے یہ لواحق نظر کے تشکیل دیے ہوئے ہیں۔ ماضی کے غویل عمر کے سیاست سے واقفیت رکھنے والوں کو یاد ہو گا کہ "ماڈا، ڈا" آزادی کی جدوجہد کے دوران کیسیا کے Camp میں کیا ہوا تھا۔ برطانوی استعماری طاقتوں کو یقین تھا کہ کیسیا کے باشندوں کو محسوس طور پر بجائے گھسے گھپ میں قید کر کے، ماڈا، ڈا کو تحریک کو کچل دیا جاسکتا ہے۔ ایسا ہی ایک گھپ Hota Camp تھا اور اہم واقعہ یہ ہو تھا کہ قیدیوں میں سے بیمار ماڈا گھپ کے گمراہ سپاہیوں کے ہاتھوں شہداء کے وارث بن گئے تھے۔ پھر حسب معمول تحقیقات شروع کی گئی تھیں اور اس کی رپورٹ کے متن پر ہی اس کھیل کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اب ہمیں غور و مت ہے صرف اس اداکار کو بچھڑنے کی جس نے اپنا کردار ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ کے رومزموجود اس خدشہ کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ مجھے یہ واقعہ اس قدر اس منظر کی طرف یاد ہے، جس طرح کہ اداکاروں کو وہ بھی ایک وقت ہمیشہ یاد رہتا ہے جب کہ کھیل کی پیش کش کے دوران انھیں نہ صرف بڑے جانے مکالموں میں سے کچھ سہریں بھول گئی ہوں، بلکہ کھیل کی وہ منز بھی تھی جس میں بھولتی۔ مجھے جو کردار سنا چکا تھا وہ گھپ کے ایک رکھالے سپاہی کا تھا، یعنی ایک تار کسے والے کا۔ ہم

سب بڑے بڑے ڈنڈوں سے لیس تھے اور جب ایک ماویٰ ایک سپاہی کی گولی پر جا رہا تھا تو سارا کام یہ تھا کہ ہم کیمپ کے ایک گودے قمر کے حکم پر اپنے ڈنڈے آہستہ آہستہ بند کریں، اور تقریباً سمر و مذاق کی طرح، قیدیوں کے کاندھوں اور گردنوں پر ضرب لگا کر شروع کریں۔ یہ ایک اور بڑے حقیقت منظر تھا۔ مشقوں کے دوران بھی، یہ حال ظاہر تھا کہ یہ ہمیں ایک اور بڑے حقیقت پُرپ نظر (surrealist tableau) دیکھ رہا تھا۔ ایک موٹے کتے ایک ریل گاڑی پر چڑھے ہوئے، جذبات سے عالمی فوٹو آٹ کتا ہے، جو مطلقاً واقعی رنگی گئی تھی، انا کر کی سے شروع کرنے والے اور پہلے جانے والوں کے ذہنوں دوران کی کیفیت کا پوری طرح اندازہ ہونے لگا۔ صبح گودے اندروں کا چھٹا سا ایک حلقہ تھا۔ ان میں سے ایک چٹائی (اور سے ڈنڈے کے) یہ دیکھا جا رہا تھا کہ ایک انسان کو کس طرح چلا جائے کہ اس کے جسم پر قابل دیدنیات نہ ہونے پڑیں، کہ قیدیوں کا ایک گروہ اپنی حلقہ اپنا غیر متشدد حربہ استعمال کرنا چاہتا تھا۔ انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ جب تک کیمپ کے حالات بہتر نہ بنادے جائیں، وہ وہاں کام نہیں کریں گے۔ تو وہ سب زمین پر پڑا دے کر بیٹھ گئے اور وہاں سے بچے سے انکار کر دیا، ورنہ مویشی احتجاج کے طور پر ان سب نے اپنے ہاتھ گھٹنوں کے پیچھے باندھ لیے۔ احکامات جاری کر دیے گئے۔ کالے چوکی ٹائٹس کے ایک گروہ نے ان کے ہاتھ دھک کے اندر اپنے ہاتھ پھنسا کر، ان سب کو خوب زد و کوبوں کی طرح کھینچ کر پھرا دیا۔

پہلے جانے والوں کے چہرے تاثرات سے ڈھکی چڑھی ہیں۔ ان سب کا فیصلہ ہے کہ وہ کسی قسم کی مزاحمت نہیں کریں گے۔ چٹائی شروع ہوتی ہے۔ چوچہ، پھر بائیں پہلو پر، بازوؤں پر آگے پیچھے، دائیں بائیں ایک ترتیب دار آہنگ کی مانند۔ اندر سے ہم آہنگی کے ساتھ بریں رہے ہیں۔ گودے چاہوں کے چہرے سے پیشہ وارانہ مستعدی سے چمک رہے ہیں، ان کے، ذوقی کبھی کبھی سستی کا مظاہرہ کر رہے ہیں، کراہ دھمکے گروہ کو یہ کام سنا چاہیے، اس طرف ڈانٹا دیا جاتی ہو جہاں ڈنڈے نہیں پڑے تھے۔ متحرک کاری کے اعتبار سے یہ ایک طویل قلم جیسا مظاہرہ تھا۔

پھر سرکار کے مطابق ایک تقابلی منظر یہ دکھانا تھا کہ قیدی کس طرح سرے۔ ان کے قول کے مطابق وہ سب بے مدد ہو کر گر پڑے تھے گویا نہ ہر بلا پانی پینے سے ان کی موت واقع ہوئی۔ تو ہم سب نے سرکاری قوں کے مطابق یہ منظر بھی پیش کیا۔ قیدی شدید جیاس کے عالم میں، ایک قطار میں پانی کی گاڑی کی طرف بڑھتے ہیں۔ جب وہ تین پانی پانی کر دینے کے باعث تڑپتے ہوئے گرتے ہیں تو انسان محنت چوکی ٹائٹس کی مانند قیدیوں کو پانی پینے سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں، گروہ سب پیدل سے تھکے بد حال ہو رہے تھے کہ انھیں اپنی سلامتی کی بھی پروا نہیں رہی اور وہ اسی طبع سے چپ چاپ پانی پیتے رہے۔ پانی کر گئے وہاں کی کہ انھیں، اور بے مدد ہو کر گرا اور پھر شدید تکلیف دہ موت۔ یہ قہر کیمپ کے گورنوں کا سرکاری بیان۔

مختصر و معید بالکل سادہ سا تھا، مخصوص انداز کے مطابق انھیں کا ایک آرمیڈ طریقہ کار۔ تو پھر مسئلہ کیا تھا؟ جی، جو بڑے خیال میں، سارے کھینے والوں کو متاثر کرتا ہے۔ کب کہیں کی پیش کش کی تفصیل کی

جاتی ہے؟ کب فناءیت حد سے نہ دو گمان پر منحصر ہوتی ہے؟ تھیل کی پیش کش کے بعد کیا ہوتا ہے؟ بھی میں نے تھیل کی تہذیب کی جس قابل ذکر خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے ہائیکف کی حیرت برآتی ہے، وہ احساس کر میں یہاں سب سے آچکا ہوں، میں اس کا چشم دید گواہ ہوں، ماضی کے لیے حال کو دوبارہ پیش کرنا ہے۔ اس صورت میں ہمیشہ موجود ہونے کا احساس چاہو تو نے کی جھڑپ چھوٹ، آزدی کی سکھ وادوں جو سکھ ہے، بے بالخصوص ناظرین کے لیے ایک خواب آور کیفیت۔ یہ دوسرے کس کی دور کی پیش کش کے وقت اور وہاں موجود ناظرین میں شاید تو لاگوں کے لیے آزدی کے برائے ایک جگہ کی موت بنو تو پر محض ایک خراش (کی علامت) تھی، ایک تھیل کی بے ایک چاروں سو تھی، ایک وطن پرست کی شہادت تھی۔

پھر بھی، ہم یہ جانتے ہیں کہ اس کوششیں تہذیبوں کی شروعات کر سکتی ہیں، کہ کسی قسم کی شادی کی اور میں فی حاشیہ ترقی کی تھیل کا عمل لاپرواہیوں میں غرت کا، نتیجے کے طور پر تہذیب سے داخلی کی شروعات کا، اور خلائی کا مدح ہو سکتا ہے۔ اس میں سوچنے پر پریمنٹ میں غرت سے تجربے سوالات کے لئے تھے۔ دشمن جیوہ افراد نے، انسا بیت پر متوں اور اصلاح پر متوں نے، غلط کے شکار وگوں کے حق میں انسانی کی آواز اٹھائی تھی۔ کچھ لوگوں نے تو سرکاری محبت کا پول کھولنے کے لیے دنیا کا سرنگ کیا تھا۔ یہ شدید تکلیف جس نے میرے تخلیقی ارادے کو مفلوج کر دیا تھا، ناظرین سے پوچھنے لگی اور بابا آخر، اس نے، ورثہ شدہ انسانیت کے لیے، میرے احساس کی جھڑپ میں بدست آمد دہوں کو تلاش کرنا۔ اس نے اس تھیل کی پیش کش کے لیے ایک حساب ہاشنگی کو ابھارا، ایک جہادی کے مسخ شدہ بارہ کی طرح جو کسی صحت مند انسان کے آگے خیرات کے جذبات ابھارنے کے لیے پھیلے ہوئے ہو۔ میرے خیال میں یہی وجہ تھی کہ، اس قابل اس، غرت نہت ذی حس انکار نے میرے احتیاج کو بے اثر کر دیا اور میرے مانتھوں کی قدر میں کا تسخیر کیا تھا۔ یہاں گناہ گویا تمام تر بے دردی اور دھڑلے، وہ متحرک جس کا محض ایک ریشہ تھا، مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ازراہ کرم آپ حضرات اپنے آراء پر پکپکانے والے جذبات اپنے پاس ہی رکھیں۔

بدعہ میں، ایک تخلیقی ذہن کو داخلی بنانے کے، نہایت غمگین عمل کے مقابلے کے طور پر اس واقعے کو مستحکم کر رہا ہوں۔ کہ عمل جو لکھنے والے کو دو طرح سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یا تو وہ کھلی طور پر بھرد ہو جاتا ہے یا پھر نہ وہ راستہ انداز میں با عمل ہونے کی خاطر، قابل قبول حقیقت سے مقابلے کے لیے، قلم کو ٹھیکہ دیتا ہے۔ تو ایک بار پھر Holo Camp میرے بزرگ عظیم کی حقیقت کے اس پہلو تک پہنچنے کے لیے ایک آسان راستہ فراہم کرتا ہے جو فی زمانہ ہرے دور میں عامی امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر اور بھی کہ بھیا تک انتہائی سے، ایک سیاہ غام افغانی (سوتکا) اس مقام پر آپ کے سامنے کھڑا ہوا ہے، اسی سال کے دوران جس میں میزبان ملک کا ایک ترقی پسند وزیر اعظم موت کے گھٹ اتار دیا گیا، اسی میں جس میں Samora Machel اس سرزمین پر قتل کر دیا گیا جو ایسی نسل پرستی کے بڑے دانش کی آخری بنیاد بنا رہا ہے جس نے تاریکی عام انسانیت کو بے حد حساب بدعانی میں جکڑ کر رکھا

ہے۔ Olof Palme کے قتل کی حقیقت کچھ بھی ہو اس کی زندگی کے تئیں کے بارے میں کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ انسانیت کے ایک بڑے حصے کے نفسی جبر و استبداد کے خلاف Olof Palme نے سخت موقف اختیار کیا تھا۔ شاید وہ لوگ، جو اس نفسی عمارت پر براہم تھے، یہ سمجھتے تھے کہ ایک فرد کی موت اس کے مضبوط عقیدے کے بڑھتے ہوئے قدم کو روک دے گی۔ شاید، یہ ایک اور وحشت کی کھینچی ہوئی دبا کا واقعہ تھا جو شدید ضرب دہائی پر، نہ کہ دہائیں پر یقین رکھتا تھا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، سفید فام قبیلے کے ایک معتبر مفکر کو خاموش کر دیا گیا ہے، مگر نقصان تو ہمارا اور آپ، دونوں کا ہوا۔ Samora Machel اور قومی راہنما جس نے اپنے ملک کو جنوبی افریقا کے خلاف صف آرا کیا تھا، اسی نوعیت کے پراسرار حالات کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ سچ، کہ ہم پر اب بھی Nkomati Accord کے آسیب کا سایہ ہے (نیکولائی میخائیل، میں جنوبی افریقا کے شہر Komatipoort میں موزمبیق کے سیاہ فام صدر Samora Machel اور جنوبی افریقا کے سفیر عام صدر PW Botha کے درمیان ہوا تھا جس میں عہد کیا گیا تھا کہ دونوں ملک ایک دوسرے کے خلاف ہجرت کرنے کی سرحد پر تحریکوں کی امداد سے پرہیز کریں گے۔ مترجم) بد قسمتی، کہ اس بحث نے سیاہ فام مشرک کی فوجی تحریک کے فتح یا ہار سے کسی کی تھی۔ اس کے برعکس، اس (Samora Machel) کے سرحد پار گئے دشمنوں کو اس کی آغوش ایک موت پر خوش ہوئی، اس لیے اس کی موت سیاہ فام نسل کے لیے ایک طرف کی فتح تھی۔

کیا یہ محسوس ایک تضاد ہے؟ تو اب آئیے ایک بار پھر Hola Camp کی طرف رخ کرتے ہیں۔ (سناء رو دیکھا گیا ہے کہ) صرف سویشی چھتر چوں یا چ بکوں کا نشانہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح گھڑے، گرسے یا گدھے وغیرہ۔ عموماً اس قسم کے غیر انسانی وجود کی ایسے تشدد سے ہلاک ہوتے ہیں۔ اگر Hola Camp کے تئیں برسیں، یہ بات یقین کے قابل ہو کہ افریقی مزارعت کاروں کو ہلاک کرنے کے لیے نہایت پیچیدہ برائی و نمار کی ضرورت پڑتی ہے، تو انہی منقرضات کے چھپکنی خودی اس بات کا اعتراف کر رہے ہیں، اب تک ساری دنیا کے سامنے جس سے ٹکا کر رہتے رہے ہیں کہ وہ چھپکنی سفید فام نسل پر برائی کی پیداوار Hoa Camp کے بعد سے اب تک اپنے دشمنوں کی دشمنی میں کتنا آگے چل چکی ہے۔ وہ وہاں Sharpeville کے سرکے سے بھی بہت آگے بڑھ گئے ہیں، جہاں انھوں نے فائر ہوتے ہوئے نیچے افقیوں کی پشت پر گولیوں پر ساقی تھیں۔ وہ تو 1930 کے اسی واقعے سے بھی آگے بڑھ چکے ہیں، جب اپنے اپنے منظم احتجاج میں جنوبی افریقا کے سیاہ فام باشندوں نے Dingaans Day کو جسے ڈیونڈر Dingaans کی شکست کے دن کے طور پر منایا جاتا تھا، اپنی غربت گھیر رہا دیوں Nave Pass کو مجمع عام میں مذبح آتش کے ایک مثبت تحریک میں بدل دیا تھا کہ Carriaght Flats کے مقام پر مزاروں راہ داریوں کے جلانے کی پاداش میں ڈرمن کی پیس احتجاج کرنے والے سبھی لوگوں پر لوٹ پڑی تھی، جس میں تقریباً نصف درجن لوگ ہلاک اور سیکڑوں زخمی ہوئے تھے۔ اس کے بعد آتش رانی کی ایک مہم شروع کی گئی تھی جس میں ہزاروں

انسانی باشندوں کو اپنے گھروں سے محروم کر دیا گیا، قید کیا گیا اور ملک بدری کی سزا دی گئی تھی۔ اور پھر 1930 کا حیر بھی تو ایک طرح کی جست تھی، اس برجستہ حقیقت سے جو Naive Pass Law کے تحت کے خلاف ہوا تھا، جس میں گھڑ سوار پلس و لوں نے حقیقت کو منہ دے کر دے پھیل لوگوں کو گھوڑے کی ماپوں کے ساتھ لٹا دیا تھا، ان پر چوبیس برس کے تھے، بھیر گھروں اور جنگی مویشیوں کی طرح سڑک کے کناروں سے ان کی تھوڑی سیوں تک ان کا تعاقب کیا گیا تھا۔ کسی دہشت گردی کا بر عمل، اپنے سر عینہ نہ مار دیتے ہوئے انسانی جانوں کے نیوں کے ساتھ بد ذاتی خود ایک اعتراض ہوتا ہے ایسے بہتر علم کا اور اس عقلی صلاحیت کا جس کا خلاف ہوتا ہے، ایک اعتراض ہوتا ہے یہ ہوتا ہے ہوتا ہے اس چال کا جو بالآخر مظلوم کی فتح پر منتج ہوتا ہے۔

Hola Camp میں کیے جانے والے حیرم کو زمرہ فوجیہ کرنے کی کوشش کے دوران جس پہونے مجھے شدت سے متاثر کیا تھا وہ یہ تھا کہ مختلف سفید فام سپاہیوں کی گواہی کے دوران ظاہر ہو، خواہ وہ کھلم کھلا کہہ گیا ہو یا ان لوگوں نے ہونے والے قتل عام سے، ہڈی صفاق سے اپنے آپ تک رکھے یا کوشش میں کہا تھا، کہ کسی لمحے بھی انھوں نے مظلوموں کو اپنے آپ سے مختلف محسوس نہیں کیا تھا۔ (ج تو یہ قہر) ان لوگوں کی بھی اس حقیقت کا احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ یہ مظلوم لوگ انسان تھے۔ یہ لوگ دوس جاور تھے یہ شاید گھس پھوس کے بنے ہوئے پختے تھے، انسان ہرگز نہیں تھے۔ یہاں میری مراد ان کے نوا یا ان کی آقاؤں سے نہیں، جنھوں نے یہ نوا، دیوانی نظام قائم کر دیا تھا اور ان میں بسنے والوں کے لیے قانون وضع کیے تھے، جنھوں نے مسکند اصولوں کی بندوبست نہیں کی تھی، اور سب کو ہمہ وقت سامراجی مان اڑانے والے ہنگامہ تھا۔ وہ ابھی طرح جانتے تھے کہ قائم مصلحتیں ایک دن فوجی ضرورتیں، جنھیں مجبور تہذیبیں صدیوں بدداشت کرتی ہیں ان کا مقدر تیسرہ مساری ہوتا ہے۔ وہ نیم بشری کھٹک، جس کو مہذب بنانے کی مہم ایثار پیشہ مدبرین کی تھی، (گھریزی کی محاورے کے مطابق) صرف ایک سامراجی لابی تھی جو کیم کے اوپر لگائی گئی ہادی کے مصداق تھی۔ گھرباں، ان میں وہ دیکھ رہے تھے، جو ان کے احیاء بجاتے تھے (سفید فام براعظم سے تعلق Exchmann جیسے لوگ) وہ سرکاری افسر ہیں، کھٹکیں مارتے ہیں، دیکھ کے حاکم ہیں، کسی کی کھوپڑی میں یہاں تصوراتی خد نہیں ہوتا جس میں یہ خیال سنا کہ یہ وہ فام بھی انسان ہوتے ہیں۔ یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہوگا کہ کھٹکی صدی سے آج تک عام جنونی افواج کی سفید فام آبادی اسی مرض میں مبتلا رہی ہے۔ اس مقدم پر اس ملک کے ایک روشن خیال اور انقلاب پسند ذہن کا بے تکلف اور مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

”جب تک میں اسکول میں اپنے آخری سال میں نہیں پہنچا تھا، مجھے اس بات احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ ان سیاہ فام عوام کا، جنھیں ووٹ کا بھی حق نہیں تھا، کسی طرح بھی ساجیت سے کوئی علاقہ ہوگا جس کا میں پر حیر کرنا ہوں یہ یہ کہ اس عظیم انقلاب میں ان کا بھی کوئی کردار ہوگا جو مختصر عیب آہل چاہتا ہے۔ مدہ کار کن جوئی دنیا کے ماتحت ہوں گے، ظاہر ہے کہ سفید فام مذہبی اور معنی ریس کے، تمام پھرنے والے لوگ ان میں

ہوں گے، جو اپنی ٹریڈ یونین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور جنھوں نے میری پارٹی کو روٹ دیا ہے۔
میں کبھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میں کسی مقامی (سیاہ فام) نوجوان دشمن کو بے گھر آنے کی
اور اپنے ساتھ کسی کھیل میں حصہ لینے کا Carnarvon Football Club کی رکنیت حاصل کرنے کی بھی
دھم دس گا۔ ایک فرنی بالکل مختلف سطح کا، بمشکل انسان، ایسے مظهر کا جبرہ لگتا تھا جس میں مجھے، اٹھارہ
نیا دہ سے نیا دہ ماسٹی ہوں۔ مجھے ان سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا، نہ دلچسپی، نہ نفرت اور نہ محبت۔ میرے
خیالوں کی سماجی تصویر میں اس (سیاہ فام فرنی) کا تڑپ بھی نہیں تھا۔ اپنے نالے کے رواجی انداز اس کی
طرح مجھ میں سمائے ہوئے تھے۔“

جی ہاں مجھے پورے یقین ہے کہ ایک افریکان (سیاہ فام جنوبی فرنی باشندے۔ مترجم) سیاہی دہی
اور ماسٹی Eddie Roux کا یہ تجربہ ذات، فریکان کی اکثریت کے نزدیک اتنا بھی دیر ہی ہموار
ہے بغیر پالش کی ہوئی جیسا ہے۔ کوئی خاص لگاؤ نہیں، کوئی دلچسپی نہیں، نہ نفرت اور نہ محبت، اپنے
رواجی انداز پر مکمل انحصار کا نتیجہ۔ متن کا یہ ٹکڑا، اس وقت اس صدی کے پہلے عشرے کے زبان کے گورے
پن کو میں دیکھتا تھا، تقریباً اس وقت کا، جب نوجوان انسان کا اجرا ہوا تھا۔ مگر ایک تحقیقی، شہادت دہی
ہی پاک صاف کیوں نہ ہو، ایسے نقوش سے بچ نہیں سکتی، جب اسے ہوا میں تازہ ہو یا مسما ہو یا جائے۔
اور اب ہم 1986 میں سانس لے رہے ہیں، یعنی تقریباً ایک صدی کی بدحواسی کے بعد جب
Native Pass Laws میں مضمون سب انسانیت کے سنگان کو دھکیلا گیا تھا۔

Eddie Roux نے سیکڑوں، بلکہ ہزاروں ہم قوم افراد کی طرح بہت جلد ترقی کی منزل طے کی۔
اس کے خاندان نے نسل منافرت کے خلاف جدوجہد میں، اپنے شہداء کی ایک فہرست ترتیب دی تھی، اور
میں ایک گونہ درد کے ساتھ یاد آ رہا ہے کہ نسل منافرت کے لیے ہاتھوں نے ایک laser bomb کے
ذریعے Rich First کے قہقہے آزاد پے تھے۔ اسی خاندان کے اور بھی لوگ تھے، Abram Fischer
Helen Suzman - Breyten Breytenbach وغیرہ، شہادت کے گہرے زخم جن کی زخموں میں مریت
کر گئے تھے۔ والٹ ورنہ ادیب، ماسٹس ہاں، عام کاری رہا، سیاست دان سب کے سب اس نتیجے پر پہنچ
مے ہیں کہ ایک سماجی حقیقت کو نہ ٹھہرے اس کے نیچے غیش کی محنت پر رگڑ کر دیکھا جائے ہے نہ اس کو بھلا کر
کے غور پر کاغذ کے سٹکے پر، نہ کیوں پر، نہ اسٹیج پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ سیاہ فام لوگ ایک غیر مبہم
کیثیت کے اسیر ہیں مگر اس موقع پر میں اس موضوع پر گفتگو نہیں چاہتا۔ ہم اس معاشرت سے کبھی طرح
وقف بھی ہیں اور اپنے مشن سے بغلیں بھی۔ دماغ وہ اور لوگ ہیں جن سے شکوک کا یہ موقع نصیب ہو رہا
ہے، صرف انھیں سے نہیں جو اس بدقسمت کمپ کے حصہ میں گرفتار ہیں، نہ ان سے جو باہر رہتے ہیں، یا
شعور کی غلامی میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ بالخصوص وہ جو بے حیا شوہر ہندی کے ساتھ مبہم اخلاقی
تعمیل بجا کرتے ہیں جو استعداد فراہم کرتے ہیں ان کو، اس نہان میں بے عملی کا استعمال کریں،

جس کا سیکنی تجربی مرض۔ ثانی ہے۔ ذاتی طور پر میں ان پابندیوں کو خدائی طور پر برداشت کرتا ہوں۔ اور ہم کیونکہ ایک دوسرے کی زندگی کے بارے میں، جس کے قول کے مطابق، مشرقی یورپ کے ایک ملک پر کانگریس ہونے والی معاشی پابندیاں نسل منڈات کی کھڑی جنوبی افریقا پر کامیاب نہیں ہوں گی۔ وہی انسانیت کا ماہر جو دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ پر گانا بجاتا ہے، پولینڈ کو تھک رہے ہوئے جب کوئی گانا گاتا تو زندہ رہنے والی آواز لگتا ہے تو وہ اپنے آس پاس کی حالت کا نہیں بدلتا ہے۔ وہ غلی بڑوں اور مرعوب انسان کے ڈرے دار لیڈروں سے اللہ پناہ میں رہتے۔

اگر کسی دماغ کے لیے، جو حقیقت کی ذریعہ بھی دلوے داری سمجھتا ہے، یہ مداخلت کی بات ہے تو سچ کی بہت بڑی مداخلت کی بات ہے۔ کیا حیرت انگیز استخراج کا وہی مذاقہ یعنی وہ جس نے علمی مشاہدے کو متوازن نسائی رویے میں تبدیل کر دینے کی صلاحیت کا مظاہرہ کیا تھا وہی عدوتہ جس نے نصف صدی کے عرصے میں، پورے یورپ میں بعد، وہ، تین پچاسی تیس Bunang Roux, Douglas Wozan, Solly Sachs, Gideon Borna وغیرہ پیدا کیے تھے کیا وہی علاقہ پچاس، ستر، بلکہ ستر میں بعد، انسانیت کی اسکی لڑائی، اتنی غیر تاریخی لڑائی سے گزرتا تھا جس کے نزدیک وہ وہاں، جو کتنے عارفانہ تھے، راہ ریلوں کے ذریعہ قتل کیے جانے لگے موقوفے پر 1919 میں جاری کیا گیا تھا، محض ایک پریشان کنی واقعہ ٹھہرے گا جس کی کوئی دیرپا حیثیت نہیں ہوگی؟

ایسا لگتا ہے کہ کوئی سو روٹی لٹا رہا ہے جو ہر قسم کی سائنسی وضاحت کو ٹکارتا رہا ہے، یا فطرت کے ارتقائی فرماں میں چائیز میں کوئی رکاوٹ ہے، جو انسان کے تمام تر تجربات کی آموزش کے سامنے ایک سوال بن کر کھڑی ہوتی ہے۔ تو پھر ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا ہوگا کہ کون سے واقعات ہوں گے جو اس نسل کے انسانوں سے ہوتے رہے؟ ہم اس خوف زدہ دیکھنے کو کس طرح برداشت کر سکتے ہیں جس میں مارے تاریخی خدشات اور مسائل ارتقا میں ہو ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس قسم کے واقعات و اجتماعات ہماری مدد کر سکیں؟ کیا ہم موت سے پہنچتی کہتے ہوئے اس سے کہیں، اور غور سے دیکھو۔ اپنا در عمل پیش کرنا۔ یہ بات کرنے کی توثیق میں کہ یہی گھڑی ممکن نہیں رہے تھے۔ یہ تو کچھ خاصے کچھ تعداد کیا، بٹن بدلیا، کھڑا اور ان سے سب انسانیت کیا جو بالکل تمہاری جیسی حال میں پٹے پید ہوئے تھے ان کے سر تمہارے جیسے ہی دونوں کے مابین سے طرین تھے اور وہ اپنے وجود پر نہایت فخر سے قائم تھے؟ تم نے اس کی پچھکاری کی سائنس کے کتنے انکالی سائنسی نتائج کیے ہیں؟ اگر تم لوگوں میں باقی ماندہ دنیا کو ایک عظیم کثیر ملی تہذیب کی قدر رکھنے کی بصیرت ہوگی تو اب تک اس بلندی پر، جہاں آج میں بیٹا ہوں، نہ جانے کتنے جنوبی افریقی سائنس دان اور ادیب کھڑے ہوئے ہوتے؟

اپنا کتاب The Adversary Within کے مقدمے میں، جو افریقی ادب میں اکثریت سے اختلاف رائے پر ایک مطالعہ ہے، Jack Cope نے لکھا ہے:

”لجھ موجود کے قاتل میں جب ہم نیچے مڑ کر دیکھتے ہیں تو، انصاف سے کہا جاسکتا ہے کہ 1942 میں امریکی یںڈرز نے ایک نہایت غلط موڑ کا اٹھا۔ خود سب سے زیادہ جیت ماکس مراچی فلم کے ہاتھوں تمام تر تکلیف اور پرشمار جاتی شخصیات ٹھکانے کے باوجود انھوں نے تاریخ سے سرکاری سبب نہیں کیا۔ وہ خود تو سراہی بن گئے۔ انھوں نے مدینہ سے سلطنت اور آباء و اجداد کے چٹھلے سرخ پتھر بنایا۔ انھیں تو لیاقت سے چار جیت سے، نوآبادیاتی استحصال سے، اور جبریت، نسلی ٹکڑ اور بے نقاب منافقت سے، جس کے وہ خود شکار بن چکے تھے، اپنے منہ موٹ لینے چاہئیں تھے۔ وہ انسان صفت اور مہذب اعمال کا پرچار کرنے کے لیے اپنے دلوں سے گھر گھر گئے تھے اور بے حد حساب و سرائی کی حد سے اپنی عقیم عمل داری کو ایک بالکل نئی دنیا میں ڈھال سکتے تھے۔“

اس کے برعکس وہ جان بوجھ کر جس قدر ممکن ہو، پیچھے کی طرف لوٹ گئے۔ یہ ان کی مسطرت کی رعایا کے ایک تیز رفتاری لوگوں کو اپنے ساتھ مدد سے ایک صدی کے عرصے میں جو قوموں سے بہت حقوق ان کو میسر ہوئے تھے، ان (مدنی) سے سب کر لیے، اور ان پر پتی ٹکڑی کو مسلط کر دیا۔“

شاید اس وقت آپ کے ذہن میں Digaan, Chaka اور Digaanwayo، بلکہ Great Trek کی جنگیں بھی تازہ رہی ہوں گی۔ مگر یہاں کہنا یہ ہے کہ اس کے بعد ایک صدی کا عرصہ مڑ چکا ہے، ایک صدی جس میں دنیا نے آگے کی طرف چھلانگ لگائی ہے، اور اگر ہم اس کو ماضی کے مقابلے میں موجودہ رفتار سے اپنے کی پیش قدمیوں کو یہ عرصہ تمام اربعین صدی کے برابر ہو گا۔ اور ہم نے دیکھا کہ ہر نسل کے مرد و عورت دونوں، نصرت اور جذبہ رفیق سے بچائی ہوئی کائنات کی حاکمیت پر قائل ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ انسانیت اور انسانیت، دونوں شعبوں میں، انسان کی حقیقی قوت نے متابقت، اعتدال، تہذیبی و ہم آہنگی، حتیٰ کہ ایک قوم کی حاکمیت سے اپنے اطراف کی معائنہ صورت حال کا مقابلہ کیا ہے۔ اس وقت جب انسان کو اپنے دشمنوں کو چارے اور پانی کی پکار پر دوبارہ کان بھرنے کا سونپا ہوتا ہے تو وہ اپنی غلطیوں پر تکرر کرتا ہے اور بارے ہوئے حد سے کی بائبل کی پیش قدمی کرتا ہے۔ تاریخ کی بدنامی اور خود غرضانہ رویہ کی مطلق اور بھی حقیقتیں بحال کر دی گئی ہیں اس لیے کہ تاریخ کے افسانہ پر مبنی احساس ہو ہے کہ وہ جتنا آگے بڑھ رہے ہیں اتنا ہی ان کی ترقی کو ان کی دشمنوں کے ذریعے روکا دیا گیا ہے جنہیں انھوں نے دوسروں کی تاریخ میں شامل کر دیا تھا۔ خود غرضی نے ترمیم پسندی کے ایک اور دور کا حکم دیا جو ابتدا میں مثیانی اور بے وقعت تھا۔ ٹکڑ ہند میں شکاف ڈالا جا چکا تھا اور اس کا منطقی نتیجہ سیلاب کے ایک دیے کی صورت میں نمودار ہو گیا تھا۔ زمین کے گردو غول میں پھرنے والے سپرد چوں میں ہرے سبب ہونے سے قبل ہی، جنگل کے پھول جگ لگم تہذیبوں نے، ناقابل ہنگامی کی اور ان کے فن نے تہذیب و تہذیب کو جنم دیا ہے۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز قدیم طاحون، تاجروں اور دیو کے مہم جو افراد کے وہ مذکورے ہیں۔ جب یورپ کے علاقے کے معنی کارخانوں کے چیت بھرنے کی

ضرورت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ مخصوص مقام حد کے تحت کہے ہوئے، وہ جوں پر مہم جو افراد کے بیان بھی جو قرون سابقہ سے ہم آہم ہوئے ہیں، بقدر آواز میں ان پر صاف کرتے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور کے متحرک مرد ہوں نے، جو اپنی زندگی وراں کی ضروریات کا خود انتظام کرتے تھے، نظریات سے ایک بائیل کا جوڑ رکھا تھا، جن کا پنا genus ان کے مستقبل کی تمہیداشت کرتا تھا۔

آلودہ اخراجات سے ہزاران تدارکوں کی اچھیاں، جن کا مقصد سیدھی سادگی خود بخود ضروریات کو مہم بخشنا تھا، ان کو خود بخود اس وقت کوآزادی سے تاراج کیا جاسکے، یورپی قہر میں، فلسفیوں، سائنس دانوں اور انسانی ارتقاء کے کلیہ نگاروں کی طرف تہمت عین اشارے کرتی تھی۔ Gobineau کا تو نام مشہور ہے، مگر اس زمانے کے یورپی کتب خیاں کے کہتے، بدنام جیسے افریقی زبان علم کیو دیکھا گیا کہ ان میں یوسپ کے فلسفے کے بہت سے قابل اثر مام، ویکل، ایک، Montesquieu، ہیوم، ویکٹر وغیرہ جگہ اور بھی نہیں بدتر کی کہ ان کی لومافنی تاریخ کے نسخے سے دے بے شمار بے شرم کلیہ نگار شامل تھے۔ جہاں تک انقلاب اور جہتانی جدوجہد کے یہ دو مشہور کلیہ نگاروں کا سوال ہے تو، ان کے اناسیت کے احوال کے اختتام کے تصورات کے باعث، ہم ان کو محاف کرتے ہوئے ان کی تلاش زمانہ سراسر ہی پر اشکال کے پہلے نکال دیں گے۔

بہر حال، جو اس اہل مقصد ماضی کو مورد احوال تکسیر انھیں بلکہ خود کشی پر بائیل لکھو جو موجودہ سما ہے۔ وہ اس بدلتے ہوئے حال سے یہ کہنا مقصود ہے کہ تم پیداوار ہو صدیوں کے مذہب کی، رنج ترین متاعب میں موجود تھی اور خود غرضی کی، جو بد قسمتی سے پاک داند سے پاک بائیزم نامی دوسرے مقصدیت میں موجود رہی ہے۔ مگر دنیا تو نمودار ہے، جب کہ تم جان بوجھ کر بچے بنے رہتا چاہتے ہو، ایک تھوڑی خود کشی بچے کی مانند جو چھ مخصوص قسم کی اندرونی خرابیوں کے باعث ممکن ہے نہ ہو گیا ہو۔ اور دنیا کو اس کے اپنے تاریخی مذہب کی طرف متوجہ بھی کرتا ہے، جس کو اب تک ترک کیا گیا ہے، جو اس بچے کی بدگوار رزورہی کو بددشت کر رہی ہے۔ کیا یہ حیرت کا مقام نہیں کہ ہم صدیوں کی تلاش ورنہ بے نیوں کے شکار ہوئے، اس دنیا سے خلاف کا مطالبہ کرتے ہیں جو آخر ہوش میں آ رہی ہے۔ مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے با مقصد اعمال سے، ایک عنقریب متاعب میں بیکر کو جہنم دینے کے تک سے خود کو بچائے، با مقصود سے لیے کہ اس کی جہنم ہی ہوئی عنقریب محنت (ولاد) آج بھی ایک ایسی مال کے ذریعے غذا حاصل کر رہی ہے، سراسر لے رہی ہے، اسی دنیا کی حقیقت و قوانین سے انسان ہونے کی سند حاصل کر رہی ہے، جو مسترد پارٹیک، بلکہ نام نہاد دھمکیوں سے ان کے ذمہ دے کا ثبات کے، اس پارٹیک ہی ہوئی ہے۔ بس، ہم صرف اتنی سادہ سی بات کہنا چاہتے ہیں کہ غدار کی اس نگہ کو کاٹ دو۔ کسی طرح کسی، اصل بددشتی سے، قطعیت سے، آخری سرہانہ سے، بد جس طرح بھی ہو سکے اس سلسلے کو منقطع کر دینا چاہیے تاکہ یہ بھی کب تک تخلیق ممکن ہو کر مر جائے، یا پھر اپنے آپ کو اس انسانی جہت میں تبدیل کر لے جو بھی تک اس کو مہم نہیں کی گئی ہے۔ اس کی دوسری طرف، ذریعہ غذا کے انتظام سے، اس کو اپنے سادگی عدم توازن، حاشیائی عدم تناسب اور پیداوار کی محنت سے جنگ کے باعث زمین

ہوئی ہو جانے والا۔ اور اگر یہ ان دماغوں اور ان دلوں کے گلے ٹھونسنے کی کوشش کرے جو اس کے وجود کا جب بننے ہیں تو اس کو ایک نامکمل اور ناقص انسان کی طرح قریب کر ختم ہو جانے والا۔

جنوبی افریقہ سے نسلی امتیاز پر مبنی نازی اچھوت مارچ ذہن انسانی کے ساتھ مختلف قسم کے کھیل کھیل رہا ہے۔ مثال کے طور پر ذرا سنئے جب پوری دنیا نے نیشنل منڈیلا کی رہائی کے لیے آواز بلند کی تو جنوبی افریقہ کی حکومت نے بڑے صبر سے فرمایا کہ نیشنل منڈیلا کو انھیں اسباب کی بنا پر قید کیا گیا ہے جس کی بنا پر اسی کی طاقتوں نے روزانہ اس کو محبوس کر رکھا تھا۔ اب دیکھیے، اس قسم کا بیان ان احتیاطی خیالات کو ضرور پسند آئے گا جو کم مقام پر مل سکیں، ہر ایک ذہن میں پیچھے ہٹنے لگتے ہیں۔ بدقسمتہاں نے مجھے ایک عجیب و غریب فلم دکھائی ہے، 'کسیلا' (Rudolf Hess as Nelson Mandela in blackface)۔ ایک ادیب نے انسانییت کو اس قسم کے انتخابی مایوسی سے دھلتے سے ٹھوکر کھانے کے لیے بھرا دیا ہے۔ اس کے علاوہ نیشنل منڈیلا کا، ہڈ ڈوف ٹیس جیسے انٹرنیٹ پر موجود کے موزوں کی طرح ایک بھی ایک ترقی کے مترادف ہے جو اس (نیشنل منڈیلا) کو انسانیت سے کم تر درجہ دیتا ہے۔ یہ نسلی امتیاز کی کچھ ایسی وجوہات ہیں۔

مدیچ ڈاٹ کام ہے جس کا سب سے بڑا مندرجہ Von Brandis Square اور Sharpeville میں کی گئی تھی، کچھ عرصہ پہلے یہاں 'Native Press Rebellion' جیسے ایک مضمون شائع ہوا۔ وہ دنیا جس کو نسلی امتیاز کے خیالات نے بڑی آسانی سے رسوا کر دیا ہے، یہی ہے، بہت سارے خفیہ رکنی امکانات کے وجود جس کو میں کھیلنے والے سے گلے لگاتا ہوں اور یہ ہے ٹھیک میرا اٹھا فیصلہ ہے کہ میں آج اس مقام پر ایسا وہاں ہوں۔ یہی میرے وجود کا قدر فراہم کرتی ہے جو اس قدر خود کشی ہے جو پٹا پیداوار کے انتہائی بڑے بوریز ہے، جو خود اپنے اور اپنے مستقبل کے بارے میں کسی پڑھ لکھا ہے کہ نہ کسی کو کچھ دیتے سے اور نہ کسی کی طلب سے کسی قسم کا خوف محسوس ہوتا ہے۔ یہ ہمارے خفیہ وجود کا مرکز ہے۔ یہ ہمارے دماغ کا منشور ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری نظر نے نہ کبھی مستحکم اپنے خدائی طرف ہو کر دیکھا ہے اور نہ اس کی کبھی ضرورت پڑی ہے۔ اور اگر کبھی ایسا ہوا بھی ہے تو ہم اپنے دماغ سے جو کچھ دشمن کو سمجھ نہیں سکے ہیں، وہ یہ سمجھ سکے ہیں کہ اس کو نبھائیں اس طرح کیا جائے۔ جب نسلی امتیاز کرنے والا جنوبی افریقی سماج دنیا کو یہ دہرا کرانے کی کوشش کرنا ہے کہ وہ اپنے تمام گلی بے امدادہ ہمدردی کے خلاف مددیت کا آخری ضلع ہے تو ایک لطف مند و نیم کے بغیر رہا نہیں جاسکتا۔ یہ نسلی امتیاز پر مبنی و راسخ، اس کو کافی سمجھتا ہے کہ وہ چند غور فرمائی رہنماؤں، نفسیاتی مریضوں اور دوسرے خرافاتی جاگیروں کا جوا کھڑا کر کے خود کو بھی جن کے شکار ہوتے رہتے ہیں اور جن میں ہم ممکن ہو دنیا کے سامنے کی ہر خدمت کرتے ہیں، اس بات پر اصرار کرنا ہے کہ اس کی پیش کی ہوئی مستقبل کی تصویر خالق پر مبنی ہے جس کو صرف اس کی حکمت عملی ہی مٹا سکتی ہے۔ اس کا دھوکہ ہے کہ یہ ایسا برا عقلم ہے جو صرف تباہی پھیلاتا ہے، اس پر وہ فعلی لگتی ہے جس نے دنیا کے محزون علم میں کبھی کوئی مثبت اضافہ نہیں کیا ہے۔ گویا یہ ایک خدا ہے،

جس کا کھڑا ہوا حریص و بھینس حدیوں میں فی یورپی تہذیب کے سر سے پھل پڑپ کر جانے کا اور سچ رہنے والے بھوک کو تنہا رات سے تھوک دے گا۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ ایک سچ جو اس قسم کے خطرے کے مقابل ہونے کا دھوکہ کر رہا ہو، خود بھی اس صدمہ میں پھلنے سڑنے میں بھجا رہے، اس حقیقت سے یہ پردہ کسے آخری دستور کی انداز میں کام کرتی ہوئی، قدرے یورپی کی رو کی عقائد کی پیداوار ہے۔

صرف مثال کے لیے ہم خدا اور قانون، بالخصوص خدا پر، نظر کرتے ہیں۔ یہ وہ کام نسل کے پاس ضرورت سے زیادہ تاریخی جواز ہے کہ وہ اپنے مقدر میں، ماناؤں خداؤں کی مثال انداز میں کے دوسرے میں پڑے۔ اس لیے کہ آج بھی پیسے سے مائدہ شدہ نسل تیز کی ذہنییت، اپنے بے شرم دلوں کے مطابق، اپنی پر تکبر سے ہوئے بے جیسے صرف جیاتی انوریت کی زبان میں ناگہانی سے زیادہ نہیں کہہ سکتا، یہاں تک نہیں۔ ایک طرف (لوح علیہ السلام کے بیٹوں۔ مترجم) حاکم کی اولاد ہے اور دوسری جانب مام کی نسل، اور بھیجی گئی ایک ناقابل تغیر حنت ہے۔ جس تک قانون کا سون ہے، یہ بدتر ہے کہ جو وہ اپنے سیاد کام لوگوں کو اس بنا پر برائی کا حق دینے سے باز کرتے ہیں کہ خود فریبی ہی اس کی قدر کرتے ہیں نہ انھیں قانون سے نیا رنگا ہے، نہ ان کے ہاں افراہی کی اجتماعی ناشی کا کوئی تصور ہے۔

بلکہ چنانکہ، بوٹن خیال، نسل امتیاز کو پسند کرنے والے مطلق غرض و حضرت بھی چاہتے ہیں کہ کسی قسم کے نسل امتیاز کو، جو نسل امتیاز تو نہ ہو مگر *status quo* کو برقرار رکھے۔ اسی دوغلی نسل کے لوگ بھی جو سیاد کام لوگوں کے خیالات سے باز، وقف رہتے ہیں، اس قانون کو مکمل طور پر رد نہیں کرتے۔ اس مرحلے پر میں تہذیبی قلب کے ایک ماہر سرچش کی خود نوشت سوچ حیات کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا، جو اپنے سائنسی کاموں کی بنا پر فوٹنل نو م کے لیے نام زد کیا گیا تھا۔ متنوع درجات پر مسلسل لہ بھیر کے باوجود بھی افریکان قبیلہ پر ایک افسوس نا۔ ماہر افسوس کی شخصیت حاوی ملتی ہے جی Eddie Roux کے لحاظ سے، اس دور کے دواجی انداز کی مکمل تصویر کی پیداوار ہے۔

ان لوگوں میں نہایت شدید اور قابل حیرانہ رنگ خائیں و حضرات بھی شامل ہوتے ہیں۔ میری دلچسپی مثال فرماؤں گے، سچ بھی یہی بیان کرتا ہے کہ ایک افریکان بھی اس درجے پر ترقی یافتہ نہیں کہ وہ مثال کے طور پر خدا یا قانون، کے مدنی اور معروضی وجود کو سمجھ سکے جس میں انسان کی اپنی پسند یا حق بات شامل ہو، جس میں وہ اپنے وجود کو بھی پاتا ہو۔ آگے چل کر وہ کہتا ہے ایک فرد کی حیثیت میں اپنے وجود اور اس کے وجود کے عملی تفاوت کو، یعنی وردی میں ملیوں افریکان کے وجود کی کٹائی کو، ابھی تک پوری طرح سمجھا نہیں چکا ہے۔ لہذا ایک وجود مطلق کے اس کی اپنی شخصیت سے بھی بند رہنے کے وجود کے، درک کی ابھی تک بہت ضرورت ہے۔

اس فوٹ کے فرسودہ دورے کی تردید میں ایک محد بھی خائن کیے بغیر، میں اس سے ایک سبق حاصل کر رہے ہیں کہ آج بھی گاہی گاہی لوگوں سے صرف نظر کرتا ہے جو آج بھی، اس بات پر مصر ہیں کہ

انسان کی شعور کی پیمائش کو انتہائی وہ مدد دیتا ہے جو اس عمومیت کو یک دوسرے وجود پر مبنی طرف مانگ کر دیتا ہے۔ میں لکھتا ہوں کہ ایک نہایت صحت مند مکتب خیال موجود ہے جو نہ صرف اس کی مخالفت کرتا ہے بلکہ اس نے بہت سے ایسے غلطی معاشرے تشکیل دیے ہیں جو اس قسم کی اتر تہیات سے ڈرنا آزماؤ باحوال میں نہ صرف عمل چہیز ہیں بلکہ جن کے قصے بھی حد سے زیادہ انتہائی کیفیت کے حامل ہیں۔

ایک بار ہم اس قسم کے، ذہنی خیالی تجاویزات کے اظہار سے فاسق بھا کر نکال جانے میں کامیاب ہوتے ہیں تو ایک اور قسم کی سمجھوتہ کوشش میں گرفتار ہو جاتے ہیں، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ہماری سماجی تاریخ میں کیسے کیسے تصادمات موجود ہیں، رنگ اور اس کے ہم مذاک کے مطابق (جن کے باعث ہم اس عظیم خراج کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں جو انسانی خد میں پھیل گیا ہے۔ خود وہ تصادمات معاشی یا سماجی زندگی سے تعلق ہیں، سماجی تعلقات یا سرکاری کامیابیوں سے تعلق ہیں۔ مختصراً یہ کہ ان تمام سرگرمیوں میں، جن کو کلی طور پر اس لحاظ سے بہت مختلف امداد میں پڑھا جا سکتا ہے، جو عہدہ نام کے مطابق، عالم پرستی میں آہم اور حوالہ کے، جہت سے قرار دے کر دیا جاتا ہے۔

جب ہم ایسا گدبہ ہوتے ہیں تو ہمیں ایک تجسس حقیقت کا سامنا ہوتا ہے۔ اگر ہم افریقی نو باستانی دور سے قبل کی سماجی تاریخ کا یہ غور مطالعہ کریں، جن میں یہ نئی کلیسیائی اور عرب اسلامی نو باستانی عہد بھی شامل ہے، تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ کسی افریقی سماج نے کبھی اپنے مذہبی عقائدات کی بنیاد پر کسی سے جنگ نہیں کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سیدہ فاطمہ نے اس بنیاد پر کہ ہم تم سے افضل ہیں، کبھی کسی معاشرے کو نہ اپنا مشیخ کرنے کی کوشش کی نہ ہی ان کو مذہب بدلنے پر مجبور کیا۔ ہاں معاشی اور سیاسی محرکات کے زیر اثر سب سمجھ جاتا ہے، مگر مذہب کے نام پر بھی نہیں۔ شاید یہی غیر فطری امداد تھا جو جنگوں کے اظہار کو نہایت کافی داریت، مگر ہمیں اس کا کوئی علم نہیں۔ بلاشبہ دنیا کے بیشتر مذہب کے دو مہمان عمائدین بربر جنگوں اور مقامی محظوظوں کی، جو اب بھی جاری ہیں، تاریخ کے مطالعے سے ہم اس شبہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ سربراہ اور دو فلسفیوں کے مطابق، مذہب صرف جنگوں کی دوسرے خود کو بچاتا ہے۔

اس لیے، بیسویں صدی کے اختتام تک، یعنی مسیحی جنگوں اور جہادی لڑائیوں کے صدیوں بعد تک، جنہوں نے ایک دوسرے کی تہذیبوں کو ماتحت و ناماں کیا، آپس میں ہم آہنگ قدم سماجی تعلقات کو سمجھنا، عوام الناس کی روحانیت کو جیوں کے رونا دہاں دیکھے مذاک کی جاری کردہ پابندیوں کی غلامی پر مجبور کرنے کے لیے انسانیت کی تہذیبوں کو تباہ کیا، اور آج بھی جب ہم قوموں کی جن کے تمام تر دلوں پر ہبانیت و سرسیری تاویلات پر منحصر ہوں، ایک دوسرے کے سامنے صرف آراء دیکھتے ہیں تو ہمیں احساس ہونا ہے کہ حقیقتاً تاریکی کا عہد ابھی تک ہماری دنیا سے گواہ نہیں ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہوا اپنے باسیوں پر، جو پتی چھڑتی پر آشوبت میں ہوں، پندہر جاری رکھے نہ اس کے لیے رہائی احکامات کا جو ریشہ سر سے وہ ایک بھی کھینچ رہا ہے، اس کردار میں کے لیے، جو ایسے قومی رشتے کے فروغ کا شہاں ہو جس کی بنیاد پر مذہب و مشرب

صرف قومیت ہی ہو۔ دوسرے لشکروں میں، ایسے معاشرے کا جدید دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ ہماری اپنی بھی کچھ مخصوص روایات ہیں، مگر ہم نے دوسروں کو مطلع بنانے کے لیے نہیں بھی استعمال نہیں کیا۔ ہم بھی کب حقیقت پسند رہا کے ہامی ہیں اور یہ دنیا مثال کے لیے کوئی اور راستہ نہیں ملے اس کے کہ وہ بھی اس دنیا کو ایک عمل بنیے جانے کے لیے رضا کا مایہ طور پر عظیم قربانی پیش کرنے کی تیاری کرے۔

روایات اور حقیقت دونوں کی روشنی میں اس دنیا کے بارے میں بات کرنے کے لیے ایک بدقسمت دشمن کو اور اس کے بیرونی مددگاروں کو یہ یاد دلا دیا کہ ہم پر غرض ہے، شاید بالکل غور کیلئے من فرس، کہ افریقی دنیا کی پید کردہ ذہنی کے مظاہر کی تاریخ بہت طویل ہے مگر بہت لگانے والوں کی کثرت نے ناقابل مدافعت تہمتوں سے اس کشتی کے سر بھی تھک لیے ہیں۔ دراصل اس نسل پرست تہذیب کو شاید یہ یاد دلانا بھی ضروری ہے کہ ہماری افریقی دنیا، اس کے تہذیبی مائے اور اس کے نفسیہ خیالات نے خود نسل پرستیوں کے سرخسوں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں، ان کی تحریکوں کی جھمبیزوں سے حتیٰ کہ ان کی اپنی سرزمینوں پر اور ان کے سفید فام عوام کے زمینوں صاف اور آلودہ دونوں قسم کے پانی کی معاونتا نہیں بھی جاری کی ہیں۔

نظر ثانی ان کی تہذیبی مضمونیوں میں تھے پڑھوں کی تلاش میں طرح طرح کے، ایسے مقابلے، دوران کے نتائج واجب ظہور تھے ہیں جو نہایت بے شرعی سے ان وجود کو میکا لگی بنانے میں چاہا دیکھتے ہیں، ان کے نئے معنی تلاش کرتے ہیں اور ان کی اپنی فاتح تہذیب کی پیدا کردہ مادی خرابیوں پر قابو پانے کی کوشش میں رستہ ہیں۔ اس کے نتیجے میں دنیا کی تلاش پر ان کے گہرے اثرات دراصل افریقی تہذیب کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے ہیں مگر جن کی بنا پر عادی افریقی دنیا بدنام کی جاتی ہے۔ یہ عمل بھی کبھی ایک افریقی انسان کی معبودوں کی میں معاون ہوتا ہے۔ اس میریت میں کہ افریقی کو ایک شہر وے کے روپ میں ہونا ہوتا تھا۔ جو افریقی شخصیت کے لیے خوف و رہے ناری کے ملے جسے جذبات پر مبنی ہوتا ہے۔ اس قسم کے معبر احوال دراصل سے سیاہ فام لوگوں کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ سیاہ فام نسل نہ صرف اپنے آپ سے واقف ہوتی ہے بلکہ اپنے عرفان پر قناعت بھی کرتی ہے۔ دراصل یہ تو خود یورپی دنیا ہے جو اس قسم کے تقابل سے اپنے آپ کے بچانے جانے کی کوشش کرتی ہے، حالانکہ یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ افریقی دنیا کے تجربے کو سنی پہنا چاہتی ہے۔

اس مقام پر ہم یورپی باطن نگاری کے اس دور کی مثال پیش کرنا چاہیں گے، یعنی اس تحریک کی جس میں افریقی معبودی، موسیقی اور ڈرامے کے طریقہ انداز اس طرح اثر پڑے تھے جیسے بے حد نامناسب، حیرت انگیز طور پر ماقول فی خیالات، تصورات اور سماجی طریقے، یعنی فائدہ، کامل مارکس، بیکون، پطرس، کوکین اور بے مہاراد جذبہ خشک۔ تو بھر Bakora (جو کہ کینیا کی ایک علاقے کی تہذیب) Nmba (شمالی کینیا کا ایک علاقہ) Youruba (مغربی افریقا کا ایک علاقہ) Dogon (مالی کے مرکزی

عدتے کی تہذیب (Dan) (روسی کا ایک تاریخی علاقہ) اور غیر یورپی روایت اور صورت سازی کی موجودگی پر حیرت کیاسی جن سے کبھی کبھی وحدت اور کبھی چھپائی کیفیت کی بدولت میں ملتی تھیں جو خصوصاً یورپیائی (Gaulic اور Teutonic) اور ترکی یعنی اور سو جو دو صدیوں کی کم از کم چار صدیوں پر محیط ہوتی تھیں۔ اس کے باوجود ان کا اثر نہ صرف ہوتا تھا انسان کی عمل آزاری، اس کے مایوسہ سکانات جوئی دنیا کی تشکیلات میں رنگ مرمی انہوں کے اثرات اور موجودہ یورپی سوچ کے بدولت فٹ سے چھٹکارے کے باعث ہوتا تھا اور ایک بہترین انیو لارمنے رشتوں کی تشکیلات کے لیے مشعل کا کام دیتا ہے۔ اس کی تحریک میں جو فسطائیت، بدامنی اور علاقہ ایشر کیست کے وسیع ستارگ جو نظر پر چھٹی ہوتی تھی، وہ حقیقت افریقہ تھا، جو دوسرے سنگ جاتا تھا، انتہائی محنت سے جس کا تجزیہ کیا جاتا تھا، جسے کبھی مکمل طور پر نگاہ نہ تھا اور کبھی نگاہ دیا جاتا تھا، استعمال کیا جاتا تھا اور کبھی پورے ہی عظم کی لوشکیلی عاقبت کو الہامی جنون کے بہاؤ میں نہ دیکھا جاتا تھا۔

مثال کے طور پر Oscar Kokoschka کی کوئی نہ پوچھے کہ اس امرام کا روبرو تصویر کی فریسی رسم پرتی نے ہمیں اپنے پسند کی، جنسی بے راہی، ورمی خودی کی طرف مائل کیا ہے۔ اور پھر یہ فطری طور پر قطعے کے الہامی بلو سے میں ڈھل گئی، مکمل طور مادی، راج کے شادی چھپائی غلبہ مادی بلکہ دراصل دنیا کی مخالفت کے ساتھ۔ اس کے برعکس Vassily Kandinsky نے اپنے طور پر، فریق فنون کے لیے کو ایک کہ، اس تصور کے پیش نظر کہ کسی فن کی سائنس کو وسیع بنادیں پر قائم کرنا چاہیے جو اپنے کردار میں بین الاقوامی ہیں، اس اصرار کے ساتھ کہ خیال ہے تو دلچسپ، مگر یہ کلی طور پر کافی نہیں، کہ (اس کی بنیاد) خصوصاً یورپی تھیے پر مبنی ہو اس طرح فنون کی سائنس ہمیں ملے جائے گی، ایک ایسی کمال ٹائیف، طرف جو فنون کی معینہ حدود سے کبھی نہ دوپے بھیل کسانان اور پائیت کی پکائی پر مبنی ہو۔

جس تحریک کا، وہی نہیں دیکھیں، یورپ کے جمالیاتی مراکز میں صد سالہ جشن منایا جانے والا ہے، جس کے مرئیوں میں Modigliani, Matisse, Gauguin, Picasso, Brancusi جیسے عظیم نام شامل ہیں، فریق اور پینٹریا کے فن مندوں میں مختلف مدارق میں جن کی چوچائی جاتی ہے اس کے ایک فرد Johannes Becher نے اپنی وطن نگاہی کے پاگن پن کی کیفیت میں قسم کھائی تھی کہ وہ ایک ہی دنیا آباد کرے گا اور "عالموں کی دیوانی بیخ کنی کے ساتھ ساتھ سیاہ نام قبائل، بچہ و بچہ، جنسی امرغی کی دیو، ذاتی مرضی۔ میں ان سب سے جگہ کروں گا اور (منجھستی سے) ان کے شکامات (تک) منانوں گا۔"

اور کیا یہ بھی میں ایک اتفاق تھا کہ ایک اور جرمن Leo Frobenius نے، جس نے خود کبھی وطن نگاہی کی تحریک میں شامل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا، Yoruba نسل کے مرکز Ile-Ile کا دورہ کیا اور اس دوران یورو بافن کے تخلیق کیے ہوئے شاہکاروں کے بائال حسن اور اس علاقے کے فرحت اور سکون بخش ماحول سے متاثر ہو کر لکھا تھا "ہمارے سامنے، اپنی کامی کی دعوات سے ڈھلا ہوا ایک خوش بہ حسین مرقع، بالکل اصل زندہ جیہ، جس پر خوب صورت گہرے ہرے رنگ کا رنگ ٹپ چکا تھا۔ بدعجب اس کا خالق

اوتو لونی، افیچا کالین کار Olokun تھا۔ اس کے ماد جو دیکھ کر بھی لوگوں کے بارے میں جن کے فن نے اس کے تخیل کو کافی لہجوں میں پہنچا دیا تھا، یہ، لکھا ہے، "میں عیسائی تیرائی سے لڑاں، Atlans عظمت کے نام اہل کی باقیات کے سامنے دیکھ کر (اس کے سر کو) کتا دیا۔ میرے سر تھی بھی کچھ تم مشتمل نہ تھے۔" یہاں تک تو گویا ہم نے آپس میں خاموش رہنے کا وعدہ کر رکھا ہو، مگر چپ چاپ کھڑے مہجہ پھر ہم نے اطراف پر نظر کی اور سیاہ قوم افراہ۔ یعنی قابل احترام پاوری کے بیٹوں، جو مرشد Olu اور اس کے ذہن اشران، کے شعلے پر ہماری نظر رکھی۔ اس تصور ہی نے، کہ ایسا ذہن خوشی مثل اور سند ذہن نسل کا مجمع ایسے حسن کا رکھوالا ہو، ہمیں ایک شہر انگیز خاموشی کے بحرے میں غرق کر دیا۔

اس جیو دیو کر رکھوالے ماٹل ہیں، یہ خیال ہی ایک مادر پدرانی دو شش شروع کر دیتا ہے کہ ان سے ان کی مٹاٹ چھین لی جائے، گویا یہ ایک سیدھا سادہ دھوکا نامہ ہو کہ ان سے، جن میں اپنے ماں و باپ کے تحفظ کی صلاحیت نہ ہو، مٹاٹ چھین لیا جانا چاہیے۔ یہ تو پہلے سیدھا ذہن کی کیفیت ہوتی جس سے Van Lvyck Low کی جیسی گہری املاطیر مانیات نظم مٹی ہیں۔ حالاں کہ مانیات کا یہی ہمدرد بعد میں اپنے شہد پسند ہم وطن نسل پرستوں کو بد۔ "میں دیکھتا نظر آتا ہے: "خدا ہمیں یہ سمجھنے کی توفیق دے کہ ہمارا بچا کیا ہوتا ہے۔ ہمیں سوچنے کی توفیق دے۔" پھر۔ کالے، سفید اور گوسے رنگ والوں سے نفرت پر، اس کیفیت پر اور اس کے اسباب پر میں یہ سے فتنے کی طلب کی ہمت کروں گا۔

یہ یعنی تھا کہ (افریکیات لہجوں کے عظیم سفید نامہ شاعر) Van Lvyck کی پُرشکوہ نظم Raka سفید نامہ شہد پسندوں کے غریب، اخلاق حلقوں میں بیکان پر پا کر دے گی۔ اس کی یہ تحقیق نسل پرست افان کے داخلی حواس پر لڑکی مانند چھا گئی، جس نے افریکیائی عقائد کے پرچاروں کو آنے والی اس وحشی دھڑکی کے اشارے پر جو The Fifth Horseman of the Apocalypse, The Black کے نقش قدم پر روانہ ہواں ہونے والی تھی۔

سیاہ قوم نسل لوگوں میں معاف کر دیے کے جذبہ کی جس قدر گنجائش ہے اس میں دنیا و دوس کے لیے بہت اہم پیغام ہے، جو میرے خیال کے مطابق، دوسرے مستند مذاہب دوران کے اپنے مختلف شعور سے ابھرتے ہیں، جنہیں غیر ملکی عقائد اور ان کی ضمنی قبیلہ پرستی بھی عمل طور پر مانتیں تھیں۔ میرے اپنے خیال کے مطابق، نسل بنیادوں پر انٹرا پر نازی کرنے والا Frobenius جو سیاہ قوم نسل کی "بائی تحریروں کو بدنامی کا وارٹ لگانے سے کبھی نہیں چوکا، یورپ کے دوسرے بہت سے آثار قدیمہ پر ا کا ڈالنے والوں سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ یورپ کے جذبہ بے ہوشے عجائب گھر یورپ کی کبھی نہ مٹنے والی ہول کی گواہی دے رہے ہیں۔ ان کی ہزار ہا ثقافت کی بے چینیوں، Jnesco، تیسری دنیا کے بے شمار داروں کی پتہ کی پیچھے حاصل کیے جانے والی اشیاء کی طلب اور ان کی قیمت اس بات کی روز افزوں ہوت پر طرے گاہ ہے۔ تو کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ آج بھی سیاہ قوم افراد کے دار سے سیاہ قوم رہبرین، حتیٰ کہ دانش ور لوگ بھی

Frobenius کا احترام کرتے ہیں؟ کہ اس کی دو میں ہر پارے جانے والے اجتماعات سیاہ فام افراد کے براعظم پر مکالماتی شخصیات سچانے کا جہانہ مہیا نہیں کرتے، کہ اس کے نسلی امتیاز پر مبنی شفقت، حملے اور فریقا کے بارے میں اس کے خیالات کو چند لائے کی اجازت بھی نہیں دیتے، وہ اس کے اس کردار کو جو اس کے انسانی تہذیب و مہارت کے سمجھنے میں آگیا تھا، مگر چہ اس کی عالمانہ روشیں چلے جائیں گی، یہ نہیں کہ مانتی رہی ہیں۔

یہ اپنی جذبہ کی بڑائی ہے جس نے ماضی کی ذرا دیا قی قومیوں کو رشتوں کا ادراک مہیا کیا ہے، جن میں سے پھر نجات لگانا، ذرا دیا قی جنگل خیر کی عمل سے نرے ہیں، جہاں انسانیت کی مانت، رنج، شہدائے ان سے روبرو ہڈوں سے ہڈی چھنے ہیں کہ انسانی کان، ہاتھ اور ماں کے عرف پیداوار کی مقدار کے حصول کے کام میں آتے ہیں۔ قومیں جو آزادی کے فکری جنون کے تجربات سے نرے ہیں، جن کی سرزمین مسیحہ انسانوں کی لاشوں اور بے مام شہداء سے بھری پڑی ہے، آتے ہی نرے فریڈشوں کے پہلو میں رہتی ہیں، ان ہی کے ساتھ اپنے مقدس شہادت دہی بھی رکھتی ہیں، جو عرف چار لپ پانچ نرس قبل تک ان کو اپنے امرہ اور قہر کے قتل عام کے مناظر دیکھنے پر مجبور کیا کرتی تھیں۔ عیسائی خیرات کے باوجود وہ اپنی تعمیر نو پر قانع بھی ہیں اور آج میں شہادت دہی بھی رہتی ہیں۔ آج میں ہاتھ بچانے کے اس جذبہ کے اسرائیلی سے خاص فعل کے ان سے یوں کی تعداد حرکتوں پر محمول کیا جاسکتا ہے جو چھوڑ کر جانے والے چارہ بھکرائوں کے جنگ دار چھوڑ کر (اپنے گھر استعمال کے لیے) خلیج کی خاطر فوری ممانعت کر جاتے ہیں۔ اس کی سچائی سے انکار نہیں کیا جانا چاہیے۔ مگر ہمارے سامنے سیاہ فام براعظم کے باسیوں کی توقعات سے ہمدردی رکھنے کی ایک حکومت کی مثال بھی ہیں جنہوں نے وہی سیاہی فلسفہ اختیار کر لیا ہے، ہر حال، آخری فیصلہ کرنے والے تو خود ہوا ہوتے ہیں اور اس قسم کے ان کے بھرے ہی سمجھے جاتے ہیں۔ اس مقام پر ہمیں صرف ایسی کیفیت کے بارے میں خیال ظاہر کرنے سے زیادہ کچھ نہ کہیں سنا چاہیے۔ یوہا میں آج بھی ایسی قومیں موجود ہیں جن کے ذہن میں، دو صدی بعد بھی، دوسری اقوام کے ان پر تسلط کی پوائی و دین اکی تازہ ہیں کہ ان کی قی نفسوں میں تہذیبی، سماجی اور سیاسی انتقام کے جذبات بھی تک دیکھے جاسکتے ہیں۔ میں نے اپنے قی مکتوب کے دور سے یہ ہیں جن پر غیر ملکی حاکموں کے تسلط کی ظالمانہ تاریخ کے آثار کیساؤں، عجائب گھروں، یادگاروں، تخیل کے میدانوں، دستاویزوں، مٹری کے کئے ہوئے چھپائی کے ٹیپوں اور بہت پردہ شیشوں کے نیچے محفوظ کی گئی تصاویری تھیں کی ناسخ کی صورت میں پائے جاتے ہیں، مگر سب سے زیادہ تو فائیں کی ان برقیات (افراد) میں جن کو غیر ملکوں کے ایسے پست درجات تک گرا دیا گیا ہے جو ان کے اترے ہوئے چہروں، لہکتے ہوئے کاندھوں و رمیز بات سن سے وہاں گشتو شہر مند کی کیفیت میں صاف نظر آتا ہے۔ جی ہاں، میں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بین الاقوامی جموں میں اس پر خدا کرے بھی ہو چکے ہیں۔ اور شہر نہ اہلکار میں ان سرکاری نیوٹروں کے تجرباتی اصراف کے باوجود کیا کسی باپ سے گماہوں کا، اس بارہا کس تک پیدا

ہونے والے بیٹوں تک تذکرہ کرتے رہنے اور انھیں شرمندہ کرتے رہنے سے بہتر یہ نہیں ہوتا کہ پیدائش کے وقت ہی، اس کے سہاویوں کے ہوان کے طور پر، اس کے بیٹے کے جسم سے (مثالی لاس کی طرح) کچھ گوشت کاٹ لیا جاتا۔

ایک غار سے نکالے جانے والے پر قبیلی سرود کے افراد کے نفس اور تہذیبی غرور کو تحلیل کرنے کی دانت کے پیش نظر، ذہن ہمارے اپنے معاشرے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جہاں اس نوع کی مستتب تواضع اب بھی نہیں نمودار رہی ہے، جہاں ماضی کے پھلتے پھولتے فرقوں کے موجودہ کھنڈر پکار پکار کر اترام تر ٹی کرتے ہیں، جہاں نوآبادیاتی اور نفس کا نظریاتی آتش زن حکمت عملی آتی بھی بھول دے رہی ہے۔ اس کے باوجود کہ وہاں کی نگلیں، شاہراہیں چارہ خمرانوں کے کاموں سے موسوم ہیں، ان کے ہنسے اور تغیر و تحویلی کے دوسرے مظاہر تفریحی میدانوں اور چوماموں پر رونق افروز ہیں، چاروں طرف پڑا اعتماد لوگوں نے ان کو مجتہد سناوٹ کے لیے، چمکے دندوں اور تیز دلی کے پیہروں کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔ ان کے سب خانے بھی، کبھی تک ان سے پاک نہیں کیے گئے ہیں تاکہ نئی نسلیں بدستور روک ٹوک کے Frobenius, Hume, Hegel, Montesquieu وغیرہم کی تعلیمات کا تفریحی منہ نہ کر سکیں، ان کے سرزد رقی پر تازہ چسپاں تسمیہ سے مدد بھیڑ کے بغیر

ہوٹیا رانیہ تجر تھمہ کی سنی خود توفیری کے لیے خطرناک ہے

پھر بھی، ذہنی گنجائش کے اس قسم کے ثبوت، ہمارے سینے پر ہوں یا چھوٹے پر، بشامی ہوں، شخص ہوں یا دستور، یہ تمام افراد کی لائق اور غیر تنقیدی معاشرت کے ثبوت کے طور پر نہیں لیے جانے چاہئیں۔ یہ ایک تجرباتی کیفیت، امکان قرض اور ایک ایسی واضح چٹائش کے مانند ہوتے ہیں جن کا عائد ان ہی سے ملتی جلتی گھر تھم چٹائش سے کیا جانا چاہیے۔ یہ کبھی کھاتی کے ایک سرے سے شروٹ پہ جانے والے آویزاں ہیں میں لگائے جانے والے ایسے نگارے ہوتے ہیں جن کو کاری کر چاہے یا نہ چاہے، ہمارے کے معیہ قوانین کی قیاد کرتے ہوئے، ایک حد تک جو بھہہ ہمارے کے بعد نوٹ کر، شبہات، مانا کائی، اور دہری فرقوں کی پھٹی ہوئی کھاتی میں گر جانا ہوتا ہے۔ تجربات کی اس سر زمین (خوبی فریت) پر جو قرون وسطی کے سہابی کلیسائی کشود اور طیر مہذب شبہات کی آماج گاہ بنی ہوئی ہے، مان سے محبت رکھنے والے تمام لوگوں کو قید کرنا چاہیے کہ یا تو اس کو جدید دنیا کے حصار میں بلے آنا چاہیے، ان کی شرکت داری کے جذبوں کے دامن، ایک مستول میاست کی طرح، کی صداقت سے مٹو جس کا مظاہرہ ہمارے برعظمہ کی آن دہونے والی بریود تمام ممکنات نے درجہ تم کیا ہے، یا عمر اس کو ذلت و شرم کی پہلی کے ساتھ ہی ان اپنی اوقات پرے چاہ جائے تاکہ وہ اپنی صف آرا اکثریت کی جگہ حکمت عملی کے باعث اندرونی طور پر خود ہی لمبے جائے۔ ترجیح کچھ بھی ہو، بیسویں صدی میں انسانیت کی اس طرح کی توہین کو بیسویں صدی تک، جس میں ہر تہذیب اپنی علامتی و ذہنی کا جشن منانا چاہتی ہے، نہیں پہنچنا چاہیے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ

تقویم عالمی سب سے گہرا وقت اور وقت کو مجیدوں عالمی جوا کرتی ہیں اور ان مجبور ہیں جس سے کوئی بھی مجبوری جو ہم سے ہمارے وجود اور اس کی انسانییت کی تہمت سے مبرا نہ ہو سب سے نہیں مصیبت کے تمام انسانی عدم مساوات کی سطح کنی، اور ان کے تمام اوجھلچوس کے انہماک سے یہ وہ اثر پڑ رہا ہے۔ ٹریا نیچے کے طور پر اس کا مقصد عالمی حق کے وی اور اس کی سب سے بڑا انجام ہے۔



کلاڈ پیماں

اعترافِ کمال۔ جو اپنے ناموں میں شاعر اور مصور کی جیسی خدائی کے حیران سے سنبھلی حالت کی عمیق اور شعوری صورت گری کرتا ہے۔

کچھ ہی عرصہ کی پہچان میں تباہی کے درمیان ”نئے مادل“ کے حوالے سے فرانس کے ادبی مقرر مے پر کلاڈ پیماں کا نام چھپی کا دعوت ہوا جس لیے کہ ان زمانے کے کھینے والوں کے ہر ادبی دستوں میں ایک ایسا طبقہ شامل تھا جو روایتی کہانی مروری سے بالکل الگ ایک ماورائے میں مصروف تھا۔ جو اس بات کی مخالفت کر رہا تھا کہ مادل میں حقیقت پر مبنی کسی منسلق وار کہانی کی کسی پابندی نہیں ہونی چاہیے جس سے ماوس یا افسانہ ایک مربوط اور منظم انداز میں آگے بڑھے۔ اس دور کے نئے کھینے والوں نے کہانی سازی میں فاکٹر اور پراؤٹ جیسے سرخیوں سے نثر کی تخلیق میں شعری تمثیل اور بصری حرفت استعمال کرنے کے طریقے اپنائے اور افسانہ اور مادل کو ایک لائیکل عجیب و غریب اور نئی جہت سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔ لہذا ان لوگوں کی نثری تخلیقات لسانی مونتاژ (Linguistic Montage) کے پے غنوں کی طرح تھیں جو کسی ایک شیخ پر مختلف اقسام کے نقوش، نمونے، بے ربط تصاویر، متاعیر، طرح طرح کی اشیاء کے ٹکڑوں وغیرہ کے چپکا دینے سے بنائی گئی ہوں۔ ان کی کہانیاں نثر کے ایسے تلف اور بد عناصر کے رابطہ ٹکڑوں کے یکجا کرنے سے بنتی تھیں جو کسی صوفی، معنوی، تھائی یا جذباتی ایک رنگ کی وجہ سے سبکو کرنے کے قابل سمجھے گئے ہوں

نہ کہ منطقی وجوہات کو دیکھ کر۔ گویا واقعات کے حلقوں کو دانستہ اس طریق نظر انداز کیا جاتا تھا کہ جان میں
بھڑکاوے کی وجہ سے حیرت اور مدہمیت کا پتہ چھوڑ دیا جائے۔ اس رجحان کو بعد میں جدیدیت کا نام
دیا گیا اور سیمان کی تخلیقات اسی رجحان کی نمائندگی کرتی ہیں۔

سیمان کی تخلیق کی ابتدا 1940 اور 1950 کی دہائی کے درمیان شروع ہوئی۔ سیمان کی تخلیق کے انداز
میں کچھ نئے مادوں سے ہوتی ہیں۔ ان کا انداز بیان تپہ دار روایتی تھا مگر اس پر فاکٹر کا اثر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔
سیمان کے انداز تحریر میں تبدیلی اس کے مابین 1957 Le Vent اور 1958 L'Herbe سے نمایاں ہوتی
شروع ہوتی جس کا خود اس نے بھی اعتراف کیا ہے۔ یہ دونوں مابین جنوبی فرانس کے پس منظر میں لکھے گئے
تھے حالانکہ یہ کہ سیمان کے خاندانی مسمے تھے بلکہ وہ ان دنوں وہاں انگریزی کا مشق کرنے میں مصروف
تھا۔ مصنف ان دونوں مابین میں غزل کی عجمی کیفیت میں تیرتے ہوئے واقعات، ماحول، بدبختیوں،
رشتوں وغیرہ کو جوڑتے ہوئے اپنے سے ایسا جال بنتا ہے کہ ان سب میں بالواسطہ تعلق یا منطقی ربط نہ
ہونے کے باوجود قاری ایک مادل کی کیفیت سے دلچسپ رہتا ہے۔

اسی منزل پر سیمان کی جدید سنان فکری کی تقسیم بھی نظر آتی ہے اور اس کی تخلیق کی زندگی اپنی ہی
زندگی شروع کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ہر خط اور بیان نگہ انداز اور خیالات کی طرف رہنمائی کرتا دکھائی دیتا
ہے۔ تحریکات، توضیحات، تفسیرات، دہوں کے نقوش، احساسات کی تفریق اور تصحیح وغیرہ کی دیکھاگئی سے
اسکی صورت پیدا ہوتی ہے جیسے مصنف کی زبان کا اپنا ایک زندہ مامیہ وجود ہے جو پھوٹتا ہے، پھلتا ہے، اپنے
جج دیتا ہے اور اپنی شکل کو آگے بڑھانے میں ایک جان و روح کی طرح کام کرتا رہتا ہے۔ گویا مصنف تو صرف
ایک ہونار کی مانند ہے جس کی حرکت سے سب کچھ خود بہ خود وجود میں آتا چلا جا رہا ہو۔

سیمان نے اپنی کتاب 1967 Hsire میں خود بھی اپنے فن اور اپنی تخلیقی صلاحیت کا کچھ بھی
سرخوشی کے انداز میں اعتراف کیا ہے جس میں حیرت بھی ہے اور احساس کامیابی کے لحاظ کا عنصر بھی۔
سیمان کی یہ کتاب اس کے فن کی بلندی کی بہترین مثال ہے جس میں اس کی لسانی خصوصیت بہ درجہ اہم
نمایاں ہوتی ہے۔

کلاڈ سیمان 1913 میں لہا فاسکر (Madagascar) کے شہر Tananarive میں پیدا ہوا۔ اس کے
ماں اور باپ دونوں فرانسیسی تھے۔ سیمان کا باپ کینی جنگ عظیم میں لڑتے ہوئے مار گیا تھا اور اس کی موت کے
بعد اس کی تربیت اس کی ماں کے ہاتھوں ہوئی۔ اس کے خاندان کے کئی افراد فرانسیسی افواج میں رہے تھے۔
مغربی فرانس کے قتلے میں اس کے اجدادوں سے یک نغصہ تئیں کے عہدے تک پہنچے تھے۔

سیمان اپنے بچپن ہی میں فرانس آ گیا تھا۔ اس کی بنیادی تعلیم پیرس کے Collège Stanislas
میں ہوئی۔ وہ مختصر عرصے کے لیے آکسفرڈ اور کیورن میں بھی داخل رہا۔ اس نے ہسپانیہ، تینیسی، اٹلی،
یونان اور روس کی طویل سیاحت بھی کی۔ دہائی جنگ عظیم میں اس نے فوجی خدمات بھی انجام دیں اور کچھ

عرسے کے لیے جنگی قیدی بھی رہا تھا جہاں سے فرار ہو کر فرانس کی "مزدوری کی جدوجہد میں شریک رہا" اس مزاحمی تحریک کے دوران اس نے اپنا پہلا ناول (1946) "The Cheat" Le Tricheur لکھا جو اس نے جنگ کی ابتدا سے پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کی تخلیقات میں یورپی امریکہ کے سفر اور دوسری جنگ عظیم کے تجربات شامل نظر آتے ہیں۔

سیماں کوڈانس کے کئی انعامات ملے اور برطانیہ کی University of East Anglia نے 1973 میں اس کو اعزازی ڈاکٹریٹ سے بھی نوازا۔ 1999 تک سیماں کی تین کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ سیماں بہ قیہ حیات ہے اور قیہیں میں تو مچھوڑ ہے۔

خطبہ

خوشن و جعفرات!

ایک ادیب کے اثبات جو اس ٹیویژن ش کا رتی کی چاپ ٹیٹل انوم سے نوازے جانے کے بعد اٹھتے ہیں، انہماک خوب صوفی سے میرے ایک ٹیٹل انوم مافوق دست نے، زراہ مہربانی، اپنے محبت پھرے خط میں Dr Andre wolfs کے لفظ استعمال کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔
"تم از ہم، تجھے کی حد تک، تحقیق ایک کہیں، جوئے کے مانند ہوتی ہے جس میں جیت و بار سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے باوجود سائنس دان (میں جن میں دیوں کو بھی شامل کروں گا) کچھ معنوں میں بچوں کی مانند ہوتے ہیں۔ ان ہی کی مانند وہ جیتنا پسند کرتے ہیں اور انعام حاصل کرنا بھی پسند کرتے ہیں۔ اپنے دل کی گہرائیوں میں ایک سائنس دان کی (میں پھر دیوں کو بھی اس میں شامل کروں گا) ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کا احترام کیا جائے۔"

اس قسم کی آسودگی میں بہت سے (پشیدہ) نکات کا اثر میں مفقودہ تجزیہ کروں تو یہ کہوں گا کہ اس میں ایک قسم کی خودستائی بھی شامل ہوتی ہے۔ میری اپنی شخصیت کے علاوہ، اس ملک کی طرف بھی (دنیا کی) توجہ مہذول بوری سے، جو بھرا ہوا یا برادر میرا اپنا ہے۔ اس میں کسی طرح کی زبانی نہیں اگر لوگوں کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ تمام تہذیبوں کے باوجود، ایک نوع کی دلش، بنام سہی، جس پر خندہ کیا جا چکا ہو، اور جس کی بھی منافقانہ انداز میں اس کا انتہا بھی کیا جا چکا ہو، میرے ملک میں، حایہ برسوں میں، بڑی طرح کی کھلی جائے والی اقدار ایک خودمختار حیوان کی طرح، اب بھی چھپ رہی ہیں اگرچہ ان پر ہر قسم کی پوشیدہ قوتیں ہر وقت حملہ آور رہتی ہیں۔

۷۔ یہ کہ اگر میں سوینڈش اکادمی کے ارکان سے اپنے اس خطاب کے دوران یہ کہوں کہ آپ کی نظر انتخاب کرنے پر میں بہت خوش ہوں اور شکر گزار بھی ہوں تو یہ فقط ایک روایتی عمل طاعت گزری اور خلاق کا اظہار ہی نہیں ہوگا۔

یہ صرف اتفاق نہیں، بلکہ مجھے ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے کہ یہ نامہ سوینڈش میں، بالخصوص سٹاک ہولم میں، اس جغرافیائی مرکز پر قائم ہے جہاں چار سکوں کے بودی نے، مختلف سببی، آئیں میں مل کر اپنے تہذیب دوست، اپنی مہارت، اپنے خلق اور اپنے قوانین سے اس کی تہذیب کو اتنا عظیم بنایا ہے کہ یہ خطہ آج کی، فوری، تہذیب سے لڑی دنیا کے اس پاس، جس میں ہم بستے ہیں، ایک مثالی (امن پسند) جزیرے کے مانند دکھائی دیتا ہے۔

یہ بھی محسوس اتفاق نہیں کہ میری نامہ ترین تصنیف *Les Géorgiques* کے پسے تراجم، مارینی، سوینڈش اور ڈینش زبانوں میں کی شائع ہوئے تھے، نہ ہی یہ خود یہ خوش ممکن تھا کہ پچھلے سرکاری کے موسم میں ایک در ترجمہ شائع ہو کر ڈینی لینڈ کے دربار جنگوں اور جنگیوں کے درمیان واقع قصبوں کی نکالوں تک پہنچ جاتا اس کے باوجود، جنوبی میں نامہ ترین فوکل انیم کا اعلان ہوا تو نیو یارک ٹائمز نے فوراً (اس مقام پر) میں، وہ میں سے صرف ایک کے جتنی بوجھ کے تذکرے پر گفتگو کر کے اس کے ساتھ ہم دیے ہوئے ہیں) سرکاری دی تہذیب نگاروں سے، میرے بارے میں ان کے خیالات کے ایک رکیک کام فرمائش کی، جب کہ ہمارے اپنے ملک کے ذرائع ابلاغ اس (بھگ) تقریباً غیر معروف ادیب کے بارے میں کوئی حقائق کہنے کی کوشش میں مصروف تھے اور اس کے مشہور شعبہ مطابقت نے، میری ادبی کوششوں پر تجویزی تجویزوں کی غیر موجودگی میں، میری زندگی اور میری ادبی کوششوں کے بارے میں، نکل قومی منصفین شائع فرما دیے، جب کہ انھوں نے آپ کے فیصلے کو اس کے لیے ایک قوی جہی سے تعبیر بھی نہیں کیا تھا۔

بدشہرہ میں اتنا پُر اعتماد و ماحول بھی نہیں کہ مجھے اس بات کا حساس نہ ہو کہ میں اور آپ کے معاہدات میں کوئی بھی انتخاب متنازعہ، بلکہ کسی حد تک من مانی ہو سکتا ہے اور میں پسند شخص ہوں جو اس بار سے دہر کے کئی دہرے دیوں کو جن کا میرے دل میں ہے حدود صواب احترام ہے، اس انوکھا کا تھا ہی حق دار رکھتا ہے (جتنا کہ مجھے سمجھا گیا ہے)۔

اگر میں اس کو ایک رسوا کن حیرت سے تعبیر کروں (جسے ایک موقر فرانسیسی جریدے نے تو ہمیشہ گرونگ گردانا ہے، اور یہ شہرہ ہر گردیا ہے کہ شاید آپ کے اور میں میں بھی سوویت مراٹ میں دوسرے داخل ہو سکے ہیں) حیرت انگیز اس لیے کہ، بڑے بڑے، اخبارات میں بھی اس قسم کے خیالات کی بد رشتہ سفاکی دی ہے۔ حالانکہ مجھے امید ہے کہ اس کو کسی طرح بھی مکاری یا بد باطنی سے، بلکہ ایک سچی کامیابی سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔ مگر جس حد تک اس احتجاج، اس بدیہی، حتیٰ کہ اس ہمیشہ گواہی دیا ہے، میں ادب ورفین کے تناظر میں، اس کو قدرت پسندی یا ترقی کے درمیان آمیزش کہنے سے پرہیز کروں گا۔ ہاں اس کی

ان مبادلہ حق کی طرف سے جو ہمیشہ سے تہذیبوں کی مخالف اور ان سے خوف زدہ رہی ہیں، زندہ دلی اور عظیم جوام کے درمیان دلدل پیدا کرنے کی ایک قاتلانہ تحریک ضرور کہا جاسکتا ہے۔

ان شکایات سے قطع نظر کہ میں ایک ”عشکن“ اور ”آکٹا ویسے وار“ اور ”کامی مطالعہ“ اور ”انجمن میں ترقی“ ادیب ہوں، مگر یہ دلدل اچھا ہوں کہ اس قسم کے اثرات ہر اس ادیب کے پرکائے جاتے ہیں جو معمولی حد تک بھی انسانی عادات و رطبت شعاع اصولوں میں دماڑا لئے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بجائے ”سینے ہمراہی حیرتوں کو ان چوتے پوتیوں اور نواسے نوامیسوں کی طرف مہذب دل کرتے ہیں جنہوں نے کبھی تو اپنے ہزاروں کی ہزار چند تصاویر کو بے ہنگم بیولیں اور بعد سے نشوونما سے تعبیر کیا تھا ورنہ وی جوق درجوق، نمائشیں اور عجائب گروں کے باہر لگی ہیں قنادوں میں گھنٹیں کھڑے ہوتے ہیں اور موقع ملنے پر ان کی بے ہنگم، اماؤنی استرکاری کے نمونوں اور سمجھ میں نہ آنے والی تصاویر کو تحسین کی نظریں سے دیکھتے نظر آتے ہیں۔

ان طرح، اس نثرام سے قطع نظر کہ آپ نے میرا انتخاب سیاسی سرانجام دہانی ناریں کے ان گماشتوں کی بنا پر کیا ہے جو آپ کی محنتوں میں نہ آئے ہیں، کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اہم سے حقوق میں سوویت یونین آج بھی ان ہر وقار طاقتوں کی علامت سمجھا جاتا ہے جو سماجی استحکام کے خلاف رو بہ عمل ہیں ایسی طاقتیں، جن سے منسک ہونے کا پنے میں خیال بھی نہ کر میں خود اپنی چاہوشی کرنا کا دماغ، ”ادب بجائے ادب“ جیسے دس فوش کن اور بے کار عطیے کو اس قدر بڑا بھلا کہا جاسکتا ہے کہ میرے نزدیک یہ کم سوائی نہیں کہ میری تحریریں، بلند خواہشات نہ ہونے کے، وجود اس درجے کی تعبیر کی جاتی ہیں جہاں ان کو اہل پنچل کرنے والے اور انکسلی کو ناز سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مجھے چلی تخلیقات کے درمے میں دیے جانے والے جو چند فیصلے کچھ زیادہ ہی دلچسپ تھے ہیں، اور کچھ وقت صرف کیے جانے کے حق دار بھی ہیں، وہ وہی نوعی اور بچے حق حق کے باعث، جسے ہم غلط بھی نہیں کہہ سکتے، اس تعداد کو اجاگر کرتے ہیں جو کچھ مخصوص زبانوں کے حامیوں اور اس ادب کے درمیان جسے میں زندہ ادب کا نام دیتا ہوں، موجود ہے، آپ چاہیں تو اسے ایک معنوں کیفیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان میں بے قدری سے استعمال ہونے والی تمام اصطلاحیں نہایت حلیط سے چلی گئی ہیں، لائق صرف اتنا ہے کہ میرے نزدیک اور ہم عصرین کے خیالات کے برعکس، سب کی سب مثبت قیہ ہوں کی جانی گئی۔

میں ان کی طرف بعد میں اس کا جو میرے سناؤں کو اس بات پر، میرے خیال میں ہر نکل مچھ، الحرام دیتے ہیں کہ ان میں ”نہ لہذا کی شربے تمامہا معلوم“ ”ابناء میں پسے ان دو محنتوں پر بات کرنا چاہوں گا جن کو تو میں ”میزر دانا جاسکتا ہے، جو نصرتی طور پر ایک دوسرے سے منسک بھی ہیں اور جو اصل مسئلے کی نشان دہی بھی کرتی ہیں۔ میری تخلیقات کو ”صحت کی پیداوار“ اور ”سچی طور پر مصنوعی“ کہہ کر دوسرا کیا گیا ہے۔

نصف اس آخری صفت (یعنی ”مصنوعی“) کے معنی ”ظن کے ذریعے تخلیق“ بیان کرتی ہے۔ مزید

”میر وہ شے جو حضرت کی مجلس بلکہ انسانی پوشش سے وہود میں آئے“ یہ تعریف اتنی سوزندہ لگتی ہے کہ کوئی بھی اس کو سرد و ختم قبول کرے گا، اگر کسی کے سر نہ آپسے جتنے نکلے نہ ہوں جن سے بھوکہ لیا جاتی ہو مگر بن کی چھان میں کی جائے تو ان سے صرف ”مصلو مانی“ ہونے کا بالکل مراد ہر مطلبہ اخذ ہوتا ہے اس لیے کہ اگر جیسے کہ سخت خلاف رتی ہے، ”مصلو مانی“ سے مراد ”بھوکہ لیا“ یا ”جوڑا“ یا ”جھگڑا“ ہو، غلط فہمی یا جھگڑا غیر ضروری تخلیق“ ہو تو فوراً یہ خیاب آتا ہے کہ نفس تو ایسا کا عروج ہوتا ہے، اور اس طرح ”تخلو مانی“ (خسے) یا یعنی زبان میں ”تخلو مانی“ کا عمل“ کہتے ہیں) اور ”بھوکہ لیا“ یا ”جھگڑا“ (ایک اور اصطلاح جسے اب غبار کش دیا جاتا ہے) جھگڑا اور نفس سے کش اور غم ہوتا ہے (جس سے کذب یا بھوکہ کا سر و سر نہ نکلے جاتا ہے)۔ پھر بھی، یہ ضروری ہوتا ہے کہ نفس یا جھگڑا کی صحیح فکر کی گئی ہو اس لیے کہ نفس پنی ہی نفس سے پنی توسیع کرتا ہے۔ اس نقطے تک جہاں اس حضرت کا دوزخ پیدا کرنا مقصود نہ ہو جو تصور بتاتی ہے، مگر جس طرح عجائب گھڑوں کی پیدا کردہ عمر انگریزی تصور پیدا کرتی ہے جیسے تجزیہ سے ہوئے غلطی عمر انگریزی سے ادیب پیدا ہوتے ہیں۔ اور جیسے کہ آگے مد کہہ رہا ہے، ”حضرت نشاۃ فیہ پر استقامت کرتی ہے۔“

بدعہ گزشتہ صدیوں پر مبنی ہونی عظیم اسہول اور مسہینہ دہ کی نوبت، جنھیں ”صریلو ملا رسوں اور جیری مزدوروں کی طرح بنا گیا تھا، منہ و انہی کے دہان“ اور اس کے بعد بھی ایک لہجہ کا، کی نوبت کی ہے۔ انھوں نے بے حد محنت اور ایمان تاری کے ساتھ کیے جانے والے کام کو اپنی محنتوں کا ثمر جانا ہے (یہاں میر تقی میر و Johann Sebastian Bach, of Nicolas Poussin سے ہے)۔ آٹھ اس کی وضاحت اس طرح کی جائے کہ جمیع کے ایک مخصوص نقطے کے نزدیک، تخلیق کے بے محنت کرنے کی بات نہ کی کسی برائی تصور کی جائے گی ہے کہ کسی ادیب کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کے نزدیک تخلیق ایک مشکل کام ہے اس پر شہدے قسم کے سہلے کے مترادف ہوتا ہے۔ شاید یہیں اس مسئلے پر بات کرنے کے لیے اور وقت درپا چاہیے اس لیے کہ اس سے آفاق پر محنت بذاتی کے گاہوں کے ابھی سے نہیں زیادہ وسیع مناظرہ ہوں گے۔

مارکس اپنی مشہور کتاب ”داس کپھال“ کے پہلے باب میں لکھتا ہے ”کسی شے کی اصل قدر قیمت، اس کی استعمالی قیمت (use-value) اسی وقت قیمت تصور ہوتی ہے جب مادی شکل میں اس سے انسان کی محنت کا کٹھن اکٹھا ہو۔“ (ماہل قدر مادی سے انحراف ہی سب سے مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ میں نہ کوئی فلسفی ہوں اور نہ ہیہ عمرانیات، پھر بھی مجھے شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے دوران، مشینوں کی ایجاد اور غصب ایک صنعتیت کے ساتھ ساتھ ایک طرف تو خمیری فوڈ فیکٹری کا فروغ ہو رہا ہے اور دوسری طرف محنت کے تصور کی مادی اس طرح، لکھنے والے اصل فیض کے بجائے ”اتھا“ کے معروف تحفے پر نڈا دیے جاتے ہیں یعنی انھیں اپنی کوششوں کے مثل ثمرات سے محروم کر دیا جاتا ہے، دوران کی حیثیت ایک معزز ذوال یا خدا جانے کس قسم کی مافوق الطہرت طاقت کے ترجمان کی کی ہو جاتی ہے، اس انداز میں کردہ خود کو ایک ذالی خدمت کار اور ہخمیر صنعت گریہا فوڈ لکھتے لکھتے ہیں جس کو ٹاٹ باہر اور ہر

طرح سے رد کر دیا گیا ہو۔ نیا دور سے نیا وہ ان کی حیثیت لٹکانے والوں کی ہی ہو جاتی ہے۔ یہ ایسی کتاب کے مترجم کی جو کہیں در تصنیف کی مافی ہو، بالکل ایک قسم کی رمز افشائی (decoding) کرنے والی مشین کی مانند جس کا کام صرف ”دور دراز“ سے آنے والے ظہیر پہچانت کو سر وہ زبان میں منتقل کر دینا ہوتا ہے۔

ساری حکمت و چال، یہ ایک وقت جو خاصا ہی دور ماوراء کر دیے والی ہوتی ہے، سادہ نظر آتی ہے۔ ادیب خود اپنے آپ میں کچھ بھی نہیں ہوتا، وہ کسی مددگار اثر سے یہ سر و شب بھیجے کے معزز کردار میں اچھل کر انکی مشنائی ذات کی صفحے کا فرد بن جاتا ہے جس میں صرف اور صرف ہیبت یا محنت کی بنا پر کوئی اور مثال کیے جانے کی توقع نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس، جیسے کہ پہلی اشرفیہ کے اثر دیکھتے تھے، کام کرنا رسوائی اور گھنا سمجھا جاتا ہے۔ آئندہ دنوں میں، کتب فنی پادہ مذہب سے لیے گئے الفاظ ”نظر عنایت“ کی بنیاد پر چانچا جائے گا، وہ رہائی نظر عنایت، جسے سب جانتے ہیں کہ نہ کسی نئی اور نہ ہی نگاہ ذات و ترتیب خواہشات کے ذریعے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اس نظر عنایت کے باعث، (جیسا کہ مارتہ کہتا تھا، ”آپ کے پاس کہنے کے لیے ہے کیا؟“ دوسرے لفظوں میں ”آپ کیا عم رکھتے ہیں“) لکھنے والا ایک امانت دار یا خادشا کی مصائب بن جاتا ہے۔ یعنی ایک ایسا فرد جو قلم اٹھانے سے قبل ہی اپنے اندر ایسی حالت کا حامل ہو جاتا ہے جو دوسرے قابل لوگوں کو نہیں دیکھی جاتی۔ اس کا مطلب یہ ہو کہ لکھنے والا اپنے آپ کو اسے استاد کے کردار میں دیکھتا ہے جس کو لوگوں کو تعلیم دینے کا فرض سونپا گیا ہو، تاہم ماولیٰ، بالکل منطقی طور پر، سماں بندی یا تمثال پرستی کی حیثیت کا ہو جائے، بالکل اسی طرح جیسے داستانوں اور اخلاقی حکایتوں کے ذریعے مذہبی تعلیمات دیکھی جاتی ہیں۔ (گویا) سمیٹنے والے کی اپنی شخصیت نابود ہو جاتی ہے (دراصل کا کام پنے آپ کو مٹا کر اپنے کردار کے پیچھے مودنا رہتا ہے) اسی طرح اس کا اصل کام بھی، یعنی اس کی تحریر میں بھی نابود ہو جاتی ہیں۔ ایسے یہ کہنے کی عادت ہوئی ہے کہ ”سب سے بچا اندر کا قابل توجہ الخازن ہوتا ہے“ اور ہمارے شعور میں کسی کا مشہور فارمولہ بٹا ہوا ہے کہ ایک ماویٰ سوئے ”ماتے کے ساتھ ساتھ چپتے ہوئے“ کہے اور کچھ نہیں ہوتا، یعنی ایک بالکل سچائی کی طرح، ایک مکی سطر پر، جو ہر قسم کی مرید سے ہن سے پاک ہو اور اس کی چمک دار سطح کے عقب میں سوائے ان نقوش کے جو بد و رعایت اور معروضی طور سے ہٹائے گئے ہوں، اور کچھ بھی نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں، ویلیر کے ال ظالمانہ فارمولے کے مطابق، جس کے ذریعے اس نے ”حقیقت پسندی“ کی حد بندی کی تھی، ایسی دنیا، جسے میں نہایت عطا کرنے کے لیے موجود نہ تھا۔“

ایک تبصرہ نگار نے ماولیٰ کیا تھا، ”کیا انھوں (یعنی فوٹس فاؤنڈیشن) نے دنیا کو یہ یقین دلانے کے لیے کلاؤسیماں کو نوٹس انعام سے نوازا ہے کہ ماولیٰ کی موت واقع ہو چکی ہے؟“ یہ سوچ اٹھانے والا بھی اس پر غور نہیں کر سکتا ہے کہ اگر ”ماولیٰ“ سے اس کی مراد وہ ادبی ماولیٰ تھا جو انیسویں صدی میں قائم ہوا تھا تو یقیناً ماولیٰ مرچکا ہے، خود و محبت نمرے کی خوب آئینہ راستیوں سے لیریز، دل خوش کن اٹھانے سے مراد،

ہر دس لکھے ریوے سینٹنوں اور کتابوں کی دکانوں پر سچ بھی خریدے اور فروخت کیے چارے ہوں، اور ایک ان لکھے چارے تک فروخت ہوتے رہیں گے، جن کے عنوانات ایسی سچائیوں کے احداث کرتے رہیں گے جنہیں کہ La Condition Humaine L'Espoir or Les Chemins de la Libération وغیرہ میں ملتی ہیں۔

میرے نزدیک غالباً سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ہماری صدی کی ابتدا میں دو عظیم الشان ادیبوں، پراسٹ اور جکس نے بہت سی نئی راہیں نکالیں تو حاصل وہ ایک تاریخی انقلاب تھا جس کے دوران نام نہاد حقیقت نگاری کے اول نے "ہستہ بہستہ خدائی" کر لی۔

مارٹل پراسٹ لکھتا ہے "میں نے حسن و ہاں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جہاں مجھے اس کے ہونے کا ثمان بھی نہیں تھا، یعنی، زیادہ تر، روزمرہ کی اشیاء میں غفرت کی شکل کی ہوئی اس زندگی کی پامال میں جس کا مقصد موت ہے" اور 1927 میں لیتن گراہم میں شروع ہونے والے ایک مضمون میں جس کا عنوان تھا "ادب کے بارے میں جو ایک روزی غرکار Tynanov نے لکھا تھا "من حیث لکل، ایک ادبی نقطہ نگاہ سے قدیم زمانوں میں تاریخی غفرت کے تذکرے کو مجھ سے معاف سمجھنا بیگانہ کے طور پر لینے پر ناغہ نظر آتا جو غفرت کی نئی کے مترادف ہوتا ہے، جب کہ دوسرا ادبی نقطہ نگاہ اس کو اہم ترین عنصر تصور کرتا ہے، جس میں قصہ مجھ میں ایک محرک ہوتا ہے، یا غیر محرک تفصیلات جمع کرنے کا ایک ہوتا۔" یہ متن، بعض کیفیت میں پیشین گوئی کے مترادف ہے، جس پر تبصرہ ہونا چاہیے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ "حکایت" خاص لغوی معنوں میں، ایک مختصر کہانی کو کہتے ہیں جس سے کوئی خدائی پہلو اُچاڑ ہو۔ اس پر فوراً یہ اعتراض ہوگا کہ درحقیقت حکایت کی بناوٹ کا عمل ایک بالکل مخالف سمت کو نشان دہا کرتا ہے، یعنی کہ حکایت کوئی خدائی پہلو سے ظہور کرتی ہے نہ کہ حکایت سے اخلاقی پہلو کی پیداوار ہوئی ہے۔ حکایت تحریر کرنے والوں کے پیش نظر جو سبب یا نصیحت ہوتی ہے، یعنی "سب سے طاقت ور وجہ ہمیشہ بہتر ہوتی ہے" یا پھر "ہر چہ چوں اپنے لئے دے کے تل پر زندہ رہتا ہے" وہ پہلے سے موجود ہوتی ہے اور جو کہانی وہ تشکیل دیتا ہے وہ فقط ایسی سماں بندی ہوتی ہے جس کے ذریعے صرف وہ کسی مسئلہ، اصول یا ضابطہ عمل کی تشریح کرتا ہے، تصویر دیکھنے کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ کامیابی کے لیے پُرامن اور قابل قبول ہو جائے۔

یہی وہ روایت تھی جو قدردن و جھلی کے زمان، حکایت کہنے والوں کی، خدائی مزاح نگاروں کی، یا مزاحیوں صدی کے کردار سازوں کی، اور اس کے بعد شادیوں صدی کی تصنیف یہ کہانیاں لکھنے والوں کی جنہوں نے صدی کے حقیقت آمیز ماحول اور معاصرہ خوبیوں تک رہنمائی کا باعث ہوئی، مثلاً بالتراب نے لکھا تھا، "تم اور تم جیسے چند شوب صورت لوگ ہی میرے خیالات کو سمجھ سکیں گے جب وہ La Maison Nuongen اور اس کے فوراً بعد César Brozeau کا مطالعہ کر رہے ہوں۔" کیا اس تشریح میں ایک پورا

سماجی نظریہ پوشیدہ نہیں؟

ان دنوں ہر اس دور میں ایک دہرائی ہوئے (جنس سے بعد کے آنے والے) فطری نہیں تھے پہلے چشم پوشی کی، اور پھر ایک صدی بعد اس کو مثالی کر دیا (جنس کی اعانت قلم سے ایک نوع کے فخر کے اور اپنے اصل قدر سے کہیں بڑی نظر کرنے والی خبیثوں نے کی، اس نواپنی حیثیت سے کہیں نیا نہ ہو سکتا تھا، ہرگز کہ ہم کے مالوں کو خوار کر دیا اور اس کی تخلیقات کو ختم دیا جن میں صرف ان کا اپنا اور حق اس انکساری عنصر ہوتا تھا۔

ایک صاحب شیشے کی عدوس دیکھتے ہوئے، اس کی تفصیلات کا بیان نہ صرف محض ایک لٹریٹریٹ نہیں لگے گا، بلکہ جیسا کہ Tynianov نے زور دے کر کہا تھا کہ ہر ادیب ہوگا، اس لیے کہ یہ خود قلم سے زبردستی منتقلی رہتا ہے، راد میں حائل رہتا ہے، اس وقت کے ارتقا میں جب با آخر قاری جو کسی غلو کر رہا تھا سر واقعہ کی اس تک پہنچ جاتا ہے۔ Henri de Montherlant لکھتا ہے، ”جب میں کسی ماویں میں کسی بیانیہ منزل پر پہنچتا ہوں تو ایک صفحہ چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔“ اسی طرح آئندہ سے ہمہ تنوں نے (جنس کا Montherlant سے کوئی اور علاوہ نہیں) علان کیا تھا کہ وہ Raskolnikov کے سرے کی تفصیلات کے بیانات کی اکثریت سے مرد نہیں سکتا مگر ”لکھے والے کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ہمیں (یعنی قاری کو) اسی قسم کی ”فطری ذاکہ“ کی آسانی نہ دے جس کے چال میں جکڑے۔“

روایتی ماویں کے کردار ”حالات“ میں سماجی اور نفسیاتی قسم کے ہوتے ہیں، جنہیں محض منصفانہ خیر خا کے کی طرح اس کی گردیا جاتا ہے، مگر اگر ایک قرائنیکی دانست کی طرح۔ ”بھس جوتی“ کے مقدمے میں Strindberg نے لکھا ہے، ”Harpagon (ماویں ایک کردار) قائل تھا کہ کبھی انسان ہے حالانکہ وہ مقدس حکومت کا بہترین کاؤنسلر بن سکتا تھا، ایک سرمایہ دار خاندان یا کچھ اور بھی۔ مگر نہیں، وہ صرف ایک سیدھا سا ماویں کبھی انسان ہے۔“ روایتی ماویں کے کردار مسلسل سے ایک کے بعد ایک چٹن آنے والے ہیں، ہم واقعات و اثرات کے خطروں میں الجھے رہتے ہیں، ایسے جو ہمیں انہماک و ستان تک لے جاتے ہیں، جس کو ماویں کا نقطہ نظر دیکھ جاتا ہے۔ یہی کردار لکھنے والے کے اصل نظریہ بیان تک قاری کی روحانی کا فطری اد کرتے ہیں، حتیٰ کہ ان کو یہ تک بتاتے ہیں کہ ہمیں ساتھ لڑنا ہی کے مردوں اور عورتوں کے بارے میں کیا تصور قائم کرنا چاہیے۔

ان حالات میں سب سے بڑی کونٹ اس بات پر ہوتی ہے کہ قلمنا پہلے سے طے شدہ سارے واقعات اسی (لکھنے والے) کی خواہش پر مختصر ہوتے ہیں جو انہیں ان سے منسوب کرنا ہے۔ اس کے نزدیک دونوں صورتیں ایک ہی جیسی فحش کا باعث ہوتی ہیں، جب ایک کردار دوسرے کے ساتھ ہے (دونوں مل پاتا)، محبت میں گرتی رہتے ہیں (یا غرت کرتے ہیں) مر جاتے ہیں (یا مرنے سے بچ جاتے ہیں)، اور اسی طرح یہ سارے واقعات، اگرچہ ہر طرح ممکن ہوتے ہیں، نہ ہوں۔ جیسا کہ کاٹز The Nigger of the Narcissus کے مقدمے میں نہ دے کر لکھتا ہے کہ لکھنے والے اپنے قاری سے اور کچھ نہیں بس سادہ لوحی اور

خوش، عقائد کی توقع کرتا ہے، وہ کرداروں کی ”منطق“ کا مائع ہو، حالات و واقعات کے ہوتے نہ ہوتے پر منحصر ہو۔ اور اس کی قوف انتہائیں ہوتی۔ اس کے برعکس بشری مارٹن اول Le Rouge et le Noir کی ابتدا ہی میں ہمیں یقین دلا ہے کہ Julien Sorel جیسے سے طے شدہ نسل کے مطابق Madame de Renai کو پستول سے گولی مار کر ہلاک کر دے گا۔ جب کہ دوسری طرف، Emile Faguet اپنے کردار میں اس مارٹن انجام وستان کو غائب رکھتا ہے۔

بالشبہ ایسے پیر اور عقل و افکار کے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ حقیقت کا رنا اس نوعی نے اپنی پیدائش کے وقت سے ہی اپنے ارتحال کی بنیاد رکھ دی ہے۔ حقیقتاً ایسا گنا ہے جو کہنے والے اپنے نامحاشہ بیگناہت پہنچانے والے فریضہ بدلتی کی ضروریوں کے احساس کے پیش نظر متذنب کی وجہ سے ان میں نامطرحہ شعور مواد شامل نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت تک، خود وہ La Franchise de Cleves, Candide, Les Liaisons Dangereuses, la Nouvelle Héloïse میں، جو وہ جیسے نظریات سے پیدار کرنے والے ادیب جیسی تخلیق تھے، ایک مادل یا قسبہ نامہ داستان میں بیگانہ شخصیتوں کے عکاس تھے، یا صرف تھیں پہلی صورتوں میں نظر آتی تھیں۔ مثلاً کے طور پر تو مشرب مسووم حوالت کے رنگ ’سوس اور گلاب‘ جیسے ہوتے ہیں، وہ دو مقامات پر عکاس ہوتی ہیں۔ سادگی عمر رسیدہ بونٹس ’کریہ‘ انتظار ہوتی ہیں، تمام ملنے ’ٹھنڈے‘ ہوتے ہیں، سارے رنگ زریعت خاک ہوتے ہیں وغیرہ۔ انعام سے قلم نگاہیں کرداروں یا علاقوں کی کسی ہی زمین اور طویل جزائیاتی تخیلات میں ہیں۔ صدی کے زمانے کے ساتھ ساتھ ایسے بیانات نہ صرف نیا رہتے ہوئے گئے بلکہ یہ داستان کے ابتدائی حصوں تک ہی کرداروں کے قوتان تحفظ تک ہی محدود نہیں رہے، بلکہ رفتہ رفتہ قہقہے کی کرداروں میں بھی بڑی مقدار میں Trojan Horse کی طرح خلیا انداز ہوتے گئے کہ ان میں، تفصیلات تو اندر رہ گئیں مگر کہانی جس کا بیان اصل مقصود تھا، باہر رہ گئی۔ Julien Sorel کی لمبا کب متعلوفی، تنگنیا سے ایلا لاری کی سوت یا ینا کرینا کا خود کو بریل گاڑی کے نیچے لال و پھان کی مہم جوئیوں کے منطقی نقطہ عروج ہوں گے جن کے خلاق پہلوؤں کو اجاگر کرنا مقصود تھا۔ مگر ان میں سے کوئی بھی Alterane کے انجام سے خند نہیں کیا جاسکتا۔ پوٹس، اس کو ایک عام سے گھر سواری کے حادثے کے ذریعے غائب کر دیتا ہے (یوں کہہ لیجیے کہ اس سے جان چھڑا دیتا ہے)۔

میرے خیال میں، تیسویں صدی کے دوران ماؤں کے ارتقا اور مصورتی کے مقام کے مابین ایک دلچسپ مقابلہ کیا جاسکتا ہے، جو کافی عرصے قبل شروع ہوا تھا۔ Ernest Gombrich لکھتا ہے کہ ”بیسویں مصورتی کا اختتام (یعنی اصل مقصد) تھا اعلیٰ شخصیات کو مقصدی بنانا، اور سب سے زیادہ مقصدی مائیں کو ایسا اظہار دینا کہ وہ دیکھنے والوں کی نگاہوں میں چرتی رہے۔“ بازنطینیوں کے دور میں اس کا اولین ٹکڑا واقعے کا صرف ہوا آسمان فخر تصویر (مصر ہل کے قدیم دور کی تصویر کی تحریر مترجم) میں دکھانے کے بجائے بیان کیا جانا ”میں سے۔ ایک شجر، ایک کوسراں ایک چشمہ، چھو پہاڑوں تصویر کی ”مناظروں“ میں پیش کیے جاتے ہیں۔

”نگر، جستہ جستہ، ایک نئی ضرورت ظہور میں آتی ہے، یعنی اس طرح آگے بڑھنا کہ دیکھنے والے ہونے والے واقعے کا گواہ بن جائے۔ جو کہ مراقبے کا مقصد ہوتا ہے۔“ یہ رفتہ رفتہ ہم کو نظریات کی ”بہشت“ کی طرف لے جاتا ہے، جس کا پہلا کاری گمر GOSO تھا، ایک ارتقا ج اپنے درستی پر آگے بڑھتا رہا تا کہ Gombich ’تیس منٹ کے نظریاتی مقابلے‘، جو اب تک یورپ و وسطی کے عام تصورات کے مطابق ترتیب دیے جاتے تھے، ان کے مقابلے لیا کہ وہ میں نے آدنی سے کس طرح واضح کی جائے یا اخلاقی مسئلے کس طرح ذہنی نشیں کیے جاسکیں، تو دامن کرنا ہوا اور بے مقصد واقعات سے صفحات کو پر کیے ہوتے تھے۔ سچوین صدی میں اس قسم کے مقررہ ایسے ہندائیوں کو بھی بھٹم کر جلتے ہیں، اس حد تک جہاں Joachim Pannar جیسے ماہرین کے ہاتھوں کا کام ایسی خوبی سے سوری ہے کہ جو چھ ایک مضمون تخلیق کر دے ہے اس کو کسی مضمون سے ہم آہنگی کی ضرورت نہیں، مسئلے اس کے جو موسیقی کی طرح، کائنات کی ہم آہنگی کو متکمل کر سکتے۔“

ایک طویل وقت کے بعد مضمون کو محسوس ہوا کہ اس کا کام ایک قسم کے سکون تنظیم کی طرح ایک طرف سے دوسری جانب اس طرح منتقل ہو گیا ہے کہ وہ صرف عمل کا ثمر بن کر رہ گیا ہے، جو عمل سے یا مواد کا انجہار نہیں کرتا، بلکہ پیدا کیے جاتا ہے۔

ادب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، اور آج ناول کے لیے (ناول سے) یہی طاقت کا مطالبہ کرنا جائز سمجھا جاتا ہے جو ٹھانڈے سے زیادہ معتبر ہو۔ جس پر ہمیشہ بحث کی جاسکے، جو فلسفے سے بھی منسوب کی جاسکے۔ ایک متن کو ٹھانڈے ہی وقت حاصل ہوتی ہے جب اس کے جزا مجموعی طور پر اور انہیں کے رشتوں کے، عتہ بہانہ کرنے ہو سکیں، جہاں تنفس اور مٹاؤ طاقت نہیں رہتے کسی سوئے اخلاقی کے باعث جو ”ادبی انوکھے پن“ کے دائرے سے باہر ہو جائے، جس طرح کہ ایک نفسیاتی سماجی حادثہ جو عام طور پر عام نہاد حقیقت کا رد اولوں میں قانون ہوتا ہے، نگر ایک اندرونی حادثہ ان معنوں میں کہ وہ یہاں جیسا واقعہ ہوتا ہو جو ٹھانڈے نہ کیا گیا ہو، چہ اندرونی خصوصیات کے باعث، دوسرے ایسے ہی یا ہی قسم کے واقعے سے پہلے یا بعد میں آئے گا۔

اگر میں deus ex machina کو متنبہ نہیں دے سکتا، جو بڑے آرام سے عین وقت پر کہانی کے کرداروں کو پس منظر کے موقع فراہم کر دیتا ہے، تو دوسری طرف مجھ کو یہ بالکل معتبر لگتا ہے، صرف اس لیے کہ قابل فہم حالات کی ترتیب میں یہ ڈرامہ کو اپنا Guernaness کے مکان کے پائین دروازے میں واقع بیسٹ مارکس کے احاطے میں منتقل کر دیا جائے، ایسی سنسنی کی کیفیت میں جب اس کے پاؤں فرش ہانے والے مسالے میں جمے ہوئے ہوں، مایا طرح Molly Bloom کو اس کی جنسی اوجھڑائی کے جذبات کے اندر، ان میں سے بچوں کے تصور میں نگر کہ وہ ان میں سے جایا جائے جنہیں وہ دوسرے دن خریدے گئے کا ارادہ رکھتی تھی، اور اتنا ہی معتبر یہ بھی ہو گا کہ نگر کا پر قسمت Benny کا لقب کے گناہوں کی

زوردار پکار ”کیڈی“ کو سن کر ہمیشہ درد سے گما جاتا رہے۔ اور پھر کیوں؟ صرف اس لیے کہ ان دونوں موضوعات میں خصوصیت کا صاف اشتراک موجود ہے، دوسرے لفظوں میں وہ دونوں موضوعات کے شعوری تجربوں کے درمیان ایک حتمی یک رنگی پائی جاتی ہے: لہٰذا ایک رنگی جوان مٹا ہونے میں، رفاقت یا صوفی مٹا ہونے کا انتہائی جتن ہے، مگر جو موسیقی پر یا مصوٰفٰی میں بھی اچھی سمجھی جاتی ہے، تفریق کے عمل سے، تھوڑے سے یا

بے شمار کی ہے۔

پھر ہمیں چاہیے ہمیشہ یہ جانے والے سوالوں کے جواب کو ایک جھٹک دکھائی دینے لگتی ہے۔ ”آپ کیوں کہتے ہیں؟“ آپ کے پاس کہنے کے لیے ہے کیا؟“

”اگر (۔۔۔) کوئی مجھ سے یہ سنا کرے“ پالی ویٹری ٹھکتا ہے کہ ”اگر کوئی خود ٹھکر مند ہونا چاہے (جیسے کہ کبھی کبھی ہندو سے ہوتا ہے) کہ میں نے کیا کہا تھا، ہے (۔۔۔) تو میں جواب دلوں گا کہ میں نے کچھ کہا نہیں چاہا ہے، مگر کچھ بتانا چاہا ہے اور یہ بتانے کا رادہ ہے جس نے مجھ سے چاہا ہے جو کچھ میں نے کہا ہے۔“ میں کہتے ہوں کہ اس جواب پر بات کر سکتا ہوں۔ اگر ٹھکے والے کی ترغیبات کی صف بندی ایک پوری طرح کھلے ہوئے (یعنی) پھٹے کے مانند ہے تو André Lwoff کہتا ہے کہ شاید ضرورت کا ادراک بالکل فضول نہیں، طلب بہ ذات خود، سب سے پہلے خود کو پہچانتی ہے، جو اپنی بات کو آتے پہ ”کھانے“ اور ”کرنے“ کا عمل چاہتی ہے (میں بتاتا ہوں، میں یہ بتاتا ہوں، اس لیے میں ہوں، یہ سنا ہے کہ یہ سنا ہے کہ میں نے بتانے کا یا ایک چیز، یا ایک قطعہ کہنے کی کوشش۔ اور اگر ہم خود کی دہ کے قطعہ ٹریک میر وڈر کیوں تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ”کھانے“ یا ”کرنے“ کے لیے یونانی زبان کے لفظ کا ماخذ وہی ہے جو لفظ ”نظم“ کا ہے جس کو اصل کی تلاش کے لیے ہمیں گہریوں میں جانا پڑے گا۔ اس لیے کہ اگر ہم اس لکھنے والے کو جسے شاعر کہا جاتا ہے، سمجھ آئی دیکھنے پر ماضی ہوں تو نظر لکھنے والے پر کس جنود پر کوئی قدغن عائد کی جاسکتی ہے جس کو ہم اپنی زبان کی ضرورت اور دوسرے مسائل کو سمجھتے ہوئے بھی، جو اس کے لیے واحد آسان ذریعہ بھی رہ سکتی ہے، صرف معذرت خواہانہ باتیں کہنے کو قسے دار کی سوچنا چاہتے ہیں؟ کیا یہ ہماری بیویوں جانے کی کوشش نہیں، جیسا کہ مارے جاتا ہے کہ ”بر بار جب بھی خائن ہرزہ میں لکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ قافیہ بگڑتی ہوئی ہے“ اور جیسا کہ نلویئر نے چارمن سینڈ سے اپنے ایک خط میں سوال کیا تھا، ”یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک قطعی غلط اور موسیقی کے لفظ کے درمیان کوئی ضرورتی مابطل ہو؟“

میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔ یورپ میں رہنے والے بہت سے لوگوں کی طرح میری ابتدائی زندگی کم بخت نہیں تھی۔ میں ایک مذہب کا گھاد ہوں۔ میں نے قاعدہ حالات میں تنہا جنگ کی ہے (میرا فوجی دستہ ان عام فوجی دستوں میں سے ایک تھا جس کو پیش قدمی کے دوران بے دردی سے اس طرح زبان کر دیا گیا تھا کہ ایک نئے بعد تقریباً کچھ نہیں بچتا تھا) میں قیدی بنایا گیا تھا۔ میں نے بیوی دیکھی ہے۔ جسمانی محنت کے ذریعے مجھے تمام طور پر صرف کر دیا گیا تھا۔ میں نے رہا ہوا کئی بار شدید بیمار ہو پھر لی یا ماہی سمیت

کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں ہر طرح کے آدمیوں کے ساتھ رہا ہوں، کلیسا کے پادریوں اور مشتمل کرنے والے عورتوں میں، اسن پسندیدہ رتہ اور چاہی پھیلاتے والوں میں، فلسفیوں اور جاہلوں میں۔ میں نے وہاں لوگوں کے ساتھ دو ٹیائیاں توڑی ہیں، مختصراً یہ کہ میں نے کافی دیر دیکھی ہے۔ ساری، گھر، نگل ہے مقصد، سوائے اس مقصد کے جس پر محبوب دیا گیا ہو۔ میں ہر طرح کی طرح ٹیکسیز کا تجربہ ہوں (جس نے کہا تھا کہ) ”اگر دنیا کا تجربہ نہ ہو، تو اس کا مشابہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ ظاہر نہیں کر دیتی ہے سوائے اس کے کہ وہ موجود ہے۔“

آپ نے دیکھا کہ سر رتہ کے قوی کے مطابق، ”میرے پاس مکھن کے لیے کچھ نہیں۔“ گھر سائی تا رنگی پر مقدس نوعیت کی کچھ اہم چیزیں مجھ پر فٹ کر دی گئی ہیں تو میرے نزدیک یہ، نیا وہ سے نیا وہ، صرف ایک مڑ حیرت کہ ہر سو کا جو بغیر کسی خاص قسمی نہ سماجی و مذہبی وجود کے ایجاد کیا گیا تھا۔

”ہندو نظیر کی کے الفاظ میں (ہم یہ کہیں کر) کیا ”تیا جائے“ یا ”نلا جائے“ تو ہر سے مرنے یہ سوں آکھرا ہوتا ہے کہ ”آکھرا کس چیز سے نلا جائے؟“

میرے سامنے بہت سے درد کا غم کے ایک منٹے پر ”تیز میں میرے مقابل کھڑی نظر آتی ہیں، ایک طرف تو احساسات کا ایک پیمانہ کی ملوث کچھ یادیں، اور مجھ میں پوشیدہ کج فطرتیں ہیں اور کھڑکی چاہر صبا کی ہیں، زبان، اکھار کے استعمل کے لیے الفاظ کی تلاش، ہم فحش (سحر) جو ان کی ترتیب کا تعین کرے گا اور جس کے کھلنے میں یہ پتی شکل و صورت پائیں گے۔

اور سب سے پہلے مجھ پر فوراً افٹے ہوتا ہے کہ جو کچھ لکھا (بی بیان کیا) جانا ہے وہ ہمیشہ وہ نہیں ہوتا جو تجزیہ کے عمل سے پہلے ہو تھا۔ اس کے برعکس، تجزیہ کے عمل کے دوران (ہر معنوں میں) یہ خود کی اپنے موجودہ وجود میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ حاصل ہوتا ہے، زبان اور سب سے متعدد کے درمیان تنازعے کا نتیجہ، بلکہ ان کی ہم رہنمائی (symbiosis) کا، اس طرح کہ میرے تجربے کے مطابق، نتیجہ ہمیشہ ادا دے سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔

استادان کو معجزہ ادب کی اس خوب صورت کا تجربہ ہی تھا۔ پتی تحریر La Vie de Henri Brulard میں اس نے حوالی فوج کے Great St. Bernard کی طرف کوچ کیا ہے۔ اس قصے کو ہر گز سچی سے بیان کرنے کی پتی بہترین دوش کے دوایاں اچھا ہے، اس کے اپنے قول کے مطابق، اسے احساس ہوا کہ شہر و صرف واقعے کی کوئی نہیں کر رہا ہے، بلکہ اس کے اس نقوش کو کندہ کر رہا ہے، جو بعد میں دیکھے گئے۔ اور وہ لکھتا ہے کہ ”ان کندہ نقوش نے (میرے اندر) حقیقت کی جگہ لے لی تھی۔ اگر استادان نے اس مسئلے پر مزید غور کیا ہوتا تو اس کو حساس ہوا ہوتا کہ وہ کندہ نقوش میں شامل ان تمام شیاؤں، عورتوں، گاڑیوں، گھوڑوں، برف زاروں، پتھروں، وغیرہ کا تصور تو کر سکتا تھا، اگر ان کو تجربہ نہ ہوتا تو ان کی شادی کی تفصیلات بہت سارے صفحات کو غرق دیتا، مگر اس کے ذہن کے مد رہنے اور نقش کندہ کاری فقط

ایک ہی نقش تھا۔ میں تو یہ سمجھا ہوں کہ مرچورو پوری کندہ کاری کو بھی بیان نہیں کر رہا تھا، مگر یہی مجھے اس کے مدد ایک نقش تیار ہو رہا تھا، جو پرانے نقش کی جگہ لے رہا تھا۔

کم و بیش شعوری طور پر، پسے سے تصور اور بعد میں پلی بد وقت کے نقش کی وجہ سے، ادیب کی منظر کے لکھنے کا رعبہ میں سے کچھ عناصر کو داخل طور پر پہلے سے صرف چنانچہ پسند کرتا، مدد کرتا ہے بلکہ ان کی میت یہ قدر قیمت کا تعین بھی کرتا ہے، مگر یہ حقیقت مڑک کے ساتھ ساتھ کتا سے کتا رہتے ہوئے اس غیر جانب دار آئینے سے دور ہو جاتے ہیں، اسٹانڈل جس کا تصور کر رہا تھا۔

مگر نہیں بولی نقطہ ششلی "حی، یا تاریخ پان میں کمر کی قسم کی تبدیلی ہوئی تو، پسے مصوروں اور ان کے بعد شاعروں نے، جو بہرہ خود نظر آنے والی دنیا کی نمائندگی کر رہے تھے، ایک دم اپنے ہاتھ اٹھائے، اور صرف ان نقوش پر قزاحت آئی جو تبدیلیوں نے ان پر ثبت کر دی تھیں۔

اسٹوئے لکھتا ہے کہ "ایک صحت مند انسان، ایک ہی وقت میں سوچتا، محسوس کرتا اور بے شمار شے کو دیکھتا رہتا ہے۔" آئیے، اس قول کو توبیس کے کردار نامہ بوزاری کے آئینے میں دیکھتے ہیں: "مرورو شے جو اب کے طبقے میں موجود تھیں (یعنی) تحک شعوری، حلقہ، نقوش، احوال، سب ایک لٹک، ایک آن وہ صحن میں نقش بازی کے ہنگام کی طرح پھوٹ نکلتے۔ تیزی سے مختلف تصویروں میں اس نے اپنے باپ کو دیکھا، Chereux و Léon کے ذمہ، غلی منزل پر، ان کے گروں کو، ایک اور منظر، اور بالوں اقرود۔"

اگر فلوپسز یہاں کسی بیمار محبت کی بات کر رہا ہے جو ایک جسم کی دیوانگی کا شکار ہے تو، اسٹوئے اپنے مضمون میں "کئی صحت مند انسان" کہہ کر اپنی بات کو عمومی درجے پر لے کر رہا ہے۔ وہ باتوں صرف جس بات پر متعلق ہیں وہ اس بیان پر کہ اسے تحت شعوری حلقے، تمام جذبات، اور تمام خیالات اپنے آپ کو ایک ہی وقت میں پیش کرتے ہیں۔ صرف فلوپسز خصوصیت سے "اٹک، اٹک تصویروں" کو دوسرے لفظوں میں نکڑوں اور ان کے اٹکائی و اٹکائی بات کر رہا ہے۔ اور یہ کیفیت Tyrannov کے بڑا نامہ قبیس کی کمروری پر سے پر وہ اٹکائی ہے، جو ماول کو بڑا جی طور پر نکار رفتہ کا نام دے کر ایک مستحبیاتی ماول کے تصور کے نکات کی نفی کر رہا ہے، جس میں قصہ نقش ایک عذر رہا جائے گا "غیر متحرک" تفصیلات اور ان کی "انہار سارڈی" کا۔

اور اس مقام پر ہمیں، ادب کے بہت سے بغیر افضل معادلات میں سے ایک کا سامنا ہے۔ ایک "مذروقی منظر نامے" کے بیان میں جس کو بہت غیر متحرک کہا جاسکتا ہے، جس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں موجود کئی شے مدقرب ہے اور وہ دور و دور غیر متحرک نہیں ہوتا بلکہ قریب و "نقش" "خاطر کرتا ہے۔ زبان کی فطری یا فطری مجبوری کے پیش نظر یہ منظر نامے کے عناصر کو بہ ترتیب موجود کیا گیا جانے کی صورت میں ادیب، جو ہی کاغذ پر پہلا لفظ لکھتا شروع کرتا ہے تو فوڈا داس کے شان دار سامنے (whole) پر آجاتا ہے، گویا زبان میں اور زبان کے کام کردہ مشق کی یہ عجب خیر سلسلہ بندی "جیسے قریب

نی صحت سے "کہا جاتا ہے، صنعت معنوی، علم بیان اور علامتوں کی مدد سے، بقول ٹھٹھے، "عمل سے پہلے بولنے لگتی ہے"۔ زبان میں سے کچھ بھی اسی طرح نہیں ہوتا، بلکہ بالکل اس کے برعکس، سب کچھ زبان سے بتدریج کسب کیے ہوئے علوم دنیا و مافیہ کا ایک تعمیراتی حصہ بنتا ہے۔

Chloveski کی جبرائی کرتے ہوئے اگر ہم "اپنی شکل" کی تحریف "عادی تصور واپس آئی شکل" کے متصور کے حلقہ میں منتقل کیجئے تو باطنی ہو جاتے ہیں تو کوئی دماغ بعد اس طرح ان پرزوں کا رویوں (mechanisms) کو ظاہر کرنے کی امید رکھ سکتا ہے جو خود اس کے اندر بہ ظاہر موجود ہے۔ شمار "علاحدہ تصویروں" کے "بے شمار اعداد" کو متحد بنانے کا موقع فراہم کرتی ہیں، جو ایک ہر شعور و وجود کی حیثیت سے اس کا بچا "خود" ہوتی ہیں، اس بات میں نہیں جس میں وہ خود سوچتا اور رکھتا ہے، اور جس کے سینے میں دانش میں، اور منطق میں، بے شمار انتقال پر معنوی محسوسات جا کر ہوتے ہیں؟

ان کے مطابق، اندرونی منتقلیوں ہونے کے بجائے، مطالب کے ایوار (nodes) ہوتے ہیں، اور جیسا کہ میں نے Orion Avenue کے اپنے مختصر مقدمے میں بھی تحریر کیا ہے، حواسات کے چورہے ہوتے ہیں تاکہ زبان و منطق اپنی تحت کی مدد سے بے شمار اعداد کے بے شمار نمکریاں تیار کر سکے۔

اور یہ شعرا نہ ہے، "حیات کی مہم جوتی" کا جس میں کہنے والا، اپنی ذمہ داری پر، خود شامل ہو جاتا ہے، ورنہ آخری جوتی فوٹویشن کے مطابق بنائی گئی کہلوں کے مقابلے میں، جو ایک مستحکماتی مادل ہمارے سامنے رکھتا ہے، نیز وہ کامل یقین و طاق دیتا ہے۔

مظاہرہ نہ کرو، بلکہ (عمل) دکھاؤ۔ نقل نہ بنانا، حقیقت کرو۔ مزید چھپا نہ کرو، بلکہ دریافت کرو۔ ایک تصویر کی طرح، مادل کو اب اپنی سوزنیت کا ڈھنکے کرنے کے لیے کسی اہم موضوع سے شریک ضروری نہیں ہوتا، حواس حقیقت سے کہ سوشلی کی طرح اس کو ایک قسم کی ہم آہنگی پیدا کرنے کی جدوجہد کرتی ہوتی ہے۔ اپنے اس مادل کے مرتجہ کہ "حقیقت نگاری کس کو کہتے ہیں؟" وہ ان ٹیکسٹس خود دے دیتا ہے کہ ایک مادل کو حقیقت نگاری کا تفسیر عام طور پر کسی ذاتی "حقیقت" کی (یا ایک شے، جس کے اثر و پہلو ہوں) اثرات پر مبنی کیا جاسکتا ہوئے اس ادبی ہیئت کے جس کا پچھلی صدی میں ارتقا کیا گیا ہے۔ یہ مادل جانا چاہیے کہ ان کہلوں کے مرداروں کی حقیقت اس تجربے سے سوانہیں جوں کو ملتے کرتی ہے، تو پھر تجربے کا یہ گھوا کس کہانی اور واقعات کے پیچھے خود کو کس طرح نمودار کرتا ہے جس کا فون سوئے، اپنے وجود کے، کوئی وجود نہیں؟ اور حقیقت یہ ہے کہ جیسے کبھی مصوری نے کتاب مقدس کے روایتی یا تاریخی مضامین سے جوڑ

حاصل کیا تھا (کون جملہ عجیبہ گار سے "Crucifixion" پر، Suzanna and the Elders پر یا Rape of the Sabine Women پر یقین کر سکتا ہے) کوئی کہنے والا، خود وہ کتنا ہی مستحکماتی مادل نگاریوں نہ ہو اپنی تحریر کی مہم جوتی کا اپنے جادو منتظر کو کہاں جا کر جوڑے گا۔ اگر یہ مہم جوتی ہے کار چلتی ہے یہ سارے جادو منتظر اپنے اثرات محدودیت پر، تو اس کا مادل بھی، خواہ اس میں کتنی ہی نشیمن اور اخلاقی مجموعے کیوں نہ

ہوں، سب کا رہ جائے گا۔

بعض اوقات لوگ، بہت تیزی اور طراری اور استادی کے بلند منصب سے، ایک نیکھنے والے کے منصب اور فرائض کی باتیں کہتے ہیں۔ کچھ برس پہلے ایک نیکھنے والے نے فریڈرک، جس میں خود اس کی زندگی موجود ہے، کچھ لوگ، بالکل غیر جذباتی اور غیر متعلقی معنوں میں، یہاں تک کہہ گئے کہ ”یہاں ایک چھوٹے سے بچے کی موت کے مقابلے میں ایک کتاب کی کوئی وقعت نہیں۔“ لیکن ایک ہندو کے بچے کی موت کے مقابلے میں بچے کی موت اتنا بڑا اور ناقابل برداشت سانحہ کیوں؟ بلکہ اس لیے کہ یہ شریخ ایک انسان کا بچہ ہے، یعنی ذہانت کا، شعور کی نعمتوں کا حامل (خواہ کتنی ہی معمولی چینیائی حیثیت ہو) جو آریج جاتا تو ایک دن اپنی انقبول کے بارے میں سوچنے لگنے کے دوسرے دن انقبول کے بارے میں پڑھنے کے، اور شاخ و رقصت، تھوڑی تو اس کے بارے میں لکھنے کے بھی قابل ہو جاتا۔

دشمن خیال کی صدف کے ختم سے قبل، جب تک ”حقیقت نئی“ گھڑی نہیں گئی تھی، NOVALIS نے حیرت افزا تنبیہ کے ساتھ اس بظاہر عوامی باعزت کیفیت کا ایک خاص اعلان کیا تھا: ”انہی کے معاملات میں بھی وہی کلیہ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ مذہبی ضرورتوں میں اگر ہر ایک ضرورت کی ضرورت میں استعمال کے لیے ایک مخصوص رکھا جاتا ہے۔ ان کا استنباط خصوصی اور اندرونی طور پر ہوتا ہے، اور یہی دوسرے ہوتا ہے جس میں ان کی مثالی خاصیت کے علاوہ کچھ اور ظاہر نہیں ہوتا۔“

شاہد اس تعامل کی کھوپڑی کے اور خاصی نیکھنے والے میں عمل تحریر کا ایک تصور پیدا ہو جاتا ہے جو تمام تر کھسار کے ساتھ دنیا کو تبدیل کرنے کے عمل میں اپنی زبان کے ذریعے شریعت کرتا ہے۔ بلکہ اس کے بعد اختیار کیا جائے والے طریقہ، ”طروحات“ سے ”انجمن تک“ اس طریقے سے بہت مختلف ہو گا جو ایک ماہر کا اختیار کرتا ہے۔ اور یہ مختلف طریقہ بالکل دیباہی ہوتا ہے جیسے کسی نامعلوم ملک کے مذاقی کو (راستہ بھولی جانے والے پاؤں واپس جانے، مختلف چھوٹی کی مش بہت کی وجہ سے راستہ پانے یا بھٹک جانے، ایک ہی مقام کے مختلف پہنچنے والے وغیرہ سے) تلاش کے عمل میں تکلیف پیش آئے۔ جہاں تک تلاش اور جذبات کی کھوپڑی کا سہا ہے تو اس سفر کا اختتام کچھ دیباہی ہو سکتا ہے، گویا سفر روانگی کے مقام پر واپس آجائے، جیسے تجربے کے ساتھ کراس نے کچھ اشاروں کی نشان دہی کر دی ہے اور ماہر ماہر ماہوں میں کچھ پیوند مل جاتا ہے۔ لہذا، اسکی راہ میں اس کو جھنم کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، جو کچھ نہ ختم ہونے والی وسعتوں کی تلاش کے دوران، اپنے ہی بنائے ہوئے ایک خام نقشے کے ذریعے ملتا ہے، جب کہ اسے یقین نہیں ہوتا کہ اس نے مخصوص جوش و خروش کی پیروی کرنے اور اپنی قوتِ فکر کا ختم ماننے کی تمام کوشش کی ہے۔ نہ تو جینے جیتی ہوتی ہے، علاوہ وہی نہایت فائدہ مند ہے اور نہ NOVALIS کی طرح غلو پیکر کسی قسم کو ہم آہنگ موتی کی دت کرتا ہے۔ اس کی تلاش میں لکھنے والے کے لیے صرف ایک شمار پیش رفت ہوتی ہے۔ ایک ماہر انسان کی طرح راستے کو محسوس کرتے ہوئے وہ ایک ہندگی میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر نئے

مرے سے کاش کی کوشش شروع کر دیتا تھا۔ اگر میں ہر قیمت پر اس کو کوششوں میں کوئی مددگار نہ ہوتا
تو کاش کرتی ہو تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مددگاریت اس میں پوشیدہ ہے، کہ ہم اس دیکھ دال کی طرف پیش
قدمی نہیں کرتے ہیں جو ہمیں قدموں کے ساتھ سے خطرے سے مرکب رہی ہے۔



یار و سلاف سائی فرت

اعترافِ کمال۔ اس کی شاعری کے لیے جو پٹی و کمال ترقی، اعلیٰ انجیری و رفائری و اختراٹ کے ذریعے انسان کی ہمدانی، اس کے قابلِ تعمیر اور آزادی پسند جو بے نقوش شری کرتا ہے۔

یاد ہے چھوٹو سو گیا کا سب سے بڑا شاعر یار و سلاف تھا جس کو اس کی قوم آج بھی شوق سے پڑھتی ہے اور یاد بھی کرتی ہے اس سے کہ وہ جانتا تھا کہ اعلیٰ اور تم تعلیم یافتہ دونوں طبقے کا دیکھنے سے کیسے کلام کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ قطعی نہیں ہے کہ اس کی صفت اس کو ہے پنا و مفیدیت کا باعث ہوئی۔ اپنی توجہ کی میں یار و سلاف سے شرفی انقلاب کا طاق تھا اور اس سے متاثر ہو کر اس نے اس کی نظمیں لکھیں جو عوام الناس میں بہتر زندگی و قومیت کو دلالت پیدا کرتی تھیں۔ اس کی نظمیں مراد، آسان اور نفی دہشکوں سے مبرا ہوتی تھیں۔ ان میں لوگ غیبتوں کا اس انداز، لہجوں، گنگو، ورو و زمرہ کی زندگی کے عکس ہوتے تھے۔ اپنے ابتدائی دنوں میں اس نے جھپٹے نمانے کی اعلیٰ وضع اور مضبوط پسند کی شاعری سے انحراف کیا۔ اس کی تحریر سبک دست، ظلم، انجیر، سریلی، ورو قومیت سے بھرپور، ایک دھڑکتے ہوئے اور بیٹے انداز کی تھی جس میں شوقی کے ساتھ ساتھ رقت و فری بھی ہوتی تھی۔ وقت گزرنے کے باوجود اس کے نفی انداز تحریر میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔

دوسلاف صرف ایک مقامی شاعر ہی نہیں، وہ ایک غیر معمولی وسعت اسلوب رکھنے والا فن کار تھا۔
 وہ دوسلاف ابتدائی سے ہم عصر یورپی ادب سے بہت متاثر ہوئے، ان سب کے باوجود وہ دوسلاف مذہبی عقیدہ
 ۲۔ ہنگ اور مشرق وسطیٰ کی شاعری کا بھی بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ سربیت کے مذہب اور ہادوق فن کے ساتھ
 ساتھ فنانس کی بنیاد پر اپنی زندگی میں بھی متاثر تھا۔

دوسلاف کی شاعری اپنی ہم گیری، ہمزوئی، اکثر ملی کیفیت اور حیرت انگیز سبب رکھنے کے
 باوجود انسان کے بنیادی احساسات، بصیرت اور تخیلات سے محروم ہے۔ اگرچہ اس کے پیچھے کی محسوس سے
 اس کی سیاسی اور عمرانی وابستگی عین تھی جو اس کی تخلیق کی رگوں میں بڑی نظر آتی تھی مگر وہ کہیں بھی کسی
 گروہ کی نظریہ کا پرچار کرنے والا مصنف نظر نہیں آتا۔ اس کی ذہنی ہم آہنگی اور حساب یک جہتی کا رگزار
 کسی تک نظر منسوب ہے پر نہیں۔ ہندو دقت زدہ، محبت کرنے والے، کام کرنے والے، حساس، تخلیق کار
 ہونے لگے ہوتے رہنے والے، ہنگ کے مارے خواہش کرنے والے انسان پر تھا خود وہ کسی تنظیم سے منسلک
 ہونا نہیں بھی سوچتا تھا۔

اس کی شاعری میں پہاڑ، شہریت، موسیقی، لفظ انگیزی اور آرائش و تزئین سے انحراف کے باوجود
 قوی شناخت اور ثقافتی رہنمائی سے منسلک رہنے کی بنا پر دوسلاف کی قوم اس سے اب بھی لوٹ کر پیدا
 کرتی ہے۔ اس نے اپنی فوجوانی ہی میں اثر پذیر اشتراکیت سے متعلقے ہوئے لیے تھے جب اس کا وطن
 تاسیہ کے جبری اقتدار کی چکی میں پس ہوا تھا اور خود کو اس کی آزادی کی جدوجہد کے لیے وقف کر دیا تھا۔
 دوسلاف نے خود کو اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد کے لیے وقف کر دیا۔ اس نے اشتراکیت
 سے فاصلہ رکھا اور اپنی قومی شناخت کو برقرار رکھنے کے لیے بڑی قربانیاں دیں۔ صوبیت داس کے قبضے کے
 دوران اس نے بالکل خاموشی اختیار کر لی تھی اور سوائے صحافتی سرگرمیوں کے سب کچھ بھروسہ کیا تھا۔ وہ خود
 بھائی دباؤ کے اس نے "مریت کے حق میں ایک لفظ بھی لکھنے کی شہی نہیں کی۔ میں وجہ ہے کہ چکیوں سے لوہا کیا
 کے لوگ اس کی عزت بھی کرتے ہیں اور اس سے دلہ نہ پوچھ بھی کرتے ہیں۔

دوسلاف سائی فٹ نے 1901 میں چیکو سلویا کے محنت کش جمہور کے ایک گھرانے میں آنسو
 کھولے۔ اس کا خاندان پرگ کے نواحی علاقے ریڈوف (Zelkov) میں رہتا تھا۔ اس نے اپنی مدرسہ کی
 تعلیم کے دوران ہی شاعری شروع کر دی تھی۔ اس کا پہلا شعری مجموعہ 1921 میں شائع ہوا تھا۔ وہ بائیں
 بازو کی شدت پسند تنظیم سوشل ڈیموکریٹک پارٹی سے منسلک تھا جو بعد میں کمیونسٹ پارٹی میں تبدیل ہو گئی۔
 اس دوران وہ کمیونسٹ پارٹی کے ایک اخبار کا مدیر بھی رہا۔ 1929 میں اپنے چھ سرخیوں کے ساتھ
 دوسلاف نے بول شہر یک (Bolshevik) اثرات اور چیمو سینا کی کمیونسٹ پارٹی کے خلاف ایک اعلان
 پر دستخط کیے اور اس کی پارٹی میں پارٹی سے خارج کر دیا گیا۔

بارو سلاف کی اخبارات اور رسالوں کا مدیہ رہا۔ جب کمیونسٹ پارٹی کے جبری وجہ سے اس کو صحافت ترک کرنی پڑی تو اس نے اپنا سا ماقولت ادب کی تخلیق کے لیے وقف کر دیا۔ اس کو 1936، 1955، 1968 میں شاعری پر نوبل انعامات دیے گئے۔ بارو سلاف نے 1998 میں انتقال کیا۔

خطبہ

دماغ کی قابلِ رحم اور غنائی کیفیت کے بارے میں

مجھ سے اکثر، بالخصوص غیر ملکی حضرات، یہ سوال آتے ہیں کہ میرے ملک میں شاعری سے بے پناہ محبت تو وجوہات کیا ہیں؟ ہم لوگ نہ صرف نکلہوں میں دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ ہم تو شاعری کو اپنی ضرورت سمجھتے ہیں۔ شاعر اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں، ہمارے سرورق شاعری کو سمجھنے کی بڑی صلاحیت رکھتے ہیں۔

میرے خیال میں، یہ نتیجہ ہے چپک (چیکو سلواکیا کے) لوگوں کی چار صد سالہ تاریخ کا، اور بالخصوص تیسویں صدی میں ہونے والی ہماری قوم کی نشان دہانی کا۔ جس برس تک چھنے والی جنگ کے باعث سیاہی آزادی سے محرومی کی وجہ سے ہماری روحانی اور سیاسی شرافتیں معدوم ہو گئی تھیں۔ اس کے ارکان کو جو موت کے گھاٹ اتارنے سے بچ رہے تھے، ان کو موٹا کر دیا گیا یا ملک بدر کر دیا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف ہماری تہذیبی نشوونما میں خلاں پڑے بلکہ ہماری زبان بھی زوال پذیر ہو گئی تھی۔ نہ صرف یہ کہ کھوکھلی جیسے بہت بے جرم پر مسلط کر دی گئی تھی بلکہ ہم پر جرمنیت (Germanization) بھی زبردستی تحویپ دی گئی تھی۔

انیسویں صدی عیسوی کے اوائل تک انقلاب فرانس، بورژوازیوں کا زور ہم کو اپنی ترجمان سے اٹھانے اور ربا تھا، ہم میں نئے سیاسی تصورات اُبھر رہے تھے، اور ہمارے دلوں میں پلِ نجات سے اور اپنی قومی تہذیب سے محبت چائیزیں ہو رہی تھیں۔ اس طرح ہماری زبان اپنی قومی شناخت کا اظہار کرنے کا سب سے اہم ذریعہ بن چکی تھی۔

شاعری ہمارے ادب کی وہ پہلی حیثیت تھی جس کوئی زندگی میں اور یہ ہماری تہذیبی اور سیاسی پیدائش کا سب سے اہم عنصر رہی۔ اسے ابتدائی مرحلے پر ہی شاعری کو چپک روایت کی خوب صورت اور نفیس نگارہ تحریر بنانے کی کوشش کو عوام نے جذبہ شکرگزاری سے دیکھا۔ چپک عوام نے، جو اپنی سیاسی نمائندگیوں اور ترجمانوں سے محروم ہو چکے تھے، اپنی کجی و خالی حالتوں کو اس کا نعم تبدیل بنانا چاہا۔

ان کی وجوہات کی بنا پر شاعری ہماری تہذیبی زندگی میں بڑی اہمیت کی حامل ہو گئی ہے۔ یہ ہے مراجعت

ہماری شاعری کے مسک کو چھوٹی صدی کے دو ماہ تاج بند اعزاز دینے کی۔ مگر صرف اس کے بعد ہی شاعری نے اتنا ہم کردار ڈال نہیں کیا۔ اس صدی کی ابتدائی میں، اور دو عالمی جنگوں کے دوران ہی اس کے شاندار شجوں نے پھوٹنے لگے تھے۔ آگے چل کر عالمی جنگ دوم کے دوران، ہماری شاعری نے ہماری قومی تہذیب کے عکس میں نمایاں کردار ادا کیا، جب ہماری قوم پر انقلاب کا وقت تھا اور اس کے اپنے وجود کی کو خدشات لاحق ہو گئے تھے۔ تمام تر بیرونی پابندیوں اور اقتصادی احوال کے باوجود شاعری کی قدروں کو بچھ کرنے میں کامیاب ہوئی جن سے عوام کو امید اور قوت ملی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد بھی، گزشتہ چالیس برسوں کے دوران، ہماری تہذیبی زندگی میں شاعری اہم درجے پر فائز رہی ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ شاعری یا غنائیت شاعرانہ عوام سے کھم، بہت سی قوت کے تکم کے لیے بنی تھی۔ ہمارے سب سے محفوظ یادگار تھی، جس میں ہماری دور کے دوسری زندگی پڑتے تھے، کبھی کبھی جن کا نام بھی سینے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ایسے بھی ٹرانک ہیں جہاں چند مہیا کرنے کی خدمت بیرونی طور پر مذہب اور اس کے علم کرتے ہیں۔ ایسے ہی ہم ایک ہیں جہاں لوگ اپنے عکس اور اپنے مقدور کاموں کے ذریعہ اظہار میں دیکھتے ہیں اور اپنے سیاسی ماحول کے نقاد میں سنتے ہیں۔ ایسے بھی ہم ایک اور قوم ہیں جنہیں اپنے سال دوران کے جواب صاحبان عقل اور جناس فلسفوں کے قول سے ملتے ہیں۔ ایسا اوقات یہ گہرا رجحان اور دلچسپی ابلاغی ادا کرتے ہیں۔ ماہی لگتا ہے کہ ہمارے قومی جذبے نے تقسیم اختیار کرنے کی کوشش میں شاعروں کا روپ اختیار کر لیا ہو اور انہیں اپنا ترجمان بنا لیا ہو۔ شاعروں اور نغمہ نگاروں نے ہمارے قومی شعور کی تقسیم کی ہے، باطنی میں ہمارے قومی انگوں کو قومی اظہار عطا کیا ہے، اور آج تک اس شعور کی کیا رہی بھی گمراہ ہیں۔ ہمارے لوگ معاہدے کو باتوں کو کسی طرح سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں جیسے کہ ان کے شاعر ان کو پیش کرتے ہیں۔

شاعری انہوں سے دیکھنا، ایک خیران کن تجربہ ہوتا ہے مگر یہ اس کا درناظر اور کیفیت کا قوی تاویل چاہو نہیں؟ کیا حد سے تجاوز کرتے ہیں شاعری تہذیب کے احوال میں غصہ نہیں پیدا کر دیتی؟ مجھے اس بات سے مکمل اتفاق ہے کہ لوگوں کی تاریخ میں ایسے دو رنگ آتے ہیں، ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں جن میں شاعری سب سے زیادہ مناسب نہایت آسان ہمارے شاہی واحد ممکنہ طریقہ اظہار رہتی ہے۔ اس لیے کہ شاعری ہی میں وہ قدرت ہوتی ہے جو غیر مجزی کی نگاہوں سے خفیہ رکھتے ہوئے، اشاراتی، کنیاتی اور مستقیمائی کیفیت کی آڑ میں وہ سمجھ کر لکھی ہے جو وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مجھے اس بات کا اصرار بھی ہے کہ شاعری کبھی بلکہ خود ہمارے مشکل دور پر ہندسیاتی طور میں بھی، ایک مائب زبان، ایک متبادل زبان، ایک ضرورت کی زبان رہی ہے۔ اس لیے کہ ان باتوں کو کہنے کے لیے، اس وقت جن کو سست انداز میں نہ کہا جا سکتا ہے اس سے بھر اور قوی ذریعہ اظہار نہیں ہوتا۔ پھر بھی، ہمارے ملک میں شاعری کی غالب غیثیت میرے ذہن پر سار رہی، اس لیے اور بھی کہ میں خود شاعری کے لیے پیدا ہوا تھا اور اپنی تمام عمر میں شاعری ساموں۔

میں اس شبہ کی بنا پر قلمبند ہوں کہ شاعری سے، غنائیت سے میری کئی محبت اور اس باب میں

میرے اس ٹرسٹ کے خیالات اور ضررے التفات کو بخش ایک ذہنی کیفیت کے علاوہ کہیں اور کچھ نہ سمجھ سکا جائے۔ غنیمت، حقیقت میں خواہ کتنی ہی سرایت کرنے کے قابل ہو جائے، اشیا کو دیکھنے کی اس کی صلاحیت خواہ کتنی ہی کم بہت کیوں نہ ہو خواہ کتنی ہی مثالے پت سے یہ انسان کی مدد والی جہتوں کو بتانے اور محسوس کرنے کے قابل کیوں نہ ہو جائے، اس کو بہر حال احساسات اور جذبات ہی سے منسلک رہنا ہوگا۔ احساسات اور جذبات اس کی تشکیل کو بخود قرار دیتے ہیں اور اس کے برعکس بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ غنائیت احساسات اور جذبات سے ہم کنار ہوتی ہے۔

کیا غنائیت کی غالب حیثیت کا مطلب یہ نہیں ہونا کہ احساسات اور جذبات میں اس کے دور کے باعث، اس کے بارے میں شبہات و اس پر تنقید کو پس منظر میں دھکیل دیا جائے؟ کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہونا کہ تمام خطرے قوت اور دل سوزی کے باوجود خوش، بچا کھلا کھ رہیں کر سکیں؟

کیا اس نوعیت کی ایک طرف مست بندی رکھنے والی تہذیب اس خطرے میں نہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو مکمل طور پر نبھانے کے قابل نہ ہو سکے گی؟ کیا ایک معشرہ جو نہ کی حد تک اپنی ہمدردی، غنائیت کی طرف جھکا ہوا ہو، کئی حد تک نہیں رکھتا کہ خود اپنا دنیا کے کسکے دراپنے وجود کے تسلسل کو یقینی بنائے؟ سچ پوچھیے تو اس بات پر میں بالکل فکر مند نہیں ہوں کہ تہذیب کا وہ عنصر ممکن طور پر نظر انداز کیے جانے کے خطرے میں ہے جس کی بنیاد ہماری معنوی طاقت پر رکھی گئی ہے، جو سوچنے پر سے طلوع ہوتا ہے اور نہایت معروضی انداز میں اپنا اظہار کرتا ہے۔ وہ معنوی عنصر جس میں ہوتا ہے، اشیا سے دوری سے، ذاتی توازن سے، اس لیے کہ وہ پروگرام کے مطابق شدتوں کی فنی کیفیت نہ مل سوزی کے جذبات پر منحصر ہوتا ہے۔ وہ معنوی عنصر نہ تو اپنے آپ کو عام آسویں میں دھیمبا ہونے کی اجازت دیتا ہے نہ خود کو کسی اندرونی طرف کی طرف پھینکتا ہے۔ ہماری عقلیت پسند فادیت پسندی اور عملی مذہبیت بہتر جانتی ہے کہ دانش کو کس طرح کا مسل کیا جائے اور کس طرح استعمال کیا جائے۔ یہ معنوی عنصر تناسل و اشیا کے بعد سے مسس اور خود بہ خود ارتقا پتے پر ہوا ہے۔ تسلیم کر لیجئے کہ اس کو بھی غیر ہمدرد نہ ہو رہا ہو جاتا ہے، اور کچھ دیر پہلے وہی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر یہ تہذیب میں اس کو غالب مقام حاصل ہے، اس کے باوجود اس کو نہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ اس کو ہماری تہذیب و ثقافت میں اپنی تصوراتی سوچ کو نئے انداز اور نئے پیکر میں پیش کرنا پڑتا ہے، اس لیے کہ یہ عقلی عہد سے قبل کی وجوہات کا جو ذہن نہیں رہ سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ عنصر اتنا ہی اہم ہے جتنے کہ وہ دونوں جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ اس کے وجود میں اسے اس مقام پر اس درجے کی وجہ نہیں دے سکتا، اس لیے کہ اس کے سوچ کا انداز، یعنی تصوراتی سوچ، ثنوں اور ادب کے لیے ضروری نہیں۔ لہذا میں اپنے آپ کو بلاخیز ترین فنی کیفیات تک محدود رکھنا چاہوں گا، جس سے ایک ادیب تخلیق کار کی ضرورت نہ کر سکتا ہے۔ وہ لوگ قارئین اور قلماسا کرنے والوں کے دلوں میں اپنے نصب بانی رکھتے ہیں اور ان کی معرفت ہماری عمل فنی ثقافت کا چھن چھیل کر سکتے ہیں۔

جو شے مجھے پریشان کر رہی ہے وہ (لفظ) گداز کا مکمل و دائمی فقدان ہے۔ اس دور میں اس لفظ سے ہماری نیرودہ بھینٹ نہیں ہوتی ہے۔ اور اگر ہم اس کو بھی سمجھا راستہ لے بھی کر رہتے ہیں تو تقریباً شینی نیرودہ کے ساتھ۔ یہ ہم کو مقامی دور کے فحش کرم کے من طریق طرح، کرم خوردہ اور قدیم، انکار و فتنہ، بالکل سب سے کٹ کر اٹھی اور غیر جذباتی اور علمی جیسا لگتا ہے۔ گید، ہم بالکل بھول ہی گئے ہیں کہ یہ ایک اور ایسی تباہ کن چیز ہے کہ اسے ایک با مقصد، چست اور قوی اور خوش پیش و اشتیاق کو کسی مادی غیبت کے لیے نہیں، مگر انصاف کے لیے، صداقت کے لیے۔ گداز حاصل جوں مردی کی ایک خصوصیت ہوتی ہے اور جوں مردی جسمانی اور فنی لذت برداشت کرنے کے لیے، اور اگر ضرورت پڑے تو خود کو قربان کرنے کے لیے بھی تیار رہتا ہے۔ اگر مں جوں مردی کا لفظ مستعمل کرنا ہوں تو اس سے میری مردانہ شیئی اور انداز کی کتابوں کی اور جنگ کے دوران کی جوں مردی نہیں بلکہ اس کے عمر کی بیکری کی، اور جوں مردی ہے جو تھکاوٹ نہیں اٹھاتی، بغیر نام و نمود کی جوں مردی کا لفظ، کچھ بالکل خاموش، جھڑکی بلکہ مبتدب، وہ جوں مردی جو بدنی اور شہوانی ہو چکی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایک تہذیب مکمل، پختہ برداشت و فی اور قریبی پیمانے پر وقت ہوتی ہے جب اس میں گداز کا ایک مقام ہوتا ہے اور اگر ہم گداز کی معنوں میں سمجھ سکتے ہیں تبھی اس کی قدر بھی کر سکتے ہیں، بالخصوص اگر ہم اس کے اہل ہوں۔

مجھے کیا شے ان خیالات تک پہنچتی ہے؟ جوں مردی کے بغیر گداز کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اس کے ہمراہ چیزوں کے جوہر کا گہرا ادماک و بھون ایک تنقیدی اور تشریحاتی، سب سے ایسا اور سب جوں سے قطعی مختلف ہو نہایت حساس شاعری جس کی اہل ہو۔ شاعری یا غنائیت تنقیدی نہیں ہوتی اس لیے کہ اس میں قصور نہیں ہوتا، یہ صرف اپنے ہی موضوع پر، قس کرتی ہے، ایسا موضوع جوں کے وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، ایسا موضوع جو اپنے مقصود سے مل کر ایک کافی کی صورت اختیار کر رہا ہے۔ گداز گمان ہی نہیں رہے گا۔ گداز تازہ کے کٹن میں اتر کر یہ نہ دیکھ سکے کہ کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے۔ اس معاشرے کو گداز کے قابل ہونے کے لیے ہر اپنی تہذیب کی تکمیل کے لیے، غنائیت سے ہٹ کر اپنی قوم کا ادراک بھی ہونا چاہیے۔ اور اگر یہ گداز کے قابل نہیں تو نہ یہ کسی جہد جہد کے لیے، نہ کسی قسم کی قربانی کے لیے تیار ہوتا ہے۔

صرف وہ ہی جوانی تصور کی مروجہ تہذیب کے ساتھ جس میں غنائیت ہی نہیں گداز، اس کا دور، اس کا سانس ایسا ہو ایسا بھی شامل ہوتا ہے، ہمارے معاشرے کو ان مسائل سے نمٹنے کے لیے اخلاقی اور روحانی تقویت پہنچا سکتا ہے جو مسلسل اس کا تھیراؤ کیے ہوتے ہیں۔ صرف ایسے ہی تحقیقی میں معاشرہ اپنے ضروری اخلاقی و سیاسی ردیوں کے نقش و نگار تلاش کرتا ہے اور ان کی سے سمجھتا ہے کہ کسی شکاوت کے بغیر ان سے کس طرح نمٹا جائے۔ معامات اور قدموں کے تمام تر محدود تیز تازہات کے ساتھ، صرف ایسے کا فن ہی ہے جو سونے ہوؤں کو چمکاتا ہے، ابھارتا ہے اور ہمارے اندر سماجی پہلو کے جوہر کی پرواز کرتا ہے۔ یہی ہم کو جو حقوں کا رکن بنانا اور ہم کو ایسے موقع فراہم کرنا ہے جس کی مدد سے ہم اپنی خلوت سے

سے جو حلقہ اور تسکین حاصل ہوئی ہو اس سے نبرد سے نبرد اور بار بار لفظ المذون ہوا چلے۔
 گداز ہمیشہ ایک قدم آگے ہوتا ہے۔ یہ وقت موجود کی زمین پر قیام نہیں کرتا، اس کے دس کے
 بجائے اس کی جڑیں کھن اور سے غذائیت حاصل کرتی ہیں۔ یہ خود کو قابو کر سکتا ہے، منظم رہ سکتا ہے، اور صحیح
 معنوں میں پرہیزگار رہ سکتا، محض اس لیے نہیں کہ اس کو ایسا ہونا پڑتا ہے، بلکہ یہ اس کا اپنا فرد فیصلہ ہوتا
 ہے، اور یہ چاہتا ہے کہ ایسا کیوں کر ہوا ہے۔ اس کے لیے کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ اور یہ لا پرواہی و سرور و جوش
 برحق کی علامت نہیں رکھتا۔ اس کے لیے ہمیں خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ ورنہ ہمارا سماج تعطل کا شکار
 ہو جائے گا، خود کو ایک مذہبی لگی میں پائے گا، صدائے خود وقت کا، حیوانیت کا گداز کا رہن چائے گا، بلکہ
 نا انصافی بن جائے گا۔ گداز کے بغیر صداقت نہ کبھی غالب آتی ہے ورنہ کبھی آئے گا۔ مگر ایسی صورت میں
 گداز اس کامیابی کی جو بظاہر ایک قدرتی آفت، نوشتہ تقدیر، بلکہ وقت آخر نظر آتی ہے، اس کی اور کیفیت
 میں بھی نہیں بدلتا۔ گداز شکست کو اپنی میں بدل دیتا ہے۔ یہ کامیابی کو جنت کر کے ایک سیاہ و تہمت ہوتا ہے
 جو کسی بڑے مذہب کا ایک حصہ نظر آتا ہے، سیاہ و تہمت جس کے کوئی معنی تھے، ہو کوئی معنی رکھتا ہے، ورنہ اس
 کام کو جزوی طور پر پورا کرتا ہے جو کسی طرف کی طرف سے ہوتا ہے، بلکہ یوں کہہ لیجئے کہ وہ صرف شاہد ایک
 دن کھل جاتا ہے حاصل نہیں جائے گا۔ جب تک ہم اپنے المذون گداز کو قابو میں رکھ سکتے ہیں، ہماری امیدیں
 قائم رہتی ہیں۔ گداز کو پوری طرح فتح نہیں کیا جاسکتا، یہ مزاحمتوں سے بچ سکتا ہے۔ انفرادی گداز اور
 قوموں کے گداز، دونوں مزاحمتوں سے بچ رہتے ہیں، پیچیدگی سے، باعزت طور پر اور فقر کے ساتھ۔ یہ
 ناکامی سے دور ہوتا ہے۔ لہذا یہ ایک رتھ بند ہوتا ہے اور جنت ہوتا بھی رہتا ہے مگر گداز کے بغیر بے معنی
 اور رنج کے امکانات رہتے ہیں۔

میں جو کچھ بھی کہتا ہوں اس کے لیے میرے پاس بہت سے جواز موجود ہیں۔ میں پیدا ہی سو قہ
 شاعری کے لیے، اور میں ہمیشہ سے شاعر ہی رہا ہوں۔ اپنی تمام زندگی میں اپنے شاعرانہ مزاج سے لطف
 المذون ہوتا رہا ہوں اور میرے نزدیک یہ ناشکر پن ہوگا کہ میں اس کا کھل کر اعتراف نہ کروں۔ مجھے اپنے
 اس دنیاوی ایمان کا روق بھانپ بہت آسانی سے ضرورت بھی ہے، باوجود اس کے کہ میری نفسیں ایسے لوگوں
 میں ہوتی ہیں جن میں ان کا اپنا گداز ہوتا ہے۔ آخر، نرم ستاری بھی تو ہوتا ہے کہ گداز کو کچھ کچھ ہے، میرے
 رنج میں بھی گداز ہوتا ہے، میری تشویش میں بھی اور میرے خوف میں بھی۔

مگر میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہوں۔ میں شاعرانہ مزاج کے حواس سے بھی کچھ کہنا چاہوں گا۔
 اب، جب کہ میں گداز کے لیے اپنے احرام کا اثر کر چکا ہوں، میں زندگی کی طرف اس کے رویے کا بھی
 دفاع کرنا چاہتا ہوں اور اس کے فوائد کا بھی۔ ایسا کرنا میرے لیے صرف صحیح کی نہیں، بلکہ حتی الامکان
 ضروری بھی ہے۔ میں یہاں ضرورت سے زیادہ زندگی کی بات صرف اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ روشن
 خیالی کے بعد سے حقیقی تہذیب نے مناسب تصوراتی سوچ کا خیالی پیش کیا ہے جو (ہماری خواہشات کی

قرنی کے ساتھ) کشش کشش نہیں؟ حق کی ناقابل اطمینان ساقی کیفیت تک سے آیا ہے جیسا کہ آتش کر
ہیں احساس ہوتا ہے کہ خاص طور پر خواہشات کے اس غیر محدود اور تنازعات شدت کی روشنی میں جو
بڑے ذہناتی انداز میں ہمارے سامنے آ رہے ہیں، اب تعمیری ناگزیر ہو گئی ہے اور ہمیں اپنے مسائل کے
اور ک کے لیے نئے راستے اختیار کرنے ہوں گے۔ معاشرے کے آتش کے دشتوں میں بڑھتے ہوئے
اظہار کی جارہا نہ ہن کے پیش نظر مجھے یہ ضروری محسوس ہوتا ہے۔ تو کیا یہ چارہ نہ ہن ہی ہے جو انداز کا مختلف
انداز ہے۔ پھر یہ صرف ایک نوٹ کی چابی ہے جو کسی قسم کے گمراہی کی راہ نہیں۔ اپنے دور کے ان کی
حالات کے پیش نظر میں غنیمت کے مخصوص فوائد و مہر راحت سے بچنا کرنا چاہتا ہوں۔

جب انداز کی کیفیت میں دعا کا بے صبرے پن کی آگ میں جھلس رہا ہو، ایک غیر اطمینان بخش
حالت پر تلاء پانے کی کوشش میں شدت احساس سے شرابور موادوں میں رگوں کے ساتھ ٹکر یک طرف
کھڑے پن سے، اس میں کامیاب بھی ہو، تو (یہ میں) غنائی کیفیت، ایک ایسی کیفیت ہوتی ہے
جس میں نہ خواہش کی سرگرمی ہوتی ہے نہ مرم کی۔ یہ (دعائیں) حمایت کی کیفیت ہوتی ہے، جو نہ عدا
ہوتی نہ بے مبراہیں خاموشی کی ایک کیفیت۔ ان اللہ کی جو انسان کے نزدیک سب سے اہم ہوتی ہیں،
سب سے حیوانی اور قویٰ کی بے حد اہم و دنیا میں قیام کرنے کی صلاحیت، صرف ممکن طریقوں سے
بڑے کی صلاحیت ہولڈر لین کے لحاظ سے شاعرانہ اور فانی انداز میں۔

گندہ ہمارے جذبات کو ابھارتا ہے، گھڑتا ہے اس میں صلاحیت ہوتی ہے، اپنے اضطراب میں
اور اپنے معیاروں کے حصوں کی تک و وہ میں، ہمیں قربانیوں اور خود کشی کی طرف لے جاتے ہیں۔ (جب
کہ) غنیمت ہم کو پیر سے اپنے گلے لگائے رکھتی ہے۔ مختلف حالتوں کے درمیان تنازعات پر غور کرنے
کے بجائے ہم ان کے توازن سے خط حاصل کرتے ہیں، جو انھیں (تنازعات کو) ہمارے (ذہنی) نقش سے
پرے گزرتا ہے اور نتیجے کے طور پر ہم اس کے وجود محسوس نہیں کرتے۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنے
اطراف پھیل جوتی دنیا کے (ناہموار) کناروں سے چٹکیں، ہم اس کی ہر اہی میں ہر پہلو اور پہچان کی
طرف بہہ چلتے ہیں۔

گندہ کا ہمیشہ کوئی مخالف ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہ چارہ نہ ہوتا ہے۔ (جب کہ) غنائی کیفیت میں
انسان کو کسی اور کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ اگر اپنی مخلوق میں وہ کسی کی طرف رجوع کرنا سے خود اس سے
دائیں کرنا ہے تو وہ شخص کوئی دشمن نہیں ہوتا۔ ایسے حالات میں، اگرچہ وہ ایک متقابل لاحقر ہوتا ہے، نفرت
ہو، سان ہو یا کوئی اور انسان، اس کے اپنے وجود کا حصہ ہوتا ہے، گویا، غنائی خودکشی کی کیفیت میں صرف
ایک شریک کا۔ اس کے علاوہ اگرچہ ہمارے مخالف میں ہوتا ہم اس کو برداشت کرینے کا موقع دیتے ہیں،
معاذ ہی خود اس کو بھی برداشت کرتے ہیں۔ اپنے اطراف کی ہر آواز کو ہم بہت غور سے سنتے ہیں، ہر اس
طرف ہم اپنے آپ کو پہنچتے ہیں۔ اس طرف ہم اپنی اسٹی بیجوں اور فصل دولت داری حاصل کرتے ہیں۔

وہی طرح کی پھر اندازاً سے ہم اپنے تخیل کو حاصل کر لیتے ہیں۔

گمراہی محض ہوتا ہے، یہ دیکھنے کی کوشش کرنا ہے کہ ہمارے پاس کیا ہے، اور کیا ہم حاضرہ موجود کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رہے ہیں یا نہیں، خواہ جو کچھ موجود ہے وہ انہی سے حاصل کیا ہو ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اخلاقی لائقیت کا نتیجہ نہیں۔ ہم اس آگے بڑھتے رہتے ہیں، یادیں کہہ دیجیے کہ ہم سوچ، حس میں اور خواہش کے معاملات میں اس وقت ایک مختلف میدان میں ہوتے ہیں، ایک بالکل مختلف حالت میں ہیں، اس حالت میں جس میں امداد سے تھ نہیں ہوتا۔ یہ (گمراہی) کسی طرح بھی غائب نہیں ہوتا، اور خیال رہے کہ اس کو نتیجہ حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں۔

گمراہی کو اپنے مشاہدات میں اپنی تمام مقوت لگائی پڑتی ہے، اس میں تھکا تھکا ہونے کی علامت بھی ہے، حقیقت ہے کہ اس لیے اس کے مائنس و مثبتات یعنی شاعرانہ، غنائیت وغیرہ طاقت کو استعمال نہیں کرتے۔ یہ غیر تشدد مہیا ہے اس لیے اس کو زندگی میں اپنی اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ معاملے کے لیے اپنے ذہن کو دیتا ہے، اور اس کی یہ حاجت کی انا ہوتی ہے۔ اس کو نہ لگائی کے اور نہ جذبات کی دلچسپی کے ذریعے گھیرا جاسکتا ہے، یہ وقت سے سہاوت نہیں آتا۔ اس میں گزرتے ہوئے وقت سے مقابلہ کرنے کی علامت ہوتی ہے اور اس کے بہترین لمحہ وقت کی بے حقیقی کیفیت کے حکم میں رہتے ہیں جہاں صرف ایک ہی چیز اہم ہوتی ہے۔ گمراہی یہ سب سمجھ رہا ہو۔

غنائیت اور اس کو قائل کرنے کی کوئی خواہش نہیں رکھتی۔ یہ ان لوگوں کو اپنے محسوسات اور تجربات میں محض شریک ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ نہ اس سے ہم اور نہ دنیا۔ یہ فکری قسم کا مؤقف اختیار کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتی۔ یہ فاصلوں سے عاری ہوتی ہے اور زندگی کے بہاؤ میں شامل ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ یہ مؤقف اختیار نہیں کرتی اس لیے اس میں تنازعات میں پھنسنے کی کچھ زیادہ علامت نہیں ہوتی۔ گمراہی کبھی کبھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ سوال اٹھاتا پڑتا ہے کہ غنائی کیفیت ذہن میں کبھی کبھی، بہت دور پر کیا اثرات مرتب کر سکتی ہے۔ مزید یہ کہ، اٹھل پھل کی کیفیت میں انسان کے شعور میں غنائی کیفیت ذہن کی شرکت اور دیکھنے یا تصور میں ہونے والی عام طور پر ممکنہ حد میں کے بارے میں بھی سوال کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی سوال اٹھ سکتا ہے، کیا طریقہ عمل کے مطابق نمونوں کو (اس کے پیش نظر یہ عصر کے مسائل کے ہم پلہ نہیں) دوسرے نمونوں سے تبدیل کیا جاسکتا ہے؟

خواہ یہ خیال کتنا ہی متناقص کیوں نہ لگے، اور بہت سی طاقتوں کے ساتھ مل کر غنائی کیفیت ذہن ہماری تہذیب کو علم و ادب کی طرف سے جانے کی علامت رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر، اس میں علامت ہے کہ ممکنہ اوقاف کو عفت کے سبب از سر نو راہ دکھائے، وہ عفت جو قدرتی طور پر زندگی سے، معقول تجربہ کے ذریعے پیدا ہوتی ہے، یا دوسرے نظموں میں اس عفت کے سبب جو ہماری موجودہ اور معقول تصوراتی سوچ کے انداز سے مختلف ہوتی ہے۔

یہ (غنائیت) ہمارے آئینہ ہے چار حیات اور حق جذبات اور ہماری خود انفرادی خواہشوں کے درمیان ایک اختلافی عنصر کا بھی کام کرتی ہے۔ بد شہر، ہماری تصویراتی سوچ کی تہذیب کے قائل ہیں، ہمارے نظریے قوت اور ہماری خواہشات ہی ہماری معاشقہ ترقی، ہمارے معنوی انقلاب، اور ان کی بنیاد پر پوری دنیا پر ہماری طاقت اور ہمارے اثر و رسوخ کا باعث بنتی ہیں۔ مگر ہمارے جوش و جذبے کی ہم سے لیے مسائل اور ہمارے دور کے منہ کی پھوٹیں کا باعث بنتی ہیں۔ جنہی دنیا کا کامیابیوں بنتی ہیں اتنے ہی نیا وہ مسائل سے وسط بھی پڑا ہے۔ یہ منہ پر فتوحات کا جذبہ ہے، ایک جذبہ جو حاکمیت کا خواہاں ہے انسان پر، قوموں پر، پورے تمدن پر۔ ایک معنوی قوت کا جذبہ جو فطرت پر اور لوگوں پر سرفرازی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ یہ دراصل ایک دماغی کیفیت ہوتی ہے جس میں ہماری خواہشات تمام ممکنات پر حاکمیت کی آرزو مند ہوتی ہیں تاکہ تمام دشمن دولت، تمام ملکیت پر قابو پو جائے جس کے لیے اپنے ہنسنے میں لیے بغیر کی ن سے لطف اندوز ہوں جائے۔ غیر وابستہ جذبات سے مخلوق کی کیفیت ممکن کے ذریعے ہی اس ضرورت سے نیا وہ طاقت و دشمنی کو تو دن کے ساتھ اور تمام دے کہ طاقت مگر اور چار حیات دنیا کے بجائے دوسرے دنیا کی طرف مڑ جاسکتا ہے۔ جیسا کہ ایف شوٹلر نے اپنی کتاب Small is Beautiful کے تحت سمجھیں گے کہ ہے لکچر اور حسد کا مادہ ہوا انسان شیطان کے مثل میں دیکھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ پھر اشیاء کو محسوس ان کی گوندیوں اور ان کے حجم ہی میں دیکھنے لگتا ہے، اور اس طرح اس کی کامیابیوں کا کامیابیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر تمام معاشرے ان ہی گوندیوں سے آلودہ ہو جائیں تو پھر چہرہ حیرت آمیز کامیابیوں حاصل کر بھی سکتے ہیں۔ اپنے شبانہ دامن کے مسائل کو سمجھانے کی صلاحیت کھو جاتے ہیں۔

تو کیا یہ سمجھ نہیں سکتے تمام ادیب جن کی انداز کی باتیں کرتے ہیں، غنائی کیفیت ذہن بھی، جن فطرت کی جھڑوں میں پیدائش ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کے اندرون کی جد ہیوں کے نمونہ سماں میں سے ان راستوں میں سے ایک راستہ ہے جو انسان کو اس کی ناقابلِ ممانعت حیثیت سے باہر نکالتا ہے جس میں وہ خود ساختہ حاکم بن کر خود فطرت سے ماوراء اس کا مخالف دیکھنے لگتا ہے۔ تو کیا غنائی کیفیت ذہن فطرت کا حاکم ہوا اس خیال کے چال سے نکلنے کا نمونہ آگاہ نہیں کہ فطرت انسان کو اس کی طاقت و استعداد کو محدود ہوتی ہے تاکہ وہ قدرت پر حکمرانی کرے، اس کو پتہ چلا کہ کبھی نہ ختم ہونے والی جہت ملکیت کی پھونک کو آسودہ کرے؟ اور کیا یہ غنائی کیفیت ذہن کی زندگی سے ہمارے رشتے تہ وہ بیرونی تبدیلی نہیں ہیڈ میٹرنے جس کا مطالبہ کیا تھا؟ وہ تبدیلی جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم زندگی کو وہی رہنے دیں جو وہ ہے، تاکہ بالآخر وہ ہم سے خود کلام کرے اور ہم پر خود کو معنوی انداز میں اور اس طرح طائر سے کہ پوری طرح ہماری سمجھ میں آسکے۔

کیا ہمیں نظر نہیں آتا کہ غنائیت طاقت اور پشت چاکی کے حک کی سخت مخالف ہے۔ غنائیت خود کو سائنس کے مسائل کے سمجھانے کے لیے ایک تہذیب کے طور پر پیش کرتی ہے جس میں ہم غنیمتیں دیکھتے ہیں،

نظامی، سیاسی اور جسمانی قوت کی زبردستی سے عمل بدش کرنے کی پیشکش کرتے ہیں۔ قوت و بہر حال بالکل اہلک کی پیداوار ہوتی ہے۔ پورا بالکل اسی انداز میں غنائیت وہیں کام آ سکتی ہے جہاں ہم کام اور کارکردگی کے پجاری نظر آتے ہیں ورنہ قدرت کے ساتھ ساتھ انسان پر اپنی حاکمیت کے ذریعے استحصال کے جذبہ میں مبتلا ہوتے ہیں اس لیے کراکٹر اولیات قوت کا کردار بھی اسی استعداد کو ہمیز کرتی ہے۔

بہت سے لوگ انہی طرح چاہتے ہیں کہ یہ جو غنائیت کے حصول کی رو زائغوں جہت، لڑکھات پر، توسیع پر اور استحصال پر زبردستی رہتی ہے اس کو پاست کیا جائے، لگا دیا جائے تاکہ اس سے پیدا ہونے والے فنی سمارٹ اثرات سے ہونے والے نقصانات اس کے ٹھکانہ سے نیا نہ ہونے پائیں۔ مگر یہ کافی نہیں کہ صرف ان حالات کے وجود کا ادراک کیا جائے کہ خیر کی تہذیبیں ہوتی ہیں، ایسی بنیادی تہذیبیں جو بدشہ ہمارے قوتوں میں ہماری خواہشات سے زیادہ اضافے کی باتیں ہموار کرتی ہیں، ان کو ہر سمت بڑھاتی ہیں (جو انسان کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں) تب ہی اسے شعور میں، ہمارے ذہنی سرشت میں تہذیب کا احساس اجاگر ہو۔ جیسے کہ ایک بد رنگیں نہایت خوب صورتی سے بیان کیا گیا تھا کہ "نورمن و قلب کا انقلاب" ہمارے ضرورت ہے۔

میں غنائیت کو، یا شاعری کو (جس میں لہجہ بھی شامل ہے) ایک سیاسی قوت، ایک سیاسی حربہ نہیں مانتا چاہتا کہ اس کو اس کی اصل اثر انگیزی سے محروم کر دیا جائے، نہ ہی یہ کہ یہ ہمارے دوسرے مضامین کے تحت ہو جائے۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں، اور یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ غنائی کیفیت وہ ذہنی کیفیت ہوتی ہے جو فنی اور شاعری کو، بلکہ شاید فنون کو بھی، ان کی اپنی حدود سے بھی ماوراء کر دیتی ہے۔ اور جہاں یہ خود کو عملی طور پر آشکارا کر سکتے وہاں تہذیب اور تمدن سماجیاتی حلقوں یا اداروں پر ایک نئی اور مثبت کیفیت میں اثر انداز ہوتی ہے۔ اس طرف یہ (غنائیت) شعور کی از مرنا پائے تہذیب و مابیت کی مسلسل ضرورت میں معاون ہوتی ہے، وہ عمل جو آج کے انسان میں، بالخصوص فنی کاروں میں روپ عمل ہے، اور ان میں بھی مگر بہت کم درجے پر، جنہوں نے اپنے آپ کو سیاسی طاقت کے خیال میں گودہ کر لیا ہے۔ اس طرح، یہ اس عمل کے خد کہہ کر کے کہ جو مصنف نہ مراقبہ کے مراحل میں ہے، جو ہمیشہ ہی شاعری کے نہ صرف قریب تر ہوتا ہے بلکہ شاعری کے مقابل میں زیادہ خصوصی انداز، باریکیں کہہ سکتے ہیں کہ ہر جہاں ہوتا ہے۔

تہذیبیں اس قسم کے کام سے عہدہ برائے نہیں ہوتیں۔ صرف تہذیب ہی سے اس کی امید رکھیں اس کی آہیں مٹا کر اور اس سے کچھ حاصل کرنے سے امید کی کے سو کچھ حاصل نہیں ہوگا، اگر ہم یہ بھلا بھی دین (بالوجود اس حقیقت کے کہ داشت بھی تہذیب ہی کا حصہ ہوتی ہے) کہ ہمارے تہذیب نہ صرف غیر متحمل ہو سکتی ہے بلکہ جاہل، حکم اور مسیح مزاج بھی اور بہت ساری اہم اقدار کے معاملے میں ہے جس بھی، جب کہ کچھ اقدار کے بارے میں کم حساس ہو سکتی ہے، سب کچھ بالکل دیکھا ہی ہوگا، وہی روایتی تہذیب دانی خواہشات ہوں گی اور وہی چاہے استدلال ہوں گے۔ دوسری طرف لوگوں پر اس خیال کو مسلط کرنے سے

کہ اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں، ہمیں سوائے اس کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا کہ ہمیں صاف نظر آئے گا کہ ہماری تہذیب کی مدافعتی انداز اپنی قدر و قیمت کھو چکی ہیں۔

آئیے، یہ کام ایک ایسی ہی تہذیب کر سکتی ہے جس کا نقطہ خراب، صرف اور صرف ایک درمیانہ شعور کی کیفیت ہو، یعنی ایک بالکل مختلف ذہنی کیفیت۔ اور اس منہ پر ہمیں خفاہیت و رشاعرہ کے لیے ایک دم زبردستی، وراہیک اچھا موقع نظر آئے گا جس میں، اس قسم کی ذہنی کیفیت میں، قدر شناسی، ہمدردی اور پابندی سے گزری ہوئی ش کے درمیان امتیاز ہوگا۔ ہر جو اس کے کہ اس قسم کی تہذیب میں محبت جیسا ایک غیر متوازن چلنے پر ایک ہم آہنگ را کر رہا ہوگا، اس کی دانش یہ ہوگی کہ اس میں کسی تہذیب کی دانش سے کم تر دانش نہیں ہوگی آج ہم جس سے مراد ہیں۔

میں تو یہ اعلان بھی کرنا چاہوں گا کہ لکھی اس صورت میں ایک ٹوش صاحب تہذیب ہو، صحیح معنوں میں تو مہر نختوں سے بالعال، جیسا کہ اس کو ہونا چاہیے۔

اور اب، جب کہ میں یہ اعلان کر رہا ہوں میرے ذہن میں ایک اور سوال سر اٹھ رہا ہے جو اس مقام پر مجھے نہیں نکالنی لگتا ہے، کیا یہ سچ نہیں کہ گمانہ تہذیبہ معاملات سے ہر گم و گاسٹ خوش آمد سمجھوتے کا تصور اس کو ہمیز کرتا ہے اور باہمی ہمدردی کی بنیاد پر ہی تمام معاملات کو قدر ثوابی سے منظر ہیں؟ جیس کہ Wezsacker ایک جامع بیان کی صورت میں کہتا ہے کہ ”محبت ایک ایسی ذہنی کیفیت ہوتی ہے جو وجود کے قائم رکھنے کی جدوجہد کو ختم کر دیتی ہے۔“ تو کیا گمانہ اپنے وجود کے سائے سے ہر نکلنے کی کوشش و دیہات کی سادگی کے ماحول میں واپس جانے کی کوشش نہیں جہاں معنویت، انصاف اور فقر و غیرو سب حقیقت جیسے ہی ہوتے ہیں؟ تو کیا گمانہ صرف سادگی کی طرف واپسی ہی کی کوشش نہیں، اس سادگی جہاں ہم پر کوئی غیر ملکی حالت حاوی نظر نہیں آتی، اور جہاں ہے اور نہ ہونا چاہیے کے درمیان کی چیخ و مدد ہو جاتی ہے۔ کیا ایک کیفیت جہاں، محبت اور حقیقت، اخلاق اور سیاست، ایک ہی میز کے گرد بیٹھ سکتے ہوں؟ اخلاق، کیا جنت، گشتہ گمانہ سے تلاش کرتی چاہیے، خفاہیت سے نہیں؟ کیا شاعری خود بخود نہیں جو جنت کے تصور کی ذہنی کوششوں میں سے ایک رہی ہے؟

اس تحریر کے دوران میرے لب میں ایک خوبش انجری رہی ہے کہ کاش میں چیراں شاعر نہ ہوتا، اپنے یقین کامل سے ہوتا۔ یعنی اپنی پسند کے مطابق شاعر بناتا۔

ولیم گولڈنگ

اصنافِ کمال۔
ن کے ناولوں کے لیے جو سمجھی ہوئی حقیقت پرانی کے فن اور متون اور اس پیری
حاشیہ ریت کے ذریعے آتے کے انسان کی کیفیت، چارٹر کرتے ہیں۔

گولڈنگ کا پہلا ہی ناول "Lord of the Flies" (1954) بہت مقبول ہوا اور انھیں کارپوں تک
یکجا۔ دوسرے فنون میں یہ اس دور میں سب سے زیادہ بکے، فی کتاب تھی حالانکہ عموماً بچوں کی دلچسپی کے
لیے دیکھ چکے پھلے موضوعات پر لکھی جاتے ہیں کتابیں اتنی تعداد میں لکھی ہیں۔ گولڈنگ کے دوسرے ناول
بھی کچھ اسی طرح مقبول ہوئے، بالخصوص "Rites of Passage" جو 1980 میں شائع ہوا تھا۔

ان کتابوں کی مقبولیت کی بنیاد کی وجہ ایک طرف اس کا دلچسپ ہونا اور ان کی دلچسپی تھی۔ ان
کتابوں کی خصوصیت تھی کہ ان کو پڑھنے سے طرف حاصل ہوتا تھا، اور ان سے منظر ہونے کے لیے کچھ زیادہ
محنت یا اعلیٰ درجے کی تعلیم ضروری نہ تھی۔ دوسری طرف یہ کتابیں ادب کے بصری دنیا میں ادیبوں اور
دوسرے فنکاروں کے عمیق توجہ اور دلچسپی کا باعث اس لیے اور بھی ہوئیں کہ ان کو گولڈنگ کی تصانیف میں کچھ
اہم اور اچھا ذوق غور کیا نہیں نظر آتی تھیں۔

ان کتابوں نے ان لوگوں کو سمجھنے سے پہلے، غلطی کرنے اور کچھ حاصل کرنے پر مجبور کیا جو یہ ان
اور سہائیت کے فن کے مرد میدان تھے اور جو ہمہ وقت اپنی دنیا کی سرنگین کے جیو تھے۔ ان معنوں میں

ٹھیک گولڈنگ کا فکری انگریز ادیب جو انھیں سوشل سے کیا جاسکتا ہے جو تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ دونوں کے لیے لکھتا تھا۔ واپس امریکی مصنف برنی میل ول سے جس کا سارا کام فوٹو معنوی کہیں ہونے کے ساتھ ساتھ دس بھانے والے اور بیکان خیر تجربات سے عمارت ہے۔ مگر جہاں بات انسان میں پوشیدہ ہوتی ہے حقیقت کو یہ ہڈا کرنے کی ہوتی ہے جتنا تھیں سوقت کی طرح گولڈنگ ایک ہارک میں نظر اور روشنی رکھتا ہے قلم کا حامل دلچسپی دیتا ہے۔ اور برنی میل ول کی طرح وہ اپنی کہفوں کے لیے وضاحت جہاں سے ایسے مفوضات چق ہے اور ایسے مانے دے تیار کرتا ہے جہاں پہنچ کر ہڈے ہڈوں کا سانس پھوں جاتا ہے۔ گولڈنگ کی کہفوں کے اعلیٰ وچسپ حکایت کے مانگ سے تیار ہوتے ہیں پھر اس میں رنگ بھرے والے کردار اور حرق مسالے کی آمیزش کی جاتی ہے۔

اپنے ایک مضمون میں گولڈنگ نے بیان کیا ہے کہ ایک نوجوان ہمیشہ ہوتے ہوئے اس نے اپنے وجود کو بڑی خوش فہمی سے دیکھا ہے۔ اس کو یقین تھا کہ انسان اپنے معاشرے کی اصلاح کرنے کے اور اس میں رائج معشرتی خرابیوں کی اصلاح کئی سے اپنے وجود کو کتنا کام اور خوش حال کر سکتا ہے۔ دوسری جگہ تعلیم نے اس کے نظریات میں بہت تبدیلیاں پیدا کیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک انسان دوسرے کے ساتھ کیا کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ یہ صرف فریقا کے جنگوں میں شکار کیے جانے والے وحشی قبائل کا معاملہ نہیں تھا۔ یہ قلم و پزیرے تھے اور مہذب لوگوں، ذکروں، عورتوں وغیرہ سے بھی بڑا رکھے گئے جو نہ صرف خود مہذب تھے بلکہ ان کا ماضی بھی تہذیبوں کا گہوارہ تھا۔

گولڈنگ اپنی تخلیقات میں ان لوگوں کی مذمت کرتا ہے جن کا خیال ہے کہ ہمارے قلم سے حق یا پس مندی دوسرے نظموں کی پیدا ہو جاتی ہے۔ گولڈنگ کہتا ہے کہ ہر خود انسان کے اندر سے پھونکی ہے۔ وراثت انسان کے اندر چھپی ہوئی ہر معاشی ہے جو ہر کو جنم دیتی ہے و اچھائیں کو ہائیں میں تبدیل کر دیتی ہے۔

گولڈنگ جنوبی برطانیہ کے علاقے کارنوال (Cornwall) میں 1911 میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ جو ایک مشہور معمار تھا وینٹشائر (Wiltshire) منتقل ہو گیا جہاں وہ ریڈ ہارمر سکول میں پڑھتا تھا۔ اسی سکول میں ابتدائی تعلیم کے بعد گولڈنگ آکسفورڈ وئی آرٹس میں داخل ہو گیا جہاں وہ اپنے باپ کی وئی خرابی کے مطابق سائنس پڑھنے لگا تھا، مگر کچھ عرصے بعد اس نے انگریزی ادب پڑھنا شروع کیا جس میں اس کو زیادہ دلچسپی تھی۔ امتحان میں کامیابی کے بعد، دوسری جگہ تعلیم سے پسے وہاں کے عرصے کے لیے، دو جگہ کے بعد پندرہ سال تک، گولڈنگ نے چھوٹے چھوٹے مانگ کر کے اور لے چھٹوں کے لیے کہانیاں لکھیں اور ناکارن بھی تو۔ اس دوران اس نے طلبہ کو پڑھایا تھا۔ جب تعلیم کے دوران برطانیہ کی بحریہ میں انشینیٹ کی حیثیت سے خدمت انجام دی تو بحریہ کے مشہور لڑاکا جہاز ہمارک کی قربانی اور ہارمنڈی کے ساحل پر اتحادی فوج کے حملہ اور قبضے میں بھی گولڈنگ شریک ہوا تھا۔ بحریہ میں خدمات کے

دوران گولڈنگ کو یونیورسٹی میں لکھنے اور ویسٹ اینڈ کے مطالعے کے مواقع بھی ملے۔
 گولڈنگ نے ٹروٹ میں صرف کہانیاں لکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر اس نے ادیب کی حیثیت سے سب
 سے پہلے اپنی نکتوں کا ایک نہایت مختصر مجموعہ شائع کیا جس کو بعد میں غور و خوض کے ساتھ دیکھا گیا۔ اس لیے کہ
 اس نے خود کو کبھی شاعر کے قائل نہیں سمجھا۔ جیسے کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، گولڈنگ کا پہلا قائل ذکر ادبی
 کام اس کا اول Lord of the Flies تھا۔ اس اول کے بعد اس کے ہمارے اول، کہشوں کا ایک مجموعہ نکلی
 کہیاں اور بہت سے مضامین اور مقالے شائع ہوئے۔
 گولڈنگ کو کئی اداروں کو اعزازی رکنیت بھی دی گئی اور کئی ادبی انعامات سے بھی نوازا گیا۔
 گولڈنگ نے 1993 میں وفات پائی۔

نحیافت سے خطاب

عزیزت مآب دو زبان شاہی، اعلیٰ مرتبت اور عزت مآب، انعام یافتگان، خواتین و حضرات

میں گرچہ ایک رجائیت پسند انسان ہوں مگر ایک قومیت پسند کے کردار میں سوینڈن آ رہا ہوں۔
 اب، شاید آپ کی حیرت انگیز مہماں نوازی نے مجھ کو ایک منظم صورت حال سے دوچار کر دیا ہے۔ اس
 پر قائم رہنا ایک مشکل کام ہے۔ یہ مجھے اس زمانے کی یاد دلاتا ہے جب میں ایک مفلس استاد تھا، ایسا
 مفلس کہ ہم میوں بیوی اپنی چھوٹی سی بیٹی کو ستر پر جھٹھکتے کے لیے مات میں لاری لاری زمین پر
 سوتے تھے۔ مجھے کچھ طریقے یاد رہے کہ ایک مات، تین بچے کے قریب، جب میں اپنی خوشاب بیٹی کے
 پانی سے دھبے پاؤں اٹھ کر زمین پر سونے کے لیے جانے لگا تھا تو بیٹی نے اچانک آنکھوں سے مجھ سے
 کہا تھا "بوا کوئی لہیفہ بنائیے۔"

ہم جالی، اب وقت آ گیا ہے کہ میں سفر کی ٹوپی اور ٹخنیاں پرے رکھ دوں۔
 میں گرم جوش مہماں نوازی کے لیے سوینڈن کا شکر گزار ہوں۔ میں نوبل فاؤنڈیشن کا اور سوینڈش
 اکادمی کا بھی غیر متوقع اور ایسے استقبال کا شکر گزار ہوں، جو مجھ پر حیرتوں کی بجلی گر پڑی ہو۔ کاش تمام
 سرحدیں اتنی ہی آسانی سے پار کی جاسکتیں اور تمام بین الاقوامی توالیے ایسے ہی دوستانہ انداز میں ہو سکتے۔
 میں بہت سے ممالک میں جا چکا ہوں اور میں نے لوگوں کو زمین سے پتی محبت، خطرات کے

احساسات، اور سب سے بڑھ کر عقل سلیم کی چھان میں آتے پاتے ہیں۔ اس ایک چیز جو میر کی نگاہ میں نہیں آئی وہ یہ ہے کہ زندگی سے محبت، خطرات کے احساسات اور عقل سلیم ان کے رہنماؤں اور حامیوں میں کھل نہیں پاتے جاتے۔

تو مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس وقت کا استغناء کروں، جو میرے نزدیک کسی ایک قوم کا فرد ہونے کی حیثیت میں نہیں بلکہ انسانیت سے تعلق رکھنے والے ایک فرد کی حیثیت میں دنیا بھر سے متعلق ہونے کا شہرہ غریبی موقع ہے۔ میں اس وقت کو مختصر وقتوں اور حضرات سے بات کرنے کے لیے استغناء کروں گا۔ میں ان سے کہوں گا کہ واپس جاسیے، فوراً اٹھ کر قدموں واپس چاسیے۔ آپس میں کسی معاہدے کے لیے چلائی، مصافحہ اور میر پھیر کی کوئی ضرورت نہیں۔ صرف عقل سلیم کی ضرورت ہے اور اس سے بھی زیادہ فاضلی کی۔ دیجئے، دیجئے، دیجئے۔ اسی سے کامیابی نصیب ہوگی، اس لیے کہ اسی سے ساری دنیا متکون ہے ہوئی، ہتراف کیا جائے گا، خوشیاں منائی جائیں گی اور آتے والے نہیں آپ کو دیکھیں دیں گی۔

خطبہ

آپ میں سے وہ حضرات جو اپنے دماغ والے بڑھاپوں ذرائع ابلاغ کی تشبیہ کی ہوں تفصیلات کے ذریعے موجودہ مقررہ گے بارے میں کچھ جان گئے ہوں گے آدھ کھٹے کی ناقابل قرار افسردگی سے بچ کر نہیں سکیں گے۔ بدشعبہ، بد نظریں میں پھنس پھنس اور قدیم وضع کی لڑائی کے نظارے نے آپ لوگوں کی افسردگی کی پہلی پھر کی پھر ہٹ کے باوجود ورنہ بھی کبریٰ سے ناقابل تنبیہ سی جی، ہر گز نہیں رہیں، میں بہت تیار ہو گیا۔ مگر یہ معاملہ کا مشکل بھی نہیں۔ میں فوٹو نگرام بالنگان میں سب سے زیادہ عمر رسیدہ ہوں اس لیے مجھے ملتی ہی (اس لفظ کو میں آستلی سے کہتا ہوں گا) بے یو ڈی پر معاف کر دیا جانا چاہیے۔ خدا کرے آپ مجھے بعد نہ سمجھیں۔ افسوس، کہ میرے چہرے میں قصہ کہانی ہوتی ہوئی نظر آتی نہیں۔ میں آپ کو کوئی گانا نہیں سنائوں گا، چاہے بدستور ہی نہیں دکھائوں گا۔ مگر سہجنا ہوں، کیا میں چاند گہری کی کوشش کروں؟ حیرت میں ہوں کہ بعد وہ شخص جس کو فوٹو نگرام چاہتا ہو چاند گہری جیسا ہے، ہووے گا کام کیسے کر سکتا ہے۔

آپ کو بھی احساس ہوگا کہ کسی بھی عمر میں ایسے صاحبِ علم اجتماع سے خطاب کرنا کتنا مشکل کام ہوگا۔ اس کا خیال ہی ایک خام قسم کی شجیدگی کی لہذا پیدا کرتا ہے۔ پھر، اس کے علاوہ عمر رسیدہ کی شجیدگی، لوگ کہتے ہیں مگر بڑھاپے بے وقوف جیسا ہے، بے وقوف نہیں پیدا جاتا۔

اس دور میں نہ درجہ کو عمر کے بے وقوف جیسا ہے، بے وقوف بھی نہیں ہوا کرتا۔ بچپن میں قتل میں نے

اس بات پر غور کیے بغیر ہی اپنے لیے 'قوتوں' کا تیل قبول کر لیا تھا کہ یہ مارنی عمر دم سے بندھا رہے گا، کچھ اسی طرح جیسے کسی لارمن سے فی گئی مثال کے طور پر، ریڈی موسیقار Rachmaninoff کا ترتیب دیا ہوا Prelude in C-sharp minor جو ہمیشہ اس کے نام کے ساتھ چپکارا ہوا تھا۔ جب بھی وہ تھیں اپنے فنی کا مظاہرہ کرتا، سمجھتا تھا کہ اس کو اس وقت تک چاہئے نہیں دیتے جب تک کہ وہ اس Prelude کو نہ نہیں دیتا۔ بالکل اسی طرح لارمن میری کتابوں کو اس وقت تک چھوڑتے رہے ہیں جب تک کہ کچھ فنون کی مشق ان کے ساتھ نہیں لگ جاتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ میں خود اپنے آپ کو تو اصول نہیں سمجھتا۔ بدشو میں نے اپنے آپ کو سمجھنے کے لیے اسی عمل کو اپنے لیے پیش کیا ہے۔ کسی تنقیدی تفسیر کے دوران میں نے خود کو ایک 'آفاقی قوتوں' کہا مگر ساتھ ہی ایک 'کائناتی رجحانیت' پسند بھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ جو نبات کا ذہن سمجھتی انداز رکھتے ہیں وہ سمجھ جائیں گے کہ میں منطقی 'کائناتی' کو خالص لغوی معنوں سے ذہن آگے بڑھ کر مستطاب کر رہا ہوں، اگرچہ 'آفاقی' اور 'کائناتی' دونوں لغویوں میں اصل مقصد کے اعتبار سے کچھ سیما و فرقی نہیں۔ دراصل میرا مطلب یہ تھا کہ جب میں کائنات کی بات کرتا ہوں، جس کو ایک سائنس دان کچھ ایسے، صوفیوں کی بنیاد پر قرار دیتا ہے جو سہراحت کہتے ہیں کہ اس کو دوبارہ میں زمین پر منتقل کیا جاسکتا ہے، تو میں ایک 'قوتوں' ہوتا ہوں اور صف کی تقسیم (Entropy) کے آگے سرخم کیے ہوتا ہوں۔ اور میں اس رجحانیت پسند ہوتا ہوں جب میں ان ردھانی پہلوؤں پر غور کرتا ہوں جن سے سائنس دان کی تہذیب اسے صرف نظر کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ نوٹیل انفارمات کی تمام دنیا میں اسکی شہرت ہے کہ لوگوں نے میری تخلیقات میں سے انتہا سہراست استعمال کرتے شروع کر دیے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ میں خود بھی اس فیشن میں کام میں شریک ہو جاؤں۔ جس برس میں میں نے دو قسم کے تجربات کے مابین فرقی کو پہچان کر لیا میں نے ایک کے ذہن میں لائے کی کوشش کی تھی جو خرابی پر مشتمل ہوتی تھی۔ اس کوشش کی ہو کھائی پڑی تھی۔

"تو میں کائناتوں پر غور کرتا رہتا ہوں۔ لیکن قابل توجہ ہوتے ہیں۔ Penicillin ٹھونپ سے نجات دلائی ہے اور ایلم ایک حکم کے مطابق نکلوں میں بیٹے ہیں۔ تمام بن، سال، دن کی روشنی خلیہ، زوں کو جانے میں لے آئی ہے اور قابل استعمال، سمجھ میں آنے والی اور علاحدہ علاحدہ تہذیبوں کو ظاہر کرتی ہے۔ جراثیم کے چاقو اور خوردبین کا کام ہوتے ہیں۔ oscilloscope روپے یا طرز عمل سے تفریب سونا جاتا ہے۔"

عمر جب سارے دن چاروں سہرے سے عمل کو میزان میں تول جاتا ہے تو وہ نہ بہ وقت اندیشہ آؤں نہ کتنا اندیشہ ہوتا ہے بلکہ وہ تو وہ اچھا ہوتا ہے یا برا۔ یہ انداز کا جسے ہم موت یا جہ کہتے ہیں چاروں کائنات میں سائنس لیتا دکھائی دیتا ہے مگر اس کو نہیں سمجھتا، صرف ان اشیاء کو نہیں سمجھتا ہے جو عظمت کی قیہی ہوتی ہیں، قابل رابطہ ہوتی ہیں۔ انھیں کو نہیں سمجھتا ہے، فیصلے کرتا ہے، سزا دیتا ہے اور آگے بڑھ جاتا

ہے۔ مگر دونوں دنیا میں حقیقتی ہیں۔ ان کے درمیان کوئی ہل نہیں ہوتا۔“

مجھے یہ خیال ہی کہ بدستور دونوں دنیاؤں کے درمیان ایک ہل موجود ہے پُر تعجب لگتا ہے اور وہی ہے جسے تو یہ خیال اس جانب سے تھوپا گیا جہاں سے اس کی کم سے کم توقع تھی، دورانِ اتحاد کے کھسک جانے کے بعد ہی تھوپا گیا ہے۔ اس لیے کہ ہم جانتے تھے کہ کائنات کی ایک ہتھکنڈی۔ (درحقیقت ایک غیر متعلق شخص ہونے کے ماتے میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ہتھکنڈی۔ میں آپ کو ایک انسان سے شجرت پیدا کر سکتا ہوں مگر اس شرط پر کہ آپ اس کی پیمائش میں نہیں کریں گے۔ اگر اس کی کوئی ابتدا نہیں تھی تو ابتدا ہی وقت نہ چکا ہے اور ہم اس کے کچھ وجوہات نہیں کہہ سکتے ہیں جہاں اب موجود ہیں)۔ ہم بھی جانتے ہیں، ہر کم زور سائنسی اعتبار سے اس بات کو مسلمہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ جوف (Back hole) کے مرکز میں کسی قسم کے قوانینِ فطرت رگڑ نہیں ہوتے۔ نیا، دوسرا سائنس دان تمہاری ہوتے ہیں اور کھل طور پر نہ ہی جوف کی باہر کی غیر سائنسی ذہن رکھتے ہیں۔ اس طرح ہم ایک بڑی منجھکہ خیر صورت سے دوچار رہتے ہیں۔ ایک ن سائنسی دانش جو ف سیاہ کے اندر معجزے کے ظہور کے امکانات پر یقین رکھتی ہے جب کہ دوسرے ن مذہبی دانش اس کے باہر معجزے ہونے پر یقین رکھتی ہے۔ اس طرح درحقیقت دونوں ہی معجزات پر یقین رکھتے نظر آتے ہیں۔ مطلقاً سربِ ریہا ہے اسے کیا کہیے۔ میعان اللہ اعلیٰ العظیم۔ آپ کا مجھ سے اس سے کم قنویت کی توقع نہیں رکھی جائے۔

آپ کے لیے برا خطرہ یہ ہے کہ ایک پرانے زمانے کا استاد جو آپ تقریر کے دوران یہ بھول سکتا ہے کہ وہ ایک مخصوص قسم کے طلبہ سے مخاطب ہے۔ شعر کے پہلے کا ایک انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ سب کچھ دیکھ چکا ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ صرف عمر رسیدہ دنیا ہی اس کی عقل مند کی کی طاقت ہے اور یہ بھی کہ اس جتنا پردہ حجبیہ کرنے اور مشورے دینے کا حق بھی رکھتا ہے۔ بے چارے جہاں عمر شکیبہ پر اور جھوٹ، صرف باؤں تہہ بندی کی عمر میں تھل بیسے۔ ان جیسے جہاں میں ان کے بارے میں بھلا کیا جانتے رہے ہوں گے؟ مگر وہی مات کے انت جب گھڑیاں اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ ایک دور سب گزر گیا تو وہ کبھی کبھی عمر رسیدہ ہونے کے فوائد کے بجائے نقصانات پر غور کرتا ہوگا۔ سے وہ جملہ یاد آتا ہوگا، جس کو حقیقت کی شاعری کہا جاتا ہے، ایک جملہ جوان دنوں میں سے ایک نے، کہتے ہیں کہ حادثاتی طور پر کبھی اس لیے کہ وہ اپنی عمر کو بچھڑی نہیں سکا کہ اپنے تجربے کی بنا پر وہ کچھ لکھ سکتا۔ اس نے لکھا تھا، انسان کو ہمیشہ اپنے کو قید رکھنا چاہیے، اسی طرح جیسے وہ اپنے ورور کو یاد رکھتا ہے۔ اس قسم کی فکر ایک عمر رسیدہ انسان کی فطری خوش طبعی کو تھپڑی کر سکتی ہے۔ کیا ایک عمر رسیدہ انسان کو خوش رہنے کا حق ہے؟ اسے اپنے ہی اختیار کو خوش دلانہ انداز میں دیکھنا کیا غیر متوقع نہیں؟ یک اور مگر بڑا شاعر کے الفاظ اس کی نظم میں سر پیش کرتے نظر آتے ہیں:

شاہانِ عظیم نے دیا ہے
 داؤد تھے اک تو ایک خلیماں
 کیا لطف تھی زندگی گزار کر
 ہمراہ ہزار لڑکیوں کے
 اور ایسے ہی بے شمار دیوانے
 جب عمر بڑھانے لگے بدلی
 صد بارن، بندشوں کے باعث
 سمان لکھا کیے حکایت
 داؤد تھے ایسے ادا میں

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نظم نڈی نور دار ہے مگر اس مسئلے پر دو باتیں کہی جاسکتی ہیں، اول یہ کہ
 میں نے اپنی شریک کچھ حصہ پیش کیا ہے جس کو عام طور پر شاعرانہ سمجھا جاتا ہے، میں اپنی اہمیت نہ باتوں میں
 سے کہہ، بلکہ McGonagall کی شاعری پیش نہیں کرنے کا جس نے بے پردہ گردانا جاسکتا ہے۔

یہ ظاہر ضروری نہیں کہ عمر رسیدگی ہم کو مزید ہی دے دیتی ہے کہ ہماری عادتیں ہماری رہنمائی
 یوں کمزور ہوتی ہیں کہ ان کا رفتہ بخیر رہتا ہے۔ تھوڑی دیر ہی کے لیے سب سے بڑے ہم بخیر نہیں رہتے۔ مجھے ذاتی
 طور پر ایک اور خطرہ درپیش ہے۔ میں کسی چھوٹے سے قلمی فن زبان میں کام نہیں کرتا اس لیے کہ وہ نا بخیر
 کی چیز ہوئی ہوگی میں سے ایک ہوگی۔ بلکہ شاید کسی بھی زبان کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ 1907
 میں انعام پانے والے یونانی شاعر اپنی حیرت سے واضح کر دیتا تھا کہ ادب کی قدر و قیمت کبھی اس کے لکھنے
 والوں کی تعداد سے نہیں لگائی جاسکتی۔ میرے خیال میں آپ کو کبھی کامیاب سے بڑا کامیاب یہ ہے کہ اس
 نے ہمیشہ لکھنے والوں کے کام کو ہی معیاری بنایا ہے۔ پتہ چلا کہ اس کو کتنے لوگ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں پڑھ سکتے۔
 نوجوان جان کبھی نے یونانی شعرا کے بارے میں کہا تھا، 'died content on pleasant sword, leaving great verse unto a little clan'
 نکار ہوں مگر آپ کو اندازہ ہو چکا ہوگا کہ میرا دل کس طرف جھکتا ہے، میں آپ کو شاعریوں کا ہانس کا
 حوالہ دوں گا۔

میری اپنی زبان، انگریزی میں ایسے بہت سے شاعر رہ چکے ہیں جن کو کسی ظہری زبان
 کے انجیل کے، وہ قدیم ہوں بلکہ جدید، مونسے سے گھبراہٹ نہیں جاسیے، مگر آج اس زبان کے بہت وسیع
 استعمال سے اس کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے نہ کہ تم استعمال سے۔ کیا یہ بجائے ایک خوب صورت نظم نگار
 کے ایک خاور شاہ دیو بنی جاتی ہے۔ یہ زبان ساری دنیا میں اشتہارات، جہازوں، سائنس، معاملات اور
 جیسوں میں اشتہار کے ذریعے پھیلتی جا رہی ہے۔ ایک زبان جس پر ادھر ادھر سے اقبا اور جہ پڑ رہا ہو کچھ

گروہ ہونے لگتی ہے۔ کثیر یا ہوتا ہے کہ گھریزی میں اسے کرنے کے دوران انسان سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ ایک مخصوص محفل سے اپنے دوستوں یا اپنے اہل خاندان سے محو کلام ہو رہا ہے یا پھر عالم خواب میں زور زور سے دھن گھر رہا ہے۔ مگر بعد میں اس کو پتا چلتا ہے کہ وہ بد کسی ضرورت کے درمیان رہا ہے کہ ایک بڑے طبقے سے ہم کلام ہو رہا تھا۔ یہ کتنا عجیب خیال ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ اگرچہ اس برسی میں خود کو امریکا سے آنے ہوئے انعام یافتگان کے زمرے میں محسوس کر رہا ہوں، مگر دل ہی میں یہ سوچ کر خوش ہو رہا ہوں کہ میری مادری زبان یورپ کے مغرب میں واقع جزیروں میں بسنے والے انسانوں سے کہیں زیادہ دنیا کے دوسرے علاقوں میں گرچہ مختلف لہجوں میں بولی جاتی ہے پھر بھی مرزئی غور پر وہ ہے گھریزی ہی۔ ذاتی طور پر میں دوشنبہ سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ تمام نیچے فصیح مکافی کے باعث آپس میں ناقابل فہم حد تک مختلف ہو رہے ہیں یا خودی سیادت اور نیلی وژن کی وجہ سے متحد ہو رہے ہیں مگر اندازاً ایک ادب کے قریب انسان اس وقت گھریزی میں نکھنے سے ادیب کو آسانی سے مکمل پر جزوی طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے پڑھنے والی کی حدود کے مطابق میں اس کے ماقدم حدود ہیں۔ کوئی نکھنے والا اپنے بارے میں خوب ترین خیالات سے بچ نہیں سکتا۔ یہ وہ شاعرت خواہ کتنی ہی گہما گہما نہ ہو جس نے کسی صحافی کی جس کو ہم زبیر کا نام دے سکتے ہیں، انتہائی باہر بندی ہو، پٹا اس نہ ہی کے ساتھ کہ اس کے ایک لفظ سے بھی تعلق نہیں، نہ جانے کس کہاں ارمال کر سکا ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ میں خود پیسے ایک نئے پھرتے ہدف کے مانند تھی مگر یقیناً (اس انعام کی شہرت کی وجہ سے) اب میں صرف بے ہوش اور شانہ بہ شانہ تھے ہوئے لوگوں کے لیے ایک سرکن ہدف ہوں جس پر جب وہ چاہیں ور کر سکتے ہیں۔ میرا مشہور اور قابل احترام انعام یافتہ ہم وطن و ہنسٹی چوہاں تک ایسے جموں سے بچ سکیں سکا تھا اس کے عام پانے کے بارے میں ایک ماقدم نے اپنی حیرت انگیز کات فارہ بڑے سخی کے پردے میں چھٹی گئی تھی کہ اس کو شاعری پر انعام دیا گیا ہے یا ستر پر؟ انہی سب باتوں کے پیش نظر تحریر تو کیا اس خطبے کے خدو خال ترتیب دینے کے دوران ہی مجھے ان دنوں سے کہیں زیادہ مشکل پیش آتی جب میں اسکول میں طے شدہ مشائخ پر لکھنے بیٹھا کرتا تھا۔ اس کا فرق ہے کہ آج میں ایک بڑی میز پر بیٹھ کر نکھتا ہوں اور اب میرے کام پر بیٹھے والے نمبروں کی شمیر بہت بڑے پیمانے پر ہوگی۔

آپ دل ہی دل میں سوچ رہے ہوں گے کہ ہر یہ شخص اس موضوع کے بارے میں کب کبھی گاہ جو اس کا اپنا کہنا جاتا ہے۔ اب اس کو ناول کے بارے میں بھی کچھ بات کرنی چاہیے۔ میں کچھ میں ذرا دیر کے لیے، واقعی صرف ذرا ہی دیر کے لیے، اس بارے میں ضرور کچھ کہوں گا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ وہ تمام موضوعات جن پر انعام دیے جاتے ہیں مخصوص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، مگر صرف ان ہی پر انعام نہیں دیا جاتا۔ ادب کو بھی، اگر وہ عیشے کے نخل میں بچ کر بیٹھ جائے تو وہ کوئی دیکھنے والا نہیں ملے گا سوائے ان لوگوں کے جو اپنے اپنے عیشے کے محلوں میں بچ کر بیٹھے ہوئے ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ مایوں کا سسٹبل کچھ

نیا وہ اچھا نہیں ہوگا۔ میں اسی مقام پر اپنے قول ہی سے ایک اقتباس پیش کرنا چاہوں گا۔ یہاں میں کسی غیر معمولی لڑکے کی نہیں، اوسط درجے کے جوان ہوتے ہوئے لڑکیوں کی بات کر رہا ہوں۔

”لڑکے کسی کتاب کی تدریس کی نہیں کرتے۔ بس، وہ کتابوں کو محض درجوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کتابیں جنسی موضوعات پر، جنگ کے بارے میں، ریڈ انڈین لوگوں پر، مسافرت پر اور سائنسی کوششوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ایک لڑکا عام طور پر اسی شے کا قویٰ راج ہے جس سے وہ بخوبی واقف ہوتا ہے، کسی دوسری چیز کو چھنے کا خطرہ ہوس نہیں دیتا۔ بندہ دکان میں کوئی بوتل اٹھانے سے پہلے اس پر گئے ہوئے لیبل کو پڑھتا ہوتا ہے تاکہ وہ صحیح شے کا انتخاب کرے۔ اس کی پسندیدہ جاسوسی کہانی کو اس قسم کی اشاعت میں رکھنا ہوگا کہ وہ سرورق ہی سے جاسوسی نظر آئے ورنہ لڑکا اس کی کتاب اٹھالے گا، جو دنیا کی ماحولیات، بصری فنون کی خصوصیات سے پر ہوتی ہیں، جس میں کوئی قتل ہی نہ ہوتا ہو۔ یہاں میری مراد ایک عام قسم کے انسان سے ہے جو اکثریت میں ہوتے ہیں، خاص طور پر بہت قویں لوگوں سے نہیں۔ دن کے ہر لمحے کی تفریح کے لیے فحش اور مہیا پسے جانے والے سب کے کامیاب کرنے میں وہ بھوکاں کا مہیا ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک ان لوگوں کے لیے ادب کی کیا حیثیت ہے سوائے اس کے کہ یہی وہ ٹیپ پر کوئی تقریبی مواد موجود نہ ہو تو وقت گزارنے کے لیے ادب ہی کو یہ راستہ کرنا چاہئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس طرح انیسویں صدی کے بزرگوں کے مقالے میں ان کی زندگی ذرا کم وحشیانہ ہوگی۔ کم چیزوں پر یقینی کر رہے گئے اور کم چیزوں سے خوف نہ کریں گے۔ لیکن جس طرح ماحولیات دوست، جانور دوست کو دہرا بھگا دیتی ہے اسی طرح کم درجے کی تمدن ابلی دوسرے کی تمدن کو دہرا کر دیتی ہے۔ جب ہم قدروں کے بارے میں فیصلے میں صرف ناقص و ناممکن اور غیر ترقی یافتہ ہوں تو شاعری یا نثر مفصل، خوف دلانے والے تھیر کے ذریعے لڑکوں کے لیے کیا مستقبل رہ چکا ہے جو زندگی کو بے اندازہ میں، بے اہم برے فنون میں بہت دھڑکی سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

یہ اقتباس تقریباً میں بڑے کی تحریر سے لیا گیا ہے اور جہاں تک ادب کا سوال ہے مادل کا طریقہ کار یہ ہے کہ عمر اس میں کوئی بگڑی نہیں آتی ہے۔ بس بتا ہوا ہے کہ درجہ بندی نیا وہ واضح ہوگئی ہے۔ دوسرے قلم کار ایسا سے مسابقت اب نیا وہ شدید ہوگئی ہے۔ مادل کا اپنا وجود ہوتا نہیں مگر وہ لائقیت کا بھوکا ضرور رہتا ہے۔

برٹش ’کہانی‘ کا ایک الگ معاملہ ہوتا ہے۔ ہم واقعات کے تسلسل کے بارے میں چاہتا چاہتے ہیں۔ اور ہم اخبارات پر ایک غائر نظر ڈالیں تو پتا چھے گا کہ ہمیں اس میں دلچسپی نہیں ہوتی کہ تسلسل واقعات مختلف ترین جزئیات کے معاملے میں بھی صحیح ہے یا نہیں۔ ”انجینیئر سیرس مائلین کی طرح، جنہوں نے ایک کہانی لکھنی چاہی جس کی شروعات ایک زلزلے سے ہوتی تھی اور جہاں اپنا ایک پہنچا گئی۔ وہ اصل ہم ایک عجیب غریب کی تلاش میں ہوتے ہیں، مگر ہم ایسے تسلسل واقعات سے معذرت حاصل کرتے ہیں جو ایک

کامیاب شے پر پہنچتے ہیں۔ مثال کے طور پر، جب کسی معمولی حادثے یا مشکل کے بیان پر پہنچے شور مچانے لگتے ہیں تو صرف چند آدمی اس "ایک دفعہ کا ذکر ہے" کہ شروع و خاتمہ کر دیتے ہیں کافی ہوتا ہے اور سب منٹوں کے لیے خاموش ہو جاتے ہیں۔ ہم سب کے پاس کوئی نہ کوئی کہانی ہوتی ہے۔ مگر کسی کتاب کی کہانی کیا ہوتی ہے، جس کو اگر مغرب وائس کے معنوں میں ایک جیسے میں کہا جائے یعنی "ایک ماوی"۔ اگر ہم اس کے پیر کو نہیں سمجھ سکتے تو چھوڑیے، جائے دسجے۔ فن میں، وہ میں، اگر ہم مردہ چیزوں کو، یا انسانی باتوں کو، جنہوں کے بغیر، جنہوں کے بغیر ساتھ رکھنا چاہیں تو ہماری زندگیوں میں پسے ہوئے بہت اچھے اور سڑک ہو جاتی ہیں۔ مگر ہاں اسکی صورت میں ہمیں اولیٰ کو بھی دیکھنا چاہیے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا کیا کچھ ہاتھ سے چڑھا جائے گا؟ یقیناً وہ کچھ بھی خالص ہو جائے گا جو انسانی جذباتوں کے لیے ضروری ہو کر رہا ہے۔ ایک ماوی اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ جب ہم چاہیں آگے پیچھے، ایک سکتے ہیں، جس رفتار سے چاہیں اسے آگے پیچھے کر سکتے ہیں، بار بار پڑھ سکتے ہیں، جو کچھ چاہیں تھوڑے کچھ بھی چاہ سکتے ہیں۔ ایک کتاب میں لکھی ہوئی کہانی مردہ، قابلِ استعمال، ہمیشہ موجود ہے، متنازعہ ہوتی ہے، اس کو بھی کے فن کی طرح بنا کر رکھنا، بند نہیں کیا جاسکتا، یہ تو صدیوں زندہ رہتی ہے۔

آسان لفظوں میں یہ گناہ سکتا ہے کہ اس کی طرف سے اور سخت دس شادیوں انسانوں کے درمیان ایک دیوار بن کر رہتا رہتا ہے۔ وہ اصل ہمارے پاس ایسا کوئی اور ذریعہ ہے ہی نہیں جس کے سہارے ہم اتنے لمبے عرصے درمیان مخصوص انداز میں اتنے قریب رہ سکیں۔ اولیٰ ہماری یہی خدمت انجام دیتا ہے۔ سادہ ہر مرد و عورت یا بچے کو بھی ہے، اپنی انفرادیت اور عزت کے محفوظ کرنے سے کسی طرح بھی کم خدمت انجام نہیں دیتا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اور کوئی بھی فن کسی ماوی اور جسم میں اس طرح سرایت نہیں کر سکتا کہ انسان ایک نئی زندگی سے آشنا ہو جائے۔ یہ اس بات کو ضرور دیکھنا چاہیے کہ ایک انسان، کم از کم، محض ایک ماوی کے ایک آدمی (one blonch of a blonch) جسے وہ صورت سے نیا نہ نظر نہ رہا ہے گا۔

میں نے ابھی شیڈ کے ٹکڑوں کی دو سچے مطالعات کی منفرد اہمیت کی بات کی تھی۔ ماوی کے بارے میں اپنے خیالات کے نگہار کے بعد میں اتنا اور اضافہ کرنا ضروری چاہتا ہوں کہ ایسے مطالعے وہ کیا کرتے ہندو قوم پر مرکوز کرتے ہیں۔ اگر بالکل پھیلنے لفظوں میں کہا جائے تو ہم وہ مسکوں سے لاپرواہ ہوتے ہیں۔ یا تو ہم خود کو محض انسانی سے ماوراء کر دیں یا "ہستہ ہستہ زمین کی زرخیزی کو درجہ درجہ کم کرتے رہیں" تاکہ کہ اس ارضی ممالک طور پر ہاتھ نہ پڑ جائے۔ کیا کوئی کہنے لگے کہ وہ فنیہ یا اور کہنے کے لیے کہہ رہا ہے مسائل خود ہمارے ہی پیدا کردہ ہیں کوئی کہانی سمجھنے کی رحمت کرنی پڑے گی؟ ایک مسئلہ، یعنی ماوی کی "فلٹ" کو یہاں بات نہیں کی جائے گی۔ میرے نزدیک یہ کوئی غیر فنیہ حار کی بات ہوگا اگر میں اس مقام کو ایک اسٹیج بنانے کی کوشش کروں جس سے جو ہر فن تھیوں کے خلاف ایک طویل اور منجیدہ تقریر کی جائے

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ اور بھی غیر فمے داری کی بات ہوئی اگر میں اس تاریخی موقع پر ان خطرات سے درگزر کروں جو ہم کو درپیش ہیں۔ میری طرح آپ حضرات بھی اس سے کبھی طرح واقف ہیں۔ بسا اوقات جب ناقابل بیکار بات پر بات کی جاتی ہے، یعنی ایک ناقابل تصور خیال پر تو یہی میں ہمیں شیکسپیر سے مدد ملتی ہے اور میں وہ جسے استعمال کروں گا جو ہیٹ نے ایک کامیاب کام سے کام لے کر لیا ہے۔

”یہاں ایسا کوئی ایک بھی نہیں جو تیری معنوی بنی کی نقل اٹا سکے؟ بے حیا؟ ب

جا، میری عورت کے کمرے میں جا اور اس سے کہہ دے کہ اسے ایک انجی سوا

پینٹ کرنا ہوگا۔ یہ مہربانی اس کو کرنی ہی ہوگی، اور تجھے اس کو ہٹانا بھی ہوگا۔“

میں اس خاتون سے شاید نیا دلی کر دیا ہوں، بس یوں ہی اس لیے کہ وہاں ہر قسم کے ہر عمل اور ہر جنس کے کارہائے سرسبز ہو رہے ہیں۔۔۔ کچھ چھپے تو کسی اور قسم کا قتل اس کثافت کو پوری طرح پیش نہیں کر سکتا، واصل یہ ایک نوٹ کی جتنی شاعرانہ ہوتی۔ سو مجھے ہی خطرے کے بارے میں بھی کچھ کہا جا چکا ہے، میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ میں اور یہاں کر سکتا تھا، جو کچھ ممکن ہوا کر دیا ہے۔

ایک خطرہ اور بھی ہے جس سے تیرا آزمانی نیا وہ مشکل ہے۔ ایک اور معزز ادیب کے لفظوں میں ”ہاں، تو شاید کہ وہاں سے نہیں بلکہ سورنے سے خطرہ ہوگی۔“ یہ سناٹا یہ مقرر سال کے قریب کی بات ہے کہ مجھے کوئی بار ایک پڑوسر رچھ نظر آئی تھی جس نے مجھے ٹھوکر مار دیا تھا۔ یہ جیسے ہمارے ملک کے مغربی علاقے میں تھی، سمندر کے کنارے پتھریلی چٹانوں کے درمیان۔ پسے سے ہی میں نشین، چاند اور سورج کے حیرت انگیز تعامل کا گرویدہ تھا اور ان سے لطف اندوز ہونا تھا مگر مجھے یہ باور کرایا گیا تھا کہ میں کسی اعتبار سے کسی عمل پر فاعل سے اثر انداز نہیں ہوا جا سکتا۔ چنانچہ میں نے ایک مخصوص مریضے میں تھا، سمندر کا پانی مراصل سے کچھ نیا روہن دور ہو گیا تھا جس کی وجہ سے مجھے ایک خوف دکھائی دیا جو مجھے ایک سمندر کے طور پر در ہے۔ سمندر کی پانی کے دور ہو جانے کی وجہ سے چٹانوں کے اطراف میں جانے والے جھڑوں میں طرح طرح کی اپنی حیات جمع ہو گئی تھی۔ مگر وہ جوڑ جوڑ سے دور تھا، میری تھنیل کے دوران، ایک دو بار آسمان کی مہربانی سے مجھے نظر آیا تھا۔ اس میں سمندر کی گہرائی جیسے بھارت بھارت کے جانور تھے، جیسے مجھے دور کہیں نظر نہیں آئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے بلکہ میں محسوس بھی کر سکتا ہوں، مگر انہوں نے کر میں اس خاص مجموعت کو غفلت میں بیان نہیں کر سکتا، نہ ان حیرتوں کی، اور نہ ہمارے دیوں کی سوئے جذباتیت کے، جو اس زندگی سے بھرپور، نظیر اور جیتوں سے بھرپور منظر میں نظر آتی تھی۔ وہ سب کچھ ابھی ہی حقیقت کے، منہ تھا جیسے کہ میرا وجود۔ اب گناہ کو پوری کائنات ایک مرکز پر سمٹ کر میری نظروں کے سامنے تھی جس کے میرے ساتھ، اور میری نظریں پہنچ سکتی تھیں۔ صرف ایک بات کے فاصلے پر، چند انجی گہرے سانس کی کی سطح پر جگ سے کھیل رہے تھے، بچہ کے سبز، داد سے، زندگی سے بھرپور، لپٹیوں اور سرخوں سے نیا وہ

ایک سڑک، ایک عمارت کے، مذہب زندگی سے بھرپور تھے وہ اور ہم بھی ان نظموں سے مسرور تھے، نہ وہاں جانے والے پانی کے کنوئروں سے نہیں چند لایا، پھوپا، گرنی کی چھٹیوں سے، پانی پر بھی، سمندر سے اتنی دور جتنا کہ آپ انگلستان میں جاسکتے ہیں، کھوہ کا وہ منظر میرے ساتھ ساتھ رہا، ایک لائق غفلت کی طرح۔ یہی نہیں، شاہ کی حیرت انگیز طریقے پر میں اس کھوہ کو اور میں میں سب سے وائی تمام رنگا رنگ مخلوق کو اپنے خیالوں میں ساتھ لیے لیے بھاگتا۔ میں اکثر بے خوابی اور مافوق اشطرت خوف سے بھرپور راتوں میں چاند کے مراحل کا حربہ کرنا اور خیالوں کی خیر میں چاندوں کی سمندری گھاس کے دھبوں سے بھٹکا رہتا۔ مجھ پر ایسے بھی آئے جب، اگرچہ وہاں سے بہت دور ہوتا تھا، میں خود کو اس کھوہ کے قریب مہرکتے ہوئے پانی پر چاند کی کرنوں کا نظارہ کرنا محسوس کرنا اور ہائی دنیا کا سحر انگیز حسن مجھے سب سے بھٹکا۔

میں اس جگہ کئی بار گیا۔ وہ خوف، جواب صرف خوف ہی رہ گیا ہے، اسی جگہ ہے اور اچھے پانی کے موسم میں، جہاں تک آپ جھک سکیں، خوف کے اندر جھانک سکتے ہیں۔ بالکل صاف سمندر ہے، ریت بھی صاف، پانی بھی صاف، اور چٹان بھی صاف، پھر غصوں کے اب دس کوئی مخلوق رہتی نہیں۔ جس جگہ وہ وہ مخلوقات رہتی تھیں، اور انہوں نے قریب قریب نہ گڑھے بنائے تھے، بالکل کھوپڑی کے نچڑھوں کی طرح جس میں ہماری آپ کی آنکھیں موقی ہیں۔ اب اگر آپ ان گڑھوں کی طرف جذباتی نگاہ سے دیکھیں، تو آپ کو لگے گا کہ آپ صرف ایک گڑھ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ زندگی کی طرف نہیں۔

کیا یہ ایک فطری عمل تھا؟ کیا یہ ایک حسن کا تیل تھا؟ یا پھر کیا یہ غفلت بھرپور کیپیڈی پانی تھا جس نے میرے بچپن کی پراسرار ریت و موت کی غینہ سوا دیا؟ میں کچھ جانتا نہیں سکتا مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ عمل بات یہ ہے کہ اس کھوہ کی جس پر ہمیں رہنا ہے، ہم خود اس کو کس طرح پامال کر رہے ہیں، لاکھوں میں یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جو میں نے پیش کی ہے۔

اب اس بار سے میں کیا کہتا ہے؟ ہمارے پاس مصنوعی سیارات ہیں، کمپیوٹر ہیں، ایسے بشر مندی کے جوہر ہیں جو ایک پُر پیچ مشین کو طویل فاصلے پر ٹھوس طریقے پر بدعنوانت اتار بھی سکتے ہیں اور وہ اس بھی دیکھتے ہیں، دلچسپ آپ ان باتوں سے، مجھ سے بھی زیادہ اذیتور ہیں۔ وہ میں تو صرف انداز ہوتے ہیں، جو اتنے قدیم اور رکی ماند ہیں جیسے کہ چھاتی، پتھر، کھڑی درمزم تانبے سے بنی ہوئی رکھالی جس سے انسان نے سب سے پہلے اپنا بھروسہ بنایا تھا۔ مہینوں چپ کی طرف دیکھتے ہیں تو قدیم اور رقیق تکتے ہیں۔ آپ تو چھل سے تو وقف ہیں۔ باوجود یہ تھا کہ کبھی تنہا کے اس کو نوٹیل انداز دیا، نہ شاعری پر اور نہ شاعر پر! اس کو انعام دیا گیا تھا صرف ایک منٹ پر جو یہ ہوئے سارے جملوں پر جو نہ مڑے نہ شاعری، مگر اس کو حقیقت کی شاعری کہا گیا ہے۔ اس کو انعام دیا گیا تھا ان جذباتی نگارشات پر جو انسانی ہمت اور جذبہ مبارزت سے مخلوق تھیں۔ ہم میں وہ دلورگ جو اس دور سے گزرتے ہیں، جانتے ہیں کہ چھل کی حقیقت کی شاعری تھے تاریخ کا رخ سوا دیا تھا۔

گو، نرم تانبے سے بنی ہوئی ڈھالی بھی شاید گمراہ راہزن رکھیں۔ لکھنوالے کی قسمتہ غلوں اور پرجوش عقیدت سے، ہر مندر کی اور جذبات میں ان ایسے مکے اللہ کا، دنیا کی سب سے طاقت ور چیزیں ہیں۔ انھیں مکے ذریعے انسان ایک دوسرے سے بات کہتے ہیں۔ ان کا صرف وہی نہیں کہتے جو کہیں، ان سوچ رہا ہو، بلکہ جو دنیا کا ایک بہت بڑا حصہ سوچ رہا ہوتا ہے۔ یہ انسان کو انسان سے بات کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں، ہزاروں میں پھنے پھرنے، اگلے انسان اپنے سر قیوں سے بات کرتے ہیں، ساتھی اپنے ساتھیوں سے، تاکہ ایک نئی نئی سے اٹھنے والی ہر ایک مددگار کی صورت، قوموں کے درمیان سے گزرتی ہے، مشکل سلیم کا، صحت مند نسبت کا، یہ مددگار رہن کر جسے نہ حکمران، نہ نہ معاملات طے کرنے والے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ اور پھر قوم جی قوم سے بات کرتی ہے۔ پھر وہ میدان پیدا ہوتی ہے جو ہمیں معتقد و رمل اندیش بناتی ہے تاکہ منہضرت کے فز نے سے اپنی ضرورتوں سے نیا نہ حاصل کریں۔ کتابوں، کپڑوں، اشعار اور خطبات کے ذریعے ہم لوگ جو انسانوں کی طرح سن سکتے ہیں، آدمی کو جنگ کے خطرات سے ہزاروں سال اندیش دنیا سے قریب کر سکتے ہیں۔ یہ ہتھیار صرف پیکا کی شکست دہی سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ میں خود کچھ نہیں کہتا، میں کہتا ہوں میں جاسکتا جو انسان کو پکا نہیں کہ وہ کیا کہتا ہے، پھر دوسرے لوگ، یہاں سے لوگ ہیں جو یہ کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ رہے ہیں۔ ہمیں ضرورت ہے اور یہ وہ انسانیت کی، زیادہ اہمیت کی اور نہ دو محبت کی۔ کچھ لوگ تو قی کر رہے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک سیاسی نظام سے حاصل کیا جاسکتا ہے، جب کہ دوسرے سمجھتے ہیں کہ محبت یہ سب کچھ پیدا کر سکتی ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ مستقبل کا جی ان ہی دونوں کے درمیان ہے اور ہم انسانی انداز کے رویے میں اُستے پڑتے بہر حال آگے بڑھتے رہیں گے، عاقبتی جتنی سے، بہادری کے ساتھ، جب تک کہ ہر کی زمین کے ساتھ ہونے والی بہیمانہ زیادتیوں صبر کو لٹھ اور بے ہودہ طاقتی نظر نہ آئے۔

ہم تخلیق کا نگو یہ ہیں۔ میرا اشارہ بالخصوص ہے اہم غیر معمولی خواتین میں سے ایک، ماریٹی ژوینہ (Juliana of Norwch) کی طرف ہے جس کے انتقال کو بھی پانچ سو برس گزریں گے میں کہتا ہوں کہ اس کا روحانیت سے واسطہ ہو گیا تھا اور اس کو ایک شے دکھائی گئی جو اس کی شکل میں ماسکتی تھی، انھیں انھوں کے زمانہ تھی۔ اس کو بتایا گیا تھا کہ اس کے ساتھ ساتھ دنیا تھی۔ اس کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس دنیا میں

یہ جوینہ ۱۳۹۲ میں پیدا ہوئی و ۱۴۱۵ میں انتقال پیدائشی محبت تھی جس نے گمراہی کی راہ میں کتاب بھی لکھی۔ اس کی کتاب The Revelations of Divine Love صوفیانہ روایت کے مضمون پر مبنی تھی۔ کتاب میں اس کے بچپن کے حالات ہیں، جو ہم جانتے ہیں کہ ۱۳۷۵ میں اس کو ایک عورت نے اغوا کر لیا تھا۔ جب وہ وہاں کے رات کو موت کے لیے تیار ہوئی تھی، کہا جاتا ہے کہ اس پر سولہ عورتیں ایٹھانی تھیں، ان کے ہاتھ حضرت عیسیٰ عیہ ص م کے اور حضرت مریم ص و اللہ عیہ کے ہاتھ میں تھے۔ صحت کے شوق سے اس نے اپنے ہاتھ جوینہ نے لکھے تھے، ان میں وہ اپنے لیے ایٹھاتی مال و مدد کی توقع نہ رکھتی تھی۔ اپنی بانی کے کئی برس بعد اس نے اپنے مددگار لکھاں اور ان کے لکھنے کی بات ورمین دے دی تھی۔ ان میں وہ کتاب تصنیف کی تھی۔

حیرت انگیز اور بول نا کسوتیں ہوں گی۔ آخر میں ایک آواز نے اس کو بتایا تھا کہ وہاں سب ہتھیار ٹھیک ہوگا، ہر شے کا طریقہ ٹھیک ہوگا اور سب کچھ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

اور سب ہم کو، اگرچہ ہم کسی روحانیت کے زور پر نہیں، اپنی منتیں دکھائی جا رہی ہیں، ہمارے ہاں Gai Maer، خدا میں ایک جیسے کن طریقہ چھڑی ہوئی۔ اب ہمارے پاس کوئی عذر نہیں کہ ہم اس کے کبھی نہ ختم ہونے والے عزائموں پر یقین نہ کریں، یہی اس سلسلے کی اقتانیت پر جس میں ہم کو رہنا ہے۔ ہم ایک عظیم بینکوں تلنے کے بیچے ہیں۔ اپنی ماں کے رشتے سے سرگرم شخص کا حصہ ہیں، وہی وسیع سے کائنات کا بھی حصہ ہیں۔ درختوں کی حقیقت کی مثال میں ہم ستاروں کے بیچے کی ہوتے ہیں۔

میرے خیال میں اب مجھ کو زمین پر اترنا چاہیے۔ چوتھوں مارنے کی جوتیوں میں پڑھتا رہتا ہوں اور جیسپر، ایک خدا، میں کن لوگوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ شہر میں بدلتی اور نکلتی ہیں اور چمک درخشاں اعزاز بھی دیتے ہیں۔ وہ ایک نہایت با عمل انسان، جیسپر، میں جس کو ہمیشہ آپ کچھ کہتے ہوں گے، کیوں لینڈ مارشل اور ڈیزائنر کہتے ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ جیسپر میں اپنے سر کے گچ کو بچانے کے لیے اعزاز کی ٹکٹ پہنا کرتا تھا۔ جہاں تک کہ کسی کو Laureate کے خیال کی تعریف کی جا سکتی ہے، اس متاثران کو خود بھی یہ رکھنا ہوتا کہ صرف کچھ مری نہیں، اس کی اور کون کون سی خدایاں اس کی حاج کے ذریعے چھپتی جا رہی ہیں۔ مثلاً، اس کو مانیا جھید کی کا لہو نہیں اور نہ پنا چاہیے۔ خوش قسمتی سے روحانیت کسی ورثے نے۔ میں اس کا کوئی نام نہیں دیتا چاہتا۔ تحقیق یہ تھا کہ میں حالات کے پیش نظر اپنا کتا، قاتلی کو یہ رکھوں۔ اسی دن، جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ 1983 کا لوٹل انور یافتہ رجب بن گیا ہوں، میں اپنے ملک کے ایک شہر میں گیا اور وہاں میں نے اپنی گاڑی ایسی جگہ کھڑی کر دی جہاں اس کی اجازت نہیں تھی۔ گاڑی کھڑی ہے سوئے چند منٹ کے بعد ہی جب میں وہاں آ تو میں نے دیکھا کہ گاڑی کی کھڑکی سے شیشے پر حمہ مانے کا نمٹ چسپا کر دیا گیا تھا۔ ایک ڈیکہ۔ وہ دن، کھٹی کی خاتون کار کے پاس بیٹا وہ تھیں۔ انھوں نے قریب کی دیوار پر گاڑی کھڑی نہ کرنے کے احکامات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”نیا آپ پر کچھ نہیں کہتے؟“ میں سہا ہوا، شرمندہ، نہ جھکائے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر آہستہ آہستہ گلی کے نمونک ہو۔ مجھے گلی کے کنارے دو پولیس کے اہلکار بھی کھڑے نظر آئے۔

میں نے ان کے مقابل اپنی گاڑی روکی اور حمہ مانے کے کاغذ کو بچہ سٹک کے نیچے سے باہر نکال دیا۔ وہ دونوں میری طرف لپٹے۔ میں نے ان سے کہا کہ پچھل کر مجھے ایک بہت ضروری کام ہے جس لیے کیا میں سیدھا مافک ہال جا کر فوراً یہ حمہ مانا کر سکتا ہوں؟ ”نہیں جناب“ ان میں سے بڑے افسر کا لڑک جوب تھا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔“ وہ اس تھوڑے انداز سے تھوڑا، یہ سے پوس وے جسے ان لوگوں کے لیے استعمال کرنے میں جو چیزے شرے سے بے ضرر و اور کچھ بے خوف سے گتے ہیں۔ افسر نے نمٹ پر بیٹھ ہوئے ایک مستطیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جس کے اوپر کچھ تھا ”بیچنے والے کا

مام اور پتا "اس جگہ پر آپ اپنا نام پورتا لیجیے، وہ پورٹل کا ایک چیک بنائیے، جو Clerk to the Justices کے نام کا ہو، پھر بنائے گئے ہو جس کا یہ پتا لیجیے، تھالے کے دہنے ہو پنی کونے پر سولہ پینس کا ڈاک کا ٹکٹ چسپاں لیجیے اور نوڈ کوئیٹر کس میں ڈال دیجیے۔"

پور پھر وہ پینس پوتیس والے ایک تھان ہو کر پوسٹ آگئے ہاں، کیا ہم آپ کو اس کا نوٹل انعام دے رہے ہیں؟



گیبریل گارسیا مارکیز

اعترافِ کمال۔ اسی کے اس مادیوں اور مختصر کہانیوں کے لیے جن کی، ٹراواریتھیں سے خلق کی ہوئی، دنیا میں حقیقت اور نوکے پن کے استخراج سے ایک ہی نقطہ کے رسی بہن مری کے تھکات کے ٹکس نجاتے ہیں۔

گیبریل گارسیا مارکیز کے ناول One Hundred Years of Solitude نے 1967 میں بین الاقوامی فنی پر جھڑکیا۔ دنیا کی بہت سی زبانوں میں اس ناول کے ترجمے ہوئے اور کڑوں کی تعداد میں فروخت ہوئے۔ یہ ناول اب بھی لاکھوں کی تعداد میں طبع ہوتا ہے اور نہ ختم ہونے والی بیچپنی سے پڑھا جاتا ہے۔ کسی ایک کتاب کی اتنی پڑیاں، ریکز سے کم عدا حیرت رکھنے والے ادیب کو عموماً بعد کی لکھ کر ایج ہے مگر اس نے ایسے تہائی لکھنے والے ادیب کی حیثیت سے جٹا مقام بنایا جس کی تحریروں میں کبھی نہ ختم ہونے والے تھل، تجربے ورمو، دی لڑاواں ہو۔

اپنی وسعت اور شکوہ میں مارکیز کا ناول، El coronado del pamarca, 1975 اس کے پہلے ناول سے چند قدم آگے کی نظر آتا ہے۔ اس کے مختصر ناول، El coroner no tiene quien le escriba, 1961 اور 1962 La mala hora اس سے ایک سال پہلے لکھے جانے والے ناول Crónica de una muerte anunciada یہ سب مل کر لکھنے والے کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں جس میں مصنف پڑ جوش خدق

وب ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھا لکھا اور اپنے فن کا مہذب ماہر بن گیا ہے۔

کثرت رسالوں اور کئی مجموعوں میں شائع ہونے والی مختصر کہانیاں مارکیز کے فن بیان میں خداداد قابلیت کا اسی عجب ثبوت گنتی ہیں۔ مارکیز کی بین الاقوامی سطح پر کامیابی حاصل ہے۔ اس کی ہر نئی تخلیق وب کے پھر سن کے نزدیک ادبی دنیا کے لیے ایک اہم واقعہ ہوتی ہے جس کے ترجمے کئی کئی زبانوں میں ہوتے ہیں اور بڑے پیمانے پر شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتے ہیں۔

یہ بھی نہیں کہ مارکیز کے انجمن کے سہارے کسی غیر معترف ادبی تخلیق کی تشہیر ہوئی ہے۔ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ کافی عرصے سے لاطینی امریکا میں تخلیق کیسے جانے دے دے وب میں ایک طرح کے وہ غم کا غلبہ رہا ہے جس کا موجودہ دنیا کے ادبی اور ثقافتی حلقوں نے بھی اعتراف کرنا شروع کیا ہے۔ وہ ثقافت جس میں داستان گوئی، قبائلی عذرت کی یاد دہانی، مختلف ہسپانوی عہد کے بے ڈھنگے پن، یورپ کی نئی اشعوری سرگرمیوں اور جدیدیت کے اتصال میں اپنے فن کی چاشنی کی آمیزش سے مارکیز نے ایسے پھر کئے ہوئے رنڈہ ادب کی تخلیق کی ہے جو دوسرے ہسپانوی امریکی دیہوں کے لیے عجیب تخلیق کا باعث ہوتا ہے۔

مسٹر۔ نظر رکھو۔ دوسرے دیہوں کی طرح مارکیز بھی یہ مت کے ساتھ ساتھ غریب اور کمزور کا ہم نوا، ملی آمریت کا مخالف اور لبرل مکتی، استحصال کا سخت دشمن ہے۔ اپنی کہانی فکس کے شعل کے علاوہ مارکیز صفت کے میدان میں بھی متحرک رہتا ہے جس میں بھی، ادب کی طرح، اس کا لہذا تجویز ہر جہت پر پورا رہا۔ وہ جہاں وہ رہا، اوقات اشتعال گھیر ہو جاتا ہے۔

سیریل گارسیا مارکیز 1928 میں شان کوہیا کے گرم علاقے کے ایک چھوٹے سے قصبے Aracataca میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے ماما کے گھر پرورش پائی جو پہلی صدی کے اوائل میں ہی امریکا کے عہد سے فارغ ہو تھا۔ مارکیز ایک بھائی بھائی کا بیٹا تھا جس نے تعلیم حاصل کر کے محافض کے میدان میں کارنامے کی کوشش نے اس کو تعلیم چھوڑنے پر آمادہ کر دیا۔ 1954 میں مارکیز کوہیا میں ایک صحافی قلم دان بن گئے۔ اس کے بعد سے وہ ہیرن، ریڈو، رسہ، ریو، اور میسیکو وغیرہ میں مقیم رہا جہاں اس کا قیوم ایک طرح کی سیاہی جواوینی تھی۔ بھائی لیکس کے علاوہ مارکیز نے فلمی منصوبے بھی کیے اور ساتھ ہی صحافتی کام بھی کیے۔

مارکیز کی چھ ہیں کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے اکثر کے کئی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ مارکیز بہ قیصر حیات ہے اور کوہیا میں ہی مقیم ہے۔

نوٹ۔ مارکیز نے خیفت میں رہا توئی زبان میں ایک مختصر تقریر کی تھی جس کا انگریزی میں ترجمہ دستیاب نہیں۔ مترجم۔

خطبہ

لاٹینی امریکا کا کوشہ تہائی

فلوریڈا سے تعلق رکھنے والا ایک مقام استونو پیگانیڈو نے، جو میکسیکو کے ہمراہ دنیا کے ارد گرد ہے بحری سفر پر گیا تھا، جوہی امریکا کے زمینی علاقے پر سے گزرنے کے بعد ایک اتنا بے کم و کاست حوالہ لکھا تھا کہ اس پر سراپہ خیال سے گزرنے کا عمل ہوتا تھا۔ اس اجمال میں اس نے لکھا تھا کہ اس نے اپنے نذر دیکھے جن کے مافقی ان کے جھوپڑ پر تھے، بغیر ٹیچوں کی ایسی چٹیاں دیکھیں جو اپنے نر کی پشت پر اٹھ کر دیتی تھیں، ان سے یہ گھر کر رہا پرندہ دیکھا جس کی چونچ ٹیچوں جیسی اور جو حیرت میں ایسے آئی پرندے پتلی (Pefican) سے ملتی جیتی تھی جو نڈوں سے محروم تھا۔ اس نے ایک ایسی ماجہ نرنگی بھی دیکھی جس کے کان بیہوں کی طرح، جسم الاٹوں جیسا، بالوں پرٹوں جیسی، جسم کی ہڈیا ہٹ گھڑوں جیسی تھی۔ اس نے بیان کیا کہ جب ان کا ایک مرقی انسان سے سر منہ ہو اور انھوں نے ہی کو آئینہ دکھا تو وہ جیسی قامت رکھنے والا انسان کہنے میں اپنا ہی نقش دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

تھیر کرمیجے والی ایک مختصر سی کتاب، جو اس وقت بھی اپنے اندر موجود دور کے ماہولوں کے خم رکھتی تھی، بدعہ اس نذر کی حقیقتوں پر چھکادیجے والی کیفیات سے باہر ہے۔ انڈیز (Indes) کے مشرقی مازنا پچوں پر مبنی بے شمار کتابیں ملتی ہیں۔ این دو باڈو (El Dorado) جیسی سرابی (خیالی) سرزمین جس کی تلاش میں ایک حقوق سرگرداں رہی، قشر نگاروں کی ہلاکی کے شہیل ایک عمر سے تک جھڑبڑ بدل کر مختلف نقشوں کی زینت بنتی رہی ہے۔ ابدی حیات دینے والے چٹنے کی تلاش میں Alvar Nuñez Cabeza de Vaca جیسی دیومالائی شخصیت کی سرزد کی میں چھ سو افراد، پر مشتمل ایک فریبہ خورہ قافلہ سفر کے دوران جس کے ارکان ایک دوسرے کو ہارپ کرتے رہے، شمالی میکسیکو میں مٹھ کر تک خاک چھاتا رہا۔ آخر میں سے صرف پانچ افراد زندہ واپس گئے۔ اس نذر کے اگلی وضاحت و اوقات میں سے ایک واقعہ ان کی یاد ہزار شہروں کا ہے جن میں سے ہر ایک پر ایک سو پندرہ سالہ رتھ اور جو Cuzco سے Azahuaiپا کی رہائی کے لیے ناوان کے طور پر اٹا کئے گئے یہ وہ تہ کیے گئے تھے مگر وہ مشرقی مقصود پر نہیں پہنچے۔ نوآبادیاتی دور میں Cartagena de ndias کے کھار پر (دریائی مٹی سے وجود میں آئی ہوئی زمین جس میں سٹا پاد جاتا ہو) پانی ہوئی مرغیوں فروخت کی جاتی تھیں جن کے دیے ہوئے مٹوں کی ٹہریاں میں سونے کے چھوٹے چھوٹے لٹے ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک سوتے کار لپٹی زمین دار کچھ برس پہلے تک

ہمارے پیچھے لگا رہا تھا۔ کچل بھری کے آخر تک ایک جرمی مشن کوئی کٹائے چلا، جس نے آپ ریو سے لائن بچانے کا منصوبہ بنانے پر مقرر کیا گیا تھا۔ اس مشن کے مامین کا خیال تھا کہ یہ منصوبہ قابل عمل ہو سکتا ہے۔ پٹرلے کے آئین کے بجائے سونے سے بنی ہوئے ریوے لائن بچھائی جائے گی اس لیے کہ اس علاقے میں آئین کی قیمت تھی۔ مگر ہسپانوی سلطنت کے غلبے سے تو؟ ناؤ ہو گئے مگر ہسپانیوں کے پاگل پن نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ میں درمیکو کے آمر ٹھکانے والے General Antonio López de Sarzana نے Pasary War میں کٹ جائے، وہی اپنی ذاتی مانگ کا بہت جوش و خروش سے جتا رہا تھا۔ General Gabriel Garcia Moreno نے 'کھوے ہوئے' پر مسلہ بندی تک پر مطلق اعلان و شہادہ کی طرح حکومت کیا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی لاش کو وردی بورس کے قہقہوں کے ساتھ ترکی صدارت پر بٹھایا گیا تھا۔ 'میں سیوے' کے تھیمو صوفی نے چار ٹکڑیاں General Maximiliano Hernández Marañez نے، جس نے قس بنارو بیاتیب کو ایک وحشیانہ قتل عام میں تہ تیغ کر دیا تھا، اپنے طعام میں زہر کا سرٹ کھانے کے لیے ایک شاقولہ متحرک (pendulum) ایجا کر دیا تھا اور اپنی عسکرانہ کی تمام شاہراہوں پر جسنے وہی چٹاٹ مانوں پر سرٹ کا قند چڑھا دیا تھے تاکہ سرخ ہمار کی دباؤ کی سخت دلی جاتے۔ Tegucigalpa شہر کے مرکزی چوک میں General Francisco Morazán کے نام سے جو عجیب سا یاد دہا گیا ہے وہاں مارشل Marshal Ney کا ہے اور اس کو جوس کے کپ پر نے بھسوں کے گودام سے خرید لیا تھا۔

اس کے بعد سے خوش خلق — کبھی کبھی بد خلق بھی — یورپیوں کو لاطینی امریکا میں (بے انتہا وسیع مملکت کے کھدینے سے ہوئے) مرد و عورتیں جن کی کبھی نہ ختم ہونے والی سرخ رویت میں مدغم ہو گئی تھی) غنے والے غیر ملکی جزیرہ نے بھی بڑی قوت سے ضرب لگائی ہے۔ ہورائیں ایک لمحے کا بھی اطمینان نصیب نہیں ہو سکا ہے۔

گیارہویں قریں ہمارے وقت کے سر پر آوردہ شاعروں میں سے ایک شاعر، چلی کے پابلو نیرودا نے بے بی اجلاس کے سامعین سے آگے فریاد خطاب کیا تھا۔ اس کے بعد سے ٹیب، اور کبھی کبھی بد، غم و ہمت رکھتے تھے، یورپی لوگوں پر، آسیب زدہ مردوں، اور مردوں خواہش کی اتحاد و مملکت لاطینی امریکا سے آنے والی پراسرار بریتاؤں کا نزال ہو رہا ہے، جن کی کبھی نہ ختم ہونے والی خدمت کو جندواری سے لے کر ایک لمحے کا سکون میسر نہیں رہا۔ ایک دہشت خور جو بچتے ہوئے کل میں محصور ہو، تنہا پوری ایک فون سے جنگ کرتے ہوئے مر گیا۔ عوامی جہانوں کے دو پراسرار رجسٹروں میں، جن کا کبھی تک سراٹھ نہیں مل سکا ہے، ہمارے جگر سے والے ایک صدمہ کی جان تھی اور اس طرح ہمدردی کا ایک سپاہی موت کی ہفتوں میں چھ گیا جس نے سچے عوام کے دل کو بھکا دیا تھا۔ پانچ جنگیں ہوئیں اور سترہ فوجی بغاوتیں، جن کے نتیجے میں ایک شہنائی خصلتوں سے آمر کا ظہور ہوا، جس نے ہمارے زمانے میں خدا کے نام پر لاطینی امریکا کا پہلا فرقہ وارانہ قتل عام کیا۔ اس دوران ایک برس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی نہ کوڑا لاطینی امریکا بچے موت کی آغوش

میں سلاویہ گئے۔ 1970 سے اب تک یورپ میں پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد اس سے کہیں کم ہے۔ لکیال شہر کی چوکی آدوی سے زیادہ یعنی ایک لاکھ میں ڈاراسات، اعتبار کی وجہ سے علقہ استی سے ماہر ہو گئے۔ بے شمار حادثوں نے، مہلکان کے قید خانوں میں بچے بنے، اور کسی کو سم نہیں کہنا میں سے کتنے بچے رکی چھپے گود لے لیے گئے یا فونی حکومت کے حکم پر نیم خانوں میں بھیج دیے گئے۔ چوں کہ وہ (امر) حالت کو بڑھا چلا رہے تھے، پورے براعظم میں تقریباً ۱۰ لاکھ مرد و عورتوں کی غینہ سلاویہ گئے، ایک لاکھ سے زیادہ آباد صرف مرکز کی امریکا کے بد قسمت ملکوں، ٹکاماگیا، میں سلاوا دور و دور سے ملا میں پتی جانوں سے گئے۔ امریکا ریاست ہائے متحدہ امریکا میں بیواہوں کو چار برس میں، نسبتاً پچیس لاکھ افراد مر گئے ہوتے۔

روایتی طور پر مہاں نواز ملک چلی سے دی۔ کچھ فران یعنی ملک کی دی کی صدر ہوئی، فرار ہو کر دوسرے ملکوں میں پناہ زمین سوئی۔ کچھ لاکھ افراد پر مشتمل آدوی دسے ایک چھوٹے سے ملک 'یورڈ' بنائے۔ جس کو اس براعظم کا سب سے نیا و د مہذب ملک سمجھا جاتا ہے، پانچ شہریوں میں سے ایک فریڈرک بٹن کر گیا۔ 1979 سے ملی سوئیڈر کی فائبر جگہ نے ترسنے والے برقی منٹ میں ایک پناہ زمین بنا دی۔ اگر ان تمام انطو یا جبراً ترک بٹن کرنے والے افراد کو کسی ایک سرزمین پر آباد کیا جاتا تو اس کی آدوی مارے سے زیادہ سوئی۔

میرا خیال ہے کہ یہ صرف شاعرانہ خیالی ہیں، حقیقت سے کہیں زیادہ برقی حقیقت ہے کہ نئی وجود کی بنا پر سونیڈش اکاوی کی توبہ اس (ملکی امریکا) کی طرف مبذول ہوئی ہے۔ کلند پر تحریر کردہ حقیقت ہی نہیں، وہ حقیقت جو ہم میں زندہ رہتی ہے اور ہر لمحہ ہماری بے شمار موت کا فیصلہ کرتی ہے، ہماری غم زدگی اور حسن سے بریں، حقیقی بیوک کے لیے خدا کا کام کرتی ہے۔ جس کا یہ چہرہ پھرنا، دیوانہ کا متوال، کوہیں فی قسمت سے اس اعزاز کے لیے چٹا گیا ہے۔ شاعر ہو یا فقیر، موسیقار ہو یا جھنڈیں کو، جنگجو ہو یا بد معاش، بے کام حیثیتوں کی تمام مخلوق، ہم سب کا ہیرو دی مسکہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کو ناقابل یقین بنانے کے لیے اپنی میں بد شگ کے لیے صرف طریقوں کے استعمال سے انتخاب کرتے رہے ہیں۔ تو وہ ستوں، مکی ہمارے گھبر جہانی کا عقدہ لے نکل ہے۔

اور گری میٹکات، جن کے تجڑ کے ہم سب حصے در ہیں، میں روکتی ہیں، تو یہ سمجھ میں آنے والی بات سے کر دیا کے اس طرف کی قربانت کی جوانی تہذیب کے درے میں غور و فکر میں بہت ارفع ہے۔ اپنے اندر زخم اور سوچ کی وضاحت کا کوئی قابل قہوں طریقہ وضع کیا چاہیے تھا۔ یہ قدرتی بات سے کہ وہ ہمیں کسی پکے سے ماننے کی کوشش کرتے ہیں جس کو وہ اپنے لیے استعمال کرتے ہیں، مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ زندگی کی کھنیاں سب کے لیے ایک جیسی نہیں ہوتیں، اور یہ بھی کہ ہمارے بچے عرفان کی تلاش خود ہم سے لیے بھی اتنی ہی دھک طلب ہر شخص 'شام' ہے جتنی کہ ان کے لیے تھی۔ ہماری حیثیتوں کی وضاحت کن نقوش کو پڑھنے سے جو ہمارے اپنے نہیں ہیں، ہم کو اور بھی ہے گا نہ اور بھی بے مادہ، اور بھی تھا

بناتی ہے۔ قابل احترام یوہپ شاپ اور کب پڑی ہو جانا اس نے ہم کو اپنے ماضی کے آئینے کی معرفت سے دیکھنے کی کوشش کی ہوئی۔ اس نے صرف پتہ کہ تھوڑا کچھ ہوتا کہ لندن شاپ کو کوئی بارہوی نہیں ملے گا۔ میں تین سو برس اور کب شاپ حاصل کرنے میں مزید تین سو برس تک لگے تھے، کہ (وہ سٹی اٹلی کے ایک قدیم ملک) لٹریٹوریا کے ایک فرمانروا کی مہربانیوں سے قبل، وہ میں صدیوں کی غیر متعلقہ کی چند میں ٹھوکریں کھاتا تھا، اور یہ بھی کہ آج کا پاداش سنٹر لینڈ، جو آج معتدل طرز کے نئے ورہدہات سے فارغ گھروں سے ہر مئی عداوت کرنا ہے مچھوئی صدی کے آخر تک قسمت کے پانی کے یوہپ میں یوہپ کو ختم میں ٹھونکا رہا تھا۔ تاکہ آئینہ کے دو عروہ میں بھی، سر مریخی فوجوں میں شامل کرانے کے بارہ ہزار ہجری ہمارے سپاہیوں نے وہ کتنا سخت و تارن کیا اور اس کے آٹھ ہزار ہسپتال کو تھوڑا کر دیا تھا۔

اس مشن پر Tonio Kroger کے گھاس کی تقسیم کرنا میرا مقصد نہیں جس کے پارما شکل اور شہوت زدہ جنوبی کے اتحاد کے تصور کو تین برس قبل اس نے اسی قسم کی ایک تقریب میں اٹھا کر اعزاز بخش تھا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ دو دنوں یورپی جوہریں بھی ایک مزید انصاف پسند اور نرم شوقین کے لیے جودہ جودہ ہے ہیں، ہماری کئی ستر طریقے سے مدد کر سکتے ہیں، اگر وہ ہماری طرف دیکھنے کے اپنے انداز پر نظر ڈالی کریں۔ مگر ہمارے خوراں سے ایک جتنی ہمارے گوشہ نشینی کو کم نہیں کر سکی جب تک کہ اس کی ان تمام لوگوں کے لیے، جائز مدد کے غرض عمل میں تبدیل نہ کر دیا جائے جو دنیا کی تقسیم میں اپنے طور پر زندہ رہنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

لاٹینی امریکا کی نہ یہ خواہش ہے اور نہ اس کا کوئی جواز ہے کہ اس کو اس کی اپنی مرضی کے بغیر گروہی رکھ دیا جائے، نہ اس کو یہ خوش تھی ہے کہ اس کی اپنی سزا دی اور انفرادیت مغرب کی لنگ بن جائے۔ اس کے باوجود ایسا لگتا ہے گویا ہماری سفر کے شمع میں ہونے والی ترقی نے، جس نے یورپ اور متحدہ امریکا کے درمیان فاصلوں کو کم کر دیا ہے، ہماری تہذیبی اور اقتصادی گویا بنایا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ اس کی جانے والے وہی انفرادیت نے مشکل پیدا کی ہے جو اس کی ہماری کوششوں کو برعکس ہے، اور بھی مشکل بنایا ہے۔ ایسا کیوں ہو چکا ہے کہ ترقی پسند یورپی باشندے اپنے سکوں کے لیے جس قسم کے ساری انصاف کے خواہاں ہیں ویسے ہی ہدف، متفاوت حالات رکھنے والے لاٹینی امریکا کے لیے، موزوں نہیں ہوں گے؟ نہیں! ہماری تاریخ میں موجود بے پایاں تشدد اور وہی ایک عرصے پر محیط نا انصافیوں اور ناقابل بیان تلخیوں کا نتیجہ ہے، ہمارے اپنے اندر کی تلخی ہزار جمعیتوں کی سازش کا نتیجہ نہیں۔ مگر بہت سے یورپی دانش ور یہ مچانے لوگوں جیسے خود نہ اندر میں سوچتے ہیں جو غفلت ان شہاب کی پتی ٹھونک رہی ہیں کہ ان کو کچھ جانتے ہیں، کیا کسی اور شہابی امریکا حصول ناممکن ہے سوائے اس کے کہ دنیا کی دہائی کا قتل کے دم و دم پر وہ کر کے زندہ رہ جائے۔ تو میرے دماغ یہ ہے ہمارے گوشہ نشینی کا وجہ۔

اس کے باوجود جبر لوٹ مار اور بے وقاحتیوں کا جواب ہم زندگی سے دیتے ہیں۔ نہ یہاں اور نہ

ولاء نہ تھا اور نہ دیرینوں کا تماشہ سے اُپ، نہ صدیوں چنے والی بڑی جنگیں، موت کے مقابلے میں زندگی کی مسلسل پرتی کو زیر کستے ہیں۔ اسکی برتری جو نمونے پر ہے اور ترقی پزیر بھی۔ ہر ایک اموات سے چھوڑتے ہیں نیا دور پیدا کتے ہوئے ہیں، جو یوں ہی کہیں گلابی کی سات نکھ ہوئی ہیں۔ تا میں نیا دور پیدا کتے ہیں سب سے تم و سر میں منکھنے والے ملکوں میں ہوئی ہیں، بلاشبہ جس میں لائینی امریکا کے میں کبھی مثال ہیں۔ تم کے برعکس دنیا کے سب سے نیا دور قش حال ملکوں نے، اتنی طاقت مجتمع کر رکھی ہے کہ مثال کے طور پر، نہ صرف یہ کر دو چرئی دنیا کی موجودہ آبادی کو دوبارہ دے سکتے ہیں بلکہ میرا ہی قوی روح کو ایک ساتھ موت کی فیندہلا سکتے ہیں جس نے ہذا ازل سے آج تک اس بد قسمت کتبہ اوشی پر مائلش میں ہو۔

آج ہی کی طرح ایک دن، میرے مرنے پر میری فکر نے کہا تھا، "میں سب انسان کے اختتام کو مسترد کرتا ہوں۔" میں اس مقدم پر، جو اس دن اس کا تھا، یہاں وہ ہونے کے لائق نہیں ہوں گا اگر میں چرئی طرح واقف نہیں ہوں کہ بیش ہر قہل جس عہد اک ایسے کے محض تصور و بھی اس نے، ماننے سے انکار کر دیا تھا، انسانیت کی ابتدا کے بعد وہ مکان، یہی ان ایک حوالہ سے مانگنی امکان سے زیادہ نہیں۔ اس نوٹ کی تعجب انگیز حقیقت کے پیش نظر، جو پرے وہ انسانیت میں ایک یوں پیا رہی ہوگی، ہم، تمام کہانیاں خلق کرنے والے، جو ہر بات پر یقین کرنا کہتے ہیں یہ سوچنے کا حق رکھتے ہیں کہ عامیے لیے اس 'یونوی' کا مذاق خلق کرنے کی کوشش کرنے میں ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے، یعنی ایک ہی، نیا دور قیہ وئی خلیق جس میں کئی کو اس بات کا حق نہیں ہوگا کہ وہ کسی کی موت کا فیصلہ کرے، جہاں محبت، سچ ثابت ہوگی، خلیق ممکن ہوں گی۔ "رصدیوں کی گوشہ خجائی پر مجبور رہنے والی قوموں کو آشکارا اور ماجر، بلکہ ایک کے لیے، زمین پر ("زادگی سے زلمہ رہنے کا) دھر سوتے میسر ہوگا۔



الیاس کانیتی

اعتراف کمال۔ ان تحریروں کے لیے جو وسیع نظر، تصورات کی ذہنی درفکار، نہ قدرت سے عمارت ہیں۔

اگر بظہر غائر دیکھا جائے تو ایس کا فنی کی اپنی تخلیقات پل مینٹ کے شمار سے کئی حصوں میں جی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی تحریر کی بکوش ایک مادل، تین ڈیڑھ، کئی جملوں پر مشتمل کہانیوں کی یادداشت، عوامی تحریکوں کے نقطہٴ آغاز کے غور مطالعے، ایک روزنامہ، لیپوں کے خاکے اور ان کے کردار کے جائزوں پر مشتمل ہے۔ اتنی متنوع تخلیقات ہونے کے باوجود یہ سب ایک نہایت منفرد و دراز مایا شخصیت کی تخلیق کی ہوئی ہیں اور یہی ایس کا بڑا کام ہے۔ ایک جلد وطن، اور جگہ دہلی مصنف کے لیے جرمن زبان کی اس کی زمین ہے۔ ایس نے جرمن زبان کو بھی ترک نہیں کیا بلکہ اس نے کئی کئی جرمن ثقافت سے دہانہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ ایس جرمن زبان کے عظیم شاعر گوئے کو بہت اہمیت دیتا ہے جس کو وہ اپنے ذہن کے لیے قریب چاہتا ہے۔

ایس کی سب سے اہم اور فانی مٹری کاوش Die Blendung 1935 میں شائع ہوئی جس کی بڑے بڑے ادیبوں نے تعریف کی عمر اس کا اسل چہ چند برس قبل ہوا۔ اس کا یہ ماہ دراصل قومی سوشلزم کی دہرہ مغفرت رہا کئی کے پس منظر میں ہونے والی عالمی شہرہ آفاق کاغذی مظلہ نامہ ہے۔ Die

Blendung اولوں کے سسے "Comédie Humaine of the Madmen" کی ایک کڑی فنی جس کا لیاں نے منسوب ہونا تھا۔ یہ کتاب ایسے نرے شیطان صفت عناصر کرداروں کا مرتب ہے جن کے ذہن سے انیسویں صدی کے مشہور مصنفین گوٹلے اور دوستوئسکی سے ملتے ہیں، الیاس خود کو جن کے فن کا قرض دار گردانتا ہے۔ اس ہول کے مرکزی مظہر کے ذراکتے اور عجیب عظمت و قہمت آئندہ کے شہر دیانا کے ایک گھر میں پیش آتے دکھائے گئے ہیں۔ الیاس کے خیال میں ہم سب کے اندر ایک پُر نجوم شخصیت (mass man) پوشیدہ ہے اور ادبی بصرین کے مطابق، یہ کتاب اس کو جانب سے دکھائی جائے گی جو اس کی ایک بلیغ استعارہ قرار دی گئی ہے۔

Die Blendung قاری کو یوٹی تحریریں کی رتد کے اب تجربے کی طرف رغبت کرتی ہے جس پر بروں کی تحقیق اور مطالعے کی بنیاد پر مصنف نے ایک قدم آگے بڑھ کر "Masse und Macht (Crowds and Power, 1960) تحریر کی۔ یہ الیاس میں پوشیدہ ایک پُر انجوم شخصیت کی پُر آشکارا پیشانی ہے جو انہوں نے ان کے اقبال میں چھپے ان بے شمار نکتہ ہائے نظر کو اجاگر کرنے کا فن چانتا ہے جو انوم ذات (Mass beings) کی سوچی نہ پیدہ رہتے ہیں۔

انہوں نے تہذیب انسانوں کے سطح پر رہنے والی گہرائی کے قلب میں اتر کر یہیں حوائی تحریریں کے کردار کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ تحقیق کے اسی میدان میں صرف حوام ہی سے نہیں، مصنف قاری کو ان لواحق فرشتوں اور شیاطین جیسے خدیں کرداروں سے متعارف کرتا ہے جو کئی مذہب کے عقائد کے ہم ارکان سمجھے جاتے ہیں۔ الیاس کے مطابق ہر حکم اور ہر طاقت کے استعمال کے پیچھے ہمیشہ موت کا خوف ہوتا ہے۔ پتا چوہی طاقت کا نقطہ ارتکاڑ ہو جاتی ہے۔ آخر کار انہی دشمن خود موت ہی ہوتی ہے۔ طاقت اور حوام کے موضوعات پر موقع تصانیف کے علاوہ شدید ارتکاڑ کے ساتھ لکھی جانے والی کئی جلدوں پر مشتمل کہانیوں کی یادداشت الیاس کا بڑا اہم کام ہے۔ اکثر کہانیوں میں ایسے حتمی حالات سے نکلنے ہیں کہ ان کو بنیادی ستورے کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ انسانوں کے طرز عمل پر ایک طرہ کاٹ، جنگ اور مردہوں سے کمر بستہ زندگی کے ختم ہونے کے خیال پر مبنی کا انہوں نے غیرہ اس کی یادداشتوں کے مخصوص خدو خال ہیں۔ اپنی وافر بذلہ فنی اور مخصوص طرز کی جو برمت کی صفت کی بنا پر الیاس اپنے دور کا سب سے اہم کہانیت نگار قرار دیا جاتا ہے۔

اس کے ذریعہ کے کہانے "بڑے بڑے روسیائی Russchall" میں پیدا ہونے والے الیاس کا فنی ان یودی خاندانوں سے تعلق رکھتا تھا جن کو 1492 میں Valencia اور Quenca کے درمیان واقع شہر کینیٹ Canes سے نکال دیا گیا تھا۔ کئی سو برس تک یہ لوگ ترکی میں رہے مگر بعد میں بخاریہ میں جا آباد ہوئے۔ 1911 میں الیاس اپنے والدین کے ساتھ ہجرت کر آیا۔ اپنے دہائی کی قبل از وقت اپنی تک موت کے بعد جو الیاس کے لیے بہت بڑا مصدمہ تھا، اس کے اثرات نے انہوں نے شہر دیانا چھپے گئے۔

ایسٹ نے 1916 اور 1924 کے درمیان سینٹر لینڈ کے شہر زورسٹ اور جملی کے شہر فرامٹ میں تعلیم حاصل کی۔ بعد میں اس نے کیمپ میں دیر سے لاطینی حاصل کی۔ تعلیم کے ختام کے بعد سے ایسٹ نے خود کو تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر دیا۔ 1938 میں ایسٹ فرانس گیا وہ کچھ دنوں بعد لندن میں آ گیا جواب میں کاؤٹین ہے۔

نوٹ: ایسٹ کی کافی نے انومائی میں تقریب میں ترجمان زبان میں ایک مختصر خطبہ دیا تھا جس کا ترجمہ دہلیب نہیں۔ مترجم



جینٹلا میلوش

اعترافِ کمال۔ جو تہذیب و تہذبات سے نچری دنیا میں اپنی ہے کچھ چیزیں کے درمیان انسان کے حالات کو بے نقاب کرتا ہے۔

جینٹلا میلوش مشرقی یورپ کے ملک۔ یہودیہ میں 1911 میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا تھا جس کا شجر و نسب قدیم قبائل سے جاتا تھا، جن کا اصل یہودیہ میں ماندو اور قدیم نوک رہتے ہیں جس میں بکتر ہوا تھا۔ صنعتی انقلاب نے بھی جس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا، یہاں لوگ تہذیب سے دور نگر ایک دوسرے سے دُشمنہ کاریوں کے بندھن میں بکڑے ہوئے تھے۔ اب وہ لوگ رہ گئے ہیں، ان کی ثقافت و دینی ان کا ملک اپنی اسی حالت میں قائم ہو رہا ہے۔ ان کی دہشت گردی، نسل کشی، جنگ و دھماکوں کے بعد انسان کے دور کے جبر نے ان کے معاشرے کو بے زمین سے ماپید کر دیا ہے۔

میلوش پوائنڈ کے شروینا (Vina) میں پیدا ہوا اور وہیں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اس نے پندرہویں سے اسیب میں دلچسپی لیتا ٹیوٹ کی اور ان ٹیوٹوں میں اس کا شمار ہونے لگا جنہوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر کسی جبر کے خلاف خطیہ تنظیم بنائی اور عموماً جبر و جبر کی۔ ایک ماسخ العتیدہ اشتراکی ہونے کے ماتے وہ جدید پوائنڈ کی سیاسی و فنی کا سرخس، ایک تجربے کے قابل کارکن اور ثقافتی رستے کا شخص بن کر نھر جس نے اپنے ملک کی نمائندگی بھی کی۔ سرد جنگ کے زمانے میں انسان کے ٹیوٹ و سپا کی موسم بہت بدل

گیا جس میں پولینڈ کی وہ سوشلسٹ تنہا کثرت بھی قسم ہو گئی جس کے مائے میں نئی نسل پروان چڑھنا چاہتی تھی۔ نئی ولایت اور نئی آزادی کے لیے ناقابلِ مذاہمت مطالبے کی بنا پر میلوٹش، حکومت کی مدد سے قاصر ہو گیا اور بالآخر 1951 میں پولینڈ سے ہجرت کر کے بیرونی جا آباد ہوا جہاں اس نے آزاد ادب کی حیثیت سے کھانا شروع کیا۔ بیرونی سے نقل مکانی کر کے میلوٹش 1961 میں امریکا چلا گیا جہاں اس کو ہدائے یونیورسٹی میں پڑش ادب کی تعلیم پر مامور کر دیا گیا۔ اتنی تبدیلیوں کے بعد بھی میلوٹش کا پولینڈ سے رشتہ جہنم میں ہوا۔

عادت کی آئینہ چھٹا، ناقابلِ تصانیف افکار ہیں کے درمیان سفر کرتے، ٹکٹ فنی اور معاشرتی نقوش کے پتھر لے سے میلوٹش کی زندگی اور اس کے خیالات کو ابتدا ہی سے بہت دھپکے لگے تھے۔ اندرونی اور بیرونی دونوں صورتوں میں میلوٹش ایک مہاجر ادیب ہے، ایک ایسا شخص جس کے لیے جسمانی ہجرت درحقیقت صرف مابعد الطبیعیاتی ہی نہیں انسان کی مذہبی اور روحانی ہجرت بن گئی۔

میلوٹش اپنی شاعری میں، نثر و مضامین میں بھی اس دنیا کی عکاسی کرتا ہے جس میں جنت سے نکالے جانے کے بعد حضرت انسان مشیم ہیں۔ مرتحہ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ وہ جنت بھی، جس سے انسان نکالا گیا ہے، بھونکتی ہی اچھی جگہ میں جہاں بالادستی کی جدوجہد میں انسان کے مقابل ایک اور باہو۔ اس دنیا میں دنیا فریب اور چھٹی تحقیقی قوتیں آج میں غلط مدد ہو گئی ہیں اور ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ میلوٹش کے فن کا خاصہ ایک طرح کی کشش اور کشاکش میں ہے جو زندگی کے بارے میں رکھتا ہے۔ اس کے مطابق ایک وہیب کی فہم داریوں میں سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ انسان کو بکشاؤں کی خاموشی سے بچائے دیکھے اور اس کو اس بات کا حساس دلئے کرے جو اثر سے ایک فوہوا کس قدر مشکل کام ہے۔ حقیقت سے آنکھیں بند نہ کرے، ہر چیز کو مدھیرے میں ڈھونڈنا اور تنگ آکر مایوسی ہو جانا ہے نہ ہی ہر شے کو شیر روشنی میں دیکھنا اور مسائل میں پڑ کر فرار کی راہ اختیار کرنا۔

جزوی طور پر خودنوشت سوانح کے مدار میں کچھ نئے ماویں اور میلوٹش کے سیاسی، ادبی اور معاشرتی تجربے ہی زندگی کے بارے میں اس کے لحاظ اور فلسفے کا پتہ ہیں۔ ترجمے کی غریب کے باوجود میلوٹش کی وسیع تخلیقات میں اس کی نثر پر غنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان میں نثرات کے بارے میں نہ صرف نگین اور جمالی کے نا ہندہ تجربات دیکھتے ہیں بلکہ لٹریچر میں اور پولینڈ میں تخلیق ہونے والے ادب کی خصوصیات تاریخ کے پس منظر اور پیچیدہ ثقافتی تخیلوں کے عکس بھی دکھائی دیتے ہیں۔ سیاسی مسائل کے تجزیوں پر میلوٹش کی نفسیاتی و تاریخی اور حقیقت کی مہر ہی اس کی بین الاقوامی شہرت کا سبب ہوئی۔ میلوٹش بہت مشکل پسند تخلیق کار ہے، پیچیدہ نثر دانٹس مند، ملکا نے اور غیب سے دہ قلم سے غصے اور تجزیہ سے ٹھنڈ مائیت کے درمیان جہد تبدیل ہونے والا۔ میلوٹش بڑی اہمیت کا حامل ادیب ہے جو اپنے تاریخی کو اپنے فن کا نہ صرف سرویدہ کر رہا ہے بلکہ قیدی بنالیا ہے۔

پولینڈ میلوٹش نے جیلوں میں رہتے ہوئے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی جو اس نے پولینڈ کا حصہ تھا۔

"Zagary" نامی ایک ادبی جلتے کے شریک حوصلہ کی حیثیت سے اس نے اپنی ادبی زندگی کا 1930 میں آغاز کیا جب اس کی نگاروں کے مجموعے شائع ہوئے تھے۔ میلوش ان دنوں پوینڈ کے ریڈیو کے مجھے سے وابستہ تھے۔

جنگ عظیم دوم کے دوران میلوش کا قیام پولینڈ کے دار الحکومت وارسا ہی میں تھا اور وہ تھیر چلائے جانے والے چھپے خانوں کے لیے کام کرتا رہا۔ میلوش نے پولینڈ کی حکومت کی سفارتی ذمہ داریوں بھی نبھائیں مگر 1951 میں اختلافات کی بنا پر اس نے اس سے ناتا توڑ دیا اور فرانس منتقل ہو گیا جہاں اس نے نثر میں کئی کتابیں لکھیں اور 1953 میں Prix Litteraire Européen یورپ کا ادبی اعزاز حاصل کیا۔ 1950 میں میلوش کو یوگوسلاویائی یونین ورسٹی کی طرف سے ملازمت کی دعوت دی گئی جہاں وہ 1961 سے سلاویہ کی زبانوں اور ادب کے استاد کی حیثیت سے مشغول رہے۔

میلوش کو کئی انعامات اور عزائمات دیے گئے جن میں امریکا کی ریاست مشین کی یونین ورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈاکٹریٹ شامل ہے۔ میلوش بہ قیصر حیات ہے اور امریکا میں مقیم ہے۔

ضیافت سے خطاب

میں ان سب شائقین اور حضرات کی طرف سے یہ عظیم عزت قبول کر رہا ہوں جن کے نزدیک میں صرف ایک فرد یا آواز ہی نہیں، بلکہ میں ان ہی میں سے ایک فرد ہوں۔ اس موقع پر ان سب کو اس میں شامل کیا جا چاہیے اس لیے اور بھی کہ وہ ایک سے زیادہ ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے تو میں ان صاحب گویا رکھا چاہتا ہوں جو پولینڈ میں رہتے ہوں یا اس کی حدود سے باہر، پولش زبان کو عزیز رکھتے ہیں۔ اس موقع پر مجھے یورپ کے اس علاقے کا بھی خیال آ رہا ہے جس کو میں چاہتا ہوں، یعنی جرمنی اور یورپ کے درمیان بسنے والی ان قوموں کا علاقہ جس کی آبادی یورپ کا مستقبل مجھے بہت عزیز ہے۔ اور خصوصی طور پر مجھے متحدہ وینیا (ethiopia) یاد آ رہا ہے جہاں میں نے جنم لیا تھا۔ چوں کہ میں ایک عمر سے سے تارک وطن کی زندگی گزار رہا ہوں، میں ان لوگوں میں شامل ہوں گا جنہیں حکومت کی بدبختی کی بنا پر اپنے آبائی قریبے اور صوبے چھوڑنے پڑے۔ تاکہ وہ ایک نئی زندگی کی ابتدا کر سکیں۔ ایسے لوگ انہوں کی تعداد میں دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اس لیے کہ یہ صدیوں ترکیب وطن کی صدی ہے۔ میں اپنے نئے وطن، یعنی امریکا سے بھی صرف نظر بھی نہیں کر سکتا جس نے مجھے ہی نہیں بلکہ مجھ سے پہلے آنے والوں کو خوش آمدید کہا ان کے

کام کو سراہا ہے۔ نہ میں ان امر کی شاعریوں کو بھول سکتا ہوں جن سے میری دوستیاں ہوئی ہیں۔ اور اگر چہ کئی فوریا پوری درستی کے جہاں میں پچھلے برس سے سواری نہاں اور اس کا ادب پڑھانا میا ہوں، کئی پڑھیسروں کو نوٹس انعام سے نواز چکا ہے، مگر اس میں نہایت کے انعام کا اضافہ ہوتا ہے۔

شاعری کو ز میں ایک قسم کا تناقض (paradox) پنہاں ہوتا ہے۔ بے حد نہ میں ایسے انفرادی ہدف حاصل کرنے کی کوشش میں شخص وہ خود اور ان کے قریبی ساتھی ہی دیکھ سکتے ہوں، اس پر مشکل اور مبہم ہونے کا نشان چہاں ہو جانے کے باوجود ایک دن ایسا وقت آجاتا ہے جب اس کو چاہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نفسیات قاری سے رابطے میں ہیں اور وہ چاہے وہ نہ چاہے اس کو ایک علامتی کردار اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ایک عمر سے تک مستند پڑھتے ہوئے بھی میں رفتہ رفتہ پڑیند کی نئی سلوں کا شاعر ہو گیا اور میرے خیال میں میری ہم جوتی میں سمجھا جتنے مگر عام نوعیت کے نقوش بھی شامل ہو گئے۔ شاعر اور اس کے قاری قاسموں کے باعث ایک دوسرے سے دور ہو سکتے ہیں لیکن اگر ان کے درمیان ایک روحانی وحدت قائم ہو جائے تو سرحدیں اور رکاوٹیں، کسی نوعیت کی بھی ہوں، ان کو الگ نہیں کر سکتیں۔ میرے خیال میں سمجھنے، میں بتا پڑا کہ ادب کس علاقے میں رہتا ہے، پڑیند میں یا اس سے دور، اس انکار سے کہ پڑیند کا ادب و شعروں میں تقسیم ہو گیا ہے، ایک بہت اجماع چیز حاصل کر لی ہے۔ ہمارے ان ساتھیوں کو ادب دیا جانا چاہیے جو شعروں قسم کے نظریات کی سرور میں نہیں رہے، ورنہ ان جو لوگوں کو بھی شعروں نے، نقد میں، رساں اور کتب کے ذریعے آزاد جہاں خیالات کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کے آزاد تھاپے خانوں میں گھبی ہوئی میری شاعری کی چند میں میرا عزیز ترین سرمایہ ہیں۔ وہ لوگ بھی کیا کم تعریف کے مستحق ہیں شعروں نے ملک سے باہر پڑش زبان کے رساں اور کتابیں شائع کرنے کی غرض سے ادارے قائم کیے ہیں، جیسے کہ ڈیری انسٹی ٹیوٹ ان فائنس، جو دوسری عالمی جنگ کے اختتام کے فوراً بعد سے، بغیر کسی تھقل کے پڑیند سے تحقق رکھے والے ادیبوں سے قریب وطن کرنے والے دیہوں کی تعلیمات کی اشاعت میں متحرک رہا ہے۔ نہایت ماسوروں حالات میں بھی یہاں تکسلس اور وحدت جذب قائم رکھے والے قاریوں کی کارروائی تیسویں صدی عیسوی کے ہونا نوکی مزاج کی عدم تکسلس اور دیوانیام کے خلاف بہت کچھ کہہ رہی ہے۔

میں پڑش زبان کے اس ادب کا حصہ ہوں، دنیا جس سے کم کم واقف ہے اس لیے کہ اس کا ترجمہ تقریباً ناممکن ہے۔ دوسری زبانوں کے ادب سے تھقل کے بعد مجھے اس کی مزا دے قدرت کا اعزاز دیا ہے۔ یہ ایک قسم کی خفیہ برادری ہے، مگر جانے والے ساتھیوں سے عمل مشترک کی جس کے اپنے رسوہت ہیں، جہاں اٹلک باہمی اور قریبی، دی سواری اور استہز، برادری کے درجے پر فائز رہتے ہیں، جس کے تاریخی رجحانات، ہمیشہ کی طرح خفیہ، غمی کی طرح اس صدی میں بھی ٹھکانہ انداز میں اپنے ساتھیوں کی مشکل وقتوں میں مددگار ہونے ہیں۔ ایشیا، افریقا اور یورپ کے شہریت خانوں میں، سپاہیوں کے قیام میں سمجھے جانے والے پڑش شاعری کے ٹکڑے خفیہ انداز میں شہریت کہتے رہے۔ یہ مقام سے، اس قسم کے

ادب کی نمائندگی ان لوگوں کی محبتوں اور بہادریاں وفات کے سامنے سرخم کسے کے مترادف ہے۔ وہ اب ہم میں موجود نہیں رہے۔ مجھے امید ہے کہ سوڈیش اکادمی کا عہدہ ہو یہ عزائم ادا کرے ان سب کے لیے ہے جن کی غیر مرئی موجودگی نے مشکل وقت میں مجھے جوسد دیا۔

خطبہ

اس ششہین پر میری موجودگی تمام عرصے کے لیے قلمی مستحکم رہی ہے جو خدا کی دی ہوئی حیرت انگیز عہد پر پیچیدہ زندگی کی ناقابلیت پیش گوئی اور اس کی تعریف میں رعب اطمان رہتے ہیں۔ میں اپنے اسٹیل کے زمانے میں نوبل نعام یافتگان کے بارے میں پوینڈ میں سلسلہ دار شائع ہونے والے سوڈ The Library of Nobel Laureates کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ مجھے ان میں اشتہال کیے جانے والے حریف کی شکستیں اور کاغذ کا جنگ بھی اچھی طرح یاد ہے۔ اس وقت میں سمجھتا تھا کہ اصل نعام پائے دے لوگ وہ وہاں رہتے ہیں جو نثر میں لکھتے ہیں اور کثرت سے لکھتے تھے۔ بہت جلد میں مجھے علم ہوا کہ ان میں شعر لکھنے والے بھی شامل ہوتے ہیں مگر نہ جانے کیوں ایک عرصے تک میں اپنے ذہن میں اسے ہونے پرانے خیالی کوٹھنیں کر رہا تھا۔ وہ بہت دنوں بعد جب 1930 میں ہائی بار میری تقسیم ہمارے یونیورسٹی کے جے۔ ایچ۔ Alma Maser Vinens میں شائع ہوئی، بدشبہ اس وقت بھی میں نے ٹوڈو کیس ادیب ہونے کے اعزاز کے قابل نہیں گردانا تھا۔ اس کے بہت دن بعد بھی، جب میں نے تہائی کی زندگی اختیار کی اور فرانس اور امریکا میں سب سے ہوئے پیش زبان میں لکھنے کا غیر ملکی پیشہ اختیار کر لیا، اس وقت بھی میں نے اپنے لیے ایسے شاعر کا کردار اختیار کرنے کی ہوشیاری کی جی اگر واقعی اپنے لیے شہرت کا خواباں ہوتا، بچے سولہ کے شہروں اور قریوں میں پانے والی شہرت کو ترجیح دے گا۔

نوٹیل نعام پانے والی ایک شاعرہ نے، جس کو میں نے اپنے بچپن میں بہت پڑھا تھا، مجھے شاعری کرنے پر ابھی راتخارہ تھی بسا لا کر لوف۔ اس کی ایک کتاب Wonderful Adventures of Nils میں جو مجھے بے حد پسند تھی، سیر کوڈوہرے کردار میں پیش کیا گیا تھا۔ وہ کردار چرچا میں اکثر زمین کی طرف دیکھا ہے مگر ساتھ ہی اسے زمین پر پھلے ہوئے وسیع منظر کے ساتھ ہی پر موجود تمام جزوئیات بھی نظر آتی ہیں۔ اس کی یہ دہری جیانی ان شاعر کا استعارہ لکھی تھی۔ مجھے ایسا ہی۔ ستارہ متر ہوئی صمدی میسوی کے ایک شاعر Macej Sarbievski کی نظم میں بھی نظر آتی تھی جو کئی پورے یورپ میں Casimire کے نقشے سے جانا جاتا تھا۔ وہ ہمارے یونیورسٹی میں شعریات پڑھاتا تھا۔ اس نظم میں شاعر نے Vano سے Andwerp

نیک دیو مارنی پرندے گزربا اعظم (Pegasus) پر سوار ہو کر آئے جانے والے اپنے سفر کا تذکرہ کیا تھا جو اپنے شاعر دوستوں سے ملاقات کے لیے کیا جا رہا تھا۔ Nils Holgersson کی طرے وہ دور سے نظر آنے والے دیوانوں، تجلیوں، جنگوں کو ایک نقشے کی صورت میں دیکھتا ہے مگر ساتھ ہی ان کو دور ہونے کے باوجود اپنی اصل جیت لارہا تھا۔ جزئیات میں بھی دیکھتا ہے اس طرح شاعر کے ذوق و شغف و شوقیہ تشا اور وہ آج بھی ان کی خوش جو وہ دیکھتا ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ شاعری کو ”جوڑ کھا“ ہی لکھتا“ کا عمل سمجھتے ہیں ان کو مظلوم ہونا چاہیے کہ وہ جدیدیت سے متاثر ہیں، اس لیے کہ شاعری کی سمجھ رکھنے والے ایک مخصوص زبان ہوتی ہے جس میں سب سے بڑی خطرات پیدا ہوتے ہیں۔

ہر شاعر اپنی سائنس دانوں پر ٹھہر کر پاتا ہے جو اس کی مقامی زبان میں تخلیقات پیش کرتے رہے ہوں۔ ہاؤسے میں وہ اپنی سائنس دانوں کے تخلیق کاروں سے سلوب اور پکڑ پاتا ہے، وہ خود اس کے گھر اس کے نزدیک قدیم انداز اظہار اس کے اپنے تجربات کے لیے ماکافی ہوتا ہے۔ اور جب وہ خود کو مطابقت پر آمادہ کر لیتا ہے تو اس کو اپنے گردان سے ”آئی ملائی“ دیتی ہے جو اس کو تھیں اور تھیں کے عمل سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور جب وہ بغاوت پر آمادہ ہوتا ہے تو اپنی پہل کاروں کی کوشش کے مختلف محرکات میں اس کو اپنے ہم عصر تخلیق کاروں پر تکیہ کرتا پاتا ہے۔ فوسوں کر اپنے پسے ہی بھوئی اشاعت کے ساتھ خود کو نام میں گرفتار پاتا ہے، اس لئے کہ جماعت کی سیاہی کے خشک ہونے سے قبل ہی اس کی تخلیقات، جو اس کی بے حد ذاتی نوعیت کی ہوتی ہیں، دوسروں کے ”سبب“ میں لٹی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اپنی شہرندی اور فوسوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ تلاش جاری رہے اور یہ مجموعہ ترتیب دیا جائے۔ مگر ایسی صورت میں تخلیق کار اپنے آپ کو دہرائے لگتا ہے۔ گویا اس تعاقب کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ اور پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ فوس اپنی کتابوں کو سب کی خشک کھلی کی طرح پیچھے چھوڑ کر ماضی کی تخلیقات سے پیچھا چھڑانے اور آگے بڑھنے کی کوشش میں ٹوٹیل انعام ملتا ہو جاتا ہے۔

وہ مزید ترجم کیا ہوتی ہے جو کسی کو کسی شے کی تخلیق اور اس کے اختتام پر قیامت نہیں کرنے دیتی؟ میرے خیال میں یہ حقیقت کی تلاش ہوتی ہے۔ میں اس لفظ کو اس کے سیدھے مادہ اور متین حسی ورثا چاہتا ہوں، وہ معنی جن کو کچھ کئی صدیوں میں ہونے والے فلسفیانہ مباحث سے فنی عقد نہیں ہوگا۔ یہ وہی زمین سے جسے Nils نے کوئی نگاہ سے اور اپنی غنائی نعیمیں لکھنے والے شاعر نے Pegasus کی پشت پر سوار ہو کر پرواز کے دوران دیکھا ہوگا۔ بلاشبہ زمین اور اس کے پوشیدہ خزانوں کو صرف بیان کے ذریعے واضح نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح کے دعوے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آج ہم جس سوال کو کثرت سنتے ہیں اس کو سننے سے قبل ہی رد کر دیتے ہیں۔ ”حقیقت کیا ہے؟“ یہ سوال ایسا ہی ہے جیسا کہ Pomus Prize کا سوال تھا کہ ”سچائی کیا ہے؟“ اگر ہم اپنے روزمرہ کے استعمال میں زندگی اور موت اور مخالف کیفیات کو اہمیت دے سکتے ہیں تو حتمی اور گندب اور حقیقت اور صواب کو کبھی ہی اہمیت ہی نہیں دے سکتے۔

(۲)

Simone Weil، جس کی تحقیقات کا میں نے دل سے قرضی لا رہوں، جو کہتا ہے کہ غاصد ہی حسن کی راجہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود کبھی کبھی غاصد رکتا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ میری نظر حسن کا عنوان ama Crad of Europe ہے اس بات کا اثر ادا کرتی ہے جس سے یہ اثر ایک تلخ وریٹلے اثر ہے۔ میں نے اپنی سوانح حیات بھی لکھی ہے جس کے فرانسیسی زبان میں ترجمے Une autre Europe کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس میں کئی شہر ہیں کہ ایک بڑے عظیم یورپ کے غلامی و عدد یورپ موجود ہیں مگر انہوں نے کہہ دیا ہے۔ دوسرے یورپ کے رہنے والوں کی تقدیر میں "میں وہیں صدق کی عظمت کے قلب میں اترتا" ہی لکھا ہوا ہے۔ میں غلامی طور پر شہر کی بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر اس وقت مجھے شہر کی کئی وقت اور مقام کے حوالے سے تصادم کے بارے میں ضرور سمجھتا ہوں۔ آج ہم کسی ایک اگلاؤ نظر سے ان وقتوں کو دیکھنے کے ذریعے شخص کر سکتے ہیں جو ہمارے دورداشت میں موت کے حوالے سے ہونے والے تمام حوادث کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں، مگر میری اور میرے ہم عصران کی شہر کی خود وہ سوڈائی ہو یا اختراعی شہر قدسی کرنے والی اس قسم کے حادثے کے لیے تیار نہیں تھی۔ سامیہ لوگوں کی طرح راستہ سمجھنے کی کوشش کے درمیان ہم پر وہ تمام تر غیبات مشکوک ہو گئیں، ذہن ہمارے دور میں جن کے فریب میں آچکا تھا۔

مراب کے مقابلے میں حقیقت کو شخص نہا آسان نہیں، بالخصوص اس وقت جب انسان ایک انقلابی کیفیت کے دور میں جی رہا ہو جو صدیوں قبل، یورپ میں شہر کی مگر ایک پچھلے سے مغربی جزیرہ نما میں کی مقتدر سے شروع کی گئی تھی کہ یہ ہمارے عرصہ حیات کے دوران ہی سائنس و ٹیکنالوجی کی مسلسل چہا کے ذریعے پورے کرۂ ارض پر محیط ہو چکے۔ اور بالخصوص یورپ کے ان علاقوں میں جہاں انسان پر فرسودہ قسم کی حاکمیت کی کوشش میں انہوں نے افراد جسمانی اور ذہنی طور پر انقلاب اور جنگ کی بھیئت چڑھا دیے تھے، ان ترغیبات کی مخالفت بہت مشکل تھی۔ اس کے باوجود شاید ہماری سب سے گراں قیمت تحصيل ان خیالات کا ادراک ہی نہیں رہا جنہیں مرئی شکل میں دیکھتے ہیں، بلکہ کچھ اشیا کے لیے وہ احترام اور تشکر ہے جو لوگوں کو اندرونی خفا اور غم کے آگے سرنگوں ہونے سے بچاتا ہے۔ اسی وجہ سے زندگی کے کچھ طریقے، کچھ ادارے، علوم کے درمیان خدائی مشے، مذہب، سماجی وغیرہ ہی نہیں بلکہ عام ورثہ کے ذریعے قائم ہونے والے مادیاتی بندھن بھی بدی کی حالتوں کے لئے کاٹنا نہ بنے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں بد نظم اور غیر منطقی انسانیت بھی زرد پر آتی جس کو فرقہ واریت کے سطوس و رد فادریوں کی وجہ سے انہول سمجھا جاتا تھا۔ بہت سے ملکوں میں لطافتی تہذیب بھی بدترجی کٹاؤ کا شکار ہوئی، ان کے باقی پتی ورثہ سے بھی غریب ہو گئے اور انہوں نے ان نقصانات سے لڑنا بھی رہا۔ مگر ان علاقوں میں ایسا نہیں ہوا جہاں مخلوط رکھے اور زندگی بخشنے والے انداز کے بندھن ایک عمل خوف کی کیفیت میں جو کہ ظہور پذیر ہو گئے۔

یہ تخیلاتی حال دراصل میرے وطن کا سالار میں سمجھتے ہوں کہ مجھے اور ہمارے دور کی علاقے سے تعلق رکھنے والے مسافروں کو بھی یہی جانے والے تھے کہ ان کے لئے شکر ہے اور شکر ہے، غلط فہمی ہے جانے کا یہ مناسب موقع ہے۔

ایک ایسے ملک میں پیدا ہونا ہی بہتر ہے جہاں انسانیت فحش خدائی ہو، جہاں مختلف مذاہب میں جاتی ہوں اور جہاں صدیوں سے مذاہب ایک ساتھ گزار رہے ہوں۔ دراصل، میرے ذہن میں اس وقت، روایت اور شاعری کا ملک سمجھتا ہوں۔ میرے قلمدان میں جو ہیں صدیوں سے پڑھنا، وہاں رہا ہے، بالکل اسی طرح میرے ذہن میں بہت سارے ہستے۔ اسے سب سے زیادہ، اور زیادہ میں ہستے والے خدائے انگریزی کی یاد دلاتے رہے ہیں۔ لہذا میں سمجھتی ہوں کہ زبان کا نہیں، پڑھنا زبان کا شاعر ہوں۔ مگر سمجھتی ہوں کہ ملکی مناظر، دروہوں کے جذبات نے بھی میرے ساتھ نہیں چھوڑا۔ بچپن ہی میں کاغذ میں لکھنے کی آواز کا پڑنا، باقی، سکول کے زمانے ہی میں Ovid کا ترجمہ کرنا، اور مذہب کی تھوڑی سی اور احترامات (apologies) کی اچھی تربیت کا حاصل ہونا کئی فائدہ مند باتیں تھیں۔ VINO جیسے شہر کے مقدس گرو، سکول اور یونیورسٹی میں تعلیم کا حصول بھی، ایک نعمت سے کم نہیں، جہاں شاہ کے جنگلوں میں baroque طرز تعمیر رہا ہوا ہے جہاں کا ہر پتھر تاریخ میں ہے، جو مذہب کی تھوڑی سی اور شاہ کے شاہکاروں (synagogues) کا شہر ہے۔ ان دنوں یہودی اس شہر کو شاہ کا یہ وطن قرار دیتے تھے۔ امریکا میں مذہب کے دوران مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنی قدیم یونیورسٹی کی مونی مونی دیو، حفظ کیے ہوئے مذہب تو میں نے غلط، پینڈنگ تاریخ اور ادب سے کیا کچھ نہیں سیکھا تھا، جن کے مخصوص خدوخال ایک یورپین تھے، جس کی لڑائیوں کو ختم کر دینے والا مڑنے، بدعتوں کے درمیان ایک مافیائی حساس اور مرکزی اقتدار کے بارے میں ہے، اتحادی و غیرہ، نوجوان امریکی غالب علوم کو حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔

ایک شاعر کی جو یہ ماحول میں پڑا ہوا ہے، ذہنی طور پر حق کا متلاشی ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے دور کے رشتے، گرو، گھر میں بچنے والی تھیں، کے مددگاروں، مسافروں کی مسلسل توقعات کے بارے میں، اور غمازوں کے مجاہدوں کا سکوت، نوجوان کو دیکھنا چاہیے۔ اس کے سامنے وہ کی میزوں پر آکر کھائے ہوں تو وہ نہ سمجھ میں آنے والے مذہبی معیار کے مضامین سے محروم ہیں۔ مگر اب تک تاریخ کے غلوں کا خدا کی شیطنت ان سب کو دھماکا کر دیتی ہے۔ اپنی پروڈکٹ کے دوران شاعر نے جس زمین کو دیکھا ہوتا ہے وہ بالائی سے سمجھتی ہوئی پکارتی ہوئی کہتی ہے کہ اس کو کچھ بندوں سے نہ دیکھا جائے۔ اور یہ نہ سمجھتا چاہئے کہنے والا ایمان و جذبہ میں آجاتا ہے، جس سے شب و روز، کسی وقت بھی سکون حاصل نہیں ہوتا، جیسا کہ طور پر پریشان کن، جیسے ہم وجود اور عمل کے درمیان تھکا ہوا سفر کی طرح پرفتن در اس کے سفر اول کے درمیان وفاداری کا خدا کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ماحول ہے، اللہ تعالیٰ متلاشی ہوتی ہے، مگر اس کو اس سے جتنا کیا جائے تو یہ طاقت نہیں رکھتی اور اگر نہیں سے قریب ہو جائے تو شاعر شکایت بھی کرنے کے قابل نہیں رہتا، یعنی عمل کے مقابل ماحول میں نہیں رہتا۔ اب، اگر حقیقت کو اس طرح پیش کیا جائے کہ اس کو

اپنی تمام خوبیوں اور فاضلہوں، مائیدگی اور امیدوں کے جھلکے سمیت گھونچ لیا جائے تو یہ صرف فاضلہ رکھنے اور اس کے اوپر پروانہ کرنے سے ہی ممکن ہو سکتا ہے، مگر اس طرح کا عمل اخلاقی نگہداری کے زمرے میں آجائے گا۔

میسویں صدی عیسوی کے پیدا کردہ تازہ جہات کے قلب میں ایسے تنازعات پوشیدہ تھے جن کی نسل کشی کے جرائم سے حدود اس قدر بڑھ گئے تھے۔ جن شاعروں نے کسی تھیں کبھی تھیں جو یادگار ہی نہیں بلکہ گہری کے مترادف تھیں، ان میں سے ایک کے خیالات کیا تھے؟ اس کے خیال میں اس دور کے لوگ ایسے تکلیف دہ تھے جن کو غیر تحریر شدہ دہشتوں نے ہی حل کرنا پڑتا تھا۔

(۲)

تمام مابین شاعریوں کا، جو صرف یہ ادبیاتی کی طرحی اپنے شہریوں اور عسکریوں کا سفر اختیار کرتے ہیں، سر پرست اور مرئی ہمیشہ ماننے ہی رہا ہے۔ تو پھر ملی کا ایک شاعر، غزلوں جیسے کلاشوں میں کیسے تھری ہو گیا۔ آج کے کسی شاعر کی ہر تھیٹا ایک ہی دریافت ہے کہ وہ اس کے اپنے میں اعتبار ہوتا ہے، مگر احتساب کی بندشوں کے ذریعے صرف زبان پر بھی غلبہ حاصل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے بلکہ الفاظ کے معنی بھی تبدیل کر دیتا ہے۔ ایک خاص قسم کی عجیب صورت ظہور میں آ جاتی ہے۔ ایک عجیب و غریب اسیر بقا کی زبان آج کے شاعر کی عادت اختیار کر چکی ہے۔ حقیقتوں کے بہت سے مضامین صرف سستی سے اس لیے معدوم ہو جاتے ہیں کہ وہ بے نام ہوتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ Eclair کی طرح، خود بہ خود پیدا ہونے والے، قوت تقریر اور امر میں سستی کی بامیدگی کے نظریوں کے درمیان ادب کی خفیہ سیلے کا کام کرتا ہے۔ ہر حال کوئی وجہ نہیں کہ ایسے عمل کو برکت نہ دیا جائے جو ”تجرباتی“ نظموں اور نثر پر مشتمل ہو، اگر ان کو ایک خود مختار فن کے حوالے سے اپنی مقررہ حدود کے اندر رکھتے ہوئے سوچا اور تخلیق کیا جاوے ہو۔ مگر یہ فرض کر میں کہ حقیقت کی تلاش میں ایک شاعر مانتے ہوئے انداز تحریر سے خود کو آزاد کرنے کی مسلسل کوشش میں ہوتا ہے، تو کیا وہ خطرناک ہوگا۔ ایک کمرے میں جس میں موجود لوگ مختلف طور پر ناگوشیہ کی سازش کیے ہوئے ہوں، ایسا ہوا سچائی کا ایک غلط بھی ہستول سے نکلنے والی گولی کی آواز جیسے محسوس ہوگا۔ اور انہیں کہہ اس کو دیکھنے کی کوشش، اچانک اٹھنے والی وقتی تلاش کی مانند، ایک خبط نہا ہوا ہے جو اس کے حدود اور کچھ سوچنے کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شاعر اندرونی یا خارجی طور پر ترک وطن اٹھتا رہتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کا یہ عمل صرف حقیقت کے بارے میں تنقیدی کے لیے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے اصل مشغلے کی خاطر اپنے وجود پر غور کرنے کے لیے، ایک مختصر وقت کے لیے ہی اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے دوسرے ماحول میں ہجرت کر کے جانا کے لیے آزاد ہو جاتا ہے۔

جہاں کہیں بھی ہوں، ان لوگوں کے لیے امید، ایک سراف کی کیفیت ہوتی ہے جو "یورپ" سے آئے ہوتے ہیں۔ غور کریں تو نظر آئے گا کہ کس حد تک ان کے تجربات ان کو اپنے معاشرتی ماحول سے تنہا کر دیتے ہیں، اور یہ کیفیت ایک نئے خدائی صورت اختیار کر چکی ہے۔ ماحولیتا جوتہ ایسی عجیبو ناہنا ہے، تو نئے ابدی شاک کے اپنے حیرت انگیز جہم کے ذریعے، ایک ایسے عمل سے گزر رہا ہے جس کو کئی شکل پر حیات کیا جاسکتا ہے اور جس کو یاد رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گزشتہ صدیوں کے ماحولہ لوگ، جو اس زمانے میں اکثریت میں تھے، اپنے ملکوں کی تاریخ اور تہذیبوں کے بارے میں بہت کم علم رکھتے تھے۔ اس زمانے کے جدید چاروں کے ماحولوں میں، جو پڑھنا لکھنا بھی جانتے ہیں، حتیٰ کہ ملکوں اور یونانی و رومیوں میں قدامت بھی کرتے ہیں، تاریخ تو موجود ہے مگر مذہم، ایک ایسا ذاتی کیفیت میں، جس میں مویرے پوئین کا اور دانیلین کا ہم عصر ہے۔ مزید یہ کہ پچھلے شروں کے واقعات، اتنی اہمیت کے لیے جن کا ہم یہ جن سے افسانہ انسانیت کے مستقبل کے لیے فیصلہ کن ہو سکتا ہے، بھلا یہ جانتے ہیں، گروہ ہود ہو جاتے ہیں، ورنہ ہم ربط اس طرح ختم ہو جاتے ہیں کہ یورپی ماحولیت کے بارے میں فریڈرک ہیگل کی پیش گوئی نظر یہ نظر پوری ہو گئی ہو۔ ہیگل نے 1887 میں لکھا تھا، "یورپ کے قاتل انسان کی آنکھیں اپنی یادداشتوں سے بے وفائی کرتی ہیں، یہ ان کو گر جانے دیتی ہیں، (پہلی یادداشتوں کے شجر کے) برگ و، رکو ہو جاتی ہیں۔ اور جو وجود اپنے لیے نہیں مانتا، ماضی کی تمام انسانیت کے لیے بھی نہیں مانتا، لہذا ان (کے تمام برگ و بار) کو (مٹا دیں)۔ مگر جانے دیتا ہے۔ معنوی فہم و فراست کے اور شہر کے بنیادی اہدائے رکھنے کے برعکس ہم ماضی کے قصبے بھٹوں کے ترغے میں ہیں۔ جیسا کہ گائی "جیمس ماسٹر" نے حالی کی میں لکھا ہے، مختلف زبانوں کی سو سے زیادہ ایسی کتابیں ہیں جو اس بات سے انکار کرتی ہیں کہ یہودیوں کا قتل عام (Holocaust) وقوع پذیر ہو گیا، کہ یہ سب یہودیوں کی تاریخ ابدی کی ذہن کی ایسا دھماکا تھا، مگر ایسا پاگل پن ممکن ہے تو کیا اس نوعیت کا مکمل انسان خدایہ قیوں ہو سکتا ہے؟ تو یہ جینیائی انجینئرنگ یا تدریسی ماحول کی عملی زیر آلودگی سے نبردہ خوف ماک خطرہ پیش نہیں کرے گا۔

"یورپ" کے شاعر کے لیے (یہودیوں کے) قتل عام کے اومان پیش آنے والے واقعات حقیقت ہیں، وقت کے انہماک سے اتنے قریب کہ وہ شاہد، ان کی دلوں سے اسی وقت تک اپنا بیچا نہیں چھڑا سکتا جب تک کہ (حضرت) داؤد (علیہ السلام) کی دعائیہ نظموں کا ترجمہ نہ کر لے۔ یہ کوشش ہوتی ہے جب قتل عام کے الفاظ کے معنی بتدریج ترسیم کیے جانے لگتے ہیں، تاکہ یہ غلط خاص طور سے یہودیوں کی تاریخ کا حصہ بن جائیں، اس طرح کہ اس عمل کا سنا نہ بچنے والوں میں شاہد پائش، مدنی، یوکرین کے باشندے اور دوسری قوموں کے قیدی بھی شامل نہیں تھے۔ اس کی تشویش اور بھی بڑھنے لگی ہے کہ اس میں مستقبل قریب کی پیشین گوئیوں نظر آئے لگتی ہیں، جب تاریخ نویں دہائی پر دھکے جانے والے واقعات تک محدود ہو کر رو جائے گی اور سچائی، جو کہ بہت پیچیدہ ہوتی ہے، اگر بالکل معدوم نہیں تو کم از کم

پہانے کاغذات میں دفن ہو جائے گی۔ دوسری حقیقتیں بھی اس کے نزدیک قرعہ قرعہ مغرب کے لیے دور
القاء وہ اس کے ذہن میں ایچ جی ویلز کی تصنیف The Time Machine کے منظر نامے کو اجاگر کرتی ہیں۔
میں کمرٹاؤن ایسے قہیمے کے پتوں سے آلودہ ہو گئی ہے جو پروا بھی، انگلیں سے عاری بھی، دوسری تاریخی
سے انہم بھی ہیں اور بچتے بھی ہوں گے جب، زیر زمین غاروں میں رہنے والی، نخلتوں کی پھوٹوں آدم خور
مخلوق ان پر حملہ آور ہو گئی۔

آگے بڑھتے ہوئے، جیسے کہ ہم ہیں، تکنیکی تبدیلیوں کی تحریک کے زیر اثر، ہم محسوس کرتے ہیں کہ
ہمارا سرہ اتھار کے عمل سے گزر رہا ہے اور ہم میں الاقوامی حریت کے عام تصور کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ وہ
ایام روز رکھنے کے قابل ہیں جب تک الٹ نیشنلزم اور قوم پرستوں کا قیوم عمل میں آتا تھا۔ بد قسمتی سے وہ
تاریخیں، ایک دوسری تاریخ کے مقابلے میں اہم نہیں رہ گئی ہیں، جس کو ہر سال یومِ معزائے طور پر منایا جاتا
چاہیے جب کہ نئی نسلیں شاید ان سے واقف بھی نہیں۔ یہ تاریخ ہے 23 اگست 1939 ہے۔ جس دن ڈاکٹر
حکمرانوں نے خفیہ معاہدے کے ذریعے آئیں میں اپنے پڑوسی ملک کی بددعا، ان کو بھی جنس کے
دامِ حکومت بھی تھے، جہاں حکومتیں بھی تھیں اور پارلیمنٹ بھی۔ اس معاہدے نے نہ صرف ایک خوفناک
جنگ کی شروعات کر لی تھی، اس نے نوآبادیاتی نظریے کا احیا بھی کر دیا تھا، جس کے مطابق قومیں سویشی کی
طرح خریدی اور بیچی جاسکتی تھیں اور جو کمال طور پر اپنے فوری آقاؤں پر انھیں رو بہ مجبور تھیں۔ ان کی سرحدیں،
ان کے حقِ خود ارادیت، ان کے پاسپورٹ وغیرہ سب ایک دھج ہو گئے تھے۔ اور یہ حیرت کی بات ہے کہ
آج بھی لوگہ لیوں پر انگلیاں رکھ کر اس مینوع پر سرگوشیوں میں بات کرتے ہیں کہ چالیس برس قبل کے
آمر حکمرانوں نے یہ نظریات کس طرح مسلط کیے تھے۔

انسانیت کے خلاف جرم، جن کا یہ کبھی اعتراف کیا جائے۔ عمومی سطح پر ملامت کی جگہ، ایسا زہر
ہے جو قوموں کے درمیان ذاتی کے اسکاٹ کو تباہ کر دیتا ہے۔ پولش شاعری کے گلدستے میرے آٹھ ماہی
دوستوں Wladyslaw Gebys اور Lech Prowar کے ستاروں کی تاریخ صرف 1940 بیان کرتے
ہیں۔ یہ کتنی افسوسناک بات ہے کہ وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کی موت کس طرح واقع ہوئی، حالاں کہ
یومِ پالینڈ جاتا ہے کہ ان کا وہی حشر ہوا ہے جو کئی ہزار پولش قومی افسروں کا ہوا تھا، ہنگامہ کے حواریوں نے
جن کے ہتھیار لے کر قید کر دیا تھا، وروہ سب ایک اجتماعی قبر میں سورجے ہیں۔ اور کیا نسل کی آبرو،
تاریخ میں زما بھی ڈھکی رہتی ہے، یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ 1944 میں پولینڈ کے دار الحکومت وارسا
میں جس کو وہ آبروؤں نے تاریخ کر دیا تھا، وہ کون سا قتل گاہ کیسے گئے تھے؟

انسانیت کے وہ دونوں قاتل اب موجود نہیں، اور کسے معلوم ہے کہ ان کی فتوحات ان کی فوجوں کی
فتوحات سے زیادہ ہر پانچس تھیں۔ حقائق اوقیانوس کے باوجود یہ اصولی کہ قیامت کی آواز ہے، وہ منتقلوں
میں پرپ کی تقسیم کے بعد قبول کر لیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ میں Balkan خطے کی غیر موجودگی مستقل طور پر

ان دو عمروں کی وراثت کی وادہ دہائی ہے۔ جنگ سے قبل یہ ریاستیں ایک ایک نیشنلزم میں شامل تھیں مگر 1939 میں ہونے والے غنیہ معاہدے کی شلوں کے نتیجے میں یہ سب یورپ کے نقشے سے غائب ہو گئیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ اپنی یادداشت کے ایک ورق کو ہر کچھم کی طرح چٹا کرنے پر آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔ یہ موضوع ”حقیقت“ کے لفظ پر میرے مراقبے سے بے تعلقی نہیں، جس کو بدعنوانی و غور پر استہدائیاں چاہتا ہے، اگرچہ یہ معنوں احرام کا حق وار ہے۔ لوگوں کی شکایات، بدعنوانی، معاہدوں کے تذکرے جن کو ہم چوتھی صدی قبل مسیح کے یونانی تاریخ دان Thucydides کو کہیں یونانی تاریخ میں پڑھتے ہیں، میٹل وراثت کے پتوں کی شکل، سمندر کی فضاؤں پر سورج کا طلوع اور غروب، اسباب اور اثرات سے یکساں ایک پارچہ، ہم اس کیفیت کو یونانی تاریخ، میرے خیال میں ایک اور عجیبی یونانی ناقابل ردھل حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو ہر دوش کے فن اور سائنس کی مرکزی محرک حاکمیت ہے۔ کثیر ایسے لحاظ بھی آتے ہیں جب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یونانی ان انکس کے معنی کی رمز کشائی سرمایوں جو دوسرے یورپ کی قوموں پر مارا ہوا ہوتا تھا، وہ مصلی جو اب وقت ان کو یادداشتوں کے نم نہ مارنا تھے جب سے وصف یورپ اور مریکا کی شلوں کے جہد نسلیں اس سے ہم سارا ہو رہی تھیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ تھمیل کی یادداشت کے عدد و وقتی اور یادداشت ہوئی نہیں۔ تم ازم، اسرئیل کی تلا بیان کرنے والی کتاب، وائٹل سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ ایک طویل عرصے تک اس کتاب نے یورپ کی اقوام کو تسلسل کے احساس کو محفوظ رکھنے میں مدد دی تھی، اس سے مراد حقائق پر مبنی تاریخی معیار مراد نہیں، جس کو نیا معنوں میں استعمال کرنا ایک فیشن بن گیا ہے۔

لک سے دو مائیں یہی کے قیام کے دوران میں نے محسوس کیا ہے کہ میں، حالیہ یا ماضی بعید کے واقعات کے نقوش کے اتمام کے ضمن میں، اپنے مغربی ساتھیوں کے مقابلے میں، خود دو ادیب ہوں یا قدریں سے مشابہ، نیا دور استثنائی کیفیت میں ہوں۔ ناباں ہندی کی کوشش میں کہے جانے والے اقدام کے خلاف جہد بعید کے دوران پولینڈ، چیکو سلواکیا، ہنگری میں تخلیق کیا جانے والا دب، لکھ ہو، نثر ہو یا فلم، سب مغربی قاری کے دماغ پر ہوران کے شعور پر ایک بڑاں ابہام کی صعوبت میں مڑ نماز ہوا ہے۔ لہذا یادداشت کی ہماری عمل حاکمیت ہے، اور یہی ہم کو ایسی گنگو سے محفوظ رکھتی ہے، جو عشق چپوں نکل کی طرح، کسی شجر یا دیوار کا سبار نہ مرنے کی صورت میں اپنے گرہی بھتی چلی جاتی ہے۔

کچھ دیر قبل میں نے اس قصہ کو ختم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا جو شاعر کو اپنے ساتھی انسانوں کے ساتھ ایک جہتی سے فاصدہ رکھنے کی ضرورت کی مخالفت کرتا ہے۔ اور اگر ہم شاعر کے استعارے کی طرف زمین کی فضاؤں میں پرواز کرنے لگیں تو ہمیں یہ دیکھنے میں کوئی حاکمیت نہیں ہوتی کہ اس دور میں بھی، جب شاعر تاریخ کے پھندوں سے کیا حد تک آزاد ہوتا ہے، ایک طرف کا ٹکڑا خدا موجود ہوتا ہے۔ تو یہ کس طرح ممکن ہو کہ ہم فضا میں بھی ہوں اور ساتھ ہی زمین کی ساری جزئیات بھی ہماری نظر میں ہوں؟ گویا، وقت کی

روانی کے چہرہ کردہ فائنل کے بنیاد پر مشہور پیشات کا غیر یقینی توازن بھی ایک مناسب تعلق کا باعث ہو سکتا ہے۔
 "دیکھتے" سے صرف یہی مراد نہیں ہوتا کہ ہم اپنی "تصویروں" کی سے دیکھ رہے ہوں۔ اس کا مطلب یہ بھی
 ہو سکتا ہے کہ ہم اس منظر یا شے کے عکس کو اپنی یادداشت میں محفوظ کر رہے ہوتے ہیں۔ "دیکھنے" اور بیان
 کرنے سے مراد یہ بھی ہوتی ہے کہ ہم کسی منظر یا شے کو اپنے تخیل کے ذریعے ترتیب دے رہے ہوتے
 ہیں۔ پیدا ہونے والے فاصلے سے نہیں ہونے چاہئیں کہ واقعات تبدیل کر سکیں، منظر ارغی کو انسانی
 حسیت کو سمجھنے کے انحصار سے ذریعے مضمون سے مضمون تبدیل چلے جائیں۔ اس کے عکس، انہیں تو ان
 سب کام کی روشنیوں میں اچانک سما جائیے کہ ہر واقعہ ہر بات اتنی معنی خیز ہو جائے کہ وہ انسان کی میاں کاریوں
 اور انسان کی عظمتوں و وقوف کی لہری یاد دہانی بن سکے۔ زندہ لوگ ہمیشہ کے لیے خاموش سو جانے والوں
 سے تاریخی اختیار حاصل کرتے ہیں۔ وہ ماضی کی دوبارہ بیحد تشکیل کی کوشش کر کے وہ گزشتہ وقتوں سے
 زور آزمائی کے ذریعے ہی اپنے فرائض کو ادا کر سکتے ہیں۔

بہند، فضا کی بندوبستوں سے ایک جہتی کے کی طرح نظر آنے والی رشتہ اور وہ رشتہ جو باہر ملتا
 وقت پر قائم رہتی ہے وہ فضا کی شاعری کے جام مال کا کام دیتے ہیں۔

(۴)

میں یہ مانگ نہیں دیتا چاہتا کہ میرا ذہن صرف ماضی ہی کی طرف منعطف ہے اس لیے کہ یہ سچ
 نہیں ہوگا۔ اپنے تمام ہم عصر کی طرح میں نے بھی، ممکنہ جہات کی اور بے زاری کی کشش کو محسوس کیا ہے
 اور ایک لاد جوڑتی ترتیب سے مغلوب ہو جانے پر خود کو مدد مت کی ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ایک کس ماہرہ
 دور میں بھی، غرضاتی سطح پر میری شاعری نے ہوش و حواس میں رہی ہے، اور میں اور انصاف کی حکمرانی کی
 تعلق ریں ہے۔ اس مقام پر اس شخص کا ذکر ضرور ہوگا جس نے مجھے ہامیڈی سے بچنے کی ترتیب دی
 تھی۔ میں اپنی "باقی" چرتی سے اس کی سرپرست چھیلوں اور بچتے رہاؤں سے، اس کی روایات سے، بلکہ اس
 کے دسیوں سے بھی تمنا کرتے ہیں، بالخصوص اس اہم اور طاقتور شخصیات سے، ہم اپنے دو شباب میں
 جس سے مل سکے ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ Oscar Masoz جیسے عزیز نے مجھ کو اپنے بچنے کی طرح
 سمجھا، جو پیرس کی عزت نریں اور دور میں شخصیتوں میں سے تھا۔ وہ ذہنی نہیں ذہن کا شاعر کیسے بنا، اس کی
 تفصیل ایک نیا نیا کی وراپ ملک کی پڑچ کہانی سے اخذ کی جاسکتی ہے، جس کو بھی Grand Duchy of
 Lithuania کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وراپ بھی ہوا کہ پیرس کے اخبارات میں اس بات پر افسوس کا
 اظہار کیا گیا کہ بین الاقوامی اہمیت کا سب سے بڑا اعزاز پچیس برس قبل میرے ہی جیسے مام رکھے والے
 شاعر کو دیا نہیں گیا۔

میں نے اس سے بہت توجہ سیکھا ہے۔ اس ہی سے میں نے گہری بصیرت حاصل کی ہے وراپ

سے میں نے ہمدانہ قدیم و جدید کے عیش مذہبی مسائل کی، نفس کی لگی کے آثار چھانڈی اور ان سے نسبت رکھی، اسے ذہن کے تمام مسائل کی ترجیحات کی بصیرت حاصل کی ہے، جن میں ہر وہ شے شامل ہے جس کا میں سے بھی علاوہ ہو، یہاں وہ دوسرے درجے کے لیے کو پہلے درجے پر رکھے گا، کچھ سے تعبیر کرنا تھا۔ بتائیں میرے لیے یہ سب بہت مشکل تھا، تاہم میں نے اس کو ایسے پیغمبر کی طرح سمجھا ہے جسے لوگوں سے محبت ہو، اسی کے قول کے مطابق، ”مؤمن، تنہا ہی، اور غصے سے تھکی چلی ہوئی پرائی محبت“ کے ساتھ اور اسی وجہ سے میں نے عظیم تباہی کی طرف بھاگی ہوئی اس پاگل دنیا کو تہیہ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی سے سنا تھا کہ ایک عظیم تباہی مائزیر سے، اور اس کی ٹیٹل بندی کے مطابق مستقبل میں پیش آنے والی ایک مہیب آتش زدگی اس فوٹل کہیں کا محض ایک حصہ ہوگی جس کو یوم آخر تک چارگی رہنا ہے۔

اس کے نزدیک تھا وہیں صدی میں سرخس کی غلط سمت میں پیش رفت کے بہت گہرے مہاب تھے، وہ پیش رفت جو ریڈش زلزلہ (landslide) جیسے مہیب اثرات پیدا کرنے کا باعث ہوئی۔ بڑے پیش رفت و لم، بلیک سے کچھ مختلف تھیں، اس نے ایک نئے دور کا اعلان کیا، مخصوص نوعیت کے سائنسی علم سے آدھ ایک نئی خوب متخیرتی بدوری بنا ڈالنا، جیسا کہ اس کا خیال تھا، تمام قسم کے سائنسی علمیں، بلکہ مستقبل کے انسان اس کی مدد سے کر رہے تھے۔ اس سے یہ فرق پڑتا ہے کہ میں واقعی ان پیشین گوئیوں پر کہاں تک یقین کرتا ہوں۔ بس ایک عام نوعیت کی حسرت بندی ہی کافی تھی۔

وہ بلیک کی طرح Oscar Milosz، نے بھی سائنس دان انجینئرز بورگ کی تحریروں سے استفادہ کیا تھا جس نے سب سے پہلے نون کے پیش کیے ہوئے کا خدائی ماڈل میں پوشیدہ انسان کی شکست کی پیش بندی کی تھی۔ جب میں اپنے عزیز کے پیش، سوئیڈن بورگ کی طرف ایک پیغام قاری کی طرح متوجہ ہو اور میرے اس کا مطالعہ کیا، اس طرح نہیں جیسا کہ وہ بدنامی میں دستور تھا، تو سچ بچ میرے سامان گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے حک میں میرا جہاں اس طرح، یعنی موجودہ قریب کے لیے ملے گا۔

وہ دلی صدی اپنے آخری مراحل کی طرف مدد دیاں ہے اور ان اثرات کے ظہیل (جن کا ذکر کیا چاہیے) میں اس کو مطعون کرنے کی حسرت نہیں آدوں گا، اس لیے کہ یہ صدی یقین اور میدان کی صدی بھی تھی۔ اس میں کسی عیشیت ہیٹھی تبدیلیوں ہوتا رہی ہیں، جن سے ہم پوری طرح واقف ہی نہیں ہو سکتے اس لیے کہ ہم خود اس کا حصہ ہیں، اور یہ تبدیلیاں وقتی فوٹل ایسی کیفیت میں برابری رہی ہیں جو مجموعہ الناس کو بھی حیران کر دیتی ہیں۔ Oscar Milosz ہی کے غمازیں، یہ کچھ تبدیلیوں سے متعلق ہیں جو ”پیسے ہونے عوام کے گھرے مان ہیں، جو ہمیشہ کی طرح زندہ و متحرک تھی ہیں اور اندھ اندھ بھی۔“ ان کے روز حقیقی قدروں کے نگاہ کے حداثی ہیں، جب کہ ایسی کوئی زبان موجود نہیں جو ان کا کماحقہ نگاہ راستہ کے۔ اس کیفیت میں نہ صرف عوامی ذرائع ابدی شامل ہیں بلکہ دانش ور بھی جن پر مدی ذمہ داریاں ہیں، مگر قلیل مرے کے لیے ہی جانے والی پیش بندیوں کی پیدا کے پیغمبر، تبدیلیاں تو ہوتی رہی ہیں، اور یہ ممکن ممکن

ہے کہ وہ وہ تمام تر خطرات اور مہیجوں کے دور کے غور نہ چاہی جائے، بلکہ اس کے کہ انسانیت ایک نئی
 دوڑ گاہ کی سے آشنا ہو۔ تب ایک نیا نظام بلندی و پستی بھرے گا، اور مجھے یقین ہے کہ Simone Weil
 اور Oscar Wilde جیسے تخلیق کاروں کے ویسٹاٹ کے فرماں بردار غلبہ و ان کا حق ملے گا۔ میرا خیال ہے کہ
 ہم کو ہر عام کچھ ہاموں سے اپنے تعلق کا ہر طرف سنا چاہیے اس لیے کہ کسی طرح ہم اپنے موقف کا
 پرزور ہمیں کر سکیں گے۔ بجائے اس کے کہ ہم ان لوگوں کے نام میں جن سے ہمیں شدید اختلاف ہو۔ مجھے امید
 ہے کہ باوجود میرے پیچیدہ خیالات کے جو ایک شاعرانہ برقی حالت ہوا کرتی ہے اس خطبے میں ہم اہم
 چالشیں کے انتخاب کے ضمن میں میرے ماں اور ہمیں احوال بحال بیان کیے گئے ہیں۔ اس لیے کہ ہم سب
 حاضرین، یعنی مقررین اور مباحثین دونوں، ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک نئی کے نیا وہ ہتھیار بنیں۔



اوڈیسیس الی تیز

اعتیاد کمال۔ اس کی شاعری کے لیے جن یونانی روایات کے پس منظر میں دانش و مادہ ڈھلے
لگائی اور حسی قوت سے تخلیقی صلاحیت اور آزادی کے لیے، عہدِ جدید کے انسان
کی جدوجہد کی منظر کشی کرتی ہے۔

یونانی کہانیاں کی تاریخ کے جہاز، ہومر کی نظم کے سودا، آئنا کی کے جذبے سے سرشار
سرکشی جیسی دیرینہ و لے طرہ، جن یونان کے سمندر پر جزائر میں ٹکڑے ٹکڑے کا بے باک منہ کرنے والا
اور شہابی تجربات کے لیے بے تاب کردار کا نام، پتے بیٹے ملی تیز کو اس کے والدین نے شاید سمجھو جو جھڑپ
تھا۔ یہ نام یونانوں کے مخصوص کردار اسامیجہ و روایت کی تائید کرتا ہے۔ اس کے خاندان کا تعلق یونان
میں شاہی جزائر (Aegean Islands) سے تھا۔ الی تیز کرت (Crete) نام کے جزیرے پر اس وقت
جبرِ مبدعہ ترکوں کے تسلط سے آزاد ہو کر یونان سے جانا تھا۔

اوڈیسیس کا اصل نام اوڈیسیس (Odysseus Alepoudheas) تھا مگر اس نے
اپنی تیز کا جھنڈا اپنی فنی زندگی کے شروٹ میں ہی اختیار کر لیا تھا۔ یہ نام جو کئی خصوصیات کا مرآہ ہے یونانی
مبات کے لفظ (Elas) (یونان)، امید (elpida)، حریت (elethra) حسن، اور شہوت انگیز نفس پرستی
اور نسوانی کشش کی علامت یونانی اساطیر کی محرت (Eleni) کے مترادف سے بنا ہے۔

ایلی چو کی شاعری کی پتوں میں جزائر کے حیوانات اور نباتات، ماحول پر بکھرے ہوئے چنگے پتھروں، سروں کے چھڑکے، ایک دوسرے والی سمندری مخلوق، مک کی کھار اور پانی کی سطح پر بکھرتے والی روشنی، سب کے نقوش نظر آتے ہیں۔ اس کی شاعری کے منظر دیکھتے دیکھتے پر سورج کی کرنوں جیسے اتر آتے ہیں جو ساری زمیں کو اپنی غوش میں لے کر اپنی دھک دھک اور چاں فزا تہزوت سے زرخیز و رو پاک کر دیتی ہیں۔ شہابی حسیت اور دنیا دہک روشنیوں ایلی چو کی شاعری کی لٹکاؤں کو منور کرتی ہیں۔ ایلی چو کے حیرت خیز تجربات اور اس کے لیجے کی بے پناہ نازق میں اور کچھ پرو دنیا کے نئے نئے منظر بھسکتے ہیں۔

ایلی چو اپنے جمشیل آئینہ فنی شاعری کے ذریعے نظر آئے والی دنیا کو ایک علامتی حقیقت کی رفعت پر لے جاتا ہے۔ اس کی شاعری کے ذریعے دنیا کو اس بات کا دھاک ہو جاتا ہے کہ اس کی جو کچھ تکی تاب ماک نہ آتی روشن اور نہ تکی حسین ہے، کیا مولا چاہیے اور وہ کیا ہو سکتی ہے۔ ایلی چو کی شاعری بتاتی ہے کہ انسان کو دنیا کی تعریف کوئی چاہیے کہ وہ کیا ہے اور اس کو کیا مولا چاہیے، یعنی زندگی عطا کرنے والی حالت کا تعلق۔ ایلی چو نے نہایت کے وجود اس کے محلی امکانات اور اس کی مومری مخلوق کے ساتھ مل کر برسر کرنے کی مدد حیات کی جو روح سرائی کی ہے، وہی لریب لریب نہیں۔ یہ ایک اخلاقی اظہار مناجات ہے جو ہمہ قوتوں کے خلاف آزادی کی جدوجہد کو توجہ دینے کے لیے یقینی تارنخ اور نہایت میں صدیوں سے مانگ رہا ہے۔ ایلی چو کہتا ہے کہ انسان کو صرف اعانت گزار ہی نہیں کرنی چاہیے۔ مسکریہ ہے کی زندگی کو کیا ہونا چاہیے، اور انسان کوئی تباہی اور بربادی کے مقابل اپنے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے۔

ایلی چو کی تحریریں درحقیقت کوئی سیاسی مرض یا زنی نہیں، یہ ایلی کو شیش ہے جس کا مقصد اخلاقی دینیت کے ذریعے اپنے وقار کا دفاع ہے جو خطرات اور مشکلات سے بچاؤ کے لیے کیا جانا چاہیے۔ ایلی چو کی شاعری کے یہ پہلو 1940 کے ابتدائی برسوں میں ظاہر ہوئے جب اس نے ہائپو ٹیٹسٹی کا قتل کے خلاف جدوجہد میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ اس کے قول کے مطابق وہ ایک نئے مہم سے تیرا آتا تھا اور اس وقت ساری کوششیں نئے انداز سے کرتی تھیں کہ کیسے زندہ رہ جائے، شاعری کی کیا ضرورت ہے۔ اور شاعری کے فن پر حسن کو نشان کے وقار کی بھائی کے لیے کس طرح استعمال کیا جائے کہ مزاحمت بھی ہوتی رہے اور آزادی پر حرف بھی نہ آئے۔

اسانید کے ایک لونی افسر کی بہ رتی، حرأت مند کی اور اس کی جان آفرینی پر نکھا جانے والا ایک تعزیتی ترانہ ایلی چو کے ذاتی تجربات پر مبنی تھا۔ یہ ترانہ دیکھتے ہی دیکھتے نوجوانوں کے دل کی جھڑکن بن گیا۔ ناقابل شکست یونانی مزاحمت کی روح کے طور پر آتی بھی اس سوانی کا ایک مقام ہے۔ جان دیتے والا سپاہی ان یونانی فوجیوں کا نمائندہ بھی سمجھا جاتا ہے جنہوں نے اپنے ملک اور ملت کے وقار کی مرہ بندی کے لیے جنگ میں اپنی جانیں دے دیں، جنہوں نے سب سپاہیوں کا بھی جو ہمان کی تاریخ میں آزادی کی حفاظت کے لیے ہونے والی جنگوں میں مارے گئے ہیں۔

اس مشہور تعزیتی قمر نے کی تخلیق ایلی چور کے لیے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ اس کے بعد ایلی چور نے 1930 میں ایک دبی جدید سے میں شائع ہوئے جو نو جوان دبیوں کی تنظیم Nea Ghranmata کا نام لیا۔ یہ تنظیم ایک طرح سے، انگریزوں کے وارے شاعریوں کے لیے مدد سے کا دہرہ نکھلی گئی۔ اس تنظیم سے متعلق شاعریوں پر فرانس سے انگریزوں کے اتحاد تحت اشعور کی جدت پسندی کے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ تعزیتی قمر نے سے جسے کبھی چارے ایلی چور کی نظمیں اپنی تازگی اور کشش میں، اشباب نگار حسیّت کی روشنی اور طباعی کی مادہ مشائیں تھیں۔ اس انداز کے سرے ایلی چور کو یونانی شاعر میں نمایاں مقام عطا کیا۔

اپنے ایک مضمون میں ایلی چور نے اپنے ارادوں کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں شاعری کو معصوم انداز کی حالت کا مرچشمہ جانتا ہوں۔ میری پوشش ہوئی کہ اس دبی کو بے ضمیر کے تقاضوں کے مطابق سدھانے کے لیے نیا قانون کا استعمال کروں یہاں تک کہ میں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ سکوں۔ یہاں میری مراد سے دور کا وہ چارہ ہے جس کی پورہ بندی سے ہم اپنی اصل اور حقیقت کو دھماقت کر سکیں۔ اسی وجہ سے میں اس مست رزاں ہوں جس پر چھنے کی ابھی تک پوشش ہی نہیں کی گئی، اس امید پر کہ ایک دن سر ہر بندھن سے مدرا آزادی حاصل کر سکیں اور وہ انصاف عام کر سکیں جس کو دنیا کی کبھی اور تیز روشنی میں بھی پہچان نہ سکے۔

اوپر ایلی چور 1911 میں جزیرے کرینٹ کے شہر Heraklion میں پیدا ہوئے۔ اس کا خاندان جزیرے Lesbos سے تعلق رکھتا تھا۔ 1914 میں یونان کے مارکوست ایستھر میں منتقل ہو گیا۔ وہیں اس نے تعلیم حاصل کی اور قانون پڑھا۔ اس نے انگریزوں سے پسپائی چھوڑ کر تعلیم ختم کر دی اور اپنا سفر ماورق ایلی چور کی دبیوں کے لیے وقف کر دیا۔ اس دوران اس کی ملاقات یونان میں فرانسیسی تحت اشعور کی جدت پسندی کے مرچشمہ ایندرا اینی ریکوز (Andreas Embrikos) سے ہوئی اور دونوں گہرے اور زندگی بھر کے بے حسرت بن گئے۔ ایلی چور نے 1935 میں اپنی نظمیں کا پیدا مجموعہ (New Letters) Nea Ghranmata شائع کیا۔

ایلی چور کی شاعری میں جنگ کے دوران جدوجہد سے حاصل ہونے والے تجربات کا پرتو دکھائی دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کو یونان کی جدوجہد آزادی میں باصدی حاصل ہوئی۔ جنگ کے بعد ایلی چور کو حکومت کے مختلف اداروں میں کام کرنے کے مواقع دیے گئے جن کی وجہ سے تقریباً وہی مدت کے عرصے کے لیے اس کی تخلیقی سرگرمیوں ماند پڑ گئیں۔ 1948 کے بعد سے اس نے باقاعدہ ادبی سرگرمیاں شروع کیں اور اس کی شاعری اور مضامین کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ 1981 تک اس کی ہائیکو شائع ہو چکی تھیں، اس دوران اس کی شاعری سے متاثر ہو کر اس کے دوستوں نے، تصاویر بنائیں جن میں Picasso، Masson, Grika, Tsarouchis شامل تھے۔

بیش تر یورپی نیا نوں میں ایلی چور کی تخلیقات کے تراجم کیے گئے ہیں۔ اس کے 1996 میں انتقال کیا۔

خطبہ

آپ حضرات سے اجازت کا خباباں ہوں کہ میں درخشندگی و روحانیت کے ذریعے آپ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ وہ جگہ جہاں میں نے اپنی زندگی گزار دی ہے اور پائے تکمیل کو پہنچا ہوں، ان ہی دو کیفیتوں کی حدوں کے درمیان واقع ہے۔

یہ اتنی بات ہے، اور بہتر بھی کہ میں میں ایسے اضافے کیے جاؤں جو خدا کے ذاتی تجربات اور زبان کی فحوں کی کوکھ سے پھوٹتے ہوں۔ اور یہ کہ نہ وہ جیت ماک ہے اس لیے ہمیں ہر شے کو ایک وسیع دائرہ میں دیکھنا چاہیے۔

میں فطری اور عام اقدار سے چیزوں کے تمام درجہ بندی تصور کی بات نہیں کر رہا ہوں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ تشبیہات کی طاقت کو اپنے جوہر کو برقرار رکھئے۔ دیکھنا چاہیے کہ ان کو اس پائیداری کی منزل پر رکھنا چاہیے کہ ان کی مابعد الطبیعیاتی اہمیت الہام کی صحت نظر آئے۔

اس منزل پر میں ایک ہی ذریعہ میں سمجھتا ہوں کہ ان مجسمہ سازوں کے بارے میں سوچنا رہا ہوں جنہوں نے اپنے مابعدیوں کو اس قدر قہر سے استعمال کیا تھا کہ وہ اپنی حدود سے تجاوز کرتے دکھائی دیتے تھے۔ اس وقت میرے ذہن میں درخشندگی مجدد کے دو مثالی مصوٰر بھی ہیں جو صرف ان میں رنگوں کے (فنی کامانہ) استعمال ہی سے ”خدا“ کا تصور اجاگر کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

تفاتیق میں اسی نوعیت کا تھیر کاہل اور موثر دھل انداز، دلوں کی میرے نزدیک ہمیشہ شاعری کی بلند آہنگی کے باعث رہے ہیں۔ ان کو محدود کرنے کے لیے نہیں، بلکہ ان کو اس حد تک وسعت دیتے ہیں جہاں تک ممکن ہو سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے اندام کا بھی احترام نہیں کیا گیا۔ مثالی انتہائی تشویش نے اس بات کی جاڑت نہیں دی۔ یا پھر قادیانیت پسندی نے سائنس کو صرف اس حد تک اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی اجازت دی جتنی کہ ضروری ہو۔

ایسا لگتا ہے کہ لوگ، حسن ہو یا بدشہنی، دونوں ہی کو نکار دیتے۔ اور خیر اہم سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں فرشتوں کے چکر کی طرف اٹھنے والا بر خیر قدم چھینے قدم سے ٹکنا نہ وہ تکلیف دہ ہوتا ہے اور وہی ہر قسم کے شیاطین کے جنم کا سبب ہوتا ہے۔

یہ بدشہنیک بھی ہے۔ مگر یہ مادی و مریزی نکلا نہیں جو بدشہنی اور بدشہنی کے کھیل سے ہمیں متاثر کرنا چاہتا ہے۔

مادی و بدشہنی میں بھی مادی رہتا ہے۔ یہ پھر بدشہنی سے اس نوعیت کی چمک دکھ حاصل کر لیتا

ہے جو خاطر و ذریعہ کرتی ہے، جس کو ہم حسن کہتے ہیں۔ حسن ہی ایک کلمہ ہوا مانتا ہے، ہمارے نامعلوم جسے کسی طرف رہنمائی کرنے والا واحد راستہ اس سمت کی جانب جو ہم سے آگے آگے چلتی ہے۔ گویا شاعری کی ایک اور تحریف ہو سکتی ہے۔ یعنی اس کی جستجو کرنے کا طرز جو ہم سے آگے نکلا جاتا ہے۔

یہ دلی کائنات میں ایک دوسرے سے مجرے ہوئے، متحدہ ذخیرہ اشارے ایک نامعلوم نبیوں کے نہ جانے کتنے معمولی عکسوں میں اظہار جاتے ہیں، اور ہم کو ان سے الفاظ تیار کرنے پر اکساتے ہیں، ایسے الفاظ اور ایسے جملے، جن کی تشریح ہم و ہمیشہ ترین صداقت کی ذیورگی پر لا کھڑا کر دیتی ہے۔

آخر، صداقت ہے کہل؟ اس غریب و غریب اور موت میں ہم جس کو اپنی اطراف پستے ہیں، یا پھر اس حقیقت میں کہ دنیا جی کے قابل ہے اور ابد تک رہنے والی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ غیر ضروری کھمار سے حذر ہی عقل مند کی ہے۔ تخلیق کائنات سے متعلق ایک ایسے کورڈ کرنے والے نظریات نے اس (صداقت) کو استہوار بھی کیا ہے اور اس کے ساتھ زیادتی بھی کی ہے۔ ان نظریات میں فزکس میں تصاویر بھی رہا ہے۔ کبھی ان کا بھی وقت تھا مگر پھر سب کے سب منظر ہستی سے معدوم کر دیے گئے۔

غیر ذہنی غصہ تھا، بچا رہا ہے اور رہے گا۔

جب عقلمند پسندی اپنے تھیں، ذہل دیتی ہے تو دوسرا غریب جو سراٹھاتی ہے، عقلمند پسندی سے فارغ ہونے والے سپاہیوں کو ممنوعہ علاقوں میں آگے بڑھاتی ہے، اور اس طرح یہ ثابت کرتی ہے کہ فرسودگی اس کو پوری طرح کھار میں نہیں لے سکتی۔ جب اپنے چکر کی پاکیزگی کے باعث شاعری میں موجود حقیقت کے تحفظ کا یقین دلاتی ہے جن کے ہاں یہ زندگی ایک قابل عمل منہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے اور اس کی چھپائی کے بغیر، یہ سارے حقائق شعور کے چند عکسوں میں بالکل اسی طرح مائب ہو جاتے ہیں جیسے سمندروں کی گہرائیوں میں کائنات کا وجود غیر اہم ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیں شفافیت کی بے حد ضرورت ہوتی ہے تاکہ ہم صدیوں کے درمیان سے ہوئے ان دھماکوں میں پڑی گہرائیوں کا صحیح احوال کر سکیں جو ہم کو زمین پر ستادہ رہنے میں معاون ہوتے ہیں۔ ہم ہر قلیطس سے افلاطون تک اور افلاطون سے عیسیٰ ابن مریم تک ان چند صدیوں اور ان میں پڑی گہرائیوں کو صاف دیکھ سکتے ہیں۔ مختلف اشیاء میں ہم تک پہنچنے والے یہ مذہب ہمیں وہی بات بتاتے ہیں کہ اس دنیا کے اندر ہی ایک اور دنیا پوشیدہ ہے، اور یہ بھی کہ اس دنیا کے عناصر ہی سے آگے آنے والی دوسری دنیا کی پیدائش کا رکن ہوتی ہے، کہ یہ دوسری حقیقت (دنیا) اسی (موجودہ دنیا) پر واقع ہے جس میں ہم غیر شعری طور پر زندہ رہتے ہیں۔ یہی ایک حقیقت کا مسئلہ ہے جس پر ہمیں پورا حق ہے مگر ہماری نگاہیں ہم کو ان کے قابل نہیں رکھتیں۔

یہ الحاق ہی نہیں ہے کہ چھوٹوں میں حسن کو تپتی کے اور تپتی کو سورج کے حوالے سے بچھا جاتا ہے۔ جس حد تک شعور خود کو پاکیزہ بناتا ہے اور اس میں نور داخل ہو جاتا ہے تو اس کے تاریک اظہار سننے

چہرہ غائب ہو جاتے ہیں اور ایک ٹکڑا چھوڑ جاتے ہیں جن میں، طبیعت کے قوانین کے مطابق، مخالف عناصر اپنے دیر سے ڈل دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں جو کچھ ہوتا ہے وہ دو رخوں ہے۔ ”کوشا“ اور ”شربت“ پر مبنی ہوتا ہے۔ تو کیا ہر غلطی کے مخالف سمت میں کھینچنے والے تناؤ کی ہم آہنگی کی بات نہیں کی گئی؟

ہمارے نزدیک یہ اہم نہیں کہ اپالوہو یا وینس، ونسی ہوں یا کنواری (مریم)، سب وہی روپ اور وہی تقسیم اختیار کرتے ہیں ہم کو جن کی ضرورت ہوتی ہے، الہی کیفیت میں جنی سے ہمارا سہاقت پڑتا ہے۔ ہم صرف لافانیات کی ایک مہک بیٹی ہے جو اس لمحے ہمارے نکلنے میں سہاقت کر جاتی ہے۔ میرے حقیر خیال میں، تمام تر عقائدی مباحث سے ماوراء شاعری کو اسی مہک کی اجازت دینی چاہیے۔

اس مرحلے پر میں ہولڈرین کا تذکرہ کرنا چاہوں گا، اس عظیم شاعر کا جس نے ابھری اور ونسی مریم کو اسی انداز میں دکھا تھا۔ اس نے ایک اندازہ نظر کو جو حقائق حقائق ہے اس کا آئینہ بھی چوکی طرز اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور جو کچھ اس نے ہم پر آشکار کیا ہے اس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ یہ بہت غول خاک ہے۔ اس نے تو ہم کو اس دور پر ہم آج جس میں غرق ہیں، اس وقت بھی قریباً گرنے پر ابھارا تھا جب اس کی شروعات ہوئی تھی۔ ”اس کے عالم میں شاعر بھلا کس کام کے ہوتے ہیں؟“

قسمتی سے انسانیت کے یہ حالات ہمیشہ گہ گہ رہے ہیں۔ اس کے برعکس شاعری نے اپنی بددھیت کو بھی خدائے نہیں کیا ہے۔ یہ دو حقیقتیں ایک دوسرے کے قوانین کے طور پر، ہمیشہ ہمارے مشہور کے ساتھ رہیں گی۔ تو پھر اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے؟ یہ سورت کی کی مہربانی ہے کہ بات ہوتی ہے اور ہمیں تیار سے نظر آتے ہیں۔ پھر بھی، پڑھنے والوں کے مطابق اگر سورت اپنی حدود سے باہر لگا جائے تو تباہی ہو جاتا ہے۔ زندگی کو ٹکڑے کرنے کے لیے ہم کو اپنے قیمتی سورت سے بھی اتنا ہی کچھ فاصلہ رکھنا پڑتا ہے جیسے کہ ہمارا تیار رہنے کی سیرت سے ایک مقررہ فاصلے پر رہتا ہے۔ ہم نے انسانی دنیا پر پے غلطی کی ہیں اور اب ہم میں نیا دنیا کی وجہ سے غلطیاں کرتے ہیں۔ مگر میں یہ کہہ کر ٹھیکہ نوبی کی قہر جب کے خوشہ چیزوں کی غلطی قہرست میں اپنے نام کا اندازہ کرنا نہیں چاہتا۔ عظمت نے، اچھی ہی پہائی چتا کہ میرا وطن، مجھے رشتا پر یقین کرنا سکتا ہے، اور مٹی کو اس کی چھال اور اس کے سج سمیت، ”مضم“ کہہ جانے کا درس دیتا ہے۔

تو پھر شاعری کا کیا ہے گا؟ اس کی سورت میں کیا حیثیت ہوتی ہے؟ میرا جواب یہ ہوگا کہ شاعری ہی وہ مقام ہے جہاں انداز کی حقیقت باقی نہیں رہ جاتی۔ مجھ جیسے بے بنیاد شخص اور ایک چھوٹے سے ملک کی شاعری کو عزا دینے کا آپ کا فیصلہ فیمن سے ہم آہنگی کے شے بد قرار رکھنے کی کوششوں کو جاننا کہنا ہے۔ میں وہ تصور ہے جو آج کل کی ”قدردانی قدروں کی عاقبت“ کی ہوئی تمام تر حقیقت کا مقابلہ کرنا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے قابل احوال کو آج میں لانا انہی احوال کی طرف ورتی ہوئی۔ اپنے ملک کی تعریف تو اور بھی نامناسب بات ہوئی۔ مگر کبھی کبھی یہ اندازہ گزیر جاتا ہے، اس لیے کہ اس نامناسب عمل کے ذریعے ہی ہم احوال و اقل کو واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ آج بھی کچھ ایسی ہی کیفیت

کا سہ چشہ نظر ہے۔

عزیز دوستو، یہ اعزاز مجھے اس زبان میں تخلیق کرنے کے عوض دیا گیا ہے جس کو صرف چند ادا کو ادبی بناتے ہیں۔ مگر یہ زبان، بغیر کسی تھفل کے، بہت کم جھڑپ کے ذہنی ہزار ہوں سے جڑی جا رہی ہے۔ ہر یہ تعجب خیز نکال اور زمانہ فاصلے میرے ملک کے تہذیبی ابعاد میں پائے جاتے ہیں۔ اس کا نکالنا۔ قد سب سے کم ہے جب کہ زمانہ پھیلاؤ رہتا ہی ہے۔ ان باتوں کو یاد دلانے پر کسی قسم کا تقاضا میرا مقصود نہیں۔ میرا مقصد صرف ان مشکلات کا اظہار ہے جو شاعر Sappho و Findar جیسے، نہایت عزیز الفاظ کے استعمال پر مجبور ہونے کی صورت میں اسے درپیش ہوتی ہیں، جب وہ اپنے اس تاریکی سے جوتلاہ انسانی تہذیب پر محیط ہوتا ہے، محروم ہو جاتا ہے۔

اگر مسئلہ خیالات کے لیے زبان جیسا آسان طریقہ موجود ہوتا تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں آسان طریقہ ”جادو“ کی طرح کام کرتا ہے۔ اس کے علاوہ صدیوں کے عربی میں، زبان کا اپنا ایک انداز چینی ہو جاتا ہے۔ جب زبان ایک بلند آہنگ تقریر بن جاتی ہے۔ اور اس کے اس طرح کے وجود کے ساتھ کچھ پابندیوں بھی بنتی ہیں۔

میں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ان کچھ صدیوں میں سے ہر صدی میں، یا کسی تھفل کے، یونانی زبان میں شاعری کی جاتی رہی ہے۔ وہاں حقیقتوں کا اجراء ہی ہوتا ہے جس سے روایات میں عظمت کا وزن پیدا ہوتا ہے، جدید یونانی شاعری جس کا ایک واضح خاکہ پیش کرتی ہے۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس شاعری سے تخلیق ہوئے والا جہان بھی قطبین کا حامل ہے جس کا ایک قطب Dionysios Solomos ہے جو، مے سے قبل یورپی ادب کے نقی پر طوطا ہوا تھا اور جس نے نہایت محنت و زہم جتنی سے فی اس شاعری کے تصویر کی تشکیل کی تھی، کہ جذبات کو عمل کے حوالے کیا جائے، انہماک کو قائم رکھا جائے، زبان کے مرفیع طریقوں کے ہر مکان کو اس طرح سے دئے کار لایا جائے کہ نئے نئے دو گناں سے دوسرے قطب Cavaty ہے، ان اس اسیت کی طرح، جو ہر قسم کے بلند باغیہ انداز بیان کی جھڑپوں کو، سستے سے سنا کر اجازت بخور حقیقت کے شہر کی انتہائی حدود کو چھو رہا ہے۔

ان قطبین کے درمیانہ والے میں سے کسی ایک سے گمراہی نہ ہو، قریب، دوسرے قطب شاعر بھی متحرک رہتا دیتے ہیں، Kostas Parnas, Angelos Sikelianos, Nikos Kazantzakis, George Sefanis۔ نو یونانی شاعری کے موضوع پر تو سائنہ و رجلیت میں طائی جانے والی تصویر کچھ ایسی طرح کی نظر آتی ہے۔

ہم، بعد میں آئے والے لوگوں کو اسی بلند آہنگی کو جو دہائے میں بنی تھی، جدید حیثیت میں ڈھاننا پڑا ہے۔ اس تکنیک کی حدود سے پرے ہم کو ایک منزل نامیغ پر پہنچنا پڑا تھا جسے ایک جانب تو یونانی روایات کے عناصر سے، اور دوسری جانب اپنے عہد کی سماجی اور نسبیاتی کیفیات سے ہم آہنگ ہونا پڑا۔

دوسرے غفلتوں میں ہمیں آج کی پورنی چٹائی زبان کو اپنی تمام سچائیوں کے ساتھ گرفت میں لیا، اور ان سچائیوں کو تفصیل میں چٹائی بھی کرنا پڑا ہے۔ اس کامیابیوں کی نہیں، اما دونوں اور کوششوں کی بات کر رہا ہوں۔ سو دیکھ کر ادبیات کی تاریخ کی شہنشاہ میں سب سے زیادہ کی اہمیت بھی ہوا کرتی ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ تخلیق کس طرح ان جہتوں کی طرف زیادہ سے ارتقا پذیر ہو سکتی ہے جب ہم اسے محدود زندگی کی سطح پر تخلیق کا کوئی عمل کر کے رکھ دیتے ہیں؟ اور پھر کس طرح وقتی سماجی گرد و جوڑ میں آسکتا ہے جب زبانوں کو شکائی کا قائل عبور رکھیں حال کر دیتی ہو؟ ہم آپ سے اور آپ ہم سے ان تخلیقات کے ذریعے واقف ہوتے ہیں جن کا اصل جوہر ترے کے بعد صرف پس یا نہیں فی حد تک ہی باقی رہ جاتا ہے۔ یہ محسوس ہوگا کہ یہ درجہ زیادہ صاف آتا ہے جو Solomos کی بنائی ہوئی شہنشاہ کی طوالت پر کشیدہ کے ذریعے پھیلنے کی توقع رکھتے ہیں اور اس تصور پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ وہ غفلتوں کے درمیان کچھ طریقے سے دیکھ کر آواز کے ساتھ ایک چٹائی بھی بناتی ہے۔

جی نہیں، اہم خاموش رہتے ہیں۔ کا قائل برکت صدف۔

ہم ایک مشترکہ زبان بنانے کے عذاب میں مبتلا ہیں، جس کے اثرات صرف ظاہر ہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ میں اپنے مشترکہ زبان کو وہی کی سیاست اور سماجی حقیقتوں کے بارے میں بھی، مہلت سے کام لے رہا ہوں۔

ہم کہتے ہیں اور ہر روز اس بات کا دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ہم ایک اخلاقی بنکامے میں آئی رہے ہیں۔ اور اس کیفیت میں کہ جب، جیسا کہ پہلے بھی نہیں ہوا، دو پتھر جو ہماری باؤ کی زندگی سے متعلق ہے ایک طے شدہ نظام کے تحت ہم تک پہنچ رہا ہے، بالکل فوجی حکامات کی طرح اور بے محابہ نظم و ضبط کے ساتھ یہ تعداد کتنا کم ہے۔ بالکل ایک جسم کے دو حصوں کی طرح جس میں ایک ضرورت سے زیادہ بھولی گیا ہو اور دوسرے سگڑ کر اصل سے کہیں کم ہو گیا ہو۔ یورپ کے لوگوں کو اتحاد کی طرف مائل کرنے کے قائل تحریف رجحانات کو ہماری تہذیب کے ان ہی دونوں، پھولے ہوئے درختوں کے ہونے، حصوں کی ہر آہنگی کے ناممکن ہونے کا مسئلہ درپیش ہے۔ مشکل یہ کہ ہماری قدریں ایک مشترکہ زبان نہیں بنائیں۔

یہ ایک امر محال ہو گا مگر یہی سچ ہے کہ شاعر کے استقبال کے لیے صرف حسیات ہی اس کی مشترکہ زبان ہوتی ہے۔ جس انداز سے وہ انسانی جسم ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں وہ خبروں میں بدل بھی نہیں دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار نظریات کے وجود حصوں نے سماجوں میں شبنم خراب کیا ہے اور ہمیں خدائی ہاتھ رکھنا ہے، اس انداز نے کسی اتحاد کو بھی جنم نہیں دیا ہے۔

جب میں حسیات کی بات کرتا ہوں تو اس سے میری مراد وہ حسیات نہیں ہوتیں جن کا، پہلے یا دوسرے درجے پر، فوری درک کر لیا جائے۔ میری مراد ان سے ہے جو ہمیں اپنے بھائی بھائیوں تک لے جاتی ہیں۔ ہندو میری مراد حسیات کی ان تہذیبات سے بھی ہے جو ہماری روح میں تشکیل پاتی ہیں۔

ہر فن تشبیہی کے ذریعے جوتا ہے۔ ایک سطر — راحت ہو یا سکھ، ایک گواز — تیر ہو یا آہستہ، ایک مخصوص بصری یا سمعی ماپنے میں دھنکی ہے۔ ہم سب جس اچھائی اور زمانے کے تاظر میں مندرہ سبچے ہیں اسی سے متاثر ہو کر ادبی اور ڈراما نگریں بھی نکلتے ہیں۔ یومرکی شاعری میں سمندر ہم کو سالم دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ اسی کو Rimbaud "سورج میں ملے ہوا سمندر" کہے گا، مگر سب تو ہی "اور بھی ابدیت ہے" جیسے الماؤ کا انداز کرے گا۔ Maïsse کی کافی کافی تصویر Archilocus میں اپنے ہاتھوں میں حنا کی ایک شاخ لیے ہوئے ایک نوجوان لڑکے کی بھی باقی ہے۔ اسی طرح مجرور روم کے غلامتے کی پا گیزگی کا خیال بھارے لیے زیادہ قابل یقین بنادیا گیا ہے۔ بہر حال، کیا بازنطینی مجسمہ نگاری میں کٹوری مریم اپنی لاندہ سبب سبوں سے بہت مختلف ہے؟ اس دنیا کی روشنی کو، فوق انشعرت ثقافت، یہ اس کے برعکس کیفیت میں تبدیل کرنے کے لیے کچھ نیا دہانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پر نے زمانے کے بزرگوں کی چھوڑی ہوئی سنسنی اور راز منہ وسطی سے ورثے میں ملنے والی سنسنی کے اتصال سے بصری سنسنی جھڑکتی ہے جو دونوں سے اسی طرح مشابہ ہوتی ہے جیسے ولید بن سے ان کی اولاد۔ تو کیا شاعری ایسے رستے پر چلی کر کافی رد کچھ ہے؟ تو کیا سنسنی مسلسل ہونے والے عمل طبابت کے اختتام پر کبھی نہیں کے رستے پر غائر ہو کچھ ہے؟ تو کیا وہ (سنسنی) تشاہات کے صحت میں دیر "نہیں گی تاکہ مادی دنیا پر پوند ہو، اس پر ہر انداز ہو سکے۔

اپنے خوابوں کو اشعار میں بیان کرنا کافی نہیں، بہت کم ہے۔ اپنے جان کو سب کی جگہ دینا کافی نہیں، بہت نادر ہے۔ مادی دنیا دراصل صرف مادی اشیا کے مظاہر کا نام ہے۔ سب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم خود کو جتنے یا خراب معمر کے طور پر پیش کرتے ہیں، جنت بناتے ہیں یا جہنم۔ سب بات ہے جو شاعری ہم کو باور کراتی نہیں سمجھتی، یا مخصوص مشکل باتوں میں، جس میں کہ کچھ بھی ہو، ہر ماخذ روکارے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔

میں نے دہا بھی، بعد اظہار پر بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت میں یہ تجویز کرنے کی کوشش نہیں کروں گا کہ فن کس طرح اس تصور میں شامل ہوتا ہے۔ یہاں میں اپنے آپ کو صرف ایک مادہ میں حقیقت پر مرکوز رکھنے کی کوشش کروں گا، وہ یہ ہے کہ جو باتوں کی زبان، ایک چاروں کی طرح حقیقت یا علامت کی صورت میں، سورج سے قریبی شے سمجھی ہے۔ اور یہ بھی کہ سورج صرف ایک مخصوص انداز زندگی سے نظم یا از مندر وسطی کی حسیات میں نہیں کرتا، یہ شاعری کی تخلیق میں، اس کے ادا کرنے میں بلکہ اس مرکز سے میں داخل ہو جاتا ہے جس سے وہ خیر وجود پاتا ہے، جس کو ہم نظم کہتے ہیں۔

یہ سراسر غلطی ہوگی اگر ہم یہ کہیں کہ یہاں سوال خاص فکر کی طرف رجعت کا ہے۔ پیکر کا مشاہدہ جیسے کہ مغرب نے میں ورثے میں دیا ہے، ایک مسلسل اسباب کا عمل ہوتا ہے جو تین یا چار سالوں کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ تین یا چار سال بچے ہی ہوتے ہیں جن میں کسی بھی قیمت پر تمام بے قاعدہ موزوں داخل دینا کی مناسب سمجھا جاتا تھا۔ فی زمانہ یہ سب کچھ ناقابل تصور ہے۔ میں بیان میں وہ پہلا شخص تھا جس نے وہ سارے مسئلے توڑ ڈالے ہیں۔

میں، ابتدا میں خفیہ طور پر مگر بعد میں نیا دوشعور کی طور پر تعمیراتی منصوبے کے تناظر میں بدستے ہوئے، قوت کی تہذیب اور تہذیب میں دلچسپی سے رہا تھا۔ یہ شعور کی نہیں کہ اس کے ادراک کے لیے ہم کو ہر گواہ کی حکمت کی طرف رجوع کرنا پڑے جنہوں نے تہذیب و ادب میں عقل و دانش کی دیو کی کے معبد تعمیر کیے تھے۔ یہی کافی ہے کہ ہم ہر موقع پر صرف اپنے معمولی شکاات اور عام سے معبد خانے و سے معماروں کی قہمی مہارت کو استعمال کریں، ان کے بتائے ہوئے حل پر عمل کریں۔ وہ حل جو عملی بھی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ خوب صورت بھی، ایسے کران کو۔ کیر Le Corbusier بھی تعریف کرانے در تعظیم کے لیے جھٹک جائے۔

شاید وہی جہت تھی جو مجھ میں ایک دم پیدار ہوئی اور یہی دارمجھے Axion Est کی عظیم تخلیق کا سامنا کرنا پڑا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ اپنے کام کو کسی عاقبتی شان مل جیسا مناسب اور تصور دینے بشیر و عظمت و استحکام حاصل نہیں کیا جاسکتا، جس کی خواہش کر رہا تھا۔

میں نے Pindar پر بارشعفی Ramanos Melecos کی مثال سامنے رکھی، جس نے اپنی ہر شاعری نظم اور گائیکی جانے والی مناجات میں ہر موقع کے لیے ایک نیا انداز ایجاد کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ منہجوں کے مخصوص عناصر کی وقفہ وقفہ سے متعین شد و گہرا بننے میری تعلقات کو وہ کثیر البہمی و درخشاں جویر عہد کہ جو کہ میرا منصوبہ تھا۔

مگر یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ ایک نظم، اطراف گھومنے والے عناصر کی کشش عقل کے ذریعے میں آکر ایک چھوٹے سے سورج کا ہیکرا تیار کرتی ہے۔ میرے خیال میں ایسی عمل مطابقت ہی، جو منصوبہ مواد کے استعمال سے مجھے حاصل ہوئی، ایک شاعر کا عظیم الشان منصوبہ ہوتی ہے۔

جتنے بغیر سورج کو جتنی پر رخصت اور اس کو ایک مشعل کی مانند چھپے آنے والے کے حوالے کرنا ایک ہر دائیگر، مگر میرے نزدیک بامرکت عمل ہوتا ہے۔ میں اس کی ضرورت دیتی ہے۔ ایک دن یہاں ہوگا کہ سورج جیسی روشنی میں غمرانی شعور کے مقابل تمام سترندہ ہی عقائد و تخیل ہو کر غائب ہو جائیں گے جو انسانوں کو زنجیر کیے ہوئے ہیں اور ان عظیموں اور جزئیات کے۔ نا طلب پر نظر انداز ہوگا۔

اسحاق باشیویز سگر

اعترافِ کتاب۔ اسی کے یہودی پیش کشاقتی مکتوبوں سے نچوڑے جذباتی اور پائیدار بیانات کے لیے جس کے ذریعے وہ عالم گیر انسانی حالت کو پیش کرتا ہے۔

”زمین اور آسمان دونوں اس سازش میں مصروف ہیں کہ عام موجودات کی ہر شے کو خاک میں ملا جائے۔ محرقہ دی جو عام ہوش میں شباب دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ماضی کے سب سے کوحال میں تبدیل کر سکتے ہیں، کچھ دعاؤں سے پرہیز بھی کر سکتے ہیں اور جاں بھی دے سکتے ہیں۔“ سگر کے افسانوں کے مجموعے (1961) The Spinoza of Market Street کی یہ عبارت اس کی اندرست بیانی اور شہدائے کے مچنے کے انداز کے بارے میں بہت چوتھی ہے۔

سگر شرقی پلینڈ کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوئے اور، دنا کے مادری یہودیوں کی آبادی میں یہاں چڑھل اس کا باپ ایک یہودی تھا اور یہودیوں کے ایک مذہبی مدرسے میں معلم تھا۔ پیدائش (Yiddish) اس کی مادری زبان تھی جو جرمن اور روسی (Slavic) زبانوں کے امتداد سے لے کر یمنی اور شرقی یورپ کے یہودیوں میں مانج تھی۔ یہ زبان و ماضی یہودی دادیوں مانجوں کی زبان تھی جو بیکروں ہنس کی لوت اور پرتی بنجوں، حکمتوں، توہم پرستیوں، حکمتوں و غیرہ سے مال مال تھی۔ اس کا باپ ایک سوائی ہونے کی وجہ سے یہودی تصوف اور تھ نظریہ بھی قوانین کا سرور تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ مشرقی یورپ کے ممالک میں، جنوب اور غریب دونوں طرح کے یہودی بستے تھے۔ مگر وقت کے ساتھ دور ماسیوں کے بہیمانہ ظلم کی وجہ سے ان کی بستیوں کا رخنہ ہو کر دیوانے میں بدل چکی تھیں، ان میں تھا کہ اس نے گئی تھی۔ مگر ان بستیوں کی ساری گہما گہمی اپنی تمام جلوہ سمانیوں اور مادی تعلقاتی نامواریوں کے ساتھ سنگر کی جاگتی آنکھوں دیکھے ہوئے خوابوں میں، اس کی تحریروں میں، بغیر کسی رنگ کی ملامت کے زندہ اور دھڑکتی دھاتی دھاتی ہیں۔ سراسیمہ خیال اور حقیقتیں اپنے روپ بدل بدل کر سامنے آتی ہیں۔ سنگر کا جہول اور تمثیل انگیز طرز نگاہ حقیقت کا روپ دھاتا ہے اور حقیقت خواب اور تصورات سے بند ہو کر اس مافوق الفطرت کیفیت میں داخل ہو جاتی ہے جہاں کچھ ممکن نہیں اور وہی چیز بھی یقینی نہیں ہوتی۔

سنگر نے پولینڈ کے دارالحکومت وارسا میں اپنا تخلیقی سفر دونوں مادی جگہوں کے درمیان کے عرصے میں شروع کیا۔ لہذا یہ، حول سے پہلے در انگریزوں کے ہوئے تخلیقی مسائل، وہ دس تیرہویں اور آدھارہاں کا باعث ہو رہے تھے جس میں سنگر نے ہوش سنبھالا تھا۔ مذہب اور تہذیب، دنیاوی اور دینی، کا تضاد، آزاد خیالی اور شک و شبہ کے مابین آدھارہاں ہی سنگر کی کہانیوں اور مادیوں کی خصوصیات ہیں۔ دوسرے بہت سے مخصوصات کے ساتھ یہ سب بھی سنگر کے مادیوں Family Moske اور The Manor and The Estate میں کا فر، ملتے ہیں۔ نئے زمانے کے دباؤ اور گوں اثرات کی وجہ سے تخلیقی اور ادبی خیالات پر یہودی خاندان کس طرح مکھڑے ہیں، اس کی حیرت انگیز متعدد کثیف سنگر کی ان پوٹا اور جامع تحقیقات میں کوئی کمی ہے۔ ان مادیوں میں مصنف کے بے پناہ نفسی وابہوں اور حس ادراک نے ایک خود مختار زندہ نگارشی شکلوں سے بنے یوں (Liquor) کا نام خود تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔

سنگر کی ابتدائی تصوراتی تحقیقات بارے میں نہیں بلکہ چھوٹی اور نسبتاً طویل کہانیاں تھیں۔ اس کا ادب 1935ء میں اس وقت شائع ہوا جب ماسیوں کی دہشت کے خطرات بڑھ رہے تھے اور سنگر اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر امریکا میں آ رہے تھے۔ وہاں اپنی آخری ماسیوں تک مقرر رہا۔ اس ادب میں سنگر نے اس موضوع کو بڑے اہتمام سے برتا ہے جو دوبار اس کی تحقیقات میں سر بھانا نظر آتا ہے۔ وہاں نہ کسی کا مذہب نہ جات نہ مذہب کا ظہور، اس کا لوگوں کو بھانسنے کا فن اور تخلیقی کامیابی، اس کے مرد و جذباتی بیگانہ میں جکر مجھے کا اکتھا ہونا، اس کا نڈال و سرسے فریب نظر کا راز مکی میں ہیں چھ اور لوگوں کا کتا بے کی صورت میں نئے فریب نظر میں جکر ہونا وغیرہ۔ Satan in Goray کا زمانہ سترہویں صدی میں جنوبی روس کے قزاقوں (Cossack) کے ہاتھوں ظلم و تاراج اور یہودیوں کے قتل عام کے بعد کا ہے۔ یہ کتاب مستقبل کے مہینے میں دیکھنے کی کوشش کرتی ہے کہ حیدر کیا ہونے والا ہے۔ یہ مظلومین نہ ہونگے اچھے ہیں نہ ہونگے خراب، ان کو ایسے ظلم و طریقوں سے برا کر دیا جاتا ہے جن پر ان کا بس نہیں چل سکتا وغیرہ۔ یعنی سب کچھ اچھوتی ہے مگر حقیقت سے بہت فریب۔

اسانیت اس کے جذبات اور اس کی بھی کھد قوت انراک کے بارے میں سنگر کا اپنا ایک مخصوص

انداز نظر ہے۔ اس کے نزدیک انسان متذبذب، بے پرواہی کے خیز و سبے بھی ہیں اور مغرب اور اشتعال دلائے وانی تخلیقی قوت رکھنے والے بھی۔ انسان کے دلوں کے طرح طرح کے ہو سکتے ہیں، کبھی جنسی اور کبھی خواب ناک اور کبھی مستقبل کے دھندلکوں میں بھلا کئے والے۔

منگرنے اپنے فلسفوں، ٹیویٹس، کہشیں اور ماووس میں اپنی صدا حیت کا لوبا مثلاً وہ ہے اور اپنے انداز تخلیق کے ذریعہ خود کو اپنے دور کے کھس اور نئی طرز کے کامیاب داستانوں صورت میں پیش کیا ہے۔ منگرنے کچھوں کے قریب کتابیں تصنیف کیں۔ اس نے اپنے امریکا کے قیام کے دوران 1991 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

جذبات قلب، توجہ دہانی، شائمی، خواتین و حضرات

لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ ”تم ایک مرقی ہوئی زبان میں کیوں لکھتے ہو؟“ میں اس کا جواب چند لفظوں میں دینا چاہتا ہوں۔

کئی بات تو یہ ہے کہ میں بھوت پرست کی کہانیاں لکھتا ہوں جن کے لیے مرقی ہوئی زبان سے بہتر کوئی زبان نہیں۔ مرقی ہوئی بھوت پرست اسے ہی زندہ ہوں گے۔ بھوت پرست بدش زبان کو پسند کرتے ہیں، اور جہاں تک میں چاہتا ہوں، وہ سب ہی زبان بولتے بھی ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ نہ صرف میں بھوت پرست پر یقین رکھتا ہوں، میں دوسرے پر بھی یقین رکھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن لاکھوں بدش زبان لکھنے والی کتابیں اپنی قبروں سے چند ہوں گی اور ان کا پیدا سوال ہوگا، ”کیا پڑھنے کے لیے بدش زبان کی کوئی کتاب موجود ہے؟“ ان کے نزدیک بدش زبان مردہ نہیں ہوگی۔

تیسری بات، کہ وہ خرابیوں سے عمرانی زبان مردہ بھی جاتی رہی ہے مگر اچانک، حیرت انگیز طور پر زندہ ہو گئی ہے۔ جو عراقی زبان کے ساتھ ہو ہے وہی ایک دن بدش زبان کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے، (حالاں کہ مجھے ذرا بھی علم نہیں کہ یہ ججزہ کیسے ہوگا)۔

ایک چوتھی اور معمولی وجہ بھی ہے، کہ بدش زبان کو فراموش نہیں کیا جانا چاہیے۔ بدش مرقی ہوئی زبان ہو سکتی ہے مگر یہ واحد زبان ہے جسے میں ابھی طرح جانتا ہوں۔ بدش میری مادری زبان ہے اور آج تک

ماں بھی نہیں مرنی۔

فنا تھیں حضرات! میرے پاس پہنچے سو زجرات میں جن کی بنا پر میں نے بچوں کے لیے کھانا شروع کیا ہے، مگر وقت کی کمی کی بنا پر میں صرف دس وجوہات بیان کروں گا۔ (۱) بچے، بھرے نہیں، کتب پڑھتے ہیں، وہ تنقید پر شور نہیں کرتے۔ (۲) بچے اپنی شناخت کی جدوجہد کے لیے نہیں پڑھا کرتے۔ (۳) وہ اپنے خدو سے جان چھڑانے کے لیے، بعد از موت کی عیسائی بھانڈے کے لیے، وادے لگاتی سے جان چھڑانے کے لیے نہیں پڑھتے۔ (۴) ان کو نظم انگیزیت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ (۵) وہ ساجیات سے بے حد نفرت کرتے ہیں۔ (۶) وہ کالک یا Finnegans Wake (جیمز جوائس کی ٹھوٹیل حزن پر نظم۔ مترجم) کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ (۷) وہ ب بھی خدا، خدائے مان، فطرتوں، مسکات، صرحت، بیان کے زمان و فکوں و اسکی تمام فرسودہ چیزوں پر یقین رکھتے ہیں۔ (۸) وہ دلچسپ کہانیاں کو پسند کرتے ہیں، عاشقیوں، شرمیلوں اور توجہ کی بیانات کو نہیں۔ (۹) جب کوئی کتاب اسکا پتہ دیتی ہو تو یہ کسی شرم، حجب اور خوف کے، وہ کھٹے ہندس جھانپتے ہیں۔ (۱۰) وہ اپنے پسندیدہ گھمے والے سے سناہت کو نہات دینے کی توقع نہیں کرتے۔ رتبہ داغ لوگ ہی ایسے پکنا نہ فریب نظر کے حامل ہوتے ہیں۔

خطبہ

”اے دور کا داستان گو اور شاعر بلاشبہ، دوسرے زمانوں کی طرح، صحیح معنوں میں جذلوں کے پہاڑ بنے والا ہوگا، نہ کہ مہاتمی و سیاہی تصویرت کا منہ۔“ اس کے ہونے کا زمین کے لیے کوئی جنت نہیں، نہ ہی ماگارا و ادب کی تخلیق کے لیے یہ کافی رہا، نہ جو نہ قابل کو قریب دے، نہ ابھارے، نہ اسے کوئی خوشی پہنچا کرے، نہ ان کے لیے اسے کوئی مایوس و فراہم کرے، جو ہمیشہ حقیقی فن کیا کرتا ہے۔ اس کے ہر جود پر بھی نچ سے کہ ہمارے عہد کا عجیبہ لکھنے والے اپنی نسل کے مسائل کے بارے میں گہرے فکر کا شکار ضرور ہوگا، وہ صرف دیکھ سکتا ہے کہ پسے کے مقابلے میں آج مذہب کی قوت پر، بالخصوص اللہ پر، ایمان کمزور رہتا جا رہا ہے جتنا کہ انسانیت کے کسی عہد ماضی میں کہیں نہیں تھا۔ آج نیا وہ ترجمے خدا پر ایمان کے بغیر کئی بڑے مہرے ہیں، ثواب و عذاب پر یقین نہیں رکھتے، نہ موت کی جانوائی پر نہ ہی اخلاقیات کے جو نذر پر۔ حقیقی دہش اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کر سکتا کہ خدا ان اپنی روحانی بنیاد کھٹا جا رہا ہے۔ ظاہری عالم جگہ کے بعد سے سوالیہ چھنگرن پر آرزو بخش بنی حقیقت کا روپ دھارتی جا رہی ہے۔ کوئی بھی غلطی کامیابی جود و دور کے انسان کی مایوسیوں کی اس کی تباہیوں کی اس کے احساس کمتری کی جگہ کے، انقلاب کے اور دہشت گردی

کے خوف میں تخیف نہیں کر سکتی۔ نہ صرف یہ کہ مالِ عدنی پر بلکہ انسان پر بھی وہاں کے کاروانوں اور کچھ اپنے فکر میں پر سے بھی ہماری نسل کا ان کا جانا رہا ہے۔

وہ لوگ جن کو مایوسی کے عالم میں اپنے ساتھیوں کے رنج و غم پر ہر سانس نہیں رہتا ہے، الفاظ کے جاکھیں، دیکھنے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ ان واقعات کے خلاف امیدیں باندھ لیتے ہیں کہ کوئی میں موجود ہوں اور اس کی حساسیت شاید تہذیب کا نور سے نکال لے گی۔ شاید قیاس کا میں قلمبرائی کوئی چنگاری موجود ہو۔

ان لوگوں کی اول رہوتے ہوئے جن کو انسان کے پاگل پن نے شدید رنج لگائے ہیں، مجھے مستقبل کے خیرات کے بارے میں بھیجیوں سے سوچنا ہوگا۔ کئی بار میں اس مشکل سے نکلنے کے لیے قوی بھی راستہ تلاش کرنے میں ناکامی پر بدلی ہوا ہوں۔ مگر ہمیشہ ایک ہی میدان یہ کہہ کر لکھنے والا اس دیکھ موجود ہوتی ہے کہ ابھی وہ نہیں ہوئی ہے اور ہم کو حالات کا جائزہ لے کر ٹھیکہ کرنا چاہیے۔ میں آزدیوں کو رکھنے والے ماحول کی پیداوار ہوں۔ اگرچہ میرے قلب میں ہر الفاظ کے بارے میں شبہات پیدا ہو گئے ہیں، مگر میں اس خیال سے کبھی انکسار نہیں کر سکتا کہ یہ کائنات طبعیاتی یا کیمیائی حادثہ ہے، ایک غیر مرئی ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ میں انسان کے دماغ کے پیدا کردہ جمیٹ، ازکار رفتہ قوال، اور اسٹام پرستیوں کو پہچان لینے کا طریقہ نیکو نہیں ہوں، میں اب بھی کچھ سچ نہیں سے پتا ہوا ہوں، میرے خیال میں جنمیں ہم سب ایک دن قبول کر لیں گے۔ یہ کوئی طریقہ ضرور ہوگا جس کے ذریعے انسان تمام سرگرمی، تمام حاکمیت، جوہریت اس کو عن کر سکتی ہو، حاصل کرنے کے باوجود بھی خدا کی بندگی کر سکتا ہے، اس خدا کی جو الفاظ کے ذریعے نہیں، عمل کے ذریعے بکھ کر رہا ہے اور کائنات جس کی تخلیق ہے۔

مجھے یہ مان لینے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اس سراپ خیال کے پیچھے بھاگتے رہے ہیں کہ ادب سننے، قیاس اور سنے کا نظریہ پیدا کر سکتا ہے، نفسیات، مذہبی و سماجی قوتیں کہ سماجی۔ قدیم یہودی ادب کی تاریخ میں شاعر اور پیغمبر کے درمیان کوئی جلیاں فرق نہیں رہا ہے۔ اکثر یہودی قدیم شاعری قانون اور مذہبی گزارے کا طریقہ بنتی ہے۔

یہودی اخبار Forward کے بچے کے قریب چھائے خانے میں بیٹھنے والے کچھ دوست مجھے قوی اور انحصار پذیر کہتے ہیں مگر سچ پوچھیے تو اس قسم کے عمل بہت دوری کے عقب میں کوئی بڑی پس منظر ہو سکتا ہے۔ میں روس، ورسن، ایڈریلین پو اور اسٹریڈ برگ جیسے قوی لوگوں کی صحبت میں راحت محسوس کرتا ہوں۔ نفسیاتی تحقیق میں میری ٹیپوڈی نے مجھے آپ کے ملک کے صوفی مغز سوئڈن بورگ اور ہمارے اپنے مریضی محنت ماسکووی کے دامن میں سکون تلاش کرنے کا موقع فراہم کیا ہے، اس طرح میرے اپنے دور کے بڑے شاعر اور میرے دوست مارٹن زائینس میں بھی، چند برس قبل ہی جن کا انتقال ہوا ہے اور جو اپنے پیچھے اعلیٰ درجے کا ادبی ماثرت چھوڑ گئے ہیں جس کا بیشتر حصہ پیدائش نبون میں ہے۔

کسی تحقیق کا یہی قیاسیت انحصار پذیر کی نہیں بلکہ یہ انسان کی طاقت و عقلانی ہوتی ہے۔ جب شاعر

بچے کلام سے قاری کا دل بہلا رہا ہوتا ہے، اسی لمحہ وہ وجود سے متعلق ازل صدقوں کی تلاش میں بھی ہوتا ہے۔ اپنے مخصوص مہر میں وہ وقت اور تیرہ فی کی گتھی کو بھی سمجھا رہا ہوتا ہے تا کہ انسانیت کے دھنوں کا جواب حاصل ہو سکے اور غلو کا انصافی کے قعر بذلت ہی میں سے محبت کے جذبے کو افشا کیا جاسکے۔ یہ بات آپ کو عجیب ضرور لگے گی مگر میں اکثر یہ سوچتا رہتا ہوں کہ جب ساری ساری کھپات و جسمہ چکی ہوں گی اور جنگیں اور انتخابات انسان کا مکمل داسیوں میں ڈھیل رہ گئے ہوں گے، اس وقت شاعر ہی، جس کو لفظوں نے اپنی جمہوریہ میں پابند کر دیا تھا، اٹھ کر ہم سب کو بہارا دے گا۔

یہ عظیم عزت جو سینڈش، کائی نے مجھ و عوا کی ہے یڈش زبان کی قدر شناسی بھی ہے، جلد وطنی کی زبان، جس کی سرحدیں نہیں ہوتیں، کوئی حکومت جس کی امداد نہیں پہنچتی، ایسی زبان جو اچھیاں گلے بڑھانے والی مفتوں، جنگی حکمت عملی وغیرہ کے لیے غلط نہیں رکھتی، ایک زبان جس کو غیر یہودیوں نے، اور سیاہی و سفیدی کے طور پر آزادی دیوں نے بھی حقیر سمجھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جو کچھ بھی عظیم مذاہب نے سمجھا تھا، اس میں مادہ ملحقوں کے یڈش و لٹو لوں نے ہی صحیح و شامان کی چیرائی کی ہے۔ یہی وہ لوگ تھے جن کو صحیح معنوں میں ہل کتاب سمجھا جاسکتا ہے۔ انھیں تو رات، ناموں، Mussar، اور کہنا (تفسیر کے نظام تفسیر) جیسے تعینات کے ذریعے انسانیت کے مطالعے اور ان کی ریشوں کے بارے میں علم کے حصول سے بے ہنوں سرسبز ہوتی تھی۔ اس مادہ علاقے صرف وہی ہوتی تھیں۔ ہی کے لیے نہیں بلکہ امن میں تجربات، ضبط نفس اور انسانیت کی جڑ تھے۔ لہذا، وہ وجود تمام مظالم کے جوان بوز لٹے میں لیے ہوتے ہیں، انھوں نے جھوٹے نہیں ڈالے ہیں۔ میں ان لوگوں کے درمیان پر و ن چاہتا تھا، اور ان کی Krochmana Street میں پر میرے والد کا مکان ایک مستطیل گاہ، انصاف کی عدالت عبادت گاہ، داستان گوئی کا، زردی کا، درختوں، سب کچھ کا مرکز تھا۔ میں نے اپنے اقامت گاہیت میں اپنے بڑے بھائی اور استاد آئی جے سنگر کے، جنھوں نے بعد میں The Brothers Ashkenazi تصنیف کی تھی، اور Spinoza سے Max Nordau تک جیسے شخصیت پسندوں کے درمیان مذہب کے مخالف مذاکرے کیے تھے۔ میں نے بنے والدین کی نہائی وہ تمام جملات سنے ہیں جو ان لوگوں کو دیے جاتے تھے جو خدا پر جان اور حق کی تلاش میں کیے جانے والے سوالات پر دیے جاتے تھے۔ ہرے گھر میں، اور بہت سے گھروں میں بھی ایسی سوالات، یڈش اخباروں کے مقابلے میں زیادہ حقیقی ہوتے تھے۔ اپنی تمام تر فصول زبانوں اور جملوں کے بارے میں یقین ہے کہ قومیں خود یہودیوں سے ان کے، ملازمین، اولاد کی تربیت اور چھان دھن کو صرف خستہ حالی اور مذہب کی نظر مافی ہودیوں سے خوشیاں حاصل کرنے کے طریقے کی طرح سمجھتی ہیں۔ میرے نزدیک یڈش زبان اور اس کے بولنے والوں کے طریقے ایک جیسے ہی ہیں۔ یڈش زبان اور یڈش جذبات، دونوں میں متقیانہ سرگرمی کے تعلق کی شہوت کے، مسیح کے انتظار کے، اور انسان کی انحرافیت کی تحسین کے اظہار رہتے ہیں۔ اس زبان میں مذہب و زندگی کا تقصیر، داسیائی کے ہر دیر سے اور محبت کے ہر معاہدے کے بارے میں

ایک خاموش مزاج کی کیفیت تھی ہے۔ پیدائش زہنیت میں گہر نہیں ملتا۔ یہ فتح کو اپنا حق نہیں سمجھتی۔ یہ چاہتے ہوئے بھی نہ تعلق کے خدائی منصوبے، ابھی ابتدائی منزلوں میں ہیں، اس میں بغیر کسی مطالبے کی حکمرانی کے کسی نہ کسی صورت حالات اور مسائل سے بچ سکتے اور تباہیوں کی طاقت کو تھکائی دے کر کھل جانے کے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔

کچھ لوگ پیدائش کا ایک مرد دنیا تک پہنچتے ہیں۔ مگر ایسا تو عبرانی کو بھی دو ہزار سال تک کہا گیا تھا اور اس (عبرانی زبان) کو بجز انہی طور پر دوبارہ زندہ کر دیا گیا ہے۔ ساری بشریت ایک مراد زبان تھی مگر اس سے اس نے دوسرے کی صوفیانہ حقیقتات وجود میں آئیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پیدائش کی کلاسیکی حقیقتات جدید عبرانی زبان کی بھی کلاسیک گردانی جاتی ہیں۔ پیدائش ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اس میں وہ خزانے چھپے ہوئے ہیں جو دنیا کی نظروں کے سامنے نہیں آئے ہیں۔ یہ شہیدوں اور صوفیوں کی، خواب دیکھنے والوں کی اور مزیوں (Cabalers) کی نہایت تھی، مزاج اور ان پادوں سے مالا مال۔ انسانیت انھیں کبھی خاموش نہیں کر سکتی۔ ایک طریقہ کے تمثیلی تجربے میں، پیدائش ہم سب کی عقل اور احساس کی موت ہے، جو خوف زدہ اور پشامید انسانیت کی خالص اصطلاح ہے۔



ہستی البکر اندر ہے

اعترافِ کمال۔ اس پرنسپل شاعرانہ تخلیق کے لیے جو کائنات اور سو جودہ کائنات میں انسان کی صورتِ حال کو اجاگر کرتی ہے اور ساتھ ہی جھٹوں کے درمیان ہسپ نوئی ہسپ کی روایات کے دھبے کو ترجمانی کرتی ہے۔

جب آئینہ اندر سے کی نقشب کا پسند مجموعہ Ambro شائع ہوا اس وقت ہی اس کا ہسپانیہ کے چوٹی کے ان شعراء سے قریبی تعلق استوار ہو چکا تھا جنہوں نے ہسپ نوئی زبان کے ادب کو سب سے پہلے پہنچایا ہے جس کو "دوسرے مہذبوں" کا مدعا دیا ہے۔ شاعری، جو ہر اور طریقہ نگار کے حوالے سے اس سرگرم عمل جتنے نے ہسپ نوئی ادب کو اپنی سمجھ میں جو فرانسیسی ادب کے لکھنے والوں نے تحت اشعوریت کی تحریک کے ذریعے پیش کیا تھا۔ قدیم جزیرہ نمائے "انہیرا" کے (جس میں ہسپانیہ اور پرتگال شامل ہیں۔ مترجم) ادبی حلقوں نے اپنی اشعوریت قائم رکھنے کے لیے فرانس اور سپین درمیان ایک خطِ تفریق کھینچ رکھا تھا۔ وہ اگرچہ رشتوں کے ذریعے ایک دوسرے سے قریب تھے مگر فرانس کی جنوبی سرحد کے اس پار وہ اپنے طرزِ تحریر کی پہچان سمجھ اور نام، انتہا پسندی اور تکلف و غیرہ سے بنا چاہتے تھے۔ مگر ہوا یہ کہ دونوں تحریکوں کی گہما گہمی یگانہ نہ تھی کی وجہ سے ہسپ نوئی ادب بھی فرانسیسی تحت اشعوریت ہی کے نام سے پہچانا جانے لگا مگر اس کو پرزور نے فرانسیسی تحت اشعوریت کو جسے اب تک کوئی شاعر نہیں لکھا تھا، آئینہ اندر سے جیسا اعلیٰ مرتبے کا شاعر دکھایا۔

ایکرو اندر سے پیسے فرمیں تخت اشعوریت صرف نثر نگاروں کے در سے زندہ اور قائم تھی۔

ہسپ نوکی اور فرامیسی ادیبوں کے دمیون مکی سرحدوں کے حوالے سے جو وہ مناسبت جاری تھا اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ہسپ نوکی دھب اپنی تحریک کو نہ صرف مختلف نقطہ آغاز سے مسلک جانتے تھے بلکہ اس کو ایک منحرف ماہ سے وابستہ سمجھتے تھے۔ اپنے لٹریٹ کے باوجود ہسپ نوکی دستان کے ادیب بھی، فرامیسی ادیبوں کی طرح، پرکلف، آرائشی نقش گری اور غیر معتدل اشاراتی طریقہ کا استعمال کرتے تھے۔

پختہ کاروں ایکرو اندر سے شاعری کی کوئی مخصوص صفت نہیں تھی۔ گھر اس کا فن ہر وقت تجدیہ کے عمل سے بڑھتا رہتا تھا۔ اس نے ایک قلمی عرصے میں اس فن میں اپنا مقام بنایا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ مستحکم ہوتا گیا۔ اس کی شاہکار کتابوں The Last، The Shadow of Paradise، Destruction of Love، Birth کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اس کا مقام بلند بھی ہوتا گیا، بالخصوص In a Vast Dominion کے بعد جو اس کی ایک اہم تخلیق تھی۔

ایسا کوئی طریقہ کار یا پیمانہ نہیں جس کے وسیلے موضوعات و وقت کے اعتبار سے، ایکرو اندر سے کی شاعری کے مسلسل ارتقا کو پایا جاسکے۔ اس کے باب ایک کیفیت جو تسلسل سے متنی ہے وہ زندگی کے لیے نہ ختم ہونے والی جدوجہد ہے۔ یہ اس کی اپنی زندگی اور ذاتی تجربات سے بھی عبارت ہے جو نگاروں سے زندگی رہی ہے۔ نئی شاعری کی ابتدا سے تین سال قبل 1925 میں ایکرو اندر سے اردو کے تقریباً قابلِ علاج عارضے میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے پچھتر عرصے کے لیے وہ باقوت و متر پر رہا، پھر ٹیپو واپس پڑا۔ پھر یوں ہوا کہ ہسپ نیو کی خانہ جنگی شریعت ہوئی اور وہ متر پر بیٹے بنے دھماکوں کی آواز میں سنتا رہتا۔ جنگ کے ختم ہوتے ہی اس کے نیا وہ تر سر تھی جلا وطن ہو گئے مگر یہ اپنی ماضی اور بیکاری کی وجہ سے ملک ہی میں رہ گیا۔ ایکرو اندر سے وقتی طور پر ہسپ نیو کے آمر حکمران جنرل فرنگوں کے جامہ دار دور کی مشکلات سبوتا رہا مگر اس نے ہار نہ مانی اور حسبِ مقدر چنے ملک کی آزادی کی روح کے طور پر متحرک رہا۔ نیمف عمر مستعد، مختصر عمر اور مثالی رہنمائی طرے نیکو اندر سے اپنی تحریروں میں بھی مشغول سے صبر آزمائی اور نئے انداز انجہار کے جوا رہنے کی قوت کا مظاہرہ کرتا رہا۔ اس کی تخلیق کا سرچشمہ کبھی شک نہیں ہو گا۔ اس نے ماضی ایکرو اندر سے سے نیا وہ کثرت و قلب و نظر کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی۔

ایکرو اندر سے 1898 میں ہسپ نیو کے شہر سیلور میں پیدا ہو۔ اس کا بچپن ملنگا کے ساحلی علاقے میں گزارا تھا مگر 1909 سے وہ ملنگا مت میڈل میں سکونت پزیر ہو گیا۔ اس نے میڈل پڑھائی اور میڈل بورڈ سکول جی اکنامکس میں قانون کی تعلیم حاصل کی۔ 1925 سے اس نے کل وقتی طور پر ادیب سے وابستگی اختیار کر لی۔ 1928 میں اس کی نغموں کا پہلا مجموعہ Ambie شائع ہو۔ اس کے بعد سے اس نے متعدد کتابیں لکھیں اور شائع کیں۔ ایکرو اندر سے کو 1933 میں اس کی کتاب Destruction of Love پر ہسپ نیو کا قومی ادبی انعام دیا گیا۔ اس کے بعد سے اس کو بہت سے اعزازات اور انعامات دیے گئے۔

بسنے البکر اندایہ نے 1984 میں دہلی میں کو ایک کجاخراچ بھی اس کے کام کے ساتھ اس کا نام بھی ہسپانیہ کی ادبی تاریخ پر علی حروف میں مرقوم ہے۔

خطبہ

ایسے وقت میں، جو کسی ادیب کی زندگی کا بہترین لمحہ ہوتا ہے، شدید جذبات پر قادر و شمع المذہق ہر دے، میں جن پر قدرت حاصل کر سکتا ہوں، اور ان جذبات کے ساتھ جو پسے لحاظ میں انسان پر طاری ہوتے ہیں، ایسے موقع پر آج میں جس سے بوجہ رہوں، سچے بے دیاں قہر کا غلبہ رکھتا ہوں۔ میں ایک دو میاں درجے کے خاندان میں پیدا ہوا تھا مگر مجھے خصوصیت کے ساتھ شادی اور آزاد خیال نقطہ نگاہ کے حامل، حول کی نعت نصیب ہوئی۔ میرے سہ ماہی صفت چڑیوں نے مجھے متضاد پیشوں کی طرف راغب کیا۔ میں قومیت تھوڑے کا ستارہ، ایک ریوے کھانی میں موزمت کی راہ، ایوانی معاملات کا سماجی بھی بنا۔ انا، شباب کی سے میری سہ ماہی شخصیت نے، جس کا میں ذکر کر چکا ہوں، مجھے ایک ٹھوس مسرت سے آشنا کیا۔ یعنی مطالعے اور وقت کی مطابقت سے تحریر۔ مگر وہی کی عمر میں اس فوٹو نے پسے پہلے خفیہ طور پر زندگی کی اونچ نیچ کے عظم کے چھ، اشعار تھیں شروع کیے۔ چوں کہ اس وقت تک اسے صحیح طور نصیب نہیں ہوا تھا میں ان کوششوں کو ہم جونی اور ہڈ جوشی کی پر محسوس کر سکوں گا۔ میرے مفکر راہ اس کی سمت کے تھیں میں میری جسمانی کم زوریوں کا بڑا دخل رہا۔ مجھے ایک عرصے میں ہارنہ راج ہو گیا تھا جس کی وجہ سے مجھے اپنی دوسری تمام مصروفیات ترک کرنی پڑیں، جنہیں میں جسمانی ہی کہنے پر استغاثوں گا، اور مجھے متناقض علاقے میں سکونت اختیار کرنی پڑی۔ اس طرح پیدا ہونے والے علاقے میں ایک اور سرگرمی داخل ہوئی جس کے لیے جسمانی قوت کا استعمال درکار نہیں ہوتا، اور جو طالبوں کے فکرم کے مطابق ہے جانے والی اعتراضات میں عمل نہیں ہوتا تھا۔ یہ ناقابل فراموش، مغلوب گرینے والے تجربے سے متعلق تھا۔ یعنی شاعری نے اس علاقے میں میرے مقابلے میں نے پورے شہرک سے کھنڈ شروع کر دیا، اور اس وقت، صرف اسی وقت سے، مجھ پر یہ آئینہ سار ہو گیا جس نے کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔

گھنٹوں کی خلوت، گھنٹوں کی جمیشتی پوشش اور گھنٹوں کا استغراق۔ خلوت اور استغراق نے مجھے ایک طرح کی آگاہی سے، ایک نوعیت کے ناظر سے آشنا کیا، جو میں نے کبھی نہیں سمجھا، بالخصوص تو انسانیت سے مکمل اشتراک۔ اس وقت سے آج تک میں نے ہمیشہ عدالت میں ہے کہ صحیح معنوں میں، شاعری ہی میر

فریجہ ایک ہے۔

شاعری ان سوالات کا مدللہ ہوتی ہے جو شاعر مسلسل اٹھاتا رہتا ہے۔ نظم، مسموع، ایک مثالیہ، ایک احساس، ایک انتفسار ہوتی ہے جس کا جواب حماقت اور غصہ ہوتا ہے نگر مسلسل ہوتا ہے جو قاری اپنے مطالعے کے دوران دہتا رہتا ہے۔ یہ ایک لطیف نگاہ ہوتا ہے جس میں شاعر سوالات اٹھاتا جاتا ہے اور قاری ان کے عمل جوالات خاصوٹتا رہتا جاتا ہے۔

کاش میں ایسے مناسب الفاظ تلاش کر سکتا جن کی مدد سے یہ قاسم کا کہہ سکا کہ کسی شاعر کے لیے تو نیک ندامت کا معنی رکھتا ہے۔ یہ ممکن نہیں۔ میں صرف آپ کو تقاضا کرتا ہوں کہ میں اپنے جسم اور اپنی روح سمیت آپ کے سامنے ہوں اور یہ بھی کہ نیک ندامت کے معنی میں وہی جواب ہے، جو نہ بتا رہا ہے، نہ غصہ ہے، نہ شک ہے، نہ حسد ہے، نہ اچانک ہے اور اس آواز جیسا ہے جو فرات دریا سے اور بحرِ مدیترہ پر آتی ہے اور خون بھی نہ رکنے والے اُن سداوت کا جواب بن جاتی ہے جو انسانیت سے کیے جاتے ہیں۔ لہذا اس اجتماعی اور مددگار آلے جانی گواہ کو میرا مؤید نہ سلام جس کو اپنے تمام تر روحانی محسوسات کے ساتھ شئے میں سوینڈش اکادمی نے میری سجدت کی ہے اور میں اس مقام سے علی الاعلان اس کا بڑے خلوص شکر ادا کرتا ہوں۔

ماتحتہ کی سادہ، میں سمجھتا ہوں کہ اس جیسا انعام جو میں آج حاصل کر رہا ہوں، بلاشبہ ہر صورت میں ایک انعام ہے جو ادب کی اس راجت کے لیے ہے جس نے، جہاں تک میرا معاملہ ہے، شاعر کو بنایا ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری یا فن بیشتر تمام روایات سے بالاتر ہوتے ہیں، اور ہر نکتہ والے فرد ان ہی روایات کی زندگی کا ایک فرد، یہ حلقہ ہوتا ہے جو یک نغمہ کے تجزیوں، انجھار کا باعث ہوتا ہے۔ اس کا جنرالی تصور ایک مختلف قسم کے استعارے کا استعمال ہوتا ہے، ہونا کہ وہ آنے والی نسلوں کو کسی زندہ و روشن مشعل تھا، جس کو مستقبل میں ایک مسلسل جدوجہد کو جاری رکھنا ہوتا ہے۔ ہم کہیں ایسے شاعر کا بھی تصور کر سکتے ہیں جو اعلیٰ ترین صلاحیتوں سمیت پیدا ہو، ہونا کہ وہ ایک رفیع و اعلیٰ تصور کا حامل ہونے کے مدد بہت کمزور شکل کی کچھ کرنے کے قابل نہ ہونے کا تا وقتے کہ اپنی خوش بختی سے وہ فن کے ایسے دھاروں میں بہنے کے جو وقت و درجہ ہیں اور قاتل، جہاز بھی۔ اس کے برعکس، میرے خیال میں ایک کم صلاحیت رکھنے والا شاعر ایک نیا وہ کامیاب کر رہا کر کے گا اگر خوش قسمتی سے وہ ایسے حقیقی، حلوں میں پے پڑھے جو واقعہ تخلیقی جو میرے مضمون اور زندہ و متحرک ہو۔ اس میں مہربان ستاروں کے زیر اثر پیدا ہو تھا۔ میری پیدائش سے قبل کافی عرصے تک، سپر نوقی تہذیب تھی جیہ جہاں سے نئے رنگیں تھیں جو کسی سے پوشیدہ نہیں۔

Galdós جیسے ماوس کا، Machado Unamuno, Juan Ramón Jiménez جیسے شعر اور ان سے پہلے Valle-Inclán جیسے فلسفی، Azorin اور Baroja جیسے نثر نگار، Valle-Inclán جیسے

Picasso اور Miró جیسے مصور، de Falla جیسے موسیقار وغیرہ ان بھی ہستیاں ہشت سادہ

کر کے بھی یوں ہی کیا نہیں ہو جاتیں، نہ ہی یہ لوگ اتفاق کی پیداوار تھے۔ میری نسل نے اس قسم کے ماحول سے، اس نتیجے سے، اس غیر معمولی زرخیز مٹی کے ٹھیلے، جن لوگوں کے بغیر ہم جس سے کوئی بھی کچھ نہ ہو سکتا، استفادہ کیا۔

اس قسم کی مسند نشینی سے، جہاں سے میں آپ لوگوں سے مخاطب ہو رہا ہوں، میری خواہش ہوئی کہ میں اپنے خطاب میں اس سرزمین کی زرخیز مٹی، پودا، اور اپنے ہم وطنوں کو بھی شامل کر لوں جنہوں نے وہ سرے عمدہ اور مختلف النوع طریقوں سے (سب فن کے ذریعے) مجھے اور میری نسل کے دوستوں کو بھی قائل بنایا کہ ہم ایسے مقدم پر پہنچ سکتے ہیں جہاں سے ہم اس سرزمین بات کر سکیں جو ہماری اور ہم سے مخصوص ہے۔

میری مراد صرف ان شخصیتوں سے نہیں جو ہمارے ذرا واسطہ زیادت کا حصہ ہیں، جو علم و ہنر ہوتی ہیں جو منظر نامے میں موجود ہوتی ہیں، وہ تاریخی حقیقت کی حامل ہوتی ہیں۔ میرا شمار اس روایت کی جانب بھی ہے، جسے کل کی بات کہا جاتا ہے، جو نہ صرف وقت کے حساب سے ہم سے قاصد پر ہے مگر ہم سے قاصد رشتے، اس تو کرنے کے قائل تھی۔ وہ روایت جو Garciaso, Fray Luis de León, San Juan de

la Cruz, Gongora, Quevedo, Lope de Vega, کی جیسی شخصیات پر مشتمل ہمارے منہرے نذر کی کلاسیک کی پیمائش تھی، ہم خود کو جس سے مربوط محسوس کرتے ہیں اور جس سے ہمیں کم تر جڑ نہیں حاصل ہوا ہے۔ ہسپانیہ، Gallos اور اس کے بعد 1898 کی نسل کے ٹھیلے اپنے آپ کو ہسپانیہ زندقہ دینے، اپنے آپ کو کشادہ کرنے کے قائل ہوا ہے، اور نتیجے کے طور پر منہ والے اس عرقی حیات سے بہرہ مند ہو رہے جو، مکی بعید سے عرقی کردہ ہے والے افراط کے ساتھ ہماری جانب سیلاب کی طرح رواں رہا ہے۔ 1927 کے زمانے کی نسل نے کسی شے کو زندہ کرنے کی خواہش نہیں کی جو شان دار ماضی کی باقیات میں سے تھی اور اچانک ہماری نظروں کے سامنے دراصل حسن کے مسلسل جھماکوں کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ ہم نے کسی شے کو بھی مسترد نہیں کیا، سوائے اس کے کہ جو معمولی درجے کی تھی۔ ہماری نسل کا جھکاؤ توجہ اور جوش و خروش کی طرف تھا، شک پرستی یا خاموشی بھی ہندش کی طرف نہیں۔

جو کچھ بھی کہیں قدر کا حامل تھا ہمارے مطلب کا تھا، خواہ وہ کس سے آیا ہو۔ اور اگر ہم ٹھکانے تھے، یا اگر ہم اس قائل تھے، تو اس سے کہ ہم نے بھی ان قدموں کو پسند کیا اور اپنے آپ میں جذب کر لیا تھا، ان قدموں کو بھی بے رحم نے جن کی مزاحمت کی ہے۔ ہم نے خود کو مضبوطی سے ان (مادوں) پر قائم رکھا ہے تاکہ ہم اپنے مقدر کی منزل کی جانب ایک پرخطر زندقہ گانے کے لیے تیار رہیں۔ لہذا، آپ کو اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ ایک شاعر جس نے دہائے حقیقت پسند (Surrealism) کی حیثیت سے شروعات کی تھی، آج خود کو روایت کا دفاع کرنے والے کی حیثیت میں پیش کر رہا ہے۔ مذہب اور نظریہ۔ یہ ہیں وہ دو الفاظ جو ہم مشکل ہیں۔

اور پھر یہ مذہب ہی تھی جی مودی نہیں بلکہ ان کی حیثیت میں، بیجان پندری اور برادری نہ مسابقت کے

پھر میں ہمارے کوٹھ سے نکل کر ہمارے دوستوں، اسی چاہ سے ہم جس کی طرف رو رہے تھے۔ میری مرد
نوجوان دونوں کے اس ہنسنے سے ہے (جب میں بھی کم عمر تھا) جو ہمارے ساتھ اس دور میں شامل ہو تھا۔
میں کتنا خوش قسمت تھا کہ میں ان قابل ترین شعرا کے دور میں زندہ تھا اور لکھ رہا تھا میں خود کو ان کے
سانچے میں بحال رہا تھا۔ جس سے میری ایک عمر مصر کے رجبے کی حیثیت میں نئے ساق ہوتی۔ میں نے ان
سب سے، جلد سے، ایک سے، بہت محبت کی ہے۔ میں نے ان سے صرف اس بنا پر محبت کی ہے کہ میں ان
سے کچھ بہت مختلف سمجھتا تھا، وہ کچھ بھی جو صرف ان شاعروں، میرے ساتھیوں، کے ثقافتی تجربے
سے خارج ہو سکتا ہو۔ ہمارے فطرت سے بڑے بڑے ان کی ہر اسی میں ہو گئی تھی اپنی اصل
انفرادیت کا ادا کر سکتی ہے۔ جس ساقی صاحب میں ہمارے شخصیت نگاروں پائی ہے اس کا معیار رہتا بلند
ہوگا اتنا ہی ہمارے لیے ناکند و مند ہوگا۔ اس مقام پر میں یہ بھی کہنا چاہ رہا ہوں کہ یہ میری خوش فہمی ہی تھی
کہ مجھے اپنی منزلوں کے حصول میں اتنے دنوں کی محبت نصیب ہوئی، جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔
اب وقت ہے کہ میں تمام تر خوش کے دو جوان محبتوں کا تذکرہ کریں، یعنی مندرجہ ذیل شخصیات سے تعامل کا:

Federico Garcia Lorca, Rafael Alberti, Jorge Guillén, Pedro Salinas, Manuel
Alcalá Galiano, Emilio Prados, Dámaso Alonso, Gerardo Diego, Luis Cernuda

اس طرح میں دراصل ان سب سے ایک جہتی، اشتراک اور تفریق کی بات کر رہا ہوں۔ یہ بات میں اس لیے
کر رہا ہوں کہ ان لوگوں کی بابت احسانت میری روح پر اتنی ہمدت سے ثبت ہیں کہ یہ میری سانسوں کا
حصہ بن چکے ہیں اور وہ کسی نہ کسی طرح، یہ میرے اشعار کے پشت حصے کے پس منظر کی موسیقی کی طرح سنائی
دیتے ہیں۔ بقدریہ بالکل فطری ہوگا کہ میں اس نسبت اور شاعری کو جس نظر سے دیکھوں وہ ان کی حساسیت
پر مبنی ہو۔ شاعر، بلکہ سچا و سچ شاعر ہمیشہ سنا رہتا ہے اور ضروری ہے کہ وہ ایک گہری مدد جانی بصیرت
دار، ایک پیغمبر جیسے ہو۔ مگر اس کی غیب گوئی بدست مستقبل بینی کے بارے میں نہیں ہوتی، اس لیے کہ اس کا
ماضی پر نظر رکھنا ہوتا ہے۔ گویا ایسی غیب گوئی جس میں زمانیت کا پہلو نہ ہو۔ شاعر چمک کرنے والا،
مشتعل کن شاعر نہیں لیکن والد اور زمانیت کو سمجھنا و ادیب کرنے والا ہوتا ہے۔ شاعر کے الفاظ ہم جیسا وہ
چاہتے رکھتے ہیں جنہرے سر ادا ہوتے ہیں، بقول فقیر، اپنی تقدیر میرے کے خدا کے ہوتے ہیں۔

تصدیقاً، شاعر وہ آدمی ہوتا ہے جو ایک آدمی سے بھی زیادہ ہونے کی حد جیت رکھتا ہے، اس لیے
کہ وہ اضافی طور پر شاعر بھی ہوتا ہے۔ شاعر اس سے بڑھتا ہے، مگر وہ اس بات پر غور نہیں کر سکتا اس لیے
کہ یہ خصوصیت شاید اس کی اپنی نہیں ہوتی۔ ایک قوم جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا، ایک جذبہ جو
اس کے لبوں کے ذریعے گلاب گرنے ہے اس کی نسل کا جذبہ جو اس کی دیانت سے منتقل ہوتا ہے۔ وہ زمین پر
اپنے قدموں پر قائم ہوتا ہے، مگر اس کے قلوب کے نیچے ایک حقیقت درخشاں ہوتی ہے جو شدت الٹی رکھتی
ہوتی، اس کے جسم سے ہوتی ہوتی، اس کی زبان سے ہوتی ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد زمین، زمین، شمع

کی صورت اس کے منور جسم سے چمکنے لگتی ہے۔ مگر دوسری طرف شاعر نمونہ نہ ہوتا ہے، جند یوں کی طرف، ایسی بند یوں کی جانب کہ اس کے اردو آسمانوں تک پہنچ جاتے ہیں، وہ ستاروں بخری نہون میں گنگو کرتے گنگا ہے، جس میں کائناتی گونج شامل ہوتی ہے، جب اس کو محسوس ہوتا ہے کہ ستاروں سے آنے والی ہوئی اس کے سینے میں داخل ہو رہی ہیں۔ ابتداء یہ سب توجہ بھاق چارے اور عمل شکرانہ سے ہوتا ہے۔ یک تہیر کی جیون کی بگھاس کی، وہ نرم ہوتی جس پر اس کے دشوار نگلیہ کیے ہوتے ہیں، یہ سب اس سے الگ نہیں ہوتے۔ وہ (شاعر) ان کو سمجھ سکتا ہے اور ان کی ان خفیہ آوازوں تک پہنچ سکتا ہے، جن کے مارک نمر بادلوں کی مہیب گھن گرج کے درمیان بھی سنے جاسکتے ہیں۔

میرے خیال میں شاعر کی حیثیت کا تعین اس کی ذہنوں میں پڑھائی اور مہارت سے نہیں ہوتا ہے۔ اس کے کام میں انجانی نکلیں وہ چیز ہے جس کا حصہ اس کی خواہش ہوتی ہے۔ انسانیت کے لیے اس کا پیغام کسی کام کا نہیں ہوگا۔ اس کا کافی بھی ہو اور درست بھی۔ خیوں سے کہ کھوکھلا پن، چمکے والے کی کوششوں سے چھپ چھپ نہیں جاسکتا، خواہ اس کے لیے کتنی ہی محنت کیوں نہ کی گئی ہو۔

ایک مسئلہ اور بھی ہے جو ذہن پر عہدہ سے نہیں مگر مقام یا نقطہ انحراف سے متعلق ہوتا ہے، کہ کچھ شاعر "اعلیٰ" کے شاعر ہوتے ہیں۔ وہ فن کا رہتے ہیں (اس قدر کہ، اس سے مطلب نہیں) وہ ان کی انحرافیت، اور اور محمد و سوسٹومات سے منسلک، (کتنی نہیں اور پڑا نہیں) وہ انھیں جو دے دے نے پنے قاریوں کے نام کی تھیں) تفصیلات کے یو جو تھے وہی ہوتی تہذیب کے بارے میں نکتہ نگینی سے حقیقت اور جاں نثاری کی بنا پر ہوتی ہے۔

دوسرے شعرا (یہاں بھی ان کے قد کی کٹلی میت نہیں) انسان کی ان خصوصیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو بنیادی اور جزییہ ہوتی ہیں۔ ان کی طرف نہیں جو ان کو انہایت غلیظ انداز میں دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں بلکہ ان کی طرف جو انھیں بنیادی طور پر تہذیب کرتی ہیں۔ اور ان چروہ انسان کو اپنے دور کی تہذیب کے درمیان دیکھتے ہیں، مگر اس کی خالص پہنچی کو محسوس کرتے ہیں جو بشر کی شہ پائی گئے، اس کی بوسیدہ پوشاک سے شمعوں کی صورت چھن چھن کر نکلتی نظر آتی ہے۔ محبت، اشرافیہ و غرور یا موت کی کیفیت ہوتی رہتی ہیں۔ یہ شعرا بنیادی شاعر ہوتے ہیں، جو انسان کی، عمل اور اس کے بنیادی عناصر سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ایسے شاعر خود کو "علیٰ" شاعر نہیں سمجھ سکتے۔ اور اس قورون ہی شاعروں میں گزرتا ہوں۔

ابتداء میری قسم کا شاعر اس مداخلت کا حامل ہوتا ہے جس کو میں صاف گوئی کا پیشہ کہتا ہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کو ہر انسان کے سینے کے اندرون سے سنا جائے، اس لیے اس کی گورہ ایک طرف سے، یک اجتماع کی گورہ ہوتی ہے، اس اجتماع کی، شاعر ایک لفظ کے لیے جس کو اپنی جذباتی آواز مستعار دے دیتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ شاعر ان زبانوں میں پڑھا اور سمجھا جاسکے جو اس کی اپنی زبان سے مختلف ہوں۔ شاعری کا ترجمہ صرف جزیہ ہی ہو سکتا ہے۔ مگر معجزہ جزیہ کے علاقے سے بات کرنے سے شاعر کو

دوسروں سے واقفانہ غیر مختلف انداز میں بات کرنے اور سمجھنے جانے کا غیر معمولی تجربہ ہوتا ہے۔ اور بچہ
 اچانک کچھ غیر متوقع بات ہو جاتی ہے۔ قاری ایک دم مبہوت ہو جاتا ہے، گویا وہ عجزانی طور پر اس
 تہذیب میں جو بڑے بچے پر اس کی اپنی نہیں مگر جس میں بغیر کسی مشکل کے وہ اپنے دل کی دھڑکن سن سکتا
 ہو اس طرح بھی اظہار کر سکتا ہے اور ذوقی حقیقت میں نندہ بھی رہ سکتا ہے، اور اظہار بھی کر سکتا ہے۔ جو
 کچھ انہی کہا گیا ہے وہ اس کیفیت میں بھی سچ ہوگا اگر اس کو ثابت دیا جائے، اور اس کو قاری پر نہیں بلکہ اس
 شاعر پر منطبق کر دیا جائے جس کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہو۔ شاعر خود بھی ان بیولوں میں سے
 ایک جیسا محسوس کرتا ہے جس سے خیالوں میں طوائف ہوتی ہوں، جو ایک جیسے مگر دو مختلف شخصیات کی مانند
 ہوں۔ لہذا وہ ادیب جس کا ترجمہ کیا جا چکا ہو خود کو دوسری شخصیت محسوس کرے گا۔ ایک تو وہ جس کو سننے
 والوں کی وضاحت پہنچا رہی ہو جو اس کو دوسری کی محسوس شخصیت کو چرچا، طرح، ادب ملتی ہے، جب کہ
 دوسری جو اس کے پیچھے ہوتی ہے، موجود بھی ہوتی ہے اور خود کو جانتی بھی رہتی ہے۔

لہذا میں اس شاعر کے لیے، اندازیت سے ایک جہتی کی خاطر، جو اس کی شخصیت کا ایک حصہ ہے،
 ایک استعاراتی نمائندگی کے ساتھ رکا سکتا ہوں جس کے لیے نوٹس انعام کا نام دیا گیا تھا۔



سال بیلو

اعترافِ کمال۔ انسانیت کے مسائل سے ہمگامی اور ہم عصر تہذیب و ثقافت کے باریک نشہ تجربے کے لیے جہاں کی تصنیفات میں پڑھنا بہتر نظر آتے ہیں۔

جوں ہی سال بیلو کی پہلی ستمبر شائع ہوئی ایسا لگا گویا امریکا کے پچاسیہ ادب کے بے تہدیلی کا موسم آگیا ہے۔ سخت کوشش طرزِ اظہار، مرقعہ، پورتنیک، نہ لٹھا، نہ بھولا اور کھر دہی نثر نے امریکی ادب کو ایسی شوقیہ کیفیت سے دوچار کر دیا تھا جہاں بیان کی سنگینی اور الفاظ کے قطعے انہی کی زمیں کو بھر کر دیا تھا۔ اس دیرانے میں ہیو کی کتاب (1944) Dangling Man ایک نئی امید بھارے کرتی۔

ہیو گے لیے مرقعہ طرزِ تخلیق کی قید سے آزادی دو مرحلوں میں ہوئی۔ اس نے سوپاں، بشری شعور اور فکریہ نثر کی طرف مڑ کر دیکھ اور ان کے کھیلنے کی طرزِ تخلیق سے استہساں فیض کیا۔ مگر اسے ان عظیم ادیبوں کی عروہ میں بھی اکتھاروں جنگی کا حساس ہوا۔ کسی کہانی میں دلچسپی صرف اس کی ذمہ داری لٹھا یا پر تشدد عمل سے نہیں بلکہ مرکزی کردار کی اندرونی تہوں کو روشن کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جس سے اندر نظر کے مطابق ماحول کے مرکزی کرداروں کو متعلقہ ماحول پر لگا چاہیے نہ کہ بلاوجہ ان کی شان برصانی جائے۔ لہذا ہیو گے کے ماحول اور فرسودہ مرکزی کرداروں کا وقت ختم ہو چکا تھا اور ہیو جیسے لوگوں نے ان کی صحرائی رسومات کی انجام دہی میں ہمدردی۔ ہیو گے ماحول Dangling Man کا انداز تحریر ہی اس کی ہیچین مہا اور اس طرز پر اس نے دوسرے

ناول (1947) The Victim کہتا ہے اس کا دیکھنا ہر لمحہ اس کے پانچویں ناول Seize the Day (1956) میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے جس میں ہیرو ناول کے مضبوط پرچے بے مثال عبور و حد سے اس کو کھینک کے دھبے چھلے گیا۔

نکمر اپنے تیسرے ناول میں، جو اس کا دوسرا مرحلہ تھا، یاد دہانی اپنے نثری اظہار کے تسلسل کے ایسا لگتا ہے کیونکہ وہ ماسے میں کچھ ناممکن تجویز دیتا ہے۔ "روایتی مزکرہ" کی تکنیک سراپا چلتا ہے۔ اس کا نتیجہ بھی خوب نکلا۔ ہیرو اپنے بذلہ شیخ اور منفرد انداز میں اپنی ثقافت کا تجزیہ کرتا ہے تو کبھی شدت کے ساتھ اور کبھی فلسفیانہ انداز میں نکمر اس طرح کہ قارئین کی دلچسپی متکثر نہ ہو۔ اس کے نتیجے میں اس کا ناول The Adventures of Augie March (1953) نکمر میں "جس کے عثمانی ہی سے قارئین کو اندازہ ہوگا" ہے کہ وہ کسی قزاق کی کارگزاریوں کے بارے میں ہے۔ اس طرح ہیرو کا بنیادی ورثہ دوبارہ واضح ہو جاتا ہے۔ جو اس کے پیشتر ناولوں Henderson the Rain King (1959), Herzog (1964), Mr Sammers کے (1975) Humboldt's Gift (1970) Planet پر صاف صاف نثری نظر آتا ہے۔

سال 1915 میں کانڈا کے فرانسیسی جرنلے دے عورتے، کانڈا کے قزاق میں پیدا ہوا نکمر پلا۔ بڑھا امریکا کے مشہور شہر شکاگو میں۔ ہیرو نے شکاگو یونیورسٹی اور کینیڈا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ جہاں سے اس کو 1937 میں عمرانیات اور بشریات کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ ہیرو نے بعد میں دیکھنا کسی یونیورسٹی میں بھی کام کیا اور دوسری جنگ عظیم کے دوران جہاز رانی کے محکمے میں خدمت بھی کی۔ اب تک ہیرو کے تیار ہونے والے نو کتبوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کی بنا پر اس کو کئی انعامات سے نوازا گیا جن میں B'nai B'rith Jewish Heritage Award for "Excellence in Jewish Literature" بھی شامل ہے۔ ہیرو نے ناول کے موضوعات سے بہت کم کتاب To Jerusalem and Back شائع کی جو ایک طرح کا سفر نامہ ہے جس میں مصنف نے اسرائیل میں اپنے گھوٹل قیام کے تاثرات لکھ دیے ہیں۔

ہیرو نے ناولوں کے علاوہ کچھ نثری بھی تصنیف کیے جو نوبل راک کے نیا ڈوے میں 1966 میں پیش کیے گئے۔ ہیرو نے مختلف رسائل اور اخبارات میں اپنی مساعی پر پھرے اور تنقید بھی لکھی۔ عرب اسرائیل کی 1967 کے دوران ہیرو نے صحافتی ذمہ داریاں بھی انجام دیں۔ ہیرو نے پرنسٹن کے بارڈ کالج اور نیو یارک یونیورسٹی میں عمرانیات کے موضوعات پر تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ ہیرو پرتیبہ حیات ہے اور امریکا میں قیام پذیر ہے۔

ضیافت سے خطاب

جذباتِ تاب و دماہِ شامی کے عاںِ مرتبتِ قرینِ فیائیں اور حضرت

دنیا میں بہت سی نیکی باتیں ہوتی ہیں جس سے سب اتفاق نہیں کرتے مگر نوٹیل انومات کی اہمیت کا ہر شخص معترف ہے۔ مختلف میدانوں میں انکی دوسرے کی کارگزاری کی قدر و ثناء کی پر نوٹیل کمیٹی کی جانب سے ہتراف گو میں خود بھی نہایت تنجیدی اور قدر کی ٹکا دے دیکھتا ہوں اور اس اعزاز کو جو مجھے کو دیا جا رہا ہے، عیشِ حراہِ تظاہر کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔

مجھے ذاتی طور پر کافی کامیابی حاصل کرنے کا انوکھی نہیں۔ میں نے کتابوں سے محبت کی ہے اور کچھ کبھی بھی ہیں۔ کسی وجہ سے نا کو تنجیدی سے برا حیرت تھا۔ کوئی بھی نظر انداز کرنے کو یہ ناشت نہیں کرتا۔ مگر ایک سرور سے کی پسندیدگی اور تعریف بھی مجھے مطمئن کر دیتی ہے۔ اس لیے کہ جب مجھے ہر طرف سے تعریف کا سامنا ہوتا تو میں پریشان ہونے لگتا ہوں۔ مقدس کتابوں میں لکھا ہے: "انوار سے ہونم پہ جب تمام لوگ تمہارے دے میں، میں، میں نے لکھا ہے" مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اتفاقاً اس پر کسی بات پر اتفاق سے یہ طرفی اور معزونی کے دو نسخہ ہونے لگتے ہیں۔ ہم نے اپنے ہم عصر لوگوں کو کتنی بار غلطیاں کرتے دیکھا ہے۔ وہ ہمیشہ تعلیمی پر نہیں ہوتے مگر یہ بات یاد رکھئے مگر کوئی ہرج نہیں کہ لوگ آپ کو جادوئی شہرت نہیں دے سکتے۔ جادوئی شہرت۔ ایک لڑکھو اپنے والدین سے ہے۔ مجھے اکیٹ یہ احساس ہوتا ہے کہ ابھی تک مجھے اپنے فن پر قابو حاصل نہیں ہوا ہے۔

مگر مجھے اس بات سے کوئی خاص پریشانی نہیں ہے کہ تمام لوگ میرے بارے میں اچھی باتیں کریں گے۔ مہذب معاشرہ اس بات پر پوری طرح متفق ہے کہ نوٹیل انوار سے ہیں، کوئی اور اعزاز نہیں مگر معاشرہ تو بہت کم باتوں پر متفق ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے خوف نہ رہتا ہے کہ میرے سر پر "فاقہ پسندیدگی کی آفت" کے حامل ہوا ہے ہیں۔ میں کوئی کتب شائع کرتا ہوں تو اکثر مجھے تہنوں کے ٹوٹے کھاتے پڑتے ہیں۔ یہ خود پسندی اور اپنے آپ کے مزاج سے کی اصلاح کے لیے ایک ناموافق مگر ضروری عمل ہوتا ہے۔

جب نوٹیل کمیٹی کے انتخاب کا اعلان ہوا تو ذائع، بلاٹ کے نمائندوں نے مجھ پر یوش کر دی (جو ایک خریف ناک تجربہ تھی) اور مجھ سے سوال کیا کہ آپ کا نوٹیل انوار پانے کے ہا سے میں میرے کیا تاثرات ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میرے اندر پوشیدہ بچہ تو (بوجود مشہور حاضرین کے بھی مجھ میں ایک بچہ موجود ہے)

بہت مثالیں ہیں مگر میرے علم کا دلچسپ شک میں مبتلا ہو گیا ہے۔ آج کی پید کی مات اسی بچے کی رات ہے۔ اور
کے دن خطبہ گاہ کی بندگی سے مجھے بہت ساری سنجیدہ باتیں کہنی ہیں۔ اور رکالٹن پراسرار اور مہم دلوں پر غور
کرنے کے لیے پھاٹن ہوتا ہے مگر اسی جمعے کی مات پر بچے کے حق پر کوئی اقتدار ملے نہیں ہوگا۔

خطبہ

چالیس سال قبل میں بہت متنوع صفات کا حامل علم تھا۔ میری عادت تھی کہ میں کسی ایک مضمون کو
پڑھنے کے لیے داخلہ دیتا مگر میرا نیا دور تر مطالعہ کسی اور میدان تعلیم میں ہوتا۔ جب مجھے "ذات اور
بیگانگی" کی چھ مہینہ ہوتی تھی تو میں جوزف کازا کا ناول پڑھتا رہتا۔ مجھے اپنے اس ناول پر افسوس کرنے
کا کبھی موقعی جواز نہیں ملتا۔ شاید کازا نے مجھے اس لیے چھانتا تھا کہ کسی امریکی کی طرح، وہ ایک بے گھر
(ہالینڈ کار شہر) تھا جو دلچسپ مشہور دنیا میں سفر کرتا پھرتا، فرانسیسی زبان بولتا، اور غیر معمولی استطاعت اور
حسن سے مملو انگریزی لکھتا تھا۔ وہ گو کے جوار میں بسے ہے اور یہ تھے بچوں کی طرح میرے لیے اس سے
نہ وہ فطرتی اور بے ہوش تھا۔ سلواکیا کا ایک باشندہ بھی جو ایک بری ٹولی جہاز کا کپتان تھا اور مارینلز کے
اطراف کے ماسٹروں سے خوب واقف تھا، مشرقی طرز کی انگریزی لکھتا تھا۔ مگر کازا میں ایک طرح کا نرالا
پہن تھا۔ اس کے مضموعات سیدھے سادے ہوتے۔ فزنی شادی، تماندگی، مگر مداخلت، لکھ مراتب،
مارک اصولوں پر مبنی جن پر اس وقت عمل کیا جاتا جب کسی طوفان کا سامنا ہوتا۔ وہ ان مارک دکھائی دینے
والے اصولوں کی طاقت پر اور اپنے فن پر یقین رکھتا تھا۔ اپنی کتاب The Nigger of the Narcissus
کے دیباچے میں اس نے اپنے اصول بہت ساری سے بیان کیے ہیں۔ کازا کا کہنا ہے کہ فن نظر آنے والی
کائنات کے ساتھ اعلیٰ ترین انصاف کی پیشکش کرتا ہے کہ فن نے اس کائنات میں، مارکے اور زندگی کے
حقائق کے تناظر میں، وہ کچھ تلاش کرنے کی کوشش ہے جو خیر دی اہمیت کا حامل ہے، بلکہ رہے اور ضروری
ہے۔ لکھنے والے وجہ اور سوچنے والے سائنس دان مختلف طریقوں سے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی
کوشش کرتے ہیں۔ کازا کے مطابق انھوں نے دنیا کو باقاعدہ جانچ پڑتال سے پہچانا ہے۔ ابتدا میں تو فن
کار کے سامنے اس کا اپنا وجود تھا، وہ اپنے وجود کی گہرائیوں میں اترتا گیا اور اس کو ان تمام باتوں کے مدقوں
میں انھارنے والے بہت سے سوالوں کا احراک ہو۔ کازا کا کہنا ہے کہ ادیب اپنے وجود پر متوجہ ہوتا ہے "اس
جسے سے جو اس کو تحفے میں ملتا تھا، حاصل نہیں کیا گیا تھا، جس میں مسرت کی حمایت بھی تھی اور حیرت کی
بھی۔ درد کی بھی اور حیرت کی بھی، ان تمام محسوسات کی جو انسانیت کی تخلیق میں مددگاروں سے کارفرما

بشارت دیتا ہے۔

ایسے سوچنے پر مجھ میں مناظروں اور مباحثوں کی خواہش نہیں ہوتی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہم "گمراہوں" کی کئی باتوں سے تنگ ہو جاتے ہیں۔ انسان کے روپ ناقص اور کٹھن دیکھنے والے ہو چکے ہیں۔ لیکن ایچ لاگٹس نے اس صدمہ کے اوائل میں کہا تھا کہ پانچویں صدی کی رومن خیریت رکھنے والے ہم، انسان، اب کئی نئی پروا بھی نہیں کرتے، بلکہ ہم تو ایک دھڑلے سے غارت گری میں لگے ہیں۔ اس نے کہا کہ "نہروں کی موت چکا ہے" جلد وہ تو یہاں تنگ کر دیا ہے کہ "ہم ایک دھڑلے کے منتوں میں غفلت ہو گئے ہیں۔" اس کے علاوہ یورپ میں صدیوں سے گلیک انٹی طاقت ور ہو چکی ہے کہ ہر ملک نے سویرے راستے، ڈکٹروں اور لڑاکاؤں میں سے اپنے لیے قتل میں سخت شخصیات منتخب کر لی ہیں۔ ایک عجیب کیفیت ہے۔ یہ منظر نامہ ہم کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ کتنی انسانی اپنی ضروریات کے لیے، جو کچھ بھی ہو جہاں سے بھی ممکن ہو، اپنے لیے مستعار لینے میں جھجک نہیں محسوس کرتی، جیسے کہ اکثر گھنڈے سے نئے شہر تعمیر کیے جاتے ہیں۔ ایسی صورت حال بھی کر رہی ہے کہ یہ ایک بد صورت تخلیق ہوتی ہے، ہمیں جس سے احتراز کرنا چاہیے، نہ کہ ہم شوٹیں سے سب کو گلے لگانے لگیں۔ مطلق، اعزاز، عظمت نے بھی بدوشہ، انفرادیت پر حسد ہے۔ کبھی کبھی تو گمراہوں کو جائیداد کی مثال پیش کیا گیا ہے۔ Robbe-Grillet کی مثال میں اس کا بھی شائبہ ملتا ہے۔ شخصیت کی مایہ ناز، نفی چیرے اور مادہ مت خشیست، مایہ ناز و مایہ ناز کا کلاماٹھ ہوتے ہیں۔

تنگر میں تو فٹن کار کی ترجیحات کے سوال میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ کیا یہ اچھا بھی اور ضرورہ بھی ہے کہ وہ (فٹن کار) خیالات و رنگ م کے تاریخی تجزیوں سے شروعات کرے؟ پوسٹ نے Time Regained میں فوجوں اور فوجی قاریوں کی اسی سطح کے تجزیوں، خودی اور سوچی سمیٹات پر معنی تعلیمات کی پسندیدگی کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے "تنگر یہ لوگ Bergotte جیسے مکلف و بول کو جوان پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں، پسند کرتے ہیں۔" پوسٹ کہتا ہے "تنگر جب فٹن پارے کو بھی، وجوہات کی ترانوہ پر توڑا جانے لگے تو پھر کچھ بھی یقینی نہیں رہ جائے گا۔ پھر تو آپ اپنی مرضی سے جو چاہیں ثابت کرنے لگیں گے۔"

Robbe-Grillet کا پیغام نیا تو نہیں۔ یہ ہم کو بتاتا ہے کہ ہمیں بدوشہ کی بشری مرکزیت کو تھوڑا سا چھوڑ کر ایسے معیاری کام کرنے چاہئیں، ہماری "گمراہی" کے بدوشہ تمہید کو جن کی ضرورت ہو۔ گمراہ "وہ" یہ تو بچوں کی پڑائی پڑائی ہے۔ Robbe-Grillet کہتا ہے کہ یہ بنیاد و تجزیہ نگاروں کے نزدیک موت کا پروانہ ہے جس پر دباؤ مخط کیے چاہئے ہیں۔ اس کے باوجود اس کو اس مقام سے نیچے نہیں گرا دیا جاتا ہے جہاں اس کو میسورین صدمہ میں کھلایا گیا تھا۔ یہ اب ایک منقطع شدہ روش ہے، جواب بھی اسی کٹھن شان و شوکت سے ان اقدار کے درمیان مستقیم ہے جس پر مادی تعلیم کے مستحکم پھول پھوڑتے رہتے ہیں۔" Robbe-Grillet کے مضمون کا عنوان ہے On Several Obsolete Noons۔ اس خود بھی

ازکار رفتہ عام تصور ہر جسم کی حدود شدہ لاشوں سے دل میں پھرتے ہیں مگر اعلیٰ درجے کے ذہن سے کبھی نہیں جھٹکا۔ مگر وہی ان سناہوں کے رماروں کا کیا کرے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ رماروں کی تخلیق کو ترک کر دیا جائے؟ کیا ان میں موجود تھی واضح خصوصیات مرکبی ہیں؟ کیا انسان ہندگی میں تخلیق کیا ہے؟ کیا انفرادیت واقعی تاریخی اور تہذیبی حالات پر اس قدر انحصار کرتی ہے؟ کیا ہم شکستہ انداز میں دنیائی تعلیمات کو قبول کرنے پر مجبور ہیں؟ میر خیال ہے کہ سوانے ان خیالات اور حالات کے جن میں مسائل پوشیدہ ہیں کچھ بھی سن کے کام کے نہیں ہیں۔ ان سب کی فرسودگی اور کلاسی ہماری حوصلہ شکنی کرتی ہے۔ مشکلات کا منبع تلاش کرنے کے لیے ہم کو اپنے اذہان کو کھٹکا لگانا ہوگا۔

گورنری موت کے پڑانے پر ”نہایت سنجیدہ مضمون نگاروں نے دستخط کیے ہیں“ کہنے سے مراد یہ ہے کہ حدود شدہ لاشوں کے ایک اور مردہ نے، جو تلاش و رہنمائی کے مجرم رہنما ہیں، پر مشتعل ہے، قانون کو زیر کیا ہے۔ مجھے یہ خیال ہی ذہن پر لب تہنم پر بھجوا کر دیتا ہے کہ ان سنجیدہ مضمون نگاروں کو دینی باتوں کے موت کے پڑانے پر دستخط کرنے کی جرات دی جائے۔ کیا فن و تہذیب کے عقب میں چھٹا چاہیے؟ سچ کی آواز نہ مچھو غلط ہو گیا ہے۔

اگر حکمت ادیب و تاجر یک دست تو کوئی وجہ نہیں کہ سناہوں نگار مردوں کو کیوں روک کر دے۔ مگر ان نظریاتی بنیادوں پر کرائس کو رد کرنا کر فر دکانا تاہ اون و مال ختم ہو چکا ہے، حاکمیت کی ریش ہوگا۔ ہم کو اپنے دانش و دلوں کو پناہ ہم نہیں دینا چاہیے۔ اور ہم ان پلین کو بے چلنے کی قسے داریں لال کرتے سے انصاف نہیں کرتے۔ کیا ماہوں کے مطالعے کے دوران ان توان کی مانے یہ خیال کی توشیح کے حدود و پیمائش اور نہیں دینا چاہیے؟ تو کیا ہم روئے زمین پر اس قسم کے تخیل پھیلنے کے لیے مارے گئے ہیں؟

Elizabeth Bowen نے ایک بار کہا تھا کہ لکھنے والے گمراہ پیدا نہیں کرتے۔ وہ پہلے سے موجود ہوتے ہیں اور ان کو تلاش کرنا ہوتا ہے۔ اگر ہم انھیں تلاش نہیں کرتے، اگر ہم ان کو پیش کرنے میں ناکام ہوتے ہیں تو غلطی ہماری ہے۔ ہمیں اس کا سہرا لے کر اترنا چاہیے کہ ان کی تلاش کا سہرا نہیں۔ انسان کے حالات کی تعریف شاید اسی مشکل تھی نہیں تھی۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم کائنات تاریخی کے ابتدائی دور میں ہیں، شاید صحیح ہوں۔ ہم لوگ نہایت عیاں تھی سے کسی مدت میں اکٹھے اٹھ چے جا رہے ہیں اور اس عمل کے دوران ہم خود کو اپنی شعوری کیفیت سے دوچار ہونا محسوس کر رہے ہیں۔ پچھلے چار سو سال امریکا کے مردوں لوگوں نے اپنی تعلیم ”حاشیہ کی ہے جو بعض معنوں میں بخشش مشکوک کے مترادف ہے۔ صدی کے پچھلے عشرے کے دوران ہونے والے فسادات کے دوران ہمیں کوئی بارنا نہ ترین تعلیمات، تصورات، حساسیت۔ نفسیات کی، تعلیم، اطفال کی اور سیاسی خیالات کی کئی کے گہرے اثرات کا، حساس ہو۔

ہر مرد ہم کو بے شمار کتابیں اور مصالحت پڑھنے کو دیتے ہیں جو امریکا کے لوگوں کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کن حالات سے گزر رہے ہیں۔ جس میں کچھ ذہانت سے پڑھتے ہیں، کچھ سر دودھل سے

کے گئے، کچھ غیر ملکی، کچھ بالکل ہی عقل سے ہاری اور کچھ انہیں خوفِ ماک ٹیج پر مبنی بیانات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ سب کے سب ان گرافوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے ہمیں مشورہ دیتے ہیں کہ ہم کو ان کے بارے میں کیا سمجھنا چاہیے۔ یہ تجزیہ نگار حضرات ان ہی خامیوں اور پُر گندگی کی پیداوار دہکتے ہیں جن کی وہ خود شخصیں کہہ رہے ہوتے ہیں۔ یہ وہ کچھ ہوتے ہیں، ایک دھب کی حیثیت سے ہیں، جن کی اچھائی اخلاقی حریت، ان کی تحکیم کی خواہش، معاشرے کی خرابیوں کے بارے میں ان کے متعصب خیالات، ان کی دل گلاڑی، ان کے مطالبات کی لامتناہی مستحکم فیزی، ان کی تشویش، ان کی تک عزائی، ان کی حریت، ان کی نواکشت، ان کی خیمیاں، ان کی تھکن کی کیفیت، اور ان غیر فیس لاری کا جس سے وہ ان تمام خرابیوں کے لیے ذمہ دار ہیں، علاقہ بالمشاورتوں کے نظریوں پر غور کرتا ہوں جو وہ بخوبی سمجھتے نظر آتے ہیں۔

مورچی مارٹن، جو کبھی سیوٹی فرنی کا پیڑ کار تھا، کلیس پر لکھی گئی اپنی کتاب میں جدید امریکا کا مائیکل انجیلو کے ٹیمے The Capave سے موازنہ کرتے ہوئے اس کو مائیکل کے ایک ٹکڑے سے "کھل و جھل میں آنے کی مکمل پوشش" کی ماحول کھٹکے سے دیکھتا ہے کہ امریکی "تیرنی" اپنی جدید جہد میں "ناویڈت، جیہات، خبرداروں اور خود خستہ سپر ہوس، مہنگوں، سنسنیوں اور اپنی مشتکی کے پیش راجح کار کی رن" کے ذریعے میں ہے۔

میں امریکیوں کی مشتکیوں کا یہ نظریہ غائر مطالعہ کرنا چاہتا ہوں، ذاتی زندگی میں الجھنیں اور تشریہ کی کیفیت میں۔ خاندانی حالات میں، زندگی میں، شوہر میں، بیویوں، والد کے لئے پراسٹیک۔ مدنی دعوں میں، ذاتی و ناہاریوں میں، جنس اعمال میں (کہاں تک رسواؤں) مزید پیچیدگی کی کیفیت سے دوچار اور اس ذاتی خرابی کے باعث ایک قسم کی موتی حیرانی پیدا ہوتی ہے۔ اخبارات میں ہم وہ کچھ پڑھنے لگے ہیں جو کبھی حیرت کن سائنسی افسانوں ملتا تھا۔ نیو یارک، ماسٹراب سوت کی شعاعوں کی، مدنی و امریکی خدائی سیوا میں ملکہ جنگوں کی دھمکتا ہے۔ میرا ہیہ یہ نفس مہنگی فریڈمین جیسا موٹا مند اور ڈسے در ماہر معاشیات اپنے مضمون November Encounter میں اعلان کرتا ہے کہ اپنے موائی اثرات کے باعث بہت جلد برصغیر عظمیٰ جلی جیسے غریب ملکوں میں رہا جائے گا۔ وہ اپنی پیشین گوئیوں سے خود بھی خوف زدہ ہے۔ کیا مطلب؟ کیا وہ تمام شریعتانہ ریاست آزادی اور جمہوری حقوق، جو محمد کا نام سے شروع ہوئے تھے، سب امریت پر منتج ہوئے؟ "تو کسی ایسے شخص کے لیے جو اس نوٹ کی روایات میں پڑا ان چڑھا ہوا جس کی باتیں کرتا کہ برصغیر کی اپنی آزادی اور جمہوریت خطرے میں ہے، تقریباً ناممکن ہے، مگر کیا سمجھیے کہ حقیقت میں ہے؟"

ان ہی حقیقتوں کے سرائے میں ہمیں اس زمین پر رہنا ہے۔ اگر میں پروفیسر فریڈمین سے بحث کرنا تو شاید کہتا کہ آپ کو اداروں کی عزتوں کو بھی فکر میں رکھنا چاہیے، برصغیر عظمیٰ اور ملکیت جلی کے مابین تہذیبی تفاوت کا، دونوں کے موائی اور روایتی کے مابین فرق کا۔ مگر میرا مقصد آپ سے مباحثہ کرنا نہیں کہ میں اس میں جیت نہیں سکتا، صرف ان غلط ماک ٹیجین گوئیوں کی طرف آپ کی توجہ دینا مقصود ہے

جن کے بارے میں ہمیں زندہ رہنا ہے، ہمارے پاس مقررہ ہیں، اور یہی کے مستقبل کے تصورات ہیں۔
 آپ سوچ رہے ہوں گے کہ کئی رسالے کے لیے ایسا ایک مضمون ہی کافی ہو گا مگر نمبر کے
 Encounter کے دوسرے صفحات پر پروفیسر جیک اسٹن واٹسن نے امریکا کی کینیڈا اور دیہ کے لیے سی کے
 عواقب پر چارج کینیڈا نے بحث کی ہے۔ امریکا کی ماکائی کا ذکر کرتے ہوئے کینیڈا جرم کا، شہری ذوال
 بیڑی، نشے پر نصاب لکھ کر دی، ہر ذہن سرائی کرتے ہوئے تعلیمی معیار کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر
 پہنچا ہے کہ ساری سب ہندو طاقت کی کوئی حقیقت نہیں رہی۔ ہم دنیا کی رہنمائی نہیں کر سکتے، تمام گاموں کی
 نیشی کی وجہ سے ہم چاند کا نہیں کر سکتے۔ پروفیسر اسٹن نے سمجھا ہے کہ ایسے معاشرے کا کوئی بھی نشان
 نہیں کر سکتا جس کے بلکہ ہلا کے ایک لاکھ مرد اور عورت، جو مل کر فیصلے کرتے ہوں اور وہ جو فیصلے کرتے
 وہ لوگ پر اثر انداز ہوتے ہوں، انھیں رہائے کا فیصلہ کرنے کا راز دے دیں۔“

یہ تو تھا، احوال سرمایہ دارانہ شہر پارک۔ ان کے نظریاتی مباحثوں کے بارے میں کیا کیا جائے؟ اب
 میں Encounter کے کچھ صفحات چمک کر اس مختصر مطالعے پر نظر کرنا چاہوں گا جو کینیڈا کی وائی وائی میں
 انگریزی کے ٹیچر و چارج واٹسن نے لکھیں ہانڈ ڈالوں کی نسلی طاقت کے بارے میں لکھا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا
 ہے کہ سوشل لیگسٹک فیلڈ ریشی کے مزید ڈیڈ اینڈ میں نے جنوبی فریچ کو جسٹ کو ہوا دیوں کی جسٹ فر
 دیتا کہ بسا اوقات Webbs نے (دیکھیں، کلائم اور دیکھیں کی طرح) اسل پر تانہ نظریات پیش کیے تھے۔
 اس کے مطابق اینگلو نے ملاتی انداز میں مشرقی یورپ کے کئی ممبر سداویاؤں کو دشمن خطاب کر رہی تھیں
 سمجھا کر سے تعبیر کیا اور مسٹ واٹسن نے مغربی جرمنی کی آرمی جیتنے سے متعلق الہیکے مائین ہوف کے ایک
 بیان کو نتیجے کے طور پر پیش کیا جو اس نے 1972 میں ہونے والی عداوتی سماعت کے دوران ’عداوتی استیصال‘
 کے حق میں دیا تھا۔ اس کے ٹوڈیکہ نظریے کے طور کی جرمین یہودی دشمنی اور اسل سرمایہ داری مخالف تحریک تھی۔
 اس کے الفاظ میں ”Auschwitz“ کا مطلب یہ تھا کہ چھ مین یہودی مارکر یورپ کے کڑے کے ایہور پر
 پھینک دیے گئے، جون کا اسل مقام تھا۔ موت کے پورا کی ہو رہی۔“

میں لکھیں ہانڈ کے ان جیاد پرستوں کے ذکر سے یہ دیکھا جا رہا ہیں کہ تعلیمات کے بیوں اور نور
 کے بیوں کو اسالی سے چھپا کر لیں چا سکتا۔ یہودی کو سداویاؤں پر مذہم سے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ مگر
 میں نے چنانچہ نظریہ واضح کر دیا ہے کہ ہم برہمن کے مذہبوں کے لیے تیار رہیں۔ میرے کا مذاق اور عروت ہمارا
 طرز مزہ کا اندیشہ ہے۔ ہم اپنی ذاتی رفق میں مضطرب اور عوامی سواست کے خراب میں رہتے ہیں۔

فن و ادب۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ایک شیعہ ہنگامہ یہ ہے مگر اس سے متصل
 طور پر مغلوب نہیں۔ مہتمم کرنے اور فیصلے کرنے کے لیے اب بھی سوچتے ہیں۔ پائیزہ ترین، سب ترین
 اور اس دہجے کی سرگرمیاں غلبہ انداز ہے ہوئی کے تابع نہیں ہوئی ہیں۔ ابھی تک نہیں۔ سب سے بھی اور
 پڑھی جا رہی ہیں۔ جدید ذہن کے پھر تے ہونے دماغوں تک پہنچنا نیا دوشکل ہو گا، مگر یہ ممکن ہے کہ ہم

شہر و غوغائی فیسوں کو گر کر سکون علاقوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ پرسکون علاقوں میں پہنچ کر ہمیں محسوس ہو کہ ہمارا انتظار ہو رہا تھا۔ جب، مجھ کو یہ محسوس ہو کہ ضرورت کی طلب بھی پڑھتی ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والا پتھر جو کبھی عالمی جنگ سے شروع ہوا تھا، ایک مہربان مددگار چٹکا ہے، وہ جو کبھی بھیا تک اور تجارت انگیز چیزوں کے بیچین زندہ رہا تھا، جس میں بدگمانیاں سرکاتی دکھائی دے رہی ہیں، وہی کتنی نظریات زد ہو رہا ہے، طرح طرح کے پانگل پن کے ساتھ گزارے کی صلاحیت پیدا ہو رہی ہے، دیو پانگنی خصوصیت، مثلاً صداقت، آزادی اور تکفل کی خواہش پڑھ رہی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں مبالغہ کر رہا ہوں۔ ان باتوں کے وافر ثبوت موجود ہیں۔ ٹوٹ پھوٹ گئی ہاں، بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا ہے مگر ہم ایک نئے قسم کی تسمیہ کے عمل کے تجربے سے دوچار ہو رہے ہیں۔ در یہ عمل کافی عرصے سے جاری ہے۔ پراڈسٹ کے Time Regained پر نظر ڈالنا سوں تو گھٹا ہے وہ اس سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کا مادل، جو عالمی جنگ کے دوران فرانسیسی معاشرے کو برباد کرتا ہے، اس کے فن کی قوت کو جانچ رہا ہے۔ اس کا اصرار ہے کہ اپنی ذاتی اور اجتماعی منجیدگیوں کے باوجود فن کے بغیر ہم خود سے بھی واقف نہیں ہو سکتے، بلکہ کسی سے بھی نہیں۔ وہ صرف فن ہی ہے جو ہمارے، طرف، اس دنیا کے ظاہر حقائق پر مبنی، غور، سوئے نفس، نباہت اور عافیت کی اٹھتی ہوئی دیواروں سے نکلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک اور حقیقت ہے، اسکی حقیقت، ہم جس کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہم وقت ہم کو اشارے کرتی رہتی ہے ہم جن کو فن کے بغیر مہول نہیں کر سکتے۔ پراڈسٹ نے ان اشاروں کو ہمارے ”چنے نقوش“ کا نام دیا ہے۔ فن کے بغیر چنے نقوش اور مسلسل وجدان کے مہول ہم سے پوشیدہ دروہا نہیں گئے اور ہم ہمارے ذاتی زمین میں سوائے عملی اختیار کی اصطلاح کے، جس کو ہم غلطی سے زندگی کہتے ہیں، اور کیا رہ جائے گا۔ سٹوئے نے بھی کچھ اسی طرح کی بات کی ہے۔ Ivan Ilyach کی طرح ایک کتاب میں بھی اس ”عملی اختتام“ کا ذکر کیا ہے جو زندگی اور موت دونوں کو ہم سے پوشیدہ رکھتا ہے۔ اپنی مہتری دیکھوں میں پردہ افشا کو چیر کر ”عملی اختتام“ کو دیکھ لینے کے بعد Ivan Ilyach ایک لہریا ایک کردار ہو جاتا ہے۔

اس اصرار کے ساتھ کہ فن زندگی کی اہم ضرورت، ایک عظیم آنا و حقیقت، ایک چالاقی طاقت ہے، پراڈسٹ نے فن اور تہذیب کے درمیان توازن برقرار رکھا ہے۔ مگر ایک طویل عرصے تک فن، ماضی کی طرح، عمل کا دوبر سے مربوط نہیں کیا جا سکا۔ تاریخ نگار ایڈگر وڈز اپنی کتاب Anand Anarchy میں کہتا ہے کہ جنگ نے بہت عرصے پہلے یہ خیال پیش کیا تھا کہ فن اب انسان کی مرکزی قوتوں کو استعمال میں نہیں لانا یہ قوتیں اب سائنس کے تعریف میں رہتی ہیں جو دراصل ”شعوری تحقیق کا سبب دروہہ پڑا“ ہے۔ فن اب کنارے لگا دیا گیا ہے جہاں اس نے اپنے ”وسیع، دل فریب و بولسموں افق“ تشکیل دے لیے ہیں۔ برنگل کہتا ہے کہ ”سائنس کے اس عہد میں بھی لوگ مصوری کرتے ہیں، شعر لکھتے ہیں مگر جدید فن پاروں میں دکھائے گئے سادے خدا کتنے ہی دل فریب کیوں نہ لگیں، خدا، یعنی باپ، اور کنواری مریم کے نقوش کتنے ہی

دوقار و رب حیب نظر کیوں نہ آئیں، ہمارے لیے نہیں کام کے نہیں رہے۔ اب ہم ان کے آگے اپنے
گھٹنیں ٹوٹ نہیں سکتے۔ ایک زمانہ ہوا جب ہم زہد و تقویٰ کے بابہ برعظم ہو کر تھے۔ "سامت
موزونیت" کی جگہ بشر مندی، دلیہ نہ مستجو اور بچاوات کی تاریکی نے نہ ہے۔ "بیکل" کے خیال میں فائن
کا سب سے بڑا کام اس پر ہے کہ فائن اب پرانی لے مارپوں سے آزاد ہو کر "سجیدہ" نہیں رہا اس کے
برعکس اس کی روح اب حقیقت کی حد بندوں کے تکلیف دہ دخل سے آزاد ہو کر کی طمانیت سے بلند ہوئی
ہے۔ مجھے علم نہیں کہ آج ایسا جونی کون کرے گا کہ حقیقت کے تکلیف دہ دخل سے، دن سافن، اپنی روح کو
بلند کرنا ہے۔ نہ ہی مجھے یقین ہے کہ اس اور کی فائن سائنس میں سامت موزونیت کی مدد انسان کی
مرکزی قوت کو اپنی جانب مائل کرتی ہے۔ اور مرکز کو (مثالیہ فارضی طور پر) ان پھر انوں نے گھیر رکھا ہے جن
کا میں تذکرہ مذہبوں۔ انیسویں صدی عیسوی میں یورپ میں ایسے بھی دیب موجود تھے جنہوں نے انسان
کی بنیادی معروضات سے دیب کا رشتہ نہیں توڑا تھا۔ اس رشتے کے توڑنے کا خیال ہی ماسٹوے اور
دوستوئس کے بے دھچکا ثابت ہوتا۔ مگر مغرب کی دینی دنیا میں عظیم اوسپن اور عام لوگوں کے درمیان فاصلے
پیدا ہو گئے۔ انہوں نے عام قادی اور بدو، جیسے کہ ایک واضح توہین سے بچا کر رکھا ہے۔ ماہر تاریخ امپریٹ
آؤن ریخ کہتا ہے کہ ان میں سے بہتوں نے دیکھا ہے کہ یورپ نے کس قسم کی تہذیب پیدا کی ہے، چمک
دکھائی مگر اپنا تہذیب غیر محفوظ، تباہی جس کا مقدر گھبرائی ہے۔ ان میں سے کچھ نکلنے والوں نے غیر مانوس
اور خوف ناک تخلیقات پیش کی ہیں، یہ پھر ناقص اور جہل مندوں سے متجاوز خیالات سے لوگوں کو دھچکا پہنچا
ہے۔ ان میں بہتوں نے اپنی تحریروں کی تہذیب کی بھی پروا نہیں کی۔ عوام کی توہین کے لیے، اپنے انتہائی
مسانک کی خاطر، ان اہم ناک گزریوں کی وجہ سے جن کی بنا پر وہ بچتی اور سلاست پر عمل نہیں کر سکے۔

انیسویں صدی میں ان ہی کا اثر زیادہ ہے اس لیے کہ باوجود انہا چند ناہم انداز اور اختراعات کے
ہمارے ہم عصر بہت قدامت پسند ہیں۔ وہ اپنے انیسویں صدی عیسوی کے رہنماؤں کی پیروی کرتے ہیں
اور تاریخ و تہذیب کی جتنی کہ کچھ بھی سمجھتی ہیں ہو چکی ہے، تخریب کرتے ہوئے پرانے معیادوں سے چسپے
بستے ہیں۔ اگر انہیں یہ محسوس ہو کہ ادب ایک در پھر ان "مرکزی قوتوں" سے متاثر ہے تو یہ جانتے
ہوئے کہ عموماً کی طرف، جو اس میں بھی اور کچھ بھی تھا، وہ بھی کی شدہ و خوارش پیدا ہو چکی ہے، آج کے نکلنے
والے کیا کریں گے۔

بدشہ، ہم مرکز کی طرف صرف اس لیے واپس نہیں ہو سکتے کہ ہم وہاں ہوا چھوچتے ہیں، سوائے اس
کے کہ میں یہ معلوم ہو کہ بحران انتہائی ہے کہ مرکز کی طرف ہمارے ذہنی شعراء کی ہے۔ مگر اس کا حل اصولاً
داخل عمل ہوگا۔ آپ ادب سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کو کیا کرنا چاہیے۔ قیمتی تصورات کو اپنے راستے خود
کھول کر دینے ہوتے ہیں۔ مگر اس کی صرف شے حق کی جاسکتی ہے کہ ہم اطراف سے (مرکز کی طرف)
واپس آ سکتے ہیں۔ ہم نکلنے والے، انسانیت کی کا حق زمانہ و نہیں کرتے۔ امریکی اپنے بارے میں کیا کہتے

ہیں، ان کے بارے میں نفسیات، سماجیات، تاریخ و سائنس اور کھتے و لے کیا کہتے ہیں؟، مگر ہوتی دن کی
 مددنی میں وہ اپنے آپ کو اسی طرح دیکھتے ہیں ہم جس سے مجبور مانوس ہیں۔ اور اسی مانگے ہوئے جاے
 میں بنے نقش، جو Rube-Griker کو اور مجھ کو آتا دیتے ہیں، ہماری عصری دنیا کے خاکہ کی پیداوار
 ہیں۔ ہم اپنی کتابوں میں صرف، سرکاری، مذہبی، عوامی، عاشق اور نفی و ڈن دیکھنے وے کو پیش
 کرتے ہیں۔ مگر ہوتی دن کی مددنی میں بنے، انھیں واصل ایک قسم کی موت ہے۔ ہمارے اندرون سے
 ایک اور نغز ہمارا رانہ ہوتی ہے، جو ان، مگر ہوتی دن کی روایتوں کے پائے ہوئے نقش اور چھل زندگی۔
 زندگی کے اندرون موت۔ کو زد کرتی ہے۔ اس لیے کہ یہ نغز ہے، اور اس حقیقت سے ہم واقف ہیں، اور
 ہماری خفیہ غیر متعلق مروت کو دیکھنا نہیں چاہتے اس لیے کہ یہ مروت خیرتی ہے مسلسل ہونے والی اتفاق
 کیفیات سے۔ شاید ہی ٹوٹ انسان بہت زیادہ حقیقت کو بھی برداشت نہیں کر سکتی، نہ بہت زیادہ تصنع کہ اور
 نہ سچائی کی بہت زیادہ پامانی کو۔

ہم خود کو چھ نہیں سمجھتے، نہ ہم ان پر یہ غور کرتے ہیں کہ ہماری حقیقت کیا ہے۔ ہمارے اجتماعی
 کائنات سے ہم سے تھوڑے بڑھ گئے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو ہاں مانے کے لیے ان کی جانب اشارہ
 کر دیتے ہیں۔ ایک جیسے ظہور جس میں ہم عام قسم کے سانچوں نے عوامی فوس کو چار گھنٹوں میں عبور کر
 لیا ہے، ہمارے ڈھوں کی تعبیر بننا ہے۔ پھر ہم لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ اب مغرب کے پچھلے پچھلے
 باغات کے اجڑنے کا وقت آ گیا ہے، ہماری عمر ایہ دار نہ تہذیب کا وقت بھی پورا ہو رہا ہے۔ کچھ بھی
 پیسے برباد کا نونے لکھ تھا کہ ہماری نسل اور تہذیب جس ایک تو رٹی تہذیبی (mutation) ہونے والی
 ہے، جس کو صرف عمر ایہ دار نہ نظام کے نبدام سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ حقیقت کی فطرت کی اتنی وسیع
 تہذیبی کا تصور تو کامیاب کسی یا محض فرائڈ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بھی کافی حد
 تک سگڑے نہیں ہیں، ہمیں درجہ ہونے کے لیے تیار رہنی چاہیے۔ مجھے یقین نہیں کہ اس کو تلاش کرنے
 تجزیہ کیا جائے یا نہی تلاش کر کا کیا ہوا تجزیہ۔ جہاں، تہذیبیں ہی ہوتی ہیں۔ جہاں کہ اکثر مزیں کہنے کی
 کوشش کرتے ہیں، اور اگر ہم ان میں سے کامیابی کا پتہ نکالنے کی کوشش کریں تو اس سے بڑی حماقت اور
 کیا ہوگی۔ مگر میں اس حقیقت کی طرف توجہ دانا چاہتا ہوں کہ دانش وروں کی جماعت میں سوچ کے ایسے
 بہت سے مدار ہیں جو مجرم ہو چکے ہیں، مثلاً سماجی نظریات، انسانی فطرت، مراتب، سیاست، جنسیات کے
 درجہ میں، دانش کے بارے میں، طبی کائنات کے درجہ میں، زندگی کی رفتار کے درجہ میں۔ بہترین
 دیہوں میں بھی ایسے ادیب بہت کم ملیں گے جنہوں نے کبھی اپنے اقدار کو سمجھنا اور اپنی پٹے شدہ معاملات
 میں تبدیلی کی رحمت گھامائی ہو۔ اس قسم کے مذہب، نچلے درجے کہنے والوں کی کتابوں کے مقابلے میں،
 جیو جس کی لائی لائیں میں زیادہ قوت سے روشن ہو رہے ہیں۔ یہ دیکھنے ہر طرف ہیں اور کوئی تنقید
 سے ان کو پہنچ بھی نہیں کر رہا ہے۔ صدیوں کے درجہ شرم کے بعد سے ایسے کتنے ماہر نگار ابھر رہے ہیں

جنہوں نے اسی نئے مارش کی طرف دوبارہ نظر کی ہے، وہ جنسی کمزوریوں کی طرف سے انداز سے دیکھنے کی کوشش کی ہے یا یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ صنعتی تہذیب انسانی حیثیت پر کس طرح اثر انداز ہوئی ہے؟ ایک صدی کے لگ بھگ ادب نے ان ہی پرانے خیالات و حرکات و ران کی انکار و نفی منہویں کو استعمال کیا ہے۔ Robbe-Grillet کہتا ہے کہ پچھلے پچاس برس کے سب سے سنجیدہ اور عمدہ نکتے والوں کے ہاں بھی، قیاسی مبالغہ ہے۔ مضامین پر مضامین اور کتابوں کے اعداد — یوں بڑھ چکے ہیں کہ کسی اور نفسیاتی تجزیہ کاروں وغیرہ جیسے سنجیدہ مضمون نگار بھی اس ہی خیالات پر صدمہ کرتے ہیں۔ جو Robbe-Grillet کے ناموں کے بارے میں کہتا ہے وہی کچھ ان خیالات کے بارے میں بھی کہہ چا سکتا ہے جو پھرے پڑے سماج پر سب انسانیت (dehumanisation) (جیسے کمزور مادوں کے ساتھ) اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم ان سے کہتے بیزار ہو چکے ہیں۔ وہ نام کی فراخ دلی کس پیمانے پر انداز میں کر رہے ہیں۔ وہ ہمیں جس قسم کی تصویر میں پیش کر رہے ہیں وہ اب ہم سے نہیں ملتی، بلکہ ان میں تو ہم ان سے لگتے ہیں اور ہمیں کچھ ٹھوکتا نظر آتا ہے جو قدیم نسلی عجائب گروں میں پائی جاتی ہیں۔ ہم لوگ تو بہت سادہ، وسیع انکسار، سادہ گوشت اکیلا رہا کرتے ہیں۔ بلکہ ہم میں ان سے بھی زیادہ صفات ہیں اور ہم سب اس کی اپنی طرح محسوس کرتے ہیں۔

تو پھر اس وقت ہمارے سامنے کیا ہے؟ فی الوقت تو، قریباً پچھنوں اور چند لوگوں کے ساتھ قیاسی رائے نہیں، صرف فی نوع انسان کا مسئلہ درپیش ہے کہ وہ، قیاسی رہے یا ختم ہو جائے گی؟ ساری قیاسی سرشتیں، ہر ایک، اس ہی میں ابھلا ہوا ہے۔ ایسی صورت حال میں ہمیں اپنے آپ کو ہکا بکا چھوڑنے اپنے انکار و نفی اور منظم تربیت کے غیر ضروری پرچہ کو اتار پھینکنا چاہیے تاکہ ہم اپنے بارے میں خود فیصلے کر سکیں اور اپنے قدم خود ڈھکیں۔ کانا ڈانے ہمارے وجود کے اس حصے سے جو ہم کو جتنے میں تھا اکیلے کی تھی تو وہ بالکل حق پر تھا۔ ہم کو بہت سارے نظموں کے فیصلے میں ان غویوں کو تلاش کرنا چاہیے۔ ان نظموں کی ماکانی ہمیں ضابطہ بندوں سے، غیر ضروری حد تک بنائے گئے اور مردانہ دے شعوہ سے ایک نہایت خوش کن چمکا ہوا دلائل ہے۔ میں بار بار ان قابل احترام مدعوں یا شعراء کو جنہیں میں نے ایک مرتبہ کے پینے سے لگائے رکھا ہے، یاد کرتا ہوں، میں نے جن کی پاسداری کی ہے اور دوسرے لوگ جن کی پاسداری کرتے ہیں۔ جہاں تک رنگ کے فن کا سوال ہے جو سنجیدگی کی منجھروں سے آزاد اور بالکل ہو کر پتی چھب دکھاتا ہے، جو تحقیقی ہو کر انسانییت کی مدد سے دماغ کو حقیقت کی جگر بندوں سے آزاد کرنا چاہتا ہے، بقا کی اس جدوجہد میں اس کا سب کوئی مقام نہیں رہا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو لوگ اس جدوجہد میں شریک رہے ہیں وہ محض بنیادی اور ناقابل انسانییت کے حامل تھے، جو تہذیب اور فن سے بالکل نا آشنا تھے۔ ہماری مریاں، ہمارے محبوب ان ہی بات کے ثبوت ہیں کہ ہم اپنے خیالات اور تہذیب کے بارے میں کہتے زرخیز ہیں۔ وہ جدوجہد ہی، جو ہم پر کشش کی کیفیت پیدا کرتی ہے، ہمیں سادگی کی طرف، ہمیں اپنے آپ پر غور کرنے اور ان الم ناک کمزوریوں کو دور کرنے کی طرف مایوس کرتی ہے، جنہوں نے

دوب اور قاری دونوں کو یک وقت مادہ اور سچ لکھنے سے روکے رکھا۔

ادیبوں کا بہت اڑا اڑا ہوتا ہے۔ ذہن قاری، مایوسی کے بعد، ویسے کے باوجود حیرت انگیز طور پر ان کا خنجر روتا ہے، ان کو چھوڑتا رہتا ہے، نا کہ اس سے یہ معلوم ہونے کے دیباچہ، فلسفے، اور سماجی کھینچے گئے درے میں فتنے کیا کرتا ہے، اس لیے کہ یہ سب کچھ اسے خالص سائنس سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ مرکزی جدوجہد سے ایک زیادہ وسیع، زیادہ چمک دار، عمل، نیا اور مربوط اور شدہ خواہش پھرتی ہے جو یہ چاہتا چاہتی ہے کہ ہم نئی نوع انسان بنیں، ہم کون ہیں؟ یہ زندگی میں کس لیے جھگڑتی ہے۔ مرکز میں تو انسانیت اپنی آزادی کے لیے تمام تر اجتماعی طاقت کے ذریعے تیرد زدن کرتی رہتی ہے جب کہ ایک نئی ذات اپنی روح پر قائم پانے کے لیے سب انسانیت سے پیار میں رہتا ہے۔ ادیب مرکز میں نہیں رہتے تو اس لیے کہ مرکز پسے سے مزاحم ہونے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ وہ اس میں داخل ہونے کے لیے چوڑی طرح آواز دیتا ہے، گروہ چاہتا ہے۔

ہاں، اس کیفیت کا فخر، پیچیدگی، بد نظمی اور اس سے پیدا ہونے والی تکلیف کی جھپٹیاں تو ہمیں پراکسٹ اور اسٹوکیٹ نے ”حقیقی نقوش“ کی طرح دکھائی ہیں۔ یہ لچر، پٹی جھٹک دکھلا کر خود غائب ہو جاتا ہے۔ اور جس یہ غائب ہو جاتا ہے تو ہم کو شبہ میں ڈال دیتا ہے۔ مگر ہم خود کو ن گمراہوں سے الگ ہونا محسوس نہیں کرتے جہاں سے یہ جھپٹیاں پھرتی ہیں۔ ہماری اصل طاقت، وہ طاقت جو ہم کو کائنات ہی سے حاصل ہوتی ہے، آتی جاتی رہتی ہے۔ ہم اس کے بارے میں گھٹو کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اس لیے کہ ہم سمجھنا نہیں سکتے، اس لیے کہ ہماری زبان اس گھٹو کے لیے کافی ہے، اور اس لیے بھی کہ بہت کم لوگ اس پر گھٹو کا خطرہ مول بننے کے لیے تیار ہوتے ہیں، اس لیے کہ انھیں ہٹا پڑے گا کہ دنیا کا وجود ہوتا ہے اور یہ ہٹا معیوب ہو چکا ہے۔ اسی لیے تقریباً ہر کوئی اس پر خاموشی ہی رہنا چاہتا ہے، اگرچہ تقریباً ہر شخص اس سے واقف ہوتا ہے۔

ادب کی قدر و قیمت ن آنے چاہئے ”حقیقی نقوش“ میں ہی منظر ہوتی ہے۔ ایک ماہر اس دنیا کی اشیاء اعمال، اکھار اور اس دنیا کے درمیان جہاں سے یہ ”حقیقی نقوش“ ابھرتے ہیں ہم کو اس بات پر یقین کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم جس کو، چھائی کچھ کر اس سے پٹے سہتے ہیں وہ ایک سراپ نہیں، اس میں کھیر و جہل ہوتا رہتا ہے۔

جس کسی نے بھی مادل تحریر کرنے میں برسوں گزارے ہیں ان حقیقتوں سے ناواقف نہیں ہو سکتا۔ مادل کا تقابل کسی مذہب یا کسی شاعر یا مذہب سے کی بلندیوں سے نہیں کیا جاسکتا۔ مگر اس مقام پر ہم اس اتنا سمجھ ہی سکتے ہیں۔ یہ آج نہیں کال ڈالیں گے کہ اسے ہم کا کوئی گھنہڑا ہے جس میں جذبہ بندہ میر ہوتا ہے۔ ایک مادل حقیقی اور بے شمار حقیقی نقوش کے درمیان، جنہیں ہم زندگی کا امام دیتے ہیں، تو ان کو دکھاتا ہے۔ یہ ہم کو بتاتا ہے کہ ہر انسان کے لیے وجود کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، کہ ہر ایک وجود جزوی طور پر ایک

سراب کی مانند ہوتا ہے، کروہوں کی موتیں کچھ واضح کرتی ہیں، کچھ مٹا چکی ہیں، کچھ پورا کرتی ہیں۔
 اور یہی ہمیں سچی، ہم پرانچلی، حتیٰ کہ اعداد و ارقام کو مرقی ہیں۔ کاغذ اور پتھر کہتا تھا، کرفن کا سات میں اس تلاش
 میں کوشاں رہتا ہے کہ ماٹے میں اور زندگی کی حقیقتوں میں کیا شے بنیادی ہے، پائیدار ہے اور غریب کی ہے۔



ایو جینیو مونتالے ☆

اعتزاف کمال۔ اس کی تیاری شاعری کے لیے جس نے، رہ گئی کے درے میں علاقہ کی انداز میں اور بغیر کسی الجھاس کے، اعلیٰ درجے کی فن کا مانتہ حیثیت کے ذریعے انسانی اقدام کی ترجمانی کی ہے۔

اپنی لکھنوں کے پہلے ہی مجموعے (Ossi di Seppia (Bones of the Cuttlefish 1925) کی اشاعت کے ساتھ، جب وہ صرف تین برس کا تھا، ایو جینیو مونتالے نے اطالوی ادب کی تاریخ میں اپنے مقام کی بنیاد رکھ دی تھی۔ جیسے جیسے اس کی شاعری نئی سرحدوں سے باہر پھیلنے لگی، مغرب کے ہم عصر ادب میں اس کی پہچان مستحکم ہونے لگی۔ اگرچہ اس کی ادب کو ایک اونچا مقام دینے میں وقت درکار ہوتا ہے مگر مونتالے کے معاملے میں یہ زیادہ ہی وقت لگا جس میں شامل اس کی اپنی مستقل تمثیلی کا بھی دخل تھا۔

ایک وجہ اور بھی تھی۔ مونتالے نے اپنی تحقیقات کی اشاعت کے درمیان اتنا وقفہ دیا کہ اس کی شاعری کے معیار اور اس کے مقام کے تعین کے بارے میں وقت پر انصراف نہ ہو سکا اور جو اس کے کرم مجموعوں کے شائع ہونے سے پہلے اس کی شاعری جرائد میں چھپی رہی تھی، اسے پہلے مجموعے کی اشاعت کے ساتھ مونتالے نے اپنی دنیا کو چھٹکا دیا تھا مگر بعد کے اُنے واسطے مجموعے نسبتاً مختار اور ان کے درمیان وقفے غویل تھے۔ اس کے پہلے مجموعے اور بعد کے چار مجموعوں کے درمیان پہلی کتاب کا غویل وقفہ تھا۔

بعد میں آنے والے مجموعے ”مرچ فلتھ“ تھے پھر بھی مونتالے اپنی شاعری کی بے پناہ حیثیت کی وجہ سے اپنے ملک کے علاوہ اور دوسرے ملکوں کے نوجوانوں کی آنکھ کا ناما بن گیا ۔

احیاء کے شہر جینووا میں پیدا ہونے والے مونتالے کی شاعری کا اس متغیر شاعری عالم کے ماحول اور اس کی جغرافیہ کی زندہ تصویر کی مانند ہے۔ اس کے ہاں جنوب کے ساحلوں کی عظیم ”قناری کی سنگا سنگا“ گہما گہما نہیں بلکہ اس کی نقیصہ ایک قسم کے پتھر پر ساحلوں کا ہوا پیش کرتی ہیں، ایسے پتھر پر ساحلوں کا جہاں تک قاری کے تصور کی پہنچ بھی پہنچتا ہے۔ مونتالے کے سلوب میں اطالوی ادب کے اس دوستان سے وابستگی ملتی ہے جو تنہائی پسندی کی طرف مائل تھا، جس کی بنا پر مونتالے اپنے کلام میں سنجیدگی وہ نرمی، وہ بناوٹی مروتانگہم و وہ ”مرچ فلتھ“ کی مافی پیش نہیں کرتا، ان لوگوں کی ثقافت سخن جس کی توقع رکھتی تھی۔ مونتالے کے نفس بیان سے قاری کی داری صرف وہی وجوہات ہی پر نہیں بلکہ اس کے ایک مخصوص روحانی انداز نظر، اس کی اپنی ایک اندرونی ضرورت کے باعث تھی۔ اس کا اپنا ایک انداز نظر تھا۔ مونتالے ان مصنفوں میں سے تھا جو کسی مرتبہ اسلوب سے نہیں بلکہ اپنے ماحول سے پرہیز کرتے ہیں بلکہ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ پورے جدید ماحول سے بھی ایک فاصلہ رکھتے ہیں۔

اگرچہ مونتالے کی شاعری کی ہی طرح سمجھا گیا ہے مگر یہ سمجھنے کے لیے کہ مٹی انداز نظر کیا ہوتا ہے ہمیں وہیں کی ان دادوں میں تامل کرنا پڑے گا جن کو مونتالے نے خیر ماؤ کہہ دیا تھا۔ عجیب بات ہے کہ مونتالے نے بھی اپنے حالی میں زندہ رہنے کی کوشش نہیں کی۔ وہی جنگ عظیم میں آسٹریا کی فوجوں کے مقابل لڑنے کے بعد دوبارہ سے شعر کی طرح اس نے میدان جنگ کی بول مکیوں کے جھجکتی حیرت انگیز بات یا ٹر میں ٹر کا کوئی پہلو نہیں دیکھا، نہ کوئی ٹاڑ لیا اور نہ ہی جنگ کے موضوع پر کوئی نظم لکھی۔ ہاں جنگ کے اختتام پر جب وہ نکھرتے ہوئے اطالوی سناٹے میں قدم رکھتا ہے تو اس کی شاعری پر بندھے ہوئے عجب سے مرادے بندھن ٹوٹ چکے ہیں۔ اطالوی ادب کے نقطہ بصر کی نظر میں مونتالے کی شاعری۔ ”آسیب اور تعویذ کی طرح۔“ براہمیں عالم موجودات کے حقیقت کی تلاش اور ان کی آزادی کی جدوجہد سے عبارت ہے۔

جنگ کے میدان سے مونتالے کی واپسی اس وقت ہوئی جب عاید کا آمر سولہ ہفتہ رہیں تو مگر مونتالے نے اس کے گمراہ میں شہریت سے استراذ کیا اس کے نتیجے میں مونتالے کو بہت مشکلات پیش آئیں۔ ملازمت نہیں ملی، اس کی ادبی مصروفیات پر بھی اثر پڑا اور اس کو معاشی مجبوری کی وجہ سے مترجم کا کام کرنا پڑا۔ اس مشکل دور میں مونتالے کی کم کمیزی اس کے کام آئی اور اس نے اپنی ادبی مصروفیات کو نیا دور وقت دیا۔ مونتالے اطالوی ادب کے افق پر چھوٹی مدت کے عرصے کے دوران چھائے رہے، وہ ملے ہوئے ادیبوں میں سے ایک تھا۔ وہ 1996 میں جینووا کے ایک کاروباری گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنی دقاعدہ تعلیم ایچ ایک ترک آمدنی اور تعلیمی حود پر مبنی اور کاما سیکھے گا۔ مگر یہی جنگ عظیم کے زمانہ، جس میں اس کو ایک فوجی فسر کی حیثیت سے اگلے سوچوں میں لڑنا پڑا اور اس کی زبان اس کے مونیکی کے استاد کا

انتقال بھی ہو گیا تو اس کا یہ شوق ادھوا ہی رہ گیا۔ پھر اس کا رہنما ان ادب اور شاعری کی جانب ہو گیا جس میں اس کو گہری دلچسپی رہی۔ اس نے جب شاعری کی طرف رجوع کیا اس وقت تک اس کو Belmi اور Detassy کی موسیقی اور تازیت پسند مصوری میں بھی خاصی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ اسے وسیع مطالعے کی بنا پر وہ انیسویں صدی کے بڑے بڑے ناول نگاروں سے بھی متعارف ہوا اور Roccatalgata Cecardi, Sbarbaro, Bone جیسے شعرا سے بھی اس کی واقفیت ہوئی۔ مگر صحیح معنوں میں اس کا ادبی مشغلہ پہلی جنگ عظیم کے اختتام کے بعد ہی شروع ہوا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران 1943 میں مونتالے کا مجموعہ Finestre شائع ہوا جس کی دو اور اشاعتیں ہوئیں۔ 1956 میں دوسرا نکتہ اثر مجموعہ La bufera e atro شائع ہوا۔ 1960 میں 270 صفحات پر مشتمل مونتالے کی خودنوشت سوانح La tartarica di Dinard شائع ہوئی جس نے شاعر کے اس دورے تحقیقاتی عمل کا احاطہ کر لیا بلکہ یہ مونتالے کے تحقیقاتی عمل کی ایک ترتیب وار تاریخ کی صورت اختیار کر گئی۔ اس پیشکش میں مونتالے ایک منفرد سوانح نگار اور غیر معمولی تحقیقاتی نثر نگار کے طور پر بھی اظہارِ ماضی میں جبر جبراس نے اپنے غم کو بھاری پڑھ کر مزید امداد میں پیش کر کے پیش کیا ہے۔

مونتالے نے 1928 میں اٹلی کے شہر فلورنس میں سکونت اختیار کر لی جہاں وہ Gabriele Vieuzeux Library کا ڈائریکٹر بن گیا۔ مگر چھوٹی دلیں بعد حکومتی کردہ سے نظریاتی اختلاف کی بنا پر اس مہدے سے سبک دوش کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ ان ہی طوں ہوا جب اٹلیہ پر آمرانہ حکومت تھی۔ مونتالے کو 1961 میں روم کی یونیورسٹی نے اعزازی ڈاکٹریٹ عطا کی جس کے بعد کئی اوریوینی ورثیدوں اٹلیہ کی میلانو، برطانیہ کی کیمبریج اور سوئٹزرلینڈ کی بازل (Basel) نے بھی ایسے ہی عزازات سے نوازا۔ بعد میں حالیہ کے صدر نے اس کو اپنی میدان میں نمایاں کامیابی کے اعتراف میں میڈلر کا تمغہ بھی تفویض کیا۔ مونتالے نے 1981 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

جلالت، آب، عالی جاہ، خواجہن اور حضرات

میری عمر کے ایک خاصے طویل عرصے کے دوران، تقریباً چھ برس تک، اٹلی میں سیاحت کی آزادی

بہت کم کم تھی۔ مگر شاعر حضرات کم خط مالک سمجھے جاتے تھے۔ دوران کو خود تنقیدی کے مشورے دیے جاتے تھے۔ نیا دوسے نیا وہ شاعروں سے درخواست کی جاتی تھی کہ وہ بالکل سمجھ نہ سکیں۔ میں نے اس نقی آزاد کی سے فائدہ اٹھایا۔ اُن میں یہ سوں نے مجھے ہر مہم کی چودھویں شاعری کی قلم نو سے گزرنے اور سچ اور حقیقی حکم گیر سفر کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ میں ایک اور شاعر پیدا ہو گیا جو بہت تکنیکی نہیں مگر جس نے بہت سی 'بہت ادا' میں مشابہت پیدا کی۔ میں نے نصف صدی کے عرصے میں، بشمول ہزاروں صفحات نثر، تقریباً پانچ سو شخصیات سمجھی ہیں۔ میں شاید دیر سے زرتشت کا مجروح کار ہو، ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ زندگی کی بنیاد وہ نکالنے کو توں 'بھلائی' اور 'رائی' کی جدوجہد پر رکھی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سارے سچے شاعروں نے شاعری ہمیشہ اچھائی کے حق میں کی ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے شاعر دانتے نے چودھویں صدی عیسوی میں اس راوی کی شان دی کی ہے۔ اس کے بعد شعر سمجھنا تقریباً تصحیح وفات کے زمانہ مملوم ہو گیا، مگر اس کے باوجود بہت سے لوگ سمجھتے رہے ہیں۔

میں بھی نہ اکی دوں میں سے ہوں اور میں نے ہمیشہ اس حیران کن اور خوف مالک معے کے در پر دست دئی ہے جس کو زندگی کہتے ہیں۔ مجھ کو قیاسی گردانا گیا ہے مگر اس انسان میں کس اقدار دیوے کی جہات اور کتنی پست و سب کے خود بینی پوشیدہ نہیں ہے جو سمجھتا ہے کہ انسان اپنا ہی خدا ہے اور یہ بھی کہ اس کا مستقبل صرف حق باقی ہو سکتی ہے۔

میں آپ، خدمت مالک، توسل فائزیشن اور مالک سینیڈس کا دل کی خدمت اقدس میں خراج عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں، جنہوں نے ایک کارکردگی کو اعزاز کا تاق پہنایا ہے اور اس وقت میں ان ای لوگ لوگوں کو یاد کرنا چاہتا ہوں جن کو سینیڈس میں ملازمت امن اور آناؤں نصیب ہے۔ ان تمام حضرات کو جن کی قرب میں موجود ہیں، میں اپنی تمام تر ممنونیت سے پر مبارکباد پیش کرنا ہوں۔

خطیبہ

کیا شاعری اب بھی ممکن ہے؟

اگر میں غلط نہیں تو اس میں عجیب و غریب بار ٹوٹل انعام حاصل کیا گیا ہے۔ اور اگرچہ کئی سائنس دان اور ادیبوں کو یہ اعلیٰ درجے کی شہرت رکھنے والی قدر شناسی حاصل ہوئی ہے، مگر ایسے لوگ کم ہی ہوں گے جو بقیہ حیات میں اور اب بھی کام کر رہے ہیں۔ کچھ تو یہاں موجود ہیں اور انہیں میں مبارکباد اور نیک

تسا میں پیش کیا جاتا ہوں۔ عام لوگوں کی رائے میں، اگرچہ جوتھیوں کی پیشین گوئی ہمیشہ غور سے کیے قابل نہیں ہوتی، اس میں کائنات میں جو بہت قریب ہیں، پوری دنیا (وہ کم دنیا کا وہ حصہ جس کو مہذب کہا جاسکتا ہے)، ایک بھی تک پہنچنے کے تاریخی بیونچوں سے دوچار ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ قیامت آتے یا نہ آتے کے ختم ہونے کا نہیں، مگر نئی سماجی پاکت شروع ہونے کا اندازہ ہے جس کے حجم ۲۰۰۰ء میں تھا۔ اس دن جب نوبل انعام کو سو برس پورے ہو چائیں گے تب ہی مکمل حساب ممکن ہو گا کہ نوبل فاؤنڈیشن اور اس سے منسلک ایسے جانے والے انعامات نے کیونکر انھیں ان کے سچے نظام کی ترتیب میں مدد کی ہے۔ انھیں وہ انسانیت کی بھائی کے لیے ہو یا خرابی کے لیے، مگر ہم ہم اس حد تک کہ کئی صدیاں تک زندگی کے معنی کے بارے میں صدیوں پرانی تعمیر تھیج رہی تھی۔ میرا شمار انسانی زندگی کی طرف سے نہ کرنا انوکھائیوں کی تخلیق پر جو کئی مزارعین میں پسے ہوئی تھی، ان مادیات پر جنھوں نے انسان کے ظہور کو ممکن بنایا۔ بہر حال میں اپنے موضوعات سے بہت شغف میں ہوتا اور سوچتا رہا ہوں کہ وہ فیصلہ جس پر نوبل انعام کے قانون کا رد و مدد ہے کیا حق بجانب تھا، اور کیا سائنس اور دینی کارگزاریوں نے نئی انسانی قدریں کو قائم کرنے اور ان کی حفاظت کرنے میں ہاتھ بٹایا ہے؟ اس کا جواب یقینی طور پر اٹھانے میں مشکل ہوگی۔ ان ناموں کی فہرست جنھوں نے انسانیت کو بچا دیا ہے، اور انھیں انعام حاصل کیا ہے خاصی طویل ہوگی۔ مگر یہ محدود طور پر، اور مثلاً اس حجم غلطی کی پیچیدگی مشکل ہوگی، جنھوں نے، کسی انعام کے لے جانے کے بغیر، انسانیت کے لیے اہم و مددگار تھیں۔ کام کیسے ہیں، اس سے کران کی کوششیں نہ تو میری چیز نہ تعلیمی مسوالت کی صورت میں، نہ انھوں نے کھی، جیسے کران کی میں کہا جاتا ہے، انہیں کی مشینوں کو کتابت کی ذمہ داری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خاص اور مزید لوگوں کا ایک مجموعہ جو وہ ہے اور وہ لوگ (اگرچہ کافی ہیں) اس جذبہ غایت پسندی کے پھیلنے کی میں رکاوٹ ہیں جو مختلف ذرائع سے بد عنوانی، جرم اور ہر طرح کے تشدد اور عدم تحش پر کاربند ہیں۔ اس کا ہر کام کے ان شکست نے اکثر و بیشتر عدم برداشت، ظالمانہ شدت پسندی اور اس جذبہ ایذا رسانی سے انکار کیا ہے جو طاقت وران کو کم زوروں کے خلاف، اور پسے ہوئے لوگوں پر ظلم کرنے والوں کو صرف آسان بنا ہے۔ یہی صورت سے خصوصاً دینی کوششوں کے انتخاب کے سلسلے میں ایسے رتب کے جو کبھی کبھی ظالمانہ بھی ہوتا ہے، مگر اہم بل جیسا ہرگز نہیں جو دراصل بدی کے ابدی شجر کا پکا پکا پھل ہے۔ میں اس نکتے پر زور نہیں دیتا چاہوں گا اس لیے کہ میں نہ غلطی ہوں، نہ عاجز ہوں اور نہ معلم، اخلاق۔

میں نے تقریر لکھی ہے اور ان کے لیے مجھے ایک انعام دیا گیا ہے۔ عمر میں لاہور میں، مترجم ادب کا اور موسیقی کا تنقید کا رہی رہا ہوں، اور بے ملازگی اس لیے کہ میں اس حکومت سے وفاداری نہیں کر سکتا جس کو میں پسند نہیں کرتا۔ چند دن قبل ایک غیر ملکی قانون صحافی مجھ سے ملاقات کے لیے آئی تھی اور اس نے مجھ سے سوال کیا تھا "تم اتنی مختلف مصروفیات کے درمیان کس طرح اپنا وقت تقسیم کرتے ہو؟" میں نے

کھنے شاعری کے لیے، اتنے کھنے ترجمے کے لیے، اتنے نئی گیری کے لیے اور بہت مریے زندگی کے لیے؟" میں نے یہ کہہ کر اس کو بھانے کی کوشش کی تھی کہ جس طرح کسی صنعتی منصوبے کے لیے منصوبہ بندی کی جاتی ہے اسی طرح زندگی کی بھی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ دنیا میں سب کا سچہوں کے لیے بہت جگہ ہے، اور دماغ میں ہمارے عہد کی سب سے خطرناک بات ہے کارتیروں کا کاروبار ہے جس سے بالخصوص نوجوان بہت متاثر ہوتے ہیں۔

پھر جہاں میں یہاں اس لیے ہوں کہ میں نے تمہیں کہی ہیں۔ بالکل فطری تخلیق گر مشکل سے نقصان دہ اور یہی کہتے والے کی شرافت کی پہچان ہے۔ مگر یہی نہیں، اس لیے کہ شاعری ایک تخلیق ہوتی ہے بلکہ کہہ لیجئے کہ یہ ایک بھاری ہے جو مخصوص لوگوں میں پائی جاتی ہے اور مدافعت ہوتی ہے۔ میں یہاں اس لیے بھی ہوں کہ میں نے تمہیں کہی ہیں، جو چہ حدود میں شائع ہوتی ہیں، انحد و ترجم کیے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی کہتے ہیں۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں کا تخلیق ہے۔ وہ شاعر کو مضمون کی صعوبات پر کرنے والا کہتے ہیں! (ان کا خیال ہے کہ) کہ مضمون کو اس کی استعداد کی حد تک استعمال کیا جانا چاہیے۔ خوش قسمتی سے شاعری کوئی قابل فرہج شے نہیں۔ یہ ایک عجیب صورت ہے جس کے دوسرے میں ہم بہت کم جانتے ہیں، اتمام کردہ مختلف فلسفی جن میں سے ایک وہ ہے جو ایک شائستہ پسند نہاں تھا اور جس کا خیال تھا کہ تاریخ بھی سمجھ تو نہیں کے تابع ہوتی ہے! اور دوسرے فلسفی ایک کچھوک پیرانی تھا اور دونوں کی بات پر متعلق تھے کہ شاعری کی تاریخ سمجھنا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعری ایک مادی شے ہے، اور میرے نزدیک یہ اولین قبائلی موسیقی کی قحط کے لیے گلے سے لٹکے والی آوازی ضرورت کی پیداواری تھی۔ بہت بعد میں یونان اور موسیقی اس طرح کیے جانے لگے کہ ان کو گانے کہا جانے لگے۔ کہیں ہوتی شاعری انگریز آسکتی ہے مگر اس کا سوتیلے سے مشرب رشتہ صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سوتیلے تعمیراتی انداز میں شروع ہوتی ہے، پھر اس میں وزن ابھرتے ہیں، پھر بند ہونے لگتے، یعنی غیر متحرک پیر۔ Nibelungenlied میں وہ Romance کے رزمیے کی شاعری کا اصل مادہ آواز ہے۔ مگر اس نظم جو دیکھی بھی چاسکتی ہوئی اس کے علاقے Provence کے شاعروں کے ہاں بھی ملے گی۔ آہستہ آہستہ شاعری بھری ہوتی جاتی ہے اس لیے کہ یہ لوگوں سے نقدی طاقی ہے مگر اس میں موسیقیت بھی ہوتی ہے، گویا یہ دونوں کو متحد کرتی ہے۔ قدرتی طور پر بالاعداد پیکروں کی تخلیق سے شاعرانہ بصارت وجود میں آتی ہے۔ جماعت کی ایجاد کے بعد سے شاعری نمودی صورت اختیار کرتی ہے، اس لیے کہ یہ کاغذ کی مادہ جگہ کو پوری طرح نہیں پھر سکتی، یہ نثری ٹکڑوں اور کمرے سے پھری ہوتی ہے۔ خالی جگہوں کی بھی قیمت ہوتی ہے۔ وہ نثر جو تمام جگہ پھرتی ہے مگر زبان سے انہیں کی چاسکتی، بہت مختلف ہوتی ہے۔ یہی موقعوں پر اور ان بیان کے لیے بہترین فریڈ ہوتے ہیں بالخصوص ان کے لیے۔ یہی صورت اس بھائیہ پھر کی ہے جو آئندہ صدیوں کے ایک ہند کی صورت ہوتا ہے، ایک ایسا پھر جو نیسویں صدی میں ہی برائن (Byron) کی

ماکمل فلم Don Juan کی کامیابی کے باوجود غیر مستعمل ہو چکا تھا۔

عمرانیسویں صدی کے کٹھن کے قریب غیر متحرک ہیئت کی حنائی نہ بھارت اور نہ سمیت کو مطمئن کرنے کے قابل رہ گئی تھی۔ انگریزی کی آزاد شاعری اور پابند ہیئت endecasyllabo scoto کے قابل سے یہ بات بہتر طور پر واضح کی جا سکتی ہے۔ اسی زمانہ میں مصروف فطرت کی تخلیق کی طرف قدم بڑھا رہی تھی اور اس کا فوری نتیجہ یا تصویر موت کا ظہور تھا۔ اس طرح ایک طویل عمل کے ذریعہ جس کے بیان کے لیے کافی وقت درکار ہوگا، یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ حقیقت یا حقیقی شے کی دوبارہ تخلیق ناممکن تھی اس لیے کہ کوشش کی صورت میں ہے کار تخلیق نہیں کر۔ اس کے باوجود مصروفی کوششوں سے انکی چیزیں بنائی گئیں جن کی نقل Carvaggio اور Rembrandt جیسے مصور بناتے تو شاید کار تخلیق ہوتے۔ کئی بڑی فلمیں انکی کے شہر و شمس کی ایک بڑی فلم میں ایک ذہنی طور پر معذور بچے کا نقشہ نمائش کے لیے رکھا گیا تھا۔ اصل تھا (très devant) مگر کیوں نہیں؟ فن تو ہر شے کا جواز پیش کر سکتا ہے۔ زمانہ غور کیجیے کہ اس نقشہ کے قریب جانے پر پتا چلا کہ یہ نقشہ نہیں تھا بلکہ وہ قسمت بچہ خود اپنے کبھت و پست میں وہاں رکھا گیا تھا۔ اس تجربے کو ذرا بہتر نہک دیا گیا تھا، مگر کچھ مدتوں میں اگر کھائیں فیئر کے تاہم میں دیکھا جائے تو یہ قلعہ جاتا تھا۔ کئی برس تک یونیورسٹی کے پروفیسر کے محبس کے مہرین بھی فن کی موت کی ضرورت کی تبلیغ کرتے رہے تھے جس کا موقی اثر نہیں ہوا۔

ایک حقیقتوں سے یہ نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں؟ بظاہر فنون امریکی فنون پیمانی دہی جمہوری ہوتے جا رہے ہیں۔ فن کھیت کے لیے اشیاء تخلیق کرنا ہے، تاہم ان کو استعمال کر کے پھینک دیا جائے اور اس کی دنیا کے اظہار میں ہے جس میں انسان ہر شے سے حتیٰ کہ اپنے ضمیر سے بھی، پھٹکار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کی مثال شور و غوغا کی سکی گھنٹیں ہوتی ہیں جہاں لاکھوں لوگوں افراد جمع ہو کر بے ہتھ موٹی کے ذریعے اپنی تنہائی کے بھونک بھونک کو کمال پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ مذہب انسان اس منزل تک پہنچا کیوں نہیں وہ خود اپنا بھوت تخلیق کر رہا ہے؟

مجھے بہت سارے اعتراضات کا اندازہ ہے۔ ہمیں اپنے ساتھ کی ان کے رویوں کو صحیح میں نہیں لانا چاہیے، جو شاید پسے سے موجود نہیں، مگر لوگ ان سے واقف نہیں ہوئے تھے اس لیے کہ ذرا بچہ اللہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہم کو نہ ان کا ہم تھا نہ ان کی شخصیات ہو سکتی تھیں۔

میں یہ بات دیکھ کر آتش چوٹک پڑتا ہوں کہ ایک عام قسم کا تیر مت جیسا، حول ہر طرف (دنیا کے مخصوص اور ہر سکون علاقوں میں بھی) ہمیشہ سے نیا وہ پھیل رہی تھی مگر چوٹ کھ کر نیکیوں ہو جانے والی مسائیلوں پر بھی محیط ہونا چاہیے۔ اس ہم عصر مذہب کی سیدہ میں مظہر رکھے والی مسائیلوں میں عمل کی سرچو فن بھی اپنی پہچان کھود رہا ہے۔ اچھا غی رہا ہے، دیکھو اور انھیں ٹیلی ویژن نے ہماری شعیتوں اور سوچ پر رکھے مواقع کے امکانات کو بھی نہیں جس کر کے رکھ دیا ہے۔ ہر لمحہ وقت کی رفتار تیز ہوتی جا رہی

ہے، اب تو صرف چند ہی پرانی تخلیقات بھی قدیم معلوم ہونے لگی ہیں اور ان کا کوئی جانے کی ضرورت ایک نئی کیفیت کا روپ دھار کر فوری ضرورت ہو جاتی ہے۔ ہمارے وقت کا نیا فن جو ایک حیرت انگیز تماشا ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ ایک مائیک فون کے پیش کا روپ اختیار کرے جس میں تمام فون کے غیر ضروری عناصر شامل ہوں، اور جو سننے یا دیکھنے والے پر کسی قسم کا سائیکی پیغام پھوڑے۔ اس کے وہاں کا *deus ex machina* کریم ہوتا ہے۔ اس کا کام نہ صرف بصری انتظامات کی مراد میں ہوتا ہے بلکہ ان حرکات کا مشہد عطا کرنا ہوتا ہے جن میں یا تو کوئی مقصد نہ ہو، اور اگر ہو تو کچھ اور کی مقصد ہو۔ ان سب میں ایک عجیب قسم کا ہانچہ پن، زندگی پر سب پایاں عدم اطمینان کی کیفیت ہوتی ہے۔ ایسے مہمانانہ خود نمائی کے مظہر اے میں شاعری جیسے نہایت پردہ پوش فن کو بھائیو مقام ملے گا؟ جس کو ہم غنائی شاعری کہتے ہیں، وہ صدیوں میں بنائے گئے اور زمان میں ترقی کیے جانے والے نقوش کی پیداوار ہوئی ہے۔ یہ سب کچھ آج بھی ہوتا ہے مگر کم صورتوں میں۔ پھر بھی ہمارے پاس ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن میں احتفاظ اپنی شاعر بھی نئے وقت سے قدم ملا کر چلتے بھاگتی دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں شاعری ہوتی اور بصری شے ہو جاتی ہے ایک جتنی ہم کی مانند لحاظ برسر میں تھمتے بھاگتی دیتے ہیں۔ ان میں حقیقی معنی نہیں ہوتے، اس مقصد و مرکزوں سے اٹھنے والے ایک نیا ہی ڈھلے کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ ان کو سمجھنے کے لیے عقدہ کشائی ضروری نہیں ہوتی، مگر کچھ صورتوں میں کسی ماہر تخلیق کار کی مدد ضرور کام آسکتی ہے۔ چوں کہ اس لوگ کو شاعری میں بصری پہلو غالب ہوتے ہیں اس لیے نظم ترجمے کے قابل ہوتی ہے اور عارضی تاریخ کے لیے یہ یکساں ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نئے شاعر محض انسانی اسات ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت سارے کمالی ورت جی شعرا لکھ سکتے ہیں نگران کے کھسے ہوئے اشعار نفسی اوصیت کے اور حقیقی سے عاری ہوتے ہیں۔ ایسی بھی شاعری لکھی جاتی ہے جس کو کسی پریشانی مجمع عام میں چھپ چھپ کر سنا دینا ہے۔ یہ کیفیت ان ملکوں میں عام ہوتی ہے جہاں آمرانہ انداز میں حکومت کرنے والے نولے قدار میں ہوتے ہیں۔ اور شاعری کے ایسے پہلو ان ہمیشہ رکتی نہیں ہوا کرتے۔ میں ایک واقعہ سنائی کی اجازت چاہوں گا اس معذرت کے ساتھ کہ یہ میری ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اگر یہ سچ ہے تو اس ذات پر دلالت کرتا ہے کہ اب شاعری کو دو اقسام میں تقسیم کرنا چاہیے، ان میں سے ایک فوری استغاثوں کے لیے ہوتی ہے جو اٹھار کے بعد دم توڑ جاتی ہے جب کہ بصری قسم وہ ہوتی ہے جو خاموشی کی فینڈ سوسکتی ہے۔ یہ کسی دن بھی خواب سے اٹھ سکتے کی طاقت رکھتی ہے۔

کچھ شاعری ایسی تصبیروں کی مانند ہوتی ہے جن کے مالکوں کا پتا نہیں ہوتا نگران کو صرف چند شروٹ کرنے والے ہی جانتے ہیں۔ یاد رہے کہ شاعری صرف سکڑوں اور اسکیوں کے ذہنی اقتباسات یا ٹکڑوں میں نہیں رہتی۔ شاعر کو غم ہی نہیں ہونا پڑتا ہے، اور نہ ہی ہوگا، کہ یہ کسی کسی تک پہنچی ہے۔ میں اپنی ذاتی مثال دینا چاہتا ہوں۔ گلی کے اخبارات کے پرانے ریکارڈ میں ایسے لوگوں کے تعزیت نامے محفوظ ہیں جو

آج بھی زندہ ہیں اور کام کر رہے ہیں۔ ان تعزیت ناموں کو ”شکر پیچہ“ کہا جاتا ہے۔ چند برس قبل *Corniere della Sera* میں میری نظر سے میرا اپنا ”شکر پیچہ“ بھی ترما تھا جس پر *Taulero Zuber* جیسے مبصر، مترجم اور منتقد لندن کے دستخط تھے۔ اس نے کہا تھا کہ ماڈرینی *Mayalovsky* جیسے عظیم شاعر نے لٹری زبان میں ترجمہ شدہ میری کچھ نظمیں پڑھنے کے بعد کہا تھا، ”یہ ہے وہ شاعر جسے میں پسند کرتا ہوں۔“ میں اس کو اطالوی زبان میں پڑھنا چاہتا ہوں۔“ یہ وعدہ ممکن نہیں۔ میرے سب سے شہرہ 1925ء میں مشہور ہونے شروع ہو گئے تھے۔ رابا دسکی نے (جو ریاست ہائے متحدہ امریکا اور دوسرے ملکوں میں سفر پر چکا تھا) 1930ء میں خود دسکی کی قلمی۔

ماڈرینی ایک نقاد گیر اور بلند آہنگ شاعر تھا۔ ”میرے جیسے الفاظ و استعارے نہ سکتا تھا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح بھی ہو، اس کی شخصیت میں مجھے میری نگاہوں کا ایک قاری مل گیا ہے۔“

آپ یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ میں شاعری کے بارے میں انا پرستانہ خیالات رکھتا ہوں۔ صرف چند نفاذ و فروش موزن بگوں کے لیے تھمے کا خیال بھی میرا نہیں تھا۔ بد حقیقت فن سب کے لیے ہے یا کسی کے لیے بھی نہیں۔ مگر جو نظر میں آتا ہے اس کا اصل خالق ہوتا ہے، تاری ہوتا ہے۔ فن، شاعر، حوالی فن، یا وہ فن جو کسی فرضی حاشیہ کے لیے ایک قسم کا مائیگی، مادی پیغام ارسال کرنا چاہتا ہے، اس کے سامنے رہتا ہے۔ رہتے ہوتے ہیں اس لیے کہ دنیا کی آدمی ایک مسلسل ارتقائی کیفیت میں ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک چھوٹے جوتے کو کسی فریم میں لٹا کر دنیا پر ناگہم دیا جائے (جیسا کہ میں نے خود دیکھا ہے) مگر یہ ممکن نہیں کہ کسی قدرتی منتظر، کسی جھیل یا کسی نعلین منتظر کو (اس کی مادی صحت میں) ٹھیس کے نیچے رکھا جائے۔

بد شہر خدائی شاعری نے اپنی حدیں توڑ ڈالی ہیں۔ نثر میں بھی شاعری ہوتی ہے۔ ہر اس ادبی درجے کی نثر میں جو صرف اخلاقی، ماسیحا یا افادی نہ ہوں۔ ایک شاعر چھپا ہوتا ہے جو نثر، یا موزن نثر، لکھتا ہے۔ اسی طرح انہوں شاعر اپنے مصرعے بھی لکھتے ہیں جن کا شاعری سے کوئی عائد نہیں ہوتا ہے۔ مگر اس سے ہم کچھ کم یا بالکل کچھ ہمت نہیں کر سکتے۔ ہر لحاظ دنیا ترقی کر رہی ہے اور کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا، مگر یہ برزخیں کہا جاسکتی ہیں کہ عوامی تہذیب، اپنی تمام تر بے ثباتی اور مازن کے اور باوجود دوری عواقب کے، کوئی ایسی تہذیب نہیں پیدا کر سکتی جو دفعتاً بھی ہو اور پھر تو بھی ہو۔ ہم سب ایسے مستقبل کی تشکیل میں معاون ہو سکتے ہیں۔ مگر انسان کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے جب کہ دنیا کی زندگی بلاشبہ لامحدود حد تک طویل ہوتی ہے۔

میں نے سوچا تھا کہ میں اپنے اس مختصر خطاب کو کیا حوالی ذریعہ ابدیت کی اس دنیا میں شاعری زندہ رکھ سکے گا؟ ”کا عنوان کون گا۔ بہت سے لوگ اس پر حیران تو ہوں گے مگر جب شیخو سے غور کریں گے تو ان کا جواب اثبات میں ہوگا۔ مگر شاعری سے مراد ہی میں جہاں اپنی زندگی کی شاعری ہو تو دنیا بھر میں اس کے

رتقا کی افراط ہوئی۔ اس کے برعکس گمراہ شاعر کو اس شاعری تک محدود رکھیں جو تخلیق کی پریشانیاں اٹھانے اور ان کے خوف سے انکار کرے اور شاعری جو کسی تجربے یا الفاظی صورت میں مائل ہو اور پھر اسے عہد کی سہولیات اور قہر میں کیفیت کو محفوظ کرتی نظر آئے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاعری کی موت کا امکان نہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ نثری نمونے پر شاعرانہ زبان کی گونج کا ایک ٹانڈا بننے کی مثال سمجھا جاتا ہے۔ تعجب ہے کہ دانتے کی "ڈیوائن کامیڈی" صدیوں بعد بھی اپنی بندی کی شریعت میں رہا کی۔ گمراہ Ronsard سے قبل یہ بعد کی فرانسیسی نثر، The Péraide، کا مطالعہ کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ انیسویں نثر نے اپنی تمام تر فزنی اور منطقی پیچیدگی جس کی بنا پر یہ کام کی زبانوں کے مقابل گمراہ بن جاتی تھی، پختگی اور بلوغت حاصل کرنے کی غرض سے، ایک بڑی قدر بازی کھائی ہے۔

اس کا اثر حیرت انگیز رہا ہے۔ The Péraide اسکی قسم کی نظموں کے مجموعے پیدا نہیں کرتی ہیں۔ کراٹوئی dolce sia nuovo نے کیا تھی، گمراہ ڈیویشنزم وایسے پانی و منبع کے ٹکڑے (سعرے) ملے ہیں جنہیں ہم تشبیہاتی شاعری کے عجائب گھر میں سجاسکتے ہیں۔ یہ دماغی اس احساس بحال پر منحصر ہے جس کو ہم نو پیمانے (Neo-Greek) کہہ سکتے ہیں، صدیوں Parnasse جس کی بنیاد کی پیدائش کرے گا۔ اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ غنائیہ۔ مرکتی ہے، پھر پید ہو سکتی ہے، اور پھر مر سکتی ہے۔ گمراہ بھی یہ انسان کی تخلیقات میں سے سب سے پُر اثر تخلیق ہے۔ آئیے ہم Joachim Du Bellay کی ایک نظم کا دوبارہ مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ شاعر 1522 میں پیدا ہوا تھا اور تینتالیس برس کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہ ایک رومن کیتھولک پادری کا بھتیجا تھا جس کے ساتھ اس نے کئی برس روم میں گزارے تھے اور جس سے وہ اپنی پر اپنے ساتھ پیادیت کی بدحوالی کے خلاف شدید نفرت کے جذبات پیدا تھا۔ Du Bellay نے Petrarchan کی (چودھویں صدی عیسوی کے ایلوئی شاعر Petrarch سے متعلق) روایات کی پیروی میں کامیابی، بدنام کامیابی سے، بہت کچھ لکھا تھا۔ گمراہ جو نظم۔ ٹینی شاعر Navagero سے متاثر ہو کر (غائب روم میں لکھی گئی تھی) اور جس سے اس کی شہرت ہوئی تھی، Lore کی وادی کے زمین سبزوں میں کے ماضی کی یادوں کی پیداوار ہے۔ Sane Beuve سے Water Pazer تک، جنہوں نے Joachim کے لیے ایک ناقابل غراموشی خاتمہ تحریر کیا تھا، جہاں تک ممکن تھا یہ منتظر نظم پڑھنی چاہتی تھی ہے، اس لیے کہ اس نظم میں آنکھوں کا تہ مرد اس طرح کیا گیا ہے کہ آنکھیں دنیا کی شاعری کے ذخیرے کا حصہ بن گئی ہیں۔ آئیے ہم اس نظم کو پڑھنے کی طرف اس لیے ہی پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس میں آنکھوں کا ایک اہم کردار ہے۔

A vous troppe legere,

qui d'aee passagere

par le monde volez

et d'un sôlant murmure
l'ombrageuse verdure
doublement esbranchez,

joindre ces violettez,

ces lis et ces fleurettes,
et ces roses icy,
ces vermeillettes roses,
tout freschement ecloses
et ces oedez aussi
De vostre douce haleine
eventez ceste plaine,
eventez ce séjour
ce pendant que j'ahanne

a mon bié, que je vanne
a la chaleur du jour

مجھے غم نہیں کہ یہ نظم روم میں ہے نثار کر دینے والے دفتر کی مصروفیت سے فراوانی خاطر رکھی گئی تھی۔ مگر اس نظم کو اس وقت تک دقتی رکھنے میں Paper کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ ذرا دیکھیے کس طرح صدیوں کے غامض طے کرنے کے بعد بھی ایک نظم کو اس کا شارج مل سکتا ہے۔

اب اس سلسلہ کو سمیٹنے کی خاطر میں ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کروں گا جنہوں نے اس مختصر خطاب کو ایک عنوان فراہم کیا ہے۔ اس زمانے کی مصروفیت میں، جس میں نئی قومیں اور نئی زبانیں بھی تاریخ کا حصہ بنتی نظر آتی ہیں، تو بیلدا مشقی کا مدد کی توقع اب میں شاعری کا کیا مستقبل دیکھتا ہے؟ اس سوال کے بہت سے جواب ہو سکتے ہیں۔ شاعری وہ فن ہے جو تکنیکی اعتبار سے ہر ایک کی پہنچ میں ہوتا ہے۔ بس، شروعات کے لیے روم کا غزل کا ایک ورق اور ایک نظم چاہیے۔ صرف دوسرے مرحلے پر اشاعت اور امتحان کے مسابک پیچا ہوتے ہیں۔

منہ کے۔ ہالی شہر اسکندریہ کے کتاب خانے میں لکھے واں آگ نے یونانی ادب کا سین چوتھائی حصہ جہ کرنا کھ کھینا تھا۔ یہ حال ہے کہ کچھ سے عصر کی میدانی شاعرانہ تخلیقات کو عالمی پیمانے کی آتش زلی بھی ختم

فہمیں کر سکتی۔ مگر اس سوال ہے تخلیق کا، غور و خوض تحقیقات کا جو ہم دے دے اور کے طرز اور قانون کے مطابق ہوتی ہیں۔ تیر چھپنے والی آندھیاں شاعری کی دیویوں کے گھستانوں کو بھی اچھا نا مان کر سکتی ہیں مگر مجھے اتنا ہی یقینی محسوس ہوتا ہے کہ شاعری سے بھری مطلوبہ کتابیں اور بے شمار صفحات وقت سے زور آزمائی کر رہی ہیں۔

مگر جب قدیم شاعرانہ تحریروں کی مدد ملتی ہے مثلاً اثناسیہ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے، اس کی عصری بحالی کا اور اسی کی نئی تشریح کا تو مختلف اقسام کے سوال پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور بدلتا ہے جب شاعری کی بات ہوتی ہے تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جس کی حدود میں رہنا چاہیے۔ آج کل کبھی ہمارے والی شاعری سے عرفی تر ہے بلکہ بڑی قسم کی تر۔ جب کہ موماسا کی سے پر دست تک فن بیان، یعنی ناول، نے بے مثال شاعرانہ تخلیقات پیدا کی ہیں۔ اور فیصلہ؟ بہت سے ادبی نام نہان کھینچے والے اس کے بارے میں تو بات ہی نہیں کرتے اور اس کے برعکس تین گھنٹوں کی بات کرنے لگتے ہیں۔ ہم اس بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں کہ تراجم و ترجمہ کے باوجود قدیم چینی شاعری تو بڑی رتی ہے جب کہ یورپ کی شاعری اپنی اصل زبان میں مذہبوں میں بکڑی رکھی جاتی ہے۔ شاید اس غیر معمولی صورت حال کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب ہم سمجھتے ہیں کہ ہم Po Chuہ کو پڑھ رہے ہیں تو اس وقت دراصل ہم آرتھروائی جیسے باتیں نکالتے ہیں، پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ اس قسم کے بہت سارے سلاطین کا ایک ہی جواب نکلتے گا اور وہ یہ ہے کہ صرف شاعری ہی نہیں، ہر قسم کا فن کبھی وہ جیسے ہم فنی انکھ رہتے ہیں، ایک ایسی برائی کیفیت میں داخل ہو چکا ہے جو انسانی سرنگ سے انسان کی حیثیت میں ہمارے وجود سے، ہمارے اس تصور سے کہ ہم اشرف المخلوقات ہیں، صرف وہ جو سمجھتے ہیں کہ وہی اپنے مقدر کے مالک ہیں، یہ ایسے مقدر کے جس کا کوئی اور حقوق و دعوں نہیں کر سکتی، جڑ ہو ہے۔ لیکن اس پر تعجب کرنا کہ ان کا مستقبل کیا ہوتا ہے، قطعاً اوقات کے ساتھ ساتھ نہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہی سے یہ پوچھا کہ کیا مستقبل کا، بلکہ مستقبل بعید کا انسان، ان بے رحم تصورات کو سمجھ سکتا ہے جن میں وہ اپنی تخلیق کے دن سے (جو ایک لاشیہ ہی عہد کے لئے ہو سکتا ہے) گرفتار رہا ہے؟

ایوند جانسن اور ہیری مارٹنسن

اعترافِ کماں۔ ایوند جانسن آدھی سئوں کی خدمت کے لیے رمان و نکتان کا عہدیت مشہور
کئے والے فنکار ہیں کے لیے۔

پیروی مارٹنسن ان تجویزوں کے لیے جو ٹیٹم کے ایک قہرے کو گرفت میں
کے تیران میں کائنات کا پروں دھاتی ہیں۔

ایوند جانسن

ایوند جانسن کی پیدائش شمالی کے قریب واقع تھوئے سے مقامی مدرسے کی تعلیم اس وقت ختم ہوئی
جب وہ صرف تیرہ برس کا تھا۔ ہیری مارٹنسن کے مستقل کی ابتدا اس وقت ہوئی جب صرف چھ برس کی عمر
میں اس نے ایک قہرے ہی رقم کے لیے اس وقت نیام کر دیا گیا تھا جب وہ ایک لاوارث بچے کی حیثیت سے
مقامی گرجے کی سرپرستی میں قلم زد ہو گئی تھی اس نے مختلف اداروں میں ابتدا کے باوجود دونوں حضرات ایسے بلند مقام
تک پہنچ گئے، یہ معاشرے کی اس واضح تبدیلی کا پتہ ثبوت ہے جو رفتہ رفتہ سرکاری دنیا میں پھیل رہی تھی۔

جائسی اور مارٹنسن بہت سارے پروتھاری مزدور جیتے کے شعرا کے نمائندہ کے طور پر سامنے آئے، مگر ادب کے میدان میں ان کو بے اثر و پھوڑ کرنے والوں کی طرح نہیں بلکہ ادب کو اپنی کارکردگی سے مالا مال کرنے کے لیے ادب میں ان دونوں کی آمد ٹھیکہ تجربہ اور قیمتی قوت کی ایسی دولت مراثی لائی جس کے بارے میں مبالغہ کیا بھی سچہ آسمان نہیں۔

کسی مصنف و راس کے کام کی منزلت کا تعین اس کے شاعرانہ، معاشی اور سیاسی پس منظر کی روشنی میں کرنا ایک اچھا طریقہ کار ہے مگر ضروری نہیں کہ یہ طریقہ کار ہمیں صحیح سمت ہی میں لے جائے۔ لویس ہارن Lucien Maury کے کس کس قسم کے قول کے مطابق ایوانہ جائسی کے ادبی کام سے پورے یورپ کے زرخیز عہد کے سب سے امتیازی اور منفرد کاموں میں سے ہیں۔ اسی کامیابی اور اس کے اثرات کے باوجود شامی سولینڈن کے وراثہ دار چھوٹے سے گاؤں کے ابتدائی مدرسے سے بھاگے ہوئے طالب علم نے اپنے ماضی اور اپنی اصلیت کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ ضرورہ اس ماحول کا قیدی بھی نہیں ہو رہا جہاں سے اس نے ابتدائی قدم اٹھائے تھے۔ اس بات کا ثبوت اس کی سوانحی خودنوشت کہشوں سے ملتا ہے جن میں اس کے ماضی کی محنتیں صاف نظر آتی ہیں۔

وسیع بین الاقوامی کاغذ اور تجربہ نے جائسی کی تحریروں کو بلند مرتبہ کا حامل بنالیا۔ جائسی نے تاریخی مآلوں کا بچے طور پر احیاء کیا جس کی مثال اس کی ہدیٰ تھانک Steps Towards Silence میں ملتی ہے، اپنی طویل تحقیق اور اس کی ژرف نگاہی کے ذریعے جائسی ہمیں وہ سچ دکھانا چاہتا ہے جو کچھ ہم پر گزرتی رہی ہے، جو پسے بھی ہو چکا ہے اور جو سب بھی ہو رہا ہے۔ جائسی و مارٹنسن دونوں حب سے بڑے پروتھاری ادیب ایساپ (Aesop) کی طرح زبیری سے بھرپور اخراجی حکایتوں کے انداز میں اپنا مدعا بیان کرنے کی خدا داد صلاحیت رکھتے تھے۔ ایساپ کی مانند انک خیالات اور بھانے والے انداز سے، جن کی ہر جگہ میں بظاہر بیان کیے جاتے سے گہرا نیا وہ معاشی پوشیدہ ہوتے ہیں، اپنے مقصد کے حال بنائے ان سے بچتے۔ دونوں انومس یافتگان میں کسی حد تک یکسانیت کے باوجود ان کی اپنی اپنی انفرادیت واضح ہے۔ جائسی کی تحریروں میں ایک آزاد ماحشرے کے باشندوں کے لیے جدوجہد سے عبارت ہیں جب کہ مارٹنسن ایک تھائی چند، مرد ہے زامفری اور جب کے میدان کا ناقابل اصلاح سیدھی نظر آتا ہے۔ مارٹنسن کے مآول The Road کا فلسفی اور گروہ گرد کردار بول Bose کی طرح سے اپنی نبت سے مصنف کا مدعا بیان کرتا ہے۔ یوں اپنی خیانتوں اور اپنے اصولوں کی غامی، جو اس کے لیے خوش قسمتی کا باعث ہوئے ہیں، اشتراکیت کی مخالفت کرتا ہے۔

مارٹنسن اپنے فلسفی کردار کی نیابتی کہتا ہے کہ میں وہ کچھ نہیں چاہتا جس کی ضرورتی خواہش کرتا ہے۔ ان اعتقاد کے ذریعے وہ مسلسل مارٹنسن کے انہماک تحریر کے بارے میں بہت کچھ کہہ چکا ہے۔ مارٹنسن زمین اور آسمان کو گوارہ گروں اور آگ اور پانی کو آگ بھڑکانے والے جہاز کی گروہ تھا ہے۔ اس کے نزدیک تصویرت

کی دنیا حقیقی دنیا سے زیادہ ہم اور گھری ہے۔ وہ دکھتا ہے کہ حقیقت تو ہر طرف ریت کے ذرات کی طرح زلی پھرتی ہیں مگر ہم کو حقیقت اور سچائی کے اطمینان اختیار کرنے کی تیز ہوتی چاہیے۔

ایونڈ جانسن 1900 میں سویڈن کے شمالی شہر Svanbjörnsbyn میں پیدا ہوا۔ اپنے چھ بہن بھائیوں میں یونڈ دسرا تھا۔ اس کا باپ پتھر کا مٹے والے مزدور تھا۔ سانس کے ذریعے نذر جانے والے پتھر کے ذرات نے اس کو شخص کی شکل پیدا کر دی تھی۔ اس وجہ سے یونڈ کو اس کی اولاد خاندانے کو لے لیا۔ اس کی پرورش کی۔ مگر صرف چودہ برس کی عمر میں وہ روزگار کی تلاش میں گھر سے نکل پڑا۔

ایونڈ نے معاش کی جنگ وہاں میں بہت سرے کام کیے۔ جنگ میں کمزوری کے سوا کاموں کے ساتھ کام کیا، بیٹوں کے ہٹے پر، رے کی مشین پر، سینما میں ٹکٹ فروخت کیے، دیہاتی اور مہمائی کی، قلم پر ڈیپٹیئر چلے، بیکل اپریٹر کا کام کیا، ریوے بیٹوں کی صفائی کی، کوئلے جھونکے، محوے کے گھٹھے تک بنائے۔ کچھ دنوں بے روزگار رہنے کے بعد ایونڈ نے قرض لے کر اسٹاک ہوم Stockholm کا سفر کیا اور Ensson کے کارخانے میں مددگار مقرر ہوئے۔ انہی دنوں فولاد کے کارخانوں میں ہڑتال ہوئی اور اس کو صرف جب سے حاصل ہونے والی قلیل کمائی چھوٹا کر لیا۔ اس دوران کچھ نوجوان ادیبوں سے شراکت میں ایونڈ نے ایک ادبی تحریک ہے Vår Nud (Our Present Day) کا اجراء کیا جو پھر شائد کے بعد بند ہوئی۔ انھیں دنوں ایونڈ نے (De gröna (The Green Ones) کی ادبی تحریک میں شمولیت اختیار کر لی۔

تقدیر نے ایک بار پھر چنا تھا۔ اور جانسن کو اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ Jopland میں پھر سے جیل خانے اور محبوس کے گھمے بنانے پڑے۔ اس دوران فارشہ وقایع میں قصا پڑھنا بھی جاری رہا۔ 1921 میں جانسن بحری جہاز کے ذریعے جرمنی چلا گیا جہاں اس نے ہولگوں میں مدت دوئے، میسٹ کے کارخانے میں ملازمت کو وراخیاؤں کے لیے کام کر کے ملازمت کی۔ 1923 میں جانسن واپس اپنے وطن سویڈن چلا گیا۔

جانسن کے انساؤں کا پہلا مجموعہ 1924 میں De fyra främlingarna (The Four Strangers) شائع ہوا۔ اس نے اپنی اتنی متنوع زندگی میں تینوں کے قریب ساتھیوں لکھیں۔ اور 1978 میں انتقال کیا۔

ہیری مارٹنسن

ہیری مارٹنسن سویڈن کے شہر Jämskögd میں پیدا ہوا۔ بچپن میں تھکی کی وجہ سے اس کو زوارٹ بچوں کے گانوں میں رہنا پڑا جہاں سے وہ کئی بار بھاگ نکلا۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے بحری جہاز میں چھ برس تک ملازمت کی اور کئی دس برس سکول میں بھی کام کیا۔ جانسن کے متعدد سفر اور طرح طرح کی

مذہبیتوں نے اس کے تخلیق کار ذہن کو بہت سے تجربات سے لاچار کیا اور متوجہ قسم کا مواد پیدا کیا جس سے اس نے بہت استفادہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی چند کتابیں کوکے سے چنے والے جہازوں کے ماحول، مشاہدات و سیاروں سے طریت ہیں۔ ان کی اشاعت کے چند برس بعد ورسوفی اقدار کی کتابوں میں اس نے ایک تنظیم بنائی "نکھ سے دیا اور انسانوں کو دیکھنے سمجھنے اور نہ جاننے کی کوشش نہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے فلسفہ و ادراک، اچھا اور بچھڑے کے تلخ تجربات سے متاثر ہو کر مارٹنسن نے انھیں بھی سمجھنے کی کچھ مجموعے شائع بھی ہوئے۔ مارٹنسن نے اپنی شاعری میں مطلقہ منظر کے لحاظ سے جائے میں پیش کیا اور ہی کو اس نے ہیرہ زار کے انکار "Thinking out in the Meadow" کا نام دیا۔

ہیری مارٹنسن نے 1978 میں اپنے انتقال تک بہتر کتابیں تصنیف کیں۔

ضیافت سے خطاب

ایواند جانسن

ہیری مارٹنسن اور اپنی جانب سے جس قدر مختصر الفاظ میں ہونگا میں ان حالات کے بارے میں تقریر کروں گا جن میں ہم دونوں "مٹا اپنے آپ کو پاتے ہیں۔"

ایک شعر یا اثر میں اپنے خیالات پیش کرنے والا یہ دیکھنے کے لیے کہ گزرتے ہوئے برسوں کے پس منظر میں اس نے آپ تک کیا حاصل کیا ہے، عموماً اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہے اور سے نظر ڈالتا ہے کہ جو کچھ اس نے حاصل کیا ہے اس میں سے کچھ تو قابل قبول ہے جب کہ باقی کم کم قیامت کے قابل ہے۔ اس قسم کی خود تنقید اکثر بہت قیمتی ہوتی ہے کہ یہ ہماری زندگی کا ایک قسم کا ناظر عیاں ہوتی ہے۔ یہ کیفیت رہنمائی دیتا ہے کہ ہمارے دماغ میں ان اساتذہ کی یادوں کو مستحکم کرتی ہے جو ہمارے لیے اہم رہے تھے۔ یہ ہم سے بہت عرصے پہلے جد ہونے والے مفکرین ہوں گے اور شعرا جو باوجود جدا ہو جانے کے اپنے کلام کے عمل پر ناز رہتے ہیں، وہ ہم عصر سمجھتے والے، جوان اور بزرگ، جو ہمارے لیے تخلیقی تحریک کا منبع رہے تھے اور جنہوں نے بعدوں کے راستوں پر ہماری رہنمائی کی تھی۔ ہم تمام تر تھکر کے ساتھ ابتدائی دنوں کے قابل اساتذہ کی یادوں کو نازہ کر سکتے ہیں، اور اس کے لیے ان دنوں کو جب نو جوانوں کی طرح ہم میں سے کچھ سینکڑوں پر حروف کے پیکر اور ان کے تسلسل کی مشق کر رہے تھے تاکہ ہمیں سختی میں حروف کے

ایکے یا بڑے استعمال کا صحیح اندازہ ہونے۔

ایک ادیب کی تحریروں میں، کثرتِ وی کچھ جھٹکتا ہے جس سے زندگی میں اس کا واسطہ پڑتا ہے یعنی وہ تجربات جو اس کی نظم یا نثر کے انداز میں اصرار کرتے ہیں۔ شاعر اور داستان گو دونوں حقیقت کی انجمن کو ہوتی ہے، یہ ان کو نظر ہوتی ہے، صحیح مقررہ شی کے لیے کہانی یا داستانیں گھڑنا کرتے ہیں۔ تخلیقی تحریک کے قریب اور خیالات کے تصور سے گزر کر اور معنی اور الفاظ کو آمیزش سے شاعر اپنے خیالات کی حسیں کر رہا ہے۔ آپ کے شاعر داستان کو اپنے خیالات میں گم ہونے، مسکے چھانے اور مواد تو رکنے میں کبھی کبھی خوب مزے مسرت کا بھی احساس ہوتا ہے۔

تمام تخلیقی ادبیات تخلیقات کے مرکز میں، جو تخلیق کی گئی ہیں اور ان چاروں ہیں انسان اپنے نوٹ کے درمیان اور تین لونی دھند اور درد مندوں میں گھرا سو نظر آتا ہے جن سے دھوپ اور مسرتوں میں اس کا واسطہ پڑ سکتا ہے جو اس کی انفرادی و سماجی تقدیر بتاتے ہیں۔ اس زندگی دنیا میں، ہمارے عہد میں، ہمیں احساس ہوتا ہے کہ وہ قریب، جسم اور روح کی ادیش اتنی بڑھ چکی ہیں کہ انسانی تاریخ میں کبھی نہیں دیکھی گئی تھیں۔ بہت سے سائنس دانوں اور شاعروں نے اپنے اپنے انداز میں مختلف طریقوں اور مقدور کے مطابق، دوسروں کی مدد سے، ایک قابلِ برداشت انداز بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ ہمیں اس بات پر یقین رکھنا چاہیے کہ امید اور ناوے ہمیں ہمارے انتہائی طرف، "انحراف صوب کے لئے، مانعاً ہی کسی کے لیے بھی نہیں" سے بہت قریب کر سکتے ہیں۔

ہیر کی مارٹنسن اور جس سوئڈش اکادمی کے شہر گزار ہیں اس اعزاز کے لیے جو انھوں نے پائی ہے باقی سے، ہم سے کسی اور سے مشورہ ہے بغیر ہمیں عطا کیا ہے اور ہمیں اس منصب پر فائز کر دیا ہے جس پر ہم اپنے آپ کو پارتے ہیں۔

ماتھائی ساتھ ہم کو ڈیڑھ لاکھ روپے کا شکریہ ادا کیا چاہیں گے جس نے انگریزی نوبل کے مستزم نام سے، بغیر کسی احتجاج کے، نوبل مہربانی ہم کو یہاں موجود ہونے کی منظوری دی ہے اور ہم کو وہ کچھ عطا کیا ہے جو ہماری ذاتی کیفیت کو اس سے کہیں بھرپور رہا ہے، ہم جس کی توقع کر رہے تھے۔

پیتربک و ہائٹ

اعترافِ کمال۔ اسی عظیم الشان اور نفسیاتی فن بیان کے لیے جس نے ادب میں ایک بر غلیم کو
جھوٹا کر دیا۔

پیتربک و ہائٹ کی بڑھتی ہوئی شہرت اس کے ان سات ماؤں کی وجہ سے تھی جن میں The
Aunt's Story اوتھن اٹلی روسے کا ماؤل ہے۔ یہ ماؤل ایک تیار اور غیر شادان تندہ آفریدی عورت کے
غیر معمولی احساسات اور جذبات میں ڈوبا ہوا ہے جس میں اس کے امریکا اور یورپ کے تین مائے دماغ
کے تجربات کی بحرین عکاسی کی گئی ہے۔ جس مصنف نے پیتربک کو غیر معمولی شہرت سے نوازا وہ The
Tree of Man ہے۔ یہ ماؤل آفریدی کے معاشرتی ماحول کے بے باک اور تیز فہم نفسیاتی تجزیے سے
عبارت ہے جس میں مصنف نے دو آدمیوں کی لحدوں اور بیرونی مشکلات اور جدوجہد کے تذکرے کے
ذریعے اپنا مدعا بیان کرنے کی دلچسپ کوشش کی ہے۔

پیتربک کے دو اور عظیم ماؤں اس کے بڑے کاماے ہیں جن میں اس نے بڑی ہنرمندی سے
مرکزی کرداروں کے ذہنی اور جذباتی تناؤ کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ ماؤل The Vivisection ایک مصور
کی خونی سوانح حیات ہے جس میں مصنف نے اس مرکزی کردار کے تمام احوال، اقدام اور مقاصد کا
مقتیدی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جو اپنی ان تھک کوششوں سے صوبہ کچھ ظاہر کر دینا چاہتا ہے مگر اس
کوشش میں آخر کار اس کی اور اس کے ایک ساتھی دونوں کی جانیں بھی ضائع ہو جاتی ہیں۔ ماؤل The Eye

of the Storm میں کہانی کا نام ایک قریب ایک سو پچاسی عورت کے اطراف گھومتا ہوا ہے جس میں اس کا حال، اس کا ماضی، اس کا حال اور اس کی زندگی کے سب احوال ایک متحرک متغیر کی طرح قاری کو نظر آتے ہیں۔ پیرک شاید وہ پہلا ناول کا رہے جس نے براعظم آسٹریلیا کو ایک قاتل غبارِ زمانہ کی پہچان دیا کہ جو تمام دنیا میں احترام سے سنی گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نئی اور نظریاتی سطح پر سمکھراویہ کی ترقی، ترویج اور شاعت کے لیے بہت کام کیے۔

پیرک ومانٹ 1912 میں مغربی لندن کے متولی اور اشرافیہ کے علاقے مائنس ہٹ میں ایک آسٹریلیائی گھرانے میں پیدا ہوا۔ وہ جب چھ برس کا تھا تب ہی اس کا خاندان صرف اس لیے آسٹریلیا ہجرت کر گیا کہ اس کی ماں ایسے گھر میں رہنا پسند نہیں کرتی تھی جس پر سسرانی خاندان کے بہت سے افراد اپنی حق جانتیں۔ پیرک کا باپ اور دادا دونوں چھٹی موتی جائیداد کے مالک تھے اور اس پر زراعت کرتے تھے۔ اس کے دادا کو شہنشاہ کی طرف سے ایک جائیداد عطا کی گئی تھی جس میں وہ گلے باغی کرنے لگا۔ پیرک کا سارا خاندان رکن و رکن سے وابستہ تھا اور یہ سارے لوگ اس بات پر فخر بھی کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کے درمیان کسی ایسے شخص کا اچھا رہا جو دیپ دین کا دل دادہ ہو، ایک حیرت انگیز اور عجیب بات تھی۔

پیرک بچپن ہی سے بیمار رہا کرتا تھا۔ اس کو دے کا عارضہ لاحق تھا، اس وجہ سے اس کو شہروں کی فضا سے دور اندرون ملک کے حصے میں داخل کرنا پڑا۔ غالباً یہ دے کے عارضے ہی کی وجہ تھی کہ وہ چنانچہ وہ وقت بجائے کھیل کود کے مطالعے میں مصروف رہا اور بہت کم عمری سے ہی شاعری اور ڈراموں میں دلچسپی لینا لگا۔ پیرک جب تیرہ سال کا ہو تو اس کو آسٹریلیا سے نکل کر انگلستان کے شہر چلٹھم کے ایک حصے میں داخل کر دیا گیا۔ اس لیے کہ اس کی ماں کے قہر کے مطابق جو کچھ بھی انگریزی ہو سب سے اعلیٰ ہونا ہے۔ انگلستان آنے کے بعد پیرک نے یورپ کے کئی ممالک کی سیاحت کی۔ سیکنڈری سکول کے ممالک کا دورہ کیا اور یونیورسٹی کے اس کو بہت متاثر کیا جہاں اس نے ان کے ہندو مذہب پر اسی دور میں ڈیڑھ گ کو دریافت کیا۔

پیرک سولہ برس کا تھا جب وہ آسٹریلیا واپس چلا گیا۔ وہ لندن تک سونیڈوں کے بارے پر کام کرتا رہا جو بقول اس کے دنیا کا بھی ایک قریبی مقام لگتا تھا۔ پیرک نے اپنے پیچھے گھر بھانے کی میز پر ماؤں کھانا ٹروٹ کیا۔ وہ عملیاتی میں لکھنے کا عادی تھا۔ وہ ہیروئی خود پرآم آمیز اور جینینڈ شخص تھا۔ محفلیوں میں بہت کم ہی منہ کھوتا تھا۔ اس کے قلوب کے مطابق کھنڈ کا لڑکے کیسے جیتے اس کا وقت بہت اچھا گزر رہا تھا۔ جب اس کو فرانسیسی اور جرمن زبان پڑھنے کی چوٹ پڑ گئی۔ جب بھی تعطیل ہوتی وہ جرمنی یا فرانسیسی زبان صاف کرنے کی غرض چلا جاتا۔ کیسے جیتے سے فارغ ہونے کے بعد اس کو یہ علم کہ اس نے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی کہ وہ لندن میں بس کراویہ تھیں کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، اس وجہ سے اور بھی گراہی نے اس وقت تک اپنی اپنی کامیابی نہیں دیا تھا۔ اس کے باپ نے، جس نے سب سے اخبار اور چھٹی موتی سکول کے علاوہ کبھی مطالعہ نہیں کیا تھا، حیرت انگیز طور پر پیرک کی مانی سعادت کے لیے رضا مندی کا اظہار کیا۔

بیٹریک کو تھیر سے اتار لیا گیا تھا کہ وہ اپنے میں کم از کم چار مائیں تھیں۔ کے آس پاس ضرور ہوتا۔ اس نے ڈرامے لکھنے شروع کیے جو شروع میں بی بی سی سے ہوتے جن کو وہ پیش کرنے پر تیار نہ تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے بوفی اس کے ماول شائع کرنے پر تیار نہ تھا۔ بس دو چار چھوٹی تھیں اور پھر اچھر کے معمولی رسالوں میں تھیں، مگر وہ کھتا رہا۔ پھر یوں ہوا کہ 1938 کے اوائل میں بیٹریک نے اپنا پہلا ماول Happy Valley مکمل کر لیا اور خوش قسمتی سے لندن سے اس کی اشاعت ہوئی۔ دوسرا شاعر Geoffrey Grigson جس نے اپنے ہمارے میں بیٹریک کو انھیں شائع کی تھیں، ہائمر کے ہاں مسودے پڑھنے پر مامور تھا۔ اس نے اس سلسلے میں مدد کی جس طرح بیٹریک ایک ادیب کے رشتے تک پہنچ گیا۔ پھر بیٹریک قسمت آزمائی سے نیویارک گیا مگر وہاں بھی اس کو مادی ہوئی تا آنکہ Viking Press نے اس کی کتابوں کی اشاعت شروع کی۔

ہائمر جگہ عظیم کے ہیں بیٹریک۔ ہذا نوں ہوائی فوج کے خفیہ ملازمے میں افسر بن گیا۔ اس دوران اس نے یورپ، مشرق وسطیٰ اور قریبا کے مکی ملک میں کام کیا جہاں اس کا وقت مٹی سے اگلے ٹیموں، ہدوت اور رہس کی آرزوں میں گزرتا۔ اس لیے فوج میں ملازمت کے دوران وہ تیار ہو گیا۔

بیٹریک لکھتا ہے کہ اس نے اپنا اول The Aunt's Story جزوی صورت پر لندن اور مصر کے شہر اسکندریہ میں لکھا تھا۔ مائیں اس وقت سے آخری واولوں نے، جو جنگ میں ہوئے نہ تھے، اس کو پڑھنے میں دلچسپی نہیں دہاتی تھیں، اس لیے کہ اس کی انگلستانی زبان ان کے لیے کسی حد تک عجیب تھی۔ اس پر اس کتاب کی ماکائی کا اتنا اثر ہوا تھا کہ ایک وقت میں نے سوچا کہ مجھے اب ایک نفا بھی نہیں سمجھتا چاہیے۔ اس کی دوبارہ شاعت کے بعد آخری کے لوگوں نے اس میں بہت دلچسپی لی۔

بیٹریک نے 1988 تک بارہ ماول، تین انماوں کے مجموعے چار ڈرامے اور چار متفرق کتابیں تصنیف کی تھیں جس میں ایک اس کی خود نوشت داستان حیات بھی شامل ہے۔ بیٹریک و ہائمن نے 1990 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

چونکہ جناب بیٹریک و ہائمن انعام وصول کرنے کی خاطر قیود تحریر میں لائے تھے اس لیے ان کا پیغام مسٹر سڈنی فوٹن نے پڑھا کر دیا۔

مجھے بہت افسوس ہے کہ میں آج جیسے موقع پر اس تک ہوم جاسکر نہیں ہوسکوں گا۔ مگر واپس آنا اور

خیالات میں ہاں نہ رہتا تو کچھ مشکل نہیں ہو کہ، اس لیے کہ میری لوجوالی کے ایک مغربی یوہیں اسٹاک ہوم کے
 ماؤن بار سے آج بھی مرتفع ہیں۔ جب میں سلاہ میں کا تھا تو میرے والدین اور میں ریل گاڑی کے
 فریجے ہالو (Malmo) تک آئے تھے۔ مگر چہاں کوئی بس نہ سگئے ہیں اور ہاں راقیہ صرف چند دنوں پر
 چھپا تھا، میری یادوں میں سمندر کو بیورکنا، اسٹاک ہوم کے ساحل پر چھل قدمی، درانی وقت کے سننے ماؤن
 ہال کی یوہیں ابھی تک تازہ ہیں (میں بتانا چلوں کہ وہ اسٹاک ہوم کی تھا جہاں میں نے اپنی زندگی کا پہلا
 جام شراب نوش کیا تھا)۔ موسم اور میری محنت نے اجازت دی تو میری خواہش ہے کہ میں ایک بار پھر آؤں
 اور ایک لوجوان کی یادوں اور ایک بوڑھے کی ہمتوں سے اس شہر کا نظامہ سوں جہاں سے مجھے پر اتکا ہوا
 اعزاز عطا ہو رہا ہے۔



ہائیمون بوئل

اعترافِ کمال۔ اس کی تحریروں کے لیے جنہوں نے اپنے وقت کے وسیع تناظر اور مباحث کی مانگ بشمول کے ذریعے جس نے اس کے احیاء میں معاونت کی۔

ہائی بوئل جرمن زبان کے ادب کے اعلیٰ پر 1948 میں طبع ہوا۔ اس نے 1972 تک تقریباً چالیس کتابیں تصنیف کی تھیں۔ جن میں کی آخری تصنیف ایک بہت وسیع اور بڑے پیمانے پر سوچا ہوا ضخیم ادب Gruppenbild mit Dame تھا جو 1971 میں شائع ہوا۔ تاہم ادب جس نے جرمن زبان کے ادب کے تمام معرین کے لیے تنقیدی خامہ فرسائی کا دافتر موقع فراہم کیا۔ بہت کم ہم عصر لکھنے والے تھے ناویں اور طریقے سے جانچے گئے ہوں گے جیسے ہائی بوئل کو پہچان دیا۔ اس میں شاید بوئل کے اندر تحریر کا قبل ہے اس لیے کہ اس نے ہائی بوئل کی تخلیق کے موضوعات تک پہنچنے کے لیے نیا انداز نکھارا تھا اور پڑا اور پڑا نظر تھوڑا سا ہے۔ لیکن وجہ ہے کہ بوئل کے اس چشمہ تخلیق سے مسلسل حیرتیں ہی حیرتیں جتنی دھماکے دیتی ہیں۔

سوئڈش کاوی نے جب بوئل کو نوٹیں انعام کے لیے مقرر کئے ہوئے تھے تو ان کی تحریروں نے جرمن زبان کے ادب کے احیاء میں معاونت کی ہے تو ان کی مراد صرف اس کے اسلوب کا مسلسل تھوڑا تھوڑا ہی چٹا نظر نہیں تھا، بلکہ اس سے ان کی مراد کسی شاعرانہ جدت سے تھی جس کے وجہ سے وہ جرمن زبان میں

مانج پھالے طرز انجاء و گورد گنا رہا ہے۔ ”رُخسور سے دیکھا جائے تو بولیں نے جسم کی نمونہ کے ادب میں مانج معروضی انداز بیان سے بہت کم انحراف کیا ہے۔

بول اپنے آپ کو ایک حیرت دار حقیقت کا رچا بنا تھا۔ جس حقیقت نگاری جو انیسویں صدی عیسوی کے مادل کا دوس میں رائج تھی جس کے ذریعے وہ باریک بینی کے ساتھ تمام جزئیات کے مطالعے کے بعد اس کو ایمان داری سے پیش کرتے تھے۔ بول بھی اس طریقہ نگار میں شامل رہتا تھا مگر اس کی ایک منفرد خصوصیت تھی وہ یہ کہ وہ تجزیہ کے موضوع کی تفصیلات میں کسی قسم کی تبدیلی کیے بغیر اس میں ایسے لطیف مزیجات کی سمیٹ کر دیتا ہے جو اسے قاری کے ضمیر کا حتمی ہو جاتی ہے۔

مگر بول کی تحریروں کے لیے کچھ حقیقتیں یاد رکھنی چھیں۔ اس کے اپنے وجود کا پس منظر، دولت جس میں اس کی نسل نے سانس لیا اور وہ ماحول، دور و حالات جن میں اس نے تنہا رہا۔ بول کی تحریروں میں ہمارے لیے اس کے ذمے مادل (Group Portrait with a Lady) کچھ حقیقتیں رہیں۔ چنانچہ نظر آتی ہے۔ کچھ مکتوبوں میں بول نے ادب کے میدان میں کامیابیوں 1953، 1954 اور 1955 میں حاصل کیں جب اس کے لیے بعد ازاں سے متعدد ناول تیار کیے۔

- (1) Und sage kein einziges Wort (And Never Said a Word)
- (2) Haus ohne Häser (The Unguarded House)
- (3) Das Brot der frühen Jahre (The Bread of Our Early Years)

ان تینوں مایوں میں وہ حقیقتیں خود پہ خود انگریزی میں جن کے نگار کے بارے میں مستقل پٹی پوری توانائی کے ساتھ کوشاں تھا۔ اس کا، خفیہ زندگی میں ہونے والے برسوں کے قسط سے جڑا ہوا تھا جو اس کے مادل "das Brot der frühen Jahre" کا عنوان بنی، یعنی زندگی کے لیے مادی کی بھیک مانگنا، مادی کے لیے چوری کرنا، اور مادی کی مایوسی جو اس کی یادداشت پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو چکی تھی۔ بول اور اس کے ہم عصروں کو بہت بڑا وقت سہنا پڑا تھا جن بغیر مرمیہ کے خاندان، گزشتہ وقت کے ساتھ بڑھتی ہوئی تباہی، بیوہ مائیں، ورثہ کی سہولت تھا۔ ان کے سانس بھی محکوم پر کسے ہوئے آمریت کے چنگوں سے ہو کر گزرتے تھے، ان کی آوازوں پر باہر سے بیٹھے ہوئے تھے۔

یہ معمولی بظہر نہیں کرتے بلکہ ان کی آمرانہ بربریت اور جبر کے بعد اتنی بعد قوم اور ملک کے مسائل سے خبردار کرنا ہونے کے لیے ادیبوں، فلسفیوں، محققوں اور دانشوروں کی ایک پوری کھپ تیار تھی۔ جسم کی زبان کے ادب کا جیسا جس میں بول بھی شریک تھا، روایت کے ساتھ تجربے سے نہیں ہو۔ یہ رہا اصل کمال جہاں کے بیچ سے پھوٹنے والے امید کے ایک اکھوے کی مانند تھا جس میں سے نئے نئے شہرے اور خوشیوں پھول نکلے جنہوں نے قوم اور ملک کو مت نئے جذبات سے سرشار کر دیا۔

مائنرٹائی 1917 میں جرمنی کے شہر کولون میں، ایک مجسمہ ساز کے گھر پیدا ہوا۔ 1924 سے 1928 تک کولون ہی میں ابتدائی تعلیم کے بعد سے میں تعلیم حاصل کی۔ 1928 سے 1937 تک ایک سرکاری

خدمت میں پڑھتا رہا۔ 1937 کے موسم بہار میں ہٹلر کے ایک اٹھائی اور سبھی کتابوں کی فروخت کے لیے کام کیا۔ اس ملازمت کو چھوڑ کر یوکل نے ادب کا گہرا مطالعہ کیا اور لکھنے کی کوشش شروع کی۔ 1938 کے موسم خزاں میں یوکل کو سرکاری کام کے لیے جبری بھرتی ہونا پڑا۔ اس کے بعد دوسری جنگ عظیم کے سلسلے میں جبری فوجی ملازمت کرانی پڑی۔ اس سلسلے میں یوکل کو فرانس، سوویت یونین، روڈیہ اور انگلینڈ میں قیام کے مواقع فراہم ہوئے۔ پھر اس کو جنگی قیدی بنا لیا گیا جس سے 1945 میں رہائی ملی۔

یوکل 1945 میں اپنی بیوی اور مشتے دامادوں کے پاس وین کوئٹن پہنچا اور وہاں جنگ کے دوران مسافر بوجھانے والے ایک مکان میں رہتا شروع کیا۔ رات کو اس کی مرمت بھی کرتا رہا۔ یوکل 1945 اور 1949 کے درمیان اٹھائے لکھتا اور رسالوں میں شائع کرتا رہا۔ 1949 میں یوکل کا پہلا مختصر ناول (The Tram was Punctual) Der Zug war pünktlich شائع ہوا۔ جس کی اپنی انجمن "Gruppe 47" میں شہرت کے بعد یوکل کی بہت سے ادبیات سے ملاقات ہوئی جو اس کے گہرے دوست بن گئے۔

یوکل نے 1950 اور 1951 کے درمیان عارضی طور پر ایک سرکاری ادارے Cologne Bureau of Statistics میں ملازمت کی جس کو پچھوڑوں بعد ترک کر دیا اور نکل کوئی طور پر ادب کی تخلیق میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران وہ اپنے بچپن سے شہر کی گلیوں میں ہی مشغول رہا۔

بائسزخ یوکل نے 1985 میں وفات پائی۔



پابلو نیرودا

اعترافِ کمال۔ اس شاعری کے لیے جو اپنی بنیادی عنصری قوت کے دریغے تک براعظم کے خوابوں و رمقدہ کا جیو آسانی ہے۔

پابلو نیرودا کو نوبل انعام دیے جانے کی محفل میں اپنی تقریر کے دوران سوئڈن کی اکادمی کے ایک رکن نے ایک بڑی تاریخی بات کہی، نوبل انعام کسی بڑے دھب کو چار چاند نہیں لگا دیتا، سچ تو یہ ہے خواہ نوبل انعام کو چار چاند لگ جاتے ہیں پھر ملے کہ سچ اویس کا انتخاب ہو۔

پابلو کی شاعری اپنی سچ سست کی بنا پر انسانیت کی بھلائی کے لیے تھی۔ اس کے کلام کے محسوس چند الفاظ میں بیان نہیں کیے جاسکتے۔ نیرودا کی مثال ایک دیونیکل پر مہرے کی ہے جس کو تھلیاں پکڑنے والے جال سے گرفتار کرنے کی کوشش کی جائے۔ نیرودا اس گہری کی مانند ہے جو اپنے غم کو خود شکافہ مریخی ہے۔ نیرودا نے اپنے کلام کے ذریعے تنہا وجود کو دوسروں کے ساتھ رہ کر بیٹا سکھانے کی کوشش کی ہے۔ پہلی میری بہت آسمان بات معلوم ہوتی ہے مگر ہمارے نہانے کی (بلکہ ہرنانے کی) سب سے بڑی مشکل یہی ہے۔ اس نے اپنے ایک گیت میں اپنے بچے۔ انسان اور زمین کے درمیان ہم آہنگی۔ کی وضاحت کی ہے جو ہر عقیدہ سے ایک مکان اٹھانے پر ہے۔

پابلو کی زندگی کا سب سے اہم سوز بے پناہی میں قیام کے دوران آیا جب اس نے اپنے اولی دوستوں

کو امرانہ قوتوں کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا۔ وہیں سے ستائے ہوئے اور زبردستی مجبور بنائے ہوئے لوگوں سے، غم و ہود کسی رسم، رنگ اور شعل کے ہوں، اس کو تہہ در تہہ کی ہوئی۔ اس تجربے نے پابلو کی شاعری کو مستقبل کے تصورات اور نیا دنیائی سے الحاح کے لیے سیاسی اور ثقافتی استعداد کے قالب میں اچال دیا۔ یہ وہ دور ہے جب وہ بغیر کسی حدم کے خود اپنے وطن میں جبر و غلبہ کی کیفیت سے دو چار تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ اس کے ملک پر اس کا اور اس کے ساتھیوں کا پورا حق ہے اور کسی کی عزت نفس کی توہین نہیں ہونی چاہیے۔ اس نے اپنے اس نظریے کوئی کی باقاعدہ بنیاد اپنے ملک چلی میں دہلی پر ڈالی۔ اپنے ملک اور قوم کے ساتھ ظلم کے تناظر میں اس جہد پر ہوتی نے پابلو نیرودا پر اس کی گہیر بنا کر اور بھی واضح کر دیا، یہاں تک کہ وہ اس کے ماضی پر غور کرنے لگا اور مستقبل سے اس امیدیں کرنے لگا جو مشرق سے مغرب تک اس کو ایک چمکتے ہوئے سراب کی مانند نظر آنے لگیں۔

جو کچھ پابلو نیرودا کے ذہن پر قلم سے صادر ہو چکا تھا اس کی تخلیق کے کما جتے ہوئے فاشی کے مقابلے میں ایک شعرے کے برابر بھی نہیں۔ پابلو نیرودا کی شاعری کی پیمائشوں میں ایک پر مارا عظیم انگیزی دیتا دیکھائی دے رہا ہے۔ اس شعرے کے لیے محض اس کی اس ساریوں سے جیسے کسی جنگل کے ماحول سے اصول کی، دہ جتے ہوئے متش فٹس سے احیاء کی توقع کی جائے۔ پابلو کی تخلیق کا ناسات کہ یہ حیثیت کلا دیکھنا اتنا مشکل ہے کہ اس پوشش میں قادی ان ابعاد کی پہچان سے رہ جاتا ہے جو مصنف اپنے عتب میں چھپوڑ کر ہے۔

پابلو نیرودا کا اصل نام میڈینی ریڈارڈو ریس باسوتو (Nefari Ricardo Reyes Basoalto) تھا۔ اس نے تیس سال قبل ہی اپنے قلمی نام سے کستا شراٹ کر لیا تھا مگر بعد میں اس نے قانونی طور پر بھی پنام پابلو نیرودا کی اختیار کر لیا۔ نیرودا جنوبی امریکا کے ہسپانوی زبان کے شعرا میں اب بھی سب سے زیادہ مقبول ہے۔ 1940 کے بعد سے اس کی تحریروں میں جنوبی امریکا کی بائیں بازو کی سیاسی جدوجہد اور ثقافتی اور تاریخی ارتقا کی نقش گری نظر آتی ہے۔ پابلو نے رواں فہمی بھی لکھی ہیں۔ اس کی تیس رواں فہمیوں کے مجموعے (1924) Song of Despair کے سہ زوایں لئے فروخت ہو چکے ہیں۔

پابلو 1904 میں چلی کے شہر پرال (Parral) میں پیدا ہو۔ اس کا باپ ریوے میں مزدور تھا جب کہ اس کی ماں جو اس کی پیدائش کے کچھ ہی دنوں بعد انتقال کر گئی تھی، ایک استاد تھی۔ پابلو کے باپ نے تیموکو (Temuco) منتقل ہوتے ہی دوسری شادی کر لی۔ پابلو کا بچپن تیموکو میں ہی گزرا۔ تیرہ سال کی عمر میں پابلو کو اپنی تعلیم ایک مقدس اخبار میں شائع ہوئی۔ کچھ دنوں بعد ہی سے، جب وہ ہریٹ سولہ سال کا تھا، پابلو نے اپنے قلمی نام سے ادبی رسالے Selva Austral میں اپنی نظمیں شائع کرانی شروع کر دیں۔ پابلو نے اپنا قلمی نام پابلو نیرودا ایک شاعر جان نیرودا (Jan Neroda 1834-1891) کی یاد میں اختیار کیا تھا جو چیکو سلواکیہ کا مشہور شاعر تھا۔ اس ابتدائی دور میں لکھی ہوئی کچھ نظمیں پابلو کے پہلے مجموعے Crepuscular (1923) میں شامل ہیں۔ ایک سال بعد پابلو کی دوسری بہترین تخلیق جوڑ جوڑ چلی تھی، شائع ہوئی۔ پابلو نے

اپنی شاعرانہ مصروفیت کے ساتھ ساتھ سانچاگو (Sanctago) کی چار وزنی آف۔ چلی میں فرانسیسی نثر اور فنِ ہندوئیس کی تعلیم حاصل کی۔

چلی کی حکومت نے 1927 اور 1935 کے درمیان پاؤ کو مختلف سرک میں سمارت کاری کے اعزاز کی عہدوں پر مامور کیا جس کی وجہ سے اس کو برازیل، سیلون (جو اب سری لنکا کہلاتا ہے)، چاد، سنگاپور، نیلس آئرس، بوسنیا اور میڈیا میں قیام کے مواقع ملے۔ اس سفرِ ہلے اور مشکل دور میں جو کچھ پاؤ نے لکھا اس میں دوسری نظمیں کے ساتھ باطنی لاشعوریت (Essence Surrealism) کی نظمیں بھی شامل ہیں جو 1933 (Residencia en la tierra) میں شائع ہوئیں۔ جس سے پاؤ کا ادبی قد بلند ہوا۔

ہسپانیہ کی خانہ جنگی اور پاؤ کے ایک قریبی دوست کی موت نے اس کو چھوڑ کر رکھ دیا اور اس کے رجوع میں اس نے ہسپانیہ اور فرانس سے نئے نئے واپس کر یک جمہوریت میں شمولیت اختیار کر لی۔ اسی سال اس کو حکومت نے ملک میں واپس بلانے کا حکم دیا۔ اس دور کی نظمیں اس کے ثقافتی اور سیاسی خیالات کی تبدیلی کی نشان دہی کرتی ہیں۔ پاؤ کی کتاب España en el Corazón جو خانہ جنگی کے دوران منظرِ عام پر آئی، اس وقت کے ماحول پر بہت اثر انداز ہوئی۔

پاؤ 1943 میں اپنے ملک واپس پہنچا اور 1945 میں سینیئر (Senator) منتخب ہوا، اور اس نے کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ کان کنوں کی مزارع کے بارے میں چلی کے صدر Gonzalez Videla کی حکمت عملی سے احتجاج کے طور پر پاؤ چلی ہو گیا۔ دس سال تک وچلی کے بعد وہ ملک سے فرار ہو کر یورپ کے کئی ملکوں میں رہا۔ اس دوران اس نے جو بھی شائع کیا اس پر اس کے سیاسی نظریات کی تہناب ہے۔ اس کی کتاب (1954) Las Jvas y el Vento کو دو ریڈیو پلی کا روٹا مچھ گیا جاسکتا ہے۔

پاؤ نے اپنے تخلیقی دور میں چالیس کے قریب کتابیں شائع کیں جن میں شاعری، نثر، ترجمے اور ڈرامے شامل ہیں۔ پاؤ نے 1973 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب*

عزیز مآب، خواتین اور حضرات

ہم بہت دور سے آئے ہیں، وہاں سے جو ہمارے عقیدے میں ہے اور ہمارے غور ہے، مختلف تہذیبوں والے، ان نمائندے جو آپ کو ہمارے سے محبت کہتے ہیں۔ ہم یہاں اشتیاق سے اس کے

ہیں، جو آج کی شام دنیا کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ہم آئے ہیں کیسا سے، خرد و جنوں سے، انتہا طبیعت اچھا (Cybernetics) سے، الجبرا سے، بلادیوں سے، شاعری سے، اسی مقام پر سبکا ہونے کے لیے۔ ہم آئے ہیں اپنی تجربہ گاہوں کے مدحیروں سے، اس روشنی سے، بات بات کے لیے جو اسی عزت بخش دی ہے اور اسی نئے ہماری آنکھیں خیرہ کر دی ہے۔ ہم انہی مریافتگان کے لیے، یہ موقع ہے سرسبز اور درد و دلائل کا۔

مگر قبل اس کے کہ میں شکرانے ان کہوں اور محالوں کے گرا اپنے حواس مجتمع کروں، اور اگر آپ اجازت دیں تو، خود اسی مقام سے بہت دور اپنے وطن سے جاؤں تاکہ میں ایک بار پھر اپنی سرزمین کی راتوں اور سویروں میں گھومتا پھروں۔

والہذا اپنے بچپن کی گلیوں میں جاؤں، جنوبی امریکا کے سردیوں میں، پکائن کے درختوں سے نھرے Araucaria کے باغوں میں، مٹی سے آبی مڑکوں پر جن کو چلتے راستے میسر نہیں، اندھین لوگوں سے ملاقات کے لیے جن کو جھل اور یہاں پھوڑ گئے ہیں، ایک ملک میں، ایک اندھیرے براعظم میں جو ابھی تک روشنی کا متنبی ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس روشنی سے روشنی مال کی روشنی سنس رہیں اور سمندر پر روشنی ہوتی جائے، میرے ماضی کو بھی جھگڑا دیں اور مریکیوں کے سختیل روشنی کر دیں جو اپنی عرب نشیں، آفریقی و زندگی کے حق کا دفاع کے کردہ ہیں۔

میں تمنا کرتا ہوں اس لمحہ کا اور موجودہ جدوجہد کا جو میری شاعری میں سمائی ہوئی ہے۔ میں آپ لوگوں سے ظہور کا طالب ہوں اگر میں اپنے شکرانے میں ان سب کو بھی شامل کر لوں جو میرے ہیں، اس زمین کے ہوائے ہونے یا ہی جو میری زندگی کے پُرسرت موقع پر مجھے اپنی نظر کے نگاروں سے زیادہ ہم، میرے پیاروں کے سلسلے سے بھی بلند اور سمندر سے نیدر وسیع لگتے ہیں۔ میں انسانیت کے اس تقسیم جرم ظہیر میں سے ہونے پر فخر کرتا ہوں، چند لوگوں میں سے نہیں بلکہ کثیر تعداد سے، جن کے غیر مرئی وجود نے مجھے اس وقت فرخے میں بلے لیا ہے۔ ان سب لوگوں کی طرف سے اور اپنی طرف سے بھی میں شکر پہ ادا کرتا ہوں سونیڈش آئیڈی کی جس نے میری شاعری کی بنا پر مجھے اعزاز بخشا ہے۔ میں شکر گزار ہوں بڑے جنگلوں، مگر یہ صرف ان دنوں کے اس ملک کا، جو مساوات کا حساس رکھتے ہیں، جو امن سے محبت کرتے ہیں جس کا توازن اور جس کی فراخ دلی چوکی دنیا کو متاثر کرتی ہے۔ میں شکر داکرتا ہوں، اپنی شاعری کا بھی، سدا پیش کرتا ہوں ورے کاغذ کو جو ہم شاعروں کا روزِ انتظار کرتا ہے تاکہ ہم اسی کو اپنے خون سے اور اپنی سیابیوں سے پختہ کریں اس لیے کہ خون داری کی کے لیے شعر لکھتے جاتے ہیں اور لکھتے جاتے جاتے ہیں۔

خطبہ

کشمیر کی طرف

میری تقریر یہ طویل سفر کے بارے میں ہوئی، ایک شہر جس نے ان علاقوں کا کیا ہے جو دور دورہ کے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ ان کا سفر اور ان کی تہائی اسیٹری ٹیویا سے کسی طرح کم ہے۔ یہاں میں اپنے ملک کا خیالہ دینا چاہتا ہوں جو شمال سے جنوب تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم پہلی کے ٹیویا، الگ تھک ہیں کہ ہمارے سرحدیں قطب جنوبی سے جاملتی ہیں جب کہ سینیٹن کا جغرافیہ ایسا ہے کہ اس کا اوپن سارا اس سیاسی کے شمالی طرف ڈاڑھ تک پہنچتا ہے۔

میں اپنے مملکت ملک کے اس علاقے تک گیا جہاں مجھے تھوڑے فاصلات، جو اب حقیقی سیاسی کی مذمت ہو چکے ہیں، کشش کشاں سے گئے تھے، جہاں پہنچنے کے لیے سمنڈ کو اینڈس (Andes Mountain) کو پار کرنا پڑتا ہے۔ یہ سمنڈ مجھے بھی پار کرنا پڑتا تھا تاکہ میں ارضیاتی سے ملنے والی اپنے ملک کی سرحدوں تک پہنچ سکوں۔ بڑے صیب اور گھنے جنگلات کی موجودگی نے اس ناقابل رسائی علاقے کے راستے کو ایک سرنگ کی مانند بنا دیا ہے، جس کے درمیان سے ہمارا سفر ہوا تھا، جو غیر بھی اور مسنون بھی تھا۔ ہم بہت بدام اشاروں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔

وہاں نہ واضح نشانات تھے نہ باقاعدہ پتے ہوئے رستے۔ میں اور میرے ساتھی، پشت گزریں چ سواری بڑے بڑے ٹیلوں، ناقابل حیدر دریاؤں، بندوبست، چوٹیوں، منسلان برف ناریہاں میں جس کی کاؤوں سے بچتے، اس علاقے کی کھوپڑی میں ٹول ٹول کر پیچیدہ راستے پر چلتے اس منزل کی طرف بڑھتے رہے جہاں میری اپنی آزادی میرا تنگ کر رہی تھی۔ جو لوگ میرے ہمراہی تھے ان کو گھنے جنگل سے نرمانے کے گر آتے تھے، مگر حفظ ماتقدم کے طور پر وہ جہاں سے نرمانے اپنے پیچڑوں سے جا بجا ٹیلوں کے ٹولوں پر نشان لگاتے جا رہے تھے تاکہ مجھے تنہا میرے مقصد کے حوالے کرنے کے بعد انھیں نشان زدہ راستوں سے واپس جانے میں آسانی ہو۔ ہم جب لانا تھا تھا نیوں، چڑوں کی ہڈیوں پیدا خاموشیوں، بڑے بڑے اور پھیلے پودوں، صدیوں کے عرصے میں بنی ہوئی بڑے بڑے، نیم ٹکڑے دھنوں کی راستہ روکنے والی شاخوں کے درمیان سے راستہ بناتے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس وقت ہم فطرت کی سشدرد دہیے والی ایسی تھی دنیا میں تھے، جو شدد سرور کی اور برف کے باعث اور بھی خطرناک ہوئی جا رہی تھی۔ تنہا ہیں، خطرناک، تنہا خاموشیاں، اور ہمارے مقصد کے حصول کی نیت، سب مل کر ایک بڑی مشکل بن گئے تھے۔ کبھی تو ہم فرار

ہوتے ہوئے انگریں و بھرموں کے تھوڑے ہوئے بہت خفیف سے نشانات کے سہارے بھی بن جتے۔
 ایسے اس بات کا قطعی یقین تھا کہ جسم کو چھیدتی ہوئی سردی کے موسم اور مہیب طوفانوں کے سچ ان فری
 لوں کا کیا حال ہے۔ اسے کورڈ اینڈس کے خفیف ٹاک پر فانی طوفان اچانک اٹھ کر مسافروں کو سات منزل
 کے برابر موٹی برف کی تھ میں گھر رہتے ہیں۔

ماتے کی دوسری جانب غیر آباد میدان میں جو منظر ہم نے دیکھا وہ انسانیت کے لیے باعثِ شرم
 تھا۔ کئی موسموں کی سوچی ہوئی بھری شخصیں، وہاں سے گزرنے والے ٹیکوں مسافروں کے چہرے
 موت کے گھٹات اتر جانے والوں کی یاد میں باقی ہوئی تھیں، تاکہ دھڑ سے گزرنے والے ان
 لوگوں کو یاد کریں جو وہاں سے آگے نہ نہ سکتے، بس وہیں برف کے نیچے ہمیشہ کے لیے سو گئے۔ میرے
 ساتھیوں نے بھی اپنے عقروں سے بندہ دل شاہِ بلوط کی جھلی ہوئی وہ شخصیں کانیں جو ہمارے سروں سے
 نمرانی تھیں، سرد موسم کے طوفانوں کی آمد سے قبل جن کے بچے بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے بھی ان کا
 معلوم مسافروں کے ہر تہ کے ڈھیر پر گزارنے کے طور پر کچھ نہ کچھ چھوڑا، کسی پر گھڑی کا ایک درجہ کارڈ
 کسی پر ہنگل کے درختوں کی شاخیں۔

میں اب ایک دیوار کھینچا۔ کورڈ اینڈس کی بلدیوں پر لگنے والے چھوٹے چھوٹے چٹریں کو کسی
 وحشی کی طرح، پہاڑ کی چٹان دینے والی ہندیوں سے، آج کی صورت چھوڑتے ہیں اور گرتے ہوئے پانی
 سے زمین اور اسی پر بکھرے ہوئے پتھر کے ٹکڑے اٹھ چکے ہوتے رہتے ہیں۔

نمرانے بار میں ٹھہرا ہوا پانی دریا وسیع و عریض آئینے کی طرح نگر پدید۔ گھوڑے اس میں کود
 پڑے اور زمین پر پاؤں نہ لگنے کے باعث دوسرے کنارے کی جانب پھرنے لگے۔ میرے گھوڑے تقریباً پانی
 میں ڈوبا ہوا تھا، اور وہی مدد نہ ہونے کے باعث میں غوطے کھانے لگا۔ میرے پاؤں بے تحاشا تلنے کی
 کوشش کر رہے تھے جب کہ گھوڑے پناہ سر پانی سے اوپر رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر ہم پانی میں رہے۔ ہم ابھی
 مشکل سے دوسرے کنارے تک پہنچے ہی تھے کہ میرے ساتھ کے ایک تجربے کار دیہاتی نے اپنی ہلکی منہ
 کہتے ہوئے مجھ سے پوچھا، ”کیا تم خوف زدہ ہو گئے تھے؟“

”بہت۔ میں تو سمجھا تھا کہ اب میری ”خوبی وقت“ آیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”مہم اپنے ہاتھوں میں کندیں لیے ہوئے تمہارے عقب میں تھے۔“ انھوں نے جواب دیا۔

”بالکل اسی جلد“ ان میں سے ایک نے تھوڑا سا پڑھنا تھا اور تیز بہریں اسے پہلے ہی
 تھیں۔ تمہارے ساتھ تو وہیں ہوا۔“

ہم اس وقت تک پہنچے جب تک کہ ایک قدرتی سرنگ میں آگئی جو شاید کسی دیو کے حاکمیت اور
 بہاؤ نے کائی تھی یا ان زلزلے کے جھکوں سے بنی تھی جو اس وقت آئے ہوں گے جب یہ پہاڑ وجود میں
 آ رہے تھے۔ ہم اس سرنگ میں داخل ہوئے جو گہرا تھا اس کے مہیب پتھروں میں سے کات کر دئی گئی تھی۔

صرف چند قدم چلنے کے بعد ہمارے کھڑکوں کے قدم بچھنے لگے۔ جب وہ پھر اسی ماحول پر قدم بھرتے گئے تو ان کے پاؤں مڑنے لگے، ان کے سوں میں لگی ہوئی لوہے کی غلوں سے چٹا بولے تھلے گھٹیں۔ کئی دروازے سمجھا کر اب گرا اور تب گمراہ میرا گھونڈ ڈھکی ہو گیا تھا۔ اس کے ٹھونسنے اور پاؤں سے ٹھونسنے بہا تھا مگر اس طویل اور عجیب راستے پر ہم آگے بڑھتے رہے۔

اس قدیم اور مصیبت بھری سفر میں کوئی شے ہماری کھنٹھرتھی۔ اچانک ایک خوبصورت اگلیزئی رے کی طرح ہم ایک خوب صورت بڑھ لڑائی میں پہنچ گئے جو چٹانوں، شگاف، پانی، سبز گھاس، جنگلی پھولوں، حسین چشموں، نیالوں آسمان اور پھولوں سے چھٹی ہوئی مٹی کی گڑوں سے مزین تھی۔

پھر مہموں ٹھہر گئے اور آگاہی کر گئی کہ ہم کسی چارو کے گارے میں ہوں، اسی متبرک مقام کے مہمان کی صورت، اور پھر میں نے جس قریب میں حصہ یاد بھی بہت متبرک، ماحول بھی تھی۔ تمام تھکے ہونے پہ اپنے گھونڈوں سے اتر گئے۔ اس چارو کے پیوں تھے کسی غریبی رسم کی طرح ایک قصب کی کھوپڑی رکھی ہوئی تھی۔ خاموشی سے وہاں موجود سب لوگ ایک ایک کسے ہاتے اور کھوپڑی میں بنے چھوٹے کے ساتوں میں گئے اور گھانے کی شیا رکھ دیتے۔ میں نے بھی اسی رسم میں شرکت کی جو بھٹکے ہوئے مسافروں کے لیے ہوتی تھی تاکہ ہر قسم کے چاند مزین کھوپڑی کی آغوش کے حلقے میں رکھی ہوئی اشیاء سے وقت بھر دست بردار ہو سکیں۔

مگر یہ ماقابلہ اموش قریب اسی پر ختم نہیں ہوئی۔ میرے ہم وطن ساتھیوں نے پانی ٹوکے مار میں اور کھوپڑی کے گرد ایک پاؤں پر اچھلتے ہوئے عجیب قسم کا رقص شروع کر دیا۔ ان کے پاؤں پہلے ہونے والے رقص سے بننے والے گارے کے گرد اندر کی پڑ سب سے تھے جو نہ جانے کتنے زمانے وائوں کے رقص سے بن گئے تھے۔ مجھے کچھ آچھا اندازہ رہا ہو کہ اس دنیا کے دور گارہ دویانے میں بھی اسی طرح ان جانے لوگوں کے درمیان ایک قسم کا رشتہ قائم تھا۔

اپنے ہم سفرؤں کے ساتھ ہم آگے بڑھتے رہے۔ کئی سرحد سے ذرا پہلے، جو مجھے اپنے وطن سے کئی ہفتے تک رکھنے والی تھی، رات کے وقت ہم پہاڑوں کے درمیان ایک درے سے گزر رہے تھے۔ چاروں ہمیں کسی نہ کسی سے پیدا ہونے والی روشنی دکھائی دی جو کسی انسان کی موجودگی کا پتا دیتی تھی۔ جب ہم قریب پہنچے تو ہمیں کچھ نیم شدہ غلامش دکھائی دیں شاید جن کے باپ اچھے چھوڑ کر گئے اور جا چکے تھے۔ ہم ان میں سے ایک میں داخل ہوئے تو فرشتے کے درمیان بڑے بڑے درختوں کے تنے نظر پڑے جو دن رات سفلتے رہتے ہیں اور جن کی چھتوں کے شگاف سے اٹھنے والے دھواں رات کے اندر سے میں گہرے نیلے رنگ کے نقاب کی طرح اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ ہمیں پیڑ کے پیچھے نظر آئے جو بلند پاؤں پر سہنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ "ک" کے قریب کچھ لوگ دروں کی طرح پڑے دکھائی دیے۔ سنانے میں ہمیں بھلائی آواز دے رہے تھے اور راہگیروں سے عبارت گانے کے بدل بھی سنائی دے رہے تھے۔

ہمارے سفر کے دوران یہ کبھی انسانی آواز تھی جو ہمارے کانوں میں پڑی تھی۔ یہ بہت محبت اور رفیق کا تھا،

محبت کی پکار اور گم شدہ بہار کی آرزو کا، ان شہروں کا جہاں سے ہم آ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا گویا ان لوگوں کو خبر نہ تھی کہ ہم کون تھے، ان کو ہمارے فرار کا وقوف ہم نہ تھا، انھوں نے نہ میرا نام نہ تھا نہ میری شاعری سے واقف تھے۔ ہو سکتا ہے گروہ ہمیں چارٹے رہے ہوں؟ دماغ اس ایسا ہوا کہ اس آگ کے گرد بیٹھ کر ہم نے گیت گائے، کھانا پیا اور بھر ہم کچھ ذخیرے اور قدیم دور کے بچے کمروں میں چلے گئے۔ ان کمروں کے درمیان سے گرم پانی کا ایک چشمہ بہتا تھا، خوش فوٹاں پیا ڈسے آتا تھا پانی، جس میں ہم نے غسل کیا، حرارت جو سمندر کوہ سے نکل رہی تھی اس نے ہمیں اپنی گرم ہنوش میں لے لیا۔

گرم پانی سے کھیاں وڈ کر ہمیں خوش ہوئی، پانی سے باہر نکلے تو طویل اور تھکا دینے والے سفر کا سراپا جو تریکا تھا۔ صبح سویرے ہم ان بقیہ چند میلوں کے سفر کے لیے باہر نکلے جو مجھے میرے وطن سے دور کرنے والا تھا۔ ہم کو بہت قربت محسوس ہو رہی تھی، جیسے ہم تیار ہو پھا ہوئے ہوں، اور نئے سرے سے ہمارا ہنسنے ہوا ہو۔ ہم اپنے گھڑوں پر سوار ہو گئے، سارے جذبے سے مرثاں اس قوت کے سہارے چلے جا رہے تھے جس نے ہم کو دنیا کی اس وسیع شاہراہ پر۔ پھینکا تھا جو ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے کچھ طرے یاد ہے کہ جب ہم نے پہاڑ کے دو میلوں کی ان کے گیتوں، نغمہ، گرم پانی، آواز کی جگہ اور سرفراز ہونے کے لیے، ہلکے میں آہل گا کہ ایسی غیر متوقع اور آرام دہ چٹان کے لیے، ٹھکانے کے طور پر چند تھکے دینے چاہے تو انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے اس بہاری خدمت کی تھی، اور کچھ نہیں۔ اس خاموش انکار میں بہت کچھ پوشیدہ تھا جس کا اندازہ کیا جا سکتا تھا، شاید ایک اعتراف تھا، شاید اسی وجہ سے کا ایک غیب۔

خواتین و حضرات

میں نے کسی کتاب سے نظم لکھنا نہیں سیکھا تھا۔ میں کسی مذہب طرز کے بارے میں مشورہ دینے سے پرہیز کروں گا جو مجھے شعرا کو ایک قطرے کے برابر بھی متوقع بصیرت دے سکے اس مقام پر جو اس سے بہت مختلف ہے جہاں سے میں آیا ہوں، جب میں اپنی تقریر میں، غرضی کے واقعات دہرانا ہوں، اس موقع پر کبھی نہ بھولے والے واقعے کو یاد کرتا ہوں تو اس لیے کہ اپنی زندگی میں مجھے ہمیشہ کتنے نہ کہیں سے ضروری مدد فراہم ہوئی ہے، اور وہ فارمولہ جو میرا منتظر تھا میرے لحاظ میں خوف فاعل کرنے کے لیے نہیں بلکہ مجھے اپنے آپ کو بچھڑوانے کے لیے تھا۔

اس طویل سفر میں مجھے نظم لکھنے کے لیے ضروری مواد میلا ہو گیا۔ کچھ تو زمین سے ملے اور کچھ ہوائی سے ملے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعری ہمیشہ ہوائی کاروائی ہے، وہی ہوا بخیرہ، اور اس میں جو عناصر رہ رہ کر سے شامل ہوتے ہیں وہ ہیں تنہائی اور اتحاد، جذبات اور عمل، دل سے قہر یا انسانیت سے، اور حضرت کے تمام مظاہر۔ میرے نزدیک، انسان اور اس کا رویہ، انسان اور اس کا کردار انسان اور اس کی شاعری، یہ سب کچھ ان کو مشغول سے برداشت ہو جاتا ہے جو ہمیشہ حقیقت اور شباب کو ہمارے ذہن میں کھینچا کر دیتی ہیں اس لیے کہ بالکل اسی طرح شاعری ان کو مدافعتی بھی ہے اور متحد بھی کرتی ہے ساری یہی میں سمجھتا ہوں کہ

اتنے دنوں کے بعد بھی میں تجھے نہیں جانتا کہ میں نے کوئی سبق سیکھا ہے۔ اسی وقت سے جب میں نے ایک بہت مشکل ورد کو یاد کیا تھا، جب میں نے ایک نئی کی کھوپڑی کے گرد قلم کیا تھا، جب میں نے ہمدی سے گئے ہوئے آئینار سے غصہ کیا تھا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ سارے سبق میرے اہل خانہ سے نکلے ہیں تاکہ دوسرے اسی سے مستفید ہوں یا پھر یہ سب تجھے ایک پیغام تھا جو مجھے دوسروں کی طرف سے بھیجا گیا تھا، تجھے کسی صورت میں یا اثر میں کی صورت میں۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے یا نہیں۔ اسی کو ختم کیا ہے، میں نہیں جانتا یہ سچائی تھی یا شاعر کی، ماضی تھی یا مستقبل، اور تقسیم سن کا اسی وقت مجھے تجربہ ہوا، وہ تجربات جنہیں میں نے بعد میں شعروں میں اظہار کیا۔

میرے دوستوں، اسی طرح پوشیدہ سچائیوں کا ادراک ہوتا ہے، جنہیں شاعر دوسروں سے سیکھتا ہے۔ اسی کوئی تہائی نہیں ہوتی جس پر قابو نہ پایا جاسکے۔ سارے راستے اسی طرف کی طرف جاتے ہیں۔ دوسروں کو بتانے کے لیے کہ ہم کیا ہیں۔ وہ کسی تہائی اور مشکل، غلط جملوں اور خاموشی کے درمیان سے گزرتا ہے تاکہ ہم اس سرت آئین معام تک پہنچ سکیں جہاں ہم اپنا بے یقین نام لکھ سکیں، اور اپنے درد نگرے گیت گائیں۔ مگر اس نام کا اس گیت میں ہمارے ضمیر کے بہت قدیم رسوخ ہوتا ہے، انسانیہت سکھاتے ہیں اور ایک مشاعرہ مقصد پر یقین رکھتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اگر تجھ یا بہت سے لوگ مجھے فرقہ واریت کا قائل سمجھتے ہیں، اور مجھے دوستی، اے داری کے قائل نہیں سمجھتے، تو میں پنا دقات بھی نہیں سنا چاہوں گا۔ اے میرے نزدیک انعام تراشی یا دقات سنا شاعر کا کام نہیں۔ مگر یہ کہ کوئی شاعر شاعری کا کاروبار نہیں سنا، اور کوئی شاعر اپنے کسی ماضی شاعر پر انعام تراشی کرتا ہے یا مناسب یا نامناسب الزامات کے خلاف پنا دقات کرنے میں پنا وقت ضائع کرتا ہے۔ میں یہی کہوں گا کہ اس طرح صرف ہماری خود کوئی ہی نہیں گمراہ کرتی ہے۔ میرے نزدیک شاعری کے دشمن ان دو ہیں جن سے نہیں ہوتے جو شاعری کرتے ہیں یا کسی کی ثقافت کرتے ہیں بلکہ دشمن تو صرف شاعر کے اپنے اندر انتقال کے فقدان کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے کسی شاعر کے دشمن نہیں ہوتے سوائے اس کی اپنی کمزوریوں کے جس کی بنا پر اس کے دل بند اور فراموش کردہ ہم عصر اس کو سمجھ نہیں پاتے، اور یہ کیفیت تمام عہد ورتہ ادماک پر یکساں رہی ہوئی ہے۔

شاعر "دیوانا" نہیں ہوتا۔ جی نہیں! وہ "توہینا" نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کے مقابلے میں جو دوسری حقیقتوں اور پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں، شاعر صوفی کا درجہ نہیں پاتا۔ میں نے بار بار کہا ہے کہ بہترین شاعر وہ ہے جو دنیا نہ ہمارے دنیوں تو دیکھتا ہے، یعنی وہ قریب ترین ماضی جو خود کو خدا نہیں سمجھتا۔ وہ آگاہ دیکھنے، تنور میں روٹی لگانے، دیکھنے والی وقت تک پکانے جب تک وہ سنہری نہ ہو جائیں اور ہمیں روٹی کی فراہم کرنے جیسے سیدھے سادے کام کو بڑے فخر سے کرتا ہے۔ اور اگر شاعر اپنے ذہن میں کھانا سیدھا سادہ احساسات نے جس کا سبب ہو جاتا ہے، تو یہ کام بھی، سادہ ہو یا مشکل، ایک بے کراں عمل میں تبدیل

ہو جاتا ہے جو ایک برادر کی بنائے ہوئی نوٹ انسان کے ماحول کو تبدیل کرنے اور انسان کی رہنمائی ضروریات، مثلاً دانی، سچائی، مشروب اور خراب فرائض کرنے کا کام انجام دیتا ہے۔ اگر شاعر کی بھی کمال نہ ہونے والی جدوجہد میں ہاتھ ملنے کی غرض سے شرکت کرتا ہے تو پھر اس کو ہر چیز میں شریک ہونا پڑے گا، پسند نہانے، مٹاؤں پکانے، مشروب بنانے اور انسانیت کے تمام خرابوں کو مچھ گھٹانے کے لیے۔ صرف اسی ماز میں انداز میں عام آدمی بن کر کیا ہم شاعری کو وہ تقسیم اسعادت دے سکتے ہیں جو ہر عہد میں چھٹکے کی طرح رفتہ رفتہ اپنی گئی ہے، بالکل اس طرح جیسے ہر ٹوک ہر عہد میں آہستہ آہستہ گھٹائے گئے ہیں۔

ان غلطیوں نے جو مجھے سچائیوں کی طرف سے گئی ہیں اور ان سچائیوں نے جو بار بار مجھے غلطیوں کی طرف سے گئی ہیں مجھے اجازت نہیں دیتی۔ درمیان میں نے بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ میں وہ نئی کامیابی تلاش کروں، یہ سیکھنے کی کوشش کروں کہ تخلیقی عمل کیسے ہوتا ہے، ادب کی ان بلند چوٹی تک پہنچنے کی کوشش کروں جن تک رسائی دشوار ہوتی ہے۔ مگر مجھے یک بات کا احساس ہو رہا ہے کہ وہ ہم کی لوگ ہیں جو پتی مشورہ سرری کے درسیے بدلتے ہوئے کو موت دے رہے ہیں۔ جو وہ ہم مستقبل کرتے ہیں، وہ کہا چاہیے یہ وہی ہمارے مستقبل کی ترقی میں رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں۔ ہم کو حقیقت اور حقیقت پسندی کی طرف جانے والا راستہ محدود جاتا ہے، تاکہ ہمیں ہر شے کا جو ہمیں گھبرائے ہوئے ہے، ہر تہذیبی کے طریقوں کا احساس ہو جائے، اور پھر ہم دیکھتے آتے، جب بہت دیر ہو چکی ہے، کہ ہم نے ایسی مباحہ آمیز حد بندی کر رکھی ہے کہ ہم ہر نئی روح کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں بجائے اس کے کہ ہم زندگی کے پھولوں کو کھسنے کا موقع فراہم کریں۔ ہم زبردستی اپنے آپ پر ایسی حقیقت پسندی جاری کر رہے ہیں جو عمارت بنائے بغیر ہی بعد میں ہمارے لیے عمارت کی امانت سے زیادہ بوجھ بن جاتی ہے، جب کہ عمارت بنانا ہمارے فرائض میں شامل تھا۔ اس کے برعکس اگر ہم کسی کچھ میں نہ آنے والی چیز کی ماعتولیت میں تیار رہیں (ایسی شے کی ماعتولیت میں تیار ہو بہت کم لوگوں کی کچھ میں آتی ہو) تو کئی غیب اور ذاتی ذہنیت کی شے کی ماعتولیت میں تیار ہو اس میں سے حقیقت اور ذات کے نمونے کے ساتھ پیدا ہونے والے فطری کماؤ کو اسے تبدیل کر دیا اور اس میں سے خود کو ایسی ناممکن کیفیت کے درمیان، گمراہ ہوئے چلوں کے کچھڑ کے دریاؤں کے تھپ پتے ہیں، جہاں ہمارے پاؤں دھنستے چلے جاتے ہیں اور ہم کسی سے رابطہ کرنے کے قابل بھی نہیں رہتے۔

یہاں تک ہم لوگوں کا سوال ہے، یعنی ہم تو روزمرہ کی غلطیوں میں رہنے والے، نکتے پڑھنے والے لوگوں کا، جن کو بدوست سے مل جاتا ہے کہ ہم آکر اپنے خون، اپنے گوشت و پوست سے ان غلطیوں کو پڑ کریں۔ ہمیں خود پڑنے کی اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس دہا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ہمیں ایک ایسی دنیا کے ساتھ نہایت تنہائی کا اظہار قائم رکھنے کے فرائض بھی ادا کرنے ہوتے ہیں جو حقیقی تو ہے مگر غلطیوں، سزاؤں، اور دھوکوں سے کم بھری ہوئی نہیں ہے اس لیے کہ یہ حقیقی ہے۔ اور ہمیں ان پرانے شعلوں کو دوبارہ جگانے کی ذمہ داریوں کا بھی احساس ہے جو پتھر کے محسوس، قدیم کھنڈروں، سچ زمین پر پھیلی ہوئی

خاموشیوں، دنی کے ذہنی فوں کے گھٹنے جھکیوں اور مہمانی بھلی کی طرح چنگھڑتے ہوئے دیوڑوں میں سو رہے ہیں۔ ہمیں ایک گونگے براعظم کے دو دروازہ عاقوں کو الٹا دے سے بھرا ہو گا جب کہ ہم قصے کہانیاں گھڑنے اور عام دیکھنے کے نقشے میں صحت سمجھتے ہیں۔ شاہی بھرے محلے میں بھی بات فیصلہ کن ہے اور اگر ایسا ہے تو باتوں کو ضرورت سے زیادہ مزہ چاہیے اور خوش کرنے کی میری عادت اور تیرہری لائف زلی تھو نہیں سٹائے۔ س کے کہ یہ کچھ ایک عام امریکی باشندے کا روزمرہ کا طریقہ ہے۔ میری نظموں کے ہر ایک کھوے نے کسی ایک مرئی شے کی طرح اپنی جگہ پر ٹھہرے ہوئے کا فیصلہ کیا ہے، میری ہر ایک نظم نے کام میں آئے واپس پر زہ پختے کا دعویٰ کیا ہے، میرے ہر گیت نے چار ماہوں پر ماہ نامی کا نشان بن کر سب لڑوں کو خدمت کرنے کی کوشش کی ہے، یہ ایسا پتھر یا لکڑی کا ٹکڑا بننے کی کوشش کی ہے جس پر دلی، یہ بعد میں آئے والے کوئی، سچے نشان کندہ کر سکے گا۔

اس قسم کے انتہائی سماج تک شعری ذمے داری پھیلانے کے بعد، صحیح ہو یا غلط، میں نے معمم امداد کرنا تھا کہ زندگی اور یہ دلی کے سامنے میری نظریاتی دنیا کساری سے ساتھ لیجے کا ہونا چاہیے۔ میں نے یہ فیصلہ اس وقت کیا جب میں نے بہت ساری بند مرتبہ مصیبتیں، مجرمانہ جرائم اور عاں شان ہزیمتیں دیکھیں۔ امریکا کی جدوجہد کے اکھڑے کے سچ میں نے دیکھا کہ میرا انسانی فرض کچھ نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں دلی و جان، امید و شکائیف کے ساتھ عوام کی محکمہ اور وسیع طاقت کا ہم نو ہو جاؤں اس لیے کہ اسی مقبول دھڑے کے ذریعے قوموں کے لیے اور مصنفین کے لیے ضروری تبدیلیوں کو نافذ کرنا ہوتا ہے۔ اور اگر میرے دیوں نے ہوتا تھا تو انتہائی خدمت اٹھائے ہیں۔ اب بھی اٹھاتے ہیں تو سچ تو یہ ہے کہ وہ فائدہ اور نظام ممکنات کے مصنف کے لیے ہیں تو اور دائرہ نہیں پاتا، اگر ہم تعلیمات کو بھٹکتے پھولتے دینا چاہتے ہیں، اگر ہم قدرمند ہیں کہ لاکھوں انسان نہ ہمیں پڑھ سکتے ہیں، بالکل پڑھ سکتے ہیں نہ ہمیں کھ سکتے ہیں نہ بالکل کھ سکتے ہیں وہ ایسی عزت کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں، جس کے بغیر ان کے لیے ایک مکمل انسان بننا ممکن نہیں۔

بہیں لوگوں کی خسارہ اپنے پر زندگی دہشتے میں ہی ہے جن کے عقب میں صدیوں کی بدعتوں کا بوجھ آکھٹا پڑا ہے، نہایت بھلی ٹوٹ پائے و پاکیزہ وہ جنہوں نے جو ہر ت اور فنی دھاتوں سے عاں شان مینا و خیر مپے تھے، جن کے پاس بے حد قیمتی اور چھپ دار گھینے تھے، لوگ جن کی نواہ دیا کی طاقتوں کے عہد میں جو آج بھی چلی آ رہی ہیں، چونکہ ان کی ملکیتوں سے محروم اور نواہ دیا گیا تھا۔

ہوئے بنیادی بنیاد ستارے جدوجہد اور امید ہیں۔ مگر تھا جدوجہد جسکی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے، نہ ہی تھا امید۔ ہر انسان میں مجتمع ہوتے ہیں، گزیرے ہوئے مہد کے نشان، مجموعہ غلطیاں، اذیتیں، اپنے وقت کی شدید روش اور تاریخ کی رفتار مگر میرا کیا ہونا، اگر مثال کے طور پر، میں نے عظیم، امریکا براعظم میں جاگیر داروں کے نظام کے استقرار میں معاونت کی ہوتی؟ تو پھر میں کس طرح سو فیصد کے عطا کیے ہوئے اعزاز سے مزین، تھا اٹھ سکتا تھا، مگر مجھے اس بات پر احساس تھا کہ نہ ہونا کہ میں نے بھی اس

تبدیلی کے عمل میں، جو ب میر سے ملک میں آ رہی ہے، تھوڑا ہی سہی نہیں بات چیت بنا رہی ہے؟
یہ سمجھنے کے لیے کہ بہت سے مختلف کیوں ماضی کی بے عزتی اور لوٹ مار سے اپنے فائنل پیمانہ
چاہتے ہیں جو عظمت کے طوق نے امریکی عوام پر رد رکھا تھا، ضروری ہے کہ پہلے ہم امریکا کے نقشے پر
نظر آئیں تاکہ ہمیں اس کے عالی شان تنوع اور وسیع مددوں پر مبنی کائنات کی فطرتی کا اندازہ ہو سکے جو
ہمارے خلاف پھیلے ہوئے ہیں۔

میں نے منقسم نسلی داروں کا مشکل راستہ اختیار کیا ہے اور سوچا کہ مرکزی نقطہ کی طرح
بچانے کی فکر پر مشن کے ذریعے کی فطرتی کے میں نے تمام تر کشمکش کے ساتھ اپنی خدمات ان بد عزت
حالات کے سپرد کر دی ہیں جو کبھی سمجھا نہیں جاسکتی ہیں مگر جو بغیر مثال کے، مافرانوں کی
خلاف تاریخی اور خود ہمدردی کی بے صبری کے خلاف جدوجہد کے لیے ہر روز پیش قدمی کرتی ہیں۔ اس لیے
کہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک شاعر ہونے کے ماتے میرے فرائض میں رنج و اعلیٰ محبت اور لامتناہی شوق کے
ساتھ نہ صرف پھولوں اور میوؤں کی مٹری سے دیہاتی مثال ہے بلکہ بے دلائل انسانی معروضیت سے بھی جس کو
میں نے اپنی شاعری میں شامل کیا ہے۔

آج پھر سے سوچیں ہونے کا آگے ہیں جب شکستہ فطرتوں میں سب سے بڑھ کر ایک اشد انگور دہلی
نظر شاعر نے پیشین گوئی کی تھی کہ ”صبح دم، سوزاں صبر سے لیں ہمیں فریب شہر میں ضرور داخل ہوں گے۔“
میں Rimbaud کی اس پیشین گوئی پر پورا یقین رکھتا ہوں۔ میں ایک تاریک علاقے سے تعلق
رکھتا ہوں، ایسی سرزمین سے جو اپنی جغرافیائی کیفیت کی وجہ سے سب سے الگ ہے۔ میں سب سے زیادہ
فراموش کردہ شاعر تھا اور میری شاعری مقامی، مظلوم اور دیہاتی تھی۔ مگر میں نے ہمیشہ انسان پر اعتبار کیا
تھا۔ میں نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں وہاں تک پہنچ گیا ہوں جہاں میں آج بھی
شاعری اور اپنے پوچھ کے ساتھ کھڑا ہوں۔

آخر میں، نیک خواہشات رکھنے والوں سے، مزدوروں سے، شاعروں سے کہنا چاہوں گا کہ
Rimbaud نے ایک سطر میں ”صبح دم، سوزاں صبر سے لیں ہمیں فریب شہروں میں ضرور داخل ہوں گے۔“
پورا مستقبل سمویا ہے جو تمام انسانیت کو روشنی، انعام اور عزت بخش دے گی۔
اس طرح گایا ہو گیت نالغ نہیں ہوگا۔

الیزا اندر ایساوچ سولزے ٹسن

اصرافِ کمال۔ اس انفرادی قوت کے لیے جس کے ذریعے اس نے روسی ادب کی مائتزمیہ ولایات کی پسند کی ہے۔

ایلیزا اندر ایساوچ سولزے ٹسن نے اپنی تحریروں میں دیوستوئسکی اور لاسٹوئے کی حقیقت پسندی و رویت کی پاک ناری کی اور ساتھ ہی اس نے شرق اور غرب دونوں میں موجود فرقوں کے بارے میں بھی حقیقت پسند نہ مائے نئی کی ہے۔ اس نے تیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی میں مصیبت یونین کے جیلوں اور اسپتالوں میں گزرا ہوا صبح و شام کے اپنے تجربے کی بنیاد پر کئی اہم تصنیف کیے۔ بعد میں اس نے کئی جلدوں پر مشتمل اپنی ضخیم کتاب (1983-1991) The Red Wheel میں روسی انقلاب روس کے دور کی تاریخ کو دوبارہ لکھنے کا چارٹریٹ کیا۔

ایلیزا اندر جنونی روس کے اس علاقے کے ایک قزاق بالٹش درخانہ ان سے تعلق رکھتا تھا جو ب قزاقستان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ دریائے سود (Black Sea) اور بحرِ قزاق (Caspian Sea) کے درمیان شمالی مینڈز کے پہاڑی علاقے سے Caucasus Mountains میں واقع شہر Kislovodsk میں 1918 میں پیدا ہوا۔ انیسویں صدی کا باپ، جو زار روس کی فوج میں امر تھا، اس کی پیدائش سے چھ ماہ قبل ہی ایک شکاری حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ انیسویں صدی میں اس نے صحابی کی خاطر ٹائپسٹ کی ملازمت کر لی اور اس

طرح پیش کی پذیرائی کی۔

ایسرا اندر پڑھنے لکھنے میں بہت ترقی تھا عمر اپنے خاندان کی عمرت کی وجہ سے اس کے ماسکو میں چار ادب پڑھنے کا مادہ ترک کر دیا اور دوستوں پولی ورنی میں ریاضی اور طبیعیات پڑھنا شروع کیا جہاں سے 1941 میں گریجویشن مکمل کر لیا۔ بعد میں اس نے ماسکو پولی ورنی سے خود کتابت کے ذریعے ادب کی تعلیم حاصل کی۔ دوسری جنگ عظیم میں ایسرا اندر روسی توپ خانے میں کپتان کے عہدے تک پہنچا گیا تھا مگر 1945 سے 1953 تک قید میں رہا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے اپنے ایک خط میں جوزف اسٹالن پر "موسٹچوس والا آدمی" (the man with the mustache) کہہ کر نکتہ چینی کی تھی۔

ایسرا اندر ماسکو کے قریب اور قزاقستان کے کمپ Elbasan میں کئی برس تک سید رہا۔ اپنی ریاضی اور طبیعیات کی اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے اس کو جسمانی مشقت والے کاموں کے بھیائے سیاست قیدوں کے لیے بنائے گئے کمپ میں رکھا گیا جہاں اس کو مزدور کے طور پر استعمال کیا گیا۔ بعد میں اس کو قزاقستان کے ایک جبری مشقتی کمپ میں منتقل کر دیا گیا جہاں اس کو پیٹ کے سرحدات کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ 1953 سے 1956 تک ایسرا اندر قزاقستان کے ایک گاؤں میں قید رہا جہاں اس کو ریاضی اور طبیعیات پڑھانے پر مامور کیا گیا۔ یہاں وہ خفیہ طور پر تصنیف میں بھی مشغول رہا۔ فوٹو فستی سے ناامید گے ایک پیش میں علاقہ کے دھم سرحدان سے شناہولی ہوئی۔ قید کے دوران کے ایسرا اندر کے تجربات اس کے پسے ادب کی بنیاد بنے۔ قید سے رہائی کے بعد Riazan میں استاد کی حیثیت سے مقرر رہا۔

بیسویں سال کی عمر تک ایسرا اندر خفیہ طور پر لکھتا رہا تھا مگر کچھ بھی شائع نہ سکا۔ پہلی بار پمپوف کے جوزف اسٹالن پر سرعام نظریاتی حصے کے بعد سیاسی احتساب اور قطع برید میں مرنی آئی اور ایسرا اندر کی پہلی کتاب One Day in the Life of Ivan Denisovich شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ ایسرا اندر کی اس کتاب اس سے روسی قید خانے کے تجربات کے ادب کی ابتداء ہوئی۔ اس ماویں میں ایسرا اندر نے ایک تیسرے شخص کے بڑا ماست کلام کے ذریعے مشقتی کمپ کے صرف ایک دن کی روداد بیان کی ہے۔ یہ کتاب روس اور مغربی ممالک میں بہت مشہور ہوئی اور اس کا قابل دوستوں کی کتاب House of the Dead سے کیا گیا جو ایسرا اندر کے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی۔

1963 اور 1966 کے درمیان ایسرا اندر کے صرف چار ماول شائع ہوئے۔ اس کی ساری تحریریں سرکار کی قطع و بند کے مواصل سے گزریں۔ کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ خروشیوف نے ہزاروں کمپے لگے اور روسی فید KGB نے ایسرا اندر کا V KRUGE PERVON اور دوسری تحقیقات ضبط کر لیں۔ اس پر احتجاج کے طور پر ایسرا اندر نے تحقیق کا روس کی انجمن کو ایک کھلا خط لکھا مگر اس دوران اس کے سارے مسودے روس سے باہر پہنچا دیے گئے تھے۔ ان تحقیقات نے ایسرا اندر کو حکومت کے سب سے بڑے تنقید کار کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت عطا کی۔

یورس پوسٹریٹس کو نو بیل نعام ملنے کی طرح ایسٹونڈر کے غلام کو بھی روسی حکومت نے روای کے خلاف سپاہی دشمنی کا قتل کر دیا۔ اسی دوران اس کی ایک اور شاخ Archipelago Gulag متحرک عام پڑائی جس میں ایسٹونڈر نے مشتعل کمیوں میں کیے جانے والے مٹا کر کے موت کے طرے پر دستاویزات، نیاقی چا بات اور چشم دید گواہوں کی اسناد پیش کی جس پر روسی حکومت کے نزدیک شکیب انگیز تھیں۔ ان ساری تفصیلات نے روسی حکومت کو غصہ ماک کر دیا اور ایسٹونڈر کو غدار کی کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ 1974 میں مصطفیٰ کو ملک بدر کر دیا گیا اور وہ سوئٹزرلینڈ چل گیا جہاں سے وہ 1976 میں امریکا منتقل ہو گیا۔

سوویت یونین کے اختتام کے بعد ایسٹونڈر 1994 میں اپنے وطن واپس چلے گئے اور اس کے ساتھ ہی اس کے خلاف غداروں کا الزام واپس لے لیا گیا۔ ایسٹونڈر کا نہایت شاندار استقبال ہوا، اس وقت کے روسی صدر بوریس یلسن نے اس سے ملاقات کی اور اس کی بڑی پوزیشن سے خطاب کا اعزاز ملا۔

ایسٹونڈر نے تیس سے زائد کتابیں تصنیف کیں، وہ ابھی بدقیمر حیات ہے۔

خطبہ

(1)

جس طرح کسی الجھے ہوئے وحشی انسان کو سمندری جہروں کی پھینکی ہوئی کوئی حیرت انگیز شے مل گئی ہو، ریت سے برآمد ہوئی، یا آسمان سے گرنی ہوئی کوئی لامتناہی چیز، نا قابل بیان ہیئت اور خطوط کی حاملہ جو پسے تو دھیمے دھیمے چٹکتی ہے اور پھر اچانک ایک روشنی کا جھماکا پیدا کرتی ہے۔ اور وہ اس کو الٹ پلٹ کر یہ معصوم بنا چاہتا ہو کہ یہ ہے کیا چیز، اس کا کیا کیا جائے، اور اس کو کس طرح استعمال کیا جائے، مگر اس کو اس کی اصل صلاحیت کا علم نہ ہو۔

کچھ اسی طرح ہم بھی باتھ آئے ہوئے کہا لیں پورے کو اپنے، تھوں ملے لیے، اعتماد کے ساتھ اس کی ملکیت کا دعویٰ کرتے ہوئے، برونی دھناتی کے ساتھ اس کو برتتے ہیں، اس کی تھوڑے کہتے ہیں، سے نیا روپ دیتے ہیں، غرور و خست کہتے ہیں، صاحبانِ اقتدار کو خوش کرنے کے لیے استعمال کہتے ہیں، کبھی اس کے تھوں گانوں کے ذریعے مانت کتب لے جانے جاتے ہیں، دل بہلاتے ہیں، سیاست اور تک نظر مانتی متعدد کے لیے استعمال کہتے ہیں۔ مگر غرض کہ ہمارے ہاتھوں میں ہوتا ہے نہ اپنی ملکیت سے الگ ہوتا ہے بلکہ ہر موقع پر، ہر آنہ نش میں جیسے اپنی اندرونی روشنی کی کچھ کرنیں ہی عطا کرتا ہے۔

حکمرانی بھی ہم اس ماضی کے کلل کو اس کے پیکر و قیام میں کرتی ہیں گے؟ کسی میں جنت ہے جو کہ
نئے کر اس نے فن کی تعریف کی ہے، وہ اس کے سر سے پہلوؤں کا شمار کر سکا ہے؟ شاید کسی زمانے میں کسی
کو اس کا دواک ہوا تھا اور اس نے میں بتایا بھی تھا مگر ہم اس سے نہ ہونے کے ممکن نہیں رہ سکے۔ ہم
نے سنا، نظر انداز کیا اور اس کو رد کر دیا اور پھر ہمیشہ کی طرح ہم اپنی عادت کے مطابق جہد ہی میں سے بہتر
کو دیا بالکل ہی نئی شے کے متلاشی ہو گئے۔ اور جب ہمیں دیرینہ سچائی سے واقفیت کیا جاتا تو اب آگے گویا یہ
ہماری دھڑکی میں تھا۔

ایک فن کار خود کو ایک خود مختار و آزاد روحانی دنیا کا خالق سمجھتا ہے، اس دنیا کی تخلیق کا فرض اپنے
کام سے پراگھائے پھرتا ہے، اس کو آؤد کرنے کا فیصلہ ہر طرح کی ذمہ داری عطا ہے، مگر وہ خود اس
کے بوجھ سے بتر کر رہتا ہے اور یہ دوسرا جاتا ہے اس لیے کہ ایک فانی مابعد روزگار اتنا بوجھ اٹھانے کی استطاعت
نہیں رکھتا، اسی طرح جیسے ایک عام انسان خود کو مرکز و محور سمجھنے کے باوجود بھی ایک متوازن روحانی دنیا کی
تخلیق میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اور اگر بد قسمتی اس پر بہت لے جائے تو وہ دنیا کی دیرینہ بے انتہی کو اپنی
کی صفات و روح کے الجھاؤ کو بھرا ہوا اس کی حقیقتوں کو اٹھام دیتے لگتا ہے۔

ایک اور فن کار اپنے اوپر ایک بڑی حالت کے عرفان کے ساتھ فاضل ذہن تربیت شدہ فرد کی
طرح و عہد کی جنت کے نیچے، ٹوٹی ہوئی خام گتہ رہتا ہے۔ تب بھی اس کو ماضی پر نگہیں ہوں، چیز، ان لوگوں
کے لیے جو اس کے کام کو سمجھتے ہیں، ہمیشہ سے نہ وہ ضروری ہوتی ہے۔ مگر اس کے بدلے میں، مدد و جس
نے یہ دنیا تخلیق کی ہے، نہ اس کو جو اس کی رہنمائی کرتا ہے، اس کی خیریتوں کے بارے میں کوئی شبہ ہونا
ہے، فن کار کو بوروں کے مقابلے میں زیادہ علم ہونا چاہیے، دنیا کے تناسب اور ہم آہنگی کا، اس میں انسانی
شرکت کی خوب صورتی اور بد صورتی کا، دوسرے اپنے ماضی انسانوں کو آگاہ کرتے رہنا چاہیے۔ نہایت بد قسمتی میں
محرومی میں قید میں، بیکاری میں، اس کا احساس، اجتماعی دیم آہنگی اس سے بے وفائی نہیں کرتا۔

تشریف کی تمام مدد معنویت، اس کے چکچکند سر دے والے پہلو، اس کی ناقابلِ پیشین گوئی
وہاں شہید انسان پر اس کے وہاں بے والے اثرات ان میں سے ایک ہے جو دنیا کے بارے میں کسی
فن کار کا فن کار نہ ہو بلکہ اس کی مالا لائق نگاہیں ہمیں طے کر رہی ہیں۔

ماہرین کامیاب اب تک انسانی وجود کے اس دور تک نہیں پہنچ سکے ہیں جس میں وہ فن سے ماہر
رہا ہو۔ نئی نوع انسان کے ابتدائی دور میں ہمیں اس کے فن کی اعداد و شمار (Hands) سے ملتی تھی جس کے
دواک میں ہمیں بہت دیر لگی۔ ہم نے کاپی کی ماہر ہم نے یہ سوائت کئے میں بہت دیر لگی تھی۔ "ہمیں
مفسر کے لیے ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم اسے لے کر کیا کریں گے؟"

اور وہ لوگ غلط ہیں، اور ہمیشہ غلط رہیں گے جو پیشین گوئی کرتے ہیں کہ ایک دن فن منسخر ہو جائے
گا، مگر جائے گا۔ وہ تو صرف ہم لوگ ہیں جنہیں موت آئے گی، فن تو باقی رہے گا تو کیا ہم یہ امید رکھیں گے؟

اپنی تہائی کے وقت بھی، ہم اس کے مختلف چہروں و اہاس کے تمام امکانات کو دیکھ لو، کچھ سمجھ گئے؟
 ہر شے خود بخود نام فنی نہیں کرتی۔ کچھ چیزیں تو لحاظ سے بھی پرے رہتی ہیں۔ فن ایک نیا راستہ
 اور حسہ دینی ہوئی روح کو بھی مستعمل کر کے ایک بلند روحانی تجربہ سے دوچار کرتا ہے۔ فن کے ذریعے
 دھڑکنے والے شہرے میں یہی کشمکش ہوتی ہے جو منطقی سوچ سے پیدا نہیں ہو سکتی۔
 بالکل ایسی طرح جیسے پریوں کی کہانوں کے چھوٹے چھوٹے آئینوں میں آپ خود کو نہیں بلکہ ایک
 لحظے کے لیے وہ چھوٹے دیکھ جیتے ہیں جس تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا، جس پر نہ توئی انسان پہنچ سکتا ہے، نہ پرواز کر
 سکتا ہے۔ جہاں ہر طرف روح کی گراہ سنائی دیتی ہے۔

(2)

ایک بار دوستانہ محفل نے ایک روضہ جملہ پھینکا تھا۔ ”حسن دنیا کو بچالے گا۔“ اس قسم کا بیانیہ ہے یہ؟
 بہت مرے تک میں اس کو مجھ میں حق کا مجموعہ سمجھتا رہا۔ بعد یہ جیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ خون آشام تاریکی میں
 حسن نے کب کب کو کسی شہرے پھیلایا ہے؟ محترم کیا ہے، بلند کیا ہے۔ اس نے پھیلایا کس کو ہے؟
 مگر حسن کے جوہر میں ایک خاص قسم کا انوکھا پن ہوتا ہے، فن کے سبب کا انوکھا پن۔ یعنی ایک بچے
 فن کی محتویات ناقابل تردید ہوتی ہے اور یہ ایک مخالف ص کو بھی ہتھیار بنانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ آپ لکھیں
 یہ محفل تیار، دائروں کی بنیاد پر ایک بظاہر دل پذیر اور شائستہ سی کی تقریر، ایک جوشیلا مضمون، ایک سماجی منصوبہ، یہ
 ایک فحش بیان، نظم، نثر، کہیں میں کیا پوشیدہ ہے اور کیا تحریف شدہ ہے، فوری معذرت نہیں ہو گا۔
 پھر ایک مقنا و تقریر، مضمون، نظام، ایک مختلف انداز میں تیار کیا ہوا فلسفہ آپ کے مقابلے میں جمع
 ہو جاتا ہے، اور یہ سب کچھ وہی ہی شائستہ اور دل پذیر ہوتا ہے اور یہ ایک بار پھر کام آتا ہے۔ یہی وجہ ہے
 کہ یہی چیزیں، ایسی صورتیں معتبر یا معتبر و نفوس ہو سکتی ہیں۔

جو بات دل پر اثر نہ کرے اس کو ڈیرانے سے بچا جائے؟

مگر ایک فن پارہ اپنے اندر خود اپنی محدودت رکھتا ہے۔ تصویرت جو کسی نقش و نگار میں دانستہ ٹھونسنے پر
 پھیلانے جاتے ہیں، انہرتے نہیں، سب کے سب زمین لڑکے ہو جاتے ہیں، کم زور یا غیروں کا سپ ہوتے
 ہیں اور کسی کو قائل نہیں کر پاتے۔ اس کے برعکس وہ فن پارے جو سچی کو سمیٹ پیتے ہیں اور ہمارے سامنے
 ایک متحرک حقیقت کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں، ہمیں اپنی گرفت میں لے پیتے ہیں، مجبور کر دیتے ہیں، کسی
 بھی عہد یا دور میں کوئی ان کو جکڑا نہیں سکتا۔

لہذا سچی، سچی اور نسج کا قدیم نمونہ محفل ایک کھوکھلا اور چند لاشی نہیں، جیسا کہ ہم اپنے خود مختار
 اور مائدہ پرست دور شباب میں سمجھا کرتے تھے۔ دانش ورروں کے خیال کے مطابق، اگر وہ تین وہ قوتوں کی
 چوٹیں ہر سے مل جائیں گھر سچی اور تنگی کے بہت باغیچہ اور بالکل راست محفل کو کاٹ دی جائے، لہذا

سے روک دی جائے تب شاید بالکل اسی مقام سے حسن کے حیرت انگیزہ غیر متوقع اور ناقابل پیشین گوئی،
مجھے پھوٹ نکلیں گے تو کیا ایسا دوزخہ تینوں خصوصیات کا کام کرے گا؟

اسی صورت میں دوستوں کی کاتول کر ”حسن دنیا کو بچالے گا“ ایک غیر منجید بیان نہیں، بلکہ ایک
پیشین گوئی تھی؟ کیوں نہ ہو، اس حیرت انگیزہ و درخش خیال انسان کو بالآخر بہت کچھ دیکھنا نصیب ہوا۔
اور اسکی صورت میں کیا فی و ادب واقعی ”ت کی نیکی مدد کر سکتے ہیں؟

یہی وہ معمولی سی بھیرت ہے جو میں ان معاملات کے بارے میں گزشتہ چند برسوں میں حاصل
کرنے میں کامیاب ہو ہوں اور میں اس مقام پر آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

(3)

اس شرفین پہ پہنچنے کی غرض سے، جہاں سے نونٹل قلعے دیے جاتے ہیں، وہ مقام جو زندگی میں
ایک باری کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے، میں نے صرف تین یا چار پے تلے نہیں، بلکہ ہزاروں کرے
بے لوج، جہد باز اور جسے قدم اٹھائے ہیں جن کے برابر میں اس شخصیت ازراہ میرے سے لگی سکا ہوں
جس میں ہمیشہ کے لیے رہتا میرا مقدس بن چکا تھا، جب کہ مجھ سے شاید وہ طاقت ور و اعلیٰ مددگروں کے
مک انھیں میں مقید رہے اور رکھ رکھاؤ کے۔ ان میں سے کچھ سے میری ملاقات Archipelago of
GULAG میں ہوئی تھی جو تباہ کاری اور بے اعتباری کی کجی میں پس رہے تھے۔ سب سے میری بات نہیں
ہونگی تھی، جس کو کاحوالی میں نے سنا تھا جب کہ باقی المود کے بارے میں صرف قیاس آمانی کر سکا تھا۔
دلی تپت رکھنے والے جو اس صیب پاؤں میں گر گئے کم از کم ان کا ماتو تھا ہے، مگر ان کے غزوہ کہتے ہی
تھے جو کبھی پیچھے نہ ہی نہیں جاسکے، جو میں جن کا کبھی ذکر بھی نہیں آیا۔ وہ حقیقت تو بھی واپس نہیں ہو سکا۔
پھر قومی ادب نامی میں ختم ہو گیا، نہ صرف یہ کہ اس کو تو بھی نصیب نہیں ہوا، بلکہ اس کو لہو تو کیا دیکھ
جاسا بھی نصیب نہیں ہوا، نہ ہندوستان کے پاؤں کے انگوٹھے پر پہچان کے لیے ایک نمبر چسپاں کر دیا گیا تھا۔
پھر بھی وہی ادب ایک لکھنے کے لیے بھی نہیں لگا، مگر دیر سے ادب کی زمین غمر و غفلت دیتی تھی۔ جہاں امن
سے پُر ایک جنگل الگ تھکتا تھا، وہاں بچے کچے شجر گرائے جاتے رہے، خالق سے بچاؤ راخیا رہی رہے تھے۔
اور آج میں کھنڈر جانے والے رانچوں کے سرے کے جلو میں، سر جھکائے کھڑ ہوں اور وہ لوگ جو
مجھ سے پہلے اس مقام تک پہنچنے کے حق دار تھے، ان لوگوں کا راستہ دے رہا ہوں، میں یہاں کھڑا ہوا
کیوں کروہ کو کہتا ہوں جو وہ ”کہنا چاہتے رہے ہوں گے؟

یہ فرس جم پر بار ہے اور ہم نے اس کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ وریٹیر سلوویوف (Vladimir
Solov'ev) کے غلامی ”تینچوں میں کسے ہونے کے باوجود ہم کو خود وہ دائرہ مکمل کسا چاہیے جو
اے اے یہ خداؤں نے تیار کیا ہے۔“

آٹریڈیٹر کمپ کے تکلیف دہ اہل میں، قیدیوں کی ایک قطار میں، جب ریلیں کی زنجیریں
جشنِ شام کے پلے کو چھید رہی ہوتیں، ہمارے گہرے اندرون میں وہ الفاظ ہوتے تھے جو ہم دنیا کو چھ
چھ مگر سنا چاہتے تھے، مگر پوری دنیا ہم میں سے کسی ایک کو سن سکتی۔ تب ہماری سمجھ میں آتا کہ ہمارے
کامیاب شریک کہے گا، اور دنیا کس طرح اس کا فوراً جواب دے گی۔ ہمارے (سپیس) افق پر ماضیت اور
روحانیت دونوں تھیں، اور میں نے: قابل تقسیم دنیا میں کوئی ماحول نہیں دیکھی۔ یہ خیالات کتاب سے
نہیں آئے تھے، وہ انکی دلہا کی خاطر درآج کیے گئے تھے۔ ان کی تشکیل ان سے تبادلہ خیالات میں ہوتی تھی جو
مربطے تھے، قید خانے میں اور جنگ کی آگ میں، اس زندگی کے مقابلے میں چین کو آن دیا تھا، وہ اس
وجود سے پیدا ہوئے تھے۔

باتر جب بیرونی بود کا زور کم ہوتا، میرے اور ہمارے افق رفتہ رفتہ وسیع ہوتے گئے، البتہ
معمول درازوں سے ہم نے "پوری دنیا" کو دیکھا اور سمجھا۔ اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ پوری دنیا ہرگز
وہی نہ تھی جیسی کہ ہمیں توقع تھی۔ یعنی ایک ریل میں ہوتی دنیا آراء و خیالات ایک رنگ دنیا، ایک دنیا جو
کسی گندے دلدل گود دیکھ کر بے اختیار گھبراہٹ میں "وہاں کیا دل کش جوڑ ہے" اور سیمنٹ سے بنے گئے گے
زیور کو دیکھ کر "وہ کیا نہیں گلابند ہے"، مگر اس کے بجائے ایک دنیا بھی جہاں کچھ غمزدہ آنسو بہاتے اور کچھ
عام ہوشی پر قہقہے کرتے ہیں۔

ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ تنی چہ زنی در زمین ہے؟ کیا ہم بے حس تھے؟ کیا دنیا بے حس تھی؟ کیا یہ
نہایت کے فرق کی وجہ تو نہیں تھی؟ کیا کہیں ہے سرلوب ایک دوسرے کے حشر کے کوسن نہیں سکتے؟ الفاظ
آواز پیدا کرنا بند کر دیتے ہیں اور پالی کی طرح بہنا شروع کر دیتے ہیں۔ بے مژدہ بے رنگ۔ غائب ہو جاتے ہیں۔
اب جب کہ سب کچھ میری سمجھ میں آئے، لگا ہے، برسوں بعد وہ کیا ہے، اور دوبارہ دہل گیا
ہے، میری تحریر اسکا فی تقریر کا لہجہ۔ وہ تقریر "ان" میں نے کی ہے۔ در کسی پلے کی مارلی شام میں سوچے
گئے، اصلی منصوبے میں، یہ سب کچھ عام ہی بات ہوتی ہے۔

(4)

روز، رات سے، انسان اس طرح ہٹتا جاتا رہا ہے کہ دنیا کو دیکھنے کا اس کا انداز، جب تک خوب
"دور حریفی" سے ہماری نہ کیا گیا، اس کے محزکات و اقتدار کے حارت، اس کے افعال اور فیثوں کا
انداز اس کے ذاتی و سرگروہی تجربات زندگی سے کیا جاتا ہے۔ وہی مقولے کے مطابق "اپنے بھائی پر نہیں،
اپنی میزبانی آنکھ پر بھروسہ کر دے" اور یہی سب سے مستحکم بنیاد ہوتی ہے اپنے اطراف پھیلی دنیا اور اس میں
انسان کے ہوا کو دیکھنے کی۔ ورا ایک طویل عہد کے دوران جب اس کے درمیان کے ذرائع کی ماضیت سے
پہلے، ہماری دنیا جیتوں اور محراب کی کیفیت میں تھی، قبل اس کے کہ اس کی ایک دھڑکتے اور بٹختے ہوئے

لوگوں سے کسی قلب، مہیت ہوئی تھی؟ میں نے، تجربے پر غور کرتے ہوئے، بغیر کسی حادثے کے، سچے گروہوں پر، اپنے ساتھ پروردگار اپنے قوی مددگاروں پر غور فرمائی کی ہے۔ اس وقت ہر فرد بشر کے لیے ایک صحیح حکم کی اقدار کا تصور کرنا ممکن تھا، اور یہ امتیاز کرنا کہ کیا صحیح ہے اور کیا ناقابل قبول ہے، کیا سبک دین ہے اور بدکاری کی حدود کیا ہیں، امداد دینی کیا ہے، اور سبے عالمی کیا ہوتی ہے۔ گروہ جگہ جگہ بکھرے ہوئے لوگ نہایت مشکل کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کی سماجی قدریں، غیرت انگیزہ طور پر محسوس تھیں، اسی طرح ان کے ماپ توں نے بھی صحیح نہ تھے، اس کے باوجود اس قسم کی بد عنوانیاں، سب مسافروں کے لیے غیرت کا باعث ہوتی تھیں، اور اکثر رہائش و حوالہ میں ان کا محسوس بجا ہونے کی طرح ذکر کیا جاتا تھا، اور بنی نوع انسان کے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہوتا تھا، اس وقت تک جو ایک نہیں ہوئے تھے۔ شراب پینے والے چند شرابیوں میں، غیر متوقع طور پر، اچانک ایک نئی نوع انسان ایک ہو گیا ہے۔ متوقع طور پر ایک، اور خطرناک طور پر ایک۔ کہ ایک عضو کو پہنچنے والے صدات اور سوزشیں چب چکے اور اب تک پہنچ جاتی ہیں، اکثر جن میں غریبی حفاظت، مہویت کا بھی خیال نہیں رہا جاتا۔ انسان حمد تو ہے، مگر بالاحتلال ایک نہیں جس طرح کہ جماعتیں، رقبہ میں ہوا کرتی تھیں، ہم سب کے باہمی تجربات کے سہارے نہیں، ایک آئندہ کے باعث نہیں، جس کو دل میں بھی کہا جاتا ہے، سب تک، ایک مشترک مقامی زبان کی جو دہر، ایک ہوا ہے تو میں ان قوامی شہادت و طباعت کے ذریعے تمام رکاوٹیں ہٹا دیتے ہوئے۔ ہم پر واقعات کا ایک مہیب تو دہر چھوڑتا ہے تو ایک لحظے میں جہی دنیا کے کانوں تک اس کے چھینے پہنچ جاتے ہیں۔ مگر ان واقعات کو اس معیار کے مطابق جو دنیا کے دوسرے حصوں میں رہتے ہیں، ماپ جانا چاہیے۔ یہ نہیں ہو رہا ہے اور یہ سب آواز کی ہروں و راخباتی کالموں پر لاگو ہونے والے غیر مانوس قوانین کے مطابق نشر نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے کہ یہ معیار، انفرادی ملک اور سات میں ہر سب پر محیط بہت مخصوص شرائط کے زیر اثر چلتے ہوئے ورکیس کے گتے تھے، غصہ کی کے خرد میں ان کے تبادلے نہیں کیے جاسکتے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں لوگ محسوس شدہ میں اور دنیا کو خود اعتمادی کی وجہ سے محنت سے جائز کیا ہوتی اپنی اقدار کو واقعات پر صرف اپنے بنائے ہوئے یہ فوں کے مطابق منطبق کرتے ہیں، دوسروں کے بچانوں پر نہیں۔

اور اگرچہ دنیا میں مختلف اقدار کے پیسے کی پیمانے موجود نہیں، مگر کم از کم چھ ہیں، ایک یہ کہ قریب کے واقعات کی جانچ کے لیے، ایک دور دراز کے واقعات کے لیے، پرانے معاشرے ایک سوانہ رکھتے ہیں، نئے معاشرے دوسرا، ماکاسب لوگ رکھتے ہیں، کاسب لوگ دوسرا۔ قدروں کے منتشر ہونے والے پیمانے پر پہنچ چکے ہوتے ہیں، خرد کم ہوتے ہیں درمیں بھی خیر دستے ہیں، اور اسی خیال سے کہ کثیر درواغیر نہ ہوں، ہم دوسری تمام قدروں سے بچ کر نکلتے ہیں، جیسے کہ پاگل ہیں، جیسے کہ (ہوکا، اور ہم بڑے عمائد سے چھٹی دنیا کو اپنی عمر یہ اقدار کے مطابق پرکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم نسبتاً بڑی، زیادہ تکلیف دہ اور کم قابل برداشت بن جاتے ہیں، اس کو نہیں جو درحقیقت بڑی ہوتی ہے، نہ وہ

تکلیف دہ اور کم قابل برداشت، مگر وہ جو کم سے قریب قریبی ہوں۔ ہر چیز جو نیا وہ دور ہو، جس کا فوراً ہم پر حملہ آور ہوئے کا خطرہ نہ ہو، درنا گیزہ گراہ کے ساتھ اس کی گلو گیزہ چٹا، اس کی مہیا دزدگیوں، خداداد اس میں لکھوں مظلوم شامل ہوں۔ سب کو سمجھنا حیث انکل برداشت کے قابل سمجھے ہیں۔

دنیا کے ایک حصے میں، نیا وہ دن نہیں ہوئے ہیں، مگر عقوبتوں کے باعث، جو قدم قدموں سے نئی وجہ تم نہیں تھیں، سکڑاؤں جڑاؤں بے تہاں پیرا کیوں نے خدا پر اپنے یقین کی خاطر جانیں دے دی تھیں۔ دنیا کے دوسرے نصف میں کوئی ایک پاگل (بڑبڑوہ اکیلا نہیں ہے) مذہب کی طرف سے ہمیں حوصلے کرنے کے لیے سمندر میں ڈھونڈتا ہوا ہے۔ کراس کو اپنے اہل پیشوا پر پورا یقین ہے۔ اس نے قدموں کے اپنے ذاتی پکائے سچ ہم میں سے ہر ایک کا حساب لگا لیا ہے۔

وہ جو قابل سے، انداز کے ایک پکائے کے مطابق، قابل رنگ اور انجری موٹی آزاد کی تھی ہے دوسری انداز کے مطابق قرب سے، اشتعال انگیزی گئے ہیں کہ ساری کی ہوں کو الٹ دیتے ہیں کہسانی ہے۔ وہ جو دنیا کے ایک حصے میں، قابل بیان ٹوٹ جانے کا شائبہ نظر آتا ہوگا، دوسرے حصے میں وہی وحشیانہ احساس کے نتیجے میں فوری زوال پہنچانے کا مطالبہ گئے گا۔ قدمی کتاب کی قدموں کے لیے مختلف پکائے ہوتے ہیں۔ وہ سوانہ ادا کھا جانے والا ایک سلاہ کم امیر۔ کا حال گئے گا پسمت ایک مقامی حادثے کے۔ ذاتی بے حریموں کی قدموں کے لیے مختلف پکائے ہوتے ہیں کہیں تو ایک نظر یہ جسم یا نظر انداز کر دیتے ہیں اور باعث لذت ہوتی ہے جب کہ دوسروں کے لیے نامانہ شدہ بھی ایک بد قسمت مذاقی کے طور پر صاف کر دیا جاتا ہے۔ ہوا اور بد معاشیوں کے لیے مختلف پکائے ہوتے ہیں ایک صورت میں، ایک صیغے کی قیں جو وطنی یا قیدی تہائی جہاں اس کو صرف وہ وہ ذلیل ذاتی پر رکھا جاتا ہے، لوگوں کے تصور کو پاش پاش کر دیتا ہے اور اخباروں کے کالم ٹمٹمے سے غریبے ہاتھ ہیں۔ جب کہ دوسری صورت میں کچھیں ہر کی قیں تہائی کے عقیدت خانے جب کہ وہی مل پر ہر ف جی ہوتی ہے اور قیدیوں کو ہر ہند کر دیا جاتا ہے، گھج لکھوں کے لیے پاگل خانے اسرحوں پر گویاں مار دیتا۔ یہ سب کا مظلوم پر ہوتا ہے اور قیوں کیا جاتا ہے۔ جب کہ دنیا کے اس پلے حصے کے بارے میں ہر ذہن بالکل پُر سکون رہتا ہے جہاں سے سوائے معمولات کے کوئی شہ نہیں آتا۔

پھر بھی، ہم انسان کی تخیلاتی مہویت اور دوسرے فرد کے غم پر اس کی خاموش بیوقوفی پر اس کی سرزنش نہیں کر سکتے، اس لیے کہ انسان بلوئی اسی طرح گیا ہے۔ مگر تمام ہی نوع انسان کے لیے، جو ایک نوع کے ہی مانند پکائی ہوتی ہو، یہی مشترکہ پہلو جی ٹکڑا جاتی کا خطرہ ہوتی ہے۔ ایک دنیا اور ایک نوع کی انسانیت انداز کے چھ، چار و صرف دو ہی نوع پر قائم نہیں رہ سکتی۔ کمال کی اور ارتقاء کی یہ مساومت ہم کو چیز بچا کر رکھ دے گی۔

وہاں رکھو کہ انسان میں دنیا کے قابل نہیں، نہ ہی ہم ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ نہ کہ ایک

دہنی پر رہ سکتے ہیں۔

(5)

مگر کون سا پیمانہ کہ انہیں میں مربوط کرے گا، اور کیسے؟ انسانیت کے لیے تشریح کا ایسا نظام کون بنائے گا، جو چاروں تہذیبوں کے مابین انسانی افعال کے لیے، برداشت اور ناقابل برداشت کے لیے، جیسے کہ آج وہ میٹر کیے جاتے ہیں۔ کون انسانیت کو بتائے گا کہ کیا چیز دہنی اور برداشت کے قابل ہوتی ہے، اور کیا چیز جس پر صرف خوش دہنی ہے؟ کون غصے کو اس شے کی طرف موڑے گا جو سب سے زیادہ ہوسناک ہے، اس کی طرف نہیں جو قریب ترین ہے؟ اپنے انسانی تجربے کی حد سے بڑے اس قسم کے عمل کے تبادلے میں کون کامیاب ہو سکے گا؟ کون متاثر کرنے میں کامیاب ہو سکے گا ایک بہت دھرم، غدد انسانی مخلوق کو دھرم کا سرسبز اور غم پرستانہ حیدر ساریوں کے پہلوؤں اور درک پر، جن کا خود اسے کبھی تجربہ نہیں ہوا؟ نشر و اشاعت، پہلوی، سائنسی ثبوت۔ سب کچھ بے کار ہوتے ہیں۔ مگر خوش قسمتی سے دنیا میں ایسے طریقے پائے جاتے ہیں۔ اس سے میری مراد فین ہے، ادب ہے۔

یہ (ادب اور فن) تجربے کر سکتے ہیں خود اپنے تجربے سے سیکھنے کی انسانی ضروریوں خصوصیت پر قابو پا سکتے ہیں، تاکہ دوسروں کے تجربات منافع نہ جائیں۔ جب ایک انسان زمین پر اپنے مختصر قیام کے خاتمہ پر پہنچ رہا ہوتا ہے، یہ ادب ہی ہوتا ہے جو جوئے کر دیتا ہے، سامان و زن اس کی زندگی تجربے کے مامانوں تجربات کا، تمام رنگوں کے ساتھ زندگی کے نچڑ کے ساتھ دوسرے انسان کی کیا ایک مامانوں تجربے کی گوشت و پوست میں دوبارہ تجسیم کر دیتا ہے اور ہم کو انھیں اپنا سمجھ کر پانے کی اجازت بھی دیتا ہے۔

طریقہ یہ کہ دونوں، مٹی تک اور تمام پر عظیم ایک دوسرے کی عظمتیں کو ڈھرائے ہیں، وقت کے اپنے حق کے ساتھ جو حصوں پر محیط ہو سکتے ہیں۔ تب یہ سب کچھ خاص و طبع ہو جاتا ہے۔ مگر نہیں، کچھ قوموں نے جس کا تجربہ کیا ہوتا ہے، مٹا اور رد کر دیا ہوتا ہے، اچانک دوسرے اس کو دہشت کرتے ہیں اور حرفی اظہار سمجھتے ہیں۔ اور پھر اس مقام پر، ان تجربات کا جو ایسے کبھی نہیں ہوئے ہوتے ہیں، نعم البدل وہ اور فن ہی ہوتے ہیں۔ یہ دونوں ایک شہرت، تجربہ صلاحیت رکھتے ہیں، جو باور ہوتی ہے زبان، رسم، مہارت، اعلیٰ کے اختیارات سے، یہ ایک پوری قوم کی زندگی کے تجربات کو دوسری قوم تک منتقل کر سکتے ہیں۔ یہ ایک تجربے کا رقوم کو نئی شہروں پر محیط قومی آزمائش میں ڈال سکتے ہیں، تاکہ وہ غیر ضروری، غلط اور جہاں جہاں جاتے سے ہمیں نہ کرے، کہ وہ انسانی فائنل کے سرچشمہ کو غلط کر سکتے۔

ادب کا بھی عاقبت شان انا ہے جو میں نوٹس سرکشین سے آج آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں۔
ادب ایک ٹیٹ تجربے کی ایک بورنگی پیش بہا صحت میں رہیں گے، جس کو وہ نہیں کیا جاسکتا،
یعنی ایک نسل سے دوسری نسل تک ترسیل۔ اس طرح سب کچھ قوم کی باقی رہنے والے برداشت کا حصہ

ہو جاتا ہے۔ یہ گفتار ہو جاتا ہے اور اپنے اندر اپنی بھولی بھولی دولت کی شمع روشن کر لیتا ہے، ویسے پیر
 میں جو بگڑا اور بدگوئی سے بچا رہتا ہے اس طرح ادب، زبان کے ساتھ قوم کی روح کی حفاظت کرتا ہے۔
 عصر حاضر جس قوموں کو برآمدگی کا دھبہ دیتے کی اور عصر تہذیب کی گھٹائی میں مختلف شعوں کی گم شدگی کی
 باتیں کرنا نہیں ہی چاہیے۔ میں اس ملے سے اتفاق نہیں کرتا مگر اس کی گھٹیا ایک اور سو باریں چاتی ہے۔
 اس مقام پر اتنا کہنا مناسب ہو گا کہ قوموں کی گم شدگی نے ہمیں اتنا نقصان نہ پہنچایا ہوتا اگر سب آدھی ایک
 جیسے جہت، ایک شخصیت، ایک چہرے جیسی قومیں، ان کی مجموعی شخصیات، نوع انسانی کی دولت ہوتی ہیں، ان
 کی ہزار تین شخصیت بھی اپنا مخصوص رنگ پہنتی ہے اور اپنے اندر مقدس اماں کا ایک خاص پتھر رکھتی ہے۔

نک ہے اس قوم پر جس کا ادب طاقت کی دست اندازی سے درم برہم ہو جاتا ہے۔ چوں کہ یہ
 گھٹن "اخبار کی آزدی" میں غلام ملازمتیں ہوتی، یہ قوم کے دل کو ہزکنے سے روک دیتی ہے اس کی
 دولت کو ٹکڑوں میں کاٹ دیتی ہے۔ قوم اپنے آپ سے بے بہرہ ہو جاتی ہے، اپنی روحانی وحدت سے
 محروم ہو جاتی ہے، اور باوجود ایک مشترک زبان لینے کے چو تک ایک ہی سرے نہ سمجھتا، بد کر دیتے ہیں۔ وہ
 قومیں جو خاموش رہتی ہیں، پروٹھی ہو جاتی ہیں، اپنے دوسرے میں، آپس میں اپنی آئے والی نسلوں سے کوئی
 بات کہے بغیر ہی مر جاتی ہیں۔ جب Achmatova اور Zamyatin جیسے ادیب عم و منہ، خود اپنی تمام زندگی
 قید میں رہے، موت کے آنے تک خاموشیوں کے سوا مل میں جھڑویے جائیں، جن کے کانوں تک خود ان
 کی اپنی غریبوں کی بدگشت نہ پہنچے، تو یہ قطعاً ان کا ذاتی، میر نہیں ہوتا، پوری قوم کے لیے غم کا، خطروں کا
 باعث ہوتا ہے۔

اور بعض معاملات میں جب خاموشیوں کے باعث پوری تاریخ کے ادراک کا سمندر ٹک جاتا
 ہے پوری نوع انسانیت کے لیے خطرہ ہوتا ہے۔

(6)

مختلف ادوار اور مختلف ممالک میں اس موضوع پر گہرا غور بخش اور دل چسپ کام سے شروع ہو
 جاتے ہیں کہ کیا کسی فن کار کو محض اپنے لیے زندہ رہنے کی آزادی ہونی چاہیے یا اس کو ہمیشہ قوم اور ملت
 کے فرائض سے، اپنے بغیر کسی تعصب کے، با اثر رہنا چاہیے۔ میرے لیے یہ کوئی طرفہ مشکل نہیں، میری ایک
 بار پھر اس بحث کا سلسلہ شروع کرنے سے پرہیز کروں گا۔ اس موضوع پر سب سے چھان و خند اچھنر کامیو کا
 نوٹیل خطاب تھا، اور میں بلا کسی شک کے اس کے پیش کردہ نتائج سے اتفاق کروں گا۔ اس میں کوئی کام نہیں
 کہ کئی شروں تک بروی ادب نے خود اپنے دوسرے میں بے مقصد سوچی بچار اور اچھل کود سے اصرار کیا تھا۔
 مجھے اس رعایت کو اپنی استعداد کی حد تک چار دیواری رکھنے میں کوئی باک نہیں۔ بہت عرصے سے بروی ادب سے
 خیالات کا عادی رہا ہے کہ ایک ٹیکسٹ والا اپنے سامنے میں بہت آچھ کر سکتا ہے، اور یہ بھی کہ ایسا کرنا اس کے

فرانکس میں شامل ہوتا ہے۔

اس سے قطع نظر کہ دنیا میں کیا ہوتا ہے، ہمیں فن کار کو اپنے تجربات اور مشاہدہ نفس کے اظہار کے حق سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں فن کار سے متاثر نہیں ہونے کی بجائے اس کے لیے اسے شرمندہ کرنا، اس کی رعب کرکٹ اور اسے لالچ دینا چاہیے۔ کیوں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو جتن جتن اظہار کرتا ہے کہ اس کا ایک معتد بہ حصہ بتا دیتا ہے۔ اس کے وقت اسے مل جاتا ہے، اور اسے اس حیرت کی نعمت اس کی طرف سے نظر پر ڈال دے۔

ناریوں کا وجود ذاتی ہے۔ ہمیں یہ طے کر لینا چاہیے کہ فن کار کسی کا قرض و نہیں دیتا، اس کے باوجود یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالات، اپنی تخلیقات، اپنے نفس و نام میں اپنے لیے کتنی دنیا و ان لوگوں کے حوالے کر سکتا ہے جو گمراہی و غفلت میں، پاگل نہیں، تو زبردست ضرور ہوتے ہیں۔

ہمارے بیسویں صدی کی بھٹی صدیوں کے مقابلے میں نیا دور کی ممانعت ہوتی ہے، اور ہم اس کی پچھلے پچاس برس کی بیوی کیوں کہ ہر گز نہیں سکتے ہیں۔ ہمارے دنیا انہی پر فی کثیفیتیں، لالچ، رشک، ضبط کی کمی، آہن کی عداوتیں جو درجہ جاتی جہد جیسے معقول نام کی آہن پر ان پڑھتی ہیں، نسلی تنازعات، موانع جہد جہد، اور کارکنوں کی انجمنوں کے تنازعات وغیرہ سے ہماری پڑی ہے۔ مصالحت سے ابتدائی اظہار ایک نظریاتی اصول میں گیا جو کٹر پن کی ایک پیداوار سمجھا جاتا ہے۔ یہ دونی خانہ جنگیوں میں لاکھوں قمریوں طلب کرتا ہے، یہ ہمارے بڑھتی ہوئے اور کرتا ہے کہ کسی کوئی چیز نہیں جو قابل تہل نہ ہو کہ یہ تصاف اور نکل کا حاکم نہیں ہے، اور یہ کہ یہ سب ہر وقت ہوتے ہوئے اور تھیر پتیر ہیں۔ اس لیے یہ اصول بتایا گیا ہے کہ بیشتر وہی کچھ کہہ جو تمہارے سرورجی بجا امت کے لیے فائدہ مند ہو۔ وہی بھی پیشہ و سرورجی ہی ہوجو تو اپنے کام میں موقع دیکھتے ہیں تو فوراً توڑ پھڑ پھرتا ہے، خواہ وہ بغیر تحقیق ہو، غیر ضروری ہو، خود اس کی وجہ سے پورا معاشرہ دھڑم سے رہیں پر ہی کیوں نہ آئے۔ جیسے کہ دہر سے دکھائی دیتا ہے، مغربی معاشرے کی اچھال کا تمام وقار اس نقطے سے پرے ہونے والا ہے جہاں سے نظام سرحدان کے مٹوں کی حرمت قابل تہل ہو جاتا اور اس کا زوال ضروری ہو جاتا ہے۔ قانونی پاس ہمارے کئی صدیوں پرانی پابندیوں کے باعث تشدد کم سے کم شرمندگی محسوس کرنے کا ہے اور نہایت ہے جو فائدہ انداز میں پوری دنیا میں پھیلتا چ رہا ہے، اس سے بے پروا کرتا رہنے کی ذراں کا دلچسپی نہایت کم ہو چکی ہے۔ مزید کہ اس کی مادی و معنوی حالت ہی نہیں، اس کی شان و شان کا سید غیر ممانعت میں فتح مند ہوتی ہے۔ دنیا میں شرم ممانعت میں غرقاب کی جاتی ہے کہ حالت کچھ بھی کر سکتی ہے جب کہ انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ متروکی کے شیا طین۔ ہمارے جو کچھ صدی کے علاقائی قیدیوں کی حیرت ممانعت کے، تہہ تھے۔ ہمارے آنکھوں کے سامنے ساری دنیا میں دیکھتے پھر رہے ہیں، اور انھوں نے heaving افواہ دھماکوں اور عیش وادی کے ذریعے ان ممانعت کا بھی ممانعت میں دہر رہا ہے جہاں بھی ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، اور اپنے رادوں کا اعلان کر رہے ہیں کہ وہ پوری تہذیب کو تباہ کر داس گئے۔ اس میں کامیاب ہو بھی سکتے ہیں۔ انھیں جہنم سے علاوہ اور کوئی توجہ

نہیں، نو عمری سے وہ جس سے واقف رہے ہیں، اُس عمر سے جب انھیں کسی ذاتی دھ سے پرانا پڑ
 ہو گا وہ انیسویں صدی کی رادی پر پھیلوں کو چٹکی چٹکی ڈیرا رہے ہیں، اس ٹن کے ساتھ کہ وہ کوئی نئی چیز
 دریافت کر رہے ہیں۔ وہ وہ چٹکی رلی گارڈ کے کہتے ہیں، ایک ہر سرت مثال کے طور پر چٹکی کہتے ہیں۔ وہ
 قدیم کے جوہر انسانیت کے تمام تر ادب کے باعث، مانتا تجربہ کار قلوب مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمیں ان بے رحم
 اپنی آمروں اور حکومتوں کو مار بھگا چاہیے، دہشتے (مم!) دگ جنھوں نے ذاتی ہم اور انھیں ایک طرف
 رکھ دی ہیں اور جنھیں حالات کا معنوں اور ک ہو گا، ان سے بہت مختلف ہوں گے۔ جس کا ارکان بہت کم
 ہے۔ مگر وہ جیہ وہ ان میں سے ہیں اور سمجھتے ہیں، جو ان نو جوانوں سے اختلاف رکھتے ہوں۔ (بہت
 سے اختلاف کی ہمت ہی نہیں کر سکتے) وہ ہر اس شے کو نگاہ سے ہیں جو "مت پسندی" جس کی نظر آتی
 ہے۔ یہ انیسویں صدی عیسوی کی ایک اور رو کی کیفیت ہے۔ جس کو وہ متواتر نے "ترقیاتی پروڈیوسر کی عدلیہ"
 سے تعبیر کیا ہے۔

میونخ (نیمہ) سے انھیں نے وہ جذبہ کسی طرح بھی ماضی نہیں بن سکا ہے کہ یہ محض ایک وقتی
 بات نہیں تھا۔ میں تو یہ تک کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا کہ میونخ کا جذبہ انیسویں صدی میں بھی جاری رہا
 ہے۔ یہ دل مہذب دنیا کے پس ایسا کوئی حربہ نہیں جس سے وہ اپنی جارحیت کو، چو تک تجدد کا مقابلہ
 کر سکے، سوائے تبسم رضامندی کے۔ میونخ کا جذبہ کامیاب لوگوں کی خواہشات کا عارضہ ہے، یہ ان لوگوں
 کی مدد کر رہی کیفیت ہے جنھوں نے اپنے آپ کو قربان کر دیا ہے کسی بھی قیمت پر خوش حال کے حصول پر،
 دنیا کے مادی بھدائی کے سب سے اہم حریف کے حصول پر۔ ایسے دگ، آج جو دنیا میں بہت ہیں، محمود اور
 لہ پائی کا راستہ اختیار کرتے ہیں، محض اس لیے کہ وہ چاہتے ہیں کہ وہ جس زندگی کے عادی ہو چکے ہیں،
 جہاں تک ممکن ہو جاری رہے، کہ وہ آج کے مشکل حالات سے دوچار نہ ہوں۔ اور کمال، آپ دیکھیں گے،
 کہ سب کچھ ٹھیک ہو گا۔ (مگر سب کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو گا، یہ دنیا کی قیمت صرف برائی ہی ہوئی، جس ہمت
 اور فتح اسی وقت نصیب ہو گی جب ہم قربانی دینے کا حوصلہ پیدا کریں گے)۔

مستزاد یہ کہ ہمیں سماج کی دشمنی کا سامنا ہے، اس لیے کہ طبیعیاتی طور پر مادی اور نیچے دی ہوئی دنیا کو
 روحانی امتزاج کی اجازت نہیں، ہم اور ہم رادی کے س میں (MOLECULES) کو ایک نصف سے دوسرے
 نصف تک چھڑاگ کر جانے کی اجازت نہیں۔ اس میں ایک حسرت، مادہ خطرہ نظر آتا ہے، کہ وہ جس کے مختلف
 حصوں کے درمیان "تصادف حادثات" کا خطرہ۔ ہمارے عصر کی سائنس چاہتی ہے کہ حادثات کی روک تھام،
 انتظام و انافی مکمل سماج پر منتج ہوتی ہے۔ حادثات کی روک تھام بین القومی شکاات اور معاہدوں کو باطل
 کر دیتی ہیں، چھو پائے ہوئے خطوں میں معاہدوں کی تشریح یا ان کو بھڑک دینے سے بھی، مٹی نقصان نہیں ہوتا،
 جیسے کبھی ان کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ گویا، چھپائے ہوئے خطے پر دنیا کے لوگ نہیں، بلکہ اس میں سرخ سے آتی
 ہوتی مہرانی فوج رہی ہو کہ لوگ یقیناً دنیا کے بارے میں کسی بھی بات سے واقف نہیں اور سب بات پر تیار ہیں

کردہ چاہیں اور مذہبی عقائد کے زیر اثر ان کو "آزادی لانے والے" سمجھ کر پامال کر دیتے ہیں۔

انسانیت کی بڑی امیدوں کے مطابق، دس صدی قبل، اقوام متحدہ کا ادارہ وجود میں آیا تھا۔ انیسویں صدی کے ایک قاضی نے اس میں اس کی نشوونما بھی ناممکن سمجھی تھی۔ دراصل یہ متحدہ قوموں کا نہیں متحدہ حکومتوں کا ادارہ ہے جس میں تمام حکومتیں برابری کے جھبے پر ہوتی ہیں۔ جو آزادانہ انتخاب کے ذریعے آتی ہوں، جو پھر بائبل کی آیت ہوں، اور وہ جن پر اسلحے کے زور سے قبضہ کر لیا گیا ہو۔ JNO کی زیر ستائش جانب داری کچھ قوموں کی آزادی کی رٹیں آمیز حکمت کرتی ہے اور دوسروں کی آزادی سے تھکن ملتی ہے۔ ایک فرمان بردار دوسرے کے ذریعے اس نے حقیقت کی نئی سیڑیوں کو زور دینا شروع کر دیا۔ عاجز و سرسبز مسلمانوں کے افراد کی کہانیوں، چیخوں اور التجاؤں کی طرف، اتنے بڑے دارے کی توجہ مبذول کرنے کے قابل نہ تھیں۔ JNO نے انسانی حقوق کے علان کو بھی، جو کچھ بڑے میں اس کی سب سے اہم دستاویز تھی، انجمن کی رکنیت حاصل کرنے کی امید و تصویب کے لیے واجب نہیں قرار دیا۔ اس طرح اس نے ان سب چارے نوکریں سے غلطی کی، حکومتوں کے بنائے گئے جن کی خواہشات شامل نہیں تھیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے اس عصر کی ذہنی کلی طور پر سائنس دانوں کے ہاتھوں میں ہے کہ وہی انسانیت کے تمام تکنیکی اقدام کے فیصلے کرتے ہیں۔ ایسا گناہ ہے کہ سیاست دانوں کی نہیں، بلکہ سائنس دانوں کی ہیں۔ ان بین الاقوامی گروہ جو پیش بھی یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ دنیا کا رخ کدھر کو بوجھا جائے۔ مگر یہ کچھ مسائل ہیں جو باقی ہیں کہ اگر سب حتمی ہو جائیں تو بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مگر نہیں، سائنس دانوں نے انسانیت کی اہم، بڑی و عمرانی حالت بننے کی کوشش کا کھل کر انکار نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے تمام اجتماعات دھرم کے آثار سے دست برداری میں صرف کرتے ہیں کہ بہتر ہوگا اگر سائنس کی محفوظ و داریوں ہی میں قیام کی جائے۔ میں نے اس جذبے نے ان پر اپنے مانوس پر پھیلا دیے ہیں۔

تو پھر اس سبب دل، حریق قوت رکھنے والی، جتنی ہوتی دنیا میں، جو وہی تباہیوں کے دہانے پر ہے، نکلنے والے کا کیا مقام ہے؟ میں چھوڑے جانے والے رکٹوں سے کیا بنا دیتا، ہم تو ایک معقول ہی گاڑی بھی نہیں دیکھتے، جو صرف مادی حالت کا حزام کرتے ہیں وہ ہمیں بہت لچن بھی کرتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ نظری نہیں کہ ہم لپٹا ہوں، کہ ٹیکوں کی ثابت ترقی اور سچائی کی ناقابل تقسیم کیفیت سے ماری ہو، اور دنیا کو اپنے رینگا اور بے لاگ تھیلوں سے تھوڑیں۔ نوٹ انسانی کیسے اتنی بد عنوان ہو چکی ہے؟ وہ کیسے کم قدر ہو گئے ہیں؟ ان کے درمیان چند خوب صورت اور شگستہ زبان کا تڑا راکٹا مشکل ہوگا؟

مگر ہمارے پاس تو اس پر واز کا بھی راستہ نہیں۔ چروہ نکلیں جس نے ایک بار کوئی لفظ ادا کر دیا وہ دوا دہ اس سے نکلیں سکتا۔ ایک ادیب اپنے سچائیوں و رہنمائیوں کے لیے غیر متعلق محسوس نہیں ہو سکتا، وہ اپنی سر زمین پر درپے عمیق نکلنے والوں سے صاف رہنے والی زبانیں کا معائنہ ہوتا ہے۔ اور گرامی کے مابقی ملکوں کے ٹیکوں نے کسی غیر ملکی دار الحکومت کے راستوں کے تاریکیوں پر خون بہا دیا ہے تو ہمیشہ ان

درونی دھیوں نے نکلنے والے کے گال پر چھانچ لگایا ہے۔ اور اگر کسی بلا آت خیر رست انھوں نے اپنے سونے ہوئے معتبر دوست کا کچھ گھونٹا ہے تو نکلنے والے کے ٹھیسوں پر اس کی سسٹاں پڑ جاتے ہیں۔ اور اگر اس کے توجہات باشندہ سے چہک چہک کر ان کی داری پر بد چٹائی کی فوقیت کا اعلان کرتے ہیں، اگر وہ خود کو خوش گوار اندیشے کے حوالے کر دیتے ہیں، لوگوں کو چکر کر پر فحالی بتاتے ہیں، تو ان کی عقولت نکلنے والوں کی سانسوں میں شامل ہو جاتی ہے۔

تو کیا ہم میں اتنی سبب دیکھیں کہ ہم وقت موجود کی دنیا کے دشمنوں سے لڑنے کی کوشش کریں؟

(7)

پھر بھی، میں یہ جان کر باغ و باغ میں گھومتا ہوں کہ انی ادب ایک بڑے سے دل کی طرح، دنیا کے افکار اور مشکلات پر جڑا ہوا ہے، لہذا اس کے مختلف کونوں میں اس کو مختلف انداز میں دیکھا اور پیش کیا جاتا ہے۔ قدیم قوی ادب سے الگ نام لے ہوئے اور میں بھی عالمی ادب کا ایک قصبہ تھا، ایک نئی دہائی کی طرح، جو قوی ادب کی پلندہ یوں کی اور اس کی ادبی اثرات کی مجبوری کئی کئیوں کی تاثیر برداری کرتا تھا۔ مگر وقت میں ایک سہولت قرار نہیں اور دیکھوں کی دوسری دنیاوں کے نکلنے والوں سے جتنا مایاں ہوئیں، مگر صدیوں بعد اور اس طرح باقی اثرات میں بھی تعطل ہوا اور قوی ادبی پلندہ یوں کے نکلنے سے ہم عصریوں میں نہیں آئے والی نسلوں کے سامنے غائب ہوئے۔

مگر آج، ایک ملک کے نکلنے والوں اور دوسرے ملک کے نکلنے والوں اور انھوں کے درمیان ایک قسم کی، مگر فوری نہیں تو تقریباً ویسی ہی، رشتہ داری ہے۔ مجھے خیر داس قسم کا تجربہ ہو رہا ہے۔ میری ان کتابوں کو بھی، نسلیں کہ جو میرے اپنے ملک میں شائع نہیں ہو سکتیں، نکلت میں یہ کہنے کے قرب قرار کے باوجود، جس کی دنیا میں قاری مل گئے۔ Heinrich Böll جیسے ممتاز نکلنے والوں نے بھی ان کے تنقیدی تجزیے کیے ہیں۔ ان تمام بڑوں میں، جب میرے کام اور آزادی میں تعطل نہیں ہوا، جو قانون کشش تعطل کے برعکس، ہوا میں اس طرح مطلق ہے، جیسے کہ ان کی کوئی حیثیت نہ ہو تب تشکر آمیز اور گرم چوٹی کے ساتھ جو میرے نزدیک بھی بہت غیر متوقع تھی، مجھے دیکھیں کہ بین الاقوامی برادری کی ہمدردی کا علم ہوا۔ اپنی پچھلے سرنگرد پر مصریوں کی طرف سے مبارکباد کے پیغام ملے، مجھے حیرانی ہوئی تھی۔ مجھ پر پڑنے والے دباؤ چھوڑ دینا سبب ادیبوں کے محدود سے میرے اخراج کے بعد کے خطرناک ہتھوں کے دوران، میرے لیے خفیہ تھی "دفاعی دعوہ" نے مجھے بدترین تنقید سے بچاؤ میں رکھا۔ اور مدافعی ادیبوں اور ان کا دل نے، میری ممکنہ جزاؤں کی صورت میں پناہ کے لیے بہ کمالی مہمان نوازی میرے لیے ایک مائیکرو تیار کر رکھا تھا۔ بالآخر، ان کی انعام کے لیے میری ماموریت بھی میرے ملک سے نہیں ہوئی، جہاں میں رہتا اور لکھتا ہوں، بلکہ Francis Mauriac اور اس کے ساتھیوں نے میرا ماموریت

کیا تھا۔ بعد میں بھی، تمام قومی و بین الاقوامی تنظیموں نے میری تائید کی تھی۔

اس طرح میں نے سمجھا اور محسوس کیا ہے کہ عالمی ادب سب سے ایک تجربے کی نگاہ سے نگاہ رکھتا ہے، یہی وہی تاریخی نگاہوں کی ایجاد کردہ ایک تنظیم بنسبیر ایک قسم کا عمومی بدن اور روح ہے، اور انسانی ترقی پر نذر انداز ہے۔ ملیاتی سرحدیں اب بھی کھلی ہوئی ہیں اور انسانی معاہدات کی وراثتیں اب بھی اس خیال میں ہیں کہ ادب بھی ایک "اندرونی معاہدہ" ہے اور ان کے عداوتی ختم کرنے میں آتا ہے۔ اخبارات اب بھی "ہمارے اندرونی معاملات میں داخل اندازوں کا حل نہیں" جیسی سرخیاں لگاتے ہیں۔ جب کہ ہماری کچی کھجوریں زمین پر ملتی اندرونی معاملے ہوتی ہیں، وہ انسانی کا واحد پھانسی میں ہے کہ ہر شخص ہر چیز کو اپنا مسئلہ سمجھے کہ شرق کے لوگ مغربی لوگوں کے خیالات پر غور کریں، اور مغربی لوگ اس بات پر غور کریں کہ شرق میں کیا ہو رہا ہے۔ ادب نے، جو انسانی حقوق کے قبضہ قدرت میں ایک بڑے حصہ کا حصہ ہے اور ہر دور کے سب سے پسے انسان کی ترقی پر اندازوں کے احساسات کو اپنے آپ میں غم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہذا، ان بڑے عہد کے ساتھ آج کے عالمی ادب کی طرف متوجہ ہو رہا ہوں، ان سکائوں و دستوں کی جانب جس سے میں "وراثت و پشت میں کبھی تعارف نہیں ہوا ہوں اور نہ جڑ سے کبھی ٹٹنے کی امید کی جا سکتی ہے۔"

دوستو! ہمیں حد کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اگر اس کی کوئی قدر و قیمت ہو۔ کسی نے عہد قدیم سے، مخالف سروہوں کے ہاتھوں زخمی و زخموں، فاقوں و درجنوں میں "پ" کے ملکوں کی طاقتوں میں، تفسیر کی نہیں، اتحاد کی تفسیر کی ہے؟ یہ صرف ادب ہی تھا، جو قدرتی دنیاؤں کے ذریعہ انھار کے ساتھ قومی جذلوں کے ساتھ قوموں کے درمیان ایک قوت اتحاد بنا، جو اس نئے زمین پر آباد ہیں۔

میرا خیال ہے کہ متعصب قوموں اور سروہوں کی تمام تر کاروائیوں کے باوجود ان تکلیف دہ حالات میں بھی، عالمی ادب انسانی کی امداد و طاقت رکھتا ہے۔ ادب میں قومی طاقت ہے کہ وہ ایک سر زمین سے دوسری سر زمین تک تجربات کے نیچے منتقل کر سکتا ہے، تاکہ ہمارے درمیان پڑنے والے شکاف کا مدارک ہو سکے، تاکہ انداز کے مختلف دنیاؤں کو ایک دوسرے سے متعلق کیا جاسکے تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے، کسی تاریخی بارے میں صحیح اطلاعات حاصل کر سکے اور ان سے نتائج برآمد کر سکے، تاکہ اسی قسم کی غلطیاں دوبارہ نہ جائیں۔ اور شاید ایسے حالات کے زیر اثر ہم فن کار لوگ اپنے آپ میں ایسی کارواں بھیست ترتیب دے سکیں جسے چوٹی دنیا قبول کرے، اور مرکز میں ہم لوگ دوسرے انسانوں کی طرح ان سب عوامل پر نظر رکھ سکیں جو ہمارے اطراف بڑھتا رہتا ہے، اور کنڈوں پر ان واقعات کے خاصے نکلے جائیں جو باقی دنیا میں ہونے لگے ہوں۔ اور ہم دنیا کی مناسبتوں پر نظر بھی رکھ سکیں اور انھیں لازم و ملزوم بھی کر سکیں۔

ہم دیکھ سکیں تو اور زمین ہوگا جو فیصلے صادر کر سکے، نہ صرف اپنے علاقوں کی ماکام کویتوں کے بارے میں، بلکہ کچھ مسائل میں رزاق حاصل کرنے کا یہ بہترین ذریعہ، اور ان افراد کا پیش ہونا ہے جو بنیادی

ظہور پر کیا نہیں ہوتے) بلکہ خود لوگوں کے بارے میں بھی، ان کی بدولانہ بات و غور و مشق کم ذریعوں کے بارے میں بھی؟ کوئی ٹیسٹ صادر کرے گا تو جوانوں کی معمولی اچھل کود پر، اور نوجوان چاقو پر مارنے والوں پر؟ ہمیں بتا دیا جائے گا کہ بے مدلی تشدد کے حملوں میں ادب کیا کچھ کر سکتا ہے۔ مگر ہمیں یہ نہیں بھوتنا چاہیے کہ تشدد کیسے زندہ نہیں رہتا نہ اس میں کیسے زندہ رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ نہ تو اس میں کذب نہ ہو سکتا ہے۔ ان کے درمیان نہایت ذاتی و دیگرے جذباتی رشتے ہوتے ہیں۔ تشدد کا ہر دھڑلہ کذب ہی میں ختم ہوتا ہے، فقط کذب ہی تشدد کا مددگار ہوتا ہے۔ مگر یہی انسان جس نے ایک بار بھی تشدد کا اپنا طریقہ قرار دیا ہے، اس کو نہایت بے رحمی سے کذب کو اپنا اصول بنانا پڑتا ہے۔ پتی پتہ تشدد کے وقت تشدد سیکھنے بندوں میں کتنا ہے، حتیٰ کہ اس پر غرور بھی کرتا ہے۔ مگر جوں ہی یہ حالت دور اور مستحکم ہو جاتا ہے، اور بڑے اطراف کی فضا کے بے چین کا احساس کرتا ہے، کہ وہ اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتا جب تک کذب کے گہر اور چند نئے مکے چاند نہ لے، اپنے اعمال کو بھی بدقول کا لباس پہنا دیتا ہے۔ یہ ہمیشہ گلابی ریشہ نہیں چھپاتا، اکثر یہ اپنے ہاتھوں سے کذب پر اور ان حمار شول میں شرکت پر بحث لیتا ہے۔

ایک سیدھے سادے انسان کے لیے سیدھا سا ناقد یہ ہوتا ہے کہ وہ کذب میں شریک ہو اور نہ غلط اقدام کی مدد کرے۔ دنیا میں یہی ہونا چاہیے، بلکہ اسی کو دنیا پر حکومت کرنی چاہیے، مگر میری مدد سے نہیں۔ مگر ان کا اور ادب اس سے زیادہ کر سکتے ہیں، وہ کذب کو فتح کر سکتے ہیں! کذب کے مقابلے میں ان کو ہمیشہ شعل اور ناقابل تردید کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ کذب دنیا میں کامیاب ہو سکتا ہے، مگر ان کے مقابلے میں نہیں۔ اور جوں ہی کذب چھپے گا، تشدد اپنی بدہندہ صورتی کے ساتھ ظاہر ہو جائے گا۔ اور فرسودہ تشدد سرنگوں ہو جائے گا۔

ایسے، میرے دوستو، میں سمجھتا ہوں کہ ہم ان شدید لحاظ میں دنیا کی مدد کر سکتے ہیں۔ اسے بہانے نہیں کہ ہمارے قبضے میں اتھک رہیں، نہ خود کو غیر شجید و المانہ حیات کے حوالے کر کے، بلکہ جنگ کر کے۔ دنیا لبان میں صدق کے بارے میں بہت کم باتیں بہت پسند کی جاتی ہیں۔ وہ مستحکم، مگر کبھی کبھی سخت، قومی تجربات کی مظہر ہوتی ہیں۔

صدق کا صرف ایک نقطہ قدر قیمت میں پوری دنیا سے نیا رہ گیا ہوتا ہے۔ اور یہ ہے، ایک تصور کی لغت میں دنیا و پر، مشرق و مغرب و انانی کے تحفظ کے اصول سے انحراف، جس کی بنا پر میں اپنی سرگرمی اور دنیا بھر کے آدمیوں سے اس کام میں امداد کی کھلی آواز دیتا ہوں۔

سیمویل بیکٹ

اعترافِ کمال۔ نثر نگاروں کے لیے جو نئے مدار کے ذریعے اور ناولوں کے ذریعے، جدید دور کے انسان کی ماداری اور نفسی کے بیان سے رفعت حاصل کرتی ہیں۔

سیمویل بیکٹ ان محدودے چند نویسوں میں سے تھا جو انگریزی، فرانسیسی و رافائلوں ناولوں میں ایک نئی قدرت کے ساتھ ادب تخلیق کرنے کی بھلاہٹ رکھتا تھا۔

جیوسف پتی ایک نظم Whoroscope کی 1930 میں اشاعت کے ساتھ ادب کے ساتھ عام پرووار ہوا جو شاخوں کے معرعوں اور مترد حاشیوں پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد اس کے مضامین کا ایک مجموعہ Proust (1931) اور ایک ناول (1934) More Ficks Than Kicks شروع ہوا۔ 1933 سے 1936 تک بیکٹ لندن میں مقیم رہا۔ ایک ناول نگار کی حیثیت سے اس کی شہرت کی ابتدا اس کے ناول Murphy سے ہوئی جس کا مرکزی کردار ایک ٹھونک سے اپنی کی خواہش اور اپنے ذہن کے تباہی میں پناہ کے دو حیاں جو وجود کو نظر آتا ہے اور جس کے ایک انتہائی دھماکے کے باعث وہ جویری وائلی سے محو ہو جاتا ہے۔

جنگ عظیم و دہم کی ابتدا کے وقت بیکٹ اپنے پیدائشی وطن آئرلینڈ Ireland میں تھا مگر وہ فوراً ہجرت کرکے امریکا کے نیو یارک کے علاقے میں شریک ہو گیا۔ ماسیوں کے علاقے میں شریک ہو گیا۔ ماسیوں کے علاقے میں شریک ہو گیا۔ ماسیوں کے علاقے میں شریک ہو گیا۔

وہ اپنی بیوی کے ساتھ جنوبی فرانس منتقل ہو گیا، جہاں وہ دو سال تک ایک گاؤں میں رہ پڑا۔ وہاں

اس نے مصوبہ رزق کے لیے ایک مزدوری حیثیت سے کام بھی کیا اور اسی دوران ہنا دوسرا ناول *Wait* بھی تخلیق کیا جو 1953 میں شائع ہوا۔ یہ اس کا آخری ناول تھا جو اس نے انگریزی کی میں لکھا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد صوف نے قیاسی عرصے کے لیے جہاز کے آؤٹ ریڈیو اس کے لیے کام کیا۔ 1946 اور 1949 کے درمیان صوف نے فرانسیسی زبان میں تین مسلسل بیانیہ ناول *Molloy*, *Malone Meurt* اور *L'Incommensable* تحریر کیے جو کچھ ہی صدی کی پانچویں دہائی میں شائع ہو کر منظر پر آئے۔ صوف کا کہن ہے کہ جب اس نے یہ ناول فرانسیسی زبان میں تحریر کیے تو اس کے لیے بغیر کسی طرز کے مھنا اس سے آہن لگا کر اس نے راستہ بھی قسم کی خوش اسلوبی کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان ناولوں نے صوف کی ان تخلیقاتی شخصیتوں سے آشنائی آشکار کی کہ سوچنے کی مجھد یوں سے اور دوسرا ناول سے فراہم نہیں۔ صوف ہمیشہ بغیر غلط کا وہ تخلیق کرنے کی خوشی کے آئینہ میں گر لگا رہا اور بے قول اس کے ہوا الفاظ کے اندر چھپی ہوئی خاموشی کو جھلکاتے ہوئے کی طور پر جدوجہد کرتا رہا۔

1949 میں صوف کا فرانسیسی زبان میں لکھا ہوا کھیل *En Attendant Good* انگریزی زبان میں 1954 میں شائع ہوا اس کے لیے تھمپسن کی دنیا میں شہرت کا باعث ہوا۔ اس کے بعد اس نے *Fin De Partie* (1957) لکھا اور بیڈو کے لیے کئی کھیل لکھے۔

صوف کی دوسری تصنیفات جو اس کی شہرت کا باعث بنیں 1945-49 کے درمیان لکھی گئی تھیں اور سب کی بنیاد دوسری جنگ عظیم کے احوال، واقعات اور تجربات پر تھی۔ ان ہی تخلیقات کے بعد صوف کے فن میں کچھ، بوخت اور پیچیدہ کے ترانے کی علامات دکھائی دیتی ہیں۔ یہ تخلیقات نہ جنگ اور اس کے تباہ کاریوں کے بارے میں ہیں، نہ محاذ جنگ نہ فرانسیسی مزاحمتی تحریک کے بارے میں جس میں صوف خود شریک رہا تھا بلکہ ان واقعات کے بارے میں ہیں جن میں انسان کی ذہنی تربیت اور انسان کی غیر انسانی تعلیم جو باتوں کو حکم کے طور پر سنبھالنے لگتا۔ ان معنوں میں صوف کے ہاں انسان کی تعلیم کا موضوع ایک فیصلے کی صورت میں باہر راہنما ہے جس نے ایک گہری تعلیم کی صورت اختیار کر لی۔ اس کیفیت کو شعور کی گہرائی میں اتارنا چاہیے بھی، اس لیے جب تعلیم ہو تو تب ہی اس کے توڑ اور مقابلے کے لیے ثابت ٹھہرے رہے۔ اس کی مثالیں حیا کی لہجوں میں نظر آتی ہیں جنہوں نے افلاطون کے کچھ رس کے نظریے یا بدشت کے ذریعے تہذیب نفس کی بنیاد رکھی۔

سیموئل صوف 1906 میں شانی *آؤ لینڈ* کے دارالحکومت ڈبلن کے ایک آسودہ خان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اس نے *Forora Royal School* اور *Thnny College, Dublin* سے تعلیم حاصل کی جہاں اس کو فرانسیسی اور کلاسیکی زبانوں میں خصوصی تربیت کا موقع ملا۔ صوف نے شانی *آؤ لینڈ* کے شہر بلن سٹ (Belleg) اور جہاز میں انگریزی کے استاد کے طور پر کام کیا۔ اس دوران اس کی مشہور اور خوب چمکیں جو کس سے نکلتی ہوئی تھیں۔ جب صوف اس کی کتاب *Finnegans Wake* کی چابی کے دوران اس کی سوانح نگار

تھا۔ بیکن نے اسی کتب کے ایک حصے کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔

1931 میں بیکن ایلمن واپس گیا اور MA کی ڈگری حاصل کی جس کے بعد Trinity College

میں ایک سال تک تعلیمی فرائض انجام دیے۔ بعد میں اس نے خدمت سے استعفیٰ دے کر پورا اپنا سارا وقت تصنیف، تالیف و تراجم میں صرف کیا۔

بیکن کے انگریزی اور فرانسیسی زبان میں تعلیم کے پورے دوران ایک زبان سے دوسری زبان میں اپنے ہی کام کے ترجموں سمیت کتابوں کی تعداد تیسرے کے قریب آتی تھی ہے۔
سیموئل بیکن نے 1989 میں وفات پائی۔



یاسوناری کاواбата

اعترافِ کمال: اس کی بیوی مہرٹ کے لیے جو بڑی حسرت کے ساتھ چھپائی فہمن کی ماہیت کا عکس رشتی ہے۔

یاسوناری کاواباتا چھپائی فہمن میں لکھنے والے پہلے ادیب تھے جس کو یب کا ٹوئیل انعام دیا گیا۔ اس کی پیش برتحقیقات بڑی دل رکنی سے چھپائی محوم اورن کے معاشرے میں رچے بسے بحیثیات کے مقام کو عکس کرتی ہیں۔ کاواباتا کی تحریروں میں ماضی کے جاپان کی حسن پرستی، جذبات پسندی، حقیقت جینی اور تحت اشعوریت کا قائل ذرا متراش پہلا جاتا ہے۔ اس نے بدتمین منہات پر مشتمل سو سے زیادہ ایسی مختصر کہانیوں لکھی ہیں جن میں اس کے فہمی بیون کا نیچہ رشتا ہے۔ ان کہانیوں میں سے ایک بہت اتر آئینز کہانی 'Up in the Tree' تھی جس میں اس نے ایک شادی شدہ جوڑے کی آپس کی لڑائی کے پچھلے پر اثرات کی اہل دور فہن کا مانہ عکس پیش کیا ہے۔ کاواباتا نے سب سے بڑائی زمانے کی کہانیاں اور مانوں میں یورپ کی تحت اشعوریت کے تجربے کیے۔ اس کا ابتدائی فطری سوب رفتہ رفتہ تاثراتی ہونا گیا جو شہانیت اور

نفسیاتی بیان کے ذریعے جاپانی جن لہیات کا انوکھا استخراج ہو گیا۔

دوسواری کاوا با 1899 میں جاپان کے بڑے صنعتی شہر اوسا کا میں ایک آسودہ حال اور تہیت مہذب گھرنے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک عیسوی تھا۔ کاوا با کو بہت کم عمری میں ہی تنہائی اور تنہائی کی زندگی گزارنے کا تجربہ ہوا۔ جب اس کی عمر صرف تین برس کی تھی اس کے باپ کا انتقال ہو گیا، سات سال کی عمر میں دادی نے ساتھ چھوڑ دیا اور اس کی واحد بہن بھی داہن متا رقت دے گئی جس وقت وہ یو نو یو کا تھا۔ اس کے خاندان کی اسوات نے کاوا با سے اس کا بچپن چھین لیا اور کئی اپنی بھین کا خیال ہے کہ ان کی صدمات کی نکتوں سے بچنے کی وجہ سے اس کی کہانوں میں احساسِ نیاں اور افسوس کا فقدان ملتا ہے۔ 6: با 1920 میں یو نو یو میں بی بی وری میں ادب کی تعلیم حاصل کرنے کا آغاز کیا اور چار برس کے مدر سرنگوشن کھل کر لیا۔ اس نے اوجوان ادیبوں کے ایک گروہ کی مدد سے Bungei jidai نام کے ایک اپنی رسالے کا اجراء کیا جو شوچیائی (Neo-Sensualism) تحریک کا پرزور داعی، حقیقت پسندی کے اہلکار ادب پر دو کا مخالف اور یورپ سے اٹھنے والے انفرادی ادب میں دلچسپی رکھتا تھا۔

ادب میں کاوا با کی کتابیں 1925 میں اس کے مختصر راول (The Izu No Odontko (Dancer کے ذریعے ہوئی۔ یہ ادب رسائل نو جوائی میں ایک مقصد پر فرقت ہونے کی اس کی پتی کوئی پتی تھی۔ کاوا با کی دھرمی تخلیقات (Nemureru Baa Sleeping Beauty 1961 اور شامت بعد از مرگ (Tanpoto (Dandemon بھی نو جوان لڑکیوں کے گرد گھومتی ہیں۔

کاوا با خصوصاً نسوانی نسبت پر تنقید کے حوالے سے پسند کیا گیا۔ اس مضمون پر اس کی بہ ہمدلی اور مہارت کی بہترین مثالیں اس کے مختصر راول The Snow Kingdom اور A Thousand Cranes ہیں جن میں سماں مہارت سے اس نے شہنائی واقعات جیسے حساس مضمون کو چاکر کرنے، اس کی جزئیات کے مشاہدے اور بیان میں اس کی اعلیٰ صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے کہ اس نے یورپ کے بڑے بڑے نیاپ اسلوب کے ماہرین کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ کاوا با کو تجزیہ جاپانی مصوری کی مانند ہے۔ اس کی نظریہ شہد جاپانی ادب میں ہائیکو (Haiku) کی فن ٹھونڈوں کی جیسا حسن رکھتی ہے۔

دوسری جگہ عظیم کے بعد کاوا با کی مشہور کتاب (The Snow Country 1948) تھی جو ایک مختصر عمر کے حسن پرست مرد اور ایک عمر رسیدہ جاپانی عورت (Geshu) کی کہانی ہے۔ 1952 میں اس کی تخلیق A Thousand Cranes منظر عام پر آئی جو جاپانی کلاسیک تخلیق The Tales of Genji پر مبنی تھی۔ 1965 میں Beauty and Sadness شائع ہوئی جس میں کاوا با نے ایک عمر رسیدہ مرد اور ایک مصروف کے دوبارہ ملاپ اور مصروف کے کم عمر عاشق کے انتقام پر مبنی کہانی بیان کی ہے۔

کاوا با کو 1953 میں آرٹ انسٹیٹیوٹ آف جاپان کا رکن چنا گیا اور چار سال بعد PEN Club of Japan کا صدر منتخب مقرر ہوا۔ بہت سے بین الاقوامی اجتماعات میں کاوا با نے جاپان کی

نمائندگی کے فرائض ادا کیے۔ اس کے فن کے اعتراف کے طور پر کھولانا کو جرمنی کا مشہور اعزاز گوٹے میڈل Goethe-Medal عطا کیا گیا۔

کھولانا نے 1972 میں خودکشی کے ذریعے اپنی جان دے دی۔ یہ وقت تک اس کی کیس کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔

ضیافت سے خطاب

جہالت تاب، عزت تاب حضرات، قابل احترام جناب صدر
متروپان نوٹیل فاؤنڈیشن، مکان سٹیڈش اکادمی
ٹوئین و حضرات!

یہ میری زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہے کہ سٹیڈش اکادمی نے 1968 کے نوٹیل انعام کے لیے میرا نام تجویز کیا ہے اور یہ انعام جہالت تاب کے دست مبارک سے مجھے عطا ہو چکا ہے۔
اس انعام کی اہلی ترین اور درخشاں وجہ اس کی تاریخ ہے کہ یہ غیر ملکی لوگوں کو بھی دیکھا گیا ہے اس کے انعام کو ایک عالمی انعام کا درجہ حاصل ہے۔ ماضی قریب میں جاپان کے یہ عالم سائنس دان لائو یو کاو (Yukawa) اور توموناگا (Tomonaga) یہ انعام حاصل کرنے والوں کے درجے پر غار ہو چکے ہیں۔
امریکی نوٹیل کی زبانوں میں شاعری بھی سمجھا تھا اور ریٹکارڈ بھی اور اسی جذبے کے تحت ادب کا انعام بہت سے ملکوں کے نکلنے والوں کو مل چکا ہے۔ لیکن ہمیں ہوتے کو آئے ہیں کہ یہ انعام ایک شرعی شخصیت، مدبر، تھریٹر کو ملتا تھا۔ اس، بھائی کے باعث جو مختلف زبانوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اور اس کے پیش نظر کہ میر، اور بڑے شہرہ آفاق ادیبوں کی تحقیقات کا ترجمہ کیا جاتا ہے، اس سٹیڈش اکادمی کے ارکان کی ماقام فراموشی تکلیف کے لیے شکر گزار، کی ماقام ہوں جو انہیں نے میری خاطر بخشتی ہے۔ لیکن برسوں میں ایک شرعی کو انعام دیا جانے پر، میرے خیال میں، جاپان کے لوگوں پر گہرا اثر ڈال رہا ہے، بلکہ شاہی لٹری کے تمام طبقوں پر بھی جن کی زبانیں بین الاقوامی سطح پر کم متعارف ہیں۔ اس انعام پائے پر اپنی خوش قسمتی کو تنہا اپنی ہی نہیں سمجھ رہا ہوں۔ اس خیال سے میرے جذبات اور بھی گہرے ہو جاتے ہیں کہ شاہی یہ انعام دنیا کے ادب کے لیے ایک نئی اور بے حد اہمیت کا حامل ہے۔

اس عالی شان موقع پر میرے دوسرے انعام پانے والے ساتھی بھی میری ہم توانی کریں گے کہ آپ نے ہم کو چند اہم نکات کا اعتراف بھی عطا فرمایا ہے جس کو میں مشرقی اور مغربی کے ادب کے درمیان سمجھوتے اور دوستی کی علامت کے طور پر دیکھتا ہوں جو حال سے مستقبل کی طرف بروقت دکھائی دیتی ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا رہوں۔

خطبہ

حسین جا پان اور میں

یہ دونوں میں نیلی پر پھول سے ہیں۔
بھری بہار، شری میں پیسے شور مارتے ہیں
خزاں میں چاند اور مہرہ کے موسم میں
روشنی اور خوشنودی برف ہوتی ہے

رستہ کا چنک چاند بال بچہ زمیں
ہر شب مرے پہن میں ہوتا ہے
ہوا چلتی ہوتی ہوتی ہے خطرہ برف ہوتی ہے

ان دو نظمیں میں سے پہلی سن 1200-1253 Dogen کی ہے اور اس کا عنوان ہے "فطری جذبہ"۔ دوسری نظم سن 1173-1232 Myoe کی ہے۔ جب کہ میں مجھ سے خطاطی کے نمونوں کی فراہمی کی جاتی ہے تو یہی دو نظمیں ہیں اکثر میں جن کا انتخاب کرتا ہوں۔

دوسری نظم کے زبور کے بارے میں ایک غیر معمولی کیفیت بیان کی گئی ہے جو اس کے معنی کی وضاحت کرتی ہے۔ "1224 کے بارے میں کہنے کی باتیں تاریخ کو چاند بادلوں کی اوت میں تھا۔ میں Kakyo Hall میں دھیان گمان کے مراقبے میں مصروف تھا۔ شب بیداری کے دوران جب "چی مات کا وقت ہو تو میں نے مراقبہ ختم کیا اور بال سے لگا کر نیچے چلے گئے۔" راتوں میں ایسا ہوا، چاند بادلوں کی اوت سے نکلا اور اس کی کرنوں نے چاروں طرف بکھری ہوئی برف کو روشن کر دیا۔ جب چاند میرے ساتھ تھا تو وہ ریختہ کے روتے کی آواز میں بھی بھوک و خوف زدہ نہ رہتا تھا۔ یوں ہی میں چاند سے نکلا چاند پھر بادلوں کے پیچھے چل گیا۔ اور جب "زمین سے شب بیداری کے آخری لمحات کا اعلان

تورہے تھے، میں نے ایک بار پھر ہندی کا رخ کیا، چاند نے بھی مجھ کو ہاتے دیکھ لیا۔ میں مرا تے کے بال میں داخل ہوا، چاند بالوں کے پیچھے پیچھے چڑھ رہا تھا، وہ چاند کی چوٹی کے پیچھے چھوٹے ہی لائق اور مجھے ایسا لگا گویا چاند خیر نور پر میری ہمراہی میں ہو۔“

اب ایک اور نظم پیش ہے جس کا نزو اس وقت ہو جب وہ چاند کو پہاڑی کے پیچھے دیکھنے کے بعد مرا تے کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

میں پہاڑوں سے پرستہ دور چلا جاؤں گا
اس طرف بھی کبھی آئے مرے پورے مہتاب
پرتی رات ہم آہیں میں ہفتگیر ہیں
اب ہم دیکھتے ہیں کی دوسری نظم کس کیفیت میں نکلی تھی۔ مرا تے سے ”کچھ کھن تو میں نے فجر
کے اہالے میں چاند کو دیکھا جو کھن میں چمک رہا تھا۔ میں خود ایک اندھیرے میں تھا اور، یہاں تک کہ
تھا گویا خود میرا دل اس روشنی سے روشن ہو رہا ہو جو چاند سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

مرا دل چمک رہا ہے
کسی حسن کی چمک سے، کسی آن مہی ونگ سے
بدستہ چاند تھپتھپا، یہ چمک رہا ہے، یہ وہی روشنی ہے
اسی (مندجہ ذیل) پر حسد اور مستحسودوں میں پروئے ہوئے، اچھے ہوئے خیالات ہی کی بنا پر
Mayoe کو شاعر بہتاپ کہا گیا ہے۔

روشنی، روشنی، اور روشنی،
روشنی، اور روشنی، روشنی،
روشنی، روشنی، اور روشنی،
روشنی سے مہتاب!

پچھلی رات سے فجر تک سرا کے مہتاب پر مندجہ ذیل تین نظموں میں Mayoe نے ایک اور پادری
شاعر Saigro کا مہتر پر استعار کیا ہے جو 1118 سے 1190 تک تعمیر حیات رہا تھا۔ اس (۱۱۱۸) کا کہنا
تھی کہ ”گرچہ میں نظم ترتیب دیتا ہوں مگر میں اس کو ایک ترتیب شدہ نظم نہیں سمجھتا“، نظم کے اکتیس
syllables سیدھے سادے لکڑے ہیں، گویا وہ مہتاب سے مخاطب ہیں، یہ مہتاب کے لیے مہتاب
میر ہمراہی ”نہیں ہے۔ مہتاب کو دیکھ کر وہ خود مہتاب ہو جاتا ہے اور مہتاب جس کو دیکھ رہا ہے اس کا
ایسا وجود بن جاتا ہے۔ گویا وہ خود نصرت میں سارے نصرت کا حصہ بن جاتا ہے۔ فجر کے وقت سے قبل مرا تے
کے کمرے کے اندھیرے میں بیٹھے پادری کے ”شفاف دل“ سے نکلتی ہوئی روشنی فجر کے مہتاب کے لیے
اس کی اپنی روشنی بن جاتی ہے۔

مادی مندجہ ذیل میں نظم کے خطوط تعارف میں ہم نے دیکھا کہ پادری کے اس کمرے میں جہاں سرا

کا مانتاب مذہب اور فلسفے پر مراقبے میں فرق پڑنے کا سنی بن جانا سے پادری کا قلب مانتاب سے ایک نہایت لطیف تعامل میں مصروف ہے، اور یہی وہ کچھ ہے جو عرصے متغایا تھا۔ میں اس لیے ہمیشہ اس وقت وہی نظم کا انتخاب کرتا ہوں جب مجھ سے میری خطاطی کے نمونے کی فہم کشی کی جاتی ہے کہ یہ نظم قابل ذکر نہایت اور ہم دن کے جذبات سے مملو ہے۔ مرا کے مانتاب کا پادری کی دت میں جانا اور پھر ہر شکل آنا، مراقبے کے کمرے میں چائے کے دارن بن جانے والے میرے قدموں کے شکات کو روشن رکھنا، مجھ کو بھیڑیے کے خوف سے ہڑکتا۔ کیا یہ ہوا کے جھونکے یہ برف، آپ کے جسم میں داخل ہوتی محض نہیں ہوتی؟ میں اس نظم کو اس کے احساسات کی گرمی، گہرے اور لطیف حساسیت کے لیے چنتا ہوں، یہ نظم جس نے پہاڑوں میں جاپانی جذبات کی پوسٹن گہرائی محسوس ہوتی ہے۔ بین رتوی سطح پر فن مصوفی شرقی و مغرب، ماضی و حال کے تقسیم کا نئی تصور Boncel کے ایک نرہ کش Yashiro Yoko نے شاعرانہ نظر کی طرف ایک سطر میں جاپانی شاعری کا ٹیچر سمویا ہے "نمف باری کا، مانتاب کا" رتوئوں کا موسم۔ تب ہم کو اپنے کامریڈ بہت مدد دیتے ہیں۔ "جب ہم برف کا حسن دیکھتے ہیں، جب ہم پورے، جب کا حسن دیکھتے ہیں، جب ہم تیرکی کے شیف کا حسن دیکھتے ہیں، جب ہمیں چاندی موسمی کا حسن چمکاتا ہے، وہی وقت ہوتا ہے جس کو اپنے پیار سے بہت یاد آتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ اس تمام رحمن سے وہ بھی کلف الموز ہوں۔ حسن کی حیرت خیزی خدمات کو ابھارتی ہے، جب ہمیں رتوئوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اور اس مقام پر غلط کامریڈ سے مردانہ "ن" کی ہوتا ہے۔ برف، مانتاب، شوفے، وردہ الفاظ جو موسموں کی ایک دوسرے سے ہم جنشوش کا احساس دلاتے ہیں، جاپانی روایت میں کوہساروں اور دیہاتوں کو، حدنگاہ تک بھیجے ہوئے بہرے اور اٹھار کی فطرت کے تمام مظاہر، اور انسانی احساسات کو بھی ان میں شامل کر دیتے ہیں۔ وہ جذبات سر دیوں میں ایک کامریڈ کا حساس، چاندی، شوفے یہ سب کے سب چائے نوشی کے اہتمام کے بنیادی عناصر ہیں۔ چائے نوشی کا اہتمام دراصل ایک طبع، جیسے موسم میں جیسے کامریڈوں کی ملاقات کا سائق ہوتا ہے۔ میں اس سلسلے میں یہ بھی کہتا ہوں گا کہ چائے نوشی کی محفل کے حسن اور اہتمام کے بین کے لیے میرے ادب A Thousand Cranes کو پیش کرتا ہوں۔ مناسب ہوگا، ایک فنی طرہ ہوگا، اس تنبیہ کے خوف ہوگا جو چائے نوشی کی محفل کے گرتے ہوئے معیار اخلاقی کے مسئلے میں کیا جاتا ہے۔

بہاروں میں خیریت پہ پھول آتے ہیں،
خیری دہات، گرمی میں جیسے شاد کرتے ہیں
قزاں میں چاند اور ہمارے موسم میں
روشنی اور فطرتی برف ہوتی ہے

تاری چ ہے تو Dogen کی اس نظم میں روایتی، بالکل عام اور معمولی انداز سے چائے نوشی

موسموں کی تشکیل کو دیکھ سکتا ہے۔ اس کو نظم بھی سمجھ سکتا ہے جو دراصل نظم ہی نہیں۔ اس کے باوجود یہ نظم
 یامادگی Ryokan 1758-1831 کی اس نظم جیسی ہے جو اس نے ہسٹر مرگ پر لکھی تھی:

میرنی وہاں کیا ہوئی؟
 چند ابھار کے تارہ چھوڑے
 ! دلی کی، کس مار کی کوئی،
 فریب نماں پر کھڑے پتے

اس نظم میں، Dogen کی نظم کی طرح بالکل سادہ اور عام سے جگر اور مادہ زمین الفاظ پر تکلف لڑی میں بہت
 دیے گئے ہیں۔ نہیں، بلکہ ایک خاص اثر کے ساتھ۔ اور یہی جاپان کا نچوڑ پیش کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ
 میں نے کہا ہے، یہ Ryokan کی آخری نظم تھی۔

بہار کا اک طویل ٹیکن، غم آمیز وطن تھا
 جو میں نے بچوں کے ساتھ بس پینڈ تھیستہ گئے
 سو بھی ناز ہے، اور مبتلا بھی ہو میں
 تو آخر عمر، بچ رہی ہے جتنی، پیو کر ہم رات رقص میں گزاریں
 یہ سچ نہیں ہے کہ اپنی دنیا سے چاہتا نہیں کچھ
 میں اس مسرت کو چاہتا ہوں، جو میری تہا ئیوں میں آئے

یامادگان، جس نے اپنے زمانے کی بے بودی کو مسترد کر دیا تھا، جو تحقیق صدیوں کی غفلت میں
 غرق تھا، اور جس کی شاعری اور خطاطی کا موجودہ دور کا جاپان مداح ہے۔ گاؤں گاؤں گھومنے والا، پناہ
 کے لیے ایک چھوٹا سا جسم ڈھانپنے کے لیے جو تیراہ کسانوں سے ملتا تھا کہنے والا ان نظموں کی کے جذبول
 کے سہارے زعمو ہے۔ اس کے نزدیک مذہبی فضیلت جیپڈی اور تولید نیاتی میں نہیں تھی۔ وہ ادب اور
 مشفق جندرت ہی کی طرف، بد مذہب کی تعلیمات "ایک مسکراتا چہرہ اور عظیم غلط" کے مطابق ماعظ
 رہا۔ جی آخری نظم میں دوسرے جیسے کچھ نہیں چھوڑا۔ مگر اس کو میدان کی کہ اس کے بعد فطرت حسین کی رہے
 گی۔ مگر کو ہم اس کی وصیت کہہ سکتے ہیں۔ اس کی نظم میں جاپان کے جذبات اور مذہبی عقیدوں کی
 گہرائیاں محسوس کی جا سکتی ہیں۔

میں تو حیران و پریشان تھا، وہ آئے گی کہ
 سب ہم اک ساتھ ہیں،
 سب اب ہمیں کس بات کی فکر؟

یامادگان نے روحانی شاعری بھی کی ہے۔ اور یہ ایک نمونہ ہے جس کو میں پسند کرتا ہوں۔ اسکو یہ

کے بڑے مایکان (وہ رہے کہ مجھے کئی عمر میں فوٹیل نعام ملا ہے) کی ملاقات ایک افسر بہت ہی ماہرہ
تائی ٹسٹن (Testun) سے ہوئی ہے اور وہ محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس نظم میں ایک نو عمر عورت کی
ملاقات سے حاصل ہونے والی سرت محسوس کی جا سکتی ہے جس کی اس نو عمر سے سے خوش تھی۔ اس نظم کا
آخری مصرع خود ایک بے مثال سادگی ہے۔

تیسرے سال کی عمر میں مایکان کا انتقال ہو۔ وہ Echigo نامی صوبے میں پیدا ہوئی جو آج کل
Nagata کہلاتا ہے، جس کے قریب میں میرا ناٹل Snow Country لکھا گیا تھا، ایک شمالی علاقہ جس کو
جاپان کا ”کوساٹو“ کہتے ہیں جہاں کچھ جاپان سے ہوئی ہوئی مائیکرپلا کر رہتی ہیں۔ ان میں سے وہ تمام زندق
شکل علاقوں کی میں رہا اور جب وہ تنہا ہوا تو نہ ان تھا اور چلتا تھا کہ موت کا وقت قریب ہے وہ روشن صاف
ہو چکا تھا، ٹہلے علاقہ جیسے کہ اس کی آخری عمر میں نظر آتا ہے میرے خیال میں اور بھی خوب صورت ہو گیا ہے۔
مگر نے اس پر ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے ”Eyes in Their Last Extremity“ یہ عنوان A
Kuzagawa Ryunosuke (1892-1927) کے اس خط سے برہنہ ہے جو اس نے خود کشی سے پہلے لکھا
تھا۔ یہ وہ خط ہے جو اپنی پوری قوت سے مجھ پر تراشا ہوا ہے۔ اکیٹا آئے کچھ تھا کہ ”میں اپنے اندر
چھید اس چاند کو جسے بھینے کی طاقت کہتے ہیں، رفتہ رفتہ کھو رہا ہوں“ اور یہ بھی کہ ”میں جا رہا ہوں
رکھو کی دنیا میں جی رہا ہوں، خوف کی طرح شفاف۔ مجھے خبر نہیں کہ مجھ میں خود کو ختم کرنے کی ہمت
کب آئے گی۔ مگر میرے لیے لغت نہ وہ خوب صورت ہے، جی خوب صورت جتنی پہلے بھی نہ تھی۔ مجھے
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ میری بات سن کر اس تھا وہ نہیں گئے کہ میں فطرت کو خوب صورت بھی کہہ رہا
ہوں اور خود کشی کا ارادہ بھی کر رہا ہوں۔ مگر فطرت یقیناً خوب صورت ہے اس لیے کہ میری ”کھیں آخری
وقت تک اس کو دیکھ رہی ہیں۔“

Akagawa نے 1927ء میں پینتیس برس کی عمر میں خود کشی کر لی۔

اپنے مضمون ”Eyes in Their Last Extremity“ میں مجھے کہنا چاہا کہ ”کوئی انسان دنیا سے خواہ
کتنی ہی بے زاریوں نہ سمجھ خود کشی کسی حیرت بھی روشن خیالی نہیں ہو سکتی۔ کتنی ہی قابل قریب کیوں نہ ہو
جو انسان خود کشی کرتا ہے اس کو ”ترید“ سے کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا“ نہ میں خود کشی کے عمل کو مرتکب ہوں نہ
مجھے اس سے کوئی ہمدردی ہے۔ اخلاقی تصورات رکھنے والے ایک محسوس میرا دوست تھا جس کو جوانی ہی میں
موت آئی۔ وہ بھی کئی برس تک خود کشی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں اپنے
مضمون میں لکھا تھا ”وہ بابا رکھتا تھا کہ موت سے مراد کوئی بھی فن نہیں، اس لیے کہ مرنا زندق ہے۔“ اس
کے لیے، جو بدھ مت کی عبادت گاہ میں پیدا ہو ہو اور جس کی تعلیم بھی بدھ مت کے مدرسوں میں ہوئی ہو
موت کا تصور مغرب کے مقابلے میں قطعی مختلف تھا۔ اس کے سینے الفاظ میں ”ان لوگوں میں جو اشیاء کو
تصور کرتے ہیں، کھلایا کوئی ہوگا جو موت کے بارے میں سوچتا“ مجھے علم تھا کہ Ikyu

(1394-1481) نے دو بار خودکشی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کو اپنا ہم خیال سمجھتا ہوں، اس لیے کہ وہ بچوں کے نزدیک بھی بہت دلچسپ انسان تھا اور اس لیے بھی کہ ہم تک اس کے بے حد و حساب مکی مکر و کار کے بارے میں بے شمار ٹیپے پہنچے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بچے اس کے ٹکٹوں پر چڑھ کر اس کی ڈرہی میں ٹھونٹیں مار رہے تھے، پھر وہ اس کے ہاتھوں سے ڈالے جھپٹے تھے۔ یہ گستاخے کہ بے خیالی کے معاملے میں وہ انتہا کے درجے پر پہنچا ہوا تھا اور یہ بھی کہ وہ حلیم الطبع تھا اور ہر ایک کے لیے قابل بردباری مبلغ تھا۔ وہ اصل بدھ مت کے ایک فرقے جین مت کے سہیلیوں میں وہ سب سے مکر اور گہرائی والا عالم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک شہنشاہ کا سیاح تھا، چھ برس کی عمر میں عہدوت گاہ میں داخل ہوا اور وہاں عمری ہی میں اس نے غیر معمولی شاعرانہ ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی کٹر و مذہب اور مذہب کے دہرے میں گہرے شبہات سے دوچار رہا کرتا تھا۔ ”مگر کوئی خدا ہے تو اس کو میری مدد کرنا چاہیے۔“ گرجیس ہے تو مجھے جہیل میں چھوٹا کر خود کو مجھیوں کی خدا کے بنا دینا چاہیے۔“ ان خیالات کے زہر تو اس نے جہیل میں پھندہ لگا کر اپنی عمر لوٹ میں نے اس کو پھنسا دیا۔ ایک اور سوانح پر جب Daikoku نامی مندر میں ایک مبلغ نے خودکشی کر لی تھی، اس کے کئی ساتھیوں کو مرزاش کی غی تھی۔ اپنے ”مغیر کے کاموں پر دوڑیں لے لے“ وہ مندر واپس گیا اور اس نے فاتح کے ذریعے خوشی کی کوشش کی۔ Collection of Rōing Clouds کے عنوان سے اس نے اپنی شاعری کا ایک مجموعہ مرتب کیا، اور اپنے لیے اس نے ”Rōing Clouds“ کا تحفہ پٹا۔ اس کے مجموعے اور اس کے بعد میں آنے والے شاعروں کے ہاں جین مت اور قرون وسطیٰ کی شاعری کی نظموں سے قطعی مختلف شہابی نعیمیں اور شباب گاہوں کے مازوں سے متعلق ایسی اسکی نعیمیں ملتی ہیں جن کو پڑھ کر انسان بہت دہ جاتا ہے۔ اس نے مجھیں کھانک شراب پیا اور عورتوں سے مظاہرہ کر کے سوچو جو جین مت کے مادی اصول کوڑوں سے آزدی کو اور اس طرح ہر قسم کی مرقبہ نہ ہی پڑھنا سے چھٹا رہے کے قریب اصل جین مت کے احیاء رندوں کے ٹھنڈے درستی و جہور کے اس کے حاصل کے لیے مختار رہیں لمحے میں خا نہ تھی اور خلاق کی جاسی کی کوشش کی تھی۔

Kyoto کے علاقے Murasakino میں واقع مندر Daikoku آج بھی چوئے فوٹی کی یادگار کا مرکز ہے اور چائے فوٹی کے کٹ کی شہرتوں میں گویا اس کی خطاطی کے نمونے بے انتہا سرے جاتے ہیں۔ خود میرے پاس بھی Ikkyū کی خطاطی کے دو نمونے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک صرف ایک سطر پر موقوف ہے ”بہار کی دنیا میں داخل ہونا“ مگر شیطان کی دنیا میں داخل ہونا مشکل ہے۔“ میں ان الفاظ کا اتنا گمراہ ہوں کہ جب بھی کوئی مجھ سے خطاطی کی فرمائش کرتا ہے تو میں بھی لقا دیکھ دیکھتا ہوں۔ ان الفاظ کوئی طرح سے پڑھا جا سکتا ہے، پڑھنے والے ان کو جتنا بھی مشکل بنانا چاہے، مگر بدھ کے ساتھ شیطان کے لفظ کی شمولیت سے جین مت کا پیرو Ikkyū فوٹی طور مجھ سے بہت قریب محسوس ہوتا ہے۔ وہ اصل ایسے فنکار کے لیے جو کج کی، اچھا کی اور حسن کی تلاش میں ہو، خلیف یا قریب میں خود دریا

ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو۔ پہلی نظر ۱۲ ہو مگر نقطہ کے پردے میں خفی ہو، مقدر کے کھسے و ثابت رہتا ہے۔ شیطان کی دنیا کے بغیر بدھ کی دنیا کا تصور ممکن ہے۔ اور شیطان کی دنیا وہ دنیا ہے جس میں داخلہ مشکل ہے۔ یہ ضروری ہو گئی کہ کسی سے۔

”اگر تمہاری کسی بدھ سے ملاقات ہو تو اس کو قتل کرو۔ اگر تمہاری ملاقات قانون کے کسی مجتہد سے ہو تو اس کو قتل کرو۔“

یہ جین مت فرقے کا مشہور منصب الجین ہے۔ اگر بدھ مت ایسے عام فرقوں میں تقسیم ہو جو عقیدے کے ذریعے نجات پر یقین رکھتے ہوں اور وہ جو اپنی کوششوں سے، تو ایسی صورت میں جین مت میں اس قسم کی شدت پسند افعال نہیں گئے جو اپنی کوششوں سے نجات کے حصول پر اصرار کریں گے۔ اس کے برعکس عقیدے کے ذریعے نجات کے دائمی Shm فرقے کے بانی (1173-1252) Shmran نے ایک بار کہا تھا کہ ”جنت میں نکلنا بدھ پید ہوئی اور مائیں کے مقابلے میں یہ کتنی زیادہ ہوتی۔“ کچھ ایسی قسم کی کیفیت Mitya کی بدھ اور شیطان کی دنیا کے بارے میں سے پھر بھی باتوں کے بھگدڑ مختلف سموں میں ہیں۔ Shmran نے یہ بھی کہا ہے کہ ”میں کسی ایک چیز کو بھی اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔“

”اگر تمہاری کسی بدھ سے ملاقات ہو تو اس کو قتل کرو، اگر تمہاری ملاقات قانون کے کسی مجتہد سے ہو تو اس کو قتل کرو،“ میں کسی ایک چیز کو بھی اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ ان باتوں کو ال میں ہی شاید بے رحم تقدیر کی فنکاری پوشیدہ ہے۔

جین مت کے عقائد میں شبہ کی پہچان نہیں ہوتی۔ جین مت میں اگرچہ شیعوں کا تصور موجود ہے مگر اس ہال میں جہاں مراقبے کا نظام نافذ ہوتا ہے وہاں نہ مہاتما بدھ کی تصویریں نہ ہی متبرک تحریریں ہوتی ہیں۔ جین مت کا چہرہ گھنٹوں خاموش اور ماسکت، آنکھیں بند کیے مراقبے میں بیٹھا رہتا ہے، بے حس کی کیفیت میں، ہر قسم کے خیالات اور تصورات سے بالکل بیزار رہنے و چھوڑنے کا کمال و جود کے دائرہ اثر میں چلا جاتا ہے۔ یہ مغرب والوں کا عدم وجود بخلا جیسا نہیں ہوتا جیہ حاصل اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے، جس روحانی کائنات جس میں ہر شے ایک دوسرے سے بالکلی ٹوٹ کر مرسلات کرتی ہے، حدود سے دور اور لا انتہا ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ جین مت کے، ہر بھی ہوتے ہیں جو شے سے سوالات اور جوابات کے تبادلے کے ذریعے جیسے گوشت خیز خیاں کی طرف، نکل کر رہتے ہیں، اور چہرہ گھنٹوں پر غور کرتا ہے۔ مگر جیسے کو بیٹھا اپنے خیالات کا حاکم اعلیٰ ہوتا ہوتا ہے اور اس کو اپنی ذاتی کوششوں سے روشن خیالی حاصل کرتی ہوتی ہے۔ اتفاقاً غریب احساس کے مقابلے میں، جیہ سبب پر زور کم دیا جاتا ہے۔ روشن خیالی تربیت پر تقسیم سے نہیں بلکہ اندرون میں کھنڈن و دل آئندہ کے ذریعے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ”برہمن“ میں ہوتی ہے، یہ بیرونی انعام کو چھوڑتی ہے۔ اس طرح عمر کو Vimalakirti Nirvāṇa Sūtra میں ”سرن جیسی خاموشی“ اپنی انتہا پر ملتی ہے۔ عبادت ہے کہ جین کے جین مت کا بانی مہشی صدی کے جنوبی ہندوستان کا، ایک شہزادہ و جی

دھرم (Bodhidharma) تھا جو نوویں صدی تک عالم خاموشی میں ایک غار میں بیٹھا دیوار کو بکتا رہا تھا اور بالآخر اس نے روشن خیالی حاصل کر لی تھی۔ چین مت میں جو خاموشی کا مراقبہ پیش کرتا ہے وہی دھرمی سے لیا ہے۔

Ikkyu کی جو کہیں کہیں خدمت ہیں:

جب میں سوال کرتا جب تم جواب دیتے
جب میں نے کچھ نہ پوچھا، تم بھی تو کچھ نہ بولے
بول رہا! پتھری چھرا، دل میں تمھارے کیا ہے

یہ تو غلط ذکر ہے کہ کچھ اور ہی ہے؟
جیسے پراتی ہوئی شہنشاہی صورت کی ہوا کی آواز
روشنائی سے بھرا ہوا خاکہ گہلی

یہ ہے شرقی مصوروں میں چین سے لے کر شرقی۔ روشنائی سے بھائی ہوئی تصویر کا جذبہ (جہاں بوجھ کر) چھوڑے ہوئے خاکہ میں ہے، قصبات (abbreviations) میں ہے دراصل میں پوشیدہ ہے جو کچھ مکمل چھوڑ دیا گیا ہے چھٹی مصور Chin Nung کے تحت میں ”آپ کسی شاخ کو خوب صورتی سے چیت کیجیے تو آپ کو جتنی ہوئی جوانی آؤر سنائی دے گی“ اور پادری Dogen نے ایک بار پوچھا تھا، ”کیا یہ اور کچھ نہیں؟“ (گویا) ہنس کی آواز میں جہاں افروز کی، شعلہ لگے پھولوں میں دل کی دھڑکن۔

گن دستہ بنانے کے فن کے بارے Ikenobo Sen نے ایک بار کہا تھا (یہ جیسے اس کے اقوال میں پائے جاتے ہیں) ”پھولوں نیری لائیں کے، اور چھوڑے سے پانی کے، استعمال سے (نظر کے سامنے) دیباؤں اور پہاڑوں کی پہنائیاں تازہ ہو جاتی ہیں۔“ بدشعبہ، ایک جاپانی دہائی فطرت کی پہنائیوں کی علامت کے، اللہ ہوتا ہے۔ مغربی باغات مناسب ہوتے ہیں جب کہ جاپانی باغ غیر مناسب انداز رکھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ غیر متناصب (asymmetrical) مدر پہنائیوں، تنوع اور گونا گونی کی مہر علامت ہوتا ہے۔ بدشعبہ غیر متناصبیت بذی اثر حسیت کے توازن پر انحصار کرتی ہے۔ منظریت کے فن کی رنگ مہنگیاں اور تخیلات کی گہرائیاں، جاپانی باغات کو بے مثال مدرت میں کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے ایک چکر تخیلیں پڑتا ہے جس کو بے آپ منظر نامہ کہا جاتا ہے، جس میں محض تاجر کے چھوٹے چھوٹے بے ہنگم گھروں سے پہاڑوں کا، دیباؤں کا، حتیٰ کہ سنگ خارہ کے ساحل سے گھراتی ہوئی سمندری مریوں کا تصور بھرنا ہے حالانکہ نظر کے سامنے ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اداروں کے تشدد کے عمل سے جاپانی باغات Donsai dwarf یا Donsai (سنگ اشیاء سے بنے باغ) کی مینت و صورت اختیار کرتے ہیں۔

ایشیا میں استعمال ہونے والے لفظ ”لینڈ سکیپ“ میں، ”پہاڑی پانی“ اسے تمام ہیچ و جوامہ کے

ماتھ ہوتا ہے، جو پیش منظر کی معنوی و روحانی میں کام آتا ہے، ایک تصور پڑھو، اور پانچوں کا بھی جتنی کہ انفرادی کا اور دینا رفر سوئی کا بھی رکھتا ہے اس کے دو جوڑوں، انفرادی، سرورگی، قرآن جیسی خصوصیت میں جن کو چائے نوشی کی محفل میں تدارک نکال دے دیکھا جاتا ہے، ایک "با ادب، سرور، خا سوٹھا" انفرادی کیفیت ہوتی ہے، جس میں ایک نوشی کی ثقافت جذبات بھی ہوتی ہے، جب کہ بے حد سادہ فخر چائے نوشی، اپنے اندر لا تہا فرقی دار ہے حد و حساب نہ مست رکھتا ہے، ایک پھول ایک سو پھولوں سے نیا نہ چمک دکھ رہتا ہے۔ سوویں صدی کا محفل چائے نوشی کا ماہر Fakyu کہتا تھا کہ پوری طرح پہلے ہوئے پھول کا استعمال، بالکل غلط ہوتا ہے۔ "نہ بھی، عام مان ہے کہ چائے نوشی کے کچھ میں صرف ایک پھول ہوتا ہے وہ بھی ایک بھلتی ہوئی کلی کی صورت میں۔ سو سو ماہ میں، مخصوص سرورائی پھول Dr. Camellia ہے جس کو Wabiusuke یا Whae Jewel کہا جاتا ہے، جس کا ترجمہ ہوگا "تہا نیوں کا سرور"۔ Camellia کا اپنی پیچیدگی، ماری اور نیوں کی چھوٹی کے باعث کچھ چائے نوشی مگر سبایا جا پسند کیا جاتا ہے، مگر محفل ایک بدکلی کی صورت میں۔ پیچیدگی تمام گھٹوں سے صاف و شفاف ہوتا ہے، اور اس میں تمام رنگ چھپے ہوتے ہیں۔ در ضروری ہوتا ہے کہ سبائی جانے زبان کلی پر شبنم کا ایک قطرہ بھی گویاں ہو ساس کلی نہ پانی کے چند قطرہوں سے غم بھی گروا جاتا ہے۔ چائے نوشی کی محفل کے لیے سب سے خوب صورت نظام مکمل ہوتا ہے مٹی کے مہنتے میں، جب شقائق امرت یعنی Peony کا پھول زردی، مٹی ہزار رنگ کے چھٹی ٹکڑوں میں سبایا جاتا ہے، مگر اس میں بھی ایک واحد کلی ہوتی ہے، اور ہمیشہ اس پر شبنم کا قطرہ ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ پھول پر قطرے آویزاں ہوتے ہیں، عملاً ٹکڑوں کو بھی نم کر دیا جاتا ہے۔

ٹکڑوں میں سب سے اعلیٰ درجے کا old Iga، سو پھولوں اور سو پھولوں مددی نیوں کا ہوتا ہے، جس کی سب سے زیادہ قیمت ہوتی ہے۔ جب old Iga کو نم کیا جاتا ہے تو اس کے رنگ اور اس پر بنے نقش و نگار اس طرح نکھر جاتے ہیں کہ دیکھنے والی آنکھوں کو کیفیت خوب سے باہر آنے والی تاریکی محسوس ہوتی ہے۔ (ایک بار) Iga کو بہت زیادہ درجہ حرارت سے دھکی ہوئی ہوتی ہے پتلا جا رہا تھا۔ یعنی سے نکلنے والی ماکہ و مایہ نشن کے دھوپ کا آمیزہ (آئینہ) فریش پر بہہ نکلا۔ جب اس کا درجہ حرارت کم ہو تو فریش پر پچھے جیسی شفاف اور چمک حرارت کی مجموعی تھی۔ چوں کہ رنگ مصنوعی نہیں تھے، بلکہ پھول میں پکھنے کے دوران مل بھی گئے تھے، اس سے بچنے والے نقش ایسے ہو گئے تھے جن کو بھٹی کی پریشان نقش سازی کے علاوہ کچھ اور نہیں کہا جاسکتا تھا۔ old Iga کی (پیرائی) سطح ٹھیک جانے کے بعد شبنم آئینہ چمک دیتی ہے، شبنم اور پھولوں کے کمال پر ریس میں معصوم ہوتی ہے۔

چائے نوشی کی رسم بھی تقاضا کرتی ہے کہ استعمال سے پہلے چائے کے پیلے کو نم کر دیا جائے تاکہ اس سے اسی طرح کی چمک پیدا ہو۔

ایک درموتے پر Ikenodo Sen نے کہا تھا (یہ بھی اس کے قول میں شامل ہے) کہ

”پہاڑوں اور ساحلوں کو خود اپنے جگر میں سمجھنا چاہیے۔“ پھولوں کی سیاہی کے پتے دہستان میں یا پن اٹکتے سکے لیے اسی نے ٹوٹے ہوئے گلدنوں کے پھولوں اور مرتجائی ہوئی شاخوں کے استعمال میں بھی نئی جہات تلاش جن میں وہ روشن کیفیت تھی جو پھولوں میں نظر آتی ہے۔ ”پہاڑے لوگ پھولوں کی سیاہی میں روشن کیفیت سرشکستے تھے۔“ اسی طرح ہم جاپانی ہڈیوں کے دریاں ایک طرح کی سرمستی دیکھتے ہیں جو چین مت کی تاثیر سے پیدا ہوئی ہے۔ رشاہ اس میں بھی، ایک انسانی دس ہوتا ہے جو تہائیوں اور طویل غائدہ جنگوں میں بھی زندہ رہتا ہے۔

Tales of Ise، جس کی تالیف دسویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی، شاعرانہ داستانیں کا سب سے قدیم مجموعہ ہے، جس کے نکلنے کو مختصر کہانیوں کہا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ شاعر Amwara no Yutaka نے اپنے محبوبوں کے لیے پھول سجائے تھے:

”ایک نہایت حساس انسان ہوتے ہوئے، اس نے ایک بڑے سے مرتبان میں نہایت انوکھے Wisaria کے پھول سجائے تھے۔ پھولوں سے مزیں گل دینے سے سارا حصے تین وقت سے زیادہ طویل پھول بھری شاخیں بھرا رہی تھیں۔“

Wisaria سے بھری طویل شاخوں سے مزیں گل دستہ اتار غیر معمولی ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو اس کے بیان پر شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود مجھے اس گل دستے میں Heian تہذیب کی علامتیں نظر آ رہی ہیں۔ Wisaria ایک خاص جاپانی پھول ہوتا ہے، اور اس میں ایک نہایت ٹھیک سوئی لطافت ہوتی ہے۔ Wisaria کی پھول بھری شاخیں، نسیم کے جھوکوں میں بہرتی ہوئی، نرمی، شائستگی، اور سکون کا پتلا ہیں۔ چاتے ہوئے موسم کے ساتھ ان کا قلاب ہو جاتا اور پھر موسم سرما کی شروعات کے سیزن میں ظہور کرنے سے ایک خوش رنگ حسن کا احساس ہوتا ہے جو جاپانی یگانہ پن کی علامت معلوم ہوتا ہے۔ بدشہ، عین وقت بھی اوپری سمت اٹھتی ہوئی پھول بھری شاخوں کا غلط اقل بھی کیا چیز ہوتا ہے۔

بادی میں قتل کی Heian تہذیب کی چمک دک اور ایک مخصوص جاپانی حسن و بیک ہی اجنبی کی دھت تھی جیسے کہ یہ غیر معمولی Wisaria اس لیے کرچینی Tang تہذیب کسی حد تک قسم کی اور جاپانی جابجی تھی۔ جہاں تک شاعری کا سوال تھا، دسویں صدی عیسوی کے شروع میں شادابی طرف سے ترتیب دیے جانے والے تذکرے Kokinshu اور انسانیوں میں Tales of Ise شامل تھے، انھیں بگے بعد جاپانی نثر کے اعلیٰ درجے کے نمونے Lady Murasaki کی Tale of Genji اور Sei Shonagon کی Pillow Book تھی، جن کے مصنفین دسویں صدی عیسوی اور سولہویں صدی کی ابتدا میں ژرے تھے۔ اس طرح ایک دھت قائم ہوئی تھی جو جاپانی ادب پر نہ صرف اثر انداز ہوئی تھی بلکہ سوویں تک اس کی حاکمیت رہی تھی۔ The Tale of Genji خصوصاً جاپانی ادب کی دستار میں کثیف جیسی تھی۔ اس نطائے سے اس وقت تک ایسی کوئی کہانی وجود میں نہیں آئی ہے جس کا موازنہ اس سے کیا جاسکے۔ یہ

جدید ادب کی بنیادوں پر صدیوں میں تخلیق ہوتا تھا ایک ٹکڑے سے کم نہیں، اور ایک ٹکڑے کی ہی طرح اس کو پوری دنیا میں جانا جاتا ہے۔ اگرچہ جاپانی ادب کی ایک بارے میں میری استعداد وہاں سے زیادہ نہیں ہے، مگر یہ محض Genji ہی تھی جو میرے نزدیک سب سے اچھی تھی۔ اس کی تخلیق کے صدیوں بعد بھی Genji کا جادو چمکا رہا ہے، وراثت کی نقل ہی اس کے لیے سب سے بڑا اخراج ہے۔ Genji ہی وہ چہرہ تھا جس نے شاعری کی آبیاری کی، اور بلاشبہ لٹریچر کے لیے بھی، حتیٰ کہ مناظر، و غنائی ایک میں اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔

Murasaki اور Sei Shonagon اور Zumi Shikibu جیسی معروف شاعرات، جن کا انتقال گیارہویں صدی کے اوائل میں اور Akazome Emon کا اسی صدی کے وسط میں ہوا تھا، جاپانی ادب کی اہم رکن تھیں۔ جاپانی تہذیب، ادب کی تہذیب، اور ادب کی تہذیب نسوانی تہذیب تھی۔ Genji اور Pillow Book کا دور اعلیٰ ترین دور تھا، جب بچہ کا دل بے پروا رہتا تھا۔ جاپانی ادب کی اعلیٰ تہذیب کے اعلیٰ حصے کا جو چہرہ تھا۔ ادب کی تہذیب خیمہ ہو رہی تھی، طاقت و مہارتی اثرات کے، انھوں سے نکل کر فوج کے مراکز میں جاری تھی، جو 1192 میں Kamakura Shogunate سے 1867 اور 1868 کے Meiji Restoration تک تقریباً سترھ صدیوں تک چلی رہی تھی۔ یہ مطلب نہیں نکالا جاسکتا کہ شاعری و ادب کی تہذیب مٹ گئی تھی۔ آٹھویں صدی شاعری تذکرے Shinkokinshu کے مطابق تیرہویں صدی کے Kokinshu کی تشکیل چاروں ایک درجہ اوپر ہو چکی تھی، اور ابھی کبھی یہ محض ادبی چہرہ جاپانی کی ہستی تک تر جاتی تھی، مگر اس میں کچھ خفیہ عناصر بھی شامل کر دیے گئے تھے، غریب خیال، پکارتے والے حیوانی بھڑکی کے نتائج خد کرنے والے، جن کے جدید علامتی شاعری سے ڈالنے سے تھے Sakyo جس کا پیسہ تذکرہ کیا جا چکا ہے، Heian اور Kamakura کے ادب کا نمونہ شاعر تھا۔

میں اسے خواب میں دیکھتی تھی کہ اس میں ہی کی تمنا میں تھی
کاش میں جان سکتی، یہ سب خواب ہے، تاکہ میں جاننے کی تمنا نہ کرتی کبھی
اپنے خوابوں میں ہر شب، اسی سے ملاقات کرتی ہوں میں
خوف، یہ سب تو ایک لمحہ پر فوٹوں سے بھی کم، حالتِ چشم دید ہے

یہ (مندرجہ بالا) مصرعے Kokinshu کی سربراہ گورنہ شاعرہ Ono no Komachi کے ہیں جو سیدھی سادگی حقیقت پسندی کے ساتھ خوابوں کے گیت گاتی ہے۔ مگر جب ہم شیزاؤکی Edo کی مندرجہ ذیل تفصیل پڑھتے ہیں، جو اسی زمانے میں تھی جب Ikkyu تھا، یعنی Muromachi کے زمانے میں، Shinkokinshu کے کچھ مصرعے کے بعد، تو ہمیں ایک سبک کی حقیقت پسندی کا احساس ہوتا ہے، جو وہ انگریز طبعیت ہو جاتی ہے، جاپانی اسکول میں، مگر مجھے جدید محسوس ہوتی ہے۔
بالوں کی جھاڑیوں پر چلتی ہوئی،

جن پہلے شورچہ یوں ہی چپکا رہے
کے کرن آفتابی، خزاں رنگ چادرے
خزاں کی ہوا، باٹ کی جھڑیوں کو ستانی ہوئی
مری استخوان میں اترنے لگی

اور وہاں سے شام کا نور سامنے آجایا ہو گیا

Dogen، شفاف، مختلف عرف کے بارے میں جس کی نظم میں نے پیش کی تھی، اور Myoe کی نظم جس نے سرما کے سورج کو اپنا سر تھپی کر دیا ہے، عام طور پر Shinkonshu دور سے تعلق رکھتی تھیں۔ Myoe نے Saigyō سے اپنی نظموں کا تبادلہ کیا اور دونوں شاعری پر باتیں کیا کرتے تھے۔ مندرجہ ذیل دستور Myoe کی سوانح سے لی گئی ہیں جو اس کے شاگرد Kikai نے ترتیب دی تھی:

”Saigyō شاعر کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اس کے اپنے قول کے مطابق، شاعری کے بارے

میں اس کا ہونا چھ، ر، عمیبت کی آگ سے بہت بند تھا۔ Cherry Blossoms, The Cuckoo, The Moon, Snow وغیرہ میں اس نے نو قلموں کی فطرت کا مقابلہ کیا تھا، اس کی آنکھیں اور اس کے کان ٹھنڈی کیفیت سے پُر تھے۔ تو جتنے بھی الفاظ سامنے آئے، کیا وہ سچے الفاظ نہیں تھے؟ جب اس نے کیوں کے گیت گائے، اس کے ذہن میں کیوں نہیں تھیں، جب اس نے اجتاب کا ترانہ گایا تو اس نے متاب کو نہیں سوچا تھا۔ (نثر) جب فوت سامنے آئی، جب ترغیب ہوئی، اس نے شعر لکھے۔ آسمان پر کتنی سُرخ کبکھاس سے آسمان رنگ لے رہا تھا۔ سورج کی چلتی روشنی، کی تھی کی آسمان روشن ہو رہا تھا۔ پھر بھی خالی آسمان کو، اپنی نصرت کے مطابق، چمکتا نہیں تھا۔ اس کو رنگ نہیں چاہیے تھے۔ خالی آسمان جیسے جذبے سے وہ بوقلموں مناظر میں رنگ بھر رہا تھا، نمران کا وہی سرٹ نہیں چھوڑ رہا تھا۔ یہی شاعری میں (گیت) چھ تھی، قطعی سچائی کی گنجی کی مانند۔“

یہ ہے وہ خالی پن، وہ عدم، مشرق کا۔ میر ہٹا کا بھی خالی پن کا کام کر دیا ہوگا ہے، مگر اس کو مغرب کا Nihilism نہ منکریت نہیں سمجھنا چاہیے۔ جہاں زیادہ بہت مختلف ہوئی ہے۔ Dogen نے پتی نظم کو موسموں کا عنوان دیا تھا ”جہاں حقیقت“، اور اس نے جب موسم کے حسن کے گیت گائے تھے تو وہ چین مت میں سرے پا کس بجے شرابور تھا۔

میکیل انجیل استوریاس*

اعترافِ کمال اس سے واضح و روشن دارادہ کا نام ہے کہ اسے جو لاطینی امریکا کے قدیم
مذہب باشندوں کی قومی شخصیتوں اور رہنماؤں کی گہرائیوں سے محسوس ہے۔

میکیل استوریاس لاطینی امریکا کے اس جدید ادب کا ایک اہم نمائندہ ہے جس میں بڑی دلچسپ
ارتقاء پیدا ہو رہی تھیں۔ میکیل انجیل اس سے کوئے مالا کے پاسوں کی طرح فطرت سے بے باک محبت
اور ایمانی دیومالایت کے زیر اثر تھا۔ اس کو اپنے کئی دہائیوں کی آزادی سے تعلق تھا کہ یہ جذبہ
اس کے تخلیقی دہ پر محیط ہو گیا تھا۔ میکیل نے قانون اور اعلیٰ علاقائی لوگ ریت کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم
کے اختتام کے بعد و فرانس چلا گیا جہاں پھر عرصے تک اس نے اپنے ملک کی مفاد پر زندگیوں بھی
اتہام دیں۔ جب 1954 میں گوئے مالا میں فوجی انقلاب آیا تو میکیل نے احتجاجاً فرانس ہی میں مجر و طینی
اختیار کر لی، اور اس وقت تک اپنے ملک و پس نہیں گیا جب تک کہ وہاں منتخب شدہ حکومت بحال نہیں
ہوئی۔ جس وقت اس کو نوٹس انعام کے لیے موزوں کیا گیا اس وقت وہ دوبارہ فرانس میں گئے۔ اس کے سفر
کی حیثیت سے متعین ہو چکا تھا۔

گوئے مالا میں تو میکیل کے ادب میں اس کا ایک مقام بن چکا تھا مگر کچھ صدی کی چھٹی دہائی
میں اس کی تصانیف کے کئی نیا نیاں میں ترجمے ہونے کے بعد سے میکیل بین الاقوامی طور پر ایک ادیب کی

حیثیت سے بھی بچھا جانے لگا۔ اس کا پہلا قابل ذکر ادبی کام (1930) *Leyendas de Guatemala* تھا جو گوتے، لائی ڈائٹ اور ماہی (Maya's) قدیم امریکی باشندے۔ مترجم) کی تہذیب سے متعلق تھا۔ یہ غنائیت سے مسوہ سپہ نوبل زبان میں تحریر کی گئی پوری کہانی اور شاعری کا حسین استراچ تھا۔ گریگیل کے عمل و تقاضی ابتداء اس کے ماہی (1946) *El Señor Presidente Mr. President* سے ہوئی۔ یہ دور انگیز نظریہ ماہی الاطنی امریکا کے ان فوجی حاکم، اس کے بارے میں تھا جنہوں نے ہاربا راٹھ کر اپنے جبر، بربریت اور بد عنوانیوں سے گوتے مار کے عوام کی مذمتی جہنم بنا دی تھی۔ جس جذبہ شوق سے گریگیل اس خوف و ہراس و رعب بھری فضا کی تخلیق کرتا ہے۔ اس سے اس کا تحریر کردہ وہ ایک انزال جرنیل کی عکاسی عداوت قہر رکھتا ہے۔ یہ ماہی کی بے لوثی افسروں کی بد معاشیوں، ہرج مہجے میں بد عنوانیوں و بد عنوانیوں کے گتھوں میں جینے کا ایک دوسرے کے خوف سازشوں کی لسی داستان ہے جو اس ملک کے عموں کی تاریخ کی مانند ہے۔ اس ماہی میں تحت الشعوریت کا مدنیان اختیار کیا گیا ہے۔

تین سال بعد گریگیل کا ہیرو ماہی (Men of Maiz) *Hombres de Maiz* نکلا۔ پندرہ ہزار سال کا ایک لوگ داستان کی مانند تھا مگر وہ اصل اس کی تخلیق اس استوائی خطے کے ہامیوں کی ویدو مالہ ان کی معاشی و عمرانی اہماری اور جبر و استبداد کی منہ پر تھی۔ گریگیل کے تین مسلسل ماہی *Viene Faeze* 1950 (*Strong Wind*) *El Papa Verde*, 1954 (*The Green Pope*), and *Los Ojos de los Enterrados*, 1960 (*The Eyes of the Buried*) اس کے ان معاشی اور سیاسی استبداد پر ایک احتجاج کی مانند تھے جنہوں نے اس کے ملک کو مستحکم وراستہ رانی خطہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ ان ماہیوں میں بھی گریگیل کے اندر پھپھیا ہوا شدید جوش اور حیثیتی پیمان ابھر کر سامنے آتا ہے جو اس ملک کے باشندے کی حیثیت سے اس کا منطقی رد عمل تھا۔

گریگیل نے اپنے آپ کو قدیم اور انکا ررانتہ مہانویان کے چنگل سے آزاد کر دیا تھا۔ پندرہویں صدی سے وہ یورپ کی جدید یورپینک کے زیر اثر تھا۔ اس کا شعور تیرا اٹھارہویں اس کو فرانسیسی قوت الشعوریت سے قریب کرنا ہے مگر خیال ہے کہ گریگیل ہمیشہ حقیقی زندگی سے حاصل ہونے والے وجدان سے فیض لب ہوا تھا۔ گریگیل استودیو 1899 میں گوتے مارا میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن، اور عالم شباب اس کے اپنے وطن میں ہی گزارا اس نے اس کا روحی و دینی سے قانون کی ڈگری کی ورا اس سے اس میں کچھ ہوا اس کا مقالہ "The Social Problem of the Indian" 1923 میں شائع ہوا۔ قانون کی تعلیم ختم کرنے کے بعد گریگیل نے اپنے ہم کتب دوستوں سے مل کر *Popular University of Guatemala* کی بنیاد ڈالی جس میں ان صاحب عملوں کو اعلیٰ تعلیم کا موقع فراہم کرنا مقصود تھا جو ماں مجیدریوں کی وجہ سے پوری دینی میں ناظرے سے محروم رہ چکے تھے۔ گریگیل نے سیاسی معاشیات کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یورپ اور اس کے بعد تھکسان کا سفر کیا۔ تھکسان میں چند ماہ قیام کے بعد وہ پیرس چھ گیا جہاں اس نے مایاؤں

کے مذہب (Mayas Religion) کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس دورن اس نے کئی لاطینی امریکی اخباروں کے لیے مراسلتکاری بھی کی۔ میکسیکو نے تقریباً تمام مغربی یورپی ملکوں، یونان، مشرق وسطیٰ اور مصر کا سفر کیا۔

1928 میں میکسیکو گئے مالا واپس گیا جہاں اس نے عوامی پولی ورٹی میں پینچر صیے جو 1928 میں Arqueadura de la Vida Nueva (Architecture of the New Life) کے عنوان سے 1928 میں شائع ہوئے۔ 1947 میں میکسیکو ارجنٹائن اور گونے مالا کے سفارت خانے میں پچھلے اٹاٹو کی حیثیت سے تعینات رہا۔ یہیں اس نے Sen de Alondra (Temple of the Lark) کے نام سے 1918 اور 1948 کے درمیان لکھی جانے والی اپنی تصویروں کی ایک بڑی شائع کی۔

جب 1954 میں گونے مالا کے صدر Jacobo Arbenz Guzman کی حکومت معزول ہوئی تو میکسیکو نے ارجنٹائن میں جواہریاتی افسر رہے اور وہیں اس وقت تک اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں مشغول رہا جب تک گونے مالا میں منتخب حکومت سربراہتہ رہی نہیں آئی۔

میکسیکو، استونیائی کی نثر اور نظم پر مشتمل چھپوں سے نورد کتابیں شائع ہوئیں۔ اس کو 1966 میں نیشنل دفنی عوام بھی 1۔ وراہی مال اس کو فرانس میں اپنے ملک کا سفیر بنا دیا گیا تھا۔ میکسیکو، استونیائی 1974 میں وفات پائی۔

ضیافت سے خطاب

میری آواز دھک دے رہی ہے، بہت دور سے میڈیٹیشن کاوش کے آسمان پر۔ بہت مشکل ہے اس کے خاندان میں شہریت۔ آسان بھی ہے۔ اس کا راستہ قسمت کے ستارے جانتے ہیں، مٹن شمعوں کے خاندان والے وقت ہیں کہ نوٹس خاندان کا فریڈ نوٹس کا ورکس، کس طرح بنا جاسکتا ہے۔ ابو کے بندھن سے عمرانی رشتوں سے ایک نئی کاکت، تھیں فی انش اور مٹن کا پیدا کردہ ایک نازک رشتہ کس طرح ستور کیا جاسکتا ہے۔ اور شاہ نوٹس انعامات کے عظیم خاندان کے ہیاڈر، الفرید نوٹس، کا فاشوش ارادہ ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ سٹل ورٹس اپنے (معنوی) وارٹس کی ایک الگ دنیا کی تخلیق۔ جہاں تک میر سواں ہے، میں ان تمام دھن میں سب سے کم مستحق کہ جاسکتا ہوں جو نوٹس خاندان میں داخل ہونے کے لیے منتخب کیے جاسکتے تھے۔

میں اس اکائی کی مرضی ہے، جس کے وعدے سال میں ایک بار مکمل ایک دھپ کو رتبہ دینے کے لیے کھلتے اور بند ہوتے ہیں، اس خاندان میں داخل ہو رہا ہوں۔ اور اس لیے بھی کہ میں نے اپنی نکتوں اور مادیوں میں ایک لفظ استعمال کیا ہے، وہ لفظ جو اپنی خوب صورتی سے نیا دنیا سے مار رہا ہے اس تشویش کا جو اس خواب دیکھنے والے کے لیے اچھی نہیں تھا جس نے اپنی ایجاد سے دنیا کو ہمارے دھپ سے جدا کیا۔ اس وقت تک کہ سب سے زیادہ ایسا جو کانفی کے دوران میں نہیں نکھوئے، ہمارے دھپ میں ملنے میں کام آئی۔ (مگر یہی تو رہے کے مشن میں وہ لفظ نہیں۔ جس کا وہ اپنی جیل میں ذکر کیا گیا ہے، غالباً یہ لفظ "انٹیمانٹ" ہوگا۔ مترجم)

مجھے نہیں معلوم کہ یہ تقابلی کچھ زیادہ ہی جسامت پر مبنی ہے، مگر یہ ضروری ہے۔ چاہ کن قوتوں کے استعمال نے، جس کو انٹیمانٹ نوٹس نے حضرت جی سے اٹھایا تھا، ہمارے امریکا کے دیوتا مت منسوبوں کو ممکن بنایا۔ ان میں بنانا کو شہر شامل ہے۔ ایک سکرنگیر چہی جس کا تقابل ہمارے مادیوں میں دکھائے جانے والے ایسے دھپوں (معدنوں) سے کیا جاسکتا ہے جو غیر مصفا شدہ دھپوں کو سہم کر کے نئی دنیا کے لیے مایوس نکالتے ہیں۔ منوں منی کے بوجھ کے نیچے دہی ہوتی ان لوگوں کی غلط فہمیاں، بد فہمیاں اور ممنوعہ اعمال کی خیر کا نہیں ایسی حقیقتوں سے لبریز ہوتی ہیں جن کو کہلوں اور مراغیر کے مابین، ہماری احتیاج کو دھپوں، مدنیہ الام نامی اور مفہم بیانات سے پتہ ڈھیروں خطوط پر روشنی ڈالتی ہیں جن سے، رہت کی مانند جھڑتے ہوئے خواب دان کی مخالف حقیقتیں برآمد ہوتی ہیں۔

ایسی غلط فہمیاں جو چالیں پن کی جغرافیہ وجود میں لاتی ہیں، خوف، ماک صدمات، جیسے کہ فحشیت، سب بے جا سمجھوتے کرنے والی ادبیات کی شریعت مقدم نہیں ہو سکتے اور اس طرح، ہمارے مادی یورپی قاری کی نظر سے غلط منفی اور کج رویا دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب صدمہ گیزی ہی کی خاطر سنسنی خیز نہیں ہوتے۔ یہ بس وہی کچھ ہوتے ہیں جو ہمیں صدمہ پہنچاتے ہیں۔ نئی دنیا کی اچھال ہونے سے قبل ہی ہمارے عقلمندوں میں فرق ہو گئے، نسلیں "خستہ کردی گئیں جب انھوں نے "زادوں کے لیے سر اٹھانے کی کوشش کی۔ کسی ادب کی شریعت مقدم ہونے کی صورت میں یہ سب کیفیت انہوں کو ماک ہوتی ہیں۔ ہمارے دھپ میں ہمیں شکست خوردہ نہیں فتح مند انسان کا لگاؤ ہے، کسی بے بصیرت مخلوق جو ہمارے گیتوں میں جو کچھ ہوتی ہے۔ ہم ایسی دنیاؤں کے لوگ ہیں جن میں یورپی تنازعات جیسے قریب نہیں ہوتے، جو اپنے تمام ابعاد میں ہمیشہ امن ہوتے ہیں۔ "نرمیہ معدنیوں میں ہمارے تنازعات ہر پہلو سے قیامت خیز رہے ہیں۔"

صلیبیں، جیڑھیں، تلی غلطیت، متون کی وحشیانہ انداز میں تلاوت۔ ریزر خواں۔ یوریک مارچر کے چھٹے خطوط حرکات، نئی زبان، غصہ کا غریب زنجیر۔ "مورہ خیالات، اپنے گہوارے کے چھٹے کے دوران میں رہنے والی معرکہ قیام کا نقصان، ان کو ایسا دیکھا جاتا ہے۔ اور کافی ساری ایجادات کے بعد قاعدہ کے ماہرین زبان چھانٹنے والی غلطیاں لیے سوچنا میرے نزدیک سب لوگوں کی ذرا امر کی خوب ہیں مگر

اپنے گھر در سے ہن کے بغیر۔ قواعد خط کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ قواعد کی مخالفت کا خطرہ اور ہم سے
مقام پر ہیں۔ متحرک الفاظ کی تلاش، ایک اور جادو، فعال الفاظ استعمال کرنے والے ادیب اور شاعر،
زندگی، اس کے تجربات، کوئی بھی پسے سے تیار شدہ نہیں، الفاظ کے درمے اشیا کی مناجی، انھیں اشیا پر
نکھڑے کر تلاش۔ اس پر مستغرق انسان کے مسائل۔ ناممکن میر پچھڑا انسان، اس کے مسائل، ایک حکم
پر عظیم۔ اور جس کو اس اکا دلی میں شایہ۔ ہم سے علم ادیب، اسکولوں کے اور مقالوں کے بارے میں
سوس نہ کیا جائے۔ مح آپ کے لیے الفاظ کے ممکنات مہیا کرتے ہیں۔ ان کی جانچ کیجیے۔ سب فراموش
ہیں۔ فراموشی انداز کا تجسس فراموشی کی تحریر ہے، مکالمہ ہے۔ اور سب سے فرائض یہ ہے کہ کسی بھی
عہد میں عمل تخلیق کے تسلسل میں کوئی رد نہ ہو جس کوئی ہے۔

خطبہ

لاٹینی امریکی مادل۔ ایک عہد کی گواہی

میرے خیال میں اس اجتماع کا خطبہ کے بجائے غیر رسمی گفتگو کے لیے ہونا چاہیے تھا، شہادت کے
مکام کے لیے اور ان موضوعات کے اداء کے لیے جو ہمارے یہ تشویش کا باعث ہوتے ہیں۔ ذرا
ہم، ان پڑھوں پر توجہ مرکوز کر کے جو ہمارے یہ تعلق رکھتے ہیں، لاٹینی امریکا کے ادب کے ساتھ
دشمن کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ہم مقامی ادب کے پرانے ہزار سالہ معنی کے عمل کی طرف واپس چھنے سوئے
اس کے تین بڑے مذاہن، ہلا، (Maya)، ایک (Aztec)، اور (Inca) پر غور کرتے ہیں۔

تو کیا مقامی لوگوں میں مادل جیسی کوئی منفرد ادب کبھی تھی؟ مجھے یقین ہے کہ تھی۔ لاٹینی امریکا کی
اصل تہذیبیں مادی میں تاریخ سے نیا دورہ کچھ موجود ہے جس کو مغربی دنیا مادل کہتی ہے۔ اس بات کا
دور رکھنا ضروری ہے کہ ان کی تاریخ کی سبب جن کو اب ہم ہاؤس کہتے ہیں، ہلا اور اینڈیک کی تہذیبی اور
بھاری مصوری پر مبنی تھی جن کو ہم آج بھی 'انکا' (جنوبی امریکا) مڈین کے سرگرم ہوں میں سے کوئی
یک۔ مترجم) کے ذریعے نہیں سمجھ سکتے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مڈین کے لوگ کوآز قصبہ کی عادات پر
مشتق مڈین کویت کے مذاہن کا سرشتی تھی (مقامی لوگ پڑھنے اور لکھنے میں فاقہ نہیں کرتے تھے کہ
ان کے مذہب و ادب کی جیسے مورتے تھے)۔

تفصیل زبان کی کہانوں کا پڑھنے والوں کے لیے سنانے والے، صرف جس کو یہ معلوم ہونا تھا کہ

ان تصویروں کے علاوہ سے کیا مراد ہے، سننے والوں کی تفریح طبع کے لیے ان کی ترجمانی کرنا چاہتا تھا۔ آگے چل کر یہ تصویروں سے بنی کہانیاں سننے والوں کی یادداشتوں میں محفوظ ہوتی چلی گئیں اور نسل در نسل زبان منتقل ہوتی رہیں تا کہ سرسپ نوبل کی آمد کے ساتھ آنے والوں کی لاطینی زبان کے حروف میں یہ براہ راست سپ نوبل زبان میں منتقل ہوتی چلی گئیں۔ اس طرح مقدس متون، یورپ کی کم سے کم مذہب کے بغیر ہمارے علم تک پہنچے۔ ہم اذوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان دستاویزات کے مطالعے ہی سے ہمیں پتا چلا کہ سے کہ مقدس امریکیوں کی تاریخ کی نمایاں خصوصیات مائل کی ہیں نہ کہ تاریخ کی۔ اس نوبل کی تفصیلات میں یہ دلائل ٹوک کہانیاں ہیں جن میں اتفاق مرہم کر گئے ہیں، روایات گھل گئی ہیں، حسن کی تائیدیں دوران میں طبع طرح کے تصورات شامل ہوتے گئے ہیں اور ان میں ایک کی بنیاد حقیقتیں ہی ایک ایسی حقیقت کی تخلیق توفیق ہیں جن کو ہم سوررئلیزم (Surrealism) کا نام دے سکتے ہیں۔

تصویرات کے ذریعے حقیقتوں کی تخلیق اور زمان و مکان کے مسلسل عمل تخلیق کے نتیجے میں ایک سے بہت زیادہ فوق انشعرت یا رفیع حقیقت وجود پاتی ہے، متواتر اسلوب بیان کا عطف اور صحیح دلوں طرح کا احتمال ہوتا ہے، یعنی، ایک ہی شے، ایک ہی قسم کے خیالات، ایک ہی کیفیت کی محسوسات کے بیان میں مختلف الفاظ کا استعمال مگر متواتر انداز میں استعمال ہوتا ہے۔ جس آپ کی قیہ ایک نکتے کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ مقدس متون کی متواتریت اس کی وجہ بندوبست کی اجازت فراہم کرتی ہے کہ بعض اوقات ہمارے لیے اس کی پرکھ مشکل ہو جاتی ہے مگر بلاشبہ کسی کیفیت ایسے شاعرانہ درجے کی معنویت پیدا کرتی ہے جو قاری کو ایسے شعور کی وادیوں میں لے جاتی ہے جس کو بوجھ لایا جانا سمجھا جاسکتا ہے۔

مگر ہم مائل کی طرح اس کی اپنی تکنیک، انداز کی ابتدا کی طرف رجوع کریں تو ضروری ہے کہ ہم ادب کی ابتدا کو موجودہ کو پہنچانے سے پہلے کی نسلوں کے مذہبوں سے منسلک کریں۔ ان کے رجحانات بہ دردی کی روایات و گیت و نغمہ میں تاریخی افسانہ طرازی سے بنا جانے والے قاری کی عمر و آواز میں شہر گاتے چہرتے تھے تا کہ وہ ان کے گانے کا حسن، ان کے معبودوں کے شہرے کی مثال سمجھ سکیں۔

کولمبیائی عہد سے قبل کے ادب میں ایسے بے شمار نغمہ بہت کم معروضہ، رزمیہ گیت تھے جن میں انسانی انداز کے خاکے ہوتے ہیں جن کا سرسپ نوبل ماہر اور متغیر کرتب بازی کا نام دیتے تھے۔

یہ رزمیہ قصے دلائل پرانے عہد کی گواہی ہیں، ایسی بلند رتبہ یا دل اور کارگزاریوں کے جن کو سن کر لوگ اسی پر عمل پیرا ہونا چاہتے۔ یہ حقیقت آمیز دپ اور قصے عقیم تہذیب کی خدمت گزریں میں نونے والے بدتمیز کی مانند ہیں۔ دوسری روایات اسی نوع کے دستاویزی انداز میں پیش کی جو عظمت میں بلکہ معروضوں کا، آزادی کا نہیں بلکہ غلامی کا احاطہ کرتی ہیں، مگر یہ ہاتھوں کا نہیں بلکہ گھوڑوں کا اور نچرنا جیانی امریکی ادب ہے جو اپنے عہد کی لاج حاصل خاموشیوں کے غلہ کو پڑھنے کی کوشش میں ہے۔

تاہم، وہ ادبی حکم یعنی مائل اور حسیروں نے جزیرہ نو آریا میں پورٹریٹ پائی، وہاں کی مٹی

میں اپنی چیزیں بیچ کر کسے کس کے برعکس یہ صرف مقامی جوش کا اظہار ہے، عریقی حیات ہے، غیور ہے، دیوار سمندر اور سرپ ہے۔ جس نے ہسپانیوں پر اثر انداز ہوا Bernal Diaz del Castillo کے ہاتھوں پیدا عظیم امریکی ناول True Story of the Events of the Conquest of New Spain نکلوا۔ اور کسی ناول کو 'پچی تاریخ' کہنا بہت کی بات نہیں؟ تو کیا ناول عموماً پچی تاریخ نہیں ہو سکتے؟ میں اس مقام پر اپنے سوال کو دہرا چاہوں گاتے کیا، قحی سے معزز، قانع نگار کی تحریر کو ناول کہنا کوئی جرات کی بات ہوتی؟

ان لوگوں کو جو اپنے بیان و نسبت سے مجھ کو ڈھیٹ کہیں گے، میں ڈھوت ہوں گا کہ وہ اس پیدل سپاہی کے سے پر گہری سانس بلی ہوئی نثر کی دنیا میں قدم رکھیں تو انہیں خود احساس ہو جائے گا کہ جو کچھ ہو چکا ہے وہ اس حقیقت کو آہستہ آہستہ بھولتے جا رہے ہیں اور ان کو یہ تخلیق خالص تصویر کی پیداوار معلوم ہونے لگے گی۔ یہ حقیقت Tenochatlan کی فصیل کے برابر کھڑے ہو کر فریڈ Bernal نے کہا تھا کہ مجھ کو بھی "یہ ایسی حرکت کی معلوم ہوتی ہے جو Amadis کی کتاب میں دہرائی گئی ہے"۔ مگر کیا یہی چاہئے گا کہ یہ ایک ہسپانوی کی تحریر ہے حالانکہ اس میں ہسپانویت صرف اتنی ہے کہ یہ گوئے مالاسکے شہر Santiago de los Caballeros کے پاس، جہاں یہ رفیع الشان مخطوط محفوظ ہے، ایک ہسپانوی کے ہاتھوں لکھی گئی ہے اور اس میں تھیلو (Cassé) کی قدیم زبان استعمال کی گئی ہے حالانکہ اس کا طرز اس سوگند میلے کا جیس ہے جس میں مذہبی ادب بھی شریک ہوتا ہو۔ Don Marcelino Menendez y Pelayo کے مطابق اس طر کا نا کھد عجیب ہے اور اس کے نزدیک یہ حقیقت بھی حیرت انگیز ہے کہ اس کو ایک سپاہی نے تحریر کیا ہے۔ یہ معزز ادیب (Don) بھی رہا ہے کہ اتنی بڑی عمر میں Bernal نے نہ صرف بہت سے لکے جانے والے مقامی دینی متون سے ہوں گے ان سے متاثر بھی ہو سکا بلکہ عمل الجہاد کے ذریعے اس نے اپنے اندر امریکا کو سمجھایا تھا اور وہ اتنی ایک امریکی بن چکا تھا۔

مگر اس مقام پر ایک نیا دور ہم جسے مختصر شدہ درجیش ہے۔ پچی آخری نسلوں کے بدوں میں مقامی لوگ جو اب ٹھوہر ہو چکے ہیں، انصاف کے طالب ہوتے ہیں اور Bernal Diaz Castillo اپنی روٹا مچہ نثار خدیوں کے ذریعے شکست کھانے اور مفتوح ہو کر پانامی گمرانیوں میں گرنے والے لوگوں کے احتجاج کی چیزوں کی لے میں اپنے گہرے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔

اس مقدم سے، ناول اور مینوں پر مبنی سارا لاطینی امریکی ادب، نہ صرف ہر عہد کی گواہی کی صحت احمیہ رکھتا ہے بلکہ وینیزویلا کے دیپ Anuro Usar Fien کے الفاظ میں "جدوجہد کی دستاویز" ہو جاتا ہے۔ وہ مکمل سارا عظیم ادب گواہی اور برہمت کے نمائندگی ہوتا ہے مگر اس کے اوراق، ایک بے رنگ اور سرد جذبات کا پتھر ہونے کے بجائے، ایسے ادیب کے لکھے ہوئے ہیں جس کو احساس ہے کہ اس کی تحریر میں تاریکی کو ستاروں اور فلکیات کے لئے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

تو کیا جنوب ہم کو کوئی بونسو (mesizo) غربی اور ہسپانوی امریکا کی نسلوں کا ملاپ دے گا؟
ایک ٹھیک ترین Inca (جنوبی امریکی انڈین گروہوں کا کوئی سردار جنہوں نے پیرو میں سلطنت قائم کی
تھی۔ مترجم) دو نسلو Garcilaso، تھو جو پیدا امریکی بنواؤ میں ہوا تھا۔ یہ امریکی اور انڈین (پورٹو الہدین
سے پیدا ہوئے) اور امریکی ہسپانوی۔ مترجم) ان مقامی گورنرس کو ہٹا کر جو پیرو (Peru) کے باہر
تھمراٹوں کی تھنیک میں پہلے ہی تھک چکی تھیں۔ Inca امریکی مذہبی مقامی امریکی مذہبی ہسپانوی،
بلکہ نسلوں کی تمیز سے تیار ہونے والی اعلیٰ تر فرم سمجھا ہے۔ "راتی کے ذریعے زندگی اور انھماک کا حق
میتا ہے۔"

سب سے پہلے تو کوئی بھی Inca کی شرم میں موجود بیچاؤ کی تک نہیں پہنچا پا سکتا ہے۔ یہ سب آزادی
کی جدوجہد کے دوران ہی ممکن ہو رہا ہے۔ پھر Inca ایک ایسے انڈین کے شان و شوکت کے ساتھ ظاہر
ہوتا ہے جو نوادہ کی تہذیب کی عظمت، یعنی تہذیب اور مذہبی پندریوں، کا مذاق کرنے کا فن جانتا ہے۔
ہسپانوی تھمراٹوں کے کاغذ، جذبات، تخیلات اور مذاق سے پتہ چلتا ہے کہ ایک دیر سے پہنچتے ہیں اور
Inca Garcilaso کی آواز کی صحت کا حکم صادر کرتے ہیں جس کے ذریعے انڈین اتنی ساری خطرناک
جیزیں یکدم چھوٹ جاتے ہیں۔

صرف شاعری اور افسانوی نثر ہی گواہ نہیں ہوتی Francisco Javier Clavijero Francisco
Javier Alegre, Andres Calvo, Manuel Fabn, Andres de Guevar جیسے مصنفین نے بھی،
جن سے تم تو تعات رکھی جاسکتی تھیں، جلد ہی کا اپنا ادب تخلیق کیا ہے جو اپنے عہد کی گواہی دیتا ہے
اور دیتا ہے گا۔

گوئنے والے شاعر Rafael Landivar میں بھی اس کا اپنا انداز ہذاوت ہے۔ اس کا احتجاج
خاصی ہے۔ وہ ہسپانوی زبان کو اس کی صفات کی ترجمہ کے بغیر "Hispani" کا نام دیتا ہے۔ ہر جہاں
Landivar سب سے کم مشہور ہے، مگر خیال میں اس کو امریکی ادب کا پچھلے دور دورہ ہمارے بھرتی،
ہماری بھرتی کے قدرتی مناظر اور سماجی بھرتی کے باسیوں کی معتبر آواز سمجھا جانا چاہیے۔ Pedro
Urena Henrquez کے مطابق "ہسپانوی نوادہیات کے شاعروں میں سے وہی متاثرہ انڈین کے بیڑن کا
ماہر ہے، سب سے پہلے اسی نے شاعرانہ انداز کو ہمیشہ کے لیے توڑ اور نئی دنیا کی فطرت کے مخصوص
خود خیال، اس کے برگ و گل، چھوڑ دیا، مگر غزادہ اس کا تھیل اور بشارت کی جاس کی نسلوں میں
رہو و ملاوت، دیکھا دیوں اور کہیوں کے بیڑن میں ایک دل فریب قلم نگار بن چکی ہے، اور بنیادی تہذیب
کی بقا کے بارے میں ہمدردی کے گہرے جذبات بھی ملتے ہیں۔"

1871 میں، اسی کے شہر مولینا میں Russcano Mexicana کے نام سے ایک شاعری کا
ڈیڑہ دریافت ہوا تھا جو Rafael Landivar کا تخلیق کردہ تھا۔ ایک برس بعد Bologna میں ہی کا دوسرا

ایڈیشن دیوفت ہوا۔ اس شاعر نے، جس کو Menendez y Pelayo نے 'عہدِ دور کا ایسل' کہا ہے، یورپ کے لوگوں کو امریکا کی سرزمین کی عظمتوں اور وہاں کے باسیوں کے رازن بہن سے آشنا کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ پہلی دنیا کے لوگوں کو معلوم ہو کہ میکسیکو کا ایک آتش فشاں Vesuvius اور Ena کا نسل مقابلہ کر سکتا ہے، کہ گوسے والا کے علاقے San Pedro Marar کے غار Castalia اور Aeneas کے مشہور فوائد کے برابر اہم تھے اور اس پر غور کیا کہ جس کو cenozoica کہا جاتا ہے، ڈاکٹر کتے ہوئے، جس کی ۲۰ زمیں چار سو ٹریں، کہتا ہے کہ وہ بلبل سے بھی زیادہ خوش ٹھو ہے۔

وہ اپنے ملک کے دیہاتوں کی، سولے چاندنی کی، جو دنیا کو قیمتی سکوں سے بھرستے ہیں اور مصری کے ڈول کی، جوشیروں کے دھڑکنے کی شہت جوتے ہیں، لکھ سرائی کرتا ہے۔

اس کی انہیں امریکا کی دولت کے بیان میں تہی باطن نہیں۔ وہ موسیقیوں، بجیروں، بکریوں اور سور کے گھومتے پھرتے گھنٹوں، زمین سے اچھے ہوئے پانی کی ادنیٰ خصوصیتوں کا ذکر کرتا ہے اور وہ گوسے والے کو کوکو اور چاکلیٹ کی خریدیں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا ہے۔ مگر Landivar کے گیتوں کی ایک اور خصوصیت ہے جس سے ہم کد اظہار ہوتا جو یہی درود ہے ان کی 'علاقائییت' سے محبت ہے۔ Landivar کے نزدیک انڈین دوسل ہے جو ہر میدان میں سرکش رہتی ہے، وہ انڈین لوگوں کی اذیتوں کو بھلائے بغیر ان کے بنائے ہوئے سطح آب پر تیرتے ہوئے باغات کے بجوبے کی مثال، حسن اور نہایت ہر مندی سے پیش کرتا ہے۔ اس طرح وہ، علاقیت سے دور، فطرتی شاعری میں (انڈین لوگوں) کے اس جوہر کو پیش کرتا ہے جس کی ہمیشگی کی گئی ہے یعنی شاعری اور مشقت مزید ان میں ان کی برتری۔

انڈین لوگوں کی مہینہ کالی اور بدقش کے بارے میں جو باتیں یورپ میں پھیلائی گئی تھیں اور امریکا میں جن کو صحیح سمجھا جاتا تھا، اس تصور Landivar نے وہ تصویر پیش کر کے پرزور مخالفت کی ہے جس میں انڈین لوگوں کی مشقت آمیزیوں کی عکاسی کی گئی ہے جو پسے بھی انہی کے شانوں پر چھیں اور آج بھی ہیں۔ اور وہ صرف بیان ہی کے ذریعے (مخالفت) نہیں کرتا اس لیے کہ ہمیں یہ حق ہوگا کہ ہم اس پر یقین نہ کریں۔ اس کی نظموں میں ہم ایک انڈین کو اپنی سبک ڈھنگ پر رنگہ رنگے سامان سفر کی بار بار دہرائی کرتے، عرف جیسے پیسہ بڑوں کی کاشت کرتے جو دھم پیدا کرتے ہیں، خوب صورت بیبیوں کو کھولنے کے لیے چٹانوں سے جوتے، عبر اور مستقل عزائی سے لے چرتے، ٹیل کے پودوں کی کاشت کرتے اور مقامی قانون سے چاندنی ٹالنے ہوئے دیکھتے ہیں۔

ہم نے امریکا کے عظیم ادب کے بارے میں جو کچھ بھی کہا ہے، Landivar کی دیکھی نظر تھی اس کا اعادہ کرتی ہے۔ اپنے سوا کے اعتبار سے یہ اشعار میں ڈھور ہوا ماں کہتا ہے۔

پچیس برس بعد Andries Belo نے ایک بیٹہ زلدہ سنے دان پل کمال اور مشہور تخلیق Siva میں امریکی کاہلے نمایاں کا احیاء کیا، جس میں نئی دنیا کی تصویر فطرت، مکن کی سرماہی میں، مرجان کے

مریخاؤں میں بھرے ہوئے کوئیں، کافی کے پودوں میں، آپس کے بڑے بڑے پتھروں میں، استوائی خطہ، اپنے تمام رنگ و بار اور حیوانی قوت کے ساتھ، گرم غریب دسیوں اور زرخیز مٹی کے بلند دھگے دھوڑ کے تناظر میں غریب دسیوں کی خستہ حالت کے ساتھ، ایک درمیر جلوہ گر ہوتا ہے۔

Bello ایک جلا وطن کے کردار میں Inca Garcilaso کو یاد دلاتا ہے جو Landivar کے امریکی شجرہ سب سے متعلق ہے مگر وہ تو ان ہی امریکی ادب کی مثال کے نہایت درخشاں ستارے ہیں۔ ان ہی سے نئی دنیا کی فطرت کی تصویر کشی کا رجحان یورپ میں ظہور کرے گا مگر اس کو وہ تاباں فرضی شاعری نصیب نہیں ہو سکے گی جو Landivar اور Bello کی تحقیقات میں نظر آتی ہیں۔ فرانسسی ماوس Alata اور Les Natchez اس کی جادوگری کی ایک جھلک تو دکھاتے ہیں مگر مسخ شدہ۔

یورپ کے نوکریں کے ذرا یک فطرت و احساس ایک پس منظر سے جس میں وہ قوت کشش نہیں جو Creole وہ قوت حاصل کرتی۔ زمانیت کے چیرہ کا فطرت کو اپنے عہد کے شاعروں اور ماہرین کا دل کی تخلیقات میں ایک مستقل مدد دیتے ہیں۔ ان کی ایک مثال José Maria de Heredia ہے جس نے نیو گرا کے مینار کا گہک گایا ہے اور دوسری مثال Estaban Echeverria ہے جو La Cautiva میں ریگستان کے مناظر پیش کرتا ہے۔

لاٹینی امریکی زمانیت صرف دیہات نہیں بلکہ ایک قوی پرچم کی مثال تھی۔ شاعر، تاریخی نوبی و ماہرین کا اپنے شب و روز کو یہی عمال اور پل تخلیقات کے خواب دیکھنے میں منقسم رہ سکتے ہیں۔ امریکا میں شاعر ہونا آج زیادہ موقع کبھی نہیں ملتا ہے۔ امریکی شاعروں میں سے وہ جس پر ٹھون لکھنے کی دیوی Muse مہربان رہی ہے، José Marmol تھا جس کی سب سے زیادہ پوچھی جانے والی تخلیق اس کا ماہر Amalia تھا۔ ہارن، پیٹے میں شراہور ٹونف سے آپکپاتی ہونی، انگلیوں نے اس کے ماہر کی اس وقت بڑی گروہائی کی ہے جب مرکزی امریکا میں پھیلنے والا آمریت کا کاکون ہمارے ہندیوں میں بھی سرایت کر گیا تھا۔ ہم جب تنقید نگار Marmol کے ماہر کی بات کرتے ہیں تو اس کی ماسماویوں وراہ پر دیکھیں کا خیال نہیں کرتے اس لیے کہ جب اس قسم کی تخلیق مرحلہ تحریر میں ہونی سے تو لکھنے والے کا پاگل دل دور دراز سے جھڑک رہا ہوتا ہے، اور جملوں میں، متن کے ٹکڑوں میں اور صفحت پر نہیں جاتے وہاں جھڑک، قوت حیات میں پیدا ہونے والے بگاڑ کو منعکس کرتی ہے۔ ہم اس وقت جذباتی شوق سے سرشار بہترین امریکی ماہر پر گفتگو کر رہے ہیں۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی Amalia (میں موجود José, Marmol کی یاد دہائیں مترجم) تارن کو اس وہجہ متاثر کرتی ہیں کہ اس کو وہ ایک عقیدے کی کتاب جیسی نظر آئے لگتی ہے۔

اس سے Sarmiento کی گواہ سنائی دیتی ہے جو ہمیں صدی کی دہائی پر موجود سب سے بڑے متذہب کی یاد دلاتی ہے، سمندر کی بے مروت۔ یقیناً Sarmiento خود بھی اچھے میں پڑ جائے گا مگر اس کو ہم ہو جائے کہ Facundo نے اپنے ہتھیار کا رٹا اس کی جانب، بلکہ یہ غلطی کی جانب کر دیا ہے یہ اعلان

کرتے ہوئے کروہ Creole امریکا کا معتبر ترین لٹریچر ہے، اس امریکا کا جو مرنے سے نکلا کرتا ہے اور تمدن اور برہنہ کے تمام غیر خودی منسوبوں کو مسمار کر دیتا جاتا ہے تاکہ ان لاہتوں کے درمیان پھنسے ہوئے امریکی عوام اپنے اصل مقام و رچی سمندرؤں کو جاصل کر سکیں۔

شمال سے جنوب کی جانب ایک اور گوار پھیلنے اور پھرنے وان تھی، José Martí کی۔ ایک جو وطن کی حیثیت میں اپنے محبوب وطن کیوں میں، اس کی موجودگی کا بھی حساس ہوا، جس کی تقریروں کی شہرہ لیسوں، شاعر و صحافی کی حیثیت میں اس کی ایک قربانی کی کیفیت پیش کرتی ہیں۔

نیسویں صدی، ماسوا چند ایک کے، اتنے ہمارے شاعروں سے بڑی پڑی ہے جن کے پاس کبھی کے سے سمجھ نہیں ہے۔ ان میں صرف چند قدر نظر آتے ہیں، Honduras کے زلدو جادو شاعر Rubén و Dario و Juan Ramon Molina۔ سچ پوچھ جائے تو شاعر حقیقت سے فرار اختیار کرتے ہیں اور غامض شاعر بننے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہی ہے۔ اسی لیے یہ شاعروں کے پھوڑے ہوئے وطنی اٹھے میں رہتی نہیں تھی، جس بات کوئی پن ہوتا ہے۔

یہ سب اپنے ہم وطن رنجور شاعروں کے احوال سے بالکل بے بہرہ تھے ہیں۔ یہ اپنے عظیم ادب کے توفیقی منہ مند تخلیق کاروں سے بھی باہر ہیں، دوسرے خطوں کی تک سے ادبی تھی شاعری سے مطمئن، اور ان کی تنقید پر آمادہ رہتے ہیں، ان کے اپنے خیال کے مطابق، جنہوں نے مقامی ادب الوطنی کی چٹا چوند سے متاثر ہو کر آزادی کی جدوجہد کے بے باک گیت گائے تھے۔

یہ تو پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد ہوا کہ مٹی مھر لوگ عام آدمی اور فنکار اپنی باری ہوئی دیات کو دوبارہ فتح کرنے پر کمر بستہ ہوئے۔ مقامی لوگوں سے مقابلے کے لیے وہ اپنی سپاہی ہندوستانوں میں لشکر امداد ہوئے اور اپنے ساتھ وہ پیڑ مارنے جو وہ اپنے مستقبل کو دینا چاہتے تھے۔

لاٹینی امریکی ادب و ثقافت کا یہ مختلف رجن میں مٹم ستاروں کے ٹو میں ہوئے، شعر کے چکر میں نہیں۔ اب نعرہ سنے پڑیو ہے، انگلیز کے ورہلوں کے سوا ملے میں اس کا انداز ہے، ادبی کا ہے اس کی جدوجہد کے لیے جس کا پسہ قدم حقیقت میں کود پڑا ہے، مجسم کرنے کے لیے جس جگہ حقیقتوں میں تر جانے کے لیے اتارنا نیت کے مسائل کی پیچیدگی ہو سکے۔ ایسی کوئی فطری شے نہیں، نہ حقیقی، نہ غیر ملکی جس کا بعد امریکا کے ادب سے نہ ملتا ہو۔ اور امریکی ماوس کا معاملہ بھی یہی ہے۔ اس میں کسی کو شک نہیں کر لینی امریکی ناول اپنی جیت میں دنیا کی ادب کے مختلف اول میں ہے۔ ہمارے ملکوں کے مختلف میدان کے تھینے واسے بھی اسی زمین میں گھسی کر رہے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ناول میں ان جو کچھ بھی ہے وہ امریکا کے ناول کی شکل ہوتا ہے، گویا ماوس نارنگی لٹاٹے کا ایک فطری گناہ ہوتا ہے۔

ہم کو، یعنی آج کے لاٹینی امریکی کاروں کو، جو اپنی دیات کے مطابق اپنے لوگوں سے معاملت رکھتے ہیں، جنہوں نے ہمارے عظیم ادب کی و قی شاعری کو بھی، دیکھا پڑ رکھا ہے، اپنے لوگوں سے چھٹی

ہوتی ہیں کو اگزار گنا ہے اختصار شدہ کان کی مڑوروں کے لیے کانوں کو اگلی حاصل گنا ہے۔ ان لوگوں کے حق میں آواز اٹھانی ہے جو شجر زراہوں میں سخت کے دوران مٹ جاتے ہیں، جنہیں کیلے کے درجات میں سورج کی کرنے جھلسا رہی ہیں، جنہیں شجر بنائے وارے کا رنگ نے انسانی پھوک میں تھریں کر دیتے ہیں۔ انہی وجوہات کی خاطر میرے لیے، اصل امریکی ماہوں ان تمام مسائل کے لیے ایک پکار ہے، ایک جی ہے جو سہیل کوئی رتی ہے اور پچھلے چار ہزاروں صفحات میں ابھرتی ہے۔ وہاں جو اصول ہوتا ہے، اپنے صفحات میں وہاں سے انسانی جذبات کا، صحت کشوں کی خان مٹھیوں کا، کسانوں کے پسینے کا، ہمارے بچوں سے مر جھائے بچوں کا اور سمندر کی جانب بہتے ہوئے ہماری وسیع زمینوں کے خون اور مرقی حیات کا، جو ہمارے نئے شہروں کو نمونے کے نمونوں کی دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ ریکی یا غیر مادی طور پر ماہوں میں ملنے کی صفت کا ثمرات و رموز ہے ان کی ماری اور قوت کا، امریکی ادب (Creoles) لوگوں کی سہ شہاس انگلیوں کی ہے جتنی کا، جو آواز اٹھاتی باتوں کی جگہ کے، نظارے میں رہے، اس وقت سے نیا بد مٹن جو آج ہم کو جھکا رہی ہے۔ سب سے بڑا حشر یہ ان نکلنے والوں کی رجائیت ہے جس نے ہمارے کی مزاحمت کی ہے تاکہ "ماری" والے لوگوں کی پیش قدمی کے لیے لوگوں کے ضمیر میں دماڑ پیدا ہو۔

لاٹینی امریکی ماہوں، یعنی ہمارا ماہوں، اس عظیم جذبے سے غدر کی نہیں کر سکتا جس نے ہمارے ہمارے عظیم ادب کی تخلیق کی ہے اور مسلسل آ رہا ہے۔ اگر آپ ماہوں صرف قاری کی تفریح کے لیے کہتے ہیں تو ان کو بڑا دیکھیے۔ میرا یہ پیغام مسکمی مسکمی کی گرم جوشی جیسے ہی پیغام ہوگا اس لیے اگر آپ ان ماہوں کو بڑا نہیں دیکھتے جب بھی وہ لوگوں کی یادداشت کے صفحات سے، جہاں ایک شاعر یا ماہوں کا زندہ رہنے کی تمنا کرتا ہے، ہر جہاں مٹ جائیں گے۔ تو ماضی کیجیے، آج تک بھرا کتنے نکلنے والے ہوئے ہیں جنہوں نے ماہوں کہتے ہوں کے صرف تفریح کے لیے اس کے برعکس، ہمارے لیے کتنا آسان ہے ان لوگوں کے نام دینا، جنہوں نے کتنا ہے تھریں کے لیے، وقت کی گوی کے لیے۔

گوئی کے لیے۔ ماہوں کا ایک نمونہ کی ماہندگاہ ہوتا ہے۔ پاپ کی طریق غرار کی کوششیں ہیں، لکھنے والے اس دنیا کی درد نیک حقیقتوں سے دوچار رہتا ہے جو اس کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے سکس کی ایسی ہے چپ حقیقتیں جو ہم کو اندھا کر دیتی ہیں، ہم کو نکلنے پر راہ دیتی ہیں اور بے ساختہ جانے پر مجبور کرتی ہیں کہ "ہم کو ایذا کیوں پہنچاتے ہو؟" جی ہاں، ہم میں حقیقت کے مارے ہوئے ہیں جس سے انکار نہیں کر سکتے، جو میسکیو کے انقلابوں کی مانند، مارے گوشت پوست میں، ان لوگوں کی تحسیم میں رہی ہے جیسے Mariano Azuela, Agustín Yáñez اور Juan Rulfo جن کا تئیں کامل کا حیرت انگیز جیسے چاقو۔ Jorge Icaza, Ciro Aegna, Jesús Lara کے ساتھ مل کر امریکی لوگوں کے اختصار اور ان کی کس مہر کی پر آواز بلند کرتے ہیں، وہ جو Done Batarra میں Romulo Gallegos کی طرح ہمارے لیے ایک ہوتا ہے پناہ نہیں تحقیق کرتا ہے۔ اور پھر یہ Horacio Quiroga ہے جو ہم کو استوائی کایوں کے چنگل سے

رہائی دلاتا ہے وہ کلاؤں جو خوراک کے لیے یہاں ہی اٹوٹھا ہے جیسے کہ کاچا امریکی محرز Arguedas
José Maria کے 'Los ros profundos'، ارجنٹائن کے Alfredo Varela کے 'Rio oscuro'، برازیل کے
Rosa Bastos کے 'Hijo de hombre' اور پیرو کے Vargas Llosa کے 'La ciudad y los
perros'، سب ہمیں دکھاتے ہیں کہ ہماری زمین پر محنت کش لوگوں کا ختم کس طرح ہوتا ہے۔

Mancozor ہم کو ان میدانوں میں لے جاتا ہے جہاں تیل نکلتا ہے اور Miguel Otero
Siva کے ہاں اپنے گھریاں چھوڑ کر جس کی طرف گھنچے چھ جاتے ہیں۔ David Vinas تم کو دھاک
Paragonia سے ڈچا رہتا ہے، Enrique Wernicke ہمیں ان پانیوں کے ساتھ بہانے چاتا ہے جو
ماری سمائی جھلتوں کو غرقاب کر دیتا ہے جب کہ Verbitsky اور Maria de Jesus ہمیں
Damasque اور ہمارے عقیم شہروں کے نیم بشری عداوتوں، بد حال مکی آبادیوں کی طرف لے جاتا ہے۔

El Hijo del Salitre میں Teretorm ہم بٹورے کی کانوں میں نو گئی سوراخ محنت کے بارے
میں بتاتا ہے، جب کہ Nicomedes Guzman ہمیں چلی کے محنت کش لوگوں کے علاقے کے بچوں کی
زندگیاں میں جھانکنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ہم Napoleon Rodriguez Ruiz کے Jaragua میں
El-Salvador کے مضافات کو محسوس کرتے ہیں اور Clarvel Alegria • Fakol کے Cenizas del
Izalco کے چھوٹے چھوٹے گاؤں کے تھارے کرتے ہیں۔ ہم Guraxdes کے 'Don Segundo
Sombra کے تذکرے کے بغیر وسیعی سبزہ ناول کا تصور بھی نہیں کر سکتے نہ ہی Eustasio Rivera کے
La voragine کے بغیر جنگوں کی بات کر سکتے ہیں، نہ Jorge Amado کے بغیر تھیو کی نہ
Gumaraes Rosa کے Gran Sertao کے بغیر برازیل کے میدانوں کی، نہ ہی Ramon Diaz
Sanchez کے بغیر وینزویلا کی بات کر سکتے ہیں۔

ہماری کتابیں علم کی جمہوریہ میں اپنی جگہ رکھانے کے لیے سنسنی خیز لوگوں یا وحشت انگیز اثرات کی
محنت میں نہیں رہیں۔ ہم ان سیکڑوں، بڑاڑوں، لاکھوں لاطینی امریکی لوگوں سے غولہ ریشوں کے ذریعے
جڑے ہوئے ہیں جو ہمارے مذہب مند امریکی براعظم میں رہتے ہوئے بھی بد حالی کا شکار ہیں۔ ہمارے
ماوس تمام دنیا کی اخلاقی قوتوں کو کچا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان لوگوں کا دفاع کیا جاسکے۔ ہمارے
ارب میں دو سوے ہزار کا عمل بہت آگے چلا گیا تھا اور امریکا کی دوبارہ دریافت کے سسے میں اس نے براعظم
کی پراگمٹ فطرت کو انسانیت کی وسعت بہم پہنچائی ہے۔ مگر یہ فطرت انڈین لوگوں کو کتابوں کے مطابق
موجودوں کے لیے ہے، نہ ہی مدافعت کی کتابوں کے مطابق سرحد دورہ لوگوں کے لیے ہے، بلکہ مردوں
اور عورتوں دونوں کے لیے ایک نئی فطرت ہے۔

پچ لاطینی امریکی ہونے کے ساتھ حسن انکبار ہمارے جذبات کو کچا کرتا ہے اور اس بات پر
ہم براہِ دل ایک نڈائی کا مار ہوتا ہے۔ یہ ایک کیمیائی عمل ہوتا ہے۔ ہمارا جیٹن طرح چلتے ہیں۔ ایک شخص

کیے ہوئے کام میں کتنی کوشش و رکتھا مساکا ستھ ہو جیہ اس کا ادماک بہت مشکل ہے اس لیے کہ اس میں نظر آنے والا اس تو صرف حروف ہی پر مشتمل ہوتا ہے۔

جی ہاں، میں کہتا ہوں 'حروف' مگر کچھ تو نہیں اور اصحوں کے ذریعے ان کی تفسیر و ہیئت ہوتی ہے۔ یہ تفسیریں پائی ہوئی دنیاؤں کی نہیں کی، بلکہ ترتیب دیے گئے ہیں۔ یہ انگریزی کی طرف سے لکھے گئے اور رجحانات کی طرف سے لکھے ہیں۔ یہ حروف سے آواز نہیں بلکہ آواز سے حروف بنانے کا عمل ہے جس کو انگریزی میں onomatopoeia کہتے ہیں۔ ہمارے زبان کی وہ حروف میں جو سب سے پہلے فن چائنا ضروری ہوتا ہے وہ onomatopoeia ہے۔ ہمارے کل متغیر کی ترتیب میں کچھ چارے واں گھنٹیں ہمارے حروف میں، ہمارے جھون میں پائی جاتی ہیں۔ ہمارے نگار مداح کیسے اس کی پر ہوتا ہے جس میں غرض کا مستعار چہنچہاں ہوتا ہے۔ ہمارے اس کی مدد کی گئی ہیں وہ ہوتا ہے، بچ بچ کر ہواؤں کو ہوتا ہے۔

کلمے بہترین ماویٰ سمجھے ہوئے نہیں۔ ہمدردی کے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ نیا فی حرکیت کی
 ایسی شاعرانہ کیفیت ہے جو مزل کے غول میں بدل جاتی ہے، جس میں پسے گوار کا گھونگھٹ اٹھتا ہے،
 جذبات، تصویر یا نقش کا غول بدل جاتا ہے۔

اسی وجہ سے عظیم سپاہی امریکی ماہلوں کی ولایت کی انھیں بھی 4 رات کے ساتھ چھوڑ دیا۔
وہاں ہر شے موسمیات سے لبریا ہوئی ہے۔

نیا نوں کے متے ہوئے سقلم میں مہر جوئی جاری ریتی ہے۔ عام آدمیوں میں ہونے والے نوں، جنس میں انڈین نوبل کی نمائندگی بھی ہوتی ہے، یورپی اور مشرقی نیا نوں کا آمیزہ بھی شامل ہوتا رہتا ہے، جو امریکا آنے والے ریگن وین کی سوچات ہے۔

الطحاوی اور آوازوں پر ایک اور قسم کی زبان اپنے جسم میں کرتے شراب سے مدمانے کوئی بھی نہیں نکلتی۔
تجلیہ کی زبان۔ ہمارے اوس طرف الطحاوی کی میں نہیں تشبیہات میں لکھے ہوئے مخصوص ہوتے ہیں۔ بہت
سے لوگ ان باتوں کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے وہ کوئی متحرک مقرر دیکھ رہے ہوں۔ اور یہ
کیفیت اس لیے نہیں ہوتی کہ نکلنے والی مادہ مافی امداد میں گھور رہا ہوتا ہے بلکہ وہ اصل مادی شکل کا پتہ عوام کی
آوازوں کو ایسی زبان کی آفاقیت سے ملے ہوئے ہیں جو آواز میں تو گھر کہا توں اور قصوں میں تو گھر اور
تشبیہات و تمثیل میں بھی تو گھر ہوتی ہے۔

یہ وہ زبان نہیں جو مصنوعی طور پر تشبیہات سے کھسکا کر رکھی ہو یا شعرا نے اثر نگینے کے لیے بنا لی ہو۔
 یہ ایک شفاف زبان ہے جو حوالی بول چال کو اپنی اتر مرصعہ سقاہت، تصور و تجسیم پختہ اور بلند درجہ کی جد باتیت کے ساتھ لینی امر کی ماحول میں سمونے والی ہے۔

و دشنام مراد زبان جو ہمارے ماہول کے ادب کو خدایت فراہم کرتی ہے، حیات ٹٹل مافس کی ہند
ہے۔ یتیں کچھے، ہمارے ماہول میں شامری کے ٹٹل بولوس کے ہزرے کے پچھپھرے ہوتے ہیں۔ ٹٹل

سمجھتے ہوں کہ غیر امریکی قارئین کے لیے ہمارے مایوں کی سب سے اہم کشش ہوتی ہے ان کی ترکیبیں،
 جس میں آویزی کے بجائے زبان کی آب و تاب، ملکی منظر کو پیش کرنے کی موسیقی و مقامی زبانوں کی
 تشبیہیں اور ان تمام زبانوں کے آپس میں جوڑنے کی شہر کی طور پر داخل ہوجاتے ہیں۔
 ان میں الخاطہ کی بھی اپنی ایک حیثیت ہوتی ہے جو ایک عداوت کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔
 ہمدردی شرمیلی (ہسپانیہ کے شہر گھٹاپا سے۔ مترجم) کی مصونیت سے مختلف ہے ان لیے کہ ہمارے مایوں
 میں استعمال ہونے والے الفاظ کی اپنی ایک قدر ہوتی ہے، بالکل ان کی اپنی اصل زبان جیسی۔ اگر مخاطب
 سے ان کی بحر کا مٹی بچھا کر لیا جائے تو کوئی بھی ہمدردی شرمیلی، ہمارے مایوں کو سمجھ ہی نہیں سکے گا۔



اشمویل یوسف ایگنن

اعترافِ کمال اس کے نہایت عیسائی اور ایمانی لہجے بیان سے لے کر یہودیوں کے بنیادی طرزِ زندگی سے مہارت ہے۔

اشمویل یوسف ایگنن نیا نیا لکھے گئے سارے ہندسوں کو توڑ کر جدید عبرانی زبان کے سربراہان، ادیب کی حیثیت سے جانا جانے لگا تھا۔ اس کا پیشہ اہم کام In the Heart of the Seas کے عنوان سے سینڈش زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ایگنن نے ابتدا میں Yiddish (یوسپ کے باسی یہودیوں کی مذہبی زبان) میں لکھنا شروع کیا تھا مگر بعد میں عبرانی زبان کو اپنا ذریعہ نگار بنایا۔ ادب کے بصرین کے مطابق، ایگنن کی شریعت اور بند آج بھی میں کہاں رکھتی ہے وہ وہ ہر مندی سے اپنا مدعا بیان کرنے پر بلا کی قدرت رکھتا ہے۔ جب وہ محرف پس برس کا تھا، ایک قابل احترام خاندان کے دوست ہونے کے باوجود پائینڈ میں واقع اپنی جائے پیدائش East Galicia چھوڑ کر ہسٹین پڑ گیا۔

ایگنن کی تحریریں طرزِ مذہبی و سماجی موقی، تجربیت، اور تحت اشعوریت کا مثالی امتزاج ہیں۔ اس نے روایتی مذہبی نوک، گہنوں، مذہبی اور مذہبی متون کو باہم اس صورت میں دیکھا ہے کہ ان کی پہلے حدیں متعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی زبان بانی عبرانی اور پائینڈ میں یہودیوں کے درمیان بول جانے والی پیش زبان کا امتزاج تھی۔

ایگنون نے اپنے وطن Buczacz (پولینڈ) کے ماحول پر مبنی، جو اس کے بچپن میں یہودیوں کی مذہبی تعلیم دوران کے زہد کے لیے مشہور تھا، وراب ویران ہو چکا ہے، جو کئی مائوں تحریریں کیے ہیں وہ بدحیثیت مصنف کے اس کو ایک جہد مقدس سمجھتے ہیں۔ ان مائوں میں اس کی بیانیہ ہرمنڈی کے باعث حقیقت اور صداقت اس طرح بظاہر پر شائد نظر آتے ہیں کہ اس میں فوقی سما مشکل ہو جاتا ہے۔

ایگنون کہتے ہیں کہ متن کو انجیل اور ریائی متون سے اس طرح مٹا کر تیار کیا ہے کہ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ مزارت کہاں ختم ہوتا ہے اور عیسیت آمیز حکایات کہاں سے شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کا چار جملوں پر مبنی ایک مجموعہ (Kol Spurev Shei Sh'Y Agnon) 1931 میں شائع ہوا جس کا دوبارہ نسخہ 1966 میں ہوا۔

ایگنون کا بہت سا کام بچپن، صدف کی تیسری دہائی میں جرمن زبان میں ترجمہ ہوا۔ جب آرمینوں نے تبرائی کے شاعر کا دوبارہ بند کر دیا تو کل ایب اور اس کے بعد نیو یارک سے اس کی کتابیں شائع ہو کر مشہور ہوئیں۔ ایگنون کا ایک ناول (1938-39 A Guest for the Night) جو One an Nata Lalun کے بچپن کے شہر کے ماحول کے پس منظر میں لکھا گیا تھا، بہت مشہور ہو۔ یہ ناول اپنی جگہ تعلیم کے دوران روحانیت کے انحطاط، ماضی کی بنا پر ماضی کی آرزو مند کی، ریورپ کے یہودیوں کے مستقبل کے بارے میں پیشین گوئیوں پر مشتمل تھا۔ یہ ناول دراصل اس کے اپنے چائے چائش کے ایک مختصر سفر کے دوران کے شدید احساسات کی بنا پر لکھا گیا۔

ایگنون کی کتاب (1951) Sefer Hamaasim اس کی ایکس مختصر کہانیوں پر مشتمل تھی جن میں اس نے شعور کی رو کی تخلیق استعمال کی تھی۔ مصنفین نے اس کتاب کی کہانیوں کے سمیر کا فکا سے طے بانخصوص اس لیے اور بھی کر کا فکا اور اشمویل دونوں ایک ہی تہذیبی پس منظر سے تعلق رکھتے تھے۔

ایگنون موجودہ پولینڈ کے شہر Buczacz میں ۱۸۸۳ میں پیدا ہوئے جہاں ان کی کھان کا دوبارہ رہنے والے مگر مذہبی یہودی خاندان میں 1888 میں پیدا ہوا۔ اس کی بنیادی تعلیم مذہبی تھی۔ مشرقی یورپی اور یہودی مذہبی پس منظر ہونے کی وجہ سے مہمانہ قدیم کی تعلیم نے اس کو تینوں کے علم سے مگرے شغف کا موقع دیا جس نے اس کے ادبی شعور کی آبیاری کی۔ اشمویل کی مرانی لاریڈ ش زبان میں لکھی ہوئی اس کی بقیہ علم اس وقت شائع ہوئی جب اس کا سوا سوا پندرہویں کا تھا۔ اوائلی مری ہی (1907) میں وہ فلسطین کے شہر چیٹا نقش ہو گیا تھا جہاں اس کو ایک یہودی عدالت میں جرم مت مل گئی۔ وہیں 1908 میں اس کا مہرانی زبان میں لکھا ہو مختصر ناول (1908) Agnion شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی اشمویل نے Agnion شخص اختیار کیا جس کو آگے چل کر اس نے اپنے خاندانی نام کے طور پر اپنایا۔

اشمویل 1912 میں جرمنی کے دارالحکومت برلن چلا گیا تھا جہاں اس نے ادب کی تعلیم حاصل کی اور دبی دانش و ادب کے حلقے سے منسلک ہو گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران وہ جرمنی میں ہی مقیم رہا اور اسی

نمانے میں اس نے ایک سرائے (Der Jude (The Jew) جاری کیا۔
 انگلی کی تیرہ کتابیں شائع ہوئیں جب کہ وہی تیرے گھریزی زبان میں کیے گئے۔ اس کا انتقال
 1970 میں ہوا اور داسریش میں زیتون کی پھاڑیوں پر فٹن ہوا۔

حیات سے خطاب*

ہماری متبرک یا بدبختوں میں محفوظ چیزوں نے فرما دیا ہے کہ دنیا کی وہی مونی نعمتوں کو ہی وقت
 تک مشعل میں نہ لایا کرے جب تک کہ خوش حالی کی دعائیں نہ مانگ لیا کرے۔ اگر ہم کچھ کھائیں دیکھیں،
 ہم کو کس سے قبل اور بعد میں شکر ادا کرنا چاہیے۔ اگر ہم سیرے کی کھیت مصلحتوں کی اشتہائیں دیکھیں، پچھلوں
 کی خوشبو سونگھیں تو بھی ہم کو ان سے تامل ہونے کی ضرورت ہے پھر کرنے کی تعلیم کی دعا مانگنی چاہیے۔
 اس خط انداز کی پوچھ بھی کہی کچھ ہو جاتا ہے جو ہمیں اپنی قومیت بھارت سے حاصل ہوتی ہے جب ہم
 Nissan کے مہینے میں آفتاب کو وسطیہ ابراج میں (Cycle of Zodiac) درختوں پر موسم بہار کی مٹی
 لکھیں کو چٹکتے، کسی قنارے، خوشنما اور خوب صورت درخت کو دیکھیں تو ہمیں نعمتوں کے حصول کا اعلان
 کرنا چاہیے۔ مٹی صورت خط سہمت کی صورت میں لاگو ہوتی ہے۔ لہذا ہم تم حضرت، آپ کے توسط سے
 سعادت سے متعلق ایک نعمت ہمارے حصے میں آئی ہے۔

یہ اس وقت ہوا جب سنیڈان کے ناب سنیڈ شریف لائے اور انھوں نے مجھ کو یہ خبر سنائی کہ
 سنیڈش، کاہن نے مجھ کو نوبل انعام سے نوازا ہے۔ جب میں نے شکرانے کی وہ چوٹی دعا پڑھی جو وہ جب
 ہو چلا ہے جب کوئی اپنے کسی ورکے بارے میں کوئی ٹوپی سے "خدا فضل فرمائے اس پر جوا چھ ہے اور
 بھلائی کرتا ہے۔" "بھلائی" جو خدا نے متعالیٰ نے معزز ارکان سنیڈش اکاڈمی کے لوگوں میں اٹھائی ہے کہ
 وہ یہ عظیم انعام اس معنی کو عطا کریں جو ایک متبرک زبان میں تحریر کرتا ہے، "جو بھلائی کرتا ہے" اور
 اس طرح اس نے مجھ پر حسان کیا ہے کہ وہ مجھ کو منتخب کر رہی۔ اور اب اس مقام تک پہنچ کر میں ایک دعا
 اور کروں گا، جو ہر اس شخص پر غرض ہے جو اپنے فرماں روا سے محبت کرتا ہے۔ "جو کتیں بانٹنے والا ہے تو،
 ایک مالک میرے خدا، کائنات کے شاہنشاہ، جس نے ایسے بادشاہ سعادت کو نعمت و عظمت عطا کی ہے جو
 گوشت اور پوست سے بنا ہے۔" آپ کے لیے بھی، ہے قابل احترام مکان اکاڈمی میں مقرر شدہ دعا کرتا
 ہوں "جو کتوں والا ہے وہ جس نے اپنے ہاتھوں میں سے کچھ گوشت اور پوست والوں کو عطا کیا ہے۔"

مالعود میں مرقوم ہے: "ایہ ختم میں، قرآن پڑھنے والے لوگ دسترخوان پر اس وقت تک نہیں بیٹھتے تھے جب تک کہ ان کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ طعام میں ان کے ساتھ کون شریک ہوگا" "لہذا آئیے، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں، پتی میز پر، جس کی سہ جوتی آپ نے قبول کیا ہے۔"

اس تاریخی حادی کے نتیجے میں جس میں مردم کے سہ ماہائیں (Tours) نے پروٹسٹنٹ دیر و دیر ہوئے تھے، بنی اسرائیل کو ان کی زمین سے نکال دیا تھا، میں حتی سرزمین کے ایک شہر میں پیدا ہوا تھا۔ مگر میں نے خود کو ہمیشہ پروٹسٹنٹ کا پیدا سمجھا ہے۔ میں نے ایک رات خواب میں یہ منظر دیکھا کہ میں اپنے شہر کو مقدس عبادت گاہ میں اپنے ایک "سلیو" بھائی کے ساتھ کھڑا اسرائیلی کے بادشاہ داریا کے وہ نئے گامبا ہوں جن کو اس دن کے بعد سے کسی کان نے نہیں سنا ہوگا جب ہمارا شہر اجاڑ دیا گیا تھا اور اس کے باقی ہجرت کئے تھے۔ مجھے شبہ ہے کہ موتی کے متبرے کے مخالف فرشتوں نے، اس خوف سے کہ میں کہیں وہی نئے عالم ہوں میں نہ گانے لگ جاؤں جو میں نے خواب میں گائے تھے، مگر ہونے تک سب میرے ذہن سے گزر کر دیے تھے اس لیے کہ اگر میرے برادراں، یعنی ہمارے قوم کے اقراں نے ان کو سن یا تو وہ اپنی خبیثوں کے چمن جانے کے غم کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔ انھوں (فرشتوں) نے میری دہ جوتی کی خاطر، کہ مجھے اپنی زبان سے نغمے گانے سے باز رکھا گیا ہے، نئے گانے کی صداقت عطا کر دی ہے۔

میرا تعلق "یوٹی" قبیلے سے ہے۔ ہر لوگ عبادت گاہ میں گانے والوں میں سے تھے۔ اور میرے والد کے خاندان کی شایستگی کے مطابق ہم لوگ یہودی خلیفہ بنو نسل سے ہیں، جن کا نامانی میرے عام کا حصہ بھی ہے۔ جب میں نے پہلا گیت لکھا اس وقت میری عمر پانچ برس کی تھی۔ یہ میں نے اپنے والد کی فرقت میں لکھا تھا۔ یہ ہوا کہ میرا باپ تجارت کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا۔ اس سے ملنے کی خواہش مجھ پر غالب آئی، اور میں نے ایک گیت گھڑیا۔ اس کے بعد سے میں نے کئی گیت گھڑے مگر ان میں سے کوئی اپنی نہیں رہا۔ میرے باپ کا گھر، جس میں غلطیوں سے بھر ہوا ایک کمرہ تھا، کافی جگہ کے دوامان بھی کرنا مستعد ہوا تھا، اور جو کچھ میں نے وہاں چھوڑا تھا وہ سب بھی ان ہی کے ساتھ شعلوں کی نذر ہو گیا۔ بہت سے نوکرانہ کاروبار بند ہو گئے، جوتے بنانے والے، جو اپنے کام کے دوران میرے گیت گانے کرتے تھے وہی جگہ میں مارے گئے اور جو جگہ میں مرنے سے بچ رہے تھے، ان میں سے کچھ تو اپنی بہنوں کے ساتھ دشمن کے حکم پر ان گڑھوں میں زندہ دفن کر دیے گئے جو ان سے ہی نکلائے گئے تھے، اور بہت سے اپنی بہنوں کے ساتھ، جو اپنے حسین کی بنا پر ہمارے شہر کی زمین تھیں اور اپنی مرلی "دو زمین میرے گیت گانے کی تھیں" Auschwitz کی پھیلوں کا ایندھن ہو گئیں۔

جو شہر میرے گیت گانے والوں کا ہوا، جو میرے گیتوں کی طرح شعلوں کی نذر ہو گئے، وہی ان کتابوں کا بھی ہو جو میں نے بعد میں لکھی تھیں۔ وہ سب شعلوں پر سو رہے جو مر جنت کی طرف پرواز ہو گئیں۔ جب Bad Homburg میں واقع میرے گھر میں اس وقت "گگ" لگی جب میں ہسپتال میں صاحب قراش تھا۔

بہل چلے والی کتابوں میں ایک بہت مہارت سے سمجھنا، مال بھی تھا جس کی وہی جہد محنت کے لیے اثر کے پاس جاتے والی تھی۔ اس کی اول کے ساتھ جس کا نام "ایدی زندگی" تھا وہ سب کچھ بھی بھل گیا جو میں نے اسرائیل کی سرزمین سے ہجرت کے بعد سے کھا تھا، جسوں اس کتاب کے جو میں نے Martin Buber کی شرکت میں لکھی تھی، اور چار دیگر اسرائیلی کتابیں بھی، جن میں سے بیشتر میرے اجداد سے مجھ تک پہنچی تھیں اور مجھ میں نے اپنا پیٹ کاٹ کر خریدی تھیں۔

میں نے بھی کہہ دیا کہ "وہ سب کچھ بھی بھل گیا جو میں نے اسرائیل کی سرزمین سے ہجرت کے بعد سے کھا تھا" مگر میں نے ابھی تک یہ نہیں بتا دیا کہ میں نے کبھی اسرائیل کی سرزمین پر قیام کیا تھا۔ اب میں اس کا ذکر کرتے جا رہا ہوں۔

جب میری عمر ساڑھے انیس سال کی تھی، میں اسرائیل گیا تاکہ وہاں زراعت کا پیشہ اختیار کروں اور اپنے نذرانہ سے روزی کماؤں۔ چونکہ مجھے کئی مرضی کا کئی کام میں مل گیا تو میں نے دھرمے دماغ کی طرف توجہ دی۔ میرا Hovevei Zion (Lovers of Zion) Society کے معتمد کے عہدے پر تقرر ہو گیا، ساتھ ہی مجھے فلسطین کا کونسل کے معتمد کے فرائض بھی سونپے گئے جو ایک طرح کی ذمہ داری تھی۔ میں نے Jewish Magistrates Court میں بھی رضا کارانہ طور پر معتمد کے فرائض انجام دیے۔ ان عہدوں کے علاوہ مجھے یہ موقع ملا کہ میں وہاں کے تقریباً ہر یودی فرد سے واقف ہو گیا، اور جن افراد سے ان عہدوں کے عظیم مایوس ہو سکا ان سے اس جذبہ محبت کے سبب متعارف ہو کر وہ میرے مذہبی بھائی بھی ہیں اور ہماری قوم کے فرد بھی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس زمانے میں سرزمین اسرائیل پر نہ کوئی ایسا مرد، نہ عورت، نہ کوئی بچہ رہا ہوگا جس کو میں نہیں جانتا تھا۔

جب میرا ساڑھے پندرہ سال کرنا کتنے ہو گیا تھا، خدے مجھے یہ غم دہش جانے کی توفیق عطا فرمائی۔ میں وہاں یہ غم پہنچا اور یہ غم میں کا صدقہ تھا کہ میں نے وہ سب کچھ کھا جو خدے نے میرے قلب اور میرے فکر پر اتھا کیا تھا۔ میں نے ایک کتاب قرینت کی تھیں پر بھی لکھی ہے، ایک کتاب Days of Awe پر وہ ایک کتاب اسرائیل کی ان تمام کتابوں کے بارے میں لکھی ہے جو قرینت کی کتابوں کے بارے میں تھیں۔ کے بعد سے اس وقت تک لکھی جا چکی تھیں۔

اسرائیل کی سرزمین پر وہی کے بعد سے صرف دو بار میں اس سے جد ہو ہوں، ایک بار اپنی کتاب کی مہم کے سبب میں جو Zelman Schocken نے شائع کی تھی، اور دوسری بار جب میں نے سویتون لومانا کے سفر کیا تھا ان کے غم شوروں نے میرے دل میں ان کے غلوں کی محبت اور ان کے یہ پسندیدگی کے جذبات کے جگ لایے تھے، اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں خود جا کر ان کو دیکھوں۔ اس بار کا میرا سفر تیسرا سفر ہے جو آپ، محترم و بزرگ ارکان کا دی کے بخشے ہوئے عزت کی وصولی کے لیے تھا ہے۔

جن دنوں میری قوم سوینڈن میں رہا تھا، میں نے غلوں اور منجھ ریلوں میں کبیاں لکھی تھیں۔ کچھ شائع ہو گئی ہیں، مگر زیادہ تر مخطوطوں کی صورت میں میرے پاس محفوظ ہیں۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میرا پیدائش گیت اپنے والد کی فرقت میں لکھا گیا تھا۔ میری اصلی تعلیم کی ابتداء بھی میرے باپ اور ہمارے شہر کے مذہبی مچ کے سامنے ہوئی۔ لیکن ان دنوں سے قبل بیہودہ تعلیم مجھے تین اور تھوڑے بچے بعد دھرم دی تھی، جب میں صرف ساڑھے تین برس کا تھا اور یہ مسئلہ اس وقت تک چلتا رہا جب میری عمر ساڑھے آٹھ برس کی ہو گئی۔

لکھ اور اوپ میں میرے مرشد کن تھے؟ یہ بچے اپنے نامزد کن بات ہے۔ کچھ لوگ تو میری کتابوں میں ایسے لکھتے والوں کی پوجا کیا دیکھتے ہیں جن کے نام سے بھی واقف نہیں اور کچھ ایسے شاعروں کے ثراوت دیکھتے ہیں جن کے نام تو میں نے سن رکھے ہیں مگر میں نے ان کو پہچاننا نہیں۔ اور میرا کیا خیال ہے؟ تو میں نے کس سے شوبہ ناپائی ہے؟ یہ قطعی ناممکن ہے کہ ہر شخص ہر نام کے نام سے واقف ہو جس کے بعد وہ کے قطرے، اس کی شہادت میں شامل رہے ہوں۔ تاکہ آپ اذہمیرے میں نہ رہیں، میں کوشش نہ کر گا کہ ان لوگوں کا تذکرہ دوسروں میں نے جن سے کچھ بھی حاصل کیا ہے۔

پہلے اور سب سے اہم تو متحمل مخطوطے ہیں، میں نے جن سے لفظ بنانے کیلئے تھان کے حد Mishna اور Talmud میں اور پھر تو میت پر لکھی تھیں Midrashim اور Rashi کی تفسیر میں ہیں۔ ان کے بعد Poskim کا نام آتا ہے، Talmud کے قانون سازوں کا دور ہمارے مقدس شعرا اور قانون دہن کی کے دانش وران کا جن کے پیشوا ہمارے سب سے بڑے ربی سویٹین میمون ہیں، جن کو متبرک Mamonides کہا جاتا ہے۔

سب سے پہلے جب میں نے احاطہ جوڑ کر حروف بنانے کیلئے میں نے، میری زبان کے مادہ، حروف زبان کی تیرہ کتاب پڑھاؤں جو میرے، تھائی، اور ان کی سب سے میں نے وہ کچھ سب کیا جو میرے حروف سے لکھا تھا۔ پھر کہ وقت کم ہے اس لیے میں کوئی فہرست مرتب نہ کر سکا جو ہوں گا وہ نہ کوئی نام لینا پسند کروں گا۔ تو پھر میں نے یہودی کتابوں کے نام کیوں لیے ہیں؟ یہ نام اپنے اس لیے ضروری تھے کہ انہی نے میرے زبان کی بنیاد رکھی تھی۔ اور میری دل کتا ہے کہ مجھے لوسٹ انو کا عزیز لانے میں انہیں کے ماتحت کا رہنا ہیں۔

ایک اور قسم کا اثر ہے، جو میں نے ہر مرد اور ہر عورت سے قبول کیا ہے، ہر یہودی یا غیر یہودی بچے سے جو بھی میری ماد میں پڑا تھا۔ میرے سامنے لوگ جو بھی دانش کرتے ہیں، کہانیاں سناتے ہیں، سب میرے دل کے اوراق پر نقش ہیں اور ان میں سے کچھ میرے علم تک جا پہنچی ہیں۔ مگر کچھ دیکھا ہر فطرت کے ساتھ ہوا ہے۔ ہر مرد اور ہر عورت اپنے ہر کے گوشے سے میں جس کا تذکرہ کیا کرتا تھا، Arnon Brook دیا، میں جس میں فوٹے لکایا کرتا تھا، وہ راتیں جو میں دیوار گریہ کے پاس عابد اور متعلی لوگوں کے ساتھ

گمراہا کرتا تھا، سب میرے صفحات دل پر نقش ہیں۔ وہ راتیں جنہوں نے مجھے مقدس سرزمین اور دیو گریہ کے دیکھنے کی توفیق دی، اس دیوار پر جو میں عطا ہوئی اور اس شہر پر جسے اس نے اپنے نام سے معنون کیا خدا ان سب پر پتی رحمتیں نازل کرے۔

مبارک میں کسی مخلوق کو کم تر نہ سمجھوں، مجھ پر ان پالنے والوں، غریبوں، غریبوں اور چھوٹوں کا ذکر بھی فرض ہے جن سے میں نے سیکھا ہے۔ ان میں سے مجھے بتاؤ میں نے اپنی کتابوں میں تحریر بھی کر دیا ہے، پھر بھی شاید میں نے ان سے سیکھا نہیں سیکھا ہے جتنا کہ سیکھنا چاہیے تھا، اس لیے کہ جب میں کسی شخص کو بھولتے، کسی چھوٹے کو چھوڑتے یا کسی کلمے کو کاٹیں یا کسی کلمے میں کوتاہی ہو تو سہجہ ہوں، شرمیلیں وہ میرے شکر یہ ادا کر رہے ہیں و میرے محاسبہ کر رہے ہیں۔

قیس اس کے کہ میں اپنی گزارشات تمام آئینوں میں ایک بات اور کہتا چاہوں گا۔ اگر میں نے اپنی تعریف میں غلو سے کام لیا ہے تو یہ میں نے آپ کے اطمینان قلب کی خاطر کیا ہے اس لیے کہ آپ نے مجھ پر نظر کر رہی ہے۔ میں خود کو حقیر جانتا ہوں۔ وہ ہر کے لیے بھی میں داؤد (علیہ السلام) کی اس مناجات کو نہیں بھولا ہوں جس میں انہوں نے فرمایا تھا، ”آقا، وہ میرا دل قوی ہے، وہ میری آنکھیں سرکش ہیں، وہ میں خود کو بڑے معاملات میں الجھاتا ہوں، خدا ان چیزوں میں جو میری عقل سے رہتا ہے۔“ اگر مجھے کسی بات پر غور ہے تو میں اس بات کا کہ مجھے اس سرزمین پر رہنے کا اشتقاقی خدا ہے خدا نے جس کی عطا کا میرے بزرگیوں سے بہرہ ور کیا گیا تھا جیسے کہ (Ezekiel 37 25) میں لکھا ہے ”میرے والد اس زمین پر رہیں گے جو ہم نے اپنے ہندسے، عقوبت و عطا کی ہے، جس پر تمہارے جدا ہو رہے ہیں،“ راہد تک اسی پر رہیں گے، وہ بھی، ان کی والد بھی لوہان کی اولاد کی اولاد بھی۔“

اختیار سے قیاس میں ایک دعا کرنا چاہوں گا، ”کوی جو سویش مندوں کو دانا کی دنا ہے اور لاوشاہوں کو نبوت، آپ کی دانا کی میں خدا سے زیادہ افسانہ کرے اور آپ کے حکمران کا مرتبہ بلند فرمائے۔ خدا کرے کہ ان کے دوز میں یہودیوں ہوں اور اسرائیلی محفوظ رہیں، مسیحیوں پر تہات و بندہ قہور کرے زمین عظم سے بھر جائے، ابدی خوشی ہو سب کے لیے، اور جو اس سرزمین پر رہتے ہیں سب اس سے بہرہ ور ہوں، آمین۔“

نے لی ساش

اعترافِ کمال۔ اس کی عی درج کے دماغ اور خدائی تحریر کے لیے جو بڑی پامردی سے
مملکت اسرائیل کی تقدیر کی قربانی کرتی ہیں۔

نے لی ساش دو جرمن شاعر اور ڈراما نگار تھے جس نے یہودیوں پر نازی جرمنی کے ظلم کے خلاف آواز
بلند کیا اور ان کی حالتِ ذمہ داری طرف مخاطب کرنے کی بے مثال جدوجہد کی۔ یہ جدوجہد اس سے ممکن
ہوئی کہ وہ نازی ہیبریت کی ابتدا میں ہی جرمنی سے سوئیڈن جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔
دوسرے کئی جرمن یہودی مصنفین کی طرح ساش کو بھی جبر وطن ہوا پڑا تھا۔ سوئیڈن کی حکومت کی
مداخلت کی وجہ سے اس کو حکومت گاہوں سے ہندول گئی اور وہ جرمنی چھوڑ کر سوئیڈن میں آباد ہو گئی۔ لہذا
اس کو دوسرے یہودیوں کے مقابلے میں سوئیڈن میں سکون کی زندگی نصیب ہوئی جس میں اس نے کمال
کیا جس کے نتیجے میں اس کو نوٹس اے اے کا اعزاز ملا۔ ساش کو جرمنی نبوت کی دنیا میں بے پناہ شہنشاہ اور
قائد کو دینے کی صلاحیت رکھنے والی دیہ کے طور پر شہرت ملی۔ اس نے حساس کی بے پناہ دل گداز
شدت سے دیا پھر کے یہودیوں پر مظالم کے لیے آواز اٹھائی۔ اس کی آواز ایسا خدائی فوجہ بنی جس میں درو
کی شدید حساسیت بھی تھی اور سائیر کی جھل بھی۔ اس کا سچا رانی لہجہ جدید الہامی اندازِ عیانت اور قدیم
شاعری کا بہترین امتزاج ہے۔

مراثی کا کمال یہ ہے کہ اس نے شعری فکر قرائی سے ایسی ڈیپ تحقیق کی ہے جو ناسی عقولیت خالوں اور لاشوں کے پھر سے دگر نہیں رہتی مگر طام سے غزفوں کی سطح سے بلند ہو کر انسان کی ہے جتنی پہلے سے پاک غم کا عکس رکھتی ہے۔ اس کا اثر برسی کے دوران تحقیق کی نئی شعریات کا ایک مجموعہ Fahrnis (Journey to the Beyond) 1961 Staublose کے نام سے شائع ہوا۔ مراثی کی سمجھنے والی تفسیری شخصیت بھی Zeichen im Sand 1961 (Signs in the Sand) کے نام سے شائع ہوئی جس کے مرکزی خیالات قدیم ہندو (مشرقی یورپ کی ایک قدیم نیاں - مترجم) کے صوفیہ غزوانے سے مشتق ہیں مگر جدید انداز سے ان کے مفہوم کو مشتے مٹے ہیں۔

یہاں مراثی کے ایک کھیل (1950) کا ذکر ضروری ہوگا جس میں ایک جرمن فوجی ایک چٹھ برس کے لڑکے کو اس بوت پر مار کر ہلاک کر دیتا ہے کہ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود تہ ذابوں کے گولی کو بھی کر اس وقت خدا سے امداد طلب کی تھی جب فوجی اس کے والدین کو قتل کر کے لے جا رہے تھے۔ خدا میں گناہ کے ایک کھیل شروع ہوئی مانگیں نے یہ مشکل تمام اس فوجی کو مشکل مشکل مراثی کیا اور قتل اس کے قتل کے امداد سے مانگیں اس پر ہاتھ لگا کر فوجی غلٹ کر رہا ہے اور ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس کھیل کے اختتام میں ایسے حقدار انصاف کا سفر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں انسان کا کھیل نہیں ہوتا۔

مراثی کی تحریریں یہودیوں پر کیے جانے والے مظالم کے خلاف شدید طعن کا راندہ و عمل کا موقع ہیں اور انسانیت کی بھلائی کی راہیں دکھاتی ہیں جو آخریہ ٹوٹل کی وصیت کا مرکزی مقصد تھا۔

مراثی جرمنی کے دار الحکومت برلن میں 1891 میں پیدا ہوئی۔ وہ اپنے موجد اور صنعت کا رہا پ کی واحد اولہ تھی۔ اس کی تعلیم پیسے تو گھر پر استادوں کے ذریعے ہوئی پھر اس کو Berliner Hohere Töchtereschule میں داخل کیا گیا۔ پندرہ برس کی عمر میں جب اس نے سوئینڈن کی ادیبہ Sema Gösta Berling کی Lagerlöfs کو پڑھا تو اس سے خدا کے ذریعے رابطہ کیا جو پینتیس برس تک جاری رہا۔ مراثی نے سوئیتی، رقص اور دب شوق سے پڑھا اور اس دوران ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس نے تنہائی سے رقص پڑھنے کا اعادہ کر لیا تھا۔

مراثی کی ابتدائی نظموں نے "سٹریو کے مشہور ادیب Stefan Zweig کو اپنی جانب متوجہ کیا اور اس نے ہی مراثی کی پہلی نظم کی شاعت کا بندوبست کیا تھا۔ مراثی نے جرمن زبان کے رہنما ادیبوں کو جن میں گوٹے Goethe اور شلر Schiller بھی شامل ہیں، بڑی توجہ سے پڑھا تھا۔ اس کی ابتدائی نظمیں نو رومانوی neo-romantic انداز کی ابسیوں سے لبریز تھیں مگر مراثی نے ان کو اپنے مجموعوں سے خارج کر دیا۔ مراثی کی شعری 1920 اور 1930 کے درمیان اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئی مگر وہ برلن کے دہلی جتنے میں کوئی مقام نہیں جانتی تھی۔ اپنے باپ کے انتقال کے بعد وہ اپنی ماں کے ساتھ جرمنی سے فرار ہو کر سوئینڈن چلی گئی، جب کہ اس کے دوسرے تمام اہل خاندان مائسی عقولیت خالوں میں موت کی بھینٹ چڑھ

گئے۔ سلاش نے روزی کمانے کی غرض سے سوئڈش زبان سیکھی اور سوئڈش زبان کے شاعروں کے کلام کا ترجمہ زبان میں ترجمہ کر کے اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ پالا۔ سلاش نے سوئڈش قومیت حاصل کرنے اور پھر اس کو چین اور قومی شہرت دینی شروع ہوئی جس کے نتیجے میں اس کو شاعری پر Droste-Hülshoff Prize دیا گیا۔ 1965 میں Peace Prize of the German Book Trade کا جو ایک بڑا اعزاز تھا۔

جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد سلاش نے ماسکوں کے ہاتھوں یودیوں کے قتل عام کے بارے میں قصیدے اور قصیدے لکھے۔ بعد میں اس نے ہاسڈی (Hasidic) ادب اور رائجیل کا گہرہ مطالعہ کیا۔ سلاش کے پندرہ مجموعے شائع ہوئے جن میں سے کئی کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوا۔

1959 میں سلاش کو جرمن زبان کا ایک بڑی معتقد کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ ٹوئسٹ ٹیوم نے اس کے بعد بھی وہ ایک معمولی سے فلیٹ میں رہتی رہی اور اس کو عیسائی یا یوں پریشان نہ رہی۔ اس نے کبھی شادی نہیں کی۔ 1970 سرحد کے عارضے میں اس کا انتقال ہوا۔

ضیافت سے خطاب*

گرمیوں کے دن تھے جب میری ایک جرمن دوست بھلا، گرووف سے ملاقات کے لیے سوئڈن گئی تاکہ وہ اپنی ماں اور میرے لیے اس ملک میں پناہ میں مدد کی طالب ہوں۔ بچے غنڈاؤں شہاب سے بھلا، گرووف سے خود کثرت میری خوش قسمتی رہی ہے اور یہ اس کی تحریروں کی کاغذیں ہے کہ اس کے وطن کے بارے میں میری دل چسپیاں بڑھیں۔

حیثیوں کی پریشانیوں کے بعد 1940 کے موسم بہار میں ہم دوگ سٹاک ہوم پہنچے۔ ڈنمارک اور ناروے پر (دوسری جنگ عظیم کے دوران) قبضہ ہو چکا تھا۔ عظیم ماہر کار امتیاز کر چکی تھی۔ ہم کسی کی زبان سمجھتے نہیں تھے پھر بھی ہم نے آمادگی کی ہوئی سلسلے کیا۔ آج، چھپیں برس بعد، سیتے و لہ کی وفات یاد آتی ہے جو وہ ہمارے شہر برلن میں ہر سال دسمبر کی دس تاریخ کو کہا کرتے تھے "اب سٹاک ہوم میں ٹوئسٹ انعام کی تقریب ہو رہی ہوگی۔" شکر گزار ہوں میں سوئڈش اکادمی کے انتخاب کا کردار میں اس کا ہوم کے تقریب میں موجود ہوں۔ مجھے ایک چری کہاں حقیقت بھی ملگ رہی ہے۔



میناکیل الیزاندرو ووج شولوخوف

اعترافِ کمال اس کی فن کارانہ قوت اور مہمت بازی کے لیے جس کے ذریعے اس نے زمان
کے راز سے ملے، وہی عوام کی تاریخ کے ایک دور کا بھرپور اظہار کیا۔

میناکیل شولوخوف کا بچپن قزاوقوں کے وطن میں گزر چکا جس کے سنگار و چور و چشی ارضی مناظر و روپوں
کے، سیوں کے خصوصی مزاج سے اس کی ایک گہرے اثرات تھے۔ اس نے اس سرزمین کو وہی انقلاب اور اس
کے نتیجے میں ہونے والی خانہ جنگی کے دوران مختلف ادارے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ شولوخوف نے پہلے
ماسکو میں محنت مزدوری سے ملازمتی زمانے کی کوشش کی مگر بعد ہی اس نے تصنیف کی طرف توجہ دینی شروع کی
اور اس زمانے میں ہونے والی خانہ جنگی کے بیان کے لیے خاکے لکھنے شروع کیے جو ایک منفرد تخلیق ٹھہرے
اور بعد میں اس کی شہرت کا سبب بنے۔

عجیب حقائق ہے کہ خانہ جنگی نے اس زمانے کی نسل کو قبل بروقت بلوغت کی منزلوں تک پہنچا دیا تھا
اور یہی وجہ ہے کہ شولوخوف نے کیسے کیسے اپنی عمر میں اپنا اچھا پائے کا مذہب مول And Quiet Flows
the Don کہنا شروع کیا تھا اور یہ شہر اپنی تھکاوٹ کے ماحول کی وجہ سے اس کی اس شاد کا تجربہ کی
ایک طرح کی طعن ہیری کی زیریں لہریں ملتی ہیں۔ شولوخوف کو، بچے مشورے کی تکمیل میں چوتھ برس کا
مرسدس گیا جس میں اس نے اپنی جنگ عظیم سے وہی انقلاب اور خانہ جنگی تک کے زمانے کا احاطہ کیا
تھا۔ اس تصنیف کا بنیادی مضمون قزاوقوں کو دردمانک جہات تھا۔ چار حصوں میں تحریر کردہ شولوخوف کی یہ

شاد کا تصنیف 1928ء اور 1940ء کے درمیان منظر عام پر آئی جس نے سلاطین یونانی کے ادبی میسرین کو اس کی طرف اس لیے مائل بھی متوجہ کیا کہ اس تصنیف کے ذریعے مصنف کے قوتوں سے روابط و اہل مدد و دل کے مراسم ملتے تھے جو وہی حاکموں کے خلاف نظر آتے تھے۔

ظاہر ہے کہ قزاقوں کی بغاوت کو ایک گوندہ شان و وقار کے حریفوں میں پیش کیا جانا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ مصنف بغاوت کرنے والوں کی قصید و نمک کا بحر ہے۔ دماغی و ذہنی طور پر نہیں تھا مگر اس تصنیف کے ذریعے شادوئل نے اپنے ضمیر پر مدے ہوئے یوحنا دانا نے کی کوشش کی تھی جو ایک بڑے درجہ کا قد تھا۔ شادوئل نے اس تصنیف میں قزاقوں کے منفرد قوتی کردار کی بے مثال نقش کشی کرنے کی کوشش کی ہے۔ تنگی اور بھوکے بھالے سان قزاق اپنی آپس کی کش مکش کے باوجود جب عہد و جہد کا وقت آتا ہے تو اپنے حریف کے مقابل ایک سید پائی ہوئی دیوار کی طرح نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔ اس بیان میں شادوئل نے بغاوت کرنے والوں کو دل فریب بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس نے خیر کی آواز کے لئے تمام دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس نے قزاقوں کی شخصیت کے گہرے پن اور غول غولائی کی جہت کی پوشیدہ دھاریوں کو آشکار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جلال کہ شادوئل ایک گہرا اشتراکی تھا مگر اس نے اپنے سیاسی خیالات اور پندیا اپند کو پورے رکھ کر اپنے منصب کے ساتھ انصاف کیا ہے جو اس کی عظمت پر دلیل ہے۔

شادوئل کی تصنیف And Quiet Flows the Don کے بارے میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی تحریر میں کوئی نئی تکنیک استعمال نہیں کرتا مگر یہ کہنا ایک طرح کی سادگی کے مترادف ہوگا، اس لیے کہ اس تصنیف کا موضوع مصنف کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کے بیان میں اس کی فن کا نہ خیال دے مافی اور خدمت سے پرہیز کرے جو اصل موضوع سے توجہ ہٹا کر اس کے بیان کی قوت کو کمزور کر دیتی ہے۔ شادوئل کے اس (Podnyazaya Tselna, 1932 and 1959 (Virgin Soil Upturned) میں جو تیری اجتماعیت کے ذریعے اجتماعی کھیتی باڑی کے منصوبہ پر ہے، مصنف دلچسپ اور تھوڑے گہرے کرداروں کی تخلیق کے ذریعے اپنی اس توانائی کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے جو اس کو عالمی سطح کے ادیبوں کے نمائندہ کھڑ کرتی ہے۔

میخائیل شادوئل 1905ء میں قزاقوں کی سرزمین کے اس علاقے میں جو آج کل Kamenskaya کے نام سے جانا جاتا ہے، پیدا ہوا۔ اس نے 1918ء تک کئی مدرسوں میں تعلیم حاصل کی۔ اس نے انقلاب روس کے دوران غلامیوں کی حمایت میں جنگ بھی کی۔ انقلابی جدوجہد کے خاتمہ پر وہ ماسکو چلے گیا جہاں اس نے صحافت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ وہیں اس نے اپنی بہت سی کہانیاں اخباروں کے ذریعے مضمون تک پہنچائیں۔ اپنی مقدماتی میں اس کا تاملی ذریعہ 1926ء میں اس وقت ہوا جب اس کی کہانیوں کا ایک مجموعہ 1926 Donskie Rasskazy (Tales from the Don) کے نام سے شائع ہوا جو اس کے مولد کے ہمسایوں (قزاقوں) کے بارے میں تھیں۔

شولوخوف نے کمیونسٹ پارٹی کی باقاعدہ رکنیت اختیار کی اور کئی موقعوں پر وہ سوشلسٹ جماعت میں مندوب کی حیثیت سے شریک بھی ہوا۔ روس کونسل کی سوشلسٹ اکادمی کا رکن بھی رہا اور Association of Soviet Writers میں نائب صدر کے عہدے پر بھی فائز ہوا۔

شولوخوف کی سترہ تصانیف شائع ہوئیں اور بہت سی زبانوں میں ان کے ترجمے بھی کیے گئے۔ شولوخوف نے 1984 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب*

اس سنجیدہ موقع پر یہ میں اپنا خوش گوار فرض سمجھتا ہوں کہ میں سوویتس اکادمی کا ایک بار پھر شکریہ ادا کروں کہ انھوں نے مجھ کو نوبل انعام عطا کیا ہے۔

جیسا کہ میں سب کے سامنے تصدیق کر چکا ہوں، جو احادیث سرب اس انعام نے مجھ میں بھرا ہے وہ جیسی اقوامی سطح پر صرف میری فنی ہیئت کی قدر رشتہ کی اور ایک ادیب کی حیثیت سے میری انفرادی خصوصیت کی سے نہیں ہے۔ مجھے خبر ہے کہ یہ انعام ایک روسی، ایک سوشلسٹ ادیب کو دیا گیا ہے۔ یہاں میں اپنی بھرتی کے کھینچنے والوں کے ایک جملہ غنیمت کی نمائندگی کر رہا ہوں۔

میں پسے بھی اس بات پر اپنی مسرت کا اظہار کر چکا ہوں کہ بالواسطہ حیثیت کی حیثیت سے نوبل کے لیے یہ انعام ایک اور اظہار رشتہ کی ہے۔ میں نے حال ہی میں اس موضوع پر متعدد دیگر انعامات پڑھے ہیں جن میں نوبل کو ایک ایسی انکار و فتنہ منسوب تحریر قرار دیا گیا ہے جو جدید دور کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر ہے۔ حالانکہ یہ نوبل ہی ہے جو موجودہ دنیا کی حقیقتوں کا مکمل اظہار کرتا ہے، جو انسان کو دنیا کے سامنے اپنے رویوں کو درمیان میں دیکھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نوبل ہی وہ حیثیت ہے جو، پہلے اس کے کہ ہم اپنی تعمیرات کو کائنات کا مرکز بنانے لگیں، ہم کو اپنے طراف بکھری ہوئی نچری پوری زندگی کے گہرے مطالعے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ادب کی یہ حیثیت ایک حقیقت پسند معرور دنیا کا وسیع ترین منظر دکھاتی ہے۔

نوبل انعام کے بہت سے فنکاران پرست و ہمارے حقیقت نگاری کو رد کرتے ہیں، ان کے نزدیک جس کا وقت گزر چکا ہے۔ قدامت پسند گردانے جانے کے امکانات کے باوجود میں یہ طمان کہہ رہا ہوں کہ میں اس تصور سے متفق نہیں اور میں حقیقت پسند نوبل انعام کا ایک پریقین مدافعت کار ہوں۔

جدید تجربات کے حوالے سے، بالخصوص دین کے میدان میں، آج کل دلی کابل کا ہی کے بارے میں بہت باتیں کی جارہی ہیں۔ میرے نزدیک حقیقی پیش رو وہ مصور ہیں جو اپنی تخلیقات میں اس سے مواد کو آشکارا کرتے ہیں جو ہمارے ذہن زندگی کی خصوصیات کو متعین کرتے ہیں۔

حقیقت نگاری میں حیث اٹکل اور حقیقت پر مبنی ماہرین دونوں نئی تجربات پر انحصار کرتے ہیں جو ماضی کے عظیم ماہرین نے پیش کیے تھے۔ پھر بھی وہ نون قانون نے اپنے ارتقا کے دوران میں اور ہم خدا کو خالی اپنا لیے ہیں جو دنیا کی طور پر چھو رہے ہیں۔

میں اس حقیقت نگاری کی بات کر رہا ہوں جس کے ساتھ ساتھ زندگی کے تصور پر زعمی تھی، اس کی تکمیل انسانیت کی بھائی کے لیے تھی۔ میں بے شک اسی حقیقت نگاری کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جس کو ہم شعرا کی حقیقت نگاری کا نام دیتے ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ زندگی کے اس لمبے کی تجرباتی کئی سے جو دنیا سے منہ پھیرنے کو قائل کرتا ہے اور نہ حقیقت سے فرار، وہ فلسفہ جو ایسے مقاصد کو حاصل کرنے کے قابل بناتا ہے جو انہوں نے انسانوں کے دل کی گورجیں اور ان کی جلد جلد کی رہوں کو روشن کرتا ہے۔

انسانیت افرد کے گرد ہوں میں بنی ہوئی نہیں ہے۔ لوگ، ان خود نمونوں کی طرح، خود میں تیرتے پھرتے ہیں جو زمین کی کشش کو توڑ کر باہر نکل چکے ہیں۔ ہم زمین پر رہتے ہیں، مشکلات اور مقامات کے ساتھ، ایک بہتر مستقبل کی امید میں، اور اس قانون کے پابند ہیں جو انہیں کے مطابق، کامل ہیں اس بات تک لیے جو اس کا طرزی دن ہو گا۔ دنیا میں بسنے والے انسانوں کے وسیع طبقے ایسی ہی خواہشات سے متحرک ہوتے ہیں، اور ان کے درمیان مشترک دلچسپیوں کی ان کو ایک ایک ہونے کے بجائے یکجا رکھتی ہیں۔

یہ محنت کرنے والے لوگ ہی ہیں جو سب کو سمجھنے یا سمجھنے سے اور دنیا کے استعمال سے بناتے ہیں۔ میں ان مصنفوں میں سے ہوں جو اپنے قلم کو انسانیت کی خدمت کے لیے استعمال کرنے کے ہر موقع کو حاصل کرنے کو بند ترین وجہ آزادی اور ان کی مزید اعزاز جانتے ہیں۔

میں قلمی جنود سے مامی سے وہ ناک اٹھاتے جاتے ہیں کہ میں، یعنی ایک سویت دیوب، آج کی دنیا میں فن کار کے مقام کو کس نظر سے دیکھ رہا ہوں۔

جس عہد میں ہم مبنی رہے ہیں وہ غیر معمولی حالات سے پر ہے۔ اس کے باوجود دنیا میں ایسی ایک بھی قوم نہیں ہے جو جنگ کی خواہش مند ہو۔ تاہم، ایسی حالتیں بھی ہیں جو پوری پوری قوموں کو جنگ کی آگ میں جھونک دیتی ہیں۔ یہ مانگن نہیں کر رہی جنگ عظیم کی ناقابل یقین آتش فشاں ادیب کے دل کو آغوش دے گا۔ ایک دن وہ ادیب اس بات کا پابند نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں کے خوف سے ہر ہر ہو جائے جو نوجوانان کو خود کشی کی طرف لے جانا چاہتے ہوں۔

تو پھر فن کار کا پیش کیا ہے اور اس کے ذمے کون سے کام ہیں جو ٹیڈ کو دیکھتا ہے، ایسے خدا کے پرتو کے مانند نہیں جو انسانیت کی اذیت کو خاطر میں نہیں لیتا، جس کا تحت، سفاکی جنگ کے شعلوں کی چٹکی سے بلند

ہو، جس لوگوں کی اولاد کی طرح، انسانیت کے ایک حقیر ذرے کی طرح؟

فن کار کو قاری کے ساتھ کھٹے دل سے ہونا چاہیے، لوگوں کو بچا کر لینا چاہیے، جو کبھی کبھی مائوسی مکار ہو سکتا ہے مگر غائب نہیں رہتا۔ لوگوں کے دلوں کو قوت دینا چاہیے کہ وہ مستقبل پر یقین رکھیں، مستقبل سنوارنے میں اپنے قوت مند پرچہ پس کریں۔ چہرے دنیا کے لیے مس کے حلیائی نہیں اور اپنی نبوت سے اپنے الفاظ سے جہاں تک ان کی آواز پہنچے ایسے حلیائی لوگوں کی تسلی دہانی کریں۔ لوگوں کو ان کی فطری ترقی کی مہذب کوششوں کے لیے مستعد کریں۔

فن میں لوگوں کے ذہن اور ان کی دانش پر اثر انداز ہونے کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔ میرے نزدیک انسان کو یہ حق پہنچنا ہے کہ وہ خود کو فن کار کہے، اگر وہ سائنس کے ذہنوں میں بھی خوب صورت خیالات سے تخلیق کرنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو منتقل کر سکتا ہے، اگر وہ انسانیت کو ناکام نہ پہنچا سکتا ہے۔

ہمارے مومنین لوگ تاریخ کے سر میں پہاڑ شدہ راستوں پر نہیں چلتے ہیں۔ ان کا سفر تھوڑی انسانوں کا طریقہ، ایک نئی روش کے پہلے کاروبار کا سفر تھا۔ میں نے ہمیشہ ایک ادیب کی حیثیت سے یہ چنا فریضہ سمجھا ہے کہ جو کچھ اب تک میں نے لکھا ہے اور جو کچھ میں سمجھ دیکھوں وہ محنت کش لوگوں کی اس قوم کے احترام کے لیے ہو، اس معمار قوم کے لیے ہو، جیہاں کی اس قوم کے لیے ہو جس نے کبھی کسی پر حملہ نہیں کیا ہے لیکن جو کبھی طرح جاتی ہے کہ ہر اس شے کا جو اس نے بنائی ہے، اپنی آزادی اور وقار کا، بڑے مستقبل کی جس طرح چاہے سنوارنے کے حق کا، باعزت دفاع کس طرح کیا جاتا ہے۔

میں چاہوں گا کہ میری کتابیں مددگار ہوں لوگوں کی بہتر سائنس بخشنے میں، ادیان کو نیا دہ پاک صاف کرتے میں، میں ان کے دلوں میں عسروں کے لیے جذبہ محبت بھارنے، انسانیت کے معیار کو بلند کرنے اور ترقی کے لیے جنگ کرنے کی شائش بیدار کرنا چاہوں گا۔ اگر میں کسی حد تک یہ کچھ کر سکا ہوں تو میں بہت خوش ہوں۔

میں اس شاء آپ سب کا شکر گزار ہوں، اور ان لوگوں کا بھی جنہوں نے اس نغمے کے سسے میں مجھے ٹیک تھا بہشت اور جہنم کے تمام رنگ بکھینچے ہیں۔

ژاں پال سارتر

امیراف کمال اس کی محنت تھی ۲۵ ماویٰ کی موت درج کی جیتو سے مہو غریبوں کے لیے جنتوں
نے ہمارے عہد پر وہ ورک اور گہرے نقوش مرتب کیے ہیں۔

ژاں پال سارتر نے دب کا نوٹیں انوم پینے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کسی ادارے
سے انعام سے کراس کا نمونہ احسان نہیں ہونا چاہتا اس لیے کہ یہ قول اس کے انعام پینے پر راضی ہونے
سے وہب کے میدان میں اس کی غیر حاجب کاری کے مروج ہو جانے کا امکان ہے۔ اس نے انعام کو
تھماتے ہوئے، اپنے ایک خیال بیان میں یہ بھی کہا کہ انعام لینے سے انکار سے اس کو مراد یہ نہیں کہ
نوٹیل فاؤنڈیشن یا انعام خود مختار ہے اس نے اس سے پہلے بھی کئی اعزازات قبول کرنے سے انکار کیا ہے
اور اس کو تین انعام کا حق حاصل بھی بتایا جائے تو وہ اس کو بھی تھمادے گا۔

انعام سے انکار کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے نزدیک اداروں کی مداخلت کے
بغیر ہی مشرق اور مغرب کے انسانوں اور تہذیبوں کے درمیان تبادلۂ خیالات و فن ہونا چاہیے۔ مزید یہ کہ اس
کے خیال کے مطابق ماضی میں انعامات دیے جانے کے معاملے میں مختلف مکاتب خیاب اور قوموں کے ساتھ
برابری کا سلوک نہیں کیا گیا اس لیے اس کے حامی قیوں سرپینے کے عمل کو کسی اور معنوں میں بھی یہ جاسکتا ہے۔
سارتر کے خیال کے جواب میں گیرالڈن انسٹی ٹیوٹ، الاسو کے سربراہ نے ایک بیان میں کہا

مرکز نے اہم قول کرنے سے انکار کیا ہے۔ اس نوع کے بارے میں ہمیشہ
مباحثے ہوتے رہے ہیں اور ہر شخص اپنے خیال کے مطابق رائے قائم کرتا ہے۔
پھر یہ کہ وہ خدا کی مدح کو سمجھ نہیں پاتا اس لیے تنقید کرتا ہے۔ مگر میرا خیال
ہے کہ رٹنیل زندہ ہوتا تو اس میں کے انہی میں حق ثابت دینا نہ ہوتا۔ دنیا
اور انسانیت کی بھلائی انسان کی برکت کا خواب رہا ہے اور بچے شاعروں اور
مردم فاضلوں پر تو یہ اور بھی صادق آتا ہے۔ رٹنیل کا بھی خواب تھا اور سارے
کے بچے تخلیقی وجدان کی بنیاد بھی یہی ہے۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی شک نہیں کہ
عالمی جنگ دوم کے بعد کے تمام ادبی اور فاضل ورثہ کی کتابت میں سارے کا ایک
مصنف اور فلسفی کی حیثیت سے، بحث مباحثے، تعریف و تنقید وغیرہ میں ایک
مرکز کی تکرار رہا ہے۔ اس کی جہاں کا نیز تخلیقیت، مرنے کی حیثیت، قاری و راس کی
دنیا کے لیے ایک نہایت اہم پیغام کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سارے نے اپنی تخلیقات
کے ذریعے جو فلسفہ پیش کر کے کی کوشش کی ہے وہ لو جو انوں کے نزدیک انہی
کا پیغام ہے۔“

سارے کے نظریے وجودیت کے مطابق انسان کو اتنی ہی خوشیاں نصیب ہو سکتی ہیں جتنی کو حاصل
کرنے کے لیے وہ اپنے مخصوص قومی مزاج کے مطابق قربانیاں دینا گوارا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
نوبل کے ہم عصر فلسفی رالف والڈو ایمرسن (Ralph Waldo Emerson) کے قول ”دنیا کی کوئی شے
تمہارے ذہن کی طاقت قاری سے زیادہ قابلِ حرام نہیں“ کی مراد یہ تھی کہ اس سے زیادہ تعریف نہیں
کی جا سکتی۔ انسانی زندگی کا معیار صرف اس کے خاندانی حالات ہی پر نہیں بلکہ اس کی اخلاقی خوبیوں پر
محصص ہوتا ہے۔ ہمارے دور کی معیاریت، پیچیدہ معاشرتی نظام، اور فرد کی زندگی کے اصل معنی خیز تو نہیں
ہوئے مگر ہندو اور مسیحی ہیں۔ اس سے آج بھی نوبل کے نظریے کے احترام کی اتنی ہی ضرورت ہے
جتنی کہ اس کے زمانہ حیات میں تھی۔

سارے ان گنے چنے مصنفوں میں سے تھا جن کے نزدیک ایک حکیم فلسفیانہ حیثیت ہی ان کے فن
کی بقا کا مرکز ہوتی ہے۔ سارے کی تصنیفات اور اس کی ذاتی شہرت کھلی عہد کی چوتھی دہائی میں عروج پر
پہنچی۔ اس کی نظریاتی تصنیفات، ماہوں اور دہائیوں کے لیے منبع فیض رہے ہیں۔ سارے کے فلسفے
کی بنیاد خدا کے وجود کا انکار ہے اور اس کے نزدیک خدا سے محرومی ہرگز قابلِ غور نہیں۔ انسان ہر قسم کی
پابندیوں سے، ہر طرح کی بالادستی سے مبرا ہے اور اس کو کوئی اخلاقی حیثیت حاصل نہیں ہے تو اس کو حق
ہے کہ وہ ہر طرح کی پابندیوں سے انکار کرے۔

شاب پل سارے 1905 میں ویرجیا میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ فرانسیسی بحریہ میں سرٹھان اور ڈن پل

کی کم عمری میں ہی اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد سارتر اپنے ماما کے گھر پلا بڑھا۔
 École Normale Supérieure میں 1924 سے 1929 تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ Le Havre
 میں فلسفے کا پروفیسر بن گیا اور یہی وہ زمانہ اس نے اگلی اوپوسٹر کا سفر بھی کیا۔ فرانسیسی استی بحوث کے ذریعے پر
 وہ ایڈموند سیرل اور مارٹن ہیڈگھ کے فلسفے کی تعلیم کے لیے برطانیہ میں مقیم رہا۔ Le Havre میں استاد رہنے
 کے بعد وہ پیرس کے Lycée Pasteur میں 1939 تک پڑھاتا رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے
 کے بعد اس نے کچھ ملازمت نہیں کی اور تصنیف و تالیف کے معاملے میں بالکل آزاد رہا۔

عالمی جنگ دوم کے دوران سارتر کو فرانسیسی فوج میں شامل ہونا پڑا تھا۔ کچھ دن جرمینوں کی قید میں
 رہا اور وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ چار دس آکر سر رتہ مڑھتی تحریک میں شامل ہو گیا۔
 جنگ کے بعد اس نے ایک ادبی اور سیاسی مجلہ Les Temps Modernes جاری کیا اور کمال دینی
 غور و ادب کے ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتا رہا۔ گرچہ رتہ نے بھی کمیونسٹ پارٹی میں
 شمولیت نہیں کی مگر محنت کشوں کی جدائی کے لیے اس نے ہار کی نظریات سے تعاون کیا اور کھل کر بھی
 کمیونزم کی حمایت نہیں کی۔

رتہ اتنی عظیم شخصیت تھی کہ اس کے بارے میں محققان لکھنے کے لیے بھی ایک کتاب دیکار ہوئی۔
 سارتر نے پچاس سے زائد کتابیں تصنیف کی تھیں جن پر ان کا فرانس کو مانا ہے۔ فرانس میں سارتر کی عظمت
 کا ثبوت یہ ہے کہ جب اس کو کسی مقدمے میں عز ہوئی تو فرانس کے صدر چارلس ڈیگال نے یہ کہہ کر کہ
 ”سارتر فرانس ہے اور ہم فرانس“ رتہ نہیں کر سکتے“ اس کی رتہ دہی کے حکم کو کالعدم کر دیا تھا۔

سارتر نے 1980 میں انتقال کیا۔



یورگوس سیفیریسؒ

امیرانی کمال۔ اس کی پہلی تہذیب سے ہمدردی اور اس سے حاکم ممتاز خدائی تحریر کے لیے۔

یورگوس سیفیریس کا شعری انداز چہ بہت نیا وہ نہیں مگر اس کے تخیل، اسلوب اور حسن زبان کی انفرادیت کی وجہ سے اس کی شاعری ایک ایسی دیر پا علامت کی مانند ہے جو پہلی (قدیم یونانی تہذیب) انداز حیات کے لیے امر ہوئی ہے۔ یونان کے مشہور شعرا Pansamas اور Sakelanos کے انتقال کے بعد یورگوس سیفیریس ہی پہلی شاعری کا نمائندہ و حیات یافتہ جو ان کے نمائندگی و سٹے کا نظم بندی راہ پر ایک سربراہ اور وہ قوی شخصیت بنا جس کی شاعری کے ترجم مختلف زبانوں میں سے تھے۔ سوئڈن میں سیفیریس کی شاعری کا تعارف 1950 میں Hjalmar Gulberg کے سوئڈش زبان میں ہے جو نئے ترجموں کے ذریعے ہوا جن میں سیفیریس کی مشہور نظم The King of Asme بھی شامل تھی۔ اس نظم سے سوئڈن و لوں کی دل کشی اس وجہ سے زیادہ تھی کہ اس نظم کے مضمون کا سلسلہ سوئڈن کے آثار قدیمہ کے ان ماہرین سے ملتا تھا جنہوں نے کھدائی میں تعادلی کیا تھا۔

سیفیریس کی شاعری کا مطالعہ قاری کو قدم قدم پر یہ یاد دلاتا ہے کہ یونان صرف ایک جزیرہ نہ تھا بلکہ، چھٹا اڑتے ہوئے پانی کی ایک دنیا ہے جس میں بیزاروں جزیرے بکھرے ہوئے ہیں جو ایک قدیم سمندری سمٹت اور جھڑت سے سمیٹے ہوئے ہیں۔ سیفیریس کی شاعری کا اس سطر یونان

ہے جو اپنے تمام چاہ و چاہال کے ساتھ اس کے حروف کے رپٹے رپٹے میں چومت ہے۔ سفیر میں قن فی اور کنایاتی انداز میں بڑی بڑی زبان کے وسیع یہ سب کمال ملتا ہے۔ یہ کہنا اتنا درست ہے کہ پتھروں کے مردہ جنگ مرمر کے ٹکڑوں اور مستحضر تے ہوئے خاموش ٹکڑوں کے مابین دلوں کی قریبی فی سفیر میں سے بہتر کسی نے بھی نہیں کی۔ اس کی تمثیل آمیز نقیوں میں ٹکڑے دم کے جنگ اور قادات کے ساتھ ساتھ قدیم یونانی اسامیوں کی شخصیات بھی نظر آتی ہیں۔

بہ اوقات سفیر میں کی شاعری ناقابل توشیح معلوم ہوتی ہے، خصوصاً اس لیے کہ وہ اپنے باطن کے پردوں کو بٹانے سے گریز کرتا ہے اور خود گم مافی کے معنی میں چرے کے پیچھے رہنا پسند کرتا ہے۔ وہ کبھی کبھی ایک قسم کے Odysseus میں اپنے مولد Smyrna کے سی طرح کے خد و خال کے ذریعے اپنی تخیلیں اور اپنے غموں کا اظہار کرتا ہے۔ مگر اس کی شاعری کو آواز میں یونانی تاریخ کی باتیں، اس کے لوٹے پھوٹے جہازوں اور ان کی نجات، ان کے آفات و ران کے بہاؤوں کے کاموں کی گونج مانی دیتی ہے۔ تنہا کے اعتبار سے سفیر میں نے ایبٹ سے سب فیض کیا ہے مگر بد شہر لچھ اس کا اہل ہے جس میں قدیم یونانی گیتوں کی تہہ بھر پائی ہوئی ہم ٹوا سو بیتی سنائی دیتی ہے۔

سفیر میں نے ایک بار اپنے باپ سے مل کر کہا تھا، "میں ایک ایک اصلوکی اور کھڑائی ہوں جو میں ہم سے ایک ہی بات کو بار بار کہتے ہوئے نہیں سمجھتا۔" اس بات میں کچھ صداقت ضرور ہے مگر ہمیں یہ بھی د رکھنا چاہیے کہ شاعر جس نظام کی مرسل چاہتا ہے اس کو اس کی نسل کی فائش سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ ہر قدم پر اس کا چلی اس قدیم یونانی تہذیب سے پا اپنے ماں ہے جوئی اور قاش نسل کو دے کر ملی ہے۔

یورگوئس سفیر جس کا اصل نام Georgios Seferis تھا Izmir میں جس کا پرانا نام اسمیرنا تھا (جواب ترکی کا حصہ ہے) 1900 میں ایک وکیل کے گھر پیدا ہوا۔ ماں تیرا وی شہر ہے جس میں ایک مذہب کے مطابق ہومر (Homer) پیدا ہوا تھا اور یہی بات سفیر جس کی شاعری کے لیے خصوصاً دعوہان کا باعث ہوئی۔ سفیر جس نے چھ دو برس کی عمر ہی سے نظمیں لکھنے شروع کر دی تھیں۔ اس کے خاندان نے 1914 میں یونان کے مائیکوٹ تختہ کی طرف کوچ کیا اور وہیں سے نے تعلیم پائی۔

سفیر جس نے جہیں کی سولہ دن یونان میں قانون کی تعلیم بھی حاصل کی اور 1924 میں ڈاکٹریت کیا ڈگری لی۔ اس دوران وہ شاعری بھی کرتا رہا اور ہم عصر فریسی زبان کے مطالعے سے کسب فیض بھی کیا۔ جب اسمیرنا پر ترکوں کا قبضہ ہوا تو سفیر جس نے خود کو جیسا وطن تصور کرتے ہوئے یونان کی سٹاف کی خدمت میں شامل ہونے کا قصد کیا اور مگر یونانی زبان میں کامل دسترس کے لیے لندن پہنچا۔ تعلیم کے بعد اس کو یونان کی وزارت خارجہ میں ملازمت مل گئی اور اس طرح اس نے لندن اور البانیہ کے یونانی سفارت خانوں میں فرائض نبھائے۔ لندن کے قیام کے دوران سفیر جس اہلیت کی شاعری سے بھی حفاط ہوا جس کا اسلوب اس پر بہت اثر انداز ہوا۔

سیفیرئس کا پہلا شعری مجموعہ (The Turning Point) Strof 1931 میں شائع ہوا۔ اس میں سیفیرئس نے بالادادہ اس دور کے مروجہ انداز نگار سے روگردانی کی اور ملاستی انداز اپنایا جو اس کے دوسرے مجموعے Sema (1932) میں بھی نظر آتا ہے۔ شاعر، مفکرمند نگار اور شاعر سیفیرئس دوسری عالمی جنگ سے قبل کے نوائے کا پیمانی زبان کا فہمیت ممتاز اور نیاں شاعر مانا گیا ہے۔ اس نے نئی شاعری میں دوسرے کی زبان کو نئی شاعرانہ فضا دے کر آہنگ سے مٹا دیا ہے۔

پورٹھ سیفیرئس کی کل دو کتابیں شائع ہوئیں۔ اس نے 1970 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

مجھ کو اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں ایک زندہ و تھکا ہوا ہوں۔ سینڈش اکاؤٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ یہی زبان میں جو صدیوں سے مشہور رہا ہے مگر اپنی موجودہ حالت میں بہت بڑے علاقے پر محیط نہیں ہے، میری پوششیں اس عقیم انداز کی مستحق ہیں۔ یہ انداز میری زبان کو بڑے دشمنین پیش کر رہا ہے اور میں اس کے جواب میں ایک غیر ملکی زبان (فرنیسی) میں تشکر کا اظہار کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری معذرت کو قبول فرمائیں گے جو میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔

میرا تعلق ایک چھوٹے سے ملک سے ہے۔ پھر وہاں کے باشندوں پر چھٹی ہوئی ایک چھٹا چھٹی زمین سے، جس کے پاس تیار کے لیے اور کچھ نہیں سوائے اس کے باسیوں کی ہمتوں کے سمندر اور سورج کی روشنی کے۔ یہ ایک جھٹکا سا ملک ہے مگر اس کی روایت ہے پیدائش اور اس کی صدیوں سے، نسل بعد نسل، کم تر سمجھا گیا ہے۔ یہاں پیمانی زبان کا استعمال کبھی بھی بند نہیں ہوا۔ یہ ملکی تہذیبوں سے گزرا ہے، ہر نئی روح کو جس کا تجربہ ہوتا ہے مگر اس میں کبھی کوئی غلط نہیں پڑے۔ یہاں کی روایت کا طرفہ تیار انسان سے محبت ہے اور انصاف یہاں کا معمول رہا ہے۔ بے حد ملتی سے قریب کی بھائی راتی الیہ فامتنوں میں وہ ملتی جو اس نیرائی کا مرتکب ہوتا ہے، انصاف کے دینا Ennyes سے ملتا پاتا دکھایا جاتا ہے۔ اور انصاف کا یہی معنوں یہاں کی فطرت کی سطحی میں بھی جاری و ساری ہے۔

”ہینیوس اپنی اوقات سے باہر نہیں ہوگا“ Heracles کہتا ہے ”اور نہ انصاف کے وزیر Ennyes کو سب معلوم ہو جائے گا“ ایک جدید سائنس دان اس صحیح فی فلسفی کی کہوت پر غور کرے تو فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ میں یہ جان کر بہت متاثر ہو ہوں کہ پیمانی زبان میں انصاف کا شعور اس قدر مراعات کر رہا ہے کہ یہی

ماذی دنیا کا قانون بن گیا ہے۔ اس صدی کی بتائیں ہمارے ایک بزرگ نے ایک بار آؤ بھرتے ہوئے کہا تھا، ”ہم خسارے میں ہیں اس لیے کہ ہم نے انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔“ وہ ایک ان پڑھ آدمی تھا جس نے پینتیس برس کی عمر تک کھانا بھی نہیں سیکھا تھا۔ شرمناک رہے نہ ان کے بیان میں سینہ پھینک پڑتی ہوئی روایات اتنی ہی قدیم ہیں جتنی کہ تحریریہ اور لکھی کیفیت شاعری کی ہے۔ یہ بات میرے لیے معنی خیز ہے کہ سونڈن نہ صرف اس شاعری کو، بلکہ عمومی طور پر شاعری کو اعزاز بخشنا چاہ رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک بہت ہی چھوٹے بچے میں سے ظہور کر رہی ہے۔ میرے نزدیک شاعری ضرور ہے اس جدید دنیا کے لیے جس میں ہم سب خوف اور ہنگامے کے ناک کے ڈسے ہوئے ہیں۔ شاعری انسان کی سانسوں میں نہیں ہوتی ہے، اور کیا ہوگا اگر ہماری سانس مسلسل سے نہیں بلکہ ڈک ڈک کر آنے لگے؟ شاعری عطا کا عمل ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ ہماری بے چینی اعطاء میں کمی کی وجہ سے نہیں۔

پچھلے سال ہی میز کے اطراف یہ کہا گیا تھا کہ جدید سائنس کی دریافت اور ادب میں زمین آسمان کا فرق ہے، مگر جدید اور قدیم یونانی باہمیوں میں خلیف ہی سوا فرق ہے۔ حقیقت یہاں گلتا ہے کہ انسان کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔ میں یہاں یہ اضافہ کرتا ہوں گا کہ ہمیں انسان کی اس آواز پر کان دھرا چاہیے۔ جس کی ہم شاعری کا نام دیتے ہیں، وہ آواز جو بیان کی گئی کہ سب نیست و نابود ہوتی دکھائی دے رہی ہے، مگر جو بنو بیگانہ کی طرح ہمیشہ پھر سے پیدا ہو جاتی ہے۔ جب بھی اس کی خطرات لاحق ہوئے ہیں اس نے پناہ ڈھونڈ لی ہے، اور جب اس کو مسترد کیا گیا ہے تو ہمیشہ اس نے جنگی طور پر کسی مٹی میں جڑ چکری ہے جس کو تو قلعہ کی نہ رہی ہو یہ دنیا کی ہڈی چھوٹی چھوٹی ہیں تیار نہیں کرتی، اس کی جڑ تو پوری دنیا کے سناٹوں کے دلوں میں ہے۔ یہ ذات کے بھنور سے نکل جانے کا طریقہ جانتی ہے۔ سونڈن اکادمی اس ادراک کے لیے واجب تھا، دشمنین ہے کہ وہ دنیا میں جن کا حلقہ اثر محدود ہے ایسی دنیا میں نہ بن جائیں کہ انسان کے دل کی دھڑکن کا دم گھٹنے لگے، اور شے کے قلوب کے مطابق۔

to judge with solemn truth life's ill-appointed lot

الفریڈ ٹوبس، شیعہ سے بہت متاثر تھا جس کے نزدیک دل کا چاہ جلال نامی یہ تھوڑی سی بات کہ ہے۔
 ہماری آہستہ آہستہ سکرتی ہوئی دیانتی ہر ایک کو دوسروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم کو آدمی کی تلاش میں رہنا چاہیے خواہ وہ کبھی سے ملے۔ جب یونانی دیوتا کے عقلمند ’سفرنگ‘ (Sphinx) نے حسب معمول Thebes کی وادی سے گزرتے ہوئے لڑکی کی بات سے اپنی ٹھیک کا جواب پوچھا تھا تو ’ایڈیپس‘ نے جواب میں صرف ایک لفظ کہا تھا ”انسان“ اور اس جواب ہی نے عقلمند نے نہایت مزاحمت کو مجسم کر دیا تھا۔ ہمیں بھی بہت سارے عقلمندوں کو مجسم کرنا ہے تو آئیے ہم ایڈیپس کے جواب پر تنقید کی سے غور کریں۔

خطبہ

کچھ جدید یونانی روایت کے بارے میں

ایک شاعر جو مجھ کو جان سے عزیز ہے، انزلیس ٹن، وائی بی یٹس (V B Yeats) نے، جس کو 1923 کا ادب کا نوبل انعام دیا گیا تھا، اسٹاک ہوم سے واپسی پر اپنے سفر کے تاثرات پر مبنی ایک مضمون The Bounty of Sweden تحریر کیا تھا۔ جب سویڈش اکادمی نے مجھے اتنے بڑے اعزاز کے لیے منتخب کیا تو چونکہ مجھے اس مضمون کا خیال آگیا۔ The Bounty of Sweden، میرے نزدیک کافی پرانا مضمون ہے اور اس کے بنیادی تصورات میں توسیع ہوئی ہے۔ اس علم کے بعد کہ آپ نے اس انعام کی شکل میں میرے ملک کو بڑی عقیدت پیش کیا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی یونانی ان بھلائیوں کو فراموش کر سکے گا جو سویڈن نے ہمارے ملک کے ساتھ کی ہیں، جذبہ ایمان سے، عہد سے، بے عیب و بے نوٹ انسانیت کے ساتھ، خواہ وہ اس میں آپ کے ماریونٹ کا رقصہ پر کے ذریعے کی غلطیوں پر جنگ کے زمانہ میں اس کے کارکنوں کے ہاتھوں میں بہت سے دوسرے مظاہر یک جہتی سے صرف نظر کر رہا ہوں جو صاف ہی میں میری نظر سے گزر رہے ہیں۔

جب آپ کے باپ، ویرت، تاب ٹمٹف ایڈولف ششم نے نوبل انعام کا فیصلہ ہمارے مجھے نصیب کیا تو میں اس وقت کو جب باقی کیفیت میں یاد کیے بغیر نہ رہ سکا جب وہ وہ فی عہد کی حیثیت میں یہ نقشہ نہیں Asine کے Acropolis کی کھدائی کے دوران شریک تھے۔ جب میں Axel Persson سے ملے، جس نے اسی مقدمہ کے رقصہ پر کی تلاش میں کھدائی کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا، تو میں نے اس کو گاؤں قادر بہت شروع کر دیا تھا، گاؤں اور اس لیے کرایا میں نے میری شاعری کو ایک نظم عطا کی تھی۔

Missolonghi کے وسط شہر میں سب سے غارت خانے میں ایک بڑا دگا رسوینڈن کے ان لوگوں کے نام منسوب کی گئی ہے جنہوں نے یونان کو جدید جدوجہد آزادی میں اپنے جانی قربان کر دی تھیں۔ ان لوگوں کے لیے ہمارا تھنکس اس سب سے غارت خانے کے لیے لیا وہ محکم ہے۔

پچھلی صدی کی ابتدا میں ایک شام، یونانی جریرے Zana کی ایک گلی میں Dionysos نے Solomos نے ایک ضعیف العرقہ کو ایک سرائے کے دروازے کے برابر ایک مشہور داستان گیت گاتے سنا جو پڑھتے میں حضرت عیسیٰ کے ہن کی قہقہے کے بارے میں تھا۔ فقیر نے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا تھا۔

(حضرت) ہمیں کے حرکات و سکنات میں
وہاں کوئی اور آگ نہیں مل سکتی،
جہاں متحرک روشنی چمکے

ہم نے سنا ہے کہ Solomon پر یہ صدیقی گریسا دلوں میں رہی ہوا کہ وہ سرائے میں دخل دیا اور
اس نے تمام حاضرین کے لیے طہارت شراب کا حکم دے دیا۔ میرے لیے یہ پختہ بہت اہم ہے میں نے
ہمیشہ اس کو شمری و طرف سے ایک بدعتی شخص تصور کیا ہے جو ہمارے لوگوں کے جذبات کو اس مقام تک
سے لے کر آگے جہاں سے جہاں کی چٹان کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔

یہ مدت ایک ایسے طویل ارتقا کا ٹکڑا ہے جو ابھی تک تکمیل نہیں پہنچا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ
میں آپ سے کچھ ایسے لوگوں کے بارے میں بات کر دوں جو چٹان کی جدوجہد آرزوئی میں اس وقت سے
بہت اہم رہے ہیں جب سے ہم نے آزادی کی سو میں رائیں بنا شروع کی ہیں۔ محاف کیجیے گا، اگر میرا
بیان سرسری ہوا اس لیے کہ میں آپ کے صبر پر زور دے رہا ہوں جس سے لانا چاہتا۔

تاریخ مشکلات اسکندریہ کی لوگوں سے شروع ہوئیں، جنہوں نے انکی (چٹان کے شہر Atac کی
زبان۔ مترجم) کلاسیک کی چکا چلد میں اس بات کی تصدیق کی کہ وہ میں یہ صحیح ہے اور یہ صحیح نہیں ہے،
اور یہ مطلق میں انہوں نے تخلیق زبان (Purism) کے درجے میں شروع کیے۔ انہوں نے اس بات پر
توجہ نہیں دی کہ زبان ایک نندہ امیاتی جسم کے متراخ ہوتی ہے، اور یہ کہ کوئی شے جس کے ارتقا کو روک
نہیں سکتی۔ ان لوگوں کو خاطر خواہ کامیابیوں ہوئیں اور انہوں نے تخلیق پسندوں (جامع زبان استعمال
کرنے والوں) کی نسل کے بعد نہیں پیدا کیے جو ابھی تک باقی ہیں۔ یہ لوگ تاریخی زبان کی روایت کی پیروی
میں سے ایک کی عادی روایات کی، نماندگی کہتے ہیں جن میں بھی خلا نہیں پڑا ہے۔

دوسری طرف جس کو ہمیشہ قاطعاً سمجھا گیا ہے، سو قیود، جو مہندس زبانیت سے عبارت
ہے۔ یہ کہانوں کی بھی تدوین سے وراہ کی چٹی تحریر کی وجہ روایت ہیں۔ میں اس دن بہت متاثر ہوا تھا
جب مجھے ایک مرنے والے کا اپنے دل کو لکھا ہوا خط پڑھنے کو ملنا جو دوسری صدی میں ایک آبی پردہ (Papyrus)
کے ڈھکھل سے بنے ہوئے کاغذ پر محفوظ تھا۔ اس کی واقعیت اور زبان کی وجہ سے مجھ کو تحیر کر دیا اور میں
اس کو پڑھ کر مضمون تھا کہ کئی صدیوں تک جذبہ حسامیت سے پورا ایک خزانہ، بیکار سے خرید رہ گیا، تخلیق
نہان اور مرنے والے زبان کی ہار پیوں کے کفن میں سسٹا، گھٹا رہ گیا۔ جیسے کہ آپ کو علم ہے کہ Gospel
(خریف شدہ انجیل۔ مترجم) بھی اس زمانے کی مقبول عام زبان میں تحریر کی گئی تھی۔ اگر کوئی حضرت عیسیٰ
کے حواریوں کی بات فورا کرے جس کی خواہش تھی کہ عوام الناس کو سمجھیں اور ان کی تعریف کریں، تو وہ
شدید بضراب کی کیفیت میں انسان کی ان گریہوں کی سے دوچار ہوگا جنہوں نے صدی کی ابتدا میں
تختہ میں بنگلے کی صورت اختیار کر لی تھی جب مگاسپل کا ٹیڑھہ کیا گیا تھا جس کو آج بھی حضرت عیسیٰ

کے ارشادات کے غیر قانونی ترجمے کے نام سے ہی یاد کیا جا رہا ہے۔

عمر میں ڈرامے آگے آگے چل رہا ہوں۔ بیان کی ذرا ذہنی سہولت کے زوال تک (منہجہ بالا) دونوں ادبیں ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ ایک طرف تو ذہنی عالم اور مادی دنیا دونوں سے راستہ تختیں حضرات تھے۔ دوسری جانب عام آدمی تھے جو ان کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے، ظاہر ہے کہ ان کا ہونا الگ طریقہ انگہار تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ بازنطینی دور میں ان دونوں سیروں کے درمیان کبھی مناسبت ہوتی تھی۔
۲۔ مائٹی کیفیات تھیں، جو اس دور کی رنگ آمیز اسٹرکاریوں اور پٹی کاریوں میں نظر آتی ہے، جو پھر کاروں کے دیپٹس سسٹم کے اختتام سے قبل ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں شاہی اور عوامی فن کاریوں کے اتصال سے ایک شاہی تاریکیاں لوہور ہی تھیں۔

تاہم، اپنے زوال سے قبل قسطنطنیہ ایک عجیب و غریب سے گزرا تھا۔ انڈرل چپ اس پر قبضہ ہو گیا تو پوری قوم پر یک طرفہ کی متحد ہو گئی تھی جس کے ذرات صدیوں تک قائم رہے۔ اس زمانے میں بہت سے ہمارے جی بھولے شاہراہ اپنے بازوؤں کی چٹاؤں کی ناکہ سے پھرے ہوئے بخاری بحر کم مرجان بنے، مشرق کے طرف چل پڑے تاکہ وہاں اس تکلیف کو کے سچ پر نہیں جس کو نسا، شامیہ کے نام سے پکارا گیا ہے۔ مگر یہاں نسا، شامیہ، سے میرا مطلب ان اتحاد کے لغوی معنی ہیں، جن سے قرون وسطیٰ سے نئے دور کی جانب، یہی نقاب نکاتی ہے، اسکی بناؤ الٹا ہے بیان میں نہیں ہوتی، سوائے کچھ مخصوص جزیروں کے، جن میں قابل ذکر Crete ہے، جو اس وقت وینس (اٹالیہ) کے حکمرانوں کے زیرِ قیام تھا۔ وہاں سولہویں صدی کے جس پاس ایک نوٹ کی شاعری اور نظمیہ نامے کی تیار ہوئی، اسکی پڑھکوہ زبان میں ہوتی جس کو اپنی نسبت کے بارے میں پورا یقین تھا۔ اسی دور میں مصوری کے کئی اہم مکاتب ابھر رہے تھے۔ اسی صدی کے درمیان کریمت کا تقسیم مصور Domenico Theotocopoulos پیدا ہوا اور اس نے کریمت ہی میں پرورش پائی، جو بعد میں El Greco کے نام سے مشہور ہوا۔ یہاں یوں کے نزدیک قسطنطنیہ کے زوال سے کبھی زیادہ تکلیف زدہ کریمت کا زوال تھا۔

۱۲۰۴ء میں صلیبی جنگجوؤں کے ہاتھوں قسطنطنیہ کا زوال ہوا، جو ایک نیا ہوا ہی تھا۔ اس کے برعکس کریمت قوتِ حیات سے برہنہ تھا، اور وہی ذہن، عقیدے اور مذہب کے آمیزے میں ہی ہوا ذہن، اس یونانی جزیرے کے حال پر غور نہیں ہوگا جس کو خیر نہیں کہ یہاں کے لوگ پتی قیہ، یوپر، ہمیشہ کمر بستہ رہتے ہیں، خواہ تاریخ کے جھگڑا بار اس کو جانے کوشش ہی نہیں نہ کریں۔ اس مقام پر ہم شاعر KAVOS کو یاد آتا ہے جس نے سپر سڈ Latayerie کو "God and our Despair" جیسے بلند مصرعہ کہہ بھیجی تھی۔

کسی بھی سطح پر ہو، کریمت سترہویں صدی کے وسط سے ہی زوال پذیر ہونے لگا تھا۔ اس وقت کریمت کے بہت سے باشندے Ionian جزیروں میں اور یونان کے دوسرے علاقوں میں پناہ کے طلب گار ہوئے۔ وہ اپنے ساتھ اپنی نظمیں بھی لائے جو ان کو نابالی یاد نہیں اور جن کو ان کے سچے ماحول نے قبول بھی

کر دیا۔ کئی نسوں تک عونی گیتوں میں شیر و شکر ان غزلوں کو یونان کی سرزمین کے دانشمندیوں نے اپنے امرا پھر کے ساتھ محفوظ رکھا۔ ان میں سے کچھ کے نو بہت پرستوں کے در سے بھی تعلق رکھنے کے ثبوت ملتے ہیں، کچھ حیرت آنے والی صدیوں کے دوران افریقا جیسے کر Digenis Acreas کے دور میں ہوا تھا جو بازنطینی عہد کی دین تھا۔ یہ سب واقعات ہمیں اس بات کا اندازہ کرنے میں مدد دیتے ہیں کہ ہر دور میں، کام، ذہن، خوشی، محبت اور موت وغیرہ کی صورت میں، بغیر کسی تہذیبی مکہ ایک ہی قسم کے روپے قائم رہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ان کا طریقہ اظہار اتنا تازہ، اتنا نواور اتنا نیت سے ملبوس ہوتا ہے کہ ہم وہابی غور پر محسوس کرنے جیتے ہیں کہ یونان کی مٹا ہمیشہ اپنے آپ سے نکلتی رہی ہے۔ اس نے ابھی تک آپ کے سامنے مثالیں دینے سے پرہیز کیا ہے، مگر میں اپنے ہنگامہ ترجمہ کرنے والوں کا جس قدر بھی شک نہیں ہوتا، کم ہے کہ ان کی جگہ سے آپ مجھ سے واقف ہوئے ہیں۔ جب بھی میں اپنی زبان سے کسی اور زبان میں، جو میری پتی زبان نہیں، ترجمہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو مجھے ایک قسم کی تکلیف دہ مٹی کا احساس ہوتا ہے۔ اس اعتراض کے ساتھ میں اپنی ایک مختصر سی نظم کا ترجمہ پیش کرتا چاہتا ہوں جو ایک چاہے جانے والی کی موت سے تعلق ہے:

تیرے شعلہ ہی کی خاطر
میں نے تم کو محاکات کھے

ایک طرف پہاڑ پہ سورت، میدانوں پہ عتاب
ور سنیٹوں پر رکھی ہے تازہ بولے شال
سورت لادب گیا ہے دیکھ عتاب بھی خواب میں ہے
مرا رہے مہینے ساتھ لے گئی ہے تازہ دال شال
مٹروں نے سوچ پوچھ اور تم کو روٹی بیا
میں نے تم کو دیا ہے نظم کا پیکا پیکا نقش
یونانی میں دیکھو گے تم، جس کا چمکا روپ

یہاں جدھر یونان سے پسے کے قتل کی کہل؟ سان فلان میں یونان کیسے گئے ہیں۔ یہ وہی دہش ہے جو آؤ مٹنے کی سرے کے سامنے مانگنے والے ضعیف بھکاری نے اس شام Dionysios Solomos کو ترکے میں لے لیا تھا۔ جب بھی مجھے اس بھکاری کا خیال آتا ہے، میرے ذہن میں وہی منقہ، بحر آتا ہے، اور یہ خیال بھی سرور ہم کو کیا دے گیا ہے۔

جدھر یونان کی تاریخ میں حیرت ماک واقعات اور چہروں کی کون کی نہیں۔ یہ نیا دور فطری ہوتا اور کسی ملک کی شاعری کی ضروریات، مثال کے طور پر، اس کے مذہبوں، کسانوں اور سپاہیوں کے ہر دمے اور مرادہ قسم کے گیتوں سے ہوتی۔ مگر ہوا اس کے بالکل برعکس۔ شروعات ہوتی ہے ’نامتے‘ میں پیدا ہونے

و لے چکے آؤں سے جو کئی مہیب آجیب کے زیر اثر تھا۔ اس زمانے میں Ionian جزائر کی تہذیب کا معیار یونان کے مقابلے میں بہت بلند تھا۔ سولویوس نے اٹلی میں تعلیم پائی تھی۔ وہ ایک عظیم یورپی تھا اور اپنے ملک کی شاعری کے مسائل سے چوڑی طرح آگاہ تھا۔ وہ اٹلی میں وہ رہی تھی ترقی کر سکتا تھا۔ اس نے اٹالوی زبان میں بھی شاعری کی تھی اور اس کی بہت افہامی میں بھی کوئی کمی نہیں ہوئی تھی مگر اس نے اپنے لیے ایک نیک گلی کا انتخاب کیا اور یونان میں ہی کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ سولویوس کو یونان کی نظموں کا مطالعہ جو کمرے کے چارہ زین اپنے ساتھ لائے تھے۔ وہ عوامی زبان کا پر جوش حامی اور تخلیق ساز زبان کا دشمن تھا۔ اس موضوع پر اس کے نظریات Dialogue Between the Poet and Pedant Scholar میں مندرجہ ہیں۔ مگر اس میں سے کچھ جملے نقل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ ”کیا میرے ذہن میں کچھ اور بھی ہے“ وہ دیکھ کر کہتا ہے ”پتھر آؤں اور زبان کے“ ایک ہر پتھر معوامی زبان کے آگے سرخم کردہ اور رستم زبان کی وقت و رہو اس کو فتح کر ڈا“ اس نے ان لوحات کا بیڑہ بچھا اور اس نے اسے تاریک کے ذریعے ایک عظیم یونانی فن کر خیر۔ بدعہ سولویوس ہی ”من بات آؤں“ کا خالق ہے جس کے بدلتی نگرے ہمارے قومی ترانے کا حصہ ہیں، وہ دوسری نظموں کا بھی جن کو کچھ مدنی میں مستحق کے ساتھ نہ سے بچانے پر گایا جاتا رہا ہے۔ مگر صرف ان کی وجوہات کی بنا پر اس کا ورثہ ہمارے لیے پیش کیا ہے کہ اس نے، جہاں تک اس کی عمر نے ساتھ لیا، ان راستوں کا تعین کرنا جن پر یونانی طرز نگہ چھینا جاتا تھا۔ اس نے زبان و نثر سے محبت کی اور تمام عمر اس کے معیار کو شاعری کے دُجے تک لے جانے میں مصروف رہا، جس کا اس نے خوب رکھا تھا۔ یہ کوشش کسی واحد انسان کی استطاعت سے بڑھ کر تھی۔ مثال کے طور پر The Free Besieged میں کی عظیم نظموں میں سے ایک ہے جو Messolonghi شہر کے لوگوں کے محاصرے اور ان کے سب سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ کچھ روبرو ہی کیا سے ہیں اس الماس کے چہرہ کا رن گرائے ساتھ شہر میں لے گیا ہے۔ اس عظیم شخص کی جدوجہد نفاذ کے لیے ہمارے پاس سوائے کچھ ریڑوں کے اور کچھ فانی جگہوں کے در کچھ نہیں رہ گیا ہے، جو ہمیشہ ایک ایسی کھنچی ہوئی کمان کی کیفیت میں ہوتا تھا جو کسی بھی لمحے ٹوٹ سکتی تھی۔ یونان کے ادیبوں کی کلی نسیبوں ان ریڑوں اور ان خانہ جگہوں سے جو نکلتی رہی ہیں۔ سولویوس 1857 میں انتقال کر گیا۔ 1927 عیسوی میں اس کی تحریر Woman of Zema جہاں بدشائع ہوئی جس کے باعث طرکاری میں بھی اس کو ایک بلند مقام ملا، اس قسم کا مقصد عجیب کردہ شاعری میں حاصل کر چکا تھا۔ یہ ایک پُرکھوہ تخلیق ہے جو ہم سے ذہنوں پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ ایک معنی خیز انداز میں مقصوم کا یہ فیصلہ تھا کہ سولویوس اپنے پیغمبر سے، انتقال کے مگر میں بعد انی نسلوں کے انصراب کا جواب فراہم کرے گا۔ وہ ہمیشہ سے ہی ایک غلبہ اولی رہا ہے۔

Andreas Karvos جو سولویوس کا ہم عصر تھا، یونانی ادب کے سب سے خبا کوگیں میں سے تھا۔

اس کی ایک تصویر بھی میسر نہیں۔ ایک ایسی کوئی شاعر Jgo Foscolo اس کا دست تھا مگر جدیدی اس سے بھی

کسی مسے پر الجھ مینھا۔ وہ ناسے جزم سے پر پیدا ہو تھا اور یہ سوں یونانی جزم سے Confused پر مشتمل رہا تھا۔ سولہویں سے اس کے سنی رابطے کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کا تمام کام میں اردو خانی نظموں کا ایک پتہ سا مجموعہ تھا جو اس وقت شائع ہوا جب اس کی عمر صرف تیس برس تھی۔ اپنے شہاب کے زمانے میں وہ اپنی سوکھو ریٹز اور نکلتا میں گھومتا پھرتا رہا۔ اس کا دماغ شہزادہ صمدی کے ہنری دور کے بلند خیالات، نیکیوں کے لیے وقف اور ظلم و امتیاد کی سخت مخالفت پر مبنی خیالات سے معمور تھا۔ اس کی شاعری ایک شہید قوم کے چاہ و بول سے مملو نظم کی حرکت پر پیدا ہے۔ بچپن ہی میں اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور اس نے اپنے ذاتی غم کو جو اس کے شعور کی گہری سوں میں چاڑھیں ہو گیا تھا، اپنے ملک کے غم کی طرح قبول کر لیا تھا۔ اس کی زبان ناممکن ہے، اس کے اشعار کے اوزان نوکھے ہیں، وہ ایک کھانگی مثالی زبان رکھتا تھا اور قبول اس کے "گرفتگی نظموں کی ایک رتی" کو گھنی سمجھتا تھا جنہیں نے سولہویں کو اتنا سمجھ دیا تھا۔ مگر خود اس کی تشبیہات ہی کے سنے حالت درجہ کے ہیں کہ وہ اس کی شاعری کو پچاڑتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ تعلیم کے لیے دلف، کارفرما، ایک عمر سے تھا رملی زمانے کے بعد اس نے اپنی جراثیم کو ہمیشہ کے لیے خیر و کبہ دیا۔ اس نے لندن میں دوبارہ شاعری کر لی اور اس کی بیوی نے انگلستان کے ایک قصبہ کی شہر میں گریس کے لیے ایک قلمی اسکی قائم کر لی۔ اس نے، یونان سے کوئی رابطہ قائم کیے بغیر وہیں اپنی زندگی کے آخری چھ برس گزار دیے۔

میں بنتی منی کی پرچھائیوں سے مڑتی اس علاقے کی زیارت کو گیا تھا جہاں ایک بوڑھے آدمی نے، جس کو اس عدالت سے یاد تھا، مجھ کو بتایا کہ اس نے ایک بدامنی کی عمر کی عورتوں سے کشش کو کھلی جو اس کے شاعر کی تھیں، جن کے دس بچے مائیں ستر کی یا وہ اور احترام سے برسر تھے۔ مگر میں ایک بار پھر، سیڈنہاس میں بیوی، یونان کی ایک دیرین ساطلی چٹان پر اپنے بڑے کو چھپاتے ہوئے ہے چہرہ آدمی کے تصور سے خود کو آزاد کرنے سے اپنے آپ کو قاصر پا رہا تھا۔ کا دوس کا سرا کا م غلطی لہجوں کی نہایت ہو گیا، بے شک اس کی زبان اس زمانے کے مزاج کے موافق نہ تھی اس لیے کہ اس زمانے کے تینتر میں لیر حقیقی اور دماغی غلطی کے دوسرے بہ رہے تھے۔ Kostas Patamas نے 1890 میں دوبارہ اس کی دریافت کی۔ اس عمر سے میں یونان چلتا کا رہو چکا تھا اور یہ وہی وقت تھا جب جدید یونان کی نئی قومیں اپنے راستے بنا رہی تھیں۔ ایک نئے زبان کی جدوجہد وسیع ہو رہی تھی۔ اس وقت مہائے بھی ہو رہے تھے مگر یہ ایک قدرتی عمل تھا۔ کئی برس سے جاری رہنے والی یہ جدوجہد ادب کی حدود سے پرے جا چکی تھی اور اب اس کے کردار اور اس کی خواہش میں نہایت حال کے بہ بہو کے لیے ناکار شامل ہو گئی تھی۔ یہ نہایت گرم جوشی سے عوام کی تعلیم کی طرف مڑ گئی۔ بنے بنائے خیالات رد کر دیے گئے۔ ہر ایک بھی چاہتا تھا کہ تمدن کے دہشت کو احتیاط سے محفوظ رکھا جائے مگر ساتھ ہی ساتھ عام انسان کے معاملات میں دلچسپیاں بڑھ گئیں تھیں، ہر کئی دوسرے کو موڑ کر دیکھا جاتا تھا۔ اور یہ کوئی موجودہ یونان کی شاعرت کے بارے میں فکر مند تھا۔

کالموں اور مکتوبوں کے ساتھ ساتھ اس صوبہ جہ میں حصہ لیا۔ اس دور میں یونان کی لوگ ریواہات پر اہم محتاجے شروع ہوئے اور وہی تہذیب کے مسلسل اور ترقی دہان کے حصول کا احساس پیدا ہوا۔

Kostas Palamas نے اس تحریک میں بڑا کردار ادا کیا۔ میں اس وقت نوخیز تھی کہ وہ میں تھا جب میں نے اس کی بارہا کو دیکھا تھا۔ ایک خطبہ دے رہا تھا۔ وہ ایک پختہ انداز میں تھا، جو اپنی آنکھوں کی گہرائی اور اپنی آواز میں گہری قدر اور تعاطی و صنف سے سننے والوں کو متاثر کر رہا تھا۔ اس کا کام بہت وسیع تھا اور یونان کی دینی زندگی کے شعروں پر چھایا رہا۔ اس نے شاعری کے۔ غنائی، رزمیاتی اور طنزیاتی۔ تمام شعبوں میں اپنا علم ادا کیا۔ سرحد کی ساتھ وہ ہر ما سب سے جمہوریت نگار تھی۔ غیر ملکی دپ کے بارے میں اس کی معلومات غیرت تھیں، اس نے ایک بار پھر بات کیا کہ یونان مسائل ایک چورہا ہے اور یہ بھی کہ یہ ریڈیویشن یا مائیکرون کے زمانے سے، بالخصوص اپنے بہترین عہدات میں، غیر ملکی اثرات و رجحانات کے لیے یہ کچھ بند نہیں رہا۔ Palamas کے لیے دشمنیاں مائیز تھیں، اکثر انہیں لوگوں میں سے جو اس کے نکالے ہوئے راستوں سے فیض یاب ہوئے تھے۔ میں اس کی عظمت کی اس حالت تصور کرتا ہوں جس کے سامنے اس پر تنقید کرنے کے لیے آتے ہیں۔ جب اس کا تنقید رہا، اس کا گویا یہ ضرورت کی طاقت تھی، تخلیق کار یونان کے ہزاروں برس میں واقع کی اور وہی موٹی، جو بہت چشتوں کو توڑ نکلی ہے۔ جب اپنی کسی چیز سے محروم ہو کر اب کرنے کے لیے چھوڑ جائے تو یہ نہیں کہتا چاہیے کہ بے ہوئے دھارے ساتھ میں صرف پھول نکالے جاسکتے ہیں۔ Palamas وہی تہذیب کے تمام اجزاء قدیم، بازنطینی اور جدید، سب سے بہت عجیبی طرح واقف تھا۔ اس کی روح میں ان کی اشیا کی ایک دنیا کا بھروسہ تھا۔ کسی دودھیا تھی، اس کی اپنی دنیا، جس کو اس نے بندھنوں سے آزاد کیا تھا۔ میں اس بات کی حمایت نہیں کروں گا کہ اس جہد کی افراط نے اس کو کبھی نقصان نہیں پہنچا۔ مگر وہ لوگ جو 1943 میں اس کی موت کے وقت اس کے نکالوت کے گرد جمع ہوئے تھے انہوں نے بھی وہی کچھ محسوس کیا تھا جو میں نے ابھی کہا ہے اور اس کے آخری دہار کے وقت وہ دیرری سے، قابلیں حاکموں کی آنکھوں کے سامنے، سب نے خود پہ خود ہر قومی قزاق، آغاوی کا محبت، کا شروع کر دیا تھا۔

Consantine Cavalry کا سارا کام 154 نظموں پر مشتمل ہے، جو Palamas کا ہم پند قطب سمجھا جاتا ہے۔ یہ ان مادر شاعروں میں سے ہے جس کے لفظ کی طاقت لوگوں کی محرک تھی، ہوتی، الفاظ کی بہتات بخالین کے لیے خطرہ پیدا کرتی ہے۔ وہ قدیم یونانی (Hellenic) تہذیب کا حصہ تھا جو عصر میں پھولی پھلی تھی اور اب ناممکن ہو رہی ہے۔ سوائے کچھ مختصہ غیر جانبداروں کے اس نے اپنی ساری عمر اپنی اپنے ولادت سکندریہ میں گزار دی۔ اس کا فن انکار سے اور اس کی نارنجی جس سے عبارت ہے۔ مارش سے یہاں میری مراد ماشی کے حالات و تعلیمات نہیں، بلکہ وہ تاریخ جو اس میں ہے، تندرہ ہے اور وہی موجودہ زندگی پر اس کے نام سے پر اور اس کے مقصد پر مسلسل روشنی ڈالی رہی ہے۔ میں Cavalry کا سوازنہ اسکندریہ

کے ساحلی علاقوں کے Proteus سے کہیں گا، جن ہومر کے خیال کے مطابق، تلسس کے ساتھ اپنی تخلیقات کے پیکر کو بدلتا رہا ہے۔ اس کا طریق حویلی فن کا نہیں تھا۔ جس پر Solomos اور Palamas چلتے رہے ہیں، بلکہ نام نہاد طریق تھا۔ جب کروڑوں نو جوانی گیتوں اور ہفتوں سے فیض حاصل کرتے رہے ہیں، یہ پلوتا رس کی طرف پلٹ کر دیکھتا پھر کسی قدیم زمانہ مچ لکھنے والے مؤرخ یا زمین کو کائنات ماننے والے یا منکندہ اعظم کے بعد عثمانی حکومت منجھائے والوں کی خوش فہمی کرتا۔ اس کی زبان میں یا ہواشت کا امیر تھی جو کسی نے اپنے بچپن میں اپنے خاندان کے (جو قسطنطنیہ کا ایک نہیں گھرا تھا) فرد کی زبان سے سنی تھی یا جو کچھ منکندہ یہی کہیں میں چیتے پھرتے اس کے کانوں میں پڑتی تھی اس لیے کہ وہ ایک شہر کا آدمی تھا۔ اس کیسے ملک اور پیسے نہانے پسند تھے جن کی سرحدوں کا تعین نہیں ہوا، جن میں شخصیات اور عقائد سرایت لحرکت ہوتے ہیں۔ اس کے بہت سے کردار ترقی کی طور پر بہت پرست ورتزونی پیرائی پر پھارے جلتے، حولی کے ہوتے ہیں۔ شامی، یونانی، آرمینیائی وغیرہ، جیسا کہ خود اس نے بیان کیا ہے۔ ایک دفعہ آپ اس کی شاعری سے آشنا ہو جائیں تو آپ خود سے یہ سوال کرنا شروع کر دیں گے کہ کیا یہ ہماری مدح کا مضمین میں پڑھیں رہا ہے، یا شاید دانش نے، چانک ہمارے حال کے وجود پر حسد کرنے کا فیصلہ تو نہیں کر لیا ہے۔ اس کی دنیا ہمدانی دنیا ہے جو ہمارے سامنے ایک جوانی ہوان کے جمل مدپ میں آتی ہے۔ اس کے دوست کی ایم فور غارتے مجھے بتا، کہ ایک راجب میں نے کہی، اس کے سامنے اس کی ایک نظم کا ترجمہ پڑھا تو Cavaty حیرت کے عالم میں چیخ اٹھا، ”تم سمجھتے ہو میرے پیارے فور غارتہ تم سمجھتے ہو۔“ خود شاید یہ بالکل بھولی ہی مینا تھا کہ اس کو سمجھنا کیسا گنا ہے۔

وقت بہت بدل چکا ہے، اور Cavaty کے بے شمار ترجمے ہو چکے ہیں اور ان پر تبصرے بھی۔ اس وقت میرے ذہن میں آپ کے سچے شاعر، مہینیات کے ماہر (Hellenist) اور نہایت مہربان ”انجمنی Hjalmar Gulberg کا خیال ابھر رہا ہے جنہوں نے مہینیات کو Cavaty سے متعارف کرایا تھا، گریوان کے تو کئی پہلو ہیں، اور سب کے سب تو واضح نہیں۔ میں Anghelos Bikellanos کے بارے میں بھی سوچ رہا ہوں۔ میں اسے کبھی طرح سے جانتا تھا، اور اس کی لاجواب آواز، جس میں وہ اپنی نفسیں پھنستا تھا، آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اس میں پچھلے دور کے مغرب کا سہ فکروہ تھا، مگر وہ غیر معمولی طور پر، ہماری زمین اور ہمارے کسانوں سے واقف تھا۔ بروقی اس سے پیدا کرتا تھا۔ سب اس کو پیار میں Anghelos پکارتے گویا وہ ہم جو لوہاں میں سے ہو۔ وہ چمکی غور پر چلتا تھا کہ نقاد اور تہذیب کے درمیان، انہی دیہاتی ملامت اور متبرک دنیا کے ساتھ جس میں وہ رہا ہے، اس طرح رشتے قائم کیے جاسکتے ہیں۔ اس میں کوئی دینا خلل کر گیا تھا، اپاؤ کی کوئی قوت، ”دیونسیا“ (شراب اور بامداری کا پانی دینا۔ مترجم) اور ”کمانسٹ“ (حضرت ہمینی)۔ کچھ عانی جنگ کے زمانہ ایک کمر کسی کی شب اس نے ایک نظم پر عنوان Dionysus in the Manger لکھی جس کی شروعات ہوتی ہے

My sweet child, my Dionysus and my Christ

کے مصرعے سے یہ دیکھ کر واقعی بہت حیرت ہوتی ہے کہ یوان میں ہمت پرستی کس طرح قدیم عیسائیت میں
 "میر" (آئینہ) بنی ہے۔ یوان میں تیار ہونی سب سے پہلی ایک لڑکا تھا جو مسیح پر چڑھا گیا تھا۔ Cavaty
 ہی، جو بہت شدت سے قیامت کے دن انسان کے اٹھانے جانے کا قائل تھا، وہ "وہی تھا جس نے لکھا تھا
 "Death is the only way"۔ اس کے نزدیک موت اور زندگی ایک ہی شے کے دو چہرے ہیں۔ میں جب
 بھی یوان سے ملتا ہوں اس سے متاثر ہوتا ہوں۔ ایک شام جب اس پر بے ہوش کا دورہ پڑ چکا تھا اور ہم سب پریشان
 ہو رہے تھے اس نے ہوش میں آتے ہی مجھ سے کہا "میں نے وہ مطلق ظلمت دیکھ لی ہے وہاں قائل بیان حد
 تک حسین تھی۔"

اب میں اس انسان کے ذکر کے ساتھ اس مختصر بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں، جو ہمیشہ ہم سب کو بچا رہا ہے، اس نے مشکل دنوں میں جب ساری امیدیں ٹوٹ چکی تھیں، میری بہت مدد کی ہے۔ خواہ میرے
 ملک میں بھی وہ تعداد تو تفریق کی بہترین مثال تھا۔ وہ دانش ور نہیں، شاعر دانش کو بھی تازہ کاری کی ضرورت
 پڑتی ہے، اس مردے کی طرح جس کو Lyases کی پکار کا جواب دینے سے پہلے تازہ خون درکار تھا۔ اس
 نے خود بتایا تھا کہ چونتیس برس کی عمر میں اس نے لکھنا اور پڑھنا سیکھا تھا تاکہ وہ آزاد کی جگہ کے
 دوران، جس میں اس نے عملی طور پر حصہ لیا تھا، جو کچھ دیکھا ہے اس کو محفوظ کر سکے۔ اس شخص کا نام
 Loannis Makryannis ہے۔ میں اس کا موازنہ اپنے ملک کے ان قدیم شعروں کے چٹروں سے کرتا
 ہوں جنہوں نے یہ عرصہ سے لکھنا پائی تھی کہ جو مجھے یقین ہے کہ وہی کوہستانی کی تعلیم دے سکتے
 ہیں۔ وہ خود بھی انسان ہی کے عرصہ سے بنا تھا، انسان کی کئی نسلوں کے عرصہ سے۔ وہ اٹھارہویں صدی
 کے اختتام کے قریب یوان کے شہر "میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے مجھے خود بتایا تھا، اس کی ماں کتنی مفلس
 تھی، وہ جنگل میں ایندھن کے لیے کڑیوں جن کر رہی تھی جب اس کو خود درہ ہو کر وہیں جنگل میں اس کی
 ولادت ہوئی تھی۔ وہ شاعر نہیں تھا شاعریت اس میں رچے بسے ہوئے تھے جیسے کہ عام انسانوں میں ہوتا
 ہے۔ ایک دفعہ ایک چھٹی فریسی، اس سے ملے آیا تھا، تو اس نے اس کو کھانے کی دعوت دی۔ اس نے مجھے
 بتایا کہ "میرا مہمان گھر سے کچھ گیت سننا چاہتا تھا، تو میں نے اس کے لیے خود کچھ گیت گھر لیے۔" اس نے
 اظہارِ رائے مندرجہ ذیل دیا تھا۔ اس کی تحریریں دیوار سے مشابہ ہوتی ہیں جس کی طرح طرح کے ایک ایک پتھر
 جوڑ کر بنایا گیا ہو۔ اس کے الفاظ پتا فریضہ بہ وجہ احسن آتا کرتے ہیں اور ان کی بھی جڑیں ہیں، بسا اوقات
 ان کی حرکت میں ہومر کی شاعری کا اسلوب ملتا ہے۔ جب اس سے نہادہ کسی اور انسان نے مجھے نظر نہایت
 سکھایا۔ وہ لفظی کے چھوٹے قصے کو پسند نہیں کرتا تھا۔ ایک دفعہ مجھے کے نام میں اس نے چلا کر کہا تھا،
 "تم لوگوں نے Comin کے قصے پر ایک نظریہ پرست لیا میرا مقرر کیا ہے۔ اس کا نام تھا Achilles، اور
 اس کا نام سننے ہی تم سمجھتے ہو گے کہ یہ ہی مشہور Achilles ہو گا پوری بھی کہ اس کا نام ہی جنگ کرے گا۔ مگر

کون نام بھی جنگ نہیں رہا، جنگ رقی ہے ہمت و فطاحت، اپنے ملک سے محبت اور ماحبت باہمی اور
 نکلی۔ "اپنے ملک کی قدیم وراثت سے اس کی محبت کا اندازہ ہو جاتا ہے جب اس نے ان سپاہیوں سے کہا
 ہو غیر ملکی دلوں کو روک دے اور سخت کرنے والے رہے، "مگر یہ لوگ تم کو دس تا دس تاہاں کی رٹ بھی دیں،
 تب بھی تم ان محسوس کو اپنی دھرتی پہنچانے نہ دینا۔ ان ہی کے لیے تو ہم نے جنگیں لڑی ہیں۔" اس کے
 پیش نظر کرجنگوں نے اس آدلی کے جسم پر بہت تکان چھوڑا ہے، اس کی زبان سے نکلے ہوئے ایسے الفاظ
 بہت وزن رکھتے ہیں۔ اس کی زندگی کے آخری دنوں میں اس کا مقصود دماغ ہو گیا تھا۔ اس کے زخموں
 نے اس کو بہت تشویش پہنچائی۔ اس کو اپنے کئی دلی گھٹن، قید میں رہا، دیا گیا، مقدمہ چلا اور وہ مجرم قرار دے
 دیا گیا۔ مادی کے عالم میں اس نے خدا کو غلطی میں لکھا "تم ہمارے بات نہیں سنتے، تم نظر اٹھا کر ہم کو نہیں
 دیکھتے۔" یہی اس کا نوجوان تھا۔ تھکن مدنی کے وسط میں Makryannis نے نکال دیا۔ ایک عرصے بعد اس
 کی ماقبالہ قسم پر دوست کے زخموں نے گئے اور 1907 میں ان کی شاعت ہوئی۔ سچے دلوں کو اس کے
 اصل مقصد قامت کے اندازے میں بہت سال لگ گئے۔

میں نے آپ سے ان لوگوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ جب سے میں نے سینڈن سے سفر شروع
 کیا ہے ان کی دیکھی میرا تعاقب کر رہی تھیں وہاں لیے بھی کر میرے ذہن میں ان کی ہمشوں کے تصور
 سے صدیوں سے بھرا ہوا ہے ایک جسم کا تصور ابھرتا ہے جس کی "خبر کا زنجیریں کوٹ گئی ہوں، جو دوبارہ
 زندہ پا گیا ہے اور وہ اپنی فحری مگرری کونوں رہا ہے، طرٹ کر رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ میری کیفیت
 نگار کی میں ہندوستان میں، حدیث میں۔ شاید میں نے بیان کیا بہت نیا دو آسان بنانے کے لیے اس کو توڑ کر
 دیا ہے۔ ذاتی معادلات کے بیان میں لاجی پابندیاں مجھے ہرگز نہیں بچا تیں۔ سچ چھپے لوگوں نے بہت سے
 نام چھوڑ دیے ہیں جیسے Damianos Korais اور Alexandros Papadiamantis مگر میری مجھوتی
 یہ ہے کہ مجھے بیان کے لیے ان کا انتخاب کرنا پڑے گا وہ میں اپنی بات کو کس طرح "کے" کر سکتا ہوں۔
 اپنی کتابوں کے لیے حضرت جوتی ہوں۔ ہر حال میں نے صرف کچھ قیاری شخصیتوں کی نشان دہی کر دی
 ہے۔ اور یہ بھی میں نے بتانا ممکن ہو سکا ہے، سادگی سے کیا ہے۔ ان لوگوں کے علاوہ اور کئی زمانے میں
 جس نے ان کو "گالک" کیا ہے، بے شک غلط لوگوں کی کئی نسلیں تھیں جنہوں نے اس طرز انکا کی طرح
 کہ جو یونان کا خاتمہ ہے، کثیر الجہات امکانات کی طرف مدد کرنے کی کوشش میں اپنی زندگی قربان کی ہے۔
 میں نے اپنی قوم کے تمام لوگوں سے، صرف بڑے مفکرین ہی سے نہیں، بلکہ ان سے بھی جن سے صرف نظر
 کیا گیا ہے، جو کتاب پر اس انہماک سے غما رہتے ہیں جیسے کوئی کسی مشہور شخصیت پر لیا ہو جاتا ہے، ان
 نوہا لوں سے ان کے گیتوں کی زبان میں، جو "خدا کی نعمت، ہم حاصل کرنے کے لیے"، اپنے گاؤں سے
 مکمل تک جانے کے لیے گھنٹوں پیچھے چلتے ہیں۔ ایک بار پھر اپنے دوست Makryannis کی طرف
 آتے ہوئے مجھے "میں" نہیں "ہم" کہنا چاہیے، کہ لیے کہ یہ سب کوئی اکیلا نہیں کر سکتا۔ میرے خیال میں

ایسی طرح ہوتا اچھا ہوگا۔ مجھے دیکھی ہی ایک بھتی کی ضرورت ہے اس لیے کہ جب میں خود بھی اپنے ملک کے لوگوں کی بات کی ٹیکوں اور زبانوں سمیت، اپنی طرح سمجھ نہیں داتا تو اتنی بڑی دنیا کے دوسرے لوگوں کو کیسے سمجھ سکتا ہوں۔

میں نے آپ سے بہت سے پرانے دیکھ کے بارے میں بات نہیں کی ہے۔ میں نے آپ کو تنکا نہیں دیا، مگر مجھے مزید چند لفظ کہنے ہیں۔ پندرہویں صدی کے تاریخی زمانے کے بعد سے یہ لوگ نوخیز انسانی کا ورثہ بن گئے ہیں۔ یہ اس تہذیب میں غم ہو گئے ہیں جس کو ہم یورپی تہذیب کہتے ہیں۔ ہمیں صبر ہے کہ کئی مہارتیں قومیں ہم کو یورپ والوں سے قریب لانے میں کوشاں ہیں۔ اس کے باوجود کچھ چیزیں ایسی ہیں جو بلا شرکت غیر سے ہماری میراث کا حصہ ہیں۔ جب سے میں نے ہومر کی تحقیقات میں یونانی زبان کے عام قسم کے الفاظ پڑھے ہیں، جن کو آج میں سوچ کی روشنی کہوں گا، مجھے ایک قسم کی بے تکلفی کا احساس ہوتا ہے، دانش کو شش سے نہیں لہہ جھوٹا رخ سے ابھرتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ لمحہ ہے جس کی سم آتی بہت دور دور تک قائم ہوتی ہے، بہت مختلف محسوس ہوتی ہے، جو کسی طرح سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ ہر حال، ہم اسی زبان پر لکھتے ہیں، جسے آپ چاہیں تو ایک تہذیبی تمدن زبان کہہ دیجیے، جس کا ارتقا کئی ہزار برسوں میں ہوا ہے مگر یہ ابھی تک خود سے وفادار ہے، کسی زبان سے جذبول کی وجہ سے اتنی ہی انسیت ہو جاتی ہے جتنی کہ اس کی طبیعت کی وجہ سے۔ مختلف انداز سے رزق ہوتی، اس زبان میں کارگزاریوں اور مختلف رویوں کے نقوش بار بار رچتے ہوئے ہم تک پہنچتے ہیں۔ یہ نقوش کبھی کبھی سرائی کو ایسے حیرت انگیز انداز میں سمجھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں جو دوسروں کے لیے ناقابل عمل معصوم ہوتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ ماضی ایک ہے، اس لیے کہ میں تعلیمی نظریات کو غربت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں مگر ہم لوگ ایک ہی ملک میں رہے ہیں اور ہم نے ان پہاڑوں کو سمندر کی جانب دھستے ہوئے دیکھا ہے۔ شاید میں نے "وحدت" کا لفظ اسی وضاحت کے بغیر استعمال کیا ہے کہ اس سے میری مراد "وحدت" نہیں۔ اس کے بغیر ہم کو عاقبت کو توڑنے کی صلاحیت دیتی ہے اور اس طرح اپنی قوت حیات کا ثبوت دیا کرتی ہے۔

میں نے آپ سے اپنی نسل کے بارے میں بات نہیں کی ہے، وہی نسل جس پر، شاید کے لوگ سے پندرہویں صدی کی ہجرت کے بعد دوہرے سمت بندی کا اخلاقی جو جو پڑ تھا، وہی جس نے یونان کی تاریخ میں ایک منفرد کیفیت دکھائی ہے یعنی یونان کی جانب آبادی کا آگیا بہانہ، چلی آبادی کا چنان میں دوہرے ارتکاز جو پسہ دنیا کے نسل پر مروج مرکز میں پھیلی ہوئی تھی۔

اور آخر میں، آپ سے میں اس نسل کی بات بھی نہیں کر رہا ہوں جو ہمارے بعد آئی ہے، جس کا بچپن، بزرگ شباب، بچپن جنگ کے زمانے میں، آپس میں لکھے ہوئے تھے۔ بلاشبہ اس کے مسائل بھی سنے ہیں اور نقطہ نظر بھی مختلف۔ یونان دور بہ دور صنعت کاری کے طرف بڑھ رہا ہے۔ قومیں ایک دوسرے سے

تویب ہوئی جاری ہیں۔ دنیا میں جبریلیا آرکی ہیں۔ حرمت تیز ہوئی جاری ہے۔ یہ نئی نسل کی خاصیت ہے۔ رُود پاتال کی سنگدلی گمنی ہے، خداداد وراثت کی ریت میں ہولناکیاں، طراف بکھری ہوئی کائنات میں صاب تو نائے کا تصور ہی بدل گیا ہے۔ یہ نئی نسل مغلوب اور بے چس ہے۔ میں اس کی مشکلات کو سمجھتا ہوں۔ مغزوہ ہم سے زیادہ مختلف تو نہیں ہے۔ ہماری آزادی کے ایک بڑے کارکن Rughas Pheraos نے ہم کو یہ سبق دیا ہے کہ ”آزاد خیالات اچھے خیالات ہوتے ہیں“ شکر سائنس سائنس سائنس تو ہمیں کھانسی لگا رہی ہے آپ کی Uppsala یونیورسٹی کے بچا تک کے آپ کی شہر پر کھنڈ یہ کہلاتا ہے۔

”آزاد خیالات اچھے ہوتے ہیں، منصفانہ خیالات بہتر ہوتے ہیں۔“
میں اب اپنے خطبے کے اختتام پر پہنچ گیا ہوں۔ میں آپ کے تحفے کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں اس بات کا بھی ممنون ہوں کہ مجلس کے مضمون ”The Bounty of Sweden“ نے انٹرنیٹ پر عسکر کے لیے نئی جہت دی ہے۔ یہ سب میں ”کچھ بھی نہیں“، اسی طرح جیسے یسوس نے عفریت Polyphemus کو حجاب دیتے ہوئے کہا تھا، ”میں نہیں، اس پر اسرار و حورے میں جس کو جان کہتے ہیں۔“



جارج ایشٹن ہیک

اعترافِ کمال۔ ہمدردانہ مزاج اور فائن سماجی شعور کے امتزاج سے ملبوس کی حقیقت پسندانہ اور پُرانگل تحریریں کے لیے۔

جارج ایشٹن ہیک 1935 تک تین ناول کوثر شائع کرچکا تھا مگر ان کے بارے میں کسی بھرے کچھ بھی نہیں لکھا۔ اس کی کتاب Torilla Flat سے اس کی شہرت کی ابتدا ہوئی۔ یہ کتاب امریکا میں بیسے ہوئے میکسیکو کے باشندوں کے بارے میں تھی۔ مصنف نے اپنے بیان کو گلیا میکسیکو کے گرم صحراؤں سے ایسا چٹ چٹا کیا تھا کہ قاری اظہارِ اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ مزید کہانیاں ہادی انشور میں King Arthur's Knights of the Round Table جیسے افراد کا خاکہ تھیں۔ کیا چاہا ہے کہ ان دنوں جب ریاست مائے حمیدہ امریکا کا معاشرہ شدید مایوسیوں کا شکار ہے ایشٹن ہیک کا ناول ایک تریاق، ایک نعمت کے مانند تھا۔ مسکناہٹ مگر چہ ایشٹن ہیک کی شخصیت کا حصہ تھی مگر اس نے صرف اس پہلے کے لیے کبھی کسی کا مذاق نہیں اڑایا۔ ہاں کبھی کبھی اس نے موضوعات ایسے چنے جو نہ صرف سنجیدہ بلکہ دنیا میں کمزور تھے۔ ایشٹن ہیک کے ناول Dubious Badge (1936) Cannery Row (1945) اور Sweet Thursday اس کے منفرد اور بظرف آمیز اسلوب کی اہل معانوں کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔

ایشٹن ہیک کے تو نام اسلوب کا ارتقا انہیں نہیں ہوا۔ اس کا ناول Of Mice and Men 1937

ایک شاہکار تھی جس کے بعد (1938) The Long Valley شائع ہوا اور پھر The Grapes of Wrath (1939) جس پر امریکی ایوانِ نمائندگان کے ایک رکن نے اس کو بھوت سے بھری اور ایک کج ذہن کی گندی تحریر سے تعبیر کیا تھا، مگر عجیب اور فوٹیل انداز میں اس کے وقت اسی مادل کو ایک عالی شان سرگزشت کے نام سے یاد کیا گیا۔

اسٹائن بک کا مادل (1962) Travels with Charley اس کے ایک مغربی داستان ہے جو اس نے ایک ماہِ مارچ گاڑی کے چھوٹے سے کیمپ میں اپنے کتے کے ہمراہ کیا تھا جہاں وہ دونوں مساج بھی تھے اور اٹھائے ایک بھٹا بھی پکاتا تھا۔ اس مادل کے مطالعے سے اسٹائن بک کے نادر اندازِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے جس کے ذریعے اس نے چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بھی اس طرح پیش کیا کہ وہ امریکا کے معاشرے پر ایک نئے پھرے کے ماتحت ہو گئیں۔ اس نے ویو ٹیکل مشینوں کے ذریعے جنگوں کی تاریخی پورے شہروں، نئی بستیوں اور بلند بالا عمارتوں کی تعمیر کو دیکھ کر کہا کہ "میں حیران ہوں کہ انڈینوں، متاثر ہونے والی برادریاں اور جی نگرانی ہے؟"

Sinclair Lewis سے لے کر Ernest Hemingway جیسے امریکی ادب کے عظیم لکھتے ہیں جس کے درمیان، جن کو فوٹیل قوم سے نوازا جا چکا ہے، اسٹائن بک نے اپنا ایک مقام بنایا ہے اور اپنی تخلیقیت کے ذریعے انہیں ہم سے اپنی انفرادیت کا وہ منوا رہا ہے۔ اسٹائن بک کی تحریروں میں ایک بے پناہ انداز کے مزاح کے نقوش ملتے ہیں جو کبھی کبھی اس کے کٹھن ورنیم پختہ انداز کی غرض کرتے ہیں مگر اس میں وقتی شک نہیں کہ اسٹائن بک اپنی ہی طور پر مظلوم، "مہیبت زدہ" اور مادیت کو گول کا طرفہ دیتے ہیں۔ اسٹائن بک کے ہاں ہم کو اس وقت کی عام امریکی سوچی کے انداز سے مختلف سوچی ملتی ہے، جب وہ دلہانہ طور پر کھیتوں، پھر زمینوں، پہاڑوں اور سمندر کے ساحلوں سے کبھی۔ ختم ہونے والے مظاہرِ قدرت سے فیض حاصل کرنا دیکھتی دیتا ہے۔

اسٹائن بک 1902 میں امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر سالیناس (Salinas) میں پیدا ہوا۔ اس کی زیادہ تر کہانیاں اسی علاقے کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ اسٹائن بک کا باپ مقامی حکومت میں ملازم تھا۔ اس نے مقامی ہائی اسکول میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

اسی تعلیم کے لیے 1920 سے 1926 تک اسٹینڈرڈ یونیورسٹی میں داخل ہوا مگر تعلیم مکمل نہ کر سکا۔ اس نے بہت کم عمری ہی سے ادب لکھنا شروع کر دیا تھا اور یونیورسٹی کے پچھلے میں نہ صرف کہانیاں بلکہ اس کی نظمیں بھی شائع ہونے لگی تھیں۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ تعلیم دہواری چھوڑنے کی وجہ کیا تھی مگر اس بات سے حالات کا ہجوم بھارہ ہو سکتا ہے کہ اس نے تعلیم کے ساتھ ساتھ مختلف نوعیت کی مزید دلچسپی کی، قلمی کام کیا، چٹکی دامن کی ادبی باغات میں پھل توڑنے کا بھی کام کیا۔

اسٹائن بک کی پچیس کے قریب تصانیف شائع ہوئیں اور اس نے 1958 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

میں سوینڈش، کارڈ کا شکر گزار ہوں کہ میں نے میرے کام کو سب سے بڑے عزاز کے قائل سمجھا۔
میرے ہاں میں اس بارے میں شبہ کبھی پیدا ہو سکتا ہے کہ بہت سے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں،
جن کی میں سب سے حد عزت و تکریم کرتا ہوں، مجھ کو اس انعام کے قائل کہیں سمجھ گیا ہے، مگر اس انعام کو
اپنے لیے حاصل کرنے پر مجھے فخر بھی ہے اور میں مسرور بھی ہوں۔

یہ ایک عام دستور ہے کہ انعام حاصل کرنے والا ادب کے عمومی رجحانات اور کیفیت پر اپنے ذاتی
خیالات کا ٹھہرا اور دانش ورانہ تصور دیتا ہے۔ مگر اس خاص موقع پر میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ میں
ادب تخلیق کرنے والوں کی اعلیٰ قدر و درجوں کے فرائض پر غور و فکر کی دعوت دوں۔

نوٹیل انعام شہرت میں اثنا بند ہے کہ اس مقام پر جہاں میں اس دولت یزدان ہوں، میں مجبور ہوں
کہ ایک مہینوں اور مہینوں کی مانند چوں چوں نہیں کر سکتا، بلکہ اپنے پیشے کے افتخار کے باعث، جس میں
بڑے، چھوٹے اور ذکی و نادانوں نے عرصہ دراز تک قابل فخر کام کیے ہیں، مجھے کسی شیر کی طرح گھسی گھسی کر کے
مراٹھا لکھا کر دینا چاہیے۔

ادب خالی کھیناؤں میں ہندو مت دعا نہیں گاتی ہوں، زردشت اور زرتشتی دیہانت کی طرف سے ماخذ
نہیں کیا گیا تھا، نہ ہی یہ خائف ہوں کہ منتخب، پیشگی نامنے والے لائبریریاں جیسے افراد کے لیے کوئی
کھانا تیار ہے۔

ادب تاریخی قدیم ہے جتنی کہ انسان کی قوت عقیدتی۔ یہ انسان کی ضروریات کے مطابق بننا رہا
ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے، سوائے اسی کے کہ اس کی ضروریات اور بڑھتی جا رہی ہیں۔

قدیم مادیاتی شاعر ہوں، گھینے ہوں و دہب ہوں، یہ سب الگ الگ اور مخصوص نہیں۔ نوٹ
انسانی نے نہ ذوق ہی سے ان کے فرائض، ان کے کام اور ان کی فہم قابل متعین کر سکتی ہیں۔

انسانیت ایک غیر وضع، منمن و متذبذب و پامندی کے دور سے گزرتی رہی ہے۔ میرے عظیم
پیشرو ولیم فاکنر نے اسی مقام سے تقریر کرتے ہوئے اس کیفیت کو آفاقی خوف کے ابلے کے نام سے
منسوب کیا تھا، جس کو اتنی دیر تک یہ داشت کیا گیا کہ جذبہ و احساس کا کوئی مسئلہ ہی نہیں رہ گیا تھا، لہذا
انسان اور اس کے چنے دل کے مابین جو تنازعات تھے بس وہی گھیننے کے قابل رہ گئے تھے۔

بہت سے لوگوں کے مقابلے میں ولیم فاکنر انسانی دل کی قوت اور اس کی کمزوریوں سے زیادہ

دلف تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ خوف کا صحیح ادماک اور اس کے حل کی تلاش ہی نکلنے والوں کے یک بڑے حصے کے وجود کا جو نہ تھی۔

یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اور پہلے تو تدبیر قسم تدبیر میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ہے۔ یہ دلی بہتری کی غرض سے نہ کہ ہماری بہت سی ضرر رساں خامیوں اور نا کامیوں کو افش کرنے کے ساتھ ساتھ ہم دے اندر کے اندھیروں اور خطرناک خوابوں کا دن کی روشنی میں لانے کا فرض سمجھا گیا ہے۔

مگر یہ بدقسمت اور بے گناہ انسان کے قلب اور روح کی عظمت اور طاقت شہد و علامتوں کے اظہار کا اور جین ممانے کا اختیار رسوا ہو گیا ہے: شکست کے موقع پر فضا جنت کے لیے، ہمت کے لیے، محبت اور ہمدردی کے لیے۔ کمزوری اور بے ہمتی کے خلاف نہ ختم ہونے والی جنگ میں یہی خصوصیات، امید اور رشک انگیزی کو دوبارہ مجتمع کرنے والی چمک و درخشندگی ہوتی ہیں۔

میرے نزدیک وہ ادیب جو انسان کی سچائی پر یقین نہیں رکھتا، نہ ادیب کا دکان رہے ورنہ وہ بے گناہ کا بے گناہ ہے۔

نئی زمانہ ہر طرف جو ایک خوف کا عالم دکھائی دیتا ہے۔ یہ دامن اتنی دنیا میں عدم تلاش کے سچا ایک اچھا اور کچھ خطرناک ہی صریح قتل چمک اور جو توڑ کا نتیجہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ادماک کا سمجھ و بوجھ کے دورے مرحلے اس بڑی تبدیلی کے لیے نہیں تھے۔ کے ہیں مگر یہ فرض کر لینے کی کوئی خامی و جہ نہیں کہ ہم اس منزل تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ بے شک ادیب کی ذمہ داری تو یہی ہے کہ وہ اس کے حصول کو یقینی بنائے۔

بالخصوص جب شکست اور کمالِ تجاہل اپنے خوفناک جزیرے کھوے سارے کھڑی ہو، تدبیر و دشمنوں کے سامنے بہا وری سے ڈٹ جانے کی انسانیت کی حوصلوں اور قابلِ فخر تاریخ کے ہوتے ہوئے، بالخصوص جب ہم سب سے بڑی ممکنہ فتح سے قریب تھے، پچھے ہوں، میدانِ جہاد کو بھگتا، حماقت ہی نہیں بدتر دے دے و بد دلی ہو۔

میں مغربی نوپیل کے حالات و زندگی پر بحث رہا ہوں۔ وہ تنہا ہی پھندا اور کتابیں لکھتی ہیں کہ صاحبِ فکر انسان تھا۔ اس نے ہنر اور دھماکا خیز قوتوں کو قافلوں میں گھسیٹا، جن سے حسبِ غلط یا بے خبری سے، بچھے تھیں یا نقصان رساں اور جادو کی دونوں قسم کے کام لیے جاسکتے ہیں۔ نوپیل نے اپنی انجمنیات کا، ظامانہ اور خوشیں استعمال خود بھی دیکھا تھا۔ اس نے اپنی تحقیق کے لیے وہی مانگا۔ شہر سے اچھائی تجاہل تک۔ مگر پچھلے بچے بھی ضرور کی ہوگی۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ کلیدیہ مائیں ہو گیا تھا مگر مجھے اس کا یقین نہیں۔ میرے خیال میں اس نے اس حماقت کے استعمال کے لیے منہج اور تحفظ کے اگے ایسا دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اور میرے خیال میں وہ لکھتا، اس نے ان اذیت کا نشان کے دماغ اور اس کے جذبات سے مشغول کیا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان اذیت کے مچا کیے جانے کے لیے مختلف میدانوں کی تخصیص میں اس

کا یہ جذبہ صاف کا رُخِ مانتا ہے۔

یہ انعامات عطا کیے جاتے ہیں، انسان اور اس کی دنیا کی برکتی ہوئی اور مسلسل عمر و دانش کے لیے، اور آپ اور مکتب کے لیے، جو ادب کے شخصوں انعامی ہیں۔ اور یہ انسانی امن کی علامتوں کے مظاہرے اور ثبوت کے عوض بھی اور دوسرے میدانوں میں حاصل کیے جانے والے عروج کے لیے بھی عطا کیے جاتے ہیں۔

الفریخ نو بیل کے انتقال کے بعد، بچپن میں سے بھی کم عمر سے مل، فقرات کے رانڈوں کا دروازہ کھلی دیا اور ہم انسانوں پر اکتیا رکا خوف ماکہ بار چڑا۔

ہم کی بہت سی حالتوں کے ٹامب ہو گئے ہیں جو پسے خد سے منسوب تھیں۔

سراسیمہ اور غیر مارد ہوتے ہوئے بھی ہم نے تمام دنیا کی موت اور نفل پر حاکمیت از خود فرغی کر لی ہے۔

خطرہ بھی، تو قیروطر و اعتبار بھی، اور قدرتِ اختیار بھی، سب کچھ آدنی کر چھوٹی میں ہے۔ اب اس کی تکمیل پزیرگی کا اہتمام اس کے سامنے ہے۔

خدا کی غنمی طاقت کے حصول کے ساتھ، ہم کیا اپنے لیے کسی کی ذمہ داری اور نالیش کی تلاش میں رہتا ہے کبھی جس کے لیے ہم دعا نہیں کیا کرتے تھے۔

انسان خود ہرے لے سب سے بڑا خطرہ بن گیا ہے اور وہی ہمارے آخری مبد بھی ہے۔

تو آج ہم حضرت یحییٰ کے جو دلی سیٹ جان کے لحاظ دہرانے ہیں "سب سے آخر میں لفظ ہے، ! لفظ آدنی ہے۔ اور لفظ آدمیوں کے ساتھ ہے۔"



☆ آنیو و اندریچ

اصترافِ کمال۔ تحریر کی اس درمیانہ حالت کے لیے جس کی مدد سے اس نے اپنے ملک کی تاریخ سے مذبذبات محو کیے داستانوں کے قتلے پر دم کو چٹا کیا۔

آنیو و اندریچ کا ادبی مشغلہ تقریباً ساٹھ برسوں پر محیط تھا۔ حاقی جنگِ دوئم سے پہلے وہ یوگیا میں ایک افسانہ نویس کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ ایک ماہی نگار کی حیثیت سے اندریچ کی شہرت اس وقت ہوئی جب اس کے ماہیوں کی (Tragdy) شہلیات The Bridge on the Drina, Bosnian Chronicle and The Woman from Sarajevo تقریباً ایک سو تھو 1945 میں شائع ہوئی۔ اندریچ اپنی تحریر میں بہت ہی کم کاری سے جدید نفسیاتی بصیرت اور الفابیلوئی تصورِ تقدیر کا آمیزہ تیار کرتا ہے۔ اس کے اس میں انسانیت کے لیے رحم دلی تو ہے مگر وہ دنیا میں برائی کے وجود اس کے خوف یا شکر سے مراد نہیں نہیں ہوتا۔ ایک مصنف کی حیثیت سے اس کے قلم میں ایسے سنے سنے موضوعات پوشیدہ ہیں جو صرف اس کے لیے مخصوص معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ہم سے کتابِ دنیا کے نامعلوم صفحات میں گم ہلکان کے غلاموں کی اذیت زدہ روایت کے لیے حساسیت کی درخواست کرتا نظر آتا ہے۔

یہ تینوں ماہی ایک دوسرے سے زیادہ زیادہ نہیں دیکھتے تھے سوائے مارتنی جس منہر کے جو مہمیب !
بلبل کی علامت سے عبارت ہے۔ تو ہیں، بندوقوں کی سماعت کٹش گھن گرنے کے ہیں اور ایسے قوی طوفانی

نوبل کے تصور کے سچ جس کے پیچھے ان کی کوئی حد نہیں دکھائی دیتی تھی ایسے ماہروں کی طرف تخلیقیت بذات خود ہی ایک کامیاب کام سمجھا جاتا تھا۔

ان پر شکوکہ اور ہالیدیگی سے ملبوس نہ رہنے والی، بالخصوص The Bridge on Drina کی شہرت سے قبل کے دور میں ہی آندریچ کے نوجوان اور حساس دل نے درشت قومیت کا خباثت شروٹا سمجھا تھا۔ یہ نوجوان عہدِ علم کی حیثیت سے اس نے قومی انقلابی تحریک میں شمولیت اختیار کر لی تھی جس کے سبب حکومتِ وقت کے ہاتھوں اس کا استحصال کیا گیا۔

The Bridge on Drina کہانی ہے اس پس کی جس کو قریب قریب یوگوسلاویہ کے ایک وزیر نے سچوویں صدی عیسوی کے اوائل میں یوزنیا کے شہر Visegrad کے قریب ڈیرنا دریا پر اس خیال سے تعمیر کروایا تھا کہ اس پل کے نقش، اس کے خیال کے مطابق، مسطرت عثمانیہ کے شرقی و غربی ایک دوسرے کے قریب ہو سکیں گے۔ یہ پل کیا بڑے عظیم الشان منصوبے پر قائم تھا جس کے دو پہلوں خوش تر رنگوں سے لگی ہوئی عمرانیں تھیں جن کی بنائی تھی تھیں۔ یہ پل بروسی جنگ عظیم کے دوران اڑا دیا گیا تھا اس دوران عثمانی و شوکت کا نشان تھا۔

یوزنیا کے ایک گاؤں میں، جو اس وقت آسٹریا و ہنگری کی مملکت کے زیرِ اثر تھا، آندریچ ایک وسط درجے کے خاندان میں پیدا ہوا۔ آندریچ جب تین برس کا تھا تو اس کا باپ جو ایک کارکنِ گرجا، وفات پا گیا اور اس کی عیال پر کچھ لوگ مال اور پیچھے لے اس کی پرورش کی۔ اس کی تعلیم سہ ماہیچو کے سکولوں میں ہوئی۔ غنفون شوب ہی میں آندریچ (Maida Bosna) نوجوان یوزنیا نام کی تحریک میں شامل ہو گیا اور اس وقت قید رہا جب آسٹریا کے حکمرانوں نے 1914 میں قس کر دیا گیا تھا۔ آندریچ کو قسین ہنس کی مزا ہوئی جس کے دوران اس کو کیر کے کارڈ اور دستوں کی دفرمت سے پڑھنے کا وقت ملا۔ آندریچ کو ان کے مطالعے سے بڑی مہارت قلب حاصل ہوئی جو اس کی تصنیفات کی زندگی کا ایک اہم موڑ بنی۔

آندریچ کی ابتدائی ادبی کاوشیں چند نکتوں پر مشتمل تھیں جو دو نکتوں (1918) Ex Pomo اور Nemri (1920) میں شامل کی گئیں۔ ایک افسانے The Journey of Aka Djerzelez سے اس نے نثر لکھنے شروع کی اور کچھ دنوں بعد اس نے نظم سے بالکل کنارہ کشی کر لی۔ اس کی تصنیفات کا پیش تر مواد ویدوویہ کے پبلشر، بیوروں اور مسلمانوں کے درمیان حدیں پر محیط جدوجہد اور علاقائی تہذیب سے متعلق تھا۔ آندریچ جو خود اپنے ملک میں ایک غیر معمولی سچے کے ماوس نگار کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا تھا، اپنے ماؤں کے دوسری زبانوں میں ترجمے کے پیش میں اقامتی قارئین کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

آندریچ کی کل تیرہ کتابیں شائع ہوئیں۔ اس طرح اس نے بہت کم لکھا۔ آندریچ نے 1975 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

اُس کو سوچنا چاہیے کہ ہم نے دارنی پر عمل کرتے ہوئے ٹوٹیل اکاؤنٹ نے اس سب ادیب کا ٹوٹیل انعام جو بین الاقوامی مختصر پر ایک منفرد اعزاز ہے، ایک چھوٹے سے ملک کے، جیسے کہ اُس کو ٹھکانا ہے، چاہا ہے، باقی کو دیکھ گیا ہے۔ اُس اعزاز کو وصول کرتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک کے بارے میں اور کچھ اُس داستان کو بارے میں، جس کو یہ اعزاز دیا گیا ہے، عرض کرنا چاہوں گا۔

جیسا کہ ہمارے ادیبوں میں سے ایک نے فرمایا ہے، واقعی میرا ملک دنیاؤں کے سچے ایک چھوٹا سا ملک ہے جو رومن توڑ دیجے والی رفتار سے چلتے ہوئے، بڑی بڑی قربانیوں کے عوض، تہذیب سمیت تمام میدانوں میں غیر معمولی جدوجہد کی حد سے وہ کچھ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس سے اُس کے مسئلہ علم اور متحارب ماضی نے اُس کو محروم رکھا تھا۔ اُس نعام کے حق دار کو منتخب کرنے میں دراصل آپ نے اُس ملک کی دینی سرگرمیوں کو ایسے وقت میں اہل کر لیا ہے جب سچے دینیوں کی طبعی ذمہ داریاں کے ساتھ ساتھ مائت، بڑی، دشمنوں کے ساتھ یہ ملک، ادیب کی دنیا میں اپنا مقام بنانے کے عمل سے گزر رہا ہے۔ اُس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُس ملک سے ایک تھکنے والے کو منتخب کرنے سے آپ نے پورے ملک کی بہت فرائض کی ہے جس کا شکر یہ ہم سب پر واجب ٹھہر اور میں بے حد مسرور ہوں کہ اس وقت اور اُس مقام پر مجھے یہ سرفرائض اور خلوص مل رہا ہے، اُس شکر کے کی واقعی کاموں میں رہا ہے۔

اس داستان کو کے کام کے بارے میں جس کو آپ نے یہ اعزاز بخشا ہے، کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ دو ہی مشکل اور ناگزیر مرحلہ ہے جب کسی ادیب اور اُس کی تخلیقات کا معاملہ ہوتا ہے کہ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ خود اپنے کام کے بارے میں کچھ کہہ بھی سکے گا، اُس لیے کہ اُس کی تخلیقات اُس کے وجود کا حصہ ہی تو ہوتی ہیں۔ ہم میں سے کچھ تو فن کے تخلیق کار کو گھونکا اور پراگندہ دماغ یا پراسے زمانے کے مشہور ادیب جیسے سمجھیں گے اور کچھ کا خیال ہوگا کہ سرفن کار کی چلی آواز ماحولیت نہ کرے تو فن پارہ خود بہتر نماز میں پنا تعارف کرے گا۔ اس قسم کا رویہ نہ تو مانائیں ہے نہ ہی بالکل نیا۔ خود Montesquieu کا بھی یہی خیال تھا کہ ادیب اپنے تخلیقات کے خود پارہ نہیں ہوتے۔ مجھے گویا سچے کا وہ قابل تعریف جملہ یاد رہا ہے کہ ”ادیب کا کام تخلیق کرنا ہے، بات کرنا نہیں“ اور کئی برسوں بعد ”نچرانی امیر کا سچے جیسے تخلیق کار نہ بھی اُس قسم کا خیال نہ بہت خوب صورتی سے پیش کیا تھا۔

مجھے اجازت دیجیے کہ میں، وقت کی مناسبت سے، اس مختصر تقریر میں داستان اور داستان گو کے

ورسے میں بھی کچھ ہوں۔ صدی بعد صدی، بہت مختلف فطرتوں کی بڑاڑوں نے ان لوگوں میں رہا۔ مگر ان لوگوں کی
 تھوڑی بڑیوں کی تشنگیوں میں شاقی جاتے وہاں نہایت قدریم کہندوں سے لے کر جدید لاسٹان کوئی کہندوں تک،
 جواب دہ ہے۔ یہ ہے شہزاد کے چھاپے نہ ہوں سے لے کر ہیں، بیٹس ترابی کے مسائن کے دھاموں سے
 بھی ہوتی ہوتی ہیں اور یہ لوگ ایک کہندوں کو سننے سے لے کر تھکتے بھی نہیں۔ وقت اور زمانے کی مناسبت
 سے کہندوں کے شانے کے اندر میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں، کہندوں کے شانے اور زمانہ و شانے کا جو مزہ ہے
 وہ نہیں ہوتا ہے، یعنی نہ ختم ہونے والا پتہ بدلی کبھی شک نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی، یہ لکھتے کہتا ہے کہ
 تھوڑی سی حق سمن سے لے کر ایک انسان، اپنے دل کی دھڑکن اور اپنی ماسوں کو اندر شد کے رنگ
 میں، ایک ہی قصہ مختلف انداز میں سناتا پڑا رہا ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاید خوش بیان شہزاد کی
 طرح یہ کہانی بھی جو کہی جا رہی ہو اور کورائے کی کوشش کرتی ہے تاکہ موت کی مانگ پر مزہ ملتی رہے اور وقت
 و زمانہ کا سراپا طویل ہوتا جائے۔ تو کیا داستان کو اپنی تخلیقات سے انسان کو خوش اپنی معرفت حاصل کرنے
 میں مدد دے؟ شاید یہ سب ہی کی اور ہے جو ان لوگوں کی جانب سے بولی رہی ہے جو مدنی کی جگہ میں
 ہیں رہے تھے اور انھیں اپنے اظہار کی تاب نہیں دینی تھی۔ بلکہ یہ ہے کہ داستان گدائی داستان خود کو سنا رہا
 ہوتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ایک بچہ اندر سے بچے کے خوف کو دہلی سے دور کرنے کی غرض سے زور زور سے
 گانے گئے۔ پھر ان کہندوں کا مقصد ان مضمین پر اجالا کرنا جو جن پر بسا اوقات زندگی ہم کو
 بے رحم سے ڈھیل دیتی ہے اور ہم کو اس زندگی سے آشنا کرنے کے لیے، جو ہم آنکھیں بند کیے لاشعور کی
 ظلم پر بسر کرتے رہتے ہیں، اس سے تیر لیا۔ جس کا ہمیں انصاف ہو سکے، اپنی کمزوریوں کا احساس
 ہونے۔ اور اس طرح داستان گو کے قاعدہ اکثر ہمارے خیال اور ہماری کمزوریوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ
 واضح کرنے کے لیے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ لہذا کبھی تو یہ خیال بھی آتا ہے کہ کیا
 انسانیت کی جگہ تاریخی و تاریخی بیانات کی ہوتی یا کبھی ہوتی، ان داستانوں میں نہیں ملے گی؟ اور یہ بھی کہ ہم اس
 تاریخ سے کچھ معنی اخذ نہیں کر سکتے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کہانی ماضی کے ماحول کی ہو یا حال کی۔
 تاہم، کچھ لوگ تو یہ بھی کہیں گے کہ وہ داستان جو تاریخ کی بہت ہو حال کو نظر انداز کرتی ہے، وہ تو کبھی
 حد تک مزہ بھی پھیر دیتی ہے۔ میرے خیال میں تاریخ کہانیاں اور ماہوں کہنے والا اس قسم کے ایک طرفہ فیصلے
 قبول نہیں کر کے گا۔ اگرچہ وہ یہ اعتراض کرنے پر راضی ہوگا کہ اس کو شاید کہ کب اور کس طرح وہ حال
 سے ماضی میں چلا جاتا ہے، اور یہ بھی کہ جس طرح کہ خواب میں ہوتا ہے، وہ صدیوں کے غاصلوں کو بہ
 آسانی پر کر جاتا ہے۔ مگر "خبر" میں، کیا ماضی اور حال ہیں، ایسی ہی جگہ یہ صوفیوں اور ایسے ہی مسائل سے
 بچا دیتے ہیں؟ وہی حنا، بخیر جانے ہوئے یا بغیر خواہش کے پیدا ہو جانا، وہ ہندو کے مندر میں پھینک دیا
 جانا، وہ جو رہتا ہوتا، اپنی تھوڑی رخت رکھنا، خود اپنے یا دوسروں کے لیے ہوتے، ایسے انجمن، ان دیکھے ورنہ قابل
 تصور صدمے اور ہلاکت کی مزاحمت کرنا جس کی نکتہ نہ ہو؟ اس سے یہ کہ کر یہ کہ ان سب کے بارے میں

اپنے خیالات کو سر اٹھانا دوسرے عقلموں میں، انسان بننا۔

تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ لکھنے والے ماضی اور حال کی فرضی خطہ حد بندی کے پرے انسان کے اس طرح کے حالات سے دوچار رہتا ہے جس کو اسے دیکھنا بھی پڑتا ہے اور جہاں تک ممکن ہو اس پر غور بھی کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے خیال کی حرارت اور اپنے سانس کی طاقت کی مدد سے نہ صرف اس کی تنقید کر سکے بلکہ جس کہانی کا ترجمہ مقصود ہو اس کو یک زمرہ اور سانس دیتے ہوئے وجود میں آجائے۔ اور یہ وجود انکا حسین، تازہ اور ہوا اور انکا ہی قابلِ تعاقب ہو جتنا کہ ممکن ہو سکتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لکھنے والے کس طرح اور کن حالات میں اپنے مقصد تک پہنچ سکتا ہے؟ کچھ کے لیے تو یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان کے خیال کو بے گام چھوڑ دیا جائے، اور کچھ کے لیے بڑی محنت اور لگن سے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ تاریخ اور سچی ارتقا کا عمل کس حد تک بروقت کی جا رہا ہے۔ کچھ تو زمانے ہوتے عہد کے معنی اور مظاہریت کو جذب کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور کچھ کی کثیر الصایف فرانسیسی ماہل نگار کی مثنوی مزاجی اور گھنڈی سرد مہری کے ساتھ کہتے ہیں کہ ”تاریخ میرے ماہوں کی بات ہے نہ کہیں کے سادہ اور سہمی یہ۔“ مختصر، ماہل نگار کو اپنی تخلیقات کے لیے جزا دل دیتے مقرر ہوتے ہیں تو صرف آخر میں تو بس کام ہی ہوتا ہے جو فیصلہ دیتی ہوتا ہے۔

ہر شخص کو ہر شے کی تفصیل بیان کرنے کے لیے تاریخی ماہل لکھنے والا اپنی تصانیف کے لیے پوری کھات ”میں نے ماضی کے دن غور و خوض میں گزارے ہیں اور بتائے دوائے کے دنوں پر نگاہ رکھی ہے“ جیسے الفاظ پر مبنی کہہ سکتا ہے۔ مگر کتب کے ساتھ یا اس کے بغیر بھی اس کا کام ہی ہو گا جو اپنے وجود کے ذریعے اس قسم کا تصور پیش کرے گا۔

پھر بھی، خیالی طور پر سوائے محنت، چاشنی اور اسلوب کے، یہ سب باتیں ایک سمجھدار شخص دانش ور نہ تفریح کے علاوہ کچھ نہیں ہوتیں جن کا کسی تخلیق سے کوئی عائد نہیں ہوتا۔ تاہم اس کی کم ہی اہمیت ہوتی ہے کہ لکھنے والا ماضی کو ابھارتا ہے، حال کو پیش کرتا ہے، رہا ہوں مردی سے مستقبل میں چھوٹک کا دیتا ہے۔ مرکزی شے تو دراصل وہ جذبہ ہے جو کہانی کو آگے بڑھاتا ہے، وہ پیچھا ہوتا ہے جو تخلیق کے ذریعے انسانیت تک پہنچتا ہے، اور یہ حلقہ کار میرے کہ ایسے محاسن میں اصول اور قواعد نہیں چلتے۔ ہر لکھنے والا، اپنے اندرون کی ضروریات کے مطابق، اپنے میدانِ طبع کے حساب سے، پیدا کی ہوئی کتاب، اپنے تصور اور اپنی قدرتِ اظہار کے مطابق اپنی کہانی تیار کرتا ہے۔ ہر لکھنے والا اپنی کہانی کی اخلاقی ذمہ داری تسلیم کرتا ہے اور ہر ایک کو ہونے کی پوری ”زادگی“ ہوتی چاہیے۔ مگر آخر میں یہ میدان کی جاتی ہے کہ، کچھ بے مواد سے قطع نظر، اپنے ہر عنصر کے لیے لکھی جانے والی کہانی نہ تو غرمت کی سیاحت سے ہوتی ہو نہ خود کشی کی مشینوں کے شور میں دب گئی ہو بلکہ یہ محبت کے پائے میں ہوتی ہو اور ”ناد اور پڑھکون“ ماضی کے طویل و عرض سے ابھار دین کر انگریزی ہو۔ داستانِ گولڈماک کی تخلیقات کسی کام میں نہیں ہوتیں جب تک کہ کسی بھی صورت میں وہ

اسان اور انسانیت کی خدمت نہیں رہیں۔ یہی سب سے اہم نکتہ ہے۔ اور یہی، کچھ بچے جو ملنے نے اس موقع کی مناسبت سے بچے فقہاء خیالات کے ذریعے کہنے کی کوشش کی ہے اور آپ کی اجازت سے، ایک بار پھر گہرے طور پر غلوں شمشیر کے ساتھ، ہابیون اسی طریقہ ختم کرنا چاہوں گا جس طرح کہ میں نے شروع کیا تھا۔



سینٹ جان پرس*

اعترافِ کماں۔ اسی تمہیں آئینہ اور جند پروہ شامری کے لیے جو ایک ٹھیکہ طریقے سے ہمارے زمانے کی یقینیت کی عکس گری کرتی ہے۔

فرانسیسی زبان کے شاعر آکس سینٹ لے ژے (Alexis Saint-Leger) نے (جو ایک سفارت کار کے عہدے پر فائز تھا) اپنی اصل شخصیت کو پروہ ماز میں رکھنے کے لیے ایک بالکل نئی مخلوق نام اختیار کیا۔ سینٹ جان پرس ہی وہ نام تھا جو ادب کے بین الاقوامی افق پر نمودار ہو کر اس کی ادبی شہرت کا باعث ہوا۔ اس طرح ایک اعلیٰ عہدے پر فائز سرکاری ملازم دہری شاعرت کے ساتھ بہت دنوں تک وہ کام انہی مہیناربد مشارقی عہدہ تو یک عمر تک چھپنے پر قسم ہوا مگر دہری شخصیت، یعنی شاعر کی حیثیت سے، اس کا تخلیقی کام بہت بعد تک جاری رہا۔

ادب کی ایک ممتاز شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ پرس کئی معنوں میں ایک اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ فرانسیسی نوآبادیاتی علاقے گواڈے لوپ (Guadeloupe) میں 1887 میں پیدا ہونے والے پرس ایک فرانسیسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو سترہویں صدی عیسوی میں فرانس سے گواڈے لوپ جا کر آباد ہوا تھا۔ اس کا بچپنا تیز ہواؤں میں بسر کرتے ہوئے پام سے درختوں کی جنت ارضی انیلیر (Anillies) میں گزرا مگر گیارہ برس کی عمر ہی میں اس کا خاندان فرانس واپس چلا گیا۔ اس کی تعلیم فرانس کے شہر پائو (Pau) میں

Bordeaux میں ہوئی جہاں سے اس نے قانون کی ڈگری لی اور 1941 میں سٹاف کی جگہ میں ملازمت اختیار کر لی۔ سب سے پہلے اس کی تعیناتی چین میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کو کئی اہم ملکوں میں فرانس کے سفارت خانوں میں متعین کیا گیا۔ کچھ عرصے کے تجربے اور اگلی کارکردگی کے بعد وزارت خارجہ کے سیکرٹری جنرل کے عہدے پر فائز ہو گیا۔

اتیسویں کے مائتو فرانس کی 1940 میں شکست کے بعد قائم ہونے والی تاجری حکومت نے پریس کو نہ صرف اس کے عہدے سے معزول کر دیا بلکہ اس کی قومیت بھی منسوخ کر دی، لہذا اس نے امریکا پہنچ کر جلاوطنی اختیار کر لی۔ امریکا میں اس کو کانگریس کے کتب خانے کا مشیر مقرر کر دیا گیا۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد قائم ہونے والی فرانس کی قومی حکومت نے اس کی شہریت ورنہ عہدہ بحال کر دیا مگر پریس نے وطن واپس جانے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ بعد میں وہ کئی بار فرانس گیا مگر صرف قلیل عرصے کے لیے۔

پیشروں نے نورداریوں کے باعث ملک ملک کی پریس کی شاعری کے آفاقی کو بیعت کی جس کی رکارڈی اس کے عہد میں صاف نظر آتی ہے۔ 1910 میں پریس کی پہلی نظم Saint-Leger Eloges Leger کے نام سے منظر عام پر آئی تھی مگر بعد میں اس نے اپنا نام تبدیل کر لیا۔ شاعری حیثیت سے اور اپنے نئے قسمی نام سے پریس کی پہلی کامیابی اس کی نظموں کے سلسلے 1910 To Celebrate a Childhood کے ذریعے ہوئی جس میں شاعر نے گاڈے واپ میں پائے جانے والے طرح طرح کے جانوروں، وہاں کی مندرجہ ذیل، حسین سبزہ زاروں اور جنگ برائے بھولوں کی چکاچند کرنے والی سبب بندی کو بیان کیا ہے۔ اپنے چین کے قیوم کے دور میں پریس نے ایک شاعر کا رستم Anabaa تخلیق کی۔ شاعر اس رزمیہ نظم کو ایک فائدہ بخش کردار کی نمونہ سے پیش کرتا ہے۔ اس قسم کے طویل سفر سے متعلق احسانات odyssean feelings سے متعلق تفصیلیں دے کر سفارت کار، مثلاً یوٹیو، اور یوٹیو سیٹے ہی جیسے سہولتوں کے ہاں بھی ملتی ہیں۔ پریس کا بہت سا کام مشہور انگریز شاعر لی اس ایلیٹ کے ہاتھوں انگریز کی نمونہ میں ترجمہ ہو کر شائع ہوا۔ یہ نظم ایک فاتح کی موتی مہر کے ذریعے لکھی ہے جو ایک تباہی آباد کرتا ہے۔ اس میں یونانی تاریخ نویس Xenophon اور خود شاعر کے اپنے سفر سے متعلق حوالے ملتے ہیں۔ ایلیٹ کے خیال کے مطابق یہ تجربہ اتنی ہی اہم ہے جیسا کہ جیمز جیکس نے بعد میں تخلیق کی۔ پریس نے 1924 اور 1940 کے درمیان بہت ساری تفصیلیں لکھیں مگر وہ بھی شائع نہیں ہوئی۔

امریکا میں قیوم کے دور میں جب وہ کانگریس کے کتب خانے میں مشہوریت کے منصب پر فائز تھے پریس نے شاعری پر خاص توجہ دی۔ جلاوطنی کی زندگی ایک مستقل کیفیت معلوم ہوتی تھی اس لیے اس دوران پریس کا ہیج بہہ اور چندر ہوتا آیا۔ اس کی نظم (Exile 1942) کا موضوع تلخ درد جانا ہے جس میں اجارہ غیر آجودا حلوں، پھر ریگستانوں جیسے عذمتیں سر اٹھاتی دکھائی دیتی ہیں۔ غالباً یہ بے رنگ اور بے حسن عذمتیں شاعری اس دور کی مایوسیوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔

پرس کی نظم Plures, 1944 جس میں وہ طوفانی بارشوں کا آجگاہ بنا تا ہے اور نظم (Vents, 1946) جس میں ہواؤں جھکی قدمتی طاقتوں سے لے پیدا کرتا ہے، پرس کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہیں۔ ان نظموں میں پرس نے دنیا کی دریا فٹ بوراس کے انتھکوں کا منظر بارش تخلیق کرتا ہے جس میں انسانی حرکات تاریخی روایت کی طرح چہی اور تخلیق دونوں اعمال ایک ساتھ سرگئی نظر آتی ہیں۔ پرس کہتا ہے کہ ”شاعری صرف ایک طرز کا علم ہی نہیں، یہ ایک طریقہ حیات ہے، بلکہ سن جیٹ انگل زندگی ہے۔“

پرس نے بہت زیادہ نہیں لکھا۔ ٹائٹا اس کی وجہ اس کی پیشہ ومانہ قوم داریوں کی بحیثیت و رعدیم انفرصتی تھی۔ اس کی کل سولہ کتابیں شائع ہوئیں۔ پرس نے 1975 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

یہ اعزاز جو بھی مجھ کو دیا ہے، میں نے شاعری کی جانب سے دیکھا کیا ہے، اور میں اس کو شاعری کی خدمت ہی میں پیش کرنے کا آزاد دیتا ہوں۔ آپ لوگ نہ ہوتے تو شاید شاعری کو یہ حرام نصیب نہ ہوتا اس لیے کہ ”ماذیت کے غلام معثرے اور شاعری کے درمیان قابضے پڑھتے بھائی دیتے ہیں۔ شاعر اس فیج کو نہ چاہتے ہوئے بھی قیوں کر مباحسب گرسائش کا عملی طور پر استعمال نہ ہوتا تو سائنس دانوں کو بھی یہی مسئلہ درپیش ہوتا۔ مگر ایک دوسرے سے لائق ہونے کے باوجود یہاں سائنس دان اور شاعر دونوں کو اعزازات دیے جا رہے ہیں۔ کم از کم اس مقام پر تو دونوں کو بہت ڈگریاں بھائیوں جیسا نہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ دونوں ہی بحال کو کھٹکتے ہیں معروض ہیں، پس فرق یہ ہے کہ ان کی تلاش کے طریقے مختلف ہیں۔“

جب ہم جدید سائنس کو خالص ریاضیات میں اپنی واضح حدود دریافت کرنے کا تماشہ دیکھیں، جب ہم طبیعیات کے میدان میں دو بڑے نظریات، نظریہ اضافیت (Theory of Relativity) اور عدم یقین کے نظریہ قدمیہ کی (Quantum theory of Uncertainty) (جو مادی ماسپ توں کی قطعیت کو ہمیشہ کے لیے محدود کر دے) توجہ کا مشاہدہ کریں، جب ہم اس عددی کے سب سے بڑے سائنسی موجد، ایسا جدید فسیات کے ہائی کا یہ اعلان سنیں کہ ”انسانی تجلی ہی اصل میں سائنس کی زرخیز کیا رہی ہے“ بلکہ یہ بھی کہ ایک سائنس دان بھی فنی کشف و کیمات کا حامل ہو سکتا ہے، تو کیا ہم شاعری کو بھی ایک طرح کی منطق سمجھنے میں حق بہ جانب نہ ہوں گے؟

حج تو بھی ہے کہ صحیح معنوں میں نسانی دماغ کی ہر محنت سب سے پہلے "شاعری" ہی ہوتی ہے اور اگر حساسیت و درداشت میں ایک ذہنک کا تناسب موجود ہو تو یہ سمجھ وید ہی عمل ہوتا ہے جیسا کہ اہلنا میں شاعر کی سائنس دان سمنا ہے۔ غیر مسلسل تخلیق و شاعرانہ جذبہ مہارت (elipsis) دونوں میں سے کون سی کیفیت ہے جس کی بازگشت دورِ اقدارِ قدیم سے ہوتی ہے؟ اور اگر قدیم دور کی ایک رات میں جب وہ روزِ ادا دھڑے اپنے اپنے ماستوں کی تلاش میں ہوں، ایک سائنسی گراٹ سے لیس ہو اور دوسرا صرف اپنے گلیں میں پیدا ہوئے جھماکوں کی مدد پر اٹھسا رہتا ہو تو بعد کون ہوگا جو سب سے پہلے منزل پر پہنچے گا؟ یہاں ہم کاشی سوال کے چھاپ سے غرض نہیں۔ یہ جیسے تاں دونوں کے لیے ایک ہی جیسے ہوگا۔ اور ظاہر یہ ہے کہ شاعرانہ ذہن کا ماحول بھی طرح طرح کے سائنس سے متروک رہے گا نہ ہوگا۔

ماہرینِ فکیرات کا غات کے مسلسل پھینکاؤ کے نظریے سے متوحش رہے ہیں مگر پھیلاؤ کے معاملے میں انسان کی اپنی مددنی کائنات کی خدائی پسندیاں بھی سمجھ گم نہیں۔ ہم سائنس کی سرحدوں، جہاں تک بھی پہنچتے ہیں شاعر کو ہمیشہ ان کے قریب ہی کوشاں پائیں گے۔ اس لیے کہ اگرچہ جیسا کہ کہا گیا ہے، شاعری مطلق حقیقت نہیں ہوتی، مگر ہم اس کو حقیقت سے اس قدر قریب پاتے ہیں کہ اپنی اچھا تک آتی کہ حقیقت۔ یہی نظم کے معنوی فکر میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ عداوت اور مطابقت کے ذریعہ، دور سے جھلساتی سماں ہندی کے ذریعے، ہزار ہا عمل اور رد عمل سے وجود میں آنے والی حیرت انگیز سرور ہندیوں کے ذریعے اور زبان کے سنوئی جیسے پن کے ذریعے جس میں وجود کے ہر آنگ کا سماں لپک گیا ہو شاعر خود کو ایسی غیر منطقی اور فوق حقیقت کیفیت میں پیش کر سکتا ہے جو سائنس کے پس کی بات نہیں۔ کیا انسان کے پس میں کوئی ایسا نیا وہ متاثر کن مخصوص لہجہ بھی ہے جو انسان کو شاعری سے بھی آگے نہ دھکے مخاطب کر سکے؟ چونکہ خود فلسفی بھی بعد طبیعیات کی دہائز سے لبرہ اختیار کر رہے ہیں، یہ شاعری ہے جو اس کی بازگشت کر سکتا ہے، لہذا اس قدیم فلسفی کے الفاظ میں جو خود بھی تہذیب کی کیفیت سے دوچار تھی، فلسفہ نہیں شاعری ہی خود کو چلی "میتروں کی بیٹی" کے روپ میں "شکار کرتی ہے۔"

مگر تخلیق کے کیفیت سے نیا وہ شاعری، زندگی کا کیا نڈاز ہے، ہر شاعر کی خود زندگی ہے۔ غامضوں میں مہلے والے انسانوں میں بھی شاعر ہوا کرتے تھے، جو میری دور میں بھی شاعر ہوں گے اس لیے کہ وہ بشری طور پر انسان کی کا حصہ ہیں۔ حتیٰ کہ خود شاعری کی ضرورت ہی سے مذہب نے بھی جنم دیا ہے، کہ یہ ایک روحانی ضرورت تھی، اور یہ شاعری ہی کا فیصل ہے کہ انسانیت کے سبب چھاتی میں روحانی شرر بجتے ہیں۔ جب اس طیرانہ دہا جاتے ہیں تو روحانیت شاعری میں نہا گزرتی ہی نہیں ہو جاتی ہے بلکہ تسلسل بھی پاتی ہے۔ جس طرح دورِ قدیم کے جلوسوں میں خدایہ دار مشعل برداروں کے لیے چاند خالی کر دیتے تھے، اسی طرح آج کے سماجی نظم و نسق اور عظمت پسندی کے دور میں صرف شاعرانہ تخلیق ہی ہے جو مذہبی کے حلقہ کی نمان کے ریش جذبات میں درخشاں ہوتا ہے۔ جب بھی "ثقافت" سے معمور اور روحانیت کی درستی کے ساتھ

ایک نئی انسان پرستی سامنے آکر رہی جو اس وقت دنیا کو بیاہیے کر وہ کسی شان سے اپنی اپنی فیس داریوں کے باوجود میراٹھا کر چل رہا ہوتا ہے۔ انسانیت کے اپنے بوجھ کے باوجود کسی طرح ڈال ڈال رہتا ہے۔ عہدہ شاعری، جی تمام تر اسے داری سے وفاداری کے ساتھ جس کو سم انسان کے روز و اسرار کی حد تک کہہ سکتے ہیں، اسکی جہد میں مصروف ہے جو انسانیت کے تمام انعام سے متعلق ہے۔ اسکی شاعری میں غیب و دنیا پر حریفی جیسی دنیا سے نہیں ہوتی، نہ ہی یہ خالصتاً حقانی ہوتی ہے نہ فنی حدود گری یا کار کا ش۔ یہ دنیا معنوی طریقوں سے موقی پیدا کرتی ہے جس کی کو قشیش یا مشابہت سے سروکار ہوتا ہے، نہ کسی قسم کی موسیقی اس کا پیٹ بھر سکتی ہے۔ شاعری تو ایک رفیع اتصال کی صورت میں، حسن کی اتھا رہی ہوتی ہے مگر اس کو اپنے لیے قطعی ہدف یا مقصد زید کی کے طور پر متعال نہیں کرتی۔ فنی و زلفی سے اور محبت کو دعا کے سے ہدا کرنے سے انکار کرنا، اس کا کمال ہے، خیر ہے، وقت ہے، اور یہ ہمیشہ اسکی قدرت کی صورت ہوتی ہے جو اس کی حدود کو معترف دیتا ہے۔ محبت اس کا آئینہ دان ہے، شورش و بجاوت اس کا قانون ہے، قشیش میں ہر جگہ اس کی جگہ ہوتی ہے۔ یہ نہ انکار کرنا چاہتی ہے نہ بے خبر رہنا چاہتی ہے، یہ وقت سے کسی غائب کی توقع نہیں رکھتی۔ اپنے مقدر سے نسک اور نظریات سے آزاد، یہ خود کو زندگی سے متصل چاہتی ہے، جو اس کا اپنا جزو ہے۔ اور یہ ایک ہی معنی میں، و صدہ عظیم اور نند و یونانی غنائی (Strophe) کی مانند حال و مستقبل کو، عام انسان اور مافوقی انطرت انسان کو، یہ رانی غلہ و آفاقی خدا کو ہم منوش کر دیتی ہے۔ وہ ابہم جس کے لیے اس کو انعام دیے جاتے ہیں اس کی اپنی فطرت سے متعلق نہیں ہوتے بلکہ ان باتوں کو منور کرنے کے لیے ہوتے ہیں یہ جن کی کھوئی ہوئی ہے، روح کی بات اور روز و جن میں انسان کی بقا پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس کے انکھار سے بہم دور ہو جاتا ہے اور یہ کجبار کسی طور بھی سائنس سے کم و بیش طلب نہیں ہوتا۔

لہذا جو کچھ موجود ہے اس سے مکمل و بنگی کے ذریعے شاعر ہمارے لیے وجود اور وجود سے یکجہت کے لیے ایک رشتہ قائم رکھتا ہے۔ اور رجائیت ہی اس کا دیا ہوا سستی ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک دیائے موجودات پر حکمرانی کے لیے ہم آہنگی ہی واحد قانون ہے۔ اسکی کوئی چیز نہیں ہوتی جو انسانی فطرت سے پرے ہو۔ انسان کی جڑیں انسانی کیفیت میں لے لی گئی ہیں۔ لہذا وہ نہیں ہوتیں جن کو ہم دھرم سے معنوں میں مگر اور تہذیب کا پھر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور وہ قبر جو منظر میں بندہ مشعلیں لیے گزرتے دیکھتی دیتے ہیں طویل تاریخی عمل کے مہشوں کے مانند ہوتے ہیں۔ ہفتہ معاشرے ایک ہی خزاں کے حصے میں نہیں مرتے، اس تبدیلی ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے اس کی تجدید یا جمود کی خطرے ہوتے ہیں۔ شاعر عاقلان کے سانچوں کو توڑتے ہیں اور اس طرح وہ نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو تاریخ سے بندھ ہو پاتے ہیں۔ شاعر کے لیے اس کے نمائے کا کوئی بھی تماشا نہیں ہوتا۔ کاش وہ ہم سب کو اس عظیم ویر میں زندگی کا صحیح عرہ دے سکے۔ اس لیے کہ یہ عظیم اور نیا دور ہے جو ایک نئے انداز کی خود اعتمادی کا طلب

ہے۔ ان اثر کا وہ کون ہے جس کو اس دور سے متعلق ہونے کا اعزاز دینا پڑے گا۔
 ”ڈنٹ نہیں“ ایک دن اپنے چہرے سے شہد کا نقاب اٹھاتے ہوئے اور لاشیائی شدتیں کیا مانتے اپنے
 تپاؤ میں رقص کی تہا پہ ماتھوں کے اشارے سے انکسار و رضا مند کی کرتے ہوئے تاریخ کھتی ہے ”نہ خوف نہ ڈر
 اور نہ شہیے میں پرو کر شہر بانجھ ہوتا ہے اور خوف غلام ہے۔ اس مسلسل ضرب کی ”ڈر“ کو سنو جو میرا بند اور درجہ
 ہاتھ انسان کی تخلیق کے تقسیم عمل پر لگا رہتا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ زندگی خود سے ہست بردار ہو سکتی ہے۔
 لیکن کوئی شے زندگی نہیں جو لامیپیوں سے پیدا ہوتی ہے یا اس کے لیے تڑپتی ذاتی ہے۔ زندگی کا نہ ختم ہونے
 والا تقسیم یکم وجود کسی جگہ پر پکا نہ حاصل کرنے سے باز رہ سکتا ہے۔ دراصل الیہ کیا پہلے مل نہیں ہوتا۔
 اس دور کا اصل تماشہ تو وہ ظلیج ہے جو عارضی اور اپنی انسان کے درمیان قائم ہے۔ کیا انسان ایک رخ سے
 روشن ہے مگر دوسرے رخ سے مدغم ہو جانے والا ہے؟ درحقیقت میں عمل شہر اک کے بطور تہریں چلتی
 فریب کے سو کچھ اور ہو سکتی ہے؟“ ہم میں سے صرف ایک سچے شاعر کی کا یہ منصب ہے کہ وہ انسان کے
 روپیہ ہونے کی شہادت دے۔

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ (یعنی شاعر) اپنے ذہن کے مقابل اپنے روحانی کاماب سے نبرد
 حاصل آئندہ رکھے۔ اس کا مطلب ہے کہ اپنی اس صدی میں ہم کو وہ انسانی کیفیت چلیں گہا ہے جو اصل
 انسان کے قائل ہو۔ اور محض اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ اجتماعی روح کو دنیا کی روحانی قوت کے قریبی
 ربط میں لایا جانا چاہیے۔ جو ہر کی توانائی کی موجودگی میں یہ شاعر کا منہ کا دیا اس کے مقاصد کے لیے کافی
 ہوگا؟ ہاں اگر انسان مٹی کا دیہہ رکھے۔

بند شاعر کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے عہد کا ناقص خمیر ہو۔



سلو اتورے کا ریمڈو

اعترافِ کمال۔ اس کی فائنل شاعری کے لیے، جو کلاسیکی قمارت کے ساتھ اپنے دور کے درد انگیز تجربات کا اظہار کرتی ہے۔

سلو اتورے کا ریمڈو کا ادبی سرمایہ وہ ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جب تک نظم سے پہلے کا ادوار اس کے بعد کامیابی کی ابتدائی شاعری، مائٹوس، ستعارات اور پیچیدہ سماں بندیوں کی وجہ سے مشکل سے سمجھ میں آتی تھیں۔ بعد کی تخلیقات میں، جب وہ نشانِ شاہی کے دور میں تھا، اس نے نیا دور تھوہ عصری تاریخ، معاشرتی حالات، جنگ کی خوفناکی اور سماں کو لائق القوتوں کی طرف دینی شروع کی۔

کا ریمڈو کی ابتدائی شاعری پابندی سے دس سال میں مرتب ہوئی رہی۔ اس کا پہلا شعری مجموعہ (Acquiesce Terre (Water and Land) 1930 میں منظرِ عام پر آیا اور اس میں وہ نظمیں بھی شامل تھیں جو اس نے اس وقت لکھی تھیں جب اس کی عمر صرف اٹھ سال تھی۔ کا ریمڈو کی مشہور نظموں میں چند مصرعوں کی ایک نظم تھی:

ہر ایک گھڑا ہے دھرتی پہ
دھرتی کی ہر گھٹائی چھائی پہ
گھٹوں کے بھاؤں میں پیوستہ
اور اچانک رات ہوئی

کانزیمدو کی شاعری میں سسبلی کے کام کی لہر اسیوں اور تباہیوں، پانی اور زمین طاقتور استعاروں کے طور پر ابھرتے ہیں۔ کانزیمدو کے تین اور مجموعے (1932) *Oboe Sommerso* اور *Poesie* (1936) *Erato e Apollon* (1938) شائع ہوئے جن کی شعری زبان پر علامتوں کا گہرا اثر ملتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے مٹانے میں کانزیمدو دست یوں کے خلاف رُود میں شامل ہوا۔ جنگ کے بعد وہ کمیونسٹ پارٹی میں شریک ہوا مگر کچھ دنوں بعد اس وقت احتجاج کے طور پر مستعفی ہو گیا جب پارٹی نے سیاسی تقسیم لکھنے پر اصرار کرنا شروع کیا۔ کانزیمدو کے شعری مجموعے (1947) *Giorno Dopo Giorno* میں اس نے وطن کی مشکلات اور جنگ میں احوال کے کردار پر شدید خوف کا اظہار کیا ہے۔ مہرین اب کی بات پر متفق ہیں کہ اس کا یہ مجموعہ جنگ عظیم دوئم کے بارے میں شاید دنیا کی سب سے اتر انگیز شاعری ہوئی ہے۔ اس کے بعد آنے والے مجموعے (1949) *La Vita non è Sogno* میں کانزیمدو، مقابلہ کرنے والے ایک نئے شاعر کے روپ میں نظر آتا ہے جو کٹر موقعوں پر کمیونسٹوں کی فک ہوئی امیدوں کے بل پر جھانپنے پر لہجہ طعن کرتا ہے۔

کانزیمدو اپنی آخری چار کتابوں میں شاعری انصاف اور برے ہوئے بدستوں اور بیوقوف کے بارے میں نیا دہ گھر شد نظر آتا ہے۔ اس کی شاعری کا آخری مجموعہ (1956) *Dare e Avere* (Give and to have) کانزیمدو تک جھڑکتا ہے کہ "شاعری، بلکہ غنائیہ شاعری بھی دراصل تقریر ہی ہوتی ہے جس کو سننے والا، شاعر کا اپنا جسمانی یا تصوراتی اندرون بھی ہو سکتا ہے، کوئی ایک انسان بھی ہو سکتا ہے یا خرابوں انسان ہو سکتے ہیں۔" کانزیمدو کے ہاں باور رکھنے کے بچپن کی باتیں اور اس کی سسبلی میں گزرا ہوا ہوئے دن موضوع بن کر ابھرتے ہیں۔ وہ اپنے گرد پھیلے ہوئے منظر سے بچنے والے نقوش کو اپنی حسوں اور پادائی، زمین اور عرب حمد آوروں سے مربوط کردہ دیکھتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کی کانزیمدو کی شاعری نیا دہ تر تہذیبی مسائل اور احوال کے تصور کے بارے میں فکر سے پرہیز کرتی ہے۔

کانزیمدو نے دب کے مختلف موضوعات پر مشائیں بھی لکھے، لکھائی شاعری اور فیشنل دنیا تک کے مزے بھی کیے۔ جن ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کے مزے کیے ان میں شکسپیئر، ہومر، ہائیڈرو، اور انکی دوسرے مشاہیر شامل ہیں۔

سوا تو رے کانزیمدو سسبلی کے ایک چھوٹے سے شہر مودیکا (Modica) میں 1901 میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ریلوے میں افسر تھا۔ کانزیمدو نے بچپن ہی سے کہتا پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے والدین نے محسوس کیا کہ بچے کی تربیت کی ضرورت پیدا ہو گئی ہے اور اسی لیے تو رے کو رام کے پانچ ٹیکٹ انسٹی ٹیوٹ میں بھیج کر تک پڑھنے کے لیے داخل کر دیا۔ ان مشکلات کی وجہ سے وہ تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور اس نے مختلف ملازمتیں کیں جس میں سرکاری تھے بھی شامل تھے۔ کانزیمدو کے استاد نسبتی *Elio Verrini* نے، جو خود ایک نثر نگار تھا اس کو اپنی سنتوں سے متعارف کر لیا۔ کانزیمدو کے ادبی دوستوں میں مونٹالے (Montale)، انکارچی

(Ungareti)، یونیٹ (Bosani) وغیرہ مثال تھے۔

کا زبوجی نگارہ کے قریب تھینٹات تھیں۔ اس نے نیپلز میں ایک ادبی جماعت کی صدارت کے دوران دماغ کی شریان پھٹ جانے کی وجہ سے 1969 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

میں ہمیشہ سے سب سمجھتا رہا ہوں کہ تمام قومیں انوم پانے والے حضرات سوئیزن کو بنادومن سمجھتے تھے ہیں، جو عصر حاضر کے لیے ایک نہایت درخشندہ مثال ہے۔ وہ حقیقت دنیا کی کوئی اور قوم اس جیسا بلکہ اس سے کمتر درجے کا بھی، خام خام کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ انعام ایک ایسے ملک سے ٹروٹ ہو ہے جس کی آبادی صرف چند ہین اشوں پر مشتمل ہے۔ ٹوٹل انعام حاصل آفاقیت کی ایک عمدہ مثال ہے جو ایک متحرک قسم کی مدعایت سے بھی ملو ہے۔

یہ انعام، ایسا اعزاز ہے جو آسانی سے حاصل نہیں کیا جاسکتا، جو کسی بھی قوم کے ہر قسم کے سیاسی دھڑے کو گھٹا کرتا ہے، اور ادب، شاعر، فاضل مس کے سامنے امکانات کی ایک وسیع فیلڈ پیش کرتا ہے۔ ہر تہذیب نے ہمیشہ مدد سے کے خطرے کو اس وقت بھی محسوس کیا ہے جب وہ تہذیبوں سے لیس اور لچھے ہوئے نظریات سے الٹی پڑ رہی ہو۔ یہاں میر سے اطراف ثانی فطرتی ان قدیم ترین تہذیبوں کے فائدہ سے موجود ہیں جو پہلے تاریخ کے مشکل دور میں بھی ان کی دلوں کے شانہ بہ شانہ رہے ہیں جو انسان کی آزادی کے لیے جدوجہد میں مشغول تھے۔ یہ وہی تہذیب ہے جس نے نرم دلیوں فرماں روا، عظیم شاعر اور کھنے والے پیدا کیے ہیں۔ مائٹی کے اور عصر حاضر کے یہ شاعر میر سے وطن اٹھایہ میں اچھی طرح جاتے ہیں، خواہ وہ اپنے مضرب و بجزوں مزاج کے لیے ہو یا قسری جذبات کے لیے۔ لوگ کہیں میں وائی کٹ دلوں کے مٹانے کی وجہ سے ان کے مشکل ٹمر ٹکاتے ہوئے ہاموں کا بھی ہم لوگ احترام کرتے ہیں۔ یہ لوگ نیا دہ قوت سے بات کرتے ہیں پانست ان شاعروں کے جن کی تہذیب زوال پذیر ہے یا ٹکاؤ لٹا ہے یا غلطی کی گرد کے دبا ہوئے سے۔ میرا مقصد خود کو مبارکباد دینا یا چالاق سے پٹا قصیدہ خوانی کرنا نہیں، میں تو اس وقت پومپ کی ٹائش پر تنقید کر رہا ہوں جب میں کہتا ہوں کہ سوئیزن کے عوام نے بالامادہ دنیا کی تہذیبوں کو نہ صرف چیلنج کیا ہے بلکہ ان پر مزاح زد بھی ہوئے ہیں۔ میں پسے کی کہہ چکا ہوں کہ شاعر اور ادیب دنیا کو بدلنے میں مدد دیتے ہیں۔ میرا یہ کہنا ایک قسم کے گمان اور اضافی بیج کے مترادف ہو سکتا ہے مگر

اس اٹکل چٹکل یا رضا مندی کے جواز کے لیے ہم کو اس رجسٹر پر غور کرنا ہوگا جوٹھکرا ہے اور غرض معاشرے میں پیدا کرتے ہیں۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ شاعری غنائی کے عالم میں ظہور کرتی ہے، غنائی کی کیفیت سے نکلا کر ہر طرف پھیلتی ہے، غنائی سے ہی یہ معاشرتی رنگ میں رنگے بغیر اپنے خالص وجود میں معاشرے تک پہنچ جاتی ہے۔ شاعری، بلکہ غنائی شاعری بھی، دراصل ایک قسم کا خطاب ہوتی ہے جس کا اولین سامع شاعر کا جسرانی یا مابعد الطبیعیاتی کردار ہوتا ہے، وہی ایک انسان ہوتا ہے، یا ہزاروں انسان ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ہر کسی حساس ایک دائرے کی کیمبر کی طرح اپنی ہی طرف واپس آتا ہے، اور چھبیس غنفل اور چھبیس انگیز آوازوں کے ذریعے پھوٹی ہوئی تاریخ کے صفحات میں گم ہو جانے والے لوگوں کی دیوار کی بازگشت کرتا ہے۔

۴۔ ہم حتیٰ معنوں میں زمین پر ایک نوانسانیت (Neo-Humanism) کی بات کر سکتے ہیں، وہی نوانسانیت جس کو ہم سرکونی کیفیت چٹا نہیں کی جاسکتی۔ اور سرکونی شاعر خود کو اس قسم کے عارضی جسمانی دخلچے کے درمیان پاتا ہے جس کو بر روی طور پر اس کی دانش اور روحانیت نے خلق کیا ہو تو کیا وہ اب بھی ایک خطرناک وجود بنائے گا؟ یہ سوال محض ادبی نہیں بلکہ سچی ادبی کا کتاب حذف (ekipsis) سے۔ آفاق کی ادبی شاعری کے مخالف یہو کے شاعر پر مشابہ نظر آتی ہے۔ اور وہی کے نزدیک شاعر کا وجود ایک ایسی دکھوت نظر آتا ہے جس کو پار نہیں کیا جاسکتا، گویا اس کو ابودردرد جانا چاہیے۔ اس کے برعکس چھبیس اور منظم معاشروں میں شاعری کی قوت برست چھبیتی جاتی ہے۔ اور ہر کسی قسم کی ادبی باڈی گری آفاق کی حساسیت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو بھی جائے، تب بھی یہ شاعری غفل جوانسانیت کو متاثر کرنا ہو بھی ہے ہر نہیں ہو سکتے گا۔

میں نے ہمیشہ میں سمجھا ہے کہ میری نظموں میں سے ایک نظم شمال کے انسان کے لیے، بلکہ مشرق کے ہیں، مگر وہ انہیں کے دسیوں کے لیے بھی گئی تھی۔ شاعری کی آفاقیت کے لیے اس کا بیکس یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ زبان کی حالت کا فحور نہایت اہم ہوتا ہے۔ آفاقیت کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ پہلے سے نہ تھا، ایک انسان دوسرے انسان کے لیے اس کا اضافہ کرتا ہے۔ ایسی آفاقیت فحور یا نقصان نہ فحور ہوں پر نہیں کہہ سکتے، راست محکم اور مفرد روحانی کیفیت میں ہی قائم ہو سکتی ہے۔ دراصل یہ اس وقت لیا و نقصان وہ ہو جاتی ہے جب اس میں چند شخصیتوں کو شامل کر دیا جائے۔

میرے نزدیک حسن عارف مطابقت یا ہم آہنگی میں ہی نہیں بلکہ، مصوری اور بے ڈھنگے پن میں بھی ہونا چاہیے، اس لیے کہ کبھی کبھی نامموری بھی درست شاعری بنکر کا روپ اختیار کرتی ہے۔ مجسمہ سازی ہو، مصوری ہو یا موسیقی یا اور کوئی فن، اخلاقی، جمالیاتی یا جہاں ایوانی مسئلہ میں ایک ہی طرف کے ہونے میں، ان کی حیرانیاں اور بریکیاں ایک جہتی ہوتی ہیں۔ ہم عصر انسان کے ہاتھوں تو یونانی حسن بھی خطرے میں پڑ گیا ہے، اس لیے کہ اس نے حسن کی سچے الماندگی لگاں لگانے کے لیے جگر کو جہاں گولیا ہے، ایسی فحور جو فطرت کے تخلیقی رجحان کو شکرا کر سکتے۔ اس مقام پر میں شاعر کی بات کر رہا ہوں، فطرت کے اس انوکھے نقش کے

بار سے ملے، جو کسی زمانہ سے ریزہ ریزہ جمع کر کے اپنے وجود کی تخلیق کرتا ہے۔ مگر زبان مجھ جملوں کی ہے لگ اور جی۔ نہ کہ گمراہ کن، ساخت سے وجود میں آتی ہے۔ ابتدا میں زندگی کا ہر تجربہ، جیسے کیا گیا ہو یا صرف محسوس کیا گیا ہو، ایک خلاف توقع آخری ٹوٹ پھوٹ، صرے صرے پھا پھانے والی روحانی ماحول کی سے وریک خف سے عبارت ہوتا ہے کہ کھل کا رخ مکے بوجھ کے دب کر منہم ہو جانے والی مدحانیت دوبارہ انجیر کرنا، رت تھپتھپ کرنا اور عارضی دیا وئی، تنقید نگاروں کے لیے، شاعر قصداً اور مست قصیدت رکھتا ہے، "رہبر و دنیاوی مذہب کی دھجیات کی مدد سے ان سے کھنڈر کرتا ہے۔ ظاہر سے کہہ سکی صورت میں تنقید نگار بھی لکھے گا کہ فلاں فلاں شعری تخلیقیت فن کی پوچھیں اور دق گمارا ہیں، اس زمانہ میں جو پکے سے موجود نہ تھیں۔ اس طرح شعری فکر کی تاریخ الٹ پلٹ ہو جاتی ہے۔ و مری صورت شاخ تھانی کو مدحیت کرنے کی اور ان بے حق گروں کی نشان دہی کرنے کی ہوتی ہے جو حصار سے ہوتی ہیں۔ تو کیا یہ شاعر کا ایک قسم کا شرمگین ہونا ہے؟ اس لیے کہ کوئی بھی ان لوگوں کے خیالی خدا کو اب نہیں کر سکتا جنہوں نے کسی سے شاعر کی ایک آدھ نظم ہی پڑھی ہو، گمراہ اور ملک سے بلا تنقید نگار بھی اس خلیہ میں ہٹا ہوتا ہے کہ اگلے پندرہ میں مصرعوں کے سمے نہیں سچے ہی نہ ہوں۔ تنقید نگار بھی، جو بہ ظاہر میا ہی لکھی ہے، اس طویل صدی میں پاکیزگی کے تصور کی جستجو ابھی ہوتی باقی ہے، ایسی صدی جس میں شاعر نہ صرف یہ کہ اجمعتوں میں گرفتار ہے بلکہ وہ شاید انسان ہی نہیں رہ گیا ہے۔ اسی لیے دل کے معاملات میں اس کی ناز ترین ریزہ خونی کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ میں کمالی شعریات کی تجویز پیش کر رہا ہوں یا سچے بنامیاتی معیار کی بدست کر رہا ہوں سوائے اس کے کہ میں اس مٹی کو سلام پیش کرنا چاہتا ہوں جس نے ایسے ایسے توانا لوگوں کو جنم دیا ہے جو ہماری تہذیب کے لیے ماس بہا اور بہتر م ہیں، جو اس ملک سے تعلق رکھتے ہیں، جن کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ آج میں خود کو بھی اسی ملک میں پاتا ہوں۔

میں میر تقی میر سے عزت مند شاعر اور ملک سونیدن کو ورسونید شاکار کی کو سلام پیش کرتا ہوں۔ اس کے اندر وہ مکان، ہے لچک اور زریں چھٹیں نے میری شاعری، ہند میرے وطن اگلی، کو ٹوٹیل نغمہ کا اعزاز دینے کا فیصلہ کیا ہے جو اس صدی کے پسے پچس برسل، بالخصوص چھپائی گئی نسلوں میں، دب اور دوسرے فنون لطیفہ کے مقابلے میں، جو ہماری تہذیب کے لیے بنیادی طور پر اہم تھا، بہت زرخیز رہا ہے۔

خطبہ

شاعر اور ان کی سب سے

"The night is long that never finds the day"

”طویل ہے وہ رات جو کبھی دن کو پا نہیں سکتی۔“ ”میکس“ میں لکھے ہوئے یہ الفاظ ٹیکسیر کے ہیں، اور یہ ہمیں شاعر کے مزاج کو بچپن میں مدد دیتے ہیں۔ پہلے تو قاری شاعر کی صدقوں میں پوشیدہ بچپن کے دوست کے، غائب ایسے دوست کے، حیرے اور حرکات و سکنات لیے نمودار ہوتا ہے، جو تنہائی میں بند آواز میں solitary readings کا تجربہ رکھتا ہو گھر سے نکالنا کی قیاسی صورت، خاص بل غلط پہلی کی قدر انداز میں اپنے آپ پر عائد ہو۔ اس صورت حال کو ایسے کچھ شعر کی بکاول سے چاہتے کی کوشش کی جاتی ہے جو سائنسی اعتبار سے اچھی ہوتے ہیں اور ایسے عاقلانہ حد سے جن کی گوریل پسے سے ملے شہد ہوتی ہیں۔

کسی انسان کی گھری شاعرانہ نقل، شاعر کے نزدیک صرف رقص کی تریا ہوتی ہے، ایک ممکن حقیقت، حالانکہ اس کی سب سے بڑی شیان نقل یہ ہوتی ہے کہ بہت سارے سنانوں سے گزرا کر جائے اور ہر 7 ہجے شعر کے ذریعے زمین یا موجودات کی سچی نیوں کے درمے میں ان سب کو متحد کیا جائے۔ معصومیت یا بوقت ایسی بگنی کیفیت ہوتی ہے جو تقسیم ترین قابل ادراک کیفیت کی پیش کش کی اجازت دیتی ہے۔ اور شاعر کے دوست کی معصومیت اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ پہلے شعر کی توان میں ایک منطقی کیفیت ہو، جو پسے جتنے حکم کی مانند ہو کہ اس سے حسب ضرورت رجوع کیا جاسکے، یا لٹکا ہو جو شاعر کو نصب پیشوی (شہابی) شکل کی تخلیق کرنے میں مدد دے۔ شاعر کے دیگر قارئین طرہ قدیم کے شاعر ہوتے ہیں، جو ناز و تحریر کے گئے صفحات کو ایک حیانت و رفاصے سے دیکھتے ہیں۔ ان کے شعر کی جیکر مسئلہ ہوتے ہیں، اور پائے سے جیکر بنانے مشکل ہوتے ہیں جن کے ذریعے ان کو توجہ کیا جاسکے۔

کہانیوں و زمانوں سمجھنے والا انسانوں پر کام کرتا ہے اور ان کی نقلیں تیار کرتا ہے، اس طرح وہ کرداروں کے معاملے میں اپنی تمام ہوشیائیں کر لیتا ہے۔ (جب کہ) شاعر بے شمار اشیا کے ساتھ اپنی صورت اور اپنے اہام میں لگن رہتا ہے۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس کو مایوں ہونا چاہیے یا خوش امید۔ (کہ) وقت گزرنے کے ساتھ وہ واحد چیر و کئی چہروں میں بدل جائے گا، تمام شاربے قبول اور ناقابل قبول خیالات ہو جائیں گے۔ یا یہ کچھ ابتدائی نگہوں کی اشاعت کے وقت ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر کو توقع تھی، پھر اسے کی گھریں عبادتی جائیں گی۔ اور ایک بار یہ کہنا تجربہ ضروری ہے کہ ایک نئے شاعر کی

کرتے تھے۔ طلبہ و فنکاروں میں کام کرنے والے اور مزدور تو کیا میں صرف ایک تجزیہ کی قریح کی تلاش میں تھا؟ پھر میرے کچھ ضرورت سے زیادہ فن قیامت کی طرف رجحان تھا؟ اس کے برعکس، میں ایک مثال تھا کہ تہائی کے خیال کو کس طرح توڑا جاتا ہے۔ تہائی، شیشپیری کی ”طویل رات“، سیاست دانوں کی مابعدیہ۔ جن کو ذہنی یا مدنی جگہوں کے دوران Tyraneus جیسے شاعر کی ضرورت تھی۔ شاعری کے میں ”وہیں گئے“ جسے یورپی ناول کا تسلسل سمجھ گیا تھا۔ اہم اہل وہ انسان وہی کا سوہوہ تھا۔ میں ہمیشہ سے کہتا رہا ہوں کہ جنگ انسانوں کو اپنے معیار تبدیل کرنے پر مجبور کرتی ہے، اس سے قطع نظر کہ ان کے ملک کو فتح نصیب ہوتی ہے یا شکست کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ شعریات اور فلسفیات پارہ پارہ ہو جاتے ہیں، ”جب پھر گرجا گئیں اور دیواریں مہذب ہو جائیں“ تو کیا شعر ہر کی فلسفہ سب پر بحال ہو جاتے ہیں۔ جب پہلے جوہر کی دھماکے سے تسلسل میں غلے لایا گیا تھا اسی نقطے پر یہ گستاخانہ تھا کہ اس پخت کو طوطا کیا جاتا جس نے ہم کو شعری تہذیب کے دور و دور شعری آوازوں کی پیش قدمیوں سے خستہ رکھا تھا۔ موت کی انھا ٹی کے بعد، اخلاقی اصولوں، حتیٰ کہ مذہبی اصولوں پر بھی ساری شان لگ جاتی ہیں۔ اب علم، جو اپنی حقیر ٹی بنا پائی کا سیہیوں سے چنے رہتے ہیں، خود کو شاعری کی بے قراریوں سے الگ کیے رکھتے ہیں۔ شاعر رات سے، اپنی تہائی کے ذہن کا ٹھکانہ پاتا ہے اور ایک ایسے دنیا کے کی شروعات کرتا ہے جو اس کے وجود کے لئے زیر قائل ہوتا ہے۔ اور مدحیہ پیش قدمیوں کی ابتدا کرتا ہے۔ اہل سیاست اور معمولی درجے کے شاعر اپنی عدمیتوں کے ہنر اور معمولی نہ پاکیزگی کی تلاش میں اہل شاعر سے تھک جاتے ہیں یہ کاری کرتے ہیں۔ یہ ایک کہانی ہے جو خود کو ذہنی ہے مرنے کے دنگ کی طرح، تھک جاتے مرنے کی تیسری باجنگ کی طرف۔ شاعر بنیادی طور پر مقدم نہیں ہوتا اور باطن اپنی تہذیب کے خیال کو توڑ کر اس میں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا، جس میں بے شمار دماغی تھک چکی ہوتی ہیں، جیسا کہ وہی تھکوں کے دور میں ہو سکتا تھا۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہیکروں کو تہہ گر رہا ہے، جب کہ اس کے برعکس، وہ اس کو نہیں پر عمل کر رہا ہوتا ہے۔ وہ شاعری سے رزمیر شاعری کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے، تاکہ دنیا کے بارے میں اور انسان کے پیدا کردہ دنیاوی عذاب کے بارے میں عقلی اور جذباتی انداز میں بات کر سکے۔ اس طرح شاعر ایک خطرہ بن جاتا ہے۔ سیاست والے معاشرتی آزادی کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور مقصدانہ تنقید کے ذریعے شاعری کے بنیادی تصور کے پیچھے ہی سے ہوا نکال دینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تحقیقی عمل کو سوچ کے لئے غیر دنیاوی اور لاعلمی قرار دیتا ہے، گوئی شاعر انسان ہونے کے بجائے گمشدہ ایک تجربہ ہے۔

شاعر اپنے دور کے انسان کے متنوع ”تجربات“ کا حامل بن جاتا ہے۔ اس کی نہایت تجرباتی یا پہل کار نہیں ہوتی بلکہ کلاسیکی معنوں میں خمد اور غصوں ہوتی ہے۔ اہلیت کہتا ہے کہ دانتے کی زبان ”ایک عام زبان کی تکمیل ہے۔“ اس کے باوجود اس کا ’سانہ اسلوب‘ دانتے جس کا سب سے بڑا اثر ہے، ایک نہایت مشکل اسلوب ہے۔“ شاعر کی زبان کو اس کی صحیح اہمیت دی جانی چاہیے۔ نہ یہ Parnassians کی

نہایت ہے نہ سناو اتوریے کی، بلکہ خصوصاً ان ملکوں میں جہاں بڑوں کی آکھوں عزیز شہادت اور وہی
 عداوت پیدا کر دیتی ہے۔ ماہرین لسانیات بھی کہیں چارے والے نہایت کوٹہ بارہ زندہ نہیں کر سکتے۔ یہ وہ حق
 ہے جو باختریت غیرے شاعر کی کلیتہاً ہوتا ہے۔ اس کی زبان مشکل ہوتی ہے، علم نہایت کی وجوہات پر
 مشغول تاریکیوں سے نہیں، بلکہ اس کے اپنے مواد کی وجہ سے۔ شاعروں کی حقیقت کا ترجمہ کیا جاسکتا ہے
 مگر یہ کام اہل علم نہیں کر سکتے، اس لیے کہ دہلی ڈاکٹر اور نہایت بڑی استعداد رکھتے ہیں دوسرے شاعروں
 کی تکنیک اور عداوت کی حقیقت پر متواتر نقل کرنے میں، سو دیکھ گئی، اور اخذ خیالات کے لیے، ان سچائیوں
 کے لیے جن پر ان کی مشورہ ہوتی تھی، جب وہ کہتے اور انیسویں صدی کے عظیم ذہنی شاعروں سے
 مشابہت نظر آنے لگتی ہیں۔ شاعر اپنی روایت سے چھٹا رہتا ہے اور بین الاقوامیت سے پرہیز کرتا ہے۔ اس
 علم، کسی ایک قسم کی محدود شاعری کی روشنی میں، یورپ، بلکہ پوری دنیا کے دوسرے ملک اس طرح سوچتے ہیں
 کہ وہ شاعری تمام دنیا میں ایک جیسی "شے" ہوتی ہو۔ اور اس قسم کی شاعر نہ سمجھ کے رقیب و رقیب کے پابند
 اس علم و روشنی کے قسم کے مواد کو پسند کرتے ہیں اور شدت سے دوسروں کو رد کر دیتے ہیں۔ مگر، کابعدی
 کے اس پر دے کے مسئلہ ہمیشہ مواد کا ہوتا ہے۔ اس طرح شاعر کا لفظ تمام انسانوں کے دلوں پر شدت سے
 ضرب لگاتے لگاتے ہے، جب کہ مطلق علم والے سمجھتے ہیں کہ ایک حقیقی ادیب اس وہی کیسے رہتا ہے۔ ان
 کے مطابق، شاعر عداوتوں میں محصور ہوتا ہے اور اس کا منہ دینی و مذہبی تجدد (syntactic trap) سے گھر
 کر ٹوٹ جاتا ہے۔ سیاست و اس علم سے قائمہ اٹھتا ہے جنہیں ہم عصر روحانی حیثیت کا پورا ادا کر
 نہیں ہوتا، بلکہ ایسے (روحانیوں) سے جو ہم، ہم دنیاویوں سے بھی پیچھے رہ گئے ہوں۔ تہذیبی یا گت کے
 نام پر وہ ایک جھجک دلاؤں اور پڑا شوبہ وسیع کا کہیں کہتا ہے جس میں مذہبی حقیقتیں اب بھی عقل انسانی
 کی غلطی پر اصرار کرتی ہیں۔

مذہبی شاعری، سابق شاعری، غنائیہ و ذرا فنی شاعری سب انسان کے گہارے مختلف درجات
 ہوتے ہیں جو صرف اسی صورت میں ضابطے کے مطابق ہوتے ہیں مگر دستور کے مطابق مواد بھی درست
 ہو۔ یہ نتیجہ کہنا ایک سنگین غلطی ہو کہ ایک روحانی فن، کسی فرد کی خصوصی جذباتی حالت (ایک مذہبی
 کیفیت) "سماج" کی وسعت پر منتج ہو سکتی ہے۔ نتیجہ نفس کشی، انسان کی انسان سے دست بردار نہ
 ضابطہ موت کے سوا کچھ دوسریں۔ سچ تحقیقی جذبہ ہمیشہ بھیجے، محنت کیوں کا شکار ہوتا ہے۔ شاعر کی یہ وہ
 دلت چیت کا، انحصار اکثر پھار عظام پر ہوتا ہے، انہیں جذبات کی آزادی پر جو کچھ نفس پر خود کو غلام پاتی
 ہے۔ وہ تنگیوں میں مدد کرنے والے، جس قابل اجازت کی پریشانی کو تھلہ میر سے، وحشت ناک شیا کے عام اور
 سادہ تجزیوں سے خوف زدہ کر دیتا ہے۔ شاعر موت سے خوف زدہ نہیں ہوتا، اس لیے نہیں کہ وہ میر کی
 بھائی پر یقین رکھتا ہے بلکہ اس لیے کہ موت اس کے خیالات میں کثرت آتی رہتی ہے، اور اس طرح وہ ایک
 پرسن جھیل کی صورت میں نکاسے کی صورت ہو جاتی ہے۔ اس حد تک کے ہر نفسی وہ (شاعر) انسان کا ایک ایسا

تصور رکھتا ہے جس میں انسان کے خواب بھی ہوتے ہیں، انسان کی بیماریاں بھی ہوتی ہیں، مفلسی کی بدچلتی سے انسان کی تباہی بھی۔ مفلسی، جو کسی بھی صورت میں اس کے لیے اب زندگی کی قیامت اٹھا رہی ہو سکتی۔

سیاست دان کی طاقت کا اندازہ کرنے کے لیے۔ اس میں مذہبی حقائق کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ اسی طرف، کلام کی دور کے بعد، شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ کے میدان کی خاموشیوں کو یاد کرنا ہرگز ان کا ایک جزو نہیں رہا، بلکہ پندرہویں صدی کے دور کی ان تصاویر اور ان کے مواد کی طرف بھی ایک نظر ڈالنی ہوگی، کیونکہ ان سے اپنے دور میں کرنے کے امکانات جاری کیے گئے۔

مگر یہ صورت پسندانہ تنقید فنون لطیفہ کے تصور اور اس کے پیکر پر ضرب لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ ان میں جوش سے جانے والے مواد کے تفصیل پر تحقیقات کا اکتفا رہتی ہے جن کے ذریعے فنون کی مکمل آزادی پر قدغن لگایا جاسکے۔ دماغ، شاعری، سیاست کی "تیسری" کوششوں کو منظور نہیں کرتی۔ یہی آئی اور قسم کی تنقیدی جمل اندازی کی خواہش کسی بھی قسم کی بنیاد پر ضرورت کی جائے۔ شاعر اپنی تخلیقی یا جاتی راہوں سے انحراف نہیں کرتا، اس طرح اس کو دنیا اور اپنی جگہ کو، دنیا کا سامنا کرتے ہوئے اپنی تباہی کا عذاب سہنا پڑتا ہے۔

مگر کیا عصر کی جاسیاب جیسی کئی شے وجود رکھتی ہے؟ اور کیا ساقی سچے اور معنی خیز مشورے دیتا ہے؟ ابھی تک اس وقت پر وقتی existentialist یا کسی شاعری کو نظر نہیں آتی ہے، فلسفہ نہ دکھانے کے لیے تیار رہتی ہے، ان کا بلکہ نفسی بحرانوں کا بھی قائل اور وقت قیامت کرتے ہیں، جب کہ سیاست دان اس اقلیت پر جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریڈ کلام شاعری کو پُر فریب استحکام کی ہوا دینے کی کوشش کرتا ہے۔

تو متنبہ ہیں میں شاعر اور سیاست دان کے درمیان مخالفت رہتی ہے۔ آئی، وہ دونوں دھڑکتے دنیا پر جن کی حاکمیت قائم ہے، آزادی کے مفاد تصور کا پرچار کر رہے ہیں، حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ سیاست دان کے لیے محض ایک قسم کی آزادی ہے، جو اس کو ایک ہی سمت لے جاتی ہے۔ اس بار کو تو ایک کا مشکل ہے جس نے تہذیب کی تاریخ کو فنون سے داغ دار کیا ہے۔ ہمیشہ کم از کم دو طریقوں سے تہذیب کی آزادی کو دیکھا جاتا ہے: وہ آزادی جو ان ملکوں میں پائی جاتی ہے جہاں میں گہرا سماجی، انقلاب آچکا ہے (مثال کے طور پر فرانسیسی انقلاب، یا اکتوبر کا انقلاب) اور وہ جو ان ملکوں میں ملتی ہے جو دنیا کے بارے میں اپنے تصور کو بدلنے سے قائل ہوئی شدہ قدر سے اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

کیا شاعر اور سیاست دان مل کر کام کر سکتے ہیں؟ شاید ایسے ممالک میں کر سکیں جس کا پہلی طرح رشتہ نہیں ہوا ہے، مگر بغیر دونوں کی مکمل آزادی کے۔ ہماری عصری دنیا میں سیاست دان مختلف نوٹ کے مؤقف اختیار کرتے ہیں، مگر شاعر اور سیاست دان کے درمیان بیانیہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ ایک تو انسان کے اندرون کے ادب آداب کے بارے میں فکر کرتا ہے، جب کہ دوسرا انسان کی صف بندی کرنے کے پیکر میں رہتا ہے۔ (ہاں،) کسی مخصوص عہد میں، انسان کے اندرون کے ادب آداب کی جستجو سے سماج کی تعمیر کے خدا جانوں کے مطابق ہو سکتی ہے۔

مذہبی طاقت، جیسا کہ ہمیں پہنچے ہی کہہ چکا ہوں، جو کثرت سیاسی اقتدار کے ساتھ مل کر بند ہوتی ہے، ہمیشہ اس قسم کی مخوف جدوجہد کا مرکزی کردار رہی ہے، اس صورت میں بھی، جب وہ بظاہر غیر جانبدار ہو۔ وہ اسباب جن کی وجہ سے شاعر، اپنے لوگوں کے اخلاق کا پیمانہ (barameter) بن جاتا ہے، سیاست دان کے لیے خط بانک ہو جاتا ہے، ہمیشہ وی ہوتے ہیں Giovanni Villani نے Croniche Fiorentine (ویرانی کی نوکڑوں کا انتخاب - مترجم) میں جن کا حالہ دیا ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں کی طاقت کے لیے کہتا ہے کہ: "میں نے 'شاعر کی حیثیت سے اپنے Commedia (پندرہویں صدی کا اعلیٰ مزاحیہ قصیدہ جو اٹلی میں اب بھی کھیلا جاتا ہے - مترجم) میں شاعری اور شورش سے خوب نظر اٹھاتا ہے، غیر ضروری حد تک، مگر شاید اس کی ملک بدری اس کی ذمہ داری تھی۔"

Villani سے بالکل مختلف، رنٹے رنٹے زمانے میں لکھا۔ Dolce Stil Nuovo (تیرہویں صدی کے اٹالیہ میں نئے نئے ادبی تحریک - مترجم) کی عمدہ hermes شاعری میں راستے طریقہ اضافہ کرتا ہے کہ انسان کا اور سیاست دان کا درمیان میں کشیدگی اپنی افراطی دیانت سے ختم ہونے کے بغیر، اپنی مبراہیت کی بنا پر نہیں، مگر اس کے گردانی سے دور کے مطابق کیا جائے والا انصاف، آفاقی اعتبار سے، مذہبیت پر مبنی ہے۔ حسن پرستیوں نے نہایت حقیقت کے ساتھ ان شعراء کو جو جی کو دے رہے ہیں، غیر شاعرانہ کے حلقہ نسیب میں ڈال دیا تھا۔ "Triviale tra le nane eterne" یعنی "معمول لوگ ابدی کنواریوں (خود) کے جبروت میں مسکراتے ہیں" جیسے مصرعے ہمیشہ ایسے لگتے ہیں گویا وہ اپنی موجودگی کی روشن خیالی کا پرچہ رکھتے ہیں، انسانی نرم دلی سے آراستہ کرنے والے ہیں، یا پھر وہ اپنے وقت کی مسابقت کی گمراہیوں میں نہیں اترتا، خواہ وہ سیاسی خطرے کی بنا پر ہو یا محض اس کی اپنی کالی کی وجہ سے۔ مثال کے طور پر پندرہویں صدی میں Angelo Poliziano نے Medici Joust کے لیے اپنے لکھے ہوئے ایک بند میں اپنی فن کارانہ آزادی دکھائی ہے جس میں بہت احتیاط کے ساتھ ایک، وقف کنواری کے بارے میں کہا ہے کہ وہ غیر مذہب خدائیں کے ساتھ کلیسا میں عبادت کے لیے جاتی ہے۔ مگر لیونارڈ ڈا وینچی، ایک مختلف انداز میں لکھے ہوئے آزاد نہیں تھا۔ اس مقام پر آزاد دلی اپنے صحیح معنی اختیار کر رہی ہے، یہ کچھ اور نہیں ہوئے اس کے کہ سیاسی طاقت کا وہ ایک اجازت ہے جو شاعر کو اپنے ذاتی غیر رسمی طبع میں داخل ہونے کا اختیار دے دیتا ہے۔ Angelo Tasso بھی آزاد نہیں تھے، نہ Abbot Parini، نہ Alfieri، نہ Foscolo۔ ان مزاحیہ لوگوں کے فن تخلیق نے وقت کے ساتھ ان کو انسان کی آواز کو پہچاننے والوں میں شمار کر لیا۔ ایک عوامی حیرتوں میں فوج کرنی لگتی ہے، مگر وہاں وہ دردمند کالوں کی جھڑپ سے کچھ نہیں ہے۔

مگر کیا سیاست دان خود آزاد ہے؟ نہیں۔ دماغ وہ برداریوں جو اس کو گھیرے ہوئے ہیں، اس کے مقدر کا فیصلہ کرتی ہیں، بلکہ ایک ممبر پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ تاریخ کے ان دور مرکزی گورنروں کے اطراف، دونوں ایک دوسرے کے حریف، اور دلی بھی آزاد نہیں۔ اور شاعر سے ہماری مراد ہے کسی ایک

عہد کے تمام لکھنے والے۔ جذبات ٹھڑکتے ہیں اور نتیجے میں تازہ عجز آتے ہیں۔ اور (فلسفوں کے) صرف عادت جنگ میں زیادہ القادس میں اسن ہوتا ہے۔ انقلاب ترتیب کا علم نہ داتا اور جنگ بھری کی پیش نہ۔
 لکھیں (عالمی) جنگ، ایک قوم سے دوسری قوم تک، گمراہی تھی دنیا میں، یہ سیاست کا، شہری اب آداب کا۔ اس کی توڑ پھوڑ کی شدت نے پھوٹی پھوٹی آزدیوں کو بھی توڑ مروڑ کر رکھ دیا تھا۔ خود مزاحمت میں بھی ایک احمدی حیات ابھر تھا جو ایک چائے پیچے نے حمد اور کی دشمنی میں پیدا ہوئی تھی، مزاحمت بذریعہ تہذیب و روح انسانیت، جس نے وہ محل کے انداز میں طاقت اور کے مقابلے میں "گام اور میدانوں میں سر اٹھایا تھا۔"

ہر ملک میں ایک تہذیبی روایت اس قسم کی فوری تحریک سے الگ تھلک رہتی ہے۔ یہ روایت محض عارضی نہیں ہوتی، مگر چند مدت پسند ہنگ والے جو تہذیب کی "جائیداد" پر مبنی تھی کہ میں سرمایہ کاری کرتے ہیں، اس کو ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ میں محض عارضی کے غلط پر اصرار کرنا چاہتا ہوں، اس لیے کہ عصری تہذیب کے مرتزے کا (جس میں قسط کی موجودگی شامل ہے) زرخ، روح اور جذبے کے تقابلی کی طرف نہیں، بلکہ انسان کی شکست مدیوں کی جوڑنے کی کوشش کی طرف ہونا بہت خوف، نہ غیر موجودگی، نہ راپر دانی و نہ کمزوری شاعر، کچھ اجازت دیں گے کہ وہ دوسروں کو ایک غیر مددگار طبیعت کی مقصد کی طرف اشارہ کریں۔

شاعر کہہ سکتا ہے، انسان آج سے شروع ہوتا ہے، سیاست وال کہہ سکتا ہے، بلکہ حقیقت میں کہتا رہتا ہے، کہ ہمیشہ کی طرح انسان اپنے اخلاقی کمیتہ پن کے نام میں پکڑا جائے گا، یہ کمیتہ پن جو پیدائی نہیں بلکہ جان بوجھ کر داخل کی ہوتی، وہ میں اثر کرنے والی لادائی پھیلت کی آلودگی سے ہوتا ہے۔

سچی، جو سیاسی دانش کے ناقابل رسائی مدیوں میں چھپائی گئی ہو، سب سے پہلے نتیجے کے طور پر بتاتی ہے کہ شاعر عرف صدر کے ناموں میں کلام کر سکتا ہے۔ مزاحمت اخلاقی ایمان ہوتی ہے شاعرانہ نہیں۔ ایک سچ شاعر کبھی کسی کو برا دینے کے لیے لفظ کو استعمال نہیں کرتا۔ اس کا فیصلہ ایک تحقیقی نظام کا حصہ ہونا ہے، کسی ایسا ہی سمجھنے کی طرح تکلیف نہیں داتا۔

یورپی لوگ مزاحمت کی اہمیت سے واقف ہیں، مزاحمت عہدہ دور کے ضمیر کی عاثر مثال رہی ہے۔ مزاحمت کا دشمن اپنی تمام چیخ پکار کے وجود آج محض ایک سر یہ ہے، جس کی نیا رو طاقت نہیں ہے۔ اس کی آواز اس کی تجویزوں کے مقابلے میں نیا رو غیر ٹھہری ہے۔ متبادل حیثیت کو شاعر کے ہاں کے مخالف کی حالت کے بارے میں دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ جب مخالفت برپا ہوتی جاتی ہے تو شاعری سیاست وال کی طاقت سوانح کو ایسے خیال میں تبدیل کر دیتی ہے جس سے فائدہ، غلبہ جاتے ہاں کو مانہ کیا جاسکے۔

مزاحمت ماضی اور حال کے درمیان گویا کش کی ایک کامل مثال ہے۔ خون (ریزی) کی زبان بھی معنوں میں نہ صرف ایک ڈراما ہوتی ہے، (بلکہ) یہ ایک فیصلہ کن اظہار ہوتی ہے، انسان کی حقوق نہیں لوجی کی مسلسل آزمائش کا۔ یہ سب مزاحمت کی پیداوار تھا اور پسندیدہ کا، ماضیہ شخصیات کے لیے جو اس نظام سے متعلق نہیں،

جنگ نے جن کو بھول کر چاہا تھا۔ ان شخصیتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جا چکا ہے۔ موت ایک خود مختار فیصلہ نہیں
 جا چکی ہے، اور منطق کے لایا ہی سرٹ رہائی کے ذریعے اس خیمہ میں کسی قسم کی حفاظت ایک غیر انسانی فعل
 ہوگا۔ شاعری کی وفاداری کسی قسم کی ممانعت یا موت کے ارادوں سے ہی سے رہتی ہے۔ سیاست ناں چاہتا ہے کہ
 لوگوں کو معلوم ہو کہ بہت سے کیسے مرا جاتا ہے جب کہ شاعر چاہتی ہے کہ لوگ بہت سے زندہ رہیں۔

شاعر سیاست ناں کی طاقت سے واقف ہوتا ہے، اور سیاست ناں شاعر پر اس وقت توجہ کرتا ہے
 جب اس کی آواز سنانے کے مختلف تنبیہات تک پہنچنے لگتی ہے، یعنی جب غنائی و رزمیہ تخلیق اپنی تمام تر خوبیوں
 اور کمزوریوں کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ ایسے وقت میں شاعر اور سیاست ناں کے درمیان ایک زیریں جدوجہد
 شروع ہو جاتی ہے۔ تاریخ میں شاعریوں کے نام پڑنے کی طرح استعارے کیساتھ ہیں، جب کہ سیاست ناں
 تہذیب کو قائم رکھنے کا دھڑکی کرتا ہے۔ ہمیں وہاں عمل و وعرف اس کی طاقت کو کم کرنے کی کوشش کرنا رہتا ہے۔
 ہمیشہ کی طرح، اس کا مقصد صرف انسان کو غنیمت یا چار قسم کے بنیادی آغا دیوں سے محروم کرنا ہوتا ہے، تاکہ
 انسان اپنی اپنی گردش میں مستقل و پختہ رہے۔ کوشش میں مصروف رہے جو اس سے چھیننا چاہتا ہے۔
 ہمارے زمانے میں سیاست ناں تہذیب سے، اور اسی طرح شاعر سے بچاؤ کے لیے چور کی چھپے اور

علی الاعلان بے شمار طریقوں سے، انوں طرح کے حربے آزماتے تھے۔ ان کا آسان ترین حربہ ہوتا ہے
 تہذیب کے تصور کا انحصار کرنا۔ میکائیلی اور سائنسی حربے، ریڈیو اور ٹیلی ویژن، فونو گراف کے تحت کو توڑنا
 ایسی شاعری پر دستِ شفقت پھیرنا جو سائے کو بھی پریشان نہ کر سکے۔ ان کو سب سے پسندیدہ شاعری ہمیشہ
 وہ ہوتی ہے جو Arcadia (رومان کے جزائر کا ایک حصہ۔ مترجم) کی یادوں کے اتنی دے اپنے عہد کی فن
 کاری کی اہانت کرے۔ مکی مطلب ہے Aeschylus (525 قبل مسیح کا یونانی ڈراما نگار۔ مترجم) کے ایک
 مصرعے کا۔ اس نے لکھا تھا، "میرا امر ہے کہ مردے زندہ لوگوں کو مارتے ہیں" جس سے میں نے اپنی
 تازہ ترین کتاب La terra impareggiabile کی ابتدا کی ہے۔ اس کتاب میں انسان کا مقدس ہرگز ارض
 سے کیا گیا ہے۔ اگر انسان کی قربانیت کے نام میں کرم کرنا گناہ ہے تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدائیں
 طاقتیں۔ اور اگر اس میں "مردہ" کی صفت کا اضافہ کر دیا جائے تو قربانیت محدود ہو جائے گی اور یہ ظاہر ہو جائے
 گا کہ یہ کئی حاکمانی قسم نہیں بلکہ یہی اس کا اصل قیمت ہے۔ اپنی حدوں سے تجاوز کرتی ہیں جب وہ اپنی
 طاقت کے شمال سے فروتن کو بلادیتی ہیں، بجائے اس کے کہ غمخیزانہ انداز میں "گ" سے معاملہ کریں۔

عوام کو پیش کی جانے والی تہذیب کے تصور کا بگاڑ، جس کو یہ یقین دہاؤ جاتا ہے کہ وہ دانش کی جنت
 کا ایک معمولی نقطہ نہ کر رہے ہیں، وہی جدید سیاسی ترکیب نہیں، مگر جان جو بھڑکنا انسان کی بربادی کا یہ طریقہ
 نیا بھی ہے اور کارگر بھی۔ خوش امیدوں ایک ٹھوس مشین بن چکی ہے، یہ بدداشت کے کھیل کے ساتھ سمجھ اور
 نہیں۔ اساطیر اور اہلکارات (فوق الطبیعت واقعات کے بارے میں تشویش) نہ صرف قتل کے معمول کی طرح
 تک گر جاتے ہیں، بلکہ تہذیبی حیرت سے سنیما کے لیے بنائی جانے والی فلمیں، میگزینوں اور کھیل کارڈوں کی

رومید کہاں تک جاتے ہیں۔ شاعر اور سیاست دان میں سے ایک کا چناؤ اس میں شامل نہیں۔ خوش نوا شاعری، جو ہلاکت غیر ہم سونے کا حیدر کرتی ہے، (فوسس کہ) تہذیب کو اس کی تاریخ کے اندر سے کہنے میں بند کر دیتی ہے، یہ یقین لاتے ہوئے کہ قزاق کا سفر بھٹن تک نہیں ہے، کرمان و اس کے کچھ ہمیشہ محدود رہے ہیں اور رہیں گے، نہ مرنے والے کل میں بھی اور نہ بھی۔ یقیناً، شاعر جانتا ہے کہ ماہ۔ اشتعال اُمیر، ماہ۔ آتی بھی ممکن ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تہذیب کی کتنی چھٹی پائیں کرنے والے ہی اس میں تفریق آتش زنی بھی کرتے ہیں۔ کسی بھی نظامِ عہد کے کھٹنے والوں پر مبنی college ان کے مرکزی گروہ ہوتی ہی آسانی سے بددیانت بناتا جیسے کہ رولز فوج کے کھٹنے والوں کو۔ پہلے گروہ والے راج کی ہدایت خوش فہمی کے ڈیسے اپنی حیات جاویدانی کا دعویٰ کرتے ہیں، جس کو وہ اپنی غیر ممکن ذہنی زندگیوں کے رنگوں سے بھی آراستہ کرتے ہیں۔ تہذیب، تاریخ کے پچھلے کھوں میں، خفیہ طور پر سیاست دان کے خلاف اپنی حالتوں کو متحد کرتی ہے۔ مگر یہ اتحاد طارئینی ہوتا ہے جو آمریت سے دور، نہ سے پھر کر دے دے میڈ جسے کام کرتا ہے۔ جب یہ حالت انسان کو ہلاکتی آراء دیوں کی تلاش سے متعلق رہے ہوتی ہے تو آمریت کے زیرِ ناپ یہ خود کو مستحکم کرتی ہے۔ جب آمریت کھٹکتا ہے، یہ اتھا۔ غالب ہو جاتا ہے اور گروہ دوبارہ برکتے ہیں۔ شاعر اکیلا ہوتا ہے۔ اس کے اطراف ایک دیوار اٹھتی ہے نفرت کو، جس میں اپنی زر پرست اپنے اپنے پھر ڈالتے ہیں۔ شاعر اس دیوار کی بلندی سے دنیا پر نگاہ ڈالتا اور فرار کرتا ہے، عام لوگوں کی سطح پر اترے بغیر، گھومتے پھرتے بنانوں کی طرح محسوس میں، ایک علم کو طرح۔ اسی way Tower سے، جو دھوا لویت کو شراب کرنے والوں کو بہت عزیز ہوتا ہے، وہ عوام کے درمیان، نہ صرف ان کی جذباتی ضرورتوں میں، بلکہ ان کے حامد یا ہی خیالات میں بھی داخل ہوتا ہے۔

یہ محسوس فضا حسرت و بے رغبت نہیں۔ خاموش محاصرے کے مرنے والے شاعری اپنی تمام ممکن میں اور اپنی نوع انسان کی تمام سرگزشت میں حتیٰ ہے۔ گھن و دل ادب جو سیاست دان کے طرف دار ہوتے ہیں پوری قوم کی نمائندہ نہیں کرتے وہ صرف ان ہی حالتوں کے احکام کی بھائی کرتے ہیں جو چاہتے ہیں کہ کچھ نیتوں کے لیے، دنیا میں شاعری کو زور دے۔ اور یہاں رولز وادنی کے قول کے مطابق ”شاعر کی زندگی جاتی ہے۔“

بورس لیونا ڈوچ پیسٹرناک

امیتاف کمال۔ ہم عصر عثمانی شاعری اور ادبی زبان کی تنظیم دہائی ۱۹۱۰ء کی دہائیوں میں
اس کے کاموں کے لیے۔

(بورس پیسٹرناک نے اپنے ملک کی حکومت کے تیر کے تحت انجمن قیوم کرنے سے انکار کیا تھا)

ادبی زبان کا شاعر بورس پیسٹرناک اپنے شاہکاراوب "ڈوکٹر ڈوچگو" (Dr Zhukov) کی وجہ
سے دنیا میں مشہور ہوئے اس مادل کے منظر عام پر آتے ہی روس کی انقلابی حکومت نے اس پر پابندی لگا دی
اور پیسٹرناک کو روس، دیوب کی انجمن سے خارج کر دیا گیا (پیسٹرناک کے انتقال کے بعد جب سوویت
یونین کا خاتمہ ہو گیا تو اس کا اثر بڑھ گیا تھا) مگر بہت جلد ہی سوویت یونین سے "ڈوکٹر
ڈوچگو" کے اٹھارہ ہزاروں میں ترجمے ہوئے۔ جب اس کو نوٹیل ختام کے لیے مامور دیکھا گیا تو روس میں
بہت حیرت ہوئی اور مجبوراً پیسٹرناک کو یہ اعزاز جس کو وہ قیوم کر چکا تھا، دیا گیا تھا۔

پیسٹرناک نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کہیں کے مجموعے (1914) Biznesvuchaki سے
کیا۔ پہلی جگہ عظیم کے زمانہ پیسٹرناک ایک خارجی غور پر پڑھنے والے انا پیس تھا اور ساتھ ہی اورال
(Ural) کے پہاڑی علاقے میں قائم ایک کیمپ کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ پوس کے ایک شخص کی وجہ

سے اس کو فوجی ملازمت سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ اور مالی کے سفر کے دوران اس کو "کراٹر ٹراگو" کے لیے کافی کامیابی حاصل ہوئی۔ اگرچہ پوسترماک سوویت یونین کی انقلابی حکومت کی دہائی سے خلیفہ زود تھا مگر وہ انقلاب کا طرفدار نہ رہا۔ پوسترماک کے والدین اور بہنوں نے اس سے ترکیب ڈال کر کہا اور سب کے سب جہنمی ہجرت کر گئے مگر اس نے اپنا وطن چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔

انقلاب روس کے بعد پوسترماک کتب خانے کے مستم کے طور پر کام کرتا تھا۔ ایک نئے شاعری حیثیت سے اس کی ابتدائی شہرت اس کی کہانوں (1917) اور My Sister's Life (1922) سے ہوئی۔ پوسترماک کے واحد بڑے مشہور شاعر ہونے کو کہتے تھے ایک شخص کہ "کاش تم کو علم ہوتا کہ میرے بچے تمہارے کہتے ہوئے ایک شاعر سے دلہانہ پیار کرتے ہیں، بالخصوص میرا بیٹا، یوں، جو ایک نوجوان شاعر کے طور پر وہی میں مشہور ہوا ہے۔ تمہارا بے حد مرگرم چاہا ہے، تم کو پسند آتا ہے، اور جو میرے خیال میں خود کو تمہارا شاعر دیتی سمجھتا ہے۔ دراصل وہی ہے جس نے تم کو روس میں سب سے پہلے متعارف کرایا ہے جہاں اس وقت تک تم سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔"

پوسترماک نے 1920 کی دہائی میں شہر ذہنیت سوانی اور سیاتس شاعری کی اور کچھ انہی نے بھی کہے جو (1922) The Childhood of Lovers کے مجموعے میں شائع ہوئے۔ کچھ صدی کی دوسری دہائی کے درمیان اس نے ذاتی موضوعات پر لکھنے سے کنارہ کشی کر لی اور اس کی توجہ صرف انقلاب پر مرکوز ہوئی۔ پوسترماک نے تاریخی اور اخلاقی مسائل کا مطالعہ شروع کیا جو اس کی نثر کی کاوش Vozhushnye Piti اور غم The Year Nineteen Five میں ظاہر ہوا۔ جب مصنفین کی انجمن نے ادیبوں پر اشتراکیت کے نظریات کو پہنچنے شروع کیے تو پوسترماک نے کھٹا بندی کر دیا اس لیے کہ اشتراکی موضوعات میں اس کے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ پوسترماک تو دراصل اخلاقی اور فلسفیانہ مسائل میں اس کی دلچسپی بڑھتی تھی۔

سوویت ادبی جمعیہ نے Novye Mir نے پوسترماک کے شہرہ آفاق ناول "کراٹر ٹراگو" کو زور کر دیا۔ اس کی پہلی شاعرت روسی زبان میں ہو چکی تھی مگر حکومت نے اس پر فوراً پابندی لگا دی اور یہ پابندی تین برس تک نافذ رہی۔ یہ ناول آخر کار 1988 میں جب سوویت روس میں آزادی اظہار کی فضا بحال ہوئی، شائع ہوا۔ دنیا بھر کے ادبی مہرین نے "کراٹر ٹراگو" کو بیسویں صدی میں روسی زبان کا سب سے بڑا ناول مقرر کیا ہے۔

پوسترماک سیاسی وجوہ کی بنا پر سوویت اشتراکیت کا مخالف نہیں تھا۔ اس کا اختلاف دراصل بحالیاتی نظریات کی بنا پر تھا۔ وہ سرکاری ادبی نظریات کے جبر کو قبول کرنے کا قائل نہ تھا اور یہی وجہ تھی جو اس کے لیے حکومت کے قہر کا باعث ہوئی۔

پوسترماک ماسکو سے جین میل کے ناول پر مصنفین کی ایک آدوی میں مشہور رہا۔ اس کی آخری ادبی کاوش Aleksander تھی جو ایک کہیں کی صورت میں اس نے پیش کی تھی۔ یہ ناول "کراٹر ٹراگو" کے

پہلی ایک فلم 1965 میں بنائی گئی جو بہت کامیاب ہوئی۔

یورن پوسٹراک 1890 میں ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا جو ماسکو میں آباد تھا۔ اس کا باپ ماسکو کے معروف رے، ایک اسکول میں پروفیسر تھا۔ اس کی ماں ایک مشہور پیانو بجاتے والی تھی۔ پوسٹراک Moscow Conservatory میں مبتلا کیے گئے، خواہش کی بنا پر داخل ہوا تھا۔ پندرہویں سال کی عمر میں اس کا دل اچھٹ گیا۔ اس نے جونیئر مارگ یولی وری میں پروفیسر ہرمن کوہن (Herman Cohen) سے فلسفہ پڑھا اور 1914 میں ماسکو واپس آ گیا۔

یورن پوسٹراک نے ۱۹۲۵ کے قریب گتہ میں شائع ہوئیں، جن میں اس کی اپنی شعری اور نثری تصنیفات کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادیبان کی تحقیقات کے تراجم بھی شامل ہیں۔ یورن پوسٹراک نے 1960 میں انتقال کیا۔



اسیٹر کامیو

اعترافِ کمال اس کی ان ہم ادبی تحلیلات کے لیے جو واضح نظری کے ذریعے ہمارے دور کے انسانی ظہیر کے مسائل کو اجاگر کرتی ہیں۔

ایک نیم پرہیزگار ہستی سے تعلق رکھنے والے کامیو کو زندگی میں کچھ حاصل کرنے کے لیے مادی جدوجہد شروع کرنی پڑی۔ ایک مفلس طالب علم ہونے کی وجہ سے اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لیے اس نے ہر طرح کے کام کیے۔ کامیو کی تعلیم کا سلسلہ بہت جلد رتی ٹکڑا کر ایک طرح سے اس میں خیر کا بیج بکھیر دیا۔ ہر طرح کے بدستے ہوئے تعلیمی سسٹم کی مشکلوں نے اس کو وہ تھوٹھکا دیا جو آگے چل کر اس کی زندگی میں بہت کام آیا۔ الجزائر یونیورسٹی میں تعلیم کے کئی برسوں کے دوران ہی وہ ایسے حلقے کے اہم لوگوں میں شمار کیا جانے لگا تھا جو آگے چل کر شمالی افریقا میں فرانسیسی سامراج کے خلاف جدوجہد میں پیش پیش رہے۔ کامیو کی ابتدائی کتابیں الجزائر کے مقامی اشتراکی اتحادوں نے شائع کیں مگر جب وہ صرف کچھ برس کا تھا کہ ایک صحافی کی حیثیت سے فرانس چلا گیا۔ جنگ کے بعد رزورٹ ماحول کے ہاتھوں کم عمری میں ہی تو زن اور اعتدال کا حشر بھگایا۔ والد کامیو جلد ہی شہر کے صفا فوں کے ادیبوں میں شمار کیا جانے لگا۔ دنیاوی زندگی اور فنانس کی حقیقتوں کے بارے میں شدید تصانیات کے شکار کامیو نے اپنی ابتدائی تحریروں میں ہی ایک طرح کا روحانیت آمیز انداز نظر اختیار کر لیا تھا جو کئی حد تک پتھر کا دور کے عدالتی

کے لوگوں کے مخصوص انداز نظر

”مہربانی میں جوں سے روشن دنیا کی تاب مانی ایک لمحہ مزاجوں کی مانند ہے

جس کا منظر سب کے دھبوں سے پامال ہوتا ہے۔“

کامیو کا یہ اس قضیہ تحریر کی بھی نمائندگی کرتا ہے جس کو نظریہ وجودیت کا نام دیا گیا ہے جو کائنات میں انسان کی ذات کو اہمیت دینے سے منکر ہے اور اس کو بے معنویت کی جنگ سے لگتا ہے۔ کامیو تحریروں میں بے معنویت (absurdity) کی اصطلاح کی متعدد غباریے (lemon) کی طرح بار بار استعمال ہوئی ہے جس کو اس نے تمام تر منطقی اور اخلاقی اعتبار کی عقلوں تک دسترس دے کر از رو، ذہن و دلی اور کرب سے شسٹ کیا ہے۔ اپنے ایک مقالے میں کامیو نے انسانی زندگی کے بارے میں الہیاتی استوارے کی مذمت کی جامع علامت کے طور پر استعمال کیا ہے جس میں Sisyphus مسلسل ایک پتھر کے ٹکڑے کو بے مشکل پتھریں پہاڑ کی چوٹی تک لے جاتا ہے جہاں پہنچ کر ہمیشہ ٹکڑا ٹوٹتا ہو جیسا آج کا ہے۔ یہاں کامیو نے اپنی توضیح اور اپنے انداز نظر کے مطابق Sisyphus صرف اپنی کوشش ہی سے مطمئن ہو کر خوش ہوتا ہے۔ کامیو کے نزدیک یہ جاننا ضروری نہیں کہ زندگی زندہ رہنے کے قابل ہے یا نہیں، اس انسان کو زندگی کی تمام تر حشر سامانوں اور محرومیوں کے ساتھ زندگی گزارنے کا جبر آنا چاہیے۔

کامیو کے بہترین ماہیوں میں سے ایک اول The Stranger تھا جس میں اس نے لکھا تھا

”آج میری ماں مر گئی۔ یہ ممکن ہے کہ مرنے ہو، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ بس گھر سے

ایک مار گیا تھا جس میں لکھا تھا: ”ماں کا انتقال ہو گیا۔ کمال تعجب ہوئی۔“۔ تمہارا

ظلم“ میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ تب مرنے ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ کمال

کی بنا ہو۔

فرانس کے مشہور ادیب تھیاں پاں مارتر سے کامیو کے بہت قریبی مراسم تھے مگر اس نے مارتر سے

اس لیے کٹ رہے تھے کہ تھیاں مارتری کردہ دستاویز کی سہولت کی حمایت کرتا تھا۔

اسیجر کامیو الجزائر کے ایک عام سے خاندان میں 1913 میں پیدا ہوا۔ اس کے ماں اور باپ

دو افسانہ نویس تھے۔ کامیو کا باپ بھی عینی جنگ میں رہا تھا۔ کامیو کی ماں کو جب اس کے شوہر کے

مرنے کی اطلاع ملی تو صدمے سے اس کے دماغ کی شریک پھٹ گئی اور اس کی زبان مفلوج ہو گئی اور وہ

تمام عمر اسی کیفیت میں رہی۔ 1923 میں کامیو کو وظیفہ دار اور اس کا داخلہ الجزائر کے مدرسہ Lycée میں

ہو گیا جہاں اس نے 1924 سے 1932 تک تعلیم حاصل کی۔ چوتھی سے کامیو کو تپ دق کا مرض لاحق ہو گیا

جس کا اس وقت تک کوئی سرسٹ اور عمل علاج ایجاد نہیں ہو تھا۔ اپنی بیماری کی وجہ سے کامیو کسی طرح کے

کلیں کوڈ میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ اس عارضے نے کامیو کو ساری عمر تک لیا۔ کامیو نے 1936 میں الجزائر

کی یونیورسٹی سے فلسفے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اپنی بیماری سے نجات حاصل کرنے کے لیے یورپ کا سفر کیا۔

کا یونک پندرہ کے قریب کتابیں شائع ہوئیں۔ انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے۔ کامیو صرف پینتالیس سال زندہ رہا۔ اس کا 1950 میں فرانس کے شہر Sens میں کار کے حادثے میں انتقال ہوا۔

ضیافت سے خطاب

’پ کی مزد کا مٹی نے بہ عکاسیت فرباں جو ہزار مجھ کو عیا کیا سے اہ کے لیے بے پادں شہرگز مٹی مجھ پر واجب ٹھہری ہے، انصاف میں جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ یہ میری ذاتی سمیت کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ ہر انسان اور شے وجودات کی بنا پر، پر ہر فن کار کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کو پہچانا جائے، اس کی قدر افزائی ہو۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ عمر چوں کہ میں اپنی حقیقت کو بہتر جانتا ہوں اس لیے ’پ کے فیصلے کے عواقب کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ ایک تقریباً جہان آدمی، جس کا کام ابھی مکمل نہیں ہو ہے، صرف غلط فہمیوں سے میں گھرا ہوا، محکمتوں سے دور بھاگنے والا اور کام کا حق کی خلیقوں میں زندگی بسر کرنے کا سادی بھلا کیوں غیر معمولی ہوں میں گرفتار نہ ہو جائے گا جب اس کو اپنا تک ایسے اعزاز کی خبر ملے جو اس کی اس کی تنہائیوں سے نکال کر چکا چودہ روشنیوں کے بچوں سے لاکھڑا کر دے۔ ادا کرتے ہوئے اعزاز کو قیوس کرتے وقت اس کے جذبات کیا ہوں گے جب چوپ کے کتے کی دیب اجن میں بہت سے مشابہہ شامل ہوں، نیاں ہند کی گر قیوسوں اور انصاف میں نے نے میں جب اس کا چا مولد و من ایک راستگی بد حالی سے گزر رہا ہو۔

میں نے کچھ ایسا ہی بھنکا اور اندرونی خلش رکھ لی کیا ہے۔ عمر یک گنہ اسن اور سکین کی خاطر میں نے اس نعمت غیر مترقبہ کو بہ سرو چشم قبول کیا ہے۔ اور چوں کہ میں صرف اپنی کامیابیوں کے بل بوتے پر خود کو اس کا حق دار نہیں پاتا، میں کسی چیز کا سبب مان نہیں لے سکتا سوائے اس کے جس نے تمام زندگی مشکل سے مشکل حالات میں بھی مجھے سہارا دیا ہے۔ یعنی اپنے فن کے نظریے کا اور سمجھنے والے کی حیثیت میں اپنے کردار کا۔ میں شکور اور دوستی کے جذبے کے تحت آسان اتفاق میں تانا چاہوں گا کہ یہ نظریہ ہے کیا۔

جہاں تک میری اپنی ذات کا سول ہے تو میں اپنے فن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر میں نے اس کو ہر شے پر بھی فوقیت نہیں دی ہے۔ اس کے برعکس مجھے اس کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس کو اپنے ساتھی انسانوں سے الگ نہیں کر سکتا، اور یہ مجھ کو اپنی موجودہ حیثیت میں اور انہیں کی

مہادی کی سطح پر نذر رکھتا ہے۔ یہ بے شمار لوگوں کو آپس کی خوشنودی اور دیکھوں کو پسندیدہ تصویر دیکھا کر حریت میں رکھتا ہے۔ یہ فہم کار کو گٹ تھک رہنے سے باز رکھتا ہے، اس کو بے پناہ محنت اور آفاقی سچائی کے تابع کر دیتا ہے۔ ورود جو خود کو دوسروں سے مختلف سمجھ کر فہم کی راہ اختیار کرتا ہے، بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ نہ تو وہ اپنے فہم کو باقی رکھ سکتا ہے نہ اپنی انفرادیت کی جب تک کہ وہ یہ قبول نہیں کریتا کہ وہ بھی دوسروں میں سے ہے۔ پھر فہم کار اپنے آپ کو دوسروں سے جوڑ دیتا ہے، دوسروں میں اس میں جس کے بغیر اس کا گزارہ نہیں اور اس سانچے کے جس سے وہ ناکام نہیں توڑ سکتا۔ ای وہ جو سے ایک سچا فہم کار کسی بھی شے و حقائق سے مسترد نہیں کرتا، اسی لیے اس کو حقیقی فیصلہ پر غلبت کرنے کے بجائے پوری طرح سمجھتا ہوتا ہے۔ اور اس فہم کار کو کسی بھی وقت اس نتیجے میں کسی ایک کے ساتھ ہونے کا مشکل فیصلہ کرنا پڑے تو وہ وہی دانش ور ہو کر ایک عام کارکن تو اس کو اس معاشرے کا ساتھ دینا ہوتا ہے جس میں، یہ قبول طے، منصف نہیں بلکہ خالق کا حکم چلتا ہے۔

اسی طرح سمجھنے والے کا کردار سامان نہیں ہوتا۔ وہ نامیخ سارہ لوگوں کی خدمت گزار کی نہیں کرتا بلکہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جو نامیخ کا ذکر سمجھتے ہیں۔ وہ نہ وہ نہ صرف سمجھتا ہوتا رہ چکے گا بلکہ اپنے فہم سے بھی محروم ہو جائے گا۔ تمام جوہر جیروں اور انہوں نے فہم کی وجہ سے اس کو خدائی سے نکال دیا۔ انہیں لگی خواہ وہ ان کا بڑا جوش عالی ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس ایک مہم نام قیدی کی مجبوراً موٹی بھی، جس کو دنیا کے دوسرے گونے میں مذہب کے حوالے کر دیا گیا ہو، وہ جب کو اعلیٰ ادب سے خود ساختہ جہاد یعنی اس وقت تک نہیں پر مجبور کر دیتی ہے جب وہ اپنی تمام تر آبرمانشوں کے باوجود اس خاموشی کو فہم موٹی نہیں کر پاتا، ورود خود کو مجبور دیتا ہے کہ وہ اپنے فہم کی حدود سے ما اعلیٰ کو مسترد کرے۔

مہم میں سے وقف بھی اتنا غصیم نہیں ہوتا جو اس قسم کے کام کے لیے موندوں ہو۔ پھر بھی اپنی زندگی کی تمام اونچ نیچ میں بھی، اپنی شہرت ہو یا مہم نامی، استبداد کے بندھنوں کی جکڑ بندی ہو یا آزادی کی ایک رقی عیاشی، ادب ایک متحرک معاشرے کے دلوں کو جیت سکتا ہے پر شرط ہے کہ وہ اپنی فہم صلاحیت کی حدود تک سچائی اور آزادی کی خدمت گاری کا جو جہاد کرے۔ چوں کہ فہم کار کا کام نہ وہ سے نہ وہ کوئی کوئی چاہ اور متحد کرنا ہوتا ہے اس لیے اس کے فہم کو کسی بھی صورت میں جھوٹ کی خدمت یا اس سے مصالحت نہیں کرنی چاہیے کہ ایسی صورت میں وہ اپنی تنہائی کی جیاری کرے گا۔ ہماری جو بھی مہم زوریاں ہوں، ہماری مہارت و ذہن داریوں سے غلبہ ہوتی ہے جن کا بیجا سامان نہیں۔ جس بات کا مہم ہو، اس کے بارے میں دور رس گفتی سے انکار کرنا اور جبر و حتم کی مزاحمت کرنا۔

اس پاگل نامیخ کے فہم میں، اپنی نسل کے انسانوں کی طرح، وقت کے تشبیح میں کھوئے ہوئے ہونے کے باوجود مجھ کو ایک خفیہ سے احساس کا مہاراجہ کر اس دور میں سمجھنا ایک اعزاز کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ یہ کام قسے داری کا ہے، اور وہ بھی صرف سمجھنے کی ذمہ داری کا نہیں۔ میری امدادی قوت

اور حالات کو ہٹانے کی تمام ٹوئیں کی معیت میں جو مر رہے تھے اور امیدوں کے باوجود ہمارے دور میں
سائنس کے رعبے تھے، یہ ڈیڑھ لاکھ میرے لیے تھیں یہ فائنٹ تھی۔ یہ لوگ جو عالمی جنگ اول کی ابتدائی
میں پیدا ہوئے تھے، جو تقریباً بیس برس کی عمر کے تھے جب محمود میرا اقتدار آیا تھا اور جب میں ہارنٹلیوں
پر مشتمل چلائے جا رہے تھے، سپر میس کی خانہ جنگی اور دوسری جنگ عظیم سے جس کی تربیت ہو رہی تھی،
نظر بند حصوں اور مشرق قیدیوں سے جو پ کے ٹوئیں کو جیو ہری آتھیں وہ کی بھینائی تھیں ان کی
درمیان اپنی نسلوں کی حفاظت کرنے پر توجہ دینی چاہیے۔ میرے خیال میں کوئی بھی ان سے رجحانیت کی توقع
نہیں کر سکتا۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ ہم کی اپنی جدوجہد میں کی سیے بغیر ان ٹوئیں کی غلطیوں پر ہم درود
توجہ کرنی چاہیے جو یہ تھی موتی ڈا امیدی کے رہنما اور جویت اور نہائی جنگ کی طرف راغب ہوئے۔ مگر
حقیقت یہ ہے کہ میرے ملک اور یورپ میں، ہم میں سے بیشتر نے، کی لادجویت کو رد کر دیا۔ جہاں کو
عظیم تھیں ان کے نہانے میں اور نہائی ڈا امیدی کے لیے، زندگی کے نئے طریقے کو ماننے پر سے ہیں جن کو ہم
سے وہ موت کی دھمک سے آگے نہیں لے سکتے۔

بدعجب برآں دنیا کو سدھانا چاہتی ہے۔ میری نسل خوب جانتی ہے کہ دوسرا سدھانیں۔ کئی، اس کا مدفن نہیں نیا وہ مشکل ہے مگر، وہی گواہ آپ کو بتا دے کہ یہ کتنی کی جدوجہد میں تو شامل ہو سکتی ہے۔ مگر مادہ دنیا کے وارث، اچھے ہوئے، کامیاب، ترقی یافتہ، ترقی یافتہ سے، یہ ہوتی ہوئی ٹیکنالوجی، مادی دنیا کے لئے نئے نظریات، جہاں معمولی درجے کی حقیقتیں سب کو بتا دے تو کر سکتی ہوں مگر یہ نہ جانتی ہوں کہ کائنات کس طرح کیا جاتا ہے، جس قدر کہ قدرت چاہے، اور قدرت اور مشق کی غلام ہو گئی ہو، اس نسل کو پہچاننے کی ہمت ہے، خداوند اور پیروں کو دنیا میں اس طرح کا نظم کرنا ہے جس میں زندگی اور موت دونوں کو قرار حاصل ہو۔

اسرار کے خفیہ میں مبتلا دنیا کو، جس میں عبادت کے لئے عبادت گاہوں کی حاکمیت قائم کرنے کا خطرہ ہوں لے رہے ہوں، معلوم ہونا چاہیے کہ وقت کے دھارے کے خلاف کئی قوموں کے درمیان ایسے امن کی بنیاد رکھنی چاہیے جو حلقہ گمشدگی کے مترادف نہ ہو، نئے سرے سے محنت اور تہذیب کی تعمیر کیا سکتی چاہیے، اور ماضی کے انہوں کوں کریمہ و بیعت کی ایک کشتی نوح بنائی چاہیے۔ مجھے اس پر یقین ہے کہ یہ نسل اتنا بڑا ہدف حاصل کر سکے گی، پھر بھی یہ تمام دنیا میں پھر ضروری ہے تاکہ سچائی اور آزادی کے دھارے پہنچنے کا مقابلہ کر سکے اور آخر ضروری ہو تو اس کے لیے بذات خود کے جان بھی دے سکے۔ اور جہاں سے بھی یہ کچھ ملے اس کا احترام ہونا چاہیے، بہت اہمیت کی جانی چاہیے، بالخصوص جہاں یہ خود کو قربان کر رہی ہو۔ بہر کیف، اس یقین کے ساتھ کہ آپ اس امر کی اجازت دیں گے کہ میں وہ اعزاز جو آپ نے ابھی مجھ کو عطا کیا ہے، اس نسل کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

کھینچنے والے کی حرکت و مہارت کی نجات کے اعتبار سے اس خود ساختہ مجھے اس کو اس کے اصل مقام پر بھی رکھنا چاہیے تھا۔ اس (اویس) کا کسی پرستی و محبت نہیں ہوتا ہے اُن کے جس کو وہ جد و جہد

میں اپنے ساتھیوں میں شریک نہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ غیر محفوظ غمزدہ نہیں ہے، سچائی کے خوف غمزدہ نہ ہو، غمزدہ درحقیقت میں جو شیے، بھیر کسی غمزدہ کی وجہ سے مرے زمانے کے سامنے بنے کام انجام دیتے والے، غمزدہ درحقیقت کے درمیان تقسیم ہو جانے والے، اور اپنے دہرے وجود سے غمزدہ کی ہوائی تخلیقات کو دیکھنا، اس کے ساتھ تاریخ کے چاہ گئی رازوں کے درمیان ایسا دہرے کرنے والے۔ ان سب کے ہوتے ہوئے ہلا کوں اس سے کھل کر ورلڈ غمزدہ کی توقع رکھ سکتا ہے۔ (۱) سچائی مہم اور پراسرار ہوتی ہے جس کو ہمیشہ مستحکم کیا جانا چاہیے۔ (۱) "مادہ خطرناک" شے ہے اور اس کے ساتھ گزرا مشکل ہوتا ہے اس لیے کہ یہ مفروضہ بناتی ہے۔ پتی کم زور میں کے کھل اور ماک کے ساتھ اور باوجود مشکلات کے اس کی طویل راہ پر ان دو غلطیوں کی طرف قدم بڑھانے چاہیے، اور اگر لکھنے والا خود کو کسی کے ایک مہم کے طور پر پیش کرے گئے تو؟ جہاں تک میری ذات کا سوال ہے تو میں ایک بار پھر صرف صاف کہہ دیتا چاہتا ہوں کہ میں اس قسم کا اور نہیں ہوں۔ میں نہ کبھی روشنی کو مسترد کر سکتا ہوں، نہ اپنے وجود میں آنے کی سیرت کی اور نہ اس آزادی کو میں جس کے سرے میں پروان چڑھا ہوں۔ اگرچہ دنیا میں یہ کیفیت میری بہت سی غلطیوں اور کم زور میں کی صفائی پیش کرتی ہے، بدعجب اس نے ہی میرے اپنے فہم اور حرفت کو بہتر طور پر سمجھنے میں میری مدد کی ہے۔ یہ آواز بھی مجھے ان تمام بے زبان لوگوں کو سنا، فراہم کرنے میں مدد کر رہی ہے جن کے لیے زندگی اس دنیا میں محض غمزدہ خوش حالی کی امید کے ساتھ نہیں۔

بند اپنی اوقات کے مطابق، آپ کی ان حمایت فراوانی پر کہ مجھے اس اعزاز کے قابل سمجھا گیا ہے، میں اپنے خیالات پیش کرنے میں خود کو نیا دہرے دیکھوں گے ہوں، اور دہرے دہرے دہرے کی مشکلات کے، میں یہ کہنے میں اور بھی زیادہ آزاد ہوں کہ میں اس عہد کو ان لوگوں کے لیے شہادت عسکرت کے طور پر حاصل کر رہا ہوں جنہیں اس جدوجہد میں حصہ لینے کے وہ جتن سنائے بدلتی اور اپنے اس کے بوقت مطالعہ، وقت خدمت میں سب میرے لیے دلی کی گہرائیوں سے ملی الاطاف، اپنے ذاتی شکر کے ساتھ، یہی کہنا باقی رہ گیا ہے کہ میں تمام طرز کے مطابق ویسا ہی وعدہ و قرار کی گنا چاہوں گا جیسے کہ ہر سچائی کا ہر مددگار ہونے والی شخصیتوں میں خود سے کہہ رہا ہوں۔

ہوان رُہمان ہیسے نیر

اعترافِ کمال۔ اس کی غزلیہ شاعری کے لیے، جو ہسپانوی زبان کو بلند عروج تک اور بحالیاتی پاکیزگی کی اعلیٰ مثالیں دکھاتی ہے۔

ہسپانوی زبان کے شاعر شوان ہیسے نیر کی پیدائش کی جگہ سے اس کا مولد بین الاقوامی سطح پر بالخصوص ان ممالک میں جہاں ہسپانوی زبان بولی جاتی ہے، بہت مشہور ہو اس لیے کہ اس کی اعلیٰ درجے کی تخلیق ”ایک نوجوان شاعر کی نثری تفہیم اور اس کا گدھا“ (1914) Placerbo Y Yo ہسپانوی زبان کے ادب میں کلاسیکی سرمایے کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کی ابتدائی شاعری نسبتاً ہی بولتی اور عمدہ عیش کے شوق سے مزین ہر کثرت تھی۔ اس کی شاعری کے دھڑلے دور میں جو 1917 سے شروع ہوتا ہے، ہوان نے بے باکی تفہیم نکلیں۔ یہ ہے جاس اس لیے کہ ان کے ان نظموں میں اس نے پیش کیے جانے والے نقوش کو ان کے بنیادی جوہر تک محدود رکھا تھا۔ ہوان کی شاعری کا مرکزی موضوع یکسانی اور دنیا کا بے مثال حسنِ فطرت تھا۔

ہوان کے باپ نے 1900 میں انتقال کیا اور اس مدغم نے اس کو شدید غم زدگی اور مایوسی میں مبتلا کر دیا۔ اپنی اس کیفیت سے نکلنے کے لیے اس نے باپس اپنے مولد Moguer کا رخ کیا۔ اس کے بعد سے اس کی عمر موت اس کے احساپ پر چھائی رہی۔ شاعری میں حسن کے تجربے کے ذریعے ہی اس نے ہمدردی و غما کے خلاف جدوجہد کی۔ اس کی قومی بیماری اس حد تک بڑھی کہ ہوان کو فرانس چارٹر ایک مینی

نوریم میں داخل ہوا پڑا تھا۔

چوبیس اور اسی سال کی عمر کے درمیان جوان کے نو عدد شعری مجموعے شائع ہوئے۔ بعد میں اس نے یہ چارے ہوئے کہ شاعری میں کمال اکتھار حاصل کرنا ممکن ہے، یہی بہت ابتدائی شاعری پر بھی نظر پڑی تھی۔ اس کے شروٹ کے مجموعے *Almas De Violeta*, *Ninleas*, *Aras*, *Rimas* 1902, *Tresses* (1903), *Jardines Lejanos* (1904) اور *Pastorales* (1905) تھے جن میں شاعر نے متعارف پر حیرت اور مظاہر قدرت کے تاثیراتی نقوش کو شاعری میں قید کرنے کی مہارت اور ہنر مند کی مظاہرہ کیا ہے۔ ہون فن مصوری کی مہارت سے بھی سمجھتا تھا (جس میں بنیادی رنگوں کے نقشہ استعمال کے ذریعے جتنی پیمائش کی گئی ہے، تزیینات نگاروں پر چوری توجہ نہیں دی جاتی) ساتھ ہی وہ محدود بینائی کی سطح کا بھی اندر دیکھتا جس کے سننے میں وہ کافی وقت گزارتا تھا۔

جوان نے شاعری میں مختلف اوزان کے استعمال کے تجربے بھی کیے۔ اس نے مرکی دیہہ زمینیا کا پیردنی (*Zenobia Camprubí*) کی مدد سے مشہور سند شاعر بعد راتھ یورپی نکتوں کے ترجمے بھی کیے اور بہت مقبول نظم *Platero and I* لکھی جس میں *Platero*، یعنی ایک گدا بھی شاعر کے ساتھ ساتھ شہروں اور دیہاتوں میں گھومتا پھرتا ہے۔ شاعر کی لسانی ہنر مند اور اداؤں کے لیے ایک بے نشان کا ساتھ ایک حسین استعاراتی تفریق کا ساتھ چھٹا کرتا ہے۔ گدھے کی موت کے بعد شاعر اس کی قبر پر جا کر اس سے سوال کرتا ہے، ”کیا تم اب بھی بھٹکنا دیکھتے ہو؟“

جوان نے 1916 میں لیبیہ کی طرف سفر کیا اور اس سے شادی کر لی۔ جوان کی زندگی میں یہ پہلا اہم ہجری سفر تھا۔ دوسرا ہجری سفر اس نے 1948 میں کیا۔ ہجری سفر نے ہون کے خیالات کو محدود کیا اور پائی کو یہ امن بدلتی ہوئی سماج کے نیچے کی گہری تنگدستی کی طرف متوجہ کیا۔ اس سفر نے اس کی تخلیق *Diano De Una Poesia Recien Casado* (1918) میں آزاد شاعری اور متنازی میت (*Concentrated Form*) کی تکنیک استعمال کرنے کا فیصلہ پیدا کیا۔ اس نظم کے بے شمار سرے ہر شکل و طرح کے نکتوں سے نکلتے ہیں۔ بعد میں جوان اپنی پائی شاعری کی سادہ طرز کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جوان 1881 میں ایک بینکار کے گھر پیدا ہوا۔ اس نے اپنے بچپن اور جوانی کے دن *Moguer* کے نہایت حسین علاقے میں گزارے۔ بعد میں اپنی شاعری میں اس نے اپنے مولد کے دیوں اور علاقے کے قدرتی حسن کو استعاراتی اور تشبیہاتی انداز میں خوب برتا۔ جوان نے بہت کم عمر ہی میں لیبیا نکلا شروٹ کر لیا تھا۔ دراصل اس نے اپنی پہلی نظم اس وقت لکھی جب وہ صرف سات سال کا تھا۔ ہون نے *Cádiz* میں واقع *Jesus Academy* میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور *Universty of Seville* میں قانون پڑھا۔ اسی دوران جوان نے مصوری میں بھی دلچسپی لی۔ قانون کی تعلیم مکمل نہ ہو سکی اور مصوری بھی بقیہ دن چھٹی بہت ہوئی۔ اس کے بعد اس نے اپنا سارا وقت اور اپنی ساری صلاحیتیں تصنیف و تالیف کے

لیے وقف کر دیں۔

ہسپانوی زبان کے مشہور شاعروں Francisco Vallsespa اور Rubén Dano نے، جن کی نظموں سے "ان کی شخصیات" اپنی مرثیوں میں تزیینی تھیں، اسی کو میڈیا آنے کی شہرت دی۔ ہوانا دومینڈا کی شاعری اور اپنی محنتوں میں جدیدی روح کی متعارف ہوئے پند بھی کیا جانے لگا۔ اس نے جدید ادبی محنتوں میں اپنا ایک مقام بنالیا اور وہ اپنی پھرے کرنے والے رسالے (1902 Helos اور Renacimiento) (1905) شروع کیے۔ اگرچہ Helos صرف ایک ہی سال نشر ہوا مگر ہوانا کی شاعری کی شہرت اور ترقی اور ترقی ہی اعتبار سے اس کو بہت اہمیت ملی۔

ہوانا کی ادبیات کے قریب تصنیفات شائع ہوئیں۔ اس نے 1958 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

(الحکام پانے والے ادیب کی ضیافت میں غیر موجودگی کی وجہ سے ان کی تقریر پر ڈورٹو ریگو پوئی ورٹی کے ترجمہ Jaine Benze نے پڑھا۔ سنائی)

"میں (اپنی ذات سے میں) اس بلوا جب غراؤ کو جو معزز سوئیڈش اکادمی نے مجھے عطا کرنے کے لیے مناسب سمجھا ہے، احساس مسئولیت و شکرگزاری کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔ بیماری اور غموں کی پورش کی بنا پر میں ڈورٹو ریگو کی مجلس میں پہنچنے پر مجبور ہوں اس لیے آپ کی تقریرات میں بلاوجہ راسخ شہرت سے معذور ہوں۔ اور تا کہ آپ میرے اپنے قلمی احساسات سے آگاہ ہو سکیں، جو میں نے ڈورٹو ریگو کی سرزمین اور یہاں کی دوستیوں سے اخذ کیے ہیں، میں ڈورٹو ریگو پوئی ورٹی کے مترجم پناذاتی نامزد ہونا نہ بھیج رہا ہوں تاکہ وہ 1956 کے نوٹس نوامات کی تقسیم کی تقریرات میں شہرت کر سکیں۔"

میں Juan Ramón Jiménez کے لیے اپنے قلب کی گہرائیوں میں ایسا اور لگاؤ پاتا ہوں اور ان کے کام کا اتنا ادراک رکھتا ہوں کہ اگر آپ مجھے "حرف کریں تو، میں خصوصاً تحکم کے لیے آپ ہی کے ہم وطن دانش ور ویرڈوں میں مراعات کرنے والے کام لیتا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ بھی اس سے اتفاق کریں گے۔ میری مراد آپ کے عظیم شاعر Hjalmar Gulberg سے ہے جنہوں نے "ج شام جو کچھ پیش کیا ہے اس کو ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے اور Juan Ramón Jiménez کی شاعری کے ترجمے کو بھی جس کے فضائل انداز کے اس باکمال شخص کی طلباء کی اکیڈمی سے اکیڈمی کی مجلس کے سامنے پیش کیا ہے۔

Juan Ramón Jiménez نے مجھے یہ کہنے کی بھی تاکید نہ تھی کہ ”اس نغمہ کی اصل حق ہمارے ہی
 اہلِ نثر و نثر ہے۔ اس کی رفاقت، اس کی جد اور چالیس برس تک اس کے وجدان کے سبب بھی میرے لیے یہ
 کہو کچھ جھنجھکیا ہوا ہے۔ اس کے خیر آج میں اپنے آپ کو بالکل بھرا دوسرے ہی رنگ میں ڈال رہا ہوں۔“
 میں نے خود Juan Ramón Jiménez کے رزوتے ہوئے لبوں سے دل چسپائی کا بے انتہا منہ
 کن اظہار سنا ہے۔ Juan Ramón ایسا شاعر ہے کہ اس کا کہا ہوا ہر لفظ اس کے اپنے لہروں کی دنیوی
 عکاسی کرتا ہے۔ اور میں مشتاقانہ میدانِ گمنا ہوں کہ ایک دن اس کے فم کا انکب داس کی تحریریں میں بھی جھنجھکی
 کا، اور یہ بھی کہ نثر و نثر کی دوسرے شاعر کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا فیض ثابت ہوگی۔



ہالدور کیلیان لیکسنیس

اعترافِ کمال۔ اس کی وضع اور پروٹا دوسرے کے لیے جس نے ملک لینڈ کے عی قن بیان کا
احیا کیا۔

لیکسنیس اپنے ن افسانوں کی وجہ سے مشہور ہے جن میں مجھیروں اور کسانوں کے مشکل حالات
زندگی کی نقش نگری کی علق سے نورال تاریخی ماولوں کے لیے جن میں قوی ورمعاشرتی مسائل کے ساتھ
ساتھ رویت اور اساطیر پر مبنی مذکورے فلم بند کیے گئے ہیں۔ گنار گنارسن Gunnar Gunnarsson
(1939-1975) اور کرستمان گوڈموندسن Kristman Guðmundsson (1902-1983) کے ساتھ
لیکسنیس بھی ایک قوی سٹیج پر ملک لینڈ کے مصنف کے طور پر مشہور ہوا۔

”ساکا واکا“ (Saka Vaka) لیکسنیس کا ناول تھا جس نے اپنی ور قوی سحر مے پر
مصنف کا متقدمتین کردیا۔ اس ناول میں بھی، اس سے پہلے ناولوں کی طرز، اشتراکی نظریات کو
منعکس کیا گیا تھا۔ اس ناول کی کہانی ایک نوجوان عورت ساکا اور مجھیروں کے ایک چھوٹے سے گروہ کے
درمیان ہے۔ اس گروہ کے سچ کوئی بدو متا جملہ اور مانی گئی کے کاروباریوں کی شکل میں داخل ہو
جاتی ہے اور یہ لوگ اس گروہ کے مزدوروں کی تحریک کے خوف صفا برا بدلتے ہیں۔ نکلستان میں اس
ماوس کی بہت پڑیاں ہوتی، یہاں تک کہ وہاں ایک مشہور اخبار نے مشورہ دیا کہ اس ناول پر مبنی فلم بنائی

ہے جس میں اس نام کی مشہور کارہائیں گارڈو سکا کا کردار کرنے کے لیے منتخب ہوئے۔
 دوسری جنگ عظیم سے پہلے اور بعد میں لیکسنیس نے جو کچھ لکھا وہ صرف آئس لینڈ کے باشندوں
 کے سیاسی اور معاشرتی مسائل پر تھا۔ لیکسنیس کی قبول تصنیف، Sjallazen Folk, 1934-35, (Independent People) میں آئس لینڈ کے ایک چھوٹے سے کسٹن کی پیکر تراشی کی گئی ہے۔ اس ناول
 کی پہلی بیسویں صدی کے اوائل کے چلی منظر میں آئس لینڈ کی ایک دور افتادہ دی کے بارے میں ہے
 جس پر ایک انڈسٹریل جاگیردار اس کے شریک کار نے سفلی عمل کر دیا ہے اور وہاں کے باشندوں کا سرخند کسان
 پنڈت بیویوں کی ہلاکت اور اولاد کی کٹارہ کٹی کے باوجود اپنے معاشرتی حالات سٹورنے کی جدوجہد کرتا
 ہے۔ ہجر کار کسان وہ کچھ حاصل کر رہا ہے جس کی اس کو تمنا تھی۔ اس ناول کو آئس لینڈ کے اشتراکیوں
 نے بہت پسند کیا اور 1937 میں جرمنی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا مگر بعد میں اس پر سرکاری پابندی عائد کر دی گئی۔
 لیکسنیس نے بعد میں جو ناول لکھے وہ نیا دور غنائی و راس کے اپنے نفس کے مشاہدے کے بارے
 میں تھے۔ یہ بعد میں لیکسنیس کے 1932 میں سوویت یونین کے سفر کے دوران غربت اور معاشرتی نظام کی
 ماکائی کے مشاہدے کے رد عمل کا نتیجہ تھی۔ سوویت یونین میں قوم کے زمانہ تاریکی جانے کے بعد، اچھے
 صدیق اور قریبیوں کی مایابی نے لیکسنیس کو بہت متاثر کیا۔ 1938 میں جب اس کے اسٹالین پر معذرتی
 مقدمہ چلایا جا رہا تھا اور اس کے نتیجے میں مارکسی نظریے کے بڑے داعی بکولائی بخارین کو "خود ادبی" کا جرم
 "کامیت" ہونے پر موت کی سزا کا نام لگ دیا گیا تو لیکسنیس بھی وہاں موجود تھے۔ رفتہ رفتہ لیکسنیس مارکسی
 نظریات سے دل برداشتہ ہو گیا اور اس نے ایک دن اشتراکیت سے انکار کر لیا۔ اس کے بعد وہ
 مشرقیت کی طرف، بالخصوص نازک مذہب کی طرف راغب ہو گیا جس کا واضح نگار اس نے اپنے ناول
 Paradise Reclaimed (1960) میں کیا ہے۔

ہالگو برکلیان لیکسنیس 1902 میں آئس لینڈ کے شہر ریکیوگ (Reykjavik) میں پیدا ہوا۔ جب وہ نین
 برس کا تھا تو اس کے والدین ایک قریبی قصبے لیکسنیس Laxnes کے ایک زمانائی فارم میں منتقل ہو
 گئے جہاں اس کا بچپن گزرا۔ ہالگو برکلیان کا اصل نام ہالگو برکلیان تھا Halldór Guðjónsson مگر اس نے
 اپنا علاقے کے نام پر اپنا نام رکھا۔ ہالگو برکلیان کا باپ اس زمانائی فارم کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا اور مڑک
 بنانے والے طرز و مذاں کا سربراہ بھی تھا۔ اس کا باپ وادی (Váðinn) بنانے میں ماہر تھا اور اس نے اپنے
 بیٹے کو بھی یہ فن اتنا سکھا دیا تھا کہ وہ بھی موسیقی سیکھنا اور اس کو اپنا وسیعہ رزاق بنانا چاہتا تھا۔ مگر بعد میں
 ہالگو برکلیان نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا۔

مصنف کی پہلی کتاب Náturunnar (1919) جب شائع ہوئی تو وہ صرف سترہ برس کا تھا۔
 لیکسنیس کی تعلیم آئس لینڈ کے لائیپن اسکول میں ہوئی۔ اس کے والدین نے اس کو یورپ کے ملکوں اور
 امریکا کا سفر کرنے کے لیے اپنا مدد فراہم کیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد لیکسنیس نے اپنا زیادہ وقت یورپ

اور امریکا میں ہی گزارا۔ اس دوران اس نے باقی دو لڑائی فلمی صنعت میں کام کرنے کی کوشش بھی کی۔
 کیسٹس نے 1923 میں کیتھولک مذہب اختیار کیا اور آئرش صوفی St. Kieran کے نام کو اپنے فلمی
 نام کا ایک حصہ بنالیا۔ کیسٹس نے لندن کے ایک اسکول میں مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد صبریت کی
 تبلیغ میں بھی کافی وقت گزارا۔ کیتھولک مذہب سے مایوسی ہونے سے پہلے اس نے کیتھولک مہتممات پر
 کئی کتابیں بھی لکھی تھیں جن میں سب سے زیادہ متاثرہ ماں Vellanna Makkha Kasner (1927) تھی
 جو St. Thomas à Kempis اور اشعوریت کے شاعر حدیثے برٹس کے زیر اثر لکھا گیا تھا۔ کئی ماسٹرول
 نے اس کتاب کو شائع کرنے سے انکار کیا اس لیے کہ مصنف نے ملکی اینڈرک الفسٹون کی ادب ترازیات
 سے انحراف کیا تھا۔ آخر کار کیسٹس کیتھولک مذہب سے کنٹراڈکشن ہو گیا۔
 بالڈوین کیسٹس نے تینتالیس کے قریب کتابیں تصنیف کیں اور 1998 میں اس کا انتقال ہوا۔

خیافت سے خطاب

جذباتی تعلیم جب میں سوئڈن کے جنوب میں سفر کر رہا تھا تو مجھے 'ڈن' ہونی خبر ملی تھی کہ میں بار
 شاید سوئڈش اکادمی کے نظری انتخاب مجھ پر چڑھ کر بددیہی طور پر اپنے ہوٹل کے کمرے کی تنہائی میں اپنے
 آپ سے پوچھنے لگا کہ دنیا کے دور کا وہ جزیرہ ہے کے ایک باسی، ایک بے چارے سیلابی پر کیا گزرتا ہے گی
 اگر ایک مشہور تہذیبی ادارہ آپ تک اسے عزاز کے لیے منتخب کر لے اور اسے حکم دیا جائے کہ وہ اس پلے
 کے سامنے حاضر ہو جائے۔

اس میں تعجب نہیں کہ اس وقت مجھے میرے حمارے واسطے، اہواز اور بچپن میں مراحمہ کیسے ہوئے
 ساتھی، جو سرکسپ بچے ہیں، یاد آئے ہیں۔ ان کی اپنی زندگی میں بھی کم ہی لوگ ان سے واقف تھے اور
 اب تو اور بھی کم لوگ ان کو یاد کرتے ہیں۔ جیسے بھی تھے، انہی کے طفیل میں اس مقام تک پہنچ سوں اور
 مجھ پر ان کا فیض آج بھی اتنا ہے کہ شاید دنیا کے ہرے بڑے ماہرین فلم اور ہوٹل کاروں سے حاصل
 نہ ہو سکتا۔ اس وقت میرے ذہن میں وہ قابل تعریف لوگ ابھر رہے ہیں جن کے لامیان میں پڑا ہوا تھا۔
 میری مراد اپنے والد اور والدہ، بلکہ ان سے بڑھ کر اپنی داری سے بے جھوٹوں نے مجھے ملکی اینڈرک کی زبان کی
 شاعری کے نثریوں میں اس وقت ہی سکھایا تھا جب میں ایک غلط بھی پڑھنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔
 اس رات ہوٹل کے کمرے میں مجھے اپنی داری کے وہ تمام اخلاقی صوبہ یاد آئے، جیسے کہ آج بھی

دوڑتے ہیں، جو انہوں نے میری رگ و پے میں مار دئے تھے یعنی سچی کسی زندہ جھوٹی کو آواز نہ پہنچاؤ،
اپنی تمام زندگی نفس، منکسر انہریت اور دنیا کے کم نہ زندگیوں کی امداد میں صرف کر دے جس کو نظر لمانا یا کیا
ہو، جس کے ساتھ ماٹھریاں ہوتی ہوں اس لیے کہ سب زیادہ انہیں گوارا ہے۔ پھر اور احترام کی ضرورت
ہوتی ہے، غلام وہ آئینہ کے ہیں یا کہیں اندر کہ میرا سارا بچپن ایسے ماحول میں گزرا تھا جس میں شر
زور دہستیوں کے لیے کتابوں اور غلاموں سے بدتر کوئی چیز نہیں تھی۔ روزمرہ کی زندگی کے معمولی نوعیت کے
کام کے لیے احترام اور پیار ہی وہ اخلاقی احکام تھے جو میرے بچپن میں ہمیشہ میرے لیے مشعل راہ رہے۔
دنیا کو جن کے نام بھی نہیں معلوم، میں ایسے دوستوں کا بھلا کیسے بھول سکتا ہوں، ہوں جنہوں نے
ٹوکھن اور نوجوانی کے زمانے میں میری اپنی کلاشوں کی رہنمائی کی۔ وہ خود ادیب تھے مگر بلا شبہ وہ بڑے
بڑے ماہرین فن سے زیادہ ادب کے پار تھے اور انہیں کے عقیدے، دیات کے چھتات کا اندازہ ہوا
ان خداداد قابلیت کے حامل لوگوں میں بہت سے ہم سے بگڑ چکے ہیں مگر وہ آج بھی میرے ذہن میں اس
طرح سے ہوئے ہیں کہ بھی کبھی تو میں یہ فیصلہ نہیں کر پاؤں کہ میرے دل سے نکلے والی جو روں میں کون سی
آواز میری اپنی ہے، رویتیں کیا میرے ان دوستوں کی ہے۔

میں آئیں لینڈ قوم کے ک ایک لاکھ پچاس ہزار لوگوں کو بھی یاد رکھتا ہوں جو کتابوں سے وہ سب
جو کرتے ہیں۔ روزی اول ہی سے میرے ہم وطن لوگوں نے میرے ادبی سفر پر نگاہ رکھی ہے، پائل میں تنقید
اور پس میں تعریف کی مگر انہوں نے میرے کسی ایک غلط کو بھی بے توہی کی منی سے میں دل نہیں ہونے
دیا۔ وہ سب ایک حساس آواز کی طرح جو ہر آواز کو محفوظ کر لیتا ہے، میرے نصیب ہوئے ہر لفظ سے لطف
نہوڑ بھی ہوئے ہیں اور نگار کی کاٹھی بھی تیار ہے۔ کسی ادیب کے لیے اس زیادہ خوش قسمتی اور یہ ہو سکتی
ہے کہ وہ سب قوم میں آگے بڑھے جس کی رگ و پے میں صدیوں کی ادبی روایتیں سرایت کر گئی ہوں۔

میرے حالات آئیں لینڈ کے ان قدیم داستان گوئیوں کی طرف بھی پرواز کرتے ہیں جنہوں نے
ہماری کلاسیک موصوفیہ کیا، جن کی شخصیتیں حوام سے اس طرح پیوستہ ہو گئی تھیں کہ ان کے زندگی بھر کے کام تو
چاہاں ہو گئے مگر انہوں میں ان کے نام بڑی نہیں رہے۔ بے شک وہ سب اپنی لازوال تخلیقات ہی میں
زندہ ہیں اور اسی طرح آئیں لینڈ کا حصہ ہیں جیسے یہاں کے حسین ریشی مناظر اور جہالت کی عمارتوں کے
حد صدیوں تک ہم نام مرا اور عورتیں سب، کسی اہمیت، کسی انعام اور کسی قدر شہائی کی پروا کیے بغیر، منی کے
بنے ہوئے گھروں میں جینے کر کتابیں لکھتے رہے۔ ان کی خستہ حال پنہاں ہوں کے لیے آگ تک میسر نہ تھی
جس کی مدد سے وہ رات گئے تک کہانیوں سمجھنے کے لیے اپنی ٹکڑی ہوتی انگلیوں کو گرم کر سکتے۔ پھر بھی وہ
ایک ادبی زبان تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئے جو نہ صرف نہایت خوب صورت بلکہ رنگ ترین زبانوں
میں سے ایک تھی بلکہ ایک جدا گانہ ادبی ہرز بھی سمجھتی۔ جب ان کے دل گرمائے رہے تو ان کے ہاتھوں
میں قلم ہی ہوتے۔

Skane کے ایک ہوٹل کے کمرے میں بیٹھ میں اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا، کسی تکھنے والے کو کامیابی اور شہرت سے بھلا کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ مانی منفعت سے حاصل ہوئے وہی رملوں کچھ ہادی ۲ سرائیں اور کیا؟ نہیں اگر ۲ کس لینڈ کا کوئی شہر، میری وادی نے جس کی عزت کرنا سکھا تھا، اپنی اصل یعنی عوام کا آدمی ہونا چاہئے، گروہ کتنی مٹی سے اپنا رشتہ ٹھوٹے، اور اس کے فرائض سے پہلو تھی گئے تو اس کا معنی وہی شہرت اور کامیابی کا بھلا کیا فائدہ۔

جسٹس قاضی خان صاحب شامی، خواجہ شمس اور حضرات! یہ میری رملوں کا بہت بڑا واقعہ ہے کہ سوینڈش اکادمی نے منتخب کر کے مجھے سوینڈش لینڈ کے تمام تقسیم داستان کو شخصیتوں سے منسلک کر دیا ہے۔ اکادمی نے قاضی دیر غراز میں میرے انتخاب کے حق میں جو دلائل پیش کیے ہیں وہ نہ صرف تمام رملوں میری ہمت افزائی کرتے رہیں گے بلکہ ان کو بھی شادمان کریں گے جن کی حمایت سے میرے کام کی قدر افزائی ہوئی ہے۔ آپ نے مجھے جو اعزاز پیشا ہے اس نے مجھے نخر و سرور کے جذبات سے نغمہ دیا ہے۔ میں ان سب کے لیے بے حد احترام اور محبت کے ساتھ سوینڈش اکادمی کا شکر گزار ہوں۔ یہ انعام اگرچہ جرمین قاضی کے دست مبارک سے مجھے دیا گیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرے مرشدین و معتمدین آکس لینڈ کی اولین روایات کے اجداد کو بھی ملتا ہوا ہے۔



آرٹسٹ ہیمنگوے

اعترافِ کمال: نازد ترین مثال "ہیوڈن آئی اور سنڈر" میں اس فنون کی مہارت اور ان اثرات کے لیے جو اس نے ہم عصر طرزِ سخن پر چھوڑے ہیں۔

جدید عہد میں ادب کے ظاہری چہرے پر ہا ہوا امریکی مصنفین کے گہرے نقوش ثبت نظر آتے ہیں۔ ہاروی نسل نے بالخصوص پچھلی صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں ادبی دھڑیوں کی نئی سمت ہدایت ہوتے دیکھی جو گراں چرائیک، مضمی صورتِ حال تھی عمر اس کے ذریعے ہاروی نسل نے اپنی آفاق میں دور رس اثرات تبدیل ہوئے۔ تیزی سے، مہرتے ہوئے سارے امریکی مصنفین میں، جن کے صرف نام ہی تاری کے لیے سب سے اہم اشاروں کے ساتھ ہیں، ایک بات مشترک ہے وہ یہ کہ سب نے امریکی (Americanism) کے اس معاشرے سے، جہاں وہ پیدا ہوئے، خوب خوب فائدے اٹھائے۔ اور یورپ کے قارئین نے جوش و خروش سے ان کی خوب پذیرائی بھی کی۔ ان لوگوں کی یہی خواہش تھی کہ امریکیوں کو امریکیوں کی طرح لکھنا چاہیے اور ان کو بین الاقوامی ادبی دنگ میں اپنے جویہ دکھانے چاہئیں۔ آرٹسٹ ہیمنگوے ان پہلے کارڈوں میں سے ایک ہے اور یہ کہنا ہے کہ وہ ہونگا کہ اپنے امریکی سر قیود میں سب سے زیادہ اہم وہی ہے جس کو پتہ نہ کہ میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہاروی نسل ایک انجمن ہوئی تو مہرے جو اپنے فن انکسار کے لیے نئی راہیں تلاش کرتی ہے اور پھر بھی لیتی ہے۔

ہیسا ہی مصافحت میں ہیمنگویے نے اپنی مخصوص طرز اس وقت کافی جب وہ مشورہ شہر کنسٹنس میں
کے ادارے میں رضا کار کے طور پر کام کیے رہا تھا۔ اس ادارے کے نہایت سخت اصولوں میں سے ایک یہ
تھا کہ ”چھوٹے پتلے استعمال کرو، چھوٹے پیراگراف استعمال کرو۔“ ہیمنگویے کی قلمی تکنیکی تربیت نے
اس کو غیر معمولی سبب نفس کا پابند بنا دیا تھا۔ ہیمنگویے کے ڈال کے مطابق ”مصنوعی مبالغہ نظر ڈالنا موب سے نکلی
ہوتی نیلی چٹکاروں کی طرح ہوتی ہے۔“ قدیم امریکی ادب میں اس کا مرشد مارک ٹوین تھا جو با شہرہ ہی
آہنگ و راستہ، وغیرہ ذاتی ہیمنگویے میں لکائے نہ دیتا تھا۔

اس نوجوان صحافی کو پہلی جنگ عظیم کی جنگی میں جھونک دیا گیا جب اس نے اٹلیہ میں مشقی مریش
گاڑی پھرنے کے لیے اپنی رضا کارانہ خدمات چھوڑ دیں۔ اس کام کے دوران وہ شعلوں میں نہا اور اس
کے جسم نے بھولے بھولے دھات کے ٹکڑوں کو اپنے اندر بنا دیا۔ انیس برس کے نوجوان کے لیے
جنگ کے تجربہات بول مانگ تھے اور یہ تجربہات اس کو سوچ کے ہم ایوان میں سے تھیں۔ ان سے اس
کو حوصلہ مل گیا تو گھر ہوئی، اس کے نزدیک ایک مصنف کے لیے جنگ کو پہلی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ایک
بے بہا دانش ہوتا ہے جس کو دنیا کی تاریخ سے بیٹا کیا جا چکا ہے۔ کئی برسوں کے بعد ہی وہ اس قاتل ہو گیا
تھا کہ اس کے ذہن کے اندر اسے اور پابند و بندہ کی فنی کامانہ کیفیت نگاری کے نتیجے کے طور پر اس کا
مشہور زمانہ ناول A Farewell to Arms وجود میں آیا جس کے ذریعے اس نے صحیح معنوں میں اپنا نام
بدش کی مثالیں کر اس سے قبل اس کے دو ناول In Our Time اور The Sun Also Rises اس کی
انفرادی طرز کی داستان گوئی کا اعلیٰ ثبوت پیش کر چکے تھے۔

بہت کم مقررہ کے دیکھنے کی مدت ہیمنگویے کو پڑے ہزار (big-game) کے لیے کشاں کشاں
فریقا کے جنگلوں میں اور سائڈ بیلوں سے لڑائی کے لیے ہسپانیہ لے گئی۔ اور جب ہسپانیہ جنگ کے میدان
میں تبدیل ہو گیا تو ہیمنگویے کو اپنے دوسرے اہم ناول Whom the Bell Tolls کے لیے دفتر جہاز اور سود
دونوں ملے۔

اچھے سارے پڑے ناولوں کے تذکرے میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہیمنگویے کا محبوبہ ہیں
جی انتھانی ہندی پر ہوتا ہے، اس کی سرد و اختصار لویسی مینھوٹ کو ہمارے شعور میں بیسٹ گرو جی ہے جب
اس کے مینھوٹ اور اس کے اعلیٰ رکوعی لہجہ میں مختصر سانچے میں قید کرنے کی کوشش کی جائے۔ شاید اس کی
بہترین مثال The Old Man and the Sea ہوگی جو پراثر ہوتی نوبل کے پانچوں میں کیور کے ایک ہی
میری ایک سٹار فیشی (Swordfish) سے ناقابل فراموش لڑائی کی کہانی ہے۔ تاریکیوں کی کہانی کے منظر
لطف پر لطف دیے جیتے ہیں کیور سارا ماجرا اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ اس کہانی کی روح انسان
تکسیت کے لیے نہیں بنا ”گور انسان کو مسکایا جا سکتا ہے، ہر ایک نہیں جا سکتا“ جیسے منہ جمنوں کی پڑہ دیتا۔
ارنست ہیمنگویے 1899 میں امریکی ریاست انڈیانا کے شہر ”اک پارک (Oak

(Park) میں پیدا ہوا۔ اعلیٰ فوج میں رضا کار کی حیثیت سے ہوئی جبکہ تقسیم میں دشمن ہوا اور عالیہ کی حکومت نے اس کو قحط سے نوازا۔ امریکا واپس پر کنڈا اور امریکا کے مختلف اخباروں میں ماسٹکار کی حیثیت سے کام کرنے کے دوران اسے یوان کے انقلاب کے بارے میں خبریں پہنچنے لگیں۔ یوان بھیج دیا گیا۔ صدیقی کی دوسری مہم میں ہیمنگوے بھی اس میں مقیم امریکیوں کی انجمن میں شامل ہو گیا جس کا تذکرہ اس نے اپنے ناول (1926) The Sun Also Rises میں کیا ہے۔

ہیمنگوے کی انجمن کے قریب تصنیفات شائع ہوئیں جب کہ سیکڑوں مقالات، مضامین، در ترجمے بھی شائع کیے گئے۔

ہیمنگوے کا 1961 میں مایست ایڈاہو (Idaho) میں انتقال ہوا۔

ضیافت سے خطاب

چچا کرارنس ہیمنگوے ضیافت میں خود تشریف نہیں لائے تھے مگر یہ ان کی تقریر کا مددے میں امریکا کے سفیر John C. Cabot نے پڑھا کر سنا ہے۔

مجھے نہ تقریر کی سہولت کی ضرورت ہے، نہ خطابت پر تکیہ اور نہ ضیافت پر غلبہ ہے اس کے باوجود میں تقریر نویس کے منتظمین کے حوالہ افراد کی شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

موت بھی اوج سوائے بے پایاں انکسار کے اور کسی طرح اس انعام کو وصول نہیں کر سکتا جو ایسے بھی عظیم سمجھنے والوں سے واقف ہو جن کو یہ انعام نہیں مل سکا۔ ایسے لوگوں کی غرمت مرقد کرنے کی ضرورت نہیں، یہاں موجود ہر شخص اپنے علم اور ضمیر کے مطابق خود غرمت بنا سکتا ہے۔

میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں اپنے ملک کے سفیر کو چنی تقریر پڑھنے کی رخصت دوں اور وہ میرے دل جذبات کی ترجمانی کر سکے۔ اس کی وجہ تو یہی ہے کہ میں سے اصل مدعا فوراً اظہار کیا ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا، اور کبھی کبھی یہ دوسری فوش قسمتی بھی ہوتی ہے، مگر اگر کاروہ سب کچھ واضح بھی ہو جاتا ہے اور اس کی بنا پر او مال کے وجود کی کمی کی کیفیت کے باعث یا خود مدعا ثابت کر لیا، پھر اس کو دیا دیا جاتا ہے۔

گھنٹہ کی اس منازلی میں تہائی ہی تہائی ہوتی ہے، دیوہوں کی انجمنیں یا مارے ادیب کی تہائی کو پورے میں چھپا تو سکتے ہیں مگر مجھے اس میں شبہ ہے کہ وہ اس کی تحریر کو بہتر بنانے میں مدد دے سکتے ہیں۔ ادیب اپنی تہائی میں اس کے عوام اناس کی نظروں میں اپنی قدر تو مددھا سکتا ہے مگر ایسی صورت میں اس

کی تحریریں نوال پذیر ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ اسکیلے کا مکتبہ ہے اور اگر وہ اچھے قسم کا وجیب ہے تو ہرگز سنے دن کے ساتھ باثو وہ بٹائے لیا اور نگہ مائی کی طرف یہ منت رہتا ہے۔

ایک سچے وجیب کے لیے ہر کتاب کی نئی شروعات کے مترادف ہوتی ہے جس میں وہ کچھ حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہو جو اس کی محنت سے پہلے وہ اس کو ہمیشہ دی کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے جو یا تو کبھی کیا نہ گیا ہو یا پھر جس میں دوسرے لوگ کام ہو گئے ہوں۔ اس صورت میں نوبی قسمت سے وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

کچھ لکھنا سکتا آسان ہوتا ہے صرف کسی عمدہ تحریر کو سننے کے زمیں کھودنا ہی ضروری ہوتا ہے اس لیے کہ ماضی میں اتنے بڑے بڑے لکھتے والے نثر چھپے ہیں کہ نئے لکھتے وہ ان سے بہتر لکھتے کوشش میں کسی طریق تک چلا جاتا ہے جہاں کوئی بھی اس کے مدد کو نہیں پہنچ سکتا۔

میں نے اس وجیب کے تذکرے میں کافی وقت لے لیا ہے۔ ہر محفل لکھنے والے کو جو کچھ بھی کہنا ضروری میں کہہ نہ سکتا رہتا ہوں۔

میں آپ حضرات کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔



وہستن چرچل

اعترافِ کمال۔ تاریخی اور سوانحی بیان میں اس کی قدرت اور ہتھکنڈاؤں کی عظمت کے لیے جس کے ذریعے اس نے انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا دفاع کیا۔

مٹا دونا درہی دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی عظیم مددگار مصنف بھی ہو ہو۔ اس منزل پر ہمارے سامنے جوئیس ہیئر، مارکس اور پلٹس، حتیٰ کی نیوٹن، لونا پارٹ کی مثالیں آجاتی ہیں جس نے غلیہ پر فوٹ کش کے دماغ جرنیلین کے کام خطوط لکھے تھے جن میں جذبات بھی تھے اور اپنی شکوہ بھی۔ چرچل کا اگر کسی سے موازنہ ہو سکتا ہے تو وہ ڈیوڈ ہیل (Disraeli) تھا جو ایک ہر گیر مصنف تھا۔

وہستن چرچل کے سیاسی اور ادبی کارنامے اس جسامت کے ہیں کہ اس کا ہیئر کے مقابلے کی شخصیت دہستے کو جی چاہتا ہے جس کے قلم میں پیسرو (Dixie) کی خدا داد قابلیت رکھے وانی کہنے کی صلاحیت تھی۔ ہمارے دور کی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسی شخصیت ہوئی ہوگی جس میں اتنی ساری اعلیٰ صلاحیتیں یک جا ہوتی ہوں گی۔ اپنے جہانمہ دورہ (Manborough) کے بارے میں چرچل نے لکھا تھا ”الٹا تو آسان بھی ہیں دورہ فرہنگی، جب کہ ہمارے مشکل بھی ہیں اور نامکمل بھی“ یہ سمجھ تو ہے مگر ہمارے دورہ وادع بھی مشکل اور نامکمل ہو سکتے ہیں۔ چرچل کے قلم نے ہمارے دورہ کو اس سے نیچے ہوئے الٹا تو بھی ہمارے کردار کے مالک ہو سکتے ہیں۔

یہ چہ چل کی تحریروں کی پہچانی آئینہ نگاری اور سنگا رنگی ہے جو سب سے پہلے قاری کو متاثر کرتی ہے۔ چہ چل کی تصنیف (1930) My Early Life جس میں دیا کی سب سے نیا دورہ تحریر کی اور رہنمائی کی باتیاں ملتی ہیں جن میں سکوں کے ایک شریک لڑکے، پوٹو جیتنے والے نوبلی انسر، کیوبا میں، خند و سنان کے سرحدی المناہٹ میں، سولڈن اور جنوبی افریقہ میں مختلف اخباری نمائندے، دستیں چہ چل کے دل چسپ سرگزشت کے خاکے ہیں۔ اللہ کے ذریعے مصوری کرنے والے نوجوان چہ چل کی تحریر میں نثر و قلم کے ساتھ ساتھ بصری ٹیکھا پن بھی ہے۔ چہ چل نے بعد میں مصوری بھی کی اور اپنی کتاب Thoughts and Adventures 1932 میں اس قریب اللہ نیکوں کے قریبیہ اس نثر و رنگ و ذریعہ ہے جو اس کو مصوری سے حاصل ہوتا تھا۔ چہ چل کو کثرت کا ہمیشہ فہمیں رہا کہ وہ جاکسٹرڈ میں تعلیم نہ حاصل کر سکا۔ اس نے بڑے فرست کے اوقات کو تحصیل علم میں صرف کیا۔ مگر اس کی پختہ نثر کے مطالعے سے کسی بھی تعلیمی کم زوری کا احساس نہیں ہوتا۔

مدیر، مؤرخ اور سوانح نگار چہ چل کی 1940 سے 1945 تک کی پانچ سالہ قیادت نے اس کو بد خطیب کی حد تک تاریخ میں ایک مرکزی مقام حاصل کر دیا۔ چہ چل بیسویں صدی کے برطانیہ کا عظیم ترین سیاسی قائد مانا گیا ہے۔ چہ چل کو اگرچہ ادب کا لائق انجام دیا گیا مگر اس کو قتل کے امن انعام دینے سے زیادہ خوشی ہوئی۔ چہ چل ایسا سبب مغت غم تھا کہ اس کے فعال اور مانع کے بارے میں کوئی حتمی پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی تھی کہ اس کا انگر قدم کیا ہوگا۔ اس نے فلسطین میں مسیوئی تحریک کی طرف داری کی، ایڈورڈ کی تخت و تاج سے دستبراری کے قہیے میں ایڈورڈ کا ساقی رہا، اور 1945 کے عام انتخابات میں اس نے میر پارٹی پر مطلق اعلان جماعت کا لہجہ نکالا۔

چہ چل بڑے کمال کا خطیب تھا۔ اجتماعات ہوں کہ پارلیمنٹ، اس کے سترے ہوتے ہی سامعین دہخو ہو جاتے تھے۔ اس کے منہ سے اللہ کی طرح نکلتے تھے گویا صدف سے صدف بھٹک رہے ہوں۔ دوسری جنگ عظیم میں اتحادی فوجوں کی فتح میں اس کی لکار کا بڑا حصہ تھا۔ اس نے اپنی اٹھارہ جون 1940 کی ایک تقریر میں کہا:

”میر خوب جانتا ہے کہ اسے یہ تو ہمیں اس جزیروے میں جاہ نما ہے۔ جنگ پارلی ہے۔ اگر ہم اس کا مقابلہ کر سکیں تو یورپ آزاد ہو سکتا ہے اور دنیا کی زندگی سورج کی کرنوں سے روشن، ایک وسیع بلندی کی طرف جاسکتی ہے۔ مگر ہماری محنت کی صورت میں، سیاست ہائے حیدر امریکا سمیت، پوری دنیا اور وہ سب جہن کو ہم جانتے ہیں اور عزیز رکھتے ہیں، چاہی کہ ایسے اللہ ہیر سے غار میں جا گریں گے جسے گمراہ سائنس کی روشنی نے نیا رو طویل اور نیا دور ٹھوس بنایا ہو گا۔ ہندو آریہ ہم سب کو راہنہ کرتا رہو چاہیں اور یہ سمجھیں کہ گمراہی کوئی مسطرت اور بدلتہ مشترکہ نژاد سماج تک قائم رہے تو آئے والی نہیں، ہمارے

ہمارے میں فخر سے کہیں گی کہ یہ ان کا بہترین نمائندہ تھا۔

ویسٹمن چرچ میں قدرت پسند سیاست دان رنڈلف چرچ (Lord Randolph Churchill) اور امریکی خاتون جینی جیروم (Jennie Jerome) کا بیٹا اور فرسٹ ڈیوٹی آف (1850-1922) ان کے اولاد میں سے تھا۔ کہتے ہیں کہ ویسٹمن کا چھوٹا بھائی جیک اس کی ماں کے بطن سے پیدا ہوا مگر اس کا دل چاہنے والی اور تھ لیٹنی وہ اس کی ماں چرچ اور تھ لیٹنی کے درمیان میں ایک بڑا جھگڑا ہو گیا تو یہاں تک لکھا ہے کہ ویسٹمن کی ماں کے وہ سوا شوق تھے حالات کو دیکھ کر کہتی کہ وہ سے یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔ چرچ نے اپنی ماں کی زبان سے اپنی کتاب (1830) My Early Life میں لکھا ہے کہ ویسٹمن چرچ اپنی تھامت میں سب سے بڑے درجے پر تھا۔ اور ایسے کوئی واضح اشارہ نہیں دیتے تھے کہ یہی لڑکا ”ہمارے عہد کا سب سے بڑا آدمی ہو گا“ جسماں طور پر ویسٹمن نے نہیں تھا۔ پانچ فٹ آٹھ انچ کا قد ہوئے لے لٹاؤ سے وہ امریکی صدر ہیری ٹریوین سے چھوٹا تھا۔ چرچ نے ہارو (Harrow) اور سینڈ ہرسٹ (Sandhurst) میں تعلیم پائی اور اپنی تھامت کے ایک سو تیس سال تک میں بیسویں نمبر پر تھا۔ دلچسپ کی موت (1895) کے فوراً بعد ویسٹمن فوج میں افسر کی حیثیت سے بھرتی ہو گیا۔

چرچ نے 1898 سے 1897 تک ہندوستان میں سپی اور صوفی کے طور پر کام کیا اور اپنی کتاب (1898) The Story Of The Malakand Field Force میں لکھا کہ ”تصنیف ایک بڑے جوش و خروش سے شروع شروع یہ ایک کہلا اور تفریح ہوتی ہے۔ پھر عشق، پھر حاکم اور اس کے بعد غلام بن جاتی ہے۔ اور آخر کی دور میں جب مصطفیٰ اس کی غلامی پر ماضی ہونے لگتے ہیں تو اچانک اس مغربیت کو قتل کر کے مجمع کی جانب اچھال دیتے ہیں۔“

ویسٹمن چرچ 1900 میں مدیوٹی پارلیمنٹ کا رکن بنا اور وکٹرینو پارلیمنٹ چیمبرز کرلیبرل پارٹی میں شامل ہو گیا، 1911 میں فرسٹ لارڈ آف ایڈمیرلٹی (First Lord of Admiralty) بنا۔ پہلی جنگ عظیم کے شروع میں اس نے ترکوں کے خلاف کارروائی کی حمایت کی۔ اس نے برطانیہ میں ٹینک اور اسی ٹینک کے استعمال کے بارے میں بحث کی۔ لیجسپ (Antwerp) کا پورٹ (Gallipoli) اور ترکوں کے خلاف کام کا مددائی کی بنا پر حکومت میں معمولی عہدے پر اس کی بھرتی ہو گئی جس سے اسے مدد دینا ہو کے چرچ نے پارلیمنٹ سے استعفیٰ دے دیا۔ اس نے دو بار فوج میں شہریت اختیار کر لی اور ترقی کر کے کرنل کے عہدے تک پہنچ گیا۔

چرچ نے 1922 میں بھر پارلیمنٹ میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر اشتراکیوں کا مخالف ہونے کی وجہ سے اس کو شکست ہوئی۔ بعد میں وہ پھر وکٹرینو پارلیمنٹ میں شامل ہو کر پارلیمنٹ کا رکن بنا اور چانسلر آف ایکس چیکر (Chancellor of Exchequer) کے عہدے پر فائز ہوا (1929-1924)۔ اس نے سونے کی قیمتوں میں اضافہ کے لیے جو اہم کام کیے ان پر معاشیات کے بڑے بڑے ماہرین نے اعتراض کیا،

اس لیے کہ ان کے خیال میں اس کی وجہ سے گوکے کی لمبیں مگر چائیں گی اور کان کنی کی صنعت پر برا اثر پڑے گا۔ اسی بنا پر 1926 میں کان کنوں کی ہڑتال ہوئی جس نے حکومت کو بل کر رکھ دیا تھا اور 1929 کے انتخابات میں کنگریو پیو پارٹی شکست کھا گئی۔

لارڈ افسریہ بکس نے انعام لگایا کہ وہ دن جنگ چھ چلنے لگا پکھر کے جنگ میں مارے جانے کا ”انتظام“ کیا تھا۔ بکس کے انعام کی بنیاد ایک جہی آئین کے تحت پر تھی جس کو دیوانہ اور بچکا تھا۔ حکومت سے باہر رہنے کے دوران چھ چلنے نے The World Cress کہنا شروع جو چھ جہوں پر مشتمل تھی اور 1931-1923 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب پر بڑی تنقید ہوئی اور اس کی اثر و پسند بدگفت، فالتو، بھولی، خفایت، اور بھولے جذباتی قرار دیا گیا۔

چھ چلنے کی سال تک حکومت سے باہر رہا اور اس دوران اس نے اپنے بند کی سوانح حیات Marlborough His Life and Times (1933-1938) کی چار جلدیں تحریر کیں۔ دوسری جنگ عظیم چھ چلنے کے بعد چھ چلنے حکومت میں شامل ہوا اور 1940 میں برطانیہ کا وزیر اعظم بنا۔ اس نے امریکی صدر روزویلٹ سے رشتہ دو ماہ بعد ہوئی۔ ان تینوں کی تہران میں ایک مذاکات ہوئی جہاں چھ چلنے نے اٹلانٹک معاہدہ کی تیار کی۔ چھ چلنے، برطانیہ اور امریکہ کی یاٹا (Yalta) مذاکات کے نتیجے میں یورپ کے دو حصے ہو گئے جو نظریاتی طور پر ایک دوسرے کے مخالف ہوئے اور دونوں کی اپنی غلطی سرور جنگ کا آغاز ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر چھ چلنے قومی بیرونی کریمیناٹس میں پارٹی کو شکایات میں شکست ہوئی اور ایک بار پھر وہ حکومت سے باہر ہو گیا۔

جنگ عظیم کے دوران برطانوی مینڈر آگدن (C K Ogden) نے بنیادی انگریزی (Basic English) کو ایک عالمی زبان بنانے کا تصور پیش کیا جس کو چھ چلنے نے پسند کرتے ہوئے کہا تھا کہ بنیادی انگریزی کا مددگار لیسن دین اور تھانہ خیالات کے لیے بڑی احتیاط سے سوچا گیا منسوب ہے جو مختلف نسوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے اور ماننے کے ایک نئے ذریعہ بنانے میں مدد دے گا۔ بنیادی انگریزی کا مسئلہ بروٹمانے میں چھ چلنے۔ (خیر ہے کہ ب تقریباً ساٹھ برس بعد یورپی یونین کے قیام کی وجہ سے Euro-English کے نام سے بنیادی یا قدرے تھانہ انگریزی کا یورپ کے سامنے ملوں کے درمیان رابطے اور کاروبار کی زبان کا مائدہ بننا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نفاذ شدت تک پہنچ کر اس کے عرصے کے دوران ہو گا اور ہر سال کچھ حروف تہجی کم کیے جائیں اور کچھ کا تلفظ بدل جائے گا۔ اس شریقی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ مترجم)

1951 میں چھ چلنے ایک بار پھر وزیر اعظم ہا اور 1953 میں اس کو صبر کا خطاب ملا۔ اس کو برطانوی پارلیمنٹ اور ملکہ عالیہ نے برطانیہ کا بہترین حیات سب سے بڑا اولیٰ مانا۔ چھ چلنے نے صحت کی خرابی کی وجہ سے 1955 میں استعفیٰ دے دیا اور اپنا وقت سمجھے سمجھنے میں صرف کرنے لگا۔ وہ رستہ شخصی سے غلطیوں کے بعد چھ چلنے نے ایک ہندو مرتبہ کتاب A History Of The English-Speaking

People (1956-58) لکھی جس میں سہ ماہی اور جنگ مرثیہ موضوعات تھے۔ کریم کے علاوہ چچاں مصوری اور گھڑ سواری کا بھی شوقین تھا۔

انز عمر میں چچاں پر بڑا مہ فاج کا اثر ہوا تھا جس کے لیے اس کو دل آویں دی گئیں جن کو وہ اہم ملاقاتوں سے پہلے کہتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ شہرت کا عادی ہو گیا تھا۔ چچاں ہونا بہت ہو گیا تھا اور کبھی صحت مند نہیں رہا۔ فاج کی وجہ سے اس کے ذہن اس کو ہنس چھینے اور انا کرنے میں مدد دیتے تھے۔ اکثر وہ خطوط لکھتے وقت اپنی معاون عورتوں کی موجودگی میں بھی غم پر ہندو جاتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا کہ سوکر اٹھنے کے بعد وہ ماہر زادہ ہندو بننے لگتا تھا۔ کسی بیمار کے سبب نہیں بلکہ یہ اس کی عادت تھی۔

چچاں کی تصنیفات کی تعداد تینتالیس بتائی جاتی ہے جب کہ اس کے بارے میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ چچاں نے 1965 میں انتقال کیا اور یہی قوتوں پر مدھمکے کے باہر اس کا مجسم نصب کیا گیا ہے۔

خیاقت سے خطاب*

(چچاں کے برہمنس چچاں جسے میں خود تشریف نہیں لائے تھے اس لیے)

ان کی تقریر یوں چچاں نے پڑھ کر سنائی)

ادب کا لوٹل انعام میر سے لیے ایک ایسا اعزاز ہے جو منفرد بھی ہے اور غیر متوقع بھی اور مجھے افسوس ہے کہ میر سے فرائض کیسے نے مجھے خدوائے کبود کی جڑت تاب، آپ کے محبوب اور مکتوم فرماں روا، کے ہاتھوں سے اس کو حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ میں شکر گزار رہوں کہ مجھے یہ فرائض اپنی اہلیہ کو سونپنے کی اجازت دی گئی ہے۔ وہ فہرست جس پر میر نام لکھا گیا ہے جس میں صدی کے سربز آور و عالمی ادب کی علامت ہے۔ سوویتس اکادمی کا فیصلہ پوری مہذب دنیا میں غیر جانب دارانہ مقتدر و مخلصانہ سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اس اعتراف میں شک نہیں کہ میری شہریت کے بارے میں آپ کے فیصلے نے مجھے مزہب کیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ کا فیصلہ صحیح ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں نے اس بات کا خطرہ مول لیا ہے کہ میں اس اعزاز کا اہل نہیں ہوں۔ مگر مجھے پرزور کوئی دوسرے نہیں ہوگا اگر آپ حضرات اس فیصلے پر خود مطمئن ہیں۔

جب سے انگریز نوٹس کا 1898 میں انتقال ہوا ہے ہم ایک الہامی اور طوفانی دور سے گزر رہے ہیں۔ اس کی اپنے ذات کے علاوہ ہر میدان میں انسان کی طاقت میں اضافہ ہوا ہے۔ میدان عمل میں بھی

یہ شدید حالات نہیں رہے ہوں گے جو شخصیات کو پست کر دیتے ہیں۔ تاریخی مشاہدہ کی کبھی خیالات پر
 تاریخی شخصیات نے ایسا ظہور کیا ہوگا یا وہ دور اس انفرادی مدد جیتوں پر تھی، مگر روشنی مرکز ہوتی ہوگی۔ اب ایک
 خوب اور سوال درپیش ہے کہ کیا وہ وہ حالات کا وہ نتائج سے باہر ہو سکتے ہیں؟ بدشہبہ ہم یہی مرے
 سے نہ رہے ہیں۔ تو یہ ہمیں عاجزی اختیار کرنی چاہیے اور رہنمائی اور ہم کا حال ہونا چاہیے۔

وہ ہم ہی تو تھے جنہوں نے یورپ اور مغربی دنیا میں محنت اور مادی تحفظ کے منصوبے بنائے،
 جنہوں نے سائنس اور ادبیات میں معجزہ نما کامرانی کا منہ لیا، اور جنہوں نے ہر ایک کے لیے نفع اور
 آزادی کی سعی کی، پھر بھی ہم ہی کو یہ قہر، ایسی کہتے، کی سفاکی، اور اس کی تباہی دیکھنی پڑی جس
 کے سامنے تو کو اور جنگیں نشان ٹرما جائیں۔ اور ہم نے ہی، جو پہلے انجمن اقوم میں تھے اور اب قوم متحدہ
 میں شامل ہیں، ایسا امن فراہم کرنے کی بنیاد ڈالی ہے جو ہر ایک مرے سے جس کے خوب دیکھتے رہے ہیں
 مگر انہوں نے ہم نے پھوٹ و دھڑکن سے، تشدد سے بھر دی دنیا، اس سے بھی زیادہ شدید تشنگی کیفیت تحریر
 دہر دیکھنے کے لیے نذر ہیں بھیجی کہ مومن سلطنت کے حلقہ کے بعد یورپ کی تھی۔

ایسے بھی کہ پس مغربی میں ہم اس شان و شوکت اور امید کا ادراک کر سکتے ہیں جس نے افریقہ
 کوئل پر ایسے بے مثال منصوبے کو اختیار کیا، وہ اپنے جد آئے دہائیوں کے لیے یکہ نہایت روشن اور دیر پا
 شعار تہذیب، متعدد اور فیضان چھوڑ گیا ہے جس کی ان کو ضرورت ہوگی۔ دنیا کا یہ مشہور قاعدہ ہمیں ایک
 با مشدد راہ کی طرف راغب کرتا ہے۔ اس لیے ہم پر لازم آتا ہے کہ ہم اپنے اطراف بکھرے ہوئے بے نظم
 شور و غوغا اور سخت گیری کا، ہر طاقت، حکم اور تنوع سے سامنا کریں۔

مادی دنیا بکھر اور تسکین سے اس کی زندگی کی طرف دیکھتی ہے، جہاں متن ملک اپنی اپنی حاکمیت
 علی پر کسی قسم کی تدفین کے بغیر، اپنے ایک جہت خیالات، خصوصاً سماجی بہت اور محنت مند انداز زندگی کے
 ساتھ قائم ہیں۔ ایسے ہی سرچشموں سے نئی نئی انسان کے لیے نئے اور روشن مکانات ملتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہی دور عجزات ہیں جو ان لوگوں کو متحرک کرتے ہیں، فو بیل فائوڈیشن جس کو اس
 لیبوں کے ساتھ عزائمات کے لیے منتخب کرتا ہے کہ وہ بھی اس کے بلند مرتبہ باقی کے تصورات اور میدان
 کی پاسداری کریں گے۔

فرانسوا شارل مارے

اعترافِ کمال۔ اُس کی تادمی ورسوانی بیانیہ مہارت اور چھٹا فصاحت کے لیے جس کے ذریعے اس نے انسانیت کی علی قدروں کا دفاع کیا

فرانسیسی ناول نگار، شاعر، ڈراما نگار اور صحافی فرانسوا مارے رومن کی تحریک متغیبن کی روحوں کا یکن تھا جس نے انسانیت اور دنیا میں موجود شر اور شر کے سرکس کو جانچنے کی کوشش کی جبکہ اس کے طے ہوئے کرداروں کی روزمرہ کی حقیقی دنیا میں کوئی نقاب ڈالی نہیں ملتا۔ اس اسی مقام پر وہ حضرت بہترین و قانع نگار کی رت ہے۔

فرانسوا کی تخلیقات میں فرانسیسی ادب کے کئی دور بے متغیبن کے وضع اثرات ملتے ہیں۔ اس نے پراگمٹ، راسینی کا گہرا مطالعہ کیا مگر اس کے نزدیک پارسا کال نیارہ اہم متغیر تھا۔ فرانسوا کا شری عربی و عربی بھی شاعر نہ مگر مشیدوں سے بھرپور ہوتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاعری اور عربی شاعری ہی کسی شاعر میں ہوتی ہے اور وہی شاعری زندہ رہنے کا حق رکھتی ہے جو ناول شاعرانہ عناصر کے ذریعے کسی بھی قسم کی فن کا مانہ تخلیق پیش کرے۔ اس کے نزدیک ایک بڑا ناول نگار بھی سب سے پہلے ایک بڑا شاعر ہونا ہے۔ فرانسوا کے ابتدائی کام میں ضمیر اور جذبات کی اسی پیش گرمی تھی مگر اس کی زندگی کے ایک روحانی تجربے کے بعد اس نے

اس تنازعے کا حل روحانیت میں پنہاؤ کی صورت میں تلاش کر رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ حیرت انگیزیت کے گہشت و چہشت کے بارے میں کوئی اجماع نہیں کرتی بلکہ اس کو بے درونی سے نکل دیتی ہے۔

اپنی جگہ عظیم کے دوران فرانسو نے Red Cross میں Hospice Orderly کے طور پر کام کیا۔

جنگ کے بعد اس نے دادوں لکھے گھران میں سے LE BAISER AU LÉPREUX

(Kiss to the Leper - 1922) بہت کامیاب ہوا۔ اس کے بعد کے دادوں کا انیس ہارو کے

کیتھا لکس نے رد کر دیا۔ ”کوہشی کا بوسہ“ (The Kiss to the Leper) مادل دھرائل ایک شہرت بد صورت نوجوان کی زندگی کی تھپی کے بارے میں ہے جس کی شادی ایک بہت خوب صورت لڑکے سے کر دی جاتی ہے۔

فرانسو کا مادل (1925) LE DÉSERT DE L'AMOUR اس کے محبوب مینوٹ ”مہمت کی ہے

ٹھری“ Family of Love کا تسلسل سے جس میں ایک جنسی طور پر تھنڈی لڑکی ہے جس جہان پیو محبت

پنے، محتاج وراں کے بیٹے کے جذبات کو براھیجت کر دیتی ہے۔ اس کا مادل DESQUEYROUX

(1927) فرانسیسی زبان کے بہترین مادلوں میں شمار کیا جاتا ہے جو دھرائل ایک نکل کا مادل ہے جس میں

ایک عورت اپنے دھرائل اور اچھڑن میں دار شوہر کو قتل کر دیتی ہے۔ اس کا مادل میں پوسے

رنگاز کے ساتھ فرانسو کے محبوب ترین موضوعات (فرانس کے صوبوں کے پوسے ہوئے انسانوں، جنسی

مجبوریوں، شہاد اور طبقہ کے ماز بائے دیوں، اور فرانس کے جنوبی علاقے کا وحشی صحن وغیرہ) پوری طرح

نور سے نظر آتے ہیں۔

فرانسو فرانس کے شہر بورڈو (Bordeaux) میں ایک معمولی تاجر ٹاں پال، مری کے ہاں 1885

میں پیدا ہوا۔ اس کی عمر ابھی دو سال کی بھی نہ ہوئی تھی کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ وہ اور اس کے ابا خاں اس

کے داد کے ہاں رہے۔ اس کی ماں کٹر کیتھولک پیرائی تھی۔ فرانسو نے سات مہاں کی عمر سے مذہبی اسکول

میں تعلیم حاصل کی جس کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی زبان نہ تھکتی تھی۔ اس نے یونیورسٹی تک بورڈو سے

1905 میں ڈگری لی جو ایم اے کے بعد ایم اے جانی تھی۔ ڈگری کے حصول کے بعد وہ سال فرانسو École

des Chartes میں داخلے کے لیے پیرس گیا۔ اس کو داخلہ تو مل گیا مگر چند ماہ بعد ہی اس نے سکول چھوڑ

دیا اس لیے کہ اس کو دل چاہیوں لکھنے لکھنے میں زیادہ تھیں اور وہ پنہاں وقت اس میں صرف کرنا چاہتا

تھا۔ 1909 میں اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ LES MAINS JOINTES منظر عام پر آیا۔

اکادمی فرانسے میں تعلیم پانے کے بعد فرانسو نے فرانس کے مشہور اخبارن فگارو (Le Figaro) کے

لیے کھانا شروٹ کر دیا اور اکثر قسطانیت پر غلطی بھی کیے۔ صدی کی تیسری دہائی کے آخر میں فرانسو نے

داد سے لکھنے بھی شروٹ کر دیے تھے مگر ان میں دادوں جیسی کامیابی نہیں ملی، سوائے ایک کھیل ASMODEE

کے جو وہ برسوں کے دوران سودہ رکھ لیا۔

دہریہ جنگ عظیم میں فرانس پر جرمن قبضے کے دوران فرانسیسوا نے احتجاج کے طور پر ایک نہیں لکھا جس کی وجہ سے سے کچھ دنوں کے لیے دے پش ہو گیا تھا۔ اس نے لیگال کی مراقات میں فرانسیسوا سماج جیت کی طرف زاری کی حمایت بھی کی، الجیز ٹری آزادی کے لیے بھی کو زینت کی بیروہیں متیہ فرانسیسوا نوہیں کے خلاف بھی لکھ جو ترقی نوہیں پر مارا تھا وہ کے مکتب ہوتے تھے۔
فرانسیسوا کی موعے سے نیا وہ کتابیں شائع ہوئیں۔ اس نے 1970 میں تقاس کیا۔

ضیافت سے خطاب

میرے خیال میں جس ادیب کو آپ اعز زینتس مہے ہوں اس کو اپنی ذات اور اپنے کام کے بارے میں سب سے آخر میں بات کرنی چاہیے۔ مگر کیا کروں، میں اپنے خیالات کو اس کے کام سے اس کی سے، اس ہے چر مکتب اور اس سیدھے روئے فرانسیسوا ادیب سے بھلا کس طرح نہ کر سکتا ہوں جو آپ کتب سونڈش کاٹی کی تعلیمات فراوان کی وجہ سے خود کو اسے بیس اعزاز کے پوچھتے دیا ہوا پاتا ہوں نہیں! میرے نزدیک یہ احساس خود کافی نہیں جو مجھے اس حد و جہد کی اس طویل راہ کو پتہ کر دیکھنے پر مجبور کرتا ہے جس نے ایک تمام بچنے سے اس مقام تک، جہاں آج میں آپ کے درمیان بیٹھا ہوں، میری رہنمائی کی ہے۔

جس وقت میں نے اس (کہانی) کو بیان کرنا شروع کیا تھا، میرے خواب و خیال میں بھی نہیں آتا تھا کہ اس کے ایک معمولی سے صدفی عدتے کے باہمی کی نکلی ہوئی ماضی کی اس چھوٹی سی دنیا کی، جو میری کتابوں میں ماس کے رہی ہے، اور وہ اس کے غیر ملکی قاریوں تک رسائی ہو جائے گی۔ ہم ہمیشہ اپنی آخر دنیا میں یقین رکھتے ہیں، ہم جوں جوں جاتے ہیں کہ وہ کتابیں جنہوں نے ہمیں مسحور کیا ہے یعنی چارچ ایلٹ ہو، ڈیو کفر، ہانسوئے ہو یا وہ متون سکی رہ سمد لا، کراف، سب نے ہمارے ملک سے کئی نیا وہ مختلف ملک، مختلف نسل اور مختلف مذاہب کے تذکرے کیے ہیں۔ ہم نے بہر حال ان سب سے پورا کیا ہے۔ اس لیے کہ ہم نے اپنے آپ کو ان کی کے ذریعے پیچھا ہے۔ ہمارے جنم بھائی کے کسانوں میں ایک پوری نسل مناسی نظر آتی ہے، اور ہمارے بچنے کی آنکھ سے پوری دنیا دکھائی دیتی ہے۔ ماضی نگار کی قایت اس میں ہوتی ہے کہ وہ اس جھگڑے عام کی قایت کو شہدہ کرتا ہے جس میں ہم نے جنم لیا ہے، جہاں ہم پیدا کرنا اور دکھ بھیلنا سیکھتے ہیں۔ میرے فرانسیسی اور غیر ملکی قارئین میں سے بیشتر کو دنیا بھر کی شہیدہ دکھائی دیتی

سے متوہا میں کہہ دوں کہ اس بات نے ہمیشہ مجھے حیران کیا ہے؟ فانی ملوک، چوں کہ خود فانی ہوتی ہے اس لیے موت کے نام سے خوف نہایت ہے۔ اور وہ جنھوں نے نہ کبھی کسی کو یا اور نہ کبھی چاہے سکے، جو بے لگام چھوڑ دیے گئے پر جن سے بے وفائی کی گئی اور جنھوں نے ایسے لوگوں کی جستجوئی جن تک ان کی پہنچ ممکن نہ تھی ورنہ بھی جنھوں نے کسی کو پیا نہیں کیا، یہ سب اسی وقت حیران ہوتے ہیں اور خود کو دوسو محسوس کرتے ہیں جب کوئی انسان نے یہ مادل میں تنہائی سے محبت کا ذکر کرتا ہے۔ "تیرا اچھی باتیں سن۔" یہودیوں نے (حضرت) عیسیٰ سے کہا "ہمیں قابل قبول بندب بیانی سے بھگاؤ۔"

نئی ہوں 'قاری ہم گھنٹے دلوں سے مٹا رہے کہ بحر سے قائل تھیں بندب بیانی سے گمراہ کریں۔ ہر جوداں کے، اسی تحریر میں انسان کے یادداشت میں رہتی ہیں جنھوں نے ساقی شعلہ کو من حیث امثل گلے سے لگایا ہے اور اسکی لاعدتج تنہائیوں سے کبھی عربی نظر نہیں کیا ہم جن کو چلی مذکور کے آخری نجات تک سمجھتے رہتے ہیں، "ذری بیوقوفی تک، اس لیے کہ آخر کار ہمیں کیسے ہی مرنا ہے۔"

یہ ایک نامید مادل نگار کی دنیا ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں آپ کا عقلم SWANBERG ہونی رہنمائی کا سبب ہیں اس کا ضرور اپنی دنیا کہتا آ رہا ہے جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، مجھ میں وہ شدید امید ہوتی جو مجھ پر ایک آسیپ کی مانند مسطر ہے۔ یہ امید ان المیروں کو، جن کا میں نے تذکرہ کیا ہے، روشنی کی ایک کمن کے بجائے سے چھیدی ہے۔ میری جہد کا رنگ سیاہ ہے اور مجھے اسی کے حوالے سے پکھا جاتا ہے بجائے اس کے کہ اس روشنی سے پرکھا جاتا جو اس سیاہی کو چھیدی ہے اور اس کے اندر کی اندر جیتی رہتی ہے۔ جب کبھی فرانس کی کوئی عورت اپنے شوہر کو نہر دینے کی اپنے عاشق کو جگہ گھنٹ کر رہ ڈالنے کی کوشش کرتی ہے تو لوگ مجھ سے کہتے ہیں، "اسی یہ رہا تمھارے لیے ایک موزوں۔" وہ گھنٹے ہیں کہ شاید میرے پاس خوف کا عجیب گھر ہے، گدی میں بھوت پریت کا ماہر ہوں۔ پھر بھی میرے کردار ان کرداروں سے مختلف ہیں جو اس دور کے نادلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ غصے کے جہد کے یورپ میں یہاں کے گھرے "خدا مر چکا ہے" کی گونج اب بھی سنائی دیتی ہے، اور جس کے ہیبت ناک نتائج ابھی تک ختم نہیں ہوئے ہیں۔ میری کہانوں کے سارے کردار شاید خدا پر یقین نہیں رکھتے مگر سب بدغمیر ہیں، جو بُرائی کو پیچھنتے ہیں اور اس سے وابستہ نہیں ہوتے۔ وہ غیر واضح طور پر محسوس کرتے ہیں کہ وہ سب اپنے اعمال کی پیداوار ہیں اور وہ دوسروں کی تقدیر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

میرے مرکزی کرداروں کے نزدیک، خدا وہ کہتے ہیں جنھیں کیوں نہ ہوں، زندگی ایک لاپتہ حرکت کا تجربہ ہے، خود کی غیر محدود برتری کی موجب ہے۔ وہ انسانیت جس میں یہ شہنہ ہو کہ زندگی کے لیے ایک سمت ہے، ایک ہدف ہے، وہ کسی طرح بھی دل شکستہ نہیں ہلائی جاسکتی۔ جدید انسان کی مادی دور سبیل دنیا کی غیر معنویت کی پیداوار ہے۔ غیر معنویت انسان کو میکانیکی بنا دیتی ہے۔ جب غصے نے خدا کی موت کا اعلان کیا، تو اس نے یہ بھی کہا کہ انسان نے جس نوٹ کا وقت گزارا ہے یہ سسٹم میں گزارنے والا

جہ روحانیت سے خفی و انفرادی تقدیر سے محروم، اس میں وہ ایسا وحشی ہو جاتا ہے جس سے جانوروں سے بھی بدتر، ماسیوں جیسی ہر سنی کی تنگی ہو۔ ایک ٹھوڑا، ایک ٹھوڑا ایک گائے مٹاؤ قیامت ہوتی ہے۔ عکس انسانیت جانور سے اس وقت تک فائدہ حاصل کیا جاتا ہے جب تک وہ مرکز ہجرت نہ ہو جائے۔ کوئی بھی نگہبند انسانیت کی تخلیقات کے مرکزی سائنس سرحدات میں ایک دھپ، بیٹے کے ہاتھیں معزز زاور نفس کا اخیلا ہو کر نظر آئے وہ کبھی ماروتی کا، ہر نفس مہاسکتا خواہ اس کا کھینچا ہو، نقشہ کشاں بنجید و مہول کیوں نہ ہو۔ چوں کہ اس کی طاقی ہوئی تصویر ہمیشہ بنجید ہی ہوتی ہے، اس کے نزدیک انسانیت حضرت گرجہ مہول نہ ہو تو بھی ہوتی ہے۔ بلاشبہ کسی عیسائی مہول نگار کی بیٹن کی ہوئی تاریخ تقریبی کہانی نہیں ہو سکتی اس لیے کہ وہ مہول کے جیتان سے "ریٹ نظر نہیں آتا۔"

انسانی کا خبیہ ہونے کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہمیں پکیزگی اور بچپن کا بھی خبیہ ہو۔ مجھے افسوس اس بات پر ہوتا کہ میں نے اپنی کہانیاں میں بچوں کو جو مقام دیا ہے جہد باز مہرین و رقاری حضرات کی پر غور نہیں کرتے۔ میری کتابوں کی گہر نیوں میں ایک بچہ خواب دیکھتا ہے، ان میں بچوں کا پیرنگھو ہوا ہے، معصومیت سے بھی ہیں اور مدار تہایاں بھی، اور وہ سب کچھ بھی جو میں نے موتہ رت کی مہول میں محسوس بھی اور پسند بھی کیا ہے۔ میری کتابوں کے پیکار سے اثرات جو سب کو نظر آگئے تھے وہ بھولی فائنڈ میں دھاق دیں، مختلف باب میں جن کے گھونٹے بے ہوئے ہیں اس لیے کہ میری کتابوں میں بچپن تک جنت گم شدہ کی مانند ہے اور یہ قاری کو بدنی کے مہولوں سے متعارف کرانا ہے۔

بدنی کے رانہاں تک پہنچنے کا کوئی اور طریقہ نہیں سوائے اس کے کہ باقوہم بدنی سے انکار کر دیں۔ یہ پھر اس کو اسی کیفیت میں قبول کر لیں جس طرح یہ ہمارے اندر اور باہر موجود ہوتی ہے، ہماری انفرادی زندگی میں، ہمارے جذبات میں اور تاریخ کے ان صفحات میں جو حقیقت کی بھوکی سستھیں انسانیت کے غولوں سے تحریر کرتی ہیں۔ میں ہمیشہ سے اس بات کا قائل رہا ہوں کہ انفرادی اور جماعتی جہد میں بہت مشابہت ہوتی ہے اور ایک صحافی ہونے کے ماتے، جو کہ میں ہوں بھی، میں اور کچھ کا نہیں کرنا سوائے اس کے کہ میں ہوں نہ نہیں خاندان میں چائیزیں کا قائل ہیں تاریخ سے سیاسی تاریخ کی ہول مایوں کا موزونہ کن رہوں۔ ہمیں بدنی کو بدنی کہنے کی بدنی قیمت چکانی پڑتی ہے، مٹی باں ہم سب کو جو یہی مہول کے زخموں گزار رہے ہیں جس کے، فق پر بستی ہوئی پتھروں کا دھواں سدھیرا ناظر آتا ہے۔ ہم نے بدنی کے جہروں کو رکھوں ہے گماہ لوگوں کی حتی کہ معصوم بچوں کی بھی، انگٹے ہونے دیکھا ہے۔ اور تاریخ اسی مہول میں آگے بڑھتی رہتی ہے۔ (عجب کہ) ان قدیم مہاک میں بھی جتنی قید خانوں کے نظام کی جھڑپ گہری ہوتی ہیں جہاں صدیوں (حضرت) مہکی کو جو با گیا اور ان کی پرستش کی گئی۔ میں خیرات میں ہوں کہ جہاں آج بھی انسانی حقوق کی پاسداری کی جاتی ہے، اور جہاں انسانی دماغ آزاد بھی ہے، ہمارا اس طرح دنیا کا وہ خطہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے کہ اس کے "peau de chagrin" کی طرح مسکنا جا رہا ہے۔

آپ ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ سمجھ سکیے گا کہ خدا پر یقین رکھنے کے وہ جوذ میں زمین پر بدی کے وجود پر کھنے والے اعتراضات سے صرف نظر کرنا چاہتا ہوں۔ ایک عیسائی کے لیے بدی سب سے نزدیک مضطرب کرنے والے پھیلڈل میں سے ایک پھیلڈل ہے۔ وہ تسان جتنا رنج کے حجام مگے وہ بیان اپنے عقیدے پر چھٹے پر مقرر ہوتا ہے، اس پر ایک دن عقیدہ و نیات کی نظر ہر بے معنویت و لٹکا ہو کر رہے گی۔ بدی کے وجود کے بارے میں "بہاؤت" کی خاصیت، غور و کفلی ہی معقول کیوں نہ ہو، مجھے قائل نہیں کر سکتی۔ اس لیے بھی کہ وہ معقول ہیں۔ اور وہ جواب جو مجھے پھر میں دل دیتا ہے وہ معقول نہیں بلکہ ایک خیال کی بنا پر ہوتا ہے۔ یہ وہی جواب ہے جو حضرت جان کے صدقہ لائبرین میں ملتا ہے کہ خدا محبت ہے۔ زندہ محبت کے لیے کچھ بھی ممکن نہیں، یہ بھی نہیں کہ وہ اپنے اندر ہر شے کو سمیٹ لے، اور یہ سب کچھ نکھار دے۔

میں یہاں ایک ایسے مسئلے کو اٹھانے پر معاف کا غلبہ مگر ہوں جوئی نسوں تک تشریحات، تنازعات، اندازہ جوہر و ستم و دشمنیوں کا باعث رہا ہے۔ مگر اس وقت آپ سے ایک مادی نگار مخاطب ہے، وہ بھی ایسا، جس کو آپ نے تمام دھروں پر نصیحت عطا کی ہے، اس سے لازم ہے کہ آپ اس کے وجدان کو کسی حد تک قائل قدر سمجھیں۔ وہ گواہی دیتا ہے کہ اس نے جو کچھ بھی سمجھا ہے اپنے عقیدے اور امیدوں کی روشنی میں سمجھا ہے اور اس نے اپنے ان قارئین کے تجربات کی توجہ نہیں کی ہے جو وہ اس کی امیدوں کے اس کے عقائد میں شریک ہیں۔ مثال کے طور پر، ہم دیکھتے ہیں کہ گراہم گرین کے لادری ٹائٹل بھی (agnosic) جو خدا یا کائنات کی ابتدا و غیرہ کے بارے میں علم رکھنے سے کنارہ کرتے ہیں، وہ مادی مظاهر کے (مترجم) اس کے عیسائی مذہب و غور سے بھرکتے ہیں۔ جو سفری کہتا ہے کہ جب کبھی عیسائیت میں کوئی غیر معمولی بات ہوتی ہے، تو ضرور اس سے مشابہ کچھ نہ کچھ غیر معمولی بات حقیقت میں بھی ہوتی ہے۔ گراہم اس خیال پر ایک لمحے کے لیے غور کریں تو شاید علم پر اس پر اسرار مطالبات کا انکشاف ہو جو گراہم گرین کی جیسی کہ خودک روئی فی تحریروں اور عیسائیت کے مخالف موم کے درمیان موجود ہے جو اس کی کتابوں کو چھوچھا چھپتے ہیں مگر ان پر ہائی علمی فلمیں شوق سے دیکھتے ہیں۔

ہاں! عیسائیت کے مخالف ہو جاؤ اندر سے مانگو کے مطابق، "آج کا انقلاب وہی گراہم کرنا ہے جو پوسے بدی زندگی کی ساس ہوتا تھا" تو پھر کیا، اگر انقلاب صرف ایک فرضی تصور ہو، اور پھر کیا اگر بدی زندگی ہی واحد حقیقت ہو؟

جواب جو کچھ بھی ہو، ہم ایک نکتے پر ضرور متفق ہوں گے کہ عیسائیت سے ماورا انسانیت ایک مطلوب انسانیت ہی رہتی ہے۔ بعد کون سی ایسی دنیاوی حقیقت ہوگی جو انسانیت کی اقدار اور مصلحت کے باوجود شے کو کبھی ختم کر سکے گی؟ آپ کے اپنے ہم وطن سترڈرک نے بھی، جو تھوٹا افریقی کی ان گہرائیوں تک اترتا چلا گیا تھا جہاں سے مناجاتوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، خواہش کی تھی کہ اس کی لوہا تیرہ ایک دہا حلف کندہ کر دیا جائے، ایسا ایک لفظ جو تین تہا ابدیت کے پچانک کہہ کر کوئی ڈر لے کے لیے کافی ہوگا

"crux ave spes unica"۔ اتنی ساری اذیتوں کے بعد وہ بھی اکی امید کی حفاظت میں، اکی محبت کے سامنے میں آرام کر رہا ہے، اور اکی کے صدمے میں آپ کا یہ *causae* آپ سے ان لڑائی دتوں کے درمے میں غلو کی درخاست کتا ہے شاہد جس سے ہر عزگی پیدا ہوئی ہو۔ مگر وہ امن از م کے خوش شاہد اس سے نیا وہ اور کیا کر سکتا تھا کہ اس کے نہ صرف اپنا دل سبوں کو سامنے رکھ دیا ہے بلکہ اپنی دین تک کے سامنے دوشے کر دیے ہیں۔ اور چون کہ اس نے اپنے کرداروں کے ذریعے اپنے سب کے تمام روز میں انیسویں کر دیے ہیں، "حق" نام آپ سب کو اپنے سبوں قلب کے رازوں سے بھی متعارف کر دینا چاہتا ہے۔



پرفابیاں لاگرکوسٹ*

اصراف کمال: فن کا ماحول تو انسانی اور بھی؟ ادبیاتی کے لیے جس کے ذریعے وہ شاعری میں انسانی کو درپیش چکی سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

لاگرکوسٹ کی کبھی ہونی کتبوں کے ہر ورق پر بکھرے ہوئے الفاظ اپنی تمام تر نراکتوں اور رچائی ہوئی سرائستگی کے ساتھ ایک پیغامِ دہشت دیتے ہیں جو الفاظ کے لیے تڑپتی ہوئی سزاوہ دیہاتی زندگی سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر عارف نظر کرتا ہے کہ یہ الفاظ اور یہ خیالات ایک ماہر کے ہاتھ میں آنے کے بعد ولت، دیا اور ان نیت کی بکتری کے لیے سنبھلے ہوئے ہیں۔

میسو میں محدث کے پہلے نصف کے دوران سائینڈش زبان میں لکھنے والوں میں ایک نہایت توانا اور اہم ماہر معتمد اخذی لاگرکوسٹ کا ہے جس نے کیمسائی عقائد کو درمیان میں لیے بغیر عیسائی مذہب کی روایت کے بنیادی تہذیب کو اپنے مقاصد کی ترسیل کے لیے استعمال کیا۔ وہ مطلق النہایت کا شہرہ جی الہ تھا۔ اس کے مرکزی موضوعات میں النہایت کے بنیادی سوال خیر و شر کے بارے میں تھے جن کے ذریعے اس نے قرون وسطی کے سچائی اور مذہبی جامدوں اور قاریوں کا بے لاگ تجزیہ کیا ہے۔

1913 کے ایک جوش و جذبہ سے بھرے منشور میں جس کا عنوان Ordkonst och bädkonst [Verbal Art and Piconal Art] تھا۔ لاگرکوسٹ نے اس وقت تک گونا گونا گونا گے دہ کے دہ

کی بستی پر شدید کتہ چینی کرنے کی جمع کی جوں کے مطابق فن کی ضرورتوں کو چہا کرنے سے قاصر تھا۔
نوجوان مصنف نے اپنے مضمون میں اعلان کیا، ”ہر کتہے والے کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ ایک فن کار کے کتہ
نظر سے بچے دور کی سوچ اور مصاحبت کی ترغیبی کرے اور بچے وقت کے خیالات اور جذبات کو
ہاوس سے اور آنے والی سطحوں کے لیے پیش کرے۔“ اس بات کا کسی حد تک تہا ر کیا جاسکتا ہے کہ بچے
ڈن رتھا اور ہوغت شعور کے ساتھ اگر کوسٹ نے کسی حد تک اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔

لاگر کوسٹ کی تحریروں میں اٹھنے والی زخمی بریں ہمیں ایک جوشیہ، غیر متزلزل خلوص کے حامل،
مہر مہر اور نہ ختم ہونے والے صبر سے پس مصنف سے متعلقہ براتی تھا۔ زور دین تصوراتی چہنچا کے حامل
لاگر کوسٹ نے نہ صرف آنے والے ذوق کے ظہرات کا تہا پسے المارہ کر لیا تھا جو مستند شانی کے ادب کو
پیش آنے والی دکھائی دیتا تھا بلکہ وہ ان جذبول کی حررت کا سب سے زیادہ ہوشیار رکھتا تھا، حالات کے
طوفان جن کو بچہ دینے کے لیے پہنچا دیتے تھے۔

اس بات یہ ہے کہ لاگر کوسٹ خواہ ذرا مافی یا مافی، مدد یا مافی، کسی طرح کا ضروری کیوں نہ
متمال کرے اس کا حقیقت تک پہنچنے کا المارہ ہی ہوتا تھا کہ ایک ہا شعور اور فطرتی ادب کا ہوتا ہے اس
کے تیس اس سے کوئی فرق نہیں پتا کہ تہا کی اس کی تو تہا کے مطابق فطرتی گے بھی د نہیں اس لیے اس
کا ہر ایک کام ایک پھر کی مانند ہوتا ہے جس سے وہ ایک ہا شعور کی مت تعمیر کیا جاتا ہے۔ یہ پھر اس کے
نزدیک ایک مقصد رکھتا ہے اور مقصد وہی ہے جس سے انسان کی محرومیوں، اس کے حالی متب، زخمی کے
پیشے ہوئے طوقی غلامی اور آزادی حاصل کرنے کے لیے بہادری و جدوجہد کی نشان دہی ہو سکتے۔ لاگر
کوسٹ کے تیس محبوب موضوعات ہیں جو [Guest of Reality], (1925) Gast hos verldgheten
Hjärtas sånger (1926) [Songs from the Heart] Han som fick leva om sig iv
(1928) [He Who Lived His Life Over Again], Dvärgen (1944) [The Dwarf],
Barabbas (1950) میں بار بار ابھرے ہیں۔

لاگر کوسٹ جنوبی سویڈن کے ایک چھوٹے سے قصبے Växjö میں ۱۸۹۱ء کے ایک مہم کے گھر
۱۸۹۱ میں پیدا ہوا۔ مذہبی روایات رکھنے والے خاندان کا ہونے کی باوجود Lutheran سنگی عقیدہ رکھتا تھا
جس کا اس نے اپنے ایک زمانے میں یہ لکھتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ وہ غیر ادبی ماحول میں پیدائش
کے لیے شکر گزار ہے۔ اس نے اپنے والدین کی مذہبیت کو پناہ تو نہیں مگر اس کے لیے اپنے جہاد کے
عقائد سے ارد گرد کی اتہار رکھا ایسا تھا اس بھی نہ تھا جیسا کہ اس کے سوانحی ناموں GAST HOS
VERKLIGHETEN (1925 Guest of Reality) سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ قبا لہ یولی وریل وینچے تک
وہ چارلس لہن کا پستار ہو گیا تھا اور اس نے فلسفیانہ موضوعات کی شاعری اور افسانے لکھنے شروع کر
دئے تھے۔ اس نے ہر سب ادب کو تعمیر حاصل کی مگر ذہنی حاصل کیے بغیر ہی تعمیر ترک کر دی۔

ل۔ کرکوسٹ نے ادیب کی حیثیت سے اپنا تعلق اپنی پہلی کتاب (1912) Mannuskor سے کر دیا۔ ایک سال بعد وہ پیرس گیا جہاں پھر فنون کے نئے رجحانات سے اس کی واقفیت ہوئی۔ پنے ایک نظریاتی مقدمے (1913) Ordkonst och biddkonst میں اس نے پانچویں صدی میں قائم کردہ نظم و ضبط کی آئینہ نگاری کی مگر (Icelandic saga) کی بلندی اور سادگی کے مقابل میں اولیٰ حضرت پرستی (Literary Naturalism) کو رد کر دیا۔

جگہ عظیم اولیٰ کے دوران ل۔ کرکوسٹ نیدرلینڈز اپنے پڑوسی ملک ڈنمارک میں رہا۔ وہاں قیوم کے نعتیہ میں اس نے ٹھیکڑے لیے لکھا۔ اس کا پہلا کھیل (1917) Densista Mannskan تھا، اس کے بعد کئی کھیل اور بھی لکھے۔ اس کی نغموں کا ایک مجموعہ بھی (1916) ÅNGEST Anguish میں شائع ہوا جس میں اس کی پیش نظر تھیں، ذاتی مسائل اور جنگ کے دوران مارے جانے کے خوف کے متعلق تھیں۔ مصنف اس عمل کی تلاش میں تھا کہ جب جنگ کی ہولناکیوں کے درمیان لاکھوں افراد مارے جاسکتے ہوں تو ایک انسان بعد اس طرح کوئی مدنی مدد کر سکتا ہے۔ یہ مجموعہ روایتی روایتی انداز نگار سے ہٹ کر اس نے آگے چل کر سوچیں میں شاعرانہ جدوجہد کی بنیاد فراہم کی۔

ل۔ کرکوسٹ کی مچھن کے ٹکڑے ہفت تھیں۔ اس نے 1974 میں انتقال کیا۔

خیاالت سے خطاب

میں سوینڈش اکادمی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے ادب کا نوبل انعام عطا کیا۔ یہ انعام اعزاز ہے کہ میں یہ سونے کرنے پر مجبور ہوں کہ کیا میں واقعی اس انعام کا صحیح معنوں میں حق دار ہوں؟ خود مجھ میں تو ایسا سوال کرنے کی ہمت بھی نہیں۔ چوں کہ یہ فیصلہ کرنے میں میرا کوئی دخل نہیں تھا اس لیے میں صاف خمیر کے ساتھ اس سے بظاہر امداد ہو سکتا ہوں۔ اس کی ذمہ داری میرے مخترم دوستوں پر ہے اور سچ پوچھیے تو اس کے لیے بھی میں ان کا شکر گزار ہوں۔

آج ہم نے بہت عمدہ تقریریں سنی ہیں، اور بھی سننے کو چاہیں گی اس لیے میں تقریر سے قاصر رہا۔ کمروں کا ٹھیکیری خدائش ہوئی کہ آپ مجھے صرف اس وقت تک کے لیے برطانت کرسیں کہ میں آپ کے سامنے اپنی ہی ایک کتاب سے اقتباس پیش کروں جو کبھی شائع نہیں ہوئی۔ میں اس پر ویش کی میں تھا کہ ایسے پیچیدہ موقع پر کیا کہوں، کہ اچانک ایک حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا۔ مجھے انھیں برس پرانا کھلی

1922 کا ایک قہمی مسودہ دل گیا۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو ایک نظر نظر سے گزرا جس میں آم و بیش دی کچھ تھا جو میں اپنی تحریر میں کہنا چاہا۔ ہاتھ اس فرق یہ تھا کہ وہ ایک کہانی کی صورت میں تھا، جو غالب سے میرے ذوق سے پس بھی کہنا ہے۔

میں نے یہ مسودہ شریبا تیس برس قبل تحریر کیا تھا۔ اس وقت میں شہرہ روم کے ساحل پر ایک بہت دل فریب مقام Pyrenees میں قیوم پڑھتا تھا۔ میں اس کا پیر باب آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

”روم زاد کی داستان“

ایک تھی دنیا، اور اس کی ایک حسین بیچ ایک مرد اور عورت وہاں رو رہے تھے، طویل عرصے پہلے کے لیے نہیں، بس ایک مختصر قیام کے لیے۔ ان کو اور بہت سی دنیاؤں کا بھی علم تھا اور ان کے نزدیک یہ دنیا دوسری دنیاؤں کے مقابلے میں بد مسود اور مقلد لگتی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ یہ دنیا رختوں، پہاڑوں، جنگلوں، آسمانوں، ہمد وقت پہلے ہوئے، دلوں، شام کے جھنکے میں چلتی اور ہر شے کو گدگداتی ہواؤں کے باعث کافی خوب صورت تھی۔ ان سب کے باوجود ان کے نزدیک دور دور کی دنیاؤں کے مقابلے میں یہ دنیا بے رنگ تھی، یہی وجہ تھی کہ اس دنیا میں انھوں نے صرف ایک مختصر عرصے کے لیے قیام کا ارادہ کیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کے نزدیک کسی اور جہد پر محبت اتنی حسین شے نہیں لگتی تھی جتنی کہ اس دنیا میں لگی۔ یہاں کی محبت ایسی شے نہیں تھی جو ہر ایک کو نصیب ہوا، ہر شے میں خود بخود خود میریت مچانے والی ہو۔ یہاں کی محبت ایک ایسے الجھن کی طرح تھی جس سے حیرت انگیز قسم کی چیزوں کی توقع ہو۔ اس طرح ہر وہ شے جو ان کی زندگی میں پسے شفاف اور زندہ رہتی تھی، پور ہمارا ہر شے، اور خفیہ لگنے لگی۔ وہ انھیں تھے اور ہر مضمون قوتوں کے رحم و کرم پر تھے۔ ان کو جس محبت نے یک جا کر رکھا تھا وہ حیرت انگیز تھی، ہاں ہمارا تھی، مت رکھتی تھی، فنا ہو سکتی تھی۔ لہذا کچھ عرصے کے لیے انھوں نے نئی دنیا میں رہنے کا فیصلہ کر لیا، جو انھوں نے دریافت کی تھی۔

یہاں ہمیشہ دن کی روشنی نہیں رہتی تھی۔ دن کی روشنی کے بعد ہر شے پر شام کے جھنکے کا چھا چھا اور سب کچھ غائب ہو جاتا۔ مرد اور عورت دونوں اپنے ہوئے چیزوں سے سرگوشیاں کرتی ہواؤں کو سنتے رہتے۔ دونوں ایک دوسرے سے فریب ہوتے، اور آپس میں سوال کرتے، ”خبر ہم اس جہد کیوں ہیں؟“ مرد نے اپنے اور عورت کے لیے ایک گھر تعمیر کیا، پتھروں اور گھاس سے بنا ہوا، اس لیے کہ فی سال ان کا یہاں سے جانے کو کوئی سادہ نہ تھا۔ عورت مٹی کے فرش پر خوشبودار گھاس بچھاتی اور شام کی سب سے مرد کا انتظار کرتی۔ دنوں آپس میں پہلے سے بھی نیا وہ محبت کرتے اور اس طرح زندگی بسر ہوتی رہی۔

ایک دن، جب مرد کھیتوں میں کام کر رہا تھا، اچانک اس پر عورت کی چاہت کا ظہور ہوا، جس سے وہ ہر شے سے باز کر محبت کرتا تھا۔ اس نے جھک کر اس زمین کو دوسرا دیا جس پر عورت بیٹھا کرتی تھی۔ عورت درختوں سے اور بادلوں سے بہت پیار کرتی کہ جب اس کا مرد گھر آتا، ان کی چھاؤں میں آتا، اس نے شام سے بھی پیار سنا شروع کر دیا کہ اس وقت مرد اس کے پاس واپس آتا۔ یہ ایک عجیب نئی دنیا تھی اور وہ نئی دنیا اس سے بہت مختلف تھی جہاں وہ پہلے رہتے تھے۔

اور پھر عورت نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ گھر کے باہر ایسا آدو دھوکے درخت نے بچے کو لایا۔ خائیا، بچے نے حیرت انگیز آنکھوں سے اصراف کو دیکھا، وہ درخت کی شاخوں سے گزرنے والی ہوائی سربراہت نے اس کی آنکھوں کو بند سے پریشان کر دیا۔ مگر مرد شکار کی خوں پھری لاش لیے تھکا مائدات کو گھر پہنچا۔ اندھیرے میں جیسے ہوئے مرد اور عورت دونوں پیار بھرے مہ ز میں اپنے مستقبل کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

کئی عجیب دنیا تھی یہ، گرم دنوں کے بعد ٹراپ اور بھاڑ دینے والا جاڑا، اور جاڑے کے بعد بھاریکا پھا موسم۔ ایک موسم سے دوسرے موسم کے درمیان، وقت کا بھاری اور یہاں کی کوئی شے جیسے تمام نہیں رہتی۔ عورت کے ہاں "موسم" بچے کی ولادت ہوئی، اور چند برسوں بعد، ایک اور بچہ پیدا ہوا۔ بچے بڑے ہوتے گئے، اپنی اپنی مصروفیات میں لگن، دوڑتے بھاگتے، کھیلتے رہے اور ہر روز کچھ نہ کچھ سیکھتے رہے۔ ایک حیرت انگیز دنیا تھی ان کے سامنے، جیسے کونے کے لیے۔ یہاں کوئی بھی سنجیدہ قسم کی شے نہیں تھی جس کو کھونا بنایا جاسکتا۔ کھیتوں اور جنگلوں میں مشقت کے باعث مرد کے ہاتھوں میں گھٹنے پڑ گئے۔ عورت کے خدو خوں ڈھنک گئے تھے، پیسے کے مقابلے میں چال کی شوخی کم ہو گئی تھی اس کی آواز ہمیشہ جیسی شہنی و سریلی ہی رہی۔ ایک تھکا دینے والے دن کے بعد جب وہ شام کاپنے بچوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی، اس نے ان سب سے مخاطب ہو کر کہا "اب ہم جلد ہی یہاں سے کوچ کرنے والے ہیں۔ اب ہم ان دنیاؤں کی طرف جانے والے ہیں جہاں ہمارا گھر ہے۔" بچے حیران ہو کر بولے، "تم کیا کہہ رہی ہو ماں؟ کیا اس کے علاوہ بھی دنیاؤں ہیں؟" ماں کی آنکھیں اپنے شوہر سے چار ہوئیں اور ان کے دلوں میں ایک ٹھیس مٹی اٹھی۔ ماں نے آہستہ سے جواب دیا "بلاشبہ، اور بھی دنیاؤں ہیں۔" اور پھر اس نے ان دوسری دنیاؤں کے بارے میں بچوں کو بتانا شروع کیا، جہاں کی ہر شے سرخ اور حیرت انگیز تھی، جہاں نہ اندھیرا تھا، نہ ہوا میں تھوڑے گاتے درخت نہ ہی کسی قسم کی جھو جھو۔ بچے اطراف جمع ہو کر اس کی باتیں سننے لگے۔ چچا میں کوئی باپ کی طرف رخ کر کے، استہساہ مہ ز میں یوں دیکھتا گیا پوچھ رہا ہوں "ماں جو کچھ کہہ رہی ہے کیا یہ سب سچ ہے؟" باپ قریب ہی بیٹھا ہوا اپنے خیالات میں تھا۔ سب سے چھوٹا بیٹا ماں کے قدموں سے قریب بیٹھا مواتھی، اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں عجیب طرح کی روشنی میں دکھ رہی تھیں۔ سب سے بڑا بیٹا، جس کی عمر بارہ برس کے لگ بھگ تھی، ڈرنا فاسلے پر بیٹھا ہوا تھا اور

دہر کی جانب نظر میں کھو رہا تھا۔ آخر میں وہ وہاں سے اٹھا اور اٹھ مہاجر کے اندر تیرے میں گم ہو گیا۔
 ماں اپنی فاسقانہ شافی رہی اور بچے اشتیاق سے سن رہے تھے۔ یہاں گستاخ کر وہ کسی دور قیام تک
 کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہی تھی۔ وہ بچے سے وہ رنگ چاقی، بالکل کی طرح چھوٹے چاکلے اسی کو
 کچھ نظر نہ آ رہا ہو، تیرے بھی یاد نہ ہو۔ اور پھر ایک لمحے کے بعد داستان جاری رکھی، ایسی جگہ میں جو کبھی سے
 بالکل بھولی چارہ کی ہو۔ کالک سے گھر سے راشن دان میں آگ سٹک رہی تھی۔ جس کی روشنی ان کے چہروں کو
 روشن اور گرمے کی فضا کو گرم کر رہی تھی۔ ان کا باپ ہتھکھوں پر ماتھہ رکھے تم سم بیٹھ رہا، درود سب بغیر کسی
 جنبش کے آدھی رات تک بیٹھے رہے۔ پھر اچانک دروازہ کھلا، کمرے میں ٹھنڈی ہو کا بھونکا اور نہ جیسا
 داخل ہو۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ پتھر تھا جس کے سینے سے تازہ خون ٹپ رہا تھا۔ یہ پتھر اس کا پہلا
 شکار تھا۔ اس نے پتھر کو آگ کے قریب زمین پر ڈال دیا اور اس سے گرم خون کا ایک ماتھوں کا رجبہ کا
 اٹھا۔ بغیر کچھ لمحے ہوئے وہ پچھنے کمرے کے ایک ذخیرے کرنے میں ہاتھ سونے کے لیے بیٹ رہا۔

اب ہر طرف خاموشی تھی، ماں اپنی داستان ختم کر چکی تھی۔ مہاجر نے ایک دوسرے کو سر ایسے
 نگاہوں سے دیکھا، گھبراہٹ سے سب کسی شغاب سے پیدا ہو گئے ہوں، وہیں پڑے ہوئے پتھر کے مردہ جسم
 کی جا پر گھبراہٹ دیکھا، اس کے چہرے سے بہتا ہوا خون پاس کے فرش کی زمین کو لال کر رہا تھا۔ مہاجر کے
 سب خاموشی سے اٹھے اور اپنے اپنے بستروں پر جا کر بیٹ رہے۔

اس رات کے بعد کچھ عرصے تک کوئی بات نہیں ہوئی اور سب اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔
 گرمیوں کے دن تھے، شدید کھیل شاداب سبز بادلوں میں بھٹکتا رہی تھیں، یہاں کوئی کبھی نہ کھا سے دیکھی
 ہوئی ہلکے بزمگ کی چھائیں ہوا میں جھبہ رہی تھیں، اور فضا دھور کی طرح شفاف تھی۔ ایک دن پیر کے وقت،
 چھوٹا جیسا اپنی ماں کے پاس آیا جب وہ دیر بیٹھی ہوئی تھی۔ بچے کا چہرہ دکھا ہوا، بالکل زرد ہو رہا تھا۔ اس نے ماں
 سے دوسری دنیا کے بارے میں سوال کیا۔ ماں نے اس کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور بہانہ "جان عزیز! میں
 اس وقت تو تمہیں کچھ بتا نہیں سکتی، دیکھو تو، سورجی چمک رہا ہے، تم دیر جا کر بھائیوں کے ساتھ کھیتے کیوں
 نہیں؟" وہ چپ چاپ رہا، چھوٹا آنسو بہا، ہوا، گھر کسی اور کھانے کے روئے کی خبر نہ ہوئی۔

اس نے پھر کبھی ماں سے سوال نہیں کیا، مگر روز بروز زرد ہوتا چلا گیا، اس کی آنکھیں عجب قسم کی
 روشنی میں چل رہی تھیں۔ ایک صبح وہ بالکل اٹھ نہیں سکا اور بستر پر ہی لیر رہا۔ دن گزرتے رہے اور وہ بستر
 سے نہ اٹھا، نہ چپ چاپ لیٹا ہی رہتا اور عجیب نظروں سے خدا میں گھونٹا رہتا۔ سب اس سے پوچھتے کہ اس
 کو کیا تکلیف ہے اور کہتے کہ جلد ہی وہ بچھا ہو جائے گا، مگر باہر لگا کر بیٹھے ہوئے نئے نئے خوب صورت
 پھولوں کو دیکھ سکے گا۔ وہ وہی جواب نہیں دیتا، بس بے حرکت لیٹا رہتا، کیا وہ ان لوگوں کو دیکھ بھی نہ رہا ہو۔
 ماں اس کو دیکھ کر رونے لگتی اور پوچھتی کہ کیا میں تم کو مزے مزے کی باتیں سنائوں مگر وہ صرف سگڑا رہتا۔
 اور پھر ایک رات اس نے آنکھیں بند کر لیں اور انتقال کر گیا۔ سب کے سب میت کے طریق

جمع ہوئے، ماں نے س کے دونوں ننھے ننھے ہاتھ اس کے سینے پر رکھے اور جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو اندھیرے کمرے میں جمع سب سے سرگوشی میں مرنے والے کے بارے میں باتیں کیں۔ کہنے لگے سرور یہ دنیا چھوڑ کر دوسری دنیا میں چلا گیا ہے، ایک بہتر اور خوشیوں سے بھرپور دنیا میں۔ مگر یہ سب انھوں نے دل شکنی کے عالم میں کہا اور سرور ہمیں بھریں۔ آخر کار وہ سب خوف زدہ اور متذبذب کے عالم میں چھوٹے بھائی کی نیت کو چھوڑ کر باہر چلے گئے۔

دوسری صبح انھوں نے میت کو زمیں میں دفن کر دیا۔ دن گزارتے رہے۔ ابھی کبھی ماں شام کو قبر کے پاس جا پہنچتی اور دوسری جانب ہندو۔ پہاڑوں کو گھونٹی دیتی۔ باپ، جب اس طرف سے جاتا تو قبر کے پاس سے ہو کر گزرتا، مگر بچے قبر کے قریب نہیں نہ جاتے، گویا یہ زمانہ بھی جیسے ہو۔

دونوں بیٹے بے ترنگے جوان بن گئے، مگر مرد اور عورت سمجھتے گئے۔ ان کے ہاں سپید ہو گئے کا مدھے حاصل گئے اور ان پر ایک طرح کا نمونہ درکار غالب آ گیا۔ باپ اب بھی بیٹوں کے ساتھ شکار کرتا جاتا مگر جب خطرناک اور وحشی جانور ہوتے تو بیٹے ہی آگے بڑھ کر ان کو شکار کرتے۔ بد قسمتی ہوئی ماں گھر سے باہر نہیں، جب ان لوگوں کی آمد متھی تو ادھر ادھر ٹوٹے لگتی۔ اس کی آنکھیں تنی کم زور ہو چکی تھیں کہ جب گھوہر کا سونچ بندہ پر ہوتا تب ہی اس کو ہر نظر آتا۔ باقی تمام وقت اس کی آنکھوں میں صرف اندھیرا ہوتا اور وہ سب سے اس کا سب چلتی راتی۔ شکار کی ایک شام وہ اندر جا کر دستر پر بیٹ رہی اور ہوا کے شور کو سنتی رہی، جس طرح وہ گزرے وقتوں میں سنا کرتی تھی۔ مردانہ کے پاس جا بیٹھا اور دونوں نے اس طرح باتیں کیں جیسے وہ اس دنیا میں ایک بار پھر ترقی و تہا ہوں۔ اگرچہ وہ بہت لاغر ہو گئی تھی مگر کافی بڑھتی ہوئی اس کے خدو خد کو روشن کیے ہوئے تھی۔ ایک ماں نے اپنے خاندان و اول سے عجیب آواز میں کہا، اب میں یہ دنیا جہاں میں نے اپنی زندگی بسر کی ہے، چھوڑ کر اپنے گھر چلا جاتی ہوں اور یہ ایک دن دو دن سب کو چھوڑ کر چل گئی۔ انھوں اس کو ہی مقام پر دفن کر دیا مرتے وقت جہاں لیٹی ہوئی تھی۔

موسم سرد پڑا۔ پہاڑ اور سردی کی شدت بھی۔ مرد و عورت ہو چکا تھا اس لیے اب اس نے باہر جانا چھوڑ دیا تھا، اس آگ کے قریب بیٹھا رہتا۔ بیٹے شکار لائرن زمین پر ڈال دیتے، باپ ان کے گلوے ہٹاتا، سگ پر چڑھتا اور آگ پر رکھ کر جیسے ہوئے گوشت سے بھڑک کر مریخ ہوتے ہوئے شعلوں کو کھتا رہتا۔ پھر جب بہار کا موسم آیا تو اس نے باہر جا کر درختوں اور پہرہ زار کی ہریالی کو دیکھا۔ سب کو دیکھ کر اس نے اثبات میں سر ہلایا، یہاں کی ہر شے اس کو مانوس تھی۔ وہ ان پودوں کے پاس لگا جن سے اس دنیا کی کوئی صبح اس نے پھول توڑ کر اپنی شریک حیات کو پیش کیے تھے۔ اپنے خون سے چربے شکار کے تھپوڑوں کے پاس لگا، جن کو اس کا بیٹا شکار کے لیے مستعمل کر چکا تھا۔ پھر وہ گھر کے اندر اپنی گلیا، دستر پر لیٹ گیا اور اپنے بیٹوں سے، جو اس کے دستر مرگہ کے پاس کھڑے تھے، کہا، اب مجھے اس دنیا سے جہاں میں اپنی

تمام زندگی رہا ہوں، سچا ہوا چاہیے، یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔" اس نے بیٹوں کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے اور اس وقت تک تھامے رہا جب تک کہ اس کا انتقال نہیں ہو گیا۔ بیٹوں نے اس کی خواہش کے مطابق اسی مقام پر اسے دفن کر دیا۔

دونوں بڑے چپکے تھے، بیٹوں نے کتھ کا سر لٹس اپنا ان کو ایک طرح کی گزری کا احساس ہوا جیسے کہ وہ ہندوستان جس سے ان کا جسمانی تعلق نہ ہو ان کو کسی چیز سے ہمدردی ہوئے تھے، اچانک ٹوٹ گیا ہو۔ دوسرے دن علی الصبح دونوں باہر سے درختوں اور رات کو ہوئے وانی بارش کی سہمی خوش گوار ہونا میں نکلے۔ دونوں قدم آور چھان، برابر برابر چلتے رہے، زمین ان کا بوجھ اٹھانے پر تھک رہی تھی۔ ان کے لیے زندگی شروع ہو رہی تھی اور وہ دنیا کی تمام سنبھالتے کے لیے تیار تھے۔



لارڈ برٹرینڈ رسل

اعترافِ کمال۔ اسی کی مختلف دورِ قیام تحریروں کی قدر شناسی کے لیے جن میں وہ انسانیت کے اعلیٰ معیار اور آئین کی اگھار کا دفاع کرتا ہے۔

برطانوی فلسفی، ریاضی دان اور تشدد کا برٹرینڈ رسل، جس کو بدشہ اس کے عہد کا سب سے پڑھا جانے والا فلسفی کہا گیا، اپنی یادداشت میں لکھتا ہے کہ اس نے 1895 میں یہ منصوبہ بنایا تھا کہ وہ فلسفے کی رائٹس پر ایک کتابی سلسلہ تحریر کرے گا جو خالص ریاضیات سے تعلیمات تک کا احاطہ کرے گا جب کہ دوسرے سلسلہ عمریات کے اچھے گئے سوالات پر مبنی ہو گا اور اس کا خیال تھا کہ دونوں کے مخرج سے اسکی تالیف تیسرا ہوگی جو رائٹس بھی ہوگی اور عملی بھی۔

لارڈ برٹرینڈ رسل نے 1948 میں جب کہ اس کی عمر ۵۳ سال کی تھی، مغرب کے فلسفے پر پڑنے والی اثرات اور خیالات پیش کر کے قاری کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس کی ٹھوس جدوجہد سے پڑندگی کو کس نظر سے دیکھا جانا چاہیے۔ اپنے مضامین میں ایک مقام پر وہ سترہ سے پہلے ترمیم والے فلسفیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے

”کسی فلسفی کا مطالعہ کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ نہ تو اس کو ایم کے سنگھ میں پڑھو نہ جانے نہ ہی اس کو بالکل نا قابلِ اعتناء سمجھا جائے۔ اس کو اس وقت تک

ایک طرح کی فرضی ہمدردی کا حق دار سمجھا جانا چاہیے جب تک کہ اس بات کا اندازہ نہ کر لیا جائے کہ اس کے کٹکڑیوں پر نشیون کرے سے یہاں محسوس ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی اسی پر تنقید کی گئی تھی۔ انہی چوبیسے اور دہائی جہاں تک ممکن ہو ہر طرح کے نکتہ ہائے نظر کے اثرات سے بالکل خالی انداز میں ہو سکتا ہے۔

ایک اور مقام پر وہ کہتا ہے،

”میرے ہم وطن فلسفے کے اٹھائے ہوئے سوالات کو بھونچتا چاہیے نہ ہی اپنے آپ کو یہ بازو نہانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہم نے ہمارے سوالات کے غیر معمولی جوابات تلاش کر لیے ہیں۔ ہمارے دور میں فلسفہ اپنے طالب علموں کی مذبذب کیفیت سے مطمئن ہوئے بغیر، عدم یقینی کے عام میں بھی بند رہنا سیکھا سکتا ہے۔“

اپنی بلند پایہ دانش اور تصانیف کا ایک عظیم سرمایہ پیش کرنے کے باوجود رسل نصف صدی کے دوران، ہمیشہ اور ہمہ وقت چوکھی لڑنے کے لیے تیار، حلقہ حور میں میٹھی میٹھی بحث بنا رہا۔ انسانی علوم سے متعلق سائنس اور ریاضیاتی منطق کے میدان میں رسل کی محبتوں و تصانیف کا میزان مشہور زمانہ سائنس دان نیوٹن کی انسانی علوم سے تعلق رکھنے والی سائنسی کامیابیوں سے کیا جاسکتا ہے۔ رسل کی سب سے ہم کامیابی یہ ہے کہ اس نے ادبی اور تنگ سائنسی موضوعات پر اس طرح قلم اٹھا یا ہے کہ عام قاری کے لیے عام آدمی کی وہ جہاں پر قدم نہیں اور ہر سطح پر اس کو پڑھا جاسکتا ہے۔

ہیڈریڈ رسل، مدیٹھ کے علاقے وینز کے شہر Trebeck میں پیدا ہوا۔ وہ دایکا وینٹ ڈیگر لے کی والدین سے متاثر ہوا تھا۔ اس کی ماں بھی مدیٹھ کے اشرافیہ سے تعلق رکھتی تھی۔ رسل جب صرف تین برس کا تھا اس کے ماں اور باپ دونوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے دادا اور ابا جان رسل نے، جو مدیٹھ کا وزیر اعظم ہو چکا تھا، اس کی پرورش کی۔

انگریزوں کے علم اہل سر سے متاثر ہو کر ہیڈریڈ رسل نے ریاضی میں مہارت طبع کا اظہار کیا اور اسی دوران اس کو فلسفے سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ یہ غائبانہ علم اہل سر کا اثر تھا کہ اس کا کہنا تھا کہ مجھے شاید پہلی پسند ہے۔ ایک اور مقام پر اس نے لکھا تھا کہ مجھے جیسے خوش داسے خاکے پسند ہیں، میں غبار، مٹاؤ، بہام سے نفرت کرتا ہوں۔ شروع شروع تو اس کو دنیا کے میں دلچسپی رہی مگر کچھ برسوں بعد اس نے حیات چارواکی کو دیکھ کر دل و دماغ کا بھی مکر ہو گیا۔

رسل نے اپنے دادا کے کتب خانے سے استہاپ فیض کیا مگر جب وہ کیمبرج میں تعلیم کے لیے داخل ہوا تو اس نے جدید نگینے والوں کو پڑھا جن میں اسمی، برنارڈ شا، فلا جیٹر، بوٹ مین اور پلٹے شامل تھے۔ برنٹیل کاغذ میں تعلیم کے دوران ہی ہیڈریڈ کی ذہانت ظاہر ہونے لگی تھی۔ تعلیم کے اختتام پر ہیڈریڈ فرانس میں مدیٹھ کے سفارت خانے سے امریکی طور پر منسلک ہو گیا۔ اس نے اپنے خاندان کے اختلافات

کے بارہویہ ایک امریکی صورت سے شاہی کرنل اوماس کے ساتھ مدین چڑھ گیا جس اس نے معاشیات پر بھی اور اس دور میں اپنے پہلی تصنیف، 1895 German Social Democracy کے لئے مواد اکٹھا کیا۔ ایک دوسری جہد و مشین کا لُج کی فیوشپ کے لیے کیسے گئے اس کے مقدمے Essay On The Foundation On Geometry (1897) کی اشاعت ہوئی۔

برٹریڈ رسل کا سب سے بڑا کام The Principles of Mathematics (1903) کی صورت میں شائع ہوا جس میں اس نے تجویز کیا کہ چند منطقی خیالات سے ریاضی کی بنیاد عذ کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں اس نے Gottlob Frege (1848-1925) کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا کہ ریاضیات دراصل منطق کے قواعد ہی کا نام ہے اور اس کی بنیاد منطقی عمل جو ہر پر ہوتی ہے جو مادے اور حادثات کے دائرہ اثر سے باہر ہوتے ہیں۔

برٹریڈ رسل نے 1907 میں برطانوی پارلیمنٹ کے چند دنوں میں حصہ لیا مگر کام نہ ہوا۔ اس خیال سے کہ دماغ میں سے ہونے والی بات جاننا ہوتی ہے، اس نے دماغ میں سے ہونے والی بات کا بیشتر حصہ ہونے والی کردار سے لیا۔ ایک غیر محرم سے برٹریڈ کے طویل سلسلے کی وجہ سے اس کی بیوی سے علاحدہ ہو گئی۔ بعد میں اس کا تھوڑا سا سلسلہ ایلٹ کی بیوی کے ساتھ بھی رہا۔ اس نے اپنے جنسی رجحانات کے بارے میں ایک کتاب (Marriage And Morals, 1929) لکھی جس میں اس نے یہ لکھ دیا ہے کہ انسان قدرتی طور پر ایک بیوی پر قناعت نہیں کر سکتا۔ اس دماغ کی وجہ سے اس کے بہت سے مذاہن اس سے مارا پی ہو گئے۔ پہلی جنگ عظیم کی ابتدا پر رسل نے جنگ کے بوجھ امن کی بات کی جس کی بنا پر اس کو اپنی فیوشپ سے ہاتھ دھوا پڑا۔ رسل نے بہت سے اداروں اور دعوں کی مدد سے ایک عمر خدمت پیش کی جس میں بدعنوانی کو جنگ میں غیر چاہیے قرار دینے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ 1918 میں رسل کو اتحادی امریکی فوج کو بدنام کرنے کی پانٹ میں پھرمایا کی قید دلائی گئی۔ اسی دوران اس نے لندن کے محکمے پر کیمپس کے قید خانے میں اپنی کتاب، Introduction To Mathematical Philosophy (1919) پر کام کیا۔ 1920 میں بدعنوانی کی سرپرستی کے ایک وفد میں شامل ہو کر رسل دوں گز جہاں اس کی ٹینٹ ہو رہی تھی سے ملاقات ہوئی مگر رسل وہاں سے بہت لڑی برداشت دیا اور واپس چلے گئے، انقلاب دس کے خلاف کتاب (The Practice And Theory Of Bolshevism, 1920) لکھی جس میں اس نے انقلابیوں پر کڑی نکتہ چینی کی۔

1920 اور 1921 کے دوران رسل نے چین کے شریچنگ میں (جواب بیچنگ کے نام سے پکارا جاتا ہے) فلسفہ پڑھایا اور سی زما نے میں اپنی ایک طاب علم لوئی دور بیچ کے تعاون سے بدعنوانی میں بیچیں اس کے مقام پر ایک نئے انداز کا اسکول قائم کیا۔ اسی دوران اس نے طریقہ تسمیر کے بارے میں ایک کتاب On Education (1925) تصنیف کی جس میں اس نے بچوں پر والدین کے غیر ضروری

خوفی اور مذہبی مذاہد کے خلاف اپنے نظریات پیش کیے۔ رسل نے بعد میں ہولڈ ایک سے شادی کر لی۔
 1922 میں رسل نے اپنی چھ سوئس سالگہ اس رانی مشرور ہونے کے ساتھ منائی کہ بچوں کی عمر
 میں انسان کا دماغ سخت "رغیر لچک و رہو جاتا ہے۔ 1927 سے 1938 تک رسل نے مختلف موضوعات پر
 خطبات اور مناسبتیں کی تھیں۔ اسی دوران میں نے اپنی فلسفیانہ کتابوں The Analysis Of Mind
 (1921) اور The Analysis Of Matter (1927) پر بھی کام کیا۔ لیکن ان کے تجربات کے بعد رسل نے
 تعلیم ہی کے موضوع پر ایک اور کتاب Education And Social Order (1932) کے لیے سوادا کھنڈ کیا۔
 1938 میں رسل امریکا منتقل ہو گیا جہاں کیسے فورین کی پولی ورٹی میں اس کو ممبران پرو فیسر بنایا
 گیا۔ اس کے بعد وہ نیو یارک کے سٹی کالج چلا گیا مگر وہاں رسل کو اس کے جنسی حقوقیات، تعلیم اور جنگ
 کے بارے میں خیالات کی وجہ سے تعلیم دینے سے روک دیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران رسل نے اپنی اتنی پسند کی کوئٹر باؤ کبھی نہ لکھی تھی زندگی کے آخری
 عشرے میں جو ہرن چھپاؤں کے جاننے کا سرخیل بن گیا تھا۔ بعد میں اس نے سیاہی جم تکس میں بھی حصہ
 لینا شروع کیا۔ نومبر 1964 میں اس نے Bertrand Russel Peace Foundason قائم کیا، وہاں میں
 یہودیوں کی اور فلسطینیوں میں عربوں کی حمایت کی، اور دینا مہر کی جگہ کو قائل قبول عدم کیا۔ رسل کو انٹرن
 میں حکومت کے خلاف ایک مظاہرے میں حصہ لینے کی وجہ سے جیل بھیج دیا گیا جہاں خرابی صحت کی وجہ سے
 صرف سات دنوں بعد رہا کر دیا گیا۔

لارڈ برٹریڈ رسل نے مختلف اور متنوع مسائل اور موضوعات پر کام سے زیادہ کتابیں تصنیف
 کیں۔ اس کے سارے کام کے حاطے کے لیے ایک فیملی کئی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ اسے مختلف سے بیان
 میں یہ کہنا اور بھی مشکل کام ہے کہ فلاں فلاں اس کو اچھی کتابیں تھیں۔ رسل نے اپنی خود نوشت سوانح
 حیات میں لکھا ہے "تین شریعہ جذبات میری پوری زندگی پر بڑی طرح محیط رہے ہیں: محبت کی تمنا، علم و
 دانش کی تلاش اور انسانیت کی معیشت زندگی پر تائید"

برٹریڈ رسل نے 1970 میں وفات پائی۔ آخری وقت جب کسی نے اس سے پوچھا کہ اگر تمہاری
 حد سے مذاقات ہو گئی تو تم کیا عذر پیش کرو گے تو اس نے کہا "میں اس کو خود اپنے وجود کے بارے میں کافی
 شہوت میں نہ کرنے پر زرا اہم کہوں گا"

خطبہ

”کون سی خواہشات سیاسی طور پر اہم ہوتی ہیں“

میں نے ۳۰ کی شام اپنے خطاب کا یہ عنوان اس لیے چنا ہے کہ میرے نزدیک موجودہ دور کے سیاسیات و سیاسی گھٹیاات کے مباحث میں نفسیات کا نام کھل استعمال کیا جاتا ہے۔ معاشی حقائق، آبادی، شہریات، ۴۰ کی عظیم و غیرہ اہمیت احتیاط سے مرتب کی جاتی ہیں۔ دور یہ معلوم کرنا چھوٹا مشکل نہیں کہ جب کوئی ایک جنگ شروع ہوتی تھی اس وقت ٹیلی اور بیرونی کوریج کی آمد دینی کیا تھی۔ اگر ہم متعلقہ کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں تو یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس وقت آبادی کی اوسط آمدنی کیا تھی اور دنیاؤں ملکوں کی افواہ کی خبریں کیا تھی لیکن اگر آپ یہ چاہنا چاہیں کہ ایک کمیونیٹی کس قسم کا انسان ہوتا ہے، کیا ایک شہری کوریج اور بیرونی کمیونیٹی میں کوئی خاص فرق ہوتا ہے، اگر آپ چاہنا چاہیں کہ مدق سے دنیاؤں کی توقعات کیا ہیں، ان میں کسی فرق کی بے اہمیتانی ہے، ان کی امیدیں اور ان کے خطرات کیا ہیں، یعنی ایسی کین میں شے ہے جو ان کو حرکت پر آتا اور دیتی ہے تو کوئی بھی حوالے کی کتاب آپ کی مدد نہیں کر سکے گی۔ مگر آپ یہ وثوق سے نہیں کہہ سکیں گے کہ کوریج کے باشندے کس اقوم عالم (UNO) میں نادرہ دل چاہی رکھتے ہیں، اپنے شہری مددگار کے ساتھ اتحاد چاہتے ہیں۔ نہ آپ یہ اندازہ لگا سکیں گے کہ یہ لوگ ایسی سیاسی شخصیات کی خاطر جن کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتے، ذہنی اصلاحات پر رائے شمار کی کو ترجیح دیں گے۔ وہ دواڑ کے ایوان پائے ناما حکومت میں برادری سر پر آوردہ شخصیات کا، اس قسم کے نئے دے سوالات سے صرف نظر کرنا ہی طرح طرح کی مایوسیاں پیدا کرتا ہے۔ اگر سیاست کو سائنسی انداز میں دیکھا جائے اور اگر وجود میں آنے والے واقعات چارک روٹمانہ ہوں تو انما سیاسی سوچو بوجو انسان کے شعری رد عمل میں سرایت کر جائے گی۔ انسان کی بھوک نعروں پر کیا اثر دیتی ہے؟ ان کی اثر انگیزی آپ کے غم میں سے ہمارے کم یا زیادہ کر سکتی ہے؟ اگر ایک شخص آپ کو مجبوریت کی پیشکش کرتا ہے اور دھرا لالچ کی ایک پوری کی، تو فاقہ زد کادہ کین سر دجہ ہوگا جس آپ لالچ کو روٹ پر ترجیح دیں گے؟ اس نوٹ کے سورت پر کم توجہ دینی جاتی ہے۔ بہر حال، ہم اس منزل پر کو سیکھیں کہ ایک طرف دیکھ کر انسانی پر غور کرتے ہیں۔ انسان کی ہر حرکت کسی خواہش کی تابع ہوتی ہے۔ کچھ پیچیدہ معصیاتی اخلاقی یہ گمراہ کن لکھیہ پیش کرتے ہیں کہ خدائی اصولوں پر عمل سے خواہشات کو دبا دیا جاسکتا ہے۔ میں اس کو گمراہ کن کہہ رہا ہوں، صرف اس لیے نہیں کہ کوئی بھی شخص اپنے غرض پر عمل نہیں کرتا، بلکہ اس لیے کہ غرض کسی کو مجبور نہیں کر سکتا جب تک کہ اس میں غرض شہری ہونے کی خواہش پیدا نہ ہو جائے۔ اگرچہ ہر کیفیت میں استثنا کا امکان

ہوتا ہے، مگر اس ملام پر میں اس نکتے کی وضاحت کے لیے نہیں (وٹس اپیاء کی ایک قدیم قوم Sabine) خواہ مخواہ کی تہذیب کی طرف اشارہ کیا چاہوں گا۔ اور یہ بھی سرشانی آسٹریلیا کی ترقی اس لیے بڑی طرح متاثر ہوئی تھی کہ سختی کو بھان کارکن، جن کو مارے کام انجام دیتے تھے، خواہ مخواہ کی صحبت سے کھل کر روٹی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر ایسے واقعات تو شاندار و تاریخی ہوتے ہیں اس لیے کہ عام طور پر مرد اور عورت کی آپس کی دلچسپیاں سیاست پر کم ہی اثر انداز ہوتی ہیں۔

ان خواہشات کو جو سیاسی طور پر اہم ہوتی ہیں ہم جیولوجی اور تاریخی سرویس میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ جیولوجی سرویس میں زندگی کی ضروریات یعنی خوراک، مکان اور لباس وغیرہ آتے ہیں۔ جب یہ اشیاء بہت کمیاب ہو جائیں تو پھر انسان ان کے حصول کے لیے کسی حد تک بھی جا سکتا ہے خواہ وہ وہ آرائی ہی کیوں نہ ہو۔ تاریخی و تاریخی کے طبیب کا کہنا ہے کہ چار مختلف موقعوں پر سرزمین عرب میں پائے گئے وے قبا نے وہاں کی آبادی کو اطراف کے علاقوں میں ہجرت پر مجبور کر دیا جس کے گہرے سیاسی، تہذیبی اور مذہبی اثرات مرتب ہوئے۔ ان چار میں سے آخری موقع غلوں اسلام کا تھا۔ اسی طرح جیولوجی سے مراد جی (Germanic) قبائل کا تھکسان کی طرف اور پھر مان فرانسیسی کی طرف ہندوستان کو کوچ کے محرک بھی ایسے ہی حالات تھے۔ بد شہر ماضی میں بھی اور اس دور میں بھی، سیاسی واقعات میں تبدیلیوں میں بہت سے وجوہات میں قبا کی طلب ایک اہم وجہ رہی ہے۔

مگر انسان تمام جان داروں سے ایک بہت اہم وقعت کی بنا پر مختلف ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کچھ ایسی انتہائی خواہشات رکھتا ہے جو کمزور پر بھی پوری نہیں ہو سکتیں اور شاید یہ خواہشات اس کی طبیعت میں بھی بے چینی ہی رکھیں گی۔ جبر کو (و داؤد) جو شکار کو بھینچ کا مار دالتا ہے۔ مترجم) جب پیٹ بھر خوراک مل جائے تو سوچنا ہے پھر اس وقت ہی جائیگا ہے جب اس کو پھر سے خوراک کی ضرورت پڑتی ہے انسان بالعموم ایسا نہیں ہوتا۔ وہ عرب جو صرف چند گھنٹوں پر زندہ بننے کے عادی تھے جب مشرقی زمین سہولت کی دولت سے مالا مال ہوئے اور ملکوں میں موجود ناقابل یقین پیش پیشات سے بہرہ مند ہوئے تو وہ بیٹھے نہیں رہے۔ ان کے لیے بھوک ہی ہیر قدرت نہیں تھی اس لیے کہ صرف سر کے جکے سے شامہ پر ہی جانی غلام قوام و قسام کی ہڈییں ٹہم کر دیتے۔ اور بھی خواہشات نہیں جنہیں نے ان کو متحرک رکھا۔ ہم بالخصوص چار خواہشوں کی نشان دہی کر سکتے ہیں، آسپ پسندی، رقابت و مسابقت، خودنمایی اور طاقت کا حصول۔

آسپ پسندی زیادہ سے زیادہ شیا پر قابض ہونے کی خواہش یا چیزوں کو اپنے نام کرنا کی محرک ہے، میرے خیال میں جس کی ابتدا غائب محرومی کے خوف اور ضروریات زندگی کی خواہش کے استعمال سے ہوئی ہے۔ ایک بار ایسٹونیا کی طرزیوں سے میری دوستی ہوئی تھی جو قبا کے باعث موت کے منہ میں چھلنے سے بال بال بچی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو خاندان کے ماحول میں تھیں اور ان کو فرخواریک مہیا تھی مگر ان کی تفریح کا زیادہ وقت قبا ہی سمجھتے تھے اس لیے کہ وہ پس جمع کرتی تھیں۔ امریکا کا مشہور

مال دار شخص مائیکل راکفلٹر (Rockefeller) جس کا لو کہیں بڑی عمرت میں گزارا تھا، اپنی آئندہ زندگی میں کچھ ایسی کام میں بسر کرنا رہا۔ بازنطینی ریشمی کپڑوں میں رو کر بھی عرب سردار ریکستانوں کو بیس قبول سکے اور اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ اشیاء کا جمع کرنا ان کا مشغلہ تھا۔ اس آستاب پھرنی کی کہیں بھی کسی فی توجیہ بخش کی جائے، دق بھی اس بات سے بکار نہیں کر سکے گا کہ آستاب پھرنی ہی سب سے بڑی محرک ہے، بالخصوص ان لوگوں میں جو زیادہ طاقت ور ہوتے ہیں۔ آپ جتنا بھی حاصل کر سکیں، ہمیشہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہیں گے، شہر سیر کی کا خواب ایسا ہے کہ آپ کو ہمیشہ اسی میں سرگرداں رکھتا ہے۔

لیکن آستاب پھرنی پر چڑھنا یہ نامانہ اقدام ہے ہم تعاقب ہے مگر کسی طرح بھی سب سے طاقتور محرک نہیں جو جھوک سے بڑھ کر ہو۔ نکات بھی نہیں زیادہ طاقتور محرک ہے۔ اس میں کسی بات میں بار بار دیکھا گیا ہے کہ مثالی خدمات اس لیے صدیوں سے جاری رہی ہیں کہ مختلف ماؤں کے بطن سے پیدا ہونے والے ملاحظین کے لیے آپس میں اتفاقی شریک سکے اور بھانہ جگتیں میں گولڈا ہو کر پیدا ہوئے۔ جو یہ یورپ کی بھی ہی طرح کے واقعات ہوتے ہیں۔ جب برطانوی حکومت نے لہذا باقاعدہ طاقتور مائیکل سے Spread کے مقام پر قیصر بن گیا۔ اس کا سب سے بڑا موقع فراہم کیا تو اس کے ذہن میں وہ خیال ابھر جس کی ہم کو توقع تھی۔ اس نے سوچا کہ مجھے بھی وہی اہل (یعنی صدر برطانیہ) جیسی بگڑی رکھنی چاہیے۔ اور یہی خیال بعد میں پیدا ہونے والے تمام مصاحف کی جڑ بن گیا۔ وہی جیسی اب ہے اس سے کہیں خوشنودا جبر ہوگی اگر رقابت کے مقابلے میں آستاب پھرنی ہمیشہ قوی رہے۔ لیکن درحقیقت زیادہ تر لوگ خوشی سے منہ منی جھپٹنے پر تیار رہے ہیں گے اگر اہل کی وجہ سے اپنے رفیقوں کو کھانا باقی سے رو چا کر رکھیں۔ موجودہ شرح محصولات (rates of taxation) کی وجہ سے ہے۔

خود فی محرک ہونی ہے قوت کے اظہار کی۔ جو لوگ بچوں کے معاملات سے منسلک ہیں وہ چاہتے ہیں کہ بچے کی طرح عجیب و غریب انداز اختیار کرتے ہیں جب کہتے ہیں "میری طرف دیکھو" یہ جملہ دراصل غلبہ ستانی کی جنوری خواہشیں ہیں سے ایک ہے۔ یہ خواہش مسخرے پن سے بعد از مرگ شہرت کی خواہش سے مختلف چیز ہے۔ ایک نو ملاحظہ اعلیٰ لوگ شہزادہ سے پادری نے بعد از مرگ پر پوچھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے، تو اس نے جواب دیا "ہاں" اور پھر کہا "میں ایک دت۔ ایک در شہنشاہ اور پایائے روم کے بعد دیکھ رہا ہوں مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میں ان لوگوں کو اپنے عمل کے پند کی سب سے اوپری منزل پر لے گیا تاکہ وہ وہاں سے شہر کا منظر دیکھ سکیں اور (افسوس کہ) میں نے ان کو دیکھا وہ نہ گئے۔ اگر دینے کے مواقع گنوا دیے جن کی وجہ سے مجھے بالائی شہرت حاصل ہو جاتی۔" تاریخ اس کے بعد خاموش ہے کہ پادری نے اس کو نجات کے لیے غور کر دیا تھا یا نہیں۔ خود فی کے بارے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اس کو جو کچھ ملے گئے ان کی طلب بردھتی جاتی ہے۔ آپ کے بارے میں جتنی بات کی جائے آپ میں اتنی ہی زیادہ خواہش ہوگی کہ آپ کے بارے میں بات کی جائے۔ ایک مزید یافتہ عامل جس

کو اپنے مقدمے کے بارے میں چھپنے والی تفصیلات پڑھنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ بہت ماریاں ہوتا ہے
 اگر اخبار نے نامکمل تفصیلات شائع کی ہوں۔ اور اخبارات میں اپنے بارے میں جتنی زیادہ تفصیلات دیکھتا
 ہے اتنا ہی ان اخبارات پر غضب ناک ہوتا ہے جس میں کم تفصیلات شائع ہوں۔ میٹھا لاس اور اوہب
 بھی کچھ اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ وہ جتنے زیادہ مشہور ہوتے جتے ہیں، اخبار کے تراشے میں کرنے
 والے ان کو مطمئن کرنا اتنا ہی مشکل پاتے ہیں۔ ایک ٹین سالہ بچے سے لے کر ایسے حالات و واقعات تک
 جس کے فلم ہمارے دنیا لرزہ انگام ہو جائے۔ انسان میں خوددانی کے اثرات کو پوچھا جا رہا کر پیش
 کرنا شرمناک ممکن ہے۔ انسان تو اسی قسم کی خواہشات کو لوہیت سے بھی جوڑنے کا گناہ کر رہا ہے جس کو
 وہ ہمیشہ قابلِ تعریف کرنا مارتا رہا ہے۔

چوں کہ ہم محرکات کی بات کر رہے ہیں تو میں چاہوں گا کہ اس محرک کی بات بھی کر دوں جو
 دوسرے سارے محرکات کو مات دے دیتا ہے۔ میری مراد "حالت سے محبت" ہے۔ طاقت سے محبت کا
 جذباتی اثر خوددانی سے بہت مشابہ ہوتا ہے مگر یہ دونوں ایک ہی نہیں ہوتے۔ خوددانی پٹی تسکین کے لیے
 تعریف و عزت چاہتی ہے اور تعریف و عزت طاقت کے بغیر بھی بہ آسانی حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہاں تک
 بائے جنرل امریکا میں جن لوگوں کو سب سے زیادہ عزت اور وقار حاصل ہوتا ہے وہ فلمی ستارے ہوتے ہیں۔
 مگر Committee of Un-American Activities جو خود نہ عزت اور نہ وقار کی حامل ہوتی ہے، ان
 لوگوں کو حاصل شدہ عزت اور وقار سے محروم کر رکھی ہے۔ یہ طائفہ میں بادشاہ زیادہ عزت اور وقار کا حامل ہوتا
 ہے مگر وزیر اعظم بادشاہ سے زیادہ طاقت رکھتا ہے۔ بہت سے لوگ عزت اور وقار کو طاقت پر ترجیح دیتے
 ہیں مگر ایسے لوگ سن حیث ائیکل حالات و واقعات پر کم اثر انداز ہوتے ہیں بہ نسبت ان لوگوں کے جو
 طاقت کو عزت اور وقار پر ترجیح دیتے ہیں۔ جب 1914ء میں Blucher نے پوین کے محلات دیکھے تو بہ
 سخت کہہ "کیا وہ بے وقوف نہیں تھے جو اتنا کچھ حاصل ہونے کے باوجود، منگو سے الگ پڑا تھا؟" پوین کے
 پاس جیتنا خوددانی کے لیے عزت اور وقار کی کوئی چیز نہیں تھی مگر جب اس کے سامنے نیلے کارمیل آگیا تو اس
 نے طاقت کا انتخاب کیا۔ Blucher کے نزدیک یہ فیصلہ حتمی تھا۔ خوددانی کی طرح طاقت سے کبھی میری
 نہیں ہوتی۔ قدرت کا مد سے کم درجے کی طاقت بھی اس ہوس کو کمال طور پر نہیں ختم نہیں کر سکتی۔ اور طاقت
 اور لوگوں کی کم زوری یہ ہوتی ہے کہ طاقت کی اثر انگیزی کے سبب ان میں، حاصل شدہ طاقت کی کثرت و
 فراوانی کے تناسب سے کہیں زیادہ طاقت کی طلب بڑھ جاتی ہے۔ درحقیقت ہمہ شخصیات کی زندگی میں
 طاقت کی سب سے زیادہ محرک ہوتی ہے۔

طاقت کے تجربے سے طاقت کی محبت میں بہت اضافہ ہوتا ہے، وہ معمولی درجے کی طاقت کا
 تجربہ ہو یا بڑے درجے کی طاقت کا۔ 1914ء عیسوی کے ٹوٹ جانے والے زمانے میں جب حیثیت و دی خواتین کو
 لبرل حاصل ہو جاتے تو ان پر طاقت کے استعمال کا خلف عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا تھا۔ اسی

طرح کسی آمرانہ نظریہ حکومت میں طاقت رکھنے والے طاقت کے استعمال سے حاصل ہونے والے نطف کے تجربے سے اور جامد ہو جاتے ہیں۔ چونکہ انسانوں پر طاقت کا منشا مرد و کام کرنے لے جاتا ہے جو نہیں نہیں کرنا چاہیے اس لیے وہ شخص جس کو طاقت کی محبت وادہ عمل کرتی ہے، وہیں کو مسرت کی اجازت دینے کے بجائے ان کو انتہا دینے میں انہماک پانا ہے۔ اگر آپ کسی جائزہ موافق پر بھی دانت سے چھٹی کے لیے اپنے سربراہی سے درخواست کریں تو طاقت سے محبت کے باعث وہ طاقت دینے سے زیادہ انکار کرنے سے شگاف اندوز ہوگا۔ اگر آپ کسی قدرت کی قیصر کے لیے اجازت امام درکار ہو تو ایک معمولی اہل کار "ہاں" کے بدلے "نہیں" کہنے سے زیادہ مسرت حاصل کرے گا۔ اسی طرح کی چیزیں ہی طاقت سے محبت کی طلب کا خطرناک نتائج ہیں۔

مگر ایسے ہی عمل کا دوسرا پسو نیا وہ پسندیدہ رہتا ہے۔ میرے خیال میں طاقت سے محبت کا جذبہ دانش کے حصول کی تک و دو کا تمیز کا ہے۔ درحقی صورت میں کسی تکنیک کی تمام قسم کی ترقیات میں نظر آتی ہے۔ سیاست کے معاملات میں بھی ایک منہم حاکم میں طاقت کی اتنی ہی محبت ہوتی جتنی کہ ایک مطلق العنان میں۔ لہذا طاقت سے محبت گئے کے عمل کی تسبیح مذمت سراسر قطعی ہوگی۔ یہ آپ کے معاشرتی حالات پر و آپ کی صلاحیتوں پر منحصر ہوگا کہ کسی فائدہ مند یا مضر رجحان کام کا مقدمہ آپ میں کچھ کرنے کی تحریک پیدا کرتا ہے۔ اگر آپ کی صلاحیتیں تکنیکی، اصولی نوعیت کی ہیں تو آپ دانش بور تکنیک میں اضافے میں معاشرت کا باعث ہوں گے اور آپ کے اندر فائدہ مند ہوں گے۔ اگر آپ ایک سیاست دان ہیں تو طاقت سے محبت کا جذبہ آپ کو کسماکتا ہے مگر اصولی طور پر یہ تحریک آپ کو ایسے کا دباؤ مملکت میں کامیابی کی خواہش پیدا کرے گی جن سے آپ کو بھی بیچہ سے عرفی نظر کرتے رہے ہوں۔ Aodriades کی طرح ایک عقیم سپہ سالار کی بات سے قطعی انتہا ہوگا کہ وہ کسی کی جانب سے لڑ رہا ہے مگر نیا وہ ترسہ ممال پر اپنے ملک کی جانب سے لڑنا پسند کریں گے لہذا ان کا مقدمہ صرف طاقت سے محبت کی نہیں بلکہ اور بھی مظاہرہ دوسے کاربوں گے۔ سیاست دان اکثریت کے ساتھ رہنے کی کوشش میں وفا داریاں برتتے رہتے ہیں مگر نیا وہ ترسہ سیاست دان طاقت سے محبت کے ڈب نظر کسی ایک پر مٹی کو دوسری پارٹی پر ترجیح دینا پسند کرتے ہیں۔ مختلف قسم کے اشخاص میں طاقت سے محبت کوئی اہل صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک قسم تو مقدمہ کے جہنی سپاہیوں کی ہوتی ہے جس کی بہترین مثال پولیس تھی۔ میرے خیال میں نچو میں نے صرف مثالیت پسندی کے زیر اثر کارہیکہ پر غائب اس کو کیفیت نہیں دی تھی۔ اگر وہ فرانس کے بجائے کارہیکہ کا شہنشاہ ہو جاتا تو اس کی شخصیت اتنی بڑی نہیں ہوتی جتنی کہ انہیں بننے کے واسطے اس کوئی تھی۔ بہر حال ایسے لوگوں کی مثال کچھ ابھی اس لیے نہیں ہوتی کہ اس کو خود کوئی اور نمبر سے زیادہ مثالیت حاصل ہوتی ہے۔ سب سے اچھی مثال جہاں اہل امتیاز اور فوقیت کی ہوتی ہے یعنی تحت مملکت سے ماثور طاقت جو عام آدمی کی نظر سے اوجھل رہتی ہے مگر تحت نشین کے اس قسم کے خیالات میں "من کھ چھو" کو کیا پتا کہ ان کی ضرورت کیا

ہے "پروان چٹھس رانی"۔ اسے لوگوں کی بہترین مثال ہرن ہوسٹائن (Baron Hosten) کی شخصیت پیش کرتی ہے جو 1890 سے 1942 تک تین سو سال کے خاندان پر قابو رہا تھا۔ وہ اپنی مادہ و علاقے میں دنیا تھا، کبھی کسی چیز پر مہر عام نہیں کیا، شہنشاہ سے ملاقات سے جدا کر دیا ہوا سونے کے موافق کے جب شہنشاہ کے اصرار کو رد نہ کر سکا تھا، وہ بار کے سارے دولت مائے اس بہانے روکتا رہا کہ اس کے پاس دہار کے لائق ہاس نہیں۔ اس نے اسکی خفیہ معلومات کھلی کر لی تھیں جن کی مدد سے وہ چھتر تہائی کے وزیر اعظم اور اس کے آپ خاندان کو مارنے دھمکانے میں متحمل کرنا تھا۔ اس نے بیگ میل کرنے کی حالت نہ دولت کے نہ شہرت کے حصول کے لیے نہ ہی کسی اور فائدے کے لیے متحمل کی، اس عرف حکومت پر پٹی پسند کی ثابت پاپسی کو چھوڑنے کے لیے کی۔ شرق میں بھی (کھلی کے) ٹوہد سراؤں میں اسے کردوں کی کمی نہیں تھی۔

میں اب ایسے محرکات کی طرف آتا چاہوں گا جو ایک طرح سے دنیا کی طور پر ان سے کم اہمیت رکھتے ہیں جن پر روشنی ڈالنا چاہی ہے، پھر بھی یہ خاصے اہم ہیں۔ ان میں پیدا محراب بیکان اور بدھ شیشی سے محبت ہے۔ چاندی کے مقابل میں انسان، استواری کی گنجش کی بنا پر بدتر رکھائی دیتا ہے، عاقل کہ میں نے چھتر گھروں میں محصور لکھوہوں میں بھی تھکا دینے والے جذبات کے پتلائی آثار دیکھے ہیں۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو، تجر بہ یہ قائم ہے کہ اپنی نوع انسان کی جملہ خواہشات میں سب سے زیادہ شدید خواہش اکتاہٹ سے فرار کی ہوتی ہے۔ جب سفید فام انسانوں کا وحشی قبائل سے پہلی بار آمنا سامنا ہوا تو انھوں نے خدائی کلام کی روشنی سے لے کر خدا سے بنے ہوئے ایک تک کی پیش کش کی۔ حشیوں نے ان پیش کشوں کو بالکل نا خواستہ قبول کر لیا مگر ان کے نزدیک سب سے عمدہ تحفہ خور آود شراب تھی جس نے، زندگی میں پہلی بار ان کو ایسی کیفیت سے دوچار کیا جو ایک فقیر عمر سے کے لیے کسی عمر ان واسیے سرور سے روٹنا کی تھی جس میں ان کو احساس ہو کہ موت کے مقابلے میں زندگی بہتر ہے۔ سفید فام لوگوں کے نقل مکانی سے قبل امریکا کے دی ریڈ انڈین ڈک جب اپنے پائپ پیتے تھے تو ہم سب کی طرح سکون سے بیٹھ کر نہیں بلکہ تنگ دلیوں مناتے ہوئے تھی زور سے دھویں کو اندر کھینچتے تھے کی اکثر غم کشا جانتے تھے۔ جب ٹوٹمین کا پید کردہ بیکان نا کے لیے کافی ہوتا تو ان میں سے کوئی دلیں پرست کھڑا ہو کر پڑوسی قبائل پر حملہ کرنے کی ترغیب سے ان میں بیکانی کیفیت پیدا کرتا جس سے ان میں ویسی ہی سرور کی ہی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی کہ ہم لوگوں میں گھڑ درو عام ملنے شمار کی کا ماحول پیدا کر دیتا ہے۔ قرار بازی سے حاصل ہونے والا نفع دراصل ایک قسم کی بیکانی کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔ ہوسید ہک (HUG) کے بیان کے مطابق موسم سرما میں دیلا بھین پر موجود چھتری تاجدار بازی میں اس وقت تک مشغول رہتے جب تک کہ سردی نقدی بار نہ جائے، پھر تمام سارا ہن تیار رہت ڈاؤن پکا دیتے اور آخر میں وہ اپنے تن پر موجود ہاس بھی باد جاتے اور نئے بدن پہر جاتے ہوئے سڑی سے ٹھٹھکر کر مر جاتے۔ میرے خیال میں، قدیم ریڈ

انہیں قبائلی طریقہ، ہم مذہب لوگوں میں بھی، بیکانی کیفیت سے محبت ہی اچانک شروع ہونے والی جگہوں پر ظہور پذیر ہو سکتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے کسی فٹ بال کے کوچ دیکھنے کے دوران ہم خوش ہوتے ہیں۔ بیکانی کیفیت سے محبت کی بنیادی وجہ کاغذی کتا سمجھنا بھی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر مادی غلطی کا اس قدر کی کیفیت کے مطابق ہے جب انسان کی زندگی کا مددگار صرف شکار پر تھا، بالکل اسی طرح جیسے ایک آدمی قدیم طریقہ کے ہتھیاروں سے میں سامان، مالت کے خوراک کے قمرے میں کسی ہرن کی ناک میں بیٹھا ہو، آخر کار شکار کر لے، فتح ملدی سے شکار کو کھینچتے ہوئے اپنے غار میں لے جا رہا ہو، کھانسی کی تھکاوٹ سے چہرہ پر مسکراہٹ رہا ہو اور اس کی بیوی شکار کو دیکھ کر کھانا تیار کر رہی ہو۔ شکار کی فائدہ کے غار میں مست، جس کے بدن کی بدنی زندگی دوزخ میں جھنڈے ہوئے گوشت کی اشتہا، آئینہ خوشی اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہی مولود شکار سے بنائی گئی غذا سے شہم پر موثر ہو کر نیند میں چلا جائے۔ اس قسم کی زندگی میں انسان کے پاس شوق ہوتا اور نہ حالت کرید و کتابت کا شکار ہو۔ مگر جب انسان رعایت کی طرف مائل ہوا اور اپنی بیوی کو سمجھوتوں میں مشقت کے کام پر لگا دیا تو اس وقت وہ اور اس نے انسانیت کی خودمختاری، بھڑک، پورے شوق کیا، اس کے ذریعہ اس نے دیواریں اور لفٹیں ایجاد کیں اور وہ ایسی زندگی کے شہاب، کھینچنے لگا کر وہ خدائی مخلوق کے بندہ بن گیا جس پر مٹی جنگلی عمار کے شکار سے دہلے گا۔ ہر مادی مشقت شدید جسمانی مشقت کے لیے موزوں ہے۔ میں جب کم عمر تھا تو میری چھٹیوں پیل چنے کی طرح میں گزرتی تھیں۔ میں دنوں بچوں میں چپا، چٹا، ورنہ تمام ایک ایک خستہ ہو جاتا تھا کہ صرف آرام سے بیٹھ رہتا ہی سب سے بڑی لذت ہوتی تھی۔ ایسے میں مجھے اسکا ہشاکا وقت ہی نہیں ملتا کہ اس کو دور بھگانے کے لیے کچھ کرنا پڑے۔ مگر جدید طریقہ حیات اس قسم کے مشقت بحیرے کاموں کے لیے موزوں نہیں۔ ہمارا پیشہ کام بیٹھ کر کیا جاتا ہے اور اس لیے زیادہ تر جسمانی کام کے لیے صرف مخصوص مہلات کو حرکت دینی ہوتی ہے۔ گزرتی جہم بچوں میں پیل چلی کر کسی مقام پر جمع ہوتا ہے تو کسی بیکان آئینہ عیان پر اس کا رد عمل کا شدید نہیں ہوگا جیسے عام حالات میں ہو سکتا ہے۔ صرف شدید مشقت سے فربہ کا علاقہ تا قلیل عمل ہوگا اور اگر نسل انسانی کو اپنی رہنا ہے تو ہمیں ایسے طریقے ڈھونڈنے ہوں گے جن کے ذریعے ہمارے جسموں کی غیر استعمال شدہ طاقت کو ایسے کاموں میں خرچ کیا سکے جو بیکان سے محبت کے جذبے کو پیدا کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر اخلاقیات کا پرچار کرنے والے اور معاشرے کے مصلحین نے تم غور کیا ہے۔ مصلحین معاشرہ کا خیال ہے کہ سلجھانے کے لیے ان کے سامنے اس سے زیادہ پیہر مسائل موجود ہیں۔ اس کے برعکس اخلاقیات والے کسی بھی طریقے سے بیکان سے محبت کے اخراج کے بارے میں سمجھد ہیں مگر بد قسمتی سے ان کی بھیدگی کے پیش نظر گماہ ہونے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ گویا نقص کا ہیں، سنیں بال و غیرہ جسم کے دوزار سے ہیں اور گماہوں کے خوف پر گمانا ہیوں کے لیے ہمارا صریح رہنا بھڑک ہو گا۔ میرے نزدیک اس قسم کی باتیں گمراہی والوں سے لگتی

حق سنا ایک مشکل امر ہے۔ یہی مختلف روپ میں آتی ہے، وہی روپ جہانوں کو بیکانے کے لیے ہوتا ہے اور کوئی منجید اور کچھ نادر لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے۔ اور اگر یہی نو جوانوں کو فتنے اٹھانے کی طرف مائل کرتی ہے تو اس کا یہ ہیروپ وہی نہیں ہوتا ہے جو گمراہ رسیدہ لوگوں کی طرف سے لفظ اٹھانے کے عمل کو بُرا کہتا ہے۔ اور کیا علامت کرنے (پھوٹوں پر چپٹے چلانے) کا عمل ضعیف لوگوں کے لیے ایک نوعاً کی بیکان انگیزی کا موجب نہیں ہوتا؟ اور کیا یہ ایک قسم کی فتنہ آور شے نہیں ہے؟ مثلاً افغان، گمراہ شے کی کیفیت پر قرار رکھنے کے لیے جس کی غور و فکر ہو رہا ہے؟ اور کیا یہ خوف کی بات نہیں کہ سینہ کی بڑائی سے ہونے والی شروعات ہمیں دھوکے اپنے حلقہ دوستوں کے، ہر شے کی علامت پر آمادہ گردی ہے؟ اور اسی قسم کی ملائش جب حد سے زیادہ پھیل جاتی ہیں تو جنگوں پر منتج ہوتی ہیں۔ میں نے تو آج تک جنگ کو کسی رسم گاہ سے شروع ہونے نہیں سنا۔

بیجان، انگیزی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے بہت سارے روپ تباہ کن ہوتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کو تباہی کی طرف لے جاتی ہے جو شربِ نثر یا تار مار کی کے معاملے میں حد سے تجاوز کرنے پر قادر نہیں رہ سکتے۔ یہ اگر ہوش کرنے سے بھوکا روپ دھارے تو تباہی لاتی ہے۔ اور سب سے زیادہ تباہ کن اس وقت ہو جاتی ہے اگر یہ جنگ کی صورت اختیار کر لے۔ یہ زمین کی گہرائیوں میں اس طرح بیٹھ جاتی ہے کہ کوئی آسمان راستہ نہ ملے تو یہ نقصان دہ راہیں تلاش کر لیتی ہے۔ اس کے لیے کھیل کود وہ اگر کئی حدود میں رہے تو، سیاست جیسے آسان راستے موجود ہوتے ہیں۔ سیاست کے معاملے میں مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ سیاست جو بیجان خیر ہوتی ہے وہی سب سے زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے۔ مہذب اندازِ حیات خاصہ دھیمہ ہو چکا ہے اور اگر اس کو مستحکم رکھنا ہے تو ہمیں ایسے بے ضرر راستے مہیا کرنے ہوں گے جن سے ہم اپنی ان خواہشات کو پورا کر سکیں جو ہمارے آباؤ اجداد شکار کے ذریعے پورا کیا کرتے تھے۔ آخر یہی مسئلہ جہاں انسان کم اور خرگوش زیادہ پائے جاتے ہیں، اس نے ایک پوری تباہی کو اپنی وحشیانہ جنگ کی تسلیں کے لیے خرگوشوں کو طرح طرح سے اسے بوئے دیکھا ہے۔ اس کے نہ ٹھنکی ٹھنکی بانڈ و راک میں اس جنگ کی تسلیں کے لیے دوسرے ذرائع فراہم ہونے چاہئیں۔ میرے خیال میں ہر بڑے شہر میں مصنوعی آبیاری ہونے چاہئیں جس میں لوگ مازک مازک شہریوں کے ذریعے آسکیں اور وہاں ایسے نالیاب بھی ہونے چاہئیں جن میں مشینیں شاکر مچھیں ہوں۔ اور اگر کوئی شخص کسی قسم کی اندرونی جنگ کی شکایت کرنا ملے تو اس کو طرہ و تہہ نہ گھنٹن، اختراعی مہیب پھیلوں کے دھوکے بخارنے کی سزا دی جانی چاہیے۔ بیجان انگیزی سے محبت کے اخراج کے آسان راستے فراہم کرنے کے لیے ہمیں خمیر کی سے خوش ترسلی ہے۔ ہماری دنیا میں اچانک کسی کی ایجاد یا دریافت سے زیادہ بیجان انگیزی کو ترجیح نہیں ہونا اور ہمارے اگلازے سے کسی زیادہ وگ اس قسم کے تجربے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

کئی قسم کی سیاسی اعتراضات میں گندھے ہوئے وہ شدید جذبے ہوتے ہیں جن کی طرف، بد قسمتی

سے، انسان زیادہ تر ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے "محبت" اور "نفرت"۔ عام طور پر ہم اس شے سے نفرت کرتے ہیں جس سے خوف کھانے میں گھبرائی ہوئی ہو جائے۔ ہم جس چیز سے نفرت کرتے ہیں اس سے خوف کھنے لگتے ہیں۔ میرے خیال میں قدیم یونان میں یہ ایک طریقہ تھا کہ میرا اس شے سے خوف بھی اور نفرت بھی کتنے تھے جس شے سے ڈرتے نہیں ہوں۔ عموماً اس کے اپنے عجوبے چھوٹے بولتے ہوئے تھے، کسی ایک خوب کے لوگ کہیں میں دوست ہوتے تھے بشرطے کہ ان کے درمیان کوئی خاص چیز دشمنی کی نہ ہو۔ دوسرے دوسرے خوب یا تو عسکر کی دشمن ہوتے تھے یا ان سے دشمنی کی توقع ہوتی تھی اور اگر کسی خوب کا ایک فرد جاننا کوئی طور پر گھبرائے ہوئے ہو جاتا تھا۔ یہ حالات پر منحصر ہوتا تھا کہ دشمنی خوب سے اجتناب کیا جائے یا نہ ہو۔ ہمارے قدیمی جہاز فیر قوموں سے ہمارے رویے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جس شخص نے کبھی سفر نہ کیا ہو وہ وہ دھڑکیوں کی طرح، تمام غیر ملکیوں کو دوسرے خوب کے افراد سمجھے گا۔ غرور و غفلت جس نے سفر کیا ہو، جس نے بین الاقوامی سیاست کا مطالعہ کیا ہو، اس کو یہ معلوم ہو گا کہ اگر اس کے اپنے خوب کو پہلنا پھولنا ہے تو، ایک حد تک، اس کے خوب کو دوسرے خوب میں غم ہونا پڑے گا۔ اگر آپ انگریز ہیں اور کوئی آپ سے کہے کہ "فرانسیسی آپ کے بھائی ہیں" تو آپ کا فوری رد عمل ہو گا "راہ چلی جا تو وہ تو کھڑے جھگڑتے اور فرانسیسی زبان میں بات کرتے ہیں۔ ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ وہ میڈیکل کھاتے ہیں" اور اگر کسی دوسرا اس بات کی وضاحت کرے کہ شاید میں روسیوں سے جنگ کرتی ہوں اور ایسا ہوا تو ہمیں Rhine دریا کے حد کا دفاع کرنا پڑے گا اور اگر Rhine کا دفاع کرنا پڑے تو ہمیں فرانسیسی لوگوں کی مدد ضرور کرنی ہوگی۔ تو ہمیں یہ صاف نظر آنے لگے گا کہ فرانسیسی لوگوں کو بھائی کہنے سے اس کا کیا مطلب ہے۔ اور اگر کوئی یہ بھی کہہ دے کہ وہی بھی آپ کے بھائی ہیں تو وہ آپ کو اسی وقت تک قائل نہیں کر سکے گا جب تک آپ کو پتہ نہ ہو کہ اس نے جو چاہے کیا ہے۔ اگر ہمیں مریش کے باشندوں سے خطرہ لاحق ہے۔ گلیا ہم ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہمارے دشمن کا دشمن ہوں اور اگر ہمارا کوئی دشمن ہی نہ ہو تو ہمیں شاید بہت کم لوگوں سے محبت کی ضرورت ہوگی۔

پھر سب کچھ اسی وقت تک بچ ہوگا جب تک کہ ہم پھرے انسانوں سے تعلق کے بارے میں سوچ رہے ہوں۔ کبھی کبھی ہم کسی زمین کو اپنی دشمن سمجھتے تھے جس لیے کہ اس کی پیداوار ہمارے لیے ناکافی ہے۔ عمومی طور پر تو آپ قدرت کو بھی اپنا دشمن سمجھ سکتے ہیں اور قدرت سے بہتر ان کی امید و انسانی زندگی کی حدود جہد کرنا سکتے ہیں۔ اگر تمام انسان زندگی کو اسی الجھنا سے دیکھنے لگیں تو پھر انسانی تعلق انسانی کی امداد باہمی کتنی انسان ہو جائے گی۔ انسان کو اس فتنے پر لایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اس انداز میں دیکھنے لگے، بشرطے کہ وہ دوسرے، اختیارات اور سیاست دان اس بارے میں غلطی ہو جائیں۔ اگر وہ دوسرے تو وہ ایک کی تعلیم دیتے ہیں، اختیارات جہد کو ابھارنے میں لگے رہتے ہیں اور سیاست دان انتہا کی کامیابی میں منہمک رہتے ہیں۔ ان کتاب میں ہی کوئی بھی نسل انسانی کو باہمی خوشی سے بچانے میں کچھ کر سکتی ہے۔

خوف پر دو طریقوں سے قابو پایا جاسکتا ہے پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ چروٹی خطر سے کو کم سے کم کیا جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ راتی (یونانی فلسفی زینو کا مکتب فکر مترجم) ضبط نفس اور برداشت کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ دوسرے طریقے کو خوف پیدا کرنے والے اسباب سے صرف نظر کر کے منسوب کیا جاسکتا ہے، بشرطے کہ کوئی فوری قدم نہ اٹھاتا ضرورت نہ ہو۔ خوف پر غلبہ حاصل کرنا سب سے اہم ہوتا ہے۔ خوف بہ ذات خود بگاڑ پیدا کرتا ہے، بہت جلد خیال کی صورت اختیار کر لیتا ہے، یہ ہر اس شے سے نفرت پیدا کرتا ہے جس سے خوف محسوس ہو اور علم کی نیابت کی طرف راغب کرتا ہے۔ انسان کے لیے حسرتی تھکنا سے زیادہ فائدہ مند نیابتی شے نہیں۔ اگر کوئی بین الاقوامی نظام قائم کیا جائے جو جنگ کا خوف ختم کر دے تو لوگوں کی بدذمتی کی ذہنیت میں بڑی سرعت سے تبدیلی آسکتی ہے۔ اس وقت تمام دنیا پہ خوف کا سایہ ہے۔ جو ہر کی اور حراشی جم سے لیس، وہ تھاوا اشتراکی مویا بد تھاوا مرما یہ کارواشتن اور ماسکو دونوں سے لڑتا ہے اور انہیقت قیامت کی طرف سرک رہی ہے۔ اگر حالات کو بہتر ہوا ہے تو سب سے ضروری قدم یہ ہوگا کہ خوف کو کم کرنے کا کوئی طریقہ تصویب جائے۔ پوری دنیا اس وقت حریف نظریات کے تازعات میں جوا سے اور اس تازے کے ہڈا رہا ہے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ ہر شے چاہتا ہے تمام نظریات ہی غالب رہیں اور دوسرے کو شکست ہو۔ میرے خیال میں ایک خیال کی مسند صرف نظریات ہی کا نہیں۔ نظریہ تو لوگوں میں روتا ہندی کا ایک طریقہ ہوتا ہے اور جذبات وہ ہیں جو حریف گروہوں میں ہمیشہ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اشتراکیوں سے نفرت کے بہت سے اسباب ہیں۔ پہلا اور سب سے اہم سبب تو یہ ہے کہ ہمیں یقین ہے کہ وہ کارنگی چاہتا دھچکن چاہتے ہیں۔ مگر یہ کام تو لقب زن بھی کرتے ہیں اور باوجود اس کے کہ ہم لقب زنی کو منظور نہیں کرتے، ہمارے ان کے لیے اشتراکیوں کے مقابلے میں بہت مختلف ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لقب زن ہم میں ویسا خوف پیدا نہیں کرتے جیسے اشتراکی کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم اشتراکیوں سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ وہ بے دین ہیں۔ یعنی تو گیا دینوں صحت سے بے دین رہے ہیں مگر ہم نے ان سے نفرت اس وقت سے شروع کی جب انھوں نے چپاگ کافی ٹیک کو چھین سے نکال دیا۔ تیسرے یہ کہ ہم اشتراکیوں سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ وہ جمہوریت پر یقین نہیں رکھتے، مگر صرف اس بنا پر ہم (اچھن کے مگر تھران۔ مترجم) فرنگوں سے تو نفرت نہیں کرتے۔ چوتھے، ہم ان سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ وہ آزادی کی اجازت نہیں دیتے۔ ہم اس کے دوسرے میں اتنی شدت سے سوچتے ہیں کہ ہم نے ان کی غالی شروع کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ نفرت کی اصل وجہ یہ نہیں۔ ہم ان سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ ہم ان سے خوف زدہ ہیں اور وہ ہم کو دھمکیاں دیتے ہیں۔ اگر روکی Greek Orthodox مذہب کے چروکار ہوتے، اگر وہ پارلیمانی حکومت قائم کرتے، اور گرن کے ہاں کھل آزاد پریس ہوتا جو مذہب ہم پر گائیوں کی یہ چھاؤں مٹا دیتا، یہ شرطیں گران کی افواج اتنی ہی طاقت دے دیتیں جتنی کی آٹا ہیں، تب بھی، ہم ان سے نفرت کرتے، اگر وہ ہمیں غیر دیستارہ سمجھنے کے موقع فراہم

کرتے۔ پارتیڈ ہب سے نفرت نہا ہی اس سے دشمنی کا جب ہوتا۔ مگر میرے خیال میں یہ مسکد ہی غول
و لے احساس کا ہے جو آدمی کثافت دین و لا ہو اس کو غیر مانوس کی سمجھا جائے گا اور جو کچھ بھی غیر مانوس ہو
اس کا نقصان وہ ہونا لازمی ہوگا۔ دراصل نظریات کی ان طریقوں میں سے ایک ہیں جن سے قوموں و جود
میں آتے ہیں اور خواہ کسی طرح بھی وجود میں آئے ہوں ان کی تفسیر ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے صرف مثالی حرکات نہایت کی ہے یا ایسے محرک کی جو اخلاقی
طور پر امتثال کا ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ حقیقت ایسا ہی ہوتا ہے، بلکہ اصولی طور پر دیکھیں تو اخلاقی طور پر
مستند حرکات جذبہ ایثار کے ہوتے ہیں اور میں اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ ایثار کی محرک بھی ہوتے ہیں
اور اکثر اوقات ہے انہی مؤثر ہوتے ہیں۔ انگلستان میں غلامی کے خلاف جو احتجاج ہوا وہ بد شہ پٹاری تھا
اور مؤثر بھی ہو۔ اس کا ایثار ہی ہیو اس وقت ثابت ہوا جب 1833 میں برطانوی مجلس عدالت گان نے
غلامی کے طور پر کمزوروں پاؤں کی رقم جیکا کے ان ممبرین فاروں کو ادا کی تھی جنہیں نے اپنے غلاموں کو
آزادی دی تھی۔ ویلنٹین منٹنڈہ بگٹریس میں برطانوی حکومت ان تمام حکومتوں کو اہم رعایتیں دیتے ہیں
تیار تھی جو غلاموں کی تیار کرتے دیتے ہیں رہیں۔ یہ تو ماضی سے ایک مثال ہے مگر اس دور کے امریکا
نے بھی اسی قسم مثالیں پیش کی ہیں جو غیر معمولی ہیں مگر میں اس بحث میں الجھ نہیں چاہتا۔

میرے خیال میں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمدردی کا جذبہ ایک خاص محرک ہوتا ہے اور
کچھ لوگ کسی وقت دوسروں کی پریشانیوں سے پریشان بھی ہوتے ہیں۔ یہ جذبہ ہمدردی ہی تھا جس نے
پچھلے سو برسوں میں انسانیت کی اخلاقی کے لیے اقدامات کرائے ہیں۔ ہم جب پگال لوگوں کے ساتھ برے
مذاق کی خبریں سنتے ہیں تو ہمیں بہت تکلیف پہنچتی ہے (اور خوشی کی بات ہے کہ آج کل پگال لوگوں کی
پناہ گاہوں میں ان سے بھرتا سوک رہا جانے لگا ہے۔ مغربی ملک میں قیدیوں پر تشدد کی اجازت نہیں اور
اگر کبھی یہ ہوتا بہت شور مچتا ہے۔ ہم Oliver Twist میں قیدیوں سے کیے جانے والے سوک کو پسند نہیں
کرتے۔ پرنسٹن ممالک میں چاندروں کے ساتھ ظالمانہ سوک منور ہے۔ اس طرح یہی انداز میں
ہمدردی مؤثر ہو رہی ہے۔ اگر جنگ کا خوف دور نہ ہو چائے تو اس کے اثر سے پسندیدہ ہوں گے۔ انسانیت
کے بھر مستقبل کے لیے جذبہ ہمدردی اور اس کے حلقہ اثر کو بڑھانا اور پھیلانا ہوگا۔

مجموعہ اس بحث کے اختتام کی منزل پر آگئے ہیں۔ سیاست افلاس کے بچائے فوٹ یا گروہ سے
متعلق ہوتی ہے اور وہی شعبہ جذبات سیاست میں ہم ہوتے ہیں جن کو کسی ایک گروہ کے مختلف ارکان ایک
جی نگاہ سے دیکھیں۔ جس وسیع قرح کی میکانزم کی بنیاد پر سیاست کی طاقت بنائی جاتی ہے وہ گروہوں کے
اندہ باہمی مصلحت پر اور غیر گروہوں کے لیے عداوت پر منحصر ہوں گروہ کے اندر اعلیٰ باہمی کچھ مکمل اور بے
عیب نہیں ہو سکتی۔ ہر گروہ میں ایسے ارکان ہوتے ہیں جو رکن ہوتے ہوئے بھی وقتی طور پر گروہ سے باہر کے
نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگ وہ ہوتے ہیں جو یا تو معیار سے نیچے کے ہوتے ہیں یا بلند مثال کے طور پر اعلیٰ

بھروسہ روٹن ٹیمپر اور سوچو! غیر وہ ایک ہوش مند مرد و گروہ کے معیار سے ہندوؤں کی سنگ اور تقاضا کو برداشت کرنے کی حد حیات پیدا کرنے ہوتی ہے جب کہ معیار سے نیچے کے لوگوں سے نفی کا پیمانہ ڈھارنا ہوتا ہے۔

جہاں تک دھرم کے گروہ سے رشتوں کا حساب ہے تو جدید تکنیک نے ذاتی مفاد و جہت کے درمیان تقاضے پیدا کیے ہیں۔ پرانے زمانے میں جب دو قبیلے آپس میں جنگ کرتے تھے تو فاتح قبیلہ مغلوب قبیلے کو جس میں کس کے اس کے عار کے کہنے والے میں ضم کر لیتا تھا۔ فاتح کے نقطہ نگاہ سے اس طرح کی ساری کامیابی کامل طور پر قابل اطمینان ہوتی تھی۔ قتل ہرگز سزا نہیں سمجھا جاتا تھا اور جگہ جگہ شہنشاہ قاتل قبول تھا۔ ایسے عالم میں جنگ کا چاروں رزق حیرت انگیز نہیں ہو سکتا۔ بدقسمتی سے ہمارے دور اب بھی ویسے ہی جذبات میں جو قدیم جنگجوئی کے لیے مناسب تھے، جب کہ جنگ کا طریقہ کار بالکل بدل چکا ہے۔ دشمن کی ہلاکت بہت مہنگا ثل ہوتا ہے۔ اگر آپ حساب لگائیں کہ کچھ جنگ میں کتنے جہازیں مارے گئے، فاتح ملک کے لوگوں کو اس کا بروائی کے لیے کتنا فائدہ نہیں پہنچا تو آپ ہر ممکن جہازیں چھیننے والے طریقہ کا محارہ لگا سکتے ہیں اور آپ دیکھیں گے کہ سودا سستا مہنگا پڑے گا۔ یہ سب کی شریک ہیں جہازوں کے دشمنوں نے قدیم دور کے حسی فوائد حاصل کیے، یعنی مفتوح ملک اب ہر کسان اور ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ مغرب کے فاتحین کو ایسے فائدے حاصل نہیں ہوئے۔ تو یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ جدید دور کی جنگ، ماؤں اعتبار سے، نفع بخش کاروبار نہیں۔ اگرچہ ہم نے دونوں عالمی جنگیں جیتی ہیں، ہم زیادہ امیر اور آسودہ ہوتے گئے یہ جنگیں نہ ہوئیں۔ اگر انسان اپنے مجموعی مفادات کا خیال رکھے لگے، جو بہت کم لوگ کہتے ہیں، تو تمام انسانیت ہاتھ ڈالنے کی اور نہ کوئی جنگ ہوگی، نہ کسی کو قتل کی، نہ یہ کی یا انہم ہم کی احمیت رہ جائے گی۔ نہ کسی کو دوسروں کے خلاف زہرا گھسنے والوں کی ایک قطعہ کی ضرورت ہوگی جس کی مدد سے ایک قوم دوسری قوم کے خلاف اذیان کو زہر آلود کرنے میں مشغول رہے۔ نہ کسی ملک کی سرحدوں پر پے افسران کی ضرورت ہوگی جو غیر ملکی کتابوں، اور انجمنی خیانت کو خواہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں، در آنے سے روک سکیں۔ نہ اپنے ملک کے چھوٹے تاجروں کے مفاد کو غیر ملکی تاجروں کی پیش قدمی سے محفوظ رکھے کے لیے کسٹم کے تحکم کی ضرورت رہ جائے گی۔ یہ سب کچھ بہت جلد ہو سکے گا اگر لوگ اپنی سزوں کے لیے اتنی سی سرگرمی دیکھ لیں جتنی کہ وہ اپنے پڑوسیوں کی بد حالی اور فلاح کے لیے دیکھتے ہیں۔ لیکن آپ کی بتائیے کہ اس قسم کے Aopian خواب دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ حقوق پرست لوگوں کی سوشلسٹ ہوئی کہ ہم ہمیں طور پر خود غرضی نہ ہو جائیں اور جب تک ہم یہ نہیں کریں گے اس اور خوشی کے عہد کا حصول ناممکن ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ کلیجہ اور پیڑوں کے ساتھ پٹا طحہب ختم کریں۔ میں نہ بات کا سکر نہیں کہ خود غرضی سے مقابلے میں اچھی باتیں بھی ہیں اور یہ بھی کہ بہت سے لوگ ان پر عمل بھی کرتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں ہرگز ہانک نہیں کہ اگر ہم خود غرضی کی تشریح "رٹن خیال ذاتی مفاد پرستی" سے کریں تو ہمارے اوقات سیاسی مساع کے نچوڑ بہت سے لوگ خود غرضی کی سطح سے بلند بھی اور پست بھی نظر آئیں گے۔

اور ایسے موقع پر جہاں لوگوں کے اعمال "خود غرضی" کو سطح سے نیچے نظر آئیں تو زیادہ تر کماں دست پر لیتے ہوگا۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ مثالیات پسند محرکات (idealistic motives) کی وجہ سے ہے۔ اور یہ وہ تو جو کچھ مثالیات کے بغیر میں روا رکھا جاتا ہے وہ دراصل غرت و رجحانت سے محبت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جب آپ بہت سارے لوگوں کو ایک ہر ایک خلاق محرکات کی طرف دیکھتے دیکھیں تو لازم ہوگا کہ آپ ظاہری سطح سے نیچے دیکھ کر خود سے سوال کریں کہ ان محرکات کے پس پردہ کیا ہے۔ بعض اوقات اعلیٰ اخلاقی پیش منہ جھ پڑا اثر انداز ہو جاتا ہے اسی لیے ضروری ہے کہ ہم نفسیاتی سطح پر استفسار کریں، جس کی کوشش میں کمربا ہوں۔ آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر جو کچھ میں کہہ چکا ہوں وہ سچ سے تو دنی کو سبز توں سے لبریز کرنے کے لیے ہمیں جس شے کی ضرورت ہے وہ علم، دانش ہے۔ اور یہ ایک قسم کا خوش آمد نتیجہ ہے کہ لیے سائنس و فہم وہ چیزیں ہیں جن کی معصوم نفسی طریقوں سے نشوونما کی جاسکتی ہے۔



ولیم فاک نر

امیٹراف کمال۔ اس کے ساتھ اور لٹکارا نہ غور پر نزلے اٹھانے کے لیے جو اس نے جدوجہد امریکی ماحول کے میدان میں کیے۔

ریاستہائے متحدہ امریکا نے جنوبی میدانوں کے سارے پس منظر بیکار اور سستے کام کرنے والے سیاہ فام غلاموں کی بہتات کا اچانک خاتمہ، خانہ جنگی میں شکست دہائی کے نتیجے میں اس علاقے کی معاشیاتی تہذیب کی تباہی، غلامی اور تکلیف دہیتوں، صنعتی انقلاب کے نتیجے میں پڑ جانے کی تجارت کی وجہ سے عوام کے معیشت و زندگی کی بہتری وغیرہ نے ان میدانوں کے دسیوں کی سوچ کو بدل دیا تھا۔ اس عرصے میں منظر میں شدید فام ویم فاک نر اور اس کے خاندان کو بہت سی کڑواہی گولیاں لگتی پڑیں اور بہت سی ماکاریوں سے سمجھا کر پڑا تھا۔ اس کشاکش کے نتیجے میں فاک نر نے جو ادب تخلیق کیا اس میں ایک عجیب تہذیب اور ایک گونہ مجبوری کے تحت حالات کو قبول کرنے کا کسب وکار قائم موجود ہے۔

اپنی تحریروں میں فاک نر سفلی سرنگی کی تھا و گہرائیوں، سان کے زخمی قربانی دینے کے عظیم جذبہ، طاقت کے حصول کا ہوس، لالچ، روہنی فقر، محک نظر کی، مضحکہ خیز مرث و ہزل، کرب، شوق اور غمگینانہ چہرے محراب کے دہانوں میں غوطہ زنی کرتا نظر آتا ہے۔ ایک کھوئی، ہر نفسیت ہونے کے کھاتے وہ تو امریکا اور امریکی ماحول کا ریں میں اپنا مانی نہیں رکھتا۔ نہ اس کے ہر عصر سمجھنے والوں میں کوئی اس کی

نوکھی پڑتھیں چہنٹ اور مرد رنگاری کی قدرت رکھتا تھا۔ اس کے شکستے ہوئے کتیرے، فوقی، خطرے
انسانی گردن درد، گھیز، ہسیا، تک، حد تک مستحکم خیر، اس کے دماغ کی تموں سے اس طرف جھرتے ہیں کہ
تھاری اس معاشقہ، محل میں موجود پندس اور پھولوں، ان میں موجود خواتین کی خوشبو، سیاہ فام
نظاموں کے پیسے کی بے، چھڑوں، رگھوڑوں کے شراب و حسوں سے ٹھنڈی بھاپ کو اس طرف ٹھس کرتا ہے
گویا وہ خود اس منظر کا ایک حصہ ہو۔ ایک منظر نگار کی کرنے والے مصو کی طرف فاک نے اپنے منظر نگار
کاہوں میں تجربہ کار شکاری دکھائی دیتا ہے اور اس کی زمینی بندھوں اور رہتیوں کہ ایک جہد کی مہارت سے
ہاتھ بھر رہا ہے۔

فاک مرکا انداز تحریر آسان نہیں تھا اس لیے کہ اس میں اس نے یورپ کی اپنی جدیدیت کی میرٹھی
کی تھی۔ اپنی تمام شبیوں کے باوجود اس کے ماقدمین کہتے تھے کہ فاک نہ بہت طویل جملے لکھنے کا عادی ہے
اور اس کی تحریریں قاری کو پٹا ماز کر دیتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ متن کو سمجھنے کے لیے جہاں غور کی ہو متعلقہ
معلومات فراہم نہیں کرتا بلکہ قاری کو ان واقعات اور تفصیلات کی طرف متوجہ کرتا ہے جو متن میں بہت آگے
جا کر ملتے ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے قات قاری اس کی پوری طرح سمجھنے میں دقت محسوس کرتا ہے۔

ولیم فاکس امریکن ریاست میں پٹی کے شہر نیو یارک میں 1897 میں پیدا ہوا۔ وہ چار بھائیوں میں
سب سے بڑا تھا۔ ابھی وہ بہت چھوٹا تھا کہ اس کے والدین میں بیٹی کے شہر آکسبرگ منتقل ہو گئے جہاں
فاک نے اپنی زندگی کے بیش تر ایام گزارے۔ اس نے تیرہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔
سکول میں اس کا فٹ بال، تھیے کا شوق تھا۔ وہ اپنے اسکول کی ٹیم میں دفاعی پوزیشن میں کھیلتا تھا جس میں
اس کی ٹیم کی بڑی ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے اپنی تعلیم مکمل ہونے سے پہلے ہی اسکول کو ٹیچر اور
بچے کا فاک کے چنگ میں ملازمستان تیار کر رکھی تھی۔

فاک نے امریکا کی بڑی فوج میں بحری ہونے کی کوشش کی مگر کتاہ تھ ہونے کی وجہ سے ناکام
رہا۔ ناکامی کے بعد وہ کینیڈا کی ہوائی فوج میں بحری ہونے میں کامیاب ہو گیا اور اس کی اعتدالی تربیت
ٹورنٹو میں ہوئی۔ اس نے پہلی جنگ عظیم میں ہوائی فوج میں کام کیا تھا مگر کبھی کسی محاذ پر لڑائی میں حصہ نہیں
لے سکا۔ اس کے باوجود وہ اپنے دوستوں اور مہنے والوں کے دھیون۔ ٹیٹس، مانتا تھا کہ جنگ کے دوران
اس کا طریقہ فرائض میں مارا گیا گیا تھا۔

ہوائی فوج کی مدد سے فاک نے شاعری کی اور ایک طراحہ رسالے میں کارٹون بنانے
لگا تھا۔ اس نے کلوں کی ایک دکان میں نوکری کی، ایک خانے میں ملازمت کی مگر وہاں سے اوقات کار
میں کتابیں پڑھنے کی پاداش میں ہر طرف گردیا گیا۔ پھر وہ آکسبرگ سے نیو آریئرز چلا گیا جہاں اس نے
شاعری کے بجائے، لہجے نثریٹ کیے۔ اس کی تفصیلات کا پہلا مجموعہ 1924 The Marble Faun میں
شائع ہو کر مقبول نہ ہو سکا۔ 1926 میں اس نے Soldier's Pay کا ناول لکھا جو ایک سوانی کی کہانی پر

مشتعل تھا جو بیک جنگ عظیم میں لڑائی اور جسمانی طور پر معذور ہو جانا ہے۔ اس کے بعد اس نے ایک طنزیہ ماہر Mosquitoes لکھا جو دہائیوں کے معبودوں اور دانش وران کی کاٹل اور بے مقصد زندگی کے بارے میں تھا۔ فاکنر کی نو بدلتی تحریریں گوچر گھر ادا رہ جاتا ہے کہ اس نے کھس، جون ہرن، نیکی من وغیرہ کا بہ خاطر مطالعہ کیا تھا اور ان سے متاثر ہوا۔

فاکنر کا 1929 میں تحریر کردہ ماہر Sables ن پندرہ ماہوں کے مسمیہ کی پہلی نثری تھا جس میں اس نے دوست دئے متحدہ امریکا کے جنوب میں ایک خلیج کیودی Yoknapawpha County تخلیق کی، ایک افسانوی کیودی جو پہلی سے لے کر واقعہ کی گھائی گئی ہے، ریڈ ایڈین زبان میں جس کا مطلب تھا صبح زمیں پر پئی آہستہ بہتا ہے۔ یہ ماہر دوبارہ Flagg کے نام سے 1973 میں شائع ہوا۔ Yoknapawpha مسمیہ کے ماہر امریکی خانہ جنگی کے ان ٹھروں پر محیط تھے جن میں متاثرہ علاقے نخطہ پچ پر تھے۔ اس میں بارہا نسلی منافرت، طبقاتی وجہ بندی اور شادمانوں کو کبھی زندگی کی علامت اور کبھی عذاب کی صورت میں برتا گیا ہے۔ فاکنر نے بیانہ، ادا، تحریر سے علامتی، ادا، تک پر صرح کے تجربے کیے۔ اس مسمیہ میں جس ماہر کے نام لیے جاسکتے ہیں ان میں

Light in August - As I Lay Dying - The Sound and The Fury - Absalom,

Absalom شامل ہیں۔

فاکنر نے دولت کمانے کے لیے میں میں تک ہالی ووڈ کی فلموں کے لیے بہت سارے فلمی متحر نامے لکھے جن میں سے بہت سے فلم کی صورت میں متحر عام پر آئے۔ فلمی دنیا میں داخل ہونے کی وجہ سے ادیب کی حیثیت سے فاکنر کو نقصان ہو گیا اس نے 1946 میں The Portable Faulkner لکھ کر ادب کی دنیا میں اپنی موجودگی کا احسان دلایا اس لیے کہ ایک بار اس نے خود کہا تھا، ایسا لگتا ہے کہ میں اسی طرح کچھ ورن متحر نامے وغیرہ لکھتا رہا تو میں ادب تخلیق کرنے کی جو کچھ صلاحیت رکھتا ہوں اس سے محروم ہو چکا ہوں گا۔

فاکنر نے گھر ساری کے دوران گرنے کے چند ہفتوں بعد جون 1962 میں رحلت کی۔ اس کے انتقال کے چند ہفتوں بعد مشہور امریکی اخبار نیو یارک ٹائمز نے لکھا مسمیہ فاکنر کی تحریریں میں قلم، نیا بلچر، زمانے محرم خود کوئی، لائیو لارڈ پچنی وغیرہ کا تذکرہ کیا خط کی مانند ہے جو حقیقت سے دور اور اس کے دماغ کی پیراوار کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

ضیافت سے خطاب

مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کہ یہ اقوام مجھ انسان کو نہیں بلکہ میرے کام کو دیا جا رہا ہے۔ نقد کی بھر
کی محنت اور کرب سے بھرے انسانی جذبے کے کام کی صرف تقاضا یا کسی ڈانڈے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے
کہ انسانی جذبے سے وہ کچھ تخلیق یا اخذ کیا جاسکے جو پیسے سے موجود نہیں۔ گویا یہ انعام میرے پاس ایک
امانت کے مانند ہے۔ جہاں تک انعام کے مان پھو کا معاملہ ہے تو اس کا لیا جا کر کچھ مشکل نہیں کہ اس کے
لیے کسی ایسے حل وار کو تلاش کیا جاسکتا ہے جو اس کی بیرونی حالت اور اہمیت کے نقطہ نگاہ سے موزوں ہو۔ مگر
میں اس موقعے اور اس رفعت کی مناسبت سے، جہاں سے یہ ہو وہ لوگ بخیر و خوش گئے جو اس قسم کے کتب
اور مشقت کے ذریعے ہی مذہم کا عمل مع چاہتے ہیں جہاں اس وقت میں گھر ہوا ہوں، اس بات پر زور
دینا چاہوں گا جو میں مطلوب ہونا چاہتا ہوں۔

ہاں آج کا امید یہ ہے کہ ایک عمر سے عام طور پر ہم ایک ایسے عادی خوف کے زیر اثر رہیں جو ہمارے
سب سے بڑا قابل برداشت حد تک تکلیف دہ ہے۔ یہاں لگتا ہے کہ سب روحانیت کے مسائل تو گویا باقی ہی
نہیں رہے ہیں ایک ہی سوال سے کہ میں (نشان) کب تو ہو جاؤں گا؟ ای امید سے آج کے لکھنے والے
نوجوان مرد ہوں یا عورتیں، سب کے سب جسم و جاں کے ان تنازعات کو بھلا بیٹھے ہیں جو انہیں تخلیق کا باعث
ہوتے ہیں کیوں کہ صرف یہ کتب اور مشقت انہیں تازہ رکھتی ہیں ادیب کو اچھا لکھنے کا جواز مہیا کرتے ہیں۔

ادیب کو ان سب کو دبا دھکیلتا ہوگا۔ اسے اپنے آپ کو سمجھانا ہوگا کہ خوف کھانا سب سے بڑا
بیرونی ہوتی ہے، یہ بھی کہ اس (خوف کھانے کی عادت) کو ہمیشہ کے لیے بھلا دینا چاہیے اور اپنی کارنگاہی عمل
میں، سوائے قلبی سچائیوں اور حقیقت کی قدیم صفت کے، اپنے دلوں میں کسی اور جذبے کے لیے جگہ نہیں رکھیں
چاہیے، وہ عادی سچائیاں — محبت، عزت، وقار، مدد دہی، فخر، قربانی — جن کی کمی سے کہانی بے ثبات اور
مائل پہنچا ہو جاتی ہے۔ جب تک لکھنے والا وہی کچھ کتا رہے جس سے پوچھنا پڑے، وہ باعین اور
بھونکا رہے گئے تھے مہر و ف کا رہتا ہے۔ اسی طرح وہ محبت نہیں، انسانی ہمتی پر، مکی شکست پر لکھتا ہے
جس میں کسی کا کچھ بھی ضائع نہیں ہوتا، ان فوجات پر لکھتا ہے جو امید سے ادیب سب سے بڑی بات یہ ہے
کہ، ہمدردی کے جذبات سے عادی ہوتی ہیں۔ گویا اس کی بخیر و نیت قفاقی مشکلات پر مدد تو کرتی ہے مگر کسی
ظاہرہ اثر کے بغیر۔ گویا وہ دلی سے تو صرف نظر کرتا ہے مگر اپنا سہارہ خود دہ پر لکھنے میں صرف کرتا ہے۔

لکھنے وار جب تک ان سب چیزوں کو دبا دھکیلتا نہیں لیتا وہ وہ جسے گامیہ کہہ دے انسانوں کے بھو

کے درمیان کھڑا آؤنی کی تھا کا نظارہ رہا ہو۔ مگر تو آؤنی کی تھا کے خیال ہی کو روکتا ہوں۔ مصروف یہ کہہ دینا تو بہت آسان ہے کہ انسان رفاقی ہے اس لیے کہ وہ سب کچھ ہلے گا لیکن جب قیامت کے دن کی نفسا نفسی اور ہر ذلّت کی آغوشی آواز بھی اس کی خون آلود شام کے سرخیوں میں غرق ہو رہی ہوگی، اس وقت بھی کہیں سے ایک آواز کوئی نہجھکے گا، نہ جھکے گا اس آواز کسی سے باتیں کرتی شافی دے گی۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ مجھے پورے یقین ہے کہ یہ مصروف انسان سب کچھ ہلے گا بلکہ وہ غائب بھی رہے گا۔ انسان رفاقی ہے، مصروف اس وجہ سے نہیں کہ مخلوق میں وہی سے جس کی آواز کہیں نہ جھکے گا اس لیے کہ اس میں ایک روح ہے وہ ہم کو سمجھنے، قربانی دینے اور ہر دشت کرینے کا جذبہ ہے۔ شاعر اور نگار کے لیے کا غرض ہے کہ وہ ان سب کے بارے میں سمجھے۔ نگار والوں کو اس بات کی رعایت ہے کہ وہ انسان کو اس کے انسانی قابلِ فخر خصوصیات، ہمت، عزت، امید، انکار و رحم، قربانی وغیرہ کی زندگی کے اس کا یہ بڑھائیں۔ شاعر کا فرض مصروف میں نہیں کہ وہ انسان کی تاریخی مرتبہ کرے۔ اس کو سب مانیں، ایسے محکمہ و درجہ امتوں میں کرنے چاہئیں جن کی مدد سے وہ قائم رہے اور کامیاب ہو۔



نامس اسٹیرنس لیلیٹ*

اعترافِ کمال۔ موجودہ دور کی شاعری میں اس کے نمایاں ورثے قدم خاقان کے اعتراف کے لیے۔

فی امر ایٹ ان معنوں میں ایک غیر معمولی ادب نظر آتا ہے کہ اس نے بتدریج ایک لہجہ استثنائی اور شعوری طور پر اختیار کر لیا تھا۔ اسے نکل کر گھر پر کی ادب پر دور میں اثرات مرتب کیے ہیں۔ اول اس خود کشانی میں محسوس ایٹ ایک مختصر جلتے سے مخاطب ہوتا ہے مگر کسی شعوری کوشش کے بغیر ۲ ہستہ ۲ ہستہ اس کا حلقہ اثر بڑھتا جاتا ہے۔ درد و غم اور غم و غمیں صنفِ ادب میں میرے جیسی کات رکھے والے اپنے مخصوص لہجے کی مدد سے اپنی نفسی و شغری قوتیں عیاں کر رہا ہے۔

اپنے ایک مضمون میں لیلیٹ نے فرمایا ہے: "ماکان اور عمرے الفی علی۔ گیتوں ہمت و ہے کہ موجودہ تہذیب میں شاعر کا تجربہ مشکل ہونا چاہیے۔ وہ کہتا ہے کہ ہماری تہذیب اور ثقافت نہایت رنگا رنگ و پرتعلیق ہے اور شائستہ حریت کے استعمان سے اس کی رنگا رنگی اور پرتعلیق نہایت پیچیدہ نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ شاعر کو زیادہ وسیع، زیادہ گہرا، آمیز اور زیادہ ناراض ہونا چاہیے تا کہ ضرورت ہو تو وہ زبان میں غماز لیا کر بھی اپنے معانی کی مرئیت کے لیے زبان کو مجبور کر سکے۔

اپنے غماز کے پس منظر میں جب ہم اس کی کوششیں اور ان کے نتائج کا تجزیہ کرتے ہیں تو

میں صاف نظر آتا ہے کہ اس کی پوشش کافی حد تک درجہ اولیٰ ہے۔ ایلین نے شاعری میں اپنے علمی تجربات کی بنیاد پر بڑی شہرت حاصل کی جس کی پہلی مثال 1922 میں نکلی جانے والی اس کی شہرہ آفاق نظم "دی ویسٹ اینڈ" تھی جو اپنی پیچیدہ مذمتی زبان، اپنی کاری کی محکم اور بہت عام نہ نالیاتی تنظیم کی بنا پر قاری کو بکا بکا کر دیتے والی تخلیق تھی۔ بلاشبہ کہ ایلین کی یہ تخلیق اس نسل میں سامنے آئی تھی جب ایک اور چٹکا دیتے والی نسل قد تخلیق جیسے جوئس کی پلسس Ulysses شائع ہوئی جس نے ہم عصر ادب پر گہرے نقوش مرتب کیے۔ ان کا ادب پڑوس کی تخلیق کوئی اتفاق حادثہ نہیں تھی اس لیے کہ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کی یہ دونوں تخلیقات اپنی سرشت، ترکیب اور جذبہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت قریب نظر آتی ہیں۔

"دی ویسٹ اینڈ" اپنے انشائیاتی فن کا نامزد فاعل اور اس میں پیشہ ور زوں کے فٹ ہونے سے قبل کی اپنے خوف ناک عنوان سے قاری کے دل کو ہلا دیتی ہے۔ اس کی غم مائی اور تعمیر و تلافی، تھی برادری، مسرت اور کجی اسطوری وارفاق کے وسیع، ناقابل بیان اثر انگیزی سے شاعیت کی بے ثمری اور نا طاقی کا اظہار کرتی ہے۔ یہ نظم "گرچہ صرف 436 مصرعوں پر مشتمل ہے مگر درحقیقت یہ سنے ہی صفحات کے ادب کے نہایت موثر اور ہم کرتی ہے۔ "دی ویسٹ اینڈ" کو لکھے ہوئے ایک نامزد اثر تھا ہے مگر یہ قسمتی سے جوہری دور اور اس کے ہدایت گیری کے مہیب رائے اس کے ہمیا تک مناظر کو جند لائیں ہونے دیتے۔ "دی ویسٹ اینڈ" کی تخلیق کے بعد بھی ایلین نے سرائے ہوئے دور با نیافت کے محاباں انسانوں کے موضوع پر ہی آب و تاب اور دلکا زکی کئی تعمیر لکھیں جن میں لاندہرب دنیا کے جدید انسان کا فانی پن، اس کی بے ترقی، لاجعیت و حسن جیسے ہمہ گیر موضوعات بہت چھلے اور پُر خلوص انداز میں انجرتے ہیں۔ (1943) Four Quares میں شائع ہونے والی ایلین کی تخلیقات اپنی مادر فکر انگیزی، تعلیمی اظہار اور دوسرے نگار کے روحانی تجربات کی کٹا پانڈائی ایک باکس موتی کی کے مترادف محسوس ہوتی ہیں۔ ایلین کی لحاظ سے بنائی ہوئی دنیا کی تصویر ایک ارتقائی و ارتقائی کے طریقے کی طرح بند ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

صرف پہلے نظر اشارہ، مقرر اور دلکا زکا ایلین کی شاعری اگرچہ عظیم نہیں مگر ایک مدنی فن کے پس منظر میں سطح سمندر سے کسی مانتہ پھار کی چھری چھائی کی مانند بلند ہوتی ہے جو چشم تصور میں کبھی کسی کیس کے مخروطی کنار کا روپ دھارتی ہے۔ ایلین کی شاعری سخت ذمے داری اور غیر معمولی نظم و ضبط، تمام جذباتی فرسودگی سے مبرا، ضرورت پر مرکب، رنگ خمائی، بے حد سادہ اور غیر ضروری "راشیں سے پاک" سرورق فوقانزول اور جھڑات کے خلا سے نھرتی ہوئی کسی گرن سے جھمکائی تھکتی ہے۔

ایلین کے فن کے اندرون کا مناجاد مشکلات اور رکاوٹوں سے عبارت ہونے کے باوجود بیگانہ انگیز ہوتا ہے۔ یہ ظاہر تھا دیکھی ہوئی گریہ کجا جائے کہ بعد شاعر کی دنیا کا سب، فی جہات اور نازہ کار ہجہ عطا کرنے والا شاعر اپنی پورے قوت سے، سادگی، جود کے پختہ صیولوں کی تاریخی ضرورت کا، ایک سرد مہر مگر

سبک منطقی نگاہ کی طرح سے دلائل کثرت سے ہے۔

ایلیٹ سر کی بدست مسودوں کے شہر بیٹنٹ لوف میں نرو انگلینڈ سے تعلق رکھنے والے ایک معتبر خاندان میں 1988 میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے ماسٹریجائی سنوں میں مسیب سے چھوٹا تھا۔ ایلیٹ کا باپ ایک کامیاب صنعت کار تھا اور اس کی ماں ایک صاحب کتاب دوستہ تھی۔ ایلیٹ کی ابتدائی تعلیم میڈیچر سائنس کی ملٹن انگریجی میں ہوئی اور اس نے گریجویٹیشن مشہور زمانہ ہارورڈ یونیورسٹی سے کیا۔ ایک سال فرانسیس کے قیام کے دوران اس نے ایک سال سوڈن میں تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے ہارورڈ واپس پر ایلیٹ نے مشہور انگریز فلسفی بریڈلے پر کام کیا اور ایک مبسوط مقالہ تحریر کیا۔ اسی دوران اس نے شکریت نوبل بھی اور بدھ مت کا مطالعہ بھی کیا۔

1914 میں ایلیٹ انگلستان منتقل ہو گیا جہاں اس نے ایڈن پاؤڈل کے ساتھ جس نے ایلیٹ کی ابتدائی شاعری کی شاعت میں معاونت کی تھی، شاعر نے طرزِ نگارم کی ترقی پر نوپ کام کیا۔ پاؤڈل نے 1917 میں ایلیٹ کے پہلے مجموعے *Prufrock and Other Observations* کی اشاعت میں بھی اس کی مدد کی۔ ایلیٹ نے ایک سال لندن کے ایک اسکول میں پڑھایا اور اس کے بعد کلرک کی حیثیت سے ایڈنڈر بیکنگ میں خدمت بھی کی۔ اس نے امریکی فوج میں تعیناتی ہونے کی کوشش کی تھی مگر کسی جسمانی کمزوری کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔

ایلیٹ نے 1919 میں اپنے ایک مضمون میں ایک نظریہ پیش کیا جس کے مطابق شاعری ہمیشہ غیر شخصی اور دمانیت سے محروم ہوتی چاہیے۔ اس کے خیال میں فن کار کی ذاتی مسائل، مٹاؤات اور شخصیت کی نامزدگی سے ممکن ہوتی ہے۔ اس کی نظر میں ادب کی خود اپنی شخصیت تھی (depersonalization) سے فنِ مرآتیں کی حدود کو چھوئے لگتا ہے۔

اپنے مضامین کے مجموعے *The Sacred Wood* (1920), *Poetry and The Use of Criticism* (1933) اور *The Classics and The Man of Letters* (1942) کی اشاعت کے ساتھ ایلیٹ ایک پسے قدآور رائے کے درجے پر فائز ہوا جو اپنی تنقید سے ہم عصر ادبی مذاق پر غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوا۔ 1922 میں ایلیٹ نے ایک سرکاری تنقید کی جریڈ *Criterion* چابی کیا جس کا وہ خود مدیر تھا۔ یہ جریڈ جنگِ عظیم دوم کے شرٹ ہونے کے ساتھ ہی بند ہو گیا۔ 1925 میں ایلیٹ نے نشریہ اشاعت کے مشہور ادارہ *Faber and Gwyer* میں شمولیت اختیار کر لی اور اس میں ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچ گیا۔ اس ادارے نے بعد میں *Faber and Faber* کا نام اختیار کر لیا۔ 1917 اور 1919 کے دوران ایلیٹ *Egoist* نامی رسالے کا نائب مدیر بھی رہا۔ اس کے بعد سے اس نے مشہور برطانوی اخبارات *The Times* کے ادبی صفحات میں پابندی سے کھانا شروع کیا۔

1927 میں ایلیٹ نے برطانوی شہریت اختیار کر لی اور چرچ آف انگلینڈ *Church of England*

کا رکن بن گیا۔ 1905 سے مرٹھ میں کے عرصے میں جب ایلینڈ کا انتقال ہوا، اس نے چھ سو کے قریب مضامین اور تبصرے کیے تھے۔ اس کے اپنی عقیدتی مضامین کے جنوری میں مارلین پائرس کی تکنیکی تشریح اور مرق کی تصحیح ہے۔

ایلینڈ نے بھی شادی Vivienne Hagh Wood نام کی ایک عیسائی ڈانسر سے کی مگر وہ اس ازدواج سے کبھی خوش نہیں رہا اس لیے کہ وہ عورت بڑی جذباتی تھی اور ان کے آن میں بہتے والے مزاج رکھتی تھی۔ بعد میں اس کو ذہنی مریش قرار دے کر اس کی موت تک کال ہسپتال میں رکھا گیا تھا۔ کئی بیوی کے انتقال کے بعد ایلینڈ نے اپنی سیکرٹری سے شادی کر لی۔ کیرس سمور جونز نے ایلینڈ کی کتاب بیوی کے بارے میں اپنی کتاب (2001) Painted Shadow: A Life of Vivienne Eliot میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایلینڈ کا ہم جنسیت کی طرف بہت واضح رجحان تھا اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ شب خوابی سے پرہیز کرتا تھا کی وجہ سے اس کی بیوی نے لارڈ لینڈ ٹریڈرٹل سے جنسی تعلقات قائم کر لیے تھے۔

ایلینڈ کے خلاف نسلی پرستی، (شادی شدہ ہونے کے باوجود) عورت سے نفرت (misogynism) آمریت، جذباتی سرد مہوری، ریسٹریکٹ کی مخالفت کی وجہ سے اس کے بہت سے قارئین نے اس کے مخالف ہو گئے تھے مگر اس پر اشتراک ہونے کا اثر نہیں لگایا گیا۔

ایلینڈ کی مرٹھ سے نیاہ کتابیں اور مضامین کے مجموعے شائع ہوئے اور اس نے جنوری 1965 میں انتقال کیا۔

شیافت سے خطاب

جب میں نے یہ سوچا، ٹروٹ کیا کہ آج کی شام میں کیا کہوں تو میرے ذہن میں بھی خیال آیا کہ مجھے صرف سونیڈش اکائی کی قدر رفاہی کی تحسین کرنی چاہیے کہ اس نے مجھے اس اعزاز کے قابل سمجھا۔ مگر مناسب طریقے سے صرف اتنا کرنا بھی میرے لیے کچھ دشوار نہیں تھا۔ اگرچہ لکھنا پڑھنا میرا کاروبار ہے مگر اس موقع پر الفاظ میری گرفت سے باہر معلوم ہو رہے تھے۔ گر میں صرف اتنا کہنے پر استیصال کیا چاہوں کہ یہ ہیں لفظی اعزاز صرف ان لوگوں کو عطا کیا جاتا ہے جو سماج پر علم ہوتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی اس لیے کہ یہ تو سب جانتے ہی ہیں۔ اگر انکسار کے جذبے کے تحت میں یہ کہوں میں خود کہ اس اعزاز کے قابل نہیں پاتا تو کیا میں ان کی نصیحت پر شبہ کے سائے ڈال رہا ہوں اور اگر میں ان کی

کے اس فیصلے کی تحریف کروں تو ایک ادبی مہم کی حیثیت سے میں اپنی شاعری کی اس قدر تناسلی پر صدمہ
 کروں گا۔ لہذا اس موقع پر میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ میں بھی کم و بیش ان کی کیفیت سے دوچار ہوا
 ہوں جو جتنے بڑے، عزاز کی سرپرستی سے پیدا ہونے والی مہم کو مقبول نہیں خود لائق، سرور مہم بالحد آمیز کی اور
 چاک ایک مشہور شخصیت بن جانے کے بعد ان کی صورت میں کسی طرح کی ہو جاتی ہیں۔ اگر نوٹیل انعام کسی
 عام انعام یا اس سے کچھ بلند درجے کا بھی ہوتا تو بھی میرے لیے قلم کے تقاضا کوئی مسئلہ
 ہو جاتے۔ مگر چونکہ اس انعام کا حصہ انہیں نیا وہ بلند ہے اس لیے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے وہ کچھ
 درکار ہو گا جو ذوق بھی زبان فراہم نہیں کر سکتے گی۔

لہذا میں آپ کے سامنے اپنی سمجھ کے مطابق، نوٹیل ادبی انعام کی تاویل وراثیت، باعاطفہ انداز
 میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ گریہاں معدودہ صرف اہمیت کی قدر تھی، یہ کسی منصب کی شہرت کا
 یا اس کے اپنے ملک کی زبان کا سرحد سے باہر پھیلنے کا سہا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ ہم میں سے شاید کسی
 کوئی، کبھی بھی یہ اعتبار کا حامل ہو۔ مگر میں نوٹیل انعام کو جسے تمام اعتبارات سے کتنے مختلف پایا
 ہوں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک طریق کا عمل ہے جس کے ذریعے کسی قوم کا ملک سے کسی شخص کا ایک
 مخصوص علامت کے طور پر، ایک مخصوص کردار کے لیے، نہایت عجیب انداز میں منتخب کیا جاتا ہے۔ ایک
 تقریب منعقد کی جاتی ہے جس کے ذریعے ایک شخص کو اچانک ایک ایسے منصب سے محروم کر دیا جاتا ہے
 جس کا اس کو کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ آیا وہ شخص اس کام کو کرتے کے لائق تھا بھی کہ
 نہیں۔ ایسا منصب جو اس شخص پر ایک جتنے کی نامزدگی کا ہو جیسا کہ دیکھا ہے، اور یہ جہ بھی ایسا جو اس کی
 تحریروں کی قدر و قیمت اور اہمیت سے نہیں نیا ہو۔

شاعری وعام طور پر سب سے آسان فی سمجھا جاتا ہے۔ مصوری، مجسمہ سازی، قیصر، موسیقی وغیرہ کو
 دیکھ کر یا سن کر عجب اٹھایا جاسکتا ہے۔ مگر نہایت، بالخصوص شاعری کی زبان کا معاملہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔
 یہ ظاہر ایسا لگتا ہے کہ شاعری لوگوں کو متحد کرنے کے بجائے ملک ایک کر دیتی ہے۔

شعراں کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ زبان ایک حد فاصل بنی جاتی ہے
 شاعری میں اس حد فاصل کو عبور کرنے کا جواز فراہم کرتی ہے۔ کسی اور جتنے کی زبان کی شاعری سے لطف
 لینے کے لیے قاری کو ان لوگوں کو سمجھنا پڑتا ہے جن کی زبان میں شاعری کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کے جو کسی اور
 طرح کا حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس مرحلے پر ہمیں یورپ کی شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالنی ہوگی اور ان گہرے
 اثرات پر بھی جو ایک زبان نے دوسرے زبان پر ڈالے ہیں۔ ہمیں دوسری زبانوں کے ہر شاعر کے ان
 بے پناہ احسانات کو بھی یاد رکھنا ہو گا جو انہوں نے اپنی زبان سے نیا وہ دوسری زبان پر کیے ہیں۔ ہمیں اس
 جتنے پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر غیر ملکی زبانوں کی شاعری کا وہ خدا فرام نہ کرے تو ہر ملک اور ہر زبان کی
 شاعری کا یہ تذاتی اور نیست و نابود ہو جائے۔ جب کسی زبان کا شاعر اپنے دلوں سے ہم کلام ہوتا ہے تو

ان تمام ناولوں کی جواز میں بھی اس کے ساتھ ہوتی ہیں جنہوں نے اس کی شاعری پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں اس کے ساتھ مرتبہ وہ خود بھی دوسری ناولوں کے بھرتے ہوئے شاعروں سے ہم کاہم ہوتا ہے اور یہ لوگ زندگی کے بارے میں اس کے تصورات اور اس کے دعوے کے مساوات کو اپنی زبان کے قارئین تک پہنچاتے ہیں۔ کسی بھی صورت کا شاعر، دوسرے شاعروں کو متاثر کرنے کے ذریعے، اس شاعری کے تراجم کے ذریعے جو دوسرے شعرا کو مزید تخلیق پر کہلاتے ہیں، اور اپنی زبان کے ان قارئین کے ذریعے جو خود شاعر نہیں ہوتے، مختلف طبقے کے لوگوں کے درمیان انبیاء و تنبیہ میں مددگار ہوسکتا ہے۔

۲۔ شاعری تحقیقات کا بیشتر حصہ انہیں لوگوں کو بتاتا ہے جو اس کے علاقے کے نہیں ہوں، یا شاعری زبان بولتے ہوں اس کے وجود "پوش کی شاعری" پر صرف "شاعری" جیسے حصوں سے بھی متحد مراد ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مختلف ناولوں اور مختلف زبانوں کی شاعری سے، وہ ہر کسی ایک ملک کی چھوٹی سی کیفیت کی کیونکہ ایک دوسرے کے بارے میں، کم کی، مگر سچ اور ایک ضرور حاصل کرتی ہے جو بہت ضروری ہوتا ہے۔ دراصل ادب کا یہ فوئیل انہوں نے سچ سے قبول کر رہا ہوں، کہ جب یہ کسی شاعر کو دنیا جاتا ہے تو بنیادی طور پر اس کی شاعری کی قدر و قیمت کو کوئی سمجھتا ہے، وہ ہاتھ دھو جاتا ہے۔ اور اس بات کی تصدیق کے لیے، وقتاً فوقتاً کسی ایک شاعر کو ماز کیا جاتا ہے۔ یہ حضرات! میں آپ سب کے سامنے ایسا وہ ہوں، اپنی اہمیت کی بنا پر نہیں، بلکہ ایک خدمت کے طور پر، تنویر کی حق کے سے سکی، اور دراصل شاعری کے افکار کے لیے۔



آندرے ژید

اعترافِ کمال کسی کی سیر فہم اور بیوقوفی کا پتہ دینے والے ہیں جن میں انسانوں کے حالات اور مسائل کا بے خوف لگاؤ، سچی اور انصافی مذاکی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

آندرے ژید ادبی زندگی کی زندگی سے اپنی روحانی ترقی کی جست کی بنا پر صرف ان کے خیالوں میں شمار ہونے لگا تھا۔ یورپ کی روحانیت کی تاریخ کا ایک اہم دور خاکے کی صورت میں ژید کی تحریروں میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس کی پتی خامی طویل زندگی میں بھی ایک طرح کا لازمی عنصر بنتا ہے۔ ژید کا شمار اسی درجے کے نگینوں میں ہوتا ہے جن کی تحریروں کی قدر پچھلے کے لیے ایک طویل تاریخ اور مختلف سطحوں پر مشتمل مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں ژید، خاصے نمایاں طور پر، کسی سدا بہار پودے کی طرح بدست ہوئے رنگوں جیسی بولچھوں اور سہنی شخصیت کا، ایک ہے جو ہمہ وقت بڑھتا رہتا ہے اور شراکت جہات میں سرگرم عمل رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تخلیقات تذبذب، زندگی سے محبت کے مقابلے میں دوہرائی، اور انسانی کے مقابلے میں انیم و صہط پر ایک مسلسل مطالعے کی کیفیت پیش کرتی ہیں۔ ژید کی اہم ظاہر زندگی خود برقی ہوتی اور ہے پناہ متحرک رہی ہے۔ اس کا 1927 میں کانگو کا سفر اور 1935 میں روس کی سیاحت اس بات کے ثبوت تھے کہ وہ پناہ متحرک نہ تھے بلکہ ایک جگہ بیٹھ کر کام کرنے والے ادیبوں میں نہیں چاہتا تھا۔

ٹید عیسائیت کے پرنسٹن فراتے سے تعلق رکھتا تھا جس کو بنا پروروں کے مقابلے میں وہ کسی روک ٹوک کے بغیر اپنے مشفق کو چارکی رکھنے اور اپنی شخصیت کو ابھارنے میں ایک طرف سے آزاد تھا۔ مگر مذہبی تعلیم کے سخت مخالف ہونے کے باوجود اپنی تمام عمر وہ عیسائیت کی بنیادی اخلاقیات اور اس سے متنبہ سرکے پر کام کرتا رہا اور اپنے ایک مکتبہ ناموں [Strait Is the Gate] (1909) La Porte étroite میں اس نے عیسائیت کے نہایت پاکیزہ جذبات اور محبت کا تذکرہ کیا ہے۔

ماوس ہوس، منہائیں پر سفر نامے ہوس، حالات کا غور و فکر کے واقعات کے تجربے، بلان کے قیامت فر اور بدلتے ہوئے مناظر، ٹید کی نہایت نفیس اعلیٰ اور کم مکی حساسیتوں سے مکمل نوبت میں قاری اسی چمک دار ذہانت، اسی فکر راست ہارنسیات سے لطف اندوز ہوتا جو اس کی محرموں کا خاصہ ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ بے باک اور چستے ہوئے تجربے سے مجموعہ معروف ناموں [The Counterfeiters] (1926) Les Faux Monnayeurs کے ذریعے، جو چند ذہنی نو جوانوں کے ایک گروہ کے بارے میں ہے، ٹید کی تکنیک کی مدت سے اپنے عصر کے اندر و تجربہ و خیالات کو بالکل نئی باتوں اور چیزوں سے آشنا کیا ہے۔

ٹید ہر طرح کے قاری کے لیے دل چسپی کا حامل تھا۔ کسی کے لیے نفسیات کا روحانی ماول گان تو کسی کے سے قدرت کا حامل جدت پسند۔ وہ ایک اہم تنقید نگار ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی مجاہد اور ہم جنس پرستوں کا طرف دار بھی تھا۔ اس کی تخلیقات کے میں اسٹوریٹس وہ اپنے آپ کی تلاش کے مناظر میں بنیادی طور پر ایک مذہبی انسان دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے ادب پر وہ ایک مسلم خلق اور دانش ور کی حیثیت سے اثر انداز رہا۔

ٹید جوں میں 1869 میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ جیورس یونیورسٹی میں قانون کا پروفیسر تھا جو ایک تنہائی پسند انسان تھا اور دن کا نیا اور وقت اپنے گھر ایک غصے سے گھرے میں گزارتا تھا جہاں دو اور اس کی کتابوں کے علاوہ کوئی رہنمائی نہ تھا۔ اندر سے بوجھ میں اس وقت جاننے کی اجازت ہوتی جب اس کو طلب کیا جاتا۔ اندر سے ٹید کی پرورش میں قیورنوش، اس کی خال کلیر (Claire) ایک گھریلو کنواری، انا شاکلٹن (Anna Shackleton) اور اس کی ماں جو بیٹ (Juliette Rondeaux) شامل تھیں۔ ٹید کو بچپنے کی تعلیم گھر پر ہی دی گئی جس کی وجہ سے بچپن میں اکثر غلطیوں و غلوں کے لیے وہ تنہا ہی رہتا۔ تیرہ برس کی عمر میں وہ اپنی خالہ زومیلین Madeleine کے عشق میں گرفتار ہو کر غریبوں کی شادی پر مجبور ہو گیا۔ میڈلین سے ستائیس سالہ شادی مہنے کے باوجود ٹید نے اس سے کبھی ہم بستری نہیں کی۔ ٹید کی ایک ہی لڑکی تھی مگر وہ اس کی بیوی کے بطن سے نہیں بلکہ ایک اور عورت سے بطن سے نکلی۔ اپنے ستائیس سالہ کام از دنیاں کا ذکر ٹید نے اپنی کتاب ET NJNC MANET IN TE (1951) میں کیا ہے۔

ٹید نے کئی اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ École Alsacienne میں اس کو ادب سے دل چسپی

پیدا ہوئی۔ ڈیج کی کئی سچے لکھنے والوں سے دوستی ہوئی اور انہی نے جوزس ماریا ہیریڈیا اور اسٹیفانی ملر کے ادبی دیوان خانوں میں بھی وقت گزارا۔ 1891 میں ڈیج نے LES CAHIERS D'ANDRÉ نامی کتاب لکھ کر ایک ماہر نگار کی حیثیت سے اپنی تحقیقی زندگی کا آغاز کیا۔ اس نے کھارو ہنس کی عمر سے لکھنا شروع کیا تھا مگر اس کی پہلی کتاب ایک گم نامہ دھب کے نام سے شائع ہوئی جو ایک نوجوان کی محرومیوں کی داستان تھی جس نے اپنی خانہ زاد سے لوٹ کر پیرتیا تھا۔ ایک سال بعد اس کا پہلا شعری مجموعہ POESIES شائع ہوا تھا مگر بعد میں اس نے شاعری ترک کر دی۔

ڈیج نے 1893 اور 1894 میں افریقا کا سفر اختیار کیا جس کے دوران اس کو مختلف النوس، غرق اور جنسی تجربات ہوئے۔ ان تجربات نے ڈیج کو اس کے ماہی (1902) The Immoralist کے لیے، جو نظریہ لذت Hedonism کی بنیاد میں حالت ورنٹ سے جنسی تجربات کی ہوس کے بارے میں سچا تصویر بنایا، راہنمائی کی۔ ڈیج کا ایک اور ماہی (1909) Spirit is the Gate بھی انہی جذبات، تجربات اور احساسات کے بارے میں ہے جو Immoralist کی بنیاد میں اس قدر کہ ڈیج نے اس کو Immoralist کا نقشہ اپنی قرار دیا ہے۔ افریقا کے سفر نے ڈیج کو جنسی بے ماہر کی طرف مائل کیا۔ ڈیج کی اہلیہ انیسٹر وینڈر سے ملاقات ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کے قریبی دوست بن گئے۔ سندھم جنس باہم جنس پرور تھا۔

ڈیج کی لکھی ہوئی نظم ہو کہ نظر، زمین اور اس کی عجا کدو نعمتوں کے صحن کی حمد و مناجات کی صورت میں 1897 میں سامنے آئی۔ نیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آتے گتے ڈیج کی تحریر میں مقبول عام ہوئیں جنہوں نے نئے لکھنے والوں کی نمونوں کو متاثر کیا جس میں بعد میں تہ آور ہونے والی انیسٹر کامیو اور ڈال پال سارتر جیسے شخصیات شامل ہوئیں اور جنہوں نے وہ سب پتھر سے دیا جو معنوی اور روایتی تھا۔

ڈیج نے 1909 میں (The New French Review) Nouvelle Revu française جیسے، ارمیتھ کی جگہ سے کی بنیاد رکھی جس کے لیے اس نے کئی مصائب خرچ بھی کیے۔ اس نے فرانسیسی ادب میں فرانسیسی قومیت کی مدد کو مسٹر ڈیج کیا۔ اس کا تہا تھا کہ اصل پرے کے دماغ میں جسم کے اثرات سے خوف زدہ نہیں ہوتے بلکہ ان کی تلاش میں رہتے ہیں۔

1924 میں کراڈن میں ڈیج کی ہر جنس پرستی کے دفاع پر شدت سے غصے کیے گئے۔ 1930 میں اس نے شترایت کی بیعت کرنے کا اعلان کیا جس نے نہ صرف اس کے قارئین کے حقوق کو حیرت زدہ کر دیا بلکہ موت پوشش کے اس کے سفر نے اس کے سنے پڑھنے والوں کو بھی مایوس کیا۔ ڈیج نے اپنی کتاب (1936) RETOUR DE L'U.S.S میں سوویت یونین سے فیصلہ کن جدوجہد انیسٹر کامیو۔ ڈیج کے ادبی دوستوں سے اس کی خط کتابت کے مطالعے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس کو مشرق پر تھوکت میسجیت کرنے کی ماکام کوشش کی تھی۔ ڈیج کے انتخاب کے بعد 1952 میں بکتھوٹ کیس نے اس کی تحریروں کو اپنے کتب خانے کے اثاثہ سیر میں شامل کر لیا۔

1942 سے دوسری جنگ عظیم کے اختتام تک وہ شادی فریڈ میں مقیم رہا۔ 1940 سے شادی کو اعزازات ملنے شروع ہوئے جو آخر کار نوبل انعام میں پہنچ گئے۔
ڈیو کی ارنالڈس کے قریبہ شہنشاہت شائع ہوئی۔ اس نے 1951 میں انتقال کیا۔

ضیافت میں تقریر

(جناب آندریس ضیافت میں شریک نہیں ہو سکے اس لیے ان کی تقریر فرانس کے سفیر جناب Gabriel Puaux نے پڑھ کر سنائی)

میرے خیال میں اس بات پر وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں کہ میں اس قابل احترام موقع پر خود حاضر ہو کر اپنی زبان سے شکریہ ادا نہیں کر سکتا اس لیے کہ کچھ مجبوریوں کی بنا پر یہ سفر ممکن نہیں جو میرے لیے نہ صرف خوش گوار بلکہ کچھ سیکھنے کا باعث بھی ہوتا۔

آپ کو اس بات کا علم ہے کہ میں نے ہمیشہ اعزازات کو قبول کرنے سے پرہیز کیا ہے، کم از کم ان سے خیرہ رہا ایک فرانسیسی ہونے کے ماتے، جس کی فرانسیسی سے توقع کی جا سکتی تھی۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں اس عظیم اعزاز کی جس کی کوئی بھی نکلنے والا خواہش ہی کر سکتا ہوں ایک قسم کے عالم بے خودی میں قبول کر رہا ہوں۔ یہ سب میں بھی سمجھتا رہا ہوں کہ میں کسی دیرانے میں صدمہ لگا رہا ہوں، پھر یہ بھی کہ شاید میں صرف ایک نہایت قلیل عرصے سے مجبور ہوں مگر آپ سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس قلیل عرصے میں عہد حیات میں میرا غنا و باکمال کچھ تھا اور اس پر بھی کہ ایک تباہ کن دن میں غائب آئے گی۔

حضرات محترم، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی مائے میرے کام کے حق میں نہیں بلکہ اس حریت پسند جذبے کے حق میں تھی جو میری تحریروں کی تحسین کرتا ہے، وہ جذبہ ہے کہ اسے دور میں، جس پر ہر سمت سے تسلط متوقع ہیں۔ میرے لپٹن رکھ آپ نے مجھ میں اس جذبے کی نشان دہی کر لی ہے اور یہ کہ آپ سب نے اس کی امداد کی ضرورت محسوس کی ہے، یہ میرے لیے ایک گونہ عقاد اور سکون کا باعث ہوا ہے۔ اس کے باوجود میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ اسی دور کے فرانس میں کی ایک اور شخصیت ایسی تھی جو مجھ سے کہیں نمایاں ہے وہ جذبہ سے سرشار تھی۔ میرا اشارہ نند اسل پور و پیری کی جانب ہے جس کے لیے میری تحسین نصف صدی کی دوستی کے دوران ہمہ وقت بدستور رہی ہے اور صرف اس کی وفات نے ہی اس اعزاز کے لیے، آپ حضرات کو اس کے بجائے میری طرف راغب کر دیا ہے۔ جذبہ دوستی سے قطع نظر،

میں نے اکثر کہا ہے کہ میں ہمیشہ بغیر اپنی کسی کم زوری کے، اس کے جوہر قائل کے سامنے اس خیال کے
چٹا نظر رکھوں رہا ہوں کہ وہ بھی ایک آدمی ہی تھا، صرف آدمی۔ کاش اس کی روحانیت اس شخص میں
شریک ہو، جو میری نظر میں تھی ہی نہ وہ جھمکنے لگتی ہے جیسے امد میرے گہرے ہوتے جاتے ہیں۔
آپ حضرات، سرحدوں اور روہوں سے ملتی، اختلاف کے باوجود اس عمارت کے شاہ سے چھوٹے کو،
خالقِ توقع، نیا وہاں نہ ہوئے کے موقع فراہم کرتے ہیں۔



ہرمن ہسے

امیڑائی کمال۔ اس کی انسانی تحریروں کے لیے جو بے باکی اور ہمسرت کی بلندی کے ساتھ
کلیسیائی انسان دوستی کے معیار اور اعلیٰ درجے کے اسلوب کی بہترین مثال پیش
کرتی ہے۔

اگرچہ ہرمن ہسے کی تحقیقات کی بہتر تفہیم کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کے ذاتی کوائف کے
بارے میں معلومات حاصل کی جائیں مگر خصوصاً ہرمن ہسے کی شخصیت کی حیرت انگیزی اور اس کے رنگ رنگ
پہلوؤں کو دیکھنے اور اس کی تحقیقات کی تحسین اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے سب سے پہلے اس کے
ذاتی پس منظر کا ایک مختصر جائزہ ضروری ہے۔

ہسے 1877 میں جرمنی کے شہر ورنبرگ (Wuerzburg) میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کلیسا کا
ایک مشہور تاریخ دان تھا اور اس کی ماں فرانسیسی نسل کے ایک کلیسائی مبلغ کی بیٹی تھی جس کی تعلیم ہندوستان
میں ہوئی تھی۔ ہسے ایک زہد و عابد صوفی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور چوں کہ اس کو ہر حال میں کلیسا ہی کا
ایک کارکن بننا تھا اسی وجہ سے اس کو مذہبوں کی خانقاہ کے ایک مدرسے میں تعلیم کے لیے داخل کرا دیا گیا
تھا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ہسے وہاں سے فرار ہو کر ایک گھڑی ساز کے ساتھ کام کیلئے نکلا۔ پھر اس نے
سوئٹزرلینڈ کے شہر بال (Basle) میں کتابوں کی ایک دکان پر۔ زمت کر لی۔

ہر کسی سے بچنے و چودنی گہریوں میں رہتی ہی ہوئی سو لائی حد پہنچی اور نوجوانی کی بغاوت سے پیدا ہونے والے تکلیف دہ خزان سے دو چار ہوا جب 1914 میں ایک دانشور انسان اور ایک قابل قدر دھب کے حیثیت سے اس نے مختلف مابوں کا انتخاب کیا۔ پیسے کی تحریروں میں جہد ملی کی دو جہد ملی، جہد ملی تھیں۔ پہلی جہد تو جنگ عظیم کی ابتدا اور اس کے دوران ہوئے والی مابوں تھیں۔ دوسری جہد یہ تھی کہ جنگ کے ابتدائی دنوں میں جب بھی اس نے اپنے سر جھبوں کے دمپن میں کا پرچار کرنے کے لیے جہد کھولنے کی کوشش کی تو اس کو حجاز کے طوفان کا سامنا کرنا پڑا۔ جو فنی کے اخبار اور رسالے نے پیسے پر شدہ حملے کیے اور ان غیر متوقع تجربات نے اس کو حیران و پریشان کر دیا۔ اپنے ان تجربات سے پیسے کی نتیجے پر پہنچا کہ چودے چودے کی تہذیب جس میں دو واسطے میں ندر رہا، نہایت پاک و نیک کی حالت اور مابوں لوں تھی۔ یہی جہد تھی کہ وہ جنگ کے دوران ہی بہ مشکل تمام حرمینی سے فرار ہو کر سوڈان لینڈ میں پناہ گزین ہو اور مابوں تہذیب اس نے وہیں کی شہریت اختیار کر لی۔

پیسے کے خیال میں چودہی معاشرے کی اس کیفیت سے چھٹکارا پانے کے لیے انسان کو طے شدہ معیاری طریقوں کے حصار کی توڑ کر رہنا ہو گا اور شاہ مشرق سے آنے والی ذہن کش روشنی ہی اس کا علاج ہو۔ شاہ مشرق اور کسانے ہوئے پیسے نے اس زمانے کی سب سے زیادہ چار کی ہوئی اور نہ عمل قرآنیت کی تحصیل نفس میں بھی اس مرض کا علاج نہ ہو سکا کی کوشش کی اور اس کوشش کے واضح ثمرات اس کی اس دور میں تخلیق کی ہوئی نہایت بے باک کتابوں میں نظر آتے ہیں۔

پیسے کے مشہور ماہل (Der Steppenwolf) 1927 میں اس کے اپنے ذاتی خیالات کی بہترین نقش گری ملتی ہے، اس نے انسان کی فطرت میں ہونے والے عمل تقسیم، خود جوش اور اشتداد کی کشاکش کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو عصری معاشرے میں سانس لینے والے انسان کو محدود وقت و جوش دیتی ہے۔ ایک بے گھر، اخصابی مرض انسان کی عجیب و غریب پہلی کے وسیعہ جس کا کئی وحشی جانور کی طرح تعاقب کیا جا رہا ہو پیسے نے ایک لادائی اور جھاکا خیر کتاب لکھی ہے جو کس حد تک خوف ناک اور ممکن ہونے کے باوجود جتنے مزاح اور شاعرانہ عبارت آرائی کے امتزاج سے کموا ایک بے مثال تخلیق ہے۔

پیسے کا مانا گنڈریٹ (Gunder) ہندوستانی ایک مشہور عالم تھا اس طرح پیسے اپنے گھومنے کے اور زندگی ہی سے ہندوستان کی دانش و ادبیت سے نہ صرف واقف ہوا بلکہ اس کی طرف راغب بھی ہو۔ اپنے ان شعور و پہنچنے کے بعد جب اس نے ہندوستان کا سفر اختیار کیا تو اپنی زندگی اور شعور کے اندر پیدا شدہ پچھلے کو تو خاموش نہ کر سکا مگر وہ بدھ مت سے بہت متاثر ہوا اور اسی کے زیر اثر اس کی حرکت اثر کتاب ”سندھارتھ“ (Siddhartha 1922) وجود میں آئی جو ایک بزمین نوجوان کی زندگی کی خوب صورت کہانی ہے جو زمین پر اپنے وجود کی اصل غایت کی تلاش میں دکھائی دیتا ہے۔

پیسے کی تخلیقات میں بدھ مت کی روحانیت کے رجاء کے ساتھ ساتھ بہت فرانس سے لے کر

طے اور دوستوں کی کے اوقات تواتر سے ملتے ہیں اس کا قائل بھی نہیں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ رشادے پیسے جنہاں پر مختلف النوع فلسفوں اور سلیب کے انتظامی تجربات کرنے والے ادیب ہے اور اس کا اپنا کوئی فلسفہ یا سوچ نہیں ہے۔ وہاں کہہ سکتے ہیں کہ اس کی سوچ نہیں ہو گا۔ پیسے کی خرید و فروخت اور تجارت کی بنیاد پر استوار ہوتی ہیں اور وہ نہایت گرس قیمت و متجاوز موضوعات کی بحث میں بھی اپنے اسلوب پر چرکی طرح قائم رہتا ہے۔

پیسے کے ماہرانہ اور اصل مادیوں میں جگہ جگہ قائل کی برادری ماست یا بالواسطہ اس سے مدد بھیتر ہوتی ہے۔ اور خواہ وہ بغاوت و سرکشی کا عائد ہو یا کہات پر سون فلسفہ و نو رو لگر کا مرحلہ ہو، اس کا اسلوب ہمیشہ قائل تعریف اور وجہ مال پر ہوتا ہے۔ ایک بے جگہ خائن اور نو سر باز کردار کلان (Klein) کی کہانی، جس میں وہ انکی فرہوگر ہاں اپنے آخری حربے استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور نرالی اور بہت پر سون انداز میں اپنے آنجنابی بھائی کا (Gedenkblätter, 1937) میں تذکرہ کرتا ہے، مختلف موضوعات کی تخلیق میں پیسے کی لہجہ امتیاز دے کی مثالیں ملتی ہیں۔

ہرمن پیسے نے اپنی خرید و فروخت میں تمام رفعت کی زندگی اور معاشرے کی جگہ بندوں کے حصہ سے بہرہ لگ کر فرواد کو اپنی رعایت کی تلاش کرنے کی جدوجہد سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ پیسے کے بہت سے مادلوں میں ان کے مرکزی کردار بنے اندرون کے سفر پر دکھائی دیتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ کوئی رعایتی مہرین کی اپنی شخصیت کی تلاش میں رہتا ہے کہ باہر اس کو وقت اور طرے کی دنیا کی حدوں سے پرے سے جانا چاہتا ہو۔

اپنے مادل Peter Camenzind کی 1904 میں شاعت اور کامیابی کے بعد پیسے نے آزاد مہر کی حیثیت سے مختلف ادب اور جہان کے لیے نگہنا شروع کیا۔ پیسے نے مادل ہرنولی (Mane Bernoulli) سے شادی کی اور اس سے اس کے تین بچے ہوئے۔ پیسے نے 1911 میں ہندوستان کا سفر کیا اور وہاں سے ماہوی کے ہاں جو اس نے مشرقی لہجہ کا مطالعہ شروع کیا۔ اپنے مادل Rosshakle (1914) میں پیسے نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا وہی کو شادی مرقی چاہیے۔ یہ غالباً اس کی اپنی زندگی کی مشکوک کا شہادت تھا جب اس کی بیوی اپنی مرضی ہو چکی تھی اور اس کا مینا بہت بیمار تھا۔

پیسے نے افس کے قریب سٹالین تصنیف کی اور 1962 میں اس نے عالمی ادب کا ایک ہے۔

ضیافت میں تقریر

(مصنف کی غیر موجودگی کی بنا پر سولہ ویں جناب Henry Vallozon نے پڑھ کر سنائی)

میں نے بے حد افسوس ہے کہ اپنی شدید حالت کی وجہ سے جناب برکن پیسے سولہ ویں جناب میں مقیم رہنے پر مجبور ہیں۔ مگر ان کی ایک تمنا تھی ہمارے ساتھ ہیں اور وہ اپنے ایک پیغام کے ذریعے جس کو مجھے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، ہم سب سے مخاطب ہیں۔

مصنف کی تحریر کردہ تقریر

اس شہادت مؤقف نہاد، محکم ملک سے نکلی ہوئی حقیقت کے ساتھ جو میں اس پڑوسر تقریب کے موقع پر برمال کر رہا ہوں، اپنی مذمت کا بھی اعجاب کرنا چاہتا ہوں کی میں بذات خود آپ کی محفل میں آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ میری صحت ہمیشہ سے کچھ اذیت کی رہی ہے اور خصوصاً 1933 سے جس بیماری کے باعث ہمیشہ کے لیے معذور ہو چکا ہوں، اس نے تو میری زندگی کا سارا علمی اثاثہ نہ صرف بہاد کر دیا ہے بلکہ مجھے بہت زبردستی بھی کر دیا ہے۔ مگر میرا دماغ ابھی ٹھیک نہیں ہوا ہے وہ میں اپنے آپ کو اس خیال سے بہت قریب پانا ہوں جس کی بنا پر فوٹیل ڈوکلوشن کا قیام مثل میں آیا، یعنی اسی تصور سے کہ ہر دماغ قومیت کی سرحدوں سے ماوراء ہمیشہ بین الاقوامی ہوتا ہے اور یہ بھی کہ اس کی صلاحیتوں کو جنگ اور ہلاکت کے لیے نہیں، بلکہ امن اور مصالحت میں استعمال ہونا چاہیے۔

میرا نصب العین میرا حال قومی امتیازات کو اس طرح دھندلانا نہیں کہ پوری انسانیت ایک ہی قسم کی ذاتی کیفیت چیل کرے۔ اس کے یہ فکس میری خواہش ہے کہ ہمارا دل بیماری زمین پر شکل اور ہر رنگ کے غوطے سے مرین ہو۔ بحالت بحالت کی نسلیں، طرح طرح کی برادریوں، بے شمار زبانوں، مختلف الکلیات و یوں اور انداز نظر کی موجودگی کو قدر دل خوش کن، اور عزت انگیز ہوتی ہے۔ میں، جو خشوں، فتوحات اور جبری اناقی وغیرہ سے ماقابل مصالحت دشمنی دیکھتا ہوں، اس کی جہاں اور موجود ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اس قسم کے حالات کی وجہ سے مادیاتی انداز میں پیدا ہونے والے بے حد متغیر اور متنازع انسانی تہذیب کے نہ چلنے کتنے مادیات جہالت کے اندھیروں کے تحت قریب سے گئے ہیں۔ مجھے پُر شعور تسکین سے غرت ہے

میں معیاریت، ناقابل نقابل ہندوئہ اور مذہب سے محبت کرنا ہوں۔ آپ کا ایک احسان مند ساتھی ہونے کے ماتے میں آپ کے ملک سوئڈن، اس کی زبان، اس کی تہذیب، اس کی قابل افکار تاریخ اور انفرادیت پر قرار رکھنے کی جہاں جہاں ہمیں قلب سے تہنیت پیش کرنا ہوں۔ میں بھی سوئڈن نہیں گیا مگر بچپن کی عشقوں کے دہان مجھے نوٹ نوٹ آن محبت میں سوئے تھی وہی ہیں جن کی ابتدا Christ Legends کے پیرے شے سے ہوئی جس کو آپ ہی کہ نام وطن اویسہ مجرہ۔ Selma Lagerlof نے ہرکلام مردانی میرے نام منقوش کیا تھا۔ اس کے بعد بھی کئی برسوں سے میرے اور آپ کے ملک کے درمیان مختلف قسم کا مین دین ماسے رہا ۲۔ تاکہ اس اچانک تقسیم تھنے نے مجھے حیرت زدہ کر دیا جس کے لیے میں اپنے بھائی کو تمام تر مہربانیوں سے شکر گزاری کا فرض، داکرہا چاہتا ہوں۔



گیبریا مسترال☆

اعترافِ کمال اُس کی آواز کی اور دھولے سے متاثر، غنائے شاعر کی یہ جس نے اس کے
نام کیس رکھی! طبعی دنیا کی مثالیت پسند انسانوں کی علامت بنا دیا۔

یہ شاعر اپنے دستِ دراز سے قاری کو ایک یہاں شروب پلاتی ہے جو ہر فن کا مزہ بھی دیتا ہے
اور تنگ قلب کی تپش بھی مٹاتا ہے۔ یہ شروب ایک ایسے چشمے سے کشید کیا گیا ہوتا ہے جو دیوان کے جزیرے
سینو Saphno سے انھیں کی وادی میں مقیم گبریا مسترال تک خود چل کر آتا ہے، شاعر کی ایک شیریں
پشیم جو بھی سنگ نہیں ہوگا۔ محبت، ہمارے شہادت، ہمارے پتہ، نصرت، بدل، اور بانوشت مسترال کی شاعر کی
کے مرکزی موضوعات ہیں۔ اپنی ایک نظم میں ایک چھوٹے سے قوت فرقی (Strawberry) کو دو زندگی کی
نمائندگی اور محبت، ہمارے شہادت کی علامت کے طور پر لکھتی ہے

بھرتی کو پامال نہ کرنا

بیاد سے بیاد سے، خوشیوں والے پھل ہیں یہ سب

ان کو باؤں کے مت روکو

ان سے پورا کرنا سو

ان کی عزت کا سیکھو

ان کو پیار سے سونگھو بھی اور

ایسا دیکھ بھی چکا کرو

جسٹنی امریکا کے ایک طویل فاصلے والے ملک چلی کی ماہر تعلیم، سماجی بہبود کی وزارت، سفارت کار اور شاعر گبریا مسٹر ال لائی امریکا کی پہلی شخصیت تھی جس کو اس کی فنیاتی شاعری پر ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ مسٹر ال کی شہرت اس وقت ہوئی جب 1914 کی جنگ عظیم میں مرجانے والوں کی یاد میں لکھی جانے والی رومانی نغموں کے مجموعے SONETOS DE LA MUERTE (Sonnets of Death) پر اس کو چلی کا ملی ادبی انعام دیا گیا۔

رودانگیر زانی یوں اور عمر میں (مثلاً 1909 میں اس کے عاشق رولاندو یورینا کی خودکشی) نے اس کی شاعری پر گہرے نقوش مرتب کیے۔ اپنی تقریباً پینہائی نغموں کے مجموعے (1938) TALA اور (1954) LAGAR میں مسٹر ال کہتی ہے کہ زندگی موت کی جانب یک ہڈ اسرار اور تقدیر سفر ہے جو ہر ذی روح کو اس دنیا سے حتمی نجات دلاتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ایک فن کار کا عوام سے ویسا ہی رشتہ ہوتا ہے جیسے کسی جسم کا روح ہے۔ مسٹر ال کی لکھی ہوئی میں عبارت اس کی گویا قیادت پر کندہ ہے۔

مسٹر ال کی تیسری ضخیم کتاب TALA جس کا انگریزی نام ترجمہ Ravage کے نام سے ہو سکتا ہے، اور جو دراصل ہسپانوی زبان کے بچوں کے ایک کھیل کا بھی نام ہے، پیدائش میں ہسپانیہ کی جنگ آزادی سے متاثر ہونے والے بچوں کی امداد کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس وقت کی فاسی اور مایوسی کے مدخل یہ کتاب کا فانی سکون کی مضمر ہے جو جسٹنی امریکا کی سرزمین کو محیط کیے ہوئے تھی، جس کی حیرت انگیز خوش و ساری دنیا کو معطر کرتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کو پڑھ کر قادی خود کو اپنے بچپن کے چشتان میں پاتا ہے اور وہی عام سی باتیں اور مکالمے سننے لگتا ہے جو بچپن میں اس کے کانوں میں گونجنے لگتے تھے۔ یہ کتاب بچوں کے معصوم گیتوں اور نغموں کی مناجاتوں سے مزین ہے۔ رقی، شراب، نمک، آگ اور پیسوں کی تشنگی کو سیرپ کرنے والے پانی پر لکھی ہوئی اس کی خمیس زندگی کے لیے انسان کی غذاؤں کی مدت مرقی ہیں۔ اپنے عاشق کی موت کے ایک ماہ بعد مسٹر ال نے ماریٹا کے انکس سے استعنان میں کامیابی کے بعد ستارہ حشیت سے ملازمت کرنی۔ 1906 سے 1922 تک اس نے مختلف اسکولوں میں بچوں کو تعلیم دی۔ پانچویں سال، جب وہ صرف سولہ برس کا نوجوان جوان تھا، مسٹر ال سے ملاقات ہوئی۔ مسٹر ال نے اس نوجوان کی حوصلہ افزائی کی۔ مسٹر ال کی پیش کردہ تعلیم اپنے عاشق اور رشتہ کے لیے تھی جس نے خود مرد کے گرام میں چکرے جانے پر خود کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔

مسٹر ال کا پیدائشی نام لوسیا گونزالس اگاڈا تھا اور وہ دیکھنا نامی گاؤں میں 1889 میں پیدا ہوئی۔ اس کے والدین باسک (Basque) اور ہندوستان کی مخلوط نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے باپ نے اپنی زندگی یورپی کوالی وقت چھوڑ دیا تھا جب گبریا صرف تین برس کی تھی۔ ان کو چھوڑنے سے پہلے اس نے اپنی بیٹی کے لیے ایک چھوٹا سا چمن بنا دیا تھا جس میں بیٹھ کر گبریا پھولوں اور جڑیوں سے گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی۔ گبریا کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں ہوئی۔ سولہ ماہ کی عمر سے اس نے ایک

استاد کی حیثیت سے پہچانا شروع کر دیا تھا اور ان کی مددگار سے اس نے اپنی اور اپنی ماں کی کدالت کی۔ ایک استاد اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے گھریلا کی شہرت ان تعینات کی وجہ سے ہوئی جو اس نے استادانہ تعلیم کے، مہین، بچوں اور ہر عمر شاعروں کے لیے لکھی تھیں۔ اس کی پہلی تصانیف سن 1905 میں اخبارات میں شائع ہوئیں جن میں اس نے فرانسیسی زبان کے شاعر فریڈرک مسٹرال اور ٹائی کے مصنف گبریلہ ڈائی انیسیمو (Gabriele d'Annunzio) سے متاثر ہو کر اپنا لکھنا شروع کیا۔ مسٹرال کے یہ تھا۔

1921 میں مسٹرال فرانسیسی زبان کی اسکول کے مدرسہ علی کے عہدے پر فائز ہو گئی جو اس نے اپنے چل میں غریبوں کے واسطے سب سے اچھا سکول تھا۔ 1922 میں اس کی نظموں کا مجموعہ Desolation شائع ہو کر چین لاقوائی سطح پر مقبول ہو گیا۔ اس مجموعے کے مرکزی موضوعات عیسائی عقائد اور موت سے متعلق تھے اور گہرے مسٹرال کے مطابق موت سے آنے والے زوال کے بعد ایک روشن دنیا ظہور پاتی ہے۔ اس مجموعے کی آخری نظم میں مسٹرال ایک عقائد پر اپنے یقین کا اظہار کرتی ہے۔ اس کی نظموں کے مجموعے (1924) TERNURA کی بہت ساری نظمیں بچپن سے متعلق ہیں۔ چچا کے مشہور ادیب اور مذہبی رہنما فرانسیسیوں نے مسٹرال کی شاعری پر تیسرے ہونے لگے تھے اگرچہ گبریلہ مسٹرال کی تقریباً تمام نظمیں اعلیٰ لہجہ رکھتی ہیں۔

سختی گو میں اپنے تئیر کے چھ ڈوں بعد مسٹرال شاعری امریکا اور یورپ چلی گئی، نئی اور فرانس میں مقیم رہی، اقوام متحدہ میں کام کیا، اور مختلف رسائل اور اخبارات میں فرانسیسی اخبار دیے۔ اس دوران اس کی بشری برکات سے بھی ملاقات ہوئی۔ 1930 میں وہ مہمان پرہیزگر و حیثیت سے نیویارک گئی اور بعد میں اس نے چلی کے فکرمند خوجہ کی مدد سے امتیاز دہانی جس میں اس نے اپنے وطن کے لیے ثقافتی سفیر کے فرائض انجام دیے اور برائٹ، ایتھنز، پکن، امریکا، اور (اس زمانے کی) لیگ نیشنز League of Nations کے تمام میں کام کیے۔

گھریلا مسٹرال کے چوتھیں کے قریب مجموعے شائع ہو کر ساری دنیا میں مقبول ہوئے۔ گھریلا نے کبھی شاعری نہیں کی مگر اس نے ایک بچے کو گھریلا تھا جو اس کی زندگی میں ہی انتقال کر گیا۔ گھریلا مسٹرال نے 1957 میں انتقال کیا۔

حیافت سے خطاب

سوویتوں کی حکومت آج لاطینی امریکا کے ایک ایسے دورانیہ ملک کی عزت فرائی کے لیے اس کی

طرف متوجہ ہو رہی ہے جو اب کی تہذیب کے بہت سے ترجمانوں میں سے ایک ہے۔ بد شہ افریڈ ٹونیل کی وسیع انٹرویو آج اس بات پر سرور ہو رہی ہوگی کہ انسانیت کے تحفظ کے لیے اس کے قائم کردہ ادارے نے اپنے سرحدوں کے دائرے کے اندر بہرہ انگظم امریکا کے جنوبی خطے کو بھی شامل کر لیا ہے۔ جس سوئیڈن کی جمیڈی وادی کے نمائندہ ادارے سے بہت متاثر ہوئی ہیں، وہ روایت جس کی خدمت اس امر میں پیشہ ہے کہ یہ مسئلہ اپنے آپ کو معاشرے کی بے مثال اور قابل قدر ضروریات کے مطابق نئے روپ میں ادا کرتی رہتی ہے۔ ماضی کے چنگل سے قدم بھاری قدموں کی سائے کے ساتھ ساتھ حال اور مستقبل کی باتیں ہوئی حقیقتوں کی قیادت کے سلسلے میں اپنی سوئیڈن نے بے مثال کام کیے ہیں اور میں ہمہ وقت سے کہہ سکتی ہوں کہ ایسی کامیابیوں کا روپ کے لیے انجمن کا باعث اور بہرہ انگظم امریکا کے لیے قابل تقلید ہوں گی۔

ایک نئی قوم کی بنی ہوئے کے نام سے، سوئیڈن کے ان روحانی پرستکاروں کو سلام پیش کرتی ہوں جنہوں نے اس سے قبل بھی بار بار میری مدد فرمائی ہے۔ اس ان لوگوں کو یاد دہانا چاہتی ہوں جنہوں نے اس ملک کے قومی بیکرین ترقی و ترقی کی ہے اور اس کے دامن کو یاد دہانہ رہنمائی ہے۔ مجھے یہ فیسر اور معلم حضرات کا وہ گروہ یاد دہانا ہے جو آئے والے تمام غیر ملکیوں کو اپنے قابل تقلید اسکول کی سیرناتے ہیں اور میری محبت بھری معتبر نظریں سوئیڈن کے دوسرے عام لوگوں، یعنی کسان، ونگار اور مزدوروں کو بھی دیکھ رہی ہیں۔

میرے لیے یہ ایک قسم کی باواجب خوبی قدری ہے کہ میں اس وقت چلی نسل کے شاعروں کی مدد راست آواز اور باواسطہ سپہ فوجی اور پرچم کی نمائندگی کی اشرافیہ کے واحد نمائندے کی حیثیت میں آپ سے مخاطب ہوں۔ صدیوں پہلے لوگ کتنی کس اور شاعری کی روایات سے مزین تھے اس بارہوئی تفریب میں شرکت کی بدولت پر ہم دونوں بے حد شاد ہیں۔

خدا اس بے نظیر قوم کی، اس کے قومی ورثے کی، ماضی کی چھوٹی سے چھوٹی اشیاء کے تحفظ کی کوششوں کی، اس کے ماحول سمندر پر بسنے والے لوگوں کی جو ہر قسم کی ننگار کو جھپٹنے کے لیے تیار رہتے ہیں وہ اس کی تخلیقات کی حفاظت کرے۔

میرے وطن نے، جس کی نمائندگی فاضل وزیر جناب Gasardo فرما رہے ہیں، جو سوئیڈن کی نہ صرف بے انتہا عزت کرتا ہے بلکہ اس سے محبت بھی کرتا ہے، مجھے اس خصوصی اعزاز کو وصول کرنے کے لیے بھیجا ہے جو آپ نے اس کو پیش کیا ہے۔ میرا ملک چلی آپ کی اس قیامت کو جو آپ نے اسے عطا ہے اپنی قلبی دونوں کے خزانے میں ہمیشہ محفوظ رکھے گا۔

جوبانز ولہم جینسن

اعترافِ کمال۔ کشادہ اور وسیع دانش و راسخ تہمتیں اسے پاک و نازدکار، انفرادی طور سے مشترک، غیر معمولی توانائی اور عموماً سے مملو شاعر، قوتِ تخیل کے لیے۔

عاشقِ طبع پر اپنی تحریروں کی بے مثال قوتِ نمونہ کے لیے پسند کیے جانے والے، اور کسی حد تک متنازعہ ہونے کے باوجود جوبانز جینسن انیسویں صدی کی تمدنی و ادبی سے صرف قلوب کے ادیبوں میں شمار کیے جاتا رہا۔ ڈنمارک کے جنگل اور تیز ہواؤں والے صوبے جٹ لینڈ کے باغی جینسن نے اپنی غیر معمولی ادبی کثرت نگاری سے اپنے ہم عصروں کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی زندگی دنیا کے ادیبوں میں جینسن سب سے انفرادی و بے حد تھا تو بے جا نہ ہو گا۔ جینسن نے اپنے گرد ایک ایسا عظیم نشان و فہم مالہ تخلیق کیا ہے جس میں اس کے شیر جہتی راسخی رجحانات سے قسطِ نظر، مختلف النوع طرز کے فنائیر، ہر ذمہ، تصویراتی اور حقیقی، تاریخی اور فلسفیانہ موضوعات ملتے ہیں۔

جینسن کی زندگی میں اپنے اہل خانہ کے ماحول پر چھا جانے والے انسان کی خصوصیات سو جو جینسن۔ جٹ لینڈ کے جنگل علاقے کے باغی کے پردہ زمین پر انسانوں اور ماحول میں بکھری شیا کے نقوش اس طرح مرتب ہو جاتے تھے کہ وہ بچپن کی حسیات اور اس زمانے کے تجربات کو جو اسے اپنے پرانے خاموشی ماحول سے حاصل ہوئے تھے، یاد آسانی یا دکر سکتا تھا اور بہت سکتا تھا۔ اس کی پہلی ادبی تلاش جینسن کو ایک جفا

کٹس، غنیمت اور حزب مخالف سے متعلق نو جوان کے طور پر پیش کرتی ہیں جو اپنے زمانے کی تنگ نظری اور فرسودگی کے خلاف جدوجہد کے لیے تیار دکھائی دیتا ہے۔

جینسن کو اپنے ملک ڈارمک کے مختلف حصوں سے ذہنی تعلق محسوس ہوتا تھا۔ ٹائٹل میں وجہ تھی کہ اس نے تازہ ہو میں سرٹس پیٹ کے لیے ایک جہاز کی طرح عجیب و غریب ہوا کے اکتوار بنائے اور وہ انیت میں بنائے گئے کی پیشکش کی۔ مختلف لوگوں کے سفر کے دوران اس کے زنجیروں میں محسوس تصورات کی ذہنی کشادگی سے متعلق ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ٹیکنالوجی اور مینیجمنٹ (Mechanisation) کے نئے نئے شرواع کر دیے تھے اور اپنے دور کے ان معدودے چند لوگوں میں اس کا شمار ہونے لگا تھا جو ریل گاڑی کے سفر کے حسن کے پرچارک تھے۔ وہ اپنے ماول (Madame D Ora (1904 اور (Hjuel (1905 میں اپنے زمانے کی حیرت انگیزی، بلند دہائی، موسیقیوں، سینما وغیرہ کی تعریف میں رجب الطمان اکتفا کرتا ہے۔ مگر یہی ہیں کہ سفر کے نئے تجربات اور کشادگی سے نئے مشق کی آگ جلد ہی سرد ہونے لگی اور پھر جینسن ایک نئے ارتقاء دور میں داخل ہونے لگا جہاں سے اس نے پلٹ کر پائے عہد کی طرف مراجعت کی، اس طویل دور کی جاہ جب انسانیت آہستہ آہستہ سے، چھوٹے چھوٹے تجربات سے حکما حاصل کرتی تھی، ماسی میں خوش رہتی تھی۔ گو ایک تیز رفتاری ہوتی گاڑی آہستہ آہستہ کی طرف مائل ہوتی ہو۔

اسی منزل پر جینسن نے چھ حصوں پر مشتمل اپنی معروف کتاب Den Lange Reize The Long Journey (1908-22) تصنیف کی جو صرف کے عہد سے کرستوف کوپلر کے طویل امریکی سفر کے عرصے تک کا عطر کرتی ہے۔ اسی کتاب کا، جو دو حصوں میں شائع ہوتی تھی، مرکزی موضوع سائنسی نیویائی لوگوں کی جدوجہد سے عبارت تھا جو جہازوں، ماسین، ماسٹروں کی فتوحات اور امریکا کی دریافت جیسے وسیع زمانے کو محیط ہے۔

ماہی کے جہازوں اور جانور حقیقتوں کے درمیان سے اپنی راہ نکالنے کے لیے جینسن اپنی اس جہیز کو دیلات اور حقیقتوں میں اس طرح تقسیم کرتا ہے کہ قاری ایک قدیم زمانے کے بے حس ہامی کی مانند نئے دور کے جذباتی انسان میں دل چسپی پنے لگتا ہے۔ وہ وحشیانہ برہنہ نر و مائٹ جذبہ میں تبدیل ہونے لگتا ہے۔ اس کی تحریر میں ایک تازہ نگرشور میز ہوا چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جو ایک واضح بلانویان، طاقت ور خطرناک بھار ور غیر معمولی توانائی سے عبارت ہے۔ اپنی اسی فطری زبان کی وجہ سے جینسن کو، سائنسی انداز کے دونوں کی سخت ماحول اور موسمی حالات کے مقابل جدوجہد کا سب سے بڑا راہی کہہ جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

جینسن 1873 میں شٹن جٹ لینڈ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ جانور کا مہاجر تھا۔ اپنے والدین کی جانب سے وہ کسانوں اور پتہ مندوں کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ 1893 میں جینسن نے ویپرگ کے ایک کھیتی باڑی سکول سے گریجویشن کیا جس کے بعد نین برس تک اس نے کہن سٹین پولی ورٹی

سے جانوروں کے علاقے کی تربیت حاصل کی۔ جنسی کا ادبی سفر بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں اپنے
 وشن کے کسی علاقے کی لوہ بھٹیوں کے ایک مجموعے (1898-1910) Hammerdavissoner سے
 شروع ہوا جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد کے اسی عرصے میں جو 1944 تک پھیلا ہوا تھا جنسی نے
 دیوالا میں دل چھکی ہے۔ بالخصوص اس ادبی پیشوں میں جو اس قسم کے رب میں عام طور پر استعمال ہوتی
 تھیں۔ اس کی یہ تصنیف (Myths) 1907-45 Myer نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ جنسی نے انھیں بھی تھیں
 اور بشریات اور فلسفہ ارتقاء سے متعلق مضامین بھی تحریر کیے۔

کچھ عرصے تک جنسی مصنفت سے بھی مصنف رہا اور بہت سے خیارات درمیان کے لیے
 مضامین بھی لکھے مگر اس دوران اس نے ملازمت نہیں کی۔ مشرقی بعید (ملائیشیا اور چین) اور اس کے بعد
 امریکا کے طویل سفر سے وہ بھی پو جنسی نے ڈائریک کے ادب اور صحافت کی جس میں جدید طرز بیان کی
 بحر مار تھی، چلے اسکی تازہ تحریروں سے متاثر کیا جن میں اس نے انگریزی اور امریکی قوتی تحریروں کے تجربے سے
 تھے۔ جنسی کی ادبی کاوشوں کا نچوڑ اس کی ان نظموں میں ملتا ہے جو اس دور کی مرید بے حدائی ست پسندی
 کے، جو یورپ کے اہم ترین پورے یورپ میں مرزج تھی، رٹر عمل کے طور پر لکھی گئیں۔ اس نے ٹھہرا
 مرادہ نہ توین تھو قیغ مواد سے نیر پوشا عری کی جو اس دور کے لیے ایک بالکل نئے طرز کی ابتدا تھی۔
 جنسی کی 74 کے ٹھہر تصنیفات شائع ہوئی اور اس نے 1950 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

میں بے حد کمالی تنظیم سینیٹس اکادمی اور سینیٹس کی قوم کا اس اعزاز کے لیے شکریہ ادا کرنا چاہتا
 ہوں جو انھوں نے ادب کے فوٹیل نظام کی صورت میں مجھے عطا کیا ہے۔ آج ہمارے تصورات میں اس
 نظام کا ادبی، انفریڈ فوٹیل رجحان ہے جس نے چکالہ مہربانی اور بہت سے فزوس دنیا جرمیں میں گھس
 ادب اور امن کی خاطر اتنا کچھ کیا ہے۔

اس عظیم سائنسی دان اور انسانیت دوست شخص نے سینیٹس کا نام ایک ایسے وسیع و عریض آفاقی
 تصور سے منسلک کر دیا ہے جو ایک ملک کی سرحدوں سے نکال کر تمام انسانیت کو قریب لائے کے خدمت میں
 مل پ عمل ہے۔

جب سینیٹس کے بین الاقوامی سطح پر مشہور عظیم ناموں کے بارے میں سوچا جاتا ہے تو ہم سب کے

فنون میں انگریزوں کی فہم میں سے سب سے بڑے فطرت کے ماسکس و ماسکس اور علی درجے کے
 لائن شخص Linné کا نام بھرتا ہے، وہی جس نے اس وقت جانوروں کو ان کے مخصوص نام دیے تھے جب
 نظریہ ارتقاء کا ظہور بھی نہیں ہوا تھا! راسی نے ہندوؤں، ٹگورڈوں اور انسانوں کو ایک ہی جہت میں شامل کر کے
 اس ایک جہت کو Females کا نام بھی دیا تھا۔ فطرت کے لیے دیا گئی تھی حد تک، اور ہر مادی وجود کے لیے
 جو حرکت کے یا سلسلے کے قابل ہو، Linné کی بے مثال جہت ہی اس کے دلدادہ کو ہمیز کرتی تھی۔ جب
 بھی کوئی کردار، فنی مخلوقات کے جنس و قسم کے تعین کے بارے میں مطالعہ کرتا ہے یہ فطرت کی سائنس اور
 تاریخ کے موضوعات پر کسی بھی کتاب کی ارتقاء کو دیکھتا ہے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کی نظروں سے Linné
 کا نام نہ گزرے۔ Linné کے خیالات میں ایک عجیب طرح کی ذاتی بالیدگی اور دل کو سواہ پینے والی روحانی
 فہم پائی جاتی، اور وہی عمدیوں سے لوگوں کے ذہنوں کو سوئیدن کے سرسبز پہاڑوں اور ان کی وادیوں
 میں بسنے والے لوگوں کی سحریت سے بھرپور فطرت کی طرف مایہ نوبت کرتی ہے۔

میرے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ میں Linné کا ذکر کروں اور میرے دل میں چارلس ڈارون کا خیال
 نہ اٹھوے، اور اسے میں سائنس کے اس عالم کی طرح یا نہ کہ اس کے لئے نہ انوں کے درمیان نہ صرف
 حدفاصل سمجھتی ہے بلکہ وہ ایک بے انتہا محبتی و انسانوں میں سب سے زیادہ مہربان شخص تھا، جو اس
 بہترین، تیسری اور چوتھی نسل جس کا متاثر نام فخر سے لے کر چلتی ہے۔ اس کے نزدیک ارتقاء صرف زندگی
 کے مطالعے ہی کا موضوع نہیں تھا بلکہ زندگی کے جوہر کی تلاش، فطرت کی کبھی ختم ہونے والی زرخیزی کا
 ثبوت اور پرت پرت، روز بہ روز نکلتی ہوئی اور دل کو سوسپنے والی حیرت انگیزی کا نام تھا۔

استدلال کی عمدت اور فہم و ادراک کے مطابق، اگر کسی کو بر قوم کی ذہنی پختگی کے مدارج کی
 پیمائش مقصود ہو تو اپنے حساب حقیقت پسندی کو دیکھ کر انگلستان سے درجے پر فائز نظر آئے گا اور وہ شخص جس
 نے انگلستان کے یہ جہاں کی حیالات آسمان انداز میں پیش کیے ہیں وہ چارلس ڈارون ہی تھا۔

کرسٹوف کی حقوق جنسوں کو Linné کے دیے ہوئے نام ہی دے دیا دیتے جنہوں نے بعد میں ان
 کے سمندراسب کے تعین کے درجے میں ڈارون کی امدادی اور ہمیں ”ینگوسونیزاش“ حقیقت پسندی نے،
 جو ہماری مشترک شایانی پس منظر (Nordic background) سے ودیعت ہوئی ہے، کارگاہ فطرت میں
 ہمیشہ کے لیے انسانیت کے مقام کے تعین کا موقع فراہم کیا ہے

اس موقع پر میں ذہنی زبان کے ادب کے ایک اور بڑے نام کا ذکر کرنا چاہوں گا جو سوئڈش
 روایات سے منسلک ہے، اور وہ نام Adam Gehenschläger ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب 1892
 عیسوی میں لنڈ (Lund) نامی شہر میں اس کی ملاقات سویڈن کے قومی شاعر Esaias Tegnér سے ہوئی تھی
 تو Tegnér نے ایک عظیم شاعر مگر نہایت سادہ انسان کے طور پر اس کی تعریف کی تھی۔ یہ بھی اتفاق ہی ہے کہ
 ایک سو برس بعد، مئی 1929 عیسوی میں اسی شہر کی جامعہ Jnversky of Lund سے سند تعلیم دی ہوئی

ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں Oehlenschläger کے علمبرداران کا وارث ہوں مگر میں خود کو اس کے پیروں اور مداخلت میں ضرور شمار کرتا ہوں۔

اسٹینڈی جیورین براؤنی کا ایک فرد ہونے کے واسطے میں قہر ولی سے آزاد اور عظیم سوینڈش قوم کا شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں جس نے مجھ سے قبل میرے حمد و ثناء Adam Oehlenschläger کی بھی اپنی اعزاز سے نوازا تھا اور وہ مرتبہ خود میرے ادبی کام کو بھی اتنی ہی ستائش کے قابل سمجھا تھا۔



فرانز ایمل سیلین پاپا

امیٹرائیڈ کمال۔ اپنے ملک کے کسٹومز کے حالات کے گہرے ادراک اور مارک فین کا رقی کے لیے جس کے ذریعے اس نے ان کے بود و باش اور نصرت سے اس کی نسبت کی نقوش گرئی کی۔

کئی جنگ عظیم کے اختتام پر سیلین پاپا نے بچوں کی بہبود کے ادارے General Mannerheim League for Child Welfare میں شرکت اختیار کر لی اور جنگ میں شہید ہونے والے بچوں کے لیے کام کیے۔ یہودی عسکری کی دوسری جنگ میں سیلین پاپا نے اپنے فسانوں کے کئی مجموعے شائع کرائے جن میں (1923) Håu Ja Ragnar بھی شامل تھا۔ اس کتاب کے متن پر، جس میں شخصیت کا غصہ لکھا تھا، بہت سے دے ہوئے۔ اس مجموعے کی ایک کاپی ایک رئیس گھر کے نوجوان مائٹار Ragnar اور اس کے گھر میں ملازم لڑکی Hiku سے محبت کے ورے میں تھی۔ مائٹار نے جو سے جنسی تعلقات قائم کرنے چاہے جس کی وجہ سے انھوں نے خودکشی کی کوشش کی۔

سیلین پاپا کو بین الاقوامی شہرت اس وقت ملی جب اس کی کتاب (1931) Nuorena Nukkunut کا برطانیہ اور امریکا میں انگریزی میں ترجمہ شائع ہوا۔ باقی ایک نوٹی دے کے ورے میں ہے جس کے ہاتھ سے نکل جانے سے ایک پورا خاندان تباہ ہو جاتا ہے جو کسان کی بیٹی سیلا Sella موت کے منغوش

میں چلی جاتی ہے۔ دڑے کے ہاتھ سے چپے جانے کے بعد غرورت کی وجہ سے سیدیا کو ایک گھریلو مزدور کا کام کما پڑتا ہے اور اس دوران اس کا عشق یک نوجوان اس سے ہو جاتا۔ اس سے سید کے جنسی تعلقات ہی کہلی کا اہم سوز ہے جس کے بعد اس محبوب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور وہ بالآخر تپ دلی کے عمارے میں چلا ہو کر انتقال کر جاتی ہے۔

جب تقسیم ہند کی ابتدا نے مسیحیوں پا کے ذہن کا چھجور کر رکھ دیا۔ جب کہ ہند سے پیدا ہونے والی شخصوں کے رد عمل کے طور پر مسیحیوں یا معاشرتی آزادی کا نقیب بن گیا اور اس ہند سے دائیں بازو کے لوگ اس کا خدائی اٹاتے جب کہ بائیں بازو کے الیٹس اس کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مسیحیوں پا کے دوستوں میں ٹیٹن لینڈ کی زبان کے سربراہ گوردھ متھنیں، رتی بلینڈ Mare Haavio ساگا رتی پاکی Sakan Fasi اور کیتا ویلکا Kusta Valkuna شامل تھے جو اس کے لیے نہ ہمز تھے۔ جب سلیوی پا نے اس دور کے عمر ٹکرائوں، جن میں اس وقت ہر مسوینی، کے نام آرسکس لیٹرنو کی کٹیرز (Christmas letter to Dictators) لکھنے کی جسارت کی تو سوز کے طور پر اس کی تمام تصانیف کے برعکس زبان میں تراجم یا مار سے اٹھا لیے گئے۔

سلیوی پا کی کتابیں (1941) Elokku اور (IhmiseLon Ihanojs ja Kurjuls - 1945) The Beauty and Misery of Human Life شائع ہوئیں جن میں اس نے اپنی زندگی کی باتیں، سوز کی بولی، نوجوانی کی بار بار اور اپنی مشائیت کے شائع ہونے کے شکوے کیے تھے۔ جب کہ بعد سلیوی پا نے سب سے ذریعہ نگہان ریڈیو کی طرف توجہ دی اور ایک طرح سے کہلی سے منھ سوز کیا۔ ریڈیو کے کھیلوں اور خطبات پر سلیوی پا کو بہت پسند کیا گیا۔ سلیوی پا کو کئی کہلیوں پر فہمیں بھی خدائی تھیں۔ سلیوی پا 1888 میں فنلینڈ کے علاقے Hameekyro میں پیدا ہوا جہاں اس کے والدین ایک عرصے سے مقیم تھے۔ جب سات سو سو سی ہفتہ اور شہر پالہ پڑنے کی وجہ سے فصل کے سارے بیج جل گئے اور سوئی ہڈا بونے اور لہس سلیوی پا کے علاوہ خاندان کے سارے بچے موت کی آغوش میں چلے گئے۔ اس علاقے میں زرخیز باؤں میں پٹنے والے بچے کے لیے ایک معمولی سا گشتی اسکول تھا مگر سو سو سی ہڈا کے لیے اس سے لڑین اصل سلیوی پا کو ایک واحد اسکول میں داخلہ مل گیا جہاں کی تعلیم سے اس کے جوہر کھلے پانچ برس تک اس کے والدین نے اسکول کے آخریات برداشت کیے اس کے بعد تین سال تک اس نے خود اپنی کتابت بھی کی اور 1908 میں قیادی نمبروں سے میٹرک بھی پاس کیا۔ اس زمانے میں فنلینڈ میں زچین حاکم عملوں کو اپنی اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے پتہ لوگ مل جاتے تھے۔ اس روایت کے مطابق ایک دردمند انسان سلیوی پا کی تعلیم کا خدائی اٹھا دیا۔ یہاں اس نے سائنسی مضامین کی تعلیم میں دن رات ایک کر دیے مگر عین اس وقت جب کہ اس کتابت سر پر تھے سلیوی پا، جو پانچ برس تک ادا د پاتا رہا تھا، اپنی تک اس پتیر انسان سے محروم ہو گیا۔ اس کو تعلیم جاری رکھنا مشکل ہو گیا اور مجبوراً وہ اس اپنے والدین کے پاس چلا گیا، جو چشتی سے پیسے سے بھی زیادہ مفلس ہو گئے تھے۔

پزل بک

اعترافِ کمال: بھئی کے کہانوں کے رومن سن، ذہنی سے لب ریز اور حقیقت پر محو بیان اور اس کے سوانحی شاہکاروں کے لیے۔

افسانہ و مست و مودتوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والی، شیعہ مسکین کی مدد، انسانی حقوق اور ترقی معاشرے کے پس منظر میں کھڑے جانے والے ماؤں کی تصنیف کے حوالے سے پزل بک کا شمار اپنے زمانے کے سربراہ اور دور و دور مقبول عام نگینوں میں ہوتا تھا۔ پزل بک کو نوٹل انعام دینے پر اس نے ان کے پیش درمصرین نے سوئڈش اکادمی کے کارپردازان پر کڑی تکی چینی کی تھی اس لیے کہ ان کے نزدیک پزل بک کا وہی قدر و قیمت نوٹل انعام کے حق و در سمجھے جانے والے ادیبوں کے جیسا تھا۔

ایک ادیب کی حیثیت سے پزل بک کا ظہور اس کے ناول East Wind-West Wind (1930) سے ہوا جو مصرین کے غریب قابل قدر تھا۔ اس سے قبل پزل بک امریکہ میں کھسکی رہی تھی جس میں قابل ذکر ایک کہانی A Chinese Woman Speaks تھی جس نے مصرین کو اس کی چاہ متوجہ کیا۔ جس ماؤں نے اس کو چین الاقوامی سطح پر پہنچایا وہ The Good Earth تھا جو 1931 میں شائع ہوا۔ یہ ناول اپنے اسلوب کے لحاظ سے انجیل جیسی نثر اور چین کے بہادرانہ کاموں کے اندر نہ بیان کا تھا جس نے اس کے کرداروں کو ایک اعلیٰ معیار عطا کی۔

1936 میں ہارس بک پبلیشنگ اسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ لیٹرز کا رکن بن گیا اور 1938 میں ٹوئیل انعام پانے کے بعد وہ امریکا کے مصنفین میں تیسری شخصیت تھی جو اس رتبے پر فائز ہوئی۔ چینی میں اپنے قیام کی وجہ سے وہ مختلف معاشرے سے تعلق رکھنے والی عورتوں اور مردوں کے درمیان رشتوں کی نزاکتوں اور الجھنوں سے بہتر طور واقف تھی۔ مختلف نسلوں کے درمیان محبت اس کی کتابوں کے سمبھوہات میں سے تھی۔ پٹی کتاب (1949) The Angry Wife میں ہارل بک نے ایک کشیدہ اور ایک فوجی کے درمیان عشق کا واقعہ پیش کیا ہے۔ اسی طرح (1952) The Hidden Flower میں ایک جاپانی خاندان کی برہمنی کا تذکرہ ہے جس کی لڑکی ایک امریکی فوجی کے عشق میں گرفتار ہو گئی تھی۔

دس کے شتران غلاب کے بعد ہارل بک اپنے رفاہی مقدمہ کے لیے بین الاقوامی امداد کے دورے میں بہت دیریں ہو گئی تھی۔ ہارل بک کی کتاب (1939) The Patriot چینی ورثی کے ایک صاحب عام کے جذبات کی نشوونما کے بارے میں ہے جس کے جذباتیاریت پسندی کو جنگ عظیم کی تباہ کاریوں نے جس جس کر دیا تھا۔ ہارل بک نے جنگ کے دوران فوجیوں کے ان بچوں کی سیر کے لیے بہت کام کیے جو مقامی عورتوں کے بطن سے پیدا ہوئے اور فوجیوں نے ان کو چھوڑ دیا تھا۔ خود ہارل بک نے نو عدد ایسے وارث بچوں کو گود لے کر ان کی پرورش کی۔

ہارل بک کی سب سے مشہور کتاب (1931) The Good Earth تھی جس کے تیسرے نیاں نالیوں میں مرتھے ہوئے اور جس پر مصنف کو 1931 میں انسائونک وب کا Pulitzer Prize دیا گیا تھا۔ اس کتاب پر ایک فلم بھی بنی تھی جو بہت کامیاب ہوئی اور اس کتاب کے کرداروں کے فروخت ہوئے۔ یہ ماں ایک چینی کسان ونگ لونگ Wang Lung کے خاندان کے بارے میں ہے جو ایک غریب کسان تھا مگر بعد میں اپنے محنت و ہمتی کی یاد دہانی کی وجہ سے ہزاروں زمین حاصل کیا۔ کتاب کی ابتدا اس وقت سے ہوئی ہے داگم جب ہوانگ Hwang خاندان سے ایک کشیدہ اولاد (Orphan) کو حاصل کرتا ہے جس کو اس کے غریب والدین نے اپنے معاشی حالات سے مجبور ہو کر ہوانگ خاندان کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ داگم نے اولاد سے شادی کر لی۔ اولاد امر چر غریب سعادت نہ تھی مگر وہ نہایت مہنتی ماں اور محبت کرنے والی بیوی بنی۔ اولاد کے بطن سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ پھر پل ہوا کہ ایک سال ساری فصل محدود ہو گئی اور اسی سال ورن نے ایک لڑکی کو جنم دیا۔ اس وقت داگم خاندان کے پاس سوائے اس کے کہ اپنی لڑکی کو فروخت کر کے اپنی مالی مشکلات سے بھٹکا مارا لے، کوئی چارہ نہ تھا مگر اس نے لڑکی کو فروخت کرنے کے بجائے جنوبی چین کی طرف ہجرت کو ترجیح دی۔ چین میں اشتران غلاب اچھا تھا، لوٹ مار شروع ہو گئی، مگر کیوں بلے گئے اور اسی جنگ میں داگم کی خوش قسمتی سے اس کو چاندنی کا ایک خزانہ مل گیا۔ ایک داگم کے حالات کا منظر تبدیل ہو گیا اور اس کے خاندان نے اپنے اس مقام کی جانب واپس کوئی کیا۔ قسمت کا کرنا ایسا ہوا کہ اسی مقبول خاندان کا، جس سے اس نے اپنی بیوی اولاد کو خریدا تھا، مگر فروخت کے لیے پیش تھا

اور ونگ نے اس کو خرید لیا۔ اب ونگ خاندان کے پاس سب کچھ تھا مگر یک پریشانی تھی کہ اس کی لڑکی سوگئی تھی جس کا کوئی علاج نہ تھا۔ ونگ نے ہی حائل شدہ دولت کے نشے میں یک اور عورت کو خرید کر اس سے شادی کر لی اور اپنی پرانی، برصورت مگر بہت بڑا دار بڑی لڑکی کو کس پیری کے عالم میں مرنے کے لیے بچھڑا دیا۔

مگدالینہ کی کہانی سے منسلک نزل یک کی دو کتابیں (1932) "Sons" اور (1935) "A House Divided" تھیں جو ونگ خاندان کے بچوں اور احوال کے درمے میں تھیں۔ ان تین کتابوں کو "The House of Earth" شائع ہوا۔

نزل یک 1892 میں امریکا کی ریاست ورجینیا میں پیدا ہوئی تھی مگر اس کی نوجوانی کے دن چین کے مشہور روہرنگسی کے کنارے آبدھار چین کیا گیا جس میں گزرتے تھے اور اس نے انگریزی سے پہلے چینی زبان پڑھنی سیکھ لی تھی۔ اس کے والدین چھوٹی بستی تھے، درانہوں نے چین میں کافی عرصے قیام کیا۔ نزل یک کا دپ ایک خاص طرح سنان تھا جس نے اپنی مگر کا بیشتر حصہ ٹیبل بٹرس کا پوانی زبان سے چینی زبان میں ترجمے میں گزرا۔ نزل یک کی ماں نے بہت سڑکیے۔ وہ ادب کی تعلیم دیتی تھی اور اس پر انھیں نظر رکھتی تھی۔ چین میں نزل یک کی ابتدائی تعلیم وہ خوش گزاری تھی۔ چینی لڑکیوں کی طرح ہی بچی تھی اس کے خاندان کو بانیوں کے خوف سے مجبور ہو کر اپنے علاقے سے نرا ہوا تھا۔

اپنی ماں اور ایک چینی خاتون کے ہاتھوں ابتدائی تعلیم کے بعد پندرہ برس کی عمر میں نزل یک کو شنگھائی کے ایک رہائشی اسکول میں بھیجی کر دیا گیا جہاں وہ 1907 سے 1909 تک ٹیچر رہی۔ نزل یک نے چین کی کیتروس اور ٹونگھو کی بہبود کے لیے بھی کام کیا۔ اس نے امریکا کی ریاست ورجینیا کے Randolph-Macon Woman's College میں نسبت کی تعلیم حاصل کی اور 1914 میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد چین میں Presbyterian Board of Missions کی استانی کمیٹی سے شمولیت اختیار کر لی، لیکن جان لاسٹیک سے شادی کی اور شنگھائی چین میں سکونت اختیار کر لی۔

نزل یک نے مدنی کی وراسپے شوہر کے لیے مترجمی کمیٹی سے کام کیا اور چین کے دیہات دیہات گھومی۔ اسی زمانے میں چین میں آزدی اور اصلاح کی تحریکیں چلی رہی تھیں جو 1917 سے 1921 تک جاری رہیں۔ 1920 میں نزل یک مان کٹک جاسی جہاں اس نے چلی ورتی میں انگریزی ادب کی تعلیم دینی شروع کی۔ پھر کچھ دنوں کے لیے پٹی وئی طور پو مقداد کی کے علاج کے لیے امریکا بھی گئی۔

اپنے چالیس سالہ دہائی میں نزل یک کے دو ماں پر یک نے اپنی 80 کتابیں تصنیف کیں جن میں اول، کھیل، مختصر افسانوں کے مجموعے، تعلیمی بچوں کے لیے کہانیاں اور اصلاح شامل تھیں۔ نزل یک نے John Sedges کے نام سے بھی پانچ ناول لکھے اور (1330-1400) Lo Guanzhong کی کتابوں Men of the Marshes اور All Men are Brothers کے عنوان سے ترجمے

بھی کیے جو ۱۹۳۳ میں شائع ہوئے۔ ہارل بک نے ۱۹۷۳ میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

میرے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ میں ان تعریفی کلمات کے بارے میں وہ سب چھو کہ سکوں جو میرے بارے میں لکھے گئے ہیں۔ میں اس اعزاز کو اس یقین کا دل سے سمجھتی ہوں کہ جو کچھ میں نے اپنی کتابوں میں پیش کیا ہے، مجھے اس کے عوض میں کبھی نہ دو عطا ہو رہا ہے۔ اب وقت میں صرف یہ فرائض ہی کر سکتی ہوں کہ میں اپنی ان کتابوں میں، جو بھی میں لکھی نہیں تھی، اس میں معذرت کا نام رکھوں گا، آج کی شب جس کی تمہیں یہ تھی ہے۔ اور میں اس جذبہ کے ساتھ اعزاز حاصل کر رہی ہوں، کہ یہ سب کچھ میرے "ننگے" کے کام پر نہیں، بلکہ "ننگے" کے جانے والے کام کے لیے بھی ہے۔ جو کچھ بھی میں احمد دھرمی کی اس شان کی یادوں سے ملنے والی تحریک اور تجربے سے حاصل کر رہی ہوں۔

اب اعزاز کو میں اپنے ملک کی عزت کے لیے احمد امریکا کی جانب سے بھی وصول کر رہی ہوں۔ ہری قوم ابھی نسبتاً کم سی ہے اور ہمیں علم ہے کہ ہم ابھی تک پوری جہاد میں نہیں آئے ہیں۔ ایک امریکی کو دیا جانے والا یہ نعام صرف ایک فرد ہی کی نہیں، قوم کے سارے لکھنے والے طبقے کی ہمت بخانا ہے، جو اس سے نہ صرف مسرت حاصل کرتے ہیں بلکہ ان سب کی حمد افزائی بھی ہوتی ہے۔ میں یہ بھی کہنا چاہوں گی کہ ہمارے ملک میں یہ بات نیا ہے، ہم بھی جانے گی کہ انعام ایک خاتون کو عطا ہو رہا ہے۔ آپ لوگوں نے اپنے ہی ملک کی ایک خاتون Selma Lagerlöf کو بھی یہ عزت بخشی تھی۔ آپ کے ہاں تو ہر طبقے کی خاتون کے کاہلے نمایاں پران کی عزت افزائی کی جاتی ہے، اس لیے شاید آپ کو اس بات کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ کسی خاتون کا ایسے بلند مقام تک پہنچنا دوسرے ملکوں میں کتنا مشکل سمجھا جاتا ہے۔ مگر میں یہ سب کچھ صرف لکھنے والوں اور عورتوں کی طرف ہی سے نہیں بلکہ تمام امریکیوں کی طرف سے کہہ رہی ہوں اس لیے ہم سب اس خوشی میں شریک ہیں۔

میں سچ سچ "میں" ہی نہیں ہوں اگر میں، اپنی ذاتی حیثیت میں، چھٹی کے موسم کے بارے میں کچھ نہ کہوں، اتنے برسوں سے جن کی زندگی میری بھی زندگی رہی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی زندگی کو ہمیشہ میری زندگی کا حصہ ہونا چاہیے۔ میرے اور میرے رضائی ملک چین کے ادباء کی مثنویوں میں ایک ہی جیسے ہیں، "سادگی کو محبت میں بھی ایک جیسے۔ مجھے ہمیشہ سے زیادہ "ننگے" کی بات سچ معلوم ہوتی ہے، جب

پونا ملک چھٹی اس دور کی سب سے بڑی جدوجہد، یعنی آزادی کی جدوجہد میں معروف نظر آتا ہے۔ میں نے چھٹی کو بھی اس طرح پسند نہیں کیا جتنا کہ آج کرتی ہوں جب میں اس کو ان تمام قوتوں کے خلاف مسدود سمجھتی ہوں جو اس کی آزادی کے دھپے ہوں۔ اس جدوجہد آزادی کا اتوار ہونے کے باعث، جو اس ملک کی نصرت میں رہتی ہے، مجھے یقین ہے کہ یہ ملک ناقابل شکست ہے۔ انسانیت کے لیے آزادی اس کو جتنی آج عزیز ہے، پہلے کبھی نہیں رہی۔ امریکی سینیٹر ڈرامہ نگاروں، ابھی تک اس نعمت سے ہر مال ہیں۔ میرا ملک کم سے کم ضرور ہے مگر آپ سے ملاقات کے بارے آپ لوگوں کی جن کی قدرتی قدیم بھی ہے اور آزادی، تہذیب و دل سے خوش آمدید کہتا ہے۔

خطبہ

چینی ماول

جب میں یہ سوچ رہی تھی کہ آج مجھے کس موضوع پر بات کرنی چاہیے تو ایسا لگا کہ گر میں نے چھٹی کے بارے بات نہ کی تو بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ پیدائش اور مسدود تہذیب کے ناطے سے امریکہ ہونے کی وجہ سے میں آج کل وہیں رہ بھی رہی ہوں اور شاید وہیں رہوں گی بھی اس لیے کہ میرا بنیادی تعلق وہیں سے ہے۔ مگر وہ امریکا کے نہیں بلکہ چینی زبان کے ماول تھے جنہوں نے مجھے اور میری تحریر کی کوششوں کو یہ دیکھنا کیا ہے۔ کہانیوں کے بارے میں میرا سب سے پہلا سناہٹ، یا جوں کہیں کہہ سکتے ہیں، شہر مجھے تھکن سے مل رہا ہے۔ میرے نزدیک یہ ناشکری کی بات ہوگی، گر میں اس کا مکمل احترام نہ کروں۔ اس کے باوجود میرے نزدیک آپ لوگوں کے سامنے چینی ماویں کی بات کرنا، کچھ ذاتی وجوہات، باپ، استاد کی ہوگی۔ وہ مسلسل ایک اور بھی وجہ ہے جس کی بنا پر مجھے اس موضوع پر دو قصیدہ بات کرنی چاہیے۔ اور وہ یہ ہے کہ میرے نزدیک چینی ماول مغرب کے ادلوں اور ماول نگاروں کے لیے روشنی کی کرن کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جب میں چینی ماول کہتی ہوں تو اس سے مراد چھٹی کے مقامی ماویں ہوتے ہیں، وہ غیر ملکی اثرات سے پہلے چینی معیاریں کے رکھے دو غلبہ میں نہیں جن کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گو یہ ان کو اپنے ملک کے ادبی خزانوں کا حق ہی نہیں۔

چھٹی میں ماول سمجھنا کبھی فن رہا نہ سمجھا گیا، نہ کسی چینی ماول نگار نے خود کو کبھی فن کار سمجھا۔ چینی ماویں، اس کی تاریخ، اس کے منبع کے لیے جینیوں کی زندگیوں میں ماول کے مقام کو اس ایک کی حقیقت کی

مذہبی میں دیکھا جا چاہیے۔ اس میں کوئی خیر نہیں کہ آپ لوگوں کے لیے، جو مانوں کو سنے سمیت دیتے ہیں، جہنم میں مادل اور مادل نویسوں کے بارے میں ایسا خیال ہی حیرت انگیز ہوگا۔

جہنم میں فن اور مادل وڈ الگ الگ چیزیں سمجھے جاتے رہے ہیں۔ وہاں ادب ایک فن کی حیثیت میں ادیبوں کی انفرادی جائیداد سمجھا جاتا تھا، وہ فن جو سب ادیب اپنے اپنے انفرادی اصولوں کے تحت ایک دوسرے کے لیے تخلیق کرتے تھے، جس میں مادل کے لیے کوئی جھڑپ نہیں ہوتی تھی۔ مگر ایسے مارے چینی ادیب خود بخود مقام کے حامل ہوتے تھے۔ چونکہ عرف و نام نہ پہنچا جاتے تھے اس لیے خود ساختہ مدافعی اصولوں کے تحت علم حاصل کرنے کے مارے ذرائع انھیں کے قبضے میں ہوتے تھے اور اسی معاشرے میں اعلیٰ حیثیت کے حامل ہوتے تھے۔ وہ اتنے طاقتور ہوتے تھے کہ شہنشاہ وقت بھی ان سے خوف کھاتے تھے۔ اسی وجہ سے انہیں کو انھی کے علم کے قیدی بنائے رکھنے کی خاطر تحکیموں نے کچھ ایسے استعمالات تیار کیے تھے جن میں کامیابی کے بغیر کسی کو بھی سیاست میں کوئی مقام نہیں مل سکتا تھا، ایسے استعمالات کہ انسان کی تقریباً پوری زندگی ان کی چوڑی میں غروب و ولادت ہوتی ماضی کیا دیکھنے میں نقل کرنے میں حال اور ماضی کی، چھائیوں اور ماضی کے مطالعے میں صرف ہو جاتا کرتی تھی۔ ادیبوں کو اپنے ماضی میں فن کے اصول تو مل جاتے تھے مگر اس میں مادل کا، جو نہیں ہوتا تھا۔ یہی کبھی انھوں نے اس کو تخلیق ہوتے دیکھا اس لیے کہ مادل تو عام آدمی تخلیق کرتے تھے اور جو کچھ یہ جتنے بھرتے آئی کر رہے ہوتے تھے اس میں ان لوگوں کو کوئی دل چاہی نہیں ہوتی جو ادب کو فن سمجھتے تھے۔ اگر ادیب عام آدمی کا قائل تو بن جاتے تھے تو عام آدمی بھی دیہات پر بستے تھے۔ انھوں نے ادیبوں کے بارے میں بہت سے لطیفے سنا رکھے تھے جن میں سے ایک نمونہ یہ کہلات ہے کہ ”ایک دن وحشی جانوروں کا ایک گروہ ایک پہاڑی کے فاس میں شکار کے لیے نکلا ہوا۔ سب نے کافی جھٹ کے بعد یہ طے کیا کہ سب الگ الگ شکار کو تلاش جائیں گے اور شام کا کھنہ ہو کر جو کچھ بھی شکار کیا ہو آپس میں برابر تقسیم کر لیں گے۔ دن بھر کے بعد صرف چیتا قافلہ ہاتھ لایا۔ جب اس سے خانہ کھانے کی بات چلی گئی تو اس نے منہ بنا کر جواب دیا، صبح کے وقت مجھے سکول کا ایک لڑکا ملا۔ مگر میرے من دیک وہ آپ لوگوں کے لیے بہت چھوٹا سی سو میں نے چھوڑ دیا۔ وہ پھر تک سوائے ایک پردی کے کچھ بھی نہیں ملا۔ مگر میں نے اس کو اس لیے لیا کہ میں جانتا تھا وہ اندر سے کھوکھلا تھا۔ دن گزرنے کے ساتھ میں پریشان ہونے لگا تھا مگر کچھ بھی نہیں ملا۔ پھر جب شام ہو چلی تو مجھے ایک ادیب نظر آیا۔ مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ اس کو شکار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں اس لیے کہ وہ کھا خٹک اور سخت ہوگا کہ اگر ہم اس کو کھانے کی کوشش کریں گے تو ہمارے دانت ٹوٹ جائیں گے۔“

چینی لوگوں کے لیے ادیب ہمیشہ سے مدافعی کا موضوع رہا ہے۔ ان کو وہ صرف اپنے مادلوں میں ہی ملتا ہے، ہمیشہ ایک جیسا، بالکل ویسا ہی جیسا کہ اپنی زندگی میں نظر آتا ہے، چوں کہ ان کی چاروں زندگی فرسودہ کلاسیک کے طویل مطالعے میں ضائع ہو جاتی ہے، ہمارے چینی ادیب ایک ہی جیسا سوچتے ہیں، ایک

ہی جیسے نظر آتے ہیں۔ مغرب میں ان کے جیسا کوئی سروہ، جماعت و طبقہ نہیں ملتا، مثلاً کوئی ایک فرد ہو تو ہو۔ مگر چین کا ادیب اپنی مثال آپ، چھوٹا، سٹکرا ہوا جسم، آگے کو نکلا ہوا، قہار ہو، جیسا منہ اور پر کو اٹھائی ہوئی نوکیں ماک، ٹیک کے پیچھے چھوٹی چھوٹی ڈھلسی ہوئی آنکھیں، جیہ مصنوعی اور ہمیشہ پیسے مسووں کا امدان آتے ہو جو اس کے علاوہ کسی کے مطلب کے نہیں، بے حد احسن خیرو نی کا مظہر، صرف عام آدمی کے لیے نہیں بلکہ تمام ادیبوں کے لیے تحقیر پرور، بھی بدتر عہد میں پیدا ہو جسم، چھٹا تو مکھ پیرائی ہوئی چال، سوائے ادبی اجتماعات کے کس بھی غرض آئے، ال، اس لیے کہ اس کا یہ وہ تو وقت فرسودہ دب کے مطالعے میں اور اس قسم کی تخلیق کرنے کی مصروفیت میں گزر چکا، ہمیشہ ہر کسی تحریر سے نفرت کرنے والے جس میں تاؤ کی بدولت ہو، یا پھر ایسی کوئی خاصیت جس کو وہ کسی سے زمرے یا قاعدے میں نہ ڈال سکے جس سے وہ خود واقف ہو۔ اگر کوئی دب کسی تخلیق کے بارے میں یہ کہے کہ "اس کو فن کہتے ہیں" تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ ایسا فن ہے جس میں کوئی شائبہ تک نہ ہو گا۔ اور اگر وہ ادب کو اس زمرے میں نہ ڈال سکے جسے ادب کہتے ہیں تو اس کے نزدیک اول نام کی کوئی چیز وجود ہی نہیں رکھتی۔

Yao Hai نے، جس کا چینی ادب کے سب سے بڑے تخلیق نگاروں میں شمار ہوتا ہے، 1776 عیسوی میں اس قسم کی تحریروں کو سنایا ہے جن کو ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان میں مضامین، سرکاری مضامین، سوانح حیات، سب سے بڑا ٹیک، شاعری، نوے "نوٹ اور غلطیوں" جن کو ہم آپ اول سمجھتے ہیں وہ ان میں شامل نہیں، حالانکہ اس دور تک، عام چینیوں میں، صدیوں کے ارتقاء کے بعد، چینی اول انتہائی بلند یوں کو چھو رہا تھا۔ حتیٰ کہ چینی ادب کے اس تذکرے یا ٹایف میں بھی اول کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے جو چین کے شہنشاہ Chien lung کے حکم پر Ssu Ku Chuen Shu کے ہاتھوں 1772 عیسوی میں مرتب ہوا تھا۔

مثلاً یہ اول کی خوش قسمتی کی تھی کہ چینی محققین کے نزدیک اس کو دب کا حصہ شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ اس طرح لکھتے داتے بھی در کتابوں دلوں فن کے ان محققین کی مجتہد سے بچ رہے جو اپنے ہم کا مدد اور اس بات پر صرف کر دیتے تھے "کیا فن ہے اور کیا فن نہیں ہے" گو دلوں ایک چارہ سوں ہندو عسروں کے عرصے میں بھی، کبھی نہ تبدیل ہونے والی جیسی کوئی شے ہے۔ چینی اول ان سب عجیبوں سے بالکل آزاد رہا۔ اس کو جی مٹی، یعنی عام آدمی، سے پھونکنے اور اس میں پھونکنے پھونکنے کی پوری آزادی تھی، سورت کی دل لہجائے دان روشنی کا پار پوس، عام لوگوں کا من بھی دلوں کے محققین کی سرور اور نہ کسی ہوؤں کی نزد سے محفوظ۔ امریکی شاعر و ادبی دانشور نے لکھا تھا، "فہرست ایک" سب زندہ مکان ہے، مگر فن ایسا مکان ہے جو "سب زندہ ہونا چاہتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ "فہرست"۔

وہی کچھ جو نظر آتا ہے ہم کو

وہی فہرست، جسے ہم جانتے ہیں

پیارا کسا مگر آتا نہیں ہے۔

ساری عقل ہے بے مہر کئی

نثر بیوں بہت ہے

چینی محققین ناول کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے سوائے اس کے کہ یہ جان بوجھ کر نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔ ہر قسم کی کبھی کبھی ان ناول کے بارے میں "گاہی کی ضرورت بھی پڑ جاتی تھی اس لیے کہ نئے لوگ شہنشاہوں کو ناول پڑھنے میں لطف ۱۲۶ تھا۔ کسی صورت حال میں بے چارے مجبور ہو جاتے تھے۔ مگر انھوں نے ایک فقرہ "ساقی اہمیت" کا ہیروفت کر لیا تھا اور صرف یہ ثابت کرنے کے لیے بے بے مقاصد لکھ ڈالے کہ یہ ناول دراصل ناول نہیں بلکہ ساقی اہمیت کی دستاویز ہوتے ہیں۔ "ساقی اہمیت" جدید امریکی ادب مرحلوں اور محو قوں کی ایک نو دریافت شدہ اصطلاح ہے، وہب کہ چین کے پورے محقق اس کو کئی ہزار برس سے ک وقت سے جانتے تھے جب انھوں نے یہ مطالب کیا تھا کہ ناول کو وہب کا حصہ بنانا ہے تو اس کے لیے ساقی اہمیت کا ہونا ضروری ہوگا۔

نثر ناول کو ادب کے ذریعے سے باہر رکھنے کے لیے قدیم چینی محققین کچھ اسی طرح کی تاہلیں

چلیں کرتے رہے:

ادب لکھ ہوتا ہے

ہر ساقی اہمیت رکھتے ہیں

اس کتاب (ناول) کی کوئی ساقی اہمیت نہیں

اس لیے یہ ادب نہیں

لہذا چین میں ناول ادب کا حصہ نہیں تھا۔

ایسے دلہان میں میر ذہن پرانا چڑھا تھا اور میں چین سے ہمیشہ کی جھجکی رہی تھی کہ ناول کا خاص ادب سے کوئی علاقہ نہیں۔ مجھے یہی قہیم ہی تھی کہ ناول ادب وہ ہوتا ہے جس کی تخلیق صاحبان علم کرتے ہیں۔ ساقی کا ذہن وہ ہونا چاہیے جو بے ہوش ہوئے جو ہر قائل کو تباہ کرنے کے لیے اصول وضع کرتا ہے اس خود کو خود اسے کو جو حیات کا عیش ترین مچ ہوتا ہے۔ جو ہر قائل، بڑا ہو یا چھوٹا، ایک جھٹکے کے منہ ہوتا جب کہ ناول، جدید ہو کر خاص بکری، وہ تراش بنا کر ہوتا ہے جس میں زہر دہی (جوہر قائل کے) پانی کو داخل کیا جاتا چاہیے، اگر عالم فاضل حضرات کی خدمت مقصود ہو۔ مگر چین کے لوگوں نے یہ خدمت ضروری نہیں سمجھی۔ کہانی کے جوہر قائل کا پانی بہر حال قدرتی چٹانوں کے فضیل نکلتا رہا۔ جس سے عام "وقی فیض" بڑبڑھتا رہا اور سکون حاصل کرتا رہا۔

ناول چین کے مرام کی بہترین تخلیق تھا، اور بد شہرت غیرے ن کا ۱۲۷ تھی۔ ناول میں استعمال

ہونے والی زبان ن کی اپنی روزمرہ کی زبان تھی، یعنی Wen-II نہیں جو ادب اور محققین کی زبان تھی۔

عوامی زبان کے مقابل Wen-I کی کچھ اسی طرح کی صورت تھی جیسی کہ سو جودہ انگریزی کے مقابلے میں

چاؤسری نکلیں انگریزی کو، اگرچہ ایک زمانے تک Wen-li خود بھی حوام کی زبان کی تھی۔ مگر ویوں نے حسب دستور بدلتی ہوئی زندگی کی زبان سے رشتہ بیکار نہیں رکھے بلکہ Wen-li کی پہلی ہیئت سے بد کسی تہہ پٹی کے اس وقت تک چسپے رہے جب تک کہ بودھ مت کی زبان Wen-li پہلی ہوتے ہوئے نکلیں کی صورت اختیار نہ کر گئی اور حوام کی زبان رفتہ رفتہ تبدیل ہوتے ہوئے اس سے دور ہوتی چلی گئی۔ لہذا چینی اولی اب Pai Hua یا حوام کی مادری میں تھے جہاں چین اور سکی بات تک چڑھے اور وہیں کما و دار ہوئی اس لیے کہ تہہ ملیوں کے سبب زبان کا انداز ایسا آسان اور سواں ہو گیا کہ ادیبوں کے مطابق، اس میں ٹھیکاری ٹھیکار کا کوئی حصہ باقی نہیں رہ گیا۔

اس مقام پر، ایک لمحے کے توقف کے ساتھ میں ان دیوں کے سبب کا ذکر کرنا چاہوں گی جو ہندوستان سے چین آئے اور اپنے ساتھ نئے مذہب بودھ مت کا تھل لائے۔ ایک عربی کے مطابق میں نے عربی پست ماوی کی زمین کی مگر مشرق میں بودھ مذہب کے پیرو شاہی زیور و شمشاد مند تھے۔ جب وہ لوگ چین میں داخل ہوئے تو انھیں نے اب کو حوام سے دور و راس رہا پرتی کے بودھ کے سستا پایا جو اس دور کی دین تھے جس کو چین کی تاریخ میں Six Dynasties کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کے پیشہ ور ادیب اس وقت بھی، بجائے اس کے کہ ان کو کیا کہنا چاہیے تھے، مصرعوں کی ساخت مضامین کے کرداروں، اور نظموں کے آہنگ میں، انھیں رہے اور یہ اس تہذیب کی حقیقت کرتے جو ان کے اہل کے مرتبہ اصولوں سے بخیر ترقی تھی۔ ایسے محدود ادبی پس منظر کے، جس میں بودھ مت کے پیرو مترجمین اپنی آواز خیاں کے پیش یہ شرفوں کے ساتھ چین میں وارد ہوئے۔ ان میں سے کچھ ہندوستان میں رہے مگر کچھ چینی بھی تھے۔ انھیں نے صاف صاف گوئی سے بکارات کا مقصد صرف دیوں کے کسی انداز کی پابندی ہی نہیں تھی بلکہ وہ لوگوں کو بکارات اور صاف زبان میں یہ بتانا تھا کہ وہ کس بات کی تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی مذہبی تعلیمات کو حوام کی اس زبان میں، جس میں دیوں تھے چاہے تھے اور جس کو عام پسند کرتے تھے، کہنے کا سہارا لے کر تبلیغ شروع کی۔ بودھ مت کی زبانوں میں سے ایک ام کتاب Fah Shu Ching کا مقدمہ کہتا ہے کہ ”جب بھی خدا کا پیغام دیا جائے، پیغام کو سادگی سے دیا جانا چاہیے۔“ اس کو چین کے وہ ماولی نوں واحد مذہبی قسم کا دیکھ دیں گے جن کے لیے دیکھا آدلی تھے اور آدلی دینا تھے۔

چینیوں کے ماویں ہیروئی طور پر لوگوں کی تفریح کے لیے تھے جاتے تھے۔ جب میں تفریح کی بات کرتی ہوں تو اس کا مطلب صرف ہنسنا ہنسا نہیں ہوتا، اگرچہ چینی ماویوں کے مقام میں سے ایک مقدمہ لوگوں کو ہنسا بھی ہوتا تھا۔ تفریح سے میرا مطلب ذہن کو پہلی طرح کسی جانب متوجہ کرنا تھا۔ یعنی حوام کی طرح کو زیر دلی نہیں، بلکہ ہر لمحہ کے لوگوں کو، کہنے کے ذریعے کسی طرف مایب کرنا اور اس طرح سیدھے سادے طریقے سے اپنے بات کو پیش کرنا تھا۔ خود بودھ مت کے پیرو لوگوں کو بھی، جو اپنے پیرووں کے بارے میں لوگوں کو بتانے آئے تھے، چاہیہ کہ لوگ محبوبوں کی اسی وقت بہر طور پر سمجھ سکیں گے جب وہ

ان کو اپنے ساتھ عام انسانوں کی طرح کام کاج کرتے دیکھ سکیں۔

چینی ماہیوں کے راز مرہ کی زبان میں سمجھے جانے کی سہولت یہ تھی کہ عام لوگ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ اسی لیے یہ ضروری تھا کہ ماہیوں کو اس طرح لکھا جائے کہ ان کو پسند آواز میں پڑھا جائے تاکہ لوگ جو نہایت ہی ایک دوسرے سے ربط کرتے تھے، ان کو سمجھ سکیں۔ (اس دور میں تعلیم کا یہ عالم تھا کہ) وہ سو کی آواز دے گا تو اس میں صرف ایک آواز پڑھنے کے قابل ہوتا تھا۔ رقص کے دنوں میں میل شام کے وقت جب سب اپنے اپنے کام سے فارغ ہو جاتے تھے، ایک شخص، اپنی بواؤں میں مقبوض بہت سادگی کہانوں میں سے کچھ پڑھا کر پڑھتا تھا۔ گویا، کچھ اسی طرح سے چینی ماہیوں کی بات ہوئی۔ (کہانی سنانے کے بعد) لوگ کسی ایک کی نوپا میں چند جمع کرتے تاکہ پڑھنے والے کے خشک گلے بتر کرنے کے لیے چائے وغیرہ کا استہام ہو سکے، یا اس داستان کو کوئی کام کا کام دہرا دیا جائے جتنا کہ وہ اتنے ہی وقت میں، اپنی ریشم کی کھڈی پر کام کر کے کر سکتا تھا۔ (کہانی سنانے والے کی مقبوضت کی چیز سے) نیا دودھ جمع ہونے لگتا تو وہ اپنے معاشی کاروبار کو سمجھتا، یا ایک پیشہ ور کہانی سنانے والا بن جاتا۔ (اس دور میں) اتنی زیادہ کہانیاں نہیں لکھی جاتی تھیں کہ ایک سال تک لوگوں کو سنانے کے لیے کافی ہوتیں اس لیے کہ چینی فطرت، روایتی کہانیوں سننے کے بہت شوقین ہوتے تھے۔ تو کہانی سنانے والے مارنے کے پسندیدہ روایتی سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کہانیاں جمع کرتے، موسم سے میل ملاپ کی چیز سے ذریعہ ہونے والے ذہن کے استعمال سے سنانے والے کہانی کے مرہ کہانوں کو سننے کو شہرت و پست کے چارے پہنا کر ان کو پھر سے زندہ کرتے، ماضی کے مہاباد شدہ صوبوں کے قصبہ ان میں ہونے والی مراثیں، گاؤں گاؤں کو حوم کر طرح طرح کے واقعات کے ملاپ سے اپنی کہانیوں کو سننے دیتے۔ لوگ بھی ان کو اپنے اپنے تجربات لکھ کر دیتے جن کو وہ دوسروں کو سنانے والی کہانیوں میں استعمال کرتے۔ کہانی سنانے والے اپنی کہانیوں کی خدمات بڑھانے کے لیے خودی میں اضافے بھی کرتے تھے مگر ادبی نزاکتوں پر پسند آجنگ جھوں سے نہیں اس لیے کہ سننے والوں کو ان میں کوئی دل چاہی نہیں ہوتی تھی۔ ان کو اپنے سننے والوں کا ہمیشہ خیال رہتا ان کے تجربے کے مطابق، سننے والوں کو وہی انداز پسند آتا تھا جس میں سادہ ہو، سادگی ہو، چھوٹے چھوٹے حصے ہوں، جن میں حوام غریب لگتے تھے، سونے ٹھونڈے بہت نگاروں کے جس سے کہانی کے واقعات اور گراں زیادہ واضح ہو جاتے۔ پھر ملے کہ کہانی کی روایت میں غیر ضروری تاثیر نہ ہو۔ کہانی میں ہرگز تاثیر نہیں ہونی چاہیے اس لیے کہ واقعات ہی اصل مقصود ہوتے تھے۔

اور جب میں واقعات کا لفظ استعمال کرتی ہوں تو اس سے مراد ہے مقصد حرکت پر ہے۔ یہ سب کچھ عمل ہی نہیں ہوتے۔ ان معادلات میں حقیقت بہت چھڑ زین والے ہوتے ہیں۔ یہ ہمیشہ کہانی کے کرداروں کو ہر شے سے بلند دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مادل Shui Hu Chuan چینی زبان کے متن عظیم ماہیوں میں سے ایک ہے، صرف اس لیے نہیں کہ یہ واقعات کی چٹا چوڑا درجہ چوڑائی سے پُر ہے،

بلکہ اس لیے کہ اس میں ایک سو آٹھ کروڑ اتنی منفی سے پیش کیے گئے ہیں کہ ایک دوسرے سے بالکل الگ دھماقے دیتے ہیں۔ اس ناول کے بارے میں لوگوں کو کہتے سنا گیا ہے کہ ”جب اس کے ایک سو آٹھ کروڑوں میں سے کوئی ایک بھی بولنا شروع کرتا ہے تو اس کا نام ملنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اتفاقاً اس کے منہ سے اس انداز سے نکلے ہیں کہ ہمیں فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کون ہے۔“ ابتدا ناولوں میں سناؤں کی شگاف اور عمل بیکر سرائی وہ پیدا معیار ہے پہلی عوام جس کی توقع کرتے ہیں وہ اس کے بعد یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مصنف کی تشریح کے بجائے کردار خود اپنے عمل سے اپنے بیکر کو پیش کریں۔

تیسری بات ہے کہ جب معمولی چائے خانوں، دہانوں، اور شہر کی گلیوں میں غیر تعلیم یافتہ عوام کے منہ سے نکلے ہوئے قصوں کہانیوں سے ناول کی ابتدا ہو رہی تھی، شاہی گلیوں میں بھی اسی طرحی اداؤں کا جنم لیا تھا۔ مگر چین کے شہنشاہوں کا طریقہ یہی نہ تھا کہ بالخصوص اگر شاہی خاندان میں ملکی بیٹا، بیٹو لوگوں کی جنمیں ”گوپ شاہی“ کہا جاتا تھا، دوزخ دھماکا تھا۔ ان کا یہ کام ہونا تھا کہ وہ عام پتروں میں بیوی، شہر کی گلیوں، چائے خانوں میں جائیں اور میں کہ دوں میں کس قسم کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہونا تھا کہ شہنشاہ کی بھانجی میں پھیلتے والی کسی بھی طرح کی بوسہ، بالخصوص ایسی بوسہ جو کسی بھارت کا پیش خیمہ ہو سکتی ہو، کان آ رہی ہو، محل تک، اظہار پہنچیں۔ مگر شہنشاہ عالم فاضل نہیں، عام انسان ہوا کرتے تھے، وہ حقیقت، نادرہ تر تجربے ہوئے اور عمدہ کی قسم کے۔ ”گوپ شاہی“ کو طرح طرح کی اور غیر مالوں باتیں سننے کے مواقع ملنے تھے اور ان کا تجربہ یہ تھا کہ شہنشاہ کو یہ سب میں کم اور ان ہی جیسی دوسروں میں زیادہ مل چکی ہوتی تھی۔ لہذا جب وہ اپنی اطلاعات کے ساتھ محلوں میں داخل آتے تو چاہیوں میں وہی کچھ سناتے جو چھوٹے ”شہر ممنوعہ“ Forbidden City میں محصور شہنشاہ عالی سننا پسند کرتے۔ تو یہ عجیب و غریب شاہ و آزاد عوام کی دنیا میں ہونے والی وہ چپ اور حیرت انگیز باتیں اور واقعات سناتے۔ پھر ان لوگوں نے ان سب باتوں کو اس لیے کھتا شروع کر دیا کہ ان کو محفوظ کیا جاسکے۔ مجھے اس بارے میں بالکل شبہ نہیں کہ یہ لوگ کہیں اور ہونے والے واقعات کو صرف ایک ہی سست، تحقیق کو اس سے شاہ کی طرف نہیں لے جاتے رہے ہوں گے، بلکہ یہ محلوں میں ہونے والے واقعات کہ شاہ نے کیا کیا کیا، پٹی منہ سے جس نے اولاد فریاد نہیں جانی کس طرح جھگڑا کیا، منہ نے کس طرح شیخ کے دروغ سے سرائی کے ذریعے شاہ کی محبوب کنیز کو زہر دلا دیا وغیرہ کو بھی عوام میں پھیلاتے ہوں گے، جو ابھی جن کو دل چھٹی سے سننے اور محفوظ ہوتے رہے ہوں گے اس لیے کہ ان کا شہنشاہ بھی ”Son of Heaven“ کے باوجود ان کے جیسے ایک عام جمہور کی انسان کی طرح مسائل میں گھرا ہوا ہوتا ہے۔ لہذا، اسی طرح ناول کے لیے، نئے انداز اور نئی قوتوں سے نچر پڑا، ایک اور راستہ پیدا ہوا، اگرچہ ثقہ دھب حضرات ناول کے وجود کو کوئی حق دینے کے لیے تیار نہ تھے۔

اس قسم کے حقیر، سادے اور کھربے کھربے انداز میں چینی ناول کی ابتدا ہوئی جو ہمیشہ عوامی ہوئی

میں لکھا جاتا رہا، ان سب باتوں سمیت ہوام جن میں دل چسپی رکھتے تھے یعنی روایت اور دیوہال، گھنٹوں اور سڑکوں، پتھر کے ٹریوں، دوران تمام باتوں سمیت ہوجوام کی زندگی میں اتار چڑھاؤ کا سبب بنتے۔

چین میں مائول اس طرح سے غلامی ستوار نہیں کیا جس طرح چند مذہب ادیبوں کے ہاتھوں مغرب میں ہوا۔ جس میں کہنے والے کے مقابلے میں مائول کی اہمیت زیادہ رہی ہے۔ مائول کا کوئی گھنٹہ نہیں ہوا نہ کوئی چھٹی ٹینڈ گھنٹہ، 'محبوب'، 'کوئی'، 'حسن'، 'نہ کوئی' اور 'نہ کوئی'، 'گھنٹہ' کے لئے کوئی 'نہ کوئی' نہیں تھا، 'بارائی' نہ تھا، 'گھنٹہ' یا 'نہ کوئی' وغیرہ۔ مگر چین میں بھی اتنے ہی تقسیم ہوں کسے کہتے ہیں جتنے گروہوں کے دھڑے ملکیں ہیں، مگر پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ وہ دونوں لوگ تھے جنہوں نے چین میں ایسے تقسیم ہوں کو جوڑ دیا ہے۔

چین کے جدید ادیب اب کوئی صدیوں بعد، یہی کچھ معبود سما چاہ رہے ہیں۔ مغرب کی جامعیت میں تربیت پانے والے، اپنی تشبیہ نگاریوں نے اپنے ملک کے نظر انداز کیے ہوئے اپنی خزانے کی دریافت شروع کر دی ہے۔ مگر کس نے یہ مائول کہے ہیں، اس کی دریافت ممکن نہیں۔ کیا مائول Shui Hu Chuan کسی ایک آدمی نے لکھا تھا یا وہ اپنی موجودہ صورت میں احادیث اور سر نو مزید سبب اور بہت سے دعووں کی مشرقی کوششوں سے تشکیل پا گیا تھا، کیا مختلف ممالک کے ادیبوں کے تعاون نے اس کو گہرائی عطا کی، وہاں کو اپنے موجودہ مقام تک بند کیا ہے؟ اب بھلا مائول یہ سب بتانے گا، اس لیے کہ وہ سب تو مرکب کئے ہیں۔ لکھنے والوں نے اپنے عرصہ حیات میں جو کچھ دیکھا، جو کچھ سنا وہ لکھ لیا، مگر اپنے مارے میں کچھ سرائے نہیں چھوڑا۔ مائول Dream of the Red Chamber کے مصنف نے کئی صدیوں بعد اپنی ایک کتاب کے مقدمے میں کہا تھا، "ہم کو Han اور Tang کے دور کے محکم کا ادراک ضروری نہیں، ہمیں تو اپنے عصر کے بارے میں بات کرنی چاہیے۔"

انہوں نے اپنے دور کی بات کی اور ایک خوش آمد گم مائی میں رہے۔ انہوں نے اپنے اولین پوتہ کوئی تھوڑے پڑھانے اس بات کے تذکرے کہ جو کچھ لکھا گیا تھا وہیوں کے معیار کے مطابق چھاننا نہیں۔ ان کو نہ یہ غمازش تھی کہ وہ بلند کرنے والی ہلکی ہواؤں میں اڑیں جن میں ہر ادیب سانس لینا چاہتا ہے نہ ان کو اس بات کی کوئی پروا تھی کہ کسی اعلیٰ مقام کو حاصل کرنے کے لیے کس قسم کے تحریک چٹائی جائے جس سے ادیب کا رتبہ بلند ہوتا ہے۔ انہوں نے وہی کچھ لکھا جس کی ان میں عمدہ حیرت تھی اور جس کو وہ پسند کرتے تھے۔ مائول نے غور پر کبھی چھاننا اور کبھی نادانستہ طور پر ہی چھاننا کھ گئے۔ ان کی موت بھی اسی خوش آمد گم مائی میں ہوئی اور اب وہ کسی میں سمٹے ہوئے ہیں۔ چین کے ادیب، ذہن اور دست آہ کے صدیق، ان تلمیذوں کو اعزاز کے ساتھ، مائول کے چند حلقوں سے نکالنا چاہتے ہیں مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ یہ لوگ تو اب ان منزلوں سے بھی گزر چکے ہیں جن کا بعد اموات افسانہ کیا جا سکے۔ مگر جو کچھ وہ کر گئے ہیں وہ واقعی ہے اس لیے کہ چین کے غیر تعلیم یافتہ ہوام، جنہوں نے ایک سال سے دھڑکی سنل تک، سیز بہ بہر، مائول کے مائول کو پہنچا ہے، وہی ان مذہب مائول کو نذر رکھے ہوئے ہیں۔

ماول Shu Hu Chuan کی بعد کی شاعریوں میں مثال مقدموں میں ایک مصنف نے جس نے اس ماول کی تحسین میں حصہ لیا تھا، لکھا ہے کہ اس میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ بھی میں کہیں لوگ اس کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ پڑھنے والا اچھا ہلا بڑا عام ہو جائے اور شخص اس کتاب کو پڑھ سکے۔ کتاب اچھی طرح لکھی گئی ہے، یا نہیں، کسی کی بحث پر اس سے کہہ دیا اثر پڑے گا۔ فیسوی کہ میں مرنے کے لیے چاہتا ہوں۔ مجھے کیسے پتا چلے گا کہ میرے بعد آنے والے جو میری کتاب پڑھیں گے اس کے بارے میں کیا مانے قائم کریں گے۔ مجھے خدشہ نہیں کہ میں بھی اپنے دوسرے جنم میں، اس کے بارے میں کیا مانے قائم کروں گا۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میں اس کو پڑھ بھی سکوں گا یا نہیں؟ تو پھر میں یہیں پریشان ہوں؟

حیرت نیا بات ہے کہ بہت سے ایسے لکھتے رہے بھی تھے جو ہم مائی کی "زنی پر رنگ کرتے تھے جن کے اپنے ذاتی دھبے بھی تھے جن کے بیان کی ان میں بہت ذہنی، انہوں نے اپنی فن کی تخلیقی سرگرمیوں کی نشان سے فرار کی خاطر ماول بھی لکھے مگر فریبی اور معمولی عام سے۔ اور جب انہوں نے ماول لکھے تو اپنی عیسیت کے مظاہرے کا ایک طرف رکھ کر مائی طرح لکھا جس میں اور مائی سے کوئی عام ماول نہیں لکھتا۔ ماول نگار کا خیال تھا کہ اس کی بارش کی طرح ہر کسی کو لکھنا ہے اور چاہے اس کی عمر دور کہانی کی غلبہ کے مطابق لکھنا چاہیے۔ اور اگر کوئی ماول نگار کسی خاص انداز پر لکھنے کے لیے پھپھو جانے لگے تو وہ ماول نگار نہیں بلکہ ایک دیہاتی مسخ بن جائے گا۔

مجھے چین کے قیام کے دوران میں سکھایا گیا ہے کہ ہاتھی ماویں نگار کفطرت کے مطابق، غیر متعلق اور ناقابلِ حار ہونا چاہیے کہ جو کچھ اس کے فکر سے لگن مباح ہو اس پر اسے پورا عبور ہو۔ اس کا فرض، وقت، خط اور واقعات کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کے فطرتی نظام کی ترتیب میں پوشیدہ، آہنگ و روکر کی تائید کرنا ہونا چاہیے۔ صرف اس ماول کے چھوٹے کلمات کو پڑھ کر قاری کو یہ نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ماویں کس کا لکھا ہوا ہے، اس لیے جب کسی ماویں نگار کا ہمارا جامہ ہو جائے تو شاید انداز ہی اس کا انداز بن جاتا ہے۔ (شاید یہی وجہ ہے کہ) چینی ماویں نگاروں نے اپنی تحریروں کو اس طرح منقوش بنایا ہے جیسے کسی غنائی خمیں میں موتی کیل کا اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔

مغربی معاشرہ کے لحاظ سے چینی ماول بے حجب نہیں۔ ان میں شریک سے محرم تک اپنی منسوب ہندی نہیں ہوتی وہ بھی یہ انسانی زندگی سے زیادہ حسرت مرثیہ اور رستہ ہوتے ہیں۔ اکثر بہت طویل ہوتے ہیں، گرواؤں کے ژدہا اور وارڈوں سے پُر، مواد کے اعتبار سے حقیقت، لہجے اور طمان کے مغلوبہ کا امتزاج بنتے ہیں۔ ان میں ناقابلِ یقین خواب پر جاؤ جیسے واقعات بھی اس جزئیات سے بیان کیے جاتے ہیں کہ سننے والے کے پاس یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔ اس زمانے کے ماویں روایتی اعتقادات اور رسوم سے بھرے ہوئے ہیں اس لیے کہ اس دور کے لوگ روایتی انداز میں سوچتے بھی تھے اور خواب بھی دیکھتے تھے۔ جس نے یہ ماول نہ پڑھے ہوں وہ موجودہ چین کی سچی کہانیں سمجھ سکتا ہے یہ کہ یہ ماول اس

دور کے چینی اقبان پر بھی اثر انداز ہوئے ہیں۔ چینی ماہلوں میں آج بھی لوگ رحمت اور رحیم رہنے لگے ہوئے ہیں باوجود اس کے کہ تمام چینی سٹاٹ کار اور مغرب سے تہذیب یافتہ کئے ہوئے وائس ورس کے خلاف وائس ٹیل کرتے رہتے ہیں۔ چین کا بنیادی دماغ آج بھی وہی ہے جیسا کہ چارلس رسل نے ۲۰۰۰ء میں کے دورے میں (حضرت ائمہ زطور پر بالکل جینوں جیسا) لکھا ہے، ”وہ دماغ جو اپنے لوگ خیالات کے سبب کسی بھی چیز پر یقین کر سکتا ہے، ہونے چاندی کے بادبان اٹاٹا ہے، سمندر کے کنارے پھماتے شہر، پرستار ورنہ جاتے کیا کیا علی قسم کے تصورات رکھتا ہے، مگر جب اس کا لوگ دماغ سیاست کے طرف پھماتا ہے تو ہر شے پر یقین کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔“

بد شہر، پشتوں کے جھوم اور بیڑاڑوں بری کے تجربات سے بھرے پڑے اسی لوگ دماغ سے چینی ماہوں کا خیمہ رانٹا ہے، اور یہ ماہوں وقت کے ساتھ اپنی میت بدلتا رہا ہے۔ جیسا کہ میں نے چند ایسے قلمی ہے، اگر عظیم چینی ماہلوں کے ساتھ کوئی ایک نام مسمی نہیں ملتا تو اس کی جہ صرف میں سے کی ان کو کو ایک ہاتھ لے کر یہ نہیں کیا ہے۔ ایک چھوٹے سے قصبے سے شروع ہو کر مختلف شہروں سے گزرتے ہوئے، کئی ہاتھوں کی شوریس سے ان کو مارلی کا روپ عطا ہے۔ مثال کے طور پر *Pei She* یا *The White Snake* *Chuan* کوئی ہر *Tang* خاندان کے دور میں کسی معلوم مصنف نے تحریر کیا تھا۔ اس وقت یہ محض ایک مافوق الفطرت قصے کی طرح تھا جس کا ہیرو ایک پتھر کا سانپ تھا۔ اس کے دوسرے نسخے میں، جو کئی صدیوں میں ظاہر ہوا، اسی سانپ کی جہاں ایک سو فنی ٹوں آٹھ مورت نے سے کی تھی۔ ٹوں اس کا تیسرا سچا میاں وہ انسانیت سے پتھر کی صورت کا تھا جس میں ٹوں آٹھ مورت ایک دفا دار مورت بن چکی تھی جو اپنے شوہر کو ایک بیوا فریم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ اسی طرح کہانی نہ صرف نئے کردار داخل کرتی ہے بلکہ نئے معیار بھی مقرر کرتی جاتی ہے اور وہ کہانی جو صرف ایک مافوق الفطرت قصے سے شروع ہوئی تھی، اساتوں کے ماہوں کے طور پر ختم ہوتی ہے۔

لہذا چینی تاریخ کے ہندوئی دلوں کی بہت سی کتابوں کو اول تو نہیں، ہاں حوالے کی ایسی کتابیں کہ جہاں سکتا ہے جو، گریسیسیر کو میا ہوتی تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے ان میں موجود کنگسوں، نکال نکال کر ان کے جہازات بناتا ہوتا۔ اس کی بہت سے کتابیں ضائع بھی ہو چکی ہیں اس لیے کہ ان کی کوئی میت نہیں آج بھی کوئی تھی۔ مگر سب آج بھی ضائع نہیں ہو گیا تھا۔ *Han* کی بہت محنت سے لکھی، گھوڑوں جیسی کھیلیں بھرتی ہوئی، کہانیاں اب بھی موجود ہیں جن میں مشغلوں میں رتھا رشی خاندانوں کے قصے ملتے ہیں۔ گوید کچھ اب بھی تاریخ کے اوراق پر جمی ہوئی ہیں۔ *Ming* خاندان کے دور میں کئے گئے *Ping Kuan Shi Tai* نامی ایک مجموعے میں مذہبیت، توہم پرستی، کئی وردہ اور ان اٹھ کے ٹوں جزایا موز کے قصے، ڈرامے، مذہب و مؤلف دیکھاؤں اور مہینے، چیتے، جڑیاں، آواگون، مردوں کے زندہ ہونے وغیرہ کے قصے ملتے ہیں۔ بدھ مت کے مذہب ہونے نرات کے ساتھ قصے اور مافوق الفطرت واقعات شامل ہوتے گئے، مثلاً

کنواری لڑکیوں کے وطن سے دیوتاؤں کی پیدائش، لڑکی دیوتاؤں کی طرح چلتے پھرتے ہوئے وغیرہ ان میں سب سے بھی اور حقیقتیں بھی ہیں، غریب آدمیوں کے قلم کھس کر پھول بن جاتے ہیں، ایسے خواب جو آدمیوں کو دیوتاؤں کی حیرت انگیز سرزد میں نہ بچا دیتے ہیں، چالاقی چھڑیاں جن کے اشارے سے لوہے سے بنی زبان گاہیں ہلکے پردوں کی طرح نصائیں تیرنے لگتی ہیں۔ Han کے لکھے ہوئے قصے حد و حد سے قوی مسائل کے سمجھنے والے ہوتے تھے جو کسی ایک آدمی یا میر و سائے پر گھومتے تھے۔ اس سب سے دور میں طرح قصوں کا ایک ضروری عنصر ہوتا تھا، چلتا پھرتا، کتر دسبے کا، ثبوت نگیز، اسی قسم کا جیسا کہ Sao Ling کے قصوں کی کتاب میں ملتا ہے، Han Tang Swan شاید اس کا جمع کیا ہو، یا جڑی طور پر کسی کا لکھا ہوا ہے۔ سب سے دور کے ختم ہونے پر اگرچہ چوک متغیر رہا جاتا ہے مگر چینی اس کو کبھی بھلا نہیں گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی اس کی تحریروں کی بات آئے تھے تو ان کو ”بان کی لالہ“ کے بیار بھرے نام سے پکارتے ہیں۔ غیر اجم اور پامال صدیوں کے بعد (قصوں کے بیان کے انداز میں) وہ وہاں کی روٹی اور نہ وہ حکم رہ گیا جو پہلے تھا، کچھ شیریں اور کچھ بوٹی، اور موشیجات تم زور ہو گئے، چینیوں کے قلوب کے مطابق، سمجھنا ملاؤں کے دور میں غیر اجم باتیں بیان ہونے لگیں، عورتوں کے بارے میں، جہیزوں کے بارے میں، ریسے میں اکھا جانے کا۔“

اگر ہم Han Dynasty کے دور کو سنو آئیں گے تو Tang Dynasty کا دور وہ پیدا کھانے کا مستحق ہو گا، اس دور کے قصے کہانیاں بھی روایتی تھیں، ایسے روایتی قصے جن کے لیے یہ دور مشہور تھا۔ یہ مہر زمان پر مبنی کا تھا، جب Yang Kwei Fei جیسی حسینہ اور اس سے ذرا کم حسین و بلی، شہنشاہ کی پسندیدہ Fei Mei شہزادی کے بارے میں ہزاروں کہانیاں تھیں۔ Tang کے دور کی روایتی کہانیاں اپنے المان اور چچ تاریکی کے باعث کسی طرح بھی مغرب میں کیسے جانے والوں سے کم نہیں تھیں۔ ان میں حرکت، بحران اور انجام، صاف صاف نہیں تو اشارہ سب کچھ ہوتا تھا۔ چینیوں کے مطابق، ”ہمیں Tang کے زمانے کے مادل ضرور پہنچے چاہئیں اس لیے کہ اگرچہ ان میں واقعات معمولی ہوتے ہیں مگر اس خوبی سے لکھے گئے ہیں کہ پڑھنے والوں کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔“

یہ روایتی حیرت انگیز بات نہیں کہ ان کی بیشتر کہانیوں میں بیان ہونے والے زمان صرف شادی پر نہیں بلکہ ان کی گھٹیل رشتہ ازدواج سے دہر کے تعلقات پر منتج ہوتی ہیں۔ ماورا ہم بات یہ ہے کہ جب تک کہانی محبت کے بارے میں ہو تو ہمیشہ کسی لیے پر ختم ہوتی ہے۔ وہ بہت مشہور کہانیاں Pei Li Shao اور Chao Fang Chao ہیں جو مکمل طور پر مادلے ازدواج محبت کے بارے میں ہیں اور بظاہر، دیوانہ خواتین کی بدترکی دھانے کے لیے لکھی گئی تھیں، جو مغلیر تعمیر یافتہ ہو یوں کے مقابلے میں، جن کی کہانی آج بھی ”زرد چیر دھورت“ کے نام سے یاد کرتے ہیں، کچھ پڑھ سکتی تھیں، کچھ نہیں، ذرا کچھ اور خوب صورت بھی ہوتی تھیں۔

اس قسم کی کہانیاں لکھنے کا رجحان اور عوام میں ان کی مقبولیت کچھ تھی۔ مروجہ تھی کہ رنڈہ شاہی مقدر ہونے لگی تھی اور لکھنے والوں کو خطرہ تھا کہ کیا جائے لگا تھا، اس لیے کہ ان کے مطابق، یہ لوگ چین کی تہذیب اور اس کے نظائر خاندان پر تسلط کر رہے تھے۔ گوکہ ایک قسم کی رجعت پسندی ہونے کا رشتہ، جیسا کہ Hui Chen Chi میں تصدیق کیا تھا جس میں ایک دانش ور جو ایک خوب صورت عورت Yng Ying سے محبت کرتا تھا غم و غم و غم کی وجہ سے یہ کہتے ہوئے اس کو رد کرتا ہے کہ "سارے غیر معمولی عورتیں خطرناک ہوتی ہیں۔ وہ خود بھی مردانہ ہو جاتی ہیں اور مردوں کو بھی تباہ کر دیتی ہیں۔ انھوں نے تو شبیہا ہوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ میں شبیہا نہیں اور بہتر ہوگا کہ میں اس کو رد کر دوں" اور اس نے واقعی اس عورت کو رد کر دیا۔ اس پر اس کا جواب مل گیا کہ "تم مجھے چھوڑنا چھوڑ دو تو چھوڑ دو، تمہیں اس کا حق ہے۔" مگر پانچ سو برس بعد چینی دلوں کی روایتی جذباتیت پھر نمودار ہوئی ہے اور مردانہ ہوتی مردانہ ایک بار پھر کہانیوں میں مقام پا جاتی ہے۔ اپنی کہانی کے آخری نسخے میں مصنف Chang و Yng کو بیوی اور شوہر کے مردوں میں پیش کرتے ہوئے اصرار پر کہتا ہے، "یہ سب اس امید پر ہے کہ دنیا کے سارے محبت کرنے والے رشتہ ازدواج میں شملک ہو جائیں گے۔" چین میں وقت میں تیزی سے گزر رہا ہے، کہانیوں میں خوشگوار ماحول کی واپسی کے لیے پانچ سو برس کا عرصہ کچھ بھی نہیں ہے۔

اتفاق سے چین کی کہانیوں میں یہ کہانی سن دو مشہور ہے۔ یہ Sung Dynasty کے عہد میں شاعر کی پیکر میں Chao Teh Jang نے The Reluctant Buterfly کے عنوان سے دیوانی تھی اور پھر Yuan Dynasty کے دور میں Tung Chai-yuen نے کرامے کی صورت میں Suh Hsi Hsiang کے عنوان سے پیش کی تھی۔ Ming Dynasty کے عہد میں، انہوں نے ایک دوسرے میں خط مبدع ہونے کے بعد ایک بار پھر Reli Hua نے جنوبی چین میں مریض s'e نامی پیکر میں Nan Hsi Hsiang Chi کے عنوان سے اس کو پیش کیا تھا۔ اس طرح سب سے آخر میں پیش آنے والا نسخہ Hsi Hsiang Chi کے نام سے مشہور ہوا۔

میں جو Tang دور کے روایتی جذبات پر زور دے رہی ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ماہوں کے لیے مرد اور عورت کے درمیان محبت Tang عہد کا سب سے اہم تھکا تھا، اس لیے نہیں کہ اس نے چین کہانی کے لیے لادنی مواد موجود نہیں تھا۔ اس دور میں غم اور مریض کے بہت سے ماہی موجود تھے، ایک انوکھے قسم کی کہانی مریض لڑائے کے بارے میں تھی، جو اس دور کے دیباہوں کا سب سے پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ان میں Chien Hung کی بھی سب سے اچھی کہانی Tung Chen Lao Fu Chuan تھی جس میں Cha Chang سب سے مشہور مریض لڑانے والے کی کہانی تھی، وہ کیسے تھکا مشہور ہوا کہ عوام کے ساتھ ساتھ اس وقت کا شہنشاہ بھی اس کو بہت پسند کرتا تھا؟

کہتے ہیں کہ وقت اور چشمے ہمیشہ رہے ہیں۔ مادی کے پیکر کا روپ Sung Dynasty میں

گھبراٹھوٹا ہوا اور Yuan Dynasty میں اس منزل پر پہنچ گیا تھا۔ فنی مادل میں پہنچنے کا تھا سوئے Hung Lou Meng کے جو Tsing Dynasty میں لکھا گیا تھا، جس کا انگریزی نام The Dream of the Red Chamber تھا۔ یہ کچھ ایسا ہی ہے جیسے وقت کی روشنی میں آئے بغیر مادل صدیوں عوام کے دلوں میں چپکے چپکے چھپتا رہا، اور Yuan Dynasty کے عہد میں اس کا نام لکھنے میں شائیں لکھیں، وہ نہیں پتہ لگے اور اس وقت تک کہ تار و درخت ان چکا تھا جب اس قدر تک ملک میں بھوکے غیر تر بیت یافتہ اور محسوس اذہان واسے مکتوب آئے ٹروٹ ہوئے۔ دانش کے ملائی ایسے زبان بھلا قدیم کا مکی رپ کی گھاس پھوس پر تہہ تک نہا کرتے، تھنا ان کی توجہ دے دے اور اس کی طرف مہذبوں ہوتی، اور شہنشاہی کی نئی روشنی میں چین کے دیر سے مادل Shui Hu Chuan اور San Kuo-Hung Lou Meng و جوہر میں آئے۔ کاش میں آپ کو بتا سکتی کہ چینوں کے نزدیک ان مادل کی کیا حیثیت ہے۔ مگر میں اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ مغرب کے ادب میں ان کے مقام ہے کی کوئی تصنیف نہیں۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں ایسا کوئی محہ نہیں آیا جس کی طرف اشارہ کر کے ہم یہ کہہ سکتے کہ ”یہ ہمارے جو اس پائے کا ہے۔“ یہ چند مادل وہ ہیں جو عوام میں مقبول چینی مادل کی آمد ہیں اس لیے کہ سچ پوچھ جائے تو ان کو ہم چینی ادب کے ۱۲ میں شمار کر سکتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ چینی زبان کے ان حرف نے ان جیسے شہ پاروں کو بھی قائل امتنا نہیں سمجھا اور متواتر آئے و لے شاہی خاندانوں کے عہد میں بھی ان کو خطرناک، ننگی اور مادل پتہ کہہ کر روک دیا گیا۔ مگر یہ شہ پارے اس لیے ننگہ رہے کہ لوگ ان کو پڑھتے تھے، سنتے تھے، اور تراشوں اور دیہاتی گیتوں کی طرح گاتے تھے اور ماسوں کی صورت میں تھیٹھ بھی تھے۔ آخر کار وہ زبان حرف نے بددیہت محبوبوں ان کے وجود کا اقرار کیا، ان مادل کے بجائے چھپے کہا، اور مگر یہ چھپے ہی تھے تو پھر ادب میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ عوام نے تو انہیں کے ان نظریوں اور مشاہدوں پر کان نہیں دھرتے تھے۔ وہ ہی ماسٹروں کے ان تذکروں اور مضامین کی پتہ کی جن میں ایسے نظریوں کو بتائے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو ان مادل کو مادل سمجھ کر پڑھتے، کسی وجہ سے نہیں صرف ان کے مسلسل قصوں میں شامل تفریح سے مخلوط ہونے کے لیے تاکہ ان کی مثال کے ذریعے اپنی تعلیمات کا غلبہ کر سکیں۔

وہ اصل عوام ہی ان کے خالق تھے۔ اگرچہ Shui Hu Chuan کے عہدہ نسخوں میں Shi Nai کا نام بطور مصنف لیا جاتا ہے، ہمیں کہیں مضمون میں پسے بھی کہا گیا ہے، اس مادل کو بھی کسی ایک فرد نے تصنیف نہیں کیا تھا۔ دور میں Sung Dynasty کے عہد کے مٹی بھر قصوں سے جو کی زمانے کے تراشوں کے بارے میں تھے، اس مادل کی روش کی دتہ ہوئی تھی۔ مگر اس کی ابتدا تاریخ کے اوراق میں تھی۔ دو دغار جو تراشوں کا مسکن تھا Shamung کے علاقے میں آج بھی موجود ہے۔ افسوس کہ مغرب کی تیرہویں صدی کی صورت حال میں مسیح شہادت میں پیش کی گئی تھی۔ شہزادہ Hua Chung کا خاندان بد زمانہ اور مادل پتہ کی طرف نال تھا۔ جب امیر نیا دوا امیر اور فریب نپا دو غریب ہوتا چارہ تھا اور کوئی

معاشرے کا پرسانہ حال نہیں تھا، یہی وقت میں (انگریزی معاشرے کے مابین ہر جیسے) "عادلی" قزاقوں کا ظہور ہوا تھا۔

میں اس مادل کے ارتقا کے بارے میں مکمل تصویلات فراہم نہیں کر سکتی نہ ہی یہ بتا سکتی ہوں کہ اس میں کس کس کا ہاتھ ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ادیب Shih Nai An نے اس کو کتابوں کی ایک پیمائش میں ڈیڑھ لاکھ میں بہت بڑی طاقت میں پیدا کیا تھا، وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر کے لیے اس کو نئے سرے سے لکھا تھا۔

اس کے بعد یہ ہائیو بار بار مشائی جاتی رہیں۔ اس کے پانچ یا چھ ہم نسخے ہیں، جن میں سے ایک کا نام Chung I Shui Hu جس میں 127 باب ہیں، ایک اور بھی نسخہ ہے جس میں 100 باب ہیں اس کے مکمل نسخے میں جو Shih Nai An سے منسوب ہے 120 باب تھے مگر اس میں جو آج کل عام طور سے استعمال کیا جاتا صرف 70 باب ہیں۔ یہ وہی نسخہ ہے جو Ming Dynasty کے عہد میں مشہور ادیب Ching Shen Tan کے ہاتھوں مرتب ہو گیا اور سی نے کہا تھا کہ صرف اپنی کاپی کے باعث سی نے اپنے بڑے کواں کتاب کے مطالعے سے منع نہیں کیا تھا، بلکہ یہ جانے ہوئے کہ کوئی بھی نوجوان اس کے مطالعے سے پرہیز نہیں کرے گا، سی نے اپنے بیٹے کو خود اپنا حکم دانی شہدہ نسخہ لکھنے میں دیا تھا۔ ایک اور نسخہ ہے جو حکومتی اداروں کے قلم پر کسی وقت ترتیب دیا گیا تھا جب حکومت کے کارپروایوں کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ عوام کو اس کے پڑھنے سے کسی بھی طرح باز نہیں رکھا جائے گا۔ اس نسخے کا چھٹی نمونہ میں سرکاری نامہ Tung Kou Chu اور انگریزی میں Waste the Robbers Laying ہے جس میں قزاقوں کی شکست اور حکومت کی فوجوں کے ہاتھوں ان کی تباہی کے واقعات کا بیان ہے۔ مگر چین کے عام آدمی نے اس نسخے کو کبھی قیوں نہیں کیا، اس کے نزدیک اس کا اپنا نسخہ ہی قابل توجہ ہے۔ دراصل ہر عنوان حکومتی اداروں کے خلاف یہ ایک طرح کی جدوجہد کے مترادف ہے۔

میں یہاں یہ بتا چاہتی ہوں کہ Shui Hu Chuan کا جزوی طور پر فرانسیسی زبان میں Les Chevaliers Chinois کے نام سے ترجمہ ہو چکا ہے جب کہ سفریاد و نسخہ اس کتاب کا انگریزی میں مکمل ترجمہ ہے جو میں نے All Men Are Brothers کے نام سے کیا ہے۔ اصلی عنوان Shui Hu Chuan انگریزی میں کوئی معنی نہیں رکھتا سوائے اس کے کہ اس سے پیدا ہوا ہے کہ یہ کس دلدلی قبیل کے کتابوں کے بارے میں ہے جس کو قزاق اپنی چادر گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ چینی لوگوں کے لیے یہ الفاظ صدیوں پہلے یا دہائیوں گونا گونا گونے کے مترادف تھے مگر ہمارے لیے نہیں۔

آخر چرچہ وقت پر لے کر ہر روز یہ مادل اپنی اصل حالت میں ہی قائم ہے مگر نئے چین میں اس کی ہیئت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ چینی کمیونسٹوں نے اس مادل کا اپنا ایک نیا نسخہ شائع کیا ہے جس کا نام چر ایک ایک معروف کمیونسٹ نے لکھا ہے اور اس کو چین کے پیپے کمیونسٹ ادب کا دھچکا دیا گیا ہے۔ اس مادل کی عظمت کا ثبوت اس کے برعکس ہونے میں پوشیدہ ہے۔ یہ آج بھی کتابی دکان ہے جتنا کہ ہمارے ٹائٹل

سے پسے تھا۔ چین کے عوام، مذہبی پیشوا، دیہاتی، جوان، بوڑھے، تاجر، دانش ور، مورخیں انہی ہوں۔ یہی جوان ہوں یا بوڑھے، حتیٰ کہ شہر و نو جوان، سبھی اس کی دولت گردانی کرتے ہیں۔ اس کی اس سے مستثنیٰ ہیں جو مغرب میں پڑھے ہیں اور چین کے ہاتھوں میں مغرب کی چارکی گمروہ کی طرح لٹنے کی ڈھمکیوں اور فوج سے ہوتے ہیں۔ مگر یقیناً سیکھیے کہ اگر یہ لوگ بھی اس وقت زندہ ہوتے تو اس وقت کے چین میں سے ہوتے جب اس کے اوقات پر چٹوری بار نکلم کاری ہو رہی تھی تو یہ سب بھی کسی عالمی مرتبہ قہار پر ایک معمولی پوئلہ کی مثال اس کے سوز و گمنازا اور اس کے مزاح سے مکتوب ہو رہے ہوتے۔

چینیوں کے قوس کے مطابق، 'ہیوانوں' Shui Hu اور بزرگوں کو San Kuo نہیں پڑھنی چاہیے۔ "اس لیے کہ نو جوان اس کے زیر اثر قیادت بن سکتے ہیں جب کہ بوڑھے ایسے کام کی طرف راغب ہو سکتے ہیں جو ان کی عمر کے لیے کچھ زیادہ ہی وقت طلب ہو سکتے ہیں۔" Shui Hu Chuan چینی طریقہ حیات کی ایک بڑی ساری حصہ بنے ہوئے Sa Kuo جنگ اور مہارت کی دستاویز ہے، اسی طرح Hung Lou Meng انسانی محبت اور خاندانی زندگی کی دستاویز ہے۔

San Kuo یا Three Kingdoms کی تاریخ بھی کچھ ایسی مہارت کی ہے جس سے Shui Hu کی تصنیف کے بارے میں ویسے ہی شبہات پیدا ہوں گے۔ اس ناول کی کہانی تین چوتھوں کی ہے جو Han Dynasty کے دور میں لکھی نہ ختم ہونے والی دوستی کے حیرت سے شہرہ ہوئی ہے اور ستاویس برس بعد چھ مختلف مسلسل شاہی خاندانوں کے زمانے تک چلتی ہے۔ اس ناول کو اس کی موجودہ صورت میں ایک ناول نگار Lo Kuan Chung نے دوبارہ تحریر کیا تھا، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ Shui Nai An کا شاگرد تھی اور شاہی شاہی نے اپنے استاد کے ساتھ Shui Hu Chuan کی تصنیف میں بھی حصہ لیا تھا۔ مگر یہ بھی کچھ ایسی نوب کا قصہ تھا جیسے کہ Bacon اور Shakespeare کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والی تاریخ۔ Lo Kuan Chung جب پیدا ہوا تھا تو Yuan Dynasty کا چہرہ آخری سانس لے رہا تھا مگر اس کا عرصہ حیات Ming Dynasty میں ہی گزارا۔ اس نے بہت سے کھیل کسے تھے مگر وہ اپنے مایوسوں میں سے سب سے اچھے ناول San Kuo کے واسطے سے مشہور ہے۔ اس کے ناول کا وہ نسخہ چین میں عام طور پر مشہور ہے جس پر Kang Hsi کے دور میں Mao Chen kan نے نظر ثانی کی تھی اور اس پر تنقید بھی کی تھی۔ اس نے اس میں تبدیلیاں بھی کیں، اس میں کہ بیانات بھی کی تھی۔ اس نے مرکزی کرداروں میں سے ایک کی بیوی Suan Fu Ren کا قصہ بھی داخل کیا تھا۔ یہ صرف یہ کہ اس قصے کا اضافہ کیا، اس نے اس ناول کا دوبارہ تحریر بھی کر لیا تھا۔ اگر ان دونوں کے لیے عام لوگوں کی حد و جہد اسے ناول کی حیثیت سے Shui Hu Chuan کی اہمیت ہے تو Suan Fu Ren اس لیے اہم ہے کہ یہ مایوس جنگجو چینیوں کے نقطہ نگاہ سے سانس اور اس کے فنی پہلوؤں پر تفصیل سے نظر ڈالا ہے، جو ہمارے انداز نظر سے بھی بہت مختلف ہیں۔ ان کہانوں کے طبقے سے تعلق رکھنے والے چینی چھاپا کاروں کو جو آج جاپان کے خلاف جنگ میں

بہت مؤثر کردار ادا کر رہے ہیں San Kuo از مہ چن، اگر ان کے اپنے پڑھنے کریدہ سے نہیں تو سر داتاوں میں جمع ہونے والی چھ پاؤں کی تھکنوں میں دستان گولوں کی نہائی سننے ہوئے ان قصوں کے طفیل، جن میں تین باورشلہوں کے درمیان جنگیں ہوئیں تھیں، جن میں جنگجو لوگوں کی بہادری کی داستانیں مزے ملے لے کر سنائی اور سنی جاتی تھیں۔ پرانے زمانے کی اس ہی جنگی حرفوں پر آج کے چھ پاؤں مار بھرہ سارستے ہیں۔ ایک جنگجو کو کیا ہونا چاہیے اس طرح تصور کیا کہ اس طرح لپکا ہوا چاہیے، لپکا ہوا اس وقت جب دشمن حمل آور ہو، اور اس طرح آگے بڑھنا چاہیے جب دشمن لپکا ہو رہا ہو۔ اس ماؤں میں ایسے سرے کر ہو جو دیکھتے جو چین کے تمام عام آدمیوں اور لڑکوں کو انہی طرح معلوم تھے۔

Hung Lou Meng یا The Dream of the Red Chamber اس نثرن تقسیم چینی ماؤوں میں سب سے چھ ہے جس کی Tsao Hsueh Chung نے، جو Manchu سرکار کے عہد میں ایک سرکار کی مراعات یافتہ ہی نہیں بلکہ Manchu لوگوں کا اپنا آدمی سمجھا جاتا تھا، بیرونی طور پر ایک خودنوشت سوانح حیات کے طور پر تحریر کیا تھا۔ اس زمانے میں Manchu لوگوں میں آٹھ مختلف جنگجو گروہ تھے، جن میں Tsao Hsueh Chung بھی شامل تھے۔ مستحق اس مادل کو کھل نہیں کر پڑا تھا اور کسی دوسرے شخص نے، جو کا Kao O تھا، آخری چالیس باب کا اضافہ کیا تھا۔ اس نظریے پر کہ اس ماؤں کے ذریعے Tsao Hsueh Chung اپنی زندگی کے واقعات لکھ رہا تھا، Hu Shih نے اور اس سے پہلے Yuan Mei نے نثر فرمائی کی ہے۔ ہر حال جو کچھ بھی بن مادل کا اصل نام Shih Tou Chu کی تھا جو 1765 عیسوی کے مغربی عہد میں پبلنگ سے نکلے تھا اور پانچ چھ باب کے مختلف بحر سے اس پر سے چین میں مشہور ہو گیا تھا۔ جب یہ شائع ہو تھا اس دور میں چھپائی بہت مہنگی تھی اس لیے اس کتاب کو چین میں ”نم مجھے ایک کتاب اوجھار“ اور میں تھیں ایک کتاب اوجھاروں“ کے مخصوص طریقہ مطالعہ سے پہچانا جاتا تھا۔

کرناؤں کے مطالعے اور انسانی جذبات کی حیرت آشی کے اعتبار سے اس کی کہانی نہ صرف مہمورت کی ایمانیات کے حہود سے کافی پیچیدہ اور گہجک ہے بلکہ ایک ایسے ہم کرنے کے مرنیاتی مطالعے جیسی کہانی سے جس کی ایک اہم فرد شاہی عاشقاؤں میں سے ایک تھی، وہ گھر ما جو کبھی ہے انہا قصوں اور حکموں خاندان کا محبوب نظر اور مراعات یافتہ تھا۔ مگر کتاب کی شروعات اس وقت سے ہوتی ہے جب اس خاندان کے چھ دن گزر چکے ہیں اور وہ بے زوال ہو چکا ہے۔ اس کے نزدیک مالی حیثیت کی مڈر ہو رہے ہیں اور اس خاندان کی واحد اولاد Chia Pao Yu نامی ایک لڑکا ہے جو بوجہ ایک نہایت فزین انسان ہونے کے جس کو چین کے روایتی انداز میں ایسی اولاد کہا جاتا ہے جو اپنے منہ میں لیش (jade) کا ٹکڑے لیے پیدا ہوا ہو خاندان کی زوال پے نیکی کے باعث خراب ہو رہا ہے۔ اس ماؤں کا مقدمہ ان لحاظ سے شروع ہوتا ہے ”جنت یک رہا نکل نوٹ پھوٹ چکی تھی اور جب اس کو درود ہوا تو اس کا یک نظر، جو استہال ہونے سے روکیا تھا، Chia Pao Yu کی منہ میں پایا جانے والا مشہور ریش کا ٹکڑا بنا“ چینی لوگوں کے ذہنی مافوق

خطریت تصورات سے استے سرچہ ہیں کہ کبھی تصور اس مادل میں بھی آنکر کرمانے آتا ہے۔

اس مادل نے چینی زبان کو گرفت میں لے لیا اس لیے کہ اس میں ان کے خاندانی، حلی، حرکے اندر عورتوں کی عطا، کھول، کھولت، ہاروں کی ہے، انتہا عفت، مائل، داروں اور کئی کئیوں کے ذکر سے پرتھا جو بے پناہ جسمیں اور مجبور ہونے کی وجہ سے خاموشی کے چہرے ہوتے ہوئے لڑکیوں کے لیے تصور کے کرمارا کرتے ہوئے نہ صرف خود خراب ہوتیں بلکہ ان کو بھی خراب کرتیں۔ چین کے گھر میں عورت اصل حکمران تھی، اور چوں کہ وہ گھر کی چار دیواری میں مقید تھی اس لیے عموماً جاں بونی تھی۔ عورتیں ہی مردوں اور بچوں کی تعلیم دیتی تھیں، ان کی دیکھ بھال کرتیں، ان کو مشقت سے بچاتیں جب کہ خون کی گھٹا شدت ضروری نہیں تھی۔ تو کچھ اسی قسم کا تھا Chia Pao Yu کا کرمان اور ہم Hung Lou Meng میں اس کا بیوا تک انجام دیکھتے ہیں۔

میں آپ حضرات کو بتا چکی تھیں کہ جب دانشوروں نے باتیں ہوں تو بھی اس مادل کے قارئین میں پیدا تو اس کی مناسبت ہو رہا ہے اس کی بے پناہ عقیدت کی، جوہ کے بیان میں انھوں نے کیا نہیں کیا۔ مجھے بتائی ہے کہ یہ لوگ بھی تھائی میں اس مادل کو پڑھتے رہے ہوں گے۔ چین میں اسے بہت سے خطے مشہور ہیں جن میں دانشور چپے چپے مادل پڑھتے ہیں مگر جب عوام کے سامنے ان کی بات کی جاتی ہے تو ایسا ظاہر کرتے ہیں جیسے انھوں نے اس کے بارے میں کبھی نہ سنا بھی نہیں۔ یہ حال، دانشوروں نے بہت سے تذکرے صرف یہ ثابت کرنے کے لیے لکھے ہیں کہ Hung Lou Meng مادل نہیں بلکہ ایک سیاسی تشبیہ ہے جس میں Manchu کی غیر ملکی حاکمیت کے دوران چین کے لوگوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کے عنوان میں ”سرخ“ کا لفظ Manchu کی علامت ہے اور وہ جون لوق جو انتہائی سر جانی ہے حالانکہ Pao Yu سے اس کی مشابہت ہونا بھی ممکن کی علامت تھی، اور اس کی کامیاب سون Pao Tsai جو شب حاصل کر رہی ہے کسی غیر ملکی کی کامیابی ہے وغیرہ وغیرہ۔ دانشوروں کے مطابق Chia کے نام سے آج بھی ہندوستان میں مراد تھی۔ مگر یہ ایک ناقابل یقین تشریح تھی اس کے لیے جو ادب کی طرح لکھا گیا تھا، مادل کی طرح ہے اور اس میں مخصوص چینی انداز میں حقیقت اور بیان کے بارے میں اور چین کے قابل فخر خاندان کے لوگوں کا تذکرہ ہے، کئی نسلیں کے چینی مردوں و عورتوں کے جہیز کی چینی مذکر میں ایک نیا چیت کے نیچے زندگی گزارنے کا چینی چینی انداز زندگی سے متعلق بیان کا۔

ان تین چینی ماؤلوں کے بیان پر مذکورہ کر میں نے بس وہی سمجھا کیا ہے جو خود چینی بھی کرتے ہیں۔ جب بھی آپ کسی چینی کے سامنے ”مادل“ کا لفظ آتا کریں گے تو عام چینی کا جواب ہوگا ”Shu Hu“ اس سے میری مراد نہیں کہ چینی زبان میں سیکڑوں مادل موجود نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ ہیں۔ میں نام لیتا چاہوں گی Hsi Yu Chi Record of Travel in the West کا جو تقریباً آٹھویں صدی قبل مسیح ہے جتنے کہ یہ تین مادل ہیں۔ Feng Shen Chuan کا بھی نام

نیا چاہوں گی جو دنیا کا ایک جگہ کے واسطے ملے، جس کے مصنف کا نام نہیں معلوم کر سکتا جاتا ہے کہ وہ Ming صہ میں تھا۔ Ru Ling Wai Shu کا نام بھی لوں گی، جو Tang Dynasty کی، (انہوں نے نہ ان کے دانش وران کی بی بیوں پر ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے، ذرا سی، مگر ہر نئی پختی جان کی طرف نہیں، بلکہ انہوں سے مزید، قابلِ رحم مگر مزاح سے ہے۔

یہاں سے نام لہو دانش وران کا مذاق اڑایا گیا ہے جو اپنی کی وہ چیزوں میں کھوئے ہوئے ہوتے ہیں، جو دنیا میں اس طرف بھرے ہوئے ہوتے ہیں جن سے کسی قسم کے نئے خیالات کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی۔ یہ اگرچہ ایک طویل کتاب ہے مگر کسی مرکزی کردار سے باری۔ ہر کردار اگلے کردار سے کسی واقعے کی طور کے ذریعے منسلک ہوتا ہے، لہذا وہ قہر و قہر ایک ساتھ چلتے اور غائب ہوتے ہیں، بقول مشہور چینی ادیب Lu Hsun کے ”خوب صورت اور رنگ رنگ ویشم اور ماسٹن کے آپس میں سے ہوئے کھول کی طرح“ (جیسے سرزمینِ سندھ کی بولی)۔

ایک اور ناول Yea Shou Pei Yin یا An Old Hermit Talks in the Sun ہے ایک مشہور مگر عموماً متنبوں کے نظر میں مقبول ادیب Shua of Kuang yin کا لکھا ہوا۔ ایک اور سب سے حیرت انگیز کتاب Ching Hua Yuan، ان موبوں کے معاشرے کے واسطے جس سے جن کی حکمران ایک مذہبی جس کی دینی دانشور صرف محاسن ہی نہیں۔ اگرچہ اس سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ عورتیں اور مردوں میں برابری ہوتی ہے مگر یہاں یہ بتانا ضروری ہو جاتا ہے کہ کتاب کا اختتام عورتوں اور مردوں کے درمیان کی جنگ پر ہوتا ہے جس میں مرد فائز ہوتے ہیں اور ایک مرد شہنشاہ ملک کی جگہ پر جاتا ہے۔

مگر میں یہ سیکڑوں ناولوں میں سے، جو چین کے عوام کے لیے دن سہرت کا باعث ہوتے ہیں، صرف چند ہی کا تذکرہ کر سکتی ہوں۔ اور اگر چین کے لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں آپ سے آقا کی سہولت پر بات کرنا چاہتی ہوں تو وہ یہی کہیں گے کہ ”ان تین عظیم (ناولوں) کے واسطے میں بتاؤ، کہ ما مرا جینا انہی تین Shu Hu Chuan اور San kuo اور Hung Lou Meng کے ساتھ ہے۔“ انہی تین ناولوں میں وہ زندگی ہے جیسی کہ چینی عوام ہر گزرتے ہیں اور عرصے سے ہر گزرتے ہیں۔ انہی میں وہ گیت ہیں جو وہ گاتے ہیں، اور وہ سب کچھ جن پر سب خستے ہیں اور وہ کچھ جس کو یہ لوگ سنا پسند کرتے ہیں۔ چینیوں نے گویا ان ناولوں کو اپنا سب کچھ سوتل دیا ہے اور اپنے آپ کو تازہ کرنے کے لیے بار بار اسی کا رُخ کرتے ہیں، انہی میں سے نئے گیت، نئے کھیل اور نئے ناول تخلیق کیے ہیں۔ کچھ تو بالکل نوان عظیم ناولوں جیسے لگتے ہیں، مثلاً وہ کچھ نئی مہارت اور محبت پر مبنی ناول Shu Hu Chuan اور Ching Ping Mei جو Shu Hu Chuan کے ایک واقعے کو بنیاد بنا کر لکھا گیا تھا۔

مگر میرے نزدیک آج ناولوں کی ایک فہرست پیش کرنا ہی سم نہیں، جس پہلو پر میں نہ دیتا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ کسی عظیم چینی عوام کے نہایت بد راسخ تصورات کا اور نہ ہی اس عظیم کا جس کو

ادب کا نام نہ جاتا ہے، ارتقا اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ ایک وقت تھا جب کہانی کا نام ہی "hsiao shao" یعنی بے معنویت اور بے وقعت پر مبنی ہوتا تھا، حتیٰ کہ مادل "sang pien hsao shun" جس کے نام سے بھی مراد صرف بوقت طویل ٹکڑے وقت اور بے کار شے ہوں گے چلتے تھے۔ ان بے کار مادل کے پلاٹ بھی ناقص، محبت کے مسائل بھی سمجھائے نہیں جاتے، دوسرے لڑائی کرنا کی خواہش خوب رہتی تھی نہ مرد بہادری نہ کہانی کبھی بالکل ختم ہوتی، کبھی بس یوں ہی کہتے جا کر رک جاتی بالکل اسی طرح جیسے زندگی اس وقت جو تک ختم ہو جائے جب موت متوقع نہ ہو۔ یہ تو یہ ہے کہ چینوں نے اپنے موجودہ ادب کی دیکھ کر صرف کو بھی خود ہی ڈھالا ہے اور آج بھی سب کچھ ہے جو زخمی ہے اور آئے والے ہے، جب کردہ سب کچھ جو رچی طور پر ادب کیلئے تیار تھا، مرچکا ہے۔

میں مادل کی رسالت کے ماحول میں ایک مصنف کے طور پر رہ رہتی ہوں۔ لہذا میری، مکتوں کی تہذیب اخلاق کے حسن اور ان کی جمالیات پر نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں یہ تربیت صحیح ہے، اور جیسا کہ میں نے کہا ہے، مغرب کے مادل کے لیے ایک درخشاں مثال ہے۔
تو یہ ہے چین، مادل نگاروں کے ذہن کا لب لباب، شاید اس حقارت کا نتیجہ جو چین اور ادب کے نام نہ اسفوں نے ان کے ساتھ رکھا ہے۔

اس لیے میں اپنے الفاظ میں وہ سب کچھ کہنا چاہوں گی جو وہ خود نہیں کہہ سکے ہیں۔
جو ہست فن کی تخلیق کرتی ہے وہی نہیں ہوتی جو فن کو پیش کرتی ہے۔ تخلیقی ہست، اپنے حتمی تجربے اور مردہ ترین طریقوں میں، ایک غیر معمولی، اور اضافی قوت حیات ہوتی ہے، ایک باطنی توانائی، جو کسی فرد میں ناقابلِ توجہ طور پر پیدا ہو جاتی ہے، ایک ایسی قوت حیات جو کسی وجود کی اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ ہو، وہ توانائی جسے کوئی حیات و مدد پوری طرح صرف نہیں کر سکتی۔ لہذا، ایسی توانائی خود اپنے آپ کو استعمال کرتی ہے، مزید زندگی کی تخلیق میں، موتی کی بیست میں، تصویر کی تجربہ میں، یا ہر اس عمل میں جو ضرورتاً طور پر ایک رستے کے لیے ضروری ہو۔ یاد رہے کہ کسی بھی فرد کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اس تخلیقی عمل سے باز رہ سکے، اس لیے کہ صرف اسی کے ذریعے وہ اس مخصوص اضافی توانائی کے وجود سے، جو ایک ہی وقت میں جسمانی بھی ہوتی ہے اور فنی بھی، چمکتا، پلمکتا ہے، تاکہ اس کی ساری خصوصیات دوسرے انسان کے مقابلے میں زیادہ مستعد اور ہمہ گیر ہوں اور اس کا پورا دماغ جسمی اعتبار سے ان سب تصورات و تجلیات کے تعامل کے لیے زیادہ متحرک ہو جو اس کے اپنے حواس اتنی فراط سے "شکار گشت" ہیں کہ واقعتاً ہر پڑ ہو کر تجلیوں کا روپ و عمارت بنی ہے۔ یہ ایسا عمل ہے جو آپ ہی "آپ اندر سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہ عمل اس وجود کے ہر فیصے کی شدید سرگرمی ہوتی ہے جو نہ صرف خود وجود کو بلکہ اس کے اطراف کی، اس کے اندر ہر انسانی زندگی کی حتیٰ کہ اس کے تمام توانیوں تک کو کار سے لگا دیتی ہے۔

اسی عمل سے فن وجود میں آتا ہے، نہ کہ مصنف کی اپنی ہوش سے۔ جو عمل تخلیق کا کہتی ہوتا ہے اسی

عمل سے ان کی پیکر تراشی نہیں ہوتی۔ لہذا فن کا تعلق ابتدائی عمل ہوتا ہے نہ کہ فنا نوی۔ اور جب وہ کچھ جو تخلیق کے ابتدائی عمل کے لیے بنا ہوں، جیسے سداول مکان اُردا نوی عمل پر فوجہ مرکب کرنے لگے تو اس کا یہ عمل بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور جب وہی پیکر تراشی کرتے گئے، سچ الہام اور سچ دہشتاؤں میں لکھنے لگے تو اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہو جاتی ہے جیسے بولی دفعتی جہاں زمین پر آب پوشیدہ چٹان میں گھنٹیں گیا ہو اور اس کے پیچھے غیری سے ٹھونسنے کے باوجود جہاز کو آگے بڑھانے میں ناکام رہیں۔ گویا جب تک جہاز اپنے مطلوبہ منزل، یعنی گہرے پانی، میں نہ پہنچے راستے پر نہیں چل سکتا۔

اور سادہ نگار کے لیے انسانی زندگی میں مطلوبہ، حلی ہوتی ہے، وہی ای جیسا اس کے اندر بھی اور اس کے اصراف بھی ہوتی ہے۔ اس کی کامیابی کا امتحان اس میں ہے کہ آیا اس کی توانائی زندگی میں اضافہ کر رہی ہے یا نہیں؟ کیا اس کی تخلیقات زندگی دہشتاؤں میں ایک سو رہا ہے، اور اس کا جواب سوائے ان زندگیوں کے جسے ہم انسان کہتے ہیں، بعد کائنات سے ملتا ہے۔ انسان کی اس سے تلی غرض نہیں کہ فی سہا ہے، کس طرح وجود میں آتا ہے، خود وہ کتنا ہی اچھا، کتنا ہی رفیع کیوں نہ ہو۔ وہ تو اپنے شب و روز، پتی بھوک اور افلاس، خوشیوں اور دکھوں، ہمدانے شایس میں گمن رہتا ہے۔ اس میں غہ نہیں کہ یہی دیکھ گچ معنوں میں سداول نگار کے کام کو اپنی اسی واحد حقیقت کی سواٹی پر پکڑ سکتے ہیں۔ اور یہ پکڑ کس کی آئے گی مدد سے نہیں کی جاسکتی، صرف کسی حقیقت کے مارے میں پکڑ کر رکھی نہیں، ان حقیقتوں کے اپنی زندگی حقیقتوں سے قائل ہی سے ہو سکتی ہے۔

اس لیے مجھے یہ عقیم دنیا ہی ہے کہ سداول نگار فن کی کسی بے حسیب اور پیکر کش پیکر کی طرح دیکھتا ہے، اس کی تعریف اسی طرح کرتا ہے جیسے کسی تیل کی میں نصب، کہ وہ عجیب و غریب کی تعریف کی جائے، غرض تو یہ ہے کہ اس کا مقام اس کے پاس نہیں۔ اس کی جہان کلیوں میں سے جہاں وہ خوش رہتا ہے۔ گویاں شور و غوغا سے پر ہوتی ہیں، ان میں چنے بستے والے مرد و عورتیں ہمسوں کی طرح اپنے اظہار میں کبھی کمال نہیں ہوتے، یہ بد صورت بھی ہوتے ہیں اور عیب دار بھی، کہاں کے ہوتے ہیں اور کہاں کا قصد ہے نہیں معلوم، ہانگ ویسے ہی نامیں جیسے انسان ہوا کرتے ہیں۔ ان میں کے باوجود وہ سب انسان ہیں اور یہ تیران سے انسانی چہرے کے ستونوں پر نصب رہتے ہیں۔

اور چہن سداول نگاروں کی طرح مجھے بھی انہی لوگوں کے لیے نگہنا سکھایا گیا ہے۔ اگر یہ لوگ انہوں میں چھپنے، ملے رہا کی کو پڑھتے ہیں تو میں بھی چاہوں گی کہ میری کہانیاں بھی انہی رسالوں میں شائع ہوں، چر جائے کہ ان عمل مرتبہ سے رسالوں میں جو بہت کم تعداد میں چھپتے ہیں۔ کہانیاں جو اس کے لیے کبھی ہوتی ہیں اور وہی اس کے بہترین پورک ہوتے ہیں اس لیے کہ ان کے جذبات زیادہ ہوتے ہیں اور ان کی جس میں کبھی کسی قسم کا باؤ نہیں ہوتا۔ نہیں! اسی سداول نگار کا ہدف کبھی خاص ادب کی تخلیق نہیں ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے میدان عمل کا پورا دھڑک بھی نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ وہ لوگ جو اس کا ہدف ہوتے ہیں، ان کے اس

میدانِ عمل میں موجود نہیں ہوتے۔ تھنڈا ایتھو کسی گاؤں کے ایک خیمے میں پٹھنے والا ہوتا ہے جو اپنی کہلوں کے سحر سے سننے والی جوانی کا نسب، رعب کتا ہے۔ قریب سے نہ رنے والے کسی لاش ورجسٹانے کے لیے بھی اس کو پتی آواز سندھیں کر رہی چاہیے۔ مگر اس کو اس وقت اپنے حوالے سے مصلیٰ ضرور پٹے چاہئیں جب غریب لوگوں کا کوئی جھنڈا کسی دیوار کی سلاش میں پھانسلوں کی جانب رواں ہوتا ہے۔ اس کی جانب رخ کر کے ہی کو آواز لگنا چاہیے، ”دیکھو تو، میں بھی دیواروں ہی کی بات کرتا ہوں“ اور کسانوں سے ان کی بیٹیوں کے بارے میں باتیں کرنا چاہیے، اندر گھر میں سے امن کے بارے میں، اندر گھر میں سے بچوں کے بارے میں اور جوان مردوں کو توں سے یکے اور دوسرے کے بارے میں بات کرنا چاہیے۔ اگر عام آدمی ہی کی بات سنا کر خوش سے تے تو اس کو مطمئن ہو جانا چاہیے، کم از کم یہ چٹو میں نے چین سے سیکھا ہے۔



راجر مارٹن ڈوگاڑ

امیرانی کمال۔ مہربانی قدرت اور اس بچائی کے لیے جس کے وسیع اس نے اپنے مادل
Les Thibaut کے تحت میں انسانی آویزش اور عصری زندگی کے بنیادی
پہلوں کی نقش نگاری کی؟

مشیون کی بھاد کے بعد سے دنیا کو کسی طرح بھی پر سکون نہیں کہی جاسکتا۔ نئی حرکت سے پیدا
ہونے والی گڑبڑا بہت ہوئی اور کسی قسم کی آوازیں، یہ سب زندگی کو ایک احتجاج جیسی منظر تک لے جاتی
ہیں۔ یہ یقیناً حیرت انگیز بات ہوئی کہ ایسے دور میں جب کے سب سے مٹیوں جھکناوس، کب انکل مخالف
سمت میں سوز دیا جلتے اور مے کو پسند بھی کیا جائے۔ اور اگر ایسا مادل قاری کو کسی تھکاہٹ میں لے جائے تو
اس کو زندگی میں موجود نفسیاتی لمبوں کا شاعر نہ عم اسیدل کہا جاسکتا ہے۔

مارٹن راجر دوگاڑ نے اپنی ادبی تخلیق کی مراد میں ملا میٹوں کو ایک چارمب سبڈ کر 1922 اور 1940
کے عوئل مر سے کے دوران کئی پیموں پر مشتمل ایک ادب Les Thibaut تحریر کیا جس میں اس دور کے
نمرواؤں کے ایک پورے نگار خانے کے ذریعے فرانسیسی معاشرے میں جبکہ عظیم دولت سے دور کسی قلم
سے پیدا ہونے والی نفسیاتی بھنوں و رہبریلوں کا اس طعنہ حاطہ کیا گیا ہے کہ قاری کو سارے مناظر زندہ
اور چتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی بیو سے دوگاڑ کے اس کام کو ایک آہستہ خرم رویا سے تعبیر کیا گیا

ہے، ایسا دیکھو جو وسیع و عریض مکوں، میدانوں اور وادیوں سے گزرتا ہے اور اس میں ان علاقوں کی سرحدیں
نہایت پرمارے رنگ شامل ہوتے ہیں۔ مائل کے بستے ہوئے دیواروں میں سمونے
ہوئے، چھوٹے ہونے پر مارے مسائل اپنے اپنے ٹکسٹس کہتے ہیں اس طرح کہ سب کچھ شامل
کھی ہو جاتا ہے اور ہر دور کے پر سکون مہاؤں میں کوئی فرق بھی نہیں ہے۔

مائل Les Thibault اپنی تمام تر جود و سامانیوں اور بے حد و حد و حدود کے ساتھ اس
مشکلات اور دشمنی تجویز نقدی کے، حول میں اپنے تاریخی و ایک گونہ سکون بخشتا ہے اور اس کو سنی امتحانات
سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کرتا ہے۔ اس مائل کے مرکزی کردار ایک ہی گھرانے کے تین اشخاص
ہیں: ایک باپ اور دو بیٹے۔ باپ پس منظر میں رہتا ہے مگر کہانی میں غیر متحرک ہونے کے باوجود وہ مقدر
ہائے پر مائل نظر آتا ہے اور اس صورت حال کو دیکھ کر بالکل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ دونوں بیٹوں اور
بے شمار دوسرے کرداروں کو دیکھ کر مائل انداز میں کہانی میں اس طرح شامل کیا گیا ہے کہ قاری کو ان کے
پیش منظر میں آنے کی توقع نہیں ہوتی مگر وہ اچانک نمودار ہو کر متحرک ہیں ہو جاتے ہیں اور کچھ بھی کرتے
ہیں۔ مصنف ہر منزل پر قاری کی گرد و پیش کے بغیر مکتے ہوئے مظہروں میں اپنے ساتھ رکھتا ہے جس
میں کبھی کبھار بھی دکھائی دے سکتا ہے۔ وہ اپنی بالکل منہ مندی سے مرکزی کردار کے دل میں ماحول
خیالات کا تجربہ بھی کرتا ہے اور اس کے متوقع عمل اور رد عمل کی پیش بندی بھی کرتا جاتا ہے۔ وہ گارڈیہ بھی
کس ہے کہ وہ خیالات اور حساسات سے لگاؤ اور ان کا طے کرکات احوال ہے جاتا ہے۔

مارٹن دو گارڈیہ 1881 میں پیرس کے قریبی علاقے Neuilly-sur-Seine میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ
ایک کامیاب وکیل تھا اور اس کے ماں کے خاندان والے بازاری تھیں کے کا دوبار سے متعلق تھے۔ سترہ برس
کی عمر میں دو گارڈیہ نے "نوارینڈین" پڑھ چکا تھا جس سے اس کو اپنا مائل Les Thibault
لکھنے کی تحریک ہوئی۔

دو گارڈیہ نے Ecole des Chartes سے تربیت لی جس میں اس نے آثاریات اور علم قدیم
کا مطالعہ (Paleography) کے موضوع پر مقالہ پیش کیا تھا جس کے ذریعے اس نے جزئیات نگاری اور
حقیقت نگاری کے تمام ہنر اس مائل کی تحریر میں استعمال کیے۔ تربیت میں سے فارغ ہونے ہی دو گارڈیہ نے
Hélène Foucault سے شادی کر لی مگر وہ کھرب نہیں ہوتی۔ ان کے ایک ہی اور بیوی اور وہ فری ہی
ان کے مابین طویل عرصے کا سبب بنی۔ بعد میں دونوں میں طلاق ہوئی اور مفکر بیوی نے دو گارڈیہ کے
ایک قریبی دوست سے شادی کر لی جو اس سے کچھ ہی عرصے بعد انتقال کیا۔

دو گارڈیہ نے 1907 میں اپنے خرقہ پر ایک مائل Devenin شائع کیا جو ایک ناکام مائل نگار کے
بارے میں تھا۔ اس نے اس سے پہلے ایک مائل Une view de Saint لکھا تھا مگر اس کو خود ہی رد
کر دیا۔ تصنیف کے میدان میں دو گارڈیہ کی کامیابی اس کے مائل Jean Barois سے ہی تھی جس کو اس

کے نائب علمی کے زمانے کے دست Gaston Gallimard نے 1913 میں شائع کیا تھا۔
 جنگ عظیم اولیٰ کے اختتام کے بعد دوبارہ نے کچھ دنوں قسطنطنیہ میں کام کیا۔ پیرس کی ادبی فضا کی
 گہماگہمی سے اکتا کر اس نے ایک گاؤں Bellême میں جا کر قلمبندی کیا۔ دوبارہ پوزیتو خود کوئی خوش حال نہ
 رہا بلکہ وہ انسان نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ماؤس ٹوئس کے میدان میں اس کا داخلہ ایک نسل گیر سے
 ہوا۔ 1940 میں جرمنوں کے فرانسیس پر حملے کے دوران دوبارہ فرانسیس سے فرار ہو کر اٹلی کے شہر ٹریس چلا گیا
 اور جنگ کے ختم ہونے تک وہیں مقیم رہا۔
 نو جہدوں پر مشتمل ماول Les Thibault کے علاوہ دوبارہ نے مترجم ماول اور کچھ جو بہت مقبول
 ہوئے۔ اس نے 1958 میں وفات پائی۔

خصیافت سے خطاب

عزت قلب ہی عہد کے زیریں یہ اسحق برابر سے معزز اور قابل احترام خواتین و حضرات کی موجودگی
 میرے جذبات ممنونیت کو برانگیختہ کر رہی ہے، بالخصوص جب میں اسحق میرے تو عینی کلمات بھی میں رہا
 ہوں جو مجھے مخاطب کر کے کہے جا رہے ہیں۔ بد مہالہ اس وقت میں اپنے آپ کو اس پرندہ شب کی مانند
 حیران و پریشان پاتا ہوں جس کا چاکلہ اس کے گھونسلے سے اٹھا کر دن کی روشنی میں ڈال دیا گیا ہو جس
 کی اندھیروں سے ماؤس نکلیں دن کی چمک دار روشنی میں غمرہ ہو جاتی ہیں۔
 میں سوینہ شاکاؤنی کی جانب سے عطا کیے جانے والے غیر معمولی نشانِ شکر پر مستحق ہوں مگر
 آپ حضرات سے اپنی حیرانی کو چھپانے میں خود کا کام پاتا ہوں۔ جب سے میں نے اپنے کانہ حوصل
 پر آپ کی حمایت و فرواں کا بخیر بخوش کیا ہے جس نے سراسر مجھے مضبوط کر رکھا ہے، میں اپنے آپ سے
 یہ سفاک کر رہا ہوں کی میں اس کی وضاحت کس طرح کروں۔
 اس سمرت آگئیں موقع پر سب پہلے میں نے اپنے ملک کو سلام پیش کیا۔ مجھے بے انتہا سمرت
 ہے کہ اس برس کے اوج کے لیے فرانسیسی زبان کے ایک صوب کے انتخاب سے معزز سوینہ شاکاؤنی نے
 ورامیل فرانسیسی زبان کے ادب کی حراج سرائی کو مناسب چلا ہے۔ اس کے برعکس میں اپنے ہم وطن، مانی
 گرمی اور قادر ہنگام، ایسے بہت سے عظیم شاعروں سے واقف ہوں جن کو اس اعزاز کے لیے چنے جانے
 کے بہت سے جواز مل سکتے تھے۔ تو پھر اس کی مقامِ اعزاز پر میں کیوں؟

سب سے پہلے تو آجیب خود کافی نے، جس کو میں مکمل طور پر کبھی فی موٹ نہیں کر سکا ہوں، پیسے سے میرے کان میں کچھ چاہی ہوئی جرے جو زچش کیے۔ میں نے تو اپنے آپ سے یہ سناں تک کر لیا کہ کیا کبھی ”بے اُصوں انسان“ کو جو میں آپ کو سمجھا ہوں، یہ اعزاز دے کر سونپنا کادری اس بات پر ضرور تو نہیں دے دی کہ اس صدف میں جب ہر مٹی بقیہ ”اور“ ”حق“ کی باتیں کرتا ہے کتب خدایہ اشخاص کو چنا جائے جو ”متذہب“ ہوں ”شبیہ میں لائے دے“ ہوں ”سناں کرنے والے“ ہوں، ایسے آزادانہ ہوں جو طرف داری کی سرنگیزیوں سے ہر اہوں، جن کی مسلسل کوشش ایسے افراد کی ظہیر کی پورش ہو جو آزاد فکر ہو اور اس حد تک وسیع القلب بھی ہو چکا کہ ایک خاکی انسان کے لیے ممکن ہو سکتا ہے۔

میر خیال ہے کہ یہ اچانک ملنے والا اعزاز، معمولی پر عادی ہے جو مجھ کو ہمیشہ سے عزیز ہے۔ اس انسان کے استعمال کے لیے ”اصول“ ایک بے لفظ ہوتا ہے جو یہ کہتا ہو کہ میں اپنی رائے کو ہمیشہ کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں۔ مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ اپنے فن کی مشق کے لیے میں نے ہمیشہ اپنے آپ پر کچھ بھی اصول مسلط کر رکھے ہیں اور ان سے وفاداری نبھانے کی کوشش بھی کی ہے۔

میں اس وقت بہت کم ہنس تھا جب میرا سہ ماہی عمرانی کے ادیب ماس ہارڈی کے ماہوں کے ایک کردار کے بارے میں اس خیال سے پوچھا تھا ”اس کے نزدیک زندگی کی اصل قدر اہل کاٹھنی میں چھنی کہ لہ ما کی فی خصوصیت ہوتی ہے“ گویا اس نے میرے اندر پوشیدہ وجدان کے اہل تاروں کو چھینا۔ جو میرے دلی مشغل سے مستک ہیں۔ وہ دن اور آفت کا دن، میں نے یہ بات اپنی گمرہ میں بالمدھوں سے کہنا دل کا روشن مقصد زندگی کے لہ ما کہ عنصر کو بنی عطا کیا ہے۔ آفت میں اس میں یہ اضافہ کیا چاہوں گا کہ کسی فرد کی زندگی کا اہل ما کہ عنصر وہ ہے جو ہوتا ہے جس کے ذریعے مقدر کی تکمیل ہوتی ہے۔

اس مرحلے پر مجھے ماسٹروئے کی زندگی چاہیے۔ مثال کی طرف اشارہ کیے بغیر چاہ نہیں، جس کی کتابیں میرے دینی دلقا پر مزا ازا ہوئیں ہیں۔ وہ پیدائی ماہوں کا راپتے آپ کو اس دعوے یا جوش کے ذریعے پہچانتا ہے جو انسان کے ذہن کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتا ہے اور اس میں پوشیدہ ہر نوٹ کے کردار کے اسکی رنگ کو اس طرح نکھارتا ہے کہ ہر وجود کا ہر لاپتہ ظاہر ہو جائے۔

میرے خیال میں کسی مادی نگار کے کام کی جگہ کا آکر کوئی مکان ہے تو صرف اس کی تخلیقات میں چٹن کیے ہوئے کرداروں کے معیار اور مقدر پر منحصر ہوتا ہے۔ مگر شاہد بات یہ کہ حتم نہیں ہو جاتی۔ مادی نگار کو زندگی کا معمولی شعور ہونا چاہیے، اس کا کام کائنات کے درمیان اس کی ذاتی بصیرت کا آئینہ بننا چاہیے۔ اس مقام پر ماسٹروئے پھر ایک عظیم، بے فن نگر آتا ہے۔ اس کا تخلیق کردہ ہر کردار کم و بیش کسی غریب، بعد اظہار فی خبط کا مستحق آتا ہے، اور ہر وہ انسانی تجربہ جو اس نے پیش کیا ہے، زندگی کے اہل معنی کے بارے میں ایک بے ممکن سوال معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ جیوں کی میرے لیے خوش آمد ہے کہ ایک مادی نگار کی حیثیت سے میرے کام کی توصیف کے ذریعے سونپنا کادری نے، اس ناقابلِ مرقا

مثال، اور اس جو بر قائل سے فیض دہی کے جذبے کو بواسطہ غریب پیش کیا ہے۔

اگرچہ میں اس پڑھنے سے متاثر ہوئے پر ان درناک خیالات کو ابھارنے میں جو ہم سب کو پریشان کرتے رہے ہیں، بے انتہا غبارت محسوس کر رہا ہوں، مگر میری خواہش ہے کہ میں اپنی تقریر کو ایک زمانہ دور مغموم مغرور سے پر تمام کروں۔ شہر سوئڈش اکادمی نے بھی، بہ وجہ، میری کتاب "Été 1914" [Summer 1914] کی طرف دیکھنے والی تھی کہ یہ کتاب نے اس کے لئے ایک نیا دور کی ہے جو اس امر کی تائید کرتا ہے۔

میں مائل ہوں کہ میری آخری کتاب کا۔ اس کی قدر و قیمت کا تعین میرا کام نہیں۔ مگر کم از کم میں اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ اس میں جن جملوں کے ذریعے یورپ میں ہونے والی 1914 کی لام بندوں کے ماحول کو یہ دور زندہ کرنے کی کوشش کے ذریعے میں کیا گیا تھا، اس میں نے اس زمانے کی خصوصیات کی کم زوریوں، تذبذب، نا اطمینانی اور غیر واضح خواہشات کا خاکہ پیش کرنے کی جرات کی ہے۔ سب سے زیادہ تو میں نے اس پسند موافق کی خواہش بالکل کے دو نقطوں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اس قصہ کو اکھاڑ بچھاؤ سے قبل 'نہر کی تھی، جس کے، خود دکھار ہوئے، وہ آگے بڑھ چکا تھا جو لوگ لاکھ آئینوں کو موت کی ٹینڈر لٹائے اور ایک کرہ کو پانی کرنے والی تھی۔

جب دنیا کی سب سے بلند مرتبہ یورپی نے تمام تر اعزاز اور اقتدار کے ساتھ کسی کتاب کی طرف توجہ کر کے تو میرے دل میں یہ خیال ابھرا ہے کہ یہ سب کچھ اس بنا پر تو نہیں کہ اس کی کتابیں ساری دنیا میں مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ ان قدر میں کا بھی پرچار کرتی ہیں جو ایک بار پھر خطرے میں ہیں، جو جنگجو قوتوں کے شیطانی حیرانم کے پھیلاؤ کے خلاف ایک ہند کا کردار ادا کرتی ہیں۔

میں اس مغرب کا غم نہ ہوں جہاں تھیں دلوں کی جھجکا رہا ہے ذہنوں کو سکین نہیں دیتی۔ چوں کہ آج دوسری دوسری کے سوتے پر، جو افریقہ و ایشیائی ممالک کی تاریخ بھی ہے (اس افریقہ و ایشیائی کی جو کچھ ایک سایہ عافیت ہی نہیں تھا بلکہ ایک ایک انقباض کا سہارے والا تھا جس نے اپنی تمام میدان قوسوں کے درمیان ایک جذبہ برآمدی پیدا کرنے پر مرکوز کر دی تھی)۔ مجھے کہنے کی اجازت دیجیے کہ "میرا کام، جس کو اس کے نام سے اعزاز دیا جا رہا ہے، نہ صرف ادب کے مقام میں معاون ہو، بلکہ اس کی کوششوں پر بھی اثر انداز ہو تو کتنا اچھا ہوگا۔ ان چھوٹی مہموں میں، جن سے ہم تر رہے ہیں، جب کہ کتب و رش کے طور پر آثار و منقوشوں میں خوب دیکھی ہوئی ہے، جب تشریف بر جسد ثانی ہوئی ہندوؤں کے اطراف، دینی بدھائی اور ہندو پسند چھروں کی "دوڑ" سے، چلی گئی ہو، جب کہ غمید و شکست خوردگی کی دھکی کے بہت سے "کارہ" ہو چکے ہوں، اس عملی رضامندی کی پرچھائیاں پڑ رہی ہوں جو صرف جنگوں کا سبب بنتی ہیں، جب انسانیت ایسے غیر معمولی اور عجیب نعمات سے نوازا رہی ہو، بغیر کسی جذبہ خود نمائی کے کہ ایک قسم کی مسلسل اذیت سے مضطرب رہی کے ساتھ میں خواہش کرتا ہوں کہ میری کتاب "Summer 1914" فوراً سے

پڑھی چائے اور زبرد بحث آئے دورانِ صبح کو بزرگوں کو جو بچہ لے گئے ہیں اور نوجوانوں کو جن کو نہ کسی بات کی خبر ہے نہ کوئی پروا، افسوس ناک باغی سے حاصل ہونے والے سبق یاد دلانے۔



یوحنا اوئل

اعتراف کمال: اس کے نبیوں میں تخلیقی قدرت، سچائی اور گہرے جذبات کے لیے جن میں نبی ہر لمحے کا تصور پیش ہوا۔

یوحنا اوئل کی دنیا بالکل بے ہوا سی تھی، اور ہم مائی سے محروم تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کے لیے زندگی سے شرمناک سوئی تھی۔ اس کی وہ شاہد اوئل کے نوجوانی سے ملے تجربات تھے جب وہ علاج کی حیثیت سے سمندری سفر پر رہا کرتا تھا۔ اوئل کو شہرت سے نفرت تھی، لہذا اس نے ہر اس عمل سے پرہیز کیا جو اس کو مشہور کرتا، شاید اس لیے بھی کہ اس کے خیال میں، اس کی زندگی کے نام میں یہ کچھ سو و موجود نہ تھا جو شہرت کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا۔

اوئل کی تخلیقات کی مایوسی ماننا اس کی شخصیت کے فہم کا بنیادی حصہ تھی، ویسے اس دور کے ادب لکھنے والوں کا انداز بھی کچھ سی قسم کا ہوا کرتا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ اس میں امریکوں کی پرانے انداز کی رہائش پسندی کے رد عمل کا بھی دخل رہا ہو۔ کوئی بھی وجہ رہی ہو اوئل کے ذہن اور فن کی تربیت ان کی فطرت پر ہوئی اور نتیجے کے طور پر وہ اپنے زمانے کے شاید دنیا کا سب سے درد انگیز ڈراما نویس تھا۔ اوئل نے اپنی تحریروں میں جس زندگی کا تصور پیش کیا ہے وہ صرف خیالی نہیں بلکہ کسی نظر آتی ہے جو خود اس نے عکس ہو اور اس کے اپنے تجربے کی بنیاد پر وجود میں آئی ہو۔ ایک قدیم طریقہ کی ام مائی جس کا پ

کتاب کوئی انفرادی جواز نہ دے گی اس قسم کی جنس سے اندرونی غور پر تجسس حاصل نہ ہوسکے۔ مگر وینیل کی اسی
لنہ کی نے ایک بڑے تخلیقی فن کی تیار رہی کی اور اسی کی بنیاد پر اس دور کے سب سے بڑے ڈراما نگار کا اچھا ہوا۔
وینیل ایک نہایت محتاط، حقیقت پسند اور تنگ مزاج ادیب تھا۔ مزاج کی حیثیت سے اس کا
سمندر کی سفر اور اس دوران تھائی کے تجربات کا ہی شاید اثر تھا کہ اس نے اس زمانے کے ٹھیکڑ کو ایک
منظریہ نگاہ کی خدمت سے متعارف کرایا جس کی وجہ سے ٹھیکڑ کو دنیا اس کی طرف سنجیدگی سے منسوب ہوئی۔

وینیل کے بہترین ڈراموں میں Anna Christie (1922) Desire under the Elms (1924) Mourning Becomes Electra (1931), Long Day's Journey into Night (1946) The Iceman Cometh (1955) وغیرہ قابل ذکر ہیں جن کا جہان طویر سے بے تک پھیلا ہوا
ہے۔ اس کے تھیں عملاً ایسے بے بس کرنا دلوں کی عکاسی کرتے ہیں جس کو اپنے سستہ اور عادات پر قابو
نہیں ہوتا۔

سیویں صدی کی جنگی دہائی میں وینیل کے کہیں کی نیو یارک میں پذیرائی شراپ ہوئی۔ 1918
اور 1924 کے درمیان اس نے The First Man, The Hairy Ape, The Fountain, Wexed
وغیرہ کتب جو بہت مقبول ہوئے۔ دوسری دہائی میں اس نے Edmond Rober (Edmond Rober)
(Jones) اور کینتھ مک گووان (Kenneth McGowan) کی شراپ میں Tramwate کے نام سے
ایک تجرباتی ٹھیکڑ شروع کیا جس میں اس کے کھیل بھی پیش کیے جاتے تھے۔

یوچین وینیل نیو یارک میں ایک آئرش کیتھولک خاندان میں 1881 میں پیدا ہوا اس کی ابتدائی
زندگی بڑی ناگوار تھی۔ اس کا باپ ایک اور کیرتھی اور اس کا بیشتر وقت مشہور کہیں The Court of
Mome Crest کے پیش کرنے کے سب سے میں سفر میں گزارتا تھا اس لیے کہ اس تھیل کا وہ مرکز کی کرور تھا۔
1885 میں وینیل St Aloysius Academy میں داخل ہو اور 1900 میں سین مین کے دار سے Dela
Sale Instrane میں بھیج دیا گیا۔ وینیل کی ماں کو مارٹین سٹورس کرنے کی لت پڑ گئی تھی جو کہا جاتا ہے کہ
وینیل کی پیدائش کے دوران کثرت سے دی گئی تھی۔ اس کی ماں کی ایسی کیفیت کی وجہ سے وینیل کا بچپن
کچھ اچھا نہیں گزرا جس کے خراب اثرات اس کی شخصیت پر پڑے اور ممکن ہے کہ اس کی شخصیت کی گئی اور
سیویں امداد تجربے کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو۔ وینیل کی ماں نے ایک بار خود کشی کی کوشش بھی کی
تھی۔ 1902 میں وینیل Beza Academy Stanford میں داخل ہو اور چھ برس بعد اس نے پرنسٹی
یونیورسٹی میں داخلہ لیا جہاں وہ صرف ایک برس ہی پڑھتا رہا۔ اس دوران اس کا بیشتر وقت
نیو یارک کے مے خانوں اور چھانوں میں گزارتا تھا۔

1909 میں وینیل نے پرنسٹیون یونیورسٹی (Kathleen Jenkins) سے شادی کی جو صرف دو سال تک
تاکم رہی۔ اس شادی سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ 1910 میں وینیل سمندر کے سفر پر چلا جس کے دوران وہ

ہندو گاہوں پر اور ہندوؤں میں مشغول رہا۔ اس نے ایک بار خود کشی کی کوشش بھی کی تھی۔ اس کو تپ دلی کا عارضہ بھی لاحق ہوا تھا اور چھ ماہ تک سنی نوریم میں علاج کے لیے داخل رہنا پڑا۔ آخر صحت یاب ہو کر نکل۔ تپ دلی سے صحت یابی کے بعد اوہیل نے نامے لکھنے شروع کیے اور اس سلسلے میں کچھ دن ہارورڈ یونیورسٹی میں قریب بھی حاصل کی۔

خراب صحت کی وجہ سے اوہیل نوٹس انعام لینے کے لیے اسٹاک ہوم خود چلا گیا۔ اس کا بیٹہ تھیلو مرسدیہ ریوں میں ہی گزارا۔

یو جین اوہیل نے چوس کے کب جھگڑا مے کھسے اور 1953 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

(یوں کہ جناب چین اوہیل خرابی صحت کے باعث قریب میں شریک نہیں ہو سکتے تھے اس لیے ان کی جگہ امریکی مقامات خائے کے ایک اعلیٰ افسر نے تھیلو کے الفاظ ادا کیے اور ان کی تقریر پڑھ کر سنائی)

اساتذہ ممتاز افراد کے اجتماع میں شرکت۔ عیناً ایک غیر معمولی رعایت ہے جو مجھے اس لیے مل رہی ہے کہ میرے ہم وطن جناب یو جین اوہیل، جن کو ادب کا ٹوٹل انعام عطا کیا گیا ہے، بد قسمتی سے آج کی تقریبات میں شرکت نہیں کر سکتے اور مجھے ان کی نمائندگی کرنے کا فرض مہیا ہوا ہے۔

میرے لیے یہ ایک غیر معمولی رعایت اس لیے اور بھی ہے کہ نوٹس انعامات کی اہمیت اور بڑی قدر و قیمت کا دنیا کے ہر حصے میں احترام کیا جاتا ہے۔ یہ انعامات صحیح معنوں میں احرام اور توقیع کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اس لیے بھی کہ سب جانتے ہیں کہ انعامات دینے کے فیصلے بغیر کسی نہ رعایت بغیر کسی قسم کے تحسب کے کیے جاتے ہیں اور فیصلے کرنے والی کمیٹیوں اور ان کے مکان اپنے فرائض کی انجام دہی میں بہت سوچ بچار کرتے ہیں، بہت وقت صرف کرتے ہیں۔

کارہائے نمایاں کی انجلی توصیف کرے اور ان میں معدود ہونے والی کوششوں کو ہمیز کرنے کے علاوہ کسی یہ عوامت قابل قدر ہیں۔ انعامات دینے کے فیصلے میں کسی قسم کی جانب داری سے عمل بچنا ہی دنیا کے تمام ممالک کے لوگوں میں اس سوچ اور جذبہ کو ابھارتا ہے جس کی بدولت انسانیت حقیقت اور

قومیت کی تمام حد بندیاں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ تاہم قدر کام کے ایسے کھلے اعتراف کے مثبت اور مستحسن اثرات مشہور و مشہور ان کی حد سے بہت آگے، دور تک لے جاتے ہیں۔

جناب O'Neill^۲ اس لیے تشریف نہیں لائے کہ کام کی نیوولی کی پہرے سے ان کی صحت اس حد تک خراب ہو گئی تھی کہ ان کے طبیوں نے ان کی مائے لیے، اپنے گھری میں کھل آرم اور سکون کی زندگی گزارنے کا مشورہ دیا ہے۔ ان کی خواہش ہے، اور میں ان کے خط میں تحریر انھیں کے اعتماد و ہر اتے ہوئے کہیں گا، کہ وہ تمام حضرات جو اس تقریب سے وابستہ ہیں، ان کی غیر جانبداری کے بیان و ان کی تجویز کی باور کریں گے، ان کی من مانی تک مزاحمت یا اس نوعیت کی کسی دوسری بات پر محملی نہ کریں گے۔ اپنی غیر جانبداری کے پیش نظر انھوں نے گورا ایک تختہ کی تقریر ارسال کی ہے تاکہ اس موقع پر ان کی جانب سے پیش کی جانے والے اپنے خط میں انھوں نے اپنی تحریر کے بارے میں لکھا ہے کہ ”سوئیڈن کے جانرین و صرف ٹوٹا کرنے کے لیے یہ نیوولی پرفیکشنسٹ نہیں۔ میرے سچے جذبات پر مبنی ایک سیدھا سادہ مابینان ہے جس کے پڑھے جانے پر مجھے مسرت ہوگی۔“ اب میں جناب وینن اوئیل کی تقریر کو پڑھنے کی مسرت حاصل کر رہا ہوں جو انھوں اس اجتماع سے خطاب کی خاطر مجھے رسائی کی ہے۔

مصنف کی ارسال کردہ تقریر

سب سے پہلے تو میں ایک دیر بھر اپنے مائیک کا اگھا رکھنا چاہتا ہوں کہ موجودہ حالات کے پیش نظر اس تقریب میں شرکت کے لیے میں بذات خود سوئیڈن آنے، شامل ہونے اور اپنی ممنونیت کے بہ طور انجمن سے معذور ہوں۔

اوئیل انومو عیا ہے جانے پر، جس کے حصول کا میں نے ابھی اپنے تیش تصور بھی نہیں کیا تھا، اپنے انکی و ممنونیت و تکر کے لیے مجھے مناسب انعام نہیں مل رہے ہیں۔ یہ اعلیٰ ترین تمیاز اس لیے اور بھی مہمیت کا باعث ہے کہ میرے نزدیک، یہ عزائم صرف میرے کامی کے لیے نہیں بلکہ امریکا میں میرے تمام لکھنے والے ساتھیوں کے لیے ہے، کہ یہ انعام دراصل یورپ کی جانب سے امریکا کے تخیل کی دیانت کے اعتراف کی علامت بھی ہے۔

میرے لکھے ہوئے تخیل محض حالات اور کسی حد تک خوش قسمتی کے سبب، جب تک شکیم و نام کے بعد لکھے جانے والے امریکی لبرمانویوں کے کام کے نمونے کے طور پر مشہور ہوئے، وہ سارے کام جنھوں نے جو یہ امریکی نامے کو وہ تمام عرصہ گزرا ہے امریکی قوم جس پر بجا طور پر غرور بھی کر سکتی ہے، اور بات حق یورپ کے ہر ایک نامے کے ساتھ بے شائبہ تخیل بھی ہے، یا جب جس سے ہم نے تخلیقی فیض حاصل کیا ہے۔

تخلیقی فیض کا ذکر کرتے ہیں مجھے بے پایاں مسرت کے ساتھ بلا کسی باک کے یہ کہنے بدھج

معنوں میں احترام کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ میرے فن نے آپ کے عظیم ہم وطن، دنیا کے تمام ذرا،
تکامل کی آمد، ناجائز رنگارنگی، ڈراما کار August Strindberg کے فن سے خوشتر نہیں کی ہے۔

۲ اگست انٹرنیٹ پر گئے اور سے پڑھ کر ہی میں نے فریاد کھنا سیکھا ہے۔ 1931-1941 کے
موسم سرہا کے جس دہائی میں نے لکھنا شروع کیا تھا، سب سے پہلے اسی کی تحریروں نے مجھے جدید
ڈراما کے دوڑ سے آشنا کیا تھا کہ جدید ڈراما ہوتا کیا ہے۔ اسی نے مجھ میں تھیٹر کے لیے خود کھیل لکھنے کی
لنگ پیدا کی تھی۔ اگر میری تحریر کسی حد تک قدر و قیمت کی حامل ہے تو وہ اسی کی دہائی، دہائی تحریک کا فیض ہے جو
لکھنے پر سب سے مجھ میں بہت سی دہائی ہے وہ تھا، وہ دہائی اسی کی تحریروں سے حاصل ہوئی ہے جس نے مجھے
اگر مجھ میں کوئی اسیت تھی تو، اس ناجائز رنگارنگی کے نقوش قدم پر، اسی کے اخلاقی اصولوں کے مطابق، چپے کا
حوصلہ دیا۔

بے شک آپ، یعنی قوم سینیٹان کے لوگوں کے لیے یہ کوئی بدی نہیں ہوگی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میر
فن بہت حد تک انٹرنیٹ پر گئے، اثرات کا مرکب ہوا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس کا اثر میرے چند ہی
ذرا میں پڑ گیا، بہت دور تک صاف نظر آئے گا۔ یہی یہ ان لوگوں کے لیے کوئی خیر ہوگی جو مجھ سے کبھی
واقف نہ تھے، اس لیے کہ میں خود اس بات کا ارتقا کرتا رہا ہوں۔ میں ان بڑوں کو فہم میں سے نہیں جو نہ
کسی عمل میں خود اپنی شرکت کے، نہ میں متذبذب میں ہوتے ہیں نہ ہی اس لیے کسی اور کے فیض و اثر کا
احترام کرنے کی طرف دیکھتے ہیں، نہ لوگوں کو ان میں عزت کا فقدان محسوس نہ ہونے لگے۔

وہ حقیقت میں انٹرنیٹ پر گئے کا مقصد نہیں ہونے پر ایک گونہ غور محسوس کرتا ہوں، اور اس کے ہم وطن
لوگوں کے سامنے اس اعلان کے لیے موقع پانے پر بے حد مسرور ہوں۔ میرے نزدیک اس کا وہی مقام ہے
جو خود اس کے دائرہ نظر میں طے کا تھا، ایک ماہر فن 'مستاد' جو آج کے دن بھی ہم سب سے زیادہ جدید ہے
ہمارا رہ رہے۔ اور مجھے اس بات پر بھی غور ہے کہ اس کی طرح اس دن کے نیشنل انعام کے فیصلے پر یہ دیکھ
کہ ایک گھنٹہ سکون کے سبب مسکرا رہی ہوگی کہ اس کی روپ چٹنے والے سچے 'مستاد' نظر میں بالآخر نہیں۔

لوئجی پیراندیلو

اعتزاف کمال۔ اورے اور فنی ہتھ بھاری کے بے باک اور ہر مذہبیتا کے لیے۔

لوئجی پیراندیلو نے بہت لکھا ہے۔ مختلف زبانوں کے مصنف کی حیثیت سے اس کے پنے وطن اسی میں شاید ہی کوئی ہوگا جس نے اس کی ادبی تکنیک کے میدان میں اتنا تخلیقی مواد چھوڑا ہوگا۔ یوگائیو (Boccaccio) نے سو مختلف ماحول چھوڑے تو پیراندیلو نے 1922-37 کے درمیان جتنے دن تھے جسے مختلف ماحول تحریر کیے جہ تھیں ایک بے کاماد ہے۔ اور یہی نہیں کہ اس نے معیار سے قطع نظر ہر دن ایک مختلف ماحول لکھ دیا۔ اس کے سارے ماحول اپنے مواد اور اوجہ کے اعتبار سے مختلف ہیں جن میں زندگی کے بے شمار نکاس، حقیقی یا فلسفیانہ رنگ میں یا متناس بیان الفاظ میں پیش کیے گئے ہیں جن میں جس قدر خطر ہے اتنا ہی مزاح بھی ہے۔ اس کے ہاں مشاعرانہ تخیل کا ایسا بیدار ہونا ہے جس میں غلبہ حقیقت کی جگہ معیار اور تخلیقی سچائی کو ملتی ہے۔

پیراندیلو کے فن کا مہذبہ انکس یہ ہے کہ اس کے قلم کی محرک قوت نفسیاتی تجربے کو بھی دوسرے کے نہیں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ عام طور پر تخیل کو جسے ہم انسانی کرداروں کی ضرورت ہوتی ہے مگر اس کے ہاں جذبات ایک مسئلے کے مانند ہے، ابہام کے پیچھے بہاؤ ہے اس طرح کہ یہ بتا ہی نہیں چکتا کہ وہ حقیقت اندر کا مرکز کیا ہے؟ آخر کار یہ بتانا ہے کہ یہاں سرے سے کوئی مرکز ہے ہی نہیں۔ ہر چیز ایک دوسرے

سے شلک ہے، کچھ بھی کھل طور پر قابو میں نہیں، اس کے باوجود بھی کہیں غیر زبان کے میں القوی ماثرین کو بھی سکتے ہیں ڈال دیتے ہیں، مہبت کر دیتے ہیں۔

ابتد میں پیرا دیلو کے ایلے کا فن عام ادبی برہان سے کچھ نیو دیو لٹلف نہیں تھا۔ ڈاؤمرے عام دیوین کی طرح اس نے بھی معاشرتی اور خلقی مسائل، والدین کی ذمہ داریوں اور سماجی ماحول کے درمیان آویزش کھندب دیوانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی اور آخر میں فتح یا شکست پر اپنے کہیں کو ختم کیا۔ مگر جیسے جیسے اس کا فن ترقی کی منازل سے گزرا گیا ویسے ویسے اس کی غراوجت کے نقوش ابھرتے گئے۔

پیرا دیلو نے 1880 کے آدھے حصے کو لکھا شروع کیے تھے مگر بعد میں اس نے اسٹیج کو ماویں کے مقابلے میں ایک بے حس طریقہ اختیار سمجھا تھا اور فیئر کی طرف راغب نہ ہو تھی۔ 1915 کے بعد سے اس نے ایلے کی طرف توجہ دلی اور پھر سال کے دوران اس نے سولہ کہیں لکھے۔ La Regione Degli Ani (1915) پیرا دیلو کا مشہور سر مشہور (Three-act) کہیں تھا۔ سپرے تو اس کہیں نے زیادہ حقیقت حاصل کہیں کی تھی مگر اس میں شامل Angelo Musco کی اداکاری کی وجہ سے ماثرین اس کی تحریروں کی جانب متوجہ ہوئے۔

پیرا دیلو کو، تھا مارٹھا اببا Martha Abba کے چکر میں ایک مثالی نسوانی کردار مل گیا جس کے لیے نہ صرف اس نے کئی کہیں لکھے بلکہ اس کو اپنے فیئر پیش کرنے والے ایلے میں بھی شامل کر دیا اور پھر اس سے دل بھی لگا لیا۔ اس ہوماس کا سریش مارٹھا کے نام اس کے عشقیہ خطوط سے تھا ہے جو Love Letters to Martha Abba کے عنوان سے 1934 شائع ہو چکے ہیں۔

پیرا دیلو کو سیاست سے بھی دل چاہا تھا۔ اس نے 1923 میں ایلے کی فاشسٹ پارٹی کی رکنیت حاصل کرنا چاہی اور فیئر آرٹ فیئر آف روم کی فاسس کے لیے ایلے کے آمر مسولین کی امداد حاصل کر لی۔ مگر چند برسوں بعد یہ اور وہی مشکلات میں پھنس کر ختم ہو گیا۔ 1934 میں پیرا دیلو کے کہیں The Fable of the Cgangeing پر فاشسٹ پارٹی کے مقتدر حصوں نے کٹہ چینی کی جس کے نتیجے میں اس نے حبشہ (Ethiopia) پر حالیہ کے حصے کی طرف داری سے پرہیز کیا۔

لوئیجی پیرا دیلو 1867 میں ایلے کے جزیرے میسولی (Sicily) کے شہر Girgenti میں کلاب Agrigento کہا جاتا ہے، پیدا ہوا۔ اس کا متول باپ گندھک کی ایک کان کا مالک تھا جس کو بعد میں میلاب نے ناماف کر دیا۔ نوجوانی کے زمانے ہی سے پیرا دیلو اپنی استعداد اور فہم تھا گھاس نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا جب کہ اس کا باپ اپنے بیٹے کو ایک ذخیرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ 1887 میں پیرا دیلو ویلی ورینی آف روم میں داخل ہوا اور پھر وہاں سے ویلی ورینی آف یون فٹل ہو گیا جہاں سے اس نے Roman Philology میں ڈاکٹریٹ کیا۔ ذمہ سے وہ ایسی پر پنے خاندان کی مافی مانت سے پیرا دیلو نے تفسیر کا پیشہ اختیار کیا۔ اس نے گونے کی Roman Beges کا ترجمہ کیا، اپنے شعری مجموعے اور

ایک افسانوں کا مجموعہ مرتب کیا۔ 1898 میں جرمانہ یلو اس تہہ کے ایک کالج میں طبی دہ کا پروفیسر مقرر ہوا جہاں اس نے چونتیس برس تک ادب کی تعلیم دی۔

جرمانہ یلو نے 1894 میں سیمس کے ایک مالی دارمندی کے کان کے مالک کی بیٹی Tonessa An Portuano سے شادی کی۔ اس کی بیوی کاغذی مرض میں مبتلا ہوئی۔ اس کی حالت بڑھ بڑھ کر خراب ہوئی جس کی وجہ سے وہ بچہ ہو گئی۔ جب عظیم اول کے زمانہ جرمانہ یلو کے بیٹے جینی قیدی بنائے گئے۔ اس کی بیوی کی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ آخر کار اس کو بچہ گھنے میں داخل کرنا پڑا۔

جرمانہ یلو کی چھپائی کتابیں شائع ہوئیں اور اس نے 1935 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

جذبات تہہ دردماں شاہی سوینڈن کے لیے احترام سے پاؤں اور مسک قلب سے شہر نرمانی کے اعزاز پر مشتعل ہوں اور اس کو اپنی خوش قسمتی جانتا ہوں کہ آپ نے اور آپ کے اہل خانہ نے اس مختصر ضیافت کو اپنی شرکت کا اعزاز بخشا۔ چارٹ کا طلب گار ہوں کہ اپنے دل کی گہرائیوں سے، اس شام کے استقبال کے لیے اپنے خیر مقدم کے لیے میزبانوں کا بھی شکریہ ادا کروں، جو اس محترم اجتماع کا ایک قابل قدر اختتام ہو گا جس میں مجھے 1934 کے ادبی نوبل انعام کے قائل سمجھا گیا اور سوینڈن کے بولت ناب شاہ کے جنرل القدر با تھوں کو ٹاٹا گیا۔

میں شاہی سوینڈن کا وہی کے اس غیر معمولی نصیب کے لیے بھی احترام سے پاؤں اور اپنے قلم سے شکر کا اظہار کرتا ہوں جو میرے طویل ادبی مشاغل کی بات چٹ کے مترادف ہے۔

اپنی دینی کاوشوں اور جدوجہد کی کامیابی کے لیے مجھے دیہاتی حیات سے رہنمائی ملتی ہے۔ ایسا دیہات، جو کچھ روشن فکر و افروغوں کے لیے شاید بے کار ہو مگر مجھ جیسا منہمک مرتکز سماج کی بچہ جیسا، نماز بردار شاعری اس تہہ کا نہیں تو کم از کم زندگی کا ایک یہ شاعر جو اپنے عمل عقیدے اور غم کو کبھی اور کسی صورت میں بھی پس پشت نہیں ڈالے گا۔ عقیدہ تو میری ساراہی فطرت کا حصہ ہے۔ میرے خیال میں، غم بردار بھی جسے کے بغیر ہمیں زندگی کے ظاہری اظہار کو دیکھنا چاہیے۔

میں نے جتنی نیا دہ قہر دی ہے اور جتنے تسلسل سے غور کیا ہے، مجھے ہمیشہ نکسارتی کا سبق ملتا ہے، زندگی کے لیے محبت اور احترام کا سبق، کمینوں سے بھری سرائی کیفیت کے لیے، تکلیف دہ تجربات کے لیے

قولہ مالک رضوی کے لیے اور بھتیجی کی اُن ماری خطاؤں کے لیے جو ہمارے تجربہ کو گہرائی اور گیرائی عطا کرتی ہیں۔ بہت جتنے کاموں حاصل ہونے لاقی، دماغ کی یہی تربیت نہ صرف میری نشوونما میں معاون ہوتی ہے بلکہ اس نے مجھے اپنے آپ میں رہنا بھی سکھایا ہے۔

میری علمی فطرتی صلاحیت کی نشوونما نے مجھے زندگی کے پھر میں ایک بھنگنے کے لیے چھینے دیا، ہر لکھ ایک ایسے سچے فن کار کی طرح جو ملی محسوسات اور تخلیقات کا ارتقا رہو تخلیقات کا اس لیے رشتہ محسوس کرنا ہوں اور محسوسات کا اس لیے کر میں سوچنا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کی تخلیق کے سمجاس میں، وہی پیچیدہ فحش کیا ہے جس کو میں نے سوچا اور جس پر میں یقین کر سکتا تھا۔

میں اس بات پر بے پایاں فخر، مسرت اور فخر محسوس کرتا ہوں کہ میری یہ تخلیق اتنے بڑے افکار کے قابل سمجھی گئی جو آپ کی جانب سے آج مجھے عطا کیا گیا ہے۔

میں اس بات پر بے حد شوق سے یقین کرنا چاہوں گا کہ یہ اعادہ کھنے والے کی فن شکاری کو نہیں، جو ہمیشہ قابل نظر امدادی ہوتی ہے، بلکہ میرے کام کے لیے شافی غلوں کو مل چکا ہے۔



ایوان بیونین

اعترافِ کہاں۔ اس کا مل فی کارنی کے لیے جس کے ذریعے میں نے شکرگاری میں مدنی مایات
کی پاس نہ رکھی تھی

اپنے ملک (روس) کی ادبی تاریخ کے تناظر میں ایوان بیونین ایک اہم ادیب کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ روسی ادب میں اس کا ایک ایسا مخصوص مقام متعین ہو چکا ہے جس پر کوئی انگلی نہیں اٹھ سکتا۔ بیونین نے روسی نثر کے ادب کے ارتقا کو بڑی دیکھ بھال کے ساتھ اس سویرے صدی کے روسی مہذب اعلیٰ ادبی مہارت کی بڑی کامیابی سے پاس رکھی تھی جس نے زندگی کی حقیقتوں کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا اور اس کے بیان کے لیے ایک مادی طرز، نگار پر بڑی کامیابی سے اپنی ساری صلاحیتیں مرکوز کیں۔ بیونین نے انطلاقی کے ظہور میں پچھلے ادبی موضوعات سے ہلکے چالے پر بڑی محنت سے قابو پایا ہے۔ ایک پیدائشی شاعر ہوتے ہوئے بھی اس نے اپنے نگار کی زبان نگار کے لیے کبھی اصل مقصد سے روگردانی کی پیشکش نہیں کی۔ اس کے تنقید نگار بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ بیونین نے اپنی مادی نثر میں بھی بڑی حساسیت سے کام لیا ہے کہ اس کا بیان ایک خوش مزہ شہرہ کے مترادف ہوتا ہے جس کا ذائقہ دوری زبان میں کیے جانے والے ترجموں میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بیونین کی صرف یہی خصوصیت اس کی تحریروں کو شاہکار بنا دیتی ہے۔

ایوان بیونین نے روسی اشتراقیہ اور کسانوں کی زندگی کے انحطاط کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے

ایوان سے انقلاب روس سے قبل کے ادیبوں کی شخصیتوں میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یوین کو اپنی نثر نگاری کے بعد سے شہرت نصیب ہوئی حالانکہ اس نے اپنی تخلیقی عمر کے دوران شاعری بھی کی جس میں زندگی کے بنیادی مسائل کو بھی موضوع بنایا۔ یوین کا پس منظر ایک مہاجرین اس کو جدید تجربات کرنے والی شخصیات کے مقابلے میں انیسویں صدی کی قدآور شخصیات۔ ترمیدوف، ماسٹرنے، گاسس، چیخوف وغیرہ کے زیادہ تر بھائی ہیں۔

یوین 1870 میں مرکزی روس کے گاؤں Voronezh کے قریب واقع اپنے جہاد کی جائیر میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ چارلیز و شرافت کے ایک وسیع وسیع سے تعلق رکھتا تھا جو غلامی کے اختتام تک قائم تھا۔ یوین کا نانا ایک بڑا جاگیردار تھا مگر اپنی جوان بیوی کے انتقال کے بعد اس نے اپنی جائیداد کو بیٹے میں اٹانا شروع کیا۔ یہی کچھ شراب اور جئے کی مدد سے یوین کے باپ نے کیا۔ انیسویں صدی کے آخر آتے اس کے خاندان کی مالی حالت کم زور ہو چکی تھی اور اس کی فست خانہ کی تعداد یوین نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جو اس کی زندگی کے داغ بھی میں عسرت میں تبدیل ہو چکی تھی۔

1881 میں یوین Yelers کے پبلک اسکول میں داخل ہوا مگر پانچ برس بعد اس کی مہجور اسکول چھوڑ کر گھر واپس آنا پڑا۔ یوین کے بڑے بھائی نے جو یوپی ورٹی میں پڑھا اور سی سی و جہاد کی عطا پر قید و بند میں بھی رہا تھا، اس کو سمجھنے پر اور دھمکی، گولی، سزا، قتل وغیرہ کو پہنچنے پر آمادہ۔

مترہ میں کی عمر میں یوین نے شاعر کی حیثیت حاصل کرنی تھی جب اس کی نظم سینٹ پیٹرز برگ کے ایک رسالے میں شائع ہوئی۔ اس نے تعمیر کیا جاری رکھا اور 1891 میں اس کی پہلی کہانی (Country Sketch) Derevensky eska مینوکی Mikhaylovsky کے رسالے Russkoye bogastvo میں شائع ہوئی۔ 1889 میں اس نے اپنے بھائی کی طرح مقامی سرکار کے دفتر میں کلرک کی حیثیت سے ملازمت کرنی۔ بعد میں Orlovskiy Vestnik اخبار میں نائب مدیر کے فرائض پر مامور ہوا، ایک سب خانے کی نگہداشت کی اور Potava کی عمارت میں شادی کے مہر کی حیثیت سے کام آیا۔ یوین مختلف اخباروں کے لیے کہانیاں لکھتا رہا اور اسی دوران اس نے چیخوف سے محبت و دوستی شروع کی جو بعد میں قریبی دوستی تک پہنچی۔ یوین کا تعلق گوئی کے Znanie Group سے بھی رہا۔ 1894 میں اس کی ملاقات ماسٹرنے سے ہوئی۔ اگرچہ وہ ماسٹرنے کی تحریروں کا مذاق تھا مگر مصنف کے اخلاقی اور سیاسی خیالات سے متاثر تھا۔ 1899 میں یوین کی ملاقات میکسم گوئی سے ہوئی جس کے نام اس نے اپنی شاعری کے مجموعے Lesopad کو مہنون کیا۔

یوین کو On the Farm, The News from Home, To the Edge of the World, Antonov Apples اور The Gensleman from San Francisco جیسی معرکتہ آواز کہشوں سے شہرت ملی۔ انقلاب روس کے بعد کسانوں کی زندگی سے متعلق لکھے گئے اخبار سے یوین کے مضمون صحت

کمیٹر ہو گئے۔ شررک دانش دوس کے مقابلے میں دیگی نڈی سے قریب ہونے کی وجہ سے یونین کے نزدیک یہ لوگ بالکل ناجی شدت پسند اور حکومت کے کاموں کے نیے موزوں تھے۔ اس سلسلے میں اس نے اپنے روزنامے Cursed Days A Diary of Revolution میں یہ عبارت What a terrible gallery of convicts لکھ کر ان دوس کی نکلی تضحیک کی۔

ایک مترجم کی حیثیت سے بھی یونین حرام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس نے 1898 میں Henry Wadsworth Longfellow کے The Song of Hiawatha کا ترجمہ شائع کیا جس کو 1903 میں پختی نوم سے فوٹا گیا۔ اس نے لایڈلٹون، مینیسن، انگریڈ سوسے (Alfred Musser) اور فرانسوا کوپے (Francis Coppée) کی تحریروں کے بھی تراجم کیے۔

یونین نے 1898 میں ایک یانی اتحاد کی لڑی سے شادی کر لی۔ جب عظیم دل سے نکل اس نے سیون (جواب سون کا بدنام ہے)، فسطین، مہر، ترکی اور دوسرے ممالک کی مدد کی تھی۔ اس نے سوردی کے تین سو سو گوردی کے ساتھ کپوری کے جریہ سے پرہیزیے۔ نقاب دوس کے بعد 1917 میں یونین ماسکو چھوڑ کر لڑکیا چلا گیا جہاں سے فرانس جانے والے آخری بحری جہاز سے ترک وطن کر کے فرانس چلا گیا۔ ترک وطن کے بعد یونین نے صرف دوس کے بارے میں ہی لکھا۔ کئی بار اس کا نام نوٹل انعام کے لیے یہ جانا رہا جو معنف کے لیے مامت کا رحت ہوتا تھا مگر ہڑکار 1933 میں اس کو ادب کا نوٹل انعام دیا گیا۔ انوم کی وصوفی کے لیے اسٹاک ہوم کے سفر کے دوران یونین کو سٹاپو نے جو ہرت کی غیر قانونی تجارت کے ٹرم میں گرفتار کر لیا اور تفتیش کے دوران معذ سے کی صفائی کی فرنی سے اس کو ایڈ کا تیل (Castor Oil) بھی پینے پر مجبور کیا گیا۔ دہری جب عظیم کے دوران جب وہ فرانس میں عظیم تھا یونین نے ہمر کی حکومت و سخت مخالفت کی اور کہا جاتا ہے کہ اس نے کئی یہودیوں کو اپنے گھر میں پناہ بھی دے رکھی تھی۔

یونین کو چالیس ستائیں شائع ہوئیں اور اس نے 1953 میں فرانس ہی میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

وہ نومبر کی نویں تاریخ تھی، یہاں سے بہت دور Provençal کے علاقے میں ایک پڑے دیگی مکان میں جب مجھے ٹیلی فون کے ذریعے اطلاع ملی کہ سونیزش کا دی نے مجھے اس انعام کے لیے منتخب کیا

سے سائرمیں وہی کہوں جو اپنے موقعوں پر سب ڈک کہتے ہیں کہ ”یہ میری زندگی کی سب سے اہم اور جذباتی خیر تھی“ تو صحیح معنوں میں سچ نہیں کہہ رہا ہوں گا۔ ایک بڑے فلسفی کا قول ہے کہ ”ان جذبات کے مقابلے میں جو کسی دن کا باعث ہوں، غشی کے چند ترین جذبات بھی سچ ہوتے ہیں۔“ اس قول کے بیان سے میں اس کیفیت میں، جس کو میں نا عمر یاد رکھوں گا، اس کے بارے میں پوچھتا ہوں، مگر تھوڑے عرصے کی جانت چاہوں گا کہ میری زندگی کے پچھلے پندرہ برسوں میں مجھے چند شادیوں سے زیادہ مالی ہی نصیب ہوئے ہیں۔ اور یہ سارے دن ذاتی نوعیت کے نہیں بلکہ اسی کے برعکس تھے۔ مگر میں نہایت وثاقت سے کہہ سکتا ہوں کہ میری پوری دلی زندگی میں کسی واقعے نے مجھے اتنی جتن بجا نب تکیں نہیں پہنچائی تھی جتنی کہ اسٹاک ہوم سے گرسی (Grasse) کے ایک ٹینسٹا ماسٹ کے چھوٹے سے ٹینس ”سینٹرے“ سے ملی۔ آپ کے عظیم ہم وطن، انریکو ٹوٹل کے قائم کردہ عظمت میں بلند ترین انعامات آج بھی کسی ادیب کی تعریف کی جاتی پوٹل کے مترادف ہیں سائرمیں کی خوش رکھے: دے سارے کھینے والوں کی طرف سے بھی اس وقت بے انتہا فخر محسوس کیا جب نہایت اہل و علمیر باریب دار چندی نے مجھے یہ اعزاز دینے کا فیصلہ کیا، اور یقین کیجئے، کہ میں آپ کا بے حد شکر گزار بھی ہوں۔ اگر ۱۹ نومبر کی اس رات، میں نے صرف اپنے بارے میں ہی سوچا ہوتا تو میں ایک گھنہ اور خود غرض انسان ہوتا۔ سائرمیں کے سارے پھیلاؤ کے سبب نے مجھے اس شب کی خاموش تہائی میں سوئیڈش اکادمی کے ٹینسے اور خام کے مطالب پر غور کرنے کا موقع دیا۔ ٹوٹل فیوڈیشن کے قیام کے بعد کی تاریخ میں پہلی بار آپ نے کسی جلاوطن کو یہ اعزاز عطا کیا ہے۔ تو پھر حقیقت میں کیا ہوں؟ سائرمیں فرانس کا، جس کے لیے بھی مجھ پر تشکر کے الفاظ کافی قرض نہیں ہے ایک جلا وطن مہمان! غلے کا دلی کے مکان حضرت، میری ذات، اور میرے کام کی ہیئت سے قطع نظر، آپ کا انتخاب بذات خود ایک نہایت خوب صورت علامت کے مماثل ہے (خوب صورت علامت اس لیے نہیں کہ اس میں میری ذات ملوث ہے)، اس لیے کہ یہ بہت ضروری ہے کہ ہماری دنیا میں اصل آزادی کے مراکز قائم ہوں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس میز پر بھی، سائرمیں کے، تھنپوٹ اور دیگر سائرمیں کے ہر قسم کے خدشات کی نمائندگی موجود ہے مگر ہم سب ایک سچائی پر متحد ہیں، ضمیر کی آواز کی آواز کی پر، غلے کی آواز کی پر، اور ان تمام آزادیوں پر ہماری تہذیب بھی اٹھنا اور ہے۔ ہم کھینے والوں کے لیے آزادی، بالخصوص، ایک کٹر عقیدہ ہے، ایک مسئلہ اصولوں سے۔ نظرات اکادمی، آپ کے انتخاب نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ سوئیڈن میں حریت سے محبت سچ کی ایک ٹوٹی عتید سے کے مترادف ہے۔

اس مختصر تقریر کے ختام پر چند الفاظ آپ کے شاہی خاندان، آپ کے ملک، آپ کے عوام اور آپ کے ادب کے لیے اس صراحت کے ساتھ کہ یہ سب سچے سچے ہیں، ایک عرصے سے میں ان سب کا مداح ہوں۔ آپ کے شاہی خاندان نے صرف کے احرام کی اتنی طرح پاسداری کی ہے جس طرح آپ کی عالی مرتبت قوم کرتی رہی ہے۔ سوئیڈش شاہی خاندان جس کی ایک نامور سپاہی نے ڈائی تھی،

دنیا کے مشہور شاہی خاندانوں میں سے ایک ہے۔ اس جدولت قاب قلمین کے جدولت قاب و شاہی خدمت میں یہ عاجز، پرہیزی، آندروا و ص، جس کو سوئٹزرلینڈ اکاڈمی نے اس الفکار کے قائل سمجھا ہے، جندولت کی گبرنیوں کے ساتھ سب پلین احترام خزانہ کرنے کی چارٹ چاہتا ہے۔



جان گاٹزورڈی

اعترافی کمال۔ اس کے متنازعہ بیان کے لیے جو فورسٹ سماگا (The Forsyte Saga) میں اپنے مزاح پر نغمہ لکھا ہے۔

انگریز کی محاورے کے مطابق منہ میں چاندنی کا چھلے سر پیدا ہونے والا اولیٰ نگار اور ناول نویس جان گاٹزورڈی نے جانیہ کے اعلیٰ طبقے کی تصویر کشی اور لکھیے سماجی طرز کے حوالے سے مشہور ہوئے۔ گاٹزورڈی ان ادبی روایت کے عم برہنوں کا نمونہ وقت جو ناول کو ساجیات کی تصویر کے لیے ایک قانونی بوزار سمجھتے تھے۔ اس کے نزدیک ادیب کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ ایک مسئلے کی بیان کر دے اس پر روشنی ڈال دے مگر اس کا نظریہ پیش کرنا اس کا کام نہیں۔ تصنیف کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے گاٹزورڈی نے کچنگ، زور، ترکیب، ہاسٹوئے اور Flaubert کو بہت احترام دیا تھا۔ گاٹزورڈی کے پسندیدہ لکھنے والے تھے کرے، ڈکس اور بیوٹل تھے جب کہ موسیقی میں وہ بے تھوین کا بہ مذاق تھا۔

گاٹزورڈی نے انگلستان کی مشہور کاؤنٹی سرے کے مرگے و دیہے جیتے کے ایک خاندان میں آنکھ کھولی۔ اس کا باپ ایک کامیاب قانون دان اور محقق اداروں کا ڈائریکٹر تھا۔ اس کی ماں بے گنس ملڈینڈ کے ایک صنعت کار گھرانے کی خاتون تھی۔ گاٹزورڈی نے آکسفرڈ، Oxord وریو و Harrow میں قانون کی تعلیم حاصل کی اور اس دوران اس نے فٹ بال اور کرکٹ کے کھیل کے حوالے سے بھی شہرت پائی۔

گائورڈی پر ستر بھی بنا تھا اس نے قانون کو اپنا پیشہ نہیں بنایا اور ایک ناکام محنت کو بھولنے کے لیے بہت سے ملک کا سفر کیا۔ اپنے واپس کے 1904 میں انتخاب کے ساتھ ہی گائورڈی معاشی طور پر خود مختار ہو گیا اور ایک سال بعد ہی اس نے ایڈا کوپر (Ada Cooper) سے اعلانِ شادی کر لی جس کے ساتھ وہ دس برس سے خفیہ طور پر رہ رہا تھا۔ اپنی باتھ ہاؤس شادی باپ کے تقاب کے بعد اس لیے کر کہ باپ اس شادی پر ہرگز راضی نہ ہوا۔ گائورڈی کی بیوی اس کے بہت سے بھائیوں اور بہنوں کے سواہی کرداروں کی بنیاد تھی۔ ایڈا کوپر کی پہلی شادی گائورڈی کے ایک عم زاد سے ہو کر نوٹ چکی تھی اور The Man of the Property (1906) کی تصنیف اسی شادی کی بنیاد تھی۔

1893 میں جنوبی مسندوں کے سفر کے دوران گائورڈی کی ملاقات جوزف کیزل سے ہوئی۔ اس ملاقات میں کیزل نے اس کو قانون کو چھوڑ کر ادب کی طرف راغب کیا۔ گائورڈی کی پہلی چوتھینیت بات سنبان کے فریضی نام سے شائع ہوئی تھیں جن کا نام بارس نے خود لکھا تھا۔ بعد میں اس کو احساس ہوا کہ ان میں سے تین کتابیں ریڈیو ڈیکھنگ کے رنگ میں تھیں۔

گائورڈی نے مومباہاں اور ترگینٹ کے مطالعے کے بعد (1900) Villa Ruben لکھی اور یہیں سے اس کو اپنی اگلی آواز ملی۔ گائورڈی کی پہلی کتاب جو اس کے اپنے نام سے شائع ہوئی The Island Pharisees (1904) تھی۔

گائورڈی کی کتاب The Man of the Property (1906) نے اس کو ایک اہم مصنف کا درجہ دیا۔ یہی کتاب اس سلسلے کے ماحولوں کی ابتدا تھی جس کو The Forsyte Saga (1906-28) کا نام دیا گیا۔ گائورڈی کی کہنوں کے مجموعے، The Man of Devon (1901) کی ایک کہانی میں اس سے پہلے فورسایت خاندان کا تذکرہ ہے۔ آج کے چل کر The Forsyte Saga کی بنیاد بننا ہے۔ فورسایت سرگرم اس کی ماحولوں کے ایک سلسلے کا نام ہے جس میں ایک اوسط درجے کے بری فوئی خاندان کی تین نسلیں کے حالات پیش کیے گئے ہیں۔ مگر فورسے دیکھا جائے تو اس کے کئی کردار اس کے اپنے قریبی امور کے حالات کو فریضی نام سے پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے کے ماحولوں میں To Let (1921), In Chancery (1920), The White Monkey 1924, The Silver Spoon (1926), Swan Song (1928), A Silent Winding Passers By وغیرہ شامل ہیں۔

ایک ڈراما نگار کی حیثیت سے گائورڈی نے ان کئیوں کی وجہ سے شہرت حاصل کی جن میں وہ قومی جوت کی مسابقت تقسیم اور غریب عوام سے بے انتہائی مہم جوئی میں اپنے خیالات پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر The Silver Box (1906) میں اس نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اس ملک میں امیروں کے لیے وہ قانون ہے جب کہ غریبوں کے لیے توچہ اور Safe میں اس نے کاتھوں کی ہڑتالی کے مضمون کو دہرایا ہے اور Justice دیکھیں ہے جس سے سناٹا ہو کر بری فوئی وزیرِ عظمہ ڈیسنی جی جی کو جلیں

کے عہد میں مدھانے کا خیال آیا۔ The Skin Game کو مشہور برطانوی فلم ساز افریڈ ہیکاک (Alfred Hitchcock) نے اپنی ایک فلم کا موضوع بنایا جب کہ Loyalties صیہونیت کی تحریک کے خلاف کھیل تھی۔ اس کا کھیل Escape و بار فلم سازی کے لیے استھان ہوا جس میں قانون کی چمکادی گھسنے والا ایک شخص ایک طوائف سے رہا رکھنے کے دوران حادثاتی طور پر ایک پولیس حکام کو موت کا مجرم قرار دیا جاتا ہے اور قید سے فرار اختیار کرتا ہے۔

جنگ عظیم اولیٰ کے دوران گائڈروں نے فوج میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر انہیں کم زور ہونے کی وجہ سے اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس سے فرائس چائروڈ گروہ کے لیے کام کیا، جنگ میں اس کی جڑوں کی مدد میں کام کیا اور اپنی آدمی آمدنی غریب لوگوں کی امداد کے لیے منتقل کر دی۔ گائڈروں نے 1917 میں مکرو کوریہ کی جانب سے عطا کیا جانے والا اعانت جڈ کا خطاب لینے سے اس لیے انکار کیا کہ اس کے خیال میں اسے یہ اعزازات قبول نہیں کرنے چاہئیں۔ فوٹیل، انعام میں سے ایک رقم سے گائڈروں نے PEN کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جو انگریزوں کے ادبی و Poet, Essayist اور Novelist کے پہلے حقوق سے جتا تھا۔

گائڈروں نے میں اول، ستائیس شخص، مشاعرے کے قلم نگار تھے ایک سو تہتر انسانے، مضامین کے پانچ مجموعے، سب سے پہلے دیکھے اور بہت سے خاکے بنائے تھے۔ اس کے 1933 میں انتقال کے بعد گائڈروں کی سہاکہ میں کمی واقع ہوئی شروع ہوئی اس لیے کہ اس کی تحریروں کو جان ایچ لارنس اور ورجینیا وولف نے شہرہ آفاق کیا نہ بنایا۔ اس کے بعد لکھنے والوں نے گائڈروں پر انعام لکھا کہ جس معاشرے پر وہ تنقید کرتا تھا بہ ذات خود اس کی تعمیر تھی۔



ایریک ایکسیل کارل فیلٹ

اعترافِ کمال۔ ایریک ایکسیل کارل فیلٹ کی شاعری کے لیے۔

ہر بڑی شاعری میں روایت اور تجربے کے درمیان نہ صرف یک گونہ ہر ایک تعلق ہوتا ہے بلکہ اس میں اصولی تجدید و تھوڑے بھی جاری و ساری ہوتے ہیں۔ ایریک کارل فیلٹ کی شاعری میں سوئڈن کی قومی روایت اس لیے زندہ ہے کہ اس نے اس کا حین چاہا ہے اور یہ ایک بہتہ کھن کا مرقعہ۔ یہ قائلِ تعریف بات ہے کہ یہ شاعر جس کا وجدان و جھلک ہوتے ہوئے، غرضی سے مشتاق ہے، اپنے طرزِ انکسار میں نیا اور تغیر دہاتی تھا اور اس نے نہ ہی بے باکی سے اشتراکی کوششیں کی ہیں جب کہ جدیدیت کے علم بردار یا عہدِ عصری رجحانات اور روشوں کی کئی چیزیں کہتے رہتے ہیں۔

اگر کوئی غیر ملکی سوئڈن کے کئی دانشمندیوں سے یہ پوچھ لے کہ ایریک کارل فیلٹ میں کیا خاص بات ہے جو تم لوگوں کو اس کی تعریف مجبور کرتی ہے اور اس کی کون سی خصوصیت ہے جو کوئی شاعر یا ال کا قدر بندہ کرتی ہے تو وہ بد جھجک یہ کہے گا کہ

”ہم اس شاعر کے سن اس لیے گاتے ہیں کہ یہ ہمارے قومی کردار کو جس الماژ
 نوکر سے ہٹ سے چٹا کرتا ہے ہم سب کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ کاش ہم
 ویسے ہی نظر آئیں۔ اس لیے اور بھی کہ وہ ہمارے قومی روحوں کی اس بحرِ بے مادر

اور بلبل مڑو دینے والی شیرازی سے نغمہ سراؤں کو کہ ہے کہ ہمارے دل و دہانے پہ
صنوبر کے درختوں سے بھرے پہاڑوں کے سائے میں آباؤ اجداد کی محبت میں جھوم
ٹھٹھکتے ہیں۔“

فکر بھر اس کو خود اس بات کا احساس ہو گا کہ اتنا عام سا موضوع حتیٰ جو بہ مکمل ہے اس لیے کہ کارل فیٹس میں
چاہے جانے کے قابل اتنی خصوصیات پوشیدہ ہیں جن کی بدولت وہ جانچ کسی غیر ملکی کے لیے ناممکن ہوئی۔ مگر یہ
سے کہ کارل فیٹس کی شاعری کے، رے میں کیل پہلے سے تیار شدہ، کشاف مکمل ہو گا کہ اس میں جموں کے
یسے عناصر پوشیدہ ہیں، ایسی قوتیں اور جھلکیں جو سویت میں جو کسی قسم کے تجزیہ کی گرفت میں نہیں آسکتیں۔

بین الاقوامی سطح پر گہم مامگر اپنے علاقے کی روایت سے وابستہ ہے حد پسند بلکہ شاعری کے لیے
نویک کارل فیٹس کو نوٹل انومس کی وفات کے بعد دیا گیا اس لیے کہ 1918 میں اس نے یہ انعام اس
لیے جیتنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس وقت وہ سوئیڈش کاوی سے وابستہ تھا اور اس لیے بھی کہ اس کے خیال
میں محاسب کے اہل رے سوئیڈن کے بہت سے نکمے و نوس کو نوٹل انعامات سے نوازا جا چکا تھا۔ اگرچہ
کارل فیٹس اپنے ملک میں بہت پڑھا جاتا تھا مگر اس کا شمار غلط جیس کے مارے شعرا میں سے ہوتا تھا۔

ایک کارل فیٹس کا اصل پیدائشی نام ایریک ایکسل ایکسنسن (Erik Axel Enckson) تھی اور اس
کی پیدائش مرکزی سوئیڈن کے ویکی علاقے دارما (Dalarna) میں ہوئی۔ اس کا پاپ یک ویکی اور اس
کی ماں یک لٹرن Lutheran پسائی فرقے سے متعلق تھی۔ اسپالا (Uppsala) یونیورسٹی میں داخل ہونے
کے فوراً بعد ہی کارل فیٹس کے پاپ کو اپنی مشکلات کا سامنا ہوا اور بعد ازاں اس کا انتقال ہو گیا۔ کارل
فیٹس کو اپنی تعلیم نہیں کرنے کے لیے مدرس کی حیثیت سے کام کرنا پڑا اور بالآخر 1902ء میں نے ریجوینیشن
کر لیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد کارل فیٹس نے کتب خانے میں ملازمت کی اور اسٹاک ہوم میں زراعت
کی اکاڈمی میں بھی کام کیا۔

کارل فیٹس ابتدا میں گسٹاف فروڈنگم (Gustaf Fröding) سے متاثر تھا اور سوئیڈن میں اس
تحریک کا حامی تھا جس کے پیچھے راک ویکی ملاقوں کی سادہ زندگی کے دل و دودھے۔ کارل فیٹس نے ادیب
کی حیثیت سے بن ستر 1895 میں رے مانوی انداز کے اسچوں کے ساتھ شروع کیا جن کو فارسی کے حلقے
میں قابل غور نہیں سمجھا گیا۔ اس دور کی اپنی شاعری میں کارل فیٹس نے اس ماحول کی عکاسی کی جس میں
ادیب اور نصابی تعلیم کا نود و نڈل نہ تھا۔ کارل فیٹس کے دو مجموعے (1898) Fridolins Visor اور
(1901) Fridolins Lustgard شائع ہوئے جن میں مرکزی کردار یک افسانوی کفارے شاعر
فریدولین (Fridolm) کا ہے جو اپنے دیگی و سٹے کی طرف لوٹتا ہے۔ فریدولین ایک سادہ ویکی انسان
ہونے کے باوجود گہری نظر رکھنے والے انسان کی صورت میں پیش آیا گیا ہے۔

کارل فیٹس کی شمس ال دود پر شے انداز میں لکھے جانے والے لوک گیتوں جیسی اور دہائی

شاعری معلوم ہوتی ہیں۔ وہ اس دور کے سوئڈن کی بے شکم شاعری میں دل چسپی بیٹا دکھائی دیتا ہے جب اس کا ملک اس وقت یورپ کی سب سے بڑی طاقت تھا۔ کارل فیٹ کے مجموعے Flora Och Fomona (1905) میں عشق پرور قصبات کے بنیادی موضوعات ایک دوسرے میں گتھے ہوئے ملتے ہیں۔ جب کہ (1927) Hestern میں کارل فیٹ اپنے کراؤں کو ماضی اور اپنے دیں ماضی سے نکالتا ہے اور سوئے و حیات سے مجموعہ سرا نظر آتا ہے۔

کارل فیٹ نے اپنے مجموعے Flora and Besono (1918) میں اپنے موضوعات کو اس طرح وسعت دی جیسے شعر اپنے یہے خاص ذاتی تجربات کے بارے میں لکھتے ہیں جو زان ہوتے ہوئے بھی مقامی دکھائی دیتے ہیں۔ مگر اس مجموعے میں شاعر نے اپنے عصر کی مسائل کو انہی طرح سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

کارل فیٹ کی شاعری پچیس سوئڈن کے معروف شاعر جوتف فریڈلگ کے فن کے وقت کی تقریر اور سینکھیر لوپس کو فوٹیل لومہ دے جانے کے جسے سے خطاب تھیں۔ کارل فیٹ کے سولہ مجموعے شائع ہوئے۔ اس کی شاعری کے زیادہ تر حصے نہیں ہوئے۔
کارل فیٹ نے 1931 میں انتقال کیا۔



سکلیئر لیونس

اعترافِ کمال: اس کے ہر کام پر کارستانی، بیان و ردِ مذہبی و عبادت سے مستثنیٰ عملِ حیات کے لیے جس کے ذریعے وہ سچے سچے کرماء خدا شنے کی الہیت رکھتا ہے

امریکی مابولنگ کا نورمانوس اور سماجی تنقید کار سکلیئر لیونس اپنے نظریہ مابولس کے لیے مشہور ہوا۔ وہ پہلا امریکی ادیب تھا جس کو نوٹیل انعام سے نواز گیا۔ اگرچہ لیونس نے امریکی مذہبی حیات پر کثرتِ تنقید کی مگر امریکی طرزِ زندگی کے بارے میں اس کا تنقیدِ رجائیت پسند نہ تھا۔

لویس 1885 میں امریکی ریاست مینی سوتا کے حسین عریض زادوں کے درمیان واقع ساؤتھ سینٹر مائی کیک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ویلی علاقے کا ایک ڈاکٹر تھا۔ اس کی ماں کینیڈا کے باسی کیک ڈاکٹر کی بیٹی تھی۔ لیونس کی ماں تپ دق کے عارضے میں اس وقت انتقال کر گئی جب لیونس صرف چھ برس کا تھا۔ اس کے انتقال کے ایک برس بعد اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی مگر لیونس نے اپنی سوتیلی ماں کو بالکل اپنی حقیقی ماں جیسا رتبہ دیا۔ لیونس کے نزدیک اس کی جائے پیدائش ایک محبِ نظر اور دلکش ماہرہ ویلی علاقے کے مائیکھی اس لیے اس نے اپنے باپ کی بیٹی سکول کے مطالعے میں پناہ ڈھونڈ لی۔ اس کی سوتیلی ماں بھی اس کو بیٹی سمجھتی تھی چڑچڑاہٹ نہ تھی۔ لیونس سرخ بالوں اور بے رونق جلد کی وجہ سے اپنے ہم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کی جملے بازیوں سے بہت دور ہوا کرتا تھا۔ انھی وجوہ نے اس کو اپنے گھر سے

جنگ چلنے پر اکسپو ذرا یک دن، جب وہ صرف تیرہ برس کا تھا، فرار ہو کر فوج میں ڈھول بجانے والے ٹرک کے طور پر جرتی ہو گیا۔ فوراً بعد ہی اس کے باپ نے اس کو ڈھول نکالا اور نوکری چھڑ کر گھر واپس آئے۔ 1902 میں اس کو یو۔ این۔ ایس میں تعلیم کے لیے داخل ہو کر کچھ عرصے بعد نیل یونیورسٹی (Yale University) چھ گیا اور وہاں کے پتلے میں اس کی تحریریں چھپنے لگیں۔

ایک سال گرنی کی چھٹوں میں نیوٹن مویشیوں کے لے جانے والے وقتی جہاز میں سوار ہو کر برطانیہ گیا۔ دوسرے دن ہی، اپنے کالج سے جہاز ہو کر پاما، چر گیا جہاں شہر پاما میں سی نوکری مل گئی۔ 1906-07 کے دوران مقامی حکومت کے دفتر میں منطقی اور چھپواری کی ملازمت کی۔ کچھ عرصے بعد نیو یارک میں آزاد پیشہ ادیب کی حیثیت سے کھانا بھی شروع کر دیا۔ اپنے نیل یونیورسٹی کے قیام کے دوران بزرگ دیب جیک لندن سے لکھنے کی ملاقات ہوئی جس کو اس نے کہلوں کے پلاٹ لکھ کر فروخت کیے۔

نیل کو 1908 میں یہ اے کی گرنی کی اور اس نے بہت سے اثنائی ناول اور تحریروں سے برطانیہ سے شائع ہونے والے ناول کے لیے ہر قاعدہ کھانا شروع کر دیا۔ لوگس نے بچپن کی عمر سے ہی اپنا دنیا بچہ کھانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے کچھ دینی نغموں بھی لکھے اور حسین عورتوں کے جھگو سورسوں سے عشق کے قصے بھی۔ اس طرح 1921 میں ہی اس کے چھ ناول شائع ہو چکے تھے۔

نیوٹن کی پہلی شائع شدہ کتاب Like and The Aeroplane تھی جو 1912 میں ماسٹر گرام Tom Graham کے فرضی نام سے منظر عام پر آ چکی تھی۔ اس کی دوسری کتاب Our Mr Wrenn (1914) تھی جس میں اس نے ایک معنوی اور سادہ لوح ہیرو کے کردار کو پیش کیا جو ہم جوتی کے خواب دیکھتا ہے۔ اسی طرح کے کردار نیوٹن کے ناولوں سے ہوتے نظر آتے ہیں جن میں قابل ذرا ناول Man Street (1920) تھا۔ نیوٹن نے دوسرے ادیبوں کی شراکت میں تحریر کی شائع کیں جن پر اس کے ہم عصر ممبروں کے چھتے تھیرے کا شروع ہوئے اور اس کا دبا بند ہونا شروع ہوا۔ 1914 میں نیوٹن نے گریس لیونگسٹن ہیگر (Grace Livingston Hegger) نامی خاتون سے شادی کرنی جو وگ (vogue) نامی رسالے میں ہیری کی حیثیت سے ملازمت کرتی تھی۔ وہ برس تک نیوٹن کا سچا دوستان (George Doran) نامی رسالے کا مدیر رہا اور مشہور حاصل کرنے والے نغمے میں کام کیا۔ بعد میں اس نے ملازمت ترک کر دی اور اپنی شریک حیات کے ساتھ ملک کی سیاحت کے لیے نکلی کھڑا ہوا۔

دونوں کی اشاعت کے بعد نیوٹن نے ادب کی تخلیق کے سوا کوئی دیر کا نہیں کیا۔ اس کے ناول Main Street کی شاعت سے اس کی شہرت ہوئی۔ یہ ناول دراصل ایک ایسے چھوٹے سے مکتبہ کی مشابہت اور حقیقت کا مطالعہ تھا جس میں دینی قسم کی نکالیں، ہر صورت عادات میں جن میں پرانے مذاہن کے تحت پابند نظر لوگ آباد تھے۔ یہ ناول موسم خزاں میں شائع ہوا اور دیکھتے دیکھتے کرسٹمک سب سے

نیا وہ بگنے والی کتاب قرار پایا۔ مصنفین کے مطابق یہ ناول امریکی کاتوں کے لیے ایک نئی آواز تھا۔ Man Street کو Pulitzer Prize کے لیے چنا گیا مگر وہ بھی دیہی ورگی کے اہل اختیار نے اس نیشنل کو کاغذ کر کے یہ انعام اپنے حقداران (Edith Wharton) کو اس کی کتاب The Age of Innocence پر عطا کر دیا۔ لیونس کا ایک اور ناول Babba (1922) بے جگہ سے لکھا ہوا ایک امریکی ناول کا نام کرتا تھا۔ اس کا ادب (1925) Arrowsmith ایک ناول کے بارے میں تھا جو مشائیت پسندی اور تجارت پرستی کے بارے میں تھا۔ اس کتاب کو بھی Pulitzer Prize کے لیے نامزد کیا گیا مگر لیونس نے انعام لینے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کا پس منظر پچھلے ناول کے ناپس پانے کا رد عمل تھا۔

لیونس نے صدی کی تیسری دہائی میں تھیمز کے لیے کہیں لکھنے پر نیا وہ توجہ دی۔ اگرچہ وہ پابندی سے ناول لکھتا اور شائع کرتا رہا مگر کبھی کبھار بھی اس کے ناول بڑی تعداد میں شائع ہوئے۔ لیونس نے اپنے اپنی تمام حیات میں چونتیس کتابیں لکھیں۔

اپنی زندگی کے آخری دنوں میں لیونس نے نرسیوں کو اپنی سہیلی کے طور پر مدد دے رہا اور ان کے ساتھ شہر کوچہ کھیلا کرتا تھا۔ 1951ء میں اس نے ششما شرب نوشی کی وجہ سے انتقال کیا۔



ٹامس مان

امترافی کمال۔ خصوصاً اس کے عظیم ناول Buddenbrooks کے لیے وقت و رفتہ جس کی قدر
تشی میں اضافہ ہوتا گیا اور جس کو پھر کی ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل ہوا۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ مذہب، رسم اور فرائض کے بعد ادب کے میدان میں کون سی سب
ایچ وہائی ہے اور وہ کون سی نئی منفرد تخلیق کی گئی ہے جس کے ذائقے قدیم زمانہ کے ادب سے جڑے ہیں
تو جواب ملے گا حقیقت نگار ادب۔ پھر اس کی حالات کے تناظر میں خفیہ ذاتی و روحانی تجربات اور عمومی
مسائل کے ایک دوسرے پر غور سے پیدا ہونے والے فطری و ذہنی کے نتیجے میں ظہور میں آنے والا ناول ہی
پوری سچائی کے ساتھ ہی منظر کشی کرتا ہے جس کی قدیم ادب میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

ٹامس اور ہانس نگار کی کے زیر اثر وجود میں آنے والی مذہبی نظر جس کو ہم حقیقت نگار ناول کہہ
سکتے ہیں فکس تھا کر رہا تھا کہ قدیم مذہب، گوئی اور اسٹوئے جیسے انگریز، فرانسیسی اور روسی مصنفین کی
دین ہے جس میں ہر قسم سے جمہوریتوں کے ادیبوں کے چاہ سے کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا تھا۔
یہودیوں کی ابتدا ہو رہی تھی کہ ایک کتابیں ماہ ادیب نے (1904) Buddenbrooks جیسے ایک
عظیم انسان ادب تخلیق کیا جس کو شاہکار کے درجے پر فائز کیا گیا۔ اس طرح جدید ادب نے بھی اپنا حق
اداکر دیا اور یہ اہم کام تھمشی کے ادیب ٹامس مان نے انجام دیا۔

اپنی نوعیت کے قہار سے متوسط طبقے کے حالات، مسائل اور مشکلات پر یعنی Buddenbrooks ایک ماورقہ جو پچیس زمانے میں لکھا گیا جس کو متوسط طبقے کا دور کیا جاسکتا ہے۔ یہ ماورقہ ایسے معاشرے کی منظر کشی کرتا ہے جس کو خدو بہت بڑا کیا جاسکتا ہے۔ اتنا چھوٹا کر قابل اعتناء نہ کر دیا جائے۔ اس میں درمیانہ طبقے یا معاشرے کے سارے طبقے اور گھرے رنگوں کی جلوہ سامانیوں کے احرج سے ایسے منظر وجود میں آتے ہیں جس میں تاریخی آفاق، ہرستہ وقت، تبدیلیاں ہوتی ہوئی تسلیں، پراپی ورنٹی تدریں مل کر قاری کو ایک وسیع منظر نامے سے آشنا کرتے ہیں جس میں جراثیمی خیرشیں ہیں، جو ساری پرتوں کی تہوں میں پوشیدہ نفاق کے چشموں کو چارے کرتا ہے، جو ہر مارک مسکے و حقیر سے برتا ہے اور کہیں بھی زور اور کی نہیں کرتا، جس میں انفرادی تو ہے مگر یہ رنجیدہ کرنے کے بجائے قاری کو ایک زہر لب مزاج سے آشنا کرتا ہے۔

Buddenbrooks کی تخلیق سے پچیس کے عرصے میں تھامس مان نے ہلاستیاب آرثر، شوپنہاؤر، فیرڈیننڈ گیسے لکسینوں کو پڑھا اور رچرڈ وگسٹر کی دل فریب موتی کی بیروں سے الگ رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس ماورقہ میں اس نے مقصدی غنائیے (terrors) کی تکنیک کو مستعمل کیا جو اس نے ڈاکٹر سے حاصل کی تھی۔ تھامس مان نے اپنا یہ ماورقہ ۱۸۹۷ء میں شروع کیا تھا جو ابتدا میں ایک خاندان کے ایک فرد کے بارے میں ایک چھوٹی سی کہانی پر مشتمل ہوا تھا مگر بعد میں اس میں اضافے ہوتے گئے اور یہ ایک اہم ثروت خاندان کی طویل عمر و دل چسپ داستان بن گیا۔

Buddenbrooks کی تکمیل کے بعد تھامس مان نے مختلف ماورقہ لکھنے کی طرف توجہ دی اور Tonio Kroger، اول لکھا جو ایک روحانی خود نوشت تھی جس میں لہجہ اور نظم و ضبط کے بارے میں چھان بین کی گئی تھی۔ ماورقہ Kongliche Hehet (۱۹۰۹) میں آیا جو فزیشن اور قاری کے بارے میں مصنف کے خیالات کی ترجمانی کرتا تھا۔ تھامس مان کا مشہور ماورقہ Der Tod in Venedig (Death in Venice) 1912 میں شائع ہوا بعد میں جس پر مبنی مشہور فلم بھی بنائی گئی۔

اس برس کی مختصر شوقہ کے بعد تھامس مان نے ایک اور بڑا کام کیا۔ اس کا نام امرامور قابل قدر ماورقہ Der Zauberberg (The Magic Mountain) 1924ء شائع ہوا جو کم کردہ انسانیت کے بارے میں تھا۔ اس میں مصنف نے قدامت پسندی اور آنا و خیالی قہر مان کے درمیان مناظرے کی تصویر کشی کی تھی۔ تھامس مان ۱۸۷۵ء میں جرمنی کے شہر لیوبیک Lubeck کے ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوا اس کا باپ ڈیوڈ Lubeck کا صدر و بعد یہ منتخب ہوا اس کی ماں جرمن پرنسٹن تھامس مان سے تھی۔ تھامس مان کے باپ نے ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا جس کی وجہ سے اس کا تھامس مان کا دواور بند ہو گیا اور اس کا خاندانی منظر جو جرمنی کے شہر میونخ چلا گیا۔ لیوبیک کی ابتدائی تعلیم کے بعد تھامس مان نے میونخ یونیورسٹی میں پڑھا اور کچھ دنوں اس نے نیچے کے ایک اور سے مل کر دوست بھی کی۔ تھامس مان کی چھٹی کتاب Der Kleine

Herr Friedmann تھی جو 1898 میں شائع ہوئی۔

جینی میں پٹر کے قتلہ میں آتے ہی ماس مان اپنا ملک چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ چلا گیا جہاں سے اس نے اپنی برسرِ کار Mass and Wen کی ادارت سنبھال لی اور کچھ ہی دنوں بعد امریکا میں جا کر آباد ہو گیا جہاں پر نسلی یونیورسٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔

ماس مان ری ادب کا بڑا مذاق تھا۔ اس نے ماسٹوئے پر کئی مضامین لکھے۔ اسے ماسٹوئے کا Anna Karenina بہت پسند تھا ماسٹوئے کی بعد کی تحریریں پسند نہ تھیں۔ اس کے خیال میں گوتے کے مقابلے میں ماسٹوئے کے قتلہ دسجے کا ادب تھا۔ ماس مان کا آخری بڑا کام Dorian Faustus (1947) تھا۔

ماس مان کی چالیس کے قریب کتابیں شائع ہوئیں۔ 1947 میں ماس مان امریکا سے یورپ واپس ہو کر رہنے لگے جہاں سے انہوں نے سوئٹزرلینڈ میں زیورخ کے قریب قیام کیا جہاں 1955 میں اس کا انتقال ہوا۔

ضیافت سے خطاب

اب جبرتی کے بیانیہ مرقی ہارن آئی اور سچی تو یہ ہے کہ میں کچھ معنوں میں بیان کی نہیں کر سکتا کہ مجھے اس گھڑی کا اتنی لذت سے انتظار تھا۔ مگر فوسس کراہی میں صداقت میں خدا پرست جیبات کا بوجھ نہیں رہتا۔ اسے بالکل اسی طرح جیسا کہ چھوٹی طور پر تقریر کی صلاحیت نہ رکھنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

میرے ہی لکھنے والے تقریر کو صلاحیت سے عامی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لکھنے والے اور بولنے والے نہ صرف تیسرے مختلف ہوتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے متقابل صنف آرا سمجھتے ہیں اس لیے کراہی کے کام بھی اور ان کی کامیابی بھی مختلف سمجھ میں خدمت کرتی ہیں۔ بالخصوص بالکل فطری طور پر کہ راجح العقیدہ لکھنے والے کو ہر ایک اور غیر وابستہ انداز سمجھتا اور اس طرح کے اختصار و الفاظ سے کراہت ہوتی ہے جس میں تقریر کرنے والا جان بوجھ کر خواہ مخواہ جانا ہو جس کا الفاظ کے بجائے اس کی شخصیت ہر اس کے حرکات و سکنات پر گہرے ہوں۔ مگر میرے مسئلہ کچھ عارضی مشکلات کی بنا پر بالکل ہی پیچیدہ ہو گیا ہے، ایسی مشکلات، جنہوں نے میرے ہنگامی تقدمات تقریر کو آہل چھل کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ میرا اشارہ ان حالات پر ہے جو اب اور دو چار بات کی طرف ہے جن میں آپ حضرات، یعنی سائنس کی دنیا کے ارکان، نے

مجھے ڈال دیا ہے۔ سچ کچ مجھے آپ کے اُن گھن گرج اور گھبراہٹوں سے عزائات کا بالکل اندازہ نہ تھا آپ جن کے چھانکرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ میرا حراج ڈرامائی نہیں بندھیہ ہے۔ میرا بھالنا درمیری خود بہشت ہمیشہ یہ سکون کی حلاجی ہوتی ہیں جس میں چٹا ہونے میں زندگی اور لڑنے کے لیے متوازن آہنگ رکھنے ہانے میں سکون۔ وہی تعجب نہیں کہ شمال سے چھوڑی جانے والی اس ڈرامائی آتش بازی (عذاب انعام) کی گھن گرج اور چٹک دھن نے میرے متوازن آہنگ میں، اور جو ٹھوڑی بہت خطیہات علامتیں مجھ میں تھیں ان میں خلل ڈال دیا ہو۔ یقین کیجیے، جب سے سویشٹائیڈ کی نے اپنے فیصلے کا اعلان کیا ہے، میں ایک طرح کی ہر مسرت ہر شادی، ایک دل بردافرا تفری کے تھوڑے میں چھوٹی رہا ہوں، درمیں پل ویش کیفیت کا اس سے بہتر انگہ نہیں کر سکتا کہ میں گوشت کی ایک خوب صورت درانوی رومانی قلم کی طرف اشارہ کر دوں۔ یہ غم کی پد سے مخاضب ہے اور دوسرے جو اس وقت میرے ذہن میں گھبرا رہا ہے وہ کچھ ہیں ہے "Du hast mir mein Gerät versteht und verschoben"۔ گویا اس نوبت انعام نے میرے رزمیہ اندر دن ملک دوسری اشیا کے علاوہ زبردستی ایک ڈرامائی وافر تفری بھی تھولیں دی ہے، درمیرے خیال میں یہ گستاخی نہیں ہوگی اگر میں اپنی زندگی پر نوبت انعام کے چھانکرنے اثرات کا اس کیفیت سے موازنہ کرنے کی جرأت کروں جیسی گرج کی پٹ سکون زندگی میں ہوائے نفس کے دھل ہوجانے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔

اور پھر، کسی بھی لمحہ کار کے لیے بغیر کسی وسوسے کے ایسا انعام اور ایسے عزائات قبول کرنا کتنا مشکل کام ہوگا جو آج مجھ پر نچھڑا رہے جا رہے ہیں۔ کیا کوئی شامت اور خود تصافی کرنے والی کار ہوگا جس کا ضمیر ان نعمات کے بارے میں طیر مطمئن نہ ہو؟ ایسے شخصے میں تو صرف کوئی ذاتی اور افریدی نقطہ نظر سے ماوا انسان ہی مدد کر سکتا ہے جو کئے نے ہر خطرات سے کہا تھا، "صرف مکار لوگ ہی منکر برحق ہوتے ہیں" (یعنی کسار دہ اصل مکاری کا دسرا م ہے) یہ اٹھا ڈالنا کس کی نہیں جا گیر در کے قول جیسا ہے جس نے خود کو دوزخ کو اور نیچے درجے کے لوگوں سے فاصے پر رکھنے کے لیے کہا تھا۔ مگر حقائق و حفرے، یہ شاید ہی چرچ ہو۔ کتب میں فالش اور ذہانت ہوتی ہے اور وہ کوئی برا امتحان اور بے وقوفی ہی ہوگا جو ان عزائات میں، جو آج مجھے معاشیہ جا رہے ہیں، شفی درتکبر کا ضیع طرح کرنے کی کوشش کرے۔ اس میں الاقوامی نعام کی جو شاید کسی حقیقی کے سبب مجھے دیا جا رہا ہے، میں اپنے ملک اور بچے لوگوں کے قدم میں رکھنا چاہوں گا، اس ملک اور دن و شب کے قدموں میں، ہم جیسے نیکھنے والے دن کی قربت کو آج اس وقت سے زبرد محسوس کر رہے ہیں جب ان کی چہرستی ہوتی سلطنت اپنے عروج پر تھی۔ بہت برصوں بعد اسٹاک ہوم کا یہ بین الاقوامی انعام ایک بار پھر جرمن ذہن، بالخصوص جرمن نظر کو حفا یا گیا ہے اور آپ کو ہاری مناسبت کا چھانکا نہیں ہو سکتا کہ اس قسم کے بھروانہ اشارے ہمارے دگر عمدہ ملک میں کمن (اکثر غلط) معنوں میں لیے جاسکتے ہیں۔

کیا میں اسی "ہمدردی" کے معنی پر قیامی اور دشمنی ڈال سکتا ہوں؟ پیچھے پندرہ برسوں میں جہنمی نے جو دانشور، نہاد و قلم کار، کامیابوں، حاشیہ کی قیادہ ایسے حالات میں نہیں ہوئیں جن کو ہم جسم ہمدردی کے لیے مزار کار کہہ سکیں۔ کوئی بھی کام یہاں نہیں تھا جس کو سکون اور ماحولیت کے ماحول میں نشوونما پانے کا موقع نہ ہو۔ کیا فنی یا فائنل سب کو شدید درمیاں سے پڑ جانے کا سامنا تھا۔ مشرقی اور مغربی دونوں نقش کی بدنامی، بدنامی، انتہائی پتھری اور انتہائی کے ماحول میں وہ کہ بھی جرمنی نے یورپی اصولوں کی حفاظت کی ہے۔ ایک یورپی کے لیے ترسیب و عیش و فراہمی سے کہ نہیں؟ میں کہتوں کہ نہیں، خواہ تین و حضرات، میری روایت بھی آپ سب ہی جیسی ہیں، میں پر دسترس لوگوں کی خدمت سے قربت کا قدر کرتا ہوں۔ اس کے باوجود میرے ایک پسندیدہ و دشمن سے۔ میں آپ کو اس کا نام بھی بتانا ہوں وہ سے سینٹ سہاسٹیئن (Saint Sebastian)، تبر کے ستون سے بندھا ہوا شباب، آر پار تیروں اور تیروں سے چھنی جسم، شدید کب کے درمیان ممکن ہوا تھا۔ انہوں نے درمیان و تقارن میں ثابتی کی یہاں تک کہ وہ انداز سے سینٹ سہاسٹیئن جس کی عداوت بن کر ابھرا تھا۔ یہ بیکر کچھ بدنامی بھر سکتا ہو سکتا ہے، پھر بھی میں اپنے دل میں جرمنی میں دربار جرمنی فن کے لیے اس نوع کی شجاعت کی گویا رنگ کی شدید خواہش محسوس کرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ جرمنی کے اسلوب کی مجموعی میں آج جو بین الاقوامی عزائم آگے رہے وہ جرمنی ان کی اسی قسم کی پڑ شکوہ شجاعت کے نشانی حاصل ہوا ہے۔ جرمنی نے اپنی شجاعت کے لیے فتنوں اور مشکلات میں باوقار رہنے کا ایک انداز پیش کیا ہے۔ اس نے سب کی طور پر جزئی و ناامیدی کی پیدا کردہ ذہنی اور عوامی افسردگی کے باطنوں مطلوب نہ ہو کر اپنی عزت کی حفاظت بھی کی ہے، انہیں سب کے مشرقی جواب اور مغربی روایت کے اصولوں کے امتزاج، کرب کی کیفیت سے، حسن کی تخلیق سے اپنے ساتھ رکھتی قائم رہا ہے۔

آخر میں، آپ سے اجازت چاہوں گا کہ میں کچھ ذاتی باتیں بھی کہوں۔ میں نے پہلے سے آج نے دسے ان ناکامیوں سے بھی، جو میرے انعام کے اعوان کے بعد مجھ سے ملنے آئے کہا تھا کہ Lubeck کی یاد دہانی کے ماتے مجھے شام سے سینڈویچوں کی یاد دہانی سے جو تھکی خاطر ہے، ہماری زندگیوں میں جو مراثت ہے، اور ایک نکلنے والے کی حیثیت سے مجھے جو ادبی ہمدردی اور شامی سوچ اور ماحول سے جو ناکامی اس کی بنا پر اسی انعام کے ملنے پر میں بہت یاد دہانی دیتا ہوں۔ جب میں بہت چھٹا تھا میں نے ایک کہانی Tomo Kröger لکھی تھی جو بچوں کو سن بھی بہت پسند ہے۔ یہ کہانی جنوب اور شمال اور دونوں کے اتصال سے پیدا ہونے والے اور مسائل میں بھرے ایک وجود کے بارے میں تھی۔ اس کہانی میں جنوب و شمال کے تعلق اور دشمنی خیالی تجربات کا جب کہ شمال، جنوب کی، دونوں گھروں کی، گھر سے جدا ہونے اور مائیں انسانیت کی عداوت بن کر چھوڑا ہے۔ آج وہی کلیوب کا مسکن، شام مجھے خوش آمدید کہہ رہا ہے اور ایک بہت مختلف تقریب میں مجھے گلے سے لگا رہا ہے۔ آج کا دن میری زندگی کا حسین ترین اور معنی خیز دن ہے۔ میری زندگی میں کبھی تفریح کا دن ہے، یہ سرشاری ہے، جسے سینڈویچ نہیں میں

"hogsdag" کہتے ہیں۔ مجھے نہایت بے ذہنی پن سے لیے گئے سویڈش زبان کے اس لفظ کے ساتھ
 نے ایک چھوٹی سی اتھارٹی کرنے دیکھی۔ خواتین و حضرات! آئیے ہم سب ایک زبان ہو کر اس فاؤنڈیشن
 کی خدمت میں اپنے تشکر کے جذبات اور مبارکباد پیش کریں، جو مری دنیا کے لیے تہ سرفہم ہے
 بلکہ منفعت بخش بھی ہے، جس کے فیض سے یہ خوب صورت تمام منفقہ ہو رہی ہے۔ سویڈش زبانیت کے
 مطابق، آئیے ہم سب مل کر ویل فاؤنڈیشن کے لیے چار گنا غرور و معززیت بند کریں۔



سگریڈ انڈسٹریٹ

اعتراف کمال۔ برصغیر میں تو وہی کے دور میں خط کشائی کی زندگی کے توانا مدار بنی رہے۔

شہر میں لکھے جانے والے اپنے اولوں میں، جو سب کے سب قابل ستائش تھے، سگریڈ انڈسٹریٹ نے اسٹینڈی ٹیو کی تہذیب کے ابتدائی دور کی عورتوں کے اُن حالات کی بے مثال متحرک کشی کی ہے، جب وہ حیرت انگیز طور پر اپنے بے ترتیب زمانے سے کلی ہوئی تھیں۔ اپنے دھڑکتے ہوئے تخیل کے ذریعے سگریڈ نے بدقسمت وکاست کی زندگی کے ایسے کی سنگان بھی کی اور سحر دانا خاندان میں گھر بے لگ سچائی سے ان عورتوں کے حالات زندگی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اس کے اولوں کے نفسانی مرکزی کردار جب بھی جنسی طور پر اپنے ضمیر سے روٹ جاتی کرتے ہیں تو ان کا حشرناک عبرت ناک ہوتا ہے۔

سگریڈ کے پسے ماں Fru Marta Duke پر جو 1907 میں شائع ہوا، مینہ یو نے کڑی تنقید کی اس لیے کہ اس کے مرکزی کردار نے اپنی جنسی حرکات میں شوہر سے بے وفائی کا اعتراف کیا۔ اس کے بعد اس کے فنانسوں کا ایک مجموعہ منظر نامہ پر آیا۔ اس کے دوسرے ماں Gunnar's Daughter (1907) میں ایلس لینڈ کی قدیم رزمیہ داستانوں کا حیا کیا گیا تھا جس پر اس کو حکومت کی جانب سے وظیفہ ملنا شروع ہو گیا اور سگریڈ نے تصنیف کی کو اپنا پیشہ بنا لیا۔

سگریڈ کا تیسرا ناول جزوی طور پر Jenny (1911) ان کی کے شہر Roma کے پس منظر میں لکھا

کہا تھا جس میں ایک نوجوان اور نوجوانی موصوفہ کے عشقیہ جذبات اور نئی مقلد کے درمیان کشمکش کو دکھایا گیا ہے، آخر کار وہ دوسرے سفر تھیوڈورسن سے یوروپاں جا کر خود کشی کر لیتی ہے۔

اپنے ناولوں کی اشاعت سے پہلے ہیگرنے نے (1917) Spänsen Av Trødspeil لکھا جس میں اس نے موجودہ کی تاریخی گھریلو زندگی اور نئے مواقع کے درمیان کشمکش کو مرکز بنایا۔ ہیگرنے نے 1924 میں رومن کیتھولک عقیدہ اختیار کر لیا اسی وجہ سے اس کے بعد کے ناول Norske Hænger (1934) میں مذہب کا کردار ہم نظر آتا ہے۔

صدیقی دوسری دہائی میں ہیگرنے کی تحریروں میں اہم Kresen Lavransdatter (1920-22) نام کا سہ پارہ (Trilogy) تھا جس میں اس نے تیرہویں و سولہویں صدی کی نوجوانی کے خد پرست اور پرہیزگار کیتھولک مائے میں ایک عورت کے کردار کا احیا کیا۔ اس سہ پارے کے پہلے حصے The Bridal Wreath میں مرکزی کردار ایک خوش حالی نسل خانہ کی مغرور اور حسین بیٹی، کرسٹین، کی نوجوانی کی دواویوں کے سفر کی تصویر کشی کرتی ہے جو ایک گم قرص شخص کے آہنی سے شادی کر لیتی ہے۔ دوسرے دو حصے The Mistress of Husbaby اور The Cross میں مصنف نے مرکزی کردار کی شادی دوران کے نتیجے میں شوہر سے محبت و نفرت کی کشمکش، خدا سے کاوا اور ہرگز اس کی موت کو بڑے پرائیڈ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سہ پارے کے بعد ہیگرنے نے ایک چہرہ پارہ The Master of Hesviken (1924-27) بھی تخلیق کیا۔ یہ تخلیق بھی توہن و سہلی کی داستان محبت و نفرت اور قتل کی داستان تھی۔

ہیگریڈ امارت کے شہر کاؤڈبورگ (Kålborg) میں ایک ماہر اداکار کے گھر پیدا ہوئے۔ اپنے والدین گھریلو کے زیر اثر ہیگریڈ نے قرون وسطیٰ کے داستان گیتوں (ballads)، رزمیہ داستانوں (Sagas) اور اسکیٹنڈی نوجوانی دوجہ مال میں دل چسپی لی۔ ہیگریڈ نے اپنی ماں سے زندگی و حقیقی انداز میں رچنا سیکھا مگر مذہب پر اس کی تنقیدی حراست سے کبھی انکسار نہیں کیا۔

جب ہیگریڈ کی عمر سترہ سال تھی اس کے والدین نقل مکانی کر کے کریستیانہ (Kristiana) میں آباد ہو گئے جو اب اوسلو (Oslo) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے والد کا 1893 میں انقلاب ہو گیا اور نائن ان کے مالی حالات خراب ہو گئے۔ ہیگریڈ نے اپنی والدہ اور دو بہنوں کی کفالت کی غرض سے سولہ برس کی عمر میں ہی۔ دہشت گردی کی زندگی جو تقریباً دس برس تک جاری رہی اس دوران اپنے فاضل وقت میں وہ اپنے قیمتی دوستوں سے خط کتابت کرتی رہی۔

جب جنگ عظیم دوم میں جرمنی نے ناروے پر قبضہ کر لیا تو ہیگریڈ نے مزاحمتی تحریک میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس کے نتیجے میں جرمنوں نے اس کی سزا سنائی اور پندرہ سال کی سزا سنائی۔ اس دوران خود ہیگریڈ کا بیٹا بھی جنگ میں مارا گیا۔ ہیگریڈ کی جرمنوں کی شیعہ مخالفی وجہ سے، ناروے سے فرار ہو کر سوئیڈن جانا پڑا اور وہاں سے وہ امریکا بھی گئی۔ امریکا کے قیام کے دوران اس نے بہت سے صحبتیں کیں اور ان خطبات

سے لکھنے کی شہرت ہوئی۔

انگریزی کی چھتیس تفنیفات شائع ہوئیں۔ اس کو 1947 میں The Grad Cross of St. Olav
اعزاز دیا گیا اور اس نے 1949 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

مجھ سے قبل کے مترجمین نے انعام کے لیے منتف کیے جانے پر مجھ سے کہیں بہتر طریقے سے
ہمارے حساب قہر کا اظہار کیا ہے اور میں ان کے حرفِ حریف سے پوری طرح متاثر ہوئی ہوں۔ میں تقریر
کرنے کے مقاصد میں تحریر میں بہت مستعد اور نظر آ رہی ہوں مگر خائن کر اپنے بارے میں کچھ کہنے میں بہت
جھجک محسوس کرتی ہوں۔ میں سوئیڈن کی خدمت میں اپنا سلام پیش کرنا چاہتی ہوں۔ سوئیڈن نے اسے قبل
میرے اعزاز میں ایک دیوت کی نئی تھی، صرف میرے ہی بارے میں بات کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس
لیے کہ میں سوئیڈن کے لیے عازم سفر ہونے والی تھی۔ دیوت میں شریک ہوا ایک نے ہمارے ویڈیو
کاؤنسل کے صدر اور میرے تمام ذاتی حساب نے بھی سوئیڈن کے لئے پُر خلوص جذبات کے نئے اور حال
کیے ہیں۔ مگر ہمارے جزیرہ کے لوگ بھی تو اس دنیا کا حصہ ہیں۔ ہمارے ملکوں کے جنگل اور کوہسار ایک
دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں اور ہمارے دیہات ایک ملک سے دوسرے ملک اپنا پانی پہنچاتے ہیں۔ ہمارے
میں ہمارے گھر سوئیڈن کے گھروں سے ملے جلتے ہیں۔ ساری تعریفیں خدا کے لیے ہیں! ہم ہمیشہ اپنے
ملکوں میں ہر طرف بکھرے بہت سارے چھوٹے بورڈز رکھنا توں میں رہے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی ابھی تک
ہمارے مٹاؤ علاقے کی انسانیت میں پوری طرح لاشیں نہیں ہو سکی ہے۔

تو میں یہاں یہ کہنا چاہتی تھی کہ مجھے کس ملک سوئیڈن کو جس کے بارے میں سوچ کر بھی ہم
فخر ہوتے ہیں، پُر خلوص جذبات پہنچانے کے لیے کہا گیا تھا اور اب کب ہوم کے لیے بھی رجس کو ہم
ماریوائی دنیا کا سب سے خوب صورت حصہ گردانتے ہیں۔



ہنری برگساں

اعترافِ کمال۔ اسی کے تمہیدور حیات بخش خیالات اور ان کی پیش پیش میں اشتعال ہونے والی
طیبات بندہ بندی کے ہونے والے کے لیے۔

ہنری برگساں کا قول ہے کہ سب سے فلسفیانہ لکھاؤں میں سب سے دیر پا اور شمر بار وہ نظام ہے جو
القافی کیفیت سے وجود میں آتا ہے۔ یہ دروقت اس کے فائزیت کے مقالے Time and Free Will
میں درج ہے جس میں برگساں نے یہ بھی کہا ہے کہ وقت کوئی تجربی شے نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے، یہی
حقیقت جو زندگی و انسان کے وجود سے اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ اس کو ٹک نہ یا جائے اس کیفیت
کو برگساں نے عمر سے کام لیا ہے، ایک قصور جس کو قوت حیات کی مطابقت سے زندہ کر بھی کہا جاسکتا
ہے۔ یہ کیفیت یہاں نوعیت کے جہل کے باوجود دائمی طور پر یہ حقیقت بننے والی سوچ والوں کی بات ہے جو
ہمیشہ حرکت پذیر رہتی ہے اس کو کسی غیر متحرک مقام سے منسلک نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ اس طرح کے
عمل سے یہ محدود ہو کر معدوم بھی ہو سکتی ہے جس کو ہم عام اشیاء میں وقت کہتے ہیں، وہ وقت جو گھڑی
کی حرکت سے یا سواری کی گردش سے ماپا جاسکتا ہے کوئی اور ہی شے ہے جو انسانی لحاظ لوہاس کے جسمانی
انفعال کے لیے بنایا جاتا ہے۔

برگساں کا کہنا یہ بھی ہے کہ فلسفے میں کوئی بات ایسی نہیں ہوتی جس کو روزمرہ کی زندگی میں بیون نہ

کیا جاسکتا ہو۔ اپنے اسلوب کی اعتبار سے برٹسوں کا تعلق رائل اور مدد کے سے کیا جاسکتا ہے مگر اس کے خیالات اکثر نہایت ہنس پر واز اور آسانی سے سمجھ میں نہ آنے والے ہوتے تھے۔

برٹسوں 1859 میں پیرس میں پیدا ہوئے۔ اس کا باپ پینڈ کا ایک یہودی تھا جب کہ اس کی ماں یٹو انز تھی۔ جب اس کی عمر صرف سترہ برس کی تھی، برٹس نے میٹھی کے ایک مشکل مسئلے کو سنے ملازمین حل کرنے پر انوکھا حل کیا تھا۔ اسی سال اس نے ایک اور مسئلے کا حل تلاش کر لیا جس کے بارے میں فرانسیسی سائنس دان پائل کا دعویٰ تھا کہ اس نے حل کر لیا ہے مگر حل شائع نہیں ہو سکا۔ ایک نو عمر سائنس کے لیے یہ بڑے عزائم کا باعث تھی۔ برٹسوں تعلیم 1877 سے 1881 تک فرانس کے مشہور تعلیمی ادارے *Ecole Normale Supérieure* میں ہوئی۔ اس نے سلاہ میں تک مختلف *lycees* میں (فرانس کے وہ ثانوی ادارے جن میں طلباء جامعات کی تعلیم کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ مترجم) فیسٹی کی تعلیم دی۔ برٹسوں نے اپنے گریجویٹوں کا مقالہ اٹلی زبان میں لکھا تھا جو اس نے *Analects Theory of Lucretius* پر لکھا تھا۔

1900 میں پیرس کی حیثیت *College de France* میں برٹسوں کا تقرر ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں بے انتہا مقبول تھے جن کو سننے کے لیے، اس کے اپنے طلباء کے علاوہ بیرونی طلباء، دانش ور، عوام، حتیٰ کہ فیسٹی میں دس چھٹی رکھنے والے سیاح تک، آتے تھے۔ کچھ عرصے اس طرح پڑھنے کے بعد سے اس کا لُج *The House of Bergson* کہا جانے لگا تھا۔ 1914 سے 1921 تک برٹسوں کو اپنے ملک کے لیے سفارتی ذمہ داریاں بھی نبھانی پڑیں لیکن اس نے 1921 کے بعد اپنی تصنیف *دنیائے ادب* اس وقت کے لیگ نیشنز *League of Nations* کے لیے معروفیت کے پیش نظر حکومت سے معذرت کر لی۔ دونوں عظیم جنگوں کے درمیان کے عرصے میں برٹسوں کو ایک طرح کے عقیدے (*Cult*) کی حیثیت مل گئی تھی۔ برٹسوں مذہب پر کار بند یہودی نہ تھا مگر اس نے یہودیوں کی مخالفت کے خلاف قانون *Anti-Semite Laws* سے مزاحمت کرنے کی کوشش کی تھی اور ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا کہ وہ مغربیوں کا مددگار رہے گا۔ اس لیے اس نے اپنے دو قلمی یہودی ہونے کا اعلان کیا جس کا وہ ذاتی طور پر کتھوک عیسائیت سے بہت قریب ہو چکا تھا۔ 1914 میں برٹسوں کی ساری کتابیں اور انجیل *Creative Evolution* کو کتھوک فرقے والوں کے لیے ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔

بچپن سال کے عرصے کے بعد برٹسوں نے اپنی ایک بڑی تصنیف *The Two Sources of Morality and Religion* (1932) شائع کی۔ اس میں بعد اس کی ایک اور کتاب *The Creative Mind* جو مضمون اور متفرق غریبوں کا مجموعہ تھی، شائع ہوئی۔

برٹسوں کو جوانی کے دور میں، پھر کی ارتقایت کے نظریے میں دلچسپی رکھتا تھا مگر بعد میں اس نے خدو کیا اور ارتقا (*Immunon*) کو انسان کی اعلیٰ ترین کسبی صفت قرار دیا۔ *The Creative*

کی گہرائیوں سے سفید شاکہ کی کاشتکاری کا شکر گزار ہوں جس نے مجھ کو وہ اعزاز بخشا ہے جس کے بارے میں سوچنے کی میں ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اس انعام کی قدر و قیمت کا نپودہ احساس ہے بلکہ میں تو صرف اس خیال ہی سے تہلکہ مچا رہا ہوں کہ اس کے ایک مصنف کے لیے یہ امتیاز فرائس سے ہمدردی کے مترادف سمجھا جا سکتا ہے۔

نوبل انعام کی شہرت بہت سی وجوہات کی بنا پر ہے، جو بالخصوص اس کی مثالیت پسندی اور بین الاقوامی امتیازی ہونے سے بڑھ کر ہو جاتی ہے۔ مثالیت پسندی یوں کہ اس کو رتبہ بعد اہل انعامیت کے کاموں کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ بین الاقوامی اس لیے کہ دنیا کے مختلف ممالک کی تحقیقات کے پتھر خانہ مطالعے اور دنیا بھر کی دانش کا میزان مرتب کرنے کے بعد ان ممالک کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ آزدانش اور قدروں کے علاوہ ہر طرح کی ہمدردیوں سے محروم نظر کرتے ہوئے معزز شخصیتوں نے اپنا اپنا حصہ لیا ہے وہ مقام چاہے جس کو فلسفوں کی زبان میں ذہنوں کے سانچے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس طرح انھوں نے اس انعام کو قائم کرنے والے کی غیر ہمدردی بلکہ بالکل واضح نیت کا پاس رکھا ہے۔ الطریقہ نوبل نے اپنی مرثیہ کردہ وصیت میں اس شخص کا حاشا اعلان کیا تھا کہ وہ مثالیت پسندی اور بین الاقوامی ہمدردی کی خدمت کا چاہتا ہے۔ اس اور سائنس کے انعامات کے ساتھ ساتھ اس کے لیے بھی ایک انعام قائم کر کے اس نے اپنی مصداق سے اپنا ہدف متعین کر دیا ہے۔

یہ بہت ہی اچھا خیال تھا۔ اس کی بتا کرتے والا یقیناً ایک اختراعی شخص تھا اس نے فائز اس صدق میں پہلے ہوئے سراپا سے اہتمام کیا۔ انیسویں صدی میں ہونے والی عیناکی ایجادات کے میدان میں حریت افزا ترقی سے یہ فہم کر لیا گیا تھا کہ ان ترقیوں کے بطن سے پیدا ہونے والے مادی اثرات کا خود ہام انسانیت کی اخلاقی سطح کی ہندی میں صلاوت ہوگا۔ روز افزوں تجربات نے اس عام تاثر کے برعکس، یہ ثابت کر دیا ہے کہ تکنیکی ترقی اپنے آپ ہی معاشرے میں زلزلہ کی گزیرا ہے والوں کی اخلاقی ترقی کا باعث نہیں ہو جاتی اور یہ بھی کہ مادیات کی فراوانی انسانیت کے لیے نئے خطرات کو بھی جنم دے سکتی ہے، اگر اس کے قدم پر قدم جہانی روحانیت کی ترقی کی کوششیں نہ کی جائیں۔ ہماری اپنی مادیاتی عقلی مشینیں مصنوعی اعضاء کے مانند ہمارے قدرتی اعضاء میں صداقت کی طرح شامل ہوتی ہیں اور اپنے ریبوٹ کے باعث انسانیت کے جسم کو بصحت دے رہی ہیں۔ اگر ہمیں (انسانیت کے) اس وسعت شدہ جسم کو صحیح و سالم ہمارے کے حرکات کو قائم رکھنا ہو تو روحانیت میں بھی مبادی وسعت پیدا کرنی ہوں ورنہ اس کا توازن خطرے میں پڑ جائے گا اور نہ صرف معاشرتی بلکہ شدید سیاسی مشکلات بھی پیدا ہو جائیں گی، جن کے اثرات انسانیت و اس کی روح کے درمیان عدم تناسب پر منتج ہوں گے، جس میں بھی تکامل کے مقابل میں، کچھ تیز رفتاریوں نہیں آئیں گی۔ بھاپ و رنجی کی صداقت کی ایک بڑی واضح مثال کے طور پر ہم یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ ان توانائیوں کے استعمال سے کم ہوتے ہوئے فائبر و گیس کے درمیان

کہ خدائی مفاہمت کا باعث ہوں گے۔ مگر آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا اور یہ کہ فاضلوں کے ختم ہونے کے برعکس مفاہمت کی سنگینی میں اضافے کے خطرات بڑھتے جائیں گے، اگر ہم نے اپنی مذہبیت کی قوتی اور جذبہ اخوت میں اضافے کے لیے زیادہ کوششیں نہیں کیں۔ ایک بین الاقوامی کرور اور مشائی ناو پے نگاہ کے حامل درجے کے لیے افراو کے مابین، اس قسم کی مفاہمت کا خدائی رجحان اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس کی نظر میں، خالص دانش و دانش نگاہ سے پوری مہذب دنیا زبان کی ایک جمہوریت کے مرتکب ہے۔ نوٹل فاؤنڈیشن ایک ایسا ہی ادارہ ہے۔

اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس قسم کے انوکھے خیال کی پوروش سوسائٹن جیسے اہل دانش کے حامل ملک میں ہوئی، اس کی نشوونما ایسے لوگوں کے درمیان ہوئی جنہوں نے معاشرے میں پیدا ہونے والے اخلاقی سوالات پر زیادہ توجہ دی ہے، اور جنہیں اس بات کا احساس ہے کہ لوگ ان کی چیزوں کو رہے ہیں، اور جو شاید کچھ قوم تھے جنہیں اس بات کا سب سے پہلے احساس ہوا کہ تعلیم کے مسائل اور سیاسی مسائل مساوی شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔

نوٹل فاؤنڈیشن کی امیپ کے اضافے کے ساتھ ساتھ اس کے دائرہ عمل میں بھی وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے اور اس سے فیض یاب ہونا اور بھی اعزاز کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ کوئی دوسری بات ہے زیادہ وقف نہیں ہوگا جتنا کہ میں۔ میں معزز سامعین کی خدمت میں اس اتنا ہی عرض کرنا چاہتا تھا اور پے عین تھکر کے ساتھ آپ حضرات سے اجازت کا خواہی ہوں۔



گراز یا ویلیدرا

ایم۔ ایف۔ کمال۔ اس کی مشیت سے متاثر شخصیات کے لیے جو بڑی وضاحت سے اس کے مولد
جزیرے کی زندگی کی لکھی گئی کہتی ہیں اور بعد دی کے عیش و عشرت کے ساتھ
انسانی مسائل سے پیش آتی ہیں۔

حالیہ کے ایک پرفضا اور حسین مناظر پیش کرتے والا جزیرہ سارڈینیا (Sardinia) کے ایک شہر
Nuoro کا، جہاں گراز یا ویلیدرا پیدا ہوتی ہے جو حیات اور اخلاقیات اور مختلف تہذیبی۔ گمانیہ اپنے ایک ناول
کی ایک بڑی عورت کے کردار سے کہلاتی ہے "یہ تمھارے خیال میں لی کا مارنے والے بڑے لوگ
ہوتے ہیں؟" نکل لہو یہ لوگ تو صرف اپنی مہارت کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں! پانے والے میں لوگ اپنے
مذہب آزمانے کے لیے جنگ پر جاتے تھے۔ ب جنگیں نہیں ہو رہی ہیں مگر ان لوگوں کو لڑائی تو کرنی ہی ہے۔
یہ لوگ لڑا کا زنی کرتے ہیں، سو بستی چاہتے ہیں اس لیے نہیں کہ ان کی نیت بڑی ہے بلکہ یہ کسی حد تک طمع
اپنی عداوتوں اور طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں یوں وہاں کے مقامی لوگ ڈاکوؤں سے بعد دی کرتے
ہیں۔ گراز پکڑے جاتے ہیں در قید ہوتے ہیں تو لوگ اس کو مشکل وقت کہتے ہیں جب وہ دبا ہوتے ہیں
تو ان کو بری نظر سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ ان کو اپنے کام کو بار بار کرنے کی ہمت لگاتی جاتی ہے"

اپنی کتاب Tradizioni Popolari Di Nuoro In Sardegna 1895 کے ذریعے گمانیہ نے

سچے مولدگاروں کے رسوم و رواج کا مشاہدہ پیش کیا ہے۔ عام لوگوں کی روزمرہ کی زندگی اور ریاضات میں اس کی دلچسپیاں گرائیو کا احاطہ کی مشہور ادبی شخصیت (1840-1922) Giovanni Verga سے قریب کرکٹس ہیں جس نے سسلی کے باسیوں کی رسوم و رواج کے بارے میں کھائے اور بہت سے ہم عصر کچھنے والوں نے جس کی پیروی کی تھی۔ گرائیو کی تحریروں میں اطالیہ میں نیسویں صدی عیسوی کی دو تحریکوں کے درمیان رکھی جا سکتی ہیں۔ یہ تحریکیں تھیں Versimo جو فکریت (Naturalism) سے منسلک تھی اور Decadentismo جو بہت اور غیر منطقی عقیدوں کی اہمیت پر زور دیتی تھی۔ IL Vecchio Dese (The Old man of Mountain, 1900) گرائیو کی بہت سی تصنیفات میں سے پہلی ہے جس میں اس نے نہایت سادہ و عوامی کرداروں کی مدد سے جنسی جذبے کو دبانے سے جنم لینے والی تحریکوں اور الجھنوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

گرائیو کی پیش کردہ تصنیفات میں اس کے مرکزی کردار اعلیٰ اخلاقی جذبوں کے حامل نظر آتے ہیں اور تقریباً سب ہی اپنی قدروں اور اپنے محبت کے جذبات کے پیش نظر ایسی قریبی مینے سے دست کش کرتے ہیں جس میں وہ اپنی جان کی بازی تک لگا رہتے ہیں۔ مثلاً کے طور پر (1903) Elias Fondu جس میں ایک چھوٹا سا بچہ بھائی کو شکست کی محبت کے جذبے کو دبانے کے لیے پاؤں میں جاتا ہے۔ اول Centre (1904) میں ایک نوجوان لڑکی اپنے ناجائز بچے کے مستقبل کو داغ و دھبہ سے بچانے کے لیے خودکشی کر رہی ہے۔

گرائیو بلیڈا 1871 میں اطالیہ کے پونٹ اور تقریباً جزیرہ سے سارڈینیا کے ایک گاؤں نورو کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ ایک کھانا پیتا زمیندار تھا جو آچھو لوں تک پہنچنے والے کا رئیس ہمدرد بھی رہا۔ اس بچہ کی عمر تک گرائیو نے ایک مذہبی اسکول میں تعلیم پائی۔ اہل اولی اور فرانسیسی زبان میں گھر کی تعلیم کے بعد اس کی اس کی باقاعدہ تعلیم تھی۔ اس نے بدقسمت فائدہ ان کے چند افراد میں سے ایک گرائیو ہی تھی جو بچہ ریوں اور جہنم کی آلودگی سے پاک رہی۔ گرائیو بچہ ہی سے مشہور ماہوں نگاروں کو پہننے کی دلچسپی تھی جس میں وہی ماہوں نگار بھی شامل تھے۔ گرائیو کا مطالعہ سب سے پہلے لٹریچر کا تھا۔ گرائیو نے بہت فوری میں ہی کھانا شربت کر دیا تھا۔ وہ آٹھ برس کی عمر سے ہی باقاعدہ کہانیاں لکھنے لگی تھی اور اس کے افسانے روم اور میلان (Milan) کے رسالوں میں شائع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ (1888) Sardinian Blood یا Sanguie Sardo تھا۔ گرائیو کا پہلا ناول Fior Di Saregna (1892) تھا جس کے بعد (1895) Anime Onese شائع ہوا جس نے اس کی شہرت بڑھائی۔ گرائیو کے ابتدائی ناولوں اور افسانوں میں ایک بہنوں کے اثرات نظر آئے ہیں، وجہ سے ادب کے پھرین جہد کی اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

گرائیو نے 1900 میں ایک مرکزی مازم سے، جس سے سارڈینیا کے صدر مقام Cagliari میں

اس کی تہا سانی ہوئی تھی، شادی کر لی۔ اس کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ گر نڈیٹا کی کے بعد سرجینا سے اظہیر کے دارگومت رہم منتقل ہوئی تھی سرجینا کا حسن ہمیشہ اس کو سناں کشاں وہاں سے جاتا رہا۔

گر نڈیٹا نے چالیس ماہ کی تصنیف کیے۔ اس نے بائزاک کی تصنیف Eugene Grandea کا اعلیٰ لوئی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔ وہم میں اس کی زندگی بہت محدود انداز میں زرق۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اپنی حوالی زندگی میں صرف ایک بار اس نے اپنے ملک سے باہر قدم نکالا جسب وہ نوبل اشہام لینے کے لیے اسکا ک ہوم گئی تھی۔

گر نڈیٹا دیکھا گئے 1938 میں انتقال کیا۔



جارج برنارڈ شا

اعترافِ کہاں۔ اس کی تحانیف کے لیے حق پر مشابہت پسندی اور انسانیت کی گہری چھپ بھی ہے اور انجیل کے لیے وار فیر معنوں کا اعتراف۔ حسن میں ڈوبا ہوا خطر بھی۔

انٹرنیشنل ڈراما نویس، ادبی تنقید نگار اور بیسویں صدی کا ایک سربراہ، اردو ادیب جارج برنارڈ شا ایک آزاد خیال انسان، مجوزوں کے حقوق کی حقارت کرنے والا اور عوام کے لیے مسوئی آمدنی کی شدید ذکاوت کرنے والا مدبر شخص تھا۔ ہمارے شانے پٹی نو جوانی کی تحقیقات میں جو المذاثرہ نگارش بنایا تھا آخر تک اسی پر ثابت قدمی سے عمل کیا۔ وہ اس طرح کے سپن ان مصرعین اور مختصر قصوں کے منہ بند کردیے جو اس کے ہرے مکر کا کرتے تھے کہ اس میں ادبی دیانت کا فقدان ہے اور یہ بھی کہ وہ دوبارہ جمہوریت کے بھڑکے ہندوستان کو بچائے رکھتا ہے۔ اس کے تصورات تجزیاتی فکر منطقی اور پسندی قسم کے ہوتے تھے، اس لیے وہ تھے ہن سے عاری دکھائی دینے کے باوجود ایک نئے قسم کی شخصیت اور ذکاوت سے منلو ہوتے تھے۔ کسی قسم کی لائٹ پیس، رسمیت یا روایت سے مزبور فوری گرفت، برائے نگی اور اعلیٰ پیمانے کی دفر شوں کی سے نگرانی پر مبنی تخلیق، گہری نوبت کے ادبی منظرہ میں ہمارے شا سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔

ایسے بے نظیر تھنڈری فوٹس دی کے مظاہرے ہی کی وجہ سے اس کے ہم عصر مصرعین اس کی پیچھے ہٹ چکے تھے کہ ہمارے شا کے پاس شعبہ بازی سے چھٹکانے کے علاوہ اور کچھ نہیں رہا۔ ہمارے شا کے مطابق

اس کی خاطر لہذا فی ہر مسئلہ اس کی حق شعور و حکمت کی حق جس کی مدد سے وہ لوگوں کو اتنا اُسیا چاہتا تھا کہ ان کے دل میں مصنف کو رسوائی کے بار پر کھینچنے کا خیال آنے لگ نہ پائے۔

ہمارا شاعر اپنے تخلیقی سفر کی ابتدا موسیقی اور ڈرامے کے ہمعصر اور بڑا دل نگار کی سے کی۔ ہمارا شاعر راجپوتی ریشز ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ ہمارا شاعر ہوتے ہی اپنی تخلیقات ایک دوسرے کو بھیجتے تھے۔ ہمارا شاعر نے جب ریشز کو اپنے لفظوں پر مبنی کتاب (1901) Three Plays for Puritans لکھی تو ویلٹر نے جواب میں لکھا اب جب کہ اسکو انڈیا میں دینا میں نہیں، پس تم ہی ایک زندہ ڈراما نویس ہو جس کو کیا قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھنا ہوں۔

ہمارا شاعر موسیقی، وب اور ڈرامے پر جن مسائل میں تھمرے اور تنقید لکھی ان میں Dramatic (1885-94) Our Corner (1885-86), Review (1888-90), The Star (1888-90) وغیرہ شامل تھے۔ موسیقی پر اس کی تنقید کے مضامین (1981) Shaws Music میں شائع ہوئے۔ اپنے جوتوں کے نعتے کو بہت کس کر بلا دے رکھے تھے۔ وہ اس کے پاؤں کے ہتھ حصے میں دھیر باد موسیقی تھا جس کی وجہ سے غدار لکھنوی تک ہمارا شاعر ایک پاؤں زمین پر رکھے کے قائل نہ تھا۔ اس دوران میں نے اپنے بڑے مشہور ڈرامے (1898) Caesar and Cleopatra اور (1898) The Perfect Wagnerie کو ڈالے۔ ان کی بات اس نے طرانا اپنے ایک دوست کو خود میں کھتا ہوا یہ یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اگر ایک کے بجائے دو مانگوں کے گل پر کھسے جاتے تو یہ کھیل کچھ بہتر بھی ہو سکتے تھے۔ اظہار کی بات یہ ہے کہ جس دوست کو ہمارا شاعر نے یہ خد کھتا تھا وہ جب عظیم اول میں اپنی ایک مانگ سے محروم ہو چکا تھا۔

مارٹے کا مشہور دور مقبول ڈراما نویس بن گیا۔ ہسی ہمارا شاعر کی سوچ پر بہت اثر انداز تھا۔ ہمارا شاعر نے اپنے ایک مقالے (1891) The Quinnessence of Ibsenism میں ڈراما نویس کے میدان میں ہسی کو جیل کا رتہ دیا تھا۔ ہمارا شاعر نے اپنے ہمدانی ڈراموں (1892) Widowers Houses میں خستہ حال عداقوں کے ماکان مکان پر شدید نگاہیں کی جس کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا گیا۔

چارٹ ہمارا شاعر آئر لینڈ کے نائیکو موت لیون میں 1856 میں پیدا ہوا۔ اس کا خاندان شمالی برطانیہ کے علاقے یوک شائر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ اجناس کا مسودہ کرتا۔ اس کی ماں ایک غریب زمین دار کی بیٹی تھی جس کی عمر بچے شوہر سے سلاہ میں کم تھی۔ ہمارا شاعر کا باپ بڑا شراب نوش تھا۔ اپنے باپ کی شراب نوشی دیکھ کر ہی ہمارا شاعر نے شراب و کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ 1866 میں ہمارا شاعر کا خاندان ایک ہجر وطن میں منتقل ہو گیا اور وہ ایک نجی سکول میں داخل کر دیا گیا۔ ہمارا شاعر نے Dublin English School سے اپنی ہقاعدہ تعلیم ختم کی۔ پندرہ برس کی عمر سے اس نے ایک جونیئر کلرک کی حیثیت سے عداوت اختیار کر لی۔ 1876 میں ہمارا شاعر لندن منتقل ہو گیا اور پھر تیس برس تک آئر لینڈ واپس نہیں گیا۔ وہ ہمیں کتب و ہولنڈ کے مشہور نماندہ نگار میونخ میں مطالعے میں مصروف پایا۔

برنارڈشا نے 1884 میں فابین سوسائٹی Fabian Society میں شمولیت اختیار کر لی اور 1885 سے 1911 تک اس کی انتظامیہ میں بھی شریک رہا۔ برنارڈشا سبزی خوردہ اور سودی عمراں نے شراب اور تمباکو سے چھینڑ لیا۔ اس نے ذاتی ادب کے مدعا نوی نگار کے مہدم اور مانے شادی کے طریقے میں انقلابی تبدیلیوں کے لیے جدوجہد کی۔ ایک مقررین فیسٹ سے اس نے یہ مقام پایا تھا اور انگلستان میں اپنے زمانے میں اس کا شمار بڑے پائے کے مقررین میں ہوتا تھا۔ فاموش فلموں کے زمانے سے برنارڈشا فلموں کا دس دودھ تھا۔ اس نے ایک فلم (1914) *Rosy Rapare The Pride of the Beauty* میں اداکاری بھی کی تھی۔ برنارڈشا کی ایک سو تین کتابیں شائع ہوئیں جن میں بہت ساری اس کے انتقال کے بعد طبع ہوئیں۔

جارج برنارڈشا کو جب نوٹیل لحام کا مستحق قرار دیا گیا تو اس نے اعزاز تو سے لپٹ کر نقد رقموں کو ہارنے سے انکار کیا۔ برنارڈشا نے 1950 میں لندن میں انتقال کیا۔ اس کے مصنفین کو ملز رائٹس دیا گیا۔



والادیسلا اسٹینسل ریمانٹ

اعترافِ کہاں۔ اس کے عظیم قوی شاہکار: "وقت" کے لیے۔

ریمانٹ کی عظیم تصنیف "وقت" (The Peasants) کے اڈالے فطرت پرستی اور دہریت سے ملتے ہیں۔ ریمانٹ نے اس بات کا کھلے طور پر اعتراف کیا ہے کہ اس کی کتاب کا تخیل فریسیوں، اولیگار زول کے مال La Terre سے انحراف دس کی ستائش میں نہیں بلکہ اس جذبہ جدوجہد اور اختلافات میں سماج جو اس کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زول کے مابین میں، حول کے بارے میں متحسین بیوی، اس کا مجموعی طرز نہ تاثر اور اس کی طبعیت کی حقیقت بیوی سے حاصل ہونے والے سبق کے بغیر اور The Peasants اور Chiope 1934-09 کی تخلیق شاہکار تھیں۔ ان سب کے باوجود Chiope اگرچہ اپنے طرز میں حقیقت پسندی سے قریب رہا مگر اس کو ایک ادبی درجے کے شاعر کا درجہ حاصل ہو گیا۔ پوینڈ کے ادیب اور ناول نگار ریمانٹ کی تحقیقات نیسویں صدی کی "طبیعی تین دہائیوں پر محیط" اس کے دامن کا ایک وسیع منظر مسلسل پیش کرتی ہیں مگر اس کا سب سے بڑا اور وسیع کارنامہ پوینڈ کی دیسی آبادی کی زندگی کے بارے میں اس کا چار حصوں پر مشتمل ناول Chiope ہے جس نے اس کی شہرت چار عالمی عالم میں پھیلادی۔ اس ناول کی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ پورے کا پور پوینڈ کی دیسی بیوی میں گھس گیا ہے۔ ریمانٹ کے نزدیک بھی یہ ناول اس کی بہترین ادبی تخلیق ہے۔

رمانٹ جنوبی پولینڈ کی ایک چھوٹی سی جگہ Kotyle Wielke میں پیدا ہو جو پولینڈ کے صنعتی شہر Lodz کے قریب میں واقع ہے۔ رمانٹ کا بچپن وہیں گزارنے میں گزر رہا جس کے، خاص کی تصویر کشی جلد جلد اس کی تمام تخلیقات میں ملتی ہے۔ اس کا باپ وہیں موتی کے سازندوں میں ایک ساز بجانے والا تھا اور اس نے اپنی تعلیم ابتدائی سے بہ مشکل اپنے نو بچوں کی پرورش کی۔ اس نے اپنے بچوں کو پڑھانا سکھانے کی کوشش کی۔ رمانٹ چل کر پڑھنے کھینچنے میں نہ وہ دل چسپی لیتا تھا، جب بھی وقت میسر ہوتا وہ کتابوں میں غرق ہو جاتا اس لیے اس نے پڑھنا بچانے کی طرف بالکل توجہ نہیں دی۔ رمانٹ کے پسندیدہ ویچوں میں ہائیس، گروسو، روٹر، سکاٹ تھے جن کو وہ بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ ابتدائی تعلیم کی تکمیل سے پہلے ہی رمانٹ نے اسکو چھوڑ دیا تھا اس لیے کہ سینکڑوں اسکو میں ناخوشی کے امتحان میں اس کو ناکامی ہوئی تھی۔ اس کو روزی کا کام سیکھنے کے لیے ایک ادارے میں داخل کر دیا گیا جہاں وہ نو کار مشینوں کے طور پر کام کرنے لگا۔ اسی دوران اس کو تعمیر میں دل چسپی پیدا ہوئی اور وہ انکم کے سٹیج کا پیمانہ ہو گیا۔ اس نے ابھی روزی کا کام بھی مکمل نہیں سیکھا تھا کہ دسیوں کو اس بات کا شہ ہو گیا کہ وہ مزدوروں کی ہڑتالوں میں حصہ لیتا ہے اور اس کی پاداش میں اس کو ادارے سے نکال باہر کر دیا گیا۔

مزدوری کی عمر میں رمانٹ نے آواز سگری شروع کی۔ اس نے ایک مفری ناکار تخلیق میں شمولیت اختیار کر لی مگر بعد ہی اس کو احساس ہو گیا کہ اس میں ناکاری کے جوہر نہ تھے۔ اس نے ایک نو مری کی حیثیت سے ایک خانقاہ میں بھی وقت گزارا مگر بعد میں ایک کارخانے اور ریوے میں ملازمت کی۔ ریوے کی لوکری میں اگرچہ محنت و محنت تھی مگر اس کو کھینچنے پڑھنے کا وقت بہت ملتا تھا۔ رمانٹ نے ریوے سے اٹھائے، تعمیر، ادارے اور سوال لکھنے شروع کیے۔ میکسم گورکی کی طرف رمانٹ نے بھی اپنے تجربات پر انحصار کیا اور اپنی مہم جوئیوں کو اپنے افسانوں میں خام مال کے طور پر برتا۔ ریوے کی لوکری کے دوران رمانٹ حادثے کا شکار ہوا اور ہر جانے کے طور پر اس کو کافی رقم ملی جس کی مدد سے وہ مالی طور پر اتنا آسودہ حال ہو گیا کہ اس کو زندگی بسر کرنے کے لیے کوئی کام کرنے کی ضرورت نہ رہی۔

1893 میں رمانٹ پولینڈ کے مارگومستہ میں منتقل ہو گیا جہاں اس کو Pilgrimage to the Mountains of Life (1894) کے ذریعے کامیابی نصیب ہوئی اس کتاب نے، جس میں اجتماعی نفسیت کی خوب صورت تحریر تراشی کی گئی تھی، پولینڈ کے قاریوں کو دلچسپی اور دلچسپی کی جانب متوجہ کیا جس کا پیدائش (1896) The Comedienne تعمیر کی زندگی کے بارے میں تھا جب کہ اس کے تئیس میں بعد کا بول Ferments تھا جو ایک انتہائی صورت کی کہانی پر مشتمل تھا جس کو ہر کار یہ احساس ہو گیا تھا کہ معاشرے کے قوانین کے خلاف بغاوت کی کئی کامیابی نصیب نہیں ہوئی چاہیے۔

رمانٹ نے بہت سے موضوعات پر کئی ناول لکھے مگر اس کو وہ مادی شمولیت نہیں نصیب ہوئی جیسی اس کے ناول The Peasants کی پڑائی ہوئی تھی۔ 1902 میں رمانٹ ویرس منتقل ہو گیا جہاں اس کو پناہ

عظیم شاعر ناول نگار تھے۔ یہ ناول پہلے ایک رسالے میں - سلسلہ وار شائع ہوا تھا۔ اور اس دور میں اس کو ٹائمس بارڈ کی بورس میں رونا کی تصنیف کا ہم چلہ قرار دیا گیا۔

اپنے اولین ناولوں میں رسالت نے چھوٹے چھوٹے جموں میں حقیقت نگاری کے انداز میں مزدوروں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو کلمہ میں اس کی توجہ روحانیت کی طرف دے گئی اور اس نے قلمی عبادت پر مشتمل ایک تاریخی ناول Rdk لکھا جو اٹھارویں صدی عیسوی کے پوینڈ کی سیاسی و معاشرتی زندگی کے بارے میں تھا۔

رسالت کی تیسری تصنیفات شائع ہوئیں اور اس نے 1925 میں انتقال کیا۔



ولیم بٹلر یٹس

اصنافِ کمال۔ اس کی بلخ شدہ شاعری کے لیے جس کا علی وجہ کا، بیانیہ بکر چوٹی ایک قوم کو اعلیٰ رکا حوصلہ دیتا ہے۔

اپنے عشق و شباب کے ابتدائی میں ولیم بٹلر یٹس ایک شاعر کے طور پر نمودار ہوا تھا۔ اس کی خود نوشت سوانح حیات سے جتنا چھٹا ہے اس وقت بھی جب وہ ایک خوش فہم لڑکا تھا اس کے اندر سے ابھرنے والی ترغیبات نے ہی اس کو دنیا سے رچنے کا سبق دیا۔ یٹس کی وطن نشو و نما سوانحی انداز میں ہوئی۔ اس طرز کے شروع مان سے ہی اس نے اپنی دائرہ اور اپنے جذبات کی آواز گونانا اور اس کی مدد سے متعین کیے ہوئے راستے پر آگے بڑھنا سیکھا۔ وحدت الوجود پر یٹس اور دنیا کی ہر شے میں پوشیدہ صداقت کے تصور نے یٹس کے کھوجی ذہن کو اور بھی بیدار کر دیا۔ اپنے دور کی سائنسی حقیقتوں سے قربت نے یٹس کو زندگی اور فطرت کے غائر مقام سے کی جانب راغب کیا۔

یٹس 1865 میں آئرلینڈ کے دبلین Duben کے باسی ایک پروفیسر گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک پارک کا مہیا، سپنے پیچھے کے تیار سے دیکھتا تھا اور اس نے معیاری اختیار کر لی تھی۔ یٹس کی ماں ایک دولت مند گھرانے سے تھیں۔ یٹس نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال لندن اور آئرلینڈ کے مغربی ماحل پر واقع شہر سینگو (Singo) میں بسر کیے جہاں اس کی ماں اپنی بے گھر تھیں۔ طویل

عرسے تک لندن میں قیوم کے بعد ۱۸۸۱ میں سنس کا گھرنا لوہن واپس چڑھ گیا۔ میٹرو پولیٹن کونسل آف آئرش میں اپنی تعلیم کے دوران سنس کی ملاقات مشہور شاعر ہارڈا نوٹس اور مصور جارج رسل (George Russell 1867-1935) سے ہوئی جو تصوف میں دل چسپی رکھتا تھا اور اس ملاقات نے سنس کو بھی تصوف و رباطیت کی طرف مائل کر دیا۔ اوگنٹ، مریڈس کی مددوں سے ماہیے، حاضرات، مافوق الطبیعت نظام اور شرقی تصوف وغیرہ نے سنس کو تمام عمر مسحور کر رکھا۔

ادب کی حیثیت سے سنس نے ۱۸۸۵ میں شاعری کے میدان میں پہلا قدم رکھا جب اس کی پہلی نظم *The Dublin University Review* میں شائع ہوئی۔ ۱۸۸۹ میں سنس کی ملاقات اس کی سب سے محبوب اداکارہ اور آئرش نغمہ نگار مڈگن (Maud Gonne 1866-1933) سے ہوئی جو شاعری زندگی میں ایک اہم سنگ میل بنی۔ شاعر سنس اداکارہ ورا نوٹس مڈ کو پوجنے کی حد تک پسند کرتا تھا جس کے لیے اس نے سچی نفسیں بھی نکھیں۔ ورا نوٹس سنس کے دل میں مڈ کے لیے محبت کے جذبات موجزن تھے۔ اس نے ایک ہارٹائیڈ کی خواہش بھی کی تھی مگر جب مڈ نے ۱۹۰۳ میں میجرک برائیداد سے شادی کرنی تو سنس اس کی جانب سے دل برداشتہ ہونا نظر آیا۔ مڈ کے زیر اثر سنس نے *Irish Republican Brotherhood* م کی انقلابی جماعت میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ مڈ نے اپنے آپ کو سیاسی جدوجہد کے لیے وقف کر دیا تھا مگر سنس اس کی سیاسی جدوجہد کوئی سرگرمیوں سے مطمئن نہ تھا اس لیے کہ وہ خود کو قومی مسئلے کی جستجو، سیلک (Celtic) قومی پیچیدگی کے احیاء و رنوک بہانوں میں ہی چسپی رکھتا تھا۔

سنس نے ۱۸۸۸ میں آئرش روایات کے سرخیل جارج رسل اور ڈیگنس، لینڈ کے مطالعے پر مبنی ایک کتاب *Fairy and Folk Tales of the Irish Peasantry* مرتب کی۔ اس نے خاص کر بچوں کے لیے *Irish Fairy Tales* بھی مرتب کی جو ۱۸۹۲ میں شائع ہوئی۔

۱۸۹۰ میں سنس اپنے آبائی وطن آئر لینڈ واپس چڑھ گیا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس نے آئرش ادبی و سماجی وراثت قومی ادبی سوسائٹی کی اوسر نو تنظیم کی۔ لیڈی گرگوری سے مل کر آئرش ٹریڈی تھیٹر (Irish Literary Theatre) کی بنیاد پڑی۔ سنس نے اس ادارے کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام بھی کیا اور اس کے لیے بہت سارے کھیل بھی لکھے۔ سنس کے سب سے زیادہ مشہور کھیل *Cathleen Houlihan* (1902) جس میں مڈ نے مرکزی کردار ادا کیا اور *The Land of Heart's Desire* تھے۔ ڈیہ پازنڈ کی سنس سے ۱۹۱۲ میں ملاقات ہوئی اور اس نے وہیں تک سنس کے معتقد کی حیثیت سے کام کیا۔ پاپوٹ نے سنس کو *Japanese Noah* نامے سے آشنا کیا جس کے اثرات سنس کی تفسیلات میں ملتے ہیں۔ سنس نے ۱۹۱۷ میں مارٹن نورمان دور کے پتھروں سے جتنے *Thoor Ballye Tower* کو خرید کر اس کی مرمت کرائی اور وہ دوسریوں کے موصوعہ میں اس کی آرام گاہ بھی بن گیا اور اس کی شاعری میں ایک علامت بنی۔

میں نے ہندوستان کے مشہور شاعر راجندر ناتھ کی کتاب "پیتا بلی" کے انگریزی میں ترجمے میں مدد کی تھی، جس کو میٹس سے بہت پہلے 1913 میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا تھا۔

باؤن برس کی عمر میں میٹس نے گھیس سلاہ جارجی ہائیڈ لی (Georgie Hyde-Lee) سے شادی کر لی جس کو کامیابی کی اُسے امید تھی مگر اس شادی سے اس کے دل بچے ہوئے۔ شادی سے پہلے میٹس نے ماٹو پیوہ دیا تھا جو روکریہ گیا۔ میٹس تو ماٹو کی لڑکی میں بھی دل چسپی رکھتا تھا مگر اس نے بھی شادی سے انکار کر دیا۔ لہجے بلی مون کے دوران میٹس کی شادی نے بھی بڑا رازہ تخلیق کے جوہر دکھائے۔ اس دوران میں اور بیوی دونوں کو پوراشٹوں پر مشتمل کتاب (A Vision) 1925) تیار ہوئی جس کا موضوع نپراسریت کے مسائل کی آمیزش کے ساتھ ملاج بذریعہ شادی تھا۔

میٹس نے 1932 میں ارش اکیدی اکی لیٹریٹام کا ایک دورہ قائم کیا۔ 1933 میں تھوڑے عرصے کے لیے اس نے اہل میں متحرک فسطائی تحریک Blueshirts کے لیے بھی کام کیا۔

میٹس کی زندگی دوران کے بعد سے اب تک شائع ہونے والی کل کتابیں ستاویں کے قریب تھیں۔ میٹس نے 1939 میں فرانس میں انتقال کیا۔

خطبہ

ارش تحریک

میں نے آج کو شام کے لیے Irish Dramatic Movement کے موضوع کا انتخاب کیا ہے، کیوں کہ جب بھی مجھے اس تقسیم اعزاز کا خیال آتا ہے، جو آپ نے مجھ کو عطا کیا ہے، میرے ذہن میں بہت سے ایسے معوم اور ماسطوم نامہ انجیر نے گتے ہیں جن کو میں کسی بھی طرح فراموش نہیں کر سکتا۔ شاید انگریزی کینی کے مکات نے اس انی م کے لیے آپ کو میرا نام اہل ہی نہ کیا ہوتا، مگر میں نے نہ کوئی کھیاں لکھا ہوتا نہ کوئی ڈرامائی تنقید، مگر میری غنائی شاعری ہا سٹیج سے جونی جانے والی زبان کے معیار کا اثر نہ ہوتا (ہو سکتا ہے کہ لکھور نے اس طرح نہ بھی سوچا ہو) نہ یہ کسی تحریک کے لیے کسی خاص درجے کی عداوت بننے کے قائل ہوتی۔ میں راک اکیڈمی آف سولین کو اپنے کاروباری رفیقوں کی محنتوں، مشکوں اور کامیابیوں کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔

ایرینڈ کے جدید ادب، اور انجیر شجک کی حد تک متھے والے خیالات کی شروعات اس وقت ہوئی جب 1891 میں Parnell کا زوال ہوا۔ سرانی کینیٹ سے آوروں کیوں میں ڈوبے ہوئے آئر لینڈ نے پارلیمنٹ سے سب سے منہ موڑ دیا۔ میں نے ان کی پیدوار کی کہ وہ قلعے کی جڑ میں مخالفت کی ابتدا ہوئی اور

میرے خیال میں وہ اصل اس فساد کی بنیاد دیتی تھی۔ وہ تھی جو ایک عمر سے دلوں میں چپ رہا تھا۔ Dr Hyde نے Gaelic League (آئرلینڈ کی کوہستانی زبان کی تحریک۔ مترجم) کی بنیاد رکھی، یہ زبان بہت عرصے تک انگریزی کی زبان کے غم اہلوں کے طور پر سیاسی مباحث میں مہینک قوت میں، یہی جماعتیں تھیں۔ دیکھی چیزوں کی شکوک و شبہات میں استعمال ہوتی جہاں گیلک زبان میں گیت گائے جاتے اور قصے کہانیاں سنائی جاتی تھیں۔ اسی دور میں نے انگریزی زبان کے لیے جس میں جدید آئرلینڈ سرچنا بھی ہے، کامیاب رہی کہنا ہے، کئی دلوں کی بنیاد رکھی، جن میں ویش کی زبانیں، عام مزدوروں اور ہر طبقے کے لوگ ان انگریزی شاعریوں، ماوس نویسوں اور ناولوں کی جن کی تحقیقات انگریزی میں پڑھ سکتے ساتھ ہی گیلک زبان کے اس ادب سے بھی مستفید ہو سکتے جن سب کے انگریزی میں ترجمہ ہو چکے تھے مگر ہمارے لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے، جو نہ غم ہونے والی سیاسی تقاریر کے عادی ہو چکے تھے، بہت کم پڑھا، لہذا ابتدائی سے ہم نے سوچا تھا کہ ہم کو خود اپنا ایک فیئر ٹائم کما چاہیے۔ ایسی کے فیئر ٹائم میں ایسا کچھ بھی نہ تھا جس کی وجہ سے ہم کو اپنا کہہ سکے۔ یہ دراصل خالی محنتیں تھیں جن کو جلد جلد گھونٹنے اور کھیل چیش کرنے والی انگریزی فیئر ٹیمپیاں کائے پائے کر اپنے کھیل چیش کرتیں، مگر ہم تو آواز کھیل اور آواز کھیل انا کار چاہتے تھے۔ جب ہم نے ان کھیل کے بارے میں سوچا، دراصل ہم نے ہر اس فن کے بارے میں سوچا، جو وہ لوی اور شاعرانہ تھا، ونا زہ انگریزی ہوتی قومیت کے (جس طرح ہنس کے بے دلی کے لیا میں ہوتا آیا ہے) جذبات سے مملو تھا۔ ہمیں اس وقت تک اپنے مطلوبہ فیئر ٹائم کے لیا میں کامیابی نہیں ہوئی تھی جب تک کہ میری ولادت 1896 میں Lady Gregory سے نہ ہو گئی، جو ایک قدیم Galway قائدانہ کی فرد تھی، جس کی پوری زندگی Galway گھریوں کے درمیان گزرتی تھی، ایک گھر جس میں وہ پیدا ہوئی اور وہاں جس میں وہ بڑی ہوئی۔ ایک جسم کسان، جس کی زبان کی بولی کہانیاں ایک خاص قسم کی انگریزی میں تھیں جس کا بیش تر حصہ انجیلوں کی سادگی و غیر مہینک گھر غلطی سے بنیاد انگریزی کی ہوئی۔ آہستہ آہستہ ہم نے اس کی زبان میں ایک بہت طاقتور اور لڑائی کیفیت دی۔ شہر کی گھر اس وقت تک نہیں جب تک کہ اس میں کھانا شروع نہیں کیا، اگرچہ ہمارے کھانے کسی لہجے سے ہر اور آزاد غم کی منزلت میں تھے۔ میرے خیال میں وہ ہماری تحریک کی طرف اس لیے مایوس ہوئی تھی کہ ہمارے موضوعات ہر زمانے مختلف تھے۔ اس کا سسرانی مکان تو کسی کی موجودگی کو وجہ سے محفوظ رہ گیا تھا مگر وہ مکان جس میں وہ پیدا ہوئی تھی چند ماہ قبل جیش زلی کے سبب جل کر ختم ہو گیا تھا۔ اس طرح کے بہت سے واقعات آئرلینڈ کے ایک وسیع علاقے میں ہوتے رہتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ ایک ایچڈ رقبے زمین کا کھنڈ تازہ تک لوگوں کو بہت مایوس کرتی ہے۔ پورا وہ کہتا ہے۔ ونا انگریزی الفون نے سب پر رحم نہیں کیا تو وہ بھی کسی پر رحم نہیں کرتے، یعنی خون کا بدلہ نہیں۔ کہلات ہے ماکہ جہات اور تھوڑی دیکھی اعلیٰ ترین صحن کے دیوانے ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ ایک پرانا سرینا رہا ہے، جو میں جب اس کی انگریزی منزل تک

چڑھ جاتا ہوں تو ہر کی ہر کی گھاٹ سے بھر ایک میدان نظر آتا ہے، بہت زیادہ فاصلے پر نہیں، جہاں کبھی ایک دیہاتی حسینہ کا پھول کے چھترور ایک چھترور، ہوا کرتا تھا، جو ایک مقامی زمیندار کی عمارت تھی۔ میں نے وہاں کے چھترور یا شندوں سے، جو ب سو جو نہیں ہے، جب بھی اس کے بارے میں بات کی تو انہوں نے وہی کہہ کہ جو Troy کی لکھیاں پر موجود ڈیڑھے مرہٹے Helen کے بارے میں کہا تھا۔ وہ مرد ہو یا عورت کسی نے بھی اس حسینہ کی تعریف میں اختلاف نہیں کیا۔ یہ تو بھی عورت نے، خود جس کے پرہیز اس کی جوانی کی شرمناک کہانوں کے دینے تھے، دیہاتی حسینہ کے بارے میں کہا، "جب بھی مجھے اس کا خیال آتا ہے میں سر سے پاؤں تک مرز چاتی ہوں۔" قرینہ پہاڑی پر بسنے والی ایک اور دیہاتی عورت تھی جس نے کہا، "سورج اور چاند کی کمرش پسے بھی ایسے حسین جسم پر نہیں پڑی ہوں گی۔ اس کی جلد اتنی پیید تھی کہ نیلی بھٹی دیتی تھی۔ اس کے رخساروں پر چھوٹے چھوٹے دوسرے نشان تھے۔" وہاں اور بھی مرد تھے جنہوں نے ان لوگوں کا بھی ذکر کیا جو ایک دن اس حسینہ کو دیکھنے کی غرض سے جمع ہو گئے تھے، خصوصاً اس آدمی کا بھی جو صرف اس حسینہ کی ایک بھٹک دیکھنے کی غرض سے دیلا پارہ کٹنے کے دوران غرق ہو گیا تھا۔ ایک ٹیک شام Rattery کا ایک گیت تھا جس نے اس حسینہ کو اتنا مشہور کیا تھا۔ چھترور میں رہنے والے آج بھی اس گیت کو گاتے ہیں، اگرچہ اب اسے گانے والے نہیں رہ گئے جتنے کہ اس وقت تھے جب میں جوان تھا۔

اے دلش کی ستارے

اے کہانوں کی لکھلوں کے سورج

اے منہرے گل گیسو

اے کہ میری متاع جس

نیری بہر

پور سکون اور آسمان عورت ہے وہ

حسن جس کا کہ اس کے بدن میں بھی ہے

اور اس کے خچالوں میں بھی

ایک کا گویا قدیم زمانے کی دنیا اپنے شہر کی آزادی سمیت ہمارے اطراف بکھری ہوئی ہے۔

سزات "تیس خوب صورت پہلوں میں، مرد کی طاقت میں اور عورت کے حسن میں، اور ہم کو نیا وہ نہیں پس

اتھا چھوڑ ہی کہنا تھا کہ شہر بھی اسی طرح سوئے گئیں جیسے گاؤں سوچتے ہیں۔ مگر جلد ہی ہم کو پتا چل گیا کہ شہر

وہ شہر ہی کی طرح سوئے گئے ہیں۔

دیسات میں آپ اپنے تھکاو کے ساتھ تپ ہوئے ہیں، اپنی ادا سبوں کے ساتھ اور زندگی کے

مشترک انیسوں کے ساتھ اور اگر آپ میں کسی قسم کی ہل چلتی صلاحیت ہے تو آپ حسین جذبات کے

خوش مند ہوتے ہیں اور رہے سو سم تو وہ خود کہتے ہی رہتے دھنکی وین، ہمیشہ یک جیسے ہی ہوں گے۔
شرم، جہاں ہر شخص آپ پر جھپٹتا رہا ہے، اپنے آپ سے نہیں چنے پڑتی سے نفرت کرتے ہیں، اور
مگر آپ اس کی اور اپنی زندگی میں تھیں نہیں گھولتا چہ جے، شاہ کی افغانی جذبہ کے باعث طش میں ہر
آپ اس کو تھیں بھی نہیں گھولتے تو کسی نے کسی کو حقیقت اور اوصاف کی تعلیم دینی ہوگی۔ پھر یہ خود آپ اس
مضمون اخلاقی سے نفرت کریں گے، اس کی کتابوں کو اس کے تھے ہوئے کیلوں کو ہر صورت و عمرہ کی، وہ
برہمن جب سمجھیں گے مگر یک دن آپ اس سے اتفاق کرنا ہی پڑے گا۔ اکثر یہ بھابہ کہ ہم لوگوں نے
خود کو گواہی دے سے اس قدر متحکم ہیں کہ ہم کو اپنی خواہش اور اپنے ادا کاروں کی خواہشوں کے برعکس
حقیقت پسندی پر مجبور ہونا پڑے، حتیٰ شاعری کو یونی میں جڑ پڑے اور کئی تقریر کو یونی میں۔

میں نے Lady Gregory سے کہا تھا کہ تمہارے لیے مجھے مافی سعادت کے امکانات نظر نہیں
آتے ہندوئیں اپنی ساری امیدوں کو خیر باد کہہ دینا چاہیے، مگر اس لیے وعدہ کیا کہ وہ اپنے کچھ دوستوں
سے مل کر دلوں دے گی۔ اس کے پریمی Edward Mearns نے ہارن ہین ٹیٹل کا خرقہ اوڑھ لیا۔
ہمارے پسے اور کارا تھکان سے آئے تھے، مگر اب ہم نے پنا کام سمجھ معنوں میں ایک چھوٹے سے غیر
پیشہ و پیشہ ہائے کے ساتھ شروع کیا ہے۔ کسی شخص نے میرے ایک ٹیکسٹ کے حد مجھ سے پوچھا، "آپ
بچے و کار کہاں سے لائیں گے؟" تو میں نے جواب دیا "میں آدمیوں سے بھرے کسی کمرے میں جاؤں
گا، وہاں موجود ہر آدمی کا نام ایک پرچی پر لکھوں گا اور ساری پرچیوں کو یک ٹوٹی میں ڈال کر ہر نام نکال
لوں گا اور وہی آدمی کریں گے۔" میں کبھی اپنے اس الہی جواب پر حیرت ہوتا ہوں، جو غلط سوال
کرنے والے کو صرف پریشان کرنے کے لیے دیا گیا تھا، مگر سوال دیکھیے کہ بالکل ویسا ہی تھا۔ وراثت
ہمارے بہترین ادا کار کسی اتفاق سے نہیں چنے گئے تھے۔ ایک تو سچ کے دینے کے پس کے ہر کار
مگر کہ تھا دوسرا ایک تیسری قسمی کہانی میں کام کرتا تھا جو ٹولینڈ کے دورے پر آئی ہوئی تھی۔ اس نے
شاید کچھ بھی نہیں سیکھا تھا اس لیے کہ اس کا اندازہ کمر در اور شیر انگیز تھا۔ جب وہ کسی سفید فام کا سردارا
کر رہا ہوتا تو تیسرا اس کے چہرے پر سفیری مل رہا، اور تیسرے کے مرقیہ طریقوں پر عمل کے مطابق، جب وہ
سیاہ فام کا سردار کرتا تو اس کے چہرے پر سیاہی مل رہی جاتی۔ اگر کسی ادا کار کو اس پر کھڑا ہونا پڑتا تو اپنے
ہاتھ کے جھکے سے گھول رہا، بالکل اسی طرح جیسا کہ میں نے اپنی شباب کے زمانے میں دیکھا تھا، ایسے
عمل کی طرح جو کئی پشتوں سے متروک ہو چکا ہو، بالکل ہی طرح جیسے چارپا کاغذ کی ایک دس کے بعد بدشاہی
شک کہنے کے لیے ہر نوکا متعال۔ ہر آدمی ادا کار اس سیاہی جھپٹے سے "میں تمہیں جو اپنی ادا کاروں کا
مقصد غریبوں کے بچوں کو تعلیم دینا کہتی تھیں مگر حقیقت وہ تعلیم ایسے "سوال و جواب ہائے" کے ذریعے ہوتی تھی۔

سوال: "بہائی کا شیخ کیا ہے؟"

جواب: "نکستان۔"

وہ سب جب الوطنی کے جذبے کے تحت آتی تھیں۔ ان میں سے دو تو تھیں۔ ایک کا نام ثابت ہوئیں Miss Algood اور Miss Maire O'Neil دونوں آپس میں بہنیں تھیں، ایک کا ذہن دُوب گیتوں اور نوبت کہنتوں میں ڈھونڈتا تھا، دوسری کا ہتھیار غنائی اور نغمہ تھا۔ مجھے خبر نہیں کہ ان کے دلوں میں ایسا کیا تھا جس نے ایک والدہ سا پیدا کر دیا تھا۔ شاہ ان کے ضمیر نے اس کو کچھ کے کچھ لئے تھے کہ ان کے دلوں میں جو کچھ ایک قسم کا قوی احساس تھا، وہ ختم ہو جاتا تھا۔ شاہ ہی وجہ سے خود مرنے کے جذبے اور بندہ خواہشات ان پر حاوی ہو گئی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ان کی غلط فہمی ہی تھی جس نے ان کے اندر سوائے ہونے جو ہر قابل گوچر رکھ دیا تھا۔ اگر ان کو تھیٹر کے میدان ہی میں قسمت آتا تو ان کی تو وہ کسی مشہور انگریزی اور کارکی علاقے کی کوشش کرتیں، مشہور انگریزی کہیں میں اور کارکی کی آرزو مند ہوتیں۔ اگر ہم ایک عرصے تک اپنے ٹولے میں بند رہتے، وہیں ان کیوں کے در قیادہ چھوٹے چھوٹے بال سروں میں تھیں پیش کرتے ہوتے تو ان کے جوہر قابل چھپے ہی رہتے۔ ہم کسی سیاہی غلط فہمی کے خوف کے بغیر تجربات کرتے رہتے۔ ہمارے پاس بہت کم رقم سیونگ تھی۔ ابتدا میں تو صرف تھوڑی سی رقم کی ضرورت ہوتی، کچھیں پاؤڈر Lady Gregory نے دیا، میں پاؤڈر میرے پاس تھے اور ایچراچھ سے کچھ رقم جمع کر لی گئی۔ ہمارے تھیٹر کا ادارہ میں کچھ فضول رہتی تھا، ہم سب، نکلنے والے، دواد کارکی کرنے والے، اکٹھے بیٹھ کر رات بھر کرتے کرتے کرکٹ مارا کھیل کھیلا جائے گا اور کون کون اس میں ادا کار کی کرے گا۔ میرے Lady Gregory اور John Synge کے انتظام سنبھالنے سے پہلے ایک سمندوار بد نظمی کی رہتی تھی، سنتوں ہمیشہ بھی چلتی رہتی تھیں اور اس زمانہ کوئی کھیل بھی نہیں چلے کیا جاتا۔ موام سے ہمارے تعلقات بھی کچھ نیا وہی خراب رہتے۔ ہمارے ایک تھیں پروٹن پرست پولیس نے سخت حملے کیے اس لیے کہ اس میں ایک شادی شدہ کسان محنت کا ایک آشنا دکھایا گیا تھا۔ جواب میں جب ہم نے جزیرہ Aran کی اس قدیم لوگ کہانی کو شائع کیا جس سے یہ خیال لیا گیا تھا تو ہم پر ہوا الزام لگا دیا گیا کہ ہم نے یہ کہانی قبائلی دور کے روم کے کسی پینچر مصنف کے ہاں سے لٹائی ہے۔ اسی زمانے میں Lady Gregory نے اپنا پہلا حرمیہ کھیل لکھا تھا۔ میرے منظوم کھیل اتنے طویل نہیں ہوتے تھے کہ وہ پوری ایک شام کے لیے کافی ہوتے اس لیے Lady Gregory نے وقت پر وقت کرنے کے لیے اپنے علاقے کی بولی میں ایک چھوٹا سا ڈراما کھیل بھی لکھا۔ کھیل کچھ بڑے تھے کہ ایک مہم وطن جب مرکا سے ایک سو پاؤڈر کی رقم کما کر واپس آتا تو اس کو پتا چڑ کر اس کی معشوقہ ایک دیوہرہ بیٹہ روم سے شادی کر چکی ہے۔ وہ بیٹہ روم سے ناش کھینچنے کے زمانہ جان بوجھ کر پورے کے پورے سو پاؤڈر ہار جاتا ہے۔ تھیٹر کمپنی نے اس کھیل کو کھینچنے سے اس لیے ہٹا رکھا کہ ایک تاریک وطن کی سو پاؤڈر کے ساتھ وہی کے ہزاروں کے نیچے میں لوگوں میں ٹک چھوڑنے کے بارے میں بہت افراطی ہوئی۔ ہم نے ثبوت پیش کیے کہ اس سے کس نیا ڈراما کما کر لوگ واپس لوٹے ہیں مگر ہم سے یہ کہہ دیا گیا کہ اس بات سے تو حالات بد بھی خراب ہوں گے۔ اس ضمن میں کچھ غم ہونے لگا پھٹ

نے ہم لوگوں کو تنگ مارا۔ آئندہ کا ریڈیو گورنری سو پاؤنڈ کی رقم کو جس پاؤنڈ تک کم کرنے پر رضامند ہو گئی اور یہ مشکل تمام یہ کہیں پیش کیا گیا۔ یہ کہیں کچھ جذباتی اور ذاتی قسم کا تھا مگر ریڈیو گورنری نے اپنے دوسرے کہیں میں اپنے کمال کو دریافت کر لیا۔ ریڈیو گورنری نے بھی ہمارے ساتھ کام کرنے کی خوش ظاہری تھی اور شاہد اسی طرح خود اس پر اپنے شخص کا انکشاف ہوا۔ وہ اس وقت انگریزوں کی رہی ہوئی۔ اس سے پہلے اس نے سوئے سپاہی یا دانشوروں کے اور تجربے نہیں کئے تھے، اس وقت تک فیئر سے بھی اسے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

ریڈیو گورنری کے Seven Short Plays کو آج پڑھ کر کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ ان میں سے ایک The Rising of the Moon جس کو آئرش کلاسیک کا نچہ عالم ہے، بھلا کیوں سیاہی بھر دینگے بازی کی بیہ سے نہ اس تک پیش نہیں کیا جاسکا۔ اس کی وجہ صرف اتنی ہی تھی کہ کہیں میں ایک سپاہی نے ایک جاگے ہوئے قیدی کو چھو لینے کے بعد جو اس بات پر چھوڑ دیا کہ قیدی نے کچھ پرانے عیت مٹ کر اس کو اپنے نام و شہادت کی بھولی ہسٹری دے دی تھی۔ اداکاروں نے اس کہیں کو پیش کرنے سے اس سے انکار کر دیا تھا کہ "رسمی پولیس کے سپاہی کے بارے میں یہ بات دیکھا جانے لگے کہ وہ دشمن ہے سب ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے تو صرف یہ قیاس بھی دشمن کے مترادف ہوگا۔ ایک مشہور بلز بانہ مقالہ لیزر نے مجھے عجیب خط لکھا، "دشمن کے ہونی اگر پولیس کے سپاہیوں کو دشمن پر مت کی صورت میں دیکھے گی تو پھر ان سے تمنا کیسے کر سکتے ہیں؟" بالآخر جب یہ کہیں پیش کیا گیا تو بہت جوش و خروش کے ساتھ پسند کیا گیا مگر ایک نئی مصیبت کے ساتھ۔ دشمن کے سب سے بڑے اخبار نے کہیں پر الزام تراشی کی کہ اس کے ذریعے شاہیہ کی فوج کو بدنام کیا گیا ہے، اس کے بعد آئر لینڈ میں گورنری حکومت کے مرکز Dublin Castle نے اس کے طور پر پولیس کی ستاروں شدہ وردیوں کو کہیں میں استعمال کرنے کی غرض سے ہمارے ساتھ فروخت کرنے پر پابندی لگا دی۔ اس پابندی سے دوسرے تجویز والے بھی مشکل میں آ گئے۔ اس لیے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کی ایسے حالات میں معاونت کیا کرتے تھے۔ حالات کہ قلعے والوں اور اخبار والوں کو خوب بھی طرح کی بات کا علم تھا کہ پولیس کے سپاہی کثیر اسی طرح سیاہی قیدیوں کو چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ مگر اس سے معاونت اور بھی خراب ہو گئی۔ (۳) مذہبی نظریات رکھنے والوں نے بھی ہمیں پسند نہیں کیا۔ Cardinal Logue نے میرے تحریر کیے ہوئے کہیں Courtes Cathleen کو ایک خود نہ تحریر کر کے قابل ملامت قرار دے دیا۔ اور جب ہم نے لکھا کہ ہم غیر ملکی شاہکار کہیں کو پیش کرنے کے خواہاں ہیں تو ایک قومی اخبار نے لکھا کہ "غیر ملکی شاہکار خطرناک ہوتے ہیں"۔ جن معنوں میں کہ بال کمروں میں ہم اپنے کہیں پیش کرتے تھے ان میں زیادہ سے زیادہ دو سو افراد ہا سکتے تھے مگر دیکھنے والے کبھی تین یا تیس سے زیادہ نہیں ہوتے۔ ہم ان کہیں کو ماہ میں دو یا تین بار پیش کر سکتے تھے مگر ان دنوں جب ہم لوگ پچیس میں دست دہریاں ہوتے تو ہر ایک ٹیما سٹیجی رہتی۔ پھر بھی اخبارات میں ہمارے بارے

میں شہر نشینوں کی کمی تھی۔ ہوفی کہ ہم سب کو اسی نگاہ سے معاشرے کے لیے سب سے بڑے خطرہ تھے۔
 دو واقعات نے ہم کو کامیابی فراہم کی، ایک دوست John Synge نے باقاعدہ ٹھیٹر فراہم کیا اور ہمیں اس
 کے روپ میں ایک ڈرامہ پیش کر دیا۔ اسے خلاف ایک نہایت دوست مضمون کی اشاعت کے بعد
 میں نے اسٹیج پر پہلے پہلے سے پہلے کر چنے نیکوؤں شائقین سے مدد کی درخواست کی۔ جب میں اسٹیج
 سے نیچے اترتا تو ہماری ایک پرانی دوست Miss Horniman نے، جن سے میں باؤڈل کی رقم منے کی امید
 تھی، کے بڑے کمرے سے کہہ ”میں تم لوگوں کے لیے ایک ٹھیٹر مہیا کرناں گی۔“ اپنے وعدے کے مطابق
 اس خاتون نے ایک ٹھیٹر نہ صرف مہیا کر دیا بلکہ اس میں ہماری ضروریات کے مطابق تبدیلیاں بھی فرمادیں،
 وہی مدت جس کو آئینج ہم Abbey Theatre, Dublin کے نام سے جانتے ہیں۔ اس خاتون نے چند
 برس ہماری مالی امداد بھی کی۔

John Synge سے میری ملاقات 1896 میں ہوئی تھی۔ کہنے لگے مجھ سے کہا تھا،
 ”ہمارے ہوٹل کی سب اوپر وہی منزل پر ایک انٹرش رہتا ہے، میں اس سے تمہاری ملاقات کرناں گا۔“
 میں اس وقت ایک مجلس انسان تھا مگر وہ تو مجھ سے بھی زیادہ مخلص نکد۔ وہ ایک بہت قدیم انٹرش خاندان
 سے تعلق رکھتا تھا، نہایت سادہ اور مہذب مگر ایک گونہ حکمران اور خاندان لکھا تھا۔ اس کی حیثیت میں فاقہ گئی
 اور نیم فاقہ گئی کے درمیان تھی۔ اس کے باوجود وہ روپ ٹھوسا پھرتا، کبھی ریل گاڑی کے تیسرے طبقے
 میں، کبھی صرف پیدل، غریب لوگوں کو سڑکوں پر ان کے گھروں میں سارنگی بجا کر ٹھکڑا کرتا۔ ایسے ہی آدمی
 کی ہم کو ضرورت تھی اس لیے کہ میرے شاگردوں میں وہ بڑے حد تک تھے جس کا سب سے زیادہ سے وہی علاقہ
 نہ تھا، نہ ہی وہ کوئی بڑا انسانیت کی خدمت کا دھوے دار تھا۔ وہ سارا سارا دن عرصے پر عام غریب آدمیوں
 کے ساتھ بغیر کسی خاص توقع کے صرف اس لیے گھوم سکتا تھا کہ وہ ان کو پسند کرتا تھا۔ وہ آئر لینڈ کے لیے
 اپنے ذاتی اثر کے مقابلے میں اپنے ساتھ لے کر نکلاؤں کے اثر سے، وہی کچھ کر سکتا تھا جو کہ Robert
 Burns نے۔ کٹ لینڈ کے لیے کیا تھا۔ جب کٹ لینڈ دانی اور مذہبی حیثیات سے لاچار تھا، شیشہ
 اینڈکی نے Robert Burns کے روپ میں اس خط زمین کی تصویرانی پر جنگلی کو بحال کر دیا۔ جب میں نے
 John Synge کو Galway کے ایک قریبی جنگوں سے بحرے جزیرے پر جائزہ دیاں کی زندگی کا مطالعہ
 کرنے کا مشورہ دیا، ”ادب میں جس کا بھی ذکر نہیں آتا تھا“ تو بیچ مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ کیا ہونے
 والا ہے۔ John Synge نے کالج میں میکک زبان کا مطالعہ کیا تھا، لہذا میں نے اس سے وی کچھ کہا جو
 میں نے اس شخص سے کہا جس نے میکک زبان پڑھی ہو اور وہ اس میں کچھ سمجھتا پتا ہو۔ جب اس نے
 جنگل بحرے جزیرے کو دیکھا تو بے حد خوش ہوا اور اس کے اپنے قول کے مطابق وہاں جانا، ”دولت کے
 کھوکھلے پن، مغرب کی خلافت سے فرار کے مترادف تھا۔ اس کی صحت خراب تھی، وہ کسی جزیرے کی
 تکلیف دو زندگی کو برداشت نہ کر سکتا تھا، اس کے باوجود وہ اس جزیرے اور اہلن کے درمیان آتا جاتا رہا۔“

Burns شہید سکاٹ لکھتا تھا کہ John Synge نے ہم کو دریا سے
 دکانوں کو تیراں کر دیا۔ کچھ عورتوں نے اس سے تنہائی کر دیا وہ ۹۸ کی بخار سے مرے میں کچھ بکھے کر،
 بد شہرہ ایسے وطنی مونیٹ پر لکھا ہوا وطنی بھی نکھیل بہت تھیلی ہو گا۔ لیجئے، وہ دو ہفتوں بعد ایک ایسی مقرر
 ٹھانے کے ساتھ واپس آیا جس پر اس نے حسبِ ماہیت بہت محنت کی تھی۔ وہ مقرر کچھ دیں تھا کہ دو عورتیں،
 ایک پرہیزگار اور دوسری کشتیوں کا جو ایک غار میں رہتی ہیں، اپنے اپنے مذہب کی حق پرستی پر آکر ایک
 نہ ختم ہونے والی بحث میں الجھ جاتی ہیں۔ کشتیوں کی عورت بادشاہ کی ہتھیاروں اور ملک میں کچھ کو برا بھلا کہتی ہے
 اور پرہیزگار عورت رو مانگیسا کے احتسابی عمل کو روپ پر طعنہ زن ہوتی ہے۔ پہلے تو دونوں بہت آہستہ
 باتیں کرتی ہیں اس لیے کہ ایک کو دوسریوں کے مانتوں عصمت و عری کا خوف تھا تو دوسری کو شادی و فساد و فحش
 کا۔ کچھ دیر بحثا بحثی کے بعد ان میں سے ایک یہ کہتی ہوئی غار سے باہر نکلتی تھی کہ وہ اسٹیشننگ راہ پر گامزن
 صحبت میں رہتا ہرگز پسند نہیں کرتی ہے اس کا یہاں بھی حشر کیوں نہ ہو۔ اس وقت تک وہ کھیل برف
 خیل خاک کے کی حد تک تھا، نہ بد فہم نہ کچھ نہیں اور نہ کبھی خیل کیا گیا، مگر میں نے اس وقت ورنہ بہت دنوں بعد
 تک یہ سمجھا کہ Synge کی اس بات کا اندازہ کس نہیں ہوا کہ اس قسم کے مقرر کے ذریعہ وہ معاشرے کے
 دوہیں کس قسم کے تصادم کی مادہ ہمارے ربا تھا۔ لہذا وہ اس مشکل کا تصور نہیں کر سکا تھا جو ہم پر آنے والی تھی

Synge سے پہلی ملاقات کے چند روز بعد جب میں سکاٹ، مالی شہر کے ذریعہ جزیرہ ایلان
 پہنچا تو جزیرے کے سارے گاؤں کا ایک گروہ جو ہم انیسویں کی آمد دیکھنے کے لیے اکٹھا ہو گیا تھا، ہمارے پاس
 جزیرے کے سب سے معزز شخص کو بلے کر آیا۔ اس معزز شخص نے ہم سے مخاطب ہو کر صرف دو جملے ادا کیے
 ”مگر آپ میں سے کسی صاحب نے کوئی چیز دیکھی ہو تو ہم اس کو ہدیہ کے لیے تیار ہیں۔ ایک صاحب
 جنہوں نے اپنے والد کو قتل کر دیا تھا، میرے گھر مہمان رہے جب تک کہ ان کو امریکا لے کر بھیج دیا جائے گا
 موقع نہیں ملے گا۔“ اس پر مجھے شخص کی کہانی کی خبر پر Synge ایک تھیں کھڑے رہے جس میں دکھایا گیا تھا
 کہ ایک نوجوان کسی چھوٹے سے مونی شرب خانے میں آتا ہے اور شراب خانے کے مالک کی بیٹی کو ہانا
 ہے کہ اس نے اپنے دل کو قتل کر دیا ہے۔ اس نوجوان نے اپنی کہانی کو اس طرح بیان کیا کہ مونی کو اس
 سے ہمدردی ہوئی، یہی نہیں بلکہ بار بار جب بھی وہ اپنی کہانی کو خانے اور مہمان کے ساتھ بیان کرتا سننے
 والے اس کا ہمدردی جاتا، شاید اس لیے کہ وہی لوگ نغمہ کاٹوں کے خوف ہوتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا
 ہے کہ جرم تھا خوف مالک ہو گا، اتنی ہی بڑی اشتعال گیزی اس کا باعث ہوئی ہوگی۔ نوجوان اپنے ہی
 قصے کے حرم میں گر کر ہو کر خوش و حرم بھی رہتا اور کسی حد تک خوش قسمتی بھی اس کا ساتھ دیتی ہے۔ وہ محبت
 میں کامیاب ہوتا ہے مگر دور میں نہیں جیتا ہے، حتیٰ کہ جوئے خانے کی مشینوں کا بھی ویلا نہ نکالی دیتا
 ہے۔ اور پھر ایک دن اپنی تک اس کا دل، سر پر چھایا ہوا ہمدردی، مگر بظاہر ٹھیک تھا کہ ہمدردی ہو جاتا ہے اور
 وہاں کے لوگ اس فریب پر چل پڑتے ہیں۔ دو نوجوان دوبارہ لوگوں کی ہمدردیوں کا حصہ کرنے کی غرض

سے اپنے باپ کو بچ کر قتل کرنے کے لئے بیچے سے مردود ڈر پڑتا ہے۔ لوگ نوجوان کی بچہ جیسی کہنی کے کنارے سے اتنے خوف زدہ ہو جاتے ہیں کہ پولیس کے حوالے کرنے کی فرشت سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتے ہیں۔ مگر نوجوان کا باپ اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیتا ہے اور وہ دونوں ایک ساتھ تشر دیتے ہیں۔ نوجوان اپنے خیالات کی اونچی اونچی بروں پر سو رہا ہے۔ یہ اعجاز کتنا عجیب ہے کہ سچ سے وہ پتا مختار آپ ہوگا (یعنی اب وہ کسی ایسے جھوٹے فرضی مہارے کا شکار نہ ہوگا)۔ نہایت خوش نما، شاعرانہ، اوتھاء، موسیقی اور طرز کے اعتبار سے ایک شاہکار اور ہمارے مقامی زبان کے خمیر کا یہ اسی ترین کھیل جب پیش کیا گیا تو عوام کے غیظ و غضب کا باعث ہو۔ ہم نے جب یہ کھیل پیش کیا، اس وقت خمیر کے اندر سفر پولیس و سے ہمارے ہاتھ جب کہ عوام کی امن و امان پر مقرر رکھے گئے تھے، بعض شہادت کے مطابق، پانچ سو پولیس کی غری ہو جو تھی۔ یہ بھی نہیں ہو کہ جہاں بھی آزمائش شائقین کے لیے یہ کھیل پیش کیا گیا ہو چھبے کی دن کسی نے ان کا دل پر کچھ پھینکا نہ ہو۔ نہ بدست میں جب یہ کھیل پیش کیا گیا تو ان کا دل پر کھینچ کا میک اور ایک دہائی گھڑی تھیں۔ خط کی بات یہ تھی کہ کھیل کے اختتام پر گھڑی کے ماٹک نے سٹیج کے دروازے پر کھڑی گھڑی واپس طلب کر لی۔ وہیں کے شائقین نے دیکھا اس کھیل کو قبول کر لیا۔ میرے خیال میں انھوں نے سوچا ہوگا کہ اسٹیج سے پیش کرنے والے بہر حال محبت کے اور انھیں رفاقت کے قائل ہیں۔ اب لے اور بھی کہ مباحثہ آمیز محبت کے ذریعے Syngue نے ایک حقیقت کو اس طرح پیش کرنے کی اس لیے کوشش کی، جو اس کو دنیا کی سرورق حقیقتوں سے محبت ہے۔ انھوں نے سوچا ہوگا کہ مغرب کا انگلستان کے مفاد کی سیاست سے دار کا بھی واسطہ نہیں، اور اگر یہ فرضی محبت ہو بھی تو وہ اتنی کم کامت کا سیاست والا ہوگا کہ دی صرف اس کا مذاق اڑائے گی، افسوس ہی کرے گا۔ اس کے بعد جو 1910 میں جب Syngue کا انتقال ہو تو رے خانہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور جب بھی ہم اس کھیل کو پیش کرتے، وہاں شائقین سے تقریباً خالی ہوا کرتے، اور چوتھ سے ہم پر مذمت مسترا دھونے لگی۔ وہ مسلسل ہمارے بیچ ن لوگوں نے حاصل کی جنھوں نے Syngue کی دست اور جنھوں سے بہت کچھ سیکھا، اگرچہ وہ لوگ دوسرے دیہات سے تھے۔ Syngue کے کام، میڈی گریجویٹ کی تعریف، میرا کھیل Cathleen O'Houlihan اور میرا ہی کھیل Hour Glass، نثری محبت میں سب ہماری کچھ اہمیتوں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ یہ کھیل ہمارے ان شعری روایت کا جو زمانہ دہائی سے چلی آ رہی ہیں، تسلس قائم رکھتے ہیں، ہمارے نئی تصویلات اور طرز و شکلوں کو بھی اندر میں پیش کرتے ہیں جس کو اب شہر پسند کرتے ہیں۔ اور وہ جنھوں نے Syngue کو پڑھ کر کھنا سیکھا ہے، بد قسمتی سے خود ملک کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ اس کو ہماری بولی میں بھی کم ہی دل چسپی ہے۔ ان کے کھیل عام طور پر معاشرے کی کھلی برائیوں، مثلاً رشوت کے ذریعے کی حد نمانے کے سوا کچھ کی حیثیت سے ملازمت کا حصول، کچھ مقامی سیاست دانوں کی کوشش کہ وہ تقریباً سب میا کی پارٹیاں سے مدد کی گئیں، وغیرہ۔ اس میں کوئی شک نہیں

کہ بہت سے نوادہ دوزیروں اور مزدوری سیاست دانوں کی، میرے خیال میں، ہمارے پیش کیے ہوئے
 کہیوں کے ذریعے تربیت بھی ہوئی ہے۔ پھر بھی، بہت سے ایسے مزاحیہ کہیں بھی ہیں جو سیاسی طرز کے
 زمرے میں نہیں آتے، باوجود کہ وہ قہر کے سیاست زدہ گروہ کی کی زندگیوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ ان
 میں سب سے زیادہ معروف Lennox Robinson کا کہیاں Wheeheaded Boy ہے جو انگلستان اور
 امریکا میں شہید چاچکا ہے۔ کچھ دنوں سے یہاں ٹھہرے ہوئے لگا ہے کہ یہ داستان ب اپنے آخری مراحل سے
 گزر رہا ہے جس لیے کہ ن کے کسی پرانے پلاٹ میں ملکی تبدیلیوں سے صورت بدی بدی کر رہے ہیں۔
 انی طرح ن کے پیش کردہ کردار بھی ایک طرح کا بیک ٹنگی عداوتیہ رکھتے چاہے ہیں۔ ن سب کے با
 وجود یہ کہنا قابل از وقت ہوگا کہ پچھلے چار برسوں میں پیش کیے گئے مینو ڈراما اور ٹریڈی سے ہمیں کیا
 حاصل ہوگا، ہاں اگر ہم اپنے ان کا وہ بے غلط شوق و اُتاحت دیتے رہیں اور اپنے تھمڑے کھلے رکھیں تو آخر کی کچھ
 صورت قدرہ رکھے گی۔ ہم لوگ ان دنوں بہت مشغول ہو چکے ہیں جن کی بنیادی وجوہات میں ہمارے ملک
 کی ناز و جنگی دوزخوں پر گویاں چھنے کی وجہ سے شائقین میں کمی اہم ہیں۔ پھر بھی اب تک ہمارے قدر
 گزارا ہو رہا ہے کہ مجھے قدر پر یقین آنے لگا ہے اور شاید اب میں آپ حضرات سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ
 میں جب چاہوں، خواہ کہانی کے درمیان یا بعد سے پسری، اپنا خطاب ختم کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ مجھے
 یقین ہے کہ اتنا سب کچھ کہنے کے بعد آپ حضرات کا اذو ہوگا ہوگا کہ جب میں آپ کے، و شاید وقت
 کے باقیوں یہ انعام حاصل کر رہا تھا، میرا جی چاہتا تھا کہ میرے ایک جانب ایک نوجوان کی روح اور دوسری
 جانب ایک گورنر، اپنے توانا پر چاہے کے ساتھ بٹا دوں۔ میں نے پچھلے چند ہفتوں میں جو کچھ دیکھا ہے
 وہ یقیناً John Synge دلیڈی ٹریڈی کے لیے سنسنی خیز ہوگا اس لیے کہ سوئڈن نے اب تک وہ کچھ
 حاصل کر لیا ہے جس کے لیے ہمارا ملک ابھی تک صرف خواہش ہی کر سکتا ہے۔ میرے خیال میں شاید سب
 سے زیادہ تو آپ کے وہ رکا مل کش متغیر، ایک خدا ان جس کو صرف تکی ساری کھیتیں ہی غیب نہیں بلکہ
 میں ان کے اطراف ہر طبقے کی حاش کا جوہر بھی دیکھ رہا ہوں۔ آئر لینڈ میں انگلستان ہو گواہ امریکا کی
 جمہوریت ہو اس نوعیت کے احساس بحال اور نظم و ضبط کا مظاہرہ نہیں پیش کیا جاسکتا۔ ایسا سب کچھ ہماری
 نسل کے لیے مہانیت قلب کا باعث ہوگا۔



Years کا کہنا تھا کہ اس نے اپنے خطاب کے لیے صرف اپنی یادداشت پر تکیا کیا تھا۔ اس
 لیے یہ مناسب ہوگا کہ خطاب کے مشج کے ساتھ ہم وہ کچھ بھی پیش کریں جو اس نے The Bounty of
 Sweden کے نام سے شائع ہونے والے مضمون میں شائع کر دیا تھا۔

(۱) نماز جنگی کے ابتدائی مہینوں میں، جب ریور کے سرے پہلے تباہ ہو چکے تھے، پتھروں اور
 گڑے ہوئے چیزوں کے مے سے بڑھیں بندھیں، میں اپنے Galway کے مکان میں تھا۔ ایک ہفتے تک

مذکورہ فی اخبار تھا نہ وہی یقین کے قابل خبر نہ ہی نہیں یہ بنا تھا رہا تھا کہ جیت کون رہا ہے و رہا رہا
مقرر ہونے والی ہے۔ جب اخبار آنے لگے تب بھی یہ کہنا مشکل تھا کہ پہاڑی کے اس پار تھی کہ گھر کے
قریب پہاڑ کی اسی قدر کے پرے کیا ہو رہا ہے۔ وقتاً فوقتاً گھر کے برابر سے زرقی ہوئی فورا کاریں
جن کی پچھٹوں پر مٹھیں، حتیٰ کہ سرسوں کے درمیان ٹھٹھیں ہوئی مٹھیں ہوتیں، کچھ رات کے وقت دھماکے کی
آواز ہوتی۔ ایک بار فوج کے وقت برابر کے ہوئے گل میں لگی آگ سے اٹھتا ہوا دھواں بھی دکھائی دیا
تھا۔ انسان ہنگاموں سے بھر پور کئی صدیوں تک شاہ اسی طرح زندہ رہا ہوا گا۔ ایک ٹھیکہ دار نے وہی خوش
کہتی ہوئی محسوس ہوئی تھی کہ انسان کو پیچیدہ دیا لگی زور نہیں ہوا چاہیے نہ صرف کے حسن کا احساس نہیں ہونا
چاہیے۔ ایک جنگی بیٹا نے کبھی میری گھڑی کے برابر کے ایک سو رخ میں گھومنا دیکھا تھا۔ اس خان
سوار کو دیکھ کر میں نے منہ بہ ذیل اٹھ کر رکھے تھے۔

درد میں، درد دیو کے گھرے پلستر پر

شہد کی گھبراہٹ دکھائی دیتی ہے

دور پٹی تل ہے ہمارے لیے شورا ساری ہیں

میر کی دیوار کھڑا چاہتی ہے

شہد کی گھبراہٹ!

جنگی بیٹا کے اچھے گھوڑے کی درز کو آواز دے گا

ہم اپنے گھر میں یوں محبت میں گیا

ہمارے ہے پتھر، نقش ہے ہمارے نقش کی گئی

گھر میں چاہی ہے

دور کوئی قتل ہوتا ہے

کسی کا گھر خالی چاہا ہے

کسے معلوم حال کیا ہے

شہد کی گھبراہٹ!

جنگی بیٹا کے اچھے گھوڑے کی درز کو آواز دے گا

یہ تو ابتدا تھی، پھر اس کے بعد کچھ ایسی ہی کیفیت چار دیواری۔ اسی لمحے ایک عجیب واقعہ ہوا، مجھے
اسکے گھبراہٹ سے خوش ہونے لگی جہاں شہد کی موجودگی ناگہان تھی۔ ایک پتھر کے راستے کے کنارے
یہ ہوا کے تیز چھوٹوں والی گلی کے موڑ پر، ہمیشہ کسی خیال کے پیش پر سوار۔ زمین و آسمان پر میری مدد بھینر
پھرے ہوئے لوگوں سے ہوئی، ہر بات پر بحث کرنے والے اور کچھ صورت حال جاننے کے لیے ہے

تھیں۔ وہ سب کی کیفیت میں تھے جو مجھے ایک حقیقی دور سے جیسی تھی۔

(۲) ہم انھیں پہلی بار Edward Marlyn کے طریق پر نکھیر دیا، جو نیلو کے علاقے کا ایک زینت دار تھا، جزائی طور پر چودھویں صدی، جزوی Gothic فن کی جھلک تھا۔ انھوں نے کلاسیک فن کا پسندیدہ مکان جس میں Grace کے بار بار دہرائے ہوئے پتھر کی نقش و نگار سے آراستہ چارباہاں گمرہ تھا، جہاں وہ Palestine کے نغموں سے دل بہلاتا، ایک گمرہ مطالعے کے لیے رگت کا شیشوں پر شاعری کی بھڑکی تصویروں سے مزین، جہاں وہ اس اور کھیرا کے پار دیوں کا مطالعہ کرتا۔ ایک سمجھ دار ہنس رازوں، مضبوط قوت اور ذوق اور دل کش شخصیت کا مالک ہونے کے باوجود، انھوں نے وسطی کے پتھر کی طرح عورتوں سے دور بھاگتے والے تجربے اور شخصیت کے ادیبان کی عجیب و غریب خوف و رقوم پرستی کا مارا "انگریزوں نے یہ کہتے کیا یا فلاں فلاں کتاب پڑھیں تو میری جان نکل جائے گی۔" میرا نہیں Courress Cathleen اور ایک کہیں اس کا، جنہیں ہماری پہلی چٹا کہیں تھیں۔ میرے کہیں کی یہ دین، کسی آسب کو اپنی مدد فرماتے دینے کے وجود واپس حاصل کر رہی ہے اس لیے کہ "خدا صرف عمل ہی نہیں، یہ بھی دیکھتا ہے۔" اس کی یہ بات بھوک سے بہاتے انسانوں کی بدنیتی کی ضرورت کی پوری کمرے کی خاطر اپنی مدد کو فروغ دینے سے باز دیکھتا تھی۔ ہمارے کہیں کی ابتدا کا اعلان ہوتے ہی Marlyn نے اپنی امداد سے ہاتھ کھینچنے کا اعلان کر دیا۔ صرف اس سے کہ کب مذہبی عالم کے فتوے کے مطابق کہیں ہم نے خیالات پہنچائی تھی۔ میں نے یہ عالموں کو سچ میں لالہ جن کے مطابق ایسا ہرگز نہیں تھا اس لیے کہ ہم لوگ جمہوریت کے پیرو تھے۔ John Synge نے اپنی جان کو مزید خطرہ لاحق ہونے کے خیال کے پیش نظر بالکل ہی کنارہ کشی کر لی۔ چند ہی ماہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا انتقال بھی بارہویں صدی میں وجود میں آنے والے ایک پورے خاندان کی موت کے مترادف تھا۔ ایک ماشاں ہے اولاد بھرت کش، نامکمل انسان، انکل موجودہ آئرلینڈ کے معاشرے کا جیتا جاگتا مریخ تھا وہ۔

(۳) Joseph Szzygowski اپنے Uppsala میں 1919 میں سینے دار چٹا کیے جانے والے نقاشوں میں سے ایک Origin of Christian Church میں کہا ہے: "دن دنیا کی کسی جگہ کے مقابلے میں دہریوں میں کم بختا پھولتا ہے۔ اس لیے کی قدر کے زمرہ اثر برائے سب کے ماتحت ہو جاتا ہے۔" یہی کیفیت کو قبول کر پنے، ان حالتوں کی خوب آوی بھگت ہوتی ہے، اور جو مانع نہیں ہوتے ان کو تو بھرت گرتی پڑتی ہے یا اٹھتی ہو جانے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔" وہ اور فن کو سب سے بڑا خطرہ، طلباء سے، انقلابی معاشرے کی جبری ترجیحات سے، اور طرح طرح کی سیاسی اور مذہبی لفظ ہوا جس (پروکلیٹ) سے کہتا ہے۔ جبری ترجیب نے جدید انگریز کی ادب کے ایک بڑے حصے کو گمراہ کیا ہے اور ان میں ہر مونی کے حوالتاں چھوٹوں نے ہمارے قوی انقلاب کی ماہر ہمارے تھی، مشہور نے آئرش شاعریوں اور ماہر، نویسنوں کی ساری توانائیوں کو ضائع کر دیا۔ ان کو ہر وقت اپنی تخلیقات کا دفاع کرتا پڑتا تھا یعنی جنہی

فصر کی تحقیق اتنا ہی مشکل رہا۔

(۴) اپنے خطاب کے بعد ہم نے O'Casey کے کہیں Juno and the Paycock میں کیا جو کئی برسوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ اس کھیل میں، جس کے گمراہ فوڈیشی کے پس ماندہ علاقے سے لیے گئے حیرہ دوستوں کی طرح، مصنف نے خانہ جنگی کے دوران ہونے والے تھکاوٹ والے پر نظر کی ہے۔ اس میں یہ ہی قتلہ، اچانک پیدا ہو جانے والی غربت، شراب نوشی کے مزاج، گھنے لوگوں کے فلسفے، شرمگاہ کاری کے گھسے پٹے منجوع، اور یہ دکھانے کے لیے مصنف کا قحی ارتقا جاری ہے ایک دو جیسے بے ہوش مشقی ملازم کے مزاج کے سب آجوش مل ہے۔ مصنف خیر، ایک انٹیں جوڑنے والا معیار جس کو امریکی سپہی کسی دور کے شخص کے جس کے میں کوئی مارنے کی غرض سے اٹھا لے گئے تھے، غمزدہ خوش قسمتی سے بچا نکلا، بچے نہیں میں جس زندگی کی تصویر پیش کر رہا ہے، وہ اس سے بخوبی جانتا ہے۔



یا ہیئتو پینا ویٹے

امیراف کمال۔ اس کے خوش باش طرزِ ادا کے لیے جس کے ذریعے اس نے ہسپانوی ڈرامے کی بلند مرتبہ رسالت کو ہماری رکھا۔

بیسویں صدی میں ہسپانوی زبان کے گھنے پھلے ڈراما نگاروں میں سے ایک اہم ڈراما نگار پینا ویٹے نے قدرت کی جانب سے عطا کردہ تحفہ کی نعمت کو ڈرامے کے لیے بخش کر دیا اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے رنگا رنگ تجربات کو ایک طے شدہ انداز کے تحت اپنے ارتقا کے لیے استعمال کیا۔ اس اعلیٰ درجے کے پُر تحفہ فن کار کے لیے اس کا "ناد وں مہاؤر" مت انتہا برزات ہی ایک نظام کی صورت اختیار کر گیا۔ شاید ہی کوئی اور شخص اس مقام تک، جس پر پینا ویٹے فائز ہوا، یہ آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔

پینا ویٹے نے اپنی دنیا کو اپنی نہایت عائرہ اور غیر آکودہ نظروں سے دیکھا اور جو کچھ بھی اس نے دیکھا اس کو اپنی حیطہ اور بہ کمال ہوشیاری و ذہانت چانچا اور پرکھا۔ اس نے کبھی کسی ذات سے، کسی خپل سے، کسی کہ خود اپنے خیارت، جوش یا دوسری کے، تجسوس بھی دھکیلا نہیں تھا۔ اس کے ہر جوش کو کبھی کسی قسم کی تنگی کا احساس ہوتا نظر نہیں آیا۔ اسی لیے اسے اس کی تحریروں میں ایک عجیب طرز کی سچاوت اور رعنت کا احساس ہوتا ہے اور یہ ایک ہی مادرِ خصوصیت ہے جس کی مانگ کم سے اور جس کا بہت کم ٹھوکیں کو ادراک ہو سکتا ہے۔ پینا ویٹے نے اپنے ابتدائی ڈراموں میں معاشرے کی خرابیوں اور متوسط سے اعلیٰ طبقے تک کے

لوگوں کے تحفظات کو بے نقاب کرنے کی جدوجہد کوشش کی۔ میا ویسٹ کی ایک مادر مٹاں ہے کہ وہ ایک پیمائشی ذرا بگاڑی اور اسٹیج کی ضروریات کے مطابق اپنے خیالات کا اظہار کر سکتی تھی مگر اس نے نہ کبھی ماحولیات کی طرف توجہ دینا نہ کسی غیرت کے لیے کوئی قربانی کا کیا۔

اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے قدامت پسند بھائی ویسٹ نے ایسے ڈراموں سے ابتداء کی جنہوں نے Jose Echegaray (1832-1916) کی رومانوں اور جذباتی ڈراما نویس کی جال پر لب راحت کو توڑ دیا۔ اس کے پہلے ڈرامے El Nido Ajeno (1894) کو مصرین نے بالکل نظر انداز کر دیا تھا مگر وہ برسی بعد اس نے Gente Conocida لکھ کر خود کو ایک ڈراما نویس کی حیثیت سے منوای کیا۔ بعد کے چند برسوں میں میا ویسٹ نے چالیس سے زیادہ ٹھیل لکھے اس نے اس دور کے ڈراموں میں حقوق ختم خطابت کو نکال دیا کیا اور ٹھیل کے مکالمے کو سادہ اور پرکشش سے آشنا کیا۔ اس کی تحریروں کی بنیاد پر اسے سٹیج مکالموں پر ہوتی، وہی طنز آمیز لہجہ جس کے لیے آئسبرو ٹنڈ اور ایڈا شا مشہور تھے۔ میا ویسٹ نے اپنے ڈرامے La Camada de las Fieras (1898) میں باغیوں میں ہسپانوی متوسلہ ہجے کی آخری گردن والی دہیت کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا اور Cursi (1901) میں اشرافیہ کی بھی خیریں۔ اس نے جہنمی جدید کی مہالیا، عسبانی سیاست کی بدعنوانیوں اور مرہیت اور مذہبی سوکاری اور منافقت کے خلاف بھی دس کھول کر لکھے۔

میا ویسٹ 1866 میں چھپتے کے دارگھوت میڈرڈ میں پیدا ہوئے۔ اس کا باپ بچوں کو بیمار چوں کا ایک قابل معالج تھا۔ معالج ہونے کے بعد وجود ٹیکسیر کے ڈراموں کا لب داود تھا اور اس نے اپنے بچوں میں بھی ڈراموں سے دلچسپی پیدا کی۔ میا ویسٹ نے San Isidore Institute میں تعلیم حاصل کی اور وہیں سے اس نے چھوٹے چھوٹے ٹھیل اور کچھ ٹھیلوں کے قلمی شروٹ کیے۔ میا ویسٹ قانون پڑھنے کے لیے میڈرڈ جاتی ورڈی میں داخل ہوا مگر اپنے باپ کی موت کی وجہ سے اس کو تعلیم اور وری چھوٹی پڑی۔ کوئی ورڈی سے لگا کر اس نے مصائب اور خاں کی طرف توجہ دی اور برسوں کے لیے باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ 1890 میں میا ویسٹ نے اداکار و حیثیت سے ایک ٹھیٹر ادارے میں خدمت کر لی۔ اس کی پہلی کوئی تصنیف Teatro Fantástico (1892) تھی۔

1890 کی دہائی کے جھڑی برسوں میں میا ویسٹ نے جدیدیت کے شیدا ادیبوں کے ایک اختراعی گروہ Generation of 98 میں شمولیت اختیار کر لی جو جنگ میں ہسپانیہ کی شکست کے بعد اس کے وقار کو بحال کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ میا ویسٹ کو اس گروہ کے جدیدے Vida Larana کا مدیر بنا دیا گیا۔ بعد میں اس نے میڈرڈ کے اخبار El Imparcial کے لیے بھی لکھنا شروع کر دیا۔ ہسپانیہ کی خانہ جنگی کے دوران اس کی بعد میں جنرل فرانکو کے ساتھ تھیں اس لیے اس کو اس کے صر میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔

میا ویسٹ کو بین الاقوامی شہرت اس کے ٹھیل Saturday Night کی وجہ سے ملی جو امریکا کے شہرینہ پارک میں ہر سال تک قارئین سے کھینچا گیا۔ اس کا دوسرا بین الاقوامی سطح پر مشہور ٹھیل La

Maquerida 1913 (The Passion Flower) تھا، جس میں سوتیلے باپ اور سوتیلی بیٹی کے درمیان نہائے تحرمان (Incest)، محبت، اور نفرت کی عظیم تشدد اور قتل کی ویرانیں ہوتی ہیں۔ مینا ویٹے نے اپنے مخصوص موضوعات اور طرز پر ازے پہلے کے بچائے اس دور کے مشہور پورٹریٹ ڈراما نگاروں کی جدید طرز، نگارش کو اپنایا۔ اس نے اپنے کہیوں میں عوامی، عداوت اور نفرت، افسردہ ریت، مہربانوں کے جدید میلانات کے تحریرات بھی کیے۔ مینا ویٹے نے اراکوں کے علاوہ وہی اور مہاشرقی مسکن پر تنقید بھی لکھی۔

مینا ویٹے 1913 میں، ہینریٹ اکیڈمی کا رکن بنا دی گئی۔ اس کے آخری دور کی تخلیقات ان مقبول نہیں ہوئیں جتنی کہ ابتدا میں ہوئیں تھیں، شاید اس لیے کہ آخری دنوں میں وہ جذباتیت اور قدیم پسند کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ جب مینا ویٹے کو نوٹس انڈیا گیا تو کئی نئے لکھنے والوں نے، جس میں مادل ہار Ramon Perez de Ayala شامل تھا، احتجاج کیا تھا۔ مینا ویٹے نے انعام دینے کے لیے منعقد ہونے والے جلسے میں شرکت سے انکار کیا تھا۔ اس لیے ہسپانیہ کے سفیر نے اس کی غیرت کی اور انعام وصول کیا۔ مینا ویٹے نے اپنی مددگی میں ہی دو سو تخلیقات شائع کیں۔ یہ کار کا 1954 میں انتقال ہوا۔

ضیافت سے خطاب*

(جوں کہ انعام پانے والا اسٹاک ہولم میں دئی جانے والی ضیافت میں شریک نہ ہو سکتا تھا اس لیے اس ضیافتی اجتماع سے ہسپانیہ کے سفیر عزت مآب Count de Torara نے خطاب کیا)

آج میں جس عظیم اہمیت کے جذبے سے سرشار ہوں اس کے بیون کو میں بہت مشکل پاتا ہوں۔ مجھے Benavente کی جانب سے حاضرین سے خطاب کے لیے خود ہی کی صلاحیتوں اور متعدد دینی ضرورت ہوتی۔ مجھے اس عظیم مصنف کی غیر موجودگی پر، اپنی طرف سے اور آپ کی طرف سے بھی، ڈیہر افسوس ہے۔ لہذا یہ منصوبہ طور پر جو عزت آپ نے Jacinto Benavente کو بخشی ہے، وہی ہسپانیہ کو بھی بخشی ہے اور ان ملکوں کو بھی جن میں ہماری زبان بولی جاتی ہے۔ میں یہ دیکھ کر بہت مسرور ہوں کہ ان تمام ملکوں کے عزت مآب سفیر حضرات اس اجتماع میں موجود ہیں

مجھے امید ہے کہ یہ انعام ہمارے برصغیر ان رشتوں کو اور مضبوط کرے گا جو ہم کو متحد رکھنے میں

معاونت کرتے ہیں اور ہمارے سکول کے درمیان باہمی افہام و تفہیم کا اور نیوحتی میں گرم جوش کا باعث ہیں۔
 آخر میں، اپنے بے پایاں قومی جذبات و محبتوں کے اظہار کے سہی جو آپ کے خوب
 صورت ملک کے لیے سرے میں ہمیشہ سے سوجزن رہے ہیں، میں آپ حضرات سے رخصت کی
 اجازت چاہوں گا۔



انا تول فرانس

امتراف کمال۔ اس کی مدینہ فکر دن کا میاں یوں کے امتراف کے سے جواہی اخلاق اسلوب تحریر سے مزین، انسانییت سے گہری ہمدردی سے معمور، ماسہ ہیں ارفا افس کے قدیم داستان کے مزین کی مچی تصویر کش کرتی ہیں۔

ایک ناول نگار کی حیثیت سے اپنی دنیا میں انا تول فرانس کا داخلہ اس کے ناموں The Crime of Sylvestre Bonnard کے ذریعے ہو۔ اپنی دوری کتب کی طرح اس میں بھی انا تول نے انفرادی صدی کو اپنے ملک کے زریں دور کے مترادف قرار دیا۔ اس ناول کا مرکزی کردار Sylvestre Bonnard اس کے فسانوی کرداروں کے جلسے کی پہلی کڑی تھا جس کے ذریعے مصنف نے دنیا میں اپنی شخصیت کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس ناول کو اس کی شائستہ نظر اور گہرے نظر کے باعث بے حد پسند کیا گیا اور فریج اکیڈمی نے مصنف کا انعام سے نوازا۔

انا تول فرانس، جس کا اصل نام شارک انا تول فرانسو تھیبال تھا، 1844 میں پیرس میں پیدا ہوا۔ انا تول فرانس کا باپ ایک کتب فروش تھا اور اس نے اپنی دکان کا نام Libranie de France رکھا تھا جس سے اس کے بیٹے نے اپنا قلمی نام لیا تھا۔ بہت کم عمری ہی سے ناول کو کتابوں اور کتب بینی کا شوق تھا۔ اس کی ابتدائی تعلیم College Stanislaus میں ہوئی جہاں اس کا شمار اوسط درجے کے طالب علموں میں ہوتا

تھا۔ سب سے ماقول نے کلیسائیت کے مخالف رویہ اختیار کیا جس پر وہ سری عمر کار بند رہا اور اپنی کتابوں میں مستحکم کلیسا اور مذہبی عقائد کا مذاق اٹاتا رہا۔ ماقول فرانس کی عمر کا ابتدائی زمانہ، جس کا بیٹن اس کی کتاب (1885) My Friends Book میں ہوا تھا، خاصا خوش حالی کا تھا۔ کئی دہریہ لیبیا Baccalaureate (گریجیشن) میں مایکم ہونے کے بعد ماقول نے "عمر کار بیٹن" میں کی عمر میں کامیابی حاصل کر لی۔ اسکول سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دنوں تک اس نے معیون کے طور پر اپنے باپ کے کتب خانے میں اس کی مدد کی ماس نے کچھ عرصے تک ایک شاعری ادارے میں Gabaglio کے طور پر بھی کام کیا اور کچھ دنوں بچوں کو پڑھانے کا کام بھی کیا۔

ماقول فرانس کے باپ نے جب اپنے کاروبار سے فراغت لی تو ماقول نے مسیہ دار معیون مدیہ کی حیثیت سے کئی اخباروں میں کام کیا۔ وہ شاعروں کے ایک حلقے میں شامل ہو گیا جہاں اس کی ملاقات فرانس کے بڑے بڑے شعرا سے ہوئی جس کی وجہ سے اس کا ادبی قدم خاصا بڑا ہو گیا۔ فرانس اور پودشیا کی جنگ کے دوران کچھ دنوں کے لیے ماقول فونٹ میں پھرتی ہو گیا تھا اور اس نے 1871 میں جیل میں سمنے وہاں شیخ ریڈی اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

ماقول فرانس نے 1877 میں ماری ساول (Valene Sauvile) سے شادی کر لی تھی مگر یہ نیا دن نہ چل سکی اس لیے کچھ ہی دنوں بعد ماقول ایک اور عورت مادم آفمن کیا۔ وہ Aman da Callaver سے جنسی طور پر منسلک ہو گیا تھا جو فوجی مصوری کے حقوق میں اپنی بی بی خانہ سرپرستی کے لیے مشہور تھی۔ اس عرصے میں ماقول نے حسن اور بانٹس کے بارے میں بھیسائیت کی بھی پی سے متاثر ہو کر Thas (1890) تخلیق کی اور مساف فلوئیر کے زیر اثر Les Lys Rouge (1894) لکھی جس میں اس نے محبت کے رشتوں اور ان کے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ یہ دونوں ماویں وہی حقوق میں بہت کامیاب ہوئے۔

1897 اور 1901 کے درمیان ماقول نے عصری تاسخ کے زیر عنوان چار ماویں لکھے۔ پہلا ماویں فرانس کی ایک اہم شخصیت موسیو بیگرے (Monsieur Bergeret) کے بارے میں تھا۔ دوسرا ماویں The Queen Pedauque (1893) تھا جس میں ماقول نے Jerome Coignard کا اس طرح تعارف کیا کہ اس کی شخصیت ماقول کے اخلاقی رجحانات اور مردانیت کی وکالت کرتی نظر آتی تھی۔ انیسویں صدی کی مغربی دہائی میں ماقول نے اصلاح موثرہ کی وکالت کی اور عصر کا عصر کے معاشرے اور کلیس کی خامیوں پر حملے کیے۔ 1890 میں ماقول اپنے ملک فرانس کے ہم اخبار Le Temps میں وہی ممبر کے طور پر مقرر کیا گیا۔

ماقول فرانس کی زندگی کے مغربی ویں برسوں پر اس کی ذاتی مشکلات کے سائے پڑتے رہے جو اس کی اپنی حرکات کے پیمانہ کردہ تھے۔ ماقول کی بیٹی کا 1917 میں انتقال ہو گیا، اس کی داشت مادم آفمن، جس کو اس نے دوسری عورتوں سے اپنے تعلقات کے بارے میں دھوکے میں رکھا تھا، شدید بیمار ہوئی اور

1910 میں انتقال کر گئی۔ اس نے اپنے گھر کی دیکھ بھال کرنے والی ملازمہ جس سے اس کے ناچائز تعلقات ہو گئے تھے، بے وقافی کی گھر بند میں اس سے شادی کر لی۔ ایک امریکی عورت نے خودکشی کرنے جس سے مائٹل نے محبت کی گھر بند میں اس کو چھوڑ دیا تھا۔

مائٹل فرانس کے ہٹری دور کے کاموں میں اس کا استعمانی ماول (Penguin Island, 1908) اہم ہے جس میں اس نے بڑی پندرہ نامعلوم ہیروئن کو انسان کے روپ میں ڈھال کر اپنے ملک فرانس اور انسانیت کے ارتقائی عمل کی تم زوریوں پر نظر کیا۔ فرانس کی مشہور مجاہدہ جون آف آرک کی سورج حیات (The Life of Joan of Arc, 1908) کی تخلیق پر کیتھولک عیسائی فرقے نے شدید تنقید کی، اس لیے سران کے خیال میں مائٹل نے اس مجاہدہ کا ایک انسان کے حقیقی روپ میں پیش کر کے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا جب کہ اس پر تاریخی طور پر کج بیانی کا بھی التزام کیا گیا۔

مائٹل فرانس نے اپنی اپنی زندگی کے دوران سینتیس کتابیں تخلیق کیں۔ اس نے 1924 میں فرانس کے شہر Tours میں انتقال کیا جہاں وہ اپنی زندگی کے ہٹری دور میں ایک مقیم رہا تھا۔ اس کے جنازے میں فرانس کی حکومت کے عہدیدار بھی شریک ہوئے۔ مائٹل فرانس کی موت سے خالی ہونے والی ادبی مسند پر شاعر پل ویری نے ممکن ہوتے ہی ایک بہت غیر متعلقہ غصہ دیا جس میں مائٹل فرانس کو توصیف کے بجائے اس پر دیکھ جسے کیے گئے تھے۔

ضیافت سے خطاب

میں نے اپنی زندگی کی حتمی ہفتی شام میں آپ کے حسین ملک کی مہمان لونی کے امکان کو بہت عزیز رکھا ہے، اس ملک کی جس نے بے شمار بہادر مرد اور بہت حسین عورتیں پیدا کی ہیں۔ اپنے حکیم جذبہ تھکر کے ساتھ میں اس اللہ م کو قوں کرنا ہوں جو میرے اپنی مشغلی کی تاج پوشی کے مترادف ہے۔ میں اس کو ایک بے نظیر اعزاز چاہتا ہوں کی یہ اس شخص کا پارٹی کیا ہو احام ہے جو قابل قدر جذبات کا حامل تھا اور اس لیے بھی کہ مجھ کو یہ انہماک منہ منہ سے کیا ہے جو نہ صرف کچھ معنوں میں منفرد ہیں بلکہ ان کی اور فائز بھی ہیں۔ فریڈ اکاڈمی کے ایک رکن کی حیثیت میں میونڈش اکاڈمی نے کئی بار مجھے اسی قسم کے انتخاب میں رجمانی کے لیے دعوت دی تھی۔ یہ میرے ملک کے انتخاب کے موقع پر تھا، جو ایک نہایت روشن طرز الفجر اور بدنی سازدین کو باکمال طریقے سے ایک دوسرے میں پیوست کرنے کی عدا حیت رکھتا ہے۔ دلائل

کے انتخاب کے موقع پر بھی میں شریک تھا، جس کے انتخاب کے ذریعے آپ نے ہندوستان کے ایک
پیسے عاشق کے کام کو سرایا ہے جو ایک اچھا انسان رہنے کے لیے اپنی غیر قیمت سے جکڑتا رہا۔

میں شاید اپنی محدود و محدود سے تجاوز کر رہا ہوں گا مگر میں بہ Norwegian Storing کے
امن انو امن بات کرنے لگ جاؤں۔ اور اگر میں بائیس کس بھی تو یہ اس انتخاب کی تحریف ہوگی جو کہ
Storing نے کیا ہے۔ مجھے شاید یہ کہنے کی اجازت دی جائے گی کہ میرے نکتہ نظر کے مطابق آپ نے
Branang کے وجود میں ایک نئے عظیم ہزار کو منتخب کیا ہے جو انصاف کے بارے میں بے حد جوشیلہ واقع ہو
سے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اب ہمیشہ اسی قسم کے لوگ مواد و قسموں کے فیصلے کیا کریں گے؟ کیا یہ
عجیب بات نہیں کہ سب سے خوف ناک جنگوں کے بعد جو امن کے معہرے ہوئے وہ دراصل امن کے
لیے نہیں بلکہ جنگوں کو جلائی رکھنے کے لیے تھے؟ مگر یورپ کی کونسل کے وزیر ارکان میں معمولی سی بھی سرچھو
ہو چھٹیں آجانی تو یقیناً جدید، یورپ تجاوز کر رہا ہو جائے گا۔

اگر کوئی، تمام مناسب وجوہات کے باوجود، اتھو دیو یورپ کے سرے کے مکان کے درمیان سم آتی
کی فتح کی سیدھیں ہمارے پاس تو کم از کم مجھے معذور خواہشیں و حضرات، یقیناً ہے کہ آپ جیسے بہادر، انصاف
پسند اور قادر لوگوں کے زیر اثر ایک نہ ایک دن کھائی کا یوں ہوا ہوگا۔



ٹٹ پیدیریں ہاسوں

اعتداف کمال۔ اس کے تقسیم الشان کا نام Growth of the Soil کے لیے۔

ٹٹ ہاسوں کی تحریر Growth of the Soil محنت کے اعزاز میں لکھی جانے والی اسل بند آجنگ داستان ہے جس کی ہر سطر عظیم الشان ہے، جس کا ہر خط مزدور کے ماتھے سے گرنے والے پسینے کے قطرہوں کا قصیدہ ہے۔ یہاں محنت کی اس قسم کا کوئی سوال نہیں جو مزدور کو مختلف دھڑوں میں تقسیم کر دے۔ اس میں محنت اپنی خام ترین صورت میں نظر آتی ہے جو محنت کو کم کرتی ہے اور بکھرے ہوئے جذبات کو یک جا کرتی ہے، محنت کش کی حقارت کرتی ہے اور اس سے پیدا ہونے والے ثمرات کو نہ صرف محفوظ کرتی ہے بلکہ موسم بہ موسم ان کی آمد کو یقینی بناتی ہے۔ جب تک پیش قدمیاں چل کر زمین چھاڑیوں سے نھری زمین کو صاف کرتا ہے اور اس میں چاؤ ل کر فصل اگاتا ہے تو نہ صرف کسی ایک ملک کے لیے قریبی مینے والا اپنی کسان نہیں رہتا بلکہ دوسری دنیا کے محنت کشوں کا ہیرو ہو جاتا ہے جس طرح آسٹریا اور مزدوروں کے شاعر Hesiod نے کھپانوں کے مزدور کی محنت کا تذکرہ کیا ہے اسی طرح ہاسوں نے اپنے فن کے منظر ماسے میں مثالی مزدور کا خاکہ پیش کیا ہے جو زمین کی بارگوری کی راہ میں آنے والی دیو کی اور قدرتی صعوبتوں سے نبرد آزما فی میں نہ صرف یہ کہ اپنی ساری زندگی بسر کر دیتا ہے بلکہ اپنی محنت سے حاصل ہونے والی کامیابی پر سرور بھی ہوتا ہے۔

ہامسون اپنی تخلیق کے لحاظ سے اس کی مخصوص قسم کے کرداروں کو پیش نہیں کرتا۔ اس کے ہمارے کردار عام حالات میں زندہ اور مرنے لیتے محسوس ہوتے ہیں، جن میں سے کچھ اہم ہیں، کچھ بہترین اور کچھ اپنے مقصد کی برآوری کے لیے اعلیٰ آرٹس نہیں رکھتے بس خاموشی سے اپنی ڈن میں کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر سب میں ایک قدر مشترک ہے وہ ان کا (مارٹنیکس) علاقائی ہنر ہے جو زمین کے ثمرات کے لیے ایک ہی چاہیہ دوا ہے۔ مارٹنیکس میں شرمسہ مرد برف اور کھل ہی نہیں جو نرم و شیریں، سرسبز گلے باغات کے گلے والے خوش رنگ و رطوبت پر پھولوں کی دین ہوتے ہیں۔ یہاں شرمسہ مرد ہر وہ کھو ہے جو غرت، پتھر پٹی اور روتا فساد زمین کو توڑ کر بند ہوتا ہے اور کسوں کو ایک گنبد مرث سے محفوظ کرتا ہے۔

یہ سب کچھ ہامسون کے عظیم شان اولی Growth of Soil کی دین ہے جس پر اس کو بین الاقوامی شہرت ملی اور انومات بھی شرمسہ برف میں کایا کا مارٹنیکس۔ ہامسون نے اس ماول سے پہلے ایک نفاذ کش ادیب کے بارے میں عدت احساس سے نچر پور پہلی اپنے ادیب Sult (Hunger) پیش کی تھی جس نے 1890 میں شاعت کے بعد سے ہر طرف کے قاریوں کو اپنی چاہ متوجہ کیا ہے۔ ہامسون نے اس ادیب میں ایک نفاذ کش شرمسہ کش ادیب کی ایسی ناقابل حیات پیش کی ہے جس کو پادہ سرکاری مہبت ہو جاتا ہے۔ اس ماول ہی نے ہامسون کو ادیب میں ہمارے خود شور سے متعارف کرنا اور اس کا ناز اثر قارئین انگلینڈ سے نوا کے تمام مکوں تک وسیع ہو گیا۔

ماول Sult کی بڑی کامیابی نے ہامسون کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا کہ اس نے اپنے خطبوں میں ادیب کی دنیا میں فطرتوں شریک ہون اور یوں اسٹوئے جیسے ادیبوں پر تنقید کی۔ اس نے اپنی تخلیق Myserer (1892) میں جمہوریت کو توہین آمیز رنگ میں پیش کیا اور نطفے کے فوق بشر نظریے کی تعریف کی۔ ہامسون نے 1894 میں ایک ماول Pan لکھا جو ایک شکاری کے بڑا ناچنے کی طرح تھا جس کی کہانی شری زندگی سے غریب ذات تھی۔ یہ ماول اس نے اس وقت لکھا تھا جب ہامسون ورس میں مقیم تھا۔

ہامسون نے 1898 میں اپنا ادیب Victoria تخلیق کیا۔ ہامسون کا پس بھی ایک ماول تھا جو ملکی پھنکی داستان محبت پر مبنی تھا جو اس وقت لکھا گیا جب ہامسون نے شادی کر لی تھی۔ اس نے اسی ماول کے نام پر اپنی بیٹی کو کووریہ کا نام دیا۔ 1900 میں ہامسون کی سینڈ چنڈا جہاں اس نے ایک غلوٹل ڈیر، کھنکھنیں لینڈ کے قیام کے دوران اس کی ملاقات بہت سے مقامی شرمسہ رادیوں سے ہوئی۔ اسی لینڈ سے لکھی کہ ہامسون نے وہیں اور شرقی لایڈ کے مکوں کو سیاحی کی اور ہا آخر ڈنمارک کے ونگوٹ کوہن پتھن میں مستقل قیام کیا۔

ہامسون نے انجیو ہن کی شرمسہ اپنا پہلا ماول Den Gadefælde (1877) تصنیف کیا تھا اور یہ ادیب Knut Pedersen Hamsund کے نام سے شائع ہوا تھا۔ 1884 میں ہامسون کی ملاقات مارک ٹوین ہوئی اور اس ملاقات کے بارے میں جو مضمون ہامسون نے لکھا اس کی چھپائی میں غلطی سے اس کے نام کا

آخری حصہ Hamsun چھپ گیا۔ اس کے بعد سے ہاسون نے اپنے اکیلا نام کو اپنا لیا۔

نٹ ہاسون 1859 میں مرکزی مارے کی وادیوں کے ایک چھوٹے سے شہر لوم Lom میں پیدا ہوا۔ وہ چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس کا باپ ایک ورزی تھا۔ جب ہاسون صرف تین برس کا تھا اس کا خاندان ہجرت کر کے ہارڈے (Hamarøy) چھڑ گیا جو آرکٹک سرک (Arctic Circle) سے صرف سو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ وہاں پہنچ کر ہاسون کے باپ نے اپنے بڑا اور بھتی اوسن Olsen کی راضی پر کاشت شروع کی۔ ہاسون ایک کتب خانہ چھڑاتا تھا جس کی کتابوں سے ہاسون نے استفادہ شروع کیا۔ ایک شش اسکوئی کی کچھ بھی رہا ضروری کے علاوہ ہاسون کی تعلیم کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ اس دوران وہ گاؤں کی چھائی سے اکثر ہاسون جاگ نکلا کرتا تھا۔ وہ اپنا لوم چھڑ گیا جہاں اس نے ایک دکان پر نوکری کر لی۔ کچھ دنوں بعد وہ ہارڈے چھڑ گیا اور وہاں مختلف قسم کے کام کیے۔

جنگ عظیم دوم سے قبل اور اس کے بعد بھی ہاسون نے کھلے بھڑے جرمنی کے ماسیوں کی طرف تامل کی جس کی بنا پر جنگ کے بعد ہاسون کو ایک شدت کی طرح الگ تھک دیا گیا تھا۔ ہاسون نے مارے کی ماسی پارٹی کی رکنیت بھی نہیں حاصل کی پھر بھی وہ فاشٹ ٹھکروں کی حمایت میں مضامین لکھتا تھا۔ جب 1943 میں اس کی مدت پھر اور جوزف گوٹل سے ہوئی تو اس نے اس احترام کو بھلا کر اپنا نوٹل تمغہ پیش کر دیا۔ اس مدت کے خاتمے سے کچھ قصبے عام ہوئے جن میں چھ یودیوں کے لئے عمر سے امان مانگنے کی ضرورت تھی۔ ہاسون کے سوانح نگار کے مطابق یہ خبر سچ نہیں تھی مگر اس نے اس بات کا ضرور اعتراف کیا کہ ہاسون نے جگر سے جرمن فوجیوں کی اپنے ملک میں لیا دنیوں کی شکایت کی اور اس کو مارا نہیں کر دیا تھا۔

جنگ کے ختم ہوتے ہی ہاسون کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور وہ کچھ عرصے کے لیے نگر بند رہا۔ اس کی بیوی پر مقدمہ چلا اور تین سال قید و مشقت کی سزا ہوئی۔ ہاسون پر بھی مقدمہ چڑھا اور اس کے نظریات کی وجہ سے اس کو جیل خانے کی سزا ہوئی۔ اپنے وکیلوں کے مشورے کے باوجود ہاسون نے اپنے شعلہ دہش کا عذر پیش کر کے سزا کا انصرام کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے نظریات کے بارے میں شرمندگی کا اقرار کیا نہ کیا۔ جگر کے اتفاق کی خبر سن کر ہاسون نے کہا کہ جگر ایک بہادر قیدی تھا جس نے انسانیت کے لئے جھگڑائی کی اور یہ کہ جگر دنیوں کی تمام قوموں کے لئے انصاف کا پیغام بھجوا رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان دنوں ہاسون کی کتابوں کی مانگ کم ہو گئی تھی مگر بعد میں اس کی شہرت دوبارہ قائم ہوئی اور اس کی تصانیف میں لوگوں کی دلچسپیاں بڑھ گئیں۔

ہاسون نے ڈے برس کی عمر میں اپنی آخری کتاب Overgrown Paths لکھی جس سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت تک وہ ذہنی طور پر چاق چوبعد تھا۔ ہاسون نے ماہولوں کے علاوہ سفر نامے، مختصر کہانیاں اور ڈرامے بھی لکھے تھے۔ اس کی تصنیفات انالس کے ٹکڑے جگ تھیں جو اس کی زندگی کے دورات کی شائع ہوئیں۔ ہاسون نے 1952 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

میں اس وقت ایک کیفیت استعجاب میں ہوں اور یہ سوچ رہا ہوں کہ اس مطلوب محلی فیضی کے موقع پر کیا کروں؟ میں محسوس کر رہا ہوں گویا میرے پاؤں زمین پر استوار نہیں رہے ہیں بلکہ ہوا پر چل رہے ہوں اور میرا سر چمک رہا ہے۔ میرے لیے اس وقت اپنے آپ میں رہنا تو واقعی آسان نہیں۔ مجھ پر آج کے دن کتنے عزازت اور کتنے زور مال فحشاء کر دیے گئے ہیں۔ میں جو کچھ بھی ہوں خود کو خوب جانتا ہوں۔ نکل اس خرچ کی بدولت جو میرے دشمنوں کو کیا گیا ہے اور اس کے قومی ترانے کے نقد پارکوں کو سن کر جو چند ایسے نکل ہی پڑاں میں گونج رہے تھے، میرے دل میں اتنے سے زمین نکل ہی گئی ہے۔

اور اتنا ق سے کیا بھی نہیں کہ میں نے زمین کو بھی ہمارے عیروں تلے سے نکلتا محسوس کیا ہو۔ اپنے فیضی باب ایام شباب میں بھی ایسے موقع آئے تھے، اور ایسے موقع بعد کس کی مدد میں نہیں آتے؟ نہیں! ان لوگوں کا دست پندوں کے لیے ایسا جس کی تعجب خیز ہوتا ہے جو پیدا ہی ہوئے ہوتے ہیں، جس کو علمی نہیں ہوتا کہ کسی دھارے میں اچانک بہہ جانا کیسا ہوتا ہے۔ کسی جوان مرد اور عورت پر اس سے زیادہ اور وقت نہیں آ سکتا کہ وہ وقت سے بہت پیسے خانا، لانا، اور کیفیت انکار کی خدوئیں میں جا بھیس۔ خدا شہد ہے کہ آئندہ زندگی میں بھی ایسے بہت سے موقع آتے ہیں جب انسان حالات کے سیلاب میں بہہ جا کر کتا ہے۔ تو چر گیا؟ ہم پھر بھی وہی سچے ہیں جو چوتھیں، یہ سب کچھ ہمارے لیے بہتری ہی ہوتا ہے۔

بہر حال میرے لیے یہ بالکل مناسب نہیں کہ اتنے سمجھو در و ممتاز لوگوں کے، ڈیباہ کے سامنے میں اپنی خانہ ساز کمست میں غوطے کھانے لگوں، بالخصوص اس لیے بھی کہ میرے بعد اس شخص کے نمائندے تو بھی کچھ کہنا ہے۔ میں ایک درپے بیٹھ جاؤں گا شریچ تو کی ہے کہ یہ میری زندگی کا بہت بڑا دن ہے۔ آپ کی فیضی رسائی سے مجھے کوئی باروں ٹوٹوں میں سے ٹک کر ہوا گیا ہے، میں طاقن ہو گیا ہوں، گویا میرے سر پر شخصیت کا ایک تاج رکھ دیا گیا ہے۔ اپنے ملک کی جانب سے میں سویڈن کا کونسل کا شکر یہ ادا کرتا ہوں اور سارے سویڈن کا بھی، اس عزاز کے لیے جو اس کے طفیل مجھے بوجھا دیا گیا ہے۔ ذرا غلو پر میں جتنے بڑے اقدار کے بوجھ کو سامنے کے لیے ہتا سر ٹھکنا ہوں مگر مجھے اس بات پر فخر ہے کہ آپ کی کاؤل نے میرے کاموں کو جتنے بڑے بوجھ بوجھانے کے قابل سمجھا۔

”میں کی شام، ٹیوی ڈیوٹس ایک مسٹر ستر نے فرمایا تھا کہ میرا اپنا ایک انداز تحریر ہے، مگر میں مثلاً (تاکید، دھوکا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بہر حال ہر کسی شخص سے کچھ نہ کچھ میکھا ہے اور بعد یہاں کون سا انسان

ہو گا جو یہ کہہ سکے کہ اس نے بھی کسی سے تجھ نہیں سیکھا۔ مجھے سوینڈن سے بچنے کے لیے بہت کچھ فرہم تھا۔
 ہاتھوں اس کی کچھ نسل کے نفوس سے۔ اگر مجھے دب کا اور اسی کے بڑے ماسوں کا نیا دھم ہوتا تو
 میں بے حد وحساب گمانے لگتا۔ میں اس قرین کا ہزاراں کرتا ہوں جو میری اسی اہمیت کے عوض مجھ کو دیا
 گیا ہے جسے بدگمانی قبضہ نہیں میری تحریروں میں دیکھا گیا ہے۔ بہر حال، مجھ جیسے خفیہ شخص کی بغیر کسی کھوج
 کی دیکھے گرائی کرلی؟ ز میں سوئے چند ماسوں کے "رکھ" ملے گا۔ ان سب کے لیے ب نہ مل جو ان
 ہوں، نہ ہی مجھ میں اتنی طاقت رہا کرتی ہے۔

نہیں! بچ بچ اس وقت مجھے درختوں روئیں میں ٹہرے ہوئے اس ایوان اور معجز اجتماع کی
 موجودگی میں آپ سب پر تنقید کی بارش کرنی چاہیے، پھول نہ مانے اور شعر ستانے چاہئیں، ایک بار پھر
 جوان ہونے کے لیے اور سختی مونی لہریں ہ سوار کی کرے کے لیے۔ اس عظیم موقع پر جو شاید میری زندگی
 کا آخری ہوگا، میں یہی کہتا ہوں چاہتا ہوں، مگر میں یہ سب نہ کر سکے گا۔ آج مجھ پر
 امر روبرو مال فراوانی سے بھرا ہوا ہے جسے میں ایک جتنی کی رہ گیا ہے، جو سب سے اہم ہے،
 تحفہ شباب اہم سب کچھ اتنے بڑھے بھی نہیں کہ ہمیں اپنے تمام شباب بڑھ سوں۔ اگر ہم لوگ جو
 بڑھاپے کے دور میں داخل ہو چکے ہیں، صرف چند قدم پیچھے کی طرف جائیں اور وہ بھی بڑھاپے کے
 ساتھ تو یہ نامناسب نہ ہوگا۔

مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، مجھے خبر نہیں کیا کرنا چاہیے، مگر میں سوینڈن کے شباب کے
 لیے، ہر چہرے کے جان لوگوں کے لیے، زندگی کی جوانیوں کے لیے ایک جام تجویز کرتا ہوں۔

کارل اشپنڈر

اعترافِ کمال۔ خصوصی طور پر اس کی تقسیم اشان نظم Olympian Spring کی توصیف میں۔

سویس نژاد شاعر اور ادیب کارل اشپنڈر نے اپنی باکمال نظم کی تصنیف کے لیے نئی بھور و روزانہ وضع کیے۔ اس تقسیم اشان نظم میں شاعر نے شعور و روحانیت کو نئے دیمانوں کے ظہور سے تعبیر کیا ہے۔ اپنی کئی تخلیقات میں اشپنڈر نے مصحفیت اور دنیا کے درمیان موجود عبادت سے نیچے آزمائی کی ہے۔

اشپنڈر اس نظم کو 1906 میں کمال پر چکا تھا مگر اس کو پتہ نہ تھا کہ 1909 میں ہی جب اس کا نظم ہائی شول مسودہ منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بعد سے سال بہ سال اس نظم کے عہد شیدائیوں میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ جب اس کو نیشنل انعام کے اعزاز سے نوازا گیا تو اس کی شہرت بڑوں میں ہو رہی تھی۔ اس نظم کی، جو پھر سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہو، اتنی تعداد میں مانگ اس لیے اور بھی حیرت انگیز ہے کہ کما حقہ حاکمِ حاصل کرنے کے لیے چورنگی نظم کو پڑھنا لازم ہے جس کے لیے قاف کے پاس فائنل وقت بھی ہونا چاہیے اور اس کی قیچہ کا کمال اسکا زبانی ضروری ہے۔ سوچنے و بات ہے کہ کہتے دے کہ جس کو میسوں نے اس کو سوچے، لکھنے اور سنوارنے میں صرف ہوسے ہوں گے، اپنی زندگی کو گہما گہما، عصر کی ضرورتوں اور کتنی ہی شخصیات کا جوتوں کو اس تصنیف پر قربان کرنا پڑا ہوگا۔

کارل اشپنڈر 1945 میں مغربی سوئٹزرلینڈ کے شہر بال (Basle) کے قریب ایک چھوٹے سے قصبے

نیمول میں پیدا ہوا۔ اس کے خاندان نے اپنے قصبے سے اس وقت بڑے شہر برن کے لیے ہجرت کی جب کارل کے باپ کو وفاقی حکومت میں خازن کا عہدہ تفویض ہوا مگر کارل اپنی ایک عزیزہ کے ساتھ ہالہ میں مقیم رہا۔ کارل اچھتر نے سترہ برس کی عمر سے ہی تعلیم لکھنی شروع کر دی تھیں۔ ہالہ میں قیوم کے دوران ہی کارل نے مورخ جینب برگ ہارڈ (Jakob Burckhard) کی علم سیاسیات کے ماہر ویلمر و سیرماگیل Wilhelm Wackernagel کے زیر اثر انگریزی زبان کی کتاب *Die Sprache* میں دل چسپی ہو گئی تھی۔ کارل نے 1883 زیورخ یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم کے لیے داخلہ لے لیا۔ اس نے کچھ عرصے کے لیے زیورخ ہائیڈل برگ اور ہالہ میں ادبیات کی تعلیم بھی حاصل کی۔

ہالہ کی حیثیت سے نکل جانے والی ایک ملازمت سے انکار کے بعد اچھتر نے "نچر برس" میں اپنی اینڈ کے خاندانوں کے بچوں کو پڑھایا جو روس کے شہر ہیٹل پٹر برگ میں مقیم تھے۔ اس نے فن لینڈ کے کئی نئی سفر بھی کیے۔ اچھتر کی پہلی طویل نظم (1881) Prometheus und Epimetheus شائع ہوئی۔ اس نظم کا خیال اس کو اس وقت آیا تھا جب وہ جرمنی کے شہر ہائیڈل برگ میں تعلیم کے سلسلے میں مقیم تھا۔ اس نظم میں شاعر نے دو شخصیتوں کے پیر میں مذہبی کشمکش اور تصوراتی آدرشوں کا تقابلی پیش کیا۔ Prometheus ایک شخص ہے جو انفرادیت پسندی کا نمائندہ ہے اور King Epimetheus سے ٹکر مچاتا ہے جو دیوتا اور سموروں کا بحوالہ ہے۔ یہ کتاب Carl Felix کے فرضی نام سے شائع ہوئی تھی اور اس کو منوہ پنے برائی نہیں ہوئی معلئے اس کے کہ اس کے کرداروں کی بنا پر شاعر پر غصے کی تصنیف Also Sprach Zarathustra سے خیالات چمانے کا قلم عائد کیا گیا تھا۔ اچھتر نے اپنے خلاف الزامات کا تجربہ چورنگ (1908) Meine Beziehungen zu Nietzsche لکھ کر کیا۔ چھتر کی شخصیتوں Prometheus اور Epimetheus کے درمیان نظریات کی تفریق کے شوشے کو کامیاب ٹوٹنے نے بھی اعلیٰ درجہ کی کتاب Psychological Types میں مذہب میں درمیان میں شخصیتوں میں تمیاز پیش کیا اور اپنی تصنیف کا ایک نسخہ اچھتر کو بھیج دیا۔ اچھتر نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا مگر بعد میں یہ کہہ کر روگرداں کہ اس میں کچھ بھی نہیں دھرا ہے۔

اچھتر نے نیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ستاد اور صحافی کے طور پر کام بھی کیا اور شاعری بھی شائع کی جس میں (1883) Extramundana اور (1889) Schmezerlinge شامل تھیں۔ 1883 میں اچھتر نے اپنی ایک شاعرہ میری ہوف Mane op der Hof سے شادی کر لی۔ جب اس کی بیوی کے نبابت مال و روادین کا انتقال ہو اور 1892 میں کثیر بدست دہشتے میں حاصل ہوئی تو اچھتر کا خاندان سوئٹزرلینڈ کے ایک بڑے شہر لوسرن (Lucerne) منتقل ہو گیا اور اچھتر دل تھی سے شاعری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اچھتر کی شایکا نظم Olymischer Frühling (Olympic Spring) جس پر اس کو نوبل انعام

وید گیا 1900 اور 1905 کے دوران کئی قسطوں میں منظر عام پر آئی تھی۔ شاعر نے 1910 میں اس پر پھر پورا نظر ثانی کی۔ یہ نظم جو دہائی کی قافوں کے مسدس میں لکھی گئی اسطوریت لفظی اور مذہب کے اتصال کا اچھا نمونہ ہے جس میں شاعر نے زندگی کے بارے میں عامی تشویش کا تجزیہ کیا ہے اور مقدار کے لیے دیوتاؤں کی آغوش میں اٹلایاں بڑی سنگ آمیزی اور بچپ انداز میں پیش کی ہے۔ اس شاعری کو بصری نے بہت سراہا اور اس کا مثنوی شاعری سے متعلق کیا گیا۔

1906 میں اچھلر کا ناول Iago شائع ہوا جس میں اس نے غیر منصاحت پسند تحقیقی دماغ اور اسطورہ کے چپے کی گوں مانگ پانہویں کے درمیان ڈویژن کو ایسے محکم انداز میں پیش کیا ہے کہ بعد میں اس ناول کے خطوط پر انسان کی نفسیاتی تخیلوں کو سلجھانے کی کوشش کی گئی۔

جب تقسیم اول کی ابتدا پر ہی اچھلر نے بڑے طویل انداز میں اپنے ملک کی صورت کو شورے کیے کہ سوئٹزرلینڈ کو لائش و لاش پر بھی جہنمی اور فرس میں سے کسی کی بھی طرف تاری نہیں کرتی چاہیے۔ جب اچھلر کو نوٹس نام دیئے جانے کا علان ہوا تو اس نے دلاں نے اچھلر کو سوئٹزرلینڈ کا ہومر کی اور اس کو جہنم کو نئے کے بعد سب سے بڑا شاعر گردانا۔ اچھلر کی آخری تصنیف Prometheus der Bader (1924) شائع ہوئی جو اسی موضوع پر اس کی پہلی تصنیف کی تھی اور دنیا کو غنائیہ شکل تھی۔

اچھلر کی متانیں کتابیں شائع ہوئیں۔ جب اس کو نوٹس انعام دینے کی تقریب منعقد ہوئی تو وہ بھارت کی وجہ سے سفر کرنے کے قابل نہ تھا اس لیے اس کا انعام اس کے ملک کے سفیر نے اس کی نیابت میں وصول کیا۔ اچھلر نے 1924 میں انتقال کیا۔

ہنرک پونتو پیدان

امریکی کمال: ڈنمارک کی روزمرہ کی زندگی کے مشاہدات کے لیے۔

ہنرک پونتو پیدان انیسویں کی اسی نسل سے تعلق رکھتا ہے جس نے 1870 کے بعد سے ڈینش زبان کے ادب کی جدید سکاؤٹائیز کو ہم آوازی کی جس کے ہم زمانہوں میں جارج برنہاردس ہیں۔ ڈنمارک اور جے پی جیکسنسین وغیرہ شامل تھے۔ ادب کی حیثیت میں اس کا علاقہ فنش راول تھا۔ فطرت انسانی کے مشاہد اور اپنے زمانے کی انحرافات کے سوز و غم کی حیثیت سے بے شک وہ شبیہ و ہم عصر ماویں نگاروں کے مشابہت میں جگہ پاتا ہے۔

ہنرک پونتو پیدان 1857 میں ڈنمارک کے جزیرہ جوت لینڈ کے شہر فریڈریکسبرگ (Fredensborg) میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ دینیات کے پڑھے عام Grundtvig کا بیروکار تھا۔ اس کا خاندان ماڈرل (Randers) کے علاقے میں منتقل ہو گیا تھا جس پر جنگ کے دوران پریشا اور آئندہ کی فوجوں نے قبضہ کر لیا اور لوٹ مار کی تھی۔ اس طور کی جانکی اور بربادی کے مناظر ہنرک کے ذہن پر نقش ہو گئے تھے جو بعد میں اس کی تخلیقات پر اثر انداز ہوئے۔ اپنے اہل خاندان سے احتجاج کے طور پر اس نے کلیسائیت کی روایات پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ کلیسائیت کی تعلیم کے بجائے ہنرک نے کچھ بینکین پولی تکنیک انشٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے یا عمر 1879 میں چلی ٹیچنگ کے تعلیم ہا تھمل چھوڑ دی اور ملک کے شاہی علاقے میں چارٹرڈ ویکی حد سے میں مشغول ہو گیا۔ اس دوران اس نے اپنی مختصر کہانیوں کا پہلا مجموعہ Clipped

Wings شائع کیا۔ ہنرک نے 1881 میں شادی کر لی اور تصنیف و تالیف کے ذریعے اپنی مزارات شریعت کردی۔ سات سال تک میوں کی شہرت سے ہر روز تھکی اور اعلیٰ کی تفریح کی اور آخر میں کوہنہ بین میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

اپنے ابتدائی ماحول میں ہنرک نے فطرت اور مذہب، ماحول اور انسانی اشکوں کے درمیان تعلق کا مشاہدہ کیا۔ اپنے دور کے ایک بڑے مصنف ہرمن بنگ (Herman Bang 1857-1912) کی طرح ہنرک نے بھی وہی مباحثیں ہند کی فطرت پرستی کے مطابق تو تھیں۔ ہنرک نے 1910 تک ہی کتابیں تصنیف کیں مگر اس کی شہرت اس کے بعد کے تین بڑے ماحول کے سسے De Fonaetede (1) Land (3 Vols 1891-95 The Promised Land) (2) Lykke-Per (8 Vols. 1898-1904) (3) De Dodes Rige (5 Vols 1912-16) کی تہ سے ہوئی۔ ان ماحول کے سرور آورد کرداروں نے اپنی زندگی کا معاشرے کو تبدیل کیا، مگر ماحول کے جبر نے ان کے ماحول کو فتح کر دیا اور ان کی آنکھیں کھول دیں۔ ہنرک نے اپنے زمانے کے تصورات اور عقائد کا تجزیہ کیا اور مدہنی نظر بن چکے تھے۔

1888 میں ہنرک کی بیوی اس کو چھوڑ کر اپنے والدین کے پاس چلی گئی اس لیے کہ وہ ایک گاہی کی بھرتی تھی اور ہنرک نے اس کے ساتھ ماسٹوئے جیسی خیریت دیا، آدم کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہنرک نے 1882 میں دوسری شادی کر لی جس سے دو بچے پیدا ہوئے۔ 1890 میں ہنرک نے اپنے ماحول Skyer (1890) میں معروف ڈنمارک کی حکومت کو اس کی مائی پرستانہ بنیادوں کے موافق کی مادی بھرتی لیکن طعن کی جو بچے ملک میں پس ماندگی کو بدنامت کر رہے ہیں۔

1898 اور 1904 کے درمیان ہنرک نے آٹھ جلدوں پر مشتمل ماحول Lykke-Per تصنیف کیا جو دراصل Per Sidenus کی انجینئر، سربراہ اور باقی دے اسپر کی اشکوں اور خواہشوں کی ہریت کی مہارتی داستان ہے جو بے غرض مدفن مقرر کرنا، رقی من و جن سے ان کی کامیابی کے لیے جدوجہد کرتا ہے مگر اپنی ذاتی کمزوریوں کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو پاتا۔

ہنرک کے بڑے ماحولوں میں آخری De Dodes Rige (The Kingdom of the Dead) تھا جس میں اس نے ڈنمارک میں میاں کی جدوجہد کا ایک دیکھ کن منظر ماحول پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد اس کی آخری تصنیف مانتہ راولی (1927) Man's Heaven تھا جس میں ایک بد عنوانی معاشرے والے ملک کے ایک بے رحم و سگ میں کردار کو پیش کیا جو جہد سے رقی فائدے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ہنرک نے سینتیس کے قریب کتابیں شائع کیں جن میں کئی ایک اس کو یادداشتیں بھی شامل ہیں۔ ہنرک پختہ پیدان نے 1943 میں انتقال کیا۔

کارل ایڈولف گیلپ

اصنافِ کمال: اس کی مختلف النوع اور زندگی سے لبریز شاعری کے لیے جو بلند و بالا حدیث سے عبارت ہے۔

اپنی دینیات کی تعلیم کے دوران کارل گیلپ رفٹ رنڈ دینیات کے بارے میں منغل رویہ اختیار کرتا اور اپنی شہر پسندی کے سرخیل چارل برینڈس (Georg Brandes) کے نظریات کی طرف مائل ہوتا چلا گیا۔ میدانِ ادب میں اس کا نظریہ اس کے پسے تخت رمانوں En Ideals سے ہو جواس نے Epigonus کے فرضی نام سے پیش کیا تھا۔ اس کے فوراً بعد اس نے سسے وار گہلیاں اور نظمیں شائع کیں جن میں خود کو دینیات کے سرچھڑے دشمن اور رمانوں کے نظریہ ارتقا کے پڑجوشی کے ہار پر پیش کیا۔

کارل جیلپ گیلپ 1857 میں جنوبی زیلینڈ (Zealand) کے علاقے روموئے (Rønne) میں ایک پادری کے گھر پیدا ہوا اس کے باپ کا جب انتقال ہوا تو کارل کی عمر صرف تین برس تھی۔ کارل کو ڈنمارک سے شہر کپنہاگن لایا گیا جہاں اس کی خالہ اور ایک اور شاعر پادری نے اس کو اس کی پوری پرورش کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اس کا داخلہ کپنہاگن یونیورسٹی میں ہو جہاں اس سے دینیات پرچی دور 1878 میں اس نے گریجویشن کیا۔ اس کو بھی پادری ہی ملنا تھا مگر چارلس ڈارون Charles Darwin، ہربرٹ اسپنسر اور چارل برینڈس کے زیر اثر اس کا دل دینیات کی ڈگری سے پہلے ہی دہرمت کی طرف مائل ہو گیا تھا۔

ہوئی ورٹی میں ہیرڈیس کے پیکر فرد کی آزاد کی اور ادب میں نصرت کی ترغیب دیتے تھے جن کی وجہ سے کارل میں یہ تبدیلیاں آئیں۔

اگرچہ امدن کی کتاب The Origin of Species مذہب کے خلاف بیانی، شراہی کے دلائل انجیل میں دپ ہوئے نظریہ تخلیق کی ہر نوئی میں کرتے تھے۔ شاہ میں وہ چھٹی کر کارل کے دلدہائی ماہوں کا مرکزی موضوع ہے، نیت کے عطا کردہ سے کارل کی بیانی ہی تھی۔ بعد میں اس نے بودھ مت اور دوسرے شرعی مذہب میں دل چسپی لی۔ کارل کے پہلے شائع شدہ ماہوں میں ایک نوجون دانش ور کو دھیا گیا ہے جو دھیات اور مذہب کی علانیہ خدمت کرتا ہے۔ اس کے دوسرے ماہوں (Germanes 1882) Laering کا مرکزی کردار کارل کی طرح خود لہر دین ہونے کے باوجود ویسے ہی بربان سے گزرتا ہے اور آخر کار آزاد خیال ہو جاتا ہے اور خود ساختہ عطا کردہ پر عمل کرنے لگتا ہے۔ کارل نے 1884 میں وکٹر کے کھیل Der Ring der Nibelungen سے متاثر ہو کر ایک منکوم : Brynhild نامی تھی جو تا مقبول ہو کر کارل کو ڈنمارک کی حکومت کی جانب سے رمن ہجر کے لیے پیش چار لی کر دی گئی۔

کارل نے 1883-84 میں ہرمینی، یوان اور اس کا سفر کیا اور 1885 سے 1887 تک ہرمینی کے شہر اےڈن میں سکونت اختیار کی۔ کارل کو سکے اور فرما رخ ہجر کے فلسفے انسانیت اور تصوریت کے نقطہ نظر سے متاثر تھا جس کے مطابق، جس کو ہم خارجی دیا کہتے ہیں، وہ دماغ کی پیداواری ہے اور مادی دنیا کا وجود مادی دماغ سے پیدا ہو نہیں سکتا۔ ان خیالات کی تحریک نے کارل کے دلدہائی جنم دیے : پہلا ماہ (1889) Marna تھا جو اس دور کے جنمی کے تاظر میں ایک دستی محبت اور دوسرا ماہ The Pagan Kamanra (1906) ہندوستان کے پس منظر میں آوگمن کے بارے میں تھا۔ کارل کے نزدیک دوستوں کی Dossoevsky اور ترکیب Turgenev، ہم مصنف تھے اور ان کے اثرات کارل کے ماہوں میں پائے جاتے ہیں۔

کارل نے اپنے استاد چارل ہیرڈیس کی ہم زاد ایوجینیا ہیرڈیس (Eugenia Heusinger) سے شادی کی اور دلدہائی میں مستقل سکونت اختیار کی اور اپنی تحریروں میں جنمیں ثبات کا استعمال بھی شروع کر دیا۔ کارل کی کئی تصنیفات جن میں بدھ مت اور آوگمن کے فلسفے کو بنیاد بنا دیا گیا تھا، تھاں لیتڈ کے سکول کے نصاب میں شامل کی گئیں۔

کارل کی تینتیس کتابیں شائع ہوئیں اور اس نے 1919 میں انتقال کیا۔

کارل گستف ورنرفان ہائیڈن اسٹام

اعترافِ کمال۔ ہمارے ادب کے نئے دور کے ایک سربراہ مودودہ لکھنے کی حیثیت سے اس کی
سمیت اور قدر شناسی کے لیے۔

سوئڈش زبان کے ن مستخدمین کا رہنے کے تجربہ میں جنہوں نے انیسویں صدی کے اواخر میں
سوئڈش شاعری کو نئی زندگی دی ہے کارل ہائیڈن اسٹام ہر سب سے درخشندہ ستارہ تھا۔ وہ پہلا ادیب
تھا جس نے سوئڈش شاعری میں نظریے کو بنیاد دی اور سوئڈش کی آنے والی نسلوں کے لیے نئے ادب
میں تصورات اور معیار مقرر کیے۔ نئی شاعری میں بھی اس نے تخلیق اور پیکر کے نمونے میں ایسی راہیں
نکالیں کہ اس کے آخری دور کے مجموعوں کے نام اب خاصے فنکار شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔ شاعر کے میدان میں بھی اس کی
تحلیقات کم اہم نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ عظیم جہات کی بنا پر وہ نیا دور پڑا۔

لہذا ہی اسے قومی سہاگ سے منے جانے والی تحریک کی بنا پر ہائیڈن اسٹام کی تحریک سوئڈش کی قومی زندگی
کی غیر آواز خصوصیات کی اس کے اصل روپ میں تشکیل کی گئی، شعور کے تھکے ہونے اور اس وقت کے اعتبار
سے ایسی اہلی اور غیر معمولی نسلوں کے ذریعے پیش رفت کی سیکھائی دینا کے ادب میں خیر نہیں تھی۔ یہ
بھی اس کے لیے ایک اعزاز کی بات تھی کہ کبھی کسی طبع چاہے عار او پی مبصر نے ہائیڈن اسٹام کی مادہ تحریر
قوت اور نئے ہونے کے بارے میں کوئی سوال اٹھایا ہو۔ سچ پوچھا جائے تو اس کی شاعری نے سوئڈش کے

ادب کو ایک جدید عہد سے متعارف کروانے کی ابتداء سے دشمن، واسیت، غمگیزی اور تدمیم لکھائی، انداز سے بھرے ادب کی بساط پیٹ کر رکھ دی۔

کارل ہائیڈن اھام Lake Vasa کے ساحل پر واقع ایک سٹی Oshammer میں واقع پہلے دور کی زمین غاری پر 1859 میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین طبقہ احرار سے تعلق رکھتے تھے۔ بچپن کے لائق پیدا کرنے ان کو اس قدر پکار دیا تھا کہ وہ اکثر بائبل کے پڑھے پڑھنے کو اپنے ہاتھ سے تو قے کرتا تھا کہ وہ تعلیم کی طرف اس کے لئے پورے کوشش بھی کرتا تھا۔ اسکول میں وہ سب سے نظر آتا تھا۔ اس کی تعلیم بس سرسری ہی تھی۔ وہ زبان کے قواعد میں فطرت سے تھا اور اپنا زیادہ وقت اپنی خواتین و شہزادوں اور ہم کتب خانوں کے ساتھ گزارتا تھا جس پر وہ آسمان سے رعب برکت کے۔ بچپن سے وہ مصور بننے کا خواہش مند تھا مگر بعد میں اس نے یہ ارادہ ترک کر لیا اور شاعری کی طرف راغب ہو گیا۔ سولہ برس کی عمر میں اس کے والدین نے ہائیڈن اھام کو اس کے عم زاو کے ساتھ مشرقی اٹلی، پیمان اور اعلیہ کے سفر پر بھیج دیا تھا۔ ایک دوسرے میں جب وہ بحیرہ Mediterranean Sea کے لئے روانہ ہوا تھا اس کے ساتھ ایک زبان دان کارلو لینڈ برگ تھا۔ اس سفر نے ہائیڈن اھام پر گہرے اثرات چھوڑے جس کی مدد سے اس نے سوئیڈن کے بے تحاش اور محروں اور ماحول میں سے رنگ گھولنے کی کوشش کی۔

ہائیڈن اھام کے باپ نے اس کے بے سمت طرز حیات کو سدھارنے کی بہت کوشش کی۔ اس کو مصوری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے Ecole des Beaux Arts چیریں بھیج دیا مگر وہیں بھی کوئی خاطر خواہ تہذیبی نہیں آئی۔ حیات میں بھی ہائیڈن اھام مصور بننے کے بجائے اسی طرح اپنے خاندان کے بارے میں بڑی بڑی باتیں کرتا اور مستقبل کے لیے عجیب عجیب منصوبے بناتا رہا۔ بیڑی سے وہ بھی پر ہائیڈن اھام نے وہ اپ کی مرضی کے خلاف ایک سوانح حیات Emma Ugola سے شادی کر لی۔ ہائیڈن اھام نے مصوری کے بجائے شاعری میں بنجیدگی سے دل چسپی لی اور اپنی ابتدائی نظمیں فن لینڈ کے شاعر Zachris Topaeus کو دیکھنے کے لیے بھیج دیں جس نے اس کی بہت افغانی کی اور شاعری جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ اس دوران اپنی بیوی کے ساتھ ہائیڈن اھام کا نیا دو وقت طالعہ دفرائس اور مارے میں گزارا۔ پھر وہ اس نے شمالی سوئیڈ لینڈ میں بھی گزارے جہاں اس کی ملاقات ادیب Strinberg August سے بھی ہوئی اور وہی مسائل پر اختلاف بھی۔ 1887 میں ہائیڈن اھام سوئیڈن واپس پہنچا۔ اس وقت تک ہائیڈن اھام کے اپنے باپ سے تعلقات بہتر ہو گئے تھے مگر ایک چار نو مارے میں جڑ بونے کی وجہ سے وہ اپنے خود کشی کر لی۔ اس طرح وہ اپنے بیٹے کی شاعری کے پسے مجموعے Pignmage and Wonder Years کی اشاعت دیکھنا نصیب نہ ہوئی جو شائع ہوتے ہی مقبول ہو گیا۔ اس مجموعے میں زیادہ تر مشرقی موضوعات برتے گئے تھے۔

اس کے بعد سے ہائیڈن اھام نے کبھی پت کر پیچھے کی طرف نہیں دیکھا۔ ادب کے میدان میں

اس کے قدم آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ ہائیڈن اھام کا سپر ماول Endymion وشن کے پس منظر میں لکھا گیا تھا جس میں مصنف نے بڑھتے ہوئی اور پی افراط کی وجہ سے یہ حد شہر ظاہر کیا تھا۔ اردو وقت گزرنے کے ساتھ گتھن شرقی جذب کا زوال نہ ہو چکا۔ اس ماول کے بعد ایک کتابچہ Renaissance ہوا جس کے فوراً بعد ماول (1892) Hans Alenius شائع ہوا، جو نثر اور نظم کا استخراج تھا۔ اس ماول کے مرکزی سوانح اپنے آپ سے تعلقات میں تقریباً ہی صورت میں دکھائی گئی تھی جو مصنف کو اپنے آپ کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں جب اسٹینڈی ٹیوڈ میں قومی شناخت کی لہر میں بڑھ رہی تھی تو وہ نوبیت (Neoromanticism) اور ناسٹ کے مترقی سے ماول نوکی میں اضافہ ہوا۔ اپنے مضامین میں، جس میں اس کا کتابچہ Renaissance ایک ہم سنگ میل تھا، ہائیڈن اھام نے معاشرتی مسائل کو حل کرنے کے مرنیہ طریقوں کو رد کیا اور تخیل، حساسیت، حسن و عرفیت کو مستجاب کرنے کے مشورے دیے۔

ناسٹ میں ہائیڈن اھام کی دل چسپی نے اسے اپنے مشہور ماول (The Charles Karolinerna Men (1897-1898) کی تصنیف پر آمادہ کیا۔ یہ ماول دراصل چھوٹے چھوٹے قصوں کا آپس میں مربوط ایک سلسلہ ہے جو سرے کے سرے Charles XI کے بارے میں ہیں جس میں اس کے فوجیوں کو یوکرین کی جنگ میں قومی جذبے سے مرثیہ دکھایا گیا ہے جب کہ فوج کے افسران کے خیالات سمجھ اور دکھائے گئے ہیں۔

اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد، جس سے اس کے تعلقات میں سربراہ کی عنصر زیادہ رہا تھا، ہائیڈن اھام نے دوسری شادی کی غمزدہ نیا وہ دن نہ چلی اور حلقہ کی پرستش ہوئی۔ ہائیڈن اھام کی دونوں شادیاں بڑے دھوم دھام سے ہوئی تھیں جن میں اس کے مزے کی نگارنی اور شام، آخری بے زار یک نیت سے انکار کی کا پتا چلتا ہے۔ دونوں شادیوں کے سرے مبرن رومن ہاوس بہت کرثریک ہوئے تھے اور مصوریوں نے ان موقعوں پر خصوصی مجسمے ترتیب دیے تھے جس میں سوئیڈن کے مشہور مصنیوں نے تہنیتی مضامین بھی کیے تھے۔ ہائیڈن اھام نے تیسری شادی خود سے جس بڑی چھوٹی لڑکی سے رچائی غمزدہ بھی لاکا سوپ نہ ہوئی۔

ہائیڈن اھام کی چونتیس تصانیف شائع ہوئیں اور اس نے 1940 میں انتقال کیا۔



رومیں رولان

اعترافِ کمال: اس کی دلی تعظیم کی ہندو پاکستانی، ہندوئی اور اس محبت بھری سچی کو خراجِ عقیدت کے طور پر، جس کے ذریعے اس نے مختلف نوٹ کے انسانوں کا متحرک کیا ہے۔

رومیں رولان بڑے اسکات کا شاعر تھا۔ حالانکہ اس نے اپنی تعریف کی وجہ ہندی میں ماول کو رومِ احترام دیا تھا مگر اس ہیئت کی تخلیق میں اس کی ہندوئی اپنے ہجرت کمال پر نظر آتی ہے، خصوصاً اس کے اسی درجے کے ادب Jean-Christophe میں Christophe کی کردار نگاری حیرت انگیز و چنگی، بزرگ جرنیات اور خصوصیت مینی کی انفرادیت کی وجہ سے ایک انتہائی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنے دور کی ہندی دلی شخصیت تھا جس کی طبع نایب ہے، باک، مادہ اور محنت مند نظریات سے بھرپور تعینات کو اپنی صدی کے عصری ادب میں نہایت بلند مقام دیا گیا۔

رومیں رولان 1868 میں فرانس کے شہر Clemency کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اس کا باپ ایک وکیل اور ماں ایک خداترس عورت تھی۔ رولان کا خاندان 1880 میں اس بچے سے عیسائی متقل ہو گیا کہ بچپن کو بہتر تعلیم دلائی جاسکے۔ ابتدائی تعلیم کے لیے رولان Ecole Normale Supeneure میں داخل ہوا۔ بعد میں اس نے روم میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ روم میں قیام کے دوران اس کی دوستی مایوے

فان میزین بگ (Matilda von Mayesenbug) سے ہوئی جس کی مشابیر ادب و ادب و ادب اور
 ہستی وغیرہ سے مذاقات تھی اور اس نے رولان کو پہلی تصنیف کی ترغیب دلائی۔ رولان نے رولان کے
 بارے میں اپنی یادداشت میں لکھا کہ میں اس لڑائی میں جو وہاں مٹا دیتا، اسی طرح کی بلند و بالا
 خواہشات اور بڑی دانش مندانہ قوتیں اٹھار پاتی ہوں جس کی میں نے دوسری قوموں کے عظیم افسانوں
 میں دیکھی ہے۔ رولان نے 1892 میں شادی کی۔ کچھ دنوں بعد وہیں وہی رہا جس کی مشیم رہے جس
 رولان کو اپنی ڈاکٹریت کے لیے Jean-Baptiste Lully اور Alessandro Scarlatti کے قبل کے اوج
 کے تھوکی سلاش میں تحقیق کرانی تھی۔ رولان کو 1895 میں ڈاکٹریت کی ڈگری مل گئی۔ سوربون کی تاریخ
 میں موسیقی کا پہلا مقالہ رولان کا تھا جو پیش ہوا اور منظور کیا گیا۔

رولان اسی ادارے میں فنون کی تاریخ کا پروفیسر مقرر ہو جہاں سے اس نے ابتدائی تعلیم حاصل
 کی تھی۔ اس کے بعد تاریخ اور موسیقی کے پروفیسر کی حیثیت سے اس کا ترقی پسندانہ میں ہو گیا۔ تدریس
 کے دوران ہی اس کی پہلی تصنیف تھیٹر سے متعلق تھی اور اس نے انقلاب فرانس کے بارے میں کئی کامیاب
 کہیں کہیں رولان نے پٹی سب سے اچھی تصنیف (1904-12) Jean-Christophe کی تکمیل کے بعد
 پکا سا بادلت اور دوسری صدیوں کے لیے وقف کر دیں۔ اس کا اس جلدوں پر مشتمل ہے: عظیم الشان
 اول جنم کے کہ تا بعد از گار موسیقار Christophe کے بارے میں تھا۔ انجمن کی سوانح حیات وہ
 پہلے ہی لکھ کر 1903 میں شائع کیا چکا تھا۔ حالانکہ یہ تصنیف جزوی طور پر موسیقار کی زندگی کے بارے
 میں تھی، رولان نے موت اور ادب کے حالات زندگی میں سے جو حصے اس میں شامل کیے۔
 رولان نے مرکزی کردار کو ایک ہیرو کے طور پر پیش کیا جو معاشی انصاف کے لیے لڑتا ہے اور جس کے
 نزدیک سرباب جیسی زندگی سے بہرہ موت ہوتی ہے۔ کرسٹوفے پیرس کے ایک سپہی کو قتل کرنے کے بعد
 سوئٹزرلینڈ فرار ہو جاتا ہے اور وہاں پہلی گریو موسیقار کی حیثیت سے کام کرنے لگتا ہے۔ کچھ عرصے بعد وہ ایک
 نامور موسیقار کی حیثیت سے واپس جاتا ہے اور وہیں اس کا شعل ہو جاتا ہے اور آخر میں اس کی موت
 پھر سے اس دہائے حیات میں شامل ہو جاتی ہے جس کے پانی سے دنیا کی بھتیجی بڑی بڑی رہتی ہے۔ اس
 عظیم ناول کے واقعات کی مطابقت اصل موسیقار Christophe کی زندگی سے بہت دور کی گئی جاسکتی
 ہے۔ اسی ناول کی بنا پر رولان ادب کے نوبل انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

رولان نے جنگ عظیم اولیٰ کے خلاف سوئٹزرلینڈ کے اٹھاروں میں بہت سے مصلحتیں لکھیں ان
 مشائیں کے مجموعے (1913) Above the Base کی شاعت کے بعد ہی رولان ایک بڑی اپنی
 شخصیت کے طور پر ابھرا۔ اس کتاب پر فرانس میں بہت احتجاج بھی ہوا۔ رولان نے جنگ کی مذمت میں
 کوئی کسر نہیں اٹھائی اور وہ ہمیشہ ملین تہذیب کی یکا مکت پر اصرار کرتا رہا۔ اپنے ایسے ہی خیالات کی بنا پر
 اس کو قتل قرار دیا گیا۔ رولان کے سوئٹزرلینڈ کے قیام کے دوران جیسا جو کس بھی مشیم تھا جس نے اپنے

تقسیم ہندو پیمس کا بیشتر حصہ ہیں تصنیف کیا تھا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد رولان کے کچھ ہوئے کہیں فرانس سے نیا دوجیہ میں جنیں ہوئے۔

تیسویں صدی کی دہائی میں رولان کو ہندوستان کے قلیے میں مل بھی ہوئی اور 1920 میں اس نے ہندوؤں کے مداحی پیشو، مہاتما گاندھی کی نہ صرف سوانح حیات لکھی بلکہ وہ گاندھی جی سے ملنے بھی گیا جو اس وقت سبزر لینڈ میں لیمان (Leman) کھیل کے ساحل پر واقع ایک آبادی میں مقیم تھے۔ وہ اس نے 1923 میں Europe کے ایک بین الاقوامی جلسے کی غور دہی جہت و قومیت کی مخالفت کرتا تھا۔ اگرچہ رولان نے اشتراکیت کو ایک مداحی تحریک کی طرح خوش آمدید کہا مگر وہ کمیونسٹ پارٹی کا کبھی رکن نہیں بنا۔ 1935 میں اس کی ملاقات گورکی اور اسٹالن سے ماسکو میں ہوئی مگر رفتہ رفتہ وہ اسٹالن ازم سے عیب ہوتا چڑ گیا اور غیر متشدد سوشلزم کی حمایت میں آیا۔ اس نے 1930 میں ایک کھیل Danton لکھا تھا جس میں دہلی انقلاب کو نظم و ضبط انقلاب پر قربان کیا گیا تھا۔

رولان 1914 سے 1937 تک سبزر لینڈ میں مقیم رہا اور اس دوران اس نے پتا دسر نہ نامی (1922-33) The Enchanted Soul تصنیف کیا۔ اس نے 1934 میں ایک مدی نواب کی سوتیلی بہن میری کو شوف Mane Koudachev سے دہری شادی کی اور وہ دونوں چار سال بعد فرانس منتقل ہو گئے۔ وہیں فاسسٹوں اور راستوں کے مخالفین کا شدید دمت اور باہمت قریبان تھا۔

رولان کی خود اپنی اور 1978 تک اس کے ورے میں شائع ہونے والی تصنیفات کی تعدد و تنوع کے ٹک بچھ ہے۔ رولان نے 1944 میں اپنی دہی کے بارے میں انقلاب کیا جو اس کو بچپن ہی سے لاحق ہو چکا تھا۔

رابندر ناتھ ٹیگور

اعترافِ کمال۔ اس ہمہ گیر حساس، نازد کار خوب صورت شاعری اور کمال ہنر کے لیے جس کے باعث اس نے اپنے شاعرانہ تخلیق کو اپنی انگریزی میں ذہل کر مغرب کے دل کا حصہ بنا دیا۔

رابندر ناتھ ٹیگور کی مذہبی نکتوں کا مجموعہ ”گیتا گیتی“ وہ تخلیق ہے جس نے بالخصوص اپنی مہرین کو چونکا دیا۔ یہ کتاب صحیح معنوں میں انگریزی دل کا حصہ بن گئی ہے۔ اس کا مستطیل تعلیم اور فن کے اعتبار سے ہندوستان کی ایک مقامی زبان کا شاعر ہونے کے باوجود اپنی شاعری کو ایک دوسری زبان کا ماس اس طرت پہنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اگرچہ اس میں وہی خصوصیات پیدا ہو گئیں ہیں جو اصل زبان کی شاعری میں موجود تھیں۔ اس مینہ سے ٹیگور کی شاعری نہ صرف پورے انگلستان اور امریکا میں بلکہ ہمارے مغربی ممالک کی دل چاہی کا باعث بنی۔ ٹیگور کی شاعری نے اپنا ما پوڈ کو بھی متاثر کیا اور اس نے لکھا کہ اس (ٹیگور) کی فطرت میں ایک قسم کا سکون، قدرتی سکون پایا جاتا ہے۔ یہ نصیب کسی شوقانی یا شوقانی کیفیت کی پیداوار نہیں معلوم ہوتی بلکہ یہ شاعر کی ذاتی عادت کے عین مطابق نکلتی ہیں۔

برطانوی زبان سے ماہد ہونے، مذہبی عقائد کی اجنبیت، اور مختلف ادبی روایت سے بچتے ہوئے کے باوجود ہر طبقہ قارئین نے ٹیگور کی شاعری کو شمس کی نگاہ سے دیکھا۔ ٹیگور کی شاعری کی خصوصیت اس کا وہ کمال

ہے جس کے ذریعے اس نے اپنے دور پر رونمزا و خیالات کو اپنے متوازن کمال فنی سے اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ انگریزی کے بصری بھی کہہ سکتے ہیں کہ نیگور نے شاعری کے ساقی حسن و رنٹر کے مراد نہ لیجے و آہن میں پیوست کر دیا ہے۔

مندیہ ستان کے چہرے ادب کے ایک عظیم مسئلہ، بنگالی زبان کے شاعر و رمانوں کا رہنما، تعلیم اور مندیہ ستان کے لیے آزادی کی کالٹ کرنے، اسے نیگور کو ادب کا قومی نوحہ منے کے دو سال بعد ہی راج برصغیر نے سر (Knighthood) کا خطاب عطا کیا تھا جس کو اس نے 1919 میں امرتسر میں چار سو ہندو ستانوں کا خون بہائے جانے پر احتجاجاً واپس کر دیا۔ میدان سیاست میں مہاتما گاندھی اور چھوٹے ہندوستان کے دوسرے بانیوں پر نیگور کا بہت اثر تھا مگر ایک صوفی منش کی حیثیت سے اس کی شہرت کی وجہ سے مغربی تارکین نے ایک متعصب "رٹو" بانیوں کے نظام کے نکتہ چیں کی حیثیت سے اس کی نظر ملنا شروع کیا۔

نیگور مغربی بنگال کے شہر کلکتہ میں 1861 میں ایک مال دار برہمن خاندان سے پیدا ہوا۔ اس کا والد مہاراشی دیو چند ماحو تھا کہ (جس کو نیگور نے بدل کر نیگور کر دیا تھا۔ مترجم) ایک مذہبی متعصب و رمانی دور تھا۔ نیگور کی ماں کا اس وقت نکاح ہو گیا جب وہ بہت کم عمر تھا۔ نیگور کا دادا جو بہت مال دار شخص تھا، بنگال کے عوام کی بھارتی کے لیے بہت سے منشوروں کی ماں ادا کرتا تھا۔ نیگور نے آٹھ برس کی عمر ہی سے شاعری شروع کر دی تھی اور جب اس کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہوا اس کی عمر ستر برس کی تھی۔ یہ مجموعہ نیگور کے ایک دوست نے اس کو حیرت کرنے کے لیے اس کی لٹری میں شائع کیا تھا۔

نیگور کی بھارتی تعلیم پسند پسند ہی تھی مگر اس کے ذریعے ہوئی، اس کے بعد مختلف اسکولوں میں جن میں بنگال کیڈمی شامل ہے جہاں اس نے تاریخ اور تہذیب کا مطالعہ کیا۔ اس نے لندن کے یونیورسٹی کالج میں بھی داخلہ لیا تھا مگر صرف ایک سال تو تعلیم کے بعد چھوڑ دیا۔ ایک دفعہ نیگور نے ایک بنگالی کوسٹے کا سفر خیرات میں دے دیا تھا تو بنگالی نے اس لیے واپس کر دیا کہ اس کو اتنی بڑی خیرات کو توقع نہ تھی۔

نیگور نے 1883 میں شادی کی اور اس کے دو بیٹے ورینین بنیاں ہوئیں۔ اس نے 1890 میں مشرقی بنگال (جو پانچہ ہائس کے نام سے موسوم ہے) سکونت اختیار کر لی جہاں سے اس نے مقامی موسیقی اور لوک گانیاں اٹھا کیں۔ 1893 اور 1900 کے درمیان نیگور نے سات جلدوں پر مشتمل شاعری کی جس میں 1894 Sonar Tan (The Golden Boat) اور 1900 Khanika شامل ہیں۔ نیگور کے لیے یہ عرصہ تخلیقی اعتبار سے بہت اہم تھا اس لیے کہ اسی زمانے میں کچھ لائٹن وڈس نے اس کو بنگال کا شیپ ہیڈ سب سے اہم بات یہ تھی کہ نیگور نے اپنی شاعری کے لیے موسیقی زبان استعمال کی تھی اور ادب کے لاش دور دور بصری کے لیے یہ عجیب بات تھی۔

نیگور پہلا ہندوستانی ادیب تھا جس نے اپنے ناولوں کو نسیمی قیاسوں سے آٹھا کیا۔ اس کی ہم عمری کاوشیں (Eyesore) 1903 اور (The Broken Nest) 1901 - Nashanir،

گیر ہارٹ ہاؤس تھمان

اعتدافِ کمال۔ خاص طور پر فنِ ڈراما کے میدان میں اس کی کامیابی، یوٹھس اور انی درجے کی تخلیقات کے لیے۔

ایک چرائی کہلات ہے کہ دلت بدلت رہتا ہے۔ اس کے ساتھ لوگ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اگر ہم ماضی کے ادنیٰ پلٹ کر دیکھیں تو ہمیں اس مقولے کی سچائی کا بھر پور انداز ہوگا۔ تاریخ کی شروعات سے اب تک کے حالات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ کئی چیزیں ظہور میں آئیں اور کئی نظر میں ہم نے ان پر نیا طرہ دیکھ نہیں سکتے مگر مستقبل میں وہی اسم کبھی نہیں۔ ڈرامائی شاعری کے غم میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ گیر ہارٹ بابہ تھمان ایک بڑا مامی تھا جس نے جسمن نہون میں ڈرامے اور ڈرامائی شاعری میں نئی جیتوں کے اضافے کیے تھے۔ اگرچہ اس کی زندگی میں ہی اس کو اعلیٰ پائے کا تخلیقی کارمان بر گیا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت اور پہچان میں اضافہ ہوتا گیا اور اس کو ڈرامے اور ڈرامائی شاعری کے صوبہ اول کے تخلیق کاروں میں شمار کیا جانے لگا۔

گیر ہارٹ بابہ تھمان 1852 میں مشرقی جرمنی کے ایک فیشن مہبل اور سباحوں کے لیے پڑھش چھوٹے سے علاقے Obersatzbrunn میں، جو اب ڈرونے Dron کے نام سے موسوم ہے، پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک ہوٹل کا مالک تھا جہاں سیاح آکر قیام کیا کرتے تھے۔ بریسلاؤ Breslau جمناریم میں (۱۸۷۰

عظیم یورپ کے وہ قانونی اسکول جن میں یونیورسٹی میں داخلے کے لیے عیادہ کرنی جاتی ہے۔ مترجم) نا کامیابی کے بعد گیر ہارٹ کو اس کے چچا کی جاگیر پر بھیج دیا گیا جہاں اس نے تحریکِ تقویٰ (Pietism) کے مدرسے میں علم ہوا اور کسانوں کے ہاتھ جو دکام کرتے تھے ان کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کرنے کا سوچا۔ ہیٹلر نے سے گیر ہارٹ تھا جس نے لگاتار اور محنت سے ساری سیکھنے کے لیے برلن لاکر کی "سٹڈی اینڈ" میں داخل ہو گیا۔ تین برس کی عمر میں وہ جینا (Jena) منتقل ہو گیا جہاں کی یونیورسٹی میں اس نے تاریخ پڑھی۔

1883 سے 1884 تک گیر ہارٹ نے روم میں "رٹ کی تعلیم حاصل کی اور پھر "پیتسم" کی روح مال کی بنیاد پر ایک روحانی نظم لکھی۔ اس طاعت اس کی علامت نے گیر ہارٹ کو تہنیتی لائی جانے پر مجبور کر دیا۔ 1885 میں اس نے میری تھوئے مان (Mary Thuenemann) سے شادی کی اور اس کے چار بچے ہوئے۔ میری ایک حسین عورت اور نئے امیر گھرانے کی ورثہ تھی، جس سے گیر ہارٹ کی 1881 میں ملاقات ہوئی تھی۔ منجھلی کے چور بھی بعد تک اس نے اپنے منجھلی کی مانی، مادی کی۔ اگرچہ گیر ہارٹ کی یونیورسٹی کو بالکل نہ سمجھتی تھی مگر اس کی دوست نے گیر ہارٹ کو مصنف کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع فراہم کیا۔ گیر ہارٹ نے بھی بہت سے کامیاب مصنفین کی طرح اپنی ابتدائی دلوں کی کہیں یونیورسٹی تعلیموں کو مسترد کر دیا اور زندگی کو اپنے اصل روپ میں پیش آنے کا قائل ہو گیا۔ دانش کے ابتدائی دلوں سے ہی گیر ہارٹ کو مادہ پرستی اور مائنتی اقلیت پر یقین ہو گیا تھا۔ اس کی ابتدائی کہانیاں (1887) Fasching اور (1888) Bahnhofs Thel ساروہ لوگ سناؤں کی نصرت پسندانہ سرگزشت پر مشتمل تھیں۔

برلن میں قیام کے دوران گیر ہارٹ کی ملاقات ترقی پسند شاعروں اور رمان نویسوں سے ہوئی جن میں آرنو ہولز (Arno Holz) بھی شامل تھے جس کے کہیں (1892) Neue Giese سے وہ پہلے ہی سے بہت متاثر تھا۔ گیر ہارٹ کا پہلا ڈرامہ (1889) Vor Sonnenaufgang تھا، پہلی ہی پیش کش میں جس کی سنسنی خیز حقیقت پسندی نے ناظرین میں ایک مامور نہیں پیدا کر دی تھی۔

گیر ہارٹ کے ڈراموں پر ہرک قسم کے اثرات دیکھے جاسکتے تھے مگر اس کے کہیں Die Webber کی وجہ سے جو سیڈیا (Sesia) (امتر میں استعمال ہونے والے ایک کم وزن کپڑے۔ مترجم) کے بنانے والے مزدوروں کی 1844 میں بغاوت کے بارے میں تھا، گیر ہارٹ اپنی نسل کے سرور اور ڈراما نویسوں کی کوئی منف میں آ گیا۔ یہی بار کھینے جانے پر اس کہیں کو مسموم اور دے دیا تھا اس کہیں میں گیر ہارٹ نے بہت محنت سے نہ صرف حقیقی تحصیلت کیات کی تھیں بلکہ تاریخی حقیقتوں پر بھی توجہ دی تھی اور اس کو سمجھنے سے قبل ان تمام رویوں کا، جو اس کہیں میں شامل تھیں، غائر مطالعہ کیا تھا۔ اس کہیں میں مقررہ گفتہ بہ سردار تھے جن سب کی خستہ حالی بے مثال انداز میں دکھائی گئی تھی۔ اس ڈرامے میں کوئی ایک سیر نہیں تھا۔ اپنے مزاحیہ ڈراموں (1893) Der Biberpelz اور Hanneles Hammetfahr میں جو برلن کے لواحقین میں منظر میں کھینے گئے تھے، گیر ہارٹ نے اپنے نصرت

پسند کرنے سے انحراف کی پیشکش کے باوجود عام انسانوں کی زندگی پر قویہ مرکوز تھی۔ بہت مختصر زندگی میں
مطالعے کے بعد گبر ہارٹ نے بہت ہی جوشیلا اور زندہ دلی سے نچر پور کھیں (Florian Geyer 1896)
لکھا جو سینچویں صدی میں کسانوں کی جنگوں کے بارے میں تھا۔ نچر چارہ تھیں یہ کہیں تھا کامیاب نہیں ہوا
جتنا کہ مصنف کا توقع تھی عمر بعد میں اسی تھیں کہ گبر ہارٹ کے بڑے کہیں میں شمار کیا گیا۔ گبر ہارٹ نے کچھ
ایپہ نامے بھی لکھے جن میں اس نے اپنے عشقیہ مسائل کو بھی کراواں کے بھیجیں میں پیش کیا۔ 1907
میں گبر ہارٹ یونان کے سفر پر گیا۔ اس دوران اس نے پنا سفر نامہ (Griechischer Frühling 1908)
لکھا جس میں اس نے عیسائیت اور بت پرستی کو موصوفہ بنایا۔

اپنے ملک کے عوام کے بنیادی مسائل پر قویہ مرکوز رکھنے کی وجہ سے گبر ہارٹ جرمنی کے صنفِ اول
کے شاعروں میں بھی شمار کیا گیا اور انسانیت کے لیے اپنے گہرے جذبات کی وجہ سے اس زمانے کے ان
بڑے ڈراما نگاروں میں شمار کیا گیا جو ہسپی، ایمریٹھ بڑگ اور ہمارا شاک کی طرح ملت اور فیشن کی تبدیلی
کے باوجود رہا نگاروں کی حیثیت سے پائندہ رہے۔

1993 تک گبر ہارٹ باپچرمان کی پتی اور اس کی تصنیفات پر مبنی دوسری شاعریوں کی تعداد دو سو
تک پہنچی تھی۔ گبر ہارٹ نے نمونے کے عرصے میں متوا موکر 1946 میں انتقال کیا۔



کاؤنٹ مارلیس میٹرلنک*

اعترافِ کمال۔ اس کی ہمہ جہت ادبی کارگزاریوں، خصوصاً ڈراموں پر کام کے لیے جو تخیل کی دولت اور شاعرانہ خیالات افق بنی تے، جو اسے ایک ممتاز مقام دیتا ہے، جو کبھی پری کھیلوں کے گیمس میں ایک گہری الہامی کیفیت پیش کرتا ہے اور حیرت انگیز طور پر قاری کے احساسات کو متنبہ کرتے ہوئے اس کے تجلیات کو براہِ انگیزت کرتا ہے۔

میٹرلنک اپنی تصنیفات میں ایک منفرد اور ایسے خاص ویب کی صورت میں نظر آتا ہے جو ہر نکتہ سے ادب کے میدان میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ مصنف کی چھاتی اور فہری استعداد و روحانیت کے اس درجے تک بلند ہو جاتی ہے کہ وہ حیرت انگیز طریقے پر اپنے قاری کے حواس کے مازک اور خیراتوں کو چپے چپے پھینکتا ہے۔ میٹرلنک اپنی ایک منفرد آواز رکھتا ہے اور اس کی حیرت انگیز ملامتوں کا، کبھی جو صوفیانہ بھی ہیں اور مزاح بھی، بڑے انکسار کے حسن کی بہت سے دہک بھی۔

مارلیس میٹرلنک بنیم کے شہر Ghent میں متحدہ بادلت پر کاربند ایک خوش حال گھرانے میں 1862 میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ عجم سونا زمین کا رتھ اور مقامی عدالت میں دستاویز و غیرہ کی تصدیق بھی کرتا تھا۔ اس کی ماں ایک ویت مندوکیس کی بیٹی تھی۔ میٹرلنک St-Barge Jesuit College میں تعلیم کے لیے داخل ہو۔ اس نے جوائی ہی سے شامری میں ملی چھوٹی بیٹی شروع کر دی تھی۔ اس کے گھر

والوں کو شاعری پر اعتراض تھا۔ اس کو قانون پڑھنے کے لیے یونیورسٹی بھیج دیا گیا۔ اس کے باوجود میٹرلک کی شاعری میں دل چھکی نہ صرف قائم رہی بلکہ اس میں اضافہ ہوتا رہا اور نتیجے کے طور پر ایکس برس کی عمر میں اس کی پہلی نظم The Rushes شائع ہوئی۔ 1885 میں گریجویٹ ٹرین کرنے سے بعد علی تعلیم کے لیے میٹرلک ویرجین چلا گیا۔ وہاں اس کی ملاقات ورنیمبرٹ ڈیویس سے تھی جسے علامت پسند شعرا سے رہی۔ وطن واپس پہنچ کر میٹرلک نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا مگر ساتھ ساتھ شاعری بھی جاری رہی اور 1899 میں اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ (Garden House Blooms) Les Chers Chaudes شائع ہوا۔ میٹرلک نے ڈیویس سے بھی شاعری کا پہلا ناما La Princesse Meline تھا۔ تیسویں صدی کی آخری دہائی میں میٹرلک نے کئی عداوتیں کیں جسے جن میں سے Pelleas et Melisande کو کلاؤنڈی Claude Debussy نے موتی کی ترتیب کے ساتھ پیش کیا۔ ڈیویس کے دبیڈاؤ 1902 میں نکلا جس نے اپنی پہلی تخلیق سے پہلے کر کلاؤنڈی تھا مگر چار برس بعد کی فنائیتیں تھیں تو ایسی بڑی کامیابی نصیب ہوئی کہ وہاں ڈیویس جیسے دیب نے بھی اس کی تعریف کی۔

1895 میں میٹرلک کی اوج کی شہرہ مخیر اور مدکارہ جارجیت جورجیہ Georgette Leblanc سے ملاقات ہوئی اور ان کی حیرت انگیز کہانیاں اپنے ہر شاعر سے طلاق حاصل نہ کر پانے

ہیں۔ دونوں جنگل جنگل مارے پھرتے ہیں۔ شرکے دو مانٹن پر دندے اور پٹے صلے کرتے ہیں گھرانے کا وفادار سامان کی جان بچا رہتا ہے۔ ان کا طرز عمل کھیل اور مستقبل کی منطقت میں چار کی تھا۔ سامان کی ماں ان کو خواب سے بیدار کر دیتی ہے۔ بچوں کی پہچان برٹنگٹ (Berlingot) نے جو خواب میں مہربان پرچی کی صورت میں وارد ہوئی تھی، اتفاق سے اسی وقت آگئی اور اس نے بچوں سے انتہا کی کردہ اس کے قریب ہر گ بچوں کی ایک لمبے تو خوشی کے لیے چاہتا تھا کہ وہ ان کے حوالے کر دیں۔ پہچان کو پہندہ حوالے کرتے وقت مصلحت پر چاہے یہ کھٹک ہو یا ہے کہ ان کا پاتو پہندہ واصل نیلے رنگ کا ہے، واکل اسی طرح کا جس کی خواب میں ان کو تلاش تھی۔ پہندے کے لیے جانتے سے پہچان کے بچے تو موت کے منہ میں جانے سے بچ گئے گھرانے دو مانٹن مصلحت کا پتو پہندہ نائب ہو گیا اور دونوں بچے تھیں بڑے ناظرین سے اپنے پہندے کو واپس مانگتے ہیں۔ یہ فیصل ایک سال تک ماسکو میں اس کے بعد لندن، نیو یارک اور ویرجیا میں پھر کر بہت مقبول ہوا۔ اس کھیل کی دو ورژن بھی بنائی گئی تھیں۔

جنگ عظیم اولیٰ کے دوران میٹرک نے یورپ، ورامریکا میں اتحادی فوجوں کی امداد کے لیے خطبے دیے۔ جہاز سے اس کے تعلقات 1909 میں ختم ہو گئے۔ ریڈیو بلک نے The Blue Bird؛ داسے کی اداکارہ Renee Dahon سے شادی کر لی۔ دونوں نے ویرجیا میں چنا گھر اپنا اور سرودیوں کے موسم میں وہ تھیں (Nee) منتقل ہو جا کر کہتے تھے۔ اب میٹرک کی ملی چیمپاں محل کی سے بہت کر فطرت پسندانہ اور نفسیاتی مسائل کی طرف ہو گئیں۔

دونوں عظیم جنگوں کے درمیان کے عرصے میں میٹرک مختلف حضار میں اور لٹریچر کے لیے 1932 میں شاہ البرٹ King Albert نے اس کو کاؤنٹ Count کا خطاب عطا کیا۔ یہ عرصہ میٹرک کے لیے اطلاق کا تھا اس لیے کہ اس کی تحریروں کو نظر انداز کیا گیا اور وہ ویرجیا میں اپنی کتابوں کی فروخت سے ہونے والی آمدنی وصول کرنے میں کامیاب رہا۔ اس کی آخری تصنیف Blues Bleues تھی جو 1948 میں شائع ہوئی۔ کاؤنٹ میٹرک کی چھتیس کتابیں شائع ہوئیں اور اس نے 1949 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

(یہں کہ انعام دینے والا ملک ہوم میں ملے جانے والی ضیافت میں شریک نہ ہو سکتا تھا اس لیے ضیافتی اجتماع سے انجم کے سفارت کار Charles Walters نے خطاب کیا)

اپنی تندہ جلالت کی بنا پر میرے فاضل ہم وطن جناب میٹرک کی گھر میں آرام کرنے پر مجبوری نے، جیسا کہ Court Morder نے ابھی فرمایا ہے، سب لوگوں کو بہت مایوس کر دیا ہے جو نہ صرف ان

کے غیر معمولی اپنی کام کے مہاج ہیں بلکہ ان سے مذاقات کے بہت مشتاق تھے۔

مجھے معلوم ہے کہ جناب میٹرلنگ کی ماری بھی آپ حضرات کی ماری سے کچھ کم نہیں۔ وہ خود بھی بہت مشتاق تھے کہ وہ خود مکررہ طرف اس عزائم نصیحت کو وصول کرتے جو ان کو دینا کیا چاہا ہے بلکہ اس ملک کو بھی دیکھتے جس کے وہ ایک مرتبے سے گرویدہ ہیں۔

اگرچہ جناب میٹرلنگ کی غیر جانبداری نے مجھ کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ میں حضرات جناب کے ہاتھوں سے ان کو دیا گیا نعام و حصوں کموں اور ان کی طرف سے آپ حضرات سے خطاب بھی کموں، ان کی غیر جانبداری پر مجھ سے زیادہ بھلائی کو انہوں سے ہو سکتا ہے۔ اس موقع پر مجھے اپنے ایک سم وٹس، Ghent کے شہری، اور کانٹا کے نام کے ایک سرکاری سے ایک درجہ مذاقات کا شرف حاصل ہوتا۔ میں بخوبی جانتا ہوں کہ ان کے جسمانی وجود کے بجائے ان کی خیالی شخصیت پر گزرا کرنا کتنا مشکل ہوگا۔

لاہور، پھر یہ اور سرفہرین، پھر انجرا چیرہ، دتہ اور رنگ، بے حد جذباتی مزاج، ہمیشہ شگے سر، کسی خوب دیکھنے والے شاعر فلسفی کا حلیہ تو نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں کے لیے جو ان کو، جس طرح جانتے ہیں، وہ ایک مفکر ایک شرمیلے انسان ہیں جو صرف اپنے قریبی دوستوں ہی میں کھتے ہیں۔ اس وقت یہاں ہم ایسے ادیب کے کام کو، جو وہ ہیں جس کی تحقیقات انہوں نے کی جنہوں سے ملو، مثلاً فی مشنیک کی گہری نیوی سے پھر اس بلندی تک پہنچتی ہیں جہاں اخلاقیات اور منطق، ہلکے سے قناتیں ٹٹاؤ گے اور جو ایک ایسے مذہب کا وہ دھاری نظر آتی ہیں جس میں کسی فکر مذہبی جن کا شائبہ بھی نہ ہو۔

کلیئڈ رکا، شندہ اور کلیئڈ شندہ (نئی جرمنی کے علاقے کی یونی جو وینڈیز کی زبان سے آتی ہے۔ مترجم) جانے کے باوجود میٹرلنگ نے اپنی تحقیقات میں نہایت چٹک دارہ پڑھیں اور خوش "ہنگ" انداز کی فرنیسی زبان استعمال کی ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنی فلسفہ زمین کی تجسیم واپس اسل کا ابھرونگار ہے۔ جو لوگ بھی ریل گاڑی یا سوڑ کے ذریعے تجسیم سے گزر رہے ہیں، فلسفہ کے میدان میں مدد کے کامور نہیں حسن ضرورت ان کی نظر سے گزرا ہوگا جہاں جسد جسد کھڑی ہوتی پتھر کی دیوگا میں جن پر بنے نقش و نگار فلسفہ کسکین عورتوں کی نگاہوں پر ان کشیدہ کاریوں کی بدولت ان ہیں جو وہ اپنی دیوڑھیوں پر نیچھی ڈالیا کرتی ہیں۔ کٹر پر سکین دیکی مذاقوں سے گزرنے والی دیکی رکی آوازوں میں آہستہ آہستہ گائے ہوئے خواب ماک کلیسائی موسیقی میں بار بار ڈیرائے جانے والے مذہبی گیت بھی سنائی دیتے ہیں۔ اور خوب صورت مل کھاتی ہوتی گلیوں والے کلیئڈز کے پرانے شہروں میں وقفے وقفے سے ٹوٹ جانے والے رات کے خانے میں صرف آتی ہوتی تھیلوں کی آوازیں اور چاندی چھٹی کھٹکتی ہوتی شہر کی قرون وسطی کی شجاعت، صدیوں کے وقار جہاں مردوں اور خوش حال کی داستانیں سنائی دے۔

ایسے جہاں شہر کی ماحول میں میٹرلنگ نے آٹھ کھوں، سب سے پلاؤ دھار میں جاک اس کی جڑا جیتیں اور جوہر قاتل کا خلی ہے۔ یہی جہد ہے جہاں اس سے ہر تعارف ہو، اور میں نے کوئی بار اس کو ایک پتہ چل

سے بحرے باغ کے عتب میں گل کے چمٹوں کی قطاروں کے درمیان دیکھا جس کی باہمی تلمیحات کا مٹا ہوا
کا شعل تھا، جن کے دے میں اس نے کھنکھایا ہے۔

میں نے جگہ کو کھنکھائی نے بجا طور پر نہ کسی ادب کے وقار میں اضافہ کیا ہے مگر ساتھ ہی اپنے ملک
کے وقار کو بھی بلند کیا ہے۔ سوئیڈش اکادمی نے اپنی انجمن کو کمر کے فرنیچر میں نہایت کے چکر میں ہمیشہ
خیالات کو حیات بخش کیا ہے۔

میں ٹوئیل آئین ٹیٹ کے ارکان کا شکریہ داکرتے ہوئے ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ
میرے غیر حاضر ہم وطن کی جانب سے محبت و تکرار کا یہ قول کریں، جس کا وقار اس کی سرزنش کو بھی بند کر
دی جاتا ہے ورنہ تمام جس کا نائنمہ ہونے کا مجھے بھی فخر حاصل ہے۔



پال یوحان لڈ وگ فان ہسے

اعترافِ کمال۔ ایک عظیم مرمے کے تخلیقی سفر کے دوران ملکیت سے سرشار مکالمات فنیو شاعرانہ ذرا
لکس ماڈل نگاری اور اپنی نثر میں مشہور نعتیہ روشوں کو پیش کیے جانے پر فنیو عقیدت
کے ہے۔

اس قوس میں کسی قسم کا شک نہیں کیا جا سکتا کہ پال ہسے ہی جدید نسبیاتی نعتیہ رمانوں کا Novella کا
رقی تھا مگر اپنے نعتیہ رمانوں میں شاہی وہ کبھی راجہ کی کیفیت سے نہ چارہ ہو تھی۔ پال صرف ماڈل یا باویلا
ہی لکھنے والا نہ تھا، وہ اپنے عصر کا بہترین نعتیہ شاعر بھی تھا۔ اس کے بہت سے مختصر ناول نظم کی کیفیت میں
لکھے تھے جن میں ٹائلر تعریف (1879) Salamander تھا جس کو کبھی جدید نہیں جا سکتا۔ اگرچہ ڈراما اس
کا فطرتی ورید اعلیٰ تھا لیکن اس نے اجماع کیاں کھے جن میں طائفی ورافسری دونوں ایک جات اور
نہایت دروندی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ پال کا ذوق بڑا غرا تھا۔ اپنے دوست ہسن Ibsen کی
تصنیف The Pretenders and Vikings at Helgeland اس کو بہت پسند تھی، اس کے باوجود اس کو
بھوت پرست جیسے تھے تھے ہی عوامی تھیں۔ وہ موسیقی کا دلدادہ تھا مگر واگنر (Wagner) اس کے دل
کے تالاب کو قابض نہیں سمجھتا تھا جتنا کہ بیٹوین Beethoven، موٹسارٹ، شوپن وغیرہ اس کو
بہت متاثر کرتے تھے۔

پاپا جیسے 1830 میں برلن میں پیدا ہوئے۔ اس کا باپ ٹیم نبلان کا ماہر تھا اور اس کی ماں ایک ممتاز اور
 نکھاتے پیتے یہودی خاندان سے تھی جو اپنے زمانے کے دربارہ شاعری کو جو ہر دنیوی ماحول فراہم کرتا تھا۔ پاپا
 کی تعلیم Friedrich Wilhelm Gymnasium برلن میں اور بعد میں (Bayern) (Bonn) کی
 یونیورسٹی میں ہوئی جہاں اس نے کلاسیک ادب اور ٹیم نبلان پڑھا۔ پاپا کو ڈاکٹریت 1852 میں ملی۔ اس
 کا مقالہ فرانس اور اٹلی کے جنوبی ساحلی علاقوں کے قدیم رومانی شعرا Troubadours پر تھا۔ پاپا کو مزید
 تحقیق کے لیے وسیعہ دیا گیا تھا جس کی مدد سے اس نے ایک سربسب تکملی میں قیام کیا۔ اپنے تحقیقی سفر
 کے دوران پاپا نے جنوبی فرانس میں یونانی چائے والی ایک رومانی Provençal کے خطوط پر تحقیق کی
 جس کی مدد سے اس نے یونیورسٹی میں ٹیچر کی ذمہ داری حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ 1854 میں باویریا
 (Bavaria) کے (جو اب جرمنی کا حصہ ہے) بادشاہ Maximilian II نے پاپا کا ایک خطیرہ خطبہ مقرر کر دیا
 اور اس کو اپنے دور کے شاعر کے سب سے پر فائز کر دیا۔ اس طرح اس کو فرانسیسی شاعری، مختصر کہانیاں اور انجیل
 لکھنے کے لیے فرصت نصیب ہو گئی۔

پاپا کی پہلی کہانی Der Jungbrunnen کی اشاعت 1850 میں ہوئی مگر اس کے بعد اس نے
 سوائے چند رومانی کہانیوں، اشعار اور ایک افسانے بہت زیادہ نہیں لکھا۔ اس کے کہیں Francesca da
 Rimini (1853) کی پیش کش سے اس کے خیریت دار سوس کا سلسلہ شروع ہوا۔ مگر چہ اس کے دور سے
 نیا دور مقبولیت حاصل نہ کر سکے مگر اس کو 1884 میں Schiller Prize دیا گیا۔

پاپا نے اپنی بیوی، مائریٹ کیئر کے ساتھ میونخ میں ہٹا کر آباد کیا اور پوری زندگی وہیں مقیم رہا
 سائے موسم گرما کے جب وہ اٹلی میں واقع شہریت پرنسٹا جھیل گارڈا (Lake Garda) کے ساحل پر یاد
 گارڈون (Gardone) میں اپنی بستی چلا جاتا تھا۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد پاپا نے 1866 میں اپنا
 شوہر Anna Schubert سے شادی کر لی۔ اپنے دوست انا ٹوئیل کا بیٹا Emanuel Geibel کے
 ساتھ مل کر پاپا نے ایک گروہ بنایا جس نے حقیقت پسندی کے پڑھتے ہوئے رجحانات سے اختلاف کیا۔

ماویر لکھنے میں پاپا کی لکھنی بہت کم (The Fury) 1857 L'Arrabbiata میں دیکھا جاسکتا ہے
 جو ایک ٹھیکرے کی لڑکی کے عشق کے بارے میں ہے۔ ٹھیکروں کی کشتی کا ایک لڑکا جو نوجوان لڑکی کے عشق
 میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ لڑکی پسے تو اس کو کشتی سے روکتی مگر بعد میں اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے۔
 اپنے کچھ دنیویہ ساتھیوں کے ساتھ مل کر پاپا نے 1870-76 Deutscher Novellenschatz
 (Treasure of German Novellas) ماویر کا ایک ضخیم مجموعہ شائع کیا اور اپنے پیش لفظ میں اس نے
 ماویر کے بارے میں اپنے نظریات بیان کیے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر ایک ماویر کو دوسرے ماویر سے اپنے تشابہ
 کے اعتبار سے مختلف ہونا چاہیے۔

پاپا پسے کے ادبی مقام کے اعتبار سے بطور پرمیونگ کی انتہا میں ہے اس کی آخری شہریت سے

نوازا۔ پال کی تصنیفات میں شاعری کے کئی مجموعے چھپا۔ لی، مرنے سے زیادہ کہیں اور یک سوئیں کے
قریب منچ کر کہیں شائیں ہیں۔ پال نے نمونہ کے عرصے میں 1914 میں انتقال کیا۔



سِلما اوٹیلیا لوویسا لاگیرلوف

اعترافِ کمال۔ بلند و بالا مٹائیت، روشن تصورات اور روحانی قوت ہر رسی توصیف میں جواس کی تحریروں کی پہچان ہیں۔

سِلما لاگیرلوف کُرن سے تاریخی روایات اور تاریخ کی بھینی بھینی خوشنواقی ہے۔ اس نے اپنے زمانے کی سکہ مانج وقت حقیقت پسندی کی تحریک سے رُوگردی کی اور بہت محبت بھرے ملازم اس اپنے مؤقلم سے ثانی سویڈن کے کسانوں کی زندگی اور وہاں کے قدرتی مناظر کی بکریاب نگاشی کی ہے۔ اس میدان میں اس کا سب سے بڑا حریف ہائینڈ اھما تھا جس کو 1916 میں دب کاؤنسل انی مرید کیا۔

سال 1858 میں جنوبی سویڈن کے شہر Marbacka میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ ایک فارغ شدہ فوجی فسر تھا۔ سِلما کو ابتدائی تعلیم اس کے گھر پر ہی مل گئی۔ وہ اپنے چھوٹے سے خاندانی گھر میں دوسرے بچوں سے لگ بھگ چھٹی۔ سِلما نے، چونکہ وہ تو پٹی و رک کے پاس رہتی تھی، جنوبی سویڈن کے جنگجو لوگوں کے، حوس، ہڈف پر پھیلنے کے مقابلوں اور وہاں کے قصے کہانیاں، روایات اور شہرے مانس کے بارے میں بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔

سِلما نے 1882 میں اسٹاک ہوم کی Royal Superior Training Academy سے تدریس میں گریجویشن کیا اور اس کے بعد وہیں تک Landskrona میں لڑکیوں کے ایک اسکول میں استاد کو

حیثیت سے تعلیم دی۔ یہی دوران اس نے ایک ناول The Story of Gosta Berling لکھا۔ ٹروٹ کی طرح جس کے ابتدائی ابواب کو ایک وہی مذاق میں بھیج دیا۔ اس مذاق کا انتظام Idun رسالے کی طرف سے کیا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے بعد کو نہ صرف انعام دیا گیا بلکہ مکمل ہو جانے پر پورے ماہ کی اشاعت کے لیے پیش کش بھی کی گئی۔

اپنی دوست Baroness Sophie Adesparra کی ماں محاورت سے بعد نے اپنا ناول Gosta Berlings Saga (The Story of Gosta Berling) مکمل کیا جو 1891 میں شائع ہوا۔ ابتدا میں تو ناول کی مانگ کم رہی تھی مگر جب اپنی بھرپور جہد کے بعد برکے نے ڈیٹش زبان میں ماہوں کے ترجمے کیے تو مثبت تبصرے میں سراہا تو یہ تصنیف انیسویں صدی کی آخری دہائی میں سویڈش زبان کے روہانی ماہوں کے حوالہ کا حصہ بن گئی۔ اس ناول پر مبنی ایک فلم بھی بنائی گئی تھی جس میں مشہور اداکار رینارڈ مارو نے بھی کام کیا تھا۔

بہما کی مختصر کہانیوں کے مجموعے Osvinga Lankar 1894 (Invisible Links) کو راتوں رات کامیابی نصیب ہوئی۔ King Oscar کی طرف سے فیلوشپ اور سویڈش کینیڈی کی جانب سے ماہی مہادار ملنے کے بعد اسے اسی نے اپنی چوتھی توجہ تصنیف و تالیف کی طرف مبذول دی۔ بعد ازاں اپنے ایک ہم عصر مصنف سولف ایکٹ Sophie Elkan سے شادی کر لی اور وہ دونوں قانون Fakun کی جتنی میں منتقل ہو گئے جہاں دونوں نے اپنی بقیر سرکاری زندگی بسر کی۔ بعد ازاں اپنے شوہر کے ساتھ اٹلی اور سسلی کا سفر کیا جس کے بعد اس نے سسلی کے بورے میں ایک اشتر کی وہ The Miracles of Anachrists 1897 - (The Miracles of Anachrists) تصنیف کیا۔ اپنے مسر اور مصطفیٰ کے سفر سے متاثر ہو کر بعد نے دو ناول Jerusalem 1901 اور I Det Helga Landet (1902) لکھے جن کی بنا پر اس کو سویڈش زبان کے سربراہ اور دو ناول نویسیوں میں مقام ملا۔

بچوں کے لیے لکھی گئی بہما کی سب سے حسین کتاب The Wonderful Adventures of Nils نامی جس کا خیال جزوی طور پر روڈیڈ کپنگ کی جانوروں کی کہانیوں سے یہ گیا تھا۔ یہ کتاب کو سویڈن کے پائری سکول بورڈ کی طرف پیش کیا گیا تھا تا کہ بچوں کو سویڈن کا جغرافیہ پر جاننے میں متعال کیا جائے۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل تصنیف ایک چودہ سالہ لڑکے Nils کی کہانی ہے جو اپنی خود غرض شراذوں کی وجہ سے بالکل (Egg-sized) بن جاتا ہے اور اپنے مکے وزن اور تپنوں نے قدم کے باعث ایک ٹیس کی پشت پر سوار ہو کر ٹیس کے چھنڈ کے ساتھ ساتھ سر سے سویڈن میں اڑ پھرتا ہے۔ بتدریج پر اٹنے کے دوران ٹیس کی زبان سے سہلا اپنے ملک اس کے باسیوں، ان کے راتن کن، اس کی جغرافیہ تاریخ اور مملکت کے بارے میں بچوں کے لیے نہایت مفید دلچسپ معلومات فراہم کر رہی ہے۔ جب لوہل انعام یافتہ چارلی ادیب کوئے (Oe) اپنا ان مضمون کے لے اسٹاک ہوم گیا تو اس نے اس پر اس کا کر بہما کی یہ کتاب وہ اپنے بچپن میں بار بار پڑھ چکا ہے۔

بہر اپنی کہانیوں اور ناولوں میں مراب خیاب کے فنی کارنامہ استعمال سے خواب اور حقیقت کے درمیان کی سرحد کو جھنڈا دیتی ہے۔ اس کے ناول (1912) Korkarten میں اسی تکنیک کے استعمال سے ایک بھائی جیسی خواب آئیں کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس ناول پر مبنی 1921 میں ایک فلم The Carnage Phantom، کافی فنی تھی جس کو اس زمانے تک ڈرامائی مناظر کی بہترین مثال ہونے کا درجہ سے سویڈن کی فلموں میں کلاسیک کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔

جنگ عظیم دوم کے شروع میں رہنے بہت سے جرمن دانش ورؤں کو تسمیوں کے قلم سے بچانے کے لیے فرانس میں مدافعت تھی۔ اس نے شاعرہ نے لی ساش Neil Sach کو سویڈن کا ویزا دیا کہ وہیں کو ماریہ صوبہ سے بچا گیا تھا۔ جب جنگ عظیم کے دوران فن لینڈ میں کی جارحیت کے خلاف لڑ رہا تھا بہر لاگیروف نے اپنے نوٹس انوم میں طے کر سونے کا تمغہ امدادی فنڈ میں دے دیا تھا۔

بہر لاگیروف کی اپنی اور اس کے بارے میں اب تک کٹش کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

بہر نے 1940 میں انتقال کیا۔

حیافت سے خطاب

چند دن قبل میں اسٹاک ہوم جانے والی ریل گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ میرے لےبے میں مکی مکلی ڈشٹی تھی جب کہ باہر گھبراہٹ مچ رہی تھی۔ میرے ساتھ سفر کرنے والے اپنے اپنے کونوں میں اوجھ رہے تھے۔ میں بالکل خاموش تھی۔ ریل گاڑی کے پیروں کی ٹرگڈز اہٹ کی گواز میرے کانوں کے پردے سے گھمراہی تھی۔

اور پھر میں ان دنوں کو یاد کرنے لگی جب اکثر اسٹاک ہوم آئی کرتی تھی۔ یہاں ہی نہیں، کسی کام سے، کسی مشکل کام کے لیے، امتحان دینے کے لیے، اپنے تازہ سوئے کے لیے کسی ماسٹر کی حدش میں۔ اور آج پھر میں اسٹاک ہوم آ رہی تھی جس درمیان کا انجام حاصل کرنے کے لیے۔ یہ بھی، میں نے سوچا، میرے لیے ایک مشکل مرحلہ ہو گا۔

اس سال خروس کا پورا موسم میں نے Varmland میں اپنے پرانے گھر میں مکمل تہائی میں گزارا تھا میں نے سوچا، اگر اب مجھے تھے سارے دنوں کے مجھے کے رہنے کا پڑے گا۔ تہائی کی حیثیت کے ان دنوں نے مجھ کو زندگی کی گہما گہمی کے معاملے میں اراپوک بنا دیا تھا میں سمجھ رہی تھی کہ میں دنیا سے اکھٹے ہونے کے خیال ہی سے ہراسیمہ ہو رہی تھی۔

ناہم، اپنے اندر ذاتی گہریوں میں اس انوکھا کائنات کرنے پر مجھے عجیب قسم کی مسرت کا احساس ہو رہا تھا، اور میں نے اپنے اندر پیرا ہونے والی بے سکونی کو دور کرنے کے لیے ن احباب کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جن کو میری خوش قسمتی اور اس انوکھے کائنات پر خوشی کا احساس ہوگا۔ دن میں میرے پیارے دوست، میرے بھائی مبین، اور سب سے بڑھ کر میری حقیقی والدہ ہیں گی جو اپنے گھر میں خوش ٹیلٹی یہ دن دیکھنے کو رہا ہیں۔

گھر پر رات آئی مجھے اپنے والد بھی یاد آئے اس دکھ کے ساتھ کہ وہ یہ سرتوں خبر دن دیکھنے کو اس دنیا میں موجود نہیں، اور پھر اس بات پر ڈر بھی، افسردہ ہو گئی کہ میں ان کے پاس جا کر بتا بھی نہیں سکتی کہ مجھ کو نوٹیل انوکھ سے نانا چاہا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس خبر کو سن کر ان سے زیادہ خوش ہونے والی ہوں نہ ہوں۔ میں آج تک کسی ایسے شخص سے نہیں جی جس کے دل میں میری شہد خوف اور اس کے خالق کے بارے میں احترام کے ایسے جذبات ہوں گے جتنے کہ میرے والد میں، اور کاٹن کو معلوم ہونا کہ سوئیڈش اکادمی نے مجھے اس عظیم اعزاز کے لیے چنا ہے۔ سچ کچھ، میں بہت افسردہ تھی کہ میں ان کو یہ خبر نہیں پہنچا سکتی تھی۔

کئی بھی شخص جس نے کبھی ریل گاڑی میں سفر کیا ہو اس نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ اس وقت جب کہ گاڑی رات کے گہرے اندھیرے میں ڈال رہی ہو کبھی کبھی ایسے طویل لمحات بھی آتے ہیں جب گاڑی کے ڈبے نسبتاً کم تر تھراہٹ کے ساتھ کہ بہاؤ کے صورت میں چلتے چلے جاتے ہیں۔ اچانک ساری سربراہیت اور پھیل غائب ہو جاتی ہے اور پیچیدگی کی پٹریوں سے ریل کی آوازیں ایک سکون بخش اور بے خطر بے متعلقی محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا گاڑی کے ڈبے ریل کی پٹری پر نہیں ہلکے بلکہ تیر رہے ہوں۔ اس ریل گاڑی میں ٹینگی میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی تھی۔ ساتھ ہی دن میں یہ خواہش بھی ابھر رہی تھی "اسے کاش میں کسی بھی طرح اپنے والد سے پھر مل سکتی اور ان کے گلے لگ سکتی۔" ایسی لطیف اور بے آواز تھی اس وقت ریل گاڑی کی حرکت کہ میں خود کو روئے زمین پر موجود تصور کرنے میں مشکل محسوس کر رہی تھی۔ اور پھر میں نے عالم ہوش ہی میں خوب دیکھنا شروع کر دیا۔ تصور شرط سے "مخبر میں اپنے والد سے ملنے چلتے میں چاہتی ہوں۔ میں نے لوگوں سے اس قسم کے تجربات سنے ہیں تو میں خواہشیں یہ تجربات نہیں کر سکتی۔ ریل گاڑی خلا میں تیر رہی، اس کو بہت دور تک چلتا تھا گھر اس کے وجود میرے خیالات کی رواس سے آگے آگے بڑھ رہی تھی۔ میری چشم تصور نے دیکھنا شروع کیا۔ اور دیکھنا چھوٹے والی سرتی پر دراز ہوا میں بیٹھے ہوں گے اور ان کے سامنے چھٹکی ہوئی نرم نرم سنہری دھوپ، چھپاتے ہوئے پردوں اور ہوا میں لہراہٹے خوش نما پتھروں سے بھرپور اچھا ہوگا۔

ایک نظر میں بلاشبہ Frigga Saga پر مرکوز ہوں گی مگر مجھ کو دیکھتے ہی وہ کتاب کو پڑے رکھ کر ٹیک کو ہاتھ پر کا کر دیا۔ انداز میں سرتی سے انھیں گے اور میری طرف بڑھیں گے۔ اور کہیں گے "ہمیں خبر میری پیوری ملے، تجھے اچانک دیکھ کر میں بے انجھا خوش ہوں" یا "ارے بسا! تم یہاں کیسے آگئی ہے

میری پیدری تھی، ”وکیل اسی طرح جیسے وہ مجھ سے ملنے وقت کہا کرتے تھے۔

پھر وہ آٹا ماری پی بیٹھ جائیں گے اور غور سوچیں گے کہ بعد ان سے ملنے میں یہاں کیوں آئی۔ پھر ایک دم وہ مجھ سے ٹکڑی ہو کر پتھریں گے، ”کیا بات ہے، تحریر تو ہے نا؟“ میں جواب میں کہوں گی، ”نہیں، تو، سب کچھ ٹھیک ہے۔“ پھر جوں ہی میں ان کو چھٹی خبر سنا جاؤں تو ایک ایک کر کے میرے لیے ہائل گروں گی اور ان کو زیادہ رست خبر سنانے کی بجائے کچھ اس طرح کہوں گی، ”تو میں آپ سے ایک مشورہ کرتے ہوں، اس لیے کہ اس وقت میں بہت بڑے قرضوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہوں۔“ اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ اس معاملے میں آپ میری کچھ مدد نہیں کر سکیں گے۔ ”تو جب دینا گئے“ پتھی، ”تو میں اس بھدہ کے بارے میں کچھ بھی کہہ سکتا ہوں گا۔“ Vamland ہی کی طرح یہاں سب کچھ بے سوائے بدلت کے۔

”اوہ! مگر تو! مجھ پر بدلت کے قرض کا بوجھ نہیں، یہ قرض تو اس سے بھی بڑا ہے۔“ ”تو کہیں گے“

”جی! تو راجہ سے تو کہو۔“

”آپ سے مدد مان کر کچھ لکھ بیٹھتی تھی نہیں، تو اس لیے کہ بند ہی سے یہ سب ہائل آپ ہی کی غلطی سے، آپ کو یاد سے کہیں؟ کس طرح آپ بیٹھنا بھاگنا بیچنا۔“ Bellman کے ایک شاگرد نے

تھے، اور کس طرح، جاڑ سے کے ہر موسم میں کم از کم دو یاں آپ ہم لوگوں کو Tegner, Runeberg اور Anderson پڑھنے پر اکسید کرتے تھے۔ کسی وہ وقت تھا جب سب سے پہلے میں نے اپنے آپ کو قرضوں محسوس کیا تھا۔ بعد کس طرح میں اتنی محبت بھری کہنوں، جیالوں کی داستانوں، بڑے وطن کی اور ساری انسانی زندگی کی سب سے بڑی کی، اور وہ قمار کے قلعے سنانے کا اتنا ادا کر سکیں گی؟ کیا میں کبھی یہ قرض کبھی ادا کر بھی سکیں گی؟

تو چلی چھوٹے والی کمری میں سیدھے ہو کر بیٹھ جائیں گے۔ ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی آجائے گی اور وہ کہیں گے ”میں خوش ہوں کہ تم پر یہ قرض چڑھا ہوا ہے۔“ میں کہوں گی، ”جی ہاں! آپ شاید ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر یہ دیکھیے میں اتنا ہی نہیں ہے، تو! اور سچ ہے تو، میرے کتنے قرض خواہ ہیں۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ آپ کے شاہ کے دور میں کتنے غریب، غناہ پرورش لوگ Vamland آتے جاتے رہے تھے، وہ طرح طرح کے گھیت سناں، بھنا، بھنا کر لے بیٹھتے تھے۔ ماں گھر، میں ان کی شرارتوں اور بد معاشرتوں کے لیے ان کی ان کی قرض دار تھیں۔ اور وہ بزرگ مرد اور عورتیں جو اپنے چھوٹے چھوٹے خا کہتری مکانوں کے سر ہانوں میں بیٹھے ہوتے، اور کوئی چٹائل سے ڈانٹیں ”کر مجھے گنگھانے چھرنوں، کھنکھی ہوئی آواز میں گائے اور زچھا کر پھاٹوں میں لپٹی جاتے والی کنوریوں کے حیرت بھرے قلعے سنانا۔ یہ تھے وہ لوگ جنہوں نے مجھے سمجھایا کہ سیاہ جنگوں کا یہ سنگار چٹانوں میں کبھی شاعری ہوتی ہے۔ اور زیادہ کیجیے تو جان! ان زور سے بولے چیرے، دھنسنے ہوئے کانوں والے ماہیوں کی سیاہ تباہیوں میں جیوں اندھیر کی خانقاہوں کی کنواں ماہیاؤں کو، ان نظاروں اور آوازوں کو جو انہوں نے سنی ہوں گی۔ میں نے ان

سب سے بڑی روایات دھارے کی ہیں۔ اور ہمارے اپنے کسان جنھوں نے یوڈھم کے شریکے کیا جس کی ان کی شہادت دار کا مرکز اور ان کی مقروض نہیں جنھوں نے مجھے لکھنے کے لیے کیا کچھ نہیں فرمایا کیا۔ اور میں صرف ان لوگوں کی مقروض نہیں، میں نے جب بن فطرت کی بھی مقروض ہوں۔ وہ تمام چاروں جو زمین پر چلتے پھرتے ہیں، وہ تمام پرندے جو لکھ لکھ میں تیرتے نظر آتے ہیں، وہ تمام ہرے بھرے چڑیا، وہ پودے، درخت، پتھر، پھول، سب نے مجھے اپنے راز سے آشنا کیا ہے۔“

والدہ مستحکم ہیں، اور بغیر کسی تردد کے اپنے سرکواہات میں پائیں گے۔ اور میں زمانہ وہ بخیرہ نظر آتے ہوئے کہیں گی، ”مگر ایسا کیا آپ کو حسرت نہیں کہ میں کتنے بڑے قرض کے بوجھ کے ذیل ہوں؟ کم از کم اس بڑے زمین پر تو کسی کو پتا نہیں کہ یہ قرض کس طرح توڑے گا، میری خیاں تھا کہ شاید کس میں تو آپ کو اس بات کا کچھ علم ہوگا۔“ تو کہیں گے ”بہم چاہتے ہیں“ اور پھر اسی طرح بے ہودہ درپردہ سنیں یہ چاہیں گے جس طرح وہ ممکن ہو چکا ہے کہ ”نہیں بیٹی، تمہاری مشکلوں کا ایک علاج ہے۔“

میں کہوں گی، ”کیا باں رو جان! اس مشکل صرف اتنی ہی نہیں، میں ان لوگوں کی بھی مقروض ہوں جنھوں نے ہمارے دنیاوی ترتیب دی ہے، اس کو حسین بیلہ بتایا ہے اور مجھ کو اسے استعمال کرنے کا شکر بھی سکھایا ہے۔ اور میں ان لوگوں کی مقروض نہیں جنھوں نے میرے عہد سے پہلے بھی غر اور نظم لکھی، جنھوں نے تحریر کو فن کا وہ دور ہے؟ کہا میں ان تمام مشعل بدعات، ان راہیں اصول نے والوں کی، ورنہ عقیم ناولیڈ، ان عظیم روایوں کی بھی میں مقروض نہیں جو اس وقت لکھ رہے تھے جب میں پائے میں اپنا گھونٹا چوکا رکھی ہوتی تھی“ کیا مجھ کو ایسے دور میں زندہ رہنے کی نعمت عطا نہیں ہوئی جب میرے اپنے وطن کا ادب اپنے بلند ترین مقام پر پہنچ چکا ہے کہ میں Rydberg کے بنائے ہوئے مرمرین سنگوں سے عشق کر سکتی ہوں؟ Snodsky کی شاعری، Strindberg کی چوٹیں، Geijerstam کی ٹوک باتوں، Anne-Charlotte Edgren کے جدید ادیبوں اور Ernst Ahlgren, Heidenstams Orient وغیرہ اور بہت کچھ جس میں جو نیاں تھیں، نیا ہے تھا، وہ سب کچھ تھا جس نے میرے سر پہ خوں کو سیراب کیا، مجھ کو متاثر کرنے پر کسلا اور میرے خوابوں کو تعبیریں دیں، کیا میں ان کی قرض دار نہیں؟“

تو کہیں گے ”ہاں، ہاں، بیبا، تم بونگل مچھ کہہ رہی ہو میری جان، تم پر بہت برا اثر ہے مگر یہ نہیں، ہم کوئی نہ کوئی راز یا خفیہ راز دھولہ نکالیں گے۔“

میں کہوں گی، ”میں نہیں سمجھتی ابو! کہ آپ کو حالات کی چینی کا مچھ ادا زہ ہے، آپ شاید بھوں سے ہیں کہ میں اپنے تمام پڑھنے والوں کی بھی مقروض ہوں۔ جوڑھے بادشاہ اور اس کے سب سے چھوٹے بیٹے کی بھی جس نے مجھ کو تربیت کے لیے جنوب کے سفر پر بھیج دیا تھا، ان چھوٹے چھوٹے اسکول کے بچوں میں جنھوں نے Nils Holgersson کو شکر کے ساتھ لکھا تھا۔ اور میرا کیا بتا، اگر کوئی بھی میری کتابیں نہ پڑھنا چاہتا، تو ان سب کو کیسے بھلا دیں جنھوں نے میرے بارے میں کچھ بھی لکھا ہے۔ آپ کو یہ مشہور

ڈیٹس مبصر یاد ہے، جس کے صرف چند غفلتوں نے پورے ڈیٹرکٹ میں میرے چاہنے والے پیدا کر دیے تھے۔ ورنہ بھی جو سرت اور جتنی کوئی فن کاری سے متھ کر یکساں جان کرنے کا فن جانتا تھا، جیسا پورے سوئڈن میں آج تک کوئی نہیں کر سکا، انہوں نے اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان سب کے بارے میں جو نمبر اس وقت میں پہنچے ہیں وہ جنہوں نے میرے لیے کام کیا ہے، ان کے لیے تھکر بھی مجھ پر ہے۔ جب سے ڈیٹرکٹ میری تعریف کے لیے بھی اور تادیب کے لیے بھی۔“

”ہاں ہاں!“ کہتے ہوئے میں اللہ کے چہرے پر مذبذب کی پوچھاؤں دیکھوں گا۔ یہ تو مجھ جانیں گے کہ میری مدد کرنا کتنا آسان نہیں۔“

میں کہوں گی، ”یاد ہیں نا آپ کو اب وہ سب جنہوں نے میری مدد کی تھی۔“ میں کہوں گی، ”یاد ہیں آپ کو میرے شخص دوست Esseeide جس نے میرے لیے اس وقت کامیابی کے دروازے کھولے چاہے تھے جب کسی کو مجھ پر یقین کرنے کی بھی جمع نہیں ہو رہی تھی۔ ان سب کو یاد کیجیے۔ جنہوں نے میری بہت خیال رکھا اور میرے کام کی، میری تحریر کی حفاظت کی تھی۔ یاد کیجیے میرے اس ہم سفر دوست کو جس نے نہ صرف مجھے جنوب کی سیر کرتی، مجھے فن کی عظمتوں سے روشناس کر دیا، بلکہ میری زندگی کو اہل سنت اور سرت انگیز بنایا تھا۔ ساری محنتیں جو مجھ کو ملیں، سارے اعزازات، سارے اقبالیات، کیا آپ اب مجھ کے گرد میں آپ سے یہ کیوں پوچھتے آئی ہوں کہ سارے قرض کس طرح آتا ہوں؟“

میں دیکھ رہی ہوں کہ اللہ نے اپنے اپنا مر جھکا دیا ہے اور وہ آج نہ وہ مخلص نہیں دکھائی دیتے۔
ڈیٹرکٹ گئے ”میں تم سے اتفاق کرنا ہوں ہی، تمہاری مدد کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا، مگر یقیناً اس کے علاوہ تم اور کسی کی قرض دہن نہیں ہوگی۔“

میں کہوں گی، ”جی، تو میرے لیے اتنا قرض ہی بہت مشکل تھا مگر میرے لیے سب سے بڑا قرض تو زیر بحث ابھی آئی نہیں۔ اسی وجہ سے تو میں آپ کے پاس مشورے کے لیے آئی ہوں۔“ ڈیٹرکٹ گئے، ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے کیا وہ قرض واپس ہوگا۔“ میں جواب میں کہوں گی، ”ہاں!“ اور اس کے بعد میں انہیں اس انعام کے بارے میں سب کچھ بتاؤں گی۔

ڈیٹرکٹ گئے، ”مجھے اکاؤنٹ کے بارے میں یقین نہیں رہا ہے۔“ اس کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے میرے چہرے پر نگاہ ڈالیں گے، اور پھر ان کو معلوم ہو جائے کہ یہ سب کچھ بالکل سچ ہے۔ اور پھر ان کے چہرے کی ہر سلوک تحریرائے گی اور ان کی آنکھوں میں ”سوئڈن کے گیس گئے۔“

میں کہوں گی، ”ڈیٹرکٹ! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان لوگوں سے کیا کیوں جنہوں نے انعام کے لیے میرا نام تجویز کیا، اور ان لوگوں سے جنہوں نے فیصلہ کیا، ڈیٹرکٹ! یہ سب صرف اعزاز اور دولت ہی نہیں جو مجھ کو دیا کر رہے ہیں، یہ فیصلہ کرتے ہوئے انہوں نے واضح کر دیا ہے کہ انہیں مجھ پر اتنا ہی اعتماد ہے کہ وہ ساری دنیا میں سے مجھ ہی کو چن رہے ہیں۔ میں بھلا یہ قرض کس طرح چکا سکوں گی؟“

(وگم سم پچھ وقتے جینھے میں گے۔ ان کے ہوں پر تیل لنگ بھی آ نہ پائے گا۔ پھر اپنی آنکھوں سے
 خوشی کے منسو پو پھتے ہوئے ہتی کوئی کے اتھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہتے ہیں، ”تس ایسے مساکس پر ہن
 وٹا کیوں کھپاؤں جن کے حل نہ اٹاں جنت کے نہ اٹاں ایسا کے پاس ہوں۔ میں ہے اچھا خوش ہوں کہ تم کو
 تو تیل انجام دیا گیا ہے، تس!“

صحابیات چاہو وجرل، عزت مآب، خاتون و محفرت! اپنے سارے مسائل کا اس سے بہتر جواب
 نہ پاؤں میرے پاس سوائے اس مزار کے در کیا رہ گیا ہے کہ آپ سب سونیڈش کاٹی کے لیے ایک جام
 تیار کر کے لے آئیں گے۔

(نامت نے تو یہاں اویلیا لودینا لایر دلی ہی تقریر کے ماب میں اس کے بعد اور کچھ
 نہیں لکھا مگر ماقم اپنے چشم تصور سے تائیں ہی گونج اور جسم کے درمیان مافرین کے
 آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو شہرہ زد کیے رہا ہے۔ ماب سن)



روڈولف کریسٹوف ایوکن☆

اعتزاف کمال۔
 بیچ کی پڑھتوں کوٹ، حیرتوں کوٹ، حقیقت، وسیع بصیرت، مگر جوئی اور قوتِ اظہار
 کے لیے جس کے ذریعے اپنی تخلیقات میں اس نے مشائیت پسند فلسفہ حیات کو نہ
 عربیت و بصیرت کی جگہ اس کا ثبوت بھی پیش کیا۔

وہ لوگ اپنے کمن کے لیے غصہ صرف کوئی معصوم اور روزمرہ کی شے نہیں بلکہ نفعی تھا۔ وہ سرمے
جو تک ایک فلسفی ہونے کے باوجود جدید سائنسی کامیابیوں کا قائل تھا۔ اس نے اپنی تجزیوں میں انسانی جہت
کے بارے میں خیریت کے شک نظر سے اور روحانی وجود کا تقابل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ غصے کی
طرح اس نے بھی تجربے کی تھل پسندی پر ضرور سنا نہیں کیا۔ وہ ہنگام اور اس کے چہرہ کار کی طرح نہ تو
سندھ بندی کرتا تھا نہ ہی وہ ایسے تجربے پر زور دیتے تھے جو انسانی تجربے کو خشنی اور ناثر کی حد تک
محدود کرنا چاہتے ہوئے انسان کے اصل تجربے کا قائل تھا اور ہی پر زور دیتا تھا۔

اپنی تصنیف (1921) n Socialism: An Analysis میں ایونکس نے اشتراکیت پر اس لیے شدید حملے کیے ہیں کہ اس کے مطابق اشتراکیت انسان کو فطرت پسندانہ نقطہ نظر سے دیکھ کر دنیا میں اس کا مقدمہ متعین کرتی ہے۔ اس کے نزدیک اشتراکیت فطرت پسندی کا مادیی اظہار تھی اور اس طرح انسانی ضروری پر تدفین نکالتی اور روحانی اثرات کو کمتر بناتی ہے۔ چونکہ کامیونٹھ کہ انسان، فطرت اور روح کا

مترادف ہے اور اس کو روحانیت کے لیے جدوجہد کے لیے روحانی عادات کو زیر کرنا چاہیے۔
 ڈیڈلف ایوگن نے 1846 میں مشرقی فرانس لینڈ (Friesland) کے شہر آرنچ میں آباد
 ایک گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ایوگن کا بچپن غربت اور والد کے انتقال کی وجہ سے مشکل گزارا۔ اس کا
 والد ڈاک کے چمکے میں ملازم تھا۔ ہر قسم کی سزاؤں کا واحد چھوٹا بھائی بھی انتقال کر گیا۔ اس کی ماں، جو
 ایک پردہ کی بیٹی تھی، کفر مذہبی عورت تھی۔ اس نے اپنے بچوں کا ہیٹ بولنے کے لیے اپنے گھر کے نانو
 کمرے کو گئے پر اٹھا دیا۔ کمرن کی اچھی تعلیم بھی ہو سکے۔ ثانوی اسکول کی تعلیم کے دوران ایوگن
 دنیا کے ماہر و فلسفی ویم رائٹر (Wilhelm Reuter) کے زیر اثر آیا۔ ایوگن نے ہلن ڈورنگٹن
 (Göttingen) کی یونیورسٹیوں میں فلسفے، علم نبات اور تاریخ کا مطالعہ کیا جہاں وہ ٹرنڈنبورگ
 (Trendelenburg) کے خیالات، بالخصوص اس کے اخلاقی معادلات اور فلسفے کو اپنی نظر میں دیکھنے کے
 عمل سے متاثر ہوا۔ ایوگن نے کچھ عرصے سے ڈائریکٹ کی ڈگری دی۔ اس نے اپنے مقالے میں ارسطو کی
 تدبیر پر کام کیا تھا۔

تعلیم کے اختتام پر ایوگن نے پانچ سال تک ایک ہائی اسکول میں مددگی کے فرائض انجام دیے۔ ارسطو
 کے بارے میں دو مختلف مقالے بھی شائع کیے اور 1872 میں Die Methode der Aristotelischen
 Forschung میں ارسطو کی منطق پر بحث بھی کی۔ 1872 میں ایوگن سٹوٹ گارٹن کی ہائی اسکول میں
 فلسفے کا پروفیسر مقرر ہوا۔ 1874 میں Jena میں فلسفہ پڑھانے پر مامور ہوا جس پر وہ طرزت سے سبکدوش
 کے وقت تک مامور رہا۔ تدبیر سے متعلق ایوگن کے ہم عصر فلسفیوں نے اس کے یوگیا طرز، استدلال، فلسفے
 کی اصطلاحات کے استعمال میں پروا کی اور اس کی تصنیفات میں تعریحات کی کی کی وجہ سے اس کے کام کو
 یونیورسٹیوں میں دیکھا۔ مشہور مددگاری فلسفی ہارلڈ بوسانک (Bernard Bosanquet) نے جو فلسفی
 مرکزیت کے مقابلے میں قدیم مشائیت کے دفاع کا قائل تھا، ایوگن کے اپنے فلسفہ کی حیثیت کے نظام کو جس کو
 وہ اخلاقی فعالیت پیری (Ethical Activism) کا نام دیتا تھا، اپنی سے رو کر دیا۔ بوسانک کے مطابق ایوگن
 کی اپنی ساری تحریروں میں فلسفے کی کوئی سنجیدہ و درجہ دار سائنس نہیں ملتی۔ اس کے بارے میں دیکھو کہ
 اخلاقی سے بڑھتی ہوئی غرق کر دیا گیا ہے۔

ادب کا نوبل انعام ملنے کے بعد ایوگن کو بین الاقوامی سطح پر مقبولیت حاصل ہوئی، اس کو مختلف
 یونیورسٹیوں میں خطاب کے دعوت ملے۔ 1907 میں اس نے ایک اور اس دور میں خصوصاً اس کی کتاب The Problem
 of Human Life as Viewed by the Great Thinkers (1890) کی روشنی سے پرکھی گئی۔ 1911
 میں ایوگن نے انگلستان کے مختلف مقامات پر سیمینار خطبے دیے اور 1912-13 میں چھ ماہ کے لیے امریکا
 کی بارڈر یونیورسٹی میں شاہل پر فیصلہ کی حیثیت سے پڑھایا جہاں اس کی اخلاقیات اینڈ ریویو کا سیشن اور
 تجویز اور ریسرچ سے بھی ہوئی۔ اس نے یونین کے اسمبلی کا کچھ دور کلبیا یونیورسٹی کے نوبل انعامی نشست

میں تقریریں بھی کیں۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران یوگوسلاویہ نے ایک سناچے تجربہ کیا تھا جس میں جرمن ہونے کے ماتے اس نے، شہر لال کیا کہ جرمنی کو جنگی اقدامات کا ذمہ نہیں ٹھہرایا جانا چاہیے۔

ایوگنی کے خیال کے مطابق میریٹ سب سے اعلیٰ مذہب ہے اور جیس کہ کاربن ماؤس سے کہا تھا یہ لوگوں کے لیے اچھا ہے۔ لیکن اگر اس کے نزدیک خدائی قدامت پسندی اور اس کے تصور اسے انسان کہہ ہاں تک نہیں سے جاتے جہاں پہنچنا انسانی زندگی کا مقصد ہونا چاہیے۔ اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے مگر کسی ماقبل مشائخ شخصیت تھے جس کا عالم نہیں ہو سکتا۔

ایوگنی وقتاً فوقتاً اپنی تصنیفات پر نظر ثانی کرتا رہتا تھا اور ان کو ترمیموں سے نازد کرتا رہتا تھا۔ اس کی بہت سی تصانیف کی، روسی دور میں پراشامینس یوگوسلاویہ نے 1882 میں شادی کی اور اس کے تین بچے ہوئے، تیس تصنیفات شائع ہوئیں اور اس نے 1926 میں انتقال کیا۔



رڈیارڈ کپلنگ

اعترافِ کمال۔ اس کی قوتِ مشاہدہ، تصورات کے نئے چہرے، حیرت کی مردانگی اور فنِ بیان میں غیر معمولی طباعت کی تعظیم کے لیے جو دنیا بھر میں مشہور خاص معترف کی تحفیات کی تصدیق کرتے ہیں۔

کئی صدیوں سے انگلستان کا ادب ترقی پذیر رہا ہے، اس کی شاخوں میں نئے نئے ٹھکانے پھولتے رہے اور عطرِ چولہا گھٹتے رہے ہیں۔ جب نئی سن کا ہر خط خوش آہنگ ہمیشہ کے لیے خاصوٹ ہو تو ہمیشہ کی طرح وہی سی آوازیں بند ہوتیں جیسی کسی بچے کا دھماکے اٹھ جانے پر ہوتی ہیں۔ یعنی یہ کہ نئی سن کے ادبی متحر سے بہت جتنے سے شاعری کا ایک شان دار عہد ختم ہو گیا اور یہ بھی کہ اب شاید کوئی بھی یہ نہیں جوالی کی سند سنبھالے۔

نئی سن کی شاعری میں مثالیّت پسندی کی لڑ پڑ ہے کہ وہ یہاں رامت آگاہیں چار کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مثالیّت پسندی کی خصوصیت بہت سے خدو خدو صفتوں کے حامل ایسے ادیبوں اور شاعروں کے تصورات میں بھی ملتی ہے جو نئی سن سے بہت مختلف بھی ہیں جن میں رڈیارڈ کپلنگ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ایک فرانسیسی ادیب نے وہ جس نے اپنا بہت سا وقت انگریزی ادب کے مطالعے میں صرف کیا تھا اس کے بارے میں لکھا ہے کہ بلاشبہ کپلنگ انگریزی ادب میں ظہور کرتے والی ایسی شخصیت ہے جس کو نظر

انداز میں کیا جاسکتا۔

کپٹنگ نے اپنی تحریروں کے ذریعے ہندوستان اور برما کی تواریخیاتی و طائفی افواج کی جواں مردی کی تحسین کی۔ وہ بھارتیوں کے قہر کے مظاہر و وسعت پر حاشیہ کے لیے مرجہا مرجہا بھی کہتا ہے اور ساتھ ہی بچے دشمنوں کا منہ بھی چڑاتا ہے۔ کپٹنگ پیدہ و جانوری ادب تھا جس کو نوبل انجیوڈیو کی سب سے مقبول تحریر (The Jungle Book (1894) تھی۔ کپٹنگ کے ہاں ادب کی سبکی اتنی تھیجراتی قوت تھی جس نے مصنف کو سحر جیسے جانوروں کے کردار تخلیق کرنے کی بصیرت عطا کی۔ طاقت کی علامت موگلی (Mowgli) کالا تیندو (Bagheera) ہمارا (Baloo) عینر ڈوہ (Kaa) منیہ کوہما (Nag) ناگی (Hathi) در چیتے چراتے احمق بندوں وغیرہ کی حرکات سے کپٹنگ نے بے مثال وراثت مناظر تخلیق کیے ہیں۔ اس کتاب نے دنیا کے بہت سے ملکوں میں کپٹنگ کو بچوں کا پسندیدہ ادیب بنادیا۔

کپٹنگ 1865 میں بمبئی میں (جو کچھ عرصے سے بمبئی کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔ مرقم) پیدا ہو۔ اس کا باپ جان کپٹنگ ٹیٹن لپیڈ کے درے جی جی بھائی اسکپ آف آرٹس استاد تھا۔ ہندوستان میں اس کا بچپن آسامی کی گود میں گزارا جنھوں نے اس کو ہندوستانی زبان سکھائی۔ کپٹنگ کو جب دو صرف چھ ماہ کی عمر میں اس کے ہنو و کے پاس انگلستان بھیج دیا گیا تھا مگر جب دو سترہ برس کا ہوا تو واپس ہندوستان آیا۔ وہیں آتے ہی اس نے ایبوری سے شائع ہونے والے اخبار Civil and Military Gazette کے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی۔ کچھ عرصے بعد جب وہ بمبئی کا بھی نہیں ہوا تھا اس نے یہ آگود سے نکلنے والے اخبار The Pioneer کی ادارت سنبھال لی۔ بمبئی کی حیثیت سے پور پورا پٹی دل چسپی کی عید سے اس نے ہندوستان کے طول و عرض کا سفر کیا۔ اس طرح اس کو ہندو مذہب کے تصورات، جذبات اور احساسات کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور ان کے مختلف گروہوں کے رسوم و رواج سے اسے گہری واقفیت ہوئی۔ کپٹنگ کی تحریروں میں ہندوستانیہ کے رنگ اتنے بقی ہیں گئے تھے کہ ایک مقولے کے مطابق فیر سوئز کی قیر سے ہندوستان انگلستان سے اتنا قریب نہیں ہوا تھا جتنا کی کپٹنگ کی تحریروں سے ہوتا۔

کپٹنگ 1878 میں جنوبی انگلستان کے علاقے ڈیون (Devon) کے رہائشی کالج United Services College میں داخل ہو جو ایک مہنگا ادارہ تھا جو وہاں فوج میں داخلے کے لیے خصوصی تربیت دی جاتی تھی۔ کپٹنگ کی تمام زور تھکوں اور امتحان کے خراب نتائج کی وجہ سے اس کا فوج میں بھرتی ہونے کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ پڑھنے کے دیوانہ وار شوق کی وجہ سے کپٹنگ دوسرے طبقے سے لگ تھلک ہی رہتا تھا۔ کپٹنگ 1882 میں ہندوستان واپس ہوا۔ ہندوستان واپس کے دو سال کے اندر کپٹنگ نے بہت ساری کہانیاں لکھیں جن کے مجموعے کا نام The Phantom Rickshaw تھا۔ اس مجموعے میں اس کی مشہور کہانی The Man who would be a King شامل تھی جس پر مبنی ایک کامیاب فلم بھی بنائی گئی۔ اس

کینی کے مطابق ایک انگریز تاجر شمال مغربی ہندوستان کے علاقے کا فرسٹان میں (جواب مملکت پاکستان کا حصہ ہے۔ مترجم) خدائی کا دعویٰ کرتا ہے، اور کسی حد تک وہاں کے مسیوں کو اپنی خدائی کا یقین دلانے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ مگر اتفاق سے ایک مقامی عورت اس کے جسم سے ٹھن بہتا ہوا دیکھ لیتی ہے اور اس کو تپا چلی جاتا ہے۔ مگر وہ خدائیں ہر ایک عام انسان ہے۔ پھر یہ ٹیڑھوے علاقے میں پھنس جاتی ہے اور اس تاجر کی خدائی ختم ہو جاتی ہے اور آخر کار وہ ماما چاٹا ہے۔

انیسویں صدی کی مغربی ادبیات کے دو ماہر کینیگ کی مختصر کہانیاں اور شاعری بہت مقبول ہوئیں۔ 1889 میں اس کی انگلستان واپسی پر وہب کے مہمیں نے اس کو چارلس ڈکنز کا ادبی وارث قرار دیا۔ 1889 اور 1892 کے دو ماہر کینیگ نے لندن میں قیوم کیا اور ہندوستان پر مبنی کہانیوں کا مجموعہ *Life's Handicap* جس میں اس کی مشہور کہانی "The Man Who Was..." شامل تھی اور شاعری کا مجموعہ *Barrack-Room Ballads* شائع کیا جس میں بدعنوان فوجیوں کے لیے پڑی پھرنے والے ایک ہندو گنگا دین کے بارے میں اس کی نظم "گنگا دین" شامل تھی جس کا ایک بندہ تھا۔

پیارے گنگا دین! دین! دین!

میں نے تجھ کو، ماجیاء، تجھ پر ظلم کیا

تیری جذباتی جدا دہائی، تو نے اُنک بھی نہ کی

جسم ہے زہرہ خالق کفن کی

جس نے تجھ کو خلق کیا ہے

تو مجھ سے بھی نفرت رکھ

پیارے گنگا دین

1892 میں کینیگ نے ایک امریکی ماہر کی بہن سے شادی کر لی اور امریکا منتقل ہو گیا۔ مگر بعد ہی اس کو حسرت ہو گیا۔ مگر وہ عداوت بننے کے قابل نہیں۔ اس نے اپنے اہل خاندان کے ساتھ واپس انگلستان کی راہ لی۔ امریکا قیوم کے دو ماہر کینیگ کی ایک نئی مرگئی تھی۔ نئی قیوم کے دو ماہر اس نے ایک ناول *The Naoakha* (1893) تصنیف کیا۔ کینیگ کی شادی کچھ اچھی نہ تھی اس لیے کہ اس کی بیوی اس پر بری طرح حاوی تھی۔ ان مشکل دنوں میں بھی کینیگ نے *Many inventions* (1893) *Jungle Book* (1895) اور *The Seven Seas* (1896) جیسی اہم درجے کی کتابیں تصنیف کیں۔

عام طور پر کینیگ کو شاعر دب *Poet laureate* کہا جاتا تھا۔ مگر اس نے اس مام نہی و عزائم کو رد کر دیا۔ کینیگ نے اس کے علاوہ اور بھی کئی اعزازات قبول کرنے سے انکار کیا۔ 1901 میں کینیگ کا سب سے اچھا ناول *Kim* شائع ہوا۔ اس کا پس منظر ہندوستان کا تھا جس میں ایک یتیم لڑکے کی کارگزاریوں کو پیش کیا گیا تھا جو انڈین رجمنٹ *Irish Regiment* میں خدمات انجام دے رہا تھا۔

کپلنگ نے اپنی زندگی میں ہی اپنے مرنے سے خطوط تک کر دیے تھے تاکہ ان کے ذریعے اس کی ذاتی زندگی منظر عام پر نہ آ سکے۔ پھر بھی بہت سے خطوط بیچ رہے جو اس کی موت کے بعد شائع ہوئے۔
 نوٹیل انوار پانے کے بعد کپلنگ کی سزا اور نظم دونوں رو بہ زوال ہو گئیں۔ کپلنگ کی پتی وراس کے بارے
 میں تاریخات پر مبنی 149 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ کپلنگ نے 1836 میں لندن میں انتقال کیا اور مرزا
 لندن میں واقع شاہی گرجا گھر ریسٹ ہسٹریا ہے کے گوشہ شعرا میں دفن ہو۔



جینو سو کار دو چی

احتراف کمال۔ اس کے عیش مطامع و رشیدی تحقیق کے لیے ہی نہیں بلکہ اس کی تمام تر تحقیقی توانائی، اسلوب کی ذہنی اور غنائی قوت کے احتراف کے طور پر جو اس کے شاعرانہ شاد کاروں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

اٹلی تو جگہ آزادی کار دو چی کی شاعری اور اس کی حساسیت کے لیے نہایت برحق ہے۔ کار دو چی ایک پُر جوش وطن پرست انسان تھا اور اس جگہ میں اپنی تمام تر حساس اور روحانی جذبات کے ساتھ شامل تھا۔ مٹی باریکیوں نے ہو وہ شکست سے کبھی دل برداشتہ نہیں ہوا جس اس کا دل ہی بات سے اس وقت ضرور دیکھتا تھا جب وہ یہ دیکھتا تھا کہ ملک کی پارلیمانی حکومت اس کی اپنی خواہشوں کے مطابق عمل نہیں کرتی۔ یہی پاپائیت کی عظمت کی مخالفت کی کوشش میں کار دو چی نے اپنے ترانوں میں قدیم رومن کی عظمت پر دلالت ہے اور بے مثال نقاد پرفرانس کی تشبیہات استعمال کی ہیں۔ مگر جب اس کی نظر میں اٹلی کی سلطنت سے ناامیدی اور خوف پر ہو جس اور اس تصور پر کہ سرری قدیم خوبیوں اور بہادری کے کامیابوں کو دوبارہ زندہ کیا جے تو کار دو چی مایوسی کی گہریوں میں گمراہ دکھائی دیتا ہے۔

کار دو چی اٹلی کے حسین علاقے تھسکی (Tuscany) کے شمال مغربی علاقے کی ایک چھوٹی سی آبادی والی ای کا سٹیو (Vai de Caseto) میں 1835 میں پیدا ہوئے۔ اس کا باپ، نیکل کار دو چی ڈاکٹر

تھا اور انکی کے خودی و علی عظیم کاربوناری (Carbonari) کا رکن تھا۔ اپنے سیاسی خیالات کی وجہ سے کاربونچی خاندان کوئی بار ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرنا پڑی اور آخر کار 1849 میں وہ سال کے لیے فلورنس میں قیوم پذیر ہوئے جہاں پہلے کاربونچی نے کھانا شروع کیا۔ اس کی پرورش عقیدت پسندی اور قوم پرستی کے ماحول میں ہوئی تھی۔ کاربونچی نے اپنے باپ سے کھانسی وپ کی سٹائش و مدے میں پائی تھی مگر اس نے خود بھی راء و راء انداز و انداز Friedrich Schiller کو پڑھا تھا۔ اگرچہ کاربونچی کا وہاں جب اس نے لکھنا شروع کیا تھا وہاں انوکھ کے طلبے کا نمائندہ تھا مگر اس نے اپنی ابتدائی شاعری میں وہاں کی کامیت فرمیں لیں۔ اس نے تاریخی مضمومات پر شاعری سے ابتدا کی اور پھر 1850 کا ترجمہ کیا۔ کاربونچی نے کافی عرصے تک چنے گاؤں کے بچوں کو قومی غمے سکھائے اور غنائی نعیمیں لکھیں۔ حکام سے ان کی وجہ سے کاربونچی کے باپ کی آمدنی کم ہوئی تھی اس لیے بیٹے نے گزروقتات کے لیے (1855) L'Arpa del Popolo Scelta di Poemi Religiosi, Morali Patriotici اپنی شاعری کا ایک مجموعہ ترتیب دیا اور اسے L'appendice کے لیے منسلک کیا۔ اس طرح کاربونچی کا شمار اس سے منسلک اہم لکھنے والوں میں ہونے لگا۔

1856 میں Pisa کے تعلیمی ادارے Scuola Normale Superiore سے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے بعد کاربونچی نے مدب کی حیثیت سے ملازمت کرنی اور 1857 میں اپنا پہلا شعری مجموعہ Rime شائع کیا۔ ان دنوں کاربونچی اور بھی نیا وہ مشکل میں رہتا رہا اس لیے اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور اس کے بھائی نے خود بھی کرنی تھی۔ 1859 میں کاربونچی نے شادی کی جس سے اس کے چار بچے پیدا ہوئے۔ یونیورسٹی آف بولونا (University of Bologna) میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہونے سے پہلے کاربونچی نے آچھ دنوں ایک اسکول میں حیاتی زبان کی تعلیم دی۔ کاربونچی پر جنائش انسان تھا اس وجہ سے یونیورسٹی میں نیچر کی حیثیت سے ملازمت کے دوران وہ بہت شہول ہوا۔ تنقید نگاری حیثیت میں کاربونچی نے اس کے تنقیدی مضامین میں اس کی زبان کی تیزی کی وجہ سے نوک اس کو صریح شاعر کہتے تھے۔ کاربونچی ابتدا میں شاد پسند تھا مگر بعد ازاں وہ دنوں میں چاکل وہ کلیسائی اقتدار کا سخت مخالف اور ایک جمہوری جمہوریت پسند شخصیت بن گیا۔ اپنے ان خیالات کو وجہ سے کچھ عرصے کے لیے یونیورسٹی کی ملازمت سے معطل رہا اور اس کو تھوڑے کی دھمکیاں بھی دی گئیں۔ انیسویں صدی میں انکی کے اتحادی سیاسی تحریک کے اثرات کاربونچی کی تصنیفات (Gambi, Levia Gravia, 1860, Juvenia 1860) Ed Epodi (1879) میں صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح کلیسائیت کے خلاف کاربونچی کے خیالات اس کی کتاب (L'Inno a Satana - The Hymn to Satan) 1865 میں ملتے ہیں جن پر خاص تازہ کھڑا ہوا تھا۔ کاربونچی کے نزدیک شیطان بدی یا بد معنائی کی تجسیم نہیں بلکہ ترقی اخراج کے مترادف ہے۔ کاربونچی اسے یہودی قوم کے سیاسی خیالات دکھاتا تھا، ایک مل میں جمہوریت پسند اور

دوسرے لمحے اس کا خیال ہو جاتا تھا۔ اپنے آخری دنوں میں وہ شاہ پسند ہو گیا تھا اور اس نے اٹلی میں اٹلی کی توسیلی سیاست کی طرف ورتی کی تھی۔ قاتل اس کے خوش اس کو 1890 میں ۲ جوت سینٹر کے رہنے پر قاتل کر دیا گیا تھا۔

کارنہ پتی کے بڑے کاموں میں سے اہم میں جہدوں پر مشتمل (1878-1889) artare اور Rime a Rami (1898) تھے جو اس نے جو ریم اور ریم میں کھڑے کر لیا۔ سیک کے بحر رتہ ہونے کی کوشش کی تھی۔

کارنہ پتی نے شاعری کے علاوہ بہت سے مضامین اور ایک مونیوٹل رسالے بھی لکھے تھے جو اس کے کلیت میں شامل ہیں۔ حالاں کہ کارنہ پتی کی اصل شہرت شاعری کی بنیاد پر تھی۔ اس کے تین جہدوں پر مشتمل کلیت (1939-41) Opere Complete میں شاعری، صرف چار جہدوں پر محیط ہے۔ کارنہ پتی نے 1907 میں انتقال کیا۔



ہنرک سینکی وچ☆

اعترافِ کمال۔ ایک مہرہ گوروہ فریبوں والے عظیم الشان معترف ہونے کی وجہ سے۔

ہنرک سینکی وچ پولینڈ کے شہر Wola Okrzejska میں یک چھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوا۔ معاشی حالات سے مجبور ہو کر اس کے خاندان نے پناہ گرجا دیا اور مہربان رہا Warsaw منتقل ہو گئے۔ ہنرک وارمر جمنزیم میں داخل ہوا اور وہاں سے تربیت سے کر 1856 میں پڑش یونیورسٹی میں قانون، طب، تاریخ اور ادب پڑھنے گیا۔ صاحبِ علمی کے زمانے ہی سے اس نے اخباروں کے لیے کھٹا شروع کر دیا تھا۔ سر وائٹر نکات اور انھیں ڈیوڈا (Alexander Dumas) سے متاثر ہو کر ہنرک نے اپنی پہلی تاریخی کہانی Ożara (The Sacrifice) لکھی جس کا مسودہ بھی موجود نہیں۔ اس کی طور پر مشکلات میں گھر جانے کی وجہ سے ہنرک کو اپنی یونیورسٹی کی تعلیم ڈگری حاصل کیے بغیر ہی اچھوٹی چھوٹی پڑی۔ اس نے آنا و پیرس میں فی کی حیثیت سے کام شروع کیا اور اس دوران بددعا نے لورماول بھی لکھتا رہا۔ اس کا پہلا ماول Ma Mame (1872) تھا جس میں اس نے صاحبِ علمی کے زمانے کے حوالے کیے۔ 1874 میں ہنرک پندرہ عورتوں کے Nwa کی طبیعت میں شراکت دار بھی ہو گیا اور اس کے کی حالت بھی سنگین ہوئی۔

ہنرک 1872 میں امریکا کے سفر پر گیا۔ پولینڈ کی مشہور ادکار مینیٹا موچیرکا اور اس کے دوستوں نے مل کر امریکا کی سیاست کیلے خود دنیا میں ایک نوآبادی قائم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ہنرک کا سفر اس

سب سے کی پہلی کڑی تھا۔ اس سفر نے ہنرک کوئی کہانیاں لکھنے پر 'کسبو جن' میں (Laternik 1882) شامل
 تھی۔ ہنرک 1872 میں لارمروہس بیکچ اور قدامت پسند اخبار (Słowo 1882-87) کا مدیر بن گیا جہاں
 سے اس نے اپنے ابتدائی ماولی شائع کیے۔ ہنرک نے Mianowski Foundation کی بنیاد ڈالی۔
 Literary Foundation (1899) کا بھی صدر منتخب ہوا۔

سر و شرا۔ کلاٹ کی تصنیفات اور فرانسیسی زبان کے تاریخی ماولوں سے متاثر ہو کر ہنرک نے 1892
 میں اپنے تین تاریخی ماولوں کے جلسے کا ناول لکھا۔ پینڈا ماول (Ogniem i Mieczem With Fire and
 1884 Sword) میں شائع ہوا جب کہ Pozop (The Deluge) نام کے ماول کو 1886 میں Pan
 Michael کی اشاعت 1888 میں ہوئی۔ یہ تینوں ماول بڑی حقیقت پر مبنی تھے اور مختصر کے بعد جذبات انگیز زبان اور
 تیز رفتار میں لکھے گئے تھے۔ ان ماولوں سے ہنرک کو فنی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے اس لیے کہ ان کے
 سرے کرنا ایسے رنگا رنگ تھے کہ پلینڈ کے باہر کے ملکوں میں بھی اس کے قارئین پیدا ہو گئے تھے۔

اس کا تاریخی شہرت کا پہلا ماول Ogniem i Mieczem اس عرصے کے درمے میں ہے جو
 1648 سے شروع ہو کر King John III (John Sobieski) کے عہد تک کا احاطہ کرتا ہے جو سترہویں
 صدی کے آخر تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ہنرک نے رچیدہ ڈرامائیو کا انداز اختیار کیا ہے مگر مہارت کی
 تکنیکی کو محبت و فطانت سے دل دیا ہے۔ ماول کا موضوع دو جنگیں ہیں جو پلینڈ نے اپنی علاقائی سر
 فیت کے لیے لڑیں۔ ماول کا پہلا حصہ پلینڈ اور یوکرین کے درمیان تنازعے کے بارے میں ہے جب کہ
 اس کا تسلسل Pozop پلینڈ پر سفیدان کے حملے کے بارے میں ہے۔

تسلطی طور پر یہ ایک کلاسیکی ماول کے نمونے ہیں جس میں ناقابل تغیر سیر ہیں، قابل دید ویت بہ
 ویت لڑائیاں ہیں، لانا لانا دیتیاں اور میری موت وغیرہ ہیں۔ اس ماول میں مصنف اپنی قوم کو داخلی کی
 مشن دار دیات سے آشنا کرتا ہے اور یہ بھی کہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ قاری خود کو افسانوی ہیرو کے
 شانہ پر شانہ پاتا ہے۔ دوسری جگہ تنظیم کے دوران بہت سے حریت پسند جنگجوؤں نے اپنے فرائض ماسان
 ماولوں کے کرداروں پر رکھ لیے تھے۔

ہنرک نے طویل سفر کیے۔ 1891 میں اس نے اٹلی میں وقت گزارا اور اپنے مشہور ناول
 Quo Vadis کے لیے اٹلی کا سفر کیا۔ اس ماول کی کہانی اگرچہ روم کے شاہنشاہ ہیرو کے مانتھوں پہلی صدی
 عیسوی میں عیسائیوں پر مظالم کے بارے میں ہے مگر اس کو جیرو محدود کے خلاف پلینڈ کے عوام کی جدوجہد
 میں ہنرک کے حصے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ کہانی جو عقائد و نظریات کا پیغام دیتی ہے، بڑی
 کامیاب رہی۔ بیسویں صدی میں اس ماول پر فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں فلمیں بنائی گئیں۔ ایک اور فلم
 چپ جات پال مذہبی اس پر 2001 میں نیلس، پلینڈ اور فرانس میں فلمائی گئی۔

1900 میں پلینڈ کی حکومت نے ہنرک کو ایک جاگیر عطا کی۔ ہنرک کا آخری اہم ماول

(The Teutonic Knights) Krzyzacy, ۱۹۰۰ قرون وسطی کے پوینڈ کے اس ہاں منظر میں لکھا گیا ہے جب پوینڈ کا یونینوں Teutons (یورپ میں ہی آلمانی اور دوسری قومیتوں۔ مترجم) سے تنازعہ چل رہا تھا۔ یہ ناولی جرمنوں کی پوینڈ کے باشندوں کے بارے میں حکمت عملی و نشان دہی کرتا تھا۔ ہنرک کی پٹی اور اس کے بارے میں تیس تھینکھٹھ شائع ہوئیں۔ اس نے 1916 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

نوٹیل نعمات کے لیے ہونے والے کھلے مقابلے میں قومیں اپنے شاعروں وادیبیل کے ذریعے نمائندگی کرتی ہیں۔ نتیجے کے طور پر کاؤن کی طرف سے خط کیے جانے والے انعام صرف اونب کی عزت نہیں بڑھاتے، بلکہ ان لوگوں کی توثیق میں بھی اضافہ ہوتا ہے جنہیں والا جن کا سہوت ہوتا ہے، اور یہ توثیق رس دات کی شہادت دیتی ہے کہ اس میں رد و قوم بھی شریک دار ہے، گویا اس کی کوششیں بار آور ہو رہی ہیں اور اس کو انسانیت کی فلاح کے لیے نقطہ رسنے کا حق ہے۔ اگر یہ عزت انسانی سب کے لیے فلاح کا باعث ہے تو پوینڈ کے لیے یہ در بھی افتخار ہے پاس کا، مٹ ہے۔ یہ کہا جاتا رہا ہے کہ پوینڈ مچکا ہے تمک چکا ہے، غلام ہو گیا ہے۔ لیکن بھیجیے اس نوع کی صورت میں پوینڈ کی زندگی اور اس کی کامیابی کا ثبوت حاضر ہے۔ لوگوں کو غلامی کی طرف سے بچنے پر مجبور ہونا پڑا کہ جب کہ دنیا کو آنکھوں کے سامنے پوینڈ کی کامیابی اور اس کے جوہر قاتل کی ستائش کی گئی ہے۔

یہ ستائش میری نہیں، پوینڈ کی سنی بہت زرخیز ہے اور اس میں مجھ سے بہتر لکھنے والوں کی نہیں یہ دسائیں پوینڈ کی کامیابی اور پوینڈ کے جوہر قاتل کی ستائش ہے۔ اسی بنا پر پوینڈ کا باشندہ ہونے کے ماتے میں سو پیش اکادمی کے امکان کی خدمت میں نہایت عاجزانہ اور پر خلوص تھکاؤ پیش کرنا چاہتا ہوں اور اس مختصر سے خط آپ کو میں Horace کے ان الفاظ پر ختم کرنا چاہوں گا۔

Principibus placuisse non ultima laus est.

ہوزے اینیگارے

اعترافِ کمال۔ متعدد ورثان قمر ہمارے قریب بیٹے کے اعتراف میں جس نے انفرادی طور پر
پورے چھوٹے المان میں ہسپانوی زبان میں ڈرامے کی اعلیٰ مائیت کی تجدید کی۔

انیسویں صدی کے آخری پچیس برسوں میں ہسپانیہ کے سرحد آورہ ڈراما نگاروں میں ہوزے
اینیگارے کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔ ہوزے نے ہسپانیہ کی تمام نئی عمر کے ڈرامے لکھنے شروع کیے تھے۔
اپنی تیسویں عمر کے دوران اس کی طرز نگارش میں بہت کمی تھی۔ ہوزے کی عمر میں ہسپانیہ کی
اعتبار سے اعلیٰ درجے کی ہوتی تھیں، لیکن نہ بیٹا آسمان نوبل اور سیدھے سادے خاکش کے باوجود ان
میں ماضی میں کی دل چاہی آخر وقت تک برقرار رہتی تھی۔ باوجود اس کے کہ انھوں نے اس کے ڈراموں میں
خاصی دل چاہی کی، انھوں نے ان کی دل چاہی اور مصفیوں نے اس کے ڈراموں میں بالکل آمیزش اور حد سے زیادہ
جذباتیت کی وجہ سے نہ صرف شدید تنقید کا نشانہ بنایا بلکہ ان کو ممنوعی اور زکاہ رفتہ قرار دیا۔ اس کے
ڈرامے نورونیت کے عناصر کی وجہ سے اور تاریخی اہمیت کے اعتبار سے اپنے زمانے کے خدائی کی نشان
دہی کرتے ہیں۔ عمر دور و جاہل کے ماضی کے لیے ان میں کوئی خاص بات نہیں۔

ہوزے اینیگارے 1832 میں ہسپانیہ کے شہر میڈرد میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین Basque
سے تھے۔ ہوزے کے والد کو انسی لیٹ آف میڈیکا میں پروفیسر کی خدمت ملنے کی وجہ سے

اس کے اہل خاندان منتظر ہو کر میوریکا میں آزاد ہو گئے تھے مگر ہونے چودہ برس کی عمر میں میڈیٹرائٹس چھو گیا۔ ہونے نے Escuela de Caminos سے 1853 میں انجینئرنگ کی اوماہی اورے میں میڈیٹری کا پروفیسر ہو گیا۔ اس نے میڈیٹری سے متعلق بہت سے مقالے لکھے اور ریاضیت کی بنا پر اس کا سپانیہ کا صفی کا میڈیٹری دارا کیا جانے لگا اس نے انجینئرنگ اسکول میں 1868 تک تدریس کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد وہ منتخب ہو کر سپانیہ کی پارلیمنٹ میں منتخب کیا اور حکومت میں وزیر تجارت کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ ہونے نے سپانیہ کے مالی ادارے Banco de Espana کے قیام میں نمایاں حصہ لیا اور میڈیٹری کے Academy of Exat Sciences کے لیے منتخب ہو گیا۔

ہونے کا پہلا کتاب El Libro Taborano 1874 میں لکھی گئی۔ Jorge Hayaseca y Ezaguirre سے پیش کیا گیا تھا جب اس کی عمر پچاس برس تھی۔ یہ کتاب ہونے نے اس زمانے میں لکھی تھی جب وہ عارضی طور پر ترکی وطن کے وزیر چھو گیا تھا۔ بادشہ و سرفراز میاں نے ملکی گئے ہونے نے درے لکھے کے لیے کسی نہ کسی طرح وقت نکالا اور سلطان ایک برس میں درے لکھے اس کے تقریباً آدھے درے منکوم تھے۔ اس کے متعلق درازوں میں (1874) En La Esposa del Vengador, (1875) Puno de La Espada اور (1877) O Locura O Sanidad شامل ہیں۔ ہونے کے درازوں کے انگریزی زبان میں ترجمے کیے جانے سے اس کو بین الاقوامی شہرت ملی۔ ہونے درے کے مشہور درازوں کا ایک اس سے متاثر تھا مگر بعد میں اس نے اپنے درازوں میں معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا۔

1870 سے 1904 تک ہونے چھاپوں کی زبان کا سب سے اہم اور مقبول دراز تھا مگر نام نہاد

Generation of 1898 کے دانش ور اس کے کام کو متروک سمجھتے تھے۔ ہونے کو King Alfonso XII

نے Order of the Golden Fleece سے نوازا۔ ہونے نے 69 درازے لکھے اور 1916 میں انتقال کیا۔



فریڈریک مسترال

اعترافِ کمال: تازہ کاراج اور حقیقی اگھا سے بھر پور اس کی شاعرانہ تخلیق کے اعتراف کے طور پر، جو پورے شعبوں کے ساتھ قدرتی مناظر و روشنی کی بولی کے ہدیوں کی منظر کشی کرتی ہے اور Provençal زبان کے عالم کی حیثیت میں اس کے قابل قدر کارناموں کے لیے۔

فریڈریک مسترال جنوبی فرانس کے ایک گاؤں Mollane میں ایک خوش حال گھرانے کے گھر پیدا ہوا۔ بچپن کے ابتدائی دنوں میں مسترال کی اپنے علاقے کی بولی Provençal سے جڑوں کی حد تک وابستگی رہی اس کی تعلیم مائیں کا بیچ آف ایجنسی میں ہوئی جہاں اس نے ہومز اور دکانوں کو پڑھا۔ تعلیم کے دوران ہی اس نے اپنی مادری بولی میں نظمیں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ مسترال شاعر بننا چاہتا تھا مگر اس کے دپ کا اصرار تھا کہ وہ پیسے اپنی تعلیم ختم کرے۔ قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مسترال نے ادب کو پیشے کے طور پر اپنایا اور ایک سال کے بعد اس کی ابتدائی نظمیں شائع ہوئیں۔ مسترال کی ابتدائی شاعری فرانس تک ہی محدود رہی تھی۔ ادب کے حلقوں کو مسترال نے اس وقت اپنی جانب متوجہ کیا جب اس کو نظمیں اس کی مقامی زبان سے نکلنے والی شاعری (Provençal 1852) میں شامل ہوئے شائع ہوئے جس کو اس کے استاد Joseph Roumanille نے مرتب کیا تھا۔ مسترال نے سچے استاد اور دوسرے

وہیں کی شرکت میں اپنی مقامی بولی اور اس کے روایات کے تحفظ کے خیال سے Felibres نامی انجمن کی داغ بیل لادی۔ اس انجمن نے Amans Prouvencau نام کا ایک مجلہ جاری کیا۔ وہ بولوں کی اس انجمن کا نعرہ تھا The sun makes me sing۔

1859 میں مسٹر مائی مائی شان مرغیو (Pastoral) شاعری پر مبنی کتاب Mireio شائع ہوئی جو مقامی بولی کے باب میں ایک اہم اضافہ تھی جس کی بدولت Provençal بولی کے بارے میں لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ مسٹر ال نے اپنی تصنیف کا مسودہ سیاست دان اور شاعر اندریس ڈی لامارین (1790-1869) Alphonse de Lamarone کو دکھایا جس کی ہمت فرائی نے اس کی کامیابی کی راہیں کھول دیں۔ بعد میں موسیقار Charles Gonoud نے مسٹر ال کی ایک نظم اپنے ہیرو میں بھی استعمال کی۔ شاعری کے میدان میں اس کی آمد کے بعد مسٹر ال چیرس کو نثر، ہدایت، کہانیاں، گانوں، داستانیں چڑھ گئیں جہاں وہ اپنی آخری سانس تک، پہلے اپنی ماں کے ساتھ اور شاہی کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ رہا جس سے اس کی شادی 1876 میں ہوئی تھی۔ مسٹر ال نے جیس سال کا عرصہ اپنی زبان کے تحت Lou Tresor Dou Felibge کی تیاری میں صرف کیا۔ اس لغت میں Provençal کی ساری بولیاں اور ان سے متعلق لوگ کہانیاں، روایات اور عقائد شامل تھے۔ Provençal زبان میں عہدہ مہر قدیم کا آخری ترجمہ بھی کیا گیا تھا۔

انیسویں صدی کی آخری دہائی میں مسٹر ال کی طویل بیانیہ نظم Neno شائع ہوئی جو پاپائے روم کے ایگنسی میں آخری دن دنوں کے بارے میں تھی۔ مسٹر ال نے صرف ایک کھیل Le Reino Jano لکھا تھا جو 1890 میں شائع ہوا۔ مسٹر ال کی آخری بڑی اور شاندار نظم Lou Pouemo Dou Rose (1897) تھی جو دھاتی جہازوں کی بیجا دہشت گردی کے اس کے عدالتی کے شہنی دنوں کے بارے میں تھی۔ مسٹر ال کی دوسری تصنیفات میں اس کی یادداشت پر مشتمل Les Mous Espetido اور (1906) Olivadou تھی جس میں اس کی مختلف نظمیں جمع کی گئی تھیں۔

مسٹر ال نوبل انعام میں ملنے والی رقم سے مرنے والی آمدنی کا بیش تر حصہ سبیل بخاری (Ehnography) کے اس عجیب گھر میں صرف کر دیتا تھا جو اس نے Anes میں قائم کیا تھا۔ مسٹر ال نے 1914 میں انتقال کیا۔ اس کی موت کے بعد تین جلدوں پر مشتمل اس کی نثر کا مجموعہ S Almanach (1926-30) شائع ہوا۔

بیورو سٹریس نے مارٹینس بیورو سٹریس

اعتراف کمال۔ اس کو اسی درجے کی عظیم الشان اور ہمہ گیر شاعری کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے، جو ہمیشہ اپنے جھنڈے کی نازدکاری اور ہندوں کی غیر معمولی مہارت سے منور ہوئی ہے۔

کسی ملک کا قومی نغمہ بیورو سٹریس کے اس گیت ”بار! بھیس اس ملک سے محبت ہے“ سے زیادہ بھد کیا خوب صورت ہو سکتا ہے۔ اور جب کوئی Armpoi Gelline جیسے، بلکہ گیت ”گلانا“ سے، جس کے نال میں اٹھتی ہوئی ہر دس جیسے، جہاں ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ دونوں ہر دس آنے والے وقت کی چھٹکی ہوئی چاندنی میں ماڈے کے ماحولوں پر ہمیشہ اس عظیم شاعر کے گیت گایا کریں گی۔ ایک غنائی شاعر ہونے کی حیثیت سے بیورو سٹریس اپنی نازدکاری اور مہارت کی بنا پر قابل تقلید تھا۔ اس کی نظمیں کبھی نہ ختم ہونے والے انسانی خزانے کا ایسا جوا تھیں کہ ان کی غمگینی سے متاثر ہو کر بہت سے موسیقاروں نے ان کو اپنی موسیقی کی وضوئوں اور گیتوں میں استعمال کیا۔

بیورو سٹریس 1832 میں ماڈے کے ایک پادری کے گھر پیدا ہوا۔ کرسنیا کے جس سکول میں اس نے بنیادی تعلیم حاصل کی اس میں سکینڈی نیویو کا سب سے مشہور لڑکا، نکا رینڈرک اسن اس کا ہم کتب تھا۔ بیورو سٹریس ماڈے کے قومی تحریکی تحریک کے بانیوں میں سے ایک چاہی تھا۔ اس نے کچھ غنائ کیں بھی کھیں

تھے مگر وہ کچھ شائع نہیں ہوئے۔ اپنی تعلیم کے زمانے سے ہی یونرسنی نے اپنی تنقید لکھنے کی ضرورت محسوس کی اور کئی اخبارات کے لیے تنقیدی مضامین اور کہانیوں بھی لکھیں۔ 1857 سے یونرسنی کی ادبیات سرگرمیوں کی شروعات ہوئی جب اس نے نارنجی قومیت کا کھیل *Mellem Slagene (Between the Battles)* لکھا اور برٹس (*Bergen*) کے ماہر تھیں تعمیر میں اسٹیج ڈائریکٹر ہو گیا۔ اس کے کچھ دنوں بعد یونرسنی نے قومی سیاست میں حصہ لیا شروع کیا اور اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو نارنجی لیے لکھنے میں اور *Anne (1858)* *En Glad Gut (1860)* جیسی اپنے ملک کی داستانیں تخلیق کرنے میں تقسیم کر دی۔ ادب کی دونوں قسموں میں طبع آزمائی سے وہ اپنے بے ندان عصری مسائل اور داستانوں کے ہیروؤں سے اپنا تعلق ناظر قائم رکھنا چاہتا تھا۔

1860 سے 1863 تک یونرسنی نے سیاحت کی جس میں زیادہ وقت اس کا انگلی میں گزرا جہاں وہ انگلی اتحاد اور چھائی فن بصر سازی سے بہت متاثر ہو۔ انگلی کا اس کا دوسرا سفر 1873-75 میں ہوا جس کے اثرات نے یونرسنی کی تخلیق کا رخ حقیقت پسندی اور معاشرتی مسائل کی جانب موڑ دیا جس کے نتیجے میں یونرسنی نے 1875 میں دو ڈرامے *En Fallt (The Bankrupt)* اور *Redakøren (The Editor)* تحریر کیے اور ایک ڈراما *In Kogen (The King)* 1877 میں لکھا۔ ان ڈراموں میں یونرسنی نے اس زمانے کے غیر مذہبی معاشرے کے باطنوں عیسائی نسب الہی کی پامانی کو اپنا موضوع بنایا اور اس سے متعلق تنقید نے اس کو ایک ایسے مذہبی پیمانے میں جتنا کر دیا جو کلیسا سے اس کی پیمائش کا سبب بنا۔ 1882 میں یونرسنی *En Hamske (A Gauntlet)* 1883 میں ایک ڈرامہ *En Hamske (A Gauntlet)* تحریر کیا جس میں اس نے جنسی معاملات میں منافقت کے ساتھ ساتھ مذہبی لوگوں کے داخلی پن پر حملے کیے۔

بعد کے برسوں میں یونرسنی نے معاشرتی اور اخلاقی ناول *Det Flager i byen og på havnen (1884 The Heritage of the Kure)* اور *Fa Guds veie (1889-In God's Way)* *Over oevne, annet stykke (1895- Beyond Human Power)* تحریر کیے جن کے مرکزی موضوعات نفسی اور مذہبی معاملات میں برداشت پر مبنی تھے۔

یونرسنی کے آخری دو ہم لڑاموں میں سے پہلا *Paul Lange og Tora Parsberg*

(1893) تھا جس کا مرکزی موضوع سیاسی معاملات میں برداشت اور لاعلمی *Norden nym (When the New Wine Blooms)* 1909 تھا۔

نوجیسوں پر مشتمل یونرسن کی ساری تحریریں 1919 میں شائع ہوئیں۔ یونرسن نے 1910 میں

نفاذ کیا۔

ضیافت سے خطاب

مجھے پورا یقین ہے کہ یہ نوع جو آج مجھ کو مدعو کیا جا رہا ہے، عوام کے نزدیک ایک قوم سے دوسری قوم کے لیے ایک متحدہ سمجھ جائے گا۔ میں کہتا چاہوں گا کہ شمالی اتحاد میں ماروے کی شہریت کے لیے کی جانے والی اس طویل جدوجہد کے بعد، جس کی سوئیڈن وائس نے یونائیٹڈ کنگڈم سے مخالفت کی تھی اور جس میں ماروے کے لیے براہ راست کا درجہ حاصل کرنے کے لیے میں بھی ٹریک تھا، مجھے یقین ہے کہ یہ چاہنے کے فیصلے کا سرا سوئیڈن کی جانب نظر کرنے کے سرچاتا ہے۔

اس وقت ایپ کے کردار پر مختلف خیالات پیش کرنے کا موقع فراہم ہونے پر میں بے پناہ خوش محسوس کر رہا ہوں۔

انتخاب کے فیصلے نظر میں رکھ کر ایک ایسا مقرر پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا جو پچھت سے ہمیشہ اس وقت میرے ذہن میں ابھرتا رہا ہے جب بھی میں نے شمالی اتحاد کی باب سرچنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقرر کو میں ایک ایسے لائق نامی جوں کی صورت میں دیکھ رہا ہوں جس میں مرد و عورت دونوں مراعات ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ جس نظام میں وہ پیش رہے ہیں، اگرچہ بالکل سیدھی نہیں پھر بھی وہ آگے آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ایک ناقابل مدافعت طاقت، جو اب ہم میں جہلی ہے مگر (رفتہ رفتہ) زیادہ سے زیادہ شعور کی بھرتی جا رہی ہے، ان لوگوں کی بہت انزائی کر رہی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسانی ارتقا ہمیشہ کسی شعور کی کوشش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پورا آج تک ایسا کوئی گز بھی نہیں سکا ہے۔ شعور کا ارتقا اور شعور کی طور پر آگے بڑھنے کی یہ کوشش ایک ایسے علاقے کے مانند ہے جس پر دونوں جانب سے دباؤ ہے۔ کسی کا جو نہ ہو۔ ہم میں سے کچھ یہ بھی ہیں جن میں ناقابل سائنس کی خدا نادر صلاحیت خود ذاتی ہے کہ وہ بہت دور تک ان ماحول کو دیکھ سکتے ہیں جس پر انسانی ارتقا کا سفر چارل مین وال ہے۔

کوئی بھی شے آج تک ہمارے شعور پر اتنی حد تک سے اثر انداز نہیں ہوئی جس طرح ہمارا یہ عم کہ خیر کیا ہے لاؤ شریک ہے۔ خیر اور شر کا احساس اس طرح ہمارے شعور میں جا گزریں ہو چکا ہے کہ اس کو بھول کر آج تک کوئی بھی ممکن نہیں ہو سکا۔ اسی لیے صرف یہ خیال ہی مجھ کو چکا کر رکھ رہا ہے کہ ہم انہوں کو خیر اور شر کے احساس سے دور ہو کر قلم اٹھا چاہیے۔ اس طرح کے استدلال کا نتیجہ تو یہ ہو گا کہ ہمارے ذہن پر یہ کیمروں میں تھریں ہو جائیں گے جن کے نزدیک خیر اور شر کچھ اسی طرح ہوں گے جیسے کہ حسن اور بد صورتی۔ میں یہاں اس بات پر زور دیتا ہوں چاہتا کہ جدید انسان، چون کہ خود کو ایک ہوش مند وجود سمجھتا

ہے اپنے ذہن سے اس شعور کو جھٹک سکا ہے جو اس کی لاشوں پر اس کی وراثت ہے اور جس نے انسانیت کی نسوں کی موجودہ زمانے تک رہبری کی ہے۔ میں اس منزل پر صرف یہ سواں گراماچوں کا کہ وہ لوگ جو اس قسم کے نظریے سے اتفاق کرتے ہیں وہ آخر کسی اور طرح کیوں نہیں سوچتے؟ کیا ان کی پسند خفاشیائیں انداز میں ہے؟ ان کے تصور میں آنے والے مناظر ہمیشہ کی طرح بلا معینے والے کیوں ہوتے ہیں؟ کیا ان لوگوں کو یقین ہے کہ دراصل جو کچھ بھی وہ سوچتے ہیں، وہ خود نہیں سوچتے؟

میرے خیال میں ہم کو کسی جواب کے انتظار میں نہیں رہنا چاہیے۔ یہ لوگ صدیوں پرانے ان خیالات اور تصورات کو بھڑبھڑاتی سے راد نہیں ہو سکتے جو ان کو وراثت میں ملنے والی اعتدالیات کو دین ہیں۔ ہم میں اور ان میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ ہم اس قسم کے (جدید) خیالات کے لیے کام کرتے ہیں جب کہ وہ ان کے خلاف رجحانات کی پوشش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اس مقام پر مجھے کوئی بات کا حق نہیں رہتا چاہیے، جیسے کہ یہ ہر نظر آتا ہے، کہ سب کچھ غیر اعتدالی بھی نہیں۔ آج ہماری رہبری کرنے والے بہت سے خیالات اور تصورات ماضی میں اعتدالی سمجھے جاتے تھے۔ دراصل میں یہ کہتا چاہ رہا ہوں کہ وہ ادیب جو اپنی تحقیقات میں جانب داری اور متعصب کردار کرنے کے دعوے کرتے ہیں خود ان کا کہنا ہو ہر لفظ جانب داری اور مقصد ہے۔ کی فائنل کرنا ہے۔ یہ دکھانے کے لیے کہ ایک ادیب روحانی آزادگی کے لیے جتنا نااہل ہو چکا ہے اس کی تحریراتی میں جانب داری نہ ہوتی ہے۔ میں اعتدالیات کی تاریخ سے بے شمار مثالیں نکال کر پیش کر سکتا ہوں۔ یونان کے عظیم شعرا افانی اور غیر افانی دونوں اقل مر کی شخصیتوں سے متعلق ہوتے تھے۔ شکسپیر کے کھیل ان عظیم نیوانی عموں، (ایکینڈی نیوانی اسٹیلر کے مطابق قدیم ترین مہارت، جنگ میں مارے جانے والوں کی دھم دھم میں مافی طور پر خیالات رقی رہتی ہیں۔ مترجم) جیسے تھے جن میں کبھی تو چٹیل دھوپ چٹیل ہوتی تھی اور کبھی طوفانی بھڑپتے تھے۔ اس کے نزدیک دنیا ایک میدان جنگ تھی مگر اس کے شر نہ جذبہ نہاد کا احساس، نقدی کے بارے میں اس کا افسانہ جیتنے ہی تھا جس کے نہ ختم ہونے والے وسیلے جنگوں میں اس کی رہنمائی کرتے تھے۔

ہم Moliere اور Holberg کے کرداروں کے بھوت سے جتنی دہچا ہیں ان کی قیروں نکال سکتے ہیں مگر سوائے اس کے اور کیا نظر آئے گا کہ اپنی بد بیئت حرکات اور ملکات والے بیولے، جھلکے دار تاریخی ماسوں اور مصنوعی بالوں کی ٹیپوں میں ملیں، جلیوں کی شکل میں اپنے فانی انہماک دینے جا رہے ہیں۔ یہ لوگ بھی تو اتنے ہی جانب دار تھے جتنے کرٹھن۔

میں نے ابھی نیوانی مہارت کا ذکر کیا تھا۔ تو کیا گھنٹے اور پھر نے اس میں Elysian texts کی جنت کا تصور شامل نہیں کیا ہے؟ ہم شاید یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فوجیان Tegner Werglenad Oenischlager بہ فمیل بائٹ اور جوئس کے میدان میں چٹیل نزم نزم اور چٹیل دھوپ کی آگ سے سرشار ہوئے تھے، سب میں نیوانی دیوتاؤں کا پرتو نظر آتا تھا۔

یہ نانا اور یہ بڑی سب ماضی ہے جس کا مقام پر میں وہاں کی شخصیات کا تذکرہ ضرور کرنا چاہوں گا جو اس کا حصہ ہیں۔ سب سے پہلے میں مادرے کے بچے ایک۔ پرانے دوست کو یاد کرنا چاہتا ہوں جو آج کل محب ہے۔ اس نے مادرے کے کئے پئے (ادبی) سرائیں پر، مدحوں و نکروں غلوں کی آگاہی کے لیے نورافشاں کرنے والے پہ شمار (دب پاؤں کے) ستارے روشن کر رکھے ہیں۔

میں مشرق میں واقع ایک پرانی ملک کے اس عظیم بزرگ کو بھی یاد کرنا چاہتا ہوں جس کو (تحقیقات کی) روشنیوں کی چمک بہتوں کہرت و شادابی سے سرشار کرتی ہے۔ ان دنوں کے جذبے، ان کے محسوس پر محیط کام کی فہمیں، شام کی ہنسی ہوئی ہو کہ میں شعبے کے مانتا، ایسے مقصد کے لیے روشن و غنی تھیں جو خود کیں نیا دور روشن تھا۔

بھی میں نے فن پر شعور کے میلانات کے ن اثرات کی بات نہیں تھی بڑی ہے جو میں کو بتا بھی سکتے ہیں، تاب نہ بھی کر سکتے ہیں۔

اگر شعوری میلانات اور فن و فنون مناسب ہوں تو سب کچھ ٹھیک ہوتا ہے۔ جن دو عظیم ادیبوں کا میں نے ابھی تذکرہ کیا ہے، ان میں سے پہلے کی تنہا تکی شمع ہیں کہ ان سے ایک کو نہ خوف آتا ہے۔ اور دوسرا جو ہے وہ اپنے انسانی فہم سے ماوا اور فکر انگیز حسنِ کلام کے بحر سے قاری کو اس طرح مستغرق کرتا ہے کہ اس سے بھی خوف آنے لگتا ہے۔ لیکن ضروری تو اس میں ہے کہ ہماری زندگی کی بہت تو نا ہونے کہ کم نور۔ کہیں خوف ہم کو اپنی سامنے پھٹنے والے راستے پر آگے بڑھنے کے بجائے واپسی پر مجبور نہ کر دے۔ لہذا جلوس کو دیاں رہتا چاہیے۔ ہم کو، اعتماد ہونا چاہیے کہ زندگی بنیادی طور پر اچھی چیز ہے، کر دہلا دینے والے حادثات و رشیدیہ امین واقعات کے باوجود بھی کہہ ارض تو مافی کے ایسے سیلاب میں تہیو ہوا جس کے وسائل ابد تک قائم رہنے والے ہیں۔ یہ مانتیں ہی اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

موجودہ دور آئینہ ترین زمانے میں وسطیہ گوئیہ راسخ رہا ہے۔ اس کے میر معنوں تصورات کے پرتاب میں یہ عقیدہ کارفرما ہے کہ زندگی ہمیں ہے اور یہ ماتم عقیدہ ہی اس کی تحریریں میں رنگا رنگ کا سبب ہے۔ ایسے بھی بہت ہیں جو اس کی کم زوریوں کی بات کرتے ہیں، اس کے لڑائی رہنمائی پر انگلی اٹھاتے ہیں۔ اٹھاتے رہیں! میرے نزدیک تو اس کی جیتنے پہنچنے کی خواہش ہی اس کی تمام کم زوریوں کی زد و ہے۔ اپنی بقا کے تحفظ کی جہت ہمیں اس قسم کے دے پر مجبور کرتی ہے، وہ نہ زندگی میں شرم اور شرمناک وہ ہوتا تو اس کا خاتمہ سب کا ہو چکا ہوتا۔ زندگی کی کوئی بھی تصویر ایسے تصور سے دور ہو تو وہ مستح شدہ تصویر ہو گی۔ یہ تصویر ہی غلط ہے کہ زندگی کے تاریک پہلو ہی ہمارے لیے خوابی کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں۔

یوروے اور مشاد پرست لوگ زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا نہیں کر سکتے، جب کہ ایک عام انسان کر لیتا ہے۔ اگر وہ لوگ بھی جو ہم کو نر مندہ سماں لہنا چاہتے ہیں، وہ بھی یہ وعدہ کر سکیں کہ خواہ کچھ بھی ہو، زندگی میں ہمیں دینے کے لیے خوشیاں بھی ہیں تو ہم اپنے آپ سے نہیں گے کہ چہوں وقت ہم انھیں میں

ہیں اور یہ وقت اتنی چلے گا اور ایسے پُر سر رانہ زندگی، جو ہماری زندگی کا حصہ ہیں، مصنف کی مرضی کے مطابق ہمارے جذبات کو خوف و تفریح کے لیے اکساتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ادیب صرف ایک قسم کی منہنی سے زیادہ کچھ حاصل نہیں کر پاتے بلکہ کبھی کبھو تو اس میں بھی ناکام رہتے ہیں۔ اور ہم قاری تو دہرے گھٹے میں رہتے ہیں اس لیے کہ وہ تو زندگی کے بارے میں مصنف کا وہ بہت منفی ہونا ہے مایا یہ کہ ہمارے دھڑکنے کی علامت نہیں رکھتا۔ مایا کوئی کوفت کا بھوش باعث ہوتی ہے!

انسان اپنے کاموں پر جتنی بڑی قدر داری دیتا ہے اس سے عہد ویر ہوئے کے لیے اس کو تھا ہی توانا ہونا چاہیے۔ اگر کوئی ہمت رکھتا ہے تو اس کے لیے نہ مایا کا قائل ذکر ہوگا نہ مایا کی عمل اس کی منتقامت سے مایا ہوگا اور نہ مایا کی منتقامت اس کی قوت بیان سے دہر ہوگا۔

ہم فن میں ایک باجمہد زندگی کے متلاشی ہوتے ہیں۔ شہادہ والی سے تپنے والے شہنم جیسے چھوٹے سے قہرے میں ہو یا تجربے والے صیہب طوفان میں۔ اس کو پا کر ہم نہ کہن، اور نہ پائے جھیں ہو جاتے ہیں۔

ہمارے شعور میں مضبوطی سے جمے ہوئے کچھ اور مدھ ہوئے کے قریب وہ خیالات نے ہماری زندگی کے ہر شعبے میں اپنا کرنا رانا کیا ہے، یہ ہمارے طرہ علم کے عمل میں بھی اور زندگی کی شفا میں رہا ہے۔

میں میرا مقصود ہے، ایک فرماں بردار اور پُر حوش کارکن کی طرہ میں نے جس کے دفاع کی کوشش کی ہے۔ میں اُن میں سے نہیں ہوں جو اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ایک ادیب، ایک فن کار کسی قسم کی ذمہ داری سے مبرا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، ادیب یا فن کار کی ذمہ داری ایک عام انسان سے بڑھ کر ہوتی ہے اس لیے کہ وہ کاموں میں سب سے آگے ہوتا ہے اور اسی کو مقصد میں چھنے والی کی متبرکی سرفی چاہیے۔

میں اس سمت میں کی جانے والی کوششوں کے برابر جانے کے لیے سوینڈش کا فن کا ہے حد شکر گزار ہوں اور اس کی جانب سے صحت مند و رہنماد ادب کی ترقی کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کی کامیابی کے لیے ایک جامہ تجویز کرتا ہوں۔

کر سچین متھائس تھیوڈور موسین

اعتراف کمال: فقیر تاریخ فکی کے عظیم ترین بقیر حیات ماہر، بالخصوص اس کے یادگار کام A History of Rome کے لیے۔

جس سال جرمن خانہ دربار تاریخ ماں موسین کو نوبل انعام کا مستحق قرار دیا سی سال یو
 ڈالٹونے کا نام بھی زور شور سے زیر بحث آیا تھا مگر ڈالٹونے کو اس اعزاز کے قابل سی نہیں سمجھا گیا
 کہ فیصلہ کرنے والے اس کے اتنا پسند حیات کو کی طرح بھی قبول کرنے پر راضی نہ تھے۔ باوجود یک
 بلند پایہ ادیب ہونے کے ڈالٹونے دنیا کے سب سے بڑے اولیٰ اعزاز نوبل انعام سے محروم رہا جو سی
 ڈالٹونے ہی میں گیا، غرور میں قابل احترام اعزاز مانا گیا ہے۔ 1910 میں ڈالٹونے کا انتقال ہو گیا اور
 وقت نے اس کو حق بہلت نہ دی کہ نوبل انعام کا فیصلہ کرنے والے وقت نہ مرنے کے بعد شاہ پٹے سے
 تبدیل کر سکتے۔ گرچہ موسین کی سب سے نیر وہ دل چاہش رومن لا Roman Law میں تھی مگر سی نے
 عصر کی سہا ست میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا۔ ہسٹریک نے قوم کی کمر توڑ دی ہے موسین نے لکھا، جب
 جرمنی کے جمہوری حاکم چانسلر ہسٹریک (Chancellor Eismark) نے رومن کو اپنے ملک کا دار الحکومت
 بنانے کا اعلان کیا تھا۔ موسین نے مزید لکھا ہسٹریک کے عہد کا لگا ہوا زخم، نقصان کے اعتبار سے، اس
 کے فوائد کے مقابلے میں لامحدود ہے۔۔۔ جرمن شخصیت اور جرمن سوچ کی مٹوئی وہ بد قسمتی ہے جس کا زوال

کبھی نہیں ہو سکے گا۔ تین جلدوں پر مشتمل چھ کتاب (1854-56) Romische Geschichte کے حوالے سے موسیقی ایک تاریخ کی حیثیت سے مشہور ہوا تھا۔

گرچہ موسیقی 1817 میں جرمنی کے شہر Garding Schleswig میں پیدا ہو۔ اس کا باپ میراثی پروفیسر فارتے کا ایک مذہبی رہنما تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو جرمن زبان کے کلاسیکی ادب پڑھنے کے علاوہ وکٹر جیو، لاربا برون، ولیم شیکسپیر جیسے مشہور ادب کا بھی پختہ مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ موسیقی نے کیل (Kiel) یونیورسٹی میں فیم نبلس (Philology) اور فلسفہ قانون کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے دوران ہی اس نے اپنے دو بھائیوں کی شرکت میں نیکسوں کا ایک مجموعہ Jederbuch Dreier Freunde شائع کیا۔ 1844 سے 1847 تک موسیقی نے اٹلی اور فرانس میں آثار قدیمہ کا مطالعہ کیا۔ 1848 میں موسیقی لایپزگ یونیورسٹی (Leipzig University) میں قانون کے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہو۔ اس سال ہی نے ایک آزاد خیال اخبار کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔

یونیورسٹی کی طرف سے اس کے عہدہ موسیقی کو Saxony میں ہونے والی شورش میں حصہ لینے کی پاداش میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دینا پڑا۔ 1852 میں اس کو زیورخ یونیورسٹی میں قانون کے پروفیسر کی عہدہ سونپا گیا۔ موسیقی نے بعد میں بریسل (Breslau) میں بھی قانون کے پروفیسر کی حیثیت سے اور برلن یونیورسٹی میں عہدہ قدیم کی تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے پڑھایا جو عہدہ تا دم مرگ جاری رہا۔ 1854 میں موسیقی نے ایک کتاب قریش کی لڑائی سے شادی کی اور اس سے ملے بچے پیدا ہوئے۔

سیاسی میدان میں بھی موسیقی کافی متحرک رہا۔ اس نے 1873 سے 1879 تک پروشیا (Prussia) کی پارلیمنٹ میں پروٹریو پارٹی کے رکن کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ پروشیا کے جرمنی سے اتحاد کے بعد موسیقی جرمنی کی شاہی پارلیمنٹ کا رکن بھی منتخب ہوئے۔ 1882 میں اس پر جرمنی کے چانسلر ایلو ہسمارک کا ایک سیاسی تقریر کے دوران بہتان تراشی کی پاداش میں مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمہ بری ہو گیا۔

موسیقی جرمنی کے اتحاد کا سرگرم حامی تھا مگر اس سے ظہور میں آنے والی نوکری شاہی مہم جویت اور غلامانہ ذہنیت جیسے مضمرات اس کو قبول نہ تھے۔ موسیقی نے یہود دشمنی (Anti-Semitism) کی تحریک پر شدید حملے کیے جو بدقسمتی سے اس کے بیشتر دوستوں میں بھی عام تھے۔ جب 1879 میں ایک جرمن قدماء پرست اور قوم پرست عالم اور محقق نے ایک جائزہ پیش کیا جس کے مطابق یہود دشمنی جرمنوں کی نفسیاتی کیفیت ثابت ہوئی اور اس نے یہودیوں کے خلاف تحریک کو صحیح قرار دیا تو موسیقی نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اس کا ایک دن یہود دشمنی و دہشت گردی اس طرح بد توڑ جائے گی کہ لوگوں کے دلوں میں یہودی تہذیب کے لیے احرام کے جذبات پیدا ہوں گے۔

موسیقی نے متن کے انہماک سے اتفاقاً دینی مادہ چھوڑا۔ اس کے بارے میں تعلیمات کے ایک بزرگ راہنما جات ملتے ہیں۔ موسیقی مائیکس تحقیق کا بہت احادی تھا اور تاریخ کے سلسلے میں مددگار مائیکس

(Auxiliary Science) پر اس کا علم بہت وسیع تھا۔ موسیقی کی تحریر، رومن تاریخ The History of Rome کی پڑتائیں، رومن طرز میں لکھی ہوئی کتب، قلعہ بندی، چھپائی، قلعہ بندی سے رومن جمہوریہ کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہیں۔ موسیقی کے اس کام سے سارے یورپ میں اس کا وقتاوت پیدا ہوا، اس سلسلے میں اس کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا مگر اس نے جدید یورپ کا قدیم رومن عہد سے سوا نہ کرتے ہیں حالانکہ صحافتی اخلاقیات دیکھا ہے جو ایک تاریخ دان کو زیب نہیں دیتا۔

شہر میں تو موسیقی کی کتابیں بہت کم نمونہ تھیں اور ویسے ہی درجہ بندی و فن میں گراں قدر ہیں۔

موسیقی نے 1903 میں انتقال کیا۔



سلی پرودہوم

اعترافِ کمال۔ اس کی شاعرانہ تخلیقات کی خصوصی قدر شناسی کے لیے جو بلندی صیاد، فنی کمال اور دل و دماغ کے مابین اتصال کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔

جب الفریڈ ٹوئٹل نے ایک خطیر رقم کا عطیہ دینے کا ارادہ کیا تو اس کی ساری زندگی کی فطرت بینی جو اس میں اس کی عمر تک بنی تھی، اس کے پیش نظر تھی جس کے سبب اس کی شاعرانہ تخیل کہ سائنسی دریافت کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی چاہیے۔ ہند ٹوئٹل نے اپنے وسیع اشعار و خواہشات کی تحکیم کے پیش نظر اپنی تاریخ ساز وصیت میں من و رقموں کی برادری کی بھلائی کے لیے سائنس کے ساتھ ساتھ ادب کے شعبے کو بھی اہمیت کے لیے شامل کیا۔

ٹوئٹل خاندان کی تاریخ میں علی پرودہوم پہلا شاعر تھا جس کو اس اعزاز کے لیے چنا گیا۔ پرودہوم کے انتخاب کے سلسلے میں کافی تنازعہ پیدا ہوا تھا اس لیے کہ 1800 کے بعد سے اس کا کچھ نہ وہ کلام شائع نہیں ہوا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ آج بھی پرودہوم دنیا میں کیا خود فراموش میں بھی بہت کم پڑھا جاتا ہے۔ پرودہوم کی ابتدائی شاعری دنیا کا غنائی، مگر اندرونی سے محسوس مظهر دکھاتی ہے۔ بعد کے مجموعوں میں اس نے اس کتب ادب کے علمبرار اور غیر شخص تکلیک کو استعمال کیا جو وہ انوکھت کی خواہاں جذباتیت کے خلاف تھا۔

رہے فیاض عثمان نسلی پرودہوم 1839 میں جرمنی میں پیدا ہوا۔ پرودہوم صرف وہ جرمن کا تھا جب

س کے باپ کا انتقال ہو گیا اور اس کی پرورش اس کے چچا کے گھر ہوئی جہاں اس کی ماں بھی انتقال ہو گئی تھی۔ پروڈیوم کا باپ سنسکی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ پروڈیوم نے جب ادب کے میدان میں قدم رکھا تو اپنے باپ کی معرفت کو اپنے ادبی نام کا حصہ بنا لیا۔ انہوں نے تعلیم کے دوران پروڈیوم کا ایک ادب اور میڈیسن میں طبی چھٹی لیا تھا عمر چھٹھوں کے شدید عارضے کے لاحق ہونے کی وجہ سے اس نے انجینئرنگ پڑھنے کا خیال ترک کر دیا۔ Lycee Bonaparte سے گریجویٹ بننے کے بعد اس نے ایک صنعتی ادارے میں خط کتابت کی عہدہ سنبھال لی۔ پروڈیوم نے 1860 میں قانون کی تعلیم بھی حاصل کی اور کچھ دنوں کے لیے ایک دستاویز کی تصدیق کرنے والے کے ساتھ کام بھی کیا۔ محبت میں ماکائی کی وجہ سے اس نے شادی کا ارادہ ترک کر دیا اور ساری عمر کنواری ہی میں بسر کر دی۔ شام کے اوقات میں وہ فلسفے کا مطالعہ کرتا اور شاعری کرتا، پس بس اس کا روز کا معمول تھا۔ پروڈیوم کی شاعری کا پہلا مجموعہ Stances et Poemes شائع ہوا تو اس کی عمر چھٹیس سال تھی۔ افسرین سے خیر پودا کی نقلوں کا مجموعہ کافی مقبول ہوا جس میں اس کی بہترین نظم "شکستہ گلدن" (The Broken Vase) بھی شامل تھی۔ پروڈیوم کی نظمیں Le Farnasse Contemporain میں گلدن شاعری میں شامل کی گئیں۔ درجہ میں Les Ecumes, Croquis Italiens (1856-68), Les Soixantes اور D'Augas (1866) کی مجموعوں میں بھی اس شاعری کا انتخاب پیش کیا گیا۔

پروڈیوم شاعری کے کلاسیکی معیار کی بھائی کا بہت خواہش مند تھا۔ وہ رومن شاعر اور فلسفی Lucretius (99-55 BC) سے بہت متاثر تھا۔ اس نے Lucretius کی شاعری کی پہلی جلد کا منظوم ترجمہ کیا اور اس کو اپنے پیش نظر کے ساتھ شائع کیا۔ پروڈیوم نے Lucretius کے فلسفہ خیالات کو اپنی شاعری میں پیش کرنے کی کوشش کی گرچہ وہ کبھی کبھی سمجھ سے بالاتر ہو جاتے تھے۔ اس صورت حال میں پروڈیوم نے ماسمانہ انداز میں تشبیہات کا مستند شروٹ کیا اور بجائے اس کے کہ قارئین کو خود سمجھنے کا وقت دیتا، اس نے اچھا استعمال کردہ علامات کی تخریج بھی کی۔

فرانس اور پریشا کے درمیان جنگ کی شروعات پر پروڈیوم فوج میں ترقی ہو کر اس نے وہاں کے اپنے تاثرات اور تجربات کا شمار اپنے مجموعے Impressions de la Guerre (1870) میں کیا۔ اسی سال اس کی ماں، اس کے چچا اور چچا کا انتقال ہو گیا اور شو پروڈیوم کی بھی فلاح کا اثر ہو گیا جس سے وہ بغیر زندگی بھر شہر و زمانہ میں اس عمر میں اس کے مجموعے Les Vaines Tendresses (1875) اور La Justice (1878) شائع ہوئے۔

1881 میں پروڈیوم فرانچ اکیڈمی کے لیے منتخب ہو گیا۔ پروڈیوم کے آخری دور کی تخلیقات میں چار بزرگ مجموعوں کی اس کی ایک طائی شان نظم Le Bonheur شامل تھی جو فاسٹ Faust کی طرح علم اور محبت کی تلاش بھی تھی اور ایک منصفیانہ مائٹھی نظر تھی کرنے نامہ پوشش بھی۔ اپنی نظم Le Testament

(1900) Poésie میں شاعری نے عرصہ مت نگاہوں اور آواز قلم نگہنے و غلوں پر اعتراضات کیے ہیں۔ ہا
 Vraie religion Selon Pascal قلم بے پاسکال Blaise Pascal کے عیسائی نظریات پر مبنی تھی جب
 کہ (1906) La Psychologie de libre Arbitre میں شاعر کہتا ہے کہ آزاد اختیار انسان کی فطرت کا
 بنیادی عنصر ہے، اس لیے یہ ضرور بالترتیب رو سچائی پر مبنی ہونی چاہیے۔

سوی پر دو ہوم کا عرصہ کے شروع 1907 میں، نقاب ہوا۔ اس نے توکل انعام میں مکتبہ والی باقی ماندہ
 قلم تحریرتے ہوئے شاعریوں کی نئی کتاب کی اشاعت میں مدد دینے کے لیے فرانسیسی ادیبوں کی انجمن کو
 عطیے میں دے دی تھی۔



اشاریہ

۲۲۵ Andre Lwoff

بارخ آویر ۳۳۹

نجر آفیجے ۳۱۹

الف

۲۲ Abram Fischer

امعزی، بیانیگی ۱۹۷

پاسی، ہنری ۶۲، ۵۳۹، ۶۱۰، ۶۷۸، ۶۸۹

۵۳، ۱۰۷، ۱۲۷

اپا نو ۳۰۹، ۳۵۹

۶۸ Epigones

۳۹۰ Achmatova

اختاطون ۱۹۳

ارسطو ۱۸۰

۸۶ Ars Poetica

اراسی ۵۸۶

۱۵۳ Armond Bernard

آ

آرچر ۱۳۳

۴۳ Archibald Meleish

۳۱۶ Archilocus

۲۱۹ Arnold Wesker

آرٹل باؤسٹر ۶۵۳

آرٹو پلس ۷

آرٹس، جارج ۱۱۳

آسٹن ۵۹۸

آسٹروائڈ ۵۹۸، ۶۱۰

آسٹن، آسٹن ۳۱

آفری، کیو ۱۹۵

آفری ۵۲۰

آفری ۳۳۵

آفری، آفری ۶۹، ۶۳، ۶۷

آفری، آفری ۲۳۶

General Maximiliano Hernandez

۲۸۲ Maxnez

۲۸۲ General Francisco Moraz

۷۳۲ Jorge Haya Secay Ezaguarre

جوزف ہایا سیکای ایزاگوارے ۱۹۹، ۱۹۸، ۱۶۹، ۱۳۹، ۸۸، ۲۲

۵۶ Joseph Roth

۷۳۳ Joseph Roumanee

۵۹، ۵۷، ۵۳ Josefa Casinh

جوزفین ۷۵، ۵۱

۲۵۲ Joachim Du Beloy

۳۵۲ Jowchen

۲۱۱ John Osborne

۲۱۲ John Arden

۲۲۹ Johannes Becher

۲۲۲ Juan Ramon Jimenez

۱۸۱ John Langshaw Austin

۲۳۹ Johann Sebastian Bach

جوتیو ۷۵، ۷۴، ۷۳

۳۳۳ Julien Sorel

جولین سیریل ۷۷

۵۰، ۷۰، ۷۱، ۷۲ Juan Ramon Jimenez

۵۰ John C. Cabot

۹۸ John Malington Syngé

جولس سینگس ۲۳، ۲۸، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷

جیرارڈ سینگس باپٹسٹا ۹۱

۱۵۶ Jeremy Cronin

۲۲۶ Jesus Lara, Jorge

۵۶ Jan Seroke

۲۵۳ Theodoropoulos, Domenicos

۲۸۸ Tynaeus

۲۳۷، ۲۳۶، ۲۳۱ Tynianov

ج

جارج جیمز ۷۳، ۷۴، ۷۵

جارج بریڈس ۷۶

جارج بریڈس ۷۶

۳۶۹ Jan Veroda

۶۷۶، ۶۷۵، ۶۷۴، ۶۷۳، ۶۷۲ John Syngé

۶۷۸ Joseph Strzygowski

۶۸۲ Jacinto Benavente

۶۸۵ Jerome Cognad

جون آف آر ۷۸

جوزف گیبارو ۷۹

جیک برب ۷۴، ۷۳

جارج بریڈس ہول گرڈر ۷۹، ۷۸

جے پی جیکسن ۷۹

جارج بریڈس ۷۹، ۷۸، ۷۷

جیمس جیکس ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱

جارج سینڈس ۷۳

جارج رٹل ۷۸

جان گارڈن ۷۳

۲۲۶ Jorge Guén

۳۰ George Sefens

۲۸۲ General Antonio Lopez de Santana

۲۸۲ General Gabriel Garcia Moreno

۵۹، ۵۷، ۵۳، ۵۲ Jeronimo Meminho

۱۰۴ Chien Hung

چینواچے ۱۵۶

ج

جام ۲۶۶

جسین مجروح ۲۰

(حضرت) بابا کو

(حضرت) عیسیٰ، عیسیٰ امین مریم ۱۶۸، ۱۶۸، ۱۶۸، ۱۶۹

۵۲۷، ۵۲۸

و

واریو ۶۵، ۶۶، ۶۷

واریو ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷

واریو (علیہ السلام) ۳۶

واریو ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹

۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳

۱۵۴، ۱۵۵

و

۱۵۸ Datok Laj

۱۵۸ Diderot

۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱

۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱

۱۵۸ Dario, Ruben

۱۵۸ Dr Andie Lwells

۱۵۸ Dr Hude

۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰

۱۵۸ Doblin

۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱

Jack Cope

جیک کاپ

۱۵۶ Jack Mapame

۱۵۶ James Benitez

جیمس، جیمس، جیمس

جیمس، جیمس، جیمس

۱۵۶ Jean Phyls

۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹

۱۵۶ Jose Maria, Arguedas

چ

۱۵۶ Chao Teh Liang

۱۵۶ Charlemagne

۱۵۶ Charles XII

چارلس، چارلس، چارلس

۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸

۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳

۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸

۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹

۱۵۶ Chon

۱۵۶ Chong

۱۵۶ Ching Shen Tan

۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹

۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸

۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸

۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹

۱۵۶ Chak

۱۵۶ Chlovski

شعبہ ۱۳۶

فوسکو، اکی نیم ۴۵۹

۴۴۱ Foscolo

۴۵۱ Foscolo, Ugo

۴۷۷ Fontane

۱۳۶ Fabel Rozack

۴۲۶ Federico Garcia Lorca

۴۶ Phetaxos, Fughas

۴۲۴ Facundo

۶۰۲ Fei Mei

فیلمز گیم ۵۹۸

ق

۴۰۴ Qu Yuan

ک

کارٹی ۵۴

کارل امیچر ۶۵۵، ۶۹۳

کارل ایچ ولف گیارپ ۶۹۹، ۶۹۸

کارل ٹیوگن ۶۹۴

۶۹۴ Carl Feis

کارل گسٹاف وورڈفان ہائینز اسٹام ۷۰۰، ۷۰۱

کارلاکس ۴۴۷

کارل مارکس ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۴۹، ۴۴۹

کارلو ایچرہگ ۷۰۱

۴۵۰ Carvaggio

کازیمیر سٹاتو ۴۸۴، ۴۸۴، ۴۸۴

۶۹۴ Casimire

۱۶۱، ۱۵۱، ۱۴۱، ۱۰۵ Kazuo Watanabe

۵۹۴۱۱, Ssu Ku Chuen Sh

ف

فانکر، یو ۵۵۷، ۵۵۶، ۵۵۵، ۴۸۵، ۴۴۴، ۴۴۵

فان میزجی گیم ۷۰۴

فانکسٹ ۷۵۵

فرانسس، بیضت ۵۷۲

فرانسوا کوئی ۶۳۰

فرانسوا شارل ماسی ۵۲۴

۵۰۶ Francisco Villaespesa

فرانکا ۶۶، ۷۷، ۷۷، ۷۷، ۷۷

فرنگوا ۵۵۵

۵۹ Franco

فرانز، گیم ۴۴۹، ۴۴۸، ۴۴۸

فرانز، گیم ۶۹، ۶۹، ۶۹

۱۴۰ Froude

۵۰، ۵۷، ۴۵ Fernando, Nogueira Pessoa

فریڈک، گیم ۶۹، ۶۹

فریڈکس، ۷۴۴، ۷۴۴

فریڈکس، ۴۴۹

۵۲۰ Frege, Götter

۴۴۵ Fray Luis de Leon

فلپ چو، ۱۶۵

فلوریس، گیم ۱۵۷، ۱۵۷، ۱۵۷، ۱۵۷، ۱۵۷، ۱۵۷

۶۸۵، ۵۴۹، ۴۴۰

۶۴۹، ۶۴۴ Flav Bert

۶۴۷ Flakol

کلیجریک گیوان ۱۳۹

گیوانیو وای ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷

۲۲ Ken Sato-Wiwa

۲۸ Kant

گنٹس، چارچ ۳۳۷

۱۷۲ Cardinal Logue

۱۲۲ Clavero, Francisco Javier

۲۲۶ Quiroga, Horacio

گ

۷۷۹ Gajardo

۲۲۵ Garciaso

۲۲۲، ۲۲۳ Garciaso, Inca

۲۵ Gargantua

۲۴ Garganua

۲۲۵، ۲۲۶ Galdos

۲۲۷ Gualdes

گاکوش گیان ۲۲، ۲۳

۱۱۶ Gabriele Deste

۲۲۲ Gideon Botha

۶۷ Gradus Cambrensis

۲۳۱ گراس

گراسیو، پیر ۱۵۷، ۱۵۸

گراسیو، جم ۱۵۸، ۱۵۹

۱۶۶ Grundvig

گراسیو، گارت ۵۰۹، ۵۱۰

گراسیو، گاسٹن ۱۲۰

۲۸۷ Greda, Jona

۲۲۷ Guzman, Nicomedes

گوسٹا، فرڈیننڈ ۱۳۸، ۱۳۹

گوسٹا، لوئی ۱۸۵

۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸ Guberg, Hjalmar

گوسٹن ۳۳۹

گوسٹن، راس ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴

۲۵ Gumer Ech

گوسٹریٹ ۵۷۲

۲۲۳ Gobaneau

گوسٹریٹ، زین ۱۳۷، ۱۳۸

گوسٹریٹ، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱

گوسٹریٹ، یو، لاف ۱۵۲

۲۱ Gosta Berling

۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸ Goston Galinard

۲۲۹ Gonzalez Videia

۲۲۵ Gengora

۲۲۹ Gaugwin

گوسٹریٹ، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱

گوسٹریٹ، راس ۵۰۸

۲۲۳ Gioso

گوسٹریٹ، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲

گوسٹریٹ، راس، گوسٹریٹ، ۵۰۸

۲۲۲ Guevar, Francisco Andres de

۱۵۷ Giovanni verga

۲۲۶ Gerard Diego

۷۲۵ Geuerstam

گوسٹریٹ، راس، گوسٹریٹ، ۱۱۷، ۱۱۸

گوسٹریٹ، ۱۱۷

لیڈی موراسا کی ۱۰۶

۶۰۳ Lu Ren Hua

۸۸ Lesang

۴۴۳ Le Corbusier

۴۱۵ Lelaput

لیتھن ۵۳۰

لیوان اسٹراس ۱۳۰

۴۵۲ Lore

۲۳۲، ۲۳۶، ۲۳۶ Leo Frobenius

۱۵۲ Lcarus

۶۴۶ Lubeck

لیڈی گرینجوی ۶۶۶، ۶۶۸، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲

۶۷۱، ۶۷۵

لیکچر س۔ بالرو میڈیکلین ۵۰۹، ۵۰۸، ۵۰۹

۴۴۴، ۴۴۴، ۴۴۴ Landivar, Rafael

۶۷۱ Lennox Robinson

۷۵۵ Lucre Hus

لیوڈا ڈاؤنڈوئی ۴۴۴، ۴۴۴

۴۶۵ Lewis, Sinclair

۴۶۷ Llosa, Vargas

م

۶۸۵ مآخمان ۶۸۵

۴۴۳ Madame de Renal

ماڈگان ۶۶۶

مارتھ ۶۲۵

مارٹن راجرڈس ۶۱۴، ۶۱۴

مارٹن ہائیڈر ۶۵۳

۴۶۶ Galegos, Romulo

۴۶۴ Geodrig Gringson

ل

لارڈ ہرن ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۶، ۷۳۶

۴۵۲ Lafayette

لیک ۶۴۳

لیکا ۴۴۸

لیٹر کوئٹ پرفیکٹ ۵۳۰، ۵۳۱

۴۶۶ La Mason Nuxingen

لرمانو ۶۴۹

۴۸۸ Lichen Berg

لیک داہی ۵۸۹، ۵۹۰

۵۹۲ Lung, Chien

۴۲۵، ۶۱۵ Lope de Vega

لیٹر ۴۴۹

۵۹۰ Lo Guanzhong

۶۰۹ Lu Hsun

۴۰۹ Lord Shattsbury

لیک این ہارکی ۴۵۷

۶۰۶ Lo Kuan Chung

۴۲۶ Lus Cernuda

۵۷۷ Luis Vaz de Camoes

۱۶۵ Lucan

لیک ہیرا ۶۴۳

۱۶۵ Lu Fo

۴۴۹, ech Pwower

۵۷۷ Lady Augusta Gregory

نے فی سائش ۳۳۷، ۳۳۹، ۳۴۰

و

وائسن، جارج ۳۳۷، ۳۳۸

وائٹر ۳۳۹، ۳۴۰

وائٹرائٹ ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰

۳۳۸، ۳۳۹ Water Paer

وائٹن شین ۱۸۳

وائٹک سمر جڈ ۳۳۹

۳۳۸ Var Nord

وائٹیر لینن ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱

وائٹیر کی ۳۳۹

۳۳۸ Van Lvyck Louw

۳۳۸ Vezotini, Edo

۳۳۷ Verbesky

ورخیا وائل ۱۳۵

ورجس ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶

ورٹن ۳۱۸

۳۳۸ Wergiened

۳۳۷ Wernicke, Enrique

۱۲۶ Visigoths

۸۱، ۸۰، ۸۱، ۸۲ Wessing

۱۳۲ Wessing

۱۸۹ Wessing

۳۳۸ Vick Baum

۱۸۲ Victor Henry

۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹

وائٹ رائٹ رائٹ رائٹ ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶

وائٹ رائٹ رائٹ ۳۳۵

۳۳۸ Vadam, Giovanni

۳۳۸ Wilfred Owen

وائٹ رائٹ رائٹ ۳۳۹

وائٹ رائٹ رائٹ ۳۳۹، ۳۴۰

۳۳۹ Wladyslaw Sebyla

وائٹ رائٹ رائٹ ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰

وائٹ رائٹ رائٹ ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰

وائٹ رائٹ رائٹ ۳۳۸، ۳۳۹

وائٹ رائٹ رائٹ ۳۳۸، ۳۳۹

۳۳۷ Vinas, David

وائٹ رائٹ رائٹ ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱

وائٹ رائٹ رائٹ ۳۳۸، ۳۳۹

۳۳۷ Vaughn

۳۳۷ Wolfgang Koepf

وائٹ رائٹ رائٹ ۳۳۸، ۳۳۹

۳۳۸ Vivienne Haigh-Wood

وائٹ رائٹ رائٹ ۳۳۹

۳۳۷ Webb

۳۳۷ Varela, Alfredo

۳۳۸ Wyzan Auden

۳۳۸ Vassily Kadinsky

۳۳۸ Weizsacker

۳۳۸ Weizsacker

۳۳۸ Vale-Indian

وائٹ رائٹ رائٹ ۳۳۹

وائٹ رائٹ رائٹ ۳۳۹

وائٹ رائٹ رائٹ ۳۳۹

۳۲۹ Henry James	۵۸۶ ہیکلوا، کوستا
۳۳۰ Henri de Montherlant	۳۰۹ وٹس
۳۳۱ Henriquez, Urena	
۳۳۲ ہنری ہارپاگون	۳۳۲ Harpagon
۳۳۳ Henry Wadsworth Long fellow	۳۱۸ ہارڈن زائٹس
۳۳۴ ہنری ہشتم	۵۰۹ ہالڈو پرگووٹس
۳۳۵ ہوارڈ ہال کے نیکس	۶۰۲، ۵۹۸ Han
۳۳۶ ہواٹک	۵۸۲ ہارپو، مارف
۳۳۷ Horace	۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹ ہائیڈر
۳۳۸ ہوزے ہنری گارسیا	۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹ ہائیڈر
۳۳۹ ہوزے مارٹا گوارا	۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹ ہائیڈر
۳۴۰ Hu Shih	۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹ ہائیڈر
۳۴۱ ہولڈر لین	۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹ ہائیڈر
۳۴۲ Holberg	۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹ ہائیڈر
۳۴۳ ہولسٹائن	۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹ ہائیڈر
۳۴۴ ہومر	۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹ ہائیڈر
۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸، ۱۵۱۹، ۱۵۲۰، ۱۵۲۱، ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ۱۵۲۶، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸، ۱۵۲۹، ۱۵۳۰، ۱۵۳۱، ۱۵۳۲، ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۳۶، ۱۵۳۷، ۱۵۳۸، ۱۵۳۹، ۱۵۴۰، ۱۵۴۱، ۱۵۴۲، ۱۵۴۳، ۱۵۴۴، ۱۵۴۵، ۱۵۴۶، ۱۵۴۷، ۱۵۴۸، ۱۵۴۹، ۱۵۵۰، ۱۵۵۱، ۱۵۵۲، ۱۵۵۳، ۱۵۵۴، ۱۵۵۵، ۱۵۵۶، ۱۵۵۷، ۱۵۵۸، ۱۵۵۹، ۱۵۶۰، ۱۵۶۱، ۱۵۶۲، ۱۵۶۳، ۱۵۶۴، ۱۵۶۵، ۱۵۶۶، ۱۵۶۷، ۱۵۶۸، ۱۵۶۹، ۱۵۷۰، ۱۵۷۱، ۱۵۷۲، ۱۵۷۳، ۱۵۷۴، ۱۵۷۵، ۱۵۷۶، ۱۵۷۷، ۱۵۷۸، ۱۵۷۹، ۱۵۸۰، ۱۵۸۱، ۱۵۸۲، ۱۵۸۳، ۱۵۸۴، ۱۵۸۵، ۱۵۸۶، ۱۵۸۷، ۱۵۸۸، ۱۵۸۹، ۱۵۹۰، ۱۵۹۱، ۱۵۹۲، ۱۵۹۳، ۱۵۹۴، ۱۵۹۵، ۱۵۹۶، ۱۵۹۷، ۱۵۹۸، ۱۵۹۹، ۱۶۰۰، ۱۶۰۱، ۱۶۰۲، ۱۶۰۳، ۱۶۰۴، ۱۶۰۵، ۱۶۰۶، ۱۶۰۷، ۱۶۰۸، ۱۶۰۹، ۱۶۱۰، ۱۶۱۱، ۱۶۱۲، ۱۶۱۳، ۱۶۱۴، ۱۶۱۵، ۱۶۱۶، ۱۶۱۷، ۱۶۱۸، ۱۶۱۹، ۱۶۲۰، ۱۶۲۱، ۱۶۲۲، ۱۶۲۳، ۱۶۲۴، ۱۶۲۵، ۱۶۲۶، ۱۶۲۷، ۱۶۲۸، ۱۶۲۹، ۱۶۳۰، ۱۶۳۱، ۱۶۳۲، ۱۶۳۳، ۱۶۳۴، ۱۶۳	

Subject: A Matter of Copyright

6 May 2009

Dear Baqar Naqvi

Subject: A Matter of Copyright

Thank you for your request.

We would be pleased to grant you permission to publish the Nobel Lectures you outlined from 1901-2000. We are very impressed with your dedication and interest in Nobel and think it is admirable that you have dedicated yourself in translating the Lectures into Urdu, so we would like to request only a symbolic fee of Euro xxx as payment for all the Lectures. I will prepare a License Agreement which will stipulate closer requirements including that you agree to refer to the Nobel Foundation's copyright for each Lecture / year.

I will prepare the License Agreement later this week and send you an email copy as well as two hard copies which you will need to sign and return to us. We will then sign and return one copy to you.

If you have a VAT number that would be helpful for invoicing.

Many thanks again,

Best regards,

Allegra Grevelius
Project Coordinator

Nobel Media AB
Sturegatan 14, 3 tr
P.O. Box 5232
SE-102 45 Stockholm, Sweden

Tel: +46(0)8 663 6136
Fax: +46(0)8 663 27 69
Cell: +46 (0) 70 739 7114
www.nobelprize.org

▲▲▲

باقر نقوی کی تصانیف

1	آزاد ہوا	شعری	1988	پبلک لیڈیشن، انسٹی ٹیوٹ آف قمریہ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر، لندن (اردو مرکز لٹریچر، لاس اینجلس سے مغرب کی بہترین کتاب انعام یافتہ) پبلک لیڈیشن، وینس، اٹلی پبلک لیڈیشن، اٹلی پبلک لیڈیشن، اٹلی پبلک لیڈیشن، اٹلی پبلک لیڈیشن، اٹلی
2	مکمل بھارت	شعری	1991	انسٹی ٹیوٹ آف قمریہ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر، لندن
3	موتی موتی رنگ	شعری	1994	انجمن تہذیبیہ نو، لاہور
4	انگریز فوٹس	شخصیت (نثر)	1999	اردو سائنس بورڈ، لاہور
5	شعبے کی دنیا	جینا، کھجک (نثر، تصویر)	2002	اردو سائنس بورڈ، لاہور
6	مکمل بھارت	مکمل بھارت (نثر)	2002	انجمن تہذیبیہ نو، لاہور
7	دامن	کلیات شعری	2004	اکادمی بانیات، اردو بورڈ، لاہور
8	برقیات، مود ایسٹرن کس کی برقیات و کپیڈ (نثر)	مکتبہ ریح	2005	مکتبہ ریح، اسلام آباد
9	مکتبہ ریح ایک مختصر جائزہ (نثر)		2006	اکادمی بانیات، اردو بورڈ، لاہور
10	امی ایف، ایک تحریک (نثر)		2007	اکادمی بانیات، اردو بورڈ، لاہور
11	نوٹس ایڈٹ	ایف، ورجن (نثر)	2009	اکادمی بانیات، اردو بورڈ، لاہور (میسورین صدی کے ادب کے نوٹس انعام پاکستان یا تحارف و تقاریر اور خطبات)

